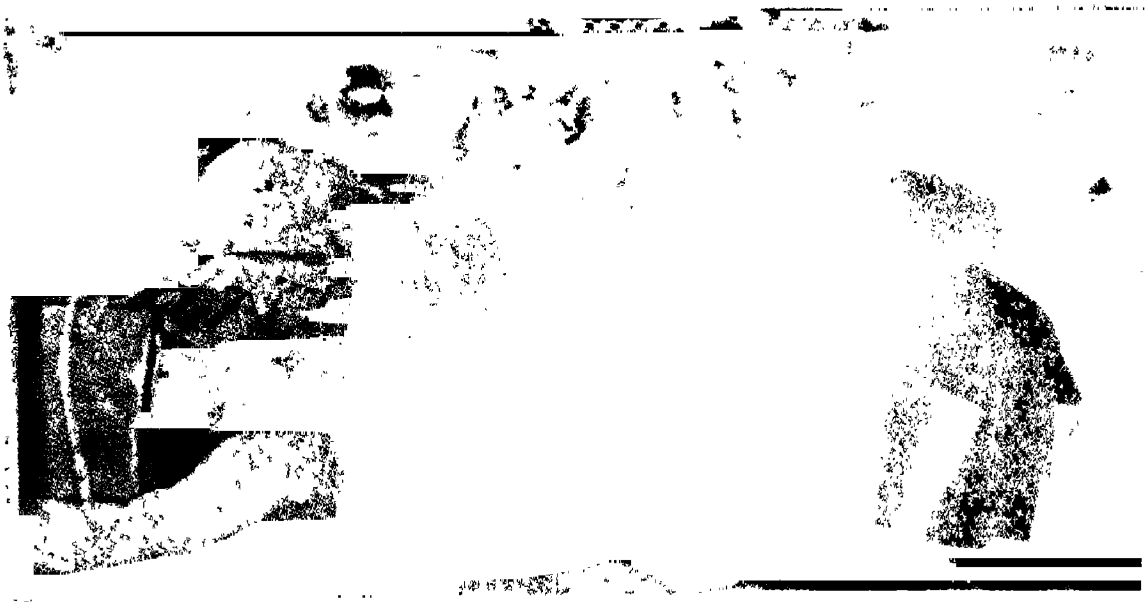
اگست ستمبر ۱۹۷۳ء ایک روپیہ

آجکل

اردو نمبر



۱۱ جولائی ۱۹۷۳ء کو ہندسرکار نے پاکستانی جنگی قیدیوں میں سے ۸۲۴ پاکستانیوں کو جن میں ۱۷ افسر، ۲۲ جونیر کمیشنڈ افسر، ۹۳۴۳ سپاہی اور ۳۰۰ شہری تھے انسانی ہمدردی کے ناتے رہا کر کے پاکستان واپس بھیجدیا۔ یہ کارروائی بنگلہ دیش کی رضامندی سے کی گئی۔ تصویر میں ایک بیمار قیدی کو واگہ سرحدی ناکے سے پار کرایا جا رہا ہے۔

جمعہ ۲۰ جولائی ۱۹۷۳ء کو پاکستانی جنگی قیدیوں کے چند عیال اور لواحقین کو بھی پاکستان واپس بھیج دیا گیا۔ تصویر میں یہ لوگ ایک خصوصی ٹرین سے واگہ سرحدی ناکے کے پاس اُتر رہے ہیں۔



اُردو کا مقبولِ عام مصوّر ماہنامہ

آجکل

نئی دہلی

ایڈیٹر
مہدی عباس حسینی

(ٹیلیفون نمبر ۳۸۷۰۶۹)

سب ایڈیٹر
نند کشور وکرم

جلد ۳۲ — شمارہ ۱-۲

اگست ستمبر ۱۹۷۳ء
شراون بھادر، آشوین تک سمت ۱۸۹۵

سالانہ چندہ

ایک سال	.	۷ روپے
۲ سال	:	۱۲ روپے
۳ سال	.	۱۷ روپے

اُردو نمبر

سرورق — جیون اڈلجہ

شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۱

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
یٹر آجکل (اُردو) پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی

ترسیلِ زر کا پتہ
بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی

اداریہ

ہند میں اُردو کا مستقبل

اُردو دُنیا کی اُن چند زبانوں میں سے ہے جو ایک سے زیادہ ملکوں میں بولی اور بھی لکھی اور پڑھی جاتی ہیں۔ دُنیا میں سب سے زیادہ ایسے لوگ جن کی مادری زبان اُردو ہے ہند میں پائے جاتے ہیں۔ باقی ماندہ پاکستان میں اور بعض اُن ملکوں میں جہاں ہندوستانی یا پاکستانی پائے جاتے ہیں۔

اُردو ہند میں پیدا ہوئی اور پروان چڑھی اور گو کہ گزشتہ ربع صدی اس کے لئے سازگار ثابت نہیں ہوئی لیکن آج بھی اُردو دو کروڑ چھیاسی لاکھ سے زیادہ ہندوستانیوں کی مادری زبان ہے جبکہ پاکستان میں اُردو محض ۳۳ لاکھ لوگوں کی مادری زبان ہے۔ اُردو پاکستان کی سرکاری زبان ضرور ہے لیکن وہاں اس کی حیثیت ایک مہاجر کی سی ہے۔ ایک طرف تو عملاً سرکاری زبان انگریزی ہے۔ دوسرے پاکستان میں اُردو کے وجود کا واحد سبب یہ ہے کہ اس کا ایک ادبی سرمایہ ہے کیونکہ وہاں علاقائی زبانیں اتنے زور اور دم داعیے کے ساتھ اُبھر رہی ہیں کہ جیسے ہی اُن کے پاس قابلِ لحاظ ادبی سرمایہ ہو جائے گا پاکستانیوں کو اُردو کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ لہٰذا پاکستان میں اُردو کا مستقبل مشتبہ ہے۔

"آج کل" کے اس شمارے میں شاید پہلی بار یہ کوشش کی گئی ہے کہ ہند کی ریاستوں میں اُردو کی صورتِ حال کا ایک صحیح جائزہ، بلاکم و کاست، محض حقائق اور اعداد و شمار کی روشنی میں پیش کیا جائے خود شناسی خود آگاہی کا پہلا درجہ ہے اور آگاہی عمل کا۔ آئندہ صفحات سے جو مجموعی صورتِ حال اخذ کی جا سکتی ہے وہ حسبِ ذیل ہے۔

۱۔ بہار، آندھرا پردیش، میسور اور مہاراشٹر کے علاوہ اردو میں ابتدائی تعلیم کا بندوبست دوسری ریاستوں میں تسلی بخش نہیں کہا جا سکتا۔ لہٰذا اردو داں اہلِ دین کے بچے دوسری علاقائی زبانیں پڑھنے لگے ہیں۔ پھر بھی [illegible] طور پر ملک میں اردو اسکولوں، طلبا اور اساتذہ کی تعداد میں اضافے کا رجحان نمایاں ہے۔

۲۔ تقسیمِ ملک کے وقت جتنے اخبارات و رسائل اردو [illegible] شائع ہوتے تھے ان کی تعداد اور اشاعت میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ اسی طرح [illegible] کی بہ نسبت آج کتابیں بھی زیادہ شائع ہوتی ہیں۔ ایسے موضوعات کا تنوع بڑھ گیا ہے۔ لیکن ایڈیشن چھوٹے ہو گئے ہیں۔ گو اس کی تلافی پیپر بیک ایڈیشنوں سے ہو جاتی ہے۔

۳۔ سرکاری اداروں میں اردو کا استعمال جو چند ریاستوں میں کم اور بعض میں بالکل ختم ہو گیا تھا اب اس میں رفتہ رفتہ پھر اضافہ ہو رہا ہے۔

۴۔ ابتدائی تعلیم میں اردو پڑھانے کا انتظام کم ہونے کے باعث اساتذہ کی تعداد میں کمی واقع ہو گئی تھی۔ لیکن اب یہ تعداد پھر بڑھ رہی ہے۔ لیکن اعلیٰ تعلیم میں طلبا اور اساتذہ کی تعداد آج ہمیشہ سے زیادہ ہے۔ فلمی اور صحافتی دنیا میں اردو مصنفین گیت کار اور صحافیوں کی بڑی مانگ ہے۔ مشاعروں کی اب بھی کمی نہیں اور شعرا کا معاوضہ بہت بڑھ گیا ہے۔

۵۔ درسی و علمی کتابوں کے تراجم کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ اصطلاحات و لغت سازی کو فروغ مل رہا ہے۔ سائنسی اور تکنیکی موضوعات پر طبع زاد کتابیں بھی لکھوائی اور شائع کی جا رہی ہیں۔

۶۔ علاقائی زبانوں اور اردو کے مابین تراجم جو تقسیمِ ملک کے وقت شاذ و نادر تھے اب بہت زیادہ بڑھ گئے ہیں۔ ہندی میں اُردو کا بہترین تخلیقی ادب نہ صرف ترجمہ ہو چکا ہے بلکہ نہایت مقبول ہوا ہے۔ اس طرح اُردو داں طبقے کو بھی دیگر ہندوستانی زبانوں کے ادب سے واقفیت ہو گئی ہے۔ اس سے قومی یک جہتی کو فروغ ملا ہے۔

۷۔ جہاں تک شعرا و ادبا کی سرپرستی کا تعلق ہے، نہ صرف مرکز بلکہ متعدد ریاستوں کی طرف سے بھی انہیں انعام و اکرام سے نوازا جاتا ہے۔ پنشن دی جاتی ہے۔ کتابوں کی اشاعت کے لئے امداد دی جاتی ہے اور کتابیں خریدی جاتی ہیں۔ اتر پردیش اور بہار میں اُردو اکاڈمیاں قائم ہو چکی ہیں۔ اُردو ادارے مثلاً انجمن ترقی اُردو، مکتبہ جامعہ، دارالمصنفین وغیرہ کو بھی امداد ملتی رہتی ہے۔ مرکز نے نہ صرف ایک ترقی اُردو بورڈ قائم کیا ہے بلکہ ایک فروغِ اُردو کمیٹی بھی مقرر کی ہے جس کے سربراہ مرکزی وزیرِ اطلاعات و نشریات، شری اندر کمار گجرال ہیں۔

مندرجہ بالا حقائق کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ اُردو کو نقصان پہنچانے والی قوتوں کا زور ختم ہو چکا ہے۔ اب فضا سازگار ہے اور حکومت پشت پر ہے سوال یہ ہے کہ کیا یہ مریض محض دوا کے بھروسے پر بیٹھا رہے گا یا کچھ قوتِ ارادی اور قوتِ عمل سے کام لے کر طبیب کے کام کو آسان کرے گا بلکہ اس کی ہر طرح سے مدد کرے گا؟

اُردو کی جڑیں مستحکم کرنے اور اس کی نشوونما کے لئے حکومت حسب ذیل اقدام کرسکتی ہے۔ پرائمری تعلیم کی سہولتیں مہیا کرنا کم از کم ثانوی درجوں تک اُردو ذریعہ تعلیم کے ادارے کھولنا اور اُردو مصنفین اور ناشرین کی امداد کرنا۔ جہاں تک شمالی ہند کا تعلق ہے ۱۹۴۷ء تک یہاں متعدد صوبوں میں اُردو مادری زبان والوں کے لئے ابتدائی ہندی اور ہندی مادری زبان والوں کے لئے ابتدائی اُردو پڑھنا لازمی تھا۔ آزادی کے بعد یہ پابندی ختم کردی گئی۔ اب اسے پھر سے لازم کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح ان صوبوں میں تمام اُن سرکاری افسروں کو جن کی مادری زبان اُردو تھی۔ ہندی کا ایک امتحان پاس کرنا ہوتا تھا جبکہ تمام اُن افسروں کو جن کی مادری زبان ہندی تھی اُردو کا ایک امتحان پاس کرنا ہوتا تھا۔ بغیر یہ امتحان پاس کئے ان افسروں کو مستقل نہیں کیا جاتا تھا۔ یہ دستور بھی دوبارہ رائج کرنا ضروری ہے۔

لیکن کوئی زبان محض حکومت کی پشت پناہی سے پھل پھول نہیں سکتی۔ زبان کا مستقبل عوام کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ اگر حکومت اسکول کھول دے اور ان کے در و دیوار اُردو پڑھنے والوں کی راہ دیکھتے رہ جائیں تو ایسے اسکولوں کا کیا فائدہ؟ یہ اُردو والوں کا فریضہ ہے کہ وہ اُردو پڑھنے اور پڑھانے پر اصرار کریں، اس کے لئے مستقل جد و جہد کریں بلکہ کچھ قربانیاں دینے پر بھی آمادہ رہیں۔ جب تک اُردو کے نام لیواؤں میں ایک مجاہدانہ اور تبلیغی جذبہ پیدا نہ ہوگا اور ایک اُردو تحریک جنم نہ لے گی حکومت کی ساری تدابیر بے سود ثابت ہوں گی۔ کہا جاتا ہے کہ پہلے گھر کا چراغ اور پھر مسجد کا چراغ، اس تحریک کا پہلا قدم یہی ہے کہ ہر اُردو داں اپنے بچوں کو اُردو پڑھانے کا انتظام کرے۔ اگر اسکول میں تعلیم ممکن نہ ہوسکے تو گھر پر اُستاد رکھ کر پڑھائے۔ اُستاد میسر نہ ہوسکے تو خود اپنے بچے کو پڑھائے بلکہ اپنے بچوں کو پڑھانے کے بعد محلے کے ناخواندہ بچوں اور بالغوں کو بھی اُردو پڑھائے۔ اس طرح اگر ایک اُردو داں محض ایک اور اُردو داں بھی بنا سکے گا تو بہت بڑا کام ہوجائے گا۔

اُردو پڑھانے کے ساتھ ساتھ اُردو کتابیں اور اخبار خرید کر پڑھنے کی عادت ڈالنا ضروری ہے۔ ہم میں سے ہر شخص سگریٹ پان بیڑی، چائے، تفریح وغیرہ پر جتنی رقم ہر ماہ خرچ کرتا ہے، اس کا دسواں حصّہ بھی ایک اُردو کتاب یا اخبار خریدنے کے لئے کافی ہوسکتا ہے۔ سوال صرف ایک اصول بنا لینے اور اس پر عمل کرنے کا ہے۔

اس تحریک کا تیسرا اصول یہ ہونا چاہیئے کہ اُردو کسی کی رقیب اور حریف نہیں خاص طور پر ہندی کی تو بالکل نہیں کیونکہ اُردو والوں کے لئے خود اپنی زبان کو سیکھنے اور سنوارنے کے لئے ہندی پڑھنا لازم ہے اور جتنی آسانی سے اردو، ہندی اور پنجابی والے ایک دوسرے کی زبان سیکھ اور لکھ سکتے ہیں اتنی دُنیا کی کسی اور تین زبان والوں کے لئے ممکن نہیں۔

تحریک کا چوتھا پہلو جو تیسرے اصول سے منسلک ہے یہ ہونا چاہیئے کہ اُردو کے بارے میں غلط فہمیوں کو دور کرانا اور علاقائی زبانوں میں اس کی صحیح امیج کو پیش کرنا از حد ضروری ہے۔ اُردو ہند کی زبان ہے، اُردو ہند کے باشندوں کی ایک ضرورت پوری کرتی ہے، اُردو ہند کی تہذیب کا ایک بیش بہا ورثہ ہے۔ آج کے نام نہاد ہندی فلموں کے مکالموں اور گیتوں غزلوں اور قوالیوں کی مقبولیت اس کا ثبوت ہے کہ اُردو ہند کے عوام کے جذبات و احساسات کی عکاسی کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ جبھی یہ زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔ برگد کے درخت کی طرح اُردو میں بھی شاخوں سے جڑیں پیدا کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ اگر اُردو والے اپنے حقوق کو پہچانیں اور اپنے فرائض سے غافل نہ ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ اُردو کی جڑیں ملک میں مضبوط نہ ہوجائیں اور اس کا مستقبل درخشدہ نہ ہو۔

یہ شمارہ: ہم نے اس شمارے کا خاکہ بڑے حوصلے سے بنایا تھا اور مضمون نگار حضرات سے اتنی معلومات کا مطالبہ کیا تھا، کہ بعض نے جائز طور پر جواب دیا کہ یہ مضمون کی بجائے ایک تھیسس کا خاکہ ہے لیکن ہمیں انتہائی مسرت ہے کہ مضمون نگار حضرات نے ریاستوں میں اُردو کی ترقی کے بارے میں واقعی اتنے سیر حاصل مضامین بھیجے کہ اُن کو مختصر کرنا بھی جوئے شیر کا لانا بن گیا۔ لہٰذا ہم ان مضمون نگاروں کو مبارک باد دیتے ہوئے اُن سے عذر خواہ بھی ہیں کہ اگر تلخیص میں کوئی اہم نکتہ چھوٹ گیا ہو تو وہ عفو و درگزر سے کام لیں۔ ہمیں قارئین سے بھی معافی مانگنا ہے کہ جس خاکے کا اعلان کیا گیا تھا اس میں مصنف، مدیر، ناشر، اور قاری کے مسائل اور مرکزی حکومت کی اُردو خدمات کا ذکر صفحات کی کمی کے باعث روک لینا پڑا۔ اب یہ مضامین اور اُردو سے متعلق دیگر بیش بہا مضامین اکتوبر کے شمارے میں شامل ہوں گے۔ جو اُردو نمبر کا ضمیمہ ہوگا۔



مسعود حسن رضوی



اعجاز حسین



آنند نرائن ملاّ



فراق گورکھپوری



حیات اللہ انصاری



مسعود حسین خاں



آل احمد سرور



علی جواد زیدی



امتیاز علی عرشی



اسلوب احمد انصاری



فضا ابن فیضی



معین احسن جذبی



نذیر بنارسی



نازش پرتاب گڑھی



نشور واحدی

اتر پردیش میں اردو



شہریار



قمر احسن



ساجدہ زیدی



غلام مرتضیٰ راہی



صلاح الدین پرویز

اُتر پردیش میں ہند کی ساری عظمتیں اور قوتیں اُس کے سارے تضاد اور کمزوریوں کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ زبانیں ماحول اور تہذیب سے بنتی اور سنورتی ہیں۔ ایک مدت تک یہ گنگا اور جمنا کا دوآبہ، ملک کا زرخیز ترین حصہ تھا۔ یہیں آریوں کی سب سے بڑی آبادیاں قائم ہوئیں۔ یہیں ان کا مذہب، تہذیب و تمدن نقطۂ کمال تک پہنچا۔ یہ نہ صرف وشنو کے اوتار، رام اور کرشن کی جنم بھومی ہے بلکہ اس میں شیو کی نگری وارانسی اور گوتم بدھ کی تبلیغ کا نقطۂ آغاز سارناتھ بھی پایا جاتا ہے۔ اس میں مغل تخیل، جذبے اور عمل کا شاہکار تاج محل پایا جاتا ہے۔ اسی میں ہندو مسلم تہذیب کا سنگم لکھنؤ موجود ہے۔ اُردو زبان کا آغاز پنجاب اور ہریانہ کے میدانوں میں ہوا۔ دکن نے اُسے ایک ادبی روپ دیا۔ دلی نے اُسے اُردوئے معلیٰ بنایا لیکن جب مغل سلطنت میں اضمحلال آنے لگا تو نوابین اودھ اور رام پور نے اُسے سہارا دیا اور لکھنؤ کے تہذیبی ماحول میں تو اُردو میں رَہ چلا، حلاوت اور نفاست پیدا ہوئی کہ اودھ کی سلطنت کے مٹنے کے سو برس بعد آج بھی ملک کے ہر گوشے کے لوگ لکھنؤ کی زبان کا دم بھرتے ہیں۔ اُردو ہی نہیں ٹکسالی ہندی بھی اسی پردیش میں بولی جاتی ہے۔

پس منظر:- اُتر پردیش میں اُردو کی جڑیں بہت قدیم ہیں۔ امیر خسرو (۱۲۵۵ء-۱۳۲۵ء) جنہیں اُردو اور ہندی دونوں زبانوں کا پہلا شاعر کہا جاتا ہے۔ ایٹہ ضلع کے ایک گاؤں پٹیالی میں پیدا ہوئے۔ خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی یہیں کچھوچھہ شریف میں دفن ہیں۔ آج اُردو کی قدیم ترین نثری کتاب، انہیں کا ایک رسالہ "اخلاق و تصوف" (تصنیف ۱۳۰۰ء) ہمارے پاس موجود ہے۔ ان کے سب بھی تاریخ اُردو ادب کے چند اہم ستون اس ریاست سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں محمد افضل جھنجھانوی (وفات ۱۶۲۵ء) جن کی اُردو کی مثنوی اور بارہ ماسہ موجود ہے اور چندر بھان برہمن (پیدائش اکبرآباد وفات ۱۶۶۲ء) جن کی ایک اُردو غزل اب بھی مشہور ہے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں عطا حسین تحسین اٹاوی (نوطرز مرصع ۱۷۹۸ء) اکرام علی (فورٹ ولیم کالج) رجب علی بیگ سرور، فقیر محمد خاں گویا، منشی عبدالکریم (مولف الف لیلہ اُردو) امانت لکھنوی، مولوی غلام امام شہید، خواجہ غلام غوث بےخبر، مولانا عبدالحق خیرآبادی، مولانا فضل حق خیرآبادی، سب اُتر پردیش کی خاک سے پیدا ہوئے۔

دراصل صرف پیدائش کو باعثِ تفاخر نہیں سمجھنا چاہئے۔ یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ کوئی علاقہ یا مرکز کسی ادب کی نشو و نما کے لئے کس قدر موافق فضا بہم پہنچاتا ہے۔ اگر ہم اس معیار کو مدِنظر رکھیں تو زوالِ دہلی کے بعد اُردو ادب کی ترویج و ترقی میں لکھنؤ، رام پور، علی گڑھ، الٰہ آباد اور اعظم گڑھ کی خدمات کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اگر برہمن، نظیر اور غالب آگرے میں پیدا ہوئے تو سرسید احمد، نذیر احمد، حالی اور وحیدالدین سلیم نے علی گڑھ میں بیٹھ کر علم و ادب کو مالا مال کیا۔ اسی طرح میر و سودا، مصحفی اور انشا، غالب، مومن اور داغ دلی والے ضرور تھے لیکن ان کو سہارا لکھنؤ اور رام پور میں ملا۔ قصہ مختصر اگر ہم چند نام گنانا چاہیں، (زندہ ادیبوں کا ذکر بعد میں آئے گا) تو ایک زریں فہرست تیار ہو جائے گی جس میں نظیر، انیس، دبیر، آتش، ناسخ، نسیم، شوق، امیر، تسلیم، جان صاحب، اکبر، چکبست، حسرت، صفی، آرزو، عزیز، ظریف، ثاقب، فانی، اصغر، جگر، سیماب، نظر، سرور، روان، نظم، رَوِش، نور لکھنوی، سہیل اور مجاز شعرا میں، سرشار، شرر، سجاد حسین، محمد علی ردولوی، سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش، قاضی عبدالغفار، پریم چند، علی عباس حسینی تخلیقی لکھنے والوں میں، اور شبلی، سید علی و سید حسن بلگرامی، عبدالستار صدیقی، سید سلیمان ندوی، رام بابو سکسینہ، نیاز فتحپوری، احتشام حسین، اختر علی تلہری، ضیا احمد بدایونی، ڈاکٹر ذاکر حسین وغیرہ تحقیق، تنقید اور انشائیہ کے میدان میں اپنا سکہ جما چکے ہیں۔

اُتر پردیش کو یہ بھی شرف حاصل ہے کہ کل ہند ترقی پسند مصنفین کی تحریک نے اسی سرزمین میں جنم لیا۔ پہلی ترقی پسند مصنفین کانفرنس ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں منعقد ہوئی اور انجمن کے صدر پریم چند اور سکریٹری سجاد ظہیر چنے گئے۔ دوسری اور تیسری کل ہند کانفرنس بھی اُتر پردیش میں بمقام الٰہ آباد منعقد ہوئی۔ تحریک کے جنم داتاؤں میں سجاد ظہیر، پریم چند، ڈاکٹر عبدالعلیم، احمد علی (جو اس وقت الٰہ آباد میں پڑھاتے تھے) فراق گورکھپوری، ڈاکٹر اعجاز حسین، ڈاکٹر عابد حسین، احتشام حسین اور ڈاکٹر رشید جہاں کا نام پیش پیش ہے۔ تحریک کا ترجمان رسالہ "نیا ادب" سبط حسن، علی سردار جعفری، اور مجاز نے لکھنؤ سے نکالا۔ اور اس زمانے میں حیات اللہ انصاری کے ہفت روزہ "ہندوستان" نے بھی ترقی پسند لکھنے والوں کو بڑھاوا دیا۔ ان دونوں جریدوں میں لکھنے والوں میں بانیوں کے علاوہ حسرت موہانی، جوش ملیح آبادی، ساغر نظامی، علی عباس حسینی، آنند نرائن ملا، علی سردار جعفری، مجاز، جان نثار اختر، حیات اللہ انصاری، علی جواد زیدی، مسعود اختر جمال، اور سلام مچھلی شہری پیش پیش تھے۔

اُردو مراکز:- اتر پردیش میں کئی طرح کے علم و فضل کے مراکز پائے جاتے ہیں۔ ایک نو دربار سے وابستہ یعنی اکبرآباد، لکھنؤ، رام پور وغیرہ، دوسرے دربارت دور چھوٹے شہر اور قصبے جہاں علماء اور صوفیا کے گھرانے اور مدرسے تھے۔ مثلاً سہارن پور، مرادآباد، میرٹھ بجنور، بدایوں، مارہرہ، نہٹور، بلگرام، جایس، سیتاپور، خیرآباد، آعظم گڑھ، چریاکوٹ، گورکھپور، فیض آباد، جونپور، مچھلی شہر، گوپامئو، غازی پور وغیرہ۔ تیسرے وہ شہر جہاں یونی ورسٹیاں قائم ہیں ان میں علی گڑھ، الہ آباد، بنارس اور لکھنؤ نے اُردو ادب کو بہت کچھ دیا ہے۔

علی گڑھ اُردو ادب کی ترویج و ترقی میں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ سر سید نے اسی کو اپنے خیال و عمل کی آماجگاہ بنایا۔ ان کے ساتھیوں میں محسن الملک، چراغ علی، نذیر احمد، اور شبلی، اتر پردیش کے رہنے والے تھے اور حالی اور سلیم پانی پتی نے اپنی عمر کا بہترین کام علی گڑھ میں کیا۔ ان کے علاوہ محمد علی جوہر، شوکت علی، محفوظ علی بدایونی، عبدالرحمٰن بجنوری، حسرت موہانی، فانی بدایونی، عظمت اللہ خاں، ظفر علی خاں، اقبال سہیل، سجاد حیدر یلدرم، سجاد انصاری، سلطان حیدر جوش، ظفر عمر، قاضی عبدالغفار، ضیاء احمد بدایونی، ڈاکٹر ذاکر حسین، خواجہ غلام السیدین، ڈاکٹر عبدالعلیم، رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور، معین احسن جذبی، مسعود حسین خاں، مختارالدین آرزو، اختر رائے پوری، اختر انصاری، سبط حسن، مجاز، علی سردار جعفری، عصمت چغتائی، شاہد لطیف، حیات اللہ انصاری، خواجہ احمد عباس، جاں نثار اختر، یاری علیگ، منٹو، خلیل الرحمٰن اعظمی، اسلوب احمد انصاری، منیب الرحمٰن اور ڈاکٹر محمد حسن بھی علی گڑھ سے کسی نہ کسی طور سے وابستہ رہے۔ یہ فہرست بھی جامع نہیں۔

اُردو زبان بولنے والوں کی تعداد

پچھلے چند دہوں میں اتر پردیش میں سیاسی اسباب کی بنا پر اُردو کو خواہ مخواہ ہندی کا حریف قرار دے کر اس کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے لیکن اب بھی اُردو مادری زبان درج کرانے والوں کی تعداد ملک میں سب سے زیادہ اتر پردیش میں ہے۔ پچھلی چند مردم شماریوں کے اعداد ملاحظہ ہوں

۱۹۵۱ء	۱۹۶۱ء	۱۹۷۱ء
۴۳٬۰۰٬۴۲۵	۷۸٬۹۱٬۷۱۴	۹۲٬۷۳٬۰۸۹
تینتالیس لاکھ چار سو پچیس	اٹھہتر لاکھ اکیانوے ہزار سات سو چودہ	بانوے لاکھ تہتر ہزار نواسی

مردم شماری کے سلسلے میں اُردو والوں کو مستقل شکایت رہی ہے کہ متعدد ریاستوں میں اُن کی تعداد صحیح نہیں درج ہوتی ہے۔ مرکزی محکمے کی غیر جانبداری میں کسی کو کلام نہیں لیکن ریاستوں میں مردم شماری کرنے والا عملہ مقامی ہوتا ہے اور یہ مقامی لوگ اگر کسی خاص زبان سے لگاؤ یا پرخاش رکھتے ہوں تو ان پڑھ لوگ بالکل اُن کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۶۱ء اور ۱۹۷۱ء کے اعداد سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اتر پردیش میں ۱۹۵۱ء میں زبان کا خانہ صحیح طور پر نہیں بھرا گیا۔ پھر ۱۹۷۱ء کے اعداد ہی کو لیجئے۔ کہا جاتا ہے کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے اور جہاں تک اتر پردیش کا تعلق ہے۔ ایسا مسلمان مشکل سے ملے گا۔ جو اُردو کو اپنی مادری زبان نہ مانتا ہو۔ لیکن ۱۹۷۱ء میں ریاست میں مسلمانوں کی مجموعی تعداد ۱٬۳۶٬۷۷٬۰۰۰ تھی۔ اور اُردو مادری زبان والوں کی تعداد صرف ۹۲٬۷۳٬۰۸۹۔ سوال یہ ہوتا ہے کہ باقی چوالیس لاکھ سے زیادہ مسلمانوں نے کون سی مادری زبان درج کرائی یا اُن کے خانے میں کون سی زبان لکھی گئی؟ واضح ہو کہ یہ تعداد ۱۹۵۱ء میں اُردو مادری زبان درج کرانے والوں کی مجموعی تعداد سے بھی زیادہ ہے۔ بہرحال اگر بانوے لاکھ کی تعداد ہی کو صحیح مان لیا جائے تو بھی یہ محض اُن لوگوں کی تعداد ہے جو اُردو کو اپنی مادری زبان بتاتے ہیں۔ اتر پردیش میں اُردو بولنے اور سمجھنے والوں کی کُل تعداد معلوم کرنا ہو تو اس میں نہ صرف ہندی بلکہ دیگر تمام زبانیں بولنے والوں کو یعنی ریاست کی پوری آبادی کو شامل کر لیجئے۔ کیوں کہ جہاں تک بول چال کا تعلق ہے اُردو اور ہندی میں کوئی فرق نہیں اور اتر پردیش کا بچہ بچہ دونوں زبانیں بولتا اور سمجھتا ہے۔

تعلیمی سہولتیں:- اتر پردیش میں اُردو تعلیم کے بارے میں کس حد تک ترقی ہوئی ہے، اس کا اندازہ لگانے کے لئے ضروری ہے کہ لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی رپورٹ کے چند ارشادات نقل کئے جائیں۔ کمشنر نے اپنی رپورٹ میں جو ۱۹۷۱ء میں طبع ہوئی تھی، لکھا ہے کہ ریاستی سرکار نے ۷۰-۱۹۶۹ء کے لئے پرائمری اسکولوں میں اقلیتی زبانوں کے طلبا کے لئے ایڈوانس رجسٹر رکھنے کے بارے میں ۵۴ میں سے صرف ۳۲ اضلاع کے بارے میں اعداد و شمار بھیجے ہیں۔ نیز یہ کہ ۷۰-۱۹۶۹ء کے لئے پرائمری تعلیم کے مکمل اعداد و شمار ریاستی سرکار نے تا حال نہیں بھیجے لہٰذا کمشنر نے ۶۹-۱۹۶۸ء کے اعداد و شمار سے یہ اخذ کیا کہ اُردو اسکولوں اور سکشنوں کی

تعداد جو پچھلے سال علی الترتیب ۲۲۶۸٬ اور ۳۶۳ ۲ تھی, ۶۹-۱۹۶۸ء میں گھٹ کر ۲۰۶۱ اور ۲۹۰ ۲ رہ گئی۔ اسی طرح اُردو پڑھنے والوں اور اساتذہ کی تعداد جو پچھلے سال علی الترتیب ۲٬۴۴٬۵۲۷ اور ۵٬۵۲ ۵ تھی ۶۹-۱۹۶۸ء میں گھٹ کر ۲٬۳۰٬۵۷۷ اور ۵۰۰۰ رہ گئی۔ جہاں تک ثانوی تعلیم کا تعلق ہے، صرف ۴۹ اضلاع کے لئے دونوں سالوں کے اعداد و شمار مہیا ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ گو ۶۹-۱۹۶۸ء میں اُردو پڑھانے والے اسکولوں اور اساتذہ کی تعداد پچھلے سال کے مقابلے میں علی الترتیب ۵۹۸ اور ۶۳۴ سے بڑھ کر ۶۸۱ اور ۸۰۲ ہو گئی۔ لیکن طلبا کی تعداد جو پچھلے سال ۹۸۴، ۳۹ تھی گھٹ کر ۸۲۶، ۳۹ رہ گئی۔

بعد کے تین سال یعنی ۷۰-۱۹۶۹ء، ۷۱-۱۹۷۰ء ۷۲-۱۹۷۱ء کے بارے میں اعداد و شمار دستیاب نہیں۔ لیکن اُتر پردیش سوچنا دبھاگ کے ایک حالیہ کتابچے سے ۷۳-۱۹۷۲ء کے لئے حسب ذیل معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

	تعداد	
اُردو (میڈیم) پرائمری اسکول	۲۲۰۰	
اُردو (اختیاری) سکنڈری اسکول	۱۲۰۰	
اُردو (میڈیم) سکنڈری اسکول	۳	(صرف علی گڑھ میں)
اُردو (اختیاری) گورنمنٹ ڈگری کالج	۱	(رام پور میں)
اُردو (اختیاری) یونیورسٹیوں میں	ریاست کی ساری یونیورسٹیاں	
ہائی اسکول امتحان اُردو طلبا (اختیاری)	۲٬۹۹	
انٹر امتحان اُردو طلبا (اختیاری)	۵٬۰۶۱	

کتابچے سے ظاہر ہوتا ہے کہ "ریاست کے شہری علاقوں کے ہر پرائمری سکول میں آئندہ تعلیمی سال سے (جواب شروع ہو چکا ہے۔ ادارہ) اُردو پڑھانے کی تمام سہولتیں مہیا ہوں گی۔ اس مقصد کے لئے تقریباً چار ہزار اُردو ٹیچر مقرر کئے جائیں گے۔ اگر کسی پرائمری اسکول میں فی الحال اُردو پڑھنے والے طالب علم نہ ہوں گے تب بھی اس اسکول میں کم از کم ایک اُردو ٹیچر کا بندوبست کیا جائے گا۔"

کتابچے کے مطابق ریاست نے اُردو کی تعلیم اور اس کی دیکھ بھال کے لئے ڈپٹی ڈائریکٹر کی تقرری کی ہے اس کے علاوہ ہر منطقے کے لئے ایک ڈپٹی انسپکٹر اُردو میڈیم اسکولوں اور ریاست بھر کے عربی مدرسوں کے لئے ایک انسپکٹر مقرر کیا جا چکا ہے۔ اُردو کے ٹیچروں کی تقرری کے لئے ۱۹۷۲ء میں ۱۸ لاکھ روپے منظور کئے گئے تھے۔

"ابھی تک پہلے درجے سے لے کر پانچویں درجے تک ہی اُردو کی درسی کتابیں مہیا تھیں۔ موجودہ حکومت نے حکم دیا کہ جولائی ۱۹۷۲ء سے چھٹی ساتویں اور آٹھویں درجوں کے لئے بھی اُردو نصاب کی کتابوں کے علاوہ تاریخ، جغرافیہ، حساب، الجبرا غرض کہ پندرہ مضامین میں اُردو کی درسی کتابیں مہیا ہو جائیں۔ چنانچہ یہ کتابیں گزشتہ سال بازار میں آ گئی تھیں۔"

اخبارات و رسائل :- اُردو صحافت میں ہندوستان کے جن مراکز کو پیش قدمی کا شرف حاصل ہے، اُن میں سے ایک اُتر پردیش ہے۔ اُردو کا پہلا اخبار جام جہاں نما ۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے شائع ہوا تھا۔ اس کے تقریباً ۱۵ برس بعد یعنی ۱۸۳۷ء میں مرزا پور سے پہلا ماہانہ اخبار "خیر خواہ ہند" جاری ہوا۔ ریاست کے پہلے ہفتہ وار "اسعد الاخبار" (آگرہ — ۱۸۴۷ء) کی اشاعت کے بعد متعدد دوسرے شہروں، بنارس، بریلی، میرٹھ، علی گڑھ، لکھنؤ وغیرہ سے سہ روزہ، ہفتہ وار، پندرہ روزہ اور ماہانہ اخبارات و رسائل کی اشاعت کا ایک سلسلہ چل پڑا۔ تاہم دُنیائے صحافت میں اس ریاست کی دھوم لکھنؤ سے اجرا شدہ منشی نول کشور کے "اودھ اخبار" (۱۸۵۹ء) اخبار "سین ٹیفک سوسائٹی" (۱۸۶۸ء) "تہذیب الاخلاق" (۱۸۷۰ء) اور منشی سجاد حسین کے مزاحیہ اخبار "اودھ پنچ" (۱۸۷۷ء) سے مچی۔ "دنیائے ادب میں اُتر پردیش کا نام منشی نوبت رائے نظر کے "خدنگ نظر" (لکھنؤ) منشی دیا نرائن نگم کے "زمانہ" (کانپور) اور مولانا نیاز فتح پوری کے "نگار" (لکھنؤ) سے اونچا ہوا۔

ماضی کی طرح یہ خطہ، اخبارات، اخبار نویسوں اور صحافیوں کا اہم مرکز ہے۔ رجسٹرار آف نیوز پیپرز فار انڈیا کی رپورٹ (۱۹۷۲ء) کے مطابق اس وقت اُتر پردیش سے ۱۸ روزنامے، ۴ سہ روزے، ۲۸۷ ہفتہ وار، ۱۹ پندرہ روزے، ۱۶۸ ماہنامے اور دیگر اخبارات و رسائل شائع ہوتے ہیں۔

جہاں تک روزناموں کا تعلق ہے۔ ۱۸ میں سے صرف چار اخبار ایسے ہیں جو آزادی کے پہلے سے نکل رہے ہیں۔ باقی سبھی روزناموں کا اجرا مختلف وقتوں میں مختلف شہروں سے عمل میں آیا ہے۔ اس وقت "قومی آواز"، "پیغام"، "قومی جنگ" اور "سیاست جدید" اُتر پردیش کے مقبول روزنامے ہیں۔ "قومی آواز" (لکھنؤ - ۱۹۴۵ء) کے موجودہ ایڈیٹر جناب عشرت علی صدیقی ہیں۔ ان سے پہلے مشہور ادیب و صحافی حیات اللہ انصاری اس اخبار کے ایڈیٹر رہے ہیں۔ یہ اخبار لگ بھگ ۹ ہزار شائع ہوتا ہے جناب وجیہ الدین کی ادارت میں کانپور سے نکلنے والا اخبار "پیغام" بھی ۱۹۴۵ء میں جاری

ہوا تھا۔ یہ اخبار بھی تقریباً ۹ ہزار شائع ہوتا ہے۔ مذکورہ اخبارات ہی جیسا مقبول روزنامہ "قومی جنگ" (رامپور۔ ۱۹۶۷ء) ہے۔ اس کے ایڈیٹر جناب ہاشم رضا عابدی الہ آبادی ہیں۔ روزنامہ "سیاست جدید" کانپور سے شائع ہوتا ہے اس کے ایڈیٹر جناب غفران زاہدی ہیں دوسرے روزانہ اخبارات "آزاد" (بنارس) "جدت" (مرادآباد) "ناظم" (رامپور) "صبح و شام" (رامپور) وغیرہ ہیں۔

ریاست سے چار سہ روزہ اخبار نکلتے ہیں۔ ان میں سے "مدینہ" (بجنور) سب سے پرانا ہے۔ یہ ۱۹۱۲ء میں جاری ہوا تھا۔ اس کے موجودہ ایڈیٹر سعید اختر صاحب ہیں۔ اس کی تعداد اشاعت تقریباً دو ہزار ہے۔

اتر پردیش سے اس وقت ۷۸ ہفتہ وار اخبار شائع ہوتے ہیں ان میں صرف دس ہفتہ وار ایسے ہیں جو آزادی کے قبل سے شائع ہو رہے ہیں باقی سبھی بعد میں جاری ہوئے۔ ریاست کا سب سے پرانا ہفتہ وار اخبار "مخبر عالم" (مرادآباد) ہے۔ یہ ۱۹۰۳ء میں جاری ہوا تھا۔ اس کے ایڈیٹر منظور رضوی صاحب ہیں۔ ۱۹۰۳ء ہی میں بدایوں سے ہفتہ وار "ترجمان القرآن" جاری ہوا تھا ریاست کا ایک کثیر الاشاعت ہفتہ وار "انصاری دنیا" (مرادآباد) ہے۔ اسرار حسین صاحب کی ایڈیٹری میں نکلنے والا یہ اخبار تقریباً آٹھ ہزار شائع ہوتا ہے۔ باقی سبھی ہفتہ وار اخبارات کی تعداد اشاعت دو ہزار سے کم ہے۔ علمی ادبی حلقوں میں "ہماری زبان" (علی گڑھ) "صدق جدید" (لکھنؤ) خاصے مقبول ہیں۔ "ہماری زبان" کے ایڈیٹر اردو کے مشہور نقاد جناب آل احمد سرور ہیں۔ "صدق جدید" کے ایڈیٹر اردو کے بزرگ نقاد صحافی اور ادیب مولانا عبدالماجد دریا بادی ہیں شیعہ قوم کا ترجمان ہفتہ وار "سرفراز" لکھنؤ سے مصطفیٰ حسن رضوی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔

اتر پردیش سے شائع ہونے والے ماہناموں میں علمی، ادبی، مذہبی جاسوسی غرض کہ ہر نوع کے رسائل شامل ہیں۔ "الواعظ" (لکھنؤ۔ ۱۹۱۴ء) "معارف" (اعظم گڑھ۔ ۱۹۱۵ء) اور "حرم" (لکھنؤ۔ ۱۹۳۱ء) ہی شاید تین ماہنامے ہیں جو آزادی سے قبل سے نکل رہے ہیں۔ "معارف" علمی ادبی رسالہ ہے۔ ریاست کے دوسرے علمی ادبی رسالے "نیا دور" (لکھنؤ ۱۹۵۱ء) "کتاب" (لکھنؤ ۱۹۶۲ء) اور "شب خون" (الہ آباد ۱۹۶۶ء) ہیں۔ "نیا دور" محکمہ اطلاعات اتر پردیش کا رسالہ ہے۔ اس کے ایڈیٹر جناب خورشید احمد ہیں۔ "کتاب" کے ایڈیٹر جناب شمیم الدین ہیں اور اس کی مجلس مشاورت میں جناب حیات اللہ انصاری، عابد سہیل، سہیل عظیم آبادی اور ڈاکٹر قمر رئیس شامل ہیں۔ "شب خون" محترمہ عقیلہ شاہین کی ادارت میں نکلتا ہے۔ جناب شمس الرحمان فاروقی اور محمود ہاشمی اس رسالے کی مجلس مشاورت میں ہیں۔ مذکورہ نیز ریاست کے دوسرے علمی ادبی رسائل میں کسی کی بھی تعداد اشاعت دو ہزار سے زیادہ نہیں ہے۔

ریاست سے مذہبی رسالے ایک بڑی تعداد میں شائع ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض کی تعداد اشاعت بھی خاصی ہے۔ ان میں "تجلی" (دیوبند) "الحسنات" (رامپور) اور "دارالعلوم" (دیوبند) "الفرقان" (لکھنؤ) "الزارالاسلام" (وارانسی) "الحضرت" (بریلی) اور دوسرے کئی رسالے شامل ہیں۔ ماہنامہ "تجلی" (دیوبند) کی تعداد اشاعت آٹھ ہزار سے زیادہ ہے۔ "کلیان" (لکھنؤ) "نور" (رامپور) اور "ثاقی" (لکھنؤ) بچوں کے ماہنامے ہیں۔ ماہنامہ "نور" چار ہزار سے شائع ہوتا ہے۔ اس کے ایڈیٹر جناب محمد عبدالحیٔ ہیں۔ "حرم" (لکھنؤ) اور "رضوان" (لکھنؤ) عورتوں کے رسائل ہیں۔ جاسوسی اور رومانی نوعیت کے رسائل "نکہت" "رومانی دنیا" "تاریخی داستان" اور "طلسمی دنیا" ہیں۔ یہ سبھی رسالے الہ آباد سے جناب سید عباس حسینی کی ادارت میں شائع ہوتے ہیں۔ ماہنامہ "شاہکار" شاید اردو کا پہلا ادبی ڈائجسٹ ہے۔ پہلے یہ الہ آباد سے نکلتا تھا اب وارانسی سے شائع ہوتا ہے۔ اتر پردیش سے شائع ہونے والے اخبارات و رسائل کی مجموعی تعداد ۱۹۸ ہے۔ اس اعتبار سے اتر پردیش ہندوستان بھر میں چوتھے نمبر پر آتا ہے۔

علمی ادبی سرگرمیاں :۔ اتر پردیش کے متعدد شاعروں اور ادیبوں کا ذکر اس مضمون کے شروع میں آ چکا ہے، دیگر ادباء و شعراء کے نام کسی تخصیص، تقدیم یا تاخیر کے بغیر حسب ذیل ہیں۔

آنند نراین ملا، مسعود حسن رضوی ادیب، نورالحسن ہاشمی، سالک لکھنوی، صباح الدین عمر، خورشید احمد، حیات اللہ انصاری، عشرت علی صدیقی، بیگم سلطانہ حیات، منظر لکھنوی، منظر سلیم، حسن شبیر، احمد جمال پاشا، وجاہت سندیلوی، عبدالاحد خاں خلیل، امین سلونوی، حیات لکھنوی، حیات وارثی، عابد سہیل، نیر مسعود، شجاعت علی سندیلوی، شبیہ الحسن نونہروی، رام لال، شاہنواز قریشی، انیس اشفاق، وقار ناصری، احمد ابراہیم علوی، مرزا کاظم، سلیمان عباسی، رضا عباس جعفری، ملک زادہ منظور احمد، عبدالقوی، شمس علوی، نور بجنوری، پیام مجھوری، فراق گورکھپوری، اعجاز حسین،

(بقیہ صفحہ ۹۱ پر)


بھارت ایک مُرقّع ہے
مذہبوں کا،
تہذیبوں کا،
زبانوں اور پہناووں کا،
رسموں اور رواجوں کا،
روایتوں اور جدّتوں کا،
آدرشوں اور اُمنگوں کا،
کاوشوں اور کامیابیوں کا۔
بے مثال رنگا رنگی
لازوال یک جہتی
بھارت ایک گُلدستہ ہے
جس میں آراستہ
بھانت بھانت کے پھول
آنکھوں کو بھاتے ہیں،
دلوں کو لبھاتے ہیں،
دماغوں کو معطّر بناتے ہیں۔
davp 73/125



قاضی عبدالودود



اختر اورینوی



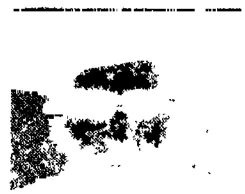
جمیل مظہری



کلیم الدین احمد



انور عظیم



وفا ملک پوری



حسن نعیم



زکی انور



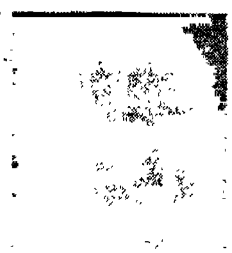
ظہیر صدیقی



غیاث احمد گدی



مظہر امام



سلطان اختر



شفیع مشہدی



بہار میں اردو

سہیل عظیم آبادی

بہار میں اُردو زبان و ادب کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کسی دوسری جگہ میں۔ ہر چند کہ اس کی کوئی تاریخی شہادت نہیں ملتی لیکن حضرت مخدوم الملک شرف الدین احمد یحییٰ منیری سے ایک نسخہ منسوب ہے جو انھوں نے کسی کو دانتوں کی تکلیف کے لئے بتایا تھا۔ اسے ہم بہار میں اُردو کی ابتدائی شکل کہہ سکتے ہیں۔ حضرت مخدوم الملک حضرت امیر خسرو کے ہم عصر بڑے عالم دین تھے۔ فردوسی سلسلہ کو انھوں نے بہت وسعت دی۔ منجن کا وہ نسخہ یہ ہے۔

نون مرچ مجیٹھ لے آوے   نیلا تھوتھا آگ جلاوے
لودھ پھٹکری کتھ پیا پریا   پیس پاس کے منجن کریا
منجن کر کے پان چبایا   دانت کے پیڑا کبھی نہ آیا

مرزا عبد القادر بیدل سے بھی اُردو کا ایک شعر منسوب ہے جس کا ایک مصرع ہے ؎

پٹنہ نگری چھوڑ کر بیدل چلے بدیس

بیدل فارسی کے شاعر تھے اور ان کا زمانہ بہت پہلے کا ہے۔ اسے بھی چھوڑ دیجئے۔ میر کے عہد میں شیخ غلام علی راسخ جیسا قادر الکلام شاعر عظیم آباد میں موجود تھا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ بہار میں اردو کا پہلا شاعر کون تھا۔ لیکن شیخ غلام علی راسخ صاحب دیوان اور قادر الکلام شاعر تھے۔ انہیں میر سے عقیدت تھی۔ ایک روایت ہے کہ وہ جوش عقیدت میں میر سے ملنے کے لئے گئے لیکن میر صاحب نے اپنی روایتی نازک مزاجی کے مطابق ملنے سے انکار کر دیا۔ راسخ نے پرچے پر ایک شعر لکھا اور ملازم کے حوالے کر دیا۔ شعر پڑھتے ہی میر ان سے ملنے کے لئے باہر آگئے۔ وہ شعر یہ ہے۔

خاک ہوں پر تو تیا ہوں چشم مہر و ماہ کا
آنکھ والے رتبہ جانیں مجھ غبارِ راہ کا

راسخ نے اپنے اشعار میں میر کی ذات سے اپنی عقیدت کا اظہار بھی کیا ہے لیکن یہ شعر بھی انہیں کا ہے۔

نظیری اور شفائی کا ہے بدل راسخ
یہ اس کا فخر نہیں کہ نظیرِ میر ہوا

پٹنہ سے چار میل پچھم قصبہ پھلواری شریف صوفیوں کا مسکن اور شعر و ادب کا مرکز رہا ہے۔ یہاں بہت سے شعرا پیدا ہوئے۔ سجاد اور فرد کا نام بھلایا نہیں جا سکتا۔ شہر عظیم آباد میں فدوی اور جوشش، منیر شریف میں غالب کے شاگرد صوفی منیری سے لے کر شاد عظیم آبادی تک شاعروں کا ایک کارواں نظر آتا ہے۔ ایسا کارواں جو بڑھتا ہی گیا۔ مرزا یاس جنگیزی جو لکھنؤ میں یگانہ بنکر رہے اور علامہ جمیل مظہری دونوں بہاری تھے۔

جہاں تک اُردو نثر کا تعلق ہے بہار میں صوفیائے کرام نے اپنے معتقدین کو پند و نصیحت کے لئے اسے استعمال کیا۔ صوفی منیری کی "راحت روح" اس کی بڑی مثال ہے۔ شاد عظیم آبادی نے اپنا ناول صورت الخیال لکھا اور "نوائے وطن" کے نام سے بہار کی تاریخ۔ نواب امداد امام اثر نے اپنے دیوان کے علاوہ نثر میں کئی اور کتابیں لکھیں جن میں کاشف الحقائق کو بڑی شہرت ملی۔ علی سجاد عظیم آبادی نے "محل خانہ" جیسا اور سیدۃ النساء صاحبہ نے "اصلاح النساء" جیسا ناول لکھا۔ ان کے بعد مولانا سلیمان ندوی، نواب نصیر حسین خیال اور آج قاضی عبد الودود جیسے محقق کلیم الدین احمد جیسے نقاد، اختر اورینوی جیسے افسانہ نگار[1] موجود ہیں۔

اُردو بولنے والوں کی تعداد

یہ تعداد ۱۹۵۱ء میں ۴۶۳۷۴۶۲۶ - ۱۹۶۱ء میں ۵۴۹۲۴۱۴۱ اور ۱۹۷۱ء میں ۴۸۲۹۹۴ تھی۔ ایک بات خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ۱۹۵۱ء میں زبان کے خانے میں اُردو کا نام موجود ہے لیکن ۱۹۶۱ء اور ۱۹۷۱ء میں اُردو کا لفظ ہٹا کر ہندوستانی کا لفظ رکھا گیا ہے۔ ایسے لوگ جن کی مادری زبان اُردو تو نہیں لیکن جو اپنے گھر سے باہر اُردو بولتے اور اپنا سارا حساب کتاب اُردو میں لکھتے ہیں، کم و بیش پندرہ لاکھ ہیں۔ یہ بیشتر پنجابی ہیں جو ملک کی تقسیم سے پہلے اپنے کاروبار کے سلسلے میں یہاں رہتے تھے اور تقسیم کے بعد بے وطن ہو کر یہاں آباد ہو گئے ہیں۔

اُردو شہروں اور قصبوں کے علاوہ دیہاتوں میں بھی لاکھوں گھروں میں بولی جاتی ہے۔ بھوجپوری، مگہی، میتھلی اور دوسری بولیوں کے علاقوں میں بھی ایسے گھرانے موجود ہیں جن کی مادری زبان اُردو ہے۔ غرض یہ زبان سارے بہار میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس طرح اُردو بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد کروڑ تک پہنچ جاتی ہے۔

تعلیمی سہولتیں

بہار میں اُردو پڑھنے والے طلبا کے لئے ہر سطح پر تعلیمی سہولتیں ہیں۔ مثلاً میونسپل بورڈوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے تحت اُردو کے پرائمری اور مڈل اسکول قائم ہیں۔ اگرچہ ان کی تعداد اتنی نہیں جتنی کہ ہونی چاہئے۔ ثانوی اسکولوں میں لڑکوں کو ہر مضمون اُردو میں پڑھنے کی اجازت ہے۔ یہی حال کالجوں کا ہے۔ طالب علموں کو ہر مضمون اُردو میں پڑھنے اور بی۔ اے تک اُردو میں سوالوں کے جواب دینے کا حق حاصل ہے۔ البتہ چند مشکلیں بھی ہیں۔ مثلاً ہائی اسکولوں تک تو ٹکسٹ بک کمیٹی

---

[1] مصنف نے ازراہِ انکسار اپنا نام نہیں گنوایا۔ لیکن بحیثیت افسانہ نگار، اُردو ادب میں ان کا مقام محفوظ ہے۔

کسی طرح اُردو کتابیں فراہم کرتی ہے لیکن کالج میں آتے ہی لڑکوں کو پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کسی مضمون کی کتابیں اُردو میں نہیں ملتیں۔ لڑکے انگریزی یا ہندی کی مدد سے پڑھتے ہیں۔ لیکن امتحان میں جواب اُردو رسم الخط میں لکھتے ہیں۔

بہار میں اس وقت چھ یونیورسٹیاں ہیں۔ پٹنہ یونیورسٹی، بہار یونیورسٹی، مگدھ یونیورسٹی، بھاگلپور یونیورسٹی، رانچی یونیورسٹی اور متھلا یونیورسٹی، متھلا نئی ہے، بھاگلپور اور بہار یونیورسٹی کے علاقوں سے حصے الگ کر کے بنائی گئی ہے۔ ان ساری یونیورسٹیوں میں اُردو امتحان کا انتظام ہے۔ پٹنہ، بہار اور مگدھ میں ایم اے تک اُردو پڑھائی جاتی ہے۔ باقی تین یونیورسٹیوں میں تعلیم کا انتظام تو نہیں لیکن امتحان دینے کی اجازت ہے اور اس کا یقین ہے کہ جلد ہی ساری یونیورسٹیوں میں اُردو تعلیم کا انتظام ہو جائے گا۔ ان یونیورسٹیوں میں طلبا کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔

ان کے علاوہ بہار میں دینی مدرسوں کی بہت بڑی تعداد ہے جن کا ذریعہ تعلیم عام طور پر اُردو ہی ہے۔ دینی مدرسوں کے علاوہ مکاتب کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔ ان میں ایسے مکتب بھی شامل ہیں جن کو کوئی سرکاری امداد نہیں ملتی۔ بلکہ گاؤں والے خود اُن کی کفالت کرتے ہیں۔

اُردو اخبارات و رسائل

بہار میں اُردو صحافت کی روایت ایک صدی سے زیادہ اپنی پرانی ہے۔ بہار سے پہلا نور الانوار آرہ سے جولائی ۱۸۵۳ء میں جاری ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اُردو صحافت کی تاریخوں میں دس روزہ پٹنہ ہرکارہ (اپریل ۱۸۵۵ء) اخبار بہار (ستمبر ۱۸۵۶ء) ویکلی رپورٹ گیا (ستمبر ۱۸۵۶ء) "چشمۂ علم" (پٹنہ۔ ۱۸۷۰ء)، ماہانہ انجمن مذاکرہ علمیہ (۱۸۷۴ء) اور بعض دوسرے اخبارات و رسائل کا پتہ چلتا ہے۔

اس وقت بہار سے سات روزنامے شائع ہوتے ہیں روزنامہ صدائے عام بہار کا سب سے پرانا اخبار ہے۔ یہ ۱۹۴۲ء میں پٹنہ سے جاری ہوا تھا۔ باقی سبھی روزنامے آزادی کے بعد شائع ہونا شروع ہوئے ہیں۔

روزنامہ صدائے عام کے ایڈیٹر سید رضی حیدر ہیں۔ اس کی اشاعت ۹ ہزار ہے۔ روزنامہ "سنگم" پٹنہ کے ایڈیٹر جناب غلام سرور ہیں اخبار اپنی تعداد اشاعت گیارہ ہزار سے زیادہ بتاتا ہے۔ ایک اور اہم اخبار "ساتھی" ہے۔ ۱۹۴۹ء میں پٹنہ ہی سے شائع ہونے والے اس اخبار کے ایڈیٹر جناب خالد رشید ہیں۔ یہ نو ہزار شائع ہوتا ہے۔

۱۹۷۰ء کے بعد شائع ہونے والے روزنامے "صداقت"، "پیغام نہشر"، "راہ رو" اور "طاؤس" ہیں۔

بہار سے شائع ہونے والے ہفتہ وار اخبارات کی تعداد بیس کے لگ بھگ ہے۔ "روشنی" (پٹنہ) بہار کا سب سے پرانا ہفتہ وار اخبار ہے۔ یہ ۱۹۵۷ء میں جاری ہوا تھا۔ اس کے موجودہ ایڈیٹر ایس۔ ایم رحیم شمیم صاحب ہیں۔ دوسرے اہم ہفتہ وار اخبار "آدرش" (گیا)، "آغاز" (پٹنہ)، "ہمارا نعرہ" (پٹنہ)، "امروز ہند" (پٹنہ)، "مشعل" (پٹنہ)، "مورچہ" (گیا) ہیں۔

بہار سے متعدد ماہانہ رسائل بھی شائع ہوتے ہیں۔ ان میں "صبح نو"، "سہیل" اور "آہنگ" قابل ذکر ہیں۔ "صبح نو" پٹنہ سے شائع ہوتا ہے۔ اس کے مدیر و مالک وفا ملکپوری ہیں۔ "سہیل" گیا سے شائع ہوتا ہے۔ اس کے ایڈیٹر محمد ادریس صاحب ہیں۔ "آہنگ" بھی گیا سے شائع ہوتا ہے۔ اس کے ایڈیٹر کلام حیدری ہیں۔ پٹنہ سے شائع ہونے والا رسالہ "مسرت" پوری ریاست میں بچوں کا واحد رسالہ ہے۔ ریاست میں عورتوں کا واحد ماہنامہ "پاکیزہ" ہے یہ پٹنہ سے نکلتا ہے۔ اس کے مدیر رضوان احمد بارہ بنکوی ہیں۔ مذکورہ نیز دیگر سبھی ماہانہ رسالے ۱۹۶۰ء کے بعد سے شائع ہونا شروع ہوئے ہیں[1]

علمی ادبی سرگرمیاں

قاضی عبدالودود، کلیم الدین احمد، اختر اورینوی جیسے برگزیدہ ادیبوں کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ ادھر نئے لکھنے والوں میں ڈاکٹر وہاب اشرفی، ڈاکٹر لطف الرحمٰن، ڈاکٹر شمیم احمد، ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی، انور عظیم، غیاث احمد گدی، کلام حیدری، یوسف اختر، سلطان اختر، منظر امام، ظہیر صدیقی، حسن نعیم، پرکاش فکری، وہاب دانش، شکیب ایاز، سید شمیم احمد، الیاس احمد گدی، شمس فریدی، احمد یوسف، شاہدہ یوسف، سید ادیب، ممتاز احمد، ناوک حمزہ پوری، ظہیر نیازی، اسلم آزاد، رضوان احمد، شمیم پھلواروی، علیم اللہ حالی، شوکت حیات، منظفر پوری، شفیع مشہدی، تاج انور، شموئل احمد، سلمیٰ بانو وغیرہ کی تخلیقات ملک کے ممتاز رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

قاضی عبدالودود صاحب کی نگرانی میں ادارہ "تحقیقات اردو" نے قابل قدر کتابیں شائع کی ہیں کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں کلچرل اکادمی (گیا)، بھی قابل ذکر ہے۔ مذکورہ اکادمی نے متعدد کتابیں شائع کی ہیں۔ سید احمد شمیم اور شمس فریدی نے نئی نظموں کا ایک اچھا انتخاب "گلوب" بڑے اہتمام سے شائع کیا۔ نئے شعرا اور ادیبوں نے اپنی کتابیں

[1] رجسٹرار آف نیوز پیپرز فار انڈیا کی حالیہ (۱۹۷۱ء) رپورٹ میں اس کی تعداد اشاعت چار ہزار تسلیم کی گئی ہے (ادارہ)

مختلف اشاعتی اداروں سے شائع کرائی ہیں تاہم مجموعی طور پر اس رفتار کو حوصلہ افزا نہیں کہا جا سکتا۔ ۱۹۷۲ء میں بہار کے ادیبوں کی شائع ہوئی کتابیں حسب ذیل ہیں۔

(۱) اشعار (مجموعہ کلام)	حسن نعیم
(۲) انتخاب کلام جمیل	پروفیسر حسن مثنیٰ
(۳) انشائیہ اور انشائیے	ڈاکٹر سید محمد حسنین
(۴) برزخ کا مشاعرہ	ڈاکٹر سید محمد حسنین
(۵) بے جڑ کے پودے (ناولٹ)	سہیل عظیم آبادی
(۶) تثلیث فن (انتخاب افسانہ، نظم اور غزل)	نعمان ہاشمی، مختار احمد عاصی اور ظہیر غازی پوری
(۷) دھوپ اور چھاؤں (شعری مجموعہ)	جگیشور پرشاد خلش
(۸) گلشن ہند (لطف) (تذکرہ)	عطاالرحمٰن عطا کاکوی
(۹) سخن شعرا (نساخ) (تذکرہ)	عطاالرحمٰن عطا کاکوی
(۱۰) سخنوران سارن	مرتبین پروفیسر ایم، اے، حمید جابر فیروزی
(۱۱) سیر اردو (انتخاب نظم و نثر)	ڈاکٹر وہاب اشرفی
(۱۳) نوائے راز (شعری انتخاب)	مہجور شمسی
(۱۴) مجموعۂ نغز قاسم (تذکرہ)	عطا کاکوی

ڈاکٹر محمد حسنین





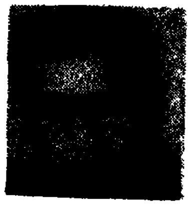
شوکت حیات





اسلم آزاد

ظفر حمیدی



رضا نقوی واہی



علیم اللہ حالی

بہار میں چھوٹی چھوٹی ادبی انجمنیں اچھی خاصی تعداد میں ہیں۔ تقریباً ہر شہر میں ایک یا دو انجمنیں قائم ہیں لیکن ان کی سرگرمیاں شعر و شاعری، اور اردو مشاعروں سے زیادہ کچھ نہیں ہیں۔ کچھ انجمنیں طلبا کے لئے انعامی مقابلے کرلیا کرتی ہیں ۔ان انجمنوں کو کوئی سرکاری یا نیم سرکاری امداد نہیں ملتی البتہ اگر کسی انجمن کے جلسے میں کوئی وزیر شریک ہو جاتا ہے تو اپنے فنڈ سے چھوٹی موٹی رقم ان کو دے دیتا ہے۔

کالجوں کی انجمنوں سے ذرا بڑی انجمنیں بھی کام کر رہی ہیں۔ مثلاً انجمن ترقی اردو" دائرہ ادب"، "حلقہ ادب"، "اردو مجلس" لیکن کسی انجمن کے پاس کوئی تعمیری پروگرام نہیں ہے۔ "دائرۂ ادب" اور "حلقۂ ادب" نے اپنے اپنے رسالے جاری کئے ہیں۔ لیکن حلقہ ادب کا رسالہ "مریخ" بند ہو چکا ہے۔ اور دائرہ ادب کا رسالہ "معاصر" پابندی سے شائع نہیں ہوتا۔

لائبریریوں کے ضمن میں پٹنہ کی خدا بخش اورینٹل لائبریری خاص طور پر قابل ذکر ہے یہ دنیا کے چند بڑے اور مشہور کتب خانوں میں شمار کی جاتی ہے۔ لیکن اس کی اہمیت اپنے قیمتی مخطوطات کی وجہ سے ہے۔ اس وقت اس میں مخطوطات کی تعداد ۹۲۳۹ ہے۔ ان میں عربی کے ۲۲۲۸، فارسی کے ۴۲۷۲، اردو کے ۶۷۲، ترکی کے ۲۰۔ اور ہندی کے ۳۷، مخطوطات ہیں۔ ۲۰۰ مخطوطات تاڑ کے پتوں پر لکھے ہوئے ہیں۔ اس کتب خانے میں مطبوعہ کتابوں کی تعداد اس لحاظ سے زیادہ نہیں یعنی کل ۵۳۵۹ کتابیں ہیں۔ یہاں عربی، فارسی، اردو کے علاوہ انگریزی، فرانسیسی، جرمنی، اسپینی، لاطینی، اطالوی، ترکی، روسی، سنسکرت اور ہندی کتابیں بھی ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی کوششوں سے ولینہ کی اردو لائبریری کی کتابیں بھی اس لائبریری میں آگئی ہیں، جس سے قدیم اردو رسالوں کا بہت بڑا ذخیرہ شامل ہو گیا ہے۔

اس لائبریری کے بعد گورنمنٹ اردو لائبریری کا نام آتا ہے۔ اس میں کل مطبوعہ کتابیں ہیں کتابوں کی مجموعی تعداد ۱۳۲۱۸ ہے۔ یہ لائبریری ڈاکٹر سید محمود کی وزارت کے دوران میں ۱۹۳۹ء میں قائم کی گئی تھی لیکن اس کے بعد حکومت نے اس کو ترقی دینے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ ان کے علاوہ ہر کالج میں چھوٹی بڑی لائبریری ضرور ہے، علاوہ ازیں پبلک کی قائم کی ہوئی لائبریاں بھی ہیں جن سے مقامی لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۴۹ پر)



راجندر سنگھ بیدی — اختر الایمان — ظہیر الدین مدنی — کرشن چندر

عصمت چغتائی — علی سردار جعفری — ساحر لدھیانوی — سکندر علی وجد — خواجہ احمد عباس

بدیع الزماں خاور — عبدالعلیم نامی — جوگندر پال — قاضی سلیم — صفدر آہ





بشر نواز

مہاراشٹر میں اردو

عبدالحمید بوبیرے

اردو کے سلسلے میں اس اختلاف کا اب بھی تصفیہ نہیں ہو پایا کہ اُردو کا جنم کس سرزمین پر ہوا۔ لیکن مہاراشٹر کا یہ دعویٰ غلط نہ ہوگا کہ اردو کا دوسرا وطن مہاراشٹر ہے۔ ولی اور سراج دکنی، میاں دادا خاں سیاح اور لچھمی نرائن شفیق، حضرت شاہ شریف اور شاہ تراب چشتی نے اس سرزمین پر اردو کو ایک نقش جاوداں بنا دیا۔

اگر دلی لکھنؤ یا پنجاب کو اردو کی سرپرستی پر ناز ہے تو مہاراشٹر کو بھی یہ فخر حاصل ہے۔ مہاراشٹر میں اُردو کی صحیح معنوں میں ترقی، اس کی اشاعت اور مقبولِ عام بنانے کا سہرا خصوصاً دکن کوکن اور مہاراشٹر کے دیگر اضلاع میں بسنے والے مقامی باشندوں کے سر ہے۔ خوجہ، میمن، بوہرہ اور کوکنی قوم کے بزرگوں نے اس ضمن میں ہمیشہ دلچسپی لی اور انہیں کی کوششوں سے اُردو کے کاز کو تقویت پہنچی۔ دکن اور کوکن کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے۔

ان بزرگوں میں صحافی، شعراء و ادبا بھی ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ چونکہ یہ تاجر طبقے سے تعلق رکھتے تھے اس لئے بیشتر اصحاب رئیس شہر تھے۔ انہوں نے اُردو مدرسوں، اردو اسکولوں، کالجوں اور دیگر اردو اداروں کی امداد میں دلچسپی لی۔

کوکنی[2] قوم کے ایک بزرگ علامہ شیخ احمد جینیکر اُردو و عربی میں کلام کہتے تھے۔ ان کے مضامین اور کلام مدد کے عربی اخبارات میں شائع ہوتے تھے۔ منشی محمد ابراہیم مقبہ کوکنی قوم کے ایک معزز رکن تھے۔ حکومت نے انہیں میر منشی مقرر کیا تھا۔ آپ کے "تعلیم نامے" کے کئی اڈیشن شائع ہوئے جسے یوپی اور پنجاب کے تعلیمی نصاب میں شامل کیا گیا تھا۔ ان کے صاحبزادے محمد احسن مقبہ اردو، فارسی، اور عربی زبان میں فاضل اور شاعر بھی تھے۔ احسن تخلص تھا۔ دیوان احسن اور غزلیات احسن کے نام سے ان کے دو دیوان شائع ہوئے ہیں۔ ایک دوسرے بزرگ قاضی غلام قاسم مہری تھے۔ قاسم تخلص تھا۔ اردو اور فارسی میں کلام کہتے تھے۔ عروس المجالس کے نام سے رسول اللہ کی سیرت پر ایک مثنوی لکھی ہے۔ اسی خاندان کے ایک اور شاعر اور مصنف قاضی غلام علی مہری بھی تھے۔ کوکنی قوم کی ایک مخیر ہستی ناخدا محمد علی روگھے[3] نے جامع مسجد بمبئی میں ایک مدرسہ، مدرسۂ محمدیہ کے نام سے جاری کیا۔ موصوف متعدد جہازوں کے مالک تھے۔ اس لئے لقب ناخدا پڑ گیا۔ مدرسۂ محمدیہ آج محمدیہ ہائی اسکول کے نام سے جاری ہے۔ ۱۸۴۷ء میں "محمدی" کے نام سے ایک اخبار بھی جاری کیا تھا[4]۔ مولوی محمد یونس ہینداد ے صاحبِ دیوان تھے۔ جلیل تخلص تھا۔ خمخانۂ ازل کے نام سے ان کا دیوان مشہور ہے۔ مولوی محمد یوسف کھتکھٹے اُردو کے علاوہ عربی و فارسی زبانوں کے ماہر تھے۔ یوسف تخلص تھا۔ مولوی صاحب کا نادر مخطوطات و مطبوعات پر مشتمل ایک کتب خانہ تھا جو آج کھتکھٹے کلیکشن (KHATAY COLLECTIO KHA) کے نام سے بمبئی یونیورسٹی میں محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ تنگیکر، قور، جینیکر، مہامکر (خطیب) خاندانوں نے قابلِ قدر ورثہ قومی ملی و مذہبی صورت میں، اُردو زبان میں یادگار کے طور پر چھوڑا ہے۔ اس قوم میں دیگر شعراء ادباء میں فاروق، شوق، معنی، سیفی، ناظر، محمود، یوسف، سالک، بدر، فرحت، اور احمد قابلِ ذکر ہیں۔

اُردو کا ایک اور سرپرست خاندان جو سلیمانی بوہرہ سے تعلق رکھتا ہے، طیب جی خاندان ہے۔ بمبئی میں تعلیمی سرگرمیوں میں اس خاندان نے ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ طیب جی بھائی میاں نے اپنی سوانح اُردو زبان میں لکھی ہے، جسے ان کے نواسے آصف فیضی نے ترتیب و تدوین کے بعد شائع کیا ہے۔ اس خاندان کے ایک اور چشم و چراغ بدرالدین طیب جی تھے۔ علی گڑھ کالج کے امدادی کاموں میں پیش پیش رہے۔ بمبئی میں انجمن اسلام کے قیام میں دلچسپی لیتے تھے اور انڈین نیشنل کانگریس کے صدر ہوئے۔ اسی خاندان میں امیر النساء بیگم، سرہائی، انیس نازلی بیگم، زہرہ بیگم فیضی، عطیہ بیگم فیضی جیسی روشن خیال خواتین نے اُردو کی سرپرستی کی۔

اُردو کے خدمت گذاروں میں وہ بھی ہیں جو نہ عالم تھے، نہ شاعر نہ ادیب، لیکن جنہوں نے زبان و تہذیب کی روایات کو برقرار رکھنے کے لئے اُردو کے اداروں کو ایک نئی زندگی دی۔

سیٹھ جان محمد قاسم خوجہ قوم کے ایک مخیر بزرگ تھے۔ بیشتر اُردو کے اداروں کی امداد کیا کرتے۔ جان محمد قاسم کمرشل ہائی اسکول انہیں کے نام سے موسوم ہے جو انجمن اسلام کے تحت آج بھی جاری ہے۔ بیگ محمد اسمٰعیل میمن قوم کے ایک اور بزرگ تھے۔ بیشتر اداروں کو ان کی سرپرستی حاصل رہی۔ موصوف کے نام سے موسوم بیگ محمد اُردو ہائی اسکول آج بھی جاری ہے۔ حاجی محمد صابو صدیق میمن قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے نام سے کئی ٹرسٹ جاری ہیں۔ تعلیمی و سماجی میدان میں یہ ٹرسٹ خدمت انجام دے رہے ہیں۔ صابو صدیق ہائی اسکول اور پالی ٹیکنک اُردو طلباء کے لئے اس بزرگ ہستی کا قابلِ قدر تحفہ ہے جو انجمن اسلام کے تحت جاری ہے۔

تاریخ پر ایک نظر ڈالنے کے بعد ناانصافی ہوگی اگر ہم اپنے ساتھی

---

[1] خطبۂ صدارت و انتخاب شاعرہ عبدالحمید بوبیرے

[2] مختصر تذکرۂ قوم کوکنی۔ عبدالحمید بوبیرے [3] اختر شہنشاہی

قافلہ والوں کو بھول جائیں جنہوں نے اسی سرزمین پر اُردو کے لئے ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔ مولوی عبدالحق۔ پنڈت سدرشن، سرشار سیلانی، علامہ آرزو لکھنؤی، بہزاد لکھنؤی، رئیس احمد جعفری، حافظ علی بہادر خاں، قطب الدین صدیقی، بدر جلالی، نذیر احمد خجندی، مولانا شوکت علی، محمد علی جوہر، جوش ملیح آبادی، ساغر نظامی، شکیل بدایونی، علامہ احمد الشبیلی، علامہ شرف زیدی، میرزا ادیب، سعادت حسن منٹو، ضیاء الدین احمد برنی، سید عبداللہ بریلوی، پروفیسر نجیب اشرف ندوی، پرنسپل فضل الرحمن، دیوان شرر، عبدالغنی چودھری، آغا حشر شیرازی، عبدالرحیم ڈسٹمکر، قاضی کبیر الدین، عمر سعد بانی، حاجی محمد چھوٹانی، سردار انور، ڈاکٹر شیخ عبدالحق، علامہ محوی صدیقی لکھنؤی، آغا خلش کاشمیری، عبدالحمید انصاری، ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی، عبداللہ ناصر، نکہت شاہجہاں پوری، مدن موہن کالیہ، قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے کچھ ساتھی راہیٔ ملک عدم ہوئے۔ کچھ پاکستان چلے گئے، کچھ دوسری ریاستوں یا غیر ملک کو چلے گئے۔

بمبئی کے علاوہ اُردو کے دوسرے مرکز دھولیہ، اورنگ آباد، مالیگاؤں، جلگاؤں، ناندیڑ، بھیمڑی، پونہ اور جالنا ہیں۔ اُردو کے خدمت گزاروں میں یہاں کی ملی جلی آبادی میں کوئی حیدرآباد یا، رامپور کا ہے۔ یا مقامی باشندہ ہے یا لکھنؤ یا بھوپال سے آیا ہوا ہے یا اعظم گڑھ سے تعلق رکھتا ہے یا سری نگر، الہ آباد، لدھیانہ، امرت سر، جالندھر کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مہاراشٹر اور خصوصاً بمبئی تمام صوبوں اور شہروں میں اس لحاظ سے بھی ایک امتیازی حیثیت کا مالک ہے۔

اُردو بولنے والوں کی تعداد

مردم شماری کی رپورٹ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مہاراشٹر میں اُردو بولنے والوں کی تعداد ہر بیس سال پر تقریباً دوگنی ہو جاتی ہے۔ جو اُردو کے حق میں فالِ نیک ہے۔ ذیل میں دیئے گئے اعداد و شمار چونکا دینے والے ہیں۔

سال	اُردو بحیثیت مادری زبان	وہ جن کی مادری زبان اُردو نہیں لیکن بولتے، لکھتے پڑھتے ہیں۔
۱۹۵۱ء	۲۰،۸۰،۷۴۲	تعداد[1] حاصل نہ ہو سکی
۱۹۶۱ء	۲۷،۲۵،۶۸۹	۸۹،۷۶۳
۱۹۷۱ء	۳۶،۶۱،۸۹۸	تعداد[2] حاصل نہ ہو سکی

مہاراشٹر میں مراٹھی کے بعد ملک کی اس سب سے بڑی سیکولر زبان کے جاننے والے زیادہ تر مسلم، پنجابی سکھ اور ہندو اور کایستھ حضرات ہیں۔ اس طرح مہاراشٹر میں اُردو بولنے، لکھنے پڑھنے اور سمجھنے والوں کی تعداد مذکورہ اعداد و شمار سے کہیں زیادہ یقینی ہے۔

تعلیمی سہولتیں

ریاست میں محکمۂ تعلیم حکومت مہاراشٹر کی جانب سے اور بمبئی عظمیٰ کے لئے میونسپل کارپوریشن کے محکمۂ تعلیم کے تحت اُردو اسکولوں (پرائمری اور سیکنڈری) اور اُردو ٹیچرز ٹریننگ کالجوں کی ایک بڑی تعداد اس بات کا ثبوت ہے کہ اُردو ذریعۂ تعلیم کے لئے یہاں کافی سہولتیں حاصل ہیں۔

۱۹۴۷ء میں صرف ایک لاکھ بچّے اُردو تعلیم حاصل کرتے تھے۔

۱۹۶۰ء میں یہ تعداد دو لاکھ ۳۰ ہزار ہوئی۔ ۱۹۷۰ء میں تین لاکھ ۲۱ ہزار طلباء پرائمری اسکول میں زیر تعلیم تھے۔ اور امسال پرائمری اسکول کے ان طلباء کی تعداد تقریباً چار لاکھ ہو جائے گی۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہاں ابتدائی اور ثانوی مدارس کے طلباء کے لئے معقول سہولتیں فراہم ہیں یہاں کے تعلیمی خاکے میں ابتدائی (پرائمری) اور ثانوی (سیکنڈری)، اسکول شامل ہیں۔ مڈل اسکول اب نہیں رہے۔ جماعت اوّل تا ہفتم کا درجہ ابتدائی ہے اور جماعت ہشتم تا یازدہم ثانوی درجات ہیں۔ حال ہی میں حکومت مہاراشٹر نے S.S.C. (میٹرک)، دسویں جماعت کو قرار دیا ہے۔ اس طرح ایک تعلیمی سال (ACADEMIC YEAR) کم ہو گیا

ریاستی سرکار کا محکمۂ تعلیم

ریاستی حکومت کے محکمۂ تعلیم کے تحت اُردو ذریعۂ تعلیم کے کئی ثانوی و ابتدائی مدارس جاری ہیں تفصیل حسب ذیل ہے۔

سال	تعداد اُردو اسکول (ابتدائی)	(ثانوی)	تعداد طلباء (ابتدائی)	(ثانوی)	تعداد اساتذہ (ابتدائی)	(ثانوی)
۱۹۶۱ء	۱۴۳۰	۱۰۷	۲،۲۱،۰۰۷	۲۳،۹۲۶	(تعداد دستیاب نہ ہوئی)	
۱۹۷۱ء	۱۸۷۰	۲۵۰	۳،۱۷،۰۷۴	۴۱،۹۰۰	۸۹۰۱	۲۲۶۷

---

[1] ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ میں اس کالم کے تحت چونکہ کوئی انتظام نہ تھا۔ اس لئے تعداد حاصل نہ ہو سکی۔

[2] حالیہ مردم شماری کی چونکہ تفصیلی رپورٹ ابھی تیار نہیں ہوئی۔ اس لئے یہ بھی تعداد نہ مل سکی۔

کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اُردو

مہاراشٹر کی چھ یونیورسٹیوں میں سے پانچ یونیورسٹیوں کے تحت کئی کالجوں میں اُردو پڑھائی جاتی ہے۔ اکثر کالجوں میں اُردو بحیثیت ایک مضمون پڑھائی جاتی ہے۔ بہت کم کالجوں میں اُردو اختیاری مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے۔ طلباء اور اساتذہ کی مکمل تعداد نہ مل سکی۔

بمبئی یونیورسٹی کے دس کالجوں، ناگپور یونیورسٹی کے آٹھ کالجوں، شیواجی یونیورسٹی کے چار کالجوں، مراٹھواڑا یونیورسٹی کے آٹھ کالجوں اور پونہ یونیورسٹی سے ملحق گیارہ کالجوں میں اُردو پڑھائی جاتی ہے۔ ان کالجوں کی مجموعی تعداد ۴۱ ہے۔

اردو اخبارات و رسائل

بمبئی شروع سے صحافت و ادب کا ایک خاص مرکز رہا ہے۔ مختلف کتابوں میں رسالہ "بامداد" (۱۸۵۹ء) ہفتہ وار "لطیف الاخبار" (۱۸۶۴ء) "کشف الاخبار" (۱۸۷۲ء) "اخبار جام جہاں نما" (۱۸۸۱ء) اخبار خادم ہند (۱۸۸۳ء) اور ان کے علاوہ بمبئی سے نکلنے والے دوسرے متعدد اخبار و رسائل کا ذکر ملتا ہے۔ گویا اس علاقے میں صحافت کی تاریخ ایک صدی سے بھی زیادہ پرانی ہے۔ اس روایت نے گزشتہ پچیس برسوں میں خوب فروغ پایا ہے۔

(رجسٹرار آف نیوز پیپرس)

اُردو اخبارات و رسائل

رجسٹرار آف نیوز پیپرس کے جائزہ کے مطابق اُردو اخبارات و رسائل کے ۴ سب سے بڑے مراکز اتر پردیش (۱۹۸)، دہلی (۱۶۷)، پنجاب (۱۳۷) اور آندھرا پردیش (۱۲۹) ہیں۔ جموں و کشمیر اور مہاراشٹر میں یہ تعداد (۹۱) مساوی ہے۔ لیکن اس جائزے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مہاراشٹر میں اُردو صحافت میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔

سال	روزنامے	ہفت روزہ	پندرہ روزہ	ماہنامے	سہ ماہی	ششماہی	سالنامے	مجموعی تعداد	کل تعداد اشاعت
۱۹۵۶ء	۱۰	۱۵		۱۳	-	۵	-	= ۴۳	—
۱۹۶۱ء	۹	۲۱	۳	۱۸	۲	-	-	= ۵۳	—
۱۹۷۱ء	۱۰	۴۷	۱۰	۱۶	۳	۲	۳	= ۹۱	ایک لاکھ چھ ہزار

۱۹۷۱ء کے بعد اُردو پریس میں ایک حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے۔ تقریباً ۴۰ نئے پرچوں کی اجرائی نے اُردو پریس کی طاقت کو اور مضبوط

کیا ہے۔ اس طرح اب مہاراشٹر ۱۹۷۱ء کی رپورٹ کے بعد پنجاب اور آندھرا پردیش کے اُردو پریس کے برابر ہو جائے گا۔

مہاراشٹر کا سب سے کثیر الاشاعت روزنامہ "انقلاب" (بمبئی) ہے۔ یہ ۱۹۳۸ء میں جاری ہوا تھا۔ آفسیٹ پر شائع ہونے والے اس اخبار کی تعدادِ اشاعت ۱۷۴۹۱ ہے۔ اس کے ایڈیٹر جناب خلش جعفری ہیں۔ دوسرا اہم روزنامہ اُردو ٹائمز (بمبئی) ہے۔ یہ ۱۹۶۱ء میں جاری ہوا تھا۔ جناب شہر یار عابدی کی ادارت میں نکلنے والے اس اخبار کی ۶۶۹۰ کی اشاعت ہے۔ دوسرے روزنامے "جمہوریت" "آج" "ہندوستان" اور "زبان خلق" ہیں۔ ہفتہ وار اخبارات میں بلٹز (اُردو) سرفہرست آتا ہے۔ اس کے ایڈیٹر جناب حسن کمال ہیں۔ اس کی اشاعت ۱۸۰۰۴ ہے۔ فلمی رسالوں میں "کہکشاں" قابلِ ذکر ہے۔ یہ ہفتہ وار رسالہ شمیم زبیری صاحب کی ادارت میں نکلتا اور ۵۵۴۹ اشاعت ہے

ادبی رسائل میں ماہنامہ "شاعر" سب سے پرانا ہے۔ یہ ابتدا ۱۹۳۰ء میں آگرے سے شائع ہوا تھا۔ اس کے مدیر جناب اعجاز صدیقی ہیں۔ دوسرا ادبی رسالہ "صبح امید" ہے۔ اسکی اشاعت لگ بھگ چار ہزار ہے اس کے ایڈیٹر عبدالحمید بوبیرے ہیں۔ ملک کے ادبی، علمی، تحقیقی رسائل میں سہ ماہی نوائے ادب (بمبئی)، بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے مدیر جناب عبدالرزاق قریشی ہیں۔

علمی، ادبی سرگرمیاں

سائنس کے اس دور میں اختر شماری آسان ہے لیکن اُردو کے قلم کاروں کی صحیح تعداد معلوم کرنا کارے دارد۔ دہلی، لکھنؤ اور پنجاب کی طرح ہمارے یہاں بھی ایک اچھی خاصی فوج ان قلم کاروں کی ہے۔ ان میں شاعر بھی ہیں، ادیب بھی، نقاد بھی، مصنف بھی، صحافی، مترجمین، دانشور غرض اُردو کی ہر جہت سے خدمت کرنے والے شامل ہیں۔ اُردو کے ان سالاروں اور علمبرداروں میں خواجہ احمد عباس، کرشن چندر، سردار جعفری، ڈاکٹر صفدر آہ، پرتو لکھنوی، کالی داس گپتا رضا، دیوی سنگھ چوہان، میتو مادھو راؤ بگڑی، سکندر علی

وحید اعجاز صدیقی، اختر الایمان، جاں نثار اختر، ساحر لدھیانوی، مجروح سلطان پوری، علی رضا، آغا جانی کشمیری، کیفی اعظمی، حامد الانصاری غازی، ادیب مالی گانوی، شہاب مالیر کوٹلوی، ڈاکٹر نامی، ڈاکٹر ظ انصاری، معین الدین حارث، خواجہ عبدالغفور، جوگندر پال، مہندر ناتھ، ڈاکٹر نظام الدین گوریکر، شبیر احمد راہی، ڈاکٹر عالی جعفری، سی ایل کاوش، خلش جعفری، شہر یار عابدی، ابراہیم فطرت، غلام احمد خاں آرزو، راجندر سنگھ بیدی، خشونت سنگھ، ملک راج آنند، پرنسپل لے اے منشی، شہاب الدین دسنوی، ناحی سلیم آصف نیبنی، سلطانہ آصف فیضی، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، سلمیٰ صدیقی، واجدہ تبسم، ڈاکٹر میمونہ دلوی، ڈاکٹر عبدالستار دلوی، شمس کنول، ندا فاضلی، قیصر عثمانی، عزیز قیسی، یوسف ناظم، ممتاز راشد، عتیق اللہ، بشر نواز، باقر مہدی، سریندر پرکاش، احمد نسیم مینائی، جمیل مرصع پوری، عبداللہ پرکا باعی، بدیع الزماں خاور، یونس اگاسکر، رضا الجبار، رائے ہریش چند ردکھی جالنوی، اشرف فاروقی، تم کوکنی، شرف کمالی، قیصر تناگیروی، لطفی رضوانی، اسمٰعیل پرکار، عارف سیمابی، معین ادبی، سرشار منیری، شباب مینائی، مہر اور ضیاء ہانی شامل ہیں۔

ادبی سرگرمیوں کے ضمن میں یہاں صحیح معنوں میں مشاعروں اور شب غزل جیسے پروگراموں کے لئے فضا سازگار رہتی ہے۔ شاذ ہی سمپوزیم کانفرنس یا سنجیدہ علمی ادبی نشستوں کا اہتمام ہوتا ہے۔ کبھی کبھار انجمن ترقی اردو کی ریاست میں شاخیں جلسے، مشاعرے یا ادبی نشستیں منعقد کرتی رہتی ہیں۔ چند تعلیمی ادارے بھی یہ کام کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ افراد بھی ہیں جو نجی طور پر اردو کی ترقی واشاعت کے لئے مساعی کر رہے ہیں۔

تاہم مہاراشٹر اُردو کتابوں کی نشر و اشاعت میں دیگر صوبوں کے مقابلے میں بہت پیچھے رہا ہے۔ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۷۱ء تک کے دوران صرف ۲۳۲ کتابیں چھپی تھیں۔ ان کتابوں میں زیادہ تر نصابی، مذہبی یا غیر معیاری ہوتی ہیں۔ علمی، ادبی، تنقیدی یا اعلیٰ تخلیقات اچھے پبلشر نہ ہونے کے سبب نہیں چھپتیں۔ اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں لیتھو، آفسیٹ یا اُردو ٹائپ پریسوں اور اچھے خوشنویسوں کی تعداد دہلی و لکھنؤ کی طرح نہیں ہے۔ اُردو کے بڑے پبلشنگ ادارے زیادہ تر دہلی و لکھنؤ میں ہیں۔

ادبی انجمنیں

ادبی انجمنوں کا مہاراشٹر میں ایک جال پھیلا ہوا ہے۔ بیشتر انجمنیں یا ادارے زیادہ تر مذہبی یا تعلیمی خدمات ہی انجام دیتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ ماہانہ ادبی نشستوں کا انعقاد کرتے ہیں۔ اُردو کے سلسلے میں اعلیٰ پیمانے پر بہت ہی کام ہوا ہے۔ انجمن ترقی اُردو، اُردو ادب عالیہ، بزم خیال، بزم شعراء، بزم نسواں، اُردو سرکل، سرسنگار سمسد، ادبی سنگم، یوپیا اسٹوڈنٹ سرکل، اپٹا جیسے ادارے اُردو کی خدمت مختلف نظریہ کے تحت کر رہے ہیں۔ قصر الادب، بزم عزیزی، بزم ناسخ، آئینۂ ادب، بزم آرزو، انجمن ترقی پسند مصنفین بھی علمی ادبی خدمات میں مصروف ہیں۔ ان اداروں کی اپنی کوئی مطبوعات نہیں۔ وقتاً فوقتاً جشن کے موقعوں پر شائع کئے جانے والے سووینزوں کی ادبی حیثیت نہیں ہو سکتی۔

ریاست کی جانب سے بھی اشاعت و ترقی کے لئے کوئی امداد نہیں کی جاتی۔ اسی طرح غیر سرکاری اداروں کا بھی یہی حال ہے۔ حال ہی میں بمبئی کے ایک دو شعراء کے مجموعۂ کلام بینکوں کے دیئے گئے قرض پر شائع ہوئے ہیں۔ اس طریقۂ کار کو مقبولیت حاصل نہیں ہو سکی۔

اہم کتب خانے

مہاراشٹر میں اُردو لائبریریوں کی بڑی تعداد ہے۔ جن میں نادر و نایاب مخطوطات و مطبوعات کا ذخیرہ ہے۔ اسی طرح ذاتی تصرف میں بھی بیشتر نایاب کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے۔ تشنہ گانِ علم و ادب ان کتب خانوں سے مستفیض ہوتے رہتے ہیں۔

ڈائرکٹر آف لائبریریز کے تحت اُن لائبریریوں کو گرانٹ ملتی ہے، جو حکومت کی منظور شدہ ہوتی ہیں۔ اہم کتب خانے حسب ذیل ہیں۔

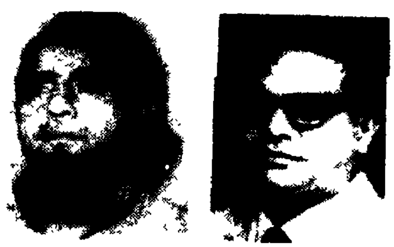
مسلم لائبریری ناگپور، مسلم لائبریری، مومن پورہ، ناگپور۔ انجمن ظل اسلام لائبریری کامٹی، مسلم لائبریری بھنڈارہ، مولانا آزاد لائبریری، ملکاپور ضلع بلڈانہ، مسلم لائبریری ممبارٹ، اُردو لائبریری ایولہ، اُردو لائبریری مالیگاؤں، احرار لائبریری مالیگاؤں، انصار لائبریری مالیگاؤں، قومی لائبریری۔ مالیگاؤں، کریمی لائبریری بمبئی، کتب خانۂ نقشبندیہ بالاپور برار وغیرہ۔

اس کے علاوہ جامع مسجد لائبریری میں تقریباً دو ہزار کتابیں ہیں۔ انجمن اسلام بمبئی کے ریسرچ سینٹر میں اُردو کتب اور رسائل تقریباً ۱۵ ہزار ہیں۔ مہاتما گاندھی لائبریری بمبئی میں اُردو کی تقریباً ۲۰ ہزار کتابیں ہیں۔ سوبائی ریڈنگ روم اور متعلقہ گشتی کتب خانہ

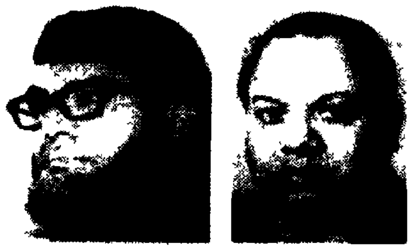
میں ۹ ہزار کتابیں ہیں۔ کھتری میمن میونسپل فری ریڈنگ روم اور لائبریری میں ۸ ہزار اور دو مزید میونسپل لائبریریوں میں ۱۶ ہزار کتابیں ہیں۔

اُردو کے چند خدمت گزار

ڈاکٹر رفیق زکریا: وزیر شہری ترقیات و اوقاف حکومت مہاراشٹر ہیں۔ رفیق اُردو زبان ہیں۔ مہاراشٹر کے اسکولوں کالجوں کے مسائل اور دیگر تعلیمی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں۔ بانی مولانا آزاد کالج اورنگ آباد۔ مراٹھواڑہ کالج آف ایجوکیشن اور مہاراشٹر کالج کے سلسلے میں ان کی خدمات تاریخی بن گئی ہیں۔



دائیں: کمال ورائن گپتا
بائیں: محمد علی مٹھا



دائیں: شام کشن نگم
بائیں: محمد حنیف خاں

شام کشن نگم مرحوم منشی دیانرائن نگم (مدیر زمانہ کانپور) کے خاندان سے ہیں۔ بمبئی میں مشاعروں، جلسوں، کانفرنسوں کے انعقاد میں دلچسپی سے خدمت انجام دیتے ہیں۔

خواجہ عبدالغفور آئی اے ایس ہیں۔ مہاراشٹر میں اُردو کے لئے جو بھی کوشش کی جائے موصوف کا تعاون ضرور حاصل ہوتا ہے "اُردو سرکل" اور سرسنگار سمستا کے چیئرمین ہیں۔ اُردو کی ترویج و اشاعت، علمی ادبی نشستوں، مشاعروں اور قومی یکجہتی کے کاز کو مضبوط بنانے کے لئے ہمہ وقت



سرگرم رہتے ہیں "قہقہہ زار" اور "شگوفہ زار" کے مصنف ہیں۔

شہاب الدین دسنوی: انجمن اسلام کے سیکرٹری ہیں جس کے تحت بیشتر اُردو اسکول جاری ہیں۔ صابو صدیق پالی ٹیکنک اور ہائی اسکول کے پرنسپل ہیں، انجمن ترقی اُردو (بمبئی) اور ترقی اُردو بورڈ کے رکن ہیں۔ تعلیمی سرگرمیوں اور تعلیمی نصاب میں گہری دلچسپی ہے۔



محمد علی مٹھا: انجمن خیر الاسلام کے جنرل سیکرٹری ہیں جس کے تحت کئی کالج اور ہائی اسکول جاری ہیں، اُردو کے اسکولوں، انجمنوں اور تعلیمی کانفرنس کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں۔

محمد حنیف خاں: انجمن خیر الاسلام کے جائنٹ سیکرٹری ہیں۔ کئی اسکولوں اور انجمنوں سے وابستہ ہیں۔

سید محمد زیدی: "یو پیا سرکل" اور "اُردو کمیٹی" کے روح رواں ہیں۔ اُردو کی ترویج و اشاعت کے لئے گرانقدر رقم دی۔ "اُردو کمیٹی" بمبئی کے زیر اہتمام اُردو کنونشن منعقد کیا

ڈاکٹر اسحٰق جمخانہ والا: "انجمن خیر الاسلام" اور کئی تعلیمی اداروں سے وابستہ ہیں۔ اُردو میں سائنس کے موضوع پر پرچہ جاری کیا ہے۔ اُردو طلباء کے لئے درسی کتابوں اور کاپیوں کی فراہمی کے لئے بڑے پیمانے پر مہم سر کر رہے ہیں۔

مصطفٰے فقیہہ: میرج تعلیمی کانفرنس میں اردو اور مرہٹی ذریعۂ تعلیم سے متعلق ایک اہم رول انجام دیا۔ رئیس ہائی اسکول (بھیونڈی)، اور کئی تعلیمی انجمنوں سے منسلک ہیں۔ "اُردو کمیٹی" کے رکن ہیں،



ریاستی سرکار کی امداد

۱۹۷۱ء سے حکومت مہاراشٹر نے اُردو مصنفین کے لئے ایک خوش آئند اقدام کیا ہے۔ ریاستی حکومت کی جانب سے ۱۹۷۱ء اور ۱۹۷۲ء میں دیئے گئے انعامات کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

سال ۱۹۷۱ء

نام کتاب	مصنف	نوعیت	ایوارڈ
۱۔ نجات سے پہلے	قاضی سلیم	شعری مجموعہ	ایک ہزار روپے
۲۔ روشنی کی کرن	رضاء الجبار	افسانے	ایک ہزار روپے

سال ۱۹۷۲ء

۱۔ میر اور میریات	ڈاکٹر صفدر آہ	نثر (تحقیق)	ایک ہزار روپے
۲۔ آؤ کہ اک خواب بنیں	ساحر لدھیانوی	شعری مجموعہ	ایک ہزار روپے
۳۔ زیر غور	یوسف ناظم	نثر (مزاحیہ)	سات سو پچاس روپے

بمبئی میں گذشتہ سال سے سرسنگار سمیتی کے چیرمین جناب فخر اجہ عبدالغفور (آئی اے ایس) اور شری برج نرائن جی (ڈائرکٹر) اور ان کے رفقاء کے تعاون سے قومی یکجہتی سے متعلق دیگر زبانوں کے علاوہ اُردو نظم و نثر پر بھی ایوارڈ دیا جاتا ہے۔ ۱۹۷۲ء کے ایوارڈ کی تفصیل درج ہے۔

انعام یافتگان	نوعیت	ایوارڈ
۱۔ علی سردار جعفری	نظم "یہ لہو"	ایک ہزار روپے
۲۔ اعجاز صدیقی	نظم "قدم ملا کے چلو"	پانچ سو روپے
۳۔ عبدالحمید بوبیرے	مقالہ "قومی یکجہتی"	ایک ہزار روپے
۴۔ بشمبر ناتھ پانڈے	مقالہ "گاندھی جی اور مسلم ایکتا"	پانچ سو روپے

اس کے علاوہ کسی بھی غیر سرکاری ادارے سے اُردو کے سلسلے میں کسی قسم کی ا[illegible] یا انعامات وغیرہ نہیں دیئے جاتے۔ البتہ اسکو کالج اور چند اخب[illegible]ات و رسائل اپنے طور پر تحریری و تقریری مقابلے، یا اُردو ڈراموں پر انعامات دیتے ہیں، یہ نہ اعلیٰ پیمانے پر ہوتے ہیں۔ نہ ہی اس سے کوئی ٹھوس مقصد حاصل ہوتا ہے۔ اس کے باوجود انفرادی طور پر یہ سعی جاری ہے۔ حال ہی میں داؤد دھابائی/فاضل بھائی ایجوکیشن ٹرسٹ نے ایک آل انڈیا مشاعرہ ہر سال منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ جس میں قومی یکجہتی پر بہترین اوّل نظم پر ایک ہزار روپے اور اس کے بعد کی نظم پر پانچ سو روپے کے انعام کا اعلان کیا ہے۔

سرکاری دفاتر اور اُردو

ریاستی سرکار کے تحت محکمۂ اطلاعات ونشریات میں اُردو نیوز سیکشن کے ذمّے خبریں، فیچرس، اور دیگر اہم اعلانات کی فراہمی ہے۔ یہ شعبہ ایک عرصہ سے کام کر رہا ہے۔

اگرامنرآف تگس، ریاست میں شائع ہونے والے اخبارات ورسائل کی پالیسی تنقید اور توجہ طلب نکات سے حکومت کو باخبر رکھتا ہے۔ تقریباً سات مترجمین اس شعبے میں کام کرتے ہیں جن میں سے ایک شعبہ کا انچارج ہوتا ہے۔ اُردو کی مطبوعات بھی اس شعبہ کو موصول ہوتی ہیں۔ جن کی ایک علیحدہ رپورٹ مرتب کی جاتی ہے اور شائع ہوتی ہے۔

اُردو کی ترویج واشاعت کے لئے تجاویز

۱۔ اہم سوال اُردو جاننے والے تعلیم یافتہ بے روزگاروں کی ملازمت کا ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ ہر ریاست اُردو والوں کی اس ضرورت پر غور کرتے ہوئے اسے پورا کرے۔

۲۔ سرکاری دفاتر (ریاستی ورمرکزی) میں اُردو کی اسامیوں کے لئے گنجائش ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ اُردو داں حضرات کی تقرری سے اُردو کے شعبوں کی کارکردگی میں تیزی پیدا ہوگی۔ بے روزگاری کے مسائل حل ہوں گے۔ محکمۂ ڈاک وتار، محکمۂ تعلقات عامہ اور دیگر اہم شعبوں میں اُردو والوں کی تقرری لازماً ہونی چاہیئے

۳۔ اُردو اخبارات وجرائد کو حکومت کی جانب سے ملنے والے اشتہارات کا اوسط دیگر زبانوں کے مقابلے میں کم ہے۔ اُردو کے صرف بڑے اخبارات وجرائد اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ حکومت کی حالیہ پالیسی اور سفارشات کے پیش نظر اُردو کے چھوٹے پرچوں کو خصوصی طور پر مالی امداد یا زیادہ سے زیادہ اشتہارات اور دیگر سہولتیں دی جانی چاہئے تاکہ ان پرچوں کی خاطر خواہ حوصلہ افزائی ہو سکے۔

۴۔ بمبئی "اے" اور "بی" ریڈیو اسٹیشن سے اُردو کے پروگرام نشر نہیں ہوتے۔ جب کہ ۷۳ لاکھ کی آبادی اُردو جانتی ہے۔ وزارت اطلاعات ونشریات اس سلسلے میں خصوصی توجہ دے تاکہ اُردو پروگرام کے لئے بھی کچھ حصہ مختص کیا جاسکے

۵۔ محکمۂ اطلاعات ونشریات، انجمن ترقی اُردو، اُردو کمیٹی، اردو دیالیمانی کمیٹی، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر پیش کئے جانے والے پروگراموں پر توجہ دے۔

۶۔ اُردو کے مصنفوں، شاعروں، اور ادیبوں کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیئے انہیں تخلیقی کاموں کے لئے امداد اعلیٰ تخلیقات پر انعامات اور اعزازات سے نواز جانا چاہیئے۔

۷۔ ریاستی سرکار کو انگریزی اور مراٹھی کی طرح لوک راجیہ اُردو میں بھی شائع کرنا چاہیئے۔



گیان چند



عمیق حنفی



محمد علی تاج



ندا فاضلی



مظفر حنفی



فضل تابش



کوثر جہاں



شفیقہ فرحت





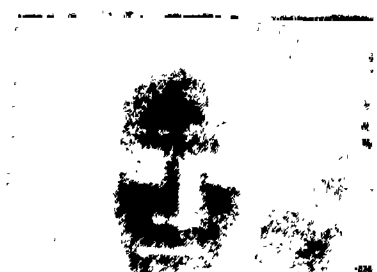
حسن مسعود



سید محمد یحیی



ملا فخر الدین



مدھیہ پردیش میں اردو

قمر الحسن

مدھیہ پردیش اپنے رقبے کے لحاظ سے ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست ہے۔ اس ریاست کی تشکیل ۱۹۵۶ء میں عمل میں آئی۔ اس میں وسطِ ہند کا قریباً سارا علاقہ جس میں مدھیہ بھارت اور بھوپال شامل تھے اور ان کے علاوہ ۔ریھ کے علاقوں کو چھوڑ کر پورے مہاکوشل اور وندھیہ پردیش کو آپس میں ملا کر اس وسیع و عریض صوبہ کی تشکیل کی گئی۔ مدھیہ بھارت کی مختلف ریاستوں ۔ں آزادی سے قبل اُردو کا چلن عام تھا۔ ان میں گوالیار، جاورہ، وغیرہ اہم ۔ں۔ ان کے علاوہ بھوپال کی مسلم ریاست تھی جس کی گزشتہ ایک صدی سے ۔ردو سرکاری زبان تھی۔ دلی اور لکھنؤ کے اُردو مراکز کی طرح بھوپال کا اپنا ایک سکول تھا۔ دوسرے اُردو ادب کی تخلیق و تشکیل کے لحاظ سے اسے ایک ۔م کی قدامت بھی حاصل تھی۔ بقول ڈاکٹر سلیم حامد رضوی مرحوم یہاں "شعر و سخن کے نمونے اٹھارویں صدی کے ابتدائی حصہ ہی میں مل جاتے ہیں" اس سلسلے ۔ں قاضی محمد صالح کی "مثنوی" اخلاقِ حسنہ" کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا جو ۱۷۰۷ء کی ۔منیف ہے۔ اس کے علاوہ قاضی محمد معظم نے "تفسیرِ ہندی" تحریر فرمائی جس زمانہ تحریر ۱۷۲۰ء ہے۔

بھوپال کے حکمراں ہمیشہ اُردو کی ترویج و ترقی کیلئے کوشاں رہے۔ نواب ۔مدر جہاں بیگم نے ۱۸۵۹ء میں فارسی کی جگہ اُردو کو سرکاری زبان قرار دیا۔ ۔کمرانوں میں سے کچھ صاحبِ دیوان شاعر بھی تھے۔ یہی حال یہاں کی ۔ت کا بھی تھا۔ نواب شاہ جہاں بیگم کے دور (۱۸۶۸ء تا ۱۹۰۰ء) میں علماءِ ۔ار کے اجتماع اور علمی و ادبی سرگرمیوں کو دیکھ کر مولانا اسلم جے پوری یہ ۔ار یہ لکھنے پر مجبور ہوگئے کہ "یہ (بھوپال) اس دور کا بغداد الہند ہے"۔

علم و ادب کی سرپرستی کا یہ سلسلہ نوابی دور ختم ہونے کے بعد بھی جاری ۔ سلیم حامد رضوی مرحوم اور ایم عرفان مرحوم کی تحقیقی کتب کی اشاعت نواب ۔مہر تاج ساجدہ سلطان صاحبہ کے عطیہ کی رہینِ منت تھی۔ شملہ ڈیوڑھی بھی اپنی ۔ف نوازی کیلئے ممتاز رہا ہے۔ کرنل عین الملک نواب زادہ رشید الظفر ۔مرحوم ہمیشہ شعراء و ادبا کی سرپرستی فرماتے رہے۔ جگر مرحوم کو ۱۰۰ روپیہ ماہانہ منصب عطا کرنے کے علاوہ "شعلۂ طور" کی پہلی اشاعت آپ ہی کی توجہ و مالی ۔نت کا نتیجہ تھی۔

غالب کے متعدد شاگرد بھوپال آکر بسے اور خوب نام کمایا۔ ان میں مولانا ۔ن رفعت کا نام بے حد اہم ہے۔ بعد میں بھی یہ سرزمین ممتاز اہلِ قلم حضرات ۔یم لیتی رہی۔ ان میں علامہ اقبال، نیاز فتحپوری، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، ۔اثر خیر آبادی، سر راس مسعود، علامہ سلیمان ندوی وغیرہ اہم ہیں۔ خود یہاں کے ۔شاعروں اور ادیبوں میں مولانا برکت اللہ، عبدالرزاق (البرامکہ) ملا رموزی، مہر ۔بیاری، سراج میر خاں سحر، معشوق علی خاں جوہر، بخشی کنج بہاری لال، محمد میاں ۔ید، سہا مجددی، ذکی وارثی، علامہ یوسف قیصر کی ادبی فتوحات کا ذکر ناگزیر ہے۔

اُردو کی ترقی کا یہ سلسلہ ۱۹۵۰ء تک جاری رہا۔ لیکن چیف کمشنری راج شروع ہوتے ہی اُردو کی سرکاری حیثیت ختم کر دی گئی۔

بھوپال کے علاوہ مدھیہ پردیش کے دوسرے علاقے جن میں اُردو کا سکہ چل رہا تھا گوالیار، برہان پور، جبلپور، کھنڈوہ، اجین، جاورہ، اندور، دھار، سیونی سرونج، ساگر وغیرہ تھے۔ برہان پور اُردو کے ایک مرکز کی حیثیت سے مہاکوشل میں ممتاز رہا۔ شیخ شاہ محمد بن فضل اللہ خانوادے نے وہاں اُردو کی شمع روشن کی اور اس سرزمین نے مفتی خیر اللہ صدیقی جیسے شخص کو پیدا کیا جس کے بارے میں رستم علی سرہندی نے "جامع الفضل والکمال شاعرِ جادو بیاں" تحریر کیا ہے۔ آپ بعد میں برہان پور سے مندسور (مدھیہ بھارت) چلے گئے۔ وہاں سے اجین تشریف لائے اور مفتی کے عہدے پر سرفراز ہوئے۔ اور پھر بھوپال چلے آئے۔ آپ نے ایک "مثنوی" فقہ ہندی" نظم کی جس کا سنِ تحریر ۱۷۳۸ء ہے۔

گوالیار میں شیخ محمد غوث گوالیاری کا خاندان علم و فضل میں یگانۂ روزگار تھا۔ شاہ مبارک آبرو، خان آرزو اور اصغر علی اصغر اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے ان تینوں نے ۱۷۶۹ء میں گوالیار سے ہجرت کی۔ آبرو اور آرزو نے دلی کو منتخب کیا۔ جب کہ اصغر بھوپال چلے آئے۔ مولفِ "آثار الشعراء" نے اصغر کو "اُردو ہندی فارسی کا نامی گرامی شاعر" تحریر کیا ہے۔ مگر ترکِ مکانی میں آپ کی اکثر تصانیف تلف ہوگئیں۔ اور آپ کو وہ مقام وہ شہرت نہ مل سکی جو آبرو اور آرزو نے پائی۔

گوالیار کو امیر علی امیر گوالیاری کا وطن ہونے کا فخر بھی حاصل ہے۔ آپ نے چالیس برس شعر و سخن کی وادی میں گزارے۔ آپ کی قلمی بیاض ۱۷۸۵ء سے ۱۸۲۵ء تک کے کلام پر مشتمل ہے۔ آپ ۱۷۹۵ء میں بھوپال تشریف لائے تھے۔

دوسروں کے برعکس شاہ غمگین ۱۸۱۵ء میں دلی سے گوالیار آئے۔ یہ وہی حضرت شاہ غمگین ہیں جن کے بارے مرزا غالب نے ایک خط میں یہ لکھا تھا: "بخدا۔ ایمان سے کہتا ہوں کہ زبان ریختہ یعنی اُردو حقائق الٰہی کے معارف کی اس سے زیادہ متحمل نہیں ہو سکتی جتنے حضور نے اس میں سموئے ہیں"۔

اسی طرح مدھیہ پردیش کے دوسرے شہروں میں بھی اُردو کے باکمال مصنفوں اور شاعروں نے اپنی اہمیت اور اپنی زبان کی ہمہ گیری کو ثابت کیا جیسے بلاسپور (مہاکوشل) میں بابو جگن ناتھ پرشاد فیض (گلزارِ فیض: ۱۹۱۲ء) کا مطبوعہ کلام مل جانا یا سرونج (پہلے یہ علاقہ ریاست ٹونک راجستھان کا حصہ تھا) میں احمد مرتضیٰ منظر (آثارِ مالوہ) کا تاریخی کتاب تحریر کرنا، ہمارے اس دعوے کی تصدیق کرتا ہے۔ کم و بیش یہی صورت حال دو ۔سے مقامات پر بھی نظر آتی ہے۔

مادری زبان ۔ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق مدھیہ پردیش میں نو لاکھ اٹھاسی ہزار دو سو پچھتر (۹,۸۸,۲۷۵) افراد کی مادری زبان اُردو تھی۔ ۱۹۶۱ء میں یہ تعداد سات لاکھ چالیس ہزار اٹھانوے (۷,۴۰,۰۹۸) تھی۔ ۱۹۵۱ء میں تین لاکھ اڑسٹھ ہزار دو سو تینتیس (۳,۶۸,۲۳۳) اور ۱۹۴۱ء میں سات لاکھ اکیا ۔ت

ہزار سات سو چھتر (۵۰،۰۷۶) یعنی تقسیم ملک سے مدھیہ پردیش کی اردو آبادی میں جو کمی واقع ہو گئی تھی اس کا ازالہ مع اضافہ ہو چکا ہے۔

تعلیمی سہولتیں

تعلیمی میدان میں مدھیہ پردیش میں اردو کے چلن کا جائزہ بعض لحاظ سے حیرت ناک اور بعض لحاظ سے دلچسپ حقائق کا منظر ہے۔ سرکاری پرائمری اور مڈل اسکولوں میں ایک سے زیادہ وجوہ سے اردو تعلیم کی راہ میں رکاوٹیں حائل رہیں۔ جب کہ مدھیہ پردیش کے مختلف علاقوں میں بڑی تعداد میں اردو میڈیم کے پرائیویٹ اسکول کھولے گئے۔ اس کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا ہے کہ گزشتہ سال سے قبل بھوپال، جسے مدھیہ پردیش میں اردو کا دل کہا جائے تو غلط نہ ہوگا، میں اردو میڈیم کا کوئی بھی پرائمری یا مڈل اسکول نہ تھا محبان اردو کے مطالبہ کو کئی سال بعد پچھلے برس درخور اعتنا سمجھا گیا اور ۸ اردو میڈیم کے پرائمری اسکول کھولے گئے۔ اس کے برعکس ہائر سیکنڈری اسکولوں اور کالجوں میں اردو پڑھنے والوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا ہے ایک محتاط اندازہ کے مطابق ۹۰ ہائر سیکنڈری اسکولوں میں اردو ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے۔ حالانکہ اردو میڈیم کا کوئی سرکاری ہائر سیکنڈری اسکول نہیں ہے، البتہ صوبہ کے متعدد بڑے شہروں میں اردو میڈیم کے پرائیوٹ ہائر سیکنڈری اسکول ہیں جن کو سرکار سے گرانٹ ملتی ہے۔

ایم پی بورڈ آف ہائر سیکنڈری ایجوکیشن نے گیارہویں درجہ تک اردو میڈیم کے استعمال کی اجازت دی ہوئی ہے اور وہ ان امیدواروں کے لئے پرچے بھی اردو رسم الخط میں شائع کرتا ہے۔ بورڈ کے انٹرمیڈیٹ مراسلاتی کورس میں اردو بھی شامل ہے اور ایک جونیئر ٹیوٹر اس شعبہ کا سربراہ ہے۔

اس وقت مدھیہ پردیش میں یونیورسٹیوں کی تعداد ۸ ہے۔ ان میں سے کسی میں اردو میڈیم میں جوابات لکھنے کی سہولت نہیں ہے۔ ان کا میڈیم انگریزی اور ہندی ہے۔ لیکن تمام یونیورسٹیوں میں اردو ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے اور ہر سال اردو طلبا کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے اس کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

سن	تعداد کالج	تعداد یونیورسٹی	بی اے تک تعلیم	ایم اے تک تعلیم	تعداد طلبا بی اے	تعداد طلبا ایم اے
۱۹۵۱	۳	۲	۴	–	۱۰۰ - اوسطاً	–
۱۹۶۱	۹	۳	۹	۱	۴۰۰ ۰	۱۴ اوسطاً
۱۹۷۱	سرکاری پرائیوٹ	۸	۲۴	۵	۹۰۰ ۰	۴۲ ۰

اردو اخبارات و رسائل

مدھیہ پردیش میں اردو اخبارات کی تاریخ پوری ایک صدی پر محیط ہے پہلا ہفت روزہ "عمدۃ الاخبار" بھوپال سے ۲۴ مارچ ۱۸۷۱ء کو جاری ہوا اس کے مدیر حکیم اصغر حسین تھے۔ ہوشنگ آباد کو اس صوبہ کا دوسرا ہفت روزہ "موج نربدا" شائع کرنے کا فخر حاصل ہے اس کے مدیر منشی عبدالکریم اوج تھے۔ اور یہ ۱۸۸۴ء میں جاری ہوا۔ مدھیہ پردیش میں بھوپال کو اردو رسائل و اخبارات کی جنم بھومی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس سلسلے میں ماہ ناموں میں "مہر منیر" (مدیر عبدالعزیز اعجاز رقم؛ ۱۸۹۶ء) "ظل السلطان" (مدیران۔ امین زبیری و یوسف قیصر؛ ۱۹۱۵ء) "نگار" (نیاز فتح پوری؛ ۱۹۲۲ء) "ندیم" (مولانا سعید رزمی؛ ۱۹۲۳ء) "محسن الملک" (حامد سعید خاں حامد؛ ۱۹۲۴ء) "افکار" (صہبا لکھنوی۔ رشدی۔ حکیم قمرالحسن۔ ۱۹۴۵ء) "جادہ" (کوثر چاندپوری۔ ۱۹۵۰ء) پندرہ روزہ جرائد میں "الحجاب" (یوسف قیصر ۱۹۱۱ء) "صبح وطن ثانی" (قدوس صہبائی شاکر علی خاں (۱۹۳۶) ہفت روزہ جرائد میں "بانو" (مدیرہ: خاتون ارشد ۱۹۳۳ء) "آواز" (مولانا سعید رزمی؛ ۱۹۳۳ء) "صبح وطن" (شاکر علی خاں۔ ۱۹۳۴ء) "بھوپال پنچ" (بھگوان دیال نشاط و عمران انصاری؛ ۱۹۳۵ء) "شاہکار" (نشاط و جی۔ ایم نغمی ۱۹۴۵ء) "نیا بھوپال" (نغمی و پریم سریواستو؛ ۱۹۴۶ء) "منزل" (ایم عرفان؛ ۱۹۴۷ء) "ترجمان" (جوہر قریشی و تیھر جیانی ۱۹۵۰ء) "نیا ساتھی" (کے این پردھان۔ یوسف قریشی ۱۹۴۹ء)

بھوپال کے علاوہ "اخلاق" کے نام سے عبدالغفار خاں نے گوالیار سے ایک پرچہ نکالا جو مختلف مقامات سے ۳۶ سال تک نکلتا رہا اور اپنے مدیر کے ترک مکانی کے ساتھ مقام اشاعت بدلتا رہا۔ آخر بھوپال میں جب خانصاحب کا انتقال ہوا تو یہ پرچہ بھی بند ہو گیا۔

اجین میں ۱۹۴۲ء میں "آفتاب مالوہ" کے نام سے ایک ماہ نامہ شائع ہوا مگر زیادہ عرصہ جاری نہ رہ سکا۔ یہی صورت حال دوسرے ماہ ناموں اور پرچوں کی بھی رہی کہ وہ شعلہ مستعجل کی طرح چند ماہ یا ایک دو سال جاری رہے اور بند ہو گئے۔ مدھیہ پردیش کی سرزمین جرائد کے اجراء کے معاملہ میں جتنی زرخیز رہی انھیں مستقل جاری رکھنے کے معاملے میں اتنی ہی سنگلاخ ثابت ہوئی ہے۔ ۱۸۷۱ء سے لے کر ۱۹۵۱ء تک تقریباً ۱۵۰ جرائد و اخبارات یہاں سے جاری ہوئے ۱۹۵۱ء اور ۱۹۷۱ء کے درمیان جو اخبارات و رسائل شائع ہوئے ان کی مجموعی تعداد کافی حوصلہ افزا رہی صرف "ندیم"، "افکار" اب بھی جاری ہیں "الحرار" (روزنامہ) نیا اضافہ ہے۔ باقی سب نئے ہیں اور پرانے بند ہو چکے ہیں۔

مدھیہ پردیش کا پہلا روزنامہ "رہبر وطن" ۱۴ اگست ۱۹۳۸ء میں محمود الحسن صدیقی کی ادارت میں شائع ہوا۔ "ندیم" اپنی صحافتی عمر کی ۳۵ بہاریں دیکھ چکا ہے۔ اس کے مدیر اعلیٰ حکیم سید قمرالحسن اور مدیر قمر اشفاق ہیں۔ یہ اپنا سلور جوبلی نمبر شائع کر چکا ہے۔ رشدی و عارف صاحبان نے ۱۹۵۰ء میں "افکار"

جاری کیا۔ ۱۲ سال سے شائع ہو رہا ہے۔ تیسرا روزنامہ "الحرار" ہے۔ اول الذکر دو روزنامے شام کو شائع ہوتے ہیں جب کہ یہ سویرے شائع ہوتا ہے۔ اس کے مُدیرِ اعلیٰ محمود الحسینی ہیں۔

اِن روزناموں کے علاوہ اس درمیانی عرصہ میں اندور سے "سفیرِ مالوہ" اور بھوپال سے "حقیقت"، "نیا بھوپال"، "خورشید" اور "نیا سماج" ۱۹۵۲ء تا ۵۷ء کے دوران شائع ہوئے مگر زیادہ دنوں جاری نہ رہ سکے۔

ماہ ناموں میں ۱۹۵۹ء میں کھنڈوہ سے "نئے چراغ" اور ۱۹۷۱ء میں اندور سے "شاخیں" شائع ہوئے۔ خود بھوپال سے "کردار" (۱۹۵۴ء) "زنجیر" (۶۳ء) "مزاح" (۱۹۶۸ء)، کا اجرا ہوا۔ مگر دو دو تین سال تک جاری رہ کر بند ہو گئے۔ یہ بڑے معیاری رسائل تھے اور انھوں نے مختصر مدت میں اپنا انفرادی مقام بنا لیا تھا۔ آج کل بھوپال سے دو ماہ نامے شائع ہو رہے ہیں۔ "آذر" اور "تشکیل" (ان ۱۹۷۳ء سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔

ہفتہ وار پرچے اس درمیان میں بڑی تعداد میں شائع ہوئے جیسا کہ چارٹ دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے۔ ان میں "نیا بھوپال" (چھگن مل۔ جوہر قریشی ۱۹۵۰ء) "راہی" (طلبا کا پہلا ہفت روزہ۔ مدیران قمر اشفاق و صادق رضا؛ ۱۹۵۴ء) "نیا دور" (شاکر علیخاں: ۱۹۵۵ء) "راج دھانی" (آصف شاہمیری — ۱۹۵۶ء) "بھوپال پنچ" (مخلص بھوپالی: ۱۹۶۰ء) "رفتار" (محفوظ منظر؛ ۱۹۶۰ء)۔ "الجبل" (جوہر قریشی: ۱۹۶۱ء) کا دورِ اشاعت کافی طویل رہا۔ مگر آج اِن میں سے کوئی شائع نہیں ہو رہا ہے۔ فی الحال "شیشہ و سنگ" (مدیر اسلام الحق ارمان) اور "ایاز" پابندی سے شائع ہو رہے ہیں۔ "ایاز" کے مُدیر مدھیہ پردیش کے سابق وزیر امداد باہمی عارف بیگ ہیں۔ جولائی میں "ایاز" نے اپنا شاندار سالنامہ شائع کیا ہے۔

ان جرائد کے علاوہ مدھیہ پردیش کی مختلف درسگاہوں میں ایک روایت ہے کہ ان کے سالانہ میگزین میں جہاں جہاں اُردو کی تدریس کا انتظام ہے، ہندی اور انگریزی کے ساتھ اُردو سیکشن بھی ضرور ہوتا ہے۔ صرف کالجوں سے اس قسم کے ۲۵ میگزین شائع ہوتے ہیں جب کہ اتنی ہی تعداد میں اسکولوں سے بھی میگزین شائع ہوتے ہیں۔ ان میں سلطانیہ گرلز ہائر سیکنڈری اسکول کا میگزین سب سے پرانا ہے۔ حمیدیہ کالج میگزین کی عمر ۲۷ سال ہو گی۔ سیفیہ کالج جداگانہ طور پر اپنا مجلہ شائع کرتا ہے جس کی ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی کی جاتی ہے۔ غالب [illegible] دی کے زمانے میں کافی تعداد میں درسگاہوں نے غالب نمبر نکالے۔ حمیدیہ کا ج میگزین کے نہرو اور ٹیگور نمبر اپنے مواد اور معیار کے لحاظ سے خاصے کی چیز تھے۔ جن مقامات پر اس قسم کے میگزین نکلتے ہیں، ان میں بھوپال کے علاوہ جبلپور، دھار، اندور، اجین، جاورہ، سیہور، گوالیار، ریوا وغیرہ کے میگزین خود راقم کی نظر سے گزرے ہیں اور خوب ہیں۔

علمی و ادبی سرگرمیاں

مدھیہ پردیش کے تمام چھوٹے بڑے شہروں میں جہاں اُردو کا ذرا سا بھی چلن ہے مشاعروں کی روایت عام ہے۔ اس کا اندازہ غالب صدی کے زمانے میں ہوا۔ بھوپال، اندور، گوالیار، کھنڈوہ، جبلپور، اجین، وغیرہ کی بات چھوڑیئے بھنڈ، منگاؤلی، گنج باسودہ جیسے شہروں میں نہ صرف مشاعرے ہوئے بلکہ غالب کی زندگی اور شعر و ادب پر تقاریر اور مقالوں کو بھی ہزاروں کی تعداد میں سامعین نے دلچسپی سے سُنا۔

لیکن ادبی و علمی سرگرمیوں کو صرف مشاعروں تک محدود سمجھنا درست نہ ہوگا۔ مختلف ادبی و تہذیبی انجمنیں ہیں جو ادبی ذوق کو نکھارنے کا فریضہ انجام دے رہی ہیں۔

مدھیہ پردیش میں شاعروں کی تعداد کے بارے میں اکثر مبالغے سے کام لیا جاتا ہے۔ مرحوم ایم عرفان نے ۱۹۶۴ء میں شاعروں کی ایک فہرست شائع کی تھی جس کے مطابق صرف بھوپال میں ان کی تعداد دو سو کے قریب پہنچ گئی تھی۔ اس حساب سے پورے صوبے میں بلا مبالغہ یہ تعداد ۵۰۰ سے تجاوز کرے گی لیکن ان میں کم از کم ۲۵۔۳۰ ضرور ایسے شاعر ہیں جن کے کلام کا معیار اور اندازِ سخن انہیں کسی بھی ادبی تاریخ میں جگہ دلانے کو کافی ہے۔ ان میں فیاض گوالیاری، اختر سعید، اسد بھوپالی، اظہر سعید، ارشد صدیقی، محمد علی تاج، اصغر شعری، شاداں گوالیاری، گوپی کرشن شوق، شاہد بھوپالی، مقصود عرفان، محفوظ منظر، مقصود عمرانی، کیف بھوپالی، گوہر جلالی، وکیل بھوپالی، عشرت قادری کے علاوہ نئی نسل میں فضل تابش، قاسم نیازی، وحید پرواز، مظفر حنفی، صابر نیازی، متین نیاز، رفعت الحسینی، وفا صدیقی، اور ان کے رفیقوں کا ایک معقول گروہ ہے جو اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو تسلیم کرا رہا ہے۔

مدھیہ پردیش کے جن نامور شعرا نے ان گزرے برسوں میں ہمیں داغ مفارقت دیا ان میں حامد سعید خاں حامد، استاد نیر بھوپالی، شاداں اندوری، علامہ یوسف قیصر، شفا گوالیاری، درگا پرشاد شاد، باسط اجینی، ناطق مالوی باسط بھوپالی شامل ہیں۔

جاں نثار اختر کا اُردو شاعری میں اپنا مقام ہے۔ آپ گوالیار سے ترک وطن کر کے بھوپال آئے۔ حمیدیہ کالج میں صدر شعبہ اُردو رہے آج کل بمبئی میں مقیم ہیں۔

بھوپال کے علاوہ ڈاکٹر پریم چند شریواستو، جے کشن چودھری حبیب، پنا لال شریواستو، حنیف انصاری، خلیل الرحمن غوری، انتھونی نادان (جبلپور)، عتیق اللہ، صادق مولیٰ، محمود سحر، کاشف الہاشمی (اجین)، عزیز اندوری، ایم طارق (اندور)، دانش مالوی، میر عرفاقی، مختار شمیم، وقار فاطمی (سرونج)، اسمٰعیل حاذق،

محمد حسین قمر، ساگر، خلیق برہان پوری، اقبال نصیب (برہان پور)، شوق ماہری خوشتر کھنڈوی (کھنڈوہ)، فیاض گوالیاری، پریم چند کیشپ سوز، ندا فاضلی، وقار صدیقی (گوالیار)، سلیم صدیقی (منڈلا)، خطیب گلشن آبادی (جاورہ)، کا ذکر کرنا بھی اس جائزے میں بے محل نہ ہوگا۔

مدھیہ پردیش میں تعلیم کی ترقی کے ساتھ تحقیقی و تنقیدی شعور بیدار ہوا۔ اس ذوق کو جلا دینے میں ڈاکٹر گیان چند نے جو حصہ ادا کیا ہے اُسے یہ صوبہ کبھی فراموش نہ کر سکے گا۔ پہلے مدھیہ پردیش اختر حسین رائے پوری کے نام سے جانا جاتا تھا جنھوں نے "ادب اور انقلاب" کے ذریعہ اپنے ترقی پسند تنقیدی رجحان کو عام کیا۔ لیکن ڈاکٹر گیان چند نے اپنے تحقیقی مزاج اور تنقیدی شعور سے پوری ایک نسل کو متاثر کیا۔ نثر کی طرف توجہ دی گئی اور بڑے پیمانہ پر تحقیقی مقالات سپرد قلم کیے گئے۔ آپ کی کتب "تحریریں" "اردو مثنوی شمالی ہند میں" اسی زمانہ کی یادگار ہیں۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر سلیم حامد رضوی نے تنقید کے لئے خاکے" اور "اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ" کتابی شکل میں پیش کئے۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر جو ایک محتاط اور سنجیدہ محقق ہیں انھوں نے قصیدہ پر کام کیا اور "اردو میں قصیدہ نگاری" اور "انتخاب قصائد اردو" کے علاوہ "مطالعہ امیر" "تنقید و تجزیہ" اور "غالبیات کے چند مباحث" اس دور کی یادگار کتابیں ہیں۔ قوی وسنوی نے غالبیات کے سلسلہ میں بڑا کام کیا اور غالب کی ببلیوگرافی کے علاوہ "غالب اور بھوپال" پیش کی۔ آفاق احمد نے مثنوی سحر البیان کو اپنے مقدمے اور فرہنگ کے ساتھ شائع کرایا۔ ان کا بہت بڑا کارنامہ غالب کے خود نوشتہ دو غیر مطبوعہ خطوط کی دریافت ہے۔ اس کے علاوہ مدھیہ پردیش کے مختلف کالجوں میں ایم اے فائنل میں DISSERTATION کے طور پر ۶۳ مقالے لکھے گئے جب کہ ۸ ریسرچ اسکالرز نے اردو میں پی ایچ ڈی کے لئے مقالے لکھ کر ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ اس وقت وکرم، جبلپور اور بھوپال یونی ورسٹیوں میں ۱۱ ریسرچ اسکالر پی ایچ ڈی کے لئے مقالے تحریر کر رہے ہیں۔ مظفر حنفی نے شاد عارفی کو اپنا موضوع بنایا۔ "ایک تنہا شاعر" "نثر و غزل دستہ" اس کا ثبوت ہیں۔

ایم عرفان نے متعدد تحقیقی موضوعات پر مضامین لکھے جو مختلف رسائل و اخبارات میں شائع ہوئے۔ ان کا بہت بڑا کارنامہ اپنے رسالہ "شعاع حیات" کا "مدھیہ پردیش اردو نمبر" (۱۹۶۴ء) ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے اپنی تاریخی کتاب "برکت اللہ بھوپالی" کے ذریعہ ایک جہاں گشت انقلابی کو حیات نو عطا کی۔ سید حامد حسین کا اصل میدان تحقیق ہے۔ آپ نے غالبیات پر بعض اہم مضامین تحریر کیے۔ نثر میں جن لوگوں نے تخلیقی ادب کی طرف توجہ کی ان میں سر فہرست تخلص بھوپالی کا نام ہے جنھوں نے "پوسٹ مارٹم" "پاندان والی خالہ" وغیرہ کے ذریعہ مختصر عرصہ میں اردو کے طنز و مزاح نگاروں میں اپنا مقام بنالیا۔ افسانہ نگاروں میں شاہمیر راہی، شفیقہ فرحت، زہرہ جمال، آفاق احمد، عیسیٰ صدیقی، نعیم کوثر، فضل جاوید، نے قدوس صہبائی و ظہور کی روایت کو آگے بڑھایا۔ کوثر چاند پوری کا قلم بغیر تھکے اپنے افسانوں، ناولوں، مقالوں، اور رپورتاژوں کے ذریعہ نثر کی خدمت کرتا رہا۔ بھوپال کے نثر نگاروں نے ہمیشہ ان سے حوصلہ پایا۔ ڈرامہ نگاروں میں ابراہیم یوسف، قمر جمالی، شاہمیر راہی، جہاں قدر چغتائی ممتاز رہے۔

ناول نگاروں میں ایم عرفان، آصف شاہمیری، وسیم بانو قدوائی کے ناول شائع ہوئے۔ وسیم بانو قدوائی نصف درجن ناولوں کی مصنفہ ہیں۔ آفاق احمد نے "اک کرن اجالے کی" کے نام سے راجا گوپال آچاری کی کہانیوں کا ترجمہ اُن کی اجازت سے کیا۔

بھوپال کے دوسرے اہم نثر نگاروں میں محمود الحسینی، ڈاکٹر عبدالودود، ڈاکٹر یونس حسنی، شمیم احمد، ایم رفیق وغیرہ شامل ہیں۔

مدھیہ پردیش کی ایک اہم شخصیت مشہور و ممتاز ڈرامہ نگار حبیب تنویر (رائے پور) ہیں جو کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان کے علاوہ شیخ فرید (محقق جبل پور) سہیل اعجاز صدیقی (افسانہ نگار۔ اجین) حسن بشیر، قاضی انصار (برہان پور) ندا فاضلی (گوالیار) کوثر جہاں (افسانہ نگار۔ جبلپور) غلش جعفری (صحافی۔ برہان پور) کے ذکر کے بغیر یہ تذکرہ نامکمل رہے گا۔

پچھلے ۲۳ برس میں مدھیہ پردیش کے مصنفین و شعراء کی جو کتابیں یا مجموعے شائع ہوئے اُن کی تعداد ۹۱ ہے۔ ان میں سے زیادہ تر بھوپال کے اشاعتی اداروں مرکز ادب، قصر ادب، مکتبہ بزم سخن، پنچ بھون وغیرہ کے اہتمام میں شائع ہوئیں۔ اوسطاً فی برس ۴ کتابیں شائع ہوئیں۔

مدھیہ پردیش میں ادبی انجمنوں کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ یہاں انجمن ترقی اردو پہلی بار ۱۹۳۶ء میں قائم ہوئی۔ بھوپال سے اس کی ابتدا ہوئی۔ یوسف قیصر قدوس صہبائی، ظہور ہاشمی اس کے بانیوں میں سے تھے۔ بعد میں مختلف مقامات پر اس کی شاخیں قائم ہوئیں۔ اس وقت مدھیہ پردیش [illegible] اس کی شاخیں فعال ہیں۔ صوبائی انجمن کے صدر مسٹر فخر الدین اور [illegible] سکریٹری پروفیسر آفاق احمد ہیں۔ لسانی اقلیتوں کے کمیشن کے سامنے اردو کے مطالبات پیش کرنے اور اردو کے حقوق کے حصول کے لئے تعمیری جدوجہد کرنے کے معاملے میں اس نے اہم حصہ ادا کیا۔ گجرال کمیٹی کے سامنے اس کے صدر اور جنرل سکریٹری نے تحریری یادداشت پیش کی اور صوبہ میں اُردو کا کیس پیش کیا۔ جبلپور میں پروفیسر عبدالباقی، پنا لال شریواستو، خلیل الرحمٰن محوری، ریوا میں پرنسپل اختر حسین نظامی، وکرم سنگھ، اجین میں احمد نور شمیم، سلطان احمد صدیقی۔ جاورہ میں قمر الدین وکیل، محمد شفیق، رفیق احمد خاں، پروفیسر خلیل مشیر۔ ساگر میں [illegible]

حسین مہر برہان پور میں حاجی صلاح الدین۔ کھنڈوہ میں ڈاکٹر خورشید احمد۔ اندور میں رو پاشن سلیم، عزیز اندوری۔ گوالیار میں بشارت وشوا ناتھ کول، وقار صدیقی منڈلیشور میں حاجی محمد خاں، عبدالرشید۔ آگر مالوہ میں قاضی جمیل الدین۔ کورواٸی میں بشیر محمد سید اعجاز علی تمری۔ دھار میں منیر محمد، شاراحمد ایڈوکیٹ، پروفیسر فضل تابش۔ گنج باسودہ میں جوہر باسودی۔ وودیشہ میں چودھری منظور علی سید فاروق علی۔ ایچ ای۔ ایل میں آر پی سکسینہ، فضل جاوید۔ بھوپال میں مولانا سعد الدین، شرقی عثمانی، اسرار مسعود، پروفیسر حسن مسعود انجمن ترقی اردو اور اردو تحریک کے سرگرم کام کرنے والے ہیں۔ مختلف شہروں میں انجمن کے اردو میڈیم مدرسے ہیں۔

اس موقع پر ایم عرفان مرحوم کی بے اختیار یاد آرہی ہے جنھیں فدائے اردو کا خطاب بجا طور پر ملا تھا انھوں نے انجمن کا پیغام پوری یاستدمیں عام کرنے اور اردو تحریک کے لئے تن من دھن سے پیش پیش رہنے کی جو مثال قائم کی ہے وہ ہمیشہ اردو والوں کے حوصلے بڑھاتی رہے گی۔

ان دنوں بھوپال میں جو ادبی تنظیمیں سرگرم عمل ہیں ان میں "حلقہ ارباب ادب" سرفہرست ہے جو پچھلے ۲۳ سال سے ایک وقار اور معیار کے ساتھ ادب کی خدمت مسلسل کئے جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ شمع ادب، بزم فن کار، بزم سخن، ادارہ فروغ اردو، تجدید ادب وغیرہ خاص اہمیت کے مستحق ہیں۔ دوسرے شہروں کے ادبی اداروں میں اجین کی بزم ادب (قائم شدہ ۱۹۴۴ء)، بزم اہل ادب (۱۹۵۲ء)، جبلپور کا حلقۂ ارباب ادب، سیہور کی شمع ادب، نقاش ادب، ساگر کی بزم ادب۔ اور اس طرح دوسرے مقامات کی ادبی انجمنیں اپنے اپنے طور پر ادبی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔

اردو کی اشاعت و ترقی کے لئے کوئی سرکاری امداد نہیں ملتی ہے۔ البتہ بعض میونسپل کمیٹیاں ضرور مدد کرتی ہیں۔ ورنہ عام طور پر کام عطیہ حاصل کر کے چلایا جاتا ہے۔ غالب صدی کے دوران جو اشاعتی پروگرام عمل میں آیا۔ اس میں سے بیشتر کو عطیے حاصل کر کے پورا کیا گیا۔

مدھیہ پردیش کے اہم کتب خانوں میں ساگر کی اردو لائبریری ہے۔ جسے نصف صدی قبل مولوی ... خاں ناقی نے قائم کیا تھا۔ اسمیں ڈیڑھ ہزار کتب ہیں۔ اس کے علاوہ انجمن ترقی اردو کی گشتی لائبریری بھی ہے برہان پور میں تو لائبریریوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ جنتا لائبریری، انڈیا لائبریری، مزدور لائبریری، خورشید لائبریری وغیرہ ان میں ایک لائبریری کی پچاس سالہ خدمات کے اعتراف میں ریاستی سرکار کے ثقافتی محکمہ نے ۱۹۶۱ء میں کئی ہزار کی مدد دی تھی۔ اجین میں وکرم یونی ورسٹی کی لائبریری کے علاوہ مادھو کالج اور گورنمنٹ گرلز کالج، سیفی کالج اور ریاستی جنرل لائبریری قابل ذکر ہیں۔ جہاں اردو کتب کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔



جے کرشن چودھری حبیب



ابو محمد سحر



آفاق احمد

بھوپال تو ایک لحاظ سے لائبریریوں کا شہر ہے۔ یہاں کی سب سے اہم لائبریری مولانا آزاد سنٹرل لائبریری ہے۔ اس کا شمار اگر ملک کے چند بہترین کتب خانوں میں کیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس میں کتب خانہ نوجدار محمد خاں کی کتب کے علاوہ حمیدیہ لائبریری کی کتب موجود ہیں۔ اردو کتب کی تعداد سات ہزار سے اوپر ہے۔ ان میں بڑی تعداد میں قیمتی قلمی نسخے، بیش بہا مخطوطے اور نادر قدیم کتب ہیں جو اب کسی قیمت پر بھی دستیاب نہیں ہو سکتی ہیں۔ ان کے علاوہ نیا اردو لٹریچر بھی ہے۔ ایک اور اہم لائبریری کتاب گھر ہے۔ جسے اسمٰعیل صاحب اپنی مسلسل علالت کے باوجود اتنا خون جگر دیکر ۱۹۳۶ء سے قائم کر رکھا ہے۔ اس میں پرانے رسائل کے فائل اور قدیم کتب و مخطوطات کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔ اس کے علاوہ اقبال لائبریری شہر کے عین وسط

میں واقع ہے۔ اس میں کتب و رسائل کی تعداد ۵۱۸۳ ہے۔ پرائیویٹ لائبریریوں میں انیس لائبریری بھی قابل توجہ ہے۔ میونسپل کارپوریشن کا بھی ایک دارالمطالعہ ہے۔ اس میں ۲½ ہزار اُردو کتب ہیں جب کہ حمیدیہ کالج میں ۵ ہزار، سیفیہ کالج میں ۴½ ہزار ایم۔ ایل۔ بی گرلز کالج میں ۲½ ہزار کتب موجود ہیں۔ کتاب گھر اور اقبال لائبریری کو میونسپل گرانٹ ملتی ہے۔

مکتبۂ شرقیہ بھوپال میں اُردو کتب کی فراہمی کا سب سے اہم مرکز ہے۔ یہ مولانا شرقی عثمانی کے انتظام و انصرام میں یہاں کی مختلف لائبریریوں اور کالجوں اور اُردو طلبا کی خدمت کر رہا ہے۔

ریاستی سرکار کی امداد

ریاستی سرکار نے اس برس اُردو کی تین شعرا محمد علی تاج، گوہر جلالی اور نیتم بھوپالی کا علی الترتیب ۱۰۰ روپیہ اور ۷۵، ۵۰ روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کیا ہے۔ کتابوں کی اشاعت کے لئے کوئی مالی مدد اس پورے عرصہ میں کسی مصنف یا شاعر کو نہیں دی گئی ہے۔ انعامی مقابلے اکثر مختلف موضوعات پر مختلف محکموں کی طرف سے منعقد ہوتے ہیں مگر اُردو کو کبھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ اس سال مدھیہ پردیش شاسن ساہتیہ اکیڈمی نے اُردو کے ایک شعری مجموعہ پر غالب انعام اور نثری تصنیف پر امیر خسرو انعام دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ ریاستی سرکار نے آج تک کسی اُردو قلم کار کو اعزاز کا مستحق نہیں سمجھا۔

سرکاری دفاتر میں اُردو

کسی محکمہ میں جزوی یا کلّی طور پر اُردو کا کام نہیں ہوتا ہے۔ البتہ مدھیہ پردیش سرکار ایم۔ پی وقف بورڈ اور مساجد کمیٹی کی مالی اعانت کرتی اور گرانٹ دیتی ہے۔ ان میں سارا کام اُردو میں ہوتا ہے محکمہ اطلاعات عامہ اُردو اخبارات کو ایک محدود پیمانے پر صرف خبریں اُردو میں فراہم کرتا ہے اور یہ بندوبست بھی گذشتہ سال سے ہوا ہے۔

اُردو کی ترویج و اشاعت کیلئے تجاویز

مدھیہ پردیش کی سب سے اہم ضرورت یو۔ پی اور بہار کی طرز پر اُردو اکیڈمی کا قیام ہے تاکہ وہ اُردو کے مسائل پر اُردو والوں اور سرکار کے درمیان رابطے کا کام دے سکے۔ اُردو والے مدھیہ پردیش کی سب سے اہم لسانی اقلیت ہیں۔ ان کو نظر انداز کرنا غیر جمہوری عمل ہوگا۔ ضرورت ہے کہ ہر عوامی رابطے کے ادارے میں ان کو نمائندگی دی جائے۔ اُردو والوں کو بہت سی بجا شکایتیں ہیں۔ ان میں سے کچھ حال ہی میں دور بھی ہوئی ہیں۔ موجودہ سرکار کا رویہ اُردو کے ساتھ ہمدردانہ ہے۔ لیکن بہت سے اہم مطالبات ابھی تک جوں کے توں ہیں صوبائی شاسن ساہتیہ پریشد کی تنگ و تاز میں اُردو کو شامل کرنا اور اردو کتب پر ۲۔ انعامات کا اعلان خوش آیند ہیں۔ مگر پریشد کے دائرہ عمل کو مزید بڑھانے اور مختلف کمیٹیوں میں اُردو کو مناسب نمائندگی کے بغیر یہ ادھورا ہے۔ محکمۂ اطلاعات سے اُردو میں صرف تھوڑی بہت خبریں فراہم کرنا ہی کافی نہیں ہے ضرورت ہے کہ ایک باقاعدہ اُردو شعبہ ہو اور یو۔ پی، مغربی بنگال، کشمیر، بہار کی طرح صوبائی محکمۂ اطلاعاتِ عامّہ اُردو میں ماہنامہ بھی شائع کرے۔ اس کے علاوہ مدھیہ پردیش کے وہ شہر جن میں معقول تعداد میں اُردو کی لسانی اقلیت بستی ہے اور جن کی نشان دہی اس جائزہ میں کی جا چکی ہے ان میں اُردو والے جن جائز سہولتوں سے محروم ہیں انہیں ان کا حق ملے۔ سرکاری اعلانات و اشتہارات اُردو میں شائع کرنا، بورڈوں کا اُردو میں لگانا، درخواستوں کا مختلف محکموں میں اُردو میں قبول کرنا اور اُردو میں جواب دینا، عدالتوں میں اُردو والوں کو کوئی تکلیف نہ ہونے دینا، اِن امور پر صوبائی سرکار کا غور کرنا ضروری ہے۔

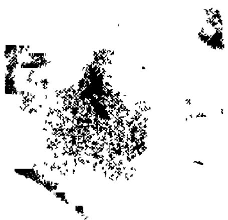
تعلیمی طور پر یہ ضروری ہے کہ مدھیہ پردیش میں اُردو کی اعلیٰ تعلیم و تحقیق کا ایک مرکز قائم کیا جائے تاکہ یہ مجوزہ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کا معقول نعم البدل بن سکے۔ بھوپال اس کے لئے مناسب ترین مقام ہے۔ مدھیہ پردیش کے مختلف ہائر سیکنڈری اسکولوں میں ۵ ہزار سے زیادہ لیکچررز ہیں۔ لیکن تقریباً سو ۱۰۰، اسکولوں میں اُردو کی تعلیم کا بندوبست ہونے کے باوجود ایڈہاک ٹیچرز سے کام چلانا اور اُردو کا ایک بھی لیکچرر نہ ہونا ناقابل فہم ہے۔ سات آسامیوں کا اشتہار سمندر سے پیاسے کو شبنم ملنے کے مترادف ہے، یہ تعداد کم از کم ۵۰ ہونا چاہیئے۔ سہ لسانی فارمولا جس میں مادری زبان کی تعلیم لازمی ہو بورڈ کے نصاب کے لئے ضروری ہے اس طرف نگراں کمیٹی کی بھی توجہ مبذول کرائی گئی۔ اُردو کی نصابی کتب کی اشاعت کی ذمہ داری ٹیکسٹ بک کمیٹی کو قبول کرنا چاہیئے لائبریریوں میں اُردو کتب کی خریداری کے لئے گرانٹ میں اضافہ کیا جائے۔

اُردو اخبارات میں کام کرنے والے صحافیوں کو ممکنہ سہولتوں کا فراہم کرنا۔ اشتہارات کے سلسلے میں رواداری کی پالیسی اپنانا اور ان کے ساتھ کسی بھید بھاؤ کی پالیسی پر عمل نہ کرنا ضروری ہے۔

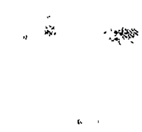
مدھیہ پردیش کے بعض شہر، جن میں خصوصیت کے ساتھ بھوپال قابل ذکر ہے، اُردو کے ایک مرکز کی حیثیت سے اس لئے بھی کو جلا دے نیز یہ کہ یہاں اُردو کی لسانی اقلیت بھی قومی ترقی اور صوبائی فلاح کے کاموں کے لئے ایک اہم اکائی ہے۔ ضرورت صرف اتنی ہے کہ اُس کی اس اہمیت کو تسلیم کیا جائے اور ہر پھول کو کھلنے دو کے اصول کا اطلاق اُردو پر بھی کیا جائے تاکہ ملک کی یہ اہم زبان اور اس زبان کے فدائی ملک و قوم کی ترقی میں اپنا مقدور بھر حصّہ ادا کر سکیں!

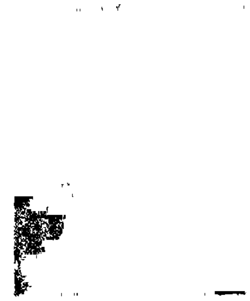
●●


دستکاری
کا
ہر نمونہ
بے مثال
اور انمول
دستکاری
کی
اشیاء
خریدیں
dave 72/166


اقبال متین


کنول پرشاد کنول


شاذ تمکنت


نریندر لوتھر


آمنہ ابوالحسن


جیلانی بانو


واجدہ تبسم


وقار خلیل


زینت ساجدہ


سلمان خمار


رؤف خلش


رؤف خیر

آندھرا پردیش میں اردو


اختر حسن

دکن دیس میں اُردو زبان و ادب کی تاریخ تقریباً چار سو برس کی تاریخ ہے۔ دکن کی قطب شاہی سلطنت کے پانچویں فرماں روا محمد قلی قطب شاہ کے دور میں دکنی اُردو نے پہلی مرتبہ شعر و ادب کی شاہراہ پر قدم رکھا اور ایک صدی کے اندر اندر ہندوستان کی یہ نومولود قومی زبان ایک مستند اور معتبر زبان بن گئی۔ محمد قلی شہر حیدرآباد کا معمارِ اول اور اُردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر تھا۔ محمد قلی کے درباری شاعر اور قطب شاہی سلطنت کے ملک الشعراء اسد اللہ وجہی نے دکنی اُردو میں پہلی عشقیہ مثنوی "قطب مشتری" لکھی اور پھر عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں "سب رس" لکھ کر حیدرآباد میں اُردو کی ادبی نثر کا سنگِ بنیاد رکھا۔ محمد قلی قطب شاہ کے بعد سلطان محمد قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن قطب شاہ نے بھی اُردو زبان و ادب کی روایت کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ اُسے اور پائیدار بنایا۔ قطب شاہی سلطنت کے سقوط کے بعد جب دکن دیس مغلوں کے زیرنگیں آگیا تو اس منزل تک پہنچتے پہنچتے اُردو کی آواز میں اتنی طاقت و تاثیر پیدا ہو چکی تھی کہ ولی کی شاعری، دکن کی سرحدیں پار کر کے، دہلی کے ایوانِ سخن میں اپنا جادو جگا رہی تھی۔

ایک مختصر سے وقفے کے بعد، آصف جاہی دور میں حیدرآباد پھر ایک مرتبہ پورے ہندوستان کے اہلِ اُردو کا مرکزِ نظر بن گیا۔ آصف جاہ سابع میر عثمان علی خاں کے دور میں پہلی مرتبہ ہندوستان کی ایک قومی زبان کو جامعاتی سطح تک ذریعۂ تعلیم بنایا گیا۔ ۱۹۱۹ء میں عثمانیہ یونی ورسٹی صورت پذیر ہوئی اور ساتھ ہی بہت بڑے پیمانے پر، ایک دارالترجمہ قائم کیا گیا۔ اور مختلف علوم و فنون کو انگریزی اور دوسری زبانوں سے اُردو میں منتقل کرنے کے لیے منتخب روزگار عالموں اور دانشوروں کی خدمات حاصل کی گئیں۔

اُردو زبان بولنے والوں کی تعداد

۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے بموجب آندھرا پردیش کی آبادی ۱۳۲,۹۸,۷۶,۳ نفوس پر مشتمل تھی جس میں اُردو مادری زبان والوں کی تعداد ۳۵,۰۳,۷۵,۲۵ تھی۔ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق آندھرا پردیش کی آبادی کا نقشہ یوں تھا: کل آبادی ۷,۶۹,۰۷,۴۷,۴۳ اُردو مادری زبان والوں کی آبادی ۳۳ لاکھ قرار پائی ہے۔ ایک سرسری اندازے کے مطابق آندھرا پردیش میں ایسے افراد کی تعداد جن کی مادری زبان اُردو نہیں ہے لیکن جو اُردو جانتے اور بولتے ہیں، تین لاکھ سے زائد ہے۔ ان میں سے کوئی دس فی صد اُردو نوشت و خواند سے بھی واقف ہیں۔ آندھرا پردیش میں بحیثیت مجموعی اُردو مادری زبان والوں کا تناسب ۸ فی صد ہے [ریاست حیدرآباد میں یہ تناسب ۱۲ فی صد تھا] آندھرا پردیش کی ریاست ۲۱ اضلاع پر مشتمل ہے جن میں سے دس اضلاع میں اُردو مادری زبان والوں کا تناسب ۱۱ تا ۱۵ فی صد اور حیدرآباد میں ۳۰ فی صد ہے۔

تعلیمی سہولتیں

سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۷۱ء میں ریاست آندھرا پردیش میں اُردو ذریعہ تعلیم کے ۲۵۰۹ پرائمری اسکول قائم تھے جن میں طلبا اور اساتذہ کی تعداد علی الترتیب ۲۴۶,۴۶,۱,۰۱ اور ۵۲۴۴ تھی اور ثانوی اسکولوں کی تعداد ۱۵۲ اور ان میں طلبا اور اساتذہ کی تعداد علی الترتیب ۴۹,۴۴۹ اور ۲,۱۶۲ تھی۔ چنانچہ پچھلے تین سال کے اندر سرکاری اور نجی کالجوں کو ملا کر اُردو میڈیم کے ۲۲ کالج عالمِ وجود میں آچکے ہیں جن میں اُردو کے ذریعہ تعلیم پانے والے طلبا کی تعداد پانچ ہزار سے متجاوز ہو گئی ہے۔ بعض کالجوں میں اُردو میں سائنس کی تعلیم کا بھی انتظام ہے۔ اسی دوران میں اُردو میڈیم کے چند کالجوں نے ڈگری کورس کا بھی آغاز کر دیا ہے۔ ان سمیت آندھرا پردیش میں ۱۵ کالج ایسے ہیں جہاں اُردو کی تعلیم کا انتظام موجود ہے ان کے علاوہ عثمانیہ یونی ورسٹی میں ایم اے کی سطح تک اردو بحیثیت ایک مضمون پڑھائی جاتی ہے سوال یہ ہے کہ اُردو میڈیم سے ڈگری کورس کی تکمیل کے بعد اگر طلبہ کی ایک معقول تعداد، جامعاتی سطح پر بھی اُردو میں تعلیم رکھنا چاہے تو ان کی اس خواہش کو کسی طرح پورا کیا جائے گا۔ کیا ایسی صورت میں ایک اُردو یونی ورسٹی کا قیام ناگزیر نہیں بن جائے گا؟

اُردو اخبارات و رسائل

:- آندھرا پردیش کی تشکیل کے بعد اُردو کے جو پرانے اور نئے روزنامے اپنی زندگی کو برقرار رکھ سکے اُن میں "سیاست"، "رہنمائے دکن" اور "ملاپ" قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ دو اور روزنامے "انگارے" اور "منصفِ دکن" بھی نکلتے ہیں۔ روزنامہ "پیام" جسے ۱۹۳۴ء میں اُردو کے مشہور صحافی اور ادیب قاضی عبدالغفار نے حیدرآباد سے جاری کیا تھا اور جس نے حیدرآباد کی صحافت کی تاریخ میں قوم پرستی اور ترقی پسندی کی روایت کو فروغ دینے میں قابلِ قدر حصہ ادا کیا تھا، ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۷ء تک اختر حسن کی ادارت میں، کچھ درمیانی وقفوں اور جھٹکوں کے باوجود، حیدرآباد کے واحد ترقی پسند اور بائیں بازو کے اخبار کی حیثیت سے اپنی زندگی کو برقرار رکھ سکا۔

۱۵ اگست ۱۹۴۹ء سے میر عابد علی خاں کی ادارت میں حیدرآباد

سے اردو کا ایک نیا روزنامہ "سیاست" جاری ہوا جو کسی وقفے کے بغیر آج تک نکل رہا ہے۔ ۱۹۵۱ء میں اس کی تعدادِ اشاعت صرف ۹۰۰ تھی اور آج کوئی گیارہ ہزار ہے۔ روزِ آغاز سے اس کے جوائنٹ ایڈیٹر محبوب حسین جگر ہیں۔

حیدرآباد کے موجودہ اردو روزناموں میں "رہنمائے دکن" سب سے زیادہ چھپتا ہے۔ ۱۹۷۱ء میں اس کی تعدادِ اشاعت بارہ ہزار تک پہنچ گئی۔ آج بھی کم و بیش اتنا ہی چھپتا ہے۔

دہلی اور جالندھر سے ایک ساتھ نکلنے والا روزنامہ "ملاپ" ۱۷ نومبر ۱۹۴۹ء سے یدھ دیر کی ادارت میں حیدرآباد سے بھی نکل رہا ہے۔ اس کی اشاعت لگ بھگ آٹھ ہزار ہے۔

مذکورہ صدر تینوں روزنامے آفسیٹ پر چھپتے ہیں۔ ان کے علاوہ رجسٹرار آف نیوز پیپرز فار انڈیا کی رپورٹ (۱۹۷۱ء) کے مطابق اندھرا پردیش سے سات اور چھوٹے بڑے روزنامے شائع ہوتے ہیں۔ مذکورہ رپورٹ کے مطابق اس ریاست سے ۴۹ ہفتہ وار، ۱۶ پندرہ روزہ اخبار، ۲۶ ماہانہ، ایک ڈیڑھ ماہی اور دو سہ ماہی رسالے شائع ہوتے ہیں۔ ہفتہ وار پرچوں میں "نیا آدم" اور "برگِ آوارہ" قابلِ ذکر ہیں۔ "نیا آدم" کمیونسٹ پارٹی کا ترجمان ہے۔ اور اس کے ایڈیٹر امجد باغی ہیں۔

حیدرآباد کے مشہور شاعر خورشید احمد جامی کی یاد میں اُن کے شاگرد عزیز محمود خاور نے یکم جولائی ۱۹۷۰ء سے "برگِ آوارہ" (پندرہ روزہ) جاری کیا اور یکم جنوری ۱۹۷۱ء سے اُسے ہفتہ وار بنا دیا۔ اس کی سرِ اشاعت میں حیدرآباد کے ایک شہرت یافتہ آرٹسٹ سعید بن محمد نقش کا ایک فیچر شریک رہتا ہے سعید بن محمد کسی شاعر یا ادیب کے دستخط کو تصویری شکل میں پیش کرتے ہیں اور اپنی حسن کاری میں اس بات کا خاص لحاظ رکھتے ہیں کہ متعلقہ شاعر یا ادیب کی شخصیت کا نقش بھی اس تصویری دستخط میں ابھر آئے۔

حیدرآباد سے اردو کے جو ادبی رسائل نکلتے ہیں اُن میں سب سے "شگوفہ" "آندھرا پردیش" اور "شعر و حکمت" بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ سلیمان اریب کی ادارت میں نکلنے والا ماہنامہ "صبا" اردو کا ایک معیاری ادبی پرچہ تھا اور ۱۹۵۵ء سے نکل رہا تھا۔ اریب کے انتقال کے بعد "صبا" کے صرف دو شمارے صفیہ اریب کی ادارت میں شائع ہوئے تب سے اس کی اشاعت التوا میں پڑی ہے۔ کوئی بارہ سال قبل اعظم راہی نے ماہنامہ "پیکر" جاری کیا تھا۔ گزشتہ چند ماہ سے اس کی زندگی کا چراغ بھی ٹمٹما رہا ہے۔ ناصر کرنولی کی ادارت میں نکلنے والے ماہنامہ "پونم" کا بھی یہی حال ہے۔ "زندہ دلانِ حیدرآباد" کا دو ماہی رسالہ "شگوفہ" مصطفیٰ کمال کی ادارت میں پچھلے چار سال سے پابندی کے ساتھ نکل رہا ہے۔ "شگوفہ" میں صرف مزاحیہ اور طنزیہ مضامین نظم و نثر میں شائع ہوتے ہیں۔

"شعر و حکمت" ایک سہ ماہی رسالہ ہے جو ۱۹۷۰ء سے اختر جہاں کی ادارت میں نکل رہا ہے۔ اس کے ترتیب کار شہریار (علی گڑھ) اور مغنی تبسم (حیدرآباد) ہیں۔ "شعر و حکمت" کا ن۔م۔ راشد نمبر خاصے کی چیز تھا۔

ان رسالوں کے علاوہ حیدرآباد سے اور بھی کئی رسالے نکلتے ہیں۔ جیسے "ہندوستانی ادب" "خاتونِ دکن" وغیرہ۔ حال ہی میں آرمور سے ایک ماہنامہ "معمار" نکلنا شروع ہوا ہے۔ اس کے مدیر ہیں لئے آر جاوید۔

علمی ادبی سرگرمیاں:- اردو کے پرانے اور نئے لکھنے والوں کی مجموعی تعداد کا تعین تو ممکن نہیں۔ لیکن ایک سرسری اندازے کے مطابق، اطمینان سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ آندھرا پردیش میں اردو کے شاعروں، افسانہ نگاروں، نقادوں اور تحقیقی کام کرنے والوں کی آبادی کسی عنوان، ایک ہزار سے کم نہ ہوگی جن میں سے اگر اچھے اہلِ قلم کا انتخاب کیا جائے تو ان کی تعداد بھی یقیناً ایک سو سے تجاوز ہو جائے گی۔ نیچے ہم کسی ترتیب کے بغیر اردو کے قلم کاروں کی ایک مختصر سی فہرست پیش کرتے ہیں۔ بعض ناموں کا چھوٹ جانا ایک قدرتی عمل ہوگا جس کی آئندہ تلافی ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، ڈاکٹر رضیہ اکبر، ڈاکٹر رشیدہ موسوی، ڈاکٹر مغنی تبسم، ڈاکٹر حفیظ قتیل، ڈاکٹر زینت ساجدہ، عالم خوندمیری، اکبرالدین صدیقی، مبارزالدین رفعت، حسینی شاہد، میر حسن، اشفاق حسین، حسن عسکری، ڈاکٹر انور معظم، جیلانی بانو، اقبال متین، عاشق شاہ، شاذ تمکنت، حیرت بدایونی، فضل الرحمٰن، ڈاکٹر جعفر حسن، غلام ربانی، آغا حیدر حسن، ہارون خاں شیروانی، حسن الدین، منجو قمر، عظمت عبدالقیوم، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، عزیز قریشی، بھارت چند کھنہ، قمر پلی بھیتی، شمس الدین تاباں، مرزا اس لاموذ، عابد علی خاں، غلام عمر خاں، ابوالخیر صہبا، کنول پرشاد کنول، نریندر لوتھر، محبوب نارائن گوڑ، احسن علی مرزا، راشد آذر، منوہر لعل بہار، ابن احمد تاب، سید مظفرالدین صاحب، گرو چرن داس سکینہ، ڈاکٹر وحید اختر، عزیز قیسی، سکندر علی وجد، متین سروش، پروفیسر سید محمد، سعید شہیدی، علی احمد جلیلی، محمد منظور احمد، رگھو بیندر راؤ

بذب، ڈاکٹر آر۔ طاہر قریشی، اظہر افسر، علی محمد خسرو، صلاح الدین نیر، خیرات ندیم، فیض الحسن خیال، اوج یعقوبی، وقار خلیل، خواجہ عبدالغفور، ڈاکٹر غیاث صدیقی، راز عابدی، عفت موہانی، نجمہ نکہت، عوض سعید، سعادت نظیر، شفیق فاطمہ شعریٰ، ناصر کرنولی، آمنہ ابوالحسن، اکرام جاوید، برق موسوی، احمد اللہ قادری، رئیس اختر، خواجہ شوق، دادا بھائی کاؤس جی، محبوب حسین جگر، مرزا شکور بیگ، سلیم اللہ، عقیل ہاشمی۔

مجتبیٰ حسین، برق آشیانوی، مسیح انجم، گرد بڑ حیدرآبادی، یوسف ناظم، پرویز یداللہ، نقی علی خاں ثاقب، تاج مہجور، حکیم یوسف حسین خاں، گیان سنگھ شاطر، عزیز النساء صبا، اعظم راہی، اسلم عمادی، سعید بن محمد نقش، رؤف خلش، رؤف خیر، حسن فرخ، نکری بدایونی، محمود خاور، صفدر حسن۔ ابراہیم شفیق، انور رشید، عیاث متین۔ اکمل حیدرآبادی، مصحف اقبال توصیفی، علی الدین نوید، علی ظہیر، باذل عباسی، عبدالحلیم علی، بشارت علی بشارت، یوسف کمال، مقصود جاوید، قطب سرشار، محسن جلگانوی، برق یوسفی، ساجد اعظم، ولی تنویر، ہادیہ شبنم، رفیق جعفر، رحمٰن جامی، شفیع اقبال، جہاں دار افسر، عبدالمنان، عبدالحنان جاوید، قیصر سرمست، حفیظ الدین۔ ثریا حبیبی، راجہ لال راجہ، اسحٰق ملک، یوسف ندیم، ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، ڈاکٹر رضی الدین احمد۔

ادبی سرگرمیاں

ادبی کانفرنسوں، مذاکروں اور مشاعروں کا چلن حیدرآباد میں بالخصوص عام ہے۔ ادبی ٹرسٹ کے کل ہند مشاعرے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں ہندستان بھر سے اُردو کے ممتاز شاعر شریک ہوتے ہیں گزشتہ عرصہ میں منعقد ایک سہ روزہ مذاکرہ اور مشاعرہ بھی خاص طور پر ذکر کے لائق ہے اس مذاکرے کا اہتمام ماہنامہ "پیکر" کے مدیر اعظم راہی نے اپنے بعض رفیقوں کی معاونت سے کیا تھا اس میں مقامی شعراء اور ادبار کے علاوہ بیرونجات کے شاعروں اور ادیبوں کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ مختلف ادبی انجمنیں باقاعدگی کے ساتھ شعر و ادب کی محفلیں برپا کرتی ہیں جن کی بدولت مقامی دنیا کے ادب میں ایک گہما گہمی سی رہتی ہے۔

اگر شائع ہونے والی کتابوں کو ادبی سرگرمیوں کا معیار اور اُن کی پہچان قرار دیدیا جائے تو میرا خیال ہے کہ آندھرا پردیش دوسری سبھی ریاستوں سے بازی لے جائے گا۔ اس لئے کہ یہ ایسے ممتاز ادیبوں شاعروں، اور افسانہ نگاروں کا مرکز ہے جو تخلیق و تحقیق میں سرگرمِ کار ہیں۔ جن کی تخلیقات برابر منظرِ عام پر آتی رہتی ہیں۔ پچھلے پندرہ سولہ سال کے دوران، ایک سرسری اندازے کے مطابق حیدرآباد سے اُردو کی کوئی پانچ سو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ گزشتہ چار پانچ سال سے اُردو کتابوں کی اشاعتی رفتار کچھ اور بھی تیز ہو گئی ہے۔ انجمن ترقی اُردو، ادارہ ادبیاتِ اُردو، شالیمار پبلی کیشنز، نیشنل بکڈپو، زندہ دلانِ حیدرآباد، مکتبۂ شعر و حکمت، ادبی ٹرسٹ، ولا اکیڈمی، ابوالکلام آزاد اورنٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور ادارہ مصنفین نو، یہاں کے فعّال اشاعتی ادارے ہیں۔

انجمن ترقی اُردو نے کوئی ایک درجن کتابیں شائع کیں۔ جن میں سے "چراغِ منزل" — شاہد صدیقی کا شعری مجموعہ، "پاس گریباں" — سلیمان اریب کا شعری مجموعہ، "رخسارِ سحر" — خورشید احمد جامی کا شعری مجموعہ، "تلگو اُردو لغت" اور "اُردو تلگو لغت" خصوصی طور پر ذکر کے قابل ہیں۔

ادارۂ ادبیاتِ اُردو نے اپنے روزِ آغاز سے اب تک اُردو کی تین سو سے زیادہ کتابیں شائع کی ہیں۔

شالیمار پبلی کیشنز ۱۹۷۱ء سے اُردو کی کتابیں چھاپ رہا ہے پچھلے تین سال کے اندر اس نئے اشاعتی ادارے نے ایک درجن سے زیادہ کتابیں شائع کی ہیں۔ شالیمار پبلی کیشنز نے حال ہی میں بہ اشتراک انڈین لینگویجز فورم ششیندر شرما کی ۲۰ تلگو نظموں کا ترجمہ، انگریزی، اُردو اور ہندی میں شائع کیا ہے۔ ششیندر شرما تلگو کے عصری ادب میں ایک بلند مرتبت شاعر اور نقاد کی حیثیت کے حامل ہیں۔

نیشنل بکڈپو نے گزشتہ دس سال کے دوران میں بعض بہت اچھی اور معیاری کتابیں شائع کی ہیں۔ اُن میں سے "تکلف برطرف" "قطع کلام" اور "قصہ مختصر" (مجتبیٰ حسین کے مضامین کے مجموعے۔) "تراشیدہ" (شاذ تمکنت)، "فانی بدایونی — حیات اور شاعری" (ڈاکٹر مغنی تبسم)، "سائے کا سفر" (عوض سعید) "سیاہ، سرخ اور سفید" (آمنہ ابوالحسن) "گلِ تر" (مخدوم محی الدین) "زباں اور علم زباں" — (عبدالقادر سروری) "رشید احمد صدیقی — شخصیت اور فن" (سلیمان اطہر جاوید) قابلِ ذکر ہیں۔

"زندہ دلانِ حیدرآباد" نے اپنے اشاعتی پروگرام کے تحت سب سے پہلے حیدرآباد کے ایک پُرانے مزاحیہ شاعر علی صاحب میاں کا مجموعۂ کلام "گھوکرو کے کانٹے" شائع کیا۔ ۱۹۶۷ء کے بعد سے اب تک یہ ادارہ کئی اچھی مزاحیہ کتابیں شائع کر چکا ہے۔ "یہ ایک تبسم" (برق آشیانوی) "تیرِ نیم کش" (بھارت چند کھنہ) "مزاحِ شریف" (رشید قریشی)

خصوصی اہمیت رکھتی ہیں۔

• مکتبۂ شعر و حکمت" حیدرآباد کا ایک نیا اشاعتی ادارہ ہے جس نے گزشتہ تین سال کے اندر چار کتابیں شائع کی ہیں۔

" ادبی ٹرسٹ " نے ۱۹۶۹ء سے اپنا اشاعتی پروگرام شروع کیا۔ اب تک یہ ادارہ پانچ کتابیں شائع کر چکا ہے۔

" ابوالکلام آزاد اورنٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" نے گزشتہ دس سال میں کوئی سولہ (۱۶) معیاری کتابیں شائع کی ہیں۔

گزشتہ آٹھ دس سال کے دوران میں آندھرا پردیش کی جامعات یا خود مصنف نے اپنے طور پر بھی کچھ کتابیں شائع کی ہیں خلاً سری وینکٹیشور یونیورسٹی (تروپتی) کے صدر شعبۂ عربی، فارسی و اردو ڈاکٹر رضی الدین احمد کی ضخیم تصنیف " نقدِ ابوالکلام" یونی ورسٹی کے رجسٹرار کی جانب سے شائع ہوئی ہے۔ حیدرآباد کے ایک صاحب طرز انشا پرداز اور ہند کے سابق سفیر ایران سعادت علی خاں کے نجی خطوط کا مجموعہ " ذکرِ یار" کے نام سے غلام عمر خاں نے اپنے سیر حاصل مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ یہ مجموعہ مکاتیب اپنے شگفتہ اندازِ بیان اور منفرد لب و لہجہ کی وجہ سے بے حد مقبول ہوا ہے۔

اَدبی انجمنیں :- پچھلے چند سال کے اندر حیدرآباد میں اُردو کی جتنی نئی انجمنوں کا قیام عمل میں آیا ہے۔ ان میں کم سے کم ایک درجن انجمنیں ایسی ضرور ہیں جو مختلف حیثیتوں سے بے حد مصروف، متحرک اور سرگرم عمل ہیں۔ سردست یہاں چند بڑی انجمنوں اور اداروں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

انجمن ترقیٔ اُردو :- کُل ہند انجمن ترقیٔ اُردو کی ریاستی شاخ کی حیثیت سے انجمن ترقیٔ اُردو حیدرآباد نے ۱۹۵۰ء سے دوبارہ اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ آندھرا پردیش کے ۲۱ اضلاع میں سے ۱۹ اضلاع میں اس کی ۵۰ شاخیں قائم ہیں۔ انجمن کا نواں سالانہ اجلاس مارچ ۱۹۷۳ء میں نظام آباد میں منعقد ہوا۔ اس کے ارکان کی تعداد حیاتی ارکان سمیت ۱۰۵ ہے۔ حبیب الرحمٰن صاحب اس کے معتمدِ عمومی، سری نواس لاہوٹی معتمد انتظامی اور میر احمد علی خاں صدر ہیں۔ اُردو کے قانونی موقف، نظم ونسق میں اُردو کے جائز مقام اور ابتدائی سے کر جامعاتی سطح تک اُردو میں تعلیم کے انتظام کے لئے یہ انجمن مفید اور نتیجہ خیز خدمات انجام دے رہی ہے۔

انجمن نے " اُردو ہال " کے نام سے ایک ثقافتی مرکز کھول رکھا ہے اس کی تعمیر اور فرنیچر پر اب تک ڈیڑھ لاکھ روپیہ صرف ہو چکا ہے۔ " انجمن ترقیٔ اُردو " نے " ایک " اورنٹیل اُردو کالج " کی بنیاد ڈالی اور ۱۹۵۶ء میں عثمانیہ یونی ورسٹی کی منظوری سے اس کالج میں انٹرنس اور ڈپ۔ او۔ ایل کی جماعتیں شروع کی گئیں۔ گزشتہ سال سے ایم۔ او۔ ایل کی جماعتیں بھی کھل گئی ہیں۔ محکمۂ تعلیمات میں اساتذہ کے تقرر کے لئے ان امتحانات کو انٹرمیڈیٹ، بی اے اور ایم اے کے مماثل قرار دیا گیا ہے۔ ریاستی پبلک سروس کمیشن نے بھی سرکاری دفتروں میں تقرر کے لئے ان امتحانات کو تسلیم کر لیا ہے

انجمن ترقیٔ اُردو اور اُردو ہال ٹرسٹ نے جولائی ۱۹۶۲ میں " اُردو آرٹس کالج " کی بنیاد رکھی۔ عثمانیہ یونی ورسٹی سے اُردو کے اخراج کے بعد، پہلی مرتبہ، کالج کی سطح تک اُردو کے ذریعہ تعلیم و تدریس کا یہ انتظام شگون نیک ثابت ہوا۔ ۱۹۷۲ء سے اس کالج میں کامرس کا شعبہ بھی کھول دیا گیا ہے۔

اُردو کے مشہور ادیب فرحت اللہ بیگ نے " اُردو مجلس " کے نام سے اُردو کی ایک ادبی انجمن قائم کی تھی، انجمن ترقیٔ اُردو نے اس پرانی انجمن کو زندہ کیا اور اس میں ایک نئی رُوح دوڑا دی۔

انجمن تحفظِ اُردو آندھرا پردیش :- ضلع پریشدوں اور پنچایت سمیتیوں کے تحت کام کرنے والے مدرسوں میں اُردو جماعتوں کے قیام کی جد و جہد میں انجمن تحفظِ اُردو نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ یہ انجمن ۱۹۶۲ء سے کام کر رہی ہے۔ اس کے موجودہ صدر ایم۔ باگا ریڈی ایم ایل اے اور معتمد چندر سری واستوا ہیں۔ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۵ء تک اس انجمن کا ترجمان پرچہ " قومی زبان " بھی نکلتا رہا۔ اس نے اُردو کتابوں کا اشاعتی پروگرام بھی شروع کیا اور کئی کتابیں چھاپیں جن میں داؤد اشرف کی لکھی ہوئی کتاب " مخدوم۔ ایک مطالعہ" بھی شامل ہے۔

مجلسِ عمل طلبہ برائے اُردو :- حیدرآباد کے طلبا نے جن میں دونوں فرقوں اور اردو و تلگو دونوں زبانوں کے طالب علم شامل تھے۔ اُردو میڈیم کے جونیر کالج قائم کرنے کا مطالبہ کرتے ہوئے " مجلسِ عمل طلبہ برائے اُردو " کے پلیٹ فارم سے اپنی آواز بلند کی اور اس خاص مقصد کے لئے ایک اڈہاک کمیٹی بنائی جس کے کنوینر کے۔ ایم عارف الدین اور عزیز پاشا اور مسٹر چندر سری واستوا تھے۔ اس کمیٹی کی جانب سے بہت بڑے پیمانے پر ریاست گیر مہم چلائی گئی۔ اُردو میڈیم کے جونیر کالجوں کے قیام میں طلبا کی اس متحدہ مہم کا بھی بہت بڑا دخل ہے۔ جونیر کالجوں کی تعلیم ختم کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کی سطح پر اُردو میڈیم اختیار کرنے والے طلبہ کے لئے اُردو میڈیم کے ڈگری کالجوں کے قیام کی تحریک بھی طلبہ برادری نے شروع کر دی اور اس کے لئے بھی ایک اڈہاک

کیٹی بنائی گئی ہے جس کے کنوینر نصرت محی الدین اور ولی تنویر ہیں۔

اِدارۂ ادبیاتِ اُردو:- اُردو کے مشہور محقق اور انشا پرداز ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے ۱۹۳۱ء میں ادارۂ ادبیاتِ اُردو کی بنیاد رکھی تھی۔ ادارے کی عمارت کا نام "ایوانِ اُردو" ہے۔ ۱۹۴۰ء میں ادارے کی جانب سے اُردو دانی، اُردو زبان دانی، اُردو عالم، اُردو فاضل اور خوشنویسی کے امتحانات کا سلسلہ شروع کیا گیا جو اب تک جاری ہے۔ عثمانیہ یونی ورسٹی نے اُردو عالم اور اُردو فاضل کے امتحانات کو علی الترتیب انٹرمنس اور ڈپ او۔ ایل کے مماثل تسلیم کر لیا۔

اَدبی ٹرسٹ:- نواب مہدی نواز جنگ کی تحریک پر "ادبی ٹرسٹ" کے قیام کا فیصلہ کیا گیا۔ چند سال کے اندر ادبی ٹرسٹ کا سرمایہ ایک لاکھ روپے سے متجاوز ہو گیا۔ ادبی ٹرسٹ کے اغراض و مقاصد یہ ہیں۔ (۱) اعلیٰ معیاری کتابوں کی فروخت (۲) اچھی کتابوں کی اشاعت (۳) اُردو کے ضرورت مند ادیبوں اور شاعروں کی مالی اعانت۔

ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ مولانا ابوالکلام آزاد کی یاد میں ۱۹۵۹ء میں ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے بانیوں میں ڈاکٹر ذاکر حسین، نواب مہدی نواز جنگ اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور جیسی شخصیتیں شامل تھیں۔ اب تک یہ انسٹی ٹیوٹ ۱۲ معیاری کتابیں شائع کر چکا ہے۔ حال ہی میں اس ادارے نے دو اہم پروجیکٹ شروع کئے ہیں۔ (۱) تاریخ دکن ۱۷۲۴ – ۱۷۴۸ء قلمبند کرنے کا پروجکٹ جس کے ایڈیٹر اِن چیف نواب علی یاور جنگ ہیں اور (۲) اُردو انسائیکلو پیڈیا تیار کرنے کا پروجکٹ، جس کے ایڈیٹر اِن چیف فضل الرحمن صاحب ہیں۔

زندہ دلانِ حیدرآباد:- فائن آرٹس اکیڈمی حیدرآباد کے ایک شعبے کی حیثیت سے ۱۹۶۲ء میں "زندہ دلانِ حیدرآباد" کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۹۶۶ء میں اس نے کرشن چندر کے زیرِ صدارت اُردو کے مزاح نگاروں کی ایک کل ہند کانفرنس منعقد کی۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کے زیرِ اہتمام، ہر سال ایک کل ہند مزاحیہ مشاعرہ بھی حیدرآباد میں منعقد ہوتا ہے۔ جس کی آمدنی سے اس ادارہ نے اپنا مالیہ بھی مستحکم کر لیا ہے اور گزشتہ دو تین سال سے طنز و مزاح نگاروں کی کتابوں کو چھپوانے کا پروگرام بھی شروع کر دیا ہے۔ اس ادارہ کا ایک ڈیڑھ ماہی رسالہ "شگوفہ" بھی نکلتا ہے۔ "زندہ دلانِ حیدرآباد" کے صدر بھارت چند کھنہ ہیں۔ ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۲ء تک اس کے معتمد مجتبیٰ حسین رہے اور آج کل حمایت اللہ اس کے معتمد ہیں۔

انجمن ترقی پسند مصنفین حیدرآباد میں ادب کی ترقی پسند تحریک ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۸ء کے اوائل تک پوری آب و تاب کے ساتھ اُردو کے ادبی اُفق پر چھائی رہی لیکن ہندوستان کی آزادی کے بعد حیدرآباد میں اس کا شیرازہ بکھر گیا۔ بعض پُرانے اور نئے اربابِ قلم نے انجمن ترقی پسند مصنفین کو نئے سرے سے منظم کیا۔ تاہم یہ انجمن ایک موثر اور فعال تنظیم نہ بن سکی۔

اِدارۂ مصنفین نو: حیدرآباد کے چند فن کاروں نے ۱۹۶۳ء میں یہ ادارہ قائم کیا جس نے جدید افسانہ نگاروں اور شاعروں کی تخلیقات کے انتخاب پر مشتمل دو مجموعے شائع کئے۔ "نیا کارواں" اور "آبگینے" اور حیدرآباد کی پُرانی نسل لیکن نئی فکر کے شاعر حکیم یوسف حسین خاں کا شعری مجموعہ "خوابِ زلیخا" بھی شائع کیا۔

اہم کتب خانے:- حیدرآباد کا پُرانا "کتب خانۂ آصفیہ" جو اب "اسٹیٹ سنٹرل لائبریری" بن گیا ہے، سب سے بڑا کتب خانہ ہے۔ اس کتب خانے میں دو لاکھ سے زیادہ قلمی اور مطبوعہ کتابیں محفوظ ہیں اور ہر سال کافی تعداد میں نئی کتابیں خریدی جاتی ہیں۔ اس کتب خانے میں اُردو مطبوعات کی تعداد لگ بھگ تیس ہزار ہے اور ۱۳۴۲ اُردو مخطوطات موجود ہیں جن کی توضیحی فہرستیں ۱۹۶۱ء میں نصیر الدین ہاشمی نے مرتب کی تھیں۔ یہ فہرستیں شائع ہو چکی ہیں۔ کتب خانۂ آصفیہ میں اُردو کے پُرانے اخبارات و رسائل کا بھی وافر ذخیرہ محفوظ ہے جو ہنوز ترتیب و تدوین کا محتاج ہے۔

سالار جنگ میوزیم میں ایک شعبہ لائبریری کا بھی ہے جس میں اُردو کے ۵۰۸ قیمتی مخطوطات کے علاوہ تقریباً دس ہزار مطبوعہ کتابیں محفوظ ہیں۔ اُردو مخطوطات کی توضیحی فہرست، نصیر الدین ہاشمی اور شاہد صدیقی نے مرتب کی تھی جو ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔

"ادارۂ ادبیاتِ اُردو" کے کتب خانے میں ۲۵ ہزار مطبوعات اور پانچ ہزار مخطوطات محفوظ ہیں جن کی فہرستیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ یہ کتب خانہ ۱۹۳۸ء میں قائم ہوا تھا۔ اُردو کے بعض قدیم اخبارات اور پرانے رسائل کے فائل اور کوئی سوا سو سال پیشتر کی اہم اُردو مطبوعات اس کتب خانے کی سب سے بڑی دولت ہے۔

بھارت گن وردھک سمیتی، حیدرآباد کا ایک قدیم کتب خانہ ہے۔ جس کی ابتدا ۱۸۱۵ء میں ہوئی تھی۔ رائے محبوب نارائن نے ۱۹۵۵ء

میں اسے دریافت اور منظم کیا اور انہیں کی لگاتار سعی و کاوش کی بدولت یہ کتب خانہ اُردو، فارسی اور دوسری مشرقی زبانوں کی اہم کتابوں کا ایک بڑا مرکز بن گیا۔ اس کی ایک قابلِ ذکر خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں دُنیا کی ۴۲ زبانوں کے ۱۱۰۸۰ لغات کا قیمتی ذخیرہ محفوظ ہے۔ اُردو کے جتنے لغات اب تک لکھے گئے ہیں۔ وہ سب اس کتب خانے میں مل جاتے ہیں۔

انجمن ترقیٔ اُردو آندھرا پردیش کے مرکزی کتب خانے میں بھی جسے ۱۹۵۶ء میں قائم کیا گیا تھا۔ اُردو کی چھ ہزار سے زائد کتابیں محفوظ ہیں۔ دیگر کتب خانے حسب ذیل ہیں۔

اسٹیٹ آرکائیوز لائبریری (جس میں اُردو فارسی کے کوئی چار ہزار مخطوطات اور ۲۵ ہزار مطبوعات محفوظ ہیں۔) کتب خانۂ سعیدیہ، کتب خانۂ جامعہ عثمانیہ، کتب خانۂ خواتین دکن، حیدری گشتی کتب خانہ، لطف الدولہ اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ لائبریری۔

سرکاری امداد:- آندھرا پردیش کی ریاستی سرکار، حیدرآباد کی انجمن ترقیٔ اُردو اور ادارۂ ادبیاتِ اُردو کو برائے نام مالی امداد دیتی ہے۔ چار پانچ ادیبوں کو کتابوں کی اشاعت کے لئے بھی امداد مل چکی ہے۔ نظامتِ تعلیمات سے بعض پُرانے ادیبوں کو وظیفے بھی ملتے ہیں۔ جن میں اسد انصاری، راگھویندر راؤ جذبؔ، حیرت بدایونی اور روحی قادری شامل ہیں۔

کمیٹی ترویج و اشاعت زبانِ اُردو، کو سالانہ دس ہزار روپے کی گرانٹ ملتی ہے۔ اس کمیٹی کی جانب سے اس سال کی بہترین اُردو کی کتاب یا کتابوں کو انعامات دئے جاتے ہیں۔ مرکزی حکومت نے ۷۳-۱۹۷۲ء کے لئے بھی آندھرا پردیش کے بعض علمی اور ادبی اداروں کو اپنی مالی امداد کا سلسلہ جاری رکھا جس کی تفصیل یہ ہے۔ ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بارہ ہزار روپے۔ آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی۔ دکنی اُردو کا لغت چھاپنے کے لئے ۲۷۸۰ روپے۔ ولا اکیڈمی حیدرآباد۔ اُردو کا ذخیرہ نامی کتاب کے لئے تین ہزار روپے۔

ریاستی سرکار کی جانب سے اب تک نہ تو اُردو کی تصنیفات پر انعامات دیئے گئے ہیں۔ نہ مصنفین کو اعزازات سے نوازا گیا ہے اور نہ آندھرا پردیش میں اُردو کی کوئی سرکاری اکیڈمی ہے البتہ حیدرآباد میں آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی اور تلگو اُردو ساہتیہ اکیڈمی کے نام سے دو ایسے ادارے موجود ہیں جنہیں حکومت سے مالی امداد ملتی ہے اور یہ ادارے تلگو کے ساتھ ساتھ اُردو کی بھی تھوڑی بہت خدمت انجام دیتے رہتے ہیں

آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی کے سربراہ راما نج راؤ ہیں اور تلگو اُردو اکیڈمی کی صدر ڈاکٹر سروجنی رنگانی ہیں۔ محکمہ تعلقاتِ عامہ بھی کتابوں کی اشاعت کے لئے اُردو ادیبوں کو مالی امداد دیتا ہے۔

نظامتِ ترجمہ آندھرا پردیش:- آندھرا پردیش کی حکومت نے ۱۹۵۶ء میں "نظامتِ ترجمہ آندھرا پردیش" کے نام سے ایک محکمہ قائم کیا جس کا اُردو شعبہ ایک نائب ناظم اور چار مددگار ناظموں پر مشتمل ہے۔ یہ شعبہ ریاستی قانون ساز اسمبلی اور کونسل میں پیش کئے جانے والے مسوّداتِ قانون کا اُردو میں ترجمہ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ سرکاری احکام، گورنر کے خطبے، بجٹ تقریروں کو بھی اُردو میں منتقل کرتا ہے۔

محکمۂ اطلاعات و تعلقاتِ عامہ:- آندھرا پردیش کا محکمۂ اطلاعات و تعلقاتِ عامہ واحد محکمہ ہے جہاں اُردو کا شعبہ بھی قائم ہے۔ یہ شعبہ ایک اسسٹنٹ ڈائرکٹر، ایک چیف ٹرانسلیٹر، ایک اسسٹنٹ ٹرانسلیٹر ایک ریڈر اور ایک اسٹینو ٹائپسٹ پر مشتمل ہے۔ حیدرآباد کے مشہور صحافی پی وامن راؤ جو تلگو اور انگریزی کے علاوہ اُردو بھی خوب جانتے ہیں۔ گزشتہ چار سال سے محکمۂ اطلاعات و تعلقاتِ عامہ کے ڈائرکٹر ہیں اس محکمے کے شعبۂ اُردو میں، اُردو کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر کی ایک جگہ قائم ہوئی ہے۔ جس پر اختر حسن کو معمور کیا گیا ہے۔ محکمہ تعلقاتِ عامہ ایک ماہنامہ "آندھرا پردیش"، تلگو، انگریزی اور ہندی کے علاوہ اُردو میں بھی شائع کرتا ہے۔ جس کی ادارت کے فرائض راقم الحروف کو تفویض ہیں۔

چند تجویزیں: (۱) ضرورت ہے کہ محکمۂ اطلاعات و تعلقاتِ عامہ آندھرا پردیش کے شعبۂ اُردو کو اور زیادہ وسیع بنیادوں پر فروغ دیا جائے (۲) حیدرآباد میں، اُتر پردیش اُردو اکیڈمی کے خطوط پر ایک اُردو اکیڈمی کی بنا ڈالی جائے (۳) اُردو کو ریاست کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے اور تعلیم کے شعبے کو پنچایت راج سے الگ کر دیا جائے۔

۴۔ اُردو مدارس کی کارکردگی کو بہتر اور موثر بنانے کے لئے، محکمہ تعلیمات کے تحت اُردو کے خصوصی افسران کا تقرر کیا جائے

۵۔ اُردو نصاب کی کتابوں کی تیاری کی جانب فوری توجہ دینا چاہیئے۔

۶۔ اُردو اساتذہ کی تربیت کے لئے موثر قدم اٹھانا چاہیئے ●●



مبارزالدین رفعت



محمود ایاز



حمید الماس



طیب انصاری



شکیل مظہری



عزیز تمنائی



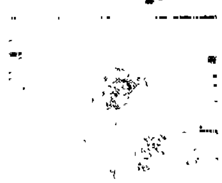
خلیل سیمابی



سید نذیر احمد



نعیم اقبال



خلیل مامون



محمد منظور احمد

میسور میں اردو



سلیم تمنائی

لسانی بنیادوں پر ریاستوں کی تقسیم سے پہلے ریاست میسور میں گلبرگہ، بیدر، بیجاپور، رائچور وغیرہ کے اضلاع نقشۂ میسور کی زینت نہیں تھے۔ لیکن ثبات انقلاب ہی کو ہے، سرکارِ خداداد کے خاتمے پر وسیع میسور بٹ گیا تھا لیکن پھر لسانی بنیادوں پر وسیع ہوگیا۔ اس طرح ریاستِ حیدرآباد سے گلبرگہ، بیجاپور، بیدر، رائچور وغیرہ اضلاع کٹ گئے۔ ادبا و شعرا کی بھی ہجرت ہوگئی۔ اور ریاستِ میسور کی ادبی تاریخ مختلف ادوار میں بٹ گئی۔ بہمنی دور، عادل شاہی دور، عہدِ سرکارِ خداداد، عہدِ راجگان۔

علم دوست سلاطین بہمنیہ کے دور میں خواجہ بندہ نواز گیسو دراز حضرت سید محمد حسینیؒ کا دہلی سے گلبرگہ ورود مسعود ہوا۔ آپ کی ذاتِ گرامی سے کئی رسالے منسوب ہیں "معراج العاشقین" "شکار نامہ" "ہدایت نامہ" "رسالہ سہ بارہ" وغیرہ۔ جدید تحقیق کی روشنی میں معراج العاشقین حضرت مخدوم حسینی بلکانوری کی تصنیف قرار پائی ہے۔

حضرت گیسو دراز کے فاضل فرزند سید محمد اکبر حسینیؒ اور پوتے عبداللہ حسینیؒ کا ایک دکنی رسالہ اور تصنیف "نشاط العشق" کا پتہ چلا ہے۔ نظامی کی ایک عشقیہ مثنوی "کدم راؤ اور پدم راؤ" مشہور ہے۔ صدرالدین و آذری جیسے مشہور شاعر و ادیب بھی گزرے

اس دور میں اُردو نے کافی ترقی کی تھی۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی نے "نورس" جیسی کتاب لکھی۔ علی عادل شاہ ثانی (تخلص شاہی) نے قصیدے، مثنوی اور غزل میں طبع آزمائی کی۔

شاہ میراں جی شمس العشاق مشہور صوفی، شاعر و ادیب تھے۔ "مغز مرغوب" "چہار شہادت" "خوش نامہ" وغیرہ آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔ میراں جی کے فرزند برہان الدین جانمؒ نے "معرفت القلوب" اور "ہشت بہشت" جیسی کتابیں لکھی ہیں۔

ملک الشعرا محمد نصرت متخلص بہ نصرتی مشہور شاعر اور شاہی کا مصاحب تھا۔ "گلشنِ عشق" "مثنوی علی نامہ" اور "تاریخِ اسکندری" اس کی مشہور تصانیف ہیں۔

شاہ امین الدین اعلیٰ بن شاہ برہان الدین جانمؒ صاحبِ ولایت و کرامت تھے۔ نثر و نظم دونوں پر آپ کا قلم رواں دواں ہے "رموز السالکین" "نظم وجود" "گفتارِ شاہ امین" "گنجِ مخفی" وغیرہ آپ کی تصانیف سے ہیں۔

ان کے علاوہ ہاشمی (یوسف زلیخا، بساتین السلاطین) شاہ ملک (شریعت نامہ) محمد امین ایاغی (نجات نامہ) شغلی (دُبند نامہ) علی (پند دل) مرتضیٰ (وصل نامہ) معظم (شجرۃ الاتقیا، گنج مخفی) شاہ عبدالقادر قادر (رسالہ من عرف) وغیرہ اس دور کے مشہور شعرا گزرے ہیں۔

عادل شاہی دور میں مرثیہ کی خاص اہمیت تھی۔ اور بقول نصیر الدین ہاشمی بحوالہ رسالہ لسان الملک نواب خیال ایک خاص گروہ مرثیہ گویوں کا پیدا ہوگیا تھا۔ دورِ جدید میں مرثیہ گو کی حیثیت سے جو مقبولیت و شہرت انیس و دبیر نے پائی، وہی شیخ شجاع الدین نوری نے عادل شاہی دور میں پائی تھی۔

اس دور میں تجری بیجاپوری (گلشنِ حسن و دل) سید محمد فراقی بیجاپوری (مراۃ الحشر) سید شاہ ندیم اللہ حسینی ندیم بیجاپوری وغیرہ اچھے شاعر گزرے ہیں۔

بیجاپور، گلبرگہ اور بیدر کے قدیم ادبا و شعرا کے علاوہ ریاستِ میسور کے نئے ضلع رائچور میں سید شاہ محمد قادری گزرے ہیں۔ ریاستِ میسور کے مشہور و معروف صوفی اور صاحبِ تصنیف بزرگ خواجہ صدرالدین بن سید عبدالقادر میراں شاہ ولی اللہ منزوی الجبلین کے برادرِ بزرگ تھے "خزینۂ عبادت"[1] و "خزینۂ معرفت" کے مصنف ہیں۔ ان دونوں کتابوں کا نفسِ مضمون اسرارِ معرفت و نکاتِ تصوف ہے۔

ٹیپو سلطان کے دور میں اُردو نے کافی ترقی کی۔ درباری زبان فارسی تھی مگر عوام کی زبان دکنی یا اُردو رہی۔

نواب حیدر علی خاں اگرچہ اُمی تھے لیکن اکبر کی طرح ان کے دربار میں بھی کئی علما و مشائخ، انشا پرداز و شاعر رہے۔ کڑپے کی تسخیر کے بعد سید شاہ کمال الدین قادریؒ اور آپ کے بڑے بھائی حضرت سید محمد حسین قادری شہیدؒ نے حیدر علی کی درخواست پر سرنگاپٹم آکر مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔ دونوں صاحبِ طریقت بزرگ تھے۔ صاحبِ دیوان اور کئی تصانیف کے مصنف۔

ہکری خاندان کے مشہور بزرگ محمد سعید ہکری المتخلص عاصی نلونگلی ۱۷۵۳ء یعنی بنائے سرکارِ خداداد (۱۷۶۱ء) سے آٹھ برس پہلے (بقول مولوی محمد خاں صاحب) فوت ہوئے۔ آپ ولی دکنی، شاہ مبارک آرزو، شاہ حاتم اور مظہر جانِ جاناں کے ہم عصر تھے۔ آپ کے

---

[1] راقم کے کتب خانے میں خزینۂ عبادت کا مخطوطہ محفوظ ہے۔ شجرۂ خلافت و شجرۂ نسب بھی۔

مرثیے، سلام، غزلیں اور نظمیں قدیم بیاضوں میں مل جاتی ہیں۔ آپ کی زبان وہی ہے جو آپ کے معاصرین کی تھی۔

سید شاہ محمد صدر الدین قادری ٹلونگلی کا سلسلۂ ارادت شاہ امین الدین اعلیٰ سے ملتا ہے۔ آپ کی نظم و نثر میں بیسیوں تصانیف ہیں۔ "مراۃ الاسرار" "مراۃ الاذکار" "مصباح النور" "من لگن" "مفتاح النور" "کسب محویت" وغیرہ آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔ ان میں "مراۃ الاسرار" کو پروفیسر قادری نے شائع کیا تھا۔ مخطوطات کی صورت میں راقم کے کتب خانے میں ان میں سے اکثر کتابیں موجود ہیں۔ ان کی کئی غزلیں بھی راقم کی خاندانی بیاض میں موجود ہیں

سلطان ٹیپو کے حکم پر سلطنت کے علماء و مشائخ نے "رسالۂ احکام نکاح" ترتیب دیا تاکہ سلطانی رعایا اس پر عمل کرے۔ حکم نامہ تو فارسی میں ہے لیکن نظمیں اردو میں ہیں۔

"مفرح القلوب" (حسن علی عزت) اور "فتح المجاہدین" (میر زین العابدین) کی طرح "خلاصہ سلطانی" یا "احکام النساء" بھی سلطان کے حکم پر قاضی غلام احمد نے لکھی تھی۔ اس کے علاوہ اس دور کی کتابوں میں "احزاب سلطانی" (حسن علی عزت)، "بہادر نامہ" "تاریخ سرنگاپٹم" "تاریخ حیدر علی" (لالہ بدھا سنگھ) "چار کرسی" (احمد خاں شیرانی) "ریاض العارفین" (محمد اسحاق) "فیض عام قدس" (سید شہاب الدین عالم باللہ)، "واقعات غوث اعظم" (عطا) وغیرہ کافی مشہور کتابیں ہیں۔

ٹیپو کی شہادت کے بعد اکثر ادبا و شعرا، ٹوٹے مالے کی طرح ادھر ادھر بکھر گئے۔ اکثر اہل علم گوشۂ گمنامی میں پڑے رہے۔ کچھ سالار جنگ اول کی دعوت پر جو ایل بی بورنگ کمشنر میسور کے ذریعے دی گئی تھی، حیدر آباد پہنچے ان میں غلام حسین باقی، شاہ عبدالقدوس قدسی، حسین شریف حکمی، سید عبدالباری، محمد عبدالعزیز، محمد محی الدین سعید متخلص حافظ محمد معین الدین مہکری کے نام سرِفہرست ہیں۔

عہد راجگاں میں اکثر راجا اردو فارسی سے آشنا تھے۔ شاہی محل کے کام کاج میں بھی اردو و فارسی کا دخل رہا۔

اس دور کے ادبا و شعرا میں میر حیات ("مصباح الحیات" "سراج الحیات" "خمسۂ حیات" "شمع محفل")، عبدالحی واعظ (جنان السیر) لطیف (دیوان لطیف) نسیم (دیوان نسیم) شاد یاغم۔ اطہر۔ تحقیق۔

آرام۔ دل۔ اویس۔ حکیم۔ مقبل۔ شہاب الدین، غلام احمد، صوفی احمد علی (دیوان نعتیہ مطبوعہ نول کشور) میکش۔ تحصیل۔ برق۔ علوی، انور۔ سعید۔ صابر۔ جادو۔ شوکت۔ طالب۔ دل۔ ناظم۔ محمود دراجی، عبرت۔ ادب۔ اکمل۔ ناصر۔ حیدر شاہ۔ مسرور۔ سالم درویش پیر قادری۔ ہری لال خوش۔ ناظر۔ رضوان۔ قائل۔ مشتاق قادری، ولی محی الدین قادری، مستان خاں۔ (گلشن رحمانی)، خلیل۔ سید غفار قادری، ممتاز وغیرہ کا نثری و شعری سرمایہ دستیاب ہوا ہے۔ میکش، تحصیل، برق۔ علوی۔ اور انور داغ کے شاگرد تھے۔[2] شاد یاغم مدیر "قاسم الاخبار" بنگلور کی "مثنوی غم" کافی مشہور ہے۔

دورِ جدید کے شاعروں اور ادیبوں کا ذکر کرنے سے پہلے بعض دیگر امور کا ذکر مناسب ہوگا۔

اردو بولنے والوں کی تعداد

۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق میسور میں اردو مادری زبان والوں کی تعداد ۵۰۴٬۷٬۸ تھی۔ جب کہ ۱۹۶۱ء میں یہ دوگنی سے بھی زیادہ یعنی ۱۸۴۴۴٬۲ ہو گئی۔ میسور میں اردو مادری زبان والوں کی تعداد برابر بڑھ رہی ہے۔ اس کا ثبوت ہمیں ۱۹۷۱ء کی مردم شماری سے ملتا ہے۔ مذکورہ مردم شماری کے مطابق میسور میں ایسے افراد کی تعداد ۸۸۶٬۹۶۳۴ ۲ تھی۔ ریاست میسور کے بعض شہر بالخصوص میسور اور بنگلور، اُم البلاد ہیں۔ ان شہروں میں شمالی ہندوستان کے لوگ ایک بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ اس امر کے پیش نظر یہ کہنا کہ ریاست میں اردو بولنے سمجھنے اور لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد مردم شماری میں مذکور تعداد سے کہیں زیادہ ہے، غلط نہ ہوگا۔

تعلیمی سہولتیں

ریاست میسور میں اردو کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام ہے۔ طلبا اور طالبات پرائمری سے لے کر ایس ایس ایل سی تک تعلیم اردو کے ذریعہ حاصل کر سکتے ہیں۔ ریاستی سرکار کے ایک قانون کے مطابق ایس ایس ایل سی کا امتحان کنڑ اور انگریزی کے علاوہ اردو میں بھی پاس کیا جا سکتا ہے۔ اس ریاست میں متعدد اینگلو اردو اسکول ہیں جن میں ذریعۂ تعلیم اردو ہے۔ مڈل اور ہائی اسکول کے سالانہ امتحان کے پرچے انگریزی کنڑ، تامل، تلیگو کے علاوہ اردو میں بھی ہوتے ہیں۔ پرچوں کی جانچ اردو داں معلموں سے کرائی جاتی ہے۔

پری یونیورسٹی کورس میں بھی اردو بحیثیت ایک مضمون کے پڑھی جا سکتی ہے۔ ریاست میسور میں تین یونیورسٹیاں ہیں۔ میسور

---

[1] اکثر گھروں میں قرآن کے ساتھ دلہن کے جہیز میں جنان السیر دینا ایک رسم ہو گئی تھی۔

[2] داغ کے میسوری شاگرد از راقم مطبوعہ "سب رس" حیدر آباد

یونیورسٹی، کرناٹک یونیورسٹی اور بنگلور یونیورسٹی۔ ان تینوں یونیورسٹیوں میں اُردو کے شعبے ہیں۔ اُردو زبان و ادب بطور ایک مضمون کے پڑھا جا سکتا ہے۔ نیز سائنس اور آرٹس میں طلباء II ڈگری تک بحیثیت ثانوی زبان کے اُردو زبان و ادب پڑھتے ہیں۔

میسور یونیورسٹی اور کرناٹک یونیورسٹی میں اُردو کے شعبے ہیں۔ یہاں اُردو میں ایم۔ اے کیا جا سکتا ہے۔ موجودہ تعلیمی سال سے بنگلور یونیورسٹی میں بھی اُردو کی چیئر قائم ہو گئی ہے۔

جہاں تک پرائمری اسکولوں، معلموں اور مادری زبان یعنی اُردو میں تعلیم پانے والے طلباء کا تعلق ہے، ان کے اعداد و شمار حسب ذیل ہیں[1]

سال	اسکول	طلباء	معلم
۱۹۶۷-۶۸	۲٬۵۴۱	۲۷۴٬۵۳۳	۷٬۰۲۸
۱۹۶۸-۶۹	۲٬۵۶۰	۲۸۴٬۷۰۳	۷٬۰۹۶
۱۹۶۹-۷۰	۲٬۵۸۶	۲۹۳٬۸۵	۷٬۳۱۸

مندرجہ بالا گوشوارے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ نہ صرف اُردو کے ذریعہ تعلیم دینے والے پرائمری اسکولوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ بلکہ ان میں استادوں اور طلباء کی تعداد بھی بتدریج بڑھ رہی ہے۔

یہی صورتِ حال ثانوی درجات میں تعلیم کی ہے۔ اعداد و شمار حسب ذیل ہیں

سال	اسکول	طلباء
	جہاں اُردو ذریعہ تعلیم ہے۔	
۱۹۶۷-۶۸	۲۶	۹٬۳۶۶
۱۹۶۸-۶۹	۳۱	۱۰٬۵۸۲
۱۹۶۹-۷۰	۳۴	۱۲۴۷۲

تاہم مذکورہ عرصہ میں اُردو بحیثیت ایک زبان پڑھنے والے طلباء کی تعداد میں کمی واقع ہوئی ہے۔ ۶۸-۱۹۶۷ میں ان کی تعداد ۳۰۴۷۱ تھی، جبکہ اگلے برس یہ صرف ۴۷٬۵۰۱ رہ گئی۔ ۷۰-۱۹۶۹ء میں ایسے طلباء کی تعداد میں مزید کمی ہوئی اور یہ گھٹ کر صرف ۴۴۸۰ رہ گئی۔ اس کمی کے باوجود اُردو کے معلموں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ ان کی تعداد ۶۸-۱۹۶۷ میں ۹۴۴، ۶۹-۱۹۶۸ء میں ۶۵۶ اور ۷۰-۱۹۶۹ میں ۲۷۶ تھی۔

[1] لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی بارہویں رپورٹ۔

اخبار و رسائل

عہد راجگاں میں کئی ایک اچھے اخبار اور رسائل شائع ہوئے۔ ان کی عمریں بھی نظر لگنے والی ہوتی تھیں۔ سلطان ٹیپو کے "فوجی اخبار" سے قطع نظر "قاسم الاخبار" میسور کا پہلا اخبار ہے جو ۱۸۶۱ء میں نعم کی ادارت میں نکلا۔ اس کے علاوہ "احسن الاخبار"، "کاس اخبار"، "بادِ صبا"، "گستر"، "ایڈورڈ گزٹ" (مدیر غلام محمد شوکت) "منشورِ محمدی" (محمد حنیف) "میسور الاخبار" (حافظ سید محمد) سلطان الاخبار" (قادر بادشاہ) "محافظِ بنگلور" (عبدالمجیب) "نیرِ اعظم" (سید شاہ عبدالقدوس)، "بنگلور اخبار" (محمد حسین و واحد علی)، "تعلیم" (عبدالحق تحقیق)، "اخبارِ مصلح" (عبدالحی سبز واری)، "رسالۂ دل سوز" (قادر شریف صابر)، "ترغیب" (عبدالحفیظ آرام) "نصرت" (محمد عبداللہ نصرت) "صبح بہار" (محمد علی آزاد) "نگارستانِ خیال" (ولی)، "جارج گزٹ" (برق)، "شاہ راہِ ترقی"، "ترغیب"، "رسالہ نسواں" (مدیر آرام)، "دیوار" اور "سبل" (مزاحیہ)، "اخبار ہلال"، "علم و عمل"، "پیکرِ خیال"، "مذاقِ عروض"، "ترانہ"، "آفتاب"، "شمع سخن"، "قول"، "درخشاں"، "کوثر"، "جلوہ سخن"، "روزی روزگار"، "درِ یتیم"، وغیرہ مشہور رسائل و اخبار تھے۔ ان کی مجموعی تعداد ستر اسی تک پہنچ جاتی ہے۔

اس وقت[1] ریاستِ میسور سے چھ روزنامے شائع ہوتے ہیں۔ "الکلام" ریاست کا سب سے پرانا روزنامہ ہے جو ۱۹۲۴ء میں جاری ہوا تھا۔ جناب ایس۔ جی محی الدین کی ادارت میں بنگلور سے شائع ہونے والے اس اخبار کی تعدادِ اشاعت دو ہزار ہے۔ ریاست کا سب سے کثیر الاشاعت روزنامہ "آزاد" ہے۔ اس کے ایڈیٹر عبدالہادی رفعت صاحب ہیں۔ یہ ۱۹۴۸ء سے شائع ہوتا ہے۔ دو دوسرے اہم روزنامے "پاسبان" (بنگلور) اور "سالار" بنگلور ہیں۔ پاسبان کے مدیر جناب کے۔ ایم عظیم آتش ہیں۔ اس کی تعدادِ اشاعت ۵٬۲۰۰ ہے۔ روزنامہ "سالار" کے ایڈیٹر محمود ایاز ہیں۔ یہ اخبار روزانہ ۱۹۶۴ء سے شائع ہوتا ہے۔

پریس رجسٹرار آف نیوز پیپرز فار انڈیا کی رپورٹ برائے ۱۹۷۱ء کے مطابق ریاستِ میسور سے آٹھ ہفتہ وار اخبار شائع ہوتے ہیں۔ "نشیمن" ریاستِ میسور بلکہ سارے ملک کا سب سے کثیر الاشاعت ہفتہ وار ہے۔ یہ بنگلور سے شائع ہوتا ہے۔ اس کی تعدادِ اشاعت ۷۹٬۲۸۴ ہے۔ اس کے مدیر اسما اسد ہیں۔

[1] اخبارات کی تعدادِ اشاعت پریس رجسٹرار آف نیوز پیپرز فار انڈیا۔ رپورٹ برائے ۱۹۷۱ء (ص ۶۰۳) پر مبنی ہے۔

دیگر اہم ہفتہ وار "کارواں" (بنگلور) اور "کوثر" (بنگلور) ہیں۔ "کوثر" کے مدیر جناب خلیل بیباک ہیں۔ اس کی تعداد اشاعت ۲۲۰۰ ہے۔ ہفتہ وار "کارواں" کے مدیر جناب کے۔ ایم عظیم آتش ہیں۔ یہ ۱۰۲۵۲ شائع ہوتا ہے۔ ان ہفتہ واروں کی ایک خاص بات یہ ہے کہ یہ سب کے سارے آزادی کے بعد شائع ہونا شروع ہوئے تھے۔

ادبی رسائل کے لئے مقامی فضا کچھ زیادہ سازگار نہیں، تاہم میسور کو ماضی میں "نیا دور" (صمد شاہین اور ممتاز شیریں) اور حال میں سہ ماہی "سوغات" (مدیر محمود ایاز) شائع کرنے کا فخر و امتیاز حاصل ہے۔ سہ ماہی "سوغات" ایک عرصہ بند رہنے کے بعد حال میں پھر جاری ہوا ہے اور اس کے دو شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ اپنے ابتدائی دور میں "سوغات" نے جدید نظم نمبر دو حصوں میں شائع کیا تھا۔ اُردو میں نظم جدید کی آبیاری میں اپنے اس یادگار نمبر کی بدولت "سوغات" کو اوّلیت حاصل ہے۔

علمی و ادبی سرگرمیاں

انیسویں صدی عیسوی کے اواخر اور بیسویں صدی کی ابتدا سے حالات بدل گئے۔ انگریزی کا عام چلن ہوگیا۔ آزادی کی جنگ شروع ہوئی۔ زبان اُردو کا تحفظ، تمدن و ثقافت کا مسئلہ بن گیا۔ اس دور نے کئی اچھے مورخ، نقاد، صحافی، ادیب و شاعر پیدا کئے۔

محمود خاں محمود (مورخ "سلطنت خداداد"، "تاریخ جنوبی ہند"، "صحیفۂ ٹیپو"، "حیدر علی"، "فیصلہ کن جنگیں"، "تاج" وغیرہ) نفیس تلمیذ جلیل مانک پوری، نذیر حسین، گردش، خاکی، محمد خاں، ڈاکٹر حبیب النساء، ڈاکٹر آمنہ خاتون، سہیل محمد شاہیں، ممتاز شیریں، شاہ ابوالحسن، سید شاہ اسد پیراں قادری، محمود ایاز، ہادی رفعت، نعیم اقبال، تابش، محمود سعید، ایم۔ اے قادر، ضمیر عاقل شاہی، شاہد شعلہ، میمونہ تسنیم، نسیر، عصمت عذرا، شہاب، تجمل، حنیف کلیم، سراج ادیبی، میر نور حسین، سلیم مینائی، فضا کوثری، سید غوث محی الدین، ڈاکٹر عبدالغفار شکیل، پروفیسر سید نذیر احمد، احمد اللہ، آغا محمد سروش، امین بیباک، سالک، خلیل سیمابی، امامی، سید مبارز الدین رفعت، سلیمان خطیب، طیب انصاری، راہی قریشی، حمید الماس، قیوم صادق بیگانہ، مبشر، رئیس مینائی، عصری وغیرہ۔

آزادیٔ ہند کے بعد بعض ناموں کا اضافہ ہوا ہے۔ اُن میں قابل ذکر حسینی سرور، میر محمود حسین، ہاشم علی، خلیل خاور، اقبال فرید، ضامن، گوہر، میر عظیم الدین، ضیاء، اقبال قادری، مائل، منصور، صلاح الدین، م۔ ن سعید، شکیل مظہری، خلیل مامون، رفیق احمد عزیز، شیدا رومانی، کشور کولاری، نشاط اکبر، جبار جمیل، مشتاق احمد خاں، عادل ادیب، نیاز احمد، شوق بنگلوری، حمید سہروردی، اکرام باگ، شبیر باگ کے نام ہیں۔

ریاست میسور میں مقامی طور پر سینکڑوں انجمنیں ہیں جو اپنے طور پر اُردو کی خدمت انجام دے رہی ہیں۔ لیکن میری نظر میں آغا می صاحب کی انجمن ترقی اُردو بنگلور، مجلس ادب بنگلور، اور انجمن اشاعت اُردو میسور ہمیشہ سرگرم عمل رہی۔ مجلس ادب اور انجمن اشاعت اُردو کو اس بات کا فخر ہے کہ انہوں نے بیسوں نئے شاعروں اور ادیبوں کو پیدا کیا اور انہیں اُبھارا۔ ان اداروں کی نیک نامی اور شہرت میں حضرت سید نذیر احمد (علیگ) پرنسپل ایوننگ کالج میسور یونیورسٹی، رکن سنڈیکیٹ و سینٹ، صدر رفاہ المسلمین ایجوکیشنل سوسائٹی میسور اور انجمن اشاعت اُردو میسور، جناب منظور احمد، معتمد مجلس ادب، اور جناب آغا می، معتمد انجمن ترقی اُردو بنگلور جیسے مخلص کارکنوں کا بڑا دخل رہا ہے۔

اُردو کو ہر دل عزیز بنانے میں۔ محرم کا عشرۂ غم، شولہ یا شوبالہ کی تقریبوں نے بھی بڑا کام کیا ہے۔ مرثیہ خوانی و سوز خوانی نے اُردو مرثیے، مزاحیہ فقروں و ترکیبوں کو جنم دیا۔ شعری مقابلے اور مناظرے کی مجلسیں آج بھی باقی ہیں۔ ان میں لستان کمر، نور یاں، ناریاں، علوی، سفلی وغیرہ جماعتیں مشہور ہیں۔

محفل مشاعرہ خاصے کی چیز ہے۔ مقامی مشاعروں کے علاوہ کل ہند مشاعرے بھی منعقد ہوتے ہیں۔ انجمن امامیہ اس میں پیش پیش ہے۔ ہندوستان کے اکثر شعرا یہاں کے مشاعروں میں شرکت کر چکے ہیں۔

مطبوعات

پریس کی آسانیاں ہمارے یہاں ضرور ہیں لیکن کوئی اشاعت گھر نہیں۔ ہر ادیب و شاعر اپنے خرچ سے اپنی تصنیف چھاپے یہ ذرا مشکل ہے۔ ویسے چھپنے کی آرزو کس کو نہیں ہوتی۔ نکاسی کا معاملہ بھی ٹیڑھا ہے۔ اس کے باوجود کچھ ہمت کر ہی جاتے ہیں۔ ڈاکٹر حبیب النساء بیگم (ریاست میسور میں اُردو کی نشوونما، "جواہر ادب"، "غالب")، ڈاکٹر آمنہ خاتون (لطائف السعادت، میسور میں اُردو، دکنی اُردو) ایم اے قادر (ادب کے نئے دھارے)، محبوب بڑائی (ہم کہاں کے دانا ہیں) ارشد قاسمی (بہار مجسم)، مجلس ادب (جنوبی ہند کا بہترین ادب)، سید ابوتراب لعطائی (دکھنی لغت)، میر محمود حسین (نسیم میسوری، مقالات محمود)، مغز مرغوب ہاشم علی، قیوم صادق (اُردو کا مذہبی ورثہ و وجہی) وغیرہ نے ہمت

سے کام لیا۔ اور یہ قابلِ تعریف ہیں۔ طیّب انصاری (ڈاور اکِ معانی)، قدیر (ذرعنا) اور راہی قریشی (صحرا کا سفر) کی کتابیں بھی ولا پبلشنگ حیدر آباد اور "مشورہ" بک ڈپو سے چھپی ہیں۔ سید مبارز الدین رفعت ریاستِ میسور کے کثیر التصانیف بزرگ ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ریاست کے مقبول شاعر محمود ایاز اور مشہور افسانہ نگار نعیم اقبال کا کلام اور افسانے کتابی صورت میں شائع ہوں۔

ریاستی حکومت کتابیں تو ضرور خریدتی ہے۔ لیکن اُردو مصنفوں اور شاعروں کی سرپرستی نہیں کرتی۔ انعام واکرام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود موجودہ حکومت سے میں مایوس نہیں پُرامید ہوں۔

ریاستِ میسور میں کتب خانوں کی واقعی کمی ہے۔ کتب خانے صدر انجمن بنگلور مسلم لائبریری بنگلور کے علاوہ راقم کو کسی اچھے کتب خانے کا پتہ نہیں۔ حیدر آباد کے جو اضلاع مثلاً گلبرگہ، بیجاپور، بیدر وغیرہ کرناٹک کے نقشے کی زینت بن گئے ہیں ممکن ہے وہاں کوئی اچھا کتب خانہ ہو۔ یونیورسٹی کے کتب خانے میں اُردو کی اچھی معیاری کتابوں کے ساتھ گھٹیا کتابیں بھی مل جاتی ہیں۔ پبلک لائبریری میں اُردو کتابیں نظر سے غائب ہوتی جارہی ہیں۔ سرکاری اورینٹل لائبریری میں مخطوطات کا ایک خاصہ ذخیرہ جمع ہے۔ جس میں راقم کے کتب خانے کی بھی کئی اہم قلمی کتابیں ہیں۔ کالج کے دانشور، لکچرار اور طلبا کے علاوہ اہلِ ذوق اس سے فائدہ یا استفادہ نہیں اُٹھا سکتے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اہلِ علم و ذوق کے لئے یہ پابندی سرے سے اُٹھا دی جائے۔

ریاستِ میسور میں اُردو زبان وادب کی ترویج واشاعت کے لئے سب سے فعال انجمن مجلس ادب بنگلور ہے۔ اس کے صدر جناب محمود سعید، جنرل سکریٹری محمد منظور احمد ہیں۔ دیگر سرگرم اراکان جناب علی حفیظ، ضیا، کرناٹکی اور م۔ن۔ سعید ہیں۔ مجلس ادب اُردو کتابوں کی اشاعت کا کام کرنا چاہتی ہے۔ ایسا اسکول کھولنا چاہتی ہے جہاں غیر اُردو داں لوگوں کو اُردو پڑھائی جا سکے۔ اُردو کی ترویج و ترقی اور اس کے تحفظ کے لئے ایک دوسرا سرگرم ادیب وشاعر محمود ایاز ہے۔

سرکاری دفاتر اور اُردو

ریاستی سرکار کے کسی دفتر میں بھی اُردو میں کام کاج نہیں ہوتا۔ البتہ محکمۂ اطلاعات میں ایک مختصر سا شعبہ اُردو کا ہے۔ جو گاہے گاہے اُردو اخبارات کو خبریں وغیرہ اُردو میں بھیجتا ہے اخبارات کو ریاستی سرکار کے اشتہارات بھی اُردو ہی میں جاری کئے جاتے ہیں۔

ریاستِ میسور میں کوئی سرکاری یا نیم سرکاری ادارہ یا اکیڈمی ایسی نہیں جو اُردو زبان وادب کے فروغ کے لئے کسی طرح سے معاون بنتی ہو۔

ریاست میں اُردو کی ترویج واشاعت کے لئے تجاویز

(۱) موجودہ تعلیمی نظام کو برقرار رکھتے ہوئے حکومت کو چاہیے کہ سرکاری اور پرائیویٹ ہائی اسکولوں میں اُردو داں طلباء وطالبات کو مادری زبان کی حیثیت سے اُردو پڑھنے کی ہر ممکن سہولت مہیا کی جائے۔

۲۔ کالجوں میں جہاں کنڑی، انگریزی اور سنسکرت وغیرہ کے ڈپلومہ کورس رکھے گئے ہیں وہاں اُردو ڈپلومہ کا بھی انتظام کیا جائے۔

۳۔ قومی یک جہتی کی خاطر ریاست کی اکثریت اور اقلیت ایک دوسرے کی زبان کو اختیار کرے۔

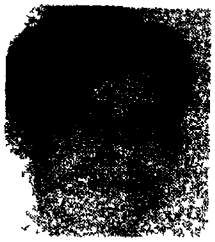
۴۔ ریاستی سرکار اُردو کے ادبی اداروں اور کتب خانوں کی مالی امداد کرے اور اُردو کی معیاری تصانیف پر انعام واکرام کے ساتھ اچھے ادیبوں اور شاعروں کے مضامین نثر و نظم کو کتابی صورت میں چھاپنے کے لئے قرضہ بھی دے۔

۵۔ ریاست کی اہم خبریں جہاں صوبائی زبان میں شائع ہوتی ہیں وہاں اقلیتی زبان (اُردو) میں بھی شائع ہوں۔

۶۔ دفتر میں کنڑی کے ساتھ اُردو میں بھی درخواستیں قبول کی جائیں اور اُسی زبان میں ان کا جواب بھی دیا جائے۔

۷۔ رسالہ "آندھرا پردیش" اور رسالہ "نیا دور" کی طرح ریاست میسور بھی ایک سرکاری جریدہ شائع کرے۔

۸۔ اُردو داں صرف حکومت پر تکیہ کر نہ بیٹھ رہیں بلکہ اس کا ہاتھ بٹائیں اور اپنے خلوص، محنت اور طاقت پر بھروسہ کریں۔


شانتی رنجن بھٹاچاریہ

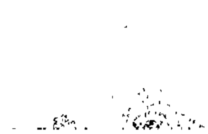

ایم اے نصر


طلحہ شبلی


ظفر اوگانوی


مظہر حیدری


ایم اے حمید


عبدالروف


مشتاق احمد


قیصر شمیم


نصر غزالی

مغربی بنگال میں اردو



جاوید نہال

سترھویں صدی میں اُردو اپنی ابتدائی شکل میں بنگال میں بھی موجود تھی۔ یوروپین سیاح ٹبری اپنے سفرنامے "مشرقی ہندوستان کا سفر ۱۶۵۵ء" میں رقمطراز ہے کہ:

"عدالتی زبان فارسی ہے لیکن عام بول چال کی زبان ہندوستانی اور بنگلہ ہے۔ مگر اب تک ہندوستانی کے لئے کوئی مناسب رسم الخط منتخب نہ ہو سکا۔"

یوروپین سیاح کے اس بیان سے اس کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ سترہویں صدی میں اُردو بولی کی حیثیت سے بنگال میں رائج ہو چکی تھی۔ مگر قطع و برید کے عمل سے گزر کر یہاں یہ بولی اٹھارہویں صدی کی ساتویں آٹھویں دہائی میں زبان کا درجہ حاصل کر سکی۔

اُردو میں نثری ادب کی تخلیق بھی پہلے فورٹ ولیم کالج میں ہوئی۔ جو جولائی ۱۸۰۰ء میں قائم ہوا تھا۔ پروفیسر جان بارتھوک گل کرسٹ اُردو کا پرستار اور محسن تھا، انتظام سلطنت کی بہتری کی غرض سے ہی سہی، اس نے فورٹ ولیم کالج میں ہندوستانی، بھاکا اور بنگلہ کے شعبے قائم کئے۔ ہندوستان کے گوشے گوشے سے نامور ادیبوں اور جید عالموں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ کالج کے ان باتنخواہ منشیوں نے اُردو نثر کی تدریس کی۔ جہاں داستان اور افسانوی ادب کی تخلیق ہوئی۔ میرامن دلی والے کی "باغ و بہار"، حیدر بخش حیدری کی "توتا کہانی" اور "قصہ حاتم طائی"، نہال چند لاہوری کی "مذہب عشق"، اور کاظم علی جوان کی "شکنتلا ناٹک" جیسی داستانیں عوام میں بے حد مقبول ہوئیں۔ وہاں کالج کے منشیوں نے بیسیوں مفید کتابیں جن میں تاریخ اور تذکرے بھی شامل تھے تالیف کیں۔ بہادر علی حسینی ("اخلاق ہندی")، حیدری۔ میرامن، میر شیر علی افسوس، خلیل علی خاں اشک ("داستان امیر حمزہ" وغیرہ)، کاظم علی جوان، مظہر علی خاں ولا ("بیتال پچیسی" وغیرہ) اور للولال جی کوی جیسی اہم ادبی شخصیتیں نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ اُردو نثر کا عالیشان قصر ان ہی منشیوں کی رکھی ہوئی بنیاد پر کھڑا ہے۔

گو کہ اُردو نثر کا باضابطہ چلن فورٹ ولیم کالج سے ہوا، لیکن صوفیائے کرام کی مساعی کی وجہ سے اٹھارہویں صدی ہی میں اُردو جہانگیر نگر (ڈھاکہ) تک پھیل چکی تھی۔ اور مرشد آباد اُردو کا ایک اہم مرکز بن چکا تھا اور نواب مخلص، قدرت اللہ قدرت، ماشاء اللہ خاں مصدر، انشاء اللہ خاں انشاء، اور جودت کی شاعری کی شہرت بنگال سے نکل کر ہندوستان میں پھیل چکی تھی۔ بعد میں واجد علی شاہ اختر کی جلاوطنی اور مٹیا برج میں مستقل قیام کے باعث مٹیا برج بھی ایک مرکز بنا۔

۱۹ویں صدی کے ادیبوں اور شاعروں نے جو ادبی متاع میراث کے طور پر چھوڑی۔ آنے ان کے جانشینوں نے محفوظ رکھا۔ اور اس میں تھوڑا بہت اضافہ ہی کیا۔ اور آج بھی اضافہ کر رہے ہیں۔

اُردو بولنے والوں کی تعداد

۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا۔ آبادی نے نقل مکانی کی۔ نتیجے میں بنگال کی ۱۶ لاکھ کی اُردو آبادی گھٹ کر چار یا پانچ لاکھ رہ گئی؛ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق بنگال میں ایسے لوگوں کی تعداد ۴،۷۷،۸۵۴ تھی، جن کی مادری زبان اُردو تھی۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق اُردو آبادی ۷،۴۸،۲۸۰ تھی، جبکہ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کی تازہ ترین اطلاع کے مطابق اُردو کی آبادی ۹ لاکھ ۵۰ ہزار ہے۔ یہ صحیح تعداد نہیں ہے۔ کیونکہ غیر سرکاری جائزے کے مطابق مغربی بنگال میں اُردو والوں کی تعداد سولہ لاکھ سے کم نہیں۔ اور ایسے لوگوں کی تعداد جو اُردو لکھ پڑھ نہیں سکتے مگر بولتے ہیں۔ کم سے کم چھ لاکھ ہے۔ گویا اس وقت مغربی بنگال میں اُردو والوں کی تعداد بائیس لاکھ ہے۔ تین کروڑ کی آبادی کی ریاست میں اردو بولنے والوں کی یہ تعداد خاصی کہی جائے گی۔ ہندی بولنے والوں کی تعداد بھی مردم شماری کی اطلاعات کے مطابق ۳۴ لاکھ ہے۔

تعلیمی سہولتیں:- حکومت مغربی بنگال نے تعلیم کی ہر سطح پر اُردو کو سہولتیں دینے کی بساط بھر کوشش کی ہے اور بعض بنیادی شکایات کے باوجود اُردو طبقہ بہت حد تک مطمئن ہے۔

پرائمری اسکول:- ریاست میں لگ بھگ ڈیڑھ سو ایسے پرائمری اسکول ہیں۔ جہاں ذریعہ تعلیم اُردو ہے۔ کارپوریشن (کلکتہ) کے کم سے کم ۲۴ پرائمری اسکولوں میں اُردو ذریعہ تعلیم ہے۔ اور دو سرکاری مڈل اسکولوں میں بھی ذریعہ تعلیم اُردو ہے۔

ہائی اسکول: صرف دو ہائی اسکول ایسے ہیں جہاں بنگلہ کے علاوہ ذریعۂ تعلیم اُردو بھی ہے۔ ایک مدرسۂ عالیہ کلکتہ اور دوسرا نواب بہادر انسٹی ٹیوشن آف مرشد آباد۔ ۲۵ سرکاری نیم سرکاری اور غیر سرکاری اُردو اسکولوں میں بھی اُردو کی تعلیم کا انتظام ہے۔ سرکاری گرلز اسکول میں صرف سخاوت میموریل گرلز ہائر سکنڈری اسکول میں اُردو تعلیم کا بندوبست ہے، لیکن معقول نہیں اور ذریعۂ تعلیم میسر نہ ہونے کے باعث اُردو خواں طالبات کے داخلے میں دشواریاں ہوتی ہیں۔

کالج ریاست میں ۱۴ سرکاری اور نجی کالجوں میں اُردو کی پڑھائی کا بندوبست ہے۔ سرکاری کالجوں میں سب سے اہم **مولانا آزاد کالج** ہے۔ جہاں اُردو آنرز کلاس تک پڑھائی جاتی ہے۔ یہاں ۱۹۶۶ء تک اُردو، فارسی، اور عربی کا ایک شعبہ تھا۔ ۱۹۶۷ء میں اُردو شعبہ کو الگ حیثیت دیدی گئی۔ اس وقت کالج میں اُردو طلبہ کی تعداد ۱۷۵ ہے۔

لیڈی برابورن کالج :- طالبات کے سرکاری کالج لیڈی برابورن کالج میں اُردو کی تعلیم باضابطہ دی جاتی ہے۔ ۱۹۷۱ء میں اس کالج میں اُردو آنرز کا شعبہ کھولا گیا ہے۔ پہلے سال آنرز طلبہ کی تعداد چار تھی۔ ۱۹۷۲ء میں یہ تعداد بارہ ہوگئی ہے۔

پریسیڈنسی کالج :- سب سے اہم اور مشہور و معروف سرکاری کالج ہے۔ آزادی کے قبل اُردو کا مکمل شعبہ تھا اور آنرز کی پڑھائی ہوتی تھی لیکن آزادی کے بعد اُردو شعبہ بند کر دیا گیا۔ چند برسوں تک پری یونی ورسٹی سطح تک اُردو پڑھائی جاتی تھی۔ مگر دو برسوں سے وہ بھی ختم ہوگئی۔

ہوگلی محسن کالج کا الحاق بردوان یونیورسٹی سے ہے۔ آزادی کے بعد فارسی، عربی اور اُردو کے شعبے ۱۹۵۶ء تک بند رہے مگر صنعتی علاقوں کے اُردو والوں کے شدید مطالبے پر اُردو شعبہ کی پھر ۱۹۵۷ء میں تجدید ہوئی۔ ۱۹۷۰ء میں اُردو آنرز کا شعبہ بھی کھول دیا گیا۔

ریاست میں دس غیر سرکاری کالج ہیں جہاں اُردو کی پڑھائی کا بندوبست ہے۔ لیکن سہولتیں طلبا کو کم میسر ہیں کیونکہ ان کالجوں میں اساتذہ کی بہت کمی ہے۔ مشن اسکولوں اور کالجوں میں اُردو پڑھائی ختم کر دی گئی ہے۔

یونی ورسٹیاں :- مغربی بنگال میں چھ یونی ورسٹیاں ہیں، لیکن صرف کلکتہ یونی ورسٹی میں اُردو کا شعبہ ہے، جو جدید ہندوستانی زبانوں (بنگلہ وغیرہ) کے ساتھ منسلک ہے۔ اور دو کل وقتی اور دو جز وقتی لیکچرار ہیں۔ ۱۹۶۱ء سے طلبہ کی تعداد اوسطاً پندرہ ہے۔ امسال تیس طلبا و طالبات نے ایم اے کے امتحان میں حصہ لیا۔

اخبارات و رسائل : اُردو صحافت نے بھی بنگال ہی میں جنم لیا۔ پہلا اخبار "جام جہاں نما" (۱۸۲۲ء) تھا۔ اور پھر "دارالسلطنت" وغیرہ انیسویں صدی کی دوسری دہائی میں شائع ہوئے۔ فی الحال اُردو روزناموں کی تعداد سات ہے۔ ۱۹۵۱ء میں پانچ تھی، ۱۹۶۱ء میں چھ ہوگئی، اور اب سات ہے۔ صبح کے روزنامے چار ہیں، شام کے تین۔ اس وقت اُردو کا سب سے مقبول اخبار "آزاد ہند" ہے۔ یہ اخبار مشہور و معروف صحافی اور مولانا آزاد کے ساتھی مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے جاری کیا تھا۔ آج کل اُن کے صاحبزادے احمد سعید ملیح آبادی اس کے مدیر ہیں۔

روزنامہ "عصر جدید" آزادی کے قبل مسلم لیگ کا نیم سرکاری آرگن تھا۔ ۱۹۵۰ء میں عصر جدید کی ملکیت بدلنے سے پالیسی بدل گئی اور یہ بھی قوم پرست اخبار ہوگیا۔

"روزانہ ہند" ۱۹۳۹ء میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی ادارت میں جاری ہوا تھا۔ اب رئیس الدین فریدی روزانہ ہند کے مدیر ہیں۔

شام کے تین اخبارات نکل رہے ہیں۔ ۱۹۵۵ء میں سالک لکھنوی کے اشتراک و تعاون سے ابراہیم ہوش نے "آبشار" نکالا، جو محنت کش طبقہ کی ترجمانی کا دعویٰ کرتا ہے۔ "غازی" کا اجرا ۱۹۶۵ء میں ہوا۔ اس کے مدیر وقار مشرقی ایم اے (علیگ) ہیں۔ "امروز" ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا، اقبال اکرامی اس کے مدیر ہیں۔

ہفتہ وار :- مغربی بنگال سے شائع ہونے والے اُردو ہفتہ وار اخباروں کی تعداد آٹھ ہے۔

"آزادیٔ ہند" جو ۱۹۶۶ء سے جاوید حسن کی زیر ادارت شائع ہو رہا ہے۔ اس کی اشاعت پانچ ہزار سے اوپر بتائی جاتی ہے۔ "کسان مزدور" ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔ مدیر جناب محمد امین ہیں۔

مقبول ترین اخبار روزنامہ "آزاد ہند" کا سنڈے ایڈیشن "اُجالا" ہے۔ اس کی اشاعت ۱۱ ہزار کے لگ بھگ ہے۔ مدیر احمد سعید ملیح آبادی ہیں۔ دیگر ہفت روزوں کے علاوہ "کہکشاں"، "علم دلیل" (۱۹۵۸ء) اور "عکاس" (۱۹۶۲ء) بھی شائع ہو رہے ہیں۔

پندرہ روزہ :- ہماری ریاست میں پانچ پندرہ روزے شائع ہوئے جن میں سے صرف دو اب بھی جاری ہیں۔ "تحریک ملت" (مدیر عبدالعزیز ایم اے لفر اور کمال جعفری کے اشتراک و تعاون سے ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔ اور حکومت مغربی بنگال کے محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامّہ کی جانب سے 'مغربی بنگال' ۱۹۵۴ء سے اب تک جاری ہے۔

ماہنامے ۱۹۵۱ء سے اب تک کوئی پندرہ ماہنامے شائع ہوئے۔ ۱۹۵۴ء میں ایک ادبی اور علمی ماہنامہ "معاون" (مدیر مظہر امام) حال مقیم پٹنہ شائع ہوا۔ سوز سکندر پوری نے ماہنامہ "سوز" ۱۹۶۲ء میں شائع کیا۔ "عبرت"، "ساز" اور کئی دوسرے ماہنامے شائع ہوئے۔ ۱۹۶۲ء میں "حسن و صحت" شائع ہوا۔ جو آج بھی جاری ہے۔ اس میں طب و حکمت سے متعلق پر از معلومات مضامین شائع ہوتے ہیں۔ "آفاق"

۱۹۵۷ء) اور نشیمن" ۱۹۵۳ء بھی عوام کی بے توجہی کا شکار ہوگئے۔ بنگال میں ہندوستان کا پہلا ڈائجسٹ[1] "فانوس" (مدیر عطاءالرحمٰن شاد) ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا۔ ایک سال بعد جواں سال صحافی نظام الحسینی نے "روحِ ادب ڈائجسٹ" شائع کیا۔ یہ دونوں ڈائجسٹ "ہما" اور "شبستاں" کی اشاعت کے بعد بند ہوگئے۔

۱۹۷۰ء میں جدید ادبی رجحان نے اس ریاست کے شعرا و ادبا بھی متاثر ہوئے۔ ظفر اوگانوی نے ۱۹۷۱ء میں "اقدار" اور نوجوان شاعر کامل اختر نے "آیات" شائع کیا۔ یہ دونوں رسالے بھی جو جدید قدروں کے ترجمان تھے جلد بند ہوگئے۔ فی الحال دو ماہنامے "سدبرگ" (مدیر ولی صدیقی سلطان پوری) اور "شہود" (مدیر شہود عالم آفاقی) شائع ہورہے ہیں۔ اور ایک بچوں کا رسالہ "غنچہ" (دوماہی) بھی نکلتا ہے۔

ادبی سرگرمیاں

مغربی بنگال میں مرحوم علامہ وحشت کے بعد پرویز شاہدی اردو کے سب سے بڑے شاعر مانے جاتے ہیں۔ ان کے کلام کے دو مجموعے "رقصِ حیات" (۱۹۵۴ء) اور "تثلیث حیات" (۱۹۶۸ء) میں شائع ہوکر مقبول ہوئے۔ وہ عظیم ترقی پسند فن کار تھے۔

شاکر کلکتوی، غواص قریشی، پروفیسر عباس علی خاں بےخود، رضا مظہری، جرم محمد آبادی پرانے غزل گو شاعر ہیں۔ نئے کہنے والوں میں علقمہ شبلی کا نام سرفہرست ہے۔ شبلی ترقی پسند شاعر ہیں لیکن عصری تقاضوں اور جدید رجحان کی خوبیوں سے بے پروا نہیں۔ مظفر حیدری کا شمار بھی ایسے شاعروں میں ہوتا ہے جو وقت کے تقاضوں سے باخبر ہیں ان کا مجموعۂ کلام "جام جم" ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔

ابراہیم ہوش کا تعلق "دبستان آرزو" سے ہے ۱۹۶۹ء میں ان کی شاعری نے ایک کروٹ بدلی اور ترقی پسند قدریں اور زندگی کے توانا مسائل ان کی شاعری کے موضوع بنے۔

قیصر شمیم، ہوڑہ کے ترقی پسند شاعر ہیں۔ ان کے کلام کا مجموعہ "ساعتوں کا سمندر" اُردو اور ہندی رسم الخط میں ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا۔ رونق نعیم، رانی گنج کے مقبول ترقی پسند شاعر ہیں۔ جواب جدید شاعری کرتے ہیں۔ ان کے کلام کا مجموعہ "دائرہ در دائرہ" ۱۹۷۲ء میں ہندی اور اُردو رسم الخط میں شائع ہوچکا ہے۔

اعزاز افضل، ترقی پسند شاعر ہیں۔

جواں مرگ وکیل اختر، ترقی پسند شاعر تھے۔ افسوس ہے کہ موت کی آندھی نے ان کی شمع حیات ۳۵ سال میں گل کردی۔

نصر غزالی، کامل اختر، وحید عرشی، فاروق شفق، خالق عبدالله، سعید قدرت، حبیب ہاشمی، شمیم انور اور احسن شفیق افق ادب پر جدید شاعر کی صورت میں ابھرے، اور جدید شاعری کو سجانے سنوارنے میں مصروفِ عمل ہیں۔

ان شاعروں کے علاوہ اقبال کرشن، شمس الزماں شمس، شہود عالم آفاقی، راز عظیم، معصوم شرقی اور کمال جعفری ابھرتے ہوئے شاعر ہیں شاعرات میں رابعہ سلطانہ ناشاد، اور صالحہ بیگم مخفی، (مرحومہ) قابلِ ذکر ہیں۔ ناشاد کے دو مجموعہ کلام "ناسور" اور "طوفانِ غم" شائع ہوچکے ہیں۔

نثر نگار:۔ مغربی بنگال میں نثر نگار خال خال ملتے ہیں۔ تحقیق کا میدان بہت وسیع ہے، مگر بنگال کے نثر نگاروں نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ "بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات"، "انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب" کی اشاعت سے نئے پود کے ادیبوں کو تحقیق سے کچھ دلچسپی پیدا ہوئی۔ اور مشتاق احمد نے "بیسویں صدی میں مغربی بنگال کے اُردو شعرا" ۱۹۷۲ء میں شائع کیا۔ ۴۲۸ صفحات کا یہ تذکرہ ۱۸۴ شاعروں کے ذکر کے باوجود ابھی تشنہ ہے۔

کلکتہ کے نثر نگاروں میں بلند ترین مقام مشہور و معروف ادیب لطیف الدین احمد اکبرآبادی کا ہے۔ جو ل۔ احمد کے نام ہی سے جانے جاتے ہیں۔۔۔ کلکتہ میں پچیس سالہ دوران قیام میں ل۔ احمد صاحب نے کئی اچھی تخلیقات اُردو ادب کو دیں۔ جن میں کہانیوں کے تین مجموعے، "دن رات" "صبح و شام"، اور "ملاحظاتِ نفسی" شامل ہیں۔ ان کی کتابیں "روسی فکر اور مفکر" اور "نقادِ ادب" بہت مشہور ہیں۔ ۸۴ سال عمر ہونے پر بھی ل۔ احمد کا قلم ادب کی خدمت کرنے سے نہیں تھکا ہے۔

پروفیسر شاہ مقبول احمد ادر سالک لکھنوی کا بزرگ ادیبوں میں شمار ہوتا ہے۔ شاعر کے ساتھ ساتھ سالک ادیب بھی ہیں۔ طنزیہ مضامین خوب لکھتے ہیں۔

پروفیسر عبدالرؤف (شعبہ اُردو کلکتہ یونی ورسٹی) بھی شاعر و ادیب ہیں۔ امریکی شاعر والٹ وھٹ مین WALT WHITMAN کی ۲۱ نظموں کا ترجمہ "والٹ وھٹ مین کی ۲۱ نظمیں" (۱۹۶۹ء) کے نام سے شائع کرچکے ہیں۔ ان کے علمی ادبی اور تحقیقی مقالے برابر شائع ہوتے ہیں۔ انہوں نے سید مظہر الحق عرف پیارے شاہ صاحب کی کتاب "اسرارِ تصوف" کو تالیف اور شائع کیا اور آج کل مرشدآباد کے مشہور شاعر نواب مخلص

---

[1] اس سے بھی قدیم اُردو ڈائجسٹ "شاہکار" ہے جو سترہ برس سے جاری ہے۔ یہ پہلے الہ آباد اور اب وارانسی سے شائع ہوتا ہے۔ (ادارہ)

کے دیوان کے نسخہ کو ترتیب دے رہے ہیں۔

شانتی رنجن بھٹاچارجی اُردو کے واحد بنگالی ادیب ہیں۔ اُن کی مطبوعہ کتابوں میں "بنگال میں ہندوؤں کی اُردو خدمات" بنگال میں اپنی نوعیت کا پہلا تذکرہ ہے۔ اُن کی تاریخ بنگلہ ادب" انجمن ترقی اُردو (ہند) نے شائع کی ہے، اُن کی کتابوں میں ایک افسانوں کا مجموعہ بھی شامل ہے۔

طلیف الرحمٰن "نساخ سے وحشت تک" کی اشاعت کے بعد ادبی دنیا میں مشہور ہوئے۔ جو چار شعرا، نساخ، اشنغ، شمس اور وحشت کی زندگی اور شاعری کا مفصل تذکرہ ہے۔ اُن کی تازہ ترین کتاب "غالب اور اس کے معترضین" (۱۹۷۳ء) میں غالب کی فارسی شاعری کا جائزہ ہے۔ اور غالب کے معترضین کے اعتراضات کو رد کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دیگر تصنیفات "تجلیاتِ فارسی" "کیف و اضطراب" (کلام کا مجموعہ) وغیرہ ہیں۔

ایم اے نصر، اور حشم الرمضان ابھرتے ہوئے ادیب ہیں جنہوں نے اُردو ادب کو کئی عمدہ مقالات دیئے ہیں۔ اقبال کرشن کے ادبی و تنقیدی مضامین "شب خون"، "کتاب" اور دوسرے رسالوں میں چھپتے رہتے ہیں۔ ایم اے حمید لکھنوی نے بھی چند اچھے ادبی مضامین لکھے ہیں۔

بنگال نے کئی اچھے افسانہ نگار اردو ادب کو دیئے۔ ۱۹۵۰ء تک یونس احمر بنگال کے مشہور افسانہ نگار تھے ان کے علاوہ نشاط الایمان، احمد سعدی اور راقم الحروف نے افسانے لکھے۔ اس وقت نشاط الایمان (ل احمد کو چھوڑ کر) سب سے پرانے افسانہ نگار ہیں۔ اُن کے افسانوں کا مجموعہ "لیل و نہار" ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا تھا۔ جدید افسانہ نگاروں میں سب سے کامیاب ظفر اوگانوی ہیں۔ ڈاکٹر ظفر اوگانوی نے تحقیقی اور تنقیدی مقالے بھی سپردِ قلم کئے ہیں۔ "صغیر بلگرامی کی حیات، شاعری اور تنقید" پر اُن کا تحقیقی مقالہ ہے۔

ظفر اوگانوی کے علاوہ سجاد نظر، انیس رفیع، فیروز عابد، عابد ضمیر، امر امیری، مشتاق اعظمی، شاہد منصور علی، وغیرہ ابھرتے ہوئے افسانہ نگار ہیں۔ ایم۔ اے۔ نصر کی ادبی زندگی بھی افسانہ سے شروع ہوئی، مگر بعد میں وہ ادبی اور تحقیقی کام میں لگ گئے۔

ادبی انجمنیں:- مغربی بنگال میں تیس ادبی انجمنیں ہیں۔ جو ریاست میں اُردو کے فروغ کے لئے کام کر رہی ہیں۔

ان میں سب سے پرانی ادبی انجمن، انجمن ترقی اُردو (ہند) شاخ مغربی بنگال اور علامہ وحشت کی قائم کردہ "انجمن احباب" ہیں۔ اول الذکر غالب صدی تقریب منانے کے بعد کچھ بے عمل سی ہوگئی ہے۔ سارد و رائٹرز ایسوسی ایشن کلکتہ کے بنیادی مقاصد میں معیاری اور مفید کتابوں کی اشاعت ہے۔ سخن زار بھی ادبی انجمن ہے جو جشن ل احمد منانے کے پروگرام کی کوشش میں مصروف ہے۔ "بزم لوح و قلم" کی علمی و ادبی کاوشیں بھی قابلِ ستائش ہیں۔ امسال سے اُس نے پرویز شاہدی ایوارڈ کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ پہلا پرویز ایوارڈ اس سال حضرت ل احمد اکبر آبادی کو ملا ہے۔ ادارہ فروغ اُردو، خسب پور ہوڑہ، اُردو اکادمی، اُردو لٹریری سوسائٹی خضر پور، بزم شاکری، بزم غواص، رائٹرس ایسوسی ایشن (ہوڑہ) بزم شہود (بیلگھریا) اُردو اکادمی شانتی بنگال، مرکز فکر و فن، اور دوسری ادبی انجمنیں، اُردو کے فروغ کے لئے کوشاں ہیں۔

کتب خانے:- مغربی بنگال میں سینکڑوں چھوٹے بڑے کتب خانے ہیں مگر ایسے کتب خانوں کی تعداد، جہاں اُردو کتابوں کا ذخیرہ ہے، بیس پچیس سے زیادہ نہیں۔ ان میں سب سے اہم کتب خانہ ایشیاٹک سوسائٹی ہے۔ جہاں اُردو کے قدیم و نادر خطی نسخوں اور مطبوعات کا ذخیرہ ہے۔ نیشنل لائبریری کلکتہ کا اُردو شعبہ "بھاشا سکشن" کہلاتا ہے جس میں کئی ہزار مخطوطات اور مطبوعہ کتابوں کا ذخیرہ ہے۔ ہر موضوع[1] پر اُردو کی کتابیں مل سکتی ہیں۔ شاہی کتب خانہ مرشد آباد میں میر انیس کے مراثی کے کئی نادر خطی نسخے ہیں۔ اس میں دس ہزار اُردو فارسی اور عربی کی کتابیں ہیں مگر اُن کی حفاظت نہیں ہو رہی ہے اور بہت سی نایاب مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کو دیمکیں چاٹ گئی ہیں۔ شاہی کتب خانہ قومی سرمایہ ہے۔ جس کی حفاظت قومی ذمہ داری ہے۔ محمد علی لائبریری، مولانا آزاد کالج کلکتہ اور ہوگلی محسن کالج کے کتب خانوں میں اُردو کا بڑا ذخیرہ ہے۔ ان اہم کتب خانوں کے علاوہ کلکتہ، مٹیا برج، آسنسول اور رانی گنج وغیرہ میں ایسے کتب خانے ہیں۔ جہاں معیاری کتابوں کا ذخیرہ مل جاتا ہے۔

سرکاری امداد:- ریاستی حکومت کی طرف سے اُردو کی تحقیقی، تنقیدی اور علمی و ادبی کتابوں کی اشاعت کے لئے کسی نوعیت کی امداد نہیں ملتی۔ انعاموں کا بھی رواج نہیں ہے۔ کسی بھی سرکاری دفتر میں اُردو میں کلی یا جزوی طور پر کام نہیں ہوتا۔ ریاستی محکمہ اطلاعات و تعلقاتِ عامہ کی جانب سے پندرہ روزہ "مغربی بنگال" شائع ہوتا ہے۔ اور اُردو میں مقامی خبریں بھی اخبارات کو فراہم کی جاتی ہیں۔ (مرکزی محکمہ اطلاعات و تعلقاتِ عامہ کی جانب

---

[1] اس کتب خانے میں ملک کی ہر مطبوعہ کتاب کا ایک نسخہ مفت بھیجنا قانوناً ضروری ہے۔ لیکن اُردو ناشر اس کی پابندی نہیں کرتے (ادارہ)

سے بھی اردو میں خبریں اور معلوماتی فیچر مہیا کئے جاتے ہیں۔

ادیبوں، شاعروں اور ثقافتی اداروں کے علاوہ ایسی شخصیتیں بھی ہیں جو اپنی بساط کے مطابق اردو کی ترویج و اشاعت کے لئے کام کر رہی ہیں۔ ان میں ڈاکٹر عطا کریم برق (صدر شعبۂ عربی و فارسی کلکتہ یونی ورسٹی) ایم اے مجید (سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند شاخ مغربی بنگال)، سریندر کمار بھلاج (ایلیسی سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند شاخ مغربی بنگال) ڈاکٹر ہیرا لال چوپڑا (کلکتہ یونی ورسٹی) وسیم الحق ایم اے وغیرہ کلکتہ یونی ورسٹی میں الگ شعبہ کے قیام، کتابوں کی اشاعت کے لئے سرمایہ کی فراہمی اور مشاعرے وغیرہ کرا کے اردو کو غیر اردو داں طبقے میں مقبول بنانے کے لئے کوشاں ہیں۔

فروغ کی تجاویز:

(۱) بنگالی علمی و ادبی حلقہ اردو سے عقیدت و محبت رکھتا ہے اس لئے اردو کتابوں کو بنگلہ کے قالب میں ڈھالنے کی ضرورت ہے، دیوان غالب کا بنگلہ میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے (۲) بنگال میں شائع ہونے والی اردو مطبوعات پر حوصلہ افزائی کے لئے انعامات دیئے جائیں (۳) ادیبوں اور شاعروں کی مالی معاونت کی جائے (۴) اردو اکادمی کے قیام کے لئے اقدام کئے جائیں (۵) مطبوعات کی اشاعت کا معقول انتظام ہو (۶) پرائمری سطح سے اعلیٰ سطح تک اردو کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام کیا جائے۔ اور اردو اساتذہ کا تقرر کیا جائے۔ (۷) آل انڈیا ریڈیو کلکتہ میں اردو کا الگ شعبہ قائم کیا جائے۔ ●●

بقیہ: تمل ناڈو میں اردو

۶۔ تامل ناڈو ریاست کے جن علاقوں میں اردو بولنے والوں کی قابل لحاظ تعداد ہے، وہاں فہرست رائے دہندگان اردو میں بھی شائع کر دی جائے۔

۷۔ اردو مدارس طلبار کی تعداد کی بنا پر نہیں بلکہ اردو بولنے والی آبادی کے تناسب کو مدنظر رکھ کر کھولے جائیں اور تناسب سے اساتذہ کا تقرر کیا جائے۔ پرائیویٹ ہائی اسکولوں اور کالجوں میں ایسے اردو اساتذہ کا تقرر ہی لازمی قرار دیا جائے جن کے پاس اردو کی ڈگری ہو۔ اردو زبان و ادب کی فہرستیں اردو ادیبوں کے مشوروں سے مرتب کرائی جائیں۔ ٹکسٹ بک کمیٹی میں ایسے اراکین بھی لئے جائیں، جن کا اردو ادب میں کوئی مقام ہو۔

۸۔ سرکاری لائبریریوں میں اردو کتابوں کے لئے موزوں رقم فراہم کرائی جائے تاکہ یہ لائبریریاں اردو کی تازہ اور جدید تصنیفات حاصل کر سکیں۔

بقیہ: بہار میں اردو

بہار میں کچھ لوگ ہیں جو انفرادی طور پر اردو کی ترقی اور اشاعت کی سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں۔ ان میں قاضی عبدالودود، کلیم الدین احمد، غلام سرور، بے تاب صدیقی، کلام حیدری، احمد کاظمی، شمس الہدیٰ استانوی، شاہد رام نگری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مصنفین کی امداد و سرپرستی

پہلے تو بہار سرکار مصنفوں کو کوئی انعام نہیں دیتی تھی۔ لیکن شری ڈی کے بروا نے اپنی گورنری کے زمانے میں دس لاکھ سے ایک خاص فنڈ مصنفوں اور فنکاروں کی امداد کے لئے قائم کیا تھا۔ اس فنڈ سے کچھ لوگوں کو ماہانہ وظیفہ مل رہے ہیں اور کچھ لوگوں کو یک مشت امداد بھی ملی ہے لیکن اعلیٰ تصنیفات پر حکومت کوئی انعام نہیں دیتی۔ اور نہ کسی کو کوئی اعزاز دیا گیا ہے۔

سرکاری دفاتر اور اردو

سرکاری دفتروں سے اردو کو انگریزوں کے عہد حکومت ہی میں دیس نکالا مل گیا تھا۔ مسٹر یونس مرحوم نے اپنی وزارت میں پٹنہ کمشنری میں اردو کے سرکاری دفتروں میں استعمال کی اجازت دے دی تھی۔ لیکن کانگریس حکومت نے اسے بعد میں منسوخ کر دیا تھا۔ رجسٹری آفس کے علاوہ اور کسی دفتر میں اردو کا استعمال نہیں ہے۔

محکمۂ تعلقات عامہ سے ایک پندرہ روزہ اردو اخبار "بہار کی خبریں" شائع ہوتا ہے۔ اس کے ایڈیٹر ہوش عظیم آبادی ہیں۔ اس محکمہ سے اخباروں کو اردو میں خبریں بھی بھیجی جاتی ہیں۔ شری ڈی کے بروا نے اپنی گورنری کے زمانہ میں اردو اکیڈیمی قائم کی تھی۔ لیکن ایک سال سے زیادہ گزر جانے پر بھی اردو اکیڈیمی نے چند اردو مصنفوں اور شاعروں کو پانچ پانچ سو روپے کی امداد دینے یا چند نشستوں کے انعقاد کے علاوہ کچھ نہیں کیا۔ مسٹر بروا نے اکیڈیمی کے قیام کے ساتھ تین لاکھ کے فنڈ کا اعلان بھی کیا تھا لیکن ۱۹۷۲ء میں اکیڈیمی کو صرف پچاس ہزار روپے کے لگ بھگ رقم ملی تھی۔ اس رقم سے اکیڈیمی کوئی مفید کام نہیں لے سکی۔

تجاویز

اردو کی ترویج و اشاعت کے لئے سب سے پہلی ضرورت تو ابتدائی اردو اسکولوں کی ہے۔ دوسری ضرورت کالج کی سطح کی کتابیں شائع کرنے کے لئے ایک اشاعتی ادارے کے قیام کی۔ لیکن سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ اردو زبان کو ملکی قانون میں دستوری تحفظ حاصل ہو۔ ●●



صلاح الدین پاشہ بہتی



حسرت سہروردی



دانش فرازی



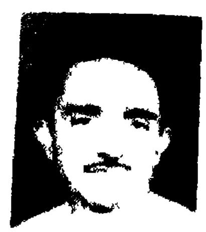
ایس ایم حیات پاشہ



راز امتیاز



نور بن خیامی



حیات مدراسی



علیم صبا نویدی



تمل ناڈو میں اردو

کاوش بدری

تمل ناڈو کے اربابِ فن نے ہر دور میں اپنے گلہائے فکر سے دامنِ اردو کو رشکِ فردوس بنایا ہے۔مگر وقت کے نالے نے انہیں اپنے اسلاف کے ادبی کارناموں سے اس قدر دور کر دیا ہے کہ آج اردو کے بیشتر نقاد اور ادیب حیرت سے پوچھتے ہیں کہ مدراس میں بھی اردو ہے؟

تمل ناڈو میں اردو روایت اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ دکن کے دوسرے علاقوں کی۔قطب شاہی دور سے یہاں آہستہ آہستہ اردو کا رواج شروع ہوا اور یہاں کی شاندار ادبی روایت ولی دکنی کے دور سے ملتی ہے جن کے معاصر ولی ویلوری تھے۔موصوف کی دو ضخیم مثنویاں مشہور ہیں۔ایک میں رتن سین اور پدمنی کا فسانہ مذکور ہے۔دوسری میں واقعاتِ کربلا ہیں۔آخر الذکر کتاب کا نام "روضۃ الشہدا" ہے جو عالمگیر کی وفات کے دو سال بعد ۱۱۱۹ھ میں تصنیف ہوئی۔یہ تصنیف غلطی سے ولی دکنی کی تصنیف مشہور ہوئی تھی۔

اردو یا اس دور میں دکھنی کہلائی جانے والی زبان کو ادبی تخلیقات کے لئے سب سے پہلے استعمال کرنے والے مولانا مولوی باقر آگاہ ویلوری تھے۔مولانا آگاہ کی بہت سی تصانیف، عربی، فارسی اور ہندی یا دکھنی اردو میں موجود ہیں۔

نواب محمد غوث خاں بہادر (متخلص بہ اعظم) نے ایک صاحبِ طرز ادیب، جلیل القدر نقاد اور شیریں مقال شاعر تھے۔ایک بزمِ مشاعرہ مدراس میں قائم کی تھی جس میں مدراس کے بڑے بڑے لائق و فائق اربابِ سخن شامل ہوتے تھے۔

اعظم کے دور میں منشی حبیب اللہ ذکا مدراسی نے بحیثیت نقاد و شاعر مرزا غالب سے اپنا ادبی اور علمی لوہا منوایا تھا۔ذکا کے ایک شعری نثری مجموعہ "خلش و خماش" پر غالب کی تقریظ شامل ہے۔غالب نے ذکا کو اپنے شاگرد سے زیادہ اپنا عزیز از جان دوست بلکہ اس سے زیادہ اپنا ہم پایہ شاعر گردانا ہے۔

ذکا سے زیادہ اردو شاعری میں علی الخصوص صنفِ غزل میں شریف مدراسی نے غالب کے دوش بدوش اردو کی صالح روایت کو جدت و ندرت کے ساتھ ملحوظ رکھا۔

دیوانِ غالب کے جواب میں شریف مدراسی نے غالب کی تمام زمینوں میں ہم قافیہ و ہم ردیف غزلیں کہیں اور پورا کلام کتابی شکل میں شائع ہو کر مقبول ہوا اس طرح غالب کے دیوان کا دوسرا جواب خود شریف ہی کے ایک ہونہار اور باکمال شاگرد نواب رؤوف احمد خاں پرتو (مصنف مثنوی حرز جاں) نے غالب کی ہر زمین میں غزلیں کہہ کر دیں۔پرتو کا یہ دیوان بھی شائع ہو کر مقبول ہوا۔

۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ء تک کا زمانہ تمل ناڈو کی ادبی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔یہاں کے چند اہم ترین علاقوں کے ادبی کردار کا سرسری جائزہ لئے بغیر یہاں کی ادبی تاریخ واضح طور پر سامنے نہیں آسکتی۔

ترپاتور (شمالی آرکاٹ) حضرت حکیم آسی ترپاتوری اور ان کے اثیم نے صنفِ غزل کے چودہ طبق روشن کئے۔

وانمباڑی میں گنڈو عبدالقادر شاکر وانمباڑی (مصنف "چندر بدن مہیار") بادشاہ وانمباڑی، کمال، فانی، اکبر اور مولانا عبدالباری حاوی (در آمبور) میں منظور صدیقی، ماہر، ساغر، مقبول، روحی، فہیم اور قدیر نے غزل کی روایت کو بڑے دل آویز پیرائے میں باقی رکھا۔(فہیم مولانا ناطق گلاؤٹھوی کے حلقۂ تلامذہ سے وابستہ تھے)

عمر آباد (نزد آمبور) دیکھنے میں یہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے مگر کاکا گھرانے کا قائم شدہ مدرسہ جامعہ دارالسلام عمر آباد ایک عظیم عربی، فارسی اور اردو کالج کا مرتبہ رکھتا ہے۔جہاں مولانا شاکر نائطی (مرحوم) نے پرنسپل اور شیخ الادب کی حیثیت سے جنوبی ہند میں تقریباً وہی کام سر انجام دیا جو اعظم گڑھ میں شبلی نے کیا تھا۔

مولانا شاکر کے جریدے "صحیفہ" میں اعلیٰ شاعری اور نقد و نظر کے نمونے شامل ہوتے تھے۔

پیرنامبٹ میں علمی و ادبی مذاق پیدا کرنے میں این ایم انور (ایم اے ایل ٹی، ایم پی) حضرت مولانا محمد اسماعیل م اسمٰعیل رفیعی اور نثار بھارتی کی خدمات بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

ویلور میں کئی نامی شعراء پیدا ہوئے جن میں سکیم ویلوری، تمام ویلوری مولانا امانی (پرنسپل منبع الانوار کالج لال پیٹ) مولانا صمدانی کمالی ویلوری قابلِ ذکر ہیں۔مولانا کمالی ویلوری کی افتادِ طبع اور شعر کہنے کا انداز نظیر اکبر آبادی سے ملتا جلتا ہے۔

میل وشارم میں جناب ایس ایم جمیل نے بحیثیت صدر انجمن ترقی اردو اپنے رفیق کار زائے احمد بادشاہ ایم اے (مالک کتاب گھر) کو ساتھ لے کر کئی عظیم الشان ادبی اجلاس اور مشاعرے منعقد کئے اور حضرت محوی صدیقی لکھنوی کو بہ اصرار میل وشارم مدعو کر کے برسوں اپنے پاس مہمان رکھا۔حضرت محوی کے دوران قیامِ میل وشارم میں بڑی سازگار ادبی فضا نے جنم لیا۔

مدورا میں مولوی غلام حسین وکیل (امریکن مشن کالج مدورا) کی برکت

سے تمل ناڈو میں جدید فکری شاعری کا آغاز ہوا۔ اور دتیل کی معرکۃ الآرا طویل نظم "کائنات" اور "تحفۂ درویش" پر رشید احمد صدیقی اور حضرت محوی لکھنوی وغیرہم نے بہترین خیالات کا اظہار کیا ہے۔

ترچناپلی مدراس کا ایک اہم ترین علاقہ ہے جہاں علمی اور ادبی روایت کے جدید نقوش کو ابھارنے میں نظر قلندر، متقین حسرت سہروردی، راسخ ایم، پروفیسر اُردو جمال محمد کالج ترچناپلی نے موثر اقدامات کئے ہیں۔ ترچناپلی میں آج سے ۱۲ برس پہلے بھی مرغوب، فرحت، جوہر اور محترمہ عاجزہ وغیرہم نے شعری و ادبی فضا تشکیل کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۰ء تک کی دہائی مدراس میں علمی و ادبی تاریخ میں نشاۃ الثانیہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ قدیم دور میں مدرسۂ اعظم میں مولانا بحرالعلوم فرنگی محلی کی علمی و ادبی خدمات کے بعد جدید دور میں گورنمنٹ آرٹس کالج (مرحوم محمڈن کالج) مدراس نے تمل ناڈو میں تقریباً وہی رول ادا کیا جو علی گڑھ میں مسلم یونیورسٹی نے ادا کیا ہے۔ اس کالج کے پرنسپل بابائے اردو جنوبی ہند ڈاکٹر محمد عبدالحق (ڈی فل آکسن) تھے۔

ڈاکٹر حق کے ایک دوست اور مخیر تاجر مرحوم جناب حاجی جمال محمد راؤتر بہادر نے ایک مجلس خطبات اسلامیہ کی بنیاد ڈالی جس کا عظیم مقصد یہ تھا کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو مذہب کے سائنسی، ثقافتی اور تاریخی پہلوؤں سے روشناس کرایا جائے۔ اس سلسلہ میں یہ ضروری سمجھا گیا کہ عالم و فاضل اصحاب کو مدراس مدعو کیا جائے، اُن سے مختلف تقاریر کرائی جائیں اور ان تقاریر کو کتابی صورت میں شائع بھی کیا جائے چنانچہ سب سے پہلے علامہ سید سلیمان ندوی کو مدعو کیا گیا جن کی تقاریر کا ترجمہ "خطباتِ مدراس" کے نام سے شائع ہوا۔ جنوری ۱۹۲۹ء میں علامہ محمد اقبال اسی سلسلہ میں مدراس تشریف فرما ہوئے اور اُن کی تقاریر کا مجموعہ بزبانِ انگریزی RECONSTRUCTION OF ISLAMIC THOUGHT IN ISLAM کے نام سے شائع ہوا۔ ڈاکٹر عبدالحق، شمس العلماء عبدالجبار اور مولانا رحیم احمد فاروقی وغیرہ کی ادارت میں ایک ماہنامہ "سفینہ" نکلتا تھا جس میں ہندوستان کے تقریباً تمام اکابرینِ علم و فن کی تخلیقات تعارف کے ساتھ شائع ہوتی تھیں۔

۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء کی دہائی تمل ناڈو کی ادبی، علمی اور شعری تاریخ میں ایک نئے باب کی شروعات ہے۔ ترقی پسند تحریک جب پورے ہندوستان میں عروج پر تھی تو اس وقت یہاں تمل ناڈو میں اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا گیا کیونکہ اس وقت یہاں روایت کی جڑیں بہت سخت تھیں۔ شریف، شاطر، دتیل، پروفیسر غلام محی الدین اثر، حکیم آسی ترپاتوری، کمالی ویلوری، مولانا شاکر نائطی اور مولانا رحیم احمد فاروقی آزاد کی وجہ سے فکری شاعری کا آغاز ہوئے چند ہی برس گزرے تھے۔ لیکن جب ترقی پسند تحریک ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں کمزور پڑنے لگی تو اس وقت تمل ناڈو کے چند ادیبوں اور شاعروں نے اسے اپنایا۔ جن میں سب سے پہلے کاکا عبدالواحد، عظیم آمبوری اور دانش فرازی شمالی آرکاٹ ہیں اور اس کے بعد مدراس میں ادیب بھارتی (مرحوم)، راز امتیاز، حسرت سہروردی، فرحت کیفی اور کاوش بدری نے ترقی پسند رجحانات کو عام کیا۔ اسی گروپ نے بعد میں جدیدیت کی ترویج کی اور بعض نئے لکھنے والوں کو بھی دریافت کیا جن میں حضرت آثم کرنولی، ساحل رشید اور عزیز تمنائی ہیں۔ اُن کے بعد ایڈوکیٹ صلاح الدین برق (معتمدِ حلقۂ اربابِ ذوق (مدراس)، حسن فیاض، فیاض حسین (ایڈوکیٹ)، علی اکبر علیم صبا نویدی اور وہاب نازش وغیرہ کی بہت ہمت افزائی کی گئی۔

۱۹۵۹ء میں کاوش بدری اور حسرت سہروردی کی مشترکہ کوشش سے "مرکزِ ادب" کی بنیاد پڑی، جس کا مقصد یہ تھا کہ تمل ناڈو کے نمائندہ شاعر و ادیب کے منتخب فن پاروں کی کتابیں سیریز کی شکل میں شائع کی جائیں، اور ایک مجموعہ تمل ناڈو کے چند گنے چنے شاعروں کی غزلوں پر مشتمل "رنگ برنگ" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے بعد راز امتیاز اور کاوش بدری نے مجلس مصنفین کی بنیاد رکھی جس کے جنرل سکریٹری راز امتیاز کی جد و جہد سے تمل ناڈو میں جدید شعور کی کرنیں پھوٹنے لگیں۔ مجلس کے تحت دانش فرازی کے قطعات کا مجموعہ "رگِ سنگ" منظرِ عام پر آیا تو اس موقعہ پر صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین نے کاوش بدری کے نام ایک طویل خط میں جماعت سازی پر یوں اظہارِ رائے کیا

"مجھے شاعروں کے جتھے بنانا اچھا نہیں لگتا کہ یہ ترقی پسند ہے، یہ روایت پسند، یہ کچھ ہے وہ کچھ۔ سچ تو یہ ہے کہ 'ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہئے'۔ شاعر کا اصل سرمایہ تو اس کے اپنے قلب و ذہن کی واردات ہیں۔ چاہے اُن کے محرک ذاتی، شخصی اسباب ہوں چاہے سماجی حالات، چاہے غمِ عشق ہو چاہے غمِ روزگار یا غمِ جاناں ہو یا غمِ دوراں! اور غم ہی پر کیا موقوف ہے کوئی دل کشا مسرت ہو کوئی جاں فزا رنگ، کوئی

امید کوئی ولولہ مگر ہوا پنا اور سچا اور وہ اُس کیفیت کو سلیقہ سے دوسروں تک منتقل کر سکے۔ اور دوسروں پر اپنی کیفیت طاری کر سکے، انہیں اس کا شریک بنائے۔" روایت پرست، اگر سُنی سُنائی روایتوں کے سہارے کام نکالتا ہے۔ جو اس کی جزو روح نہیں ہیں۔ (جیسا کہ اکثر ہوتا ہے) تو وہ نقالی کرتا ہے۔ شاعری نہیں" ترقی پسند" اگر ترقی اور انقلاب" کے مانگے ہوئے تصورات اور الفاظ اور نعرے لے کر اُدھار مال سے اپنی شاعری کا کاروبار چلاتا ہے (جیسا کہ اکثر ہوتا ہے) اور ان تصورات و افکار نے اس کے وجود داخلی کو ہچکولے نہیں دیئے ہیں۔ جلایا تپایا نہیں ہے تو وہ نہ شاعر ہے نہ ترقی پسند ہے

بر زبانش گفتگو با استعارے در دل او آرزو ہا مستعار!

" چونکہ اس طرح سوچتا ہوں اس لئے ہمیشہ چوکس رہتا ہوں کہ ان رائج الوقت تقسیموں اور اکھاڑہ بندیوں کو تسلیم کرکے اپنے دل و دماغ اور شاعر کے درمیانی راستے میں غیر ضروری رکاوٹیں تو نہیں پیدا کر رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اور آپ کے ساتھی اُردو زبان و اُدب کے ذریعہ سچے شعر و ادب کی خدمت انجام دیتے رہیں گے۔"

اُردو بولنے والوں کی تعداد ۔ تمل ناڈو میں جہاں کی آبادی ۴½ کروڑ کی ہے، جن میں تقریباً چار کروڑ عوام کی مادری زبان خالص تمل ہے۔ وہاں ۷ لاکھ ۵۹ ہزار ۶ سو نے اپنی مادری زبان اُردو لکھوائی ہے۔ اگر ایمان کی پوچھیے تو پندرہ لاکھ مسلمانوں کی مادری زبان اُردو ہوگی۔ ایسے لوگوں کی تعداد جن کی مادری زبان اُردو نہیں ہے لیکن جو اُردو بولتے ہیں، تقریباً ایک کروڑ سے زائد ہوگی۔ ان لوگوں میں تقریباً چالیس لاکھ لوگ اردو بولتے، لکھتے اور پڑھتے ہوں گے۔ مردم شماری کے دوران سب سے بڑی غلطی یہ ہوئی کہ ماں باپ نے بے خیالی میں اور بعض اُردو دشمن عناصر نے عمداً اُردو کی بجائے مادری زبان تمل لکھوا دی ہے۔ شمالی آرکاٹ کے مسلمان بخوبی اُردو بول سکتے ہیں۔ گو پرانی روایات کے پیش نظر آپس میں (بوڑھے اور بوڑھیاں) تمل زبان ہی میں زیادہ گفتگو کرتے ہیں۔ مگر بچوں اور بچیوں کی طرف ان کا روئے سخن اُردو میں ہوتا ہے۔

آج تمل ناڈو میں ذیل کے تین علاقوں کی علاقائی زبان اُردو قرار دی گئی۔ مدراس ڈسٹرکٹ، نارتھ آرکاٹ ڈسٹرکٹ اور ترچناپلی ڈسٹرکٹ۔ ۱۹۵۱ء میں اُردو بولنے والوں کی تعداد تملناڈو میں ۱۶٬۲۶٬۸۲۴ تھی۔ اور ۱۹۶۱ء میں تقریباً ۱۵٬۳۰٬۵۵٬۶ تھی (بہ شمول ہندوستانی اور جو اُردو ہی کی ذیلی بولیاں ہیں) ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق اُردو مادری زبان والوں کی تعداد ۷٬۵۹٬۶۰۷ تھی۔ مگر اب اس کی رفتار ترقی رُک سی گئی ہے۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ڈی ایم کے وزارت نے سہ لسانی فارمولے کو ختم کرکے دو لسانی فارمولہ رائج کر دیا ہے جس کے نفاذ سے اقلیتوں کے غریب طبقے کو اپنی مادری زبان میں تحصیل علم سے زیادہ ملازمتوں کی فکر لاحق ہوگئی ہے اور انہوں نے لامحالہ اُردو مدارس کو خیرباد کہتے ہوئے تمل مدرسوں میں داخلہ لینا شروع کر دیا جس کی وجہ سے درجنوں اُردو لوائر اینڈ ہائر ایلیمنٹری اور ہائی اسکولوں میں جہاں ہزاروں طلبا اُردو زبان پڑھتے تھے وہاں سو پچاس سے بھی کم طلبا نظر آنے لگے۔ اساتذۂ اُردو کا کام بھی اتنا گھٹ گیا کہ بعض لوگوں کی ملازمتیں بھی خطرے میں پڑ گئیں۔ تین تین کلاسوں کو ملا کر مجبوراً ایک کلاس بنانا پڑا۔ کوئمبتور کے ایک ہائی اسکول کے اُردو منشی کو کام نہ ہونے کی وجہ سے چپراسی بنا دیا گیا۔ مگر بعد میں غالب کی صد سالہ برسی کے سلسلے میں عظیم الشان مشاعرہ منعقد کرنے پر چند بارسوخ افسروں اور ایک منسٹر کی سفارش سے ان کو دوبارہ منشی کی پوسٹ پر بحال کیا گیا۔ وہ دن دور نہیں جب ان استادوں کو کارپوریشن کے دفتروں میں کلرک بنا دیا جائے گا یا برطرف کر دیا جائے گا۔

دو لسانی فارمولہ کے تحت سرکاری مدارس میں پارٹ I میں علاقائی زبان یا مادری زبان سکھائی جاتی ہے۔ اور پارٹ II میں انگریزی یا کوئی غیر ملکی زبان (عربی و فارسی بھی شامل ہے) لیکن موجودہ سیاسی پالیسی اور معاشی حالات کچھ ایسے تلخ ہیں کہ وہ طلبا جن کی مادری زبان اُردو ہے، پارٹ I کے تحت اپنی مادری زبان اردو کی بجائے تمل پڑھنا ضروری سمجھتے ہیں اور پارٹ II میں عربی فارسی کی بجائے لامحالہ بین الاقوامی زبان انگریزی کو ترجیح دینے لگے ہیں۔

تمل ناڈو کی ڈی ایم کے سرکار کے اس دو لسانی فارمولے کے خلاف سب سے پہلے آواز اٹھانے والا ادارہ مجلس مصنفین اردو تمل ناڈو تھا۔

تعلیمی سہولتیں ریاست میں اب بھی کثیر تعداد میں میونسپل اور سرکاری ابتدائی، مڈل اور ثانوی اسکول ہیں جہاں اردو ذریعۂ تعلیم ہے۔ متعدد نجی ایلیمنٹری اور ہائی اسکول ہیں جہاں اردو ذریعۂ تعلیم ہے۔ ان کے علاوہ عربی فارسی اور اردو کے مدارس بھی موجود ہیں جو کروڑوں روپیوں کی وقف شدہ جائداد سے چلتے ہیں۔ مدراس سٹی میں کارپوریشن کے تحت بیس اردو ایلیمنٹری اسکولوں میں پانچویں درجے تک اردو اور انگریزی میں اسباق پڑھائے جاتے ہیں تمل زبان ضمناً یہاں پڑھائی جاتی ہے۔ کارپوریشن اردو گرلس اسکول مدراس میں تقریباً انیس ہیں جہاں اردو ذریعۂ تعلیم ہے۔ مذکورہ چالیس اسکولوں میں آٹھویں درجے تک طلبا تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ کارپوریشن کی طرف سے ایک ہی ہائی اسکول ہے جہاں اردو ذریعۂ تعلیم ہے۔ مدراس سٹی میں صرف ایک ہی

گورنمنٹ ٹریننگ ایلیمنٹری اینڈ ہائی اسکول فار اردو بوائز ہے جہاں اردو ذریعۂ تعلیم ہے۔ ترچناپلی میں اسی قسم کا جو ٹریننگ اسکول فار اردو گرلس تھا، بند ہو چکا ہے۔ مدراس میں صرف دو گورنمنٹ ہائی اسکول فار گرلس میں اردو ذریعۂ تعلیم ہے۔ مدراس سٹی میں کئی پرائیویٹ ہائی اسکول فار بوائز میں جہاں اردو ذریعۂ تعلیم ہے جن میں مدرسۂ مرتضویہ، مسلم ہائی اسکول (سی عبدالحکیم ٹرسٹ) اور یتیم خانہ وغیرہ اہم قابلِ ذکر ہیں۔

مدراس کے مختلف علاقوں میں متعدد اسکول ہیں جہاں اردو ذریعۂ تعلیم ہے۔ ان میں اسلامیہ ہائی اسکول وانمباڑی، مدرسۂ اعظم مدراس، اسلامیہ ہائی اسکول پیرنامبٹ، سی عبدالحکیم ہائی اسکول میل وشارم، مدرسۂ اشاعت الحسنات عرف چیتا مدرسۂ نسواں آمبور، مدرسۂ مظہر العلوم ہائی اسکول اور مدرسۂ دینیات آمبور قابلِ ذکر ہیں۔

اردو، عربی، فارسی مدارس تملناڈ میں سات اہم ترین اردو، عربی اور فارسی مدارس قائم ہیں جو تقریباً ایک سو سال سے علمی وادبی خدمات سرانجام دے رہے ہیں جہاں بیرونی ممالک کے طلبا بھی اکتسابِ نور کرتے ہیں۔ ان مدارس میں بیشتر اساتذہ اعلیٰ شعری مذاق ہی نہیں رکھتے بلکہ ان میں چند اچھے ادیب اور شاعر بھی ہیں۔ یہ مدرسے منشی فاضل ادیب فاضل، مولوی اور افضل العلماء کی سند دیتے ہیں۔ ان میں دو چار مدرسوں کو ماہانہ تقریباً چالیس ہزار روپیوں کی آمدنی ہے اور ان میں طلبا کے مفت قیام اور کھانے پینے کا باقاعدہ انتظام ہے۔ طلبا پانچ یا سات سال کا کورس ختم کرکے یہاں سے فارغ ہوتے ہیں۔ ہر مدرسہ میں تقریباً تین چار سو طلبا تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ان مدارس میں مدرسۂ جامعۂ دارالسلام عمر آباد، مدرسۂ باقیات الصالحات عربک کالج ویلور، مدرسۂ لطیفیہ المعروف بہ حضرت مکانی ویلور، جمالیہ عربک کالج مدراس، مدرسۂ محمدی المعروف بہ دیوان صاحب باغ مدراس، مدرسۂ منبع الانوار لال پیٹ، جامعۂ انوار العلوم ترچناپلی مشہور ہیں۔

یونیورسٹی اور کالج تمل ناڈو میں تین یونیورسٹیاں ہیں۔ مدراس یونیورسٹی، مدورا یونیورسٹی جو ابھی حال میں قائم ہوئی ہے اور اناملے یونیورسٹی۔ ان تینوں یونیورسٹیوں میں اردو موجود ہے۔ مدورا یونیورسٹی میں ہنوز اردو کا پروفیسر نہیں ہے۔ مدراس یونیورسٹی میں عربی فارسی اور اردو کا مشترکہ پروفیسر ہے۔ اناملے یونیورسٹی میں اردو اور ہندی کا مشترکہ پروفیسر ہے۔ مشترکہ پروفیسر ہونے کی وجہ سے مذکورہ یونیورسٹیوں میں اردو کو زیادہ فروغ پانے کا موقع نہیں ملتا اگر ان تینوں زبانوں کے علٰحدہ علٰحدہ شعبے قائم ہو جائیں تو ہر زبان میں تحقیقی کام کرنے کا موقع فراہم ہو سکتا ہے۔ ابھی تک مذکورہ یونیورسٹیوں میں ایم اے اردو کا درجہ نہیں۔ البتہ مدراس یونیورسٹی میں عربی ایم اے کا الحاق ہے۔ حضرت محوی کے زمانے میں اردو زبان وادب پر بہت کام ہوا۔ کئی کتابیں اردو سے متعلق یونیورسٹی کے ذریعہ شائع ہوئیں۔ مولانا محمد یوسف کوکن کا تقرر جب شعبۂ عربی و فارسی کے لئے ہوا تو حضرت محوی کے تعاون سے کئی نایاب عربی اور اردو مخطوطات کو اردو زبان میں محفوظ کر لیا گیا اور انہیں کتابی شکل دی گئی۔ مدراس یونی ورسٹی میں تقریباً دس سالوں سے ایم لٹ یا پی ایچ ڈی (اردو) کے لئے کسی نے اپنا نام درج نہیں کرایا۔ صرف نظر قلندر حسرت سہروردی نے ۱۹۶۰ء میں بزبان اُردو ایم لٹ کیا ہے موصوف کو پی ایچ ڈی کرنے کا موقع مدراس یونی ورسٹی سے اس لئے نہیں مل رہا ہے کہ صدر شعبہ پی ایچ ڈی نہیں ہیں۔ مدراس یونی ورسٹی کے اُردو ڈپارٹمنٹ میں کوئی لکچرر اُردو زبان و ادب میں ڈگری یافتہ نہیں ہے۔ عربی اور فارسی کے سند یافتہ لوگوں سے اُردو کا کام لیا جا رہا ہے۔

یہاں کے کالج ذیل میں تمل ناڈو کے ان کالجوں کے نام درج ہیں جہاں اُردو زبان پارٹ II کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے (۱) ایس آئی ای ٹی کالج فار ویمن مدراس جس کے بانی اور سرپرست جسٹس بشیر احمد سعید ہیں۔ (۲) کوین میریز کالج فار ویمن شہر مدراس کا قدیم تاریخی ادارہ ہے (۳) گورنمنٹ آرٹس کالج مدراس (مرحوم محمڈن کالج) (۵) پریسیڈنسی کالج مدراس (۶) نیو کالج مدراس۔ یہ مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن کے تحت چلنے والا عظیم ادارہ ہے۔ یہاں ایسے اساتذہ کی خاصی تعداد ہے جن کی مادری زبان اُردو ہے۔ اس کالج میں اسلامک سیمیناری قائم ہے اور پی عبدالواحد ایجوکیشنل ٹرسٹ کی جانب سے ایکسٹنشن لکچرز کا انتظام بھی ہے۔ جس کے تحت مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا سعید اکبرآبادی وغیرہ تشریف لا چکے ہیں۔ اس کالج کے آل انڈیا مشاعرے بھی مشہور ہیں۔ کالج میں چار ہزار سے زیادہ طلبا ہیں۔ اُردو زبان وادب کی ترویج واشاعت کے لئے اس کالج میں پروفیسر حامد صدیقی اور پروفیسر سیّد عباس صاحب کی مساعی جمیلہ سے ادارۂ ترقی اُردو بھی قائم ہے (۷) جمال محمد کالج ترچناپلی میں تقریباً تین ہزار سے زیادہ طلبا تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ تقریباً ۱۵۰ لکچرر ایسے ہیں جن کی مادری زبان اُردو ہے۔ پروفیسر حسرت سہروردی ایم لٹ صدر شعبۂ اُردو ہیں۔ (۸) مقید شاہ نقت بورڈ کالج مدراس (۹) اسلامیہ کالج وانمباڑی (۱۰) مظہر العلوم کالج آمبور (۱۱) گورنمنٹ [illegible] (۱۲) گورنمنٹ آرٹس کالج ویلور (۱۳) سی عبدالحکیم [illegible] ان تیرہ کالجوں میں تقریباً سترہ ہزار طلباء سے زیادہ

تعلیم حاصل کرتے ہیں جن میں تقریباً ۵ پانچ ہزار سے زیادہ طلباء کی مادری زبان اُردو ہے جو پی یو سی اور ڈگری کلاسوں میں اُردو کو پارٹ II کی حیثیت سے پڑھتے ہیں۔ سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ مدراس یونی ورسٹی میں اُردو ایم اے نہ ہونے کی وجہ سے ان کالجوں کے لئے اُردو اساتذہ کا ملنا دشوار ہے۔

اُردو اخبارات ورسائل: تمل ناڈو میں صرف دو اُردو روزنامے ہیں۔ ایک روزنامہ "مسلمان" ہے جو ۱۹۲۷ء سے باقاعدہ جاری ہے۔ جس کے مدیر عبدالطیف فاروقی ہیں۔ جنگِ آزادی کے دوران موصوف کی سیاسی خدمات کے صلے میں مرکزی حکومت نے حال ہی میں دو سو روپیوں کے وظیفہ سے نوازا ہے۔ اس روزنامے کی اشاعت تقریباً پانچ ہزار ہے۔ دوسرا روزنامہ "اتحاد" ہے جو تقریباً ایک سو سال سے ہفتہ وار کی شکل میں جاری تھا۔ حال ہی میں یہ ہفتہ وار روزنامہ بن گیا ہے۔ اس کی اشاعت تقریباً دو ہزار ہے۔ ۱۹۵۱ء کی دہائی میں یہاں بے شمار ہفتہ وار نکلے، جن میں "شر"، "منیر"، "فانوس"، "افکار"، "آزاد مزدور"، "زندگی"، "آزاد نوجوان"، "سرکار"، "زمانہ"، "اتحاد"، وغیرہ ہیں۔ ۱۹۶۱ء کی دہائی میں، "پیام جنوب"، "سفیرِ ہند" (پندرہ روزہ) "امام"، "پاکیزہ"، "نجمہ"، "ہم نشین"، "اتحاد"، "قلم دلیش"، "ہم سفر"، "تمل ناڈو ٹائمز"، "مبین"، "مسلم رپورٹ"، "رفیقِ ملت" وغیرہ تھے۔ ۱۹۷۱ء میں مذکورہ ہفتہ واروں میں صرف "مبین"، "تمل ناڈو ٹائمز"، "رفیقِ ملت"، "مسلم رپورٹ" اور "آزاد نوجوان" ہی باقی رہ گئے ہیں۔ "مبین" اور "تمل ناڈو ٹائمز" ہی ان پانچوں ہفتہ واروں میں باقاعدہ جاری ہیں۔ ان ہفتہ واروں کی تعداد اشاعت ایک ہزار ہے۔ ماہناموں میں ۱۹۵۱ء کی دہائی میں "پیغام"، "قلمستان"، "مشعل"، "فن کار" اور "منزل" نکلتے رہے۔ ۱۹۶۱ء کی دہائی میں "جل ترنگ"، "آب وتاب"، اور "ساون" نکلے۔ ان ماہناموں کی اشاعت بھی تقریباً ایک ہزار تھی۔ وانمباڑی سے ایک اُردو ڈائجسٹ "حنا" کا اجرا اسی ماہ سے ہوا ہے جس کے مدیر ملک العزیز ہیں۔ مذکورہ بالا کالج اور پرائیوٹ مدارس سے بڑے شاندار سالنامے نکلتے ہیں۔ ان سالناموں میں "جیا"، "اللطیف"، "دارالسلام"، "سفیر"، "آئینہ ایام"، اور "الباقیات" قابلِ ذکر ہیں۔

علمی وادبی سرگرمیاں: تملناڈو میں تقریباً ڈھائی سو شعراء ہیں۔ جن کی ایک خاصی تعداد مقامی مشاعروں میں حصہ لیتی ہے۔ جنوب اور خصوصاً مدراس سے نکلنے والے مقامی رسائل میں بھی ان میں سے بعض لوگ چھپتے ہیں۔ ان میں بعض شعراء صرف تمل ناڈو کے اُردو ادب میں نمایاں مقام رکھتے ہیں بلکہ ان میں سے چند ملک بھر میں مشہور ہیں۔ جن کی شعری ونثری تخلیقات ہند وپاک کے جدید وقدیم معیاری رسائل میں شائع ہوئی ہیں۔ ان میں بعض لوگوں کی شعری تخلیقات مجموعوں کی شکل میں شائع ہو چکی ہیں جن پر قدآور نقادوں اور شاعروں کے تبصرے متعدد رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔

فہرستِ شعرائے جدید: تمل ناڈو کے جدید شعراء میں دانش فرازی، کاوش بدری، راز امتیاز، اسمٰعیل رئیسی، فرحت کیفی، عزیز تمنائی، حسرت سہروردی، ساحل رشید، ادیب بھارتی (مرحوم)، کمال ویلوری، راجی صدیقی، آثم کرنولی، عبد مدراسی، بدر جمالی، نورس خیامی، ہلال جہانگیر، تمنا یوسفی، حیات مدراسی، حسن فیاض، اور علیم صبا نویدی، قابلِ ذکر ہیں۔ ان شعراء میں دانش فرازی کے تین شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ نورس خیامی کا شعری مجموعہ شائع ہو چکا ہے عزیز تمنائی کے سانٹوں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے کاوش بدری کی ایک طویل مثنوی اور مسدس کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ حسرت سہروردی کا عظیم تمل شاعر ترو وتور کی منظوم تمل تصنیف "کرل" کا اُردو ترجمہ ساہتیہ اکاڈمی کی طرف سے شائع ہو چکا ہے حسرت سہروردی کا زیر اشاعت شعری مجموعہ "گل نالۂ دل" ہے۔ اسمٰعیل رئیسی نے ٹی ایس ایلیٹ کی چند نظموں کے منظوم تراجم کئے ہیں جن میں "چند شب خون" (ماہنامہ الہ آباد) میں شائع ہو چکے ہیں۔ "عصری ادب" کے ایک شمارہ میں ڈاکٹر محمد حسن نے راز امتیاز کا مناسب تعارف کرایا ہے جدید صنف ترائیلے میں فرحت کیفی کے تقریباً دو سو ترائیلوں کا مجموعہ زیر اشاعت ہے۔ مذکورہ شعراء میں چند کی جدید غزلوں اور جدید نظموں کے مجموعے زیرِ طبع ہیں۔

افسانہ نگار: یہاں پچھلے دو تین برسوں میں کئی جدید افسانہ نگار اور شاعر ابھرے ہیں۔ افسانہ نگاروں میں ایس ایم حیات بادشاہ، ادیب بھارتی، راز امتیاز، علی اکبر امید رس، مہر طلعت، علیم صبا نویدی، حسن فیاض، فضل جاوید، انور ربانی، رشید مدراسی ایڈوکیٹ، صلاح الدین پاشہ برق (معتمد حلقہ ارباب ذوق)، فیاض حسینی (ایڈوکیٹ)، قابلِ ذکر ہیں۔ صلاح الدین برق جنوب میں خلیل جبران کے بارے میں حرفِ آخر مانے جاتے ہیں۔ موصوف کے کئی منظوم اور نثری تراجم شائع ہو چکے ہیں۔ مذکورہ افسانہ نگاروں میں علی اکبر، علیم صبا نویدی، حسن فیاض، فضل جاوید، رشید مدراسی کے افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ حسرت سہروردی، اور ایس ایم حیات بادشاہ نے شاہکار تمل افسانوں کے ترجمے کئے ہیں۔

نثرنگار: نثرنگاروں میں پروفیسر محمد یوسف کوکن عمری، پروفیسر فضل اللہ، سید محمد یوشع، حمزہ حسینی، راز امتیاز، اسمعیل رفیعی، دانش فرازی، حسرت سہروردی، اور کاوش بدری قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر کوکن کی متعدد تحقیقی و تاریخی و ادبی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ حمزہ حسینی، پروفیسر فضل اللہ اور محمد یوشع کی کتابیں بھی تاریخی و ادبی موضوعات پر شائع ہو چکی ہیں۔

تنقید نگار: تنقیدی مقالات لکھنے والوں میں اسمعیل رفیعی، راز امتیاز، دانش فرازی، اور کاوش بدری ہیں۔

ادبی انجمنیں تملناڈو میں ان گنت اردو ادبی انجمنیں ہیں۔ تملناڈو میں "مجلس مصنفین اردو" کے ذریعے یہاں پر تنقیدی شعور عام ہوا۔ اور جدید نظم اور جدید غزل کی طرف جھکاؤ پیدا ہوا۔ مذکورہ مجلس کے جنرل سکریٹری راز امتیاز اور ناظم نشرواشاعت راقم الحروف ہیں۔ اس مجلس کے تحت تین منظوم تصنیفات شائع ہو چکی ہیں۔ "حلقۂ ارباب ذوق" جدید افسانہ نگاروں اور شاعروں کی انجمن ہے جس کے معتمد صلاح الدین برق ہیں اور راقم الحروف اور راز امتیاز وائس پریذیڈنٹ ہیں۔ "اے جے اردو سیمینار" نے مدراس میں کئی عظیم الشان کل ہند مشاعرے منعقد کئے۔ اس ادارے سے پروفیسر عبدالوہاب بخاری اور پروفیسر حیدر علی خاں حیدر وابستہ ہیں۔ "اردو ایسوسی ایشن" کے ذریعہ مخصوص نشستوں کا اہتمام ہوتا ہے اس کے جنرل سیکریٹری راجی صدیقی ہیں۔ مذکورہ انجمنوں کے علاوہ شہر مدراس میں [illegible] "اردو انجمن" "بزم شگوفہ" "تمل ناڈو پبلیکیشن" "فردوس ادب" "حلقۂ ادب" "محفل ادب"، "کرسنٹ سوسائٹی"، "بزم راغب"، "بزم سخن"، "انجمن شعرائے اہل بیت" وغیرہ موجود ہیں۔ پنجابی ایسوسی ایشن مدراس کی جانب سے کل ہندیا نے پر عظیم الشان مشاعرے ہوتے ہیں۔ ان مشاعروں کے ذریعہ لاکھوں روپیں کا سرمایہ اکٹھا ہوا جو پنجابی اسکول کے لئے صرف کیا جاتا ہے جس میں اردو کی بجائے ہندی پڑھائی جاتی ہے۔

کتب خانے تمل ناڈو میں متعدد اہم کتب خانے ہیں۔ مولانا محمد غوث شرف الملک مرحوم کے ورثا کے یہاں جو مدراس دیوان صاحب کے باغ میں مقیم ہیں۔ علوم و فنون کی عربی فارسی اور اردو کتابوں کا ایک انوکھا اور بے مثال ذخیرہ موجود ہے یہاں بھی میں حیدرآباد اور دوسرے مقامات کو چھوڑ کر صرف مدراس کی کتابوں کو شمار کرنا شروع کیا گیا ہے تا حال ۷۱،۴۹۲ کتابیں شمار ہوئی ہیں ان میں پندرہ ہزار سے زیادہ کتابیں قلمی ہیں۔ یہ "امانتی لائبریری" کے نام سے موسوم ہے۔ اسی طرح مدرسہ جامعہ دارالسلام عمرآباد، مدرسہ باقیات الصالحات، مدرسہ لطیفیہ (حضرت مکانی ویلور) مدرسہ مظہر العلوم مالی اسکول آمبور میں ہزاروں کتابیں عربی فارسی اور اردو کی موجود ہیں، کتب خانۂ عام اہل اسلام مدراس میں بھی بڑی نایاب کتابیں موجود ہیں (لگ بھگ تیس ہزار) ہزاروں روپوں کی آمدنی ہر ماہ اس لائبریری کو حاصل ہے مگر عرصہ دراز سے ایک نئی کتاب بھی نظر نہیں آتی۔ فہرست میں بہت ساری نایاب کتابوں کے نام درج ہیں جو الماریوں سے غائب ہیں۔ خصوصاً ریکارڈ آفس مدراس میں ہزاروں کتابیں عربی فارسی اور اردو کی محفوظ ہیں۔ مگر مدراس یونی ورسٹی لائبریری میں جدید کتابوں کا فقدان ہے۔ تملناڈو کے مختلف اضلاع میں ان گنت لائبریریاں ہیں۔ جہاں کم و بیش کئی چار لاکھ اردو کی کتابیں ہوں گی۔ جمال محمد کالج ترچناپلی اور فلاح ملت فیڈریشن آمبور میں قدیم و جدید کتب کا ایک انبار موجود ہے۔ گورنمنٹ اورینٹل سنسکرت لائبریری مدراس میں بھی اردو کی بڑی نایاب کتابیں ہیں۔

ریاستی سرکار کی جانب سے اردو کی سرپرستی نہ کبھی تھی نہ اب ہے۔ یہاں نہ کسی کو اعلیٰ اردو تصنیفات پر کوئی انعام ملتا ہے اور نہ کسی کو کوئی اعزاز ہی نصیب ہوا ہے۔ حالانکہ تمل زبان کے بعد یہاں ریاست بھر میں کثیر تعداد میں بولی جانے والی زبان اردو ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ آل انڈیا ریڈیو مدراس میں جہاں ہندی، تلگو، ملیالم وغیرہ کے شعبے موجود ہیں۔ اردو کا نام و نشان تک نہیں۔ اس کے برعکس وجے واڑہ (اے پی) میں تملناڈو سے بھی ۵۰٪ کم اردو بولنے والے ہیں مگر وہاں کے ریڈیو اسٹیشن سے "نورس" کے نام سے علمی ادبی و شعری پروگرام براڈکاسٹ ہوتا رہتا ہے۔ یہاں کے کسی محکمے میں جزوی یا کلی طور پر اردو میں کام کاج نہیں ہوتا۔ خود مدراس یونی ورسٹی میں اردو سے زیادہ عربی اور فارسی پر کام ہو رہا ہے۔ یہاں ریاست کی جانب سے کوئی رسالہ اردو میں نہیں نکلتا۔ یہاں اردو اکاڈمی کا وجود نہیں ہے اور انجمن ترقی اردو کی شاخ بھی کبھی کی بند ہو گئی۔

کیرلہ میں اردو تملناڈو میں اردو کی رفتار کا جائزہ لینے کے بعد مختصراً کیرلہ میں اردو کی پوزیشن پر روشنی ڈالنا نہایت ضروری ہے۔ چونکہ مدراس سے پہلے عربوں کے قدم کیرلہ میں پہنچے تھے اور وہاں کی زبان ملیالم کے عربی زبان سے سنجوگ ہونے سے یقیناً ایک ایسی زبان نے جنم لیا گیا۔ جو قریب قریب اردو سے ملتی جلتی رہی ہوگی۔ اگر اس زبان کو وہاں پنپنے کا موقع شروع سے ملا ہوتا تو

آج اُردو کا معیار وہاں تمام ریاستوں سے بلند رہا ہوتا۔ کیرلہ کے باشندوں کی مادری زبان ملیالم ہے۔ اُردو یہاں بیرونی زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ مسلمان جن کی مادری زبان اُردو ہے پٹھان کہلاتے ہیں۔ ان لوگوں کی تعداد بھی آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ عربی چونکہ مسلمانوں کی مذہبی اور مقبول زبان ہے اس لئے زیادہ سے زیادہ ملیالی مسلمان طلبا، عربی زبان کو سیکنڈ لینگویج کی حیثیت سے پڑھنا اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔ کیرلہ کے مختلف علاقوں میں [illegible] اسکول ایسے ہیں جن میں سیکنڈ لینگویج کی حیثیت سے اُردو کی تعلیم کا انتظام ہے۔ ایک دو طالب علم بھولے بھٹکے [illegible] اُردو کی طرف بھی آنکلتے ہیں اُردو لینے میں ایک زبردست رکاوٹ اور دشواری یہ ہے [illegible] ڈگری کورس ختم کرکے ڈگری کورس میں انہیں اُردو کو خیرباد کہہ کر دوسری زبان بدلنی پڑتی ہے۔ اس لئے طلبا، کالج میں داخلہ لیتے وقت اُردو سے اجتناب کرتے ہیں۔ اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لئے فوری کارروائی کی ضرورت تھی۔ لہٰذا محمد حسین شاکر ایم اے صدر شعبۂ اُردو گورنمنٹ برنن کالج تلیچیری (کیرلہ) نے ڈائرکٹر آف کولجیٹ ایجوکیشن کے نام درخواست بھیجی کہ ڈگری کورس میں اُردو کو داخل کیا جائے [illegible] کیرلا کے چند لوگوں سے جو اُردو سے بھی [illegible] مدد حاصل کی۔ بالآخر ۱۹۵۰ء سے اُردو کو ڈگری کورس میں داخل کردیا گیا۔ ۱۹۵۲ء میں لسانی بنیاد پر جب صوبوں کی تقسیم ہوئی اور ملابار کو صوبۂ مدراس سے الگ کرکے کیرالہ میں ضم کردیا گیا تو کیرلہ کی جانب سے اُردو کے امتحان کا انتظام بھی نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ متعدد مقامات پر مدارس میں اُردو ختم ہوگئی۔ ۱۹۵۷ء میں پبلک اور مختلف انجمنوں اور اداروں کی جانب سے حکومت کیرلہ کی خدمت میں کئی محضر بھیجے گئے اور اُن میں اس بات پر بھی زور دیا گیا کہ جس طرح عربی سنسکرت اور دیگر زبانوں میں اساتذہ کی فراہمی کا انتظام ہوتا ہے۔ اسی طرح اُردو LOWER اور HIGHER میں بھی اُردو اساتذہ کی فراہمی کا انتظام ہو۔ تقریباً ۱۰ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد حکومت کیرلہ نے ۱۹۷۱ء سے اُردو HIGHER اور LOWER امتحانات منعقد کرنے کا اعلان کردیا اور تقریباً دو سالوں سے یہ دونوں امتحانات ہونے لگے ہیں۔ کیرالہ یونی ورسٹی سے یہ درخواست بھی کی گئی کہ افضل العلما اور دوسرے امتحانات کی طرح اُردو کے ادیب فاضل امتحانات کا انتظام بھی کیا جائے تاکہ اعلیٰ ثانوی مدارس میں اُردو پروفیسروں کی فراہمی کا مسئلہ حل ہوسکے۔ خدا خدا کرکے ۱۹۶۶ء سے ادیب فاضل کے امتحانات کی اجازت مل گئی۔ ۱۹۵۷ء سے بی اے میں اُردو شروع ہوجانے کے بعد اُردو کے بہی خواہوں کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ حکومت اس زبان کو مضمون اختیاری کی حیثیت سے بھی پڑھانے کا انتظام کرے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں بھی کامیابی حاصل ہوگئی۔ اور ۶۸ سے گورنمنٹ برنن کالج میں اُردو بھی مضمون اختیاری کی حیثیت سے پڑھائی جارہی ہے ۷۴-۱۹۷۳ء کے تعلیمی سال سے گورنمنٹ نے برنن کالج میں اُردو پوسٹ گریجویٹ کورس جاری کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کورس کے الحاق کے لئے کالی کٹ یونی ورسٹی سے درخواست کی گئی ہے۔ اُردو زبان و ادب [illegible] کیرلا میں [illegible] زندگی عطا کرنے والی شخصیت پروفیسر محمد حسین شاکر ایم اے کی ہے۔ جن کی مساعی [illegible] کا نتیجہ ہے کہ کیرلا میں طلبا میں اُردو سے کافی دلچسپی پیدا ہوگئی ہے [illegible] کی کوشش سے عنقریب کیرلہ میں آل انڈیا اُردو کانفرنس کا انعقاد بھی عمل میں آنے والا ہے۔

تجاویز:

۱۔ ریاستی حکومت [illegible] اور ساہتیہ اکاڈمی کی ریاستی شاخ کی جانب سے تمل ناڈو اور کیرلا کے معیاری اردو ادیبوں اور شاعروں کی کتابوں پر انعامات، وظیفے اور دوسرے ایوارڈ دیئے جائیں۔

۲۔ تمل ناڈو اور کیرلا کی یونی ورسٹیوں میں شعبۂ اُردو قائم کیا جائے۔ مدراس یونی ورسٹی میں تاحال عربی، فارسی اور اُردو کا ایک ہی مشترکہ شعبہ ہے لہٰذا تینوں شعبوں کو علیحدہ کرکے ان کے لئے علیحدہ علیحدہ صدر شعبہ مقرر کیے جائیں۔

۳۔ آل انڈیا ریڈیو مدراس، ترچناپلی وغیرہ سے روزانہ مقامی خبریں، دیہاتیوں اور کسانوں کے خصوصی پروگرام اُردو میں بھی نشر کرائے جائیں۔ ہفتہ وار اُردو ادبی پروگرام کا آغاز کرکے اس کے وقت میں مزید توسیع کرائی جائے۔

۴۔ تمل ناڈو محکمۂ اطلاعات کی جانب سے ایک ماہنامہ اُردو میں شائع کرایا جائے جیسے ہریانہ، یوپی، آندھرا وغیرہ میں ہورہا ہے اور اُردو اخباروں کے لئے ریاستی خبروں کو اُردو میں ترجمہ کرکے فراہم کیا جائے۔

۵۔ دونوں ریاستی حکومتوں کا جو کلچرل ڈپارٹمنٹ ہے اس میں ابتک اُردو اقلیت کو نظر انداز کردیا گیا ہے۔ لہٰذا اس ڈپارٹمنٹ کی جانب سے کرائے جانے والے ثقافتی پروگراموں میں اُردو والوں کو بھی شریک کیا جائے۔

(بقیہ صفحہ ۹۴ پر)

نیز بھاشا ریجی کے سپرد لسانی اقلیتوں کا کام کیا گیا ہے۔ توقع ہے کہ آئندہ سال سے ۲۵۰ پرائمری اسکول صوبے میں کھولے جائیں گے اردو میں نصابی کتابیں شائع کی جائیں گی۔ اردو کے اساتذہ کی ٹریننگ اور ان کی تعیناتی کا انتظام کیا جائے گا۔ ٹیکنیکل کالج آف ایجوکیشن اجمیر میں سنہ ۱۹۷۱ء سے اردو کو بھی نصاب میں شامل کیا جا چکا ہے۔

اردو اخبارات و رسائل

صحافت کے اعتبار سے راجستھان میں کوئی نمایاں کام نہیں ہوا۔ تاہم اس خطے میں صحافت کی روایت بڑی پرانی ہے۔ اس خطے سے پہلا ہفتہ وار "مظہر السرور" بھرت پور سے سنہ ۱۸۴۹ء میں پہلا ماہنامہ "البیان" جے پور سے ۱۹۰۰ء میں اور پہلا سہ ماہی "شاعری کی کایا پلٹ" ۱۹۱۴ء میں جھالاواڑ سے شائع ہوا۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں اور بیسویں صدی کے پہلے ربع میں مختلف مقامات سے مختلف اوقات میں متعدد اخبار و رسائل شائع ہوتے رہے۔

قیامِ راجستھان کے بعد سنہ ۱۹۴۸ء میں کوٹہ سے منشی للتا پرشاد شاد نے "الشاد" کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا تھا جو سنہ ۱۹۵۰ء میں بند ہو گیا۔ اس کے بعد غالباً سنہ ۱۹۵۱ء میں جے پور سے روزانہ اخبار "خبر" جاری کیا گیا۔ انجمن ترقی اردو جے پور کے قیام کے بعد سنہ ۱۹۵۵ء میں جے پور سے اخبار "نئی روشنی" مولانا احترام الدین احمد شاغل کی ادارت میں جاری ہوا۔ یہ اخبار پابندی کے ساتھ کئی سال تک جاری رہا۔ سنہ ۱۹۶۰ء کے بعد سے اب تک راجستھان سے حسبِ ذیل اخبار جاری ہوئے۔ ان میں سب سے زیادہ عرصہ تک جاری رہنے والا اخبار پندرہ روزہ "بشارت" جے پور ہے جس کے مدیر کلیم الدین تجلی عثمانی ہیں۔ یہ اخبار ۵ نومبر سنہ ۱۹۶۲ء میں جاری ہوا تھا اور اب تک پابندی کے ساتھ چھپ رہا ہے۔ اس میں سیاسی خبروں پر بے لاگ اور غیر جانبدار تبصرے ہوتے ہیں۔ ملکی اور بین الاقوامی حالات کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ سیاسی خبروں پر تبصرے کے علاوہ اس کا ایک حصہ ادبی بھی ہوتا ہے جس میں راجستھان کے قدیم و جدید شعرا کا تعارف، کلام اور ادبی جھلکیاں ہوتی ہیں۔

اس کے علاوہ "بدلا ہوا زمانہ" ہفت روزہ اخبار قابلِ ذکر ہے جو فصاحت علی شہابی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ یہ اخبار جنوری سنہ ۱۹۷۱ء میں جاری کیا گیا تھا اور پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ اس میں سیاسی خبریں اور ادبی مواد ہوتا ہے۔

ماہناموں میں پابندی کے ساتھ شائع ہونے والا جریدہ "سلطان الہند" ہے۔ یہ ماہنامہ صولت حسین خاں دیوانِ درگاہ اجمیر کی سرپرستی میں سنہ ۱۹۶۷ء سے پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ اس میں تصوف اور مذہب سے متعلق کافی معلومات اور مضامین شائع ہوتے ہیں۔ "ایجنٹ" ہفت روزہ اخبار "ہندوستان" سنگھل اور قیصر رشید کی ادارت میں جاری ہوا تھا ابھی چھپ رہا ہے۔ ایک ماہنامہ "گلزار" جے پور سے غلام احمد کلیم گزشتہ دو سال سے جھنجھنوں سے شائع کر رہے ہیں۔

علمی و ادبی سرگرمیاں

راجستھان کے ادیبوں، مصنفوں اور شاعروں کی صحیح تعداد کا اندازہ لگانا مشکل ہے یقیناً ۵۰۰ سے زائد تعداد ہوگی۔ اس لئے کہ سنہ ۱۹۷۰ء میں راقم نے ایک بار راجستھان کے شعرا و ادبا کی فہرست مرتب کرنے کی کوشش کی تھی۔ نامکمل فہرست میں اس وقت حیات ۲۵۰ سے زائد حضرات کے نام شامل ہو چکے تھے۔ "تذکرہ شعرائے جے پور" مصنفہ مولانا احترام الدین احمد شاغل، "تذکرہ شعرائے جودھپور" جناب "سخن" مصنفہ شرف الدین یکتا، "تذکرہ دامانِ باغبان" جس میں ایسے شعرا کا ذکر ہے جو سرکاری مدارس میں اساتذہ ہیں، "راجستھان کے موجودہ اردو شاعر" مرتبہ پروفیسر پریم شنکر سریواستو، راقم الحروف کا تحقیقی مقالہ اور جے پور، اودے پور اور ٹونک میں منعقدہ کل ہند مشاعروں اور سمپوزیم و سیمینار وغیرہ کی مطبوعہ رپورٹس کے مطالعہ سے مندرجہ بالا قول کی صداقت ہوتی ہے۔ سربرآوردہ شاعروں اور ادیبوں میں سے صرف چند حضرات کے نام ذیل میں درج کئے جاتے ہیں یہ وہ حضرات ہیں جن کے کلام کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں یا انکی تصانیف و مضامین و مقالات شائع ہوتے رہتے ہیں۔

۱۔ الحاج مولانا احترام الدین شاغل (مرحوم) راجستھان کے شعرا و ادبا اور اردو کی بقا اور ترقی و ترجیح کے لئے کام کرنے والوں میں حضرت شاغل مرحوم کا نام سرِفہرست نظر آتا ہے۔ انہی کی کوششوں سے سنہ ۱۹۵۳ء میں انجمن ترقی اردو جے پور اور سنہ ۱۹۵۶ء میں صوبائی انجمن قائم ہوئی۔ موصوف نے اخبار "نئی روشنی" کی ادارت کے علاوہ تقریباً ۳۵ کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ ان میں سے ۲۰ کتابیں شائع بھی ہو چکی ہیں۔ ان میں سے "تذکرہ شعرائے جے پور"، "گلدستہ بلاغت" اور "دیوان شاغل" حصہ اول خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۲۔ الحاج مولانا ایوب خاں صاحب قمر واحدی۔ قمر صاحب نہ صرف صاحبِ دیوان استاد شاعر بلکہ اردو کے ایک بے لوث خدمتگار ہیں۔ آپ سنہ ۱۹۵۰ء سے اردو کالج جے پور میں بحیثیت پرنسپل اعزازی خدمت انجام دے رہے ہیں

۳۔ مولانا سید منظور الحسن برکاتی۔ راجستھان کی قدیم ترین اسلامی

درسگاہ "دارالعلوم خلیلیہ" ٹونک میں ادبیات اُردو کے استاد مولانا منظور الحسن صاحب برکاتی کا نام راجستھان کی ادبی دنیا میں خاص مقام رکھتا ہے۔ آپ کا خاص میدان نثر ہے۔ ملک کے مشہور جرائد میں آپ کے مضامین اکثر چھپتے رہتے ہیں کئی مطبوعہ کتابیں بھی ہیں۔ اُن میں سے "ٹونک کی عیدیں" (۱۹۵۸ء) "تاجدارِ مدینہ" (۱۹۶۷ء) "ٹونک کے جشنِ عید میلاد النبی" (۱۹۶۵ء) "بسمل سعیدی اپنے وطن میں" (۱۹۶۶ء)، خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

غلام معین الدین مفتون

ضلع کوٹہ بوندی اور جھالاواڑ کو ادبی سرگرمیوں سے واقف کرانے والے جناب مفتون کوٹوی کو راجستھان کی ادبی دنیا میں خاص مقام حاصل ہے آپ نہ صرف خوشگو شاعر بلکہ نثر نگار بھی ہیں۔

مولانا عبدالرحیم سالک عزیزی

خوشگو شاعر اور نثر نگار ہیں۔ "سلکِ گوہر" کے نام سے ایک مجموعۂ کلام ۱۹۶۰ء میں شائع ہو چکا ہے۔ آپ کی جدوجہد سے ضلع سیکر، چورو اور جھنجھنوں جیسے ریگزار میں چمنِ اُردو کی آبیاری ہو رہی ہے۔ وہاں انجمن ترقی اُردو صحیح معنی میں سرگرمِ عمل ہے۔ یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ آپ کی کوششوں سے جس قدر اُردو کے مدارس ضلع جھنجھنوں میں قائم ہیں، راجستھان کے کسی دوسرے ضلع میں اس کی اس زمانہ میں مثال نظر نہیں آتی۔ آپ ہی کی کوششوں سے قصبہ نوا میں قمرالسعد کالج قائم ہوا جو جامعۂ اردو کے امتحانات کا ایک بہترین مرکز رہا ہے۔

پروفیسر پریم شنکر سریواستو

شعبۂ انگریزی گورنمنٹ کالج بیکانیر کے صدر ہیں مگر اردو سے بے انتہا دلچسپی رکھتے ہیں۔ انجمن ترقی اُردو کے نائب صدر بھی رہے اور "نخلستان" سہ ماہی رسالے کے ایڈیٹر بھی۔ شاعر بھی ہیں نثر نگار بھی۔ آپ کی سب سے اہم تصنیف "راجستھان کے موجودہ اردو شاعر" ساہتیہ اکیڈمی راجستھان نے ہندی رسم الخط میں ۱۹۶۹ء میں شائع کی تھی۔

سید فضل متین متین

فضل متین صاحب اجمیر کے ادیبوں میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں سہ ماہی رسالہ "نخلستان" کے عرصۂ دراز تک معاون مدیر رہے۔ آپ نے "تذکرۂ شعرائے اجمیر" مرتب کیا ہے جو ابھی زیورِ طباعت سے آراستہ نہیں ہوا۔

نفاست علی خاں راہی شہابی

راجستھان کے نوجوان شعرا میں راہی شہابی کو جو ملک گیر شہرت اور مقبولیت حاصل ہے وہ اُن کی فطری صلاحیتوں کی دلیل ہے آپ محکمہ تعلقاتِ عامہ راجستھان میں اسسٹنٹ ایڈیٹر کی گزیٹڈ پوسٹ پر فائز ہیں۔ آپ کی قومی نظموں کا مجموعۂ کلام "میرا وطن" ہندی رسم الخط میں طبع ہو کر کانگریس کے جے پور میں منعقدہ سالانہ اجلاس کے موقع پر اندرا گاندھی کو پیش کیا گیا تھا۔ راجستھان کے سرکاری مشاعرے عام طور پر راہی صاحب کے زیرِ اہتمام منعقد ہوتے ہیں۔

کلیم الدین تجلی عثمانی

اخبار "بشارت" جے پور کے ایڈیٹر نوجوان شاعر تجلی عثمانی صحافت کے علاوہ ڈرامہ نگاری کے میدان میں مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ انجمن ترقی اُردو راجستھان کے جنرل سکریٹری ہیں۔

ممتاز شکیب

شکیب شاعر بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی۔

مختار الرحمٰن راہی

افسانہ نگار کی حیثیت سے کافی مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

صاحبزادہ شوکت علی خاں ایم۔ اے

شعبۂ تحقیقاتِ علومِ شرقیہ راجستھان کی ٹونک شاخ کے انچارج ہیں ان کے مختلف تحقیقی مضامین مختلف رسائل میں چھپتے رہتے ہیں۔

مولانا محمد عمران خاں صاحب بی اے

اردو عربی اور فارسی کے متبحر عالم ہیں۔ مشاہیر علمائے ٹونک پر ایک ضخیم کتاب مرتب کر چکے ہیں جو ابھی طبع نہیں ہوئی۔ ڈسٹرکٹ لائبریری ٹونک میں ملازم ہیں۔

صاحبزادہ حامد رشید خاں

گورنمنٹ سکنڈری اسکول علی گڑھ (ضلع ٹونک) میں ہیڈ ماسٹر ہیں شاعر بھی ہیں اور ڈرامہ نگار بھی۔ ان کا ایک ناول بھی چھپ چکا ہے راجستھان کے دوسرے معروف اور صاحبِ دیوان شعرا میں

اتنے بڑھ گئے تھے کہ مولانا عبدالحق نے لکھا ہے کہ لوگ جے پور کو چھوٹی دلی کہا کرتے تھے [1] یہی حال خاص طور پر ٹونک اور الور کا تھا۔ اسی زمانے کے الور کے ایک شاعر بیدارلال منہت نے یہ شعر کہا تھا ؎

شور ہے شعر و سخن کا ہر طرف ان دنوں الور جہان آباد ہے

اسی طرح تقریباً ہر مقام پر جہاں اردو کا رواج رہا نہ صرف باہر سے آئے ہوئے بلکہ یہیں کے شعرا و ادبا حضرات نے راجستھان میں اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج میں اپنی تخلیقات کے ذریعہ نمایاں حصہ لیا۔ شعر و ادب کی محفلیں منعقد کیں۔ ادب، فلسفہ، مذہب، طب، نجوم، معاشرت، معاشیات، اقتصادیات، علم نباتات، تاریخ، تذکرہ، سوانح، افسانہ، ناول، ڈرامہ، سفرنامہ وغیرہ غرض ہر موضوع پر بے شمار کتابیں تصنیف و تالیف اور ترجمہ کیں۔ اخبار جاری کئے۔ ادبی ادارے قائم ہوئے۔

۱۹۴۷ء کے بعد عام سیاسی اور سماجی حالات، معاشی بحران اور ذہنی انتشار و معاشرتی انتزاع نے اردو ادب کو بھی متاثر کیا خصوصاً اس لئے کہ بیشتر حضرات کسی نہ کسی حیثیت سے والیانِ ریاست سے وابستہ تھے۔ اور ریاستوں کا خاتمہ یقینی تھا۔ چنانچہ راجستھان کی تشکیل کے وقت یہاں کی ادبی فضا پر تاریکی سی چھا گئی تھی جہاں ہوتی تھی بیشتر اہلِ علم ترکِ وطن کر چکے تھے۔ ادبی محفلیں معدوم پڑ گئی تھیں مگر یہ کیفیت بہت زیادہ عرصہ باقی نہیں رہی۔ کچھ ذہنی سکون ملنے کے بعد اہلِ علم و ادب نے ادھر توجہ شروع کی۔ کچھ باہر آنے والے تارکینِ وطن نے شعر و سخن کے ساتھ دلچسپی کا اظہار کیا اور آہستہ آہستہ علمی و ادبی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا خصوصاً ۱۹۵۳ء میں انجمن ترقی اردو جے پور اور ۱۹۵۶ء میں انجمن ترقی اردو راجستھان کے قیام کے بعد اس خطہ میں اردو زبان و ادب کی ترقی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

اُردو بولنے والوں کی تعداد

(جن کی مادری زبان اردو ہے)

۱۹۵۱ء	۱,۵۶,۱۶۰
۱۹۶۱ء	۵,۰۹,۶۵۴
۱۹۷۱ء	۶,۵۰,۹۴۷

یہ اعداد و شمار مردم شماری کی سرکاری رپورٹس کے مطابق ہیں لیکن ان کی صحت قابلِ اعتراض ہے۔ مثال کے طور پر مسلمانوں کی زبان اُردو مانی جاتی ہے اگر اسی مسئلہ کی رو سے دیکھا جائے تو ۱۹۵۱ء کی رپورٹ کے مطابق اُن کی تعداد ۹,۴۹,۳۵۰ تھی جبکہ اردو بولنے والوں کی تعداد ۱,۵۶,۱۶۰ بتائی گئی ہے۔ یہ تعداد اُن افراد کی ہے جن کی مادری زبان اردو مانی گئی ہے۔ ایسے افراد جو بحیثیت ثانوی زبان اردو بولتے ہیں اُن کی تعداد یقیناً اس سے کہیں زیادہ ہے۔

تعلیمی سہولتیں

اردو تعلیم کی روایت اس خطے میں بڑی پرانی ہے۔ وسطِ انیسویں صدی سے یہاں کے مدارس میں اردو تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ دینی مکتبوں میں تو اردو کی تعلیم دی ہی جاتی تھی۔ مدرسہ کی سطح پر بھی انتظام شروع ہوا۔ چنانچہ ۱۸۴۵ء میں جے پور میں اورینٹل کالج قائم کیا گیا جس میں اردو کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ ٹونک میں دارالعلوم خلیلیہ قائم کیا گیا۔ اس سے قبل ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے قائم شدہ اجمیر کے مدرسہ میں ۱۸۳۶ء سے اردو کی تعلیم کا انتظام تھا۔ غرض راجستھان میں ۱۹۴۷ء سے قبل اردو تعلیم باقاعدہ طور پر شروع ہو چکی تھی۔

قیامِ راجستھان کے بعد اگرچہ اس صوبہ میں ایم اے کی سطح تک اردو کی تعلیم نہیں تھی۔ پرائمری درجوں سے بی اے تک مختلف مقامات پر برائے نام اردو قائم رہ گئی تھی۔ طالب علموں کی تعداد اس قدر گھٹ چکی تھی کہ سرکاری رپورٹس میں بھی ان کا پتہ نہیں چلتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۵۶ء میں انجمنِ ترقی اردو راجستھان کے قیام کے بعد حکومت کی توجہ اس جانب مبذول کرائی گئی اور اس کے بعد مختلف رپورٹس میں اُردو کا ذکر کیا جانے لگا۔ چنانچہ جہاں ۱۹۵۷ء تک اردو پڑھنے والے طلبہ اور ایسے مدارس اور اداروں کی تعداد کا پتہ نہیں چلتا جن میں اردو پڑھائی جاتی تھی وہاں ۱۹۶۱ء آتے آتے اعداد و شمار کے کچھ حقائق سامنے آنے لگے چنانچہ تقریباً ۶۰ پرائمری اسکولوں، ۲۰ ہائی اسکولوں اور ۵ کالجوں میں اردو تعلیم کا انتظام تھا۔ کالجوں میں مجموعی حیثیت سے تقریباً ۔۔ طالب علم اردو پڑھتے تھے۔ ان مدارس میں اردو بحیثیت ایک مضمون یا ثانوی زبان پڑھائی جاتی تھی۔ مادری زبان کی حیثیت سے اردو میں تعلیم کا انتظام نہ تھا۔ بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن راجستھان کی جانب سے ہائی اسکول، سکنڈری اسکول کے امتحانات میں جوابات اردو میں لکھنے کی رعایت ضرور تھی مگر اس کا استعمال برائے نام تھا۔

البتہ تقریباً ہر ضلع میں دینی تعلیم کے مدارس تھے جن میں اردو پڑھائی جاتی تھی خصوصاً جامعہ اردو علی گڑھ کے امتحانات کو خاص مقبولیت حاصل تھی۔ ۱۹۶۱ء میں ۱۷ مقامات پر اس کے مرکز قائم تھے بعض جگہ باقاعدہ تعلیم کا انتظام تھا۔ اُن میں شبینہ اردو کالج جے پور، دارالعلوم

---

[1] جائزۂ زبان اردو

خلیلیہ ٹونک اور قمر اردو کالج ٹواڑ (ضلع جھنجھنو) قابلِ ذکر ہیں۔

۱۹۶۱ء کے بعد جو سرکاری رپورٹس شائع ہوئیں ان میں چند رپورٹس سے ماخوذ اعداد و شمار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۶۱ء اور ۱۹۷۱ء کے درمیان یہاں اردو پڑھنے والے طلبہ کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوا۔

کمشنر لسانی اقلیات کے مطابق آٹھویں رپورٹ ۱۹۶۵-۶۶ء (ص ۵۲) ۱۹۶۳-۶۴ء میں بحیثیت مادری زبان اردو میں تعلیم کی سہولت نہیں تھی ۱۹۶۴-۶۵ء میں ۵ اردو میڈیم اسکول تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ حقیقت میں ۱۹۶۴-۶۵ء سے مادری زبان کی حیثیت سے اردو میں تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔

راجستھان:- سرکار کے "بھاشا وبھاگ" کی رپورٹ بابت ۱۹۷۰-۷۱ء (ص ۱۴) کے مطابق ۱۹۶۶ء سے بھاشا وبھاگ کے ذریعہ لسانی اقلیتوں کی سہولتوں کا انتظام کیا جانے لگا۔

کمشنر لسانی اقلیات کی گیارھویں رپورٹ (ص ۵۸) کے مطابق ۱۹۶۵ء میں ریاستی حکومت نے گجراتی، پنجابی، سندھی اور اردو کے ذریعہ تعلیم دینے کے احکامات جاری کئے۔ یہ بھی تجویز مدِنظر رکھی گئی کہ کم از کم ہر ضلع میں مادری زبان سے متعلق ایک گورنمنٹ ہائر سکنڈری ہو بشرطیکہ وہاں اس زبان کی چھٹی جماعت سے نویں جماعت تک ۶۰ طلبہ یا چھٹی جماعت میں کم از کم ۱۵ طلبہ ہوں۔ ۱۹۶۶ء میں لسانیاتی اقلیتی طلبہ کا ایک رجسٹر بھی مدارس میں کھولنے کا حکم جاری کیا گیا۔ اس رپورٹ کے ضمیمہ ۷ اور ۸ کے مطابق اس ریاست میں اردو تعلیم کی کیفیت یہ تھی:-

	مدارس کی تعداد	طلبہ کی تعداد جنکی مادری زبان اردو تھی	اساتذہ کی تعداد جو اردو پڑھا سکتے تھے
پرائمری تعلیم ۱۹۶۶-۶۷ء	۴۰	۵,۲۰۳	۱۳۷
۱۹۶۷-۶۸ء "	۳۱	۴,۵۵۲	۱۵۷
سیکنڈری تعلیم ۱۹۶۶-۶۷ء	۲۴	۲,۷۲۵	۷۹
۱۹۶۷-۶۸ء "	۲۱	۲,۲۹۶	۳۶

کمشنر مذکور کی بارھویں رپورٹ جولائی ۱۹۶۹ء لغایت جون ۱۹۷۰ء کے مطابق (ص ۱۴) جن پرائمری مدارس میں اردو کے ذریعہ تعلیم دی جاتی تھی ان کی تعداد سابقہ سال کے مقابلہ میں ۳۹ سے گھٹ کر ۳۳ رہ گئی اور اساتذہ کی تعداد ۱۷۷ سے کم ہو کر ۱۲۵ رہ گئی۔ طلبہ کی تعداد ۵,۴۸۳ سے بڑھ کر ۵,۵۴۷ ہو گئی۔

ثانوی تعلیم کے سلسلہ میں رپورٹ میں درج ہے کہ ۱۹۶۸-۶۹ء میں تین اردو میڈیم اسکول تھے جن میں ۱۹۴ طلبہ کو تعلیم دی جاتی تھی۔ جبکہ سابقہ سال میں ایسا کوئی اسکول نہ تھا جو طلبہ بحیثیت ایک مضمون اردو پڑھتے تھے انکی تعداد ۲,۲۹۰ سے بڑھ کر ۲,۷۷۴ ہو گئی اور مجموعی حیثیت سے اساتذہ کی تعداد ۲۶ سے بڑھ کر ۴۶ ہو گئی۔

بھاشا وبھاگ کی ۱۹۷۱-۷۲ء کی رپورٹ کے مطابق (ص ۱۹) طلبہ، مدرسین اور مدارس کی تعداد حسب ذیل تھی:-

اردو مادری زبان کے ذریعہ تعلیم	مدارس	طلبہ	مدرسین
ابتدائی تعلیم	۴۳	۷,۵۱۷	۱۳۰
ثانوی تعلیم	۱۲	۴,۴۸۳	۶۰

ان کے علاوہ سات کالجوں میں بی اے کی سطح تک اردو پڑھائی جاتی تھی جن کا تعلق راجستھان یونیورسٹی، جے پور اور اودے پور یونیورسٹی سے تھا۔

تازہ ترین اعداد و شمار جو حکومت کی جانب سے ۱۷ مئی ۱۹۷۳ء کو گجرال کمیٹی کے سامنے پیش کئے گئے ہیں ان کی رو سے سابقہ سال ۱۹۷۲-۷۳ء کی تعلیمی کیفیت حسب ذیل ہے:-

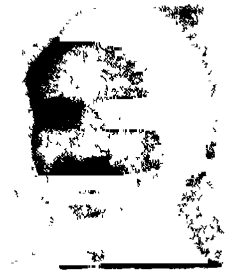
	مدارس	طلبہ
پرائمری اسکول	۱۸۲	۷,۵۱۵
مڈل اسکول	۱۴۵	۴,۴۸۲
سکنڈری اسکول	۱۸	۴۴۸

ان میں ۳۴ پرائمری اسکولوں میں ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ گذشتہ سال اودے پور یونیورسٹی میں ایم۔اے (اردو) کی تعلیم شروع کی گئی۔ اس سال اعلان کیا گیا ہے کہ ۱۹۷۳-۷۴ء کے سشن سے راجستھان یونیورسٹی جے پور میں بھی اردو میں ایم اے کی تعلیم کا انتظام کیا جائے گا۔

اس رپورٹ میں کالجوں کی تعداد نہیں بتائی گئی ہے۔ تاہم اس وقت اودے پور یونیورسٹی اور راجستھان یونیورسٹی سے ملحقہ کل سات کالجوں میں بی۔اے کی سطح تک اور اودے پور میں ایم۔اے تک اردو پڑھائی جاتی ہے۔ صرف راجستھان یونیورسٹی جے پور کے مختلف امتحانات میں (بی۔اے سہ سالہ کورس) ریگولر اور پرائیویٹ امیدواروں کی تعداد یہ تھی۔

	فرسٹ ایر	سیکنڈ ایر	فائنل ایر	کل
۱۹۷۲ء	۸۵	۵۹	۳۹	۱۸۱
۱۹۷۳ء	۹۶	۷۳	۴۴	۲۱۳

مئی ۱۹۷۲ء میں حکومت نے لسانی اقلیات سے متعلق ایک انسپکٹر کا تقرر کیا ہے جو خصوصاً تعلیمی امکانات کے اجرا کی دیکھ بھال کرے گا



بسمل سعیدی



منظور الحسن برکاتی



محمد علی زیدی

محمود سعیدی



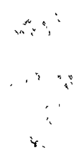
احتشام اختر



کلیم الدین حملی عثمانی



ممتاز راشد



دل ایوبی



محمد عثمان عارف بیکانیری



راہی شہابی



راجستھان میں اُردو

ابوالفیض عثمانی

راجستھان میں مغلیہ حکومت کے زوال کے زمانے تک اگرچہ اُردو کو عام مقبولیت حاصل نہیں ہوئی تھی تاہم اس کی ترقی کے لئے زمین ہموار ہو چکی تھی چنانچہ اٹھارویں صدی عیسوی میں راجپوتانہ کی مختلف ریاستوں کے حکمرانوں نے سلاطینِ مغلیہ سے اپنے مراسم ختم کر کے انگریزوں کے ساتھ تعلقات قائم کئے اور آہستہ آہستہ انہوں نے باقاعدہ انگریزی حکومت سے عہد و پیمان کئے۔[1] اس کے زیرِ اثر ملازمت اور تلاشِ معاش کے سلسلے میں اہلِ علم و فضل یہاں پہنچنے لگے۔ اس کے علاوہ دہلی کی تباہی اور رات دن کی لوٹ مار سے پریشان ہو کر بہت سے اربابِ علم و فن وطن کو خیرباد کہہ کر اس خطے میں بھی پہنچے چنانچہ میر تقی میر اور ان کے صاحبزادے میر فیض علی تقریباً گیارہ سال نواحِ بھرت پور میں رہے۔[2] میر کے ایک شاگرد مرزا اکبر علی بیگ گل جو صاحبِ دیوان تھے اور چند دوسرے شعرا نے جے پور کو مسکن بنایا۔[3] گل کا جے پور ہی میں انتقال ہوا۔[4] اسی زمانہ میں حکیم مان ڈی سلوا فطرت (۱۷۴۳ء تا ۱۸۴۵ء)[5] اور خیراتی خاں دلسوز شاگردِ شاہ نصیر دہلوی[6] جے پور پہنچ چکے تھے۔ اسی طرح الور میں خواجہ بدرالدین خاں اماں مترجم "بوستانِ خیال" اور اُن کے صاحبزادے خواجہ قمرالدین خاں راقم تلمیذ مرزا غالب،[7] اجمیر میں فخر الشعرا میر نظام الدین ممنون،[8] بھرت پور میں دیوان جانی، بہاری لال راضی مصنف "تعریفِ زبانِ فارسی" ۱۸۴۳ء (وغیرہ) اور ٹونک میں حکیم الہند مولانا برکات احمد، مولانا نظام الدین مانک پوری اور مولانا فضل اللہ، مولانا حیدر علی رامپوری اور منشی بساون لال شاداں (مصنفِ امیر نامہ) وغیرہ کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس طرح جے پور، اجمیر، ٹونک، الور، بھرت پور اور بیکانیر وغیرہ میں ۱۸۵۰ء سے اُردو کے شعرا اور ادبا کی موجودگی کی وجہ سے شعر و ادب اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور بلا تفریقِ مذہب و ملت اہلِ علم چمنِ اُردو کی آبیاری کر رہے تھے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ریاستوں کے دفاتر میں بھی کہیں کہیں اُردو کا استعمال کیا جانے لگا۔ چنانچہ ریاست جے پور کی قدیم ترین سرکاری اردو تحریر ۱۸۲۵ء کی پائی جاتی ہے۔[9]

[1] تفصیل کے لئے ایچیسن ٹریٹیز جلد چہارم (متعلقہ راجپوتانہ) ملاحظہ فرمائیے۔

[2] ذکر میر ص ۱۰

[3] دیوان گل کا اصل نسخہ (قلمی) کتب خانہ شاغل جے پور میں محفوظ ہے۔

[4] تذکرہ شعرائے جے پور ص ۲۲۵

[5] یورپین اور انڈو یورپین شعرائے فارسی و اردو ص ۱۵۰

[6] سخن شعرا مرتبہ عبدالغفور نساخ ۱۸۶۳ء ص ۱۶۲

۱۸۳۲ء میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی انگریزی حکومت نے اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا تو دیسی ریاستوں کے حکمرانوں نے بھی ان کی پیروی میں باقاعدہ طور پر اپنے دفاتر میں اُردو کا استعمال جاری کرایا اور اپنی ریاستوں کے قوانین اردو میں شائع کرائے۔ مثال کے طور پر ریاست جے پور کا "مجموعہ قوانینِ عدالت دیوانی و فوجداری" اسی ریاست کے مطبع میں ۱۸۴۶ء میں شائع ہوا تھا۔[10] اسی طرح مہاراجہ بلونت سنگھ ۱۸۵۳ء تا ۱۹۲۵ء کے عہد سے ریاست بھرت پور کے دفاتر میں اُردو کا استعمال شروع ہوا اور اسی زمانے میں ریاست الور اور ریاست مارواڑ میں بھی اردو کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہوا۔[11] اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہونے کی وجہ سے اس کی ترقی اور نشوونما پر خوشگوار اثر پڑا۔ مختلف ریاستوں میں سرکاری سطح پر اُردو کے پریس قائم کئے گئے جن میں عام طور پر ریاست کے قوانین وغیرہ شائع کئے جاتے تھے۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد دہلی، لکھنؤ اور دیگر مقامات کے بے شمار اربابِ علم و فضل مختلف ریاستوں میں پہنچے جن میں الور، جے پور، ٹونک، بھرت پور، کوٹہ، جھالاواڑ، جودھ پور، بیکانیر اور اجمیر کمشنری کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ والیانِ ریاست نے ان کو نوازا کر نہ صرف فکرِ معاش سے آزاد کر دیا بلکہ ان کو اپنے درباروں سے وابستہ کرنے میں فخر بھی محسوس کیا۔ ذہنی سکون حاصل ہونے پر ان حضرات نے اپنے فضل و کمال کے جوہر دکھائے اور دہلی، لکھنؤ کی ادبی فضاؤں کی جھلک دیسی ریاستوں میں نظر آنے لگی۔

جے پور ہی میں ۱۸۷۰ء میں مولانا سلیم الدین تسلیم کے زیرِ صدارت بزمِ ادب کے نام سے ایک ادبی انجمن قائم کی گئی۔ اس کے زیرِ اہتمام ہر ماہ پابندی کے ساتھ طرحی مشاعرے منعقد کئے جاتے تھے۔ اس بزم کے ۱۸۷۲ء سے ۱۸۷۴ء تک کے پچیس مشاعروں کا گلدستہ "فرحت الشعرا" منشی کندن منشی نے مرتب کیا تھا۔[12] جے پور کے مشاعروں کا یہ پہلا مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔[13] اسی قسم کی ادبی انجمنیں ٹونک اور اجمیر میں بھی قائم کی گئیں اور رفتہ رفتہ مختلف مقامات پر اس قسم کی انجمنیں قائم کی جانے لگیں۔ جے پور میں علمی و ادبی چرچے

[7] خمخانہ جاوید جلد سوم ص ۳۵۵

[8] دلی کا دبستانِ شاعری ص ۲۶۶

[9] ماہنامہ "زمانہ" کانپور ستمبر ۱۹۴۳ء ص ۲۶۳

[10] ایک نسخہ راقم کے پاس موجود ہے۔

[11] روداد اردو سیمینار جودھ پور ص ۱۱۷ [12] تذکرہ شعرائے جے پور ص ۶

[13] اصل مخطوطہ کتب خانہ شاغل جے پور میں محفوظ ہے۔

دل ایوبی ٹونکی، بسمل سعیدی، چندر بہاری لال ماتھر صبا، شرف الدین یکتا، گوپال کرشن شفق جے پوری، پارسا کوثری، اتم چند چندن، بیمل بیکانیری، دین محمد مشتاق بیکانیری، روحی بھاردواج جودھپوری، مرزا حامد ٹونکی، حارث بیکانیری، عقیل شاداب، ثاقب اودے پوری، منصور چوروی، ظفر غوری، مخمور سعیدی اور ممتاز راشد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے بسمل سعیدی، مخمور سعیدی اور ممتاز راشد ملک گیر شہرت کے حامل ہیں۔

قیام راجستھان کے بعد اس خطے کے شعرا و ادبا کی مجموعی حیثیت سے تقریباً سو کتابیں شائع ہوئیں۔ ان میں بیشتر شعری مجموعے ہیں۔ چند تذکرے کچھ افسانے اور چند کتابیں ادب، سیر اور سیاست سے متعلق ہیں۔ چند ادبی جلسوں اور مشاعروں کی روداد ہیں۔

ادبی انجمنیں

یوں تو مختلف مقامات پر ادبی انجمنیں قائم ہیں مگر انجمن ترقی اردو راجستھان جے پور اہم ہے اور اس سے ملحقہ ۲۵ شاخیں مختلف مقامات پر قائم ہیں۔ انجمن مذکور نے سرکاری احکامات اور قوانین پر عمل کرانے کی کوشش کی ہے۔ اعلیٰ سطح پر ادبی اجتماعات قائم کئے۔ سرکاری مدارس میں اردو تعلیم کا انتظام کرانے کی پوری کوشش کی اور کامیابی بھی حاصل کی۔ جامعہ اردو کے امتحانات کو راجستھان یونیورسٹی اور حکومت راجستھان سے تسلیم کرایا۔ گورنمنٹ کالج کوٹہ میں اردو جاری کرانے کے سلسلہ میں نمایاں کوشش کی۔ انجمن ہی کی کوشش کی بنا پر حال ہی میں حکومت راجستھان نے راجستھان یونیورسٹی میں آئندہ سال سے اردو میں ایم۔ اے کے درجات کھولنے کا اعلان کیا ہے۔

انجمن مذکور نے راجستھان کے ایک باکمال خوش نویس منشی امید نظر کو ان کے فن خطاطی کے اعتراف میں کل راجستھان اردو کنونشن ۱۹۵۶ء کے موقع پر "جواہر رقم" کا خطاب اور طلائی تمغہ دیا تھا۔

انجمن ترقی اردو کے علاوہ "انجمن شعر و ادب" جے پور، "انجمن کاروان فکر" جے پور، "انجمن تعمیر اردو" ٹونک وغیرہ بھی قائم ہیں مگر انکا دائرہ عمل مشاعروں کی حد تک محدود رہا ہے۔ ان کے علاوہ مدارس اور کالجوں میں بھی چند ادبی انجمنیں موجود ہیں۔ ان میں "بزم ادب" گورنمنٹ کالج ٹونک قابل ذکر ہے۔ جو ۱۹۶۶ء سے مستقل طور پر کالج میں ادبی جلسے منعقد کراتی ہے۔

اشاعت و ترقی کے لئے ملنے والی امداد

راجستھان میں ساہتیہ اکیڈمی کے علاوہ کوئی ادارہ یا حکومت اردو کی اشاعت و ترقی کے لئے کوئی امداد نہیں دیتی اور ساہتیہ اکیڈمی کا دائرہ نہایت محدود رہا ہے۔ ہر سال چند شعرا کو بہت معمولی رقم دیجاتی ہے۔ مثال کے طور پر گذشتہ سال کل ایک ہزار روپیہ کی رقم پانچ تصانیف پر امداد کے لئے منظور کی گئی تھی۔ ساہتیہ اکیڈمی کی جانب سے ہر سال ایک اردو کانفرنس یا سمپوزیم منعقد کرنے کے لئے ہزار ڈیڑھ ہزار روپیہ کی رقم دیئے جانے کی ایک روایت قائم ہے۔

اہم کتب خانے

راجستھان کے ضلعی صدر مقامات پر ڈسٹرکٹ لائبریریاں اور کچھ میونسپل بورڈ کی لائبریریاں ہیں جہاں اردو کی کتابیں موجود ہیں۔

سب سے اہم قلمی کتب کا ذخیرہ، اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک ہے۔ جہاں چار ہزار کے قریب عربی فارسی اور اردو کے مخطوطات ہیں۔ مدارس، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی لائبریریوں میں بھی اردو کتابیں موجود ہیں اور جہاں اردو پڑھائی جاتی ہے وہاں کتابوں کے بجٹ میں سے رقم بھی دیجاتی ہے

ایک غیر معروف سرکاری کتب خانہ محکمہ اوقاف سے متعلق جامع مسجد بھرت پور میں ہے۔ اسی طرح ایک نیم سرکاری کتب خانہ فتح پور شیخاوالی میں ہے۔ بعض میوزیموں خصوصاً الور میوزیم میں نادر و نایاب مخطوطات کا بیش بہا ذخیرہ ہے۔ مجموعی حیثیت سے سرکاری اور نیم سرکاری تقریباً پچاس کتب خانے موجود ہیں جہاں ہزاروں کتابیں الماریوں کی زینت بنی ہوئی ہیں —— مہاراجہ پبلک لائبریری جے پور ہی میں کئی ہزار اردو کتابیں ہیں۔

راجستھان میں کچھ قدیم نجی کتب خانے بھی ہیں جہاں قدیم کتب کافی تعداد میں موجود ہیں ان میں کتب خانہ شاغل جے پور، کتب خانہ مولانا عمران ٹونک، کتب خانہ فصل مبین صاحب اجمیر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ بعض حضرات کے پاس کتابوں کے خاصے بڑے ذخیرے ہیں۔ مثلاً مفتون کوٹوی، مولانا قاضی الاسلام صاحب و مولانا سید منظور الحسن صاحب برکاتی ٹونکی حکیم سلیم الدین خانصاحب مرحوم جے پور، ماسٹر ثروت حسین زیدی صاحب جے پور، ڈاکٹر احمد یار خاں صاحب جے پور، حکیم سید یحییٰ خاں صاحب ٹونک وغیرہ۔ اس سلسلہ میں انجمن ترقی اردو راجستھان کی جانب سے نو تعمیر شدہ انجمن کی عمارت میں قائم "مہاراجہ جے سنگھ اردو ریڈنگ روم" جے پور کا نام بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اسی طرح مکرانہ میں "مولانا آزاد لائبریری" اور جودھپور میں "مولانا آزاد لائبریری"، "میمو اقبال لائبریری جودھپور" کا نام بھی آتا ہے۔ اس قسم کے کتب خانوں کی تعداد بھی ۲۰ کے قریب ہے

ایسے افراد جو نجی طور پر اردو کی ترقی و اشاعت کیلئے مساعی کر رہے ہیں،



جوش ملسیانی



میلا رام وفا



ست پرکاش سنگر



روشن پٹیالوی



بلبیر راٹھی



شباب للت



شرون کمار ورما



پریم وار برٹنی



نریش



عاقل لاہوری



مہیش پٹیالوی



مصور سبزواری

پنجاب، ہریانہ، ہماچل پردیش میں اردو



نند کشور وکرم

پروفیسر محمود شیرانی کے قول کے مطابق اُردو کا گھر پنجاب ہے۔ اُردو کی ابتدائی شکل دکنی کی پنجابی سے مماثلت اس امر کا بین ثبوت ہے۔ گو یہ امر بعض محققین کے نزدیک متنازعہ فیہ ہے تاہم اس سے انکار مشکل ہوگا کہ پنجاب کا ابتدا ہی سے اُردو سے ایک گہرا تعلق رہا ہے اور یہ کہ اہلِ پنجاب نے تاریخِ ادب میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ اُردو کبھی کسی علاقے، صوبے، شہر یا فرقے کی زبان نہیں رہی اور اس کی ترقی و ترویج میں برصغیر کے تمام فرقوں، مذہبوں اور علاقوں سے تعلق رکھنے والے افراد نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے تاہم ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد پنجاب میں اُردو کو ترقی و فروغ کے غیر معمولی مواقع نصیب ہوئے اور لاہور اُردو کا ایک اہم مرکز بن گیا۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں ناکامی کے بعد جب ملک پر انگریزوں کا تسلط ہو گیا۔ اور اُردو کے مسلّمہ مراکز دلی اور لکھنؤ کے عوام انگریزوں کے انتقام کا شکار ہوئے تو اکثر اہلِ قلم ان مراکز سے ہجرت کر کے ہندوستان کے دیگر محفوظ مقامات میں گوشہ نشین و پناہ گزین ہوئے۔ اس تباہی و بربادی کے خونیں دور میں "آبِ حیات" کے مصنف مولانا محمد حسین آزاد بھی مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے بالآخر لاہور پہنچے۔ اُن کی آمد سے لاہور کی علمی اور ادبی زندگی میں بہار سی آگئی اور پھر اُن کی اور مولانا الطاف حسین حالی کی کوششوں سے پنجاب میں "علمی انجمن" کی سرگرمیوں کا آغاز ہوا، اور پنجاب میں اُردو بڑی تیزی سے ترقی کے مراحل طے کرنے لگی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں پنجاب سے علامہ اقبال ایسی عظیم المرتبت شخصیت کا ظہور ہوا جن کی حیات آفریں فلسفیانہ شاعری نے نہ صرف اُردو زبان و ادب کو بلکہ پنجاب کو بھی بلند مرتبہ عطا کیا۔ اقبال سے پیشتر پنجاب سے تعلق رکھنے والی ایک نامور ہستی مولانا حالی کی تھی جنہوں نے اپنی شاعری اور "مقدمہ شعر و شاعری" سے ایک نئی طرح ڈالی اور شعر و ادب کو ایک نئی سمت اور انداز سے روشناس کرایا۔ غالباً غالب کے بعد اقبال ہی ایسے عالی مرتبت اُردو شاعر تھے جن کی شہرت حدودِ ہندوستان سے نکل کر غیر ممالک میں بھی پھیلی۔ حفیظ جالندھری نے شاہنامہ اسلام لکھ کر صرف پنجاب میں ہی نہیں بلکہ تمام ہندوستان میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لی تھی۔

وہ زمانہ قومی بیداری کا تھا۔ ملک جدوجہدِ آزادی میں انگریزی اقتدار سے نبرد آزما تھا۔ لالہ لاجپت رائے اند

مولانا ظفر علی خاں کی سیاسی تحریر و تقریر نے ملک میں سیاسی بیداری پیدا کی۔ اور پھر تبدریج پنجاب کی اُردو سرگرمیوں میں اضافہ ہونے لگا۔ لاہور اُردو کا ایک اہم مرکز بن گیا۔ بیرون پنجاب کے متعدد شاعروں اور ادیبوں نے بھی لاہور ہی کو اپنا مرکز و وطن بنا لیا۔

اگرچہ ۱۸۵۷ء سے پیشتر پنجاب میں "شملہ اخبار"، "چشمۂ فیض" سیالکوٹ، "کوہ نور"، "دریائے نور"، "لاہور گزٹ"، "ریاض نور" وغیرہ اخبارات شائع ہوتے تھے لیکن دنیائے صحافت میں اس کی دھوم تب مچی جب ۱۸۸۷ء میں لاہور سے "پیسہ اخبار" کا اجرا ہوا۔ اس اخبار کے بعد لاہور سے بہت سے اخبارات منظرِ عام پر آنے لگے۔ یہاں تک کہ جب ملک کی تقسیم ہوئی تو لگ بھگ بیس روزنامے پنجاب سے شائع ہو رہے تھے۔ ان میں سے کچھ اخبارات ایسے تھے جنہیں ملک گیر شہرت و مقبولیت حاصل تھی اور پنجاب کی سیاست میں بھی غیر معمولی اثر و اقتدار حاصل تھا۔ لاہور سے اُن دنوں "پرتاپ"، "ملاپ"، "زمیندار"، "امروز"، "احسان"، "نوائے وقت"، "شہباز"، "بندے ماترم"، "منشور"، "رنجیت"، "بندے ماترم"، "اجیت"، "پربھات"، "آزاد" اور "ویر بھارت" شائع ہوتے تھے۔ اُن کے علاوہ ایک روزنامہ "شمس" ملتان سے اور "الفضل" قادیان سے شائع ہوتا تھا۔ ان روزناموں کے علاوہ ایک سو سے زائد رسائل شائع ہوتے تھے، جن میں سے "ادبی دنیا"، "ادبِ لطیف"، "ہمایوں"، "کہکشاں"، "عالمگیر"، "شاہکار"، "کاروان"، "پریت لڑی"، "تہذیبِ نسواں" اور "رہنمائے تعلیم" ایسے بلند پایہ ادبی و تعلیمی جریدے شامل تھے۔ غالباً اتنے بلند پایہ ادبی جریدے لاہور کے علاوہ کسی شہر سے تو کجا کسی صوبے سے بھی شائع نہیں ہوتے تھے۔ ان رسائل کے علاوہ "بیسویں صدی"، "مست قلندر"، "لطفِ شباب"، "نرالا" اور "مستانہ جوگی" ایسے لگ بھگ دو درجن ماہنامے بھی اہلِ اُردو کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے۔

تقسیمِ ملک سے پیشتر لاہور میں درجنوں اشاعتی ادارے اور ادبی انجمنیں تھیں اور یہ شہر ادب کی ہر تحریک میں پیش پیش تھا۔ یہاں اشاعتی اداروں میں دارالاشاعت، مکتبۂ اُردو، مکتبہ جدید، مکتبہ ادبی دنیا، نراین دت سہگل اینڈ سنز، عطر چند کپور اینڈ سنز، تاج کمپنی، ادبی مرکز، لاجپت رائے اینڈ سنز، گلاب سنگھ اینڈ سنز اور ادبی انجمنوں میں انجمن اُردو پنجاب، انجمن ترقی پسند مصنفین، حلقہ اربابِ ذوق، مجلس اربابِ علم اور حلقہ نیازمندانِ لاہور خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔

افسانہ نویسی کا دور شروع ہوا تو پنجاب سے اتنے مشہور

کے اُردو کے ڈگری کورس کا انتظام کہیں نہیں۔ البتہ دوسری یونی ورسٹیوں میں پری آرٹس اور کہیں کہیں فرسٹ ایر اور سکنڈ ایر بی اے میں اُردو اختیاری اور ثانوی مضمون کے طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ گجرات یونی ورسٹی سے ۱۵۱ کالج ملحق ہیں۔ ان میں سات یا آٹھ کالجوں میں اُردو اختیاری مضمون کے طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ عموماً ایک ہی اُستاد اُردو اور فارسی پڑھاتا ہے۔ بہت سے کالجوں میں فارسی ہے لیکن اُردو نہیں اور فارسی کا اُستاد کبھی اُردو پارٹ ٹائم ہوتا ہے۔ ساؤتھ گجرات یونی ورسٹی کے ۲۲ کالجوں میں سے صرف ایک یا دو کالجوں میں اور سوراشٹر یونی ورسٹی کے ۵۴ کالجوں میں سے صرف ایک کالج میں اُردو پڑھانے کا انتظام ہے۔

اخبارات ورسائل:- گجرات میں اُردو اخبارات اور رسائل کی کوئی تاریخ نہیں۔ یہاں سے کبھی کوئی ایسا اخبار یا رسالہ نہیں نکلا جو کسی بھی اعتبار سے اہم اور وقیع قرار دیا جائے۔ کسی زمانے میں مولانا حبیب الرحمٰن غزنوی نے روزنامہ "پیغام" نکالا تھا جو مشکل سے سال دو سال زندہ رہا اور ختم ہو گیا۔ اسی طرح ایک ہفتہ وار اخبار "آزاد" کا بھی پتہ چلتا ہے جو افادہ جاہ وحشی کی ادارت میں آج سے تیس سال پہلے نکلا تھا اور چند اشاعتوں کے بعد ختم ہو گیا۔ یہی حال رسالوں کا ہے۔ بہت چھان بین کرنے کے بعد بزرگوں کی زبانی اتنا جانے کو ملا ہے کہ ساٹھ ستر سال پہلے احمد آباد اور پالن پور سے ایک دو ایسے رسالے نکلتے تھے جن میں مقامی شعراء کا کلام چھپتا تھا۔ یہ رسالے بھی مشکل سے سال بھر چلے ہوں گے۔ گویا اخبارات اور رسالوں کے معاملے میں گجرات بالکل صفر ہے۔

یہاں اُردو کا کوئی چھاپہ خانہ نہیں۔ اُردو کے ہینڈ بل اور پوسٹر تک بمبئی کے پریس میں چھپوانے پڑتے ہیں۔ نوجیون پریس، گجرات یونی ورسٹی پریس اور ایک دو پرائیوٹ پریسوں میں اُردو ٹائپ کا انتظام ہے لیکن اس کا استعمال امتحان کے پرچوں اور یونی ورسٹی کی اُردو فارسی کی ایک دو نصاب کی کتابوں تک محدود ہے۔

گجرات میں ادبی اور علمی کام کرنے والوں کا نقشہ یہ ہے۔ سوائے مرحوم قاضی اختر جوناگڑھی، مرحوم حبیب الرحمٰن غزنوی، ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی اور سید اکبر علی ترمذی کے ایک بھی ایسا نام نہیں جس نے اُردو کی علمی، تحقیقی اور ادبی دُنیا کو اپنا عطیہ پیش کیا ہو۔

مرحوم قاضی اختر جوناگڑھی ایک قابلِ قدر علمی اور ادبی شخصیت کے مالک تھے۔ ولی پر ان کی تحقیقات کی بڑی اہمیت ہے۔ اسلامی تہذیب پر بھی انھوں نے پُرمغز مقالات لکھے ہیں۔ اقبال کی ببلیوگرافی پر ان کی کتاب اقبالیات میں ایک اضافہ ہے۔ وہ شاعر بھی تھے اور "لمعاتِ اختر" کے نام سے ان کا ایک مجموعۂ کلام بھی شائع ہوا ہے۔ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی نے بھی ولی پر گراں مایہ تحقیقاتی کام کیا ہے۔ "ولی گجراتی" کے علاوہ ان کی دوسری اہم تصنیف "اُردو غزل ولی تک" اہلِ علم کی نظروں میں وقیع مقام پا چکی ہے۔ مرحوم مولانا حبیب الرحمٰن غزنوی نے بہت سے مضامین لکھے ہیں لیکن افسوس کہ وہ رسالوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ اور کتابی صورت میں ابھی تک ان کی شیرازہ بندی نہیں ہو سکی۔ سید اکبر علی ترمذی صاحب نے غالب کے چند نادر خطوط پر انگریزی اور اُردو میں ایک اہم کتاب پیش کی ہے۔ اکبر علی ترمذی، ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی اور ڈاکٹر احمد حسین قریشی مرحوم پروفیسر ابراہیم ڈار کے ہونہار شاگرد ہیں اور ان تینوں میں علمی ذوق اور تحقیقی لگن پیدا کرنے میں ڈار صاحب کا بڑا حصّہ تھا۔ ضیاء الدین ڈیسائی آثارِ قدیمہ میں، اکبر علی ترمذی محکمۂ مخطوطات میں اور ڈاکٹر قریشی بطور فارسی کے پروفیسر کے گجرات کالج احمد آباد میں کام کر رہے ہیں۔ ان حضرات کی دلچسپی کا موضوع اُردو سے زیادہ تاریخ اور ہندوستان کا فارسی ادب رہا ہے لیکن چونکہ اُردو سے بھی ان کا تعلق رہا ہے اس لیے ان کا ذکر ضروری تھا۔

مظہر الحق علوی اب تک چالیس پچاس ناولوں کے ترجمے کر چکے ہیں بچوں کی بے شمار کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ انگریزی ناولوں کے ساتھ ساتھ اب وہ گجراتی کے اہم ناولوں کا بھی اُردو میں ترجمہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انھوں نے گجراتی کے مشہور ناول نگار جھویرچند میگھانی کے ایک ناول کا ترجمہ کیا ہے۔

گجرات میں اُردو شاعروں کی کبھی کمی نہیں رہی۔ عظیم الشان مشاعرے ہمیشہ برپا ہوتے رہے اور چھوٹی موٹی شعری نشستوں کی بھی کافی گرم بازاری رہی ہے۔ اُردو والے چاہے اُردو پڑھ لکھ نہ سکیں لیکن تخلص رکھ کر غزلیں ضرور کہتے ہیں۔ گجرات کے ہر علاقے میں دو چار اور بعض علاقوں میں تو بیسیوں کی تعداد میں غزل گو شاعر مل جائیں گے۔ گجرات میں مشاعروں اور ادبی کانفرنسوں کی ہمیشہ دھوم رہی ہے اور ان کی بدولت گجرات کے لوگ اُردو کے نامور شعراء اور ادیبوں سے واقف ہوتے رہتے ہیں۔

گجرات کے بزرگ شاعروں میں مرحوم فخر الدین فخرؔ احمد آبادی اور مرحوم کلیمؔ احمد آبادی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ کلیم صاحب کا مجموعۂ کلام "متاعِ کلیم" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ فخر صاحب کا بھی مجموعہ "میخانۂ غوث" کے نام سے چھپ چکا ہے لیکن ان کا بہت سا کلام ہنوز زیورِ

طبع سے آراستہ نہیں ہوا۔ گجرات کے جن دیگر شعرا کے مجموعے ابھی تک شائع ہو چکے ہیں اُن کے نام ذیل میں درج ہیں۔

حزیں قریشی "بہشتِ خیال"۔ جمال قریشی "جمال کربلا"۔ جمیل قلبی "لفظوں کا سفر"۔ خلش بڑودوی "قطارِ شیشہ" امام الدین رسوا "تجلیات"۔ محمد علوی "خالی مکان" اور "آخری دن کی تلاش"۔

گجرات کے ایک مشاق غزل گو شاعر مرحوم زخمی صاحب کا مجموعہ "کائنات" کے عنوان سے زیرِ طبع ہے۔ اسی طرح احمدآباد کے ایک گوشہ نشین شاعر مرحوم کامل صاحب کا مجموعہ بھی طباعت کی آخری منزلوں میں ہے۔

محمد علوی اور عادل منصوری مقامی حدود سے آگے نکل کر اُردو شاعری کی مرکزی روایت میں اپنا مقام پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ جدید اردو شاعری میں ان دونوں نے جو نام پیدا کیا وہ گجرات کے باعث فخر ہے۔

آزادی کے بعد کی ایک دلچسپ ادبی خاصیت ادیب کی ذولسانیت ہے۔ عادل منصوری اُردو اور گجراتی دونوں میں یکساں دسترس رکھتے ہیں۔ اُردو میں ان کا مجموعۂ کلام ابھی تک شائع نہیں ہوا لیکن گجراتی میں اُن کے دو شعری مجموعے اور دو ڈراموں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ گجراتی غزل کو نیا موڑ دینے میں عادل کی غزلوں کا بڑا حصہ ہے۔ اُن کے ڈرامے زیادہ تر ایبسرڈ ٹائپ کے ہیں اور کافی مقبول ہیں۔ راقم الحروف بھی اُردو میں تنقیدیں اور گجراتی میں ڈرامے لکھتا ہے۔ ڈراموں کا ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے اور دوسرا زیرِ ترتیب ہے۔ ذولسانی ادیبوں میں شیخ آدم آلو والا کا نام بھی قابلِ ذکر ہے وہ گجراتی کے ایک مقبول شاعر ہیں اور اُردو میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں۔ اُن کی نظموں کا ایک مجموعہ "اپنے اک خواب کو دفنانے ابھی آیا ہوں" کے نام سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ شیخ آدم آلو والا پندرہ بیس سال سے جرمنی میں مقیم ہیں۔ اس عرصے میں ان زبانوں کا شعری مزاج بدل گیا جن میں وہ تخلیقِ شعر کیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی آواز بہت دُور سے آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

جہاں تک تنقید کا تعلق ہے راقم الحروف کے بے سرو پا مضامین کے علاوہ اس شعبے میں گجرات کا عطیہ صفر کے برابر ہے۔

سنجیدہ ادبی مذاق کی عدم موجودگی میں ہر قسم کی ادبی سرگرمیاں محض وقتی اُبال ہوتی ہیں۔ گجرات میں اُردو کی ادبی انجمنوں کی کمی نہیں ہے۔ ہر شہر میں کم از کم دو تین انجمنیں تو مل ہی جائیں گی۔ احمدآباد میں تو انجمنوں کی تعداد پندرہ بیس تک پہنچتی ہے۔ ان انجمنوں کا واحد کام مشاعرے برپا کرنا ہے۔

۱۹۴۲ء میں احمدآباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین قائم ہوئی تھی۔ اور راقم الحروف ہی اس کا سکریٹری تھا۔ اس انجمن نے بڑے شاندار مشاعرے اور کانفرنسیں کیں۔ احمدآباد کا مزدور طبقہ ترقی پسند ادب کا بڑا سرپرست تھا۔ مشاعروں میں بڑی تعداد میں مزدور شریک ہوتے اور داد سخن دیتے۔ اُردو کے مقتدر رسالے "ادبِ لطیف" "سویرا" "نقوش" "نیا ادب"، مزدور علاقوں میں اور ٹریڈ یونین لائبریریوں میں گشت کرتے اور چاروں طرف ایک ہموار ادبی فضا پیدا کرتے۔ ترقی پسند تحریک نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ عوام اعلیٰ ادب کی سرپرستی کر سکتے ہیں۔ تحریک کے خاتمے کے ساتھ عوام کا اعلیٰ ادب سے رشتہ بھی ختم ہو گیا اور گو مزدور علاقوں میں آج بھی بہت سی ادبی انجمنیں قائم ہیں اور شاندار مشاعرے ہوتے ہیں، لیکن نہ تو لوگ ادبی رسالوں میں دلچسپی لیتے ہیں نہ ادبی کتابوں میں۔ ٹریڈ یونین لائبریریوں کا حال بھی پتلا ہے اور ان علاقوں میں وہ ادبی فضا درہم برہم ہو چکی ہے جو ترقی پسند تحریک نے کسی زمانے میں قائم کی تھی۔ حال ہی میں ترقی پسند انجمن کی از سرِ نو تنظیم کی گئی ہے اور وہ اپنا کام آہستہ آہستہ آگے بڑھا رہی ہے۔

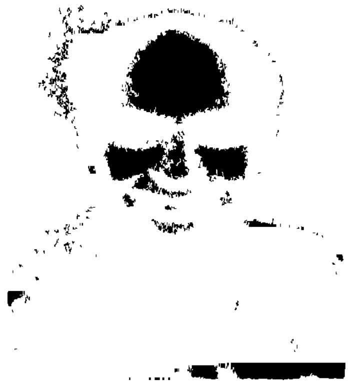
گجرات میں انجمن ترقی اُردو بھی قائم ہے لیکن بے جان اور بے عمل ہے۔ فی الحال گجرات میں کوئی ایسی ادبی انجمن، اکاڈمی یا تحقیقی ادارہ نہیں جو علمی اور ادبی کام کرتا ہو۔ مطبوعات شائع کرتا ہو، یا ریسرچ کے کام کی حوصلہ افزائی کرتا ہو۔ گجرات میں پانچ یونیورسٹیاں ہیں لیکن نہ تو اُردو کا تحقیقی کام ہوتا ہے نہ وہاں سے کسی موضوع پر اُردو کی کوئی کتاب شائع ہوتی ہے۔ اگر کتابوں کی اشاعت کا اوسط نکالا جائے تو فی برس ایک کتاب بھی نہیں آتی۔ ایسی صورت میں سرکاری یا نیم سرکاری اداروں سے ملنے والی امداد کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

گجرات میں ریاستی حکومت کی طرف سے مصنفوں کی سرپرستی کا کوئی انتظام نہیں۔ آج تک ریاستی سرکار نے کسی اُردو کتاب کی اشاعت میں مالی امداد نہیں دی۔ نہ کوئی انعام یا اعزاز دیا۔

یہاں یہ سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ اس معاملے میں اُردو والوں نے سرکار کو حقیقی صورتِ حال سے واقف کرانے اور اپنے حقوق منوانے کے لیے کیا کوششیں کی ہیں۔ اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے

(باقیہ صفحہ ۸۰ پر)

گجرات میں اردو



وارث علوی



محمد علوی



عادل منصوری



جمیل کلیمی



رشید افروز

گجرات کی سرزمین گنجینۂ معنی ہی نہیں بلکہ مدفن اہل دل بھی ہے۔ یہاں علمائے کبار کے پہلو بہ پہلو بڑے بڑے اولیا اللہ بھی عدم کی نیند سو رہے ہیں۔ اردو زبان کے ابتدائی کلمات انہی بزرگان دین کے مقدس لبوں سے ادا ہوئے ہیں چنانچہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے پوتے حضرت قطب عالم کے متعلق مشہور ہے کہ ایک روز آپ پچھلی رات کو اٹھ کر باہر نکلے تو کسی چیز سے ٹھوکر لگی۔ آپ کے منہ سے اس وقت یہ کلمہ نکلا "لوہ ہے یا لکڑ یا پتھر ہے" اسی طرح حضرت قطب عالم کے فرزند یا خلیفہ حضرت شاہ عالم کے اقوال و ملفوظات میں جو جمعات شاہی میں محفوظ ہیں، ہندی اور گجراتی کے بہت سے فقرے دیکھنے کو ملتے ہیں مثلاً "اب چھوکرا۔ بے ادبی مگذار و گستاخی مکن" اور عام طور پر "پڑھ ڈوکرے" والا فقرہ تو بہت مشہور ہے۔

گجرات کی قدیم اردو جسے اہل گجرات "گجری" کے نام سے پکارتے تھے، چند نمونے دستیاب ہوئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ گجرات میں اردو کا استعمال بھی ادبی طور پر ہونے لگا تھا۔ اس سلسلے میں تین نام بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ شیخ بہاء الدین باجن (وفات ۱۵۰۶ء) شیخ خوب محمد خوب چشتی (وفات ۱۶۱۴ء) اور شاہ علی جیوگام دھنی (وفات ۱۵۶۵ء) بہاء الدین باجن فارسی اور برج دونوں میں شعر کہتے تھے۔

شاہ علی جیوگام دھنی کے کلام کا مجموعہ جواہر اسرار اللہ مصنف مرآۃ احمدی کے نزدیک دیوان مغربی کے ہم پایہ ہے۔ انہوں نے اظہار عشق میں ہندی شعراء کا اسلوب اپنایا ہے۔ شیخ خوب محمد خوب چشتی کی سب سے مشہور کتاب "خوب ترنگ" ہے جس میں صوفیانہ اصطلاحات میں تصوف کے مطالب و مقامات کا بیان ہے۔ مثنوی کی زبان کو عربی اور فارسی آمیز گجراتی کہا گیا ہے۔

سیکولر شاعری میں گجرات میں پہلا نام امین کا ملتا ہے جن کا انتقال اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ میں ہوا۔ انہوں نے گوجری زبان میں یوسف زلیخا کی داستان منظوم کی ہے جو کافی ضخیم ہے۔ امین نام کا ایک اور شاعر بھی محمود شاہ ثانی کے ندیمان خاص سے تھا اور اس نے بہرام گور اور حسن بانو کے حسن و عشق کا فسانہ نظم کرنا شروع کیا تھا لیکن مکمل نہ کر سکا۔ دولت نامی ایک دوسرے شاعر نے اسے پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ ان قدیم شعراء کے بعد گجرات میں ولی کا نام آتا ہے۔ ولی اور عزلت کے بعد تا زمانۂ حال گجرات میں کوئی ایسا شاعر نہیں گزرا جس نے اردو شاعری کی مرکزی روایت میں اپنا مقام پیدا کیا ہو۔ محمد علوی جو ولی ہی کے خاندان سے ہیں پہلے شاعر ہیں جنہوں نے ولی کے بعد گجرات کے باہر اردو کے اہم مراکز سے داد سخن وصول کی ہے۔

آج کل (اردو نمبر)

مادری زبان

مردم شماری کی رپورٹ کے مطابق گجرات کے وہ لوگ جنہوں نے اپنی مادری زبان اُردو لکھوائی ہے ان کی تعداد حسب ذیل ہے۔

۱۹۵۱	۳۹۶٬۰۹۲
۱۹۶۱	۵٬۹۴٬۵۳۸
۱۹۷۱	۵٬۸۱٬۵۰۸

اس رپورٹ سے ظاہر ہے کہ اُردو بولنے والوں کی تعداد آبادی کے تناسب سے ۱۹۵۱ء کی بہ نسبت ۱۹۶۱ء میں بڑھی ہے۔ لیکن ۱۹۷۱ء میں گھٹی ہے۔ اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نظر نہیں آتی کہ یا تو لوگوں نے مادری زبان لکھوانے میں یا مردم شماری کے عاملوں نے صحیح اندراجات بھرنے میں بے پروائی سے کام لیا ہے۔ دیہاتوں اور شہروں میں مسلمانوں کے وہ فرقے جن کی مادری زبان گجراتی، کچھی یا مارواڑی ہے اُردو بولنے والے مسلمانوں کے ساتھ اُردو ہی میں بات چیت کرتے ہیں۔ اس طرح گجرات کا مسلمان عام طور پر ذولسانی واقع ہوا ہے۔ جہاں تک بول چال کی زبان کا تعلق ہے وہ یکساں آسانی اور روانی کے ساتھ گجراتی اور اُردو بولتا ہے۔ دور دراز کے دیہاتوں میں بھی علمائے دین کے وعظ شستہ اُردو میں ہوتے ہیں۔

گجرات میں اُردو اور اُردو کی تعلیم کی طرف حکومت کی طرف سے کسی جانبداری کا رویہ اختیار نہیں کیا گیا۔ البتہ وہ نجی ہائی اسکول جہاں گجراتی کی تعلیم ہوتی ہے ان میں اُردو اور فارسی کی طرف کوئی ہمدردانہ رویہ بھی اپنایا نہیں گیا۔ بہت سے ایسے علاقوں کے ہائی اسکول جہاں مسلمانوں کی تعداد معتدبہ تھی اور جہاں آزادی تک اُردو اور فارسی کی تعلیم کا معقول انتظام تھا۔ ان میں سے آہستہ آہستہ اُردو اور فارسی دونوں وختم کر دیا گیا۔ یہی رویہ مشن اسکولوں نے بھی اپنایا۔ اب ان اسکولوں میں مسلمان بچے اُردو اور فارسی کے بجائے گجراتی اور سنسکرت پڑھتے ہیں۔ گجرات میں اُردو کی طرف اُردو والوں کا رویہ بھی نہایت افسوسناک اور عبرت ناک رہا ہے۔

آزادی ملتے ہی گجرات کے مسلمانوں نے فیصلہ کیا کہ گجرات میں اردو ذریعۂ تعلیم کی اب ضرورت نہیں رہی اور اگر طالب علم ہائی اسکول میں تمام مضامین اُردو میں پڑھتا ہے تو یونی ورسٹی کی اعلیٰ تعلیم میں جس کا میڈیم اب گجراتی بن چکا تھا، اسے دشواریاں پیش آئیں گی۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ بچہ اپنی ابتدائی تعلیم یعنی پہلی سے لے کر ساتویں جماعت تک کی تعلیم اُردو میڈیم میں لیتا ہے اور آٹھویں جماعت سے گیارہویں جماعت تک تمام مضامین گجراتی میں پڑھتا ہے۔ پڑھے لکھے اور متمول مسلمان اپنے بچوں کو ابتدا ہی سے گجراتی یا انگریزی اسکولوں میں داخل کرا دیتے ہیں۔

گجرات میں اُردو میڈیم کا کوئی ہائی اسکول نہیں ہے۔ البتہ پرائمری اسکول تمام ریاست میں پھیلے ہوئے ہیں کمشنر لسانی اقلیات کے مطابق ۶۸-۱۹۶۷ء میں اُردو کے پرائمری اسکولوں کی تعداد گجرات میں ۱۳۲ تھی جن میں ۳۸۰۴۰ بچے تعلیم پاتے تھے۔ احمد آباد میں ایک سے چار جماعتوں تک اُردو اسکولوں کی تعداد ۴۹ ہے جن میں ۱۳۸۴۵ بچے تعلیم پاتے ہیں۔ پانچ سے سات جماعتوں والے اسکولوں کی تعداد ۲۹ ہے جن میں ۹۸۶۶ بچے تعلیم پاتے ہیں۔ اس طرح صرف احمد آباد میں ۸۷ اسکول ہیں۔ اور ان میں ۲۳٬۱۱۷ بچے پڑھتے ہیں۔ ساتویں جماعت کے بعد یہ بچے مڈل اسکول میں جاتے ہیں جہاں اُردو صرف ایک مضمون کے طور پر انہیں پڑھائی جاتی ہے اور باقی مضامین گجراتی کے ذریعے پڑھائے جاتے ہیں۔ ایسے اسکول جو اُردو کو صرف ایک مضمون کے طور پر پڑھاتے ہیں عموماً مسلمان ٹرسٹوں ہی کے قائم کیے ہوئے ہیں مثلاً انجمنِ اسلام ہائی اسکول احمد آباد، اینگلو عربک ہائی اسکول سورت، مدرسہ ہائی اسکول بڑودہ۔ ایسے اسکولوں کی تعداد ریاست میں سات آٹھ سے زیادہ نہیں۔[1]

جہاں تک یونی ورسٹی کی تعلیم کا تعلق ہے پورے گجرات میں صرف ایک کالج یعنی گجرات کالج احمد آباد میں اُردو کے ڈگری کورس کا انتظام ہے۔ پوسٹ گریجویٹ کی تعلیم کا انتظام بھی صرف گجرات یونی ورسٹی میں ہے لیکن ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ یونی ورسٹی میں فارسی کا ریڈر تو ہے لیکن اُردو کا لکچرر تک نہیں۔ ایم اے کی کلاسیں صرف گجرات کالج میں ہوتی ہیں اور نصاب مختلف کالجوں کے مختلف پروفیسروں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ گجرات میں اُردو کی طرف طالب علموں کا رجحان ہمیشہ کم رہا ہے۔ اُردو اسپیشل میں طالب علموں کی تعداد ایک دو سے زیادہ کبھی بڑھی نہیں۔ یہی حال ایم اے کا رہا ہے۔ کالجوں میں پوری یونی ورسٹی میں اُردو ایک اختیاری مضمون کے طور پر ہے۔ پوری گجرات یونی ورسٹی میں اُردو بطور ایک اختیاری مضمون لینے والوں کی تعداد ہر سال پچاس ساٹھ سے زیادہ نہیں ہوتی۔

گجرات میں پانچ یونی ورسٹیاں ہیں۔ لیکن سوائے گجرات یونی ورسٹی

---

[1] لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی حالیہ (بارھویں) رپورٹ کے مطابق ریاست گجرات میں ۶۸-۱۹۶۷ء میں ایسے ثانوی اسکولوں کی تعداد دس تھی جہاں ذریعۂ تعلیم اُردو تھی۔ ان اسکولوں میں تعلیم پانے والے بچوں کی تعداد ۱۴۰۱ اور استادوں کی تعداد ۲۵ تھی۔

معروف شعرا ... [illegible] ... سے تعلق رکھتے ہیں ... [illegible] ... [illegible] ... ممتاز مفتی، غلام عباس، [illegible] ... ام اسلم، [illegible] ... پنجاب ہی کی دین ہیں۔ اسی طرح تلوک چند محروم، جوش ملسیانی، [illegible] احمد فیض، قتیل شفائی، احمد ندیم قاسمی، اختر شیرانی، ساحر لدھیانوی، احمد ریاض، قیوم نظر، [illegible] یوسف ظفر، الطاف مشہدی، حفیظ ہوشیارپوری، [illegible] عبدالمجید سالک، [illegible] عابد علی عابد، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، عرش ملسیانی، جگن ناتھ آزاد اور دوسرے ممتاز شعرا کا تعلق بھی اسی خطہ زمین سے ہے۔ ان کے علاوہ [illegible] القادر، حفیظ جالندھری، مولانا تاجور نجیب آبادی، [illegible] ... غلام رسول مہر، میاں بشیرالدین [illegible] ... سید عبداللہ ... [illegible] ... عاشق بٹالوی، شورش کاشمیری ... [illegible] ... ایسے شخص تھے جو شہرت کے مالک ادیبوں اور صحافیوں کی مرکز بنا ... کا مرکز بھی لاہور ہی تھا۔

آزادی وطن کے بعد ملک کی ایک بہت بڑی آبادی سے ساتھ ساتھ ادبا و شعرا کو بھی ہجرت کرنا پڑی۔ لاہور کے بہت سے روزنامے اور جریدے جو ہندوؤں کی ملکیت تھے، دہلی یا جالندھر سے شائع ہونے لگے۔ ہوشیارپور کی ... [illegible] ... مشرقی پنجاب ... [illegible] ... "پارس"، "پرتاپ" اور ... نے دہلی کو اپنا مرکز بنایا لیکن روزنامہ "پرتاپ"، "ملاپ" دہلی اور جالندھر سے اور روزنامہ "پربھات" اور "اجیت" جالندھر سے شائع ہوتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ ہی عرصہ میں جالندھر مشرقی پنجاب میں اخبارات و رسائل کا سب سے بڑا مرکز بن گیا لیکن اسکولوں میں اُردو پڑھنے والوں کی تعداد بتدریج کم ہونے لگی ایک وجہ یہ بھی کہ ایک تو اُردو جاننے والوں کی اکثریت مغربی پاکستان میں ہجرت کر گئی۔ دوم مشرقی پنجاب میں ہندی اور پنجابی کے تنازعہ کی وجہ سے صوبے کی از سر نو تشکیل وقوع پذیر ہوئی جس کے باعث پہلے سے تقسیم شدہ اس صوبے کو دو چھوٹی چھوٹی ریاستوں پنجاب، ہریانہ میں تقسیم کر دیا گیا اول الذکر کی زبان پنجابی اور آخر الذکر کی ہندی قرار پائی۔ مختصراً یہ کہ آزادی کے بعد بچا کھچا مشرقی پنجاب اب پنجاب، ہریانہ اور ہماچل پردیش میں بٹ گیا۔

اُردو بولنے والوں کی تعداد: تقسیم سے پیشتر پنجاب میں اُردو مادری زبان والوں کی تعداد کافی تھی لیکن آہستہ آہستہ اس میں کمی ہوتی گئی۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری میں پنجاب میں ۲۷۵۰۶۶۰ کی مادری زبان اُردو تھی لیکن آئندہ دس برس میں سات اضلاع ہریانہ میں چلے جانے سے اُردو مادری زبان والوں کی تعداد میں غیر معمولی کمی واقع ہوئی۔ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۱۳۵۵۱۰۶۰ افراد کی آبادی میں سے صرف ۹۰۰۳ افراد کی مادری زبان اُردو تھی۔ بہرحال موجودہ پنجاب میں اُردو لکھنے، بولنے اور پڑھنے والوں کی تعداد اتنی کم نہیں جتنی کہ مردم شماری کی رپورٹ سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہاں سے شائع ہونے والے اخبارات و رسائل کی تعداد و اشاعت کے پیش نظر یہ قیاس بے جا نہ ہوگا کہ یہاں اُردو داں لوگوں کی تعداد ۲۰ لاکھ سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ۴۰ سال سے زائد عمر کے تعلیم یافتہ اور نیم خواندہ افراد کی اکثریت اُردو لکھ پڑھ اور بول سکتی ہے۔

تعلیمی سہولتیں: نئی نسل کا اُردو پڑھنے لکھنے کی جانب کوئی رجحان نہیں اور ریاست میں اب اُردو کی تعلیم و تدریس نہ ہونے کے برابر ہے۔ لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی بارہویں رپورٹ کے مطابق ریاست میں ۱۹۶۷-۶۸ء میں اُردو کے کل دو پرائمری اسکول اور دو ثانوی اسکول تھے۔ ان اسکولوں میں اُردو کے ذریعہ تعلیم پانے والے طلبا کی تعداد بالترتیب ۷۹۲ اور ۲۸۴ تھی۔ ان اسکولوں میں معلموں کی مجموعی تعداد ۴۶ تھی۔

تاہم اب ریاستی حکومت اس طرف سنجیدگی سے توجہ دے رہی ہے۔ اس نے اُردو کی ترقی و فروغ پر پانچ لاکھ روپیہ سالانہ خرچ کرنے کا پروگرام مرتب کیا ہے۔ اس پروگرام کے تحت ریاست میں اُردو کے چار اسکول کھولے جائیں گے اور سہ لسانی فارمولے پر عمل کرتے ہوئے وہاں تمام اسکولوں میں اُردو کی تعلیم کا انتظام کیا جائے گا۔

پنجاب یونی ورسٹی اور ریاست کے کئی کالجوں میں اُردو تعلیم و تدریس کا انتظام ہے۔ اس کے علاوہ پنجابی یونی ورسٹی پٹیالہ صرف ایم اے اُردو کے امتحانات دینے کا ہی انتظام نہیں بلکہ یہاں کے شعبۂ انتھراپالوجی لسانیات کے زیر اہتمام اُردو سیمینار منعقد کئے

جاتے ہیں۔ ایسا ہی ایک سیمینار پچھلے دنوں مذکورہ بالا شعبے نے منعقد کیا تھا جس میں پروفیسر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر عبدالغفار شکیل، ڈاکٹر منسراج رہبر، اقتدار حسین، مرزا خلیل احمد بیگ اور نصیر احمد خاں نے حصّہ لیا اور مقالے پڑھے۔ اس سیمینار میں ایک تجویز پاس کی گئی کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے تعاون و اشتراک سے پنجابی یونیورسٹی میں ایک ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کا مقصد اردو پنجابی کا باہمی تحقیقی مطالعہ ہو۔

اُردو اخبارات و رسائل

اس صوبے میں اُردو روزناموں کی تعداد (پندرہ) سوائے اُتر پردیش کے دوسری تمام ریاستوں سے زیادہ ہے لیکن جہاں تک تعدادِ اشاعت کا سوال ہے۔ اُتر پردیش بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ پنجاب کے کثیر الاشاعت روزنامے "ہند سماچار" کی تعدادِ اشاعت ۴۱،۲۰۰ ہے جبکہ اتر پردیش کے تمام اُردو روزناموں کی مجموعی تعدادِ اشاعت لگ بھگ ۳۸ ہزار ہے۔ حالانکہ وہاں تقریباً ۹۲ لاکھ افراد کی مادری زبان اُردو ہے اور پنجاب میں صرف ۲۹ ہزار کی۔

مہاشہ کرشن کا "پرتاپ" پنجاب کا سب سے پُرانا روزنامہ ہے۔ یہ دہلی اور جالندھر سے شائع ہوتا ہے۔ اس کے جالندھر ایڈیشن کی تعدادِ اشاعت ۱۷،۵۷۶ ہے۔ یشری ویریندر اس کے ایڈیٹر ہیں۔ اور اس کا سنِ اجرا ۱۹۱۹ء رہا ہے۔ مہاشہ خوشحال چند خورسند نے روزنامہ "ملاپ" کا اجرا ۱۳ اپریل ۱۹۲۳ء کو لاہور میں کیا تھا۔ یہ اخبار اب بیک وقت دہلی، حیدرآباد اور جالندھر سے شائع ہوتا ہے۔ روزنامہ ملاپ جالندھر کے مدیر مشہور کانگرسی رہنما اور صحافی شری یش ہیں۔ ۱۹۶۱ء میں جالندھر سے روزنامہ "پردیپ" کا اجرا ہوا۔ جو ریاست کے کثیر الاشاعت اخبارات میں سے ہے

ان کے علاوہ جالندھر سے "پربھات"، "جے ہند" اور "جالندھر رپورٹر" لدھیانہ سے چھ روزنامے "صداقت"، "سماج"، "بھارت درپن"، "ہمگوتم"، "رجحان" و "ترجمان" اور امرتسر سے صرف ایک روزنامہ اخبار "فلائنگ میل" شائع ہوتا ہے۔ ان سبھی اخبارات کی تعدادِ اشاعت ایک ہزار سے تین ہزار کے درمیان ہے۔

اخبارات کی تعدادِ اشاعت کے لحاظ سے بھی پنجاب دوسرے نمبر پر ہے۔ اُردو روزناموں کی مجموعی تعدادِ اشاعت ۳۷۶،۰۰۰ ہے اور پنجاب کے اخبارات کی مجموعی تعدادِ اشاعت ۹۳،۰۰۰ ہے یعنی کل تعدادِ اشاعت کی ایک چوتھائی۔

[1] پندرہ روزناموں کے علاوہ یہاں سے ۶۷ ہفتہ وار، ۳۰ پندرہ روزہ اور ۲۸ ماہانہ رسائل شائع ہوتے ہیں۔ ریاست کا سب سے پرانا ہفتہ وار "آریہ گزٹ" جالندھر (۱۸۸۵ء) گزشتہ ۸۸ برس سے جاری ہے۔ بھائی پرمانند مرحوم کا "ہندو" بھی یہاں کا ایک پُرانا ہفتہ وار ہے جو ۱۹۲۲ء سے برابر شائع ہو رہا ہے۔ پندرہ روزہ "سناتن دھرم پرچارک" کا سنِ اجرا ۱۹۰۱ء اور "بجرنگ" کا سنِ اجرا ۱۹۳۵ء ہے۔ یہ جریدے مذہبی ہیں۔ ان کی اشاعت بڑی محدود ہے۔

تقسیم کے بعد فکر تونسوی اور محمود جالندھری نے جالندھر سے "رفتار" اور "نقوش" کا اجرا کیا جو اعلیٰ معیار کے ادبی پرچے تھے۔ اسی طرح تاجور سامری کی زیرِ ادارت "جن سیت" اشاعت پذیر ہوا۔ لیکن ان ادبی پرچوں کو زیادہ عرصہ زندہ رہنا نصیب نہ ہوا۔ بہرحال ۱۹۵۳ء میں "پگڈنڈی" (امرتسر) ۱۹۵۴ء میں "پرواز" (لدھیانہ) ۱۹۵۹ء میں "نگارش" (امرتسر) ۱۹۶۶ء میں "جاں نثار" (امرتسر) ایسے ادبی پرچوں کا اجرا ہوا۔ لیکن ان میں سے کسی کو بھی ملک گیر شہرت حاصل نہیں ہو سکی۔ ان کی تعدادِ اشاعت محدود ہے اور یہ بے قاعدگی کا شکار ہیں۔

علمی ادبی سرگرمیاں :-

ریاست میں اُردو ادباء و شعراء اتنی زیادہ تعداد میں ہیں کہ اُن کا شمار ایک مسئلہ ہے۔ بہرحال اندازہ ہے کہ معروف و مستند ادیبوں اور شاعروں کی تعداد لگ بھگ دو اڑھائی سو ہوگی۔ ریاست میں اکثر مشاعرے، سیمینار اور ادبی اجلاس منعقد ہوتے رہتے ہیں۔

اُردو کے معمّر اور مشہور شاعر جوش ملسیانی کا تعلق بھی اسی خطۂ زرخیز سے ہے۔ آپ اُستاد داغ کے آخری بقیدِ حیات شاگرد ہیں اور خود آپ کے اَن گنت شاگرد برِصغیر ہند و پاک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ آپ کی متعدد تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ حکومتِ پنجاب سے ایوارڈ ملنے کے علاوہ انہیں مرکزی حکومت نے پدم شری سے نوازا ہے۔

اسی طرح برہم دت قاصر بھی پنجاب ہی کے ایک بزرگ ادیب و شاعر ہیں جن کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ہند سرکار نے پدم شری کا اعزاز عطا کیا ہے۔ ایک درجن سے زائد کتابوں کے اس مصنف کا تلمذ فیروز الدین طغرائی سے ہے۔ قاصر صاحب کو کئی ادبی انعامات مل چکے ہیں۔

---

[1] پریس اِن انڈیا، وزارتِ اطلاعات و نشریات۔ نئی دہلی

میلارام وفا یہاں کے ایک برگزیدہ شاعر و صحافی ہیں۔ ان کی شاعری کی تعریف و توصیف پنجاب کے کئی عالموں اور ادیبوں نے کی ہے۔ وہ پنجاب کے راج کوی ہیں۔

جواں مرگ شاعر نریش کمار شاد پنجاب کے مشہور شاعر و صحافی درد نکودری (جو عرصے سے لاپتہ ہیں) کے فرزندِ ارجمند تھے۔ شاد نے قلیل عرصے میں ملک گیر شہرت حاصل کر لی تھی اور متعدد کتابیں تصنیف کی تھیں۔۔۔ نیز افسانہ نگار ستیندر کمار روما بھی پنجاب کے ہی رہنے والے ہیں۔

ان کے علاوہ رتن پنڈوروی، اودے سنگھ شائق، اختر رضوانی، ساحر کپورتھلوی، ساحر سیالکوٹی، نانک چند ناز، پورن سنگھ ہنر، ست پرکاش سنگھ قیس جالندھری، کرپال سنگھ بیدار، سورج تنویر، رشی پٹیالوی، مدن راہی، ڈاکٹر نریش، کرشن ادیب آزاد گلاٹی، مہیش پٹیالوی، پریم کمار نظر، پریم وار برٹنی، ساحر سنامی، گنگا دھر تسنیم، سریھگوان شاد، روشن پٹیالوی، برق ہوشیارپوری، اختر بھنگالوی، بسمل امرتسری، رام ناتھ اسیر، سیاح سنامی، رام رتن مضطر، ہما ہرنالوی، بنواری لال نسیم، وفا پٹیالوی، افضل نکودری، سرشار سیلانی، سادھو سنگھ ہمدرد، نسیم نوحملی، متر نکودری، کلیم کرت پوری، اخگر فیروزپوری، تیر امرتسری، کمال کرتارپوری، ساگر نکودری، شوق جالندھری، روشن نکودری طیش، رام ناتھ رشک بشن داس راز، اوم پرکاش عارف، درگا داس قامر، ہربنس لال مجرم وغیرہ کے نام آتے ہیں۔

بہت سے ممتاز و نامور ادبا و شعراء ایسے ہیں جن کا تعلق پنجاب سے ہے۔ لیکن جو تقسیم کے بعد ملازمت یا روزگار کی وجہ سے پنجاب سے باہر مختلف مقامات پر سکونت پذیر ہیں۔ جیسے مالک رام، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، ساحر لدھیانوی، جگن ناتھ آزاد، عرش ملسیانی، گوپال متل، امرت لال عشرت، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، فکر تونسوی، مخمور جالندھری، رعنا جگی، اُپیندر ناتھ اشک، دیویندر ستیارتھی، بلونت سنگھ، ہنس راج رہبر، پرکاش پنڈت، چرخ چنیوٹی، اکمل جالندھری، ربیر، جمنا داس اختر، ساحر ہوشیارپوری، ضیا فتح آبادی، طالب چکوالی، ظفر ادیب، افسر آذری، عمر جلال آبادی، دوارکا داس شعلہ، ہیرا لال چوپڑہ، وغیرہ۔ اسی طرح دیویندر اسر، سریندر پرکاش، جواں چند بسمل، منموہن تلخ، کرشن موہن، بلراج کومل، بلراج مینرا، جوگندر پال، رام لال، راج نرائن راز، کمار پاشی، بالی، وشوا ناتھ درد، جو تقسیم کے بعد اُردو ادب میں معروف ہوئے پنجاب سے ہی متعلق ہیں۔

کتابوں کی اشاعت پنجاب کتابوں کی اشاعت کے معاملے میں بے حد پسماندہ ہے۔ پنجاب میں اُردو کی بہت کم کتابیں شائع ہوتی ہیں وہ اُن میں بہت کم اعلیٰ معیار کی ہوتی ہیں۔ کوئی بڑا اُردو ناشر نہ ہونے کی وجہ سے خالص ادبی قسم کی کتب مصنفین کو خود اپنی گرہ سے چھپوانا پڑتی ہیں یا پھر پنجاب کے باہر کسی ناشر یا ادارے کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

اَدبی انجمنیں: ریاست میں کئی اَدبی انجمنیں قائم ہیں جن کے تحت اجلاس اور مشاعروں کا انعقاد ہوتا رہتا ہے۔ تقسیم ملک کے بعد فکر تونسوی، مخمور جالندھری، تاجور سامری، بلراج کومل، شرر فتح پوری، سہاگ سنگھ عاجز وغیرہ نے پنجاب میں کچھ عرصے تک انجمن ترقی پسند مصنفین کی سرگرمیاں جاری رکھیں لیکن بعد ازاں وہ انجمن ختم ہو گئی۔

اس وقت ریاست میں انجمن ترقیٔ اُردو پنجاب خصوصًا قابلِ ذکر ہے جس کی وجہ سے محسوس ہوتا ہے کہ ریاست میں ابھی اُردو کی سرگرمیاں جاری ہیں۔ اسی انجمن کی سفارشات و تجاویز پر ریاست میں ایک گیارہ رُکنی اُردو کمیٹی کا تقرر ہوا ہے۔ جس کے صدر وزیرِ تعلیم سردار امراؤ سنگھ اور کنوینر ڈائرکٹر محکمہ السنہ ہیں۔ اس کمیٹی کے پانچ رُکن انجمن نے اور باقی ریاستی حکومت نے نامزد کیے ہیں۔ یہ کمیٹی گیان سنگھ راڑیوالہ، اودے سنگھ شائق، نوبہار صابر، سورج تنویر، محمد کفایت اللہ، پورن سنگھ ہنر، رام لال بھنڈاری موہن لال سنگھی، پیارے لال رتن، مہر چند کوثر، اور رشی پٹیالوی پر مشتمل ہے۔

انجمن ترقیٔ اُردو پنجاب کا مطالبہ ہے کہ پنجاب کے محکمہ السنہ میں اُردو کا ایک شعبہ قائم کیا جائے، اُردو اہلِ قلم کی امداد و اعانت کی جائے۔ نیز انہیں ان کی تخلیقات پر انعامات و اعزازات عطا کیے جائیں۔ محکمہ تعلقاتِ عامہ میں ایک شعبۂ اُردو کا قیام عمل میں آئے، اور محکمۂ تعلیم کے تحت اُردو تعلیم و تدریس کے لیے شبانہ مرکز قائم کیے جائیں۔

انجمن ترقیٔ اُردو پنجاب کے علاوہ اور بھی کئی ادبی ادارے ہیں جو اُردو کی ترقی و ترویج میں بڑی گرمجوشی سے حصہ لے رہے ہیں۔ اُردو پریشد چنڈی گڑھ بھی اس خطے میں اُردو کے فروغ میں نمایاں خدمات انجام دے رہی ہے۔ ڈاکٹر نریش پریشد کے سکریٹری ہیں۔ پریشد نے اُردو زبان کو مقبول و دلعزیز بنانے کے لئے اُردو کی

کلاسوں کا اہتمام بھی کیا ہے۔

انعامات واعزازات: ریاستی سرکار اُردو ادیبوں کو اکثر انعامات و اعزازات سے نوازتی رہتی ہے۔ ہندی اور پنجابی کے ساتھ ساتھ اُردو شاعروں کو بھی "راج کوی" کا اعزاز بخشا گیا ہے۔

اعزازات کے علاوہ اُردو ادیبوں کو انعامات دینے میں بھی ریاستی حکومت پیش پیش ہے۔ کئی شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات پر انعامات دیئے جا چکے ہیں۔ مرحوم تلوک چند محروم اور نرلیش کمار شاد کے علاوہ پریم دت قاصر کو اُن کی کئی تصنیفات پر انعامات ملے ہیں۔ عرش ملسیانی، کرپال سنگھ بیدار، میلا رام وفا، آزاد گلاٹی، شہاب للت، پورن سنگھ ہُنر کو بھی اعزازات و انعامات مل چکے ہیں۔ علاوہ بریں مرکزی حکومت سے جوش ملسیانی، حفیظ جالندھری، اختر رضوانی، اور پورن سنگھ ہنر کو ماہانہ پنشن یا مالی امداد دی گئی۔

محکمۂ تعلقات عامہ: محکمہ اطلاعات عامہ کی جانب سے پہلے اُردو میں ماہنامہ "پاسبان" شائع ہوتا تھا لیکن اب کچھ عرصہ سے بند ہے۔ موجودہ صورتِ حال کے پیشِ نظر توقع ہے کہ حکومتِ پنجاب اس کا دوبارہ اجرا کرے گی جس سے صرف اُردو کی خدمت ہی انجام نہیں پائے گی بلکہ بیرونِ پنجاب رہنے والا اُردو داں طبقہ بھی پنجاب کی سرگرمیوں سے روشناس ہو سکے گا۔

ہریانہ

زبان کی بنیاد پر پنجاب کی ازسرِنو تشکیل ہوئی اور یکم نومبر ۱۹۶۶ء کو پنجاب کے ہندی بولنے والے سات اضلاع پر مشتمل ایک الگ ریاست ہریانہ بنا دی گئی۔ اس پردیش کی آبادی ۱۰۰۳۶۸۰۸ ہے۔ درحقیقت یہ وہ علاقہ ہے جہاں ہریانی بولی بولی جاتی ہے جس کا اُردو سے گہرا رشتہ ہے اور جس نے قدیم اُردو کی نشو ونما میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔ ڈاکٹر محمود شیرانی نے دکنی زبان کی جن خصوصیات کی توضیح پنجابی سے کی ہے غالباً وہ یہی زبان ہریانی ہے اور اسی سے اُردو زبان نکلی ہے۔

بہرحال اُردو چاہے پنجاب یا ہریانہ میں پیدا ہوئی ہو چاہے دکن یا دلی میں لیکن اس میں شک نہیں کہ اس کی ترقی اور نشو ونما میں بہت سی ریاستوں نے حصہ لیا ہے۔ جن میں ہریانہ بھی پیش پیش ہے۔ یہاں ہمیشہ بڑی تعداد میں اُردو جاننے والے لوگ موجود رہے ہیں۔

اُردو زبان بولنے والوں کی تعداد

۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہریانہ میں ۱۹۵۸۳۶ افراد نے اپنی مادری زبان اُردو لکھوائی ہے۔ یہ لوگ زیادہ تر گوڑگاؤں اور انبالہ ضلع میں ہیں لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ یہاں صرف دو لاکھ کے قریب ہی افراد اُردو جاننے بولنے والے ہیں۔

تعلیمی سہولتیں: اگرچہ یہاں اُردو تعلیم کا تمام اسکولوں میں بندوبست نہیں اور بہت کم طلبا اُردو میں داخلہ لیتے ہیں تاہم اگر کسی اسکول میں چالیس یا کسی جماعت میں دس طالب علم اُردو پڑھنے کے خواہاں ہوں تو وہاں اُن کے لیے اُردو اُستاد کا انتظام کر دیا جاتا ہے۔ لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی رپورٹ کے مطابق ۶۸-۱۹۶۷ء میں دو ثانوی اسکولوں میں صرف ۵۲۵ طلبا تعلیم پا رہے تھے۔ صوبے میں صرف ایک یونی ورسٹی کوروکشیتر ہے لیکن وہاں اُردو تعلیم کا کوئی بندوبست نہیں

اخبارات ورسائل چونکہ یہ پردیش پہلے پنجاب کا ہی ایک حصہ تھا اور جالندھر اخبارات کا مرکز تھا۔ لہٰذا اب بھی اس کی ضرورتیں جالندھر یا دلی کے روزنامے ہی پوری کرتے ہیں۔ یہاں سے کوئی روزنامہ شائع نہیں ہوتا۔

ریاست[1] سے ۲۱ ہفتہ وار رسائل پندرہ روزہ اور نو ماہانہ جرائد شائع ہوتے ہیں۔ ریاست کا سب سے پرانا ہفتہ وار "جاٹ گزٹ" ہے جو ۱۹۱۶ء سے شائع ہو رہا ہے۔ اسی طرح کرنال سے شائع ہونے والا ہفت روزہ "امرت" ۱۹۳۷ء سے علاقے کی نمائندگی کر رہا ہے۔ ان کے علاوہ "انبالہ سندیش"، "انبالہ ٹائمز"، "ارمان ہریانہ"، "بھارت پتر"، "دیپ سندیش"، "درست گفتار"، "ہریانہ تلک"، "جنم بھومی"، "جگت نیتر"، "میو گزٹ"، "پیغام" (سول پت) "پبلک اوپینین"، "روشن شعلہ"، "تحقیقات" اور "ناقدین" ہفتہ وار شائع ہوتے ہیں۔ پندرہ روزہ "نکرپالیکا" "پورنیما" "پرشارتھی گزٹ"، "وائس آف امپلائز"، "نیہ فکر"، "آریہ" کا منتر کاٹیر دمیوزا، "مست بادل"، "سماج واد" کے علاوہ ماہنامہ "ہریانہ" "دیت کی بارش" "ارادے" "خوشدل" "نرالا جوگی" "ترمان پنجاب" "نظارے" "قوم پرست" اور "شہید" یہاں سے چھپنے والے ماہانہ جرائد ہیں۔

---

[1] پریس ان انڈیا ۱۹۷۱ء وزارت اطلاعات ونشریات، نئی دہلی

ادبا و شعراء: ہریانہ کو یہ شرف حاصل ہے کہ مولانا حالی ایسی اُردو کی قدآور شخصیت اسی ریاست کے شہر پانی پت میں پیدا ہوئی جس نے اُردو شاعری میں ایک نئی طرح ڈالی اور "مقدمہ شعر و شاعری"، "حیاتِ سعدی"، "یادگارِ غالب" اور "حیاتِ جاوید" لکھ کر اُردو نثر نگاری میں ایک نئی راہ نکالی۔ وحیدالدین سلیم پانی پتی ایسے اُردو محقق، زبان داں اور صحافی کا تعلق بھی اسی شہر سے ہے۔ وقار انبالوی کا بھی تقسیم سے پیشتر یہی وطن تھا۔ خواجہ غلام الثقلین، خواجہ غلام السیدین، صالحہ عابد حسین اور خواجہ احمد عباس کا تعلق بھی اسی خطے سے ہے۔

گو یہ ریاست بہت چھوٹی ہو گئی ہے تاہم یہاں شعراء و ادبا کی کمی نہیں اور اب بھی یہاں خاصی تعداد میں اُردو ادیب اور شاعر موجود ہیں جیسے سرشار طالب پانی پتی، کشمیری لال ذاکر، تمنا انبالوی، شیدا انبالوی، بل کرشن اشک، امیر چند بہار، پورن کمار ہوش، رشتہ فتح پوری، زخمی حصاری، ن۔ ن۔ بھٹی، منوہر لال منوہر، پریم حصاری، آتش بہاولپوری، عابد عالمی، بلبیر راٹھی، مظلوم کیتھلوی نصوصاً قابل ذکر ہیں۔ منصور سبزواری کا اگرچہ ہریانہ وطن نہیں، تاہم روزگار کے سلسلے میں وہ ایک عرصے سے ہریانہ میں سکونت پذیر ہیں۔

حضرت آفتاب پانی پتی بھی یہاں کے ایک بزرگ ممتاز شاعر تھے اور ہریانہ کے قیام کے بعد صوبائی حکومت نے انہیں راج کوی کا اعزاز دیا تھا۔ چند برس ہوئے اُن کا انتقال ہو گیا۔

ادبی انجمنیں: ہریانہ کی ادبی سرگرمیوں میں انجمن ترقی اُردو ایک اہم رول ادا کر رہی ہے۔ ریاست میں اُردو کو دُوسری سرکاری زبان تسلیم کرانے کے سلسلے میں اس کے جنرل سیکرٹری اوم پرکاش ملک اور سیکرٹری حکیم اجمل خان ملک دوڑ دھوپ کر رہے ہیں۔ انجمن کا مطالبہ ہے کہ چونکہ اُردو ہریانہ کی بول چال کی زبان ہے اور اسے وسیع پیمانے پر استعمال کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس کی ترقی اور فروغ کے لئے لسانی محکمے میں ایک الگ شعبہ قائم کیا جائے جیسا کہ پنجاب میں ہے۔

اُردو کلب رہتک، بزمِ ادب انبالہ، حلقۂ اربابِ اُردو گوڑگانواں اور دیگر کئی انجمنیں ریاست میں اُردو سرگرمیوں کا مرکز ہیں۔ اور ان کی بدولت اُردو ادبا و شعراء کا اجتماع اور مشاعروں وغیرہ کا اہتمام ہوتا رہتا ہے۔

کتابوں کی اشاعت: جہاں تک اُردو کتب کی اشاعت کا تعلق ہے۔ یہاں سے اُردو کتابیں زیادہ تعداد میں شائع نہیں ہوتیں کیونکہ یہاں عمدہ معیار کی کتابت و طباعت کا تسلی بخش انتظام نہیں۔ لہٰذا یہاں کے ادبا و شعراء اپنی تخلیقات اکثر نجی طور پر دہلی سے یا کسی اور بیرونی ادارے کی وساطت سے چھپواتے ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں منصور سبزواری کا شعری مجموعہ "پانچھی دھیرے چل" منظرِ عام پر آیا تھا۔ ۱۹۷۱ء میں امیر چند بہار کی رباعیات کا مجموعہ "نسیمِ بہار" اشاعت پذیر ہوا۔ جو اس سے پیشتر انگریزی نظموں کا منظوم ترجمہ "نسیمِ مغرب" کے نام سے پیش کر چکے تھے۔ اسی برس رانا گنوری نے کالی داس کے شاہکار "میگھ دوت" کا ترجمہ شائع کیا۔ ابھی حال میں جدید شاعر بل کرشن اشک کا دوسرا شعری مجموعہ "آئینہ اور پرچھائیں" منظرِ عام پر آیا ہے۔ اس سے پہلے اشک کی تصنیف "دھوپ کے پھول" شائع ہو چکی ہے۔ علاوہ ازیں بلبیر راٹھی کا مجموعۂ کلام "قطرہ قطرہ"، سرور فتح پوری کا "کاروانِ سحر" اور عابد عالمی کا مجموعۂ کلام "دائرہ" شائع ہو چکا ہے۔

انعامات و اعزازات

اگرچہ اُردو کو ابھی تک ریاست میں دوسری زبان کا درجہ حاصل نہیں، تاہم ریاستی حکومت اُردو ادبا و شعراء کی انعامات و اعزازات سے حوصلہ افزائی کرتی رہتی ہے اس نے اس زبان کے ادیبوں اور شاعروں کو بھی نظرانداز نہیں کیا۔ جب آفتاب پانی پتی کا انتقال ہوا تو حکومت نے جیمنی سرشار کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں راج کوی بنایا۔

ادبی تصنیفات پر بھی اکثر انعامات دیئے جاتے ہیں۔ نوبہار صابر کے مجموعۂ کلام "کارواں خیالوں کے" پر حکومت نے ایک ہزار روپے کا پہلا انعام عطا کیا تھا۔ اسی طرح ۱۹۷۲ء میں عابد عالمی کی تصنیف "دائرہ" اور دیپ وید دوالوی کی کتاب "طلاق" پر پانچ پانچ سو روپے کے انعامات دیئے گئے۔ علاوہ بریں ظفر ادیب کی تنقیدی کتاب "ہم عصروں پر غالب کا اثر" پر ایک ہزار کا انعام مرحمت کیا گیا۔ ان کے علاوہ ہریانہ سرکار نے اُردو کے جن ادیبوں اور شاعروں کو انعامات دیئے۔ اُن میں کشمیری لال ذاکر، خواجہ احمد عباس، بل کرشن اشک اور بلبیر راٹھی بھی شامل ہیں۔

ریاست کی سرکاری زبان ہندی ہونے کی وجہ سے اب تمام دفتری کارروائی ہندی میں ہوتی ہے لیکن چونکہ پُرانا ریکارڈ اُردو میں ہے لہٰذا اُردو جاننے والے عملے کی بڑی ضرورت پڑتی ہے۔

محکمۂ اطلاعات عامہ: محکمۂ اطلاعات عامہ کو بھی اُردو کی اہمیت و افادیت کا احساس ہو گیا ہے اور چونکہ ریاست میں ایک بڑی تعداد میں لوگ اُردو جاننے والے ہیں، لہٰذا انہیں ریاست کے ترقیاتی پروگرام سے رُوشناس کرانے کے لئے "تعمیرِ ہریانہ" کا اجرا کیا گیا ہے جس کے مدیر سکھ دیو راج شرما ہیں۔

ہماچل پردیش

۱۵ اپریل ۱۹۴۸ء کو پنجاب کی ۳۱ پہاڑی ریاستوں کو ملا کر ہماچل پردیش کی تشکیل کی گئی۔ اس ریاست کی آبادی ۳۴،۶۰،۴۳۴ ہے اور اکثریت کی زبان ہندی اور پہاڑی ہے۔

اردو بولنے والوں کی تعداد مردم شماری کی رپورٹ کے مطابق ۱۹۶۱ء میں ریاست میں صرف ۱،۷۶۲ افراد کی مادری زبان اردو تھی لیکن ۱۹۷۱ میں یہ تعداد بڑھ کر ۱۰،۱۲۱ ہو گئی۔ اگرچہ اب بھی بہت کم لوگوں کی مادری زبان اردو ہے، تاہم یہاں کی اچھی خاصی آبادی اردو داں ہے۔ ریاستی سرکار نے اس زبان کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ سہ لسانی فارمولے کے تحت یہاں کے اسکولوں میں اردو پڑھائی جاتی ہے۔ لیکن پڑھنے والوں کی تعداد معمولی ہے۔

اخبارات و رسائل :- جہاں تک اخبارات و رسائل کا تعلق ہے ہریانہ کی طرح یہاں سے بھی کوئی روز نامہ شائع نہیں ہوتا، اور اس کی ضرورت بھی پنجاب سے شائع ہونے والے اخبارات ہی پوری کرتے ہیں۔ حالانکہ پنجاب کا دوسرا اردو اخبار "شملہ اخبار" اسی ریاست کی راجدھانی شملہ سے ۱۸۴۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اب یہاں سے صرف نو جریدے شائع ہوتے ہیں لیکن ان میں سے کسی کو بھی ملک گیر شہرت حاصل نہیں اور سبھی مقامی نوعیت کے ہیں۔ یہ سبھی کانگڑہ اور دھرم شالہ سے شائع ہوتے ہیں۔ اب توقع ہے شملہ سے ایک سہ ماہی "شناخت" منظرِ عام پر آئے گا۔ ریاست کا سب سے پرانا ہفتہ وار "ڈوگرہ سندیش" ہے جو ۱۹۴۸ء سے شائع ہو رہا ہے۔ سب سے کثیر الاشاعت ہفت روزہ "کیلاش" ہے جس کی تعدادِ اشاعت ۳،۷۹۲ ہے۔ ان کے علاوہ ریاست سے ہفتہ وار "ہمارا ہماچل" "کانگڑہ سماچار" "للکار" اور "لوک راج" — دو پندرہ روزے "ہماچل سپر سبھات" اور "پہاڑی دنیا" نیز ایک ماہنامہ "برقِ ہماچل" شائع ہوتے ہیں۔

ادبا و شعراء :- گو اس ریاست میں اردو کو پنجاب اور ہریانہ کی نسبت زیادہ تعلیمی سہولتیں حاصل ہیں، پھر بھی ان دو ریاستوں کی نسبت یہاں پر اردو ادیبوں اور شاعروں کی تعداد کم ہے۔ یہاں کے ادبا و شعراء میں لال چند پرارتھی، چاند کلوی، کرشن کمار طور، کاہن سنگھ جمال، عاقل لاہوری، احسن رضوی، رتن سنگھ ہنر، ضیا صدیقی، ساغر پالمپوری، سرشٹی چند شوق، طلعت عرفانی، راجندر ناتھ رہبر، ساغر گپت، سلطان شہاب، پریم بھکھڑولوی قابلِ ذکر ہیں۔

ادبی سرگرمیاں ریاست میں بزمِ ادب ہماچل اردو سرگرمیوں کا واحد مرکز ہے جس کے تحت شملہ میں مشاعرے اور اجلاس منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن آزادی سے پیشتر کی شملہ کی سرگرمیوں کے مقابلے میں یہ سب ہیچ ہیں کیونکہ پہلے شملہ میں ایسے یادگاری اور تاریخی مشاعرے منعقد ہوتے تھے جنہیں اہلِ اردو آج بھی فراموش نہیں کر سکے۔

کتابوں کی اشاعت :- اردو کتب کی اشاعت کی رفتار بھی غیر تسلی بخش ہے۔ یہاں سے بہت کم کتابیں اشاعت پذیر ہوتی ہیں اور ان میں بھی اچھی اور قابلِ ذکر کتابیں کم ہوتی ہیں۔ چونکہ ریاست میں عمدہ لیتھو پریس اور کتابت کا اہتمام نہیں لہٰذا عام طور پر کتابیں دہلی، جالندھر وغیرہ سے شائع ہوتی ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں راجندر ناتھ رہبر کی شعری تصنیف "کلس" اور گزشتہ برس دھرم پال عاقل لاہوری کا شعری مجموعہ "خونِ جگر" منظرِ عام پر آیا۔

انعامات و اعزازات ریاستی حکومت اردو کی ترقی و ترویج اور ادیبوں اور شاعروں کی حوصلہ افزائی میں تھوڑی بہت دلچسپی رکھتی ہے۔ ابھی حال میں بزمِ ادب ہماچل پردیش کو سہ ماہی "شناخت" شائع کرنے کے لئے مالی امداد دی گئی ہے۔ اور آئندہ مزید مالی امداد دینے کا بھی وعدہ کیا گیا ہے۔

محکمہ اطلاعاتِ عامہ ریاست میں محکمہ تعلقاتِ عامہ کی جانب سے اردو کی جانب کوئی توجہ نہیں دی جا رہی اور نہ ہی کوئی خبرنامہ یا رسالہ اردو میں شائع کیا جاتا ہے۔

فروغ کے لئے تجاویز :- پنجاب ہریانہ اور ہماچل میں اردو کی ترقی و فروغ کے لئے لازمی ہے کہ :-

۱۔ سہ لسانی فارمولے کے تحت تمام اسکولوں میں اردو کی تعلیم لازمی قرار دی جائے اور دفتروں میں ملازمت کے لئے امیدوار کے واسطے مڈل اسکول تک اردو امتحان پاس کرنے کی شرط عائد کی جائے۔

۲۔ اردو اساتذہ کے لئے ٹریننگ اسکول قائم کئے جائیں۔

۳۔ اعلیٰ معیار کی نصابی کتابوں کی اشاعت کا خاطر خواہ انتظام کیا جائے اور ان کے لئے مالی امداد بھی دی جائے۔

۴۔ اردو ادیبوں اور شاعروں کو اعزازات، انعامات اور وظائف دیئے جائیں، نیز انہیں اپنی کتابیں شائع کرنے کے لئے مالی امداد بھی دی جائے۔



رسا جاودانی



اختر محی الدین



غلام رسول نازکی



سندلال واتل



حامدی کاشمیری



حکیم منظور



شکیل الرحمٰن



موہن یاور



علی محمد لون



شجاع سلطان



نور شاہ



تیج بہادر بھان



عابد مناوری



رفیق راز



عرش صہبائی

جموں و کشمیر میں اردو



محمد یوسف ٹینگ

مہاراجہ گلاب سنگھ نے ۱۸۴۶ء میں کشمیر کو خرید کے جموں وکشمیر کی متحدہ ریاست کی بنیاد ڈالدی۔ اس سے قبل ہمیں کشمیر میں اُردو کے چلن کے متعلق کوئی تفصیلی حوالے تو نہیں ملتے۔ لیکن مختلف شواہد کی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ اُردو ہمسایہ پنجاب سے یہاں پہونچ چکی تھی۔ افغان عہد کے فارسی شاعر دیا رام کاچرو خوشدل (ولادت ۱۷۴۴ء) کا یہ اُردو شعر ملاحظہ ہو: ع

آ گئے تھے مثلِ شبنم سیرِ گلشن کر چلے
باغباں تو دیکھ لے اپنا چمن ہم گھر چلے

جدید کشمیری زبان کے اولین استاد محمود گامی (وفات: ۱۸۵۵ء) کے کشمیری کلام میں ٹھیٹھ اُردو کے ایسے مصرعے بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔

شنو فریاد میری ہے خدایا
یا
اسی کو چارہ مانگو وقتِ مشکل

کشمیر میں اُردو کے چلن کے متعلق ایک انگریز افسر فریڈرک ڈریو نے اپنی کتاب میں کچھ دلچسپ اِشارے کئے ہیں۔ یہ شخص ۱۸۶۲ء میں ریاست میں طبقات الارض کے ماہر کی حیثیت سے آیا تھا۔ اس نے مہاراجہ کے دربار کی زبان کے متعلق لکھا ہے:

"ہندوستان سے آنے والے ملازم لوگ بلاشبہ ہندوستانی (اُردو) بولتے ہیں اور مقامی لوگ اسے سمجھ لیتے ہیں۔" مہاراجہ گلاب سنگھ کے جانشین رنبیر سنگھ کا ذاتی محافظ دستہ رام پور کے روہیلوں پر مشتمل تھا، جو اُردو بولتے تھے۔ شاہی دربار کی شان دوبالا کرنے کے لئے لکھنؤ اور دہلی سے نقیب بھی ملازم رکھے گئے تھے۔ جو دربار کو اپنی گونجدار آواز سے پُر وقار بناتے تھے۔ اِس کے علاوہ ہندوستان سے مختلف طائفے اور اہلِ نشاط بھی جموں وکشمیر جاتے تھے اور انکی گائی ہوئی غزلیں فوراً مقبول ہو جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ بیرون ریاست سے کچھ سیاح سیلانی بھی کشمیر آتے تھے۔ چنانچہ ہرگوپال خستہ نے لکھا ہے کہ بازار میں عام کشمیری ان سے اُردو میں آسانی کے ساتھ بات چیت کر سکتے تھے۔

اُردو انیسویں صدی کے آخر میں کشمیر دربار میں کس قدر اہمیت حاصل کر چکی تھی اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ جموں دربار نے اُردو کے مشہور انشاء پرداز شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد دہلوی کو کشمیر آکر یہاں کی تاریخ لکھنے کی دعوت دی تھی۔

مہاراجہ پرتاپ سنگھ ۱۸۸۵ء میں تخت نشین ہوئے۔ تو انھوں نے فارسی اور انگریزی کو ترک کر کے اُردو کو سرکاری زبان بنا دیا۔

موجودہ صدی کی کروٹ پر اُردو ریاست میں اپنا سکہ بٹھا چکی تھی۔

مولانا شبلی نعمانی ۱۸۹۹ء میں کشمیر آئے اور وہاں اپنے کشمیری دوست سعدالدین سعد کے یہاں ٹھہرے۔ یہ سعد اُردو کے بہت اچھے شاعر تھے اور ان کا کلام سر عبدالقادر کے شہرۂ آفاق رسالے "مخزن" میں شائع ہوتا رہتا تھا۔ اسی طرح ہرگوپال خستہ نے ریاست کی پہلی اُردو تاریخ "گلدستۂ کشمیر" ۱۸۸۳ء میں شائع کی اور کشمیر کی مشہور ترین لوک کہانی "ہی مال" کا منظوم اُردو ترجمہ بھی شائع کیا تھا۔ اُردو کے خوشگو شاعر خوشی محمد ناظر دربار کشمیر کے نہایت اہم رکن تھے۔ چنانچہ انھوں نے سرینگر میں "مفرح القلوب" کے نام سے صاحبانِ ذوق کا ایک حلقہ ترتیب دیا جس کے اراکین میں منشی سراج الدین اور صادق علی صادق کافی مشہور تھے۔ یہ دائرہ سرینگر کے خوب صورت ترین باغات اور جھیل ڈل کی لہروں پر تیرتے ہوئے شکاروں میں اُردو کے مشاعرے منعقد کراتا تھا اور اس نے کشمیر میں اُردو کا ذوق عام کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اسی زمانے میں اور اس کے بعد وقفے وقفے سے محمد حسین عارف، برجموہن دتاتریہ کیفی، نواب جعفر علی خاں اثر، خلیفہ عبدالحکیم، خواجہ غلام السیدین، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، حفیظ جالندھری، فیض احمد فیض جیسے چوٹی کے اُردو ادیب اور شاعر ریاست میں آئے اور اُردو کی آبیاری میں معاونت کی۔

ہائی کورٹ کے جج پنڈت بھاگ رام نے اِس صدی کی دوسری دہائی میں درباری منظوری سے حکم صادر کیا کہ جموں وکشمیر کی عدالتوں میں فارسی کی بجائے اُردو میں کام کاج کئے جائیں۔ اسی زمانے میں محکمۂ مال میں بھی اُردو کو کام کاج کی زبان بنانے کا حکم صادر ہوا۔ ۱۹۳۱ء میں جب کشمیر میں تحریکِ آزادی شروع ہوئی تو اُردو اس تحریک کی نشر و اشاعت کا ذریعہ بنی اور لاہور میں چھپنے والا لٹریچر کشمیریوں کی ترجمانی اُردو میں ہی کرتا تھا۔ تحریک کے اکثر نعرے اُردو میں بلند ہوتے تھے اور تحریک کے بانی شیخ محمد عبداللہ اپنی تقریروں کا آغاز عموماً ڈاکٹر اقبال کی قومی نظموں سے کرتے تھے۔ خود شیخ صاحب نے مجھ سے بیان کیا ہے کہ کشمیر میں آزادی کی جوت جلانے میں ان نظموں سے بڑی مدد ملی۔ اگرچہ شیخ صاحب کی ترنم ریز آواز بھی اِن کی تاثیر کی ایک وجہ تھی۔

کشمیر میں اُردو کی تدریس کے لئے ۱۹۴۰ء کا سال تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ اس سال حکومت نے سیدین کمیٹی کی سفارشات منظور کرتے ہوئے ریاست کے سکولوں کے لئے آسان اُردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا، لیکن اِسے فارسی یا دیوناگری کسی بھی رسم الخط میں لکھنے پڑھنے کی آزادی دیدی۔ اِسی سال تمام سکولوں اور کالجوں میں اُردو سکھانے کے لئے خاص اساتذہ تعینات کئے گئے اور کم و بیش یہی پالیسی آج تک رائج ہے۔ کشمیر میں اُردو کی تاریخ کے سلسلے میں ۱۹۵۶ء کا سال بھی نہایت اہم ہے۔ اسی سال ریاست جموں وکشمیر کی پہلی آزاد آئین ساز اسمبلی نے جو آئین منظور کیا۔ اس میں دفعہ

۵۴ء کے تحت اُردو کو ریاست کی سرکاری زبان قرار دیا گیا

اُردو بولنے والوں کی تعداد

اُردو ریاست میں ایک محدود طبقے کی مادری زبان ہے صرف ان لوگوں کی جو دہلی یا یوپی اور پنجاب سے یہاں تجارت یا ملازمت کے سلسلے میں آئے اور یہیں بس گئے۔ چونکہ ریاست میں ۱۹۵۱ء میں کوئی مردم شماری نہیں ہوئی۔ اس لئے ہمیں ابتدائی اعداد و شمار کے لئے ۱۹۴۱ء کی مردم شماری رپورٹ کا سہارا لینا پڑیگا۔ اس رپورٹ میں، ہندی اور اُردو کے بولنے والوں کیلئے مشترکہ عنوان قائم کر کے ان کی تعداد درج کی گئی ہے۔ اس کے مطابق ہندوستانی ساری ریاست میں ۱۰۸۵۲۸ (ایک لاکھ آٹھ ہزار پانچسو اٹھائیس) لوگوں کی مادری زبان درج کی گئی ہے۔ جموں اور کشمیر کے صوبوں میں ان کی تقسیم یوں بتائی گئی ہے۔

جموں = ۹۷،۸۶۸

کشمیر = ۱۰۶۶۱

۱۹۵۱ء میں چونکہ ریاست میں مردم شماری نہیں ہوئی۔ اس لئے اب ۱۹۶۱ء کے اعداد و شمار کا جائزہ لینا مناسب رہیگا۔ اس رپورٹ میں زبانوں کے گوشوارے میں جن لوگوں کی مادری زبان اُردو بتائی گئی ہے۔ اُن کی تعداد کل ۱۲۴۴۵ بارہ ہزار چارسو پینتالیس ہے ریاست کی کل آبادی ۳۵۶۰۹۷۶ درج ہے۔ اور پہاڑی بولنے والوں کی تعداد ۲۲۳۲۳ (بائیس ہزار تین سو تیئیس) بتائی گئی ہے۔ جب کہ ہندوستانی بولنے والوں کی تعداد گھٹ کر صرف ۶ (چھ) رہ گئی ہے لیکن یہ صورت حال کا صحیح آئینہ نہیں ہے کیونکہ اس مردم شماری کے نقائص پر اس کی اشاعت کے ساتھ ہی کشمیر کے اخباروں میں کافی لے دے ہوئی تھی۔ بہرحال ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ریاست جموں و کشمیر میں ۱۲،۴۴۰ افراد کی مادری زبان اُردو ہے۔ لیکن مادری زبان نہ ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اُردو کشمیر اور جموں میں وسیع پیمانے پر پڑھی لکھی اور سمجھی نہیں جاتی۔

یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ریاست کی آبادی کا ۳۰ سے ساٹھ فی صدی حصہ یہ زبان یا تو سمجھتا ہے۔ یا بولتا ہے یا پڑھتا ہے

تعلیمی سہولتیں

ریاست میں ہائی اسکول تک اُردو ذریعہ تعلیم ہے۔ لہٰذا کم از کم نظریاتی حد تک یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جو طالب علم ان سکولوں میں پڑھتے ہیں وہ اُردو سے واقف ہیں۔ اس سلسلے میں وزارت تعلیم کے مہیا کردہ اعداد و شمار یوں ہیں

(اعداد و شمار لاکھوں میں)

	ابتدائی سکولوں	مڈل	ہائی/ہائر
۵۰-۵۱	۰،۸۶	۰،۲۰	۰،۲۲
۷۱-۷۲	۳،۳۵	۱،۲۱	۰،۷۲

کالجوں میں چونکہ اُردو ایک الگ مضمون کی حیثیت سے (اختیاری مضمون) پڑھائی جاتی ہے۔ لہٰذا وہاں اُردو پڑھنے والے طلبار کا صحیح شمار آسان ہے۔ ریاست میں دو یونیورسٹیاں قائم ہیں (۱) کشمیر یونیورسٹی اور (۲) جموں یونیورسٹی۔ کشمیر یونیورسٹی کے متعلقہ کالجوں میں اُردو کے طلبار کی تعداد کا گوشوارہ ۷۳-۱۹۷۲ء کے تعلیمی سال کے لئے رجسٹرار کے دفتر سے یوں دیا گیا ہے

پی۔یو۔سی۔ ۲۲۹۰۔ بی۔اے (حصہ اول) ۱۳۳۸۔ بی اے (فائنل) ۱۵۰۱

اور یونیورسٹی میں شعبہ اُردو میں زیر تعلیم طلبار کی تعداد یوں ہے۔

ایم۔اے (پریویس) ۵۰۔ ایم اے (فائنل) ۲۲۔

پی۔ایچ۔ڈی سے پہلے کا کورس = ۵

پی۔ایچ ڈی (زیر تکمیل) = ۲

جموں یونیورسٹی میں مختلف مدارج کے طلبار کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

بی۔اے۔سال اول	۲۴۳
بی۔اے۔سال دوم	۲۱۰
بی۔اے۔سال سوم	۲۰۰
ایم۔اے۔سال اول	۲۵
ایم۔اے۔سال دوم	۱۶
پی۔ایچ۔ڈی (زیر تکمیل)	۹

اُردو اخبارات و رسائل

ریاست میں اُردو کا پہلا اخبار "بدیا بلاس" ۱۸۶۴ء میں شائع ہوا جس میں اُردو کے علاوہ ہندی کا حصہ بھی شامل ہوتا تھا۔ یہ سرکاری اخبار تھا۔ لیکن جب سالگرام سالک، محمد دین فوق وغیرہ نے کشمیر سے اخبار نکالنے کی اجازت چاہی تو انھیں مایوسی ہوئی۔ آخرکار ۲۴ جون ۱۹۲۴ء کو لالہ ملک راج صراف جموں سے اُردو کا پہلا روزنامہ "رنبیر" جاری کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس وقت صورت یہ ہے کہ جموں سے کل چھ روزانہ اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ جن میں اُردو کے روزنامے چار ہیں۔ (۱) عمارت (۲) قومی آواز (۳) سندیش (۴) اُجالا۔

جموں سے شائع ہونے والے ہفتہ وار اُردو اخبارات کی تعداد چالیس ہے۔ اس کے علاوہ اُردو میں تین پندرہ روزہ اخبار بھی شائع ہوتے ہیں۔

سری نگر سے اس وقت نو روزنامے شائع ہوتے ہیں۔ جو سب کے سب

اردو زبان میں چھپتے ہیں۔ ان کی تفصیل یوں ہے۔

(۱) آفتاب (۲) سرینگر ٹائمز (۳) ہمدرد (۴) خدمت (۵) زمیندار (۶) چنار (۷) وُلر (۸) نوجیون (۹) سنسار۔

سرینگر سے اس کے علاوہ ۲۵ ہفتہ وار شائع ہوتے ہیں۔ جن میں سے ۲۴۔ اردو میں ہی شائع ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ سرینگر سے ہی تین ماہانہ اُردو رسالے اور ایک دوماہی اُردو رسالہ شائع ہوتا ہے۔[1]

ریاست کے تقریباً تمام کالج بھی اپنے جریدے نکالتے ہیں جن میں اردو کا حصہ نہ صرف شامل ہوتا ہے۔ بلکہ اکثر صورتوں میں باقی دوسرے حصوں پر بھاری ہوتا ہے۔[2] ریاست کے کچھ ممتاز اخبارات حسب ذیل ہیں!

۱۔ "آفتاب"۔ سرینگر سے روزانہ شائع ہوتا ہے۔ خواجہ ثناء اللہ بٹ اس کے مُدیر ہیں۔ یہ ریاست کا واحد اخبار ہے جو آفیسٹ پر چھپتا ہے۔ روزانہ اخبارات میں اس کی توقیر بہت زیادہ ہے۔

۲۔ "سرینگر ٹائمز"۔ سرینگر سے روزانہ شائع ہوتا ہے۔ صوفی غلام محمد اس کے مُدیر ہیں۔ اپنے برجستہ کارٹونوں کی وجہ سے مشہور ہے۔

۳۔ "آئینہ" اس کے مُدیر پارلیمنٹ کے ممبر شمیم احمد شمیم ہیں۔ یہ ہفتہ وار ریاست سے باہر کے اُردو حلقوں میں بھی پڑھا جاتا ہے۔

۴۔ "خدمت" یہ وادی میں چھپنے والا سب سے قدیم روزانہ اخبار ہے۔ اور برسر اقتدار جماعت کانگریس کا ترجمان ہے۔ ریاست کے ایک کہنہ مشق صحافی پنڈت نندلال واتل اس کے مدیر ہیں۔

۵۔ "سنہرلش" جموں کا سب سے پرانا اور سب سے زیادہ چھپنے والا روزانہ اخبار۔ مسٹر نذیر حسین سمنانی ممبر لیجسلیٹو کونسل اس کے مدیر ہیں۔

۶۔ "چاند"۔ یہ ہفتہ وار جموں سے سالہا سال سے شائع ہو رہا ہے یہ ریاست کے اخبارات میں سب سے زیادہ ضخیم ہوتا ہے۔ اسکے مُدیر دیوان نرسنگھ داس نرگس اُردو کے ایک کہنہ مشق قلم کار اور جموں کے مورخ ہیں۔

۷۔ "رفتار" ــــ یہ ہفتہ وار جموں سے اُردو کے معروف کہانی کار موہن یاور کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ اپنے خوب صورت گیٹ اپ کی وجہ سے پسند کیا جاتا ہے۔

۸۔ "ہمدرد"۔ سرینگر سے خواجہ غلام رسول عارف کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ یہ اخبار اپنی میانہ روی کی وجہ سے پسند کیا جاتا ہے۔

۹۔ "اذان"۔ یہ ہفتہ وار جماعت اِسلامی (کشمیر) کا ترجمان ہے۔ جماعت کے امیر پیر سعد الدین اس کے مُدیر ہیں۔

۱۰۔ "شیرازہ"۔ یہ ریاست کی زبانوں، فن اور تمدن سے متعلق اکادمی کا ادبی اور تحقیقی رسالہ ہے۔ راقم الحروف اسکا مدیر ہے۔ ہر دو ماہ کے بعد شائع ہوتا ہے۔

علمی و ادبی سرگرمیاں

ریاست میں اُردو کے ادیبوں کی فہرست بہت طویل ہے لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ پچھلے بیس برس کے عرصے میں تخلیقی ادب پیدا کرنے والے سرکردہ ادیبوں کا رُجحان اُردو زبان کی بجائے کشمیری اور ڈوگری کی طرف زیادہ ہوگیا ہے۔ چنانچہ کشمیر کے سربرآوردہ ترین ادیب دیناناتھ نادمؔ رحمان راہی۔ میر غلام رسول نازکی۔ اختر محی الدین۔ محمد امین کامل وغیرہ بیس برس پہلے اُردو میں ہی لکھتے تھے۔ لیکن آج ان کی توجہ کا اصل مرکز کشمیری زبان ہے۔ اس کی وجہ کچھ تو علاقائی قومیت کا ابھرتا ہوا احساس ہے اور کسی حد تک یہ بھی کہ اُردو کے وسیع میدان میں کشمیری لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی۔ لیکن اِس کے باوجود اِس وقت بھی جموں وکشمیر میں اُردو کے شاعروں، نثر نگاروں اور صحافیوں کی تعداد بلا مبالغہ سو اور ڈیڑھ سو کے درمیان ہے۔

کشمیر کے اُردو شاعروں میں شہ زور کاشمیری، مکتب سیمابؔ کی آخری یادگاروں میں سے ایک ہیں اور اپنے رنگ کے نہایت پختہ مشق شاعر ہیں۔ میر غلام رسول نازکی اُردو قطعات کا مجموعہ "دیدۂ تر" بہت پہلے شائع ہو چکا ہے۔ نازکی فارسی اور عربی کے جید عالم ہیں۔ اور ان کے نثری مضامین میں ان کے تبحر علمی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ عبد القدوس رسا جاودانی (بھدروا) اُردو کے کلاسیکی رنگ میں اچھی غزل کہتے ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام "نیرنگ غزل" شائع ہوکر دادِ تحسین حاصل کرچکا ہے۔ ڈاکٹر حبیب اللہ حامدی کاشمیری شاعر۔ نقاد۔ ڈرامہ نگار، افسانہ نویس اور ناول نگار بھی ہیں۔ اُن کی تنقیدی کتاب "غالب کے تخلیقی سرچشمے" جدید اُردو ادب کے تنقیدی سرمائے میں ایک اہم اِضافہ ہے۔ حامدی صاحب کی زیر ترتیب کتاب جدید ہیئت کے موضوع پر ہے۔ موہن یاور کے افسانوں کے کئی مجموعے جن میں "سیاہ تاج محل" اور "ہونٹوں کی توبۂ" شامل ہیں، ان کے ہلکے پھلکے انداز نگارش کے لئے داد حاصل کرچکے ہیں۔ قاضی غلام محمد کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ ریاضی سے منسلک ہیں۔ اُن کے مزاحیہ کلام کا مجموعہ "حرف شیریں" اُردو کے مزاحیہ ادب میں ایک خوشگوار اضافہ قرار دیا گیا ہے۔ شمیم احمد شمیم کا آئینہ اُردو

---

[1] نیوز پیپر ڈائریکٹری (۳۰، ۱۹۷۱) نظامتِ اطلاعات حکومت جموں وکشمیر سرینگر۔ اب اس میں "علم و دانش" نامی ایک اور سہ ماہی رسالے کا اضافہ ہوگیا ہے۔

[2] ان میں سری پرتاپ کالج کا "پرتاپ" اور امر سنگھ کالج کا "لالہ رُخ" نہایت اعلیٰ روایت کے حامل ہیں اور ڈاکٹر تاثیر جیسی شخصیات ان سے وابستہ رہ چکی ہیں۔

صحافت میں اپنا مقام بنا چکا ہے۔ آفتاب کے مدیر ثنا ء اللہ بٹ کا روزانہ فکاہی کالم "خضر سوچتا ہے وُلر کے کنارے" اپنے رنگ کی انتہائی دلچسپ اور ہر دل عزیز تحریر ہوتی ہے۔ اُردو کے نوخیز ادیبوں میں تیج بہادر بھان۔ نور شاہ (افسانہ، ناول نگار)، حکیم منظور۔ محمد یسین۔ رفیق راز۔ شجاعت سلطان (شاعر) شامل ہیں۔ ان کے علاوہ عرش صہبائی، میکش کاشمیری شوریدہ کاشمیری سلطان الحق شہیدی۔ عابد مناوری۔ قیصر قلندر (شاعر) علی محمد لون (ڈرامہ نویس) کلدیپ رعنا۔ ریاض پنجابی اور بشیر شاد (افسانہ نگار) بھی اُردو ادب میں خوشگوار اضافے کر رہے ہیں۔ بیرون ریاست کے ادبا میں ڈاکٹر گیان چند جین (صدر شعبۂ اُردو جموں یونیورسٹی)، ڈاکٹر محمد حسن (صدر شعبہ اُردو کشمیر یونیورسٹی)، ڈاکٹر شکیل الرحمان، جگن ناتھ آزاد، کمال احمد صدیقی کشمیر میں اُردو ادب کو فروغ دینے میں اہم حصہ ادا کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر اکبر حیدری نے چند ہی برسوں میں تحقیقی میدان میں اپنا مقام بنا لیا ہے اور ان کا مرتبہ "کلیات میر" زیر طبع ہے۔

ریاست میں ہر سال پچاس سے ساٹھ اور بعض اوقات ایک سو تک اُردو کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ ان میں سے کچھ تو مجموعۂ کلام ہوتے ہیں۔ کچھ تاریخ اور سوانح سے متعلق ہوتی ہیں۔ اور کچھ سیاسی اور عصری مسائل سے متعلق مختلف مکاتب ہائے فکر کی ترجمان ہوتی ہیں۔

ریاست میں خالص اُردو کے لئے اس وقت کوئی جماعت سرگرم نہیں ہے۔ اگرچہ شمیم احمد شمیم انجمن ترقی اُردو (ہند) کی مجلس عاملہ کے رکن ہیں۔ لیکن انھوں نے ابھی تک ریاست میں اس انجمن کی شاخ قائم کرنے کی طرف سنجیدگی سے توجہ نہیں کی ہے۔ تاہم کشمیر کی سب سے بڑی تنظیم "کشمیر کلچرل آرگنائزیشن" اُردو کی ترویج کے لئے مناسب کام کر رہی ہے۔ اس انجمن کی طرف سے کشمیر کے روحانی پیشوا شیخ نورالدین نورانی کے ششش صد سالہ جشن کے سلسلے میں خاص مقالات کو اُردو میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ جشن اقبال منانے کی بھی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ کل ہند بزم شعراء اور نیا ادب کی انجمنیں بھی اچھی کارگذاری کرتی ہیں اور محفلوں کا انعقاد کرتی رہتی ہیں۔

ریاست میں اُردو کا سب سے بڑا اشاعتی ادارہ یہاں کی کلچرل اکادمی ہے۔ اگرچہ یہ شکایت عام ہے کہ اکادمی اُردو کی طرف پوری توجہ نہیں کرتی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ریاست میں اس ادارے سے زیادہ اُردو کے لئے اور کوئی ادارہ خدمت انجام نہیں دے رہا ہے۔ اکادمی ہر سال ریاست کے اُردو ادیبوں کی منتخب تخلیقات پر مشتمل انتھالوجی "ہمارا ادب" شائع کرتی ہے۔ اکادمی سے دو ماہی "شیرازہ" بھی شائع ہوتا ہے۔ اور اس میں لکھنے والوں کو معاوضہ بھی دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اکادمی اُردو کشمیری فرہنگ مرتب کر رہی ہے جس کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ اکادمی کی طرف سے ریاست میں اُردو کی بہترین کتابوں پر ہر سال ایک ہزار روپے کا پہلا اور سات سو روپے کا دوسرا انعام پیش ہوتا ہے۔ اب تک ۲۲ کتابوں پر انعامات دیئے جا چکے ہیں۔ اکادمی اُردو میں کتابیں چھاپنے والے مصنفین کی مالی اعانت بھی کرتی ہے۔ اس کی مالی اعانت سے اب تک اسّی کے قریب اُردو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

اس کے علاوہ یونیورسٹی کا اُردو شعبہ "ادبیات" نام کا رسالہ نکالتا ہے یونیورسٹی اُردو میں توسیعی تقریروں وغیرہ کا اہتمام بھی کرتی ہے۔ اس سال جموں میں محکمۂ صنعت کے اہتمام سے اُردو ادب کے سلسلے میں ایک کل ہند سیمینار منعقد ہوا جس میں کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، علی سردار جعفری، عصمت چغتائی۔ ظ۔ انصاری، ذاجدہ تبسم وغیرہ نے شرکت کی۔ کلچرل اکادمی اور ریڈیو کشمیر کی طرف سے سال میں تین چار کل ہند مشاعرے بھی منعقد ہوتے ہیں۔

کتب خانے

ریاست میں اگرچہ اُردو کے کتب خانے الگ حیثیت میں کام نہیں کرتے، لیکن یہاں کے بڑے بڑے کتب خانوں میں اُردو کتب و رسائل کا نہایت عمدہ ذخیرہ موجود رہتا ہے۔ کشمیر یونیورسٹی کا کتب خانہ حال میں قائم ہوا ہے لیکن یہاں اُردو کتابوں کی تعداد پندرہ ہزار سے تجاوز کر چکی ہے اور ان میں اُردو کی بہترین مطبوعات شامل ہیں۔ سری پرتاپ پبلک لائبریری کی پینتیس ہزار کتابوں میں پندرہ ہزار کے قریب اُردو کتابیں موجود ہیں۔ اور اس کا فیض سب سے زیادہ عام ہے۔ محکمہ تحقیقات علمیہ کی لائبریری اگرچہ کمیت کے لحاظ سے مختصر ہے، لیکن کیفیت میں اس کا جواب نہیں ہے اور اُردو کے کچھ نادر قلمی نسخے یہاں پر موجود ہیں[1]۔ اسی طرح کلچرل اکادمی کے کتب خانے میں اب اُردو کے نادر قلمی نسخوں کی اچھی تعداد شامل ہے جن میں خوش نویسی کے مرقعوں کو امتیازی مقام حاصل ہے۔ غیر سرکاری اداروں میں جامعۃ مدینۃ العلوم (حضرت بل)، میں اُردو کی کتابوں اور خاص طور پر مذہبی لٹریچر کا نہایت عمدہ ذخیرہ موجود ہے۔ یہ ادارہ اوقاف اسلامیہ کی نگرانی میں ہے اور اس کو ایک شاندار عمارت میں منتقل کرنے اور زیادہ ہمہ گیر بنانے کے لئے ایک کمیٹی سے سفارشات مرتب کرنے کو کہا گیا ہے۔

---

[1] اس لائبریری میں کل کتابوں کی تعداد سترہ ہزار ہے جن میں مخطوطات کی بیش قیمت دولت شامل ہے۔ یہاں پر اُردو کے ساٹھ مخطوطات محفوظ ہیں جن میں سے بیشتر اب تک غیر مطبوعہ ہیں +

اس مشاعرے کی اہمیت بھی خصوصی ہے۔ اس میں نہ صرف ہندوستان کے مشہور و اہم خوش گو اور خوش گلو شعرا شریک ہوتے ہیں بلکہ ماضی قریب تک پاکستان کے ممتاز شعرا فیض، قتیل شفائی، سید محمد جعفری، عدمؔ، زہرہ نگاہ، سحاب قزلباش وغیرہ شریک ہوتے رہے ہندوستانی شعرا میں فراقؔ گورکھپوری، علی سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر، غلام ربانی تاباں، شمیم کرہانی، جگن ناتھ آزاد، عرش ملسیانی، ساغر نظامی، مخمور سعیدی، لشور واحدی، بشیر بدر، شاذ تمکنت، کیفی اعظمی، نازش پرتاب گڑھی وغیرہ اکثر اس مشاعرے کی رونق بڑھاتے ہیں۔

دیگر مشہور مشاعروں میں چیمسفورڈ کلب کا مشاعرہ ہوتا ہے۔ ہفتہ وار تیج کے ایڈیٹر دھرمپال گپتا وفا بھی ہر برس ایک شاندار مشاعرہ برپا کرتے ہیں۔ وسط سال یعنی اگست میں یوم آزادی کا مشاعرہ ہوتا ہے۔ جس میں بیرونجات کے شعرا کے علاوہ مقامی شعرا کو بھی مدعو کیا جاتا ہے چند مہینے قبل یہاں کل ہند مزاحیہ مشاعرہ بھی منعقد ہوا تھا۔ دلی میں اپنی نوعیت یہ پہلا مشاعرہ تھا۔ بعض سرکاری محکمے بھی مشاعرے منعقد کرتے ہیں۔ بیشتر مقامی کالجوں کے سالانہ مشاعرے بھی ہوتے ہیں۔ چھوٹی بڑی سطح پر ادبی جلسوں کا رواج عام ہے۔ کتابوں کی رسم اجرا کی تقریبیں بھی آئے دن ہوتی رہتی ہیں۔ ایسی تقریبوں کا انعقاد متعلقہ افراد اور ادبی انجمنیں کرتی ہیں۔ ممتاز ادیبوں کی ادبی خدمات کے اعتراف میں جلسے ہوتے ہیں اور ایسے موقعوں پر ان سے متعلق مضامین کے مجموعے پیش کئے جاتے ہیں۔ ایسے مجموعوں میں "نذر ذاکر"، "نذر عرشی" اور "ارمغانِ مالک" وغیرہم خاص طور پر لائقِ ذکر ہیں۔ دہلی میں شعرا کے جشن منانے اور انہیں استقبالیہ دینے کا رواج بھی عام ہے۔

زیادہ سنجیدہ علمی سرگرمیاں، مذاکرے و خطبات کا اہتمام دلی یونیورسٹی کا شعبۂ اردو اور جامعہ ملیہ کرتے ہیں۔ ادھر ایک اہم سیمینار انجمن ترقی پسند مصنفین نے "ادب اور عصری آگہی" کے موضوع پر منعقد کرایا تھا۔ اس میں مقامی شاعروں اور ادیبوں کے علاوہ لکھنؤ اور بعض دوسرے شہروں کے ادیب اور شاعر بھی شریک ہوئے تھے۔

ادبی سرگرمیوں کے اہم مراکز غالب اکیڈمی، ایوانِ غالب، دلی یونیورسٹی وغیرہم خاص ہیں۔

کتابوں کی رسم اجرا کی تقریبات کا سرسری ذکر اوپر آچکا ہے۔ ایسے میں اشاعتی اداروں کا ذکر بھی ناگزیر ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان کے کسی ایک شہر میں اتنے فعال اشاعتی ادارے نہیں ہیں۔ ان میں سے بعض چھوٹے پیمانے پر کام کرتے ہیں اور بعض بہت بڑے پیمانے پر۔ بڑے پیمانے پر کام کرنے والے ادارے مکتبۂ جامعہ پرائیویٹ لمیٹڈ، اور پنجابی پستک بھنڈار ہیں۔ اس کے علاوہ اشاعتی پبلی کیشنز، ہند پاکٹ بکس، دیہاتی پستک بھنڈار اور شمع بک ڈپو سرگرم اداے ہیں۔

۷۲-۱۹۷۳ء میں مکتبہ جامعہ نے ۲۵۰ کتابیں شائع کیں۔

دوسرے اہم اشاعتی ادارے، نیشنل بک ٹرسٹ، ترقی اردو بورڈ، تعلیمی تحقیق کی قومی کونسل، ساہتیہ اکاڈمی، پبلی کیشنز ڈویژن ہیں یہ بھی سرکاری ادارے ہیں۔ نیشنل بک ٹرسٹ نے سال گزشتہ میں لگ بھگ ۱۲ ادبی کتابیں اردو میں شائع کی ہیں۔ ترقی اردو بورڈ کا دائرہ کار بیشتر علمی ہے۔ اس بورڈ نے پچھلے سال مختلف موضوعات پر چھ کتابیں شائع کیں۔ ان میں بچوں کی کتابیں بھی شامل ہیں۔ تعلیمی تحقیق کی قومی کونسل (این سی ای آر ٹی) نصابی کتب شائع کرتی ہے۔ پچھلے سال اس کونسل نے ایسی چار کتابیں شائع کی ہیں۔ پی۔ کے۔ پبلی کیشنز کا قیام حال ہی عمل میں آیا ہے۔ تاہم اس ادارے نے سال گزشتہ میں لگ بھگ بیس کتابیں شائع کی ہیں۔ اس کا خاص دائرہ کار نوجوان شعرا اور ادیبوں کی کتابوں کی اشاعت ہے

نیشنل اکیڈمی نے سال گزشتہ میں سات کتابیں شائع کیں۔ چھوٹے پیمانے پر کام کرنے والے اشاعت گھروں میں مکتبۂ شاہراہ، ایشیا پبلشرز، دیہاتی پستک بھنڈار، رشیدیہ کتب خانہ، آزاد کتاب گھر، ادارۂ اشاعت دینیات ہیں۔ یہ اشاعت گھر علمی ادبی، تحقیقی، سیاسی اور مذہبی موضوعات پر کتابیں شائع کرتے ہیں۔ سٹار پبلی کیشنز اور ہند پاکٹ بکس، صرف پاکٹ بکس شائع کرتے ہیں۔ ان سب اشاعتی اداروں کی کل مطبوعات کو یکجا کریں تو اوسط ایک سو کتب فی سال سے کم نہ بیٹھے گا۔ ادھر کتابوں کی اشاعتی رفتار میں کچھ مزید تیزی آئی ہے۔

دہلی میں ادبی انجمنیں بے شمار ہیں۔ تاہم انجمن ترقی اردو، انجمن تعمیر اردو، علمی مجلس، انجمن عروج ادب دہلی، رائٹرز ایسوسی ایشن وغیرہم زیادہ فعال ہیں انجمن ترقی اردو، شاید دہلی کی واحد ادبی انجمن ہے جسے مقامی حکومت سے سالانہ مالی امداد ملتی ہے۔

کتابوں وغیرہ کی اشاعت کے لئے مقامی نظم و نسق کوئی امداد نہیں دیتا البتہ بعض اہم کتابوں کی اشاعت کے لئے مرکزی وزارتِ تعلیم کچھ امداد دیتی ہے۔

دہلی میں ایسی کوئی لائبریری نہیں جو صرف اردو کی ہو۔ البتہ بعض لائبریریوں میں اردو کے سیکشن ہیں۔ دہلی یونیورسٹی، جامعہ اور کالجوں کے علاوہ دہلی پبلک لائبریری، ہارڈنگ لائبریری وغیرہ میں اردو کے باقاعدہ سیکشن ہیں۔ نذیریہ لائبریری میں اگرچہ اب نئی کتابیں نہیں خریدی جاتیں لیکن وہاں اردو کی پرانی کتابوں کا بہت قیمتی ذخیرہ موجود ہے۔

غرض دہلی میں ادبی انجمنیں اور اشاعتی ادارے کسی نہ کسی طرح اردو کی ترقی و اشاعت کے لئے سرگرم کار رہتے ہیں۔ تاہم بعض اصحاب ایسے بھی ہیں، جو بڑی خاموشی سے، اپنے طور پر، گو چھوٹے پیمانے پر سہی، اردو کی خدمت انجام

(بقیہ صفحہ ۹۳ پر)

بقیہ: اُتر پردیش میں اُردو

کلیم عرفی، اوپیندر ناتھ اشک، عقیل احمد، حامد حسین حامد، عطیہ نشاط، مسیح الزماں، شمس الرحمٰن فاروقی، رئیس فراز، فرخ جعفری، مرغوب حسن، اجمل اجملی، تنویر سامانی، نصر قریشی، نظام صدیقی، ل احمد اکبر آبادی، مجنوں گورکھپوری، ساغر نظامی، علی سردار جعفری، مجروح سلطانپوری، کیفی اعظمی، اختر الایمان، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، مقصوم رضا راہی، بیکل اُتساہی، کمال امروہی، مسعود حسین خاں، محمد حسن، نذیر احمد، نسیم قریشی، پرتو لکھنوی، قمر رئیس، اکبر حیدری کشمیری، شارب ردولوی، شمیم نکہت، قمر احسن، حمدون عثمانی، جعفر عباس، جعفر عسکری، حرمت الاکرام، شوکت پردیسی، محمد حسن شاہد، وامق جونپوری، ابرار اعظمی، نشار اعظمی، فضا ابن فیضی، علی جواد زیدی، شمیم کرہانی، فضل امام رضوی، حکم چند نیر، نذیر بنارسی، محمود احمد ہنر، امرت لال عشرت، محمود الٰہی، سلام سندیلوی، مصطفےٰ کمال، زبیدہ ایچ قاضی، احمر لاری، موسیٰ مجروح، ایم کو ٹھیاوی راہی، مولانا عبدالماجد دریا بادی، خمار بارہ بنکوی، نشور واحدی، زیب غوری، کمال جائسی، محمد احمد رمز، ناظر الحسینی، فنا نظامی، قیصر حسین قیصر، رشید احمد صدیقی، نازش پرتاب گڈھی، تشنہ کانپوری، مصطفےٰ حسین اثر، آل احمد سرور، اسلوب احمد انصاری، خورشید الاسلام، منیب الرحمٰن، معین احسن جذبی، خلیل الرحمٰن اعظمی، شہریار، ساجدہ زیدی، اختر انصاری، زاہدہ زیدی، وحید اختر، شمیم حنفی، بشیر بدر، صلاح الدین پرویز، غلام مرتضیٰ راہی، اعتبار علی عرشی، راجندر ناتھ شیدا، زیدی جعفر رضا، نازش انصاری، فیاض رفعت، قاضی عبدالستار، مسعود علی ذوقی، وارث کرمانی، ہادی مصطفےٰ آبادی، عروج زیدی، جگر بریلوی، حامد اللہ افسر، اختر بستوی، رشید حسن خاں، ذکی کاکوروی، نورتقی نور، حفیظ میرٹھی، شاکر تسلیم، انوار رضوی، اقبال عمر، ایاز جھانسوی، تاباں جھانسوی، ذکا صدیقی، علی حماد عباسی، ڈاکٹر مسعود آہ، علیم مسرور، انگر مشتاق رحیم آبادی، عمر انصاری، شمیم انہونوی، انوار الحسن، مسرور جہاں، ضیا عظیم آبادی، عبدالقیوم، عطیہ پروین، حبیبہ بانو، خدیجہ رحمٰن، نجمہ اخلاق، نجمہ شہریار، کاظم علی خاں، محمد انصار اللہ نظر، امام مرتضیٰ نقوی، مشیر الحق، اخلاق حسین عارف، شارب لکھنوی، جلیل نجیب آبادی، میاں محمد ذوقی، ہندی گورکھپوری، عبدالنور بیگ، شمس فرخ آبادی، کلاپتی سبہائے بلگرامی، قمر سیوانی، شاعر فتح پوری، شہنشاہ مرزا، مصطفےٰ حسن رضوی، بنجامن نامی ناحدی، حیدر علی جعفر، کیف احمد صدیقی، اقبال مجید، چودھری محمد نعیم، مرتضیٰ حسین بلگرامی وغیرہ

اتنی بڑی اُردو آبادی اور شاعروں، ادیبوں، صحافیوں اور رسائل کی اتنی بڑی تعداد کے پیش نظر، ادبی ثقافتی محاذ پر خاطر خواہ سرگرمیوں کا ہونا اغلب و ناگزیر ہے۔ یہاں کے ہر چھوٹے بڑے قصبے اور شہر میں شاعر، ادیب اور ادبی انجمنیں ہیں۔ تاہم اس ریاست میں اُردو سرگرمیوں کے بعض بڑے مرکز: علی گڑھ، لکھنؤ، بنارس، الٰہ آباد، رامپور، اعظم گڑھ وغیرہ ہیں۔ یہی علم و فن، تعلیم اور نشر و اشاعت کے بڑے مرکز بھی ہیں۔ اُردو شاعروں اور ادیبوں کی بڑی اکثریت ان شہروں میں قیام پذیر ہے۔ بیشتر اخبارات و رسائل انہی مراکز سے شائع ہوتے ہیں۔ مرکزی انجمن ترقی اُردو کا صدر دفتر یہیں ہے۔

اُتر پردیش کے بیشتر مقامات پر انجمن کی شاخیں قائم ہیں۔ ریاست میں انجمن گو تعلیمی محاذ پر زیادہ سرگرم ہے، تاہم یہ اور دیگر انجمنیں ادبی و تخلیقی سرگرمیوں کی برابر محرک و معاون بنتی ہیں۔ چھوٹے بڑے مشاعرے ہوتے ہیں۔ "شب افسانہ" کا انعقاد ہوتا ہے۔ تنقیدی پروگرام ہوتے ہیں۔ زیادہ سنجیدہ علمی ادبی سرگرمیاں مذاکرے اور خطبات علی گڑھ، لکھنؤ، الٰہ آباد وغیرہ کا حصہ ہیں۔ اس ضمن میں علی گڑھ یونی ورسٹی کا شعبۂ اُردو خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے کہ یہ علمی سرگرمیوں کی آماجگاہ ہے۔ یہاں ہر سال علمی ادبی موضوعات پر مذاکرے ہوتے ہیں۔ حالیہ مذاکرہ اقبال پر تھا۔

مذاکروں کے انعقاد کے سلسلے میں اُتر پردیش اُردو اکادمی بھی لائقِ ذکر ہے۔ اکادمی جلد ہی ایک نمائش بھی منعقد کرنے والی ہے جس میں اُردو ہندی تحریرات، تصویروں اور گوشواروں وغیرہ سے اُردو کی تاریخ نمایاں کی جائے گی اور واضح کیا جائے گا کہ اُردو نے اپنی پیدائش سے لے کر ۱۹۴۷ء تک ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور قومی یک جہتی، کے جذبات کو تقویت دینے میں کتنا اہم حصہ لیا ہے۔

لیا ہے۔ اکاڈمی لائبریریوں اور دار المطالعات کو کتابوں اور رسائل کی خرید کے لئے عطیات دے کر بھی علمی ادبی سرگرمیوں کو فروغ دے رہی ہے۔

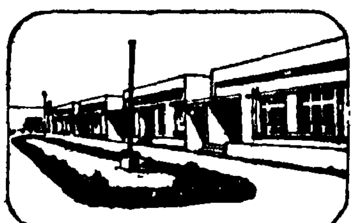
یونی ورسٹیوں کے شعبہ ہائے اُردو، انجمن ترقی اُردو اور اُردو اکادمی کے علاوہ دیگر بے شمار انجمنیں بھی علمی و ادبی فضا کو برقرار رکھنے کے سلسلے میں مفید کام کر رہی ہیں۔ ان میں حلقۂ احباب فروغِ اُردو، ہندی اُردو سنگم، (لکھنؤ) اور علی گڑھ میں قائم نئے شعراء کی انجمنیں "ہم عصر" "اقدام راہی" قابلِ ذکر ہیں۔

(سلسلہ کے لئے دیکھئے صفحہ ۹۶)

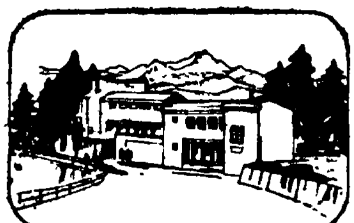
یہی تو وقت ہے
مغربی بنگال کی سیر کا

ٹورسٹ بیورو
اپنی قیام گاہوں میں
آپ کا خیر مقدم کرتا ہے

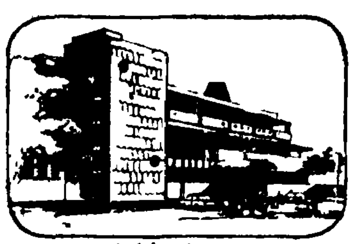
کیا آپ واقعی کسی بھی پہاڑی
جگہ کی سیر کو نکل رہے ہیں؟
یا پھر سمندر کے کنارے جانے کا
ارادہ ہے یا کہیں اور رست
کے دن گزارنا چاہتے ہیں؟
دارجلنگ، کالمپونگ،
ڈگھا، ڈائمنڈ ہاربر، مالدہ،
مرشد آباد، شانتی نکیتن،
درگاپور یا وشنو پور جہاں بھی
جائیں آپ کے قیام کے لئے
آرام دہ اور کفایتی
ٹورسٹ لاج موجود ہیں۔
شانتی نکیتن، سنہال نزد
دارجلنگ اور ڈگھا میں آپ کو
مسافر خانے بھی ملیں گے۔
سنہال میں پوری فیملی کے لئے
کمرہ دستیاب ہے صرف دن بھر
کی چھٹی گزارنی ہو تو ڈائمنڈ ہاربر
کے لاج میں قیام کیجئے



لکزری ٹورسٹ کاٹیج ۔ شانتی نکیتن



لکزری ٹورسٹ لاج ۔ دارجلنگ



ٹورسٹ سنٹر ۔ ڈائمنڈ ہاربر



لکزری ٹورسٹ لاج ۔ کالمپونگ

رابطہ پیدا کیجئے:
ٹورسٹ بیورو
حکومت مغربی بنگال
۳/۲ بنائے بادل دینیش باغ
(ڈلہوزی اسکوائر) ایسٹ، کلکتہ ۱
فون ۔ ۲۳-۸۲۷۱
گرام. 'TRAVELTIPS'

سرکاری دفاتر اور اردو: اتر پردیش سرکار کے بہت سے محکموں میں اردو کا چلن ہے مثلاً محکمہ پولیس، دیوانی اور مال کی عدالتوں میں درخواستیں اور شکایات عرضیاں رسم الخط میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ عدالتوں کی طرح رجسٹری کے دفتروں میں بھی اردو زبان میں دستاویز داخل کی جا سکتی ہیں۔ سرکاری گزٹ کے خلاصے بھی اردو رسم الخط میں شائع کئے جاتے ہیں۔ اہم قوانین، قواعد اور سرکاری اعلانات وغیرہ کے خلاصے بھی اردو میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ جن ضلعوں اور تحصیلوں میں اردو بولنے والوں کی آبادی ۱۵ فی صد یا اس سے زائد ہے۔ وہاں رائے دہندگان کی فہرستیں بھی اردو میں شائع کی جاتی ہیں۔

محکمہ اطلاعات اتر پردیش کی طرف سے اردو اخبارات کو خبریں اور سرکاری اعلانات اردو میں بھیجے جاتے ہیں۔ محکمہ اطلاعات ایک اردو ماہنامہ "نیا دور" شائع کرتا ہے اس میں شائع ہونے والے مضامین نظم و نثر کا معقول معاوضہ دیا جاتا ہے۔

اردو کی ترویج و اشاعت کے لئے تجاویز:-

(۱) سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت اپنی اعلان کردہ پالیسیوں کو من و عن عملی شکل دے اور تعلیم کے شعبے میں بھرپور مساعی سے کام لے۔

(۲) حکومت کو بچوں کی کتابوں کے انعامی مقابلے کرانے چاہئیں۔

(۳) اردو اکاڈمی کو نصابی اور دوسری کتب کے ساتھ بچوں کے ادب کی خاطر خواہ حوصلہ افزائی کرنی چاہئے۔ معلوماتی نیز سائنسی موضوعات پر کتابیں تصنیف کرانی چاہئیں۔ بچوں کے مصنفوں کو زیادہ تعداد میں انعام دینے چاہئیں۔ بچوں کے لئے جن کتابوں کی اشاعت کے لئے اکاڈمی امداد دے۔ ان کی اعلیٰ طباعت پر زور دیا جانا چاہئے۔

(۴) حکومت اتر پردیش کو بچوں کے لئے ایک اچھا پندرہ روزہ اخبار اور اکاڈمی کو ایک اعلیٰ معیار کا ماہنامہ جاری کرنا چاہئے۔

(۵) سرکاری ملازمت کے لئے اردو کی واقفیت لازمی قرار دینی چاہئے۔

(۶) اردو مادری زبان والوں کے لئے ابتدائی ہندی اور ہندی مادری زبان والوں کے لئے ابتدائی اردو کی تعلیم لازمی قرار دینا چاہیئے۔

(۷) سرکاری گزٹ، قوانین اور اعلانات صرف اردو رسم الخط میں نہیں اردو زبان میں شائع ہونے چاہئیں، اور اس کام کے لئے آندھرا پردیش کی طرح ایک شعبہ ترجمہ قائم ہونا چاہئے۔

دیکھتے ہیں۔ ایسے ایک صاحب شیخ عبدالغنی ہیں۔ موصوف نے اردو کا ایسا قاعدہ تیار کیا ہے جس سے بچے ڈیڑھ دو ماہ کی قلیل مدت میں اردو پڑھنے لکھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

امداد دہلی کا انتظامیہ اردو کی ترقی اور فروغ کے لئے کسی قسم کی کوئی مدد نہیں دیتا۔ (انجمن ترقی اردو کو جو مدد ملتی ہے اس کا ذکر کیا جا چکا ہے) کتابوں کی اشاعت کے لئے کسی قسم کی مالی امداد نہیں دی جاتی لیکن کچھ ہی عرصہ ہوا کہ ساہتیہ اکیڈمی کے انداز پر ساہتیہ کلا کیندر کا قیام عمل میں آیا ہے جس نے ڈاکٹر عابد حسین کی ایک کتاب پر گیارہ سو روپے کا انعام بھی دیا ہے۔ حال ہی میں اتر پردیش کی اردو اکیڈمی سے انعامات پانے والے مصنفین میں مالک رام، گوپال متل، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر خلیق انجم، شمیم کرہانی، کرشن موہن، بانی، ہرچرن چاولہ، محمود سعیدی، بسمل سعیدی، ڈاکٹر شارب ردولوی اور [illegible] شامل ہیں۔

مقامی حکومت اردو کے لئے کوئی انعامی مقابلے نہیں کرتی لیکن دہلی کے دارالخلافہ ہونے سے انہیں مرکزی سرکار کی مختلف وزارتوں اور محکموں کی طرف سے ہونے والے انعامی مقابلوں میں اردو مصنفین شریک ہو سکتے ہیں وزارت تعلیم، تعلیمی تحقیق کی قومی کونسل اور فیملی پلاننگ و اجتماعی ترقی کے محکموں جات مصنفین کے جو مقابلے علاقائی زبانوں میں کراتے ہیں ان میں اردو بھی شامل رہتی ہے۔ گزشتہ عرصے میں دہلی کے جن ادیبوں نے ان میں اور یونیسکو کے مقابلوں میں انعام پائے ہیں ان میں تصدق عباس، کشور سلطان، [illegible] اور [illegible] شامل ہیں۔

۱۹۵۰ء تک دہلی کی میونسپل کارپوریشن کا کام زیادہ تر انگریزی اور اردو میں ہوتا تھا۔ عدالتوں میں بھی اردو کا رواج تھا۔ ۱۹۵۰ء میں ہندی کو دہلی کی سرکاری زبان تسلیم کرلئے جانے کے بعد دفتروں میں آہستہ آہستہ اردو کا استعمال تقریباً ختم ہو گیا۔ اگرچہ دہلی کے انتظامیہ کے بیان کے مطابق تمام سرکاری دفاتر اردو میں درخواستیں قبول کرتے ہیں۔ مقامی حکومت کا محکمہ تعلقات عامہ اردو میں بھی خبرنامے، نیز اخبارات و رسائل کو اردو میں اشتہارات جاری کرتا ہے یوم جمہوریہ کے مشاعرے کا اہتمام بھی یہی محکمہ کرتا ہے۔

تجاویز مقامی حکومت کو اردو کی ترقی و فروغ کی تدابیر اختیار کرنے نیز مقامی ضرورتوں کے مطابق اردو میڈیم والے مزید اسکول کھولنے چاہئیں۔

سرکاری دفتروں میں اردو داں لوگ ملازم رکھے جانے چاہئیں۔

دہلی میں بھی اردو اکیڈمی قائم کی جانی چاہئے۔ نیز اردو ادیبوں و شاعروں کو تصنیفات پر انعام اور کتابوں کی اشاعت کے لئے مالی امداد دینی چاہئے۔

اُتر پردیش میں اُردو کی تیز رفتار ترقی

موجودہ ریاستی حکومت کی جانب سے زبردست سہولتیں

اُردو جسے دستورِ ہند میں ایک قومی زبان کا درجہ حاصل ہے، ہمارے ملک، خاص طور سے ہماری ریاست اُتر پردیش کی ایک اہم اور مقبول زبان ہے۔ یہ کسی فرقے یا مذہب کی زبان نہیں۔ اس کے چمن کی آبیاری میں سب برابر کے شریک اور حصے دار ہیں۔ اُتر پردیش کی موجودہ ریاستی حکومت نے اسکے پھلنے پھولنے اور اسکی ترقی و توسیع کے لئے متعدد اہم اور دوررس اقدامات کیے ہیں۔

پرائمری سطح پر

- جولائی ۱۹۹۷ء سے ریاست کے تمام شہری علاقوں کے ہر پرائمری اسکول میں اُردو پڑھنے کی سہولت
- اس مقصد کے لئے تقریباً چار ہزار اُردو ٹیچروں کا تقرری کا فیصلہ
- اگر کسی پرائمری اسکول میں فی الحال اُردو پڑھنے والے بچے نہ بھی ہوں تب بھی اُس اسکول میں کم سے کم ایک اُردو ٹیچر کا انتظام ہوگا
- تمام تسلیم شدہ اُردو میڈیم اسکولوں اور مکتبوں کو مالی امداد دینے کا بندوبست۔
- ٹریننگ اسکولوں میں اُردو کی استعداد رکھنے والے امیدواروں کو داخلے میں سہولت۔
- اُردو کے ٹرینڈ ٹیچر نہ ملنے پر اَن ٹرینڈ اُردو ٹیچروں کی تقرری کا فیصلہ
- کوئی اَن ٹرینڈ اُردو ٹیچر اُوپر کے احکامات کے بغیر ملازمت سے علاحدہ نہیں کیا جائے گا۔
- ٹیچروں کو اُردو پڑھنے کی جانب زیادہ سے زیادہ متوجہ کرنے کے لئے ترغیبی الاؤنس جاری رکھنے کا فیصلہ
- نئے اُردو میڈیم اسکول قائم کرنے کی کوششوں کی یقین دہانی۔

ثانوی سطح پر

- جونیر اور ہائر سیکنڈری اسکولوں میں سہ لسانی فارمولے کے تحت اُردو پڑھنے کا بندوبست۔
- ہر گورنمنٹ ہائر سکنڈری اسکول میں سہ لسانی فارمولے کے تحت اُردو کی تعلیم کے لئے ایک اُردو ٹیچر کی تقرری۔
- تسلیم شدہ ہائر سکنڈری اسکولوں میں بھی سہ لسانی فارمولے کے تحت اردو کی تعلیم کا بندوبست کئے جانے کے احکامات۔
- جونیر ہائی اسکول تک تمام کتابیں اُردو میں دستیاب۔

ڈپٹی ڈائرکٹر (اُردو)

- اُردو کی تعلیم، اس کی دیکھ بھال اور ترقی کی رفتار کو تیز کرنے کے لئے ڈپٹی ڈائرکٹر (اُردو) کی تقرری

ڈگری سطح پر

- اعلیٰ سطح پر بھی اُردو کی تعلیم کا بندوبست۔
- بجنور، میرٹھ، سہارنپور، مظفر نگر، پیلی بھیت، بریلی، مرادآباد، رامپور وغیرہ کے ضلعوں میں ایک ایک ڈگری کالج کو ڈگری کلاسوں میں اُردو پڑھانے کے لئے آئندہ تعلیمی سال سے مالی امداد دینے کا فیصلہ۔
- یونیورسٹیوں کے علاوہ اُن سے الحاق شدہ ڈگری کالجوں میں بھی اُردو کی تعلیم کی سہولت مہیا کرنے کیلئے کارروائی۔
- تمام گورنمنٹ کالجوں میں گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ کی سطح پر اُردو کی تعلیم کا بندوبست۔

اُردو اکاڈمی

- اُردو زبان کے تحفظ اور اُردو ادب کی ترقی کے لئے ملک بھر میں سب سے پہلے ریاست اُتر پردیش میں اُردو اکاڈمی کا قیام۔
- اکاڈمی کے قیام سے ریاست میں اُردو زبان و ادب کا مستقبل روشن۔
- اُردو ادیبوں، شاعروں، لائبریریوں اور مطالعہ گھروں کو اکاڈمی کی جانب سے اب تک پانچ لاکھ روپیے کے انعامات و مالی امداد۔

عدالتوں اور سرکاری کاموں میں اُردو کے لئے سہولت

- تمام ضلع افسران کو اُردو میں لکھی ہوئی درخواستیں قبول کرنے کے سخت احکامات
- ان احکامات کی خلاف ورزی کرنے والے افسران کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے گی
- دیوانی ملازمتوں کے لئے اُردو کا امتحان بھی پاس کرنا ضروری۔
- اہم قوانین، قواعد اور سرکاری اعلانات اور فہرست رائے دہندگان کی اُردو میں بھی اشاعت
- ہندی کی طرح اُردو اخبارات کو بھی سہولتیں

اُردو ہماری، آپ کی، سب کی زبان ہے
اس کی خدمت کرنا اور ترقی دینا ہمارا فریضہ ہے

محکمۂ اطلاعات، اتر پردیش کی جانب سے جاری کیا گیا

اتر پردیش کے تقریباً ہر بڑے شہر میں اردو کے ناشر موجود ہیں۔ لکھنؤ میں نسیم بک ڈپو، ادارۂ فروغ اردو، کتابستان، دانش محل، مکتبہ دین و ادب، نصرت پبلشرز، الہ آباد میں شب خون کتاب گھر، کتابستان، مکتبہ جاوید، نکہت پبلشرز اور ادارۂ انیس اردو، اعظم گڑھ میں دارالمصنفین، شبلی اکاڈمی، مطبع معارف اور ندوۃ المصنفین، علی گڑھ میں انجمن ترقی اردو، سرسید بک ڈپو، امروہہ میں بک کارنر، دانش کدہ، رام پور میں انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز وغیرہ۔

کتابوں کی اشاعت کا سب سے بڑا مرکز لکھنؤ ہے۔ لکھنؤ سے ہر برس پچاس ساٹھ کتابیں مختلف موضوعات پر شائع ہوتی ہیں جبکہ باقی دوسرے سبھی مرکز مل ملا کر اتنی کتابیں شائع نہیں کر پاتے۔ ایک اندازے کے مطابق اتر پردیش میں ہر برس ایک سو کتابیں شائع ہوتی ہیں۔

یونی ورسٹیوں اور کالجوں کی لائبریریوں کے علاوہ بہار سے لے کر ہر چھوٹے بڑے شہر میں لائبریریاں موجود ہیں۔ ان میں لکھنؤ کی امیر الدولہ پبلک لائبریری اور یونی ورسٹی (ٹیگور) لائبریری، علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری، رام پور کی رضا لائبریری اردو کے محققین کے لئے ایک نعمت ہیں۔ ان میں بھی موخرالذکر لائبریری بڑی قدر و قیمت کی حامل ہے۔

اردو کی ترقی اور ترویج و اشاعت کے ضمن میں جناب آل احمد سرور، جناب آنند نرائن ملا، بیگم حامدہ حبیب اللہ، جناب صباح الدین عمر، قاضی محمد عدیل عباسی کے اسمائے گرامی سرفہرست آتے ہیں۔

ریاستی سرکار کی امداد: حکومت اتر پردیش اور اردو اکاڈمی مصنفین کی امداد و سرپرستی کرتی ہے اور کتابوں کی اشاعت کے لئے مالی امداد دیتی ہے۔ مثلاً اردو اکاڈمی نے گزشتہ عرصے میں ۲۳ مصنفین کو ان کے مسودات کی اشاعت کے لئے بیس ہزار روپے سے زیادہ کے عطیات دیئے ہیں۔ اکاڈمی کی امداد سے شائع ہونے والی کتابوں میں فضا ابن فیضی کا مجموعۂ کلام سفینۂ زر گل اور ابا ز بلگرامی کا مجموعہ جنبش لب شامل ہیں۔

کتابوں کی اشاعت کے لئے امداد کے علاوہ اعلیٰ تصنیفات پر حکومت اتر پردیش کا محکمۂ تعلیم اور اتر پردیش اکاڈمی انعامات بھی دیتے ہیں۔ محکمۂ تعلیم کی طرف سے اردو کی معیاری کتاب پر دیا جانے والا سب سے بڑا انعام "غالب انعام" کے نام سے موسوم ہے۔ دوسرے اور تیسرے انعامات بالترتیب "اکبر الہ آبادی" اور "بسمل" انعامات کہلاتے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ متفرق انعامات بھی دیئے جاتے ہیں۔

محکمۂ تعلیم نے ۱۹۷۱ء میں شائع شدہ گیارہ معیاری کتابوں پر انعامات دیئے۔ اتر پردیش اردو اکاڈمی نے یکم جنوری ۱۹۶۹ء سے ۳۰ نومبر ۱۹۷۱ء تک عرصہ میں شائع ہونے والی معیاری کتابوں پر ۹۵ ممتاز اردو ادیبوں اور شاعروں کو اکتالیس ہزار پانچ سو پچاس روپے اور یکم دسمبر ۱۹۷۱ء سے ۳۱ دسمبر ۱۹۷۲ء تک شائع ہونے والی اردو کتابوں کے ستر مصنفین کو ۳۰ ہزار بیس روپے کے انعامات دیئے گئے۔ ان میں سے ۹۶ مصنفین اتر پردیش کے ہیں۔ سرفہرست ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی (اردو ادب میں ترقی پسند تحریک — دو ہزار روپے) ڈاکٹر وحید اختر (فلسفہ اور ادبی تنقید — دو ہزار روپے) اور شاعدہ زیدی (آتش سیال — ایک ہزار روپے) ہیں۔ حکومت اتر پردیش اور اتر پردیش اردو اکاڈمی لائبریریوں کو کتابوں کی خرید کے لئے عطیات دیتی ہے۔ مارچ ۱۹۷۳ء کے آخر تک اردو اکاڈمی نے ۱۷۴ کتب خانوں کو اٹھاون ہزار سے زیادہ رقم دینا منظور کی تھی۔

اردو اکاڈمی ضعیف اور نادار ادیبوں اور شاعروں کی امداد بھی کرتی ہے۔ اکاڈمی نے اس وقت تک ایسے بیس افراد کو فی کس چار سو روپے کی رقوم دی ہیں۔ اس کے علاوہ اکاڈمی چار ادیبوں اور شاعروں کو مستقل ماہانہ امداد بھی دیتی ہے۔

(سلسلے کے لئے دیکھئے صفحہ ۱۰۱)

آئندہ شمارے میں
(ضمیمہ اردو نمبر)

مصنف کے مسائل قرۃ العین حیدر۔ ظ انصاری۔ جوگندر پال۔ حامدی کاشمیری۔ مجتبیٰ حسین۔ ستیش بترا۔ ضیا فتح آبادی

مدیر کے مسائل اعجاز صدیقی۔ عابد سہیل۔ یوسف ٹینگ۔ احمد سعید ملیح آبادی۔ مالک رام

ناشر کے مسائل
محمد حسین شمس علوی (ادارۂ فروغ اردو۔ لکھنؤ)
دیانند ورما (پنجابی پستک بھنڈار دلی)
عابد علی خاں (ادبی ٹرسٹ حیدرآباد)

قاری کے مسائل دیویندر اسر، وہاب دانش، حکیم منظور

اصطلاحات سازی: مسعود حسن
ترجمے کے مسائل: شہباز حسین
درسی کتب کا مسئلہ: حسینی شاہد
اور دوسرے متعلقہ موضوعات پر مضامین



جولائی میں نئی دہلی میں ہند اور برما کے مابین تجارتی بات چیت ہوئی۔ برمی وفد کے سربراہ ڈاکٹر ٹی ای تھے اور ہند کے وفد کے سربراہ مرکزی
وزارتِ صنعتی ترقی میں نائب وزیر شری زیڈ آر انصاری (ٹوپی پہنے ہوئے)



کیرالا میں سرکار بے زمین کھیت مزدوروں کے لیے دیہی علاقوں میں ایک لاکھ مکان بنا رہی ہے ارناکلم ضلع میں ایسے چند مکانات کا منظر



جولائی میں وزارتِ اطلاعات و نشریات کے نائب وزیر شری دھرم بیر سنہا نے وزارت کے فوٹو ڈویژن میں تصویروں کی کاپی بنانے کی ایک
روشنی مشین کا افتتاح کیا جو ایک گھنٹے میں ایک ہزار فوٹو تیار کر سکتی ہے۔ شری دھرم بیر سنہا (کرتے میں) کے دائیں ہاتھ پر فوٹو
ڈویژن کے ڈائریکٹو شری کاسی ناتھ ہیں۔

VOL. 32 No 1 & 2 AJKAL (MONTHLY) AUGUST -SEPTEMBER 19
Published by the Director, Publications Division, Patiala House NEW DELHI 11001
Printed by Indian Printing works, Rani Jhansi road, NEW DELHI-55
REGD. No D -


اگست-ستمبر ۱۹۷۲ء ایک روپیہ
آجکل
اردو مہ

ہندپاک سمجھوتہ



پاکستانی وفد کی دہلی میں آمد



عزیز احمد صاحب نے نماز جمعہ جامع مسجد میں ادا کی



پاکستانی وفد راج گھاٹ پر



گفت وشنید جاری ہے



سمجھوتے پر دستخط - ۲۸ اگست ۱۹۷۳ء

ہند پاک سمجھوتہ

بالآخر پاکستان نے ہند بنگلہ دیش کی ۱۷ اپریل کی پیش کش مان لی۔ ۲۸ اگست ۱۹۷۳ء کو جو ہند پاک سمجھوتہ ہوا اس کی رو سے موٹے طور پر حسب ذیل نتائج برآمد ہونے کی توقع ہے۔

۱۔ ۱۹۵ قیدیوں کے ماسوا ہند میں موجود سارے پاکستانی فوجی اور غیر فوجی قیدی رہا کر کے اپنے ملک واپس بھیج دیئے جائیں گے۔

۲۔ ساتھ ہی ساتھ پاکستان میں موجود بنگالیوں اور بنگلہ دیش میں موجود پاکستانیوں کو بھی اپنے اپنے ملک واپس بھیجنے کا کام شروع ہو جائے گا۔

۳۔ پاکستان "معتدبہ تعداد" میں ایسے غیر بنگالیوں کو واپس لے لیگا جو پاکستان واپس جانا چاہتے ہیں جبکہ بنگلہ دیش ہر بنگالی کو پاکستان سے واپس بلانا چاہتا ہے۔

۴۔ جب ہند اور بنگلہ دیش میں موجود پاکستانیوں کی اور پاکستان میں موجود بنگالیوں کی واپسی مکمل ہو جائے گی تب ہند، پاکستان اور بنگلہ دیش کے وزرائے اعظم یا ان کے نمائندے مل بیٹھ کر جنگی جرائم میں ماخوذ ۱۹۵ پاکستانی قیدیوں کے بارے میں بات چیت کریں گے جن پر بنگلہ دیش مقدمہ چلانا چاہتا ہے۔

۵۔ اس سلسلے میں بنگلہ دیش نے واضح کر دیا ہے کہ وہ پاکستان سے ایک ہمسر ریاست کی سطح پر ہی گفتگو کرے گا۔

اس سمجھوتے کو نہ صرف ہند پاکستان اور بنگلہ دیش کی بلکہ عقل سلیم کی فتح بھی کہا جا سکتا ہے اس سے ہر فریق کو فائدہ پہنچے گا۔ ہند نے اتنے دنوں ان قیدیوں اور نظربندیوں کو اپنی تحویل میں رکھ کر یہ ثابت کر دیا کہ وہ کسی دباؤ یا دھونس سے متاثر نہیں ہو سکتا جب تک پاکستان اس معاملے کو اقوام عالم یا بین الاقوامی عدالت میں اٹھاتا رہا، ہند پر کوئی اثر نہیں ہوا لیکن جب بات براہ راست گفتگو اور مصالحت تک پہنچی تو ہند نے یہ بھی واضح کر دیا کہ اسے جنگی قیدیوں اور نظربندیوں کو اپنے پاس رکھنے کا اور ان پر زر کثیر صرف کرنے کا کوئی شوق نہیں۔

بنگلہ دیش کو اس سمجھوتے سے یہ فائدہ پہنچے گا کہ وہ بھی ایسے کئی لاکھ آدمیوں کی خبرگیری سے فارغ ہو جائے گا جو پاکستان جانا چاہتے ہیں۔ پھر بنگلہ دیش جنگی جرائم میں ماخوذ قیدیوں کے بارے میں اسی وقت بات چیت کرے گا جبکہ پاکستان اسے برابری کا درجہ دے گا

پاکستان کو یہ فائدہ پہنچے گا کہ جنگی قیدی پھر اپنے وطن پہنچ جائیں گے یہ بھی پیش نظر رہنا چاہیئے کہ بنگلہ دیش، ہند اور پاکستان تینوں میں سوکھے یا سیلاب نے تباہ کاری مچا رکھی ہے۔ پھر تینوں ملکوں کی معیشت ۱۹۷۱ء کی جنگ سے بڑی حد تک متاثر ہے۔ یہی نہیں آج ساری دنیا میں غلے کی کمی ہے اور مہنگائی کی زیادتی۔ لہذا دانشمندی کا تقاضہ یہی ہے کہ تینوں ملک ایک دوسرے سے بے خطر ہو کر اپنی معاشی حالت درست کرنے میں منہمک ہو جائیں تاکہ عامۃ الناس کو فائدہ پہنچ سکے۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب اس سمجھوتے پر خلوص نیت کے ساتھ عمل ہو۔ اس سے قبل شملہ سمجھوتے کے وقت بھی وزیر اعظم پاکستان (جو اس وقت صدر پاکستان تھے) بہت سی خوش آئند باتیں کر کے گئے تھے لیکن پاکستان پہنچتے ہی انہوں نے اس مسئلے کو بین الاقوامی عدالت میں بھیج دیا اور اس بار بھی ابھی اس سمجھوتے کی سیاہی خشک بھی نہ ہونے پائی تھی کہ جناب بھٹو نے ایک بیرونی نامہ نگار کو بیان دیا کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے میں دیر لگے گی۔

چیست یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما؟

ابھی ایک تیسرے سمجھوتے کی گنجائش باقی ہے جس کے تحت پاکستان نہ صرف بنگلہ دیش کو تسلیم کرے بلکہ اس سے سفارتی تعلقات بھی قائم کرے۔ ساتھ ہی ساتھ ہند پاکستان سفارتی تعلقات قائم ہونا اور نقل و حمل اور رسل و رسائل کی پابندیاں دور کرنا ضروری ہے سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ دونوں ملکوں میں ایک دوسرے سے کتابیں اور رسائل بھی منگانے اور بھیجنے پر پابندی ہٹا لی جائے تاکہ یہ پتہ چلتا رہے کہ پڑوسی ملکوں کے دانشور کیا سوچ رہے ہیں۔ اقوام عالم کے چارٹر کے بموجب ساری جنگیں پہلے پہل انسانی ذہن میں جنم لیتی ہیں۔ اگر شاعر و ادیب، حکیم و دانشور کا بس چلے تو ان جنگوں کو ذہن میں دفن بھی کیا جا سکتا ہے۔

یہ شمارہ: اس ضمیمے کے ساتھ اردو نمبر تمام ہوا۔ خصوصی نمبر نے ہمارے معمول اور منصوبوں میں بہت خلل ڈالا جس کے لئے ہم اپنے لکھنے والوں اور پڑھنے والوں دونوں کے معافی خواہ ہیں لیکن شاید آپ ہم سے اتفاق کریں گے کہ ایسا نمبر نکالنا ضروری تھا اور اس کی افادیت سالہا سال تک قائم رہے گی ۔۔۔ پچھلے شمارے میں "دلی میں اردو" (صفحہ ۸۷ کالم ۲) سے جامعہ کی تعلیمی خدمات سے متعلق ایک پیراگراف ہو گیا جس میں درج تھا کہ جامعہ ملک کا واحد ادارہ ہے جہاں ابتدائی سے لے کر یونیورسٹی سطح تک ذریعہ تعلیم اردو ہے۔

مرکزی حکومت اور اردو

دستور ہند کے مطابق ملک کی سرکاری زبان ہندی اور انگریزی ہے لیکن اردو ہند کی چند بڑی بڑی زبانوں کی فہرست میں شامل ہے۔

حکومت کو ملک کے ہر کونے کونے میں اپنا پیغام پہنچانا ہے۔ لہذا اردو کسی صورت میں نظر انداز نہیں ہو سکتی۔ پھر دستور میں اقلیتوں کی زبان اور کلچر کی حفاظت کی یقین دہانی موجود ہے۔ چنانچہ قوانین کا اردو میں ترجمہ ہوتا ہے۔ پارلیمنٹ میں دی گئیں اردو تقریریں پارلیمانی ریکارڈ میں ... م الخط میں محفوظ رہتی ہیں۔ رائے دہندگان کی فہرست اردو میں مہیا کی جاتی ہے اور کمشنر برائے لسانی اقلیات مرکز اور ریاستوں میں اردو کے حقوق کا تحفظ کرتا ہے اور جہاں کبھی اردو اور دیگر زبانوں پر زیادتی ہوتی ہے، اس کا ذکر اپنی سالانہ رپورٹ میں کرتا ہے جو صدر کو پیش کی جاتی ہے اور جس پر پارلیمنٹ میں بحث ہوتی ہے۔

وزارت تعلیم

وزارت تعلیم ہر سال بچوں اور بالغوں کے ادب کے علاقائی زبانوں میں مقابلے منعقد کرتی ہے اور انعام یافتہ کتابوں کی ایک خاص تعداد خریدتی بھی ہے۔ اس میں اردو کی کتابیں بھی شامل رہتی ہیں

ترقی اردو بورڈ

وزارت نے چوتھے پانچ سالہ منصوبے کے تحت ایک کروڑ روپے سے ترقی اردو بورڈ قائم کیا ہے جس کا خاص مقصد اردو میں تعلیمی کتابیں مہیا کرنا ہے۔ پانچویں پلان میں بھی اس مقصد کے لئے ایک کروڑ روپیہ تجویز کیا گیا ہے۔

اردو میں نصابی کتابوں کی کمی دور کرنے کے لئے ترقی اردو بورڈ مڈل اور ہائر سیکنڈری درجوں کے لئے ۹۴ کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرا رہا ہے جو تعلیمی تحقیق و تربیت سے متعلق قومی کونسل نے تیار کی ہیں۔ ان میں سے بیس کتابیں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ اور بارہ عنقریب شائع ہونے والی ہیں۔ ریاستیں یا تو انہی کتابوں کو استعمال کر لیں گی۔ یا اپنی اپنی ضروریات کے مطابق ان میں ردو بدل کر لیں گی۔

حکومت کی درخواست پر ترقی اردو بورڈ دلی کے ثانوی اور اعلیٰ ثانوی اسکولوں کے ہر درجے کی اردو کتابوں کی ضرورتوں کا جائزہ لے گا۔ بورڈ دلی میں مڈل اور اعلیٰ ثانوی نصاب میں شامل ۸ کتابوں کا ترجمہ بھی کرا رہا ہے۔ ان میں سے چھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

ترقی اردو بورڈ یونیورسٹی سطح کی کتابیں بھی تیار کرا رہا ہے۔ کوئی چھ سو کتابیں اور موضوعات، ترجمہ اور تصنیف و تالیف کے لئے چنے جا چکے ہیں۔ بیس کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور ۳۲ زیر اشاعت ہیں۔ علاوہ ازیں انگریزی اردو اور اردو انگریزی لغات زیر تالیف ہیں اور حیدر آباد کے ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو اردو کا ایک جامع انسائیکلوپیڈیا تیار کرنے کا کام سپرد کیا گیا ہے۔

ترقی اردو بورڈ ایک سرکاری ادارہ ہے۔ بورڈ کے چیرمین مرکزی وزیر تعلیم اور سکریٹری، وزارت کے جائنٹ سکریٹری (لینگویجز) ہیں۔ پروفیسر مجیب بورڈ کے وائس چیرمین ہیں۔ بورڈ کی سرگرمیوں کو تیزی سے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے وزارت تعلیم کے تحت ایک فروغ اردو بیورو کھولا گیا ہے جو جناب شہباز حسین صاحب کی سرکردگی میں بورڈ کے سکریٹریٹ کے طور پر کام کرتا ہے۔

اساتذہ کی ٹریننگ:

وزارت تعلیم نے میسور میں علاقائی زبانوں کا ایک مرکزی انسٹی ٹیوٹ قائم کیا ہے۔ اس کی ایک شاخ پٹیالہ میں قائم ہے جہاں ہر مضمون کے ثانوی درجوں کے اساتذہ کو اردو میں دس ماہ کی ٹریننگ دینے کا انتظام ہے۔ ابھی تک اس اسکیم سے صرف گیارہ اساتذہ نے فائدہ اٹھایا ہے۔ البتہ حکومت ہماچل پردیش کی درخواست پر علاقائی مرکز کا ایک ذیلی مرکز سولن میں کھولا گیا ہے جہاں تین سال کے عرصے میں کوئی ۵۰۰ اردو اساتذہ کو ٹریننگ دی جائے گی جو ہماچل پردیش کے اسکولوں میں اردو تعلیم کے لئے درکار ہوں گے

حکومت ہند کی مرکزی اسکولوں کی اسکیم کے تحت ہر طالب علم حسب خواہش مادری زبان میں تعلیم حاصل کر سکتا ہے۔ چنانچہ اردو تعلیم کے لئے موصول ہونے والی درخواستوں کے پیش نظر ملک بھر میں پھیلے ہوئے ۲۷ مرکزی اسکولوں میں ۱۸۷۶ طلبا کی اردو تعلیم کا انتظام موجود ہے۔

نیشنل بک ٹرسٹ:

نیشنل بک ٹرسٹ تاریخ، تہذیب، کلچر سے متعلق کتب اور بچوں کی کتابیں شائع کرتا ہے۔ ٹرسٹ نے اب تک ۵۹ کتابیں اردو میں شائع کی ہیں۔

ساہتیہ اکاڈمی:

اکاڈمی ہر سال علاقائی زبانوں میں جن میں اردو بھی شامل ہے شائع ہونے والی بہترین کتابوں پر پانچ ہزار روپے کا انعام دیتی ہے۔ اکاڈمی علاقائی اور بدیشی زبانوں کے کلاسیکی ادب کو اردو میں منتقل کراتی رہتی ہے۔ علاوہ ازیں اکاڈمی نے کلیات ابو الکلام شائع کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے، جس کے ... مالک رام صاحب ہیں۔ ابھی تک اکاڈمی کوئی چانسر ...

جن میں مولانا آزاد کی حسب ذیل کتابیں شامل ہیں، غبارِ خاطر، تذکرہ اور ترجمان القرآن جلد اوّل تا چہارم

وزارتِ تعلیم کا کلچر کا محکمہ اُردو مصنفین کو وظائف و اعزازات دیتا ہے۔ محکمہ اُردو اور دیگر علاقائی زبانوں کو فروغ دینے والے اداروں اور افراد کو کتابیں شائع کرنے کے لئے امداد و عطیات بھی دیتا ہے (اُردو کے جن مصنفین کو وزارتِ تعلیم سے امداد و وظیفہ مل چکا ہے اس کی فہرست کے لئے ملاحظہ ہو "آج کل" اگست ۱۹۷۲ء)

وزارتِ خوراک و زراعت : وزارتِ خوراک و زراعت کا محکمۂ اجتماعی ترقی، اور امداد باہمی ہر سال ایک کل ہند بیک لٹریچر انعامی مقابلہ کراتا ہے جس میں اُردو کتابیں بھی داخل کی جاسکتی ہیں۔ انعام یافتہ کتابوں کو محکمہ شائع کرتا ہے اور جن علاقوں میں اُردو بولی اور پڑھی جاتی ہے وہاں اُن کتابوں کو دیہی علاقوں میں مفت تقسیم کیا جاتا ہے۔

وزارتِ اطلاعات ونشریات

پریس انفارمیشن بیورو : وزارتِ اطلاعات ونشریات کا محکمہ "پریس انفارمیشن بیورو" انگریزی، ہندی، اُردو اور ملک کی دیگر بڑی زبانوں میں حکومت کی پبلسٹی کا ذمہ دار ہے

اُردو پبلسٹی کا بیشتر کام صدر دفتر دلی سے ہوتا ہے۔ صدر دفتر کے علاوہ کچھ علاقائی اور مقامی دفاتر بھی ہیں، جو سرینگر، جموں، جالندھر حیدرآباد، کلکتہ، بمبئی، لکھنؤ، پٹنہ اور میسور میں واقع ہیں۔

دلی کا صدر دفتر سارے ملک میں کوئی ۵۲۰ اُردو اخبارات و رسائل کو حکومت کی مختلف النوع سرگرمیوں خصوصاً پنج سالہ منصوبوں اور ترقیاتی اسکیموں کے بارے میں پریس ریلیز، فیچر، خبرنامے، اور دیگر معلومات مہیا کرتا ہے۔ عام طور پر یہ پریس ریلیز وغیرہ اولاً انگریزی میں تیار کئے جاتے ہیں اور ان کا اُردو ترجمہ اُردو اخبارات کو بھیجا جاتا ہے۔ انگریزی پریس ریلیز ٹیلی پرنٹر کے ذریعہ بیورو کے سارے علاقائی اور مقامی دفاتر میں بیک وقت پہنچائی جاتی ہے جہاں اُس کا اُردو ترجمہ کیا جاتا ہے تاکہ مقامی اخباروں کو بغیر کسی تاخیر کے یہ پریس ریلیز مہیا ہوجائیں۔

اُردو اخبارات کی مخصوص ضرورتوں کے پیشِ نظر بعض پریس ریلیز اور دیگر مضامین اُردو ہی میں تیار کرائے جاتے ہیں۔ یہ مضامین، فیچر وغیرہ مشہور اُردو ادیبوں اور شاعروں سے لکھوا کر اخبارات کو مہیا کئے جاتے ہیں۔ اُردو پریس کی دلچسپی کی خبروں کے ساتھ ساتھ ثقافتی تقریبوں کی تصاویر بھیجنے کا خاص طور پر اہتمام کیا جاتا ہے۔

بیورو اُردو کے چھوٹے اخباروں کا خاص خیال رکھتا ہے اور لیتھو سے چھپنے والے اخباروں کی ضرورتوں کے پیشِ نظر بیورو نے ستمبر ۱۹۷۱ء سے ایک چربہ سروس شروع کی ہے۔ یعنی تصاویر کے چربے پیلے کاغذ پر مہیا کئے جاتے ہیں جس سے اخباروں کو بلاک بنانے کی ضرورت نہیں رہتی۔ شروع میں ۵۲ اخباروں کو چربے مہیا کئے جاتے تھے۔ لیکن اب کوئی ۲۰۰ اخباروں کو یہ چربے ہر ہفتے بھیجے جاتے ہیں۔

پبلی کیشنز ڈویژن : اطلاعات ونشریات کا ادارۂ مطبوعات "پبلی کیشنز ڈویژن" کہلاتا ہے۔ یہ ادارہ سال میں کوئی دو سو کتابیں اور ہر ماہ ۱۱ مختلف رسائل شائع کرتا ہے ڈویژن کا رسالہ "آج کل" ۱۹۴۲ء سے مستقلاً شائع ہو رہا ہے اور شاید مرکزی حکومت کا قدیم ترین رسالہ ہے (ڈویژن اسی نام سے ایک ہندی رسالہ بھی شائع کرتا ہے جو اُردو آج کل سے مختلف ہوتا ہے) "آج کل" میں علمی، معلوماتی، اور ادبی مضامین و تخلیقات شائع ہوتی ہیں۔ اُردو ماہناموں میں "شمع" اور "بیسویں صدی" کے بعد "آج کل" کی اشاعت و خریداری سب سے زیادہ ہے۔ "آج کل" میں شائع ہونے والے مضامین و تخلیقات کا معاوضہ بھی دیگر علمی و ادبی جرائد کے مقابلے میں زیادہ ملتا ہے۔ کتابت، طباعت اور تصاویر کے لحاظ سے یہ ایک علمی پائے کا رسالہ ہے۔ فی الحال اس میں مشہور افسانہ و ناول نگار قرۃ العین حیدر کا ایک ناول بالاقساط شائع ہو رہا ہے "آج کل" میں شائع ہونے والے مضامین، افسانے اور نظمیں بڑی کثرت سے (اور عام طور پر بغیر کسی حوالہ) دیگر جرائد میں نقل کئے جاتے ہیں۔

رسالے کے علاوہ ڈویژن سے متعدد اقسام کی کتابیں اور کتابچے شائع ہوتے ہیں۔ اوّل تو علمی اور ادبی کتابیں مثلاً آئینۂ غالب "گنجینۂ غالب" "آج کل کی کہانیاں" "دو شہروں کی کہانی" (مصنفہ چارلس ڈکنس) "ندیا کنارے" (علی عباس حسینی) وغیرہ۔ دوسری اقتصادی اور سیاسی نوعیت کی کتابیں اور کتابچے مثلاً پنج سالہ پلان، نیا موڑ اور پنڈت نہرو، مولانا آزاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین پر کتابیں۔ تیسری قسم بچوں کی کتابوں کی ہے مثلاً "ہمارا دیش" "ہند کی نامور ہستیاں" جس کے چار حصے شائع ہوچکے ہیں اور پانچواں زیرِ طبع ہے۔

فی الحال ڈویژن میں دو بڑی کتابیں "مولانا آزاد" از عرش ملسیانی اور "ہندو تہذیب کا مسلمانوں پر اثر" از ڈاکٹر محمد عمر زیرِ اشاعت ہیں۔

(باقی صفحہ ۲۷ پر)

مصنّف کے مسائل

قرۃ العین حیدر
ظ۔ انصاری
جوگندر پال
حامدی کاشمیری
ضیا فتح آبادی
ستیش بترا

قرۃ العین حیدر

آشا محل نوروجی گماڈیا روڈ بمبئی - ۲۶

مصنّف کے مسائل سب کو معلوم ہیں یں کون سی نئی بات آپ کو بتاؤں گی۔ آئے دن ان مسائل پر شاندار سمینار اور کانفرنسیں منعقد ہوتی ہیں، جن پر مختلف سرکاری اور نیم سرکاری ادارے لاکھوں روپیہ خرچ کرتے ہیں لیکن جب ایک نامور ادیب اُردو زبان کا مرتا ہے سب کے ذہنوں میں پہلا خیال یہ آتا ہے "مرحوم کے بیوی بچوں کا کیا ہوگا ؟"

اُردو ادب اور ادیب کی یتیمی اب ایک ضرب المثل کے طور پر استعمال کی جاسکتی ہے۔ جہاں بھی آپ کو کوئی تباہ حال فرسٹریٹڈ ادیب یا شاعر نظر آئے پہچان لیجئے اور ایمان لے آیئے کہ وہ اُردو زبان میں لکھتا ہے۔ اس یتیم و یسیر کے لئے چند ادارے قائم کئے گئے ہیں جہاں سے اسے اس کی کسی کتاب پر ۵۰۰ یا ایک ہزار کے انعام کی شکل میں خیرات مل جاتی ہے تو وہ پھولا نہیں سماتا۔ اس کے مضامین یا افسانے یا کلام اُن رسالوں میں چھپتے ہیں جن کی تعداد اشاعت ایک ہزار سے زیادہ نہیں۔

یہ اُردو کے موجودہ ادیب کی دُنیا اور اُس کے قارئین کا حلقہ ہے۔ اتنی المناک اور عبرت ناک حد تک مختصر بساط پر ہم اُردو ادب کی بات اتنی دھوم دھام سے کیوں کرتے ہیں؟

سیدھی بات یہ ہے کہ جب تک ہندی ریاستوں کے اسکولوں میں اُردو نہیں پڑھائی جائے گی پہلے اس کے قارئین کا حلقہ معدوم ہوگا، پھر اُردو، پھر اُسے ڈھونڈ چراغ رُخ زیبا لے کر۔

اُردو اس وقت بھی ایک سماجی تفریح بن چکی ہے مثلاً ایک نئی کتاب جس کا صرف پانچ سو یا ہزار کا اڈیشن (اکثر مصنف کے اپنے پیسے سے) چھپتا ہے اس کے افتتاح کے عمرانے پر ایک آدھ وزیر یا کوئی اور بڑا آدمی مدعو کیا جاتا ہے اور اس ادیب کی گل پوشی ہوتی ہے۔ (ادیب کی گل پوشی میری سمجھ میں آج تک نہ آئی) اس طرح ادب تفریح کے علاوہ اکثر سماجی ترقی کا ذریعہ بھی بن جاتا ہے۔

لیکن حضور والا ایک ایسا وقت بھی آسکتا ہے جب نہ اُردو ادب رہے گا نہ گلپوش ادیب۔

کیا میں حد سے زیادہ قنوطی ہوگئی ہوں ؟ دیکھئے اتنی کتابیں تو شائع ہو رہی ہیں۔

کتنی کتابیں ؟ ذرا ایک سال کے اندر چھپنے والی تمام اُردو کتابوں کے اعداد و شمار جمع کرنے کی زحمت گوارا کیجئے۔ ان کتابوں کے موضوع کیا ہیں ؟ کتنی بکتی ہیں ؟ اُن مصنفوں کو کتنی رائلٹی ملتی ہے ؟ اُن کا ذریعۂ معاش کیا ہے ؟

میرے سامنے مسئلہ ادیب اور قاری کے مابعد الطبیعاتی رشتے، ترسیل وغیرہ کا نہیں ہے جب پڑھنے والے ہی نہ رہے آپ "کمیونی کیٹ" کس سے کیجئے گا ؟ میں تو صرف یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ میرے قارئین کی تعداد اُردو میں اتنی کم کیوں ہے۔ اور اگر بحیثیت مصنف (پروفیشنل مصنف نہیں جو ہمارے ہاں تقریباً نایاب) مالی لحاظ سے میں ہمیشہ نقصان میں رہی ہوں تو اس کے اسباب کیا ہیں ؟

یہ نرا نا رونا ہے کہ صاحب لکھنے والے کو پیسہ نہیں ملتا۔ آخر کیوں نہیں ملتا ؟

ہمارے پاس تو پیسہ نہیں ہے۔ رسالہ بند ہونے والا ہے۔ مکتبہ بڑی مشکل سے چلا رہے ہیں۔ کتابیں آج کل کون خریدتا ہے ؟

اور جو دولت مند پبلشر ہیں اُن کے بارے میں کیا خیال ہے؟

وہ — ابھی وہ سب چیزیں اور قانون سے بالاتر ہیں۔ اُن کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ لیجئے قصہ ختم ہو گیا۔ اب کیجئے آپ کیا کیجئے گا۔

اُردو ادب میں لاقانونیت ہمیشہ سے ہے مگر اب اس کے DIMENSION میں اضافہ ہو گیا ہے۔ ایک روشن مثال کے طور پر میں اپنا گراموفون بجا کر سناتی ہوں تاکہ آپ عبرت حاصل کر سکیں۔

اس بندۂ حقیر کے ماں باپ، نانی اور ایک عدد ماموں ان پانچ افراد کی لکھی ہوئی کتابوں کی اگر فہرست بنائی جائے تو خاصی طویل ہوگی۔ ان میں سے بیشتر کتابیں بے حد مقبول اور مشہور رہی ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے اسکولوں اور یونیورسٹیوں کے نصابِ تعلیم میں شامل رہی ہیں۔ یا اب ہیں۔ اُردو ادب میں اُن کا خاص مقام ہے۔ وغیرہ وغیرہ وغیرہ

لیکن ان کتابوں کے مصنفین کا ریکارڈ یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر کتابوں کی رائلٹی کے نام کا ایک پیسہ محترم مصنفین کو آج تک نہ ملا۔ یا کبھی اگر تکلفاً ملا ایک آدھ کتاب کا تو وہ بقدرِ اشکِ بلبل۔ یہ صورتِ حال صرف اس برصغیر میں ممکن ہے۔

والدہ کے ناشرین کو میں بری الذمہ ٹھہراتی ہوں کیوں کہ ۱۹۰۸ء سے لے کر آخر عمر تک وہ اپنی کتابیں ناشرین کو مفت عطا کرتی رہیں۔ (معاوضہ لینا کسرِ شان تھی) ان کی پھوپھی کے پانچوں ناول اسی طرح چھپے۔ سب سے زیادہ مشہور "گودڑ کا لال" کے کئی ایڈیشن پاکستان میں چھپ چکے ہیں۔ اور چند سال قبل نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے بھی اسے "نئی اسٹائل" سے شائع کیا۔ مرحومہ کے ورثا بفضلِ خدا دونوں ملکوں میں موجود ہیں میں نے نسیم بکڈپو کو خط لکھا۔ فرعونیت اور لاقانونیت کا یہ عالم ہے کہ کسی نے اس کا جواب دینے کی بھی ضرورت نہ سمجھی۔

دوسرا ریکارڈ اس ناچیز نے بسلسلۂ "آگ کا دریا" قائم کیا ہے۔ پاک و ہند میں ۱۹۶۰ء سے اب تک اس کے لاتعداد چوری کے ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن پہلے قانونی ایڈیشن سمیت اُس وقت سے آج تک اس کی رائلٹی کا ایک پیسہ خاکسار کو نہیں ملا۔ یہ ایسا عجیب و غریب واقعہ ہے جب غیر ملکی ادیبوں، ناشروں اور صحافیوں کو معلوم ہوتا ہے تو وہ یقین نہیں کرتے۔

میری ساری کتابیں اسی طرح دونوں ملکوں میں چھپ رہی ہیں۔ متعدد اُردو ادیب اس لاقانونیت کا شکار رہیں، مگر حیرت انگیز بات یہ ہے کہ سب نے اس صورتِ حال کو ایک لاعلاج مرض کی طرح قبول کر لیا ہے۔ علاوہ ازیں ساہتیہ اکاڈمی۔ رجسٹرار آف کاپی رائٹس۔ محکمہ پولیس، وزارت اطلاعات و نشریات۔ سب کو اس صورتِ حال کا بخوبی علم ہے۔ لیکن چونکہ ادیبوں کے حقوق کی حفاظت ایک نہایت غیر اہم اور فالتو بات ہے لہٰذا اس مسئلے کی طرف ایک سرے سے توجہ ہی نہیں دی جاتی۔ پولیس اسمگلرز کا درآمد کیا ہوا سونا، گھڑیاں، چرس، گانجہ وغیرہ پکڑنے کے لیے مستعد رہتی ہے۔ فلم اسٹارز کے گھروں پر چھاپے مارے جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ سنسنی خیز خطرناک یا گلیمرس لوگ ہیں اور لاکھوں کروڑوں کی ہیراپھیری کے معاملات ہیں۔ غریب مصنفوں کے چند ہزار روپے مارے گئے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ چور ناشروں کا کوئی ذکر تک نہیں کرتا۔

البتہ ادبا کے لیے حسبِ موقعہ رائٹرز کیمپ، سمینار اور ایٹ ہوم ہوتے رہیں گے۔ اور جب کوئی ادیب یا شاعر بیمار پڑے گا تو اس کے علاج کے لئے چندہ جمع کیا جائے گا۔

اس سال فروری میں ساہتیہ اکاڈمی کی جنرل کونسل میٹنگ میں میں نے تجویز کیا کہ ہر ہندوستانی زبان کے ضرورت مند ادبا کے لیے وظیفے، اُن کے بچوں کے لیے مفت تعلیم کا انتظام، طبی امداد وغیرہ کے لیے ایک فاؤنڈیشن یا فنڈ قائم کرنا سب سے زیادہ ضروری ہے۔ اکاڈمی کے سکریٹری نے بتایا کہ یہ تجویز منسٹری آف کلچر کے "زیرِ غور" ہے۔

سوال یہ ہے کہ منسٹری آف کلچر کے فرائض کیا ہیں۔؟

میرے پاس کلکتہ سے ایک بنگالی ادیب کا خط آیا جنہوں نے السٹریٹڈ ویکلی کے لیے کہانی بھیجتے ہوئے لکھا تھا کہ بیمار ہیں۔ ملازمت چھوٹ گئی ہے اور علاج کے لئے پیسہ نہیں۔ ایک اور نامور بنگالی ادیب افلاس کی وجہ سے ایک گاؤں کے کچے جھونپڑے میں رہتا ہے۔ یہ ایک متمول زبان کے لیکھکوں کی حالت ہے۔ بمبئی کے ایک بے حد دولت مند ناشر نے جو انگریزی کتابیں شائع کرتا ہے۔ ڈاکٹر ملک راج آنند کے پندرہ ہزار روپے ہضم کر رکھے ہیں۔

ہم نہ جانے کس خوش فہمی کی بنا پر اپنے ادبی مسائل کا مقابلہ مستقل مغرب سے کرنے کے شوقین ہیں۔ اور کبھی یہ عقل میں نہیں آتا کہ ہمارے اور مغربی لیکھکوں کے معاشی اور سماجی حالات میں زمین آسمان کا فرق ہے اور اُن کی تخلیقات ان کی زندگیوں کی عکاس اور ترجمان ہیں۔

آج سے تقریباً پندرہ بیس سال قبل برطانیہ کے برہم نوجوانوں نے ESTABLISHMENT کی اصطلاح استعمال کی تھی۔ یہ اب ہمارا مرغوب ترین لفظ ہے۔ ہمیں وقتاً فوقتاً اطلاع ملتی رہتی ہے کہ فلاں فلاں ESTABLISHMENT میں شامل ہو گیا۔ یہ ایک قسم کی گالی بھی ہے اور معراج بھی۔ جو لوگ اس پُراسرار ٹیم میں شامل ہو جاتے ہیں، گویا ہندی فلم کے ویلین ہیں۔ ہیرو ہمیشہ باغی رہتا ہے۔ جب وہ بھی ESTABLISHMENT میں پہنچ جاتا ہے۔ باقی باغی رہتے ہیں۔ اور یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔

اور اس ساری کشاکش، تلخی، رقابت اور ذاتی بغض و عناد کی ایک بنیادی وجہ ادیبوں کی مالی نا آسودگی ہے۔ متموّل معاشروں کے متموّل ادیب کو ان جھگڑوں میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔
اور کیا عرض کروں ـــــ والسلام۔



ظ۔ انصاری
۳۲ بشیر مینشن، ۳۱ کولابا روڈ، بمبئی ـ ۵

بات کہنے سے پہلے مجھے اپنے موضوع کی حدبندی کر لینی چاہئے۔ مصنف کے لفظ میں ادیب، شاعر، فن کار اور کسی بھی موضوع پہ ذاتی غور و فکر سے لکھنے والے آجاتے ہیں۔ اُن کے مسائل ہر ایک زبان میں مشترک بھی ہوں گے کسی قدر مختلف بھی تو ہم یہاں اپنی سہولت اور تخصیص کی خاطر مصنف سے محض اُردو مصنف مراد لیں گے۔ اور مسائل سے صرف وہ خارجی مسئلے جن سے آج گزرنا پڑ رہا ہے۔ وہ مسئلے نہیں جو کسی اہلِ قلم کو کسی غیر معین زمانے یا زمین پہ پیش آتے رہتے ہیں یا آئیں گے۔ ان کے لئے تو پورا دفتر درکار ہے۔

تصنیف اور مصنف کے درمیان جبر و اختیار کا ایک گہرا اور پُراسرار رشتہ ہوتا ہے۔ یہ محض اختیاری عمل نہیں رہا کہ جب چاہا تو مصنف نے قلم اٹھایا، نہ چاہا تو نہیں اٹھایا۔ تصنیف تو ہی کام کی ہے جس کے لکھنے پہ مصنف نے خود کو اندر سے مجبور پایا ہو، چاہے یہ مجبوری شخصی ہو یا سماجی، علمی ہو یا جذباتی، اخلاقی ہو یا نفسیاتی جب مصنف اس کشمکش سے گزر کر ع

"کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں، ہو تو کیوں کر ہو"

موضوع کے لئے الفاظ یا کوئی اور لباس چُنتا ہے، پلاننگ، ترتیب، تراش خراش پہ آنکھیں ٹیکاتا ہے تو یہاں سے معاملہ اس کے اختیار کا ہے۔ اس کی قدرتِ اظہار کا ہے۔

یہ دعویٰ کہ ہم صرف اپنے لئے لکھتے ہیں، اسی معنی میں درست ہے، ورنہ کسی خیال کو کاغذ پر اتارنے کا عمل بجائے خود جانی یا انجانی کوشش اور عین فطری خواہش ہے اس بات کی کہ ہم دوسروں تک پہنچیں۔ جب دوسروں تک پہنچنا ٹھہرا تو وہ "دوسرے" بھی نظر میں ضرور رہتے ہیں چاہے وقتی طور سے پس منظر میں بکھرے ہوئے ہوں۔

ہر زمانے میں بڑے مصنفوں نے اس سے انکار کیا یا انکار کرنا چاہا کہ وہ دوسروں کا پاسِ خاطر کرتے ہیں، پھر گلے شکوے بھی کئے کہ اُن کا زمانہ یا ارد گرد کے لوگ دیدہ ور نہیں، جیسی قدر دانی ہونی چاہئے، نہیں کر سکتے۔ اور خود وقت نے ثابت کر دیا کہ کہیں نہ کہیں، کبھی نہ کبھی فن پارے یا تصنیف کے مخاطب، اہلِ نظر وارث یا حقدار سامنے آتے ہیں اور یوں تصنیف اور مصنف کا منشا پورا ہو جاتا ہے۔ یہ سطریں لکھتے وقت فردوسی سے لے کر انیاں ازٹیگور تک ایک ہزار برس کی تاریخِ ادب کی اہم شخصیتیں میری آنکھوں میں پھر رہی ہیں۔

یہ بنیادی بات سامنے رکھ کر چلئے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آج کے ہندوستان میں اُردو کا سچا مصنف بنا گھر پھونک تماشے کے لئے کمر کستا ہے

کبیرا کھڑا بزار میں لئے لُکٹیا ہاتھ
جو گھر پھونکے آپنا، چلے ہمارے ساتھ

اُردو کے تصنیفی عمل میں سرگرمی آئی سرسید کے دور سے۔ پہلے صرف خوش حال زمیندار اور شہری متوسط طبقے کے گنے چُنے خاندان ہی کتاب خرید کر پڑھا کرتے تھے۔ ۱۹ ویں صدی کے وسط تک یہ حال تھا کہ مصنف چھپوانے سے پہلے اپنی کتاب بکوانے کی ذمہ داری لے۔ اگر دس روز کی ضمانت دے تو مقررہ جلدیں لیتھو کے پتھر تلے سے نکلیں۔ ۲۰ ویں صدی کے آغاز میں اُردو کی غیر مذہبی تصانیف کے لئے ایک تنگ سا شہری مارکیٹ بننے لگا۔ دوسری جنگِ عظیم کے آس پاس ہائی اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں سے سندیں لینے والی نسل ریلوے میں راشننگ اور سپلائی میں، سی اوڈی میں، فوجی شعبوں میں اور نئے کالجوں میں کھپنے لگی۔ اچھی خاصی تعداد میں وہ "دوسرے" سامنے آئے۔ ہزاروں نوجوان جنہوں نے اُردو کا مضمون لے رکھا تھا، خود کمانے لگے۔ اخبار اور رسالے خرید کر پڑھنے لگے تو اُن کے مصنف بھی ابھرے۔ نئی روح ویپے فرشتے، جاسوسی جنسی اور نیم تاریخی، یا ذہنی، "تاریخی" ناول لکھنے والے کا کام تو آسان ہو گیا۔ ع

کہ بدست و دہن ذالقہ از آں رفتہ

لیکن مغربی ادبیات اور علمی مضامین منضم کئے ہوئے لوگوں کے پاس کہنے کو بہت کچھ تھا۔ اس "بہت کچھ" کے مخاطب اُردو میں شروع سے بہت کم تھے، کم ہی رہے۔ آج کترا رہے ہیں۔

کچھ تو یہ کہ اُردو زبان شمالی ہند کے شہروں میں رہی جیسے حیدرآباد بلا تو وہ دہلی اور لاہور سے بھی پسماندہ جاگیرداری کا مرکز۔ گاندھی جی کی تحریک اور قومی آزادی کی رو کے ساتھ دیہات نے شہروں پہ بڑھنا شروع کر دیا تھا۔ صنعتی سرگرمی کے پہلے پہلو سائنسی تجربات کے مرکز بنتے ہیں، وہ بیشتر اُردو والوں کی دسترس سے دور رہے۔ کچھ یہ کہ سائنس کی ٹھوس

تعلیم کا چلن عام نہیں تھا گنتی کے تین چار ادارے (انجمن ترقی اردو (ہند) جامعہ عثمانیہ، ہندوستانی اکاڈیمی (الٰہ آباد) علی گڑھ اور پنجاب یونی ورسٹیوں کے اشاعتی شعبے) سال میں دو تین کتابیں تبرک کے طور پر نکال دیتے تھے نتیجہ یہ کہ سائنسی سطح پر کام کرنے والے مصنف کو اپنے وجود و عدم کا مسئلہ درپیش رہا اور تصنیفی قوت جیسی کچھ تھی، پورا فیض نہیں پہنچا سکی۔ حالات پیدا ہو رہے تھے کہ اس کا فیض پہنچتا، مصنف کسی غیر متعلق سرپرستی سے بے نیاز رہ کر اعلا دماغی کاوش کا نتیجہ پیش کر کے صرف اسی پر بسر کر سکتا، سو تقسیم ہند (۱۹۴۷) نے

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

۴۸-۱۹۴۷ء کی شکست و ریخت نے اردو کے دو اہم مرکزوں۔ اردو مصنف کی دو پناہ گاہوں (پنجاب اور حیدرآباد) پر بل ڈوزر چلا دیا، یوپی اور بہار کے اسکولوں میں اردو کا رواج اٹھ جانے سے ۲۵ برس کے دوران ایک ایسی نسل اٹھی۔ جو مصنف تب تک ابھر چکے تھے وہ مستند ہو چکے تھے انہیں یونیورسٹیوں میں، فلموں اور ریڈیو میں جینے کا سہارا مل بھی گیا۔ جو ابھی اٹھان کے ابتدائی مرحلے میں تھے، وہ یا تو دب کر رہ گئے اور تن آسانی کا شکار ہو گئے۔ یا انہوں نے تصنیفی صلاحیتوں کے لیے دوسری زبانوں (مثلاً ہندی اور انگریزی) اور سبیلوں کا (یعنی لکھنا چھوڑ کر ریسرچ اداروں میں ملازمت کا) رخ کیا۔ جو اچھے خاصے جا رہے تھے، انہوں نے دیکھا کہ مصنف کا مسئلہ نازک ہو گیا ہے تو رفتار ہی روک لی۔ کیا لکھیں؟ کس کے لیے لکھیں؟ کیوں کر لکھیں؟ مصنف کا موڈ تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ؎

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

ہندوستان کی تمام زبانوں سے بڑھ کر تامل زبان میں سائنسی تصانیف کی گرم بازاری ہے، بنگالی میں ناول اور ڈرامے کی، مراٹھی میں تاریخ، لسانیات اور ڈرامے کی، ملیالم میں فنون لطیفہ اور شاعری کی ـــ تو ظاہر ہے اس میں دوسرے اسباب کے علاوہ "عیارِ طبعِ خریدار" بھی ضرور شامل ہے۔ اردو کا مصنف کس کے در پہ دہائی دے؟ شاعر کے مخاطب شعر سنتے ہیں۔ شاعر کو نوازتے ہیں۔ اس کا مجموعۂ کلام نہیں خریدتے۔ ڈرامہ نگار کو نہ اسٹیج میسر ہے، نہ کتاب گھر۔ افسانوی ادب خاصا بک جاتا ہے لیکن سب سے زیادہ شہرت یافتہ مصنف (کرشن چندر) بھی افسانوں ناولوں کی دوسری بہتری فروخت سے اپنی شاموں کا خرچ پورا نہیں کر سکتا۔ تاریخ، تنقید اور فلسفے کے پڑھنے والے ۴۰ برس سے اوپر کے لوگ ہیں جن کے بجٹ میں کتابوں کی خریداری کی گنجائش بہت کم ہوتی ہے فنی مضامین کسی یونی ورسٹی میں اردو میں پڑھائے نہیں جاتے۔ پڑھنے والوں میں تشنگی ہے، لیکن ان کے مصنف کی نہ مانگ ہے، نہ اُسے لگن ہے۔ سائنسی تصانیف پر کل تک خاک اُڑ رہی تھی اب کچھ سرکاری سرپرستی نے سہولتیں فراہم کی ہیں۔

پہلے کے دنوں میں اردو مختلف علاقوں کی کسی قدر ترقی یافتہ، مگر نہایت جاندار زبان تھی، اب وہ زبان کے بجائے دین ایمان ہو گئی ہے یا کم از کم ہندوستانی مسلمانوں میں جزوِ ایمان بنتی جا رہی ہے۔ دس بیس برس کے اندر ہندوستانی مسلمان اسے اپنی پہلی یا دوسری زبان ماننے لگیں گے۔ دھتکار اور کسمپرسی نے اسے یہاں تک پہنچا دیا کہ غیر منطقی سبب سے سہی، مگر زندہ رہے گی اور سیکھی سکھائی بھی جائے گی

دینیات کی تصنیفیں پہلے بھی "دنیاویات" سے زیادہ ہی بکتی تھیں اقبال اور جوش کے مجموعوں سے کئی گنا، مولانا اشرف تھانوی کا "بہشتی زیور" چلا۔ اور اب تو مذہبی موضوعات کا مصنف اور اُن کا ناشر پہلے سے بہتر حالت میں ہے۔ مسلمانوں کی سماجی پستی کے ساتھ اس کے پڑھنے والے، بیچنے والے اور کتب خانے اور بڑھ گئے ہیں۔ دنیا تو سدھری نہیں آخرت ہی سدھار لیں۔ خواندگی عام ہونے سے اردو میں مذہبی تصانیف اور رسائل کی خواندگی بڑھی ہے۔ الٰہ بس۔ باقی ہوس!

مصنف کا اول مسئلہ یہ ہے کہ اس کا قدرداں حلقہ موجود ہو، دربار اور درباری نہ ہوں تو ہمدرد سرکار ہو۔ بازار ہو۔ علمی ادبی ادارے ہوں، بحث و تکرار کے اکھاڑے ہوں۔ اداروں اور اکھاڑوں کا اکھڑنا مصنف کو کساد بازاری کی چتاونی دیتا ہے "تحسینِ ناشناس" سے اتنا نقصان مصنف کو نہیں پہنچتا جتنا "سکوتِ سخن شناس" سے۔ فرانس ایک زمانے سے جدید اور جدید تر ادبی و فنی تحریکوں کا علمبردار رہا۔ تو یہ نہیں کہ وہاں ہر ایک اہل قلم تصنیف کے سہارے آسائش سے جی لیتا ہے، البتہ قابل ذکر تصنیف بیدار حلقوں میں گونج پیدا کرتی ہے: بحث و تکرار کی راہیں کھولتی ہے صدائے بازگشت کی ڈوری تھام کر مصنف گمنامی اور مفلسی کی کھوہ پار کر جاتا ہے۔ روس میں

۱؎ یہاں یہ تذکرہ بے جا نہ ہوگا کہ "آج کل" نئی دہلی کے ایک سابق ایڈیٹر عرش ملسیانی کے تقاضے پر میں نے مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا کٹھ پتلی کا تماشا، بیلے ڈراما، اندر سبھا اور اوپیرا، نوٹنکی، اور اوپیریٹا۔ پہلا مضمون "بیلے کا تعارف" لکھنے میں پورے ۵۶ دن لگ گئے۔ اور جب چھپا تو ۹۸ روپے کے منی آرڈر کے سوا نہ کوئی تجسس بھرا خط آیا نہ اصرار۔ صرف یہ ہدایت ملی کہ مضامین مختصر لکھیے، یعنی قسطوں میں چھاپنا دشوار ہے۔

ادیبوں کی انجمن ہر ایک مصنف کو پال سکتی ہے۔ نہ سرکاری وظیفے اور انعام یا کثیر اشاعتی اڈیشن کسی مصنف کا بیڑا پار کرتے ہیں۔ یہ سو فیصدی تعلیم اور ذہنی بیداری کی برکت ہے، جو قابلِ قدر تصنیف مصنف کو دو چار سال کے اندر سارے ملک سے روشناس کرا دیتی ہے۔

آج اُردو میں بعض رسالے (ان میں ڈائجسٹ بھی شامل ہیں) پچاس ہزار سے زیادہ اشاعت رکھتے ہیں، کئی روزنامے بھی منافع سے چل رہے ہیں لیکن نہ تو ان کے ذریعے کوئی واقعی مصنف اُبھرنے پاتا ہے نہ انہیں اُردو مصنفین کے مسئلے سے کوئی سروکار ہے۔ پھر وہ اس کمائی کو مصنف پر لگانا منافع کا سودا نہیں سمجھتے۔ جن اخبارات و رسائل میں چھپ کر کوئی نیا اہلِ قلم مصنفین کی صف میں جگہ پائے، اُن کی اشاعت محدود، مالی حالت ناگفتہ بہ اور ادارت کُل وقتی نہیں۔ اشاعت گھروں کا نام جن کتابوں کے سرورق کی زینت بنتا ہے، وہ صرف اپنا پتہ دینے کے قصوروار ہوتے ہیں۔ خرچ عموماً مصنف کی جیب سے نکلتا ہے۔

اب البتہ ساہتیہ اکادمی، نیشنل بک ٹرسٹ، ترقی اُردو بورڈ، اُردو اکادمی (دہلی)، ادارۂ ادبیاتِ اُردو، اسلامک کلچر، حیدرآباد) اور کسی قدر مکتبہ جامعہ نے مشکل آسان کی ہے۔

ہمارے یہاں مصنف کا مسئلہ صرف اتنا نہیں جتنا کسی بھی ترقی یافتہ زبان کے مصنف کو درپیش ہوتا ہے یعنی اپنے شعور اور قوتِ بیان کی تربیت، وسیع مطالعہ، تیاری وغیرہ۔ بلکہ وہ بھی ہے جو اپنے ملک یا وطن سے دور تک پھیلی ہوئی زبانوں میں وقت و مقام کے ساتھ خود بخود اپنا حل نکال لیتا ہے یعنی خاص خاص حلقوں، خیالوں، فکری یا فنی تحریکوں کے نمائندہ رسالے، اخبارات، اور اشاعت گھر جو شہد کے چھتوں کی طرح اُن رجحانوں کے مصنف کی تصنیفی کوششوں کے لئے مرکز اور غذائی سپلائی کا سامان کرتے ہیں۔ وہ اُبھرتے ہیں ایڈیٹروں یا ایڈیٹوریل بورڈ کے مخصوص رجحانوں اور اُن کی تصنیفی صلاحیت کے ساتھ (یہاں اچھے منیجروں سے کام نہیں چلتا) سرکاری مدد سے چلنے والے رسالے سجل، سنجیدہ اور قابلِ قدر ہو سکتے ہیں۔ (جیسا کہ "آج کل"، "شیرازہ"، "نیا دور" ہیں) لیکن وہ بحث اور تکرار، آئیڈیالوجی یا جدید تجربوں کی بحث کا، مصنف سے کشتی لڑنے اور داؤ پیچ سکھانے کا ذمہ نہیں لے سکتے۔ یہ کام "شب خون"، "عصری ادب"، "سوغات" اور "کتاب" جیسے رسالے اور ان کے حلقے انجام دے سکتے تھے لیکن ان میں کسی کی اشاعت ایک ہزار سے اوپر نہیں جاتی جو لہو پسینہ ایک کرنے والے مصنف کے لئے بہت حوصلہ شکن ہے اور یہ دیئے بھی اڈیٹروں کی باہر کی آمدنی کا تیل جلا جلا موت و حیات کی درمیانی رہ گزر میں ٹمٹماتے رہتے ہیں ؎

کیا پوچھے ہے وجود و عدم اہلِ شوق کا
خود اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

پہلے کبھی دیوانِ عام اور دیوان خانے تھے، حویلیاں اور مردانے تھے۔ وہ نہ رہے تو پبلک ہال، ادبی کلب اور ادبی حلقوں نے، لائبریریوں اور کتب خانوں نے اکھاڑوں کی منڈیر آگے تک بڑھائی۔ اسکولوں کالجوں میں، سرکاری ملازمتوں میں اُردو کو جگہ دلوانے کی جو کوششیں جاری ہیں وہ اپنی جگہ۔ لیکن مصنف کا اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ جہاں اُردو زندہ ہے وہاں ایسے عوامی ادارے، مرکز، کتب خانے اور کلب موجود ہوں یا وجود میں لائے جائیں جو لکھنؤ کے نخاس اور امین آباد کے چائے خانوں کا رول انجام دے سکیں۔ جو تصنیفی مال کے لئے شیئر بازار اور اسٹاک ایکسچینج کا کام کر سکیں۔ جہاں نئی تصنیف پر، اس کی جدت یا بے راہ روی پر آہ یا واہ کی جا سکے اور مصنف کو اس کی خبر لگتی رہے۔ جس گنبد میں بازگشت نہ گونجے وہاں کا مزار ویران ہو جاتا ہے۔

مصنف کا اہم مسئلہ آئیڈیالوجی نہ پہلے تھا، نہ اب ہے۔ متضاد اور معاند نظریوں کی تو تکار سے تو مصنف کو نشاط ملتا ہے۔ ذہن ہی کی آویزش اور آمیزش سے نئے تجربوں کی سرحدیں تلاش کرنے نکلتا ہے اور جب تلاش کر لیتا ہے تو پرانی تجربہ گاہوں میں اختلاف کا نیا فتنہ کھڑا ہوتا ہے۔ وہ فتنہ جو مصنف کے لئے خیر و برکت کا سبب ہے۔ مصنف کا اہم مسئلہ تجربہ گاہ کا مہیا ہونا ہے۔ وہی نہ ہو تو بے حسی کی فضا مصنف اور تصنیف دونوں کو برف خانے میں رکھ دیتی ہے ؎

بہر قیمت کہ می گیرند ایں جنسِ وفا خوب است
پس از مدت گزر افتاد بر ما کاروانے را (نظیری)

جس طرح مسجدوں سے ذرا ہٹ کر خانقاہیں بھی ہوا کرتی تھیں۔ آج اُردو کے مصنف کی ایک ضرورت یہ ہے کہ کالجوں، یونیورسٹیوں اور مدرسوں یا یتیم خانوں کی مسندوں سے الگ ایسے ادبی کلب اور حلقے مہیا ہوں جہاں نئے رسائل اور تصانیف پر بحث کرنے میں لوگ ایک دوسرے کا گریبان پکڑنے اور پگڑی اچھالنے سے نہ گھبرائیں۔ عام سرد مہری، کساد بازاری، بے رخی اور بے زاری کے ماحول میں ہمارے مصنف کو جب تک مشاعرہ باز شاعروں سے زندہ گلے لگانے یا ہوٹ (HOOT) کرنے والے نہ ملیں، پرانے مصنف کا تازہ دم رہنا اور نئے کا اُبھرنا دشوار ہے۔ روٹی تو کسی نہ کسی ذریعے سے کمالے لیکن مصنف بحیثیت مصنف تو کچھ اور کمانا چاہتا ہے۔ وہی اس

کی شہ رگ سے قریب بھی ہے اور شہ رگ کو لہو سے سیراب بھی رکھتا ہے۔ اُردو رسم خط اور علمی تعنیفی زبان کی تہہ داری سے عام بے نیازی کے اس دَور میں مصنف کے سامنے یہ سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اس کے لئے کوئی اکسیری نسخہ تلاش کرنا چاہیئے۔

جوگندر پال

مقبرہ روڈ، اورنگ آباد (مہاراشٹر)

ہر مصنف کا بنیادی مسئلہ ایک ہی ہے: وہ واقعی مصنف ہے یا محض اپنے الفاظ کا بوجھ ڈھوتا رہتا ہے؟ — اگرچہ قلم کے مزدوروں کی مجلسی اہمیت سے انکار ممکن نہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ کوئی تخلیقی تحریر کسی چور کے مانند دبے پاؤں مصنف کے دل و دماغ میں وارد ہوتی ہے اور اتنی معصوم نظر آتی ہے گویا یونہی بھٹکتی ہوئی اچانک اُدھر آنکلی ہو اور پھر یہ ہوتا ہے کہ مصنف پہلے ہی فلیش میں اُس پر اپنا تن من دھن لٹانے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ قلم کی مزدوری بڑا معزز پیشہ سہی، لیکن پیشہ ہونے کے باعث پیشہ وری کے ہتھکنڈوں سے پاک نہیں، اور اگر بالفرض کوئی بڑا نیک آدمی اپنے آپ کو ان ہتھکنڈوں سے بچائے رکھنے میں کامیاب ہو جائے تو بھی وہ اپنے سوچنے اور محسوس کرنے کے معیار کو سود و زیاں کے تابع رکھنے پر مجبور ہوتا ہے، کیونکہ اِس اصول کے بغیر کسی بھی پیشہ ور کی بیلنس شیٹ سے تجارت کے خوشگوار نتائج برآمد نہ ہوں گے۔

اگر یہ سچ ہے کہ تخلیق کے جو سُرٹ جانے، سچائیوں کی کنواری شکلوں کی تلاش میں کھو جانے اور دانشوری کی متعینہ حدود سے آگے نکل کر فکر و احساس کی ذاتی واردات سے کھلتے ہیں تو مصنف کو اپنی دیوانگی کی رہبری میں یہ کچے راستے طے کئے بغیر چارہ نہیں۔ جبکہ کوئی غیر مصنف اپنے ڈرائنگ روم میں اُس دیوانے کا مذاق اڑاتے ہوئے، انعام و خلعت کی نمائش کر کر کے اپنے مجلسی رتبے کے دعوے گنوا گنوا کر اپنے پرستاروں کو یقین دلا رہا ہوگا میری طرف دیکھو، میں کتنا بڑا مصنف ہوں، مجھے فلاں انعام ملا ہے، میں فلاں ادبی کمیٹی کا صدر رہوں، اپنی فلاں کتاب سے مجھے ہزاروں کا فائدہ ہوا ہے! میں اُن تمام شخصی اور غیر شخصی خطرات سے بخوبی واقف ہوں جو ہمیں ازلی سچائیوں کی غیر ہموار سطحوں کی مسافت میں پیش آتے ہیں، اور اگر میرے خدا کو اپنے اَن گنت جھنجھٹوں سے فرصت ہے تو میری دعا ہے کہ وہ میری مدد کرے، اُن خطرات سے سدا نبرد آزما ہونے کی میری ہمت بنی رہے، میں اپنی ہار کو تقدیر کا لکھا ہوا سمجھ کے اطمینان سے نہ بیٹھ جاؤں، میری بے چینی کی ہشاش بشاش کیفیت بنی رہے اور میں بخوشی اپنے شعور کی سزا بھگتا رہوں۔

اوائل میں تخلیق کار کو اپنا نام بڑا پیارا معلوم ہوتا ہے۔ گویا بھولے بھالے انداز میں کسی خوبصورت لڑکی سے فلرٹ کرنے کی بجائے اسے اپنے آپ سے ہی فلرٹ کرنا پسند ہو۔ میرے اِس رویے سے مجھے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ میں تین چار سال ہی میں اپنے آپ سے مایوس ہو گیا اور مجھے نئے سرے سے اپنی نشاندہی کی فکر لاحق ہونے لگی: میں محض اپنا نام ہوں یا اپنا آپ؟ اپنا آپ ہوں تو کیا میں بذاتِ خود ایک وحدت ہوں، یا ایک برتر خارجی وحدت کا باطن؟ — جوں جوں زندگی اور فن میں میری شرکت میں اضافہ ہوتا چلا گیا، توں توں میں اپنے نام، ذات اور تعصبات سے بری طرح دستبردار ہونے لگا۔ میں نے اکثر ایسے ادبا کے بارے میں بھی سوچا ہے جن کے نام کی مالا ہر سُو جپی جا رہی ہو اور جنہیں ادب میں سَر سے بھی اوپر تک ڈوب کر اپنا نام یکسر بھول چکا ہو۔ اس تپسیا اور لگن کے بغیر شاید آپ کو ساری دنیا میسر آ جائے لیکن زندگی کا عرفان اسی اٹوٹ انہماک سے نصیب ہوتا ہے۔

ادب اور عرفان کے اس پہلو کی طرف میرا دھیان شاید اس لئے چلا گیا ہے کہ ہم بحیثیت لکھنے والے آج اپنی تخلیقی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی خواہش سے اتنے بے تاب نظر نہیں آتے جتنے اس خواہش سے کہ ہماری تشہیر کے ذرائع کے امکانات وسیع تر ہوتے چلے جائیں۔ ہمارے دور کی عظمتوں کے کئی اسباب میں ایک نمایاں سبب یہ بھی ہے کہ اپنے آدرش کے اشتہار کو مکمل تر بنائے جانے کی کوشش میں ہمارے پاس اُس آدرش کی تکمیل کی فرصت نہیں رہی۔ سو ہمارے راکٹ ہمیں خلا میں لا کے چھوڑ دیتے ہیں۔ لیجئے، آپ ساتویں آسمان پر آپہنچے، مزے سے اِس سورگ پُوری میں جھنجھنا بجا بجا کر اپسراؤں کو اپنی طرف متوجہ کرتے رہیئے، تاکہ وہ بڑے پیار سے آپ کو گود میں اٹھا اٹھا کر جھلاتی پھریں، ہائے، کتنا پیارا بچہ ہے! — کس کا ہے؟ — اور کس کا؟ — اپنی ہی اکلوتی سمجھ بوجھ کا۔

ادب کے عنوان سے سیاست یا فلسفہ پر بحث کی خارملی سمتیں بھی ادیب کو بے سمت کر سکتی ہیں۔ اگر میں پہلے سے ہی اپنے اوپر یہ پابندی لاد لوں کہ مجھے کسی نظریے کا تابع ہو کر کہانی لکھنی ہے تو میں شاید اس نظریے کی وضاحت میں الفاظ کی مناسب نشست کا اہتمام تو کر لوں مگر میری کہانی، کہانی نہ ہو گی۔ کہانی تو ساری کی ساری اپنے مخصوص ماحول کی تہذیب، اپنے کرداروں کی جداگانہ خُوؤں، ان کے اپنے اعمال و مسائل، اور ان کی گفتار و فکر کے اپنے اپنے لہجے سے جڑی ہوتی ہے۔ مصنف ہونے کے تعلق سے میں اپنے آپ کو اپنی کہانی اور اس کے کرداروں کی آزادیوں

کا پابند بنا لیتا ہوں۔ فنونِ لطیفہ کو اسی لیے انسان کی متمدن اور بالغ عادتوں میں شمار کیا جاتا ہے کہ ان میں اُس کے کسی ذاتی تعصب کی گنجائش نہیں۔ اپنے اسی رویّے کی بدولت کہانی کار اپنے قاری کو بھی اپنے ساتھ کہانی کی تخلیق میں شریک کر لیتا ہے نتیجۃً جس طرح وہ اپنی متجسس جہد اور توفیق کے مطابق کہانی لکھتا ہے۔ اسی طرح اس کے قاری کی فہم میں اس کا اپنا تجسس کارفرما ہوتا ہے اور کہانی کو پڑھ کر گویا وہ اسے از سرِ نو تخلیق کرتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اگر میں اپنے کمزور لمحوں میں اپنے کرداروں سے جارحانہ سلوک روا رکھوں اور انہیں اپنی مرضی کا اسیر بنا لینے کے درپے ہو جاؤں تو وہ میرے ذہن میں چلتے پھرتے۔ اپنے سانس خود آپ لیتے، اپنے طور پر اپنی زندگی جیتے، اپنے دکھ جھیلتے۔ اپنے سکون کا جتن کرتے۔ اپنی کہانیاں بُنتے نظر نہ آئیں۔ میرا ذہن اسپتال سا بن جائے۔ یہاں اس کی جان بچانے کے لئے اسے آکسیجن چڑھائی جا رہی ہے (نہیں بھئی، موت کے ڈر سے یوں نہیں چیخا جاتا۔ یوں چیخو۔ یوں ــ ں!)۔ یہاں اس اپاہج کو لکڑی کی ٹانگوں پر چلنا سکھایا جا رہا ہے (لو، چلو اب! یوں ــ ں!)، یہاں اس ماؤف الذہن کو سوچنے کا ڈھنگ سکھایا جا رہا ہے (یوں ــ ں!) ــ نہیں! خدارا میرے ذہن کی ہری بھری بستی کو اس نادر شاہی یلغار کے دردناک نتائج سے بچا رہنے دو۔ مجھے بستیاں اس لئے نہیں اجاڑنی ہیں کہ ہاری ہوئی فوجوں کی پشت پر اپنے لئے آرمی میڈیکل ایگزیکیوٹو کے فرائض کی انجام دہی کے مواقع فراہم کر سکوں۔ جیو اور جینے دو!

کئی نیم ذہن لوگ ایک طویل مدت تک لکھے ہوئے لفظ کی کھلم کھلا آبروریزی کرتے رہے اور انہیں ٹوکنے کا مسئلہ اس لئے نہ اٹھا کہ انھوں نے نہایت معتبر لہجے میں اپنے آپ کو اور دوسروں کو ڈانٹ ڈپٹ کر سمجھا بجھا دیا کہ شرافت کا تقاضہ بس یہی ایک ہے۔ اُن کی دھاندلی سے ادب کو یہ فائدہ ضرور پہنچا کہ 'لکھا ہوا لفظ' رمیت سے اکھڑ جانے پر مجبور ہو گیا، مگر یہ بھی کیا کہ بیچارے کو منہ سے ٹپکے ہوئے لفظ سے بھی گیا گزرا سمجھ کر کوئی پناہ ہی نہ دے۔ مجھے اپنا ایک دوست اس لئے نہایت بھلا معلوم ہوتا ہے کہ بولتے بولتے جب اس کا لہجہ نہایت گمبھیر، نہایت فراواں ہو جاتا ہے تو وہ غیر شعوری طور پر اپنا قلم کھول کر انگلیوں میں لے لیتا ہے۔ 'لکھا ہوا لفظ' بولا جائے یا لکھا جائے۔ وہ ہمارے زبان کے تخلیقی استعمال سے بہرہ ور ہوئے بغیر وجود پذیر نہیں ہوتا۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ زبان جتنی زیادہ تخلیقی ہوتی ہے اتنی ہی گہری حد تک وہ اپنے معنی میں ڈوبی ہوتی ہے اور قاری کو نظر نہیں آتی۔

کہانی کی زبان اور اسلوب کے ضمن میں بیشتر نقاد اس لئے دھوکا کھا جاتے ہیں کہ اپنی علمی عادات کے باعث وہ فن کے قالب اور روح کو جدا جدا دیکھتے ہیں۔ کوئی جسم اپنے ہی جوہر سے پھوٹ کر باہر آتا ہے اور اس کی ہیئت سے اُس کی مخصوص جینیس کا سراغ ملتا ہے۔ سو کہانی کے ان گنت فارم ممکن ہیں، گڑبڑ کا اندیشہ البتہ اُس وقت ہوتا ہے جب کوئی لکھنے والا کسی بھی ہیئت میں ایک سالم کہانی پیش کرنے کی بجائے اپنی اس خواہش سے بے چین ہو جاتا ہے کہ اسے صرف فارم کا کوئی انوکھا تجربہ پیش کرنا ہے، اور بس۔ میرے دوست جب مجھ سے کہانی میں کہانی پن کے مسئلہ پر استفسار کرتے ہیں تو مجھے لگتا ہے کہ وہ دراصل یہ چاہتے ہیں، اب بھی ہمارے کرداروں کو وہی واضح اور بھولے بھالے واقعات پیش آتے چلے جائیں جو انہیں اپنی جوانی میں پیش آیا کرتے تھے: شادی یا جنازہ! ـ پر اب اس کا کیا کیا جائے کہ ایک واقعہ صرف ایک ہی بار پیش آتا ہے۔ چونکہ سبھی واقعات کا سیاق و سباق الگ الگ ہے اس لئے بظاہر ایک جیسے واقعات کا حلیہ بھی الگ الگ ہو گا۔ کئی ایک تو کسی ہیئت میں بندھنے میں ہی نہیں آتے، جس سے اُن کی بے ہیئتی ہی سے اُن کی کسی ہیئت کا برآمد ہونا قابلِ یقین معلوم ہوتا ہے۔

"پر پھر ہم اسے کہانی کا نام کیسے دیں گے؟"

"ویل! جیسے آج آپ اپنی اس قدر بدلی ہوئی زندگی کو زندگی ہی کہنے پر مجبور ہیں۔"

کئی سال پہلے کہانی سے جب میرا میل جول بڑھنے لگا تو ایک بار اُس نے جھجک کر خواہش ظاہر کی کہ سارا سارا دن تمہاری فرصت کے انتظار میں بیٹھی رہتی ہوں، کیسے عاشق ہو کہ مجھ سے اپنا دھندا عزیز رکھتے ہو؟ میری بھی خواہش ہے کہ سارے کام چھوڑ کر اب ہمہ وقت عشق ہی کروں۔ دو ایک بار میں نے نہایت گرمجوشی سے اپنی اور کہانی کی خواہش کو پورا کرنے کا اقدام بھی کیا ہے لیکن پٹ کر اپنا سا منہ لے کر رہ گیا ہوں۔ مجھے کسی سے شکایت نہیں، اک میرا حوصلہ ماڈرن لائف کے اہتمام میں محصور نہ ہوتا۔ یا خدا! مجھے سب کچھ تج دینے کی توفیق دے تاکہ میری اَن لکھی کہانیاں میرے وجود میں دھنسی نہ رہ جائیں، میرے ساتھ ہی مٹی نہ ہو جائیں!

حامدی کاشمیری

۲۹۶ جواہر نگر سری نگر کشمیر

تخلیق و تصنیف کی چوبیس سالہ مدت میں، جس اہم مسئلے کا مجھے سامنا

رہا ہے وہ شخصی ہوتے ہوئے بھی عمومی نوعیت کا ہے، یعنی مالی دشواریوں کا مسئلہ۔ ریاست میں معلّم کی حیثیت سے اپنے تدریسی فرائض کی انجام دہی میں مالی دشواریاں ہمیشہ اس سکون اور یکسوئی میں مخل انداز ہوتی رہی ہیں، جو ادب کی تخلیق کے لیے ذہنی ارتکاز کی ضمانت ہے۔ مالی مشکلوں سے کم و بیش ہر ہندوستانی مصنف اور شاعر کا سامنا رہتا ہے۔ گزشتہ ادوار میں، جاگیردارانہ نظام میں درد، شیفتہ، ذوق یا داغ جیسے درباری شعراء، جو مالی طور پر خوشحال تھے، استثنیٰ کی حیثیت رکھتے ہیں نہیں تو عام طور پر شعراء (ان میں میر اور غالب بھی شامل ہیں) تمام عمر مالی پریشانیوں میں مبتلا رہے اور فکرِ معاش میں گھلتے رہے۔ شاعر ہونا ہی افلاس زدہ ہونے کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ یہاں کے ادیب کو اپنا اور بیوی بچوں کا پیٹ بھرنے کے لیے کوئی نہ کوئی ذریعۂ معاش ڈھونڈنا ہی پڑتا ہے۔ اس کام میں اسے اپنے وقت اور توانائی کا بہترین حصہ قربان کرنا پڑتا ہے۔ وہ تھکا ماندہ گھر لوٹتا ہے۔ تو مشکل ہی سے چند لمحے اُسے نصیب ہوتے ہیں جن میں وہ ادب کی تخلیق پر توجہ دیتا ہے۔ ہمارے ملک میں کسی مضمون، افسانے یا نظم کے معاوضے کے طور پر ملنے والی رقم اتنی حقیر ہوتی ہے کہ اس کا ذکر نہ کیا جائے تو اچھا ہے۔

سرکاری، نیم سرکاری یا غیر سرکاری ادبی اداروں سے وقتاً فوقتاً بہترین قرار دی گئی کتابوں پر جو انعامات دیئے جاتے ہیں، وہ بھی آٹے میں نمک کی حیثیت رکھتے ہیں اور کوئی ٹھوس مقصد پورا نہیں کرتے۔ ریاستی اکاڈمی سے میری دو تنقیدی کتابوں "جدید اُردو نظم اور یورپی اثرات" اور "غالب کے تخلیقی سرچشمے" پر سات سات سو روپے کے انعامات ملے۔ ظاہر ہے یہ رقم دل بہلاوے کے لیے بھی کافی نہیں چہ جائیکہ اس سے حوصلہ افزائی یا عزت افزائی کا پہلو برآمد ہو سکے۔

اُردو تنقید میں موضوعاتی کتب کی قابلِ لحاظ کمی کے پیشِ نظر میں نے چند موضوعاتی کتابیں لکھی ہیں۔ ہر بار مسودے کی تکمیل کے بعد جو حوصلہ شکن اور صبر آزما مسئلہ آن کھڑا ہوا ہے وہ مسودے کی اشاعت کا ہے۔ یہ مسئلہ یک رُخا نہیں، بلکہ کئی پہلو رکھتا ہے۔ اور ہر قدم پر نئی دُشوار منزل کو نمایاں کرتا ہے۔ سب سے پہلے سرمایہ کی فراہمی کا مسئلہ ہے۔ جہاں صورتِ حال یہ ہو کہ مشکل ہی سے گزر بسر ہو رہی ہو، وہاں کتاب کی اشاعت کا خواب دیکھنا دیوانگی سے کم نہیں۔ میں نے اپنی دیوانگی پر قابو نہ پا کر چند کتابیں مثلاً ایک ناول "بلندیوں کے خواب" ایک افسانوی مجموعہ "سراب"، اور تنقیدی کتاب "جدید اُردو نظم اور یورپی اثرات" کو خود ہی چھپوانے کا بیڑہ اٹھایا، اور اپنے اس شوقِ فضول پر رفیقۂ حیات کے

لے کر دوستوں اور رشتہ داروں سبھی کے سنگِ ملامت کے وار سہے۔

پیسے کی فراہمی کے بعد بھی کئی اور حوصلہ شکن مرحلے باقی رہ جاتے ہیں، مثلاً کاتب کا ملنا۔ اس زمانے میں اچھی یا معیاری کتابت تو امرِ محال بن چکی ہے۔ جدید معاشرے میں قدروں کے انہدام اور مادی منفعت اندوزی کے رجحان کے نتیجے میں ہر کام میں سطحیت راہ پا رہی ہے اور قابلیت کا تنزل واقع ہو رہا ہے۔ ہمارے کاتب حضرات بھی آخر اسی معاشرے کے افراد ہیں۔ میں کاتب حضرات کی معذوریوں کو سمجھتا ہوں لیکن اُن کی تغافل شعاریوں کا ستم رسیدہ ہوں، اور پھر کتابت کرتے ہوئے وہ جس بے رحمی سے مسوّدے کا حلیہ بگاڑتے ہیں اس سے مزید اُلجھن ہوتی ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ آج کے سائنسی دور میں بھی ہم کاتب کی گرفت سے آزاد نہیں ہو سکے ہیں۔

کاتب کے چنگل سے خدا خدا کر کے نکل جایئے تو لیتھو کے کرشمے دیکھنے کو ملیں گے۔ میری نظر میں عام طور پر لیتھو کا کام غیر اطمینان بخش رہا ہے۔ الفاظ تو کیا، بعض صفحات پر سطروں کی سطریں غائب ہو جاتی ہیں۔ کبھی سیاہی کی زیادتی طباعت کا سارا حسن غارت کر دیتی ہے، اور پھوہڑ کالے حروف کے ڈھیر کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔ کتاب چھپ بھی گئی تو بلاک سازی کے لیے ریاست کے باہر کسی فرم سے رابطہ پیدا کرنا پڑتا ہے جو وقت کی بربادی میں رہی سہی کسر کو پورا کرتا ہے۔ اگر آپ اس جھنجھٹ میں پڑے بغیر سستے چھوٹنے کے مصداق مسودہ کسی پبلشر کے ہاتھ اونے پونے بیچ ڈالیں تو یاد رکھیے کتاب کو منظرِ عام پر دیکھنے تک عمرِ خضر کی ضرورت پڑے گی۔ اتفاق سے اگر کسی دن کتاب آ ہی گئی تو اس کی کتابت، طباعت اور گٹ اپ دیکھ کر آپ اپنا سر پیٹیں گے۔

کتاب چھپ کر آتی ہے تو ایک انجانا نشہ رگ رگ میں اترنے لگتا ہے، بشرطیکہ کتاب اچھی چھپی ہو۔ لیکن یہ نشہ اترتے دیر نہیں لگتی جب کتاب کی نکاسی کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ کئی مہینے بلکہ سال بھی گزر چکنے کے بعد کتاب کی سبھی جلدیں آپ کے کمرے کے بڑے حصے پر پھیلی ہوں اور کاغذ کے کیڑوں کے لیے خوراک مہیا کر رہی ہوں، تو یہی کتابیں آپ کا منہ چڑانے لگتی ہیں اور آپ اپنے اندر کے مصنف کی بدنصیبی پر ماتم کرتے ہیں۔ اُردو زبان میں کتاب کی نکاسی کی کوئی مؤثر صورت ہے ہی نہیں۔ کتب فروش اداروں یا ایجنسیوں کے مالک و منتظم آج بھی اپنے کاروبار کو جدید سائنسی لائنوں پر وسعت دینے کے موڈ میں نہ ہوں اور پڑھنے والوں کی غالب اکثریت جاسوسی کتابوں یا

دومانی ماؤلوں کو گلے کا تعویذ بنانے پر مصر ہو تو کتاب کی نکاسی کا مسئلہ کیونکر حل ہوگا؟ ابتدائی مرحلوں میں مصنف کی حیثیت سے میں دو معروف ناشروں کی بد پرکتی ہوں کو لیڈروں کی نذر کیے بیٹھے کے سہارے کتاب نے اپنے دوستوں (ان میں باذوق حضرات کی کوئی تخصیص نہیں) میں بڑی فیاضی سے تقسیم کرتا رہا۔ لیکن اب صورت حال ذرا مختلف ہے۔ تازہ کتاب چھپتے ہی بعض تاجروں کی جانب سے اور خاص کر چند معروف کتب فروشوں کے آرڈر وصول ہوتے ہیں اور کتاب (چالیس فیصد کمیشن پر) بہ آسانی نکل جاتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ رقم کی وصولی میں کبھی کبھی برسہا برس لگ جاتے ہیں۔ پھر بھی صد شکر ہے کہ نکاسی میرے لئے کوئی سنگین مسئلہ نہیں رہا۔ لیکن اس مقام تک آتے آتے کتنے ہفتخوان طے کرنا پڑے ہیں، وہ میں جانتا ہوں اور ہر ہندوستانی مصنف کو ان سے گزرنا پڑتا ہے۔ ایک صحت مند اور خوشگوار ادبی فضا کا فقدان بھی مصنف کے لئے کبھی کبھی گھٹن پیدا کرتا ہے۔ تسلیم کہ تاریخ ادب میں ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں جو اس خیال کی تردید کرتی ہیں۔ انتہائی غیر اطمینان بخش حالات میں بھی اعلیٰ ادب کی تخلیق ہو سکی ہے۔ سامنے کی مثال پہلی جنگ عظیم کے انتشار کی ہے جس میں جیمس جوائس اور ایلیٹ جیسے بڑے فنکار پیدا ہوئے۔ غالب بھی شدید انتشار اور تخریب کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن ان مثالوں کے باوجود موافق ادبی ماحول کی افادیت سے انکار ممکن نہیں۔ ساتھ ہی اپنے ہم خیال اور ہم مشرب ادیبوں اور شاعروں سے مل کر اور مختلف نزاعی ادبی مسئلوں پر تبادلۂ خیال کرنے سے فکر و خیال کی بعض گتھیاں حل ہونے میں مدد ملتی ہے۔ دوسرے بڑے شہروں میں مصنفوں کا زیادہ وقت ایسی جگہوں پر گزرتا ہے، جہاں وہ اکثر نزاعی مسئلوں پر بے لاگ انداز سے گفتگو کرتے ہیں۔

ملک کے جس خطے میں میں رہتا ہوں وہاں خالص ادبی نوعیت کی کوئی انجمن نہیں، اور اگر ہے تو نظریاتی وابستگی کی بنا پر ادب سے زیادہ سیاست کی چیز بن کر رہ گئی ہے۔ اس لئے لامحالہ خلوت گزیں ہونا پڑتا ہے اور بعض ادبی نکات کی تفہیم کے لئے ذاتی سمجھ بوجھ پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ میری نگر سے کوئی خالص ادبی ماہنامہ بھی نہیں نکلتا۔ جو فکر و خیال کی ترسیل کا ذریعہ بنتا۔ تاہم یہ بات میرے لئے سدِ راہ نہیں رہی ہے۔ پھر بھی جہاں میں رہتا ہوں ایک گہرے سناٹے کا احساس ہوتا ہے اور میں پرورشِ نوا میں مصروف ہوں۔

مصنف بھی دوسرے انسانوں کی طرح معاشرے کا ایک ہوشمند فرد ہے۔ وہ ان تمام خانگی اور معاشرتی اور ملکی رسوم و رواج کا پابند ہے جنہیں تہذیبی اور اخلاقی تقدیس کا شرف حاصل ہے۔ بظاہر یہ اچھی بات ہے۔ معاشرتی زندگی کی مؤثر کارکردگی کے لئے سماجی اور اخلاقی رسوم کا احترام کرنا تہذیبی قدروں کی توسیع کے مترادف ہے۔ لیکن شخصی طور پر بارہا یہ محسوس کرتا آیا ہوں کہ یہ پابندیاں مصنف کی خود مختار اور آزادی پسند شخصیت کو پابہ جولاں کرتی ہیں۔ اور تخلیق و تصنیف کے شخصی آزادی کے تعلق سے جو مطالبے ہیں، ان کی نفی کرتی ہیں۔ میرے ساتھ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ لکھنے کے حاوی موڈ کو جو ہفتوں بلکہ مہینوں کے کرب انگیز انتظار کے بعد نصیب ہوا ہے خیرباد کہہ کے کسی عزیز یا دوست کے یہاں کسی خانگی تنازعے یا شادی بیاہ یا کسی اور تقریب سعید کے سلسلے میں جانا پڑا اور جب گھنٹوں کی مغز ماری کے بعد اس سماجی فریضے سے عہدہ برآ ہو کر گھر لوٹا ہوں تو اگلے دو روز تک بے سدھ پڑا رہا ہوں۔ رہا لکھنے کا موڈ، سو —

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا ...

بالکل اسی طرح تخلیقی لمحات اس وقت بھی درہم برہم ہو جاتے ہیں جب آپ وقت بے وقت کے ملاقاتی نازل ہوتے ہیں اور جیسے شعور کی تکنیک میں بازار کے بڑھتے ہوئے بھاؤ سے لے کر چاند پر انسان کے اترنے کے موضوعات پر بے تکان بولتے چلے جاتے ہیں اور آپ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتے ہیں۔ میں اس خیال کی وکالت نہیں کر رہا ہوں کہ ادیب کو دنیوی اور سماجی ذمہ داریوں سے کھلی چھٹی دی جائے۔ ایسا شاید ممکن نہیں لیکن یہ ضرور چاہتا ہوں کہ اسے اتنی پابندیوں میں نہ جکڑا جائے کہ "زنجیر گرانباری زنجیر" محسوس کرے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی فنکارانہ حیثیت کو بے رحمی سے نظر انداز نہ کیا جائے۔

آخر میں ایک ایسے مسئلے کی طرف اشارہ کروں گا جو شخصی ہوتے ہوئے بھی غیر شخصی ہے اور جس کا تعلق موجودہ عہد کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ہے۔ یہ مسئلہ روایت کے حصاروں میں اپنے آپ کو محفوظ خیال کرنے والے ادیبوں کے مقابلے میں ایسے ادیبوں اور مصنفوں کو پریشان کرتا ہے جو برق رفتار سائنسی اور میکانکی ترقی کے نتیجے میں اور اس سے بھی بڑھ کر حیات و کائنات کے تعلق سے نئی حسیت کے تحت اپنے وجود کو معرضِ ہلاکت میں دیکھتے ہیں۔ مسئلہ یہ نہیں کہ نئی ہیومن سچویشن میں فنکار نئے تجربات سے گزرتا ہے۔ ایسا ہونا فطری عمل ہے۔ البتہ مسئلے کی سنگینی کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب نئے تجربات کے مؤثر اظہار کے لئے اظہار و بیان کے روایتی اور فرسودہ اسالیب کی عدم معنویت ظاہر ہوتی ہے اور نئے اسالیب کی تخلیق کے لئے لفظ کے دشت و سراب سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ مسئلہ یہیں پر ختم نہیں ہوتا بلکہ آپ اپنے تجربات کی نئی لسانی تشکیل کے بعد ایک

اور مسئلے سے دوچار ہوتے ہیں جو پہلے مسئلے سے غیر متعلق نہ ہوتے ہوئے بھی آپ کی دسترس سے باہر ہے۔ اور پڑھنے والوں کی جانب سے آپ پر چسپاں ہوتا ہے۔ یعنی ابلاغ کا مسئلہ۔ اس مسئلے سے اپنے وقتوں میں کیٹس، ایلیٹ اور غالب کو بھی نمٹنا پڑا۔ اس مسئلے کا کئی دوسرے ہم عصروں کی طرح مجھے بھی سامنا ہے۔ میں نے حال ہی میں ایک ناولٹ لکھا ہے۔ "پرچھائیوں کا شہر" یہ "شاعر" کے ناولٹ نمبر میں شائع ہوا ہے۔ اس میں بدلتے ہوئے حالات میں نئی حسیت کی مصوری کے لئے مجھے اسلوب میں کچھ تبدیلیوں سے کام لینا پڑا۔ مثلاً اس میں سوریلزم کے اثرات نمایاں ہیں۔ یہ ناولٹ جب روایتی ناول کے عادی قارئین کی نظر سے گزرا تو ان کی جانب سے کسی دل خواہ جواب RESPONSE کا اظہار نہ ہوا۔ یہی حال نئے عہد میں لکھے جانے والے ان افسانوں اور نظموں وغیرہ کا ہے جو نئی حسیت کی، غیر روایتی انداز میں مصوری کرنے کی سعی کرتے ہیں۔



مجتبیٰ حسین
۴۲ [illegible] ہاؤس نئی دہلی

مصنف کے مسائل پر کیا اظہار خیال کیا جائے جب کہ مصنف کی ذات خود ایک مسئلہ ہوتی ہے اور جب بات اردو کے مصنف کی آتی ہے تو معاملہ ذرا کیا بلکہ بالکل ہی ٹیڑھا ہو جاتا ہے۔ آپ کو یہ حقیقت تسلیم کرنی ہی ہوگی کہ مصنف ایک الگ چیز ہوتی ہے اور اردو کا مصنف بالکل جدا گانہ مخلوق ہے۔ ہر مصنف مصنف تو ہو سکتا ہے لیکن اردو کا مصنف ہرگز نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ بد قسمتی سے اردو کے مصنف ہونے کا الزام اپنے سر اٹھائے پھر رہے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اردو میں تصنیف و تالیف کا کام "کار ثواب" کے زمرے میں آتا ہے۔ اس کا اجر آپ کو اس دنیا میں نہیں بلکہ دوسری دنیا میں ملتا ہے۔ ہم لوگ حقیقتوں کو تسلیم کرنے کے معاملہ میں بڑے معصوم واقع ہوئے ہیں۔ ایک مزاح نگار کی حیثیت سے میں عادتاً مجبور ہوں کہ حقیقت کو حقیقت ہی رہنے دوں اور اس پر کوئی نقاب نہ چڑھاؤں۔ اس موقع پر مجھے وہ لطیفہ یاد آ رہا ہے کہ ایک صاحب کے تین بیٹے تھے۔ ایک دن ان صاحب کے ایک پرانے ملاقاتی ایک عرصہ بعد راستہ میں مل گئے۔ خیریت پوچھی پھر پوچھا "آپ کے بیٹے کیسے ہیں؟"

ان صاحب نے کہا "میرا ایک لڑکا ڈاکٹر بن گیا ہے، دوسرا وکیل ہے۔ ان کے علاوہ میرا ایک اور لڑکا بھی تھا"۔

ملاقاتی نے بات کاٹ کر پوچھا "تو کیا وہ مر گیا۔؟"

ان صاحب نے کہا "بس یونہی سمجھ لیجئے کیونکہ وہ اردو کا شاعر بن گیا ہے۔ اب اس کے لئے "تھا" کا استعمال نہ کروں تو اور کیا کروں؟"

سماجی طور پر اردو کے شاعر اور ادیب کا امیج (IMAGE) ہی کچھ اور ہے۔

حیدرآباد میں ایک بار ایک صاحب نے اردو کے چند ادیبوں اور شاعروں کو اپنے ہاں کھانے پر بلایا تھا۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ اس ضیافت کا اہتمام کس ضمن میں کیا جا رہا ہے۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد کسی نے پوچھا "حضرت! یہ آپ کو اردو ادیبوں اور شاعروں کو کھانا کھلانے کی کیا سوجھی؟ آخر معاملہ کیا ہے؟"

وہ صاحب بڑی متانت سے بولے "بھئی! اصل معاملہ یہ ہے کہ میں نے منت مانی تھی کہ اگر میرا لڑکا میٹرک کے امتحان میں کامیاب ہو گیا تو میں اردو کے گیارہ ادیبوں اور شاعروں کو کھانا کھلاؤں گا۔ بس اتنی سی بات ہے۔ آپ اس حرکت میں ادب دوستی اور سخن فہمی کے جراثیم تلاش کرنے کی کوشش نہ کریں تو اچھا ہے۔"

آج اردو کے مصنف کے لئے لکھنا اتنا مشکل کام نہیں ہے جتنا کہ لکھے ہوئے کو چھپانا۔ "اور" پڑھوانا مشکل ہے۔ ہمارے نئے ادیبوں کی اکثریت ایسی ہے جو ادب کی تخلیق پر اتنی توجہ صرف نہیں کرتی جتنی کہ اپنے ادب کی اشاعت پر۔ اس کے لئے سب سے پہلے تو آپ کو رسائل کے ایڈیٹروں سے اپنے مراسم استوار کرنے پڑتے ہیں۔ مراسم استوار کرنے کے کئی طریقے ہوتے ہیں۔ آپ کو وقتاً فوقتاً ایڈیٹروں کے نام خطوط لکھنے پڑتے ہیں جن میں بار بار ان کی مزاج پرسی کی جاتی ہے۔ خط میں سرد و گرم جملوں کے بعد اردو ادب کی بقا کے لئے ان کی کوششوں کو خراج تحسین ادا کرنا پڑتا ہے۔ اگر آپ ایسا نہ کریں تو آپ کی تخلیق کی فوری اور مناسب جگہ پر اشاعت ممکن نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر نئے لکھنے والے ایڈیٹروں کو خطوط زیادہ اور افسانے یا شعر کم بھیجتے ہیں افسانہ یا غزل چاہے "قابل اشاعت" ہو یا نہ ہو۔ ایڈیٹر کے نام خط کا قابل اشاعت ہونا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ بعض تخلیقات تو صرف ان کے ساتھ آنیوالے خطوط کی بنا پر شائع ہو جاتی ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی اچھے خط کو شائع کرنے کے لئے برے افسانے یا بری نظم کو چھاپنا ہی پڑتا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ مصنف اور ایڈیٹر کے تعلقات بڑے لطیف

اور نازک ہوتے ہیں۔ ادیب کو ہر دم یہ فکر لاحق رہتی ہے کہ کہیں آبگینوں کو ٹھیس نہ لگ جائے۔ ایک بار ایک رسالہ کے ایڈیٹر کی صحت خراب ہو گئی۔ تو کئی ادیبوں نے ان کی مزاج پرسی کچھ اس انداز سے کی تھی جیسے اگر وہ فوراً صحت یاب نہیں ہوئے تو یہ لوگ خودکشی کر لیں گے۔ اس دھمکی سے ڈر کر ہی ایڈیٹر کو فوراً صحت یاب ہو جانا پڑا۔ مجبوری انسان سے کیا نہیں کرواتی۔ اگرچہ یہ باتیں بہت معمولی ہیں۔ لیکن اگر آپ کو غور سے دیکھنے کی عادت ہو تو پتہ چلے گا کہ ادب میں "پیرو کاری" اب ایک مستقل صنف کا درجہ اختیار کرتی جا رہی ہے۔

ہر ادیب کی فطری خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ ادب میں مقام حاصل کرے اور مقام کے سلسلے میں مشکل یہ ہے کہ ادب کے اکثر "مقامات" پر پہلے ہی سے "پرانے ادیب" بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ انہیں تو نئے لکھنے والوں کو جگہ ملے۔ آپ ادب میں جس مقام پر پہنچنا چاہتے ہیں اس مقام پر نظر ڈالتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اول تو وہاں پہلے ہی سے کچھ ادیب بیٹھے ہوئے ہیں اور دوم یہ کہ اس مقام پر پہنچنے کے لئے ادیبوں کی ایک قطار لگی ہوئی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے قطار کے اگلے سرے پر "ادب میں مقام" تقسیم نہ ہو رہا ہو بلکہ راشن تقسیم ہو رہا ہو۔ پھر جن ادیبوں کو "مقام" مل جاتا ہے ان کی حالت ان سیاستدانوں سے مشابہ ہوتی ہے جنہیں ایک بار "کرسی" مل جائے تو پھر وہ کرسی کو اس وقت تک نہیں چھوڑتے جب تک وہ خود سے نہ ٹوٹ جائے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے پرانے ادیب اور ان کے نقاد "مقام" کے معاملہ میں بڑے لالچی اور کنجوس واقع ہوئے ہیں۔ ہمارے ادیب اپنی "استطاعت" کے مطابق "خدمت" انجام دینے کے بعد مطمئن نہیں ہوتے۔ میرے خیال میں ایک ادیب کو اپنی "شاہکار تخلیق" لکھ لینے اور یہ جان لینے کے بعد کہ وہ اس سے بہتر کوئی اور چیز ادب کو نہ دے سکے گا ادب سے ریٹائر ہو جانا چاہئے۔ اور اپنا مقام کسی اور کے لئے خالی کر دینا چاہئے۔ دنیا کے ہر پیشہ میں ریٹائرمنٹ کی گنجائش ہوتی ہے لیکن مصنف کا پیشہ ہی ایک ایسا پیشہ ہے جس میں آدمی ادب اور دنیا سے ایک ساتھ "ریٹائر" ہوتا ہے۔ سچ پوچھئے تو ہمارے بہت سے ادیب ایسے ہیں جو ایک منزل پر پہنچنے کے بعد اگر لکھنا ترک کر دیتے تو ادب کی بہت بڑی خدمت انجام دیتے۔ بعض اوقات کچھ نہ لکھنا بھی ادب کی خدمت کی تعریف میں آتا ہے۔ بعض اپنی ماضی کی شہرت کے بل بوتے پر اپنی کسی بھی تیسرے درجے کی تخلیق کو پہلے درجہ کی تخلیق منوانے کی کوشش کرنا خود ادب کی ایک "بدخدمتی" ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادھر چند برسوں سے ادب میں بتوں کو توڑنے کا ایک سلسلہ چل پڑا ہے۔ پرانے بت نہ ٹوٹیں تو نئے بت کیسے بنیں۔

اس سلسلہ میں ہمارے نقادوں پر بھی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے ہمارے نقادوں نے عرصہ سے یہ وطیرہ بنا رکھا ہے کہ کسی بھی ادیب کی تخلیقات کی طرف اس وقت تک آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے جب تک کہ وہ نہ مر جائے۔ "زندہ ادیب" اتنی اہمیت نہیں رکھتا جتنا کہ ایک "مردہ ادیب"۔

پھر اردو تنقید کی ایک بدبختی یہ ہے کہ اردو پڑھانے والا ہر لیکچرار یا پروفیسر اپنے آپ کو نقاد بھی سمجھتا ہے۔ دنیا کے کسی اور ادب میں آپ ایسی مثال نہیں بتا سکتے کہ انگریزی یا فرانسیسی پڑھانے والا ہر پروفیسر اپنے آپ کو نقاد بھی سمجھتا ہو۔ کسی زبان کو پڑھانا ایک الگ چیز ہے اور تنقید نگاری بالکل ہی ایک الگ چیز۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گیا ہے کہ اردو کی تنقید اب تک "کالج کی چار دیواری" سے باہر نہیں نکل سکی ہے۔ وہ اب بھی اسنابری SNOBBERY کا شکار ہے۔ اصلی اور کھرے نقاد آپ کو بہت ہی کم نظر آئیں گے۔ اردو تنقید نگاری کی اس گھٹی گھٹی سی فضا میں اردو کے نام نہاد نقاد نئے ادیبوں کو مقام عطا کرنے کے معاملے میں بڑی کوتاہی سے کام لیتے ہیں۔ بحیثیت مزاح نگار میں یہاں صرف ایک مثال دینے پر اکتفا کروں گا کہ مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ اردو مزاح نگاری کو جو کچھ دیا ہے اس کی روشنی میں اردو کے پچھلے مزاح نگاروں کے بہت سے بت بھلے ہی نہ توڑے جائیں مگر ان کے بازو مشتاق احمد یوسفی کا ایک نیا بت تو کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ مگر کسی نقاد کو یہ توفیق عطا نہیں ہوئی کہ وہ مشتاق احمد یوسفی کے فن کا سیر حاصل جائزہ لے سکے۔ اصل میں اب ادب میں "دفتریت" داخل ہوتی جا رہی ہے۔ جو ادیب داخل رجسٹر ہو چکے ہیں۔ ان کا بال بھی بیکا نہیں کیا جا سکتا۔ نقادوں کے اس "دفتری رویہ" کی وجہ سے نئے ادیبوں میں دو رجحان پروان چڑھتے جا رہے ہیں۔ ایک رجحان تو وہ ہے جس کے تحت وہ رسالوں کے ایڈیٹروں اور نقادوں کی خوشنودی حاصل کر کے ادب میں "مقام" پانا چاہتے ہیں۔ اور دوسرا رجحان وہ ہے جس کے تحت ادیب اپنے آپ کو "نمایاں" کرنے کے لئے بے معنی اور بے ہنگم تخلیقات کا سہارا لیتے ہیں۔ اپنے آپ کو نمایاں کرنا ہر ادیب کی فطری خواہش ہوتی ہے۔ اور اپنے آپ کو "نمایاں" کرنے کے ہزاروں طریقے ہو سکتے ہیں۔ اگر آپ اپنے کوٹ کے کالر میں گلاب کا پھول لگانے کی بجائے "گوبھی کا پھول" لگا کر سڑک پر چل پڑیں تو آپ دیکھتے ہی دیکھتے سڑک پر چلنے والوں میں یقیناً "نمایاں" ہو جائیں گے۔ ہمارے بعض نئے ادیب ادب میں جس قسم کے "اوٹ پٹانگ تجربے" کر رہے ہیں۔ وہ گوبھی کے پھول کو کوٹ کے کالر میں لگانے کی تعریف میں آتے ہیں۔ ادب

اس مقام کے حصول کی اس افراتفری میں بجائے تخلیقی ادیب پستے جا رہے ہیں۔ وہ صرف اپنے سکونِ قلب کے لئے شعر کہتے اور افسانہ لکھتے ہیں۔

ایک مصنف کے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی تصنیف کو شائع بھی کرے۔ اور اردو میں تصنیف کی اشاعت اب ایک مشکل مسئلہ بنتی جا رہی ہے۔ لہٰذا اکثر مصنفین بیٹھے بٹھائے "ناشر" میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ایک ناشر نے مجھے بتایا تھا کہ کرشن چندر جیسے ادیب کی کسی کتاب کے ہزار نسخے چھاپے جائیں تو ان سارے نسخوں کی نکاسی کے لئے کم از کم تین سال درکار ہوتے ہیں۔ ایسے میں بھلا دوسرے ادیبوں کو کون گھاس ڈالے گا۔ ناشرین یہ سمجھتے ہیں کہ اردو کے کسی ادیب کی کتاب چھاپنے سے بہتر یہی ہے کہ وہ کیلنڈر یا ڈائریاں چھاپیں۔ اگر سنجیدگی سے سروے کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ اردو کے ۸۰ فی صد مصنفین اپنی کتابیں خود اپنے صرفے سے چھاپتے ہیں اور "خودکشی" کے مرتکب ہوتے ہیں۔ میں اردو کے ایک مقبول افسانہ نگار سے واقف ہوں جنہوں نے آج سے دس بارہ سال پہلے محض "ادب کی خدمت" کے جذبے کے تحت ایک ساہوکار سے تین ہزار روپے قرض لے کر اپنے افسانوں کا مجموعہ چھاپا تھا۔ رسالوں میں تو خیر اس مجموعے کی بڑی تعریف چھپی۔ لیکن آج تک کہیں یہ خبر نہیں چھپی کہ افسانہ نگار موصوف اب تک اپنے کئے کی سزا بھگت رہے ہیں۔ اور ساہوکار کو نہ صرف سود ادا کر رہے ہیں۔ بلکہ اس مجموعے کی اشاعت کے بعد وہ اور بھی نئے ساہوکاروں کے مقروض ہو گئے ہیں۔ ورنہ افسانوں کے مجموعہ کی اشاعت سے قبل وہ اچھی خاصی پُرسکون زندگی گزار رہے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب اُن کے افسانوں کا مجموعہ نیا نیا چھپ کر اُن کے گھر آیا تھا تو اُن کا گھر اس مجموعے کے نسخوں سے بھر گیا تھا۔ الماریوں میں نسخے تو خیر رکھے ہی جاتے ہیں لیکن اُن کے ہاں تو پلنگوں اور برتنوں میں بھی افسانوں کے اس مجموعے کے نسخے رکھے گئے تھے۔ سارے گھر میں "ریفریجریٹر" ہی ایک ایسی چیز تھی جس میں کتابوں کے نسخے موجود نہیں تھے۔ اس واقعہ کو دس سال بیت گئے مگر آج بھی اُن کے بچے ان نسخوں کو قطار کی شکل میں رکھ کر انہیں اسٹول یا کرسی کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ دیوار پر کسی اونچی جگہ کیل ٹھونکنی ہو تو بچے ان نسخوں کی "سیڑھی" بنا لیتے ہیں۔ حالانکہ ان دس برسوں میں افسانہ نگار موصوف نے اپنے مجموعہ کے سینکڑوں "اعزازی نسخے" مختلف ادیبوں، ایڈیٹروں، اور شاعروں کو بھیجے ہیں۔

آپ ہی بتائیے ایسے میں کس کی شامت آئی ہے کہ وہ اپنی تصنیف چھپواتا پھرے۔ اردو والوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ کتاب خرید کر پڑھنے کو ایک تعزیری جرم سمجھتے ہیں اور حتی الامکان اس جرم کا ارتکاب نہیں کرتے۔ اس ضمن میں اردو مصنفین کی دشواریوں کا اندازہ آپ کو کسی اردو کتاب کے مصنف کے لکھے ہوئے دیباچے اور کتاب کے "انتساب" کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔ "دیباچہ" میں مصنف جس اہتمام و احترام کے ساتھ ان اصحاب کا شکریہ ادا کرتا ہے جو اس کی کتاب کی اشاعت میں ممد و معاون ثابت ہوئے، یہ کسی اور زبان کے مصنف سے ممکن نہیں۔ میرے خیال میں اردو کا مصنف جتنے "شکریئے" ادا کرتا ہے۔ اُتنے "شکریئے" کسی اور زبان کا مصنف ادا نہیں کرتا۔ یوں لگتا ہے جیسے کتاب کی اشاعت کے بعد وہ دُنیا کے ہر فرد کے احسانوں کے بوجھ تلے دب گیا ہے۔ وہ اپنی "انا" کو بیچ کر بس شکریہ ادا کرتا رہ جاتا ہے۔ ناشر کا شکریہ ادا کرنا تو خیر کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اردو کا مصنف کتاب کے جلد ساز کا شکریہ ادا کرنے پر بھی مجبور ہوتا ہے۔ کتابوں کے "انتسابات" میں مصنف کی انا کا سودا صاف دکھائی دیتا ہے۔ ایک کتاب نظر سے گزری تھی جس کا انتساب کچھ اس قسم کا تھا۔

"——— صاحب کے نام جو چمڑے کے کاروبار میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے، جن کی دکان فلاں بازار میں ہے اور ٹیلیفون نمبر فلاں ہے، ایک بار آپ اُن کی دکان سے مال خریدیں تو پھر آپ کسی اور دکان کا رُخ نہیں کریں گے۔ — اور یہ کتاب اُنہی کی ادب دوستی، سخن فہمی اور ادبا، پروری کے نتیجہ میں شائع ہو رہی ہے۔"

اس انتساب کے پیچھے اردو مصنف کی ساری بے بسی اور مجبوریوں کی داستان چھپی ہوئی ہے۔ ورنہ کہاں چمڑے کا کاروبار اور کہاں شعر و شاعری۔ اردو کتابوں کے "دیباچوں" سے اردو مصنف کا جو تصور ابھرتا ہے۔ وہ ایک لاچار، بے بس، مظلوم اور کمترین انسان کا تصور ہوتا ہے۔

جن ادیبوں کے پاس تھوڑی سی انا ہوتی ہے۔ وہ اپنی غیر مطبوعہ تخلیقات کا انبار اپنے گھروں میں لگاتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ادب اُن کے سارے گھر پر قابض ہو جاتا ہے۔ میں ایک شاعر سے واقف ہوں جو گزشتہ چالیس برسوں سے باقاعدہ شعر کہتے چلے آرہے ہیں۔ ہزاروں غزلیں انہوں نے کہیں، مگر کبھی کتابی صورت میں اُن کی اشاعت کی نوبت نہ آئی۔ ان کا کلام کئی صندوقوں اور ڈبوں میں بند پڑا رہا۔ پھر قدرت کو نہ جانے کیا غصہ آیا کہ ایک رات شہر میں موسلا دھار بارش ہوئی اور اس نالے میں طغیانی آگئی جو شاعر موصوف کے گھر کے سامنے بہتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پانی اُن کے گھر میں داخل ہو گیا۔

اور اپنے ساتھ ان کے سارے غیر مطبوعہ کلام کو بھی بہا لے گیا۔ دوسرے دن یہ ملے تو بڑے اُداس اُداس سے تھے میں نے اُداسی کی وجہ پوچھی تو بولے "اب تمہیں اپنے دکھ کا حال کیا بتاؤں۔ ؟ کل رات نالے میں جو طغیانی آئی تو میرا وہ سارا غیر مطبوعہ کلام بھی نالے میں بہہ گیا جو میں نے چھوٹے صندوقوں میں بند کر رکھا تھا۔ میری تو ساری کائنات ہی لُٹ گئی۔ اب میرے پاس بچا ہی کیا ہے؟"

اس پر میں نے انہیں دلاسہ دیتے ہوئے کہا "بھائی صاحب! اس میں قصور تو آپ ہی کا ہے۔ اگر آپ پہلے ہی اپنے کلام کو نالے میں پھینک آتے تو نالے کو آپ کے کلام تک پہنچنے اور اسے اپنے ساتھ بہا لے جانے کی ضرورت پیش نہ آتی اور دوسرے لوگوں کے گھر بھی نہ اجڑتے!"

یہ تو ہوئیں کتابوں کی اشاعت کی دشواریاں۔ دوسری طرف اُردو کے مصنفین "قاری" کی عدم موجودگی سے پریشان ہیں۔ میرے خیال میں اب خالص ادب کے مصنفین ہی آپس کے "قاری" بھی ہیں یعنی اب ایک مصنف دوسرے مصنف کا قاری ہے۔ مصنفین ایک دوسرے کی چیزیں پڑھ کر خوش ہو لیتے ہیں۔ اُردو کے قاری کی گمشدگی کے بارے میں جب بھی غور کرتا ہوں تو مجھے اس کی حالت اس سر پھری اولاد کی سی معلوم ہوتی ہے جو والدین کے بیجا ظلم وستم اور زیادتیوں سے تنگ آکر گھر سے بھاگ گئی ہو۔ ۱۹۶۰ء کے بعد ادب میں اچانک نئے تجربوں کی جو بھرمار شروع ہوئی وہ "اولاد" پر والدین کے ظلم وستم کا درجہ رکھتی تھی۔ "اولاد" اس ظلم وستم کو کچھ عرصہ تک تو بڑے صبر وضبط کے ساتھ برداشت کرتی رہی — اُردو قاری کے صبر وضبط کا یہ عرصہ ۱۹۶۰ء سے شاید ۱۹۶۵ء تک رہا ہوگا۔ اس کے بعد قاری نے رفتہ رفتہ کھسکنا شروع کیا اور اب یہ حال ہے کہ قاری تلاش کے بعد بھی نہیں ملتا — مجھے ایک مشاعرہ میں شرکت کا موقع ملا تھا اس میں شاعر تو کوئی تیس چالیس تھے مگر سامعین پانچ سے زیادہ نہیں تھے (بشمول میرے) یہ بات عجیب سی لگ رہی تھی کہ تیس چالیس شعراء تو ڈائس پر بیٹھے رہیں اور صرف پانچ سامعین ہال میں بیٹھے رہیں۔ کسی منچلے نے یہ تجویز پیش کی کہ ہال کی خالی کرسیوں کو پُر کرنے کے لئے شاعر حضرات نیچے بیٹھ جائیں اور سامعین ڈائس پر پہنچ جائیں چنانچہ یہی ہوا۔ اور ایک ایک شاعر باری باری سے مائک پر پہنچ کر اُن پانچ سامعین کو کلام سُناتا رہا۔

اگر قارئین اور سامعین کی قلت کا یہی حال رہا تو ایک دن وہ بھی آئے گا جب سامعین کو باضابطہ معاوضہ دے کر مشاعروں میں بلانا پڑے گا اور پھر مشاعرہ کے بعد شاعر حضرات ان کے آٹو گراف بھی لیا کریں گے۔

اصل میں اُردو کا پرانا قاری اب دوسری زبانوں کی طرف متوجہ ہونے لگا ہے۔ آج کا مصنف جو کچھ بھی لکھتا ہے اس کی حیثیت اندھیرے میں تیر چلانے کے برابر ہوتی ہے۔ اُسے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس کا تیر کسی قاری کو گھائل کر بھی رہا ہے یا نہیں؟

مصنف اپنی تخلیق رسالوں میں چھپوا تا تو ہے مگر اُسے یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کسی نے اُسے پڑھنے کی غلطی کی بھی یا نہیں؟ اس صورتِ حال نے بالخصوص اُردو کے مصنفین میں ایک بے بسی اور بے حسی کی سی کیفیت طاری کر دی ہے۔ قاری نہ ہوں تو مصنف کے اطراف GLAMOUR کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ GLAMOUR پیدا نہ ہو تو مصنف میں لکھنے کی URGE کیسے پیدا ہو سکتی ہے۔ میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ میرے مضامین کو اُردو کے مقابلہ میں ہندی کے قارئین نے زیادہ پسند کیا ہے اور انہوں نے زیادہ خطوط لکھے۔ اب ہم کسی اُردو مصنف کے سامنے اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں، تو وہ استہزائیہ انداز میں اپنے ردِ عمل کو یوں پیش کرتا ہے "بھئی ہندی کے قارئین ان مضامین کو پسند نہ کریں تو اور کون کرے گا۔ اُن کے پاس اچھا ادب ہے ہی کہاں؟"

اس تجزیے میں ایک خوفناک قسم کے (SECLUSION) کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ جب تک اُردو مصنفین اپنے آپ کا تجزیہ نہیں کریں گے اور گمشدہ قاری کو پھر سے دریافت کرنے کی کوشش نہ کریں گے تب تک اُن کے مسائل یونہی اُلجھتے رہیں گے۔ اُن کی بے بسی اور بے حسی اور بھی بڑھتی جائے گی۔ اور قدم قدم پر اُن کی انا کا "سودا" ہوتا رہے گا۔



ضیا فتح آبادی

جے ۵/۲۱ راجوری گارڈن،
نئی دہلی ۱۱۰۰۲۷

مصنف کے مسائل پر غور کرنے سے پیشتر یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ یہاں مصنف سے مراد وہ فنکار ہے جو اپنی ذہنی وشعوری استعداد کی زائیدہ شعری یا نثری تخلیق کو کتابی صورت میں پیش کرتا ہے۔

۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۷ء تک کے زمانے کو اُردو زبان کا سنہری دور کہا جاسکتا ہے۔ اسی زمانے میں وہ ریڈیو میں سکۂ رائج بنی۔ اُس کی ترویج و ترقی کے لئے بے شمار ادبی اور اشاعتی ادارے قائم کئے گئے۔ سینکڑوں رسائل و جرائد جاری ہوئے اور مختلف موضوعات پر کتابیں تصنیف پاکر ہزاروں کی تعداد میں اشاعت پذیر ہوئیں۔ اُردو مصنفین نے فیصلہ کیا کہ زندہ رہنے کے لئے اُن کو اپنے فن کی قیمت وصول کرنی ہوگی۔ اس فیصلے کے تحت ایک خاص گروپ نے اپنی تخلیقات اشاعت کے لئے مفت تقسیم کرنے سے انکار کر دیا۔ تصنیف و تالیف کے کام نے پیشے کی صورت اختیار کرلی اور فنی و تنقیدی شعور بیدار ہوا۔ حیدرآباد دکن اور پنجاب میں وہ کارہائے نمایاں سرانجام پائے جنہیں بھلایا نہیں جاسکتا۔ نتیجتاً اُردو پڑھنے اور لکھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہی نہیں ہوا بلکہ اُردو ادب میں تازہ خون کے دخول نے اسے اتنی توانائی بخش دی کہ وہ دوسری عالمی زبانوں کا مقابلہ کرسکے۔ لیکن یہ سب کچھ تقسیم اور حصول آزادی سے قبل کا واقعہ ہے۔ زمانہ مابعد میں اُردو اپنے ہی گھر میں اجنبی بن گئی۔ گو تصنیف و تالیف کا کام جاری رہا مگر اُردو پڑھنے اور لکھنے والوں کی تعداد بتدریج کم ہوتی چلی گئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اب اُسے ایک اقلیتی طبقے کی زبان کے طور پر محفوظ رکھنے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔

مصنف کا سب سے بڑا مسئلہ اُس کا حلقۂ قارئین ہے۔ قارئین کا حلقہ جتنا وسیع ہوگا کتابوں کی مانگ اتنی ہی زیادہ ہوگی۔ اور جب کتابوں کی مانگ زیادہ ہوگی تو نہ صرف کتابیں زیادہ چھپیں گی، بلکہ کتابیں چھاپنے والے بھی پیدا ہوں گے اور جب کتابوں کی مانگ بڑھے گی تو مصنفین کی قدر و قیمت میں بھی اضافہ ہوگا۔ بدقسمتی سے اُردو ادب کی حالت اس وقت اس کے برعکس ہے۔ جہاں اس کی توام بہن ہندی ہر دلعزیز اور مقبول ہو رہی ہے۔ وہاں اُردو کے ساتھ سوتیلوں جیسا سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں مصنف عمل تصنیف سے بہرہ ور ہو تو ہوسکتا ہے مگر وہ اس کو ذریعۂ معاش نہیں بنا سکتا۔

جب کتابوں کی کھپت کم ہوتی ہے تو اشاعتی ادارے خود بخود کم ہوجاتے ہیں کیونکہ اشاعتی ادارے خسارے پر چل کر محض خدمت ادب کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتے۔ اور اگر وہ منافع نہیں کماتے تو مصنف کو کیا دے سکتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اُردو کے جو گنے چنے اشاعتی ادارے ہیں وہ بیشتر اُن مصنفین کی کتابیں چھاپتے ہیں جن کا نام چلتا ہے اور ایسے مصنفین یقیناً فائدے میں رہتے ہیں مگر افسوس اس بات کا ہے کہ اُردو ادب میں اس قسم کی اجارہ داری اس کی مقبولیت اور ترقی میں رکاوٹیں پیدا کرتی ہے۔

زیادہ تعداد اُردو مصنفین کی ایسی ہے جو شکم پُری کے لئے غیر ادبی اور اُردو سے غیر متعلق کام کرتے ہیں مگر اُردو علم و ادب سے انہیں والہانہ عشق ہے اور وہ اپنے اوقاتِ فرصت خدمتِ اُردو میں صرف کرکے تسکین ذات کرتے ہیں۔ اُن کی خدمات و تخلیقات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور اُن سے اُردو کے کاز کو تقویت بھی ملتی ہے مگر وہ جب کوئی تصنیف مکمل کرلیتے ہیں تو ان کے سامنے جو سوال ایک پہاڑ بن کر کھڑا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس طباعت و اشاعت کی صورت کیونکر پیدا ہو۔ یہ ایسا پہاڑ ہے جس کا کاٹنا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ بغیر کسی سفارش یا ذاتی رسوخ کے کتاب کا مسودہ کسی اشاعتی ادارے کو بھیجنا سعی لاحاصل ہے۔ چنانچہ یا تو وہ کتاب مسودے ہی کی صورت میں پڑی رہ جاتی ہے یا پھر چھپتی ہے تو مصنف کے اپنے پیسوں سے جو وہ اپنا اور اپنے متعلقین کا پیٹ کاٹ کر جمع کرتا ہے۔ میرے علم میں ایک ایسا شاعر ہے جس نے اپنا پہلا دیوان شائع کرنے کے لئے ذاتی مکان تک فروخت کردیا تھا۔ جو کتابیں اس طریقے سے طبع ہوتی ہیں اُن کی نکاسی اور فروخت کا مسئلہ مصنف کے لئے دردِ سر بن جاتا ہے۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ ایسی کتابیں زیادہ تر مفت تقسیم کرنی پڑتی ہیں اور باقی کتابیں یا تو گھر کی الماریوں کی زینت بن جاتی ہیں۔ مصنف کا بیشتر وقت تو اپنے غیر ادبی مستقل کام میں صرف ہوتا ہے۔ باقی ماندہ وقت میں وہ اتنا بھی نہیں کرسکتا کہ جو چند خود شائع کردہ کتابیں وہ کسی طرح کتب فروشوں تک پہنچا چکا ہے اُن سے معلوم کرے کہ کتنی کتابیں فروخت ہوگئیں۔ یہ کتب فروش زیادہ کمیشن پر ایسی کتابیں اپنے یہاں رکھتے ہیں اور فروخت کے بعد اُن کی قیمت بعد وضع کمیشن اگر مصنف کو مل جائے تو اُسے اپنی خوش قسمتی پر ناز کرنا چاہئے۔ ورنہ ان کتب فروشوں سے روپیہ وصول کرنا کارِ محال ہے۔ اشاعتی اداروں کا سلوک بھی عام مصنفین کے ساتھ اُن کتب فروشوں سے جدا نہیں۔ چنانچہ اگر کسی مصنف کی تصنیف کسی ایسے ادارے سے شائع ہوتی ہے تو اُس کو حق تصنیف کا صلہ بہت معمولی ملتا ہے یا ملتا ہی نہیں۔ بعض اوقات تو اشاعتی اداروں سے چھپنے والی کتابوں کا بارِ اشاعت خود مصنف برداشت کرتا ہے اور گو کہ یہ ادارے اپنی ایجنسیوں اور اشتہارات کے ذریعے اُن کی کافی جلدیں فروخت کرلیتے ہیں تاہم جو معاوضہ مصنف کو ملتا ہے

وہ اخراجات سے بہت کم ہوتا ہے۔

کچھ ادارے حکومت نے بھی قائم کر رکھے ہیں مگر ان سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کا حال بھی مختلف نہیں۔ یہاں بھی مصنف کا نام، اثر و رسوخ کارگر ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ حکومت نے ضرورت مند مصنفین کو تصانیف کی طباعت وغیرہ کے لیے نقد بھی مہیا کیا ہے مگر اوّل تو ایسے مصنفین کی تعداد بہت کم ہے اور دوسرے کتاب چھپنے کے بعد کے جو مسائل اوپر بیان کیے گئے ہیں ان کا حل یہ بھی تلاش نہیں کر سکے۔

تو پھر اردو مصنف کے عام مسائل خوشی اس بات کی ہے کہ ہزار ہا مشکلات کے باوجود عمل تخلیق و تصنیف جاری ہے اور یہی چیز آگے چل کر اردو کے احیاء و بقا کی ضامن بن سکتی ہے۔ اردو ایک زندہ زبان ہے۔ اور یہ مسائل اس کی زندگی کا ثبوت۔



ستیش بترا

ای-۹، گریٹر کیلاش انکلیو نمبر ۱
نئی دہلی ۱۱۰۰۴۸

جہاں ہندوستانی مصنف کی یہ خوش قسمتی ہے کہ ابھی تک اس کی سوچ اور فکر پر پہرے نہیں بٹھائے گئے، وہاں اس کا یہ المیہ ہے کہ وہ آج بھی محض اپنی تصانیف کے سہارے گزر بسر نہیں کر سکتا۔ اقتصادی طور پر اس کی حالت نہایت قابل رحم ہے۔ بیشتر رسالے، اخبار اور ادارے اس کی کاوشوں کا معمولی معاوضہ بھی نہیں دیتے اور جو معاوضہ اسے ملتا ہے اس سے اس کے کاغذ، قلم اور ڈاک وغیرہ کا خرچ بھی مشکل ہی سے پورا ہو سکتا ہے۔ کسی مصنف کا محض اپنی تصانیف کے سہارے زندہ رہنا قریب قریب ناممکن ہے۔ اگر اس حالت میں اسے روزی کے لیے کسی اور شعبہ کا سہارا لینا پڑے تو ہم اس سے اپنی تصانیف کے ساتھ پورا انصاف کرنے کا تقاضا کیونکر کر سکتے ہیں! نہ اس کے پاس تجزیہ اور تحقیق کے لیے وقت ہے اور نہ ہی وہ گھوم پھر کر زندگی کی وسیع کتاب کا بخوبی مطالعہ کر سکتا ہے۔ اس کی نظر کا محدود ہونا لازمی ہے۔ ایسے میں اس کی تخلیقات پر گھٹن اور تنگ نظری کی چھاپ رہے گی۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ شروع میں جوش اور ولولوں کے سہارے قربانی دیتا ہے لیکن پھر جلد ہی وہ ان تعبیوں میں کھو کر جو کہ اس کا پیٹ پالتے ہیں، ادب سے کنارہ کش ہو جاتا ہے اور اس طرح سے سماج ایسے لوگوں کی صلاحیتوں سے محروم رہ جاتا ہے۔ اور پھر اس سماج میں جہاں مالی حالت ہی کسی فرد کا سماجی رتبہ متعین کرتی ہے، کیا کسی قلاش لیکن قابل قدر مصنف کا کوئی سماجی رتبہ ہو سکتا ہے؟ اس کے لیے ایک کلرک، وکیل، حکیم، ڈاکٹر یا کوئی اور پیشہ کر لینا قریب قریب لازمی ہو جاتا ہے۔ اگرچہ ایک مصنف کا محض مصنف ہونا ہندوستان میں ناقابل تصور ہے تاہم یہ کسی سماج کے لیے بھی باعث ننگ و ذلت ہے کہ وہ اپنے ادیبوں اور دانشوروں کو ان کے صحیح رتبے سے نہ پہچانے۔

یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ حال ہی میں مصنفین کے لیے سرکاری اعزاز، امداد اور انعامات کی کچھ راہیں کھلی ہیں لیکن یہ آٹے میں نمک برابر ہیں۔ کیونکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب جنتا کے بنیادی مسئلے حل نہیں ہو سکے تو مصنفین کے اس چھوٹے سے طبقے کے لیے اور کیا بھی کیا جا سکتا ہے۔ ہر ملک میں دانشوروں اور ادیبوں کی تعداد ہمیشہ کم رہتی ہے۔ لیکن یہی وہ لوگ ہیں جو اپنی تحریروں سے وقت کے دھارے موڑ سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے اس اہم طبقہ کی زیادہ سے زیادہ حوصلہ افزائی لازم ہے۔ مصنف یہ نہیں چاہتا کہ اسے ہمیشہ اعزاز اور انعامات سے ہی نوازا جائے بلکہ تقاضا اس بات کا ہے کہ حالات اس قدر سازگار بنائے جائیں کہ اس کے اقتصادی مسائل اس کی راہ میں حائل نہ ہوں اور وہ خود اپنے تئیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے۔ بالکل اسی طرح جیسے بیکاری کا مسئلہ عطیہ یا بھتہ دینے سے نہیں بلکہ روزگار کے زیادہ سے زیادہ وسیلے پیدا کر کے حل کیا جا سکتا ہے۔

ایک مصنف کو اقتصادی طور پر آزاد کرانے کے لیے ضروری ہے کہ مصنف کی زبان کو ملک کی دوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ یکساں طور پر فروغ حاصل ہو۔ نہ کہ اس پر پابندی اور پہرے بٹھا دیے جائیں۔ یہ حکومت اور سماج کا فرض ہے کہ ہر زبان کو پنپنے کا یکساں موقعہ ملے۔ اگر زبان زندہ ہے تو مصنف بھی زندہ رہنے کی آرزو کر سکتا ہے۔

ہر زبان کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ زبان جاننے والے موجود ہوں اور ان کی تعداد بڑھتی رہے۔ ان کے لیے تعلیم و تصنیف کی سہولتیں میسر ہوں۔ کاغذ، چھپائی کا معقول انتظام ہو۔ کتابوں کے چھپنے اور بکنے کے ذرائع ہوں تاکہ کتابیں کثیر تعداد میں چھپیں۔

(بقیہ صفحہ ۴۱ پر)

مدیر کے مسائل

اعجاز صدیقی
عابد سہیل
یوسف ٹیننگ
مالک رام
احمد سعید ملیح آبادی



اعجاز صدیقی
مدیر "شاعر" قصر الادب پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶
بمبئی

میں ایک علمی و ادبی رسالہ کا مدیر ہوں ۔ میری پوری عمر اسی دشت کی سیاحی میں گذری ہے ۔ یہ میرا خاندانی ورثہ بھی ہے شوق بھی اور پیشہ بھی ۔ میرے چالیس سالہ ادبی تجربات اب وہاں پہنچ چکے ہیں جہاں نہ کوئی مسئلہ نیا معلوم ہوتا ہے اور نہ کوئی تجربہ انوکھا میں نے اتنے تجربات کئے ہیں اور مجھے اتنے زیادہ مسائل سے گذرنا پڑا ہے کہ اگر انہیں بیان کروں تو ایک کتاب بن جائے ۔

یہ حقیقت ہے کہ رسائل کے مسائل ان کے اپنے دور سے وابستہ ہوتے ہیں۔ دور بدلتا ہے تو مسائل کی شکلیں بھی بدل جاتی ہیں ۔ میں نے وہ دور بھی دیکھا ہے جب ادبی رسالے بہت ہی کم تھے اور غیر منقسم ہندوستان میں پڑھنے والوں کی تعداد زیادہ ۔ قلم بھی گنے چنے تھے اور بیشتر ایسے علمائے ادب اور اساتذۂ سخن تھے ، جن کی اہلیت میں شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی ۔ وہ علم و فن پر زبردست عبور رکھتے تھے اور ان کی تخلیقات کو پڑھنے کیلئے اردو والے بے چین رہتے ۔ رسائل کے مدیران کے رشحات قلم آنکھ بند کر کے شائع کر دیا کرتے تھے ۔ نہ مسودہ میں کاٹ چھانٹ کی ضرورت ہوتی تھی اور نہ معیار میں انتخاب کی ۔ نہ ہمارا ادب اتنے خانوں میں بٹا ہوا تھا اور نہ شاعری کے اتنے رنگ و آہنگ تھے ، جتنے آج ہیں ۔ قاری کو نہ طویل غزل پر اعتراض ہوتا تھا اور نہ طویل نظم پر نہ وہ فنی نکات سے اکتاتا اور کتراتا تھا ، نہ علمی مباحث سے مشکل عربی فارسی الفاظ و تراکیب کو بہ آسانی ہضم کر لیا جاتا تھا ۔ اس وقت اظہار و ابلاغ کا کوئی خاص مسئلہ نہ تھا ۔ رسالہ کے سادہ سے سرورق اور اوسط درجہ کی کتابت و طباعت سے قاری کو مطمئن کیا جا سکتا تھا ۔ ترتیب مضامین میں کسی تنوع کا احساس تک نہ ہوتا تھا ۔ قاری صرف اپنی بلند ادبی شخصیتوں کی نئی تخلیقات پڑھنے کے لئے بے چین رہتا تھا ۔ اسے نہ مدیر سے شکایت ہوتی تھی اور نہ ادیب و شاعر سے وہ کوئی گلہ کرتا تھا ۔ پس ادبی رسائل کا مطالعہ جزو زندگی تھا اور ممتاز اہل قلم کا احترام لازمۂ ادب ۔ دوسری جنگ عظیم تک ادبی رسائل سے قاری کا رشتہ بڑا گہرا اور مستحکم تھا ۔ عید نمبروں "دیوالی نمبروں" "محرم نمبروں" اور دوسرے خاص نمبروں کی کاپیاں ان بڑے شہروں میں جہاں سے یہ رسالے نکلتے تھے ، مقامی طور پر ہزار بارہ سو فروخت ہو جایا کرتی تھیں ۔ آج کئی شہروں میں مل کر بھی اتنی فروخت نہیں ہو پاتیں ۔

اس دور میں "شاعر" "ادبی دنیا" اور "ساقی" نے نئے لکھنے والوں کو تلاش کیا ۔ اس آنے والی ادبی نسل کے بیشتر لوگ مغربی تعلیم پانے کے باوجود بنیادی طور پر مشرقی علوم سے جڑے ہوئے تھے ۔ یہ جہاں مغرب سے آنے والی ادبی ہواؤں سے اپنی سانسوں کو سنوار رہے تھے ، وہیں مشرقی مزاج سے بھی آشنا تھے ۔ انھوں نے ادب و شعر کو ایک خوشگوار موڑ دیا اور مدیران رسائل نے انہیں اپنے یہاں جگہ دینے میں افتخار محسوس کیا ۔ قارئین نے بھی ان میں گہری دلچسپی لی ۔ اسلئے کہ ادیبوں اور شاعروں کا وہ قافلہ ... دم قافلہ زبان و ادب کے تعمیری پہلوؤں کو سامنے رکھ کر آگے بڑھ رہا تھا ۔ اس نے علم و فن سے روگردانی نہیں کی تھی ۔ زبان کو نقصان نہیں پہنچایا تھا ۔ بلکہ نئے موضوعات و اسالیب پیدا کر کے ادب و شعر کو زندگی سے اور زیادہ قریب کیا تھا ۔ اس دور کے بعد وہ دور آیا جب رسائل کی بہتات ، لکھنے والوں کی کثرت اور پڑھنے والوں کی سخت قلت ہو گئی ۔ ادب میں بے ادبی آگئی اور فکر و فن میں انتشار پیدا ہو گیا ۔

آج کے ادبی رسائل کے لئے مندرجہ ذیل باتیں اہم مسئلہ بنی ہوئی ہیں ۔

۱ ۔ ادبی رسائل کا سرکولیشن
۲ ۔ ادبی رسائل کا معیار
۳ ۔ ادبی رسائل کے قاری

اردو کے ادبی رسالے عام طور پر ہزار دو ہزار کی تعداد اشاعت سے آگے نہیں بڑھتے ۔ بعض رسالوں کا سرکولیشن تو اتنا کم ہے کہ اسے ظاہر کرتے ہوئے شرم آتی ہے ۔ تین چار ہزار کی تعداد میں چھپنے والے رسالے مشکل سے ایک دو ہی ہوں گے ۔ سبھی ادبی رسالے پر زور اپیلیں کرتے رہتے ہیں مگر ان کا سرکولیشن نہیں بڑھتا اور نتیجہ

یہ نکال لیا جاتا ہے کہ ادب کے پڑھنے والوں کا قحط ہے۔ مگر یہ پوری سچائی نہیں، البتہ آدمی خود ہی خوردہ ہے۔

ہمارا کوئی رسالہ ایسا نہیں ہے، جسے صحیح معنوں میں ادبی ماہنامہ کہا جا سکے۔ معیار لکھنے والوں سے بنتا ہے۔ چونکہ ادبی رسائل بڑے ادیبوں اور شاعروں کو معاوضہ نہیں دے سکتے، اس لئے وہ تازہ معیاری تخلیقات سے محروم رہتے ہیں۔ کوئی مُدیر اپنے اثر و رسوخ سے ہر شمارہ کے لئے چند بڑے ادیبوں کی تخلیقات حاصل کرلے تو یہ ایک الگ بات ہے۔ پھر بھی اُسے رسالہ کا پیٹ بھرنے کے لئے بڑی تعداد میں دوسرے اور تیسرے درجہ کی تخلیقات شامل کرنا پڑتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ معیار میں یکسانیت پیدا نہیں ہو پاتی اور عدم یکسانیت اس اُردو قاری کو گراں گذرتی ہے جو کالجوں میں میرؔ، غالبؔ، مومنؔ، حالیؔ، شبلیؔ، سرسید، اقبالؔ، حسرتؔ، سیمابؔ، فانیؔ، جوشؔ، نیاز فتحپوری، پطرس، مجنوں گورکھپوری اور رشید احمد صدیقی وغیرہ کو پڑھ کر آیا ہے۔ ادبی رسالے پڑھنے والوں میں غالب اکثریت ان ہی تعلیم یافتہ لوگوں کی ہے جو پچیس سے چالیس سال تک کی عمر کے ہیں۔

نظم و نثر کی تخلیقات کا انتخاب مُدیر کے لئے ایک زبردست دردِ سر ہے۔ اس کا بیشتر وقت اسی کی نذر ہو جاتا ہے۔ وہ رسالہ کے سلسلے میں اور کچھ سوچ ہی نہیں سکتا۔ معتبر اہلِ قلم کی تخلیقات کے علاوہ اُسے جو مواد موصول ہوتا ہے وہ نوّے فیصد غیر معیاری ہوتا ہے۔ سو افسانوں میں سے دس، دو تین سو نظموں غزلوں میں سے پچیس تیس اور چالیس پچاس مضامین میں سے سات آٹھ معیاری ہوں تو اندازہ لگایئے کہ مُدیر کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ ایک اوسط درجہ افسانے اور مضمون کو پڑھنے میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ صرف ہوتا ہے۔ بڑی تعداد میں آئی ہوئی تخلیقات کو پڑھنا، غیر معیاری تخلیقات کو واپس کرنا اور لکھنے والوں کی برہمی کو برداشت کرتے ہوئے، انہیں مطمئن کرنا ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا کوئی حل نہیں۔ آج چونکہ قلم کاری عام ہے اور کچّی تحریروں کی اشاعت کی آرزو تیز، اس لئے رسالے اور قلم کار کے مابین کوئی مفاہمتی رشتہ قائم نہیں ہوتا، ایک کش مکش سے دونوں کو گذرنا پڑتا ہے۔ پہلے ایسا نہیں ہوتا تھا۔ ادیب و شاعر اپنی وہی تخلیقات اشاعت کے لئے بھیجتے تھے جو معیارِ ادب پر پوری اُتر سکیں۔ ہر ادیب و شاعر اپنی ذمہ داری محسوس کرتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کیا "چھپنے" کے قابل ہے اور کیا "چھپانے" کے لائق۔

اِسی سلسلے کا ایک اور مسئلہ چلتی پھرتی تخلیقات اور مطبوعہ مضامین نثر و نظم کا ہے۔ بعض تخلیقات ایک رسالہ کے دفتر سے کئی رسالوں کے دفاتر تک گھومتی رہتی ہیں۔ بعض تخلیقات کے متعلق جب یہ علم ہوتا ہے کہ وہ مطبوعہ تھیں اور اُن کے شائع ہونے کے بعد قارئین کی شکایتوں کے جو دفتر کھلتے ہیں، ان سے اور بھی افسوس ہوتا ہے۔

مُدیر کے مسائل میں ایک بڑا مسئلہ کتابت کا بھی ہے۔ تعلیم یافتہ اور اصولِ کتابت سے اچھی طرح واقف کاتب مشکل ہی سے ملتے ہیں۔ اگر خوش قسمتی سے مل جائیں تو اُن کی ناز برداری آسان نہیں۔ عموماً کتابت کی ایسی بھیانک اور اتنی زیادہ غلطیاں ہوتی ہیں کہ انہیں بنوانے بنوانے جان پر بن جاتی ہے۔ مگر غلطیاں پھر بھی رہ جاتی ہیں: "ڈیش کی جگہ "کاما" اور "کاما" کی جگہ "ڈیش"۔ غلط جوڑ، بڑے چھوٹے دوائر، مرکب اور منفرد الفاظ کا خلافِ قاعدہ لکھا جانا۔ نوک پلک کا پیدا نہ ہونا تو عام بات ہے۔ بعض قلم کاروں کے مسودات بھی اتنے شکستہ لکھے ہوئے ہوتے ہیں کہ کاتب تو کاتب خود مُدیر کو پڑھنا دشوار ہوتا ہے۔ دوسری زبانوں میں ٹائپ کا رواج ہے اور اکثر قلم کار ٹائپ شدہ مسودے بھیجتے ہیں۔ پہلے پریسوں میں کام کم تھا۔ ہر پریس میں ایک "مصلحِ سنگ" ہوتا تھا جو پتھر بنانے اور معکوس لکھنے میں ماہر ہوتا تھا۔ اب پریسوں میں کام کی بھرمار ہوتی ہے۔ رسائل تو کیا کتابوں تک کے پروف نہیں ملتے۔ غلطیاں دُور ہوں تو کیسے؟

ادبی رسائل کے قارئین میں بڑی تعداد خود ادیبوں اور شاعروں کی ہوتی ہے۔ اِن میں سے بیشتر کو اعزازی طور پر رسالہ بھیجا جاتا ہے اور وہ اس کے مستحق بھی ہیں۔ مستقل قلمی معاونین کو معاوضہ نہ دیا جا سکے تو کم از کم رسالہ تو پہنچنا چاہیئے۔ بعض قلم کار اتنے دردمند ہوتے ہیں کہ وہ زرِ سالانہ بھی ادا کرتے ہیں اور اپنی تخلیقات بھی بھیجتے ہیں۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جو مانگ کر رسالہ پڑھتا ہے اور تیسرا طبقہ ہماری درس گاہوں کے طلبہ اور اساتذہ کا ہے مگر ان کی تعداد بھی زیادہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ اُردو تعلیم کم سے کم ہوتی جا رہی ہے۔ اُردو مادری زبان والے طلبہ کالجوں میں ٹیکنیکل مضامین لے لیتے ہیں، اس لئے انہیں ادب سے وہ دلچسپی نہیں ہو سکتی جو ہونی چاہیئے۔ وہ فلمی گیتوں اور فلمی رسالوں سے وقتی طور پر دل بہلا لیتے ہیں۔ رہا اُردو عوام میں ادبی رسائل کی مقبولیت کا سوال تو اس پر آج تک کسی نے سوچنے کی زحمت ہی نہیں کی۔ ادبی رسالے ہیئت و مواد میں اتنے یکساں ہوتے ہیں کہ اگر ایک کا سرورق دوسرے پر لگا دیا جائے تو فرق کرنا مشکل ہو جائے۔ ادبی رسائل کی ناکامی اور سکڑتے ہوئے حلقۂ قارئین میں ان محدود نظریات و وسائل کو بھی دخل ہے، جن میں ہمارے رسالے جکڑے ہوئے ہیں۔ سچائی یہ ہے کہ ادبی رسائل وقت کے تقاضوں کو پُورا کرنے میں سخت ناکام ہیں۔ اُردو میں وہ ادب پیدا نہیں ہو رہا ہے جو دوسری زبانیں پیدا کر رہی ہیں۔ اس میں موضوعاتی تنوّع کا سخت فقدان ہے۔ یہ مسئلہ مدیرانِ رسائل اور قلم کار، دونوں کے سوچنے کا ہے۔

عابد سہیل

ماہنامہ "کتاب" کپور مارکیٹ، لکھنؤ-۳



اُردو کے ادبی رسائل کو مُدیر نصیب ہی کہاں ہیں؟ کسی بھی ادبی جریدے کو لیجئے آپ کو کوئی ایسا مدیر نہیں ملے گا جو سرکولیشن، کتابت، طباعت، پروف ریڈنگ، سرورق کے ڈیزائن اور حدیہ ہے کہ رسالہ سپردِ ڈاک کیے جانے کے مراحل تک کی ذمہ داریوں سے بے نیاز رہ سکتا ہو۔ ایک ہی شخص کے سر اتنی بہت سی ذمہ داریاں اگر ڈال دی جائیں یا پڑ جائیں تو ظاہر ہے کہ وہ ان میں سے کسی سے بھی پوری طرح عہدہ برآ نہ ہو سکے گا۔

جب صورت حال یہ ہو تو اس بات کا اندازہ لگانا کوئی مشکل بات نہیں کہ یہ نام نہاد مدیر رسالہ کے معیار کو برقرار رکھنے، اسے نئے ادبی رجحانات کا مزاج شناس بنانے، غلط رجحانات کی نشاندہی کرنے اور نئے لکھنے والوں کی مناسب ہمت افزائی کرنے کے لئے واقعی وہ سب کچھ نہ کر پاتے ہوں گے جس کی ان سے توقع کی جاتی ہے۔ اگر کسی رسالہ نے زندگی کی آٹھ دس بہاریں دیکھ چکا ہے اور اسے زیادہ بہتر جرائد کی عدم موجودگی کے سبب اچھی خاصی شہرت مل چکی ہے تو تخلیقات کے لئے بیشتر صورتوں میں کوئی خاص پریشانی نہیں ہوتی۔ ان میں ایک آدھ قدرِ اوّل کی ہوتی ہیں باقی دوسرے اور تیسرے درجے کی اور ان کی آمیزش سے ایک ایسا معجون مرکب تیار ہو جاتا ہے جس میں کچھ پرانے اور مشہور نام ہوتے ہیں کچھ نئے لیکن مشہور، کچھ بالکل نئے۔ کچھ تجربہ، کچھ تجربہ کے نام پر نقلیں۔ کچھ روایات، کچھ کھوٹا کچھ کھرا۔ چلئے اللہ اللہ خیر صلا۔ تازہ شمارہ تیار ہو گیا۔

لیکن کیا کسی ادبی جریدے کے مدیر کا کام یہی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح ہر ماہ ایک شمارہ تیار کر دے؟ نئے ادیبوں کی ہمت افزائی اور ان کی کوتاہیوں اور خامیوں پر ہمدردانہ طریقہ سے غور کرنے کی صلاحیت اور پرانے اور مشہور لکھنے والوں کی خراب چیزوں کو واپس کرنے کی جرأت اگر کسی شخص میں نہیں تو وہ ممکن ہے کسی اور شعبہ میں کامیاب ہو جائے لیکن اچھا مدیر ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ہمارے یہاں کے بیشتر ادبی جرائد کچھ اس طرح کے ہیں کہ اگر ٹائٹل، فہرست و اداریہ کے صفحات اور پیشانی جہاں عام طور پر رسالہ کا نام لکھا ہوتا ہے الگ کر دیے جائیں اور انھیں ملا دیا جائے تو ایک رسالہ کو دوسرے سے الگ کرنا مشکل ہو جائے گا۔ کاتب کی شانِ خط سے کوئی پہچان لے تو بات دوسری ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ اس کا سبب یہی ہے کہ ہمارے ادبی جرائد کو مُدیر نصیب ہی نہیں۔

ہمارے ادبی جرائد کو بعض چیزیں ورثہ میں ملی ہیں مثلاً یہ کہ وہ جتنا خشک، خراب کتابت و طباعت اور غیر جمالیاتی سرورق سے مزین ہو اسی قدر معیاری ہے کہ حسن اور نفاست کا، ادبی جرائد کی حد تک، ایک دوسرے سے بیر معلوم ہوتا ہے۔ چھ سات افسانے، دو تین تنقیدی مضامین، پندرہ بیس نظمیں، غزلیں، کچھ تبصرے، کچھ خطوط جن میں مدیر کی تعریف زیادہ ہوتی ہے اور پچھلے شمارہ میں شائع شدہ تخلیقات کے حُسن و قبح سے بحث کم، یہ ہوتی ہے کل کائنات ہمارے ادبی جرائد کی۔ سائنس، نفسیات، فلسفہ، معاشیات، سماجیات اور دوسرے علوم (DISCIPLINE) کو ان جرائد نے اپنے اوپر حرام قرار دے رکھا ہے۔ آرٹ کے نام پر ایک آدھ پینٹنگ کسی ادبی جریدے میں شائع بھی ہو جاتی ہے لیکن عام طور پر صرف اس صورت میں کہ بلاک مفت مل جائے۔ کسی عمدہ فلم پر، چاہے وہ فنی شہپارہ ہی کیوں نہ ہو، تبصرہ۔ توبہ کیجئے۔ ادبی جریدہ نہ ہوا قلم فیر ہو گیا۔ روس سے لے کر امریکا تک کے کسی بھی ادبی جریدہ کو اٹھا لیجئے۔ آرٹ، رقص، موسیقی، سینما پر نہ صرف مضامین اور سیمینار ملیں گے بلکہ درجنوں تصاویر نیک، چھپائی ایسی خوب صورت ہوگی کہ کاؤنٹر پر نظر پڑ جائے تو آپ خریدے بغیر وہاں سے نہ ہٹیں لیکن اُردو کے ادبی رسائل کی دنیا ہی نرالی ہے۔

ہم یہ تو جانتے ہیں کہ وہ طبقہ اشراف ختم ہو گیا جو کبھی کبھی واقعی علم دوستی اور پیشتر کے نام و نمود کے لئے علم و ادب کی سرپرستی کرتا تھا اور نئے معاشی رشتوں اور حقیقتوں نے پڑھے لکھے لوگوں کے ایک بڑے حصے کو اس قابل نہیں رکھا ہے کہ وہ ادب، فلم، علوم اور دوسرے فنون لطیفہ کے الگ الگ رسالے خرید سکیں۔ لیکن ہم نے اس صورت حال کے مضمرات پر اب تک غور نہیں کیا ہے۔

ہم نے مسئلہ کو اس نقطۂ نظر سے بھی نہیں دیکھا ہے کہ نہ صرف مختلف علوم کا تعلق ادب سے روز بروز بڑھتا جا رہا ہے بلکہ مختلف علوم خود بھی ایک دوسرے کو (OVERLAP) کرنے لگے ہیں۔ نفسیات کا مطالعہ سماجیات کے بغیر ممکن نہیں، معاشیات کو خریدار کی نفسیات کے بغیر سمجھا نہیں جا سکتا اور کوئی ادب

نوٹ: یہ بات کم از کم "آج کل" کے لئے نہیں کہی جا سکتی جو ہر شمارے میں ایک خاص موضوع پر خصوصی مضامین شائع کرتا ہے۔ اور اسی طرح سائنس، اقتصادیات، ادب، زبان، کلچر، سیاحت وغیرہ کے موضوع پر مضامین شائع کر چکا ہے۔ (ادارہ)

اپنے وقت کے سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی محرکات سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ ادبی جریدہ کے مدیر کو اتنی سی بات سمجھنے کے لئے روس کو چھوڑیئے امریکا، برطانیہ اور CONTINENT کے پچھلے تین سو برس کے فلسفیانہ افکار، جمالیات، لسانیات، نفسیات کی کم از کم اہم تحریکوں اور تحریروں پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ کارل مارکس، فرائڈ، یونگ، ایڈلر، سارتر، یاسپرس، کامو، وٹگنسٹائن، وجودیت، Picture theory of meaning اور Theory of Verification کا ذکر ادبی مضامین میں کبھی کبھی مانگے کے اُجالے کی طرح ضرور آ جاتا ہے لیکن سچ پوچھئے تو ہمارے یہاں ان سب کو پڑھا کتنوں نے ہے۔ آج کے زمانے میں ان سب تحریکوں اور نقطہ ہائے نظر سے واقفیت نہ ہونے کے باوجود ممکن ہے کوئی شاعر اور ادیب اپنا حق ادا کر دے اور داد تحسین بھی پا لے لیکن ۱۹۷۳ء میں کوئی مدیر ان سے بے بہرہ رہ کر ادارت کے فرائض ایمانداری سے انجام نہیں دے سکتا۔

فرانس نے دیوقامت شاعر پیدا کئے ہیں ہم ان کی تخلیقات کے تراجم بھی برابر شائع کرتے ہیں لیکن کسی ادبی جریدے کو آج تک یہ توفیق نہ ہوئی کہ وہ چند سال قبل فرانس کے ناکام انقلاب کے دوران کی جانے والی ان بے نام شاعروں کی تخلیقات کا ترجمہ پیش کرتا جو پیرس کے مکانوں اور تعلیمی اداروں کی دیواروں پر رات کی تاریکی میں لکھ دی جاتی تھیں۔ کیا اس شاعری کا دنیا کی شعری روایت سے کوئی تعلق نہیں۔ ممکن ہو کہ یہ شاعری ہماری شعری روایت کا حصہ نہ بن سکے لیکن یہ ہماری شعری دنیا کے کسی گوشے کو روشن اور منور تو کر سکتی تھی۔

اب ایک اور مسئلہ کی طرف آیئے۔ مدیر اپنے رسالہ میں کس طرح کی تخلیقات شائع کرے؟ آج شاید ہی کوئی ایسا ہو جو ادب اور زبان کے جامد تصور کو تسلیم کرتا ہو۔ ادب کے معیار بھی بدلتے ہیں۔ ادبی اقدار بھی اور زبان بھی۔ زبان سیاسی حالات، سماجی اور معاشی رشتوں سے بھی متاثر ہوتی ہے اور اپنے اندرونی تضاد سے بھی۔ یہی حال ادب کا بھی ہوتا ہے۔ زبان و ادب کے اس بدلتے ہوئے پس منظر میں کسی تخلیق کے بارے میں فیصلہ کرنا شاید سب سے مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ زبان و ادب کے معیار میں تبدیلی کا تصور شاید معیار کے تصور کے بغیر ممکن نہیں لیکن تجربے جزوی طور پر ہی سہی معیار کو پامال کئے بغیر نہیں کئے جا سکتے۔ اور کونسا تجربہ ایسا ہے جس پر وقت قبولیت کی مہر ثبت کر دیگا اور کسے پامال کر کے آگے گذر جائے گا؟ ظاہر ہے ہر مدیر نہ تو ہر ایسی بجلی کو جس کے جیب و داماں پرانی بجلیوں سے یکسر خالی ہوں یہ کہہ قبول کر سکتا ہے کہ ہم فیصلہ کرنے والے کون ہوتے ہیں، فیصلہ تو وقت کریگا اور نہ ہر تجربہ کو زبان و ادب کے بنے بنائے سانچوں سے ناپ کر رد کر سکتا ہے۔ یہ منزل کسی بھی مدیر کے لئے سب سے کٹھن ہوتی ہے۔ لیکن اگر مدیر کو وقت کی چاپ کا عرفان اور اس بات کی آگہی ہے کہ زبان سے آگے جانے کا راستہ زبان ہی سے ہو کر گذرتا ہے تو شاید وہ اس پل صراط سے آسانی سے گذر جائے۔

ادبی جرائد کے بیشتر مسائل رسالہ کی معاشی حالت سے جڑے ہوتے ہیں۔ اگر کوئی رسالہ ایک باتنخواہ مدیر کے علاوہ کم از کم دو کارکنوں کا بوجھ اٹھا سکے تو ظاہر ہے مدیر متعدد دوسرے متعلقہ کاموں سے بے نیاز ہو کر اپنی ادارتی ذمہ داریاں یکسوئی سے پوری کر سکے گا۔ لیکن ہمارے یہاں حالت یہ ہے کہ بیشتر ادبی جرائد خسارہ کا سودا ہیں اور چند سرپھروں کے شوق فضول سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ ویسے مسئلہ کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اگر یہ رسائل متعلقین رسالہ کا ذریعہ معاش بھی ہوتے تو شاید یہ حالت نہ ہوتی۔

اب دو لطیفے سنیئے:

تقریباً دو سال ادھر ایک صاحب کی شعری تخلیق کتاب میں شائع ہوتی تھی کہ تعریفی خطوط کا تانتا بندھ گیا۔ ان میں دو تین خطوط میں تخلیق کو غلط جگہ دینے کی شکایت کی گئی تھی اور ایک خط میں ٹائیٹل پر شاعر کا نام ہونے کا شکوہ بھی تھا۔ دو ایک دن بعد ایک نئے مقابلتاً معروف شاعر کا خط آیا کہ یہ غزل زیادہ بہتر Treatment کی مستحق تھی۔ کم سے کم اسے نورے صفحہ پر شائع کیا جانا چاہیے تھا۔ یہ خط ملخ "تند تیزیاں" کے صفحات پر اشاعت کے لئے فوراً ہی کاتب کے حوالے کر دیا گیا۔ دوسری ڈاک سے انہی صاحب کا دوسرا خط موصول ہوا "خدارا وہ خط شائع نہ کریں۔ موصوف نے یہ خط اپنے سامنے بیٹھ کر لکھوایا تھا۔ میں انکار نہ کر سکا۔ اگر چھپ گیا تو بڑی سبکی ہوگی۔"

دوسرا واقعہ بالکل حالیہ ہے۔ ایک صاحب نے اپنی چند غزلیں بھیجیں اور اس کے ساتھ یہ بھی پیشکش کی کہ اگر ان کی کوئی شعری یا نثری تخلیق ہر ماہ رسالہ شائع کرنے کے لئے تیار ہو تو وہ ہر مہینہ رسالہ کو تین روپے پیش کیا کریں گے۔

یہ دونوں اور اس طرح کے دوسرے واقعات محض لطیفے نہیں ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس طرح کے واقعات کیوں پیش آتے ہیں؟ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اردو ادب کی دنیا روز بروز سکڑ رہی ہے۔ ادبی جریدے خریدنے والے زیادہ تر یا تو آج کے ادیب ہیں یا کل کے ہونے والے ادیب۔ بساط کے اس اختصار کی ذمہ داری مدیران جرائد پر بھی کچھ کم نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے رسالوں کو ایسا بنا رکھا ہے کہ عام پڑھا لکھا شخص ان میں کوئی دلچسپی نہیں پاتا۔ کیا کوئی ایسی صورت نہیں کہ ادبی رسائل کم از کم پانچ چھ ہزار کی تعداد میں شائع ہوں اور کم سے کم بیس پچیس ہزار لوگوں کی نظروں سے ہر جریدہ گذرے؟

الٰہی یہ بساط رقص اور بھی بسیط ہو   صدائے تیشہ کامراں ہو کوہکن کی جیت ہو

محمد یوسف ٹینگ

مدیر شیرازہ "کلچرل اکاڈمی، شہید گنج
سری نگر

ایک مدیر کی حیثیت سے جب میں اپنے مسائل کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے کسی گرہستن کی یاد آجاتی ہے۔ بھات بھاجی میں ذائقہ ہو اور وہ اچھے بنے ہوں، تو گھر والی کو اس کی داد دینا فضول ہی نہیں بلکہ غیر ضروری سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اگر کہیں سالن میں ذرا بھی مرچ مسالے کی کمی بیشی رہی تو سارے گھر میں مہا بھارت چھڑ جاتی ہے۔ ایک مُدیر کو بھی اپنے معاملات میں اس قسم کے تجربات سے آئے دن گذرنا پڑتا ہے۔

مدیر کے مسائل کے دو موٹے موٹے عنوانات ہیں۔ پہلے عنوان کا تعلق رسالے کے ظاہری رنگ روپ اور شکل و شباہت سے اور دوسرے کا مُدیر اور اُس کے قارئین کے باہمی رشتے سے، جو کبھی رقیبانہ ہوتا ہے اور کبھی حریفانہ۔

مدیر کو نہ صرف اپنے قارئین کو اپنے ذوقِ نظر کے قریب لانے کی سعی کرنا پڑتی ہے بلکہ ان کا مذاق اور جمالیاتی حس خود اسے بھی متاثر کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اخذ و قبول کا یہ سلسلہ اثباتی بھی ہو سکتا ہے۔ اور منفی بھی۔ اور یہ کبھی خطِ مستقیم میں سفر نہیں کرتا۔ میں تجارتی رسالوں کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ لیکن ادبی رسالوں کو لیجئے۔ "مخزن" "نگار" "نقوش" وغیرہ سے لے کر سردار جعفری کے "گفتگو" اور فاروقی کے "شب خون" تک مُدیر کو اسی خاص مسئلے سے دوچار ہونا پڑا ہے۔

"تعمیر" یوں تو ایک سرکاری رسالہ تھا اور اس طرح اس کی تعمیر میں کچھ مجبوریاں مُضمر تھیں۔ لیکن میری ادارتی کد و کاوش نے مجھے جلد ہی یہ بات سمجھا دی کہ ان حدود میں حسبِ ضرورت لچک آسکتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی بہر حال رسالے کی سرکاری حیثیت اور تخلیقی ادب کے کج کلاہانہ مزاج میں تصادم ناگزیر ہے۔ اور مُدیر کی حالت اُس وقت بالکل اس مصرعے کے مانند ہو جاتی تھی۔ ؎ ادھر تقاضے ہیں مصلحت کے، اُدھر تقاضائے دردِ دل ہے

مُدیر کیلئے آزمائش کا موقع وہ ہوتا ہے جب اُس کی ذاتی پسند عام ڈگر سے ہٹ کر نیا راستہ اختیار کرے۔ ہندوستان میں اُردو کی ادبی صحافت کی بدنصیبی یہ ہے کہ اس کا مقابلہ نہایت ارزاں قسم کی تجارتی اور فلمی صحافت سے ہے۔ ہر مُدیر کی یہ بڑی خواہش ہوتی ہے کہ اُس کا رسالہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے اور داد پائے۔ لیکن جب وہ رسالے کو خاص تحقیقی اور ادبی معیاروں پر نکالتا ہے تو اُسے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ رسالہ غیر مقبول بن گیا ہے۔ اور اس کا حلقۂ اشاعت کتنا محدود رہ گیا ہے۔ ظ. انصاری کے "آئینہ" کی مثال سامنے ہے۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ اُردو کا حلقہ بدقسمتی سے سکڑتا جا رہا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اُردو رسالہ خریدنے کے لئے بہت کم لوگ مائل ہوتے ہیں۔ جب مدیر کو معلوم ہو کہ اس کا رسالہ صرف چند مفت خوروں کے پاس جاتا ہے۔ تو وہ رسالے کے تخلیقی کردار سے مایوس ہو کر اس کو محض رسماً جاری رکھتا ہے۔ یہ کیفیت رسالے کے لکھنے والوں تک بھی پہونچ جاتی ہے۔ وہ چند پیسے کمانے کے لئے کالم پُری تو کرتے ہیں لیکن "دل و جان کی میزبانی" کے لئے کسی ایسے رسالے کا دسترخوان چن لیتے ہیں جو بھلے ہی کچھ روپے نہ دے سکے مگر جو واقعی قارئین میں شوق اور ذوق سے پڑھا جاتا ہو۔

مُدیر کے مسئلے کا یہ پہلو بھی کچھ کم افسوسناک نہیں ہے کہ اُس کے پاس آنے والی تخلیقات کا بیشتر حصہ ایسی منظومات پر مشتمل ہوتا ہے، جو نہایت فرسودہ لب و لہجے اور مزاج کی ہوتی ہیں۔ اس قسم کی منظومات کی فراوانی یہ ظاہر کرتی ہے کہ کچھ محترم اور معزز مستثنیات کے بغیر ابھی اُردو میں جاگیردارانہ دور کی ذہنیت بدستور حاوی ہے۔ ہمیں اُردو کے عام قاری اور لکھنے والے کو جواں مردی، بغاوت اور کفر کے کچھ آداب سکھانے ہوں گے۔

اُردو رسالے کے مُدیر کو ملنے والے مضامین کے بارے میں جتنا کم کہا جائے اتنا اچھا ہے۔ عام طور پر مدیر کو مضامین موسم کے مطابق ملتے ہیں یعنی اگر کسی بڑے آدمی کا انتقال ہو گیا، تو اس کے کھانے پینے، معاشقوں اور اُس کے کارناموں پر ہر ایک پہلو کے بارے میں مضامین ملنا شروع ہو جائیں گے۔ جن میں کسی قسم کی طبع زاد جودت کا سُراغ دُور دور تک نہیں ملتا۔

اُردو چونکہ بہت دنوں تک درباروں کے سائے میں پروان چڑھی اور پناہ گزیں رہی ہے۔ اس لئے میرے خیال میں اس کی ذہنی بساط پر ابھی جمہوریت کا عرفان پیدا نہیں ہو سکا ہے۔ چنانچہ جب مضمون نگار حضرات کی توجہ ان کوتاہیوں کی طرف دلائی جاتی ہے تو وہ رسالے اور مدیر دونوں سے برہم ہو جاتے ہیں۔

اُردو رسایل کی ایک بڑی محرومی یہ بھی ہے کہ انھیں اپنے ان بزرگ اور سربرآوردہ ترین لکھنے والوں کا تعاون بہت کم حاصل ہوتا ہے۔ جنھوں نے اُردو میں لکھ کر شہرت پائی اور اپنے ساتھ اُردو کے قد و قامت کو بھی بلند کیا۔ یہ بزرگ ادیب اپنی زبان کے کیف و کم کے ساتھ شمولیت کر کے اس کے مصائب کو کم کر سکنے کا باعث بن سکتے تھے مگر اس کے برعکس انھوں نے اپنے پیشے میں غرق ہونے کے لئے چھوڑ دیا ہے۔

اس کے ساتھ ہی ہمارے کچھ اور چوٹی کے ادیبوں اور خاص طور پر نقاد حضرات کی ایک صف ایسی ہے جنھوں نے ماضی میں چند مضامین لکھ کر اُفقِ ادب

پر قبضہ کر لیا ہے لیکن اب کمیٹیوں، کمیشنوں اور بورڈوں کی غیر تخلیقی فضاؤں میں نظر بند ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہ ادیب لکھنا تو درکنار، خطوط کا جواب دینے کی زحمت گوارا نہیں کر سکتے۔ البتہ کرم فرمائی کا بھرم قائم رکھنے کے لئے مجموعوں اور کلیات کے لئے پیش لفظ ضرور لکھتے ہیں۔

آج سے تیس چالیس سال پہلے ذہنی اور فکری انقلابات اس وقت تیزی سے نہیں تھی جیسی آج کے زمانے میں ہے۔ ایک رسالے کے مدیر کو ان فکری تبدیلی سے واقف ہی نہیں رہنا پڑتا بلکہ اپنے رسالے کو اس کے ساتھ ہم آہنگ بنانے کے لئے بھی مستعد رہنا پڑتا ہے۔ لیکن اس میں ایک عجیب رکاوٹ جو سامنے آتی ہے۔ وہ رسالے کا مزاج ہوتا ہے جو مسلسل روایت سے تشکیل پاتا ہے۔ جب مدیر اپنے رسالے کو جدید رجحانات کی پٹریوں سے جوڑنا چاہتا ہے تو اس کے حلقۂ قارئین کو ذوقی کی سطح پر جھٹکے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ایک زندہ رسالے کو نہ صرف یہ کام کرنا پڑتا ہے بلکہ قارئین کے زیادہ سے زیادہ حلقے کو نئی تحریک کا مزاج آشنا بنانے کے لئے طرح طرح کی ترغیبات کا بھی سہارا لینا پڑتا ہے۔

مدیر کے مسائل کا ایک اور رخ رسالے کی ظاہری شکل و صورت سے وابستہ ہوتا ہے۔ اردو میں ابھی ٹائپ کا رواج نہیں ہے اور آفسیٹ کی سہولت بھی بہت کم خوش نصیبوں کو حاصل ہے۔ ان حالات میں خوشنویسی کے مسائل جو مشکلات کھڑی کر دیتے ہیں اس کا اندازہ مدیر کے بغیر شاید دیا ہی نہیں جا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خوشنویسی ایک فن کی حیثیت سے دم توڑ چکی ہے۔ اور کشمیر جیسے مقام میں جو کبھی محمد حسین زرین رقم، محمد وآو شیریں رقم جیسے مثیل خوشنویسوں کا مامن تھا۔ اب ایسے کاتب ملتے ہیں جو یہ کام محض اس لئے کرتے ہیں کہ ان کو کوئی دوسری ملازمت نہیں ملی۔

اردو کے رسالے کا مدیر آج کے زمانے میں ایک خاص قسم ہی ہوئی آشفتہ خاطر شخصیت ہے۔ اس زبان کے مسائل نے زمانے کے دوسرے آشوبات کے ساتھ مل کر اسے آزمائش کے صحراؤں میں کھڑا کر دیا ہے۔ اور اگر اس ابتلا میں کوئی جینئس سے پیش قدمی پر آمادہ رکھ سکتی ہے۔ تو وہ اس کی ذاتی لگن ہے۔



مالک رام

مدیر تحریر، ۳۹۲، ڈیفنس کالونی،
نئی دہلی

میں پچھلے چھ سات برس سے تماہی "تحریر" شائع کر رہا ہوں۔ لیکن "تحریر" عام پرچوں سے کچھ مختلف ہے۔ یہ خالص علمی اور تحقیقی پرچہ ہے؛ اس میں ادبی مضامین افسانے، نظمیں، غزلیں شائع نہیں ہوتیں۔ ظاہر ہے اس پابندی کے باعث ہمیں بعض مشکلات اور مسائل کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ انھیں میں سے چند کا بیان یہاں مقصود ہے۔

سب سے بڑی مشکل تو یہی ہے کہ تحقیقی اور علمی مضمون لکھنے والے نہیں ملتے۔ میں نے پہلے دن ایک اصول مان لیا تھا کہ مضمون کسی سے طلب نہیں کروں گا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر کسی صاحب نے میری درخواست پر مضمون لکھا اور وہ ہمارے معیار پر پورا نہ اترا، تو دشواری پیدا ہوگی۔ نہ اسے چھاپ سکوں گا، نہ واپس کرنے کا موقع رہے گا کیونکہ ان کے ناراض ہو جانے کا اندیشہ ہوگا۔ لہٰذا میں نے محض ان اصحاب سے مضمون کی درخواست کی تھی جن کی استعداد اور علمی روایت کا مجھے علم اور یقین تھا۔ اس سے فائدہ یہ ہوا کہ ہمیں کسی موقع پر محض مروت کے مارے کوئی مضمون شائع نہیں کرنا پڑا۔ ایک آدھ مضمون کی قسم نہیں کھاتا جو نہ چھپنا چاہیے تھا، لیکن بعموم ہمارا معیار بلند رہا ہے۔ اور اب تو عام طور پر ہمارے لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کو بھی اعتراف ہے کہ ہمارا علمی معیار قابل اطمینان ہے۔

اس سے یہ نہ خیال کیا جائے کہ "تحریر" کے تمام مضمون بلند پایہ ہیں، یا یہ کہ انھیں اس موضوع پر حرفِ آخر سمجھا جائے۔ ایسی بات نہیں۔ حرفِ آخر تو کسی انسانی کوشش کیلئے بھی نہیں کہا جا سکتا، چہ جائیکہ علم اور تحقیق کے میدان میں جہاں آئے دن نئی معلومات منظر عام پر آتی رہتی ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ میں نے کبھی کبھی بعض ایسے مضمون بھی شامل اشاعت کئے ہیں جو مکمل نہیں تھے یا جن کی معلومات ناقص تھیں۔ یہ محض اس لئے ہوا کہ اس موضوع پر پہلے سے کوئی مواد موجود نہیں تھا۔ خیال ہوا کہ جتنا کچھ جمع ہو گیا ہے، اسے تو محفوظ کر دیا جائے۔ اس سے جو صاحب آگے کام کریں گے انھیں معلوم ہو جائے گا کہ کہاں کہاں کمی رہ گئی ہیں اور وہ مزید معلومات مہیا کرنے کی کوشش کریں گے۔ اور جن اصحاب کو اس موضوع سے دلچسپی ہے، انھیں یہ منتشر معلومات یکجا مل جائیں گی۔ اور اگر وہ چاہیں تو مزید تحقیق کا خود اہتمام کریں۔

بات اس سے چلی تھی کہ اردو میں علمی مضمون لکھنے والے بہت کم ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اردو میں لکھنے والے تحقیقی مضمون کیوں نہیں لکھتے؟ یا لکھتے ہیں تو بالعموم وہ علمی معیار پر پورا کیوں نہیں اترتا؟

میں جہاں تک سمجھ سکا ہوں۔ اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ ہم لوگ آج تک شعر و شاعری کے طرزِ بیان سے آزاد نہیں ہو سکے۔ ہر ایک موضوع کے لیے الگ زبان ہوتی ہے، الگ اسلوب اور طرزِ بیان؛ اس کی اپنی فضا ہوتی ہے۔ اگر اس نکتے کو مدنظر نہ رکھا جائے، تو مضمون عدمِ توازن کا شکار ہو جائے گا۔ بالکل وہی اعتراض اس پر بھی وارد ہوگا، جو غزل پر ہوتا ہے کہ اس کے اشعار میں تسلسل اور ربط مفقود ہوتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہمارے بیشتر مضمون نگار اچھا خاصا علمی اور سنجیدہ مضمون لکھتے لکھتے اسمیں شعر لکھنے لگتے ہیں، مرصع و مسجع و مقفیٰ فقرے لے آتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہوائی باتوں اور انشا پردازی کے اتنے دلدادہ ہیں کہ کسی وقت تھوڑی دیر کیلئے بھی بالکل سنجیدہ نہیں رہ سکتے۔ ان کے لیے لطیفہ "

ئی سے اپنا دامن چھڑانا محال ہے۔ یا پھر یہ تسلیم کیا جائے کہ انھیں علمِ تحقیق اور شعور و انشا کی نسبت ... جو فرق ہے، اس کا پتا نہیں۔

... ضروری ہے جب تک مضمون نگار اپنے موضوع کے تمام ماخذ پر حاوی ہونے کی ... نہیں ... اسے ان تمام ... نہ ہو، جو اس کی ... مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ ... سہل انگاری سے کام لیتا ہے۔ دونوں صورتیں افسوس ناک ہیں۔ ... اس طرح کے مضمون مکمل کرنا پڑتے ہیں۔ حوالے کی کمی تو اکثر دیکھنے میں آئی ہے ... سبب میری سمجھ میں یہ آیا ہے کہ مضمون نگار نے اصلی ماخذ نہیں دیکھا بلکہ ... کسی دوسرے مصنف کے ہاں دیکھی ہے اور وہ اسے پیش اس طرح سے کرتا ہے ... اس کی اپنی تحقیق ہو۔ ... اس دوسرے مصنف کا نام لکھنے یا اس کا حوالہ ... عار محسوس ہوتی ہے۔ یہ بات جہاں تنگ نظری کی دلیل ہے وہیں اس سے یہ بھی ... ہوتا ہے کہ وہ شخص صحیح معنوں میں محقق نہیں ہے۔ نہ وہ کبھی محقق بن سکتا ہے۔ اصلی محقق کبھی دوسرے کا جائز حق غصب نہیں کرتا! اگر وہ کسی سے استفادہ کرتا ہے، تو بے جھجک اس کا اعتراف کرتا ہے۔ اس کے برخلاف بعض مضمون نگاروں کی روش یہ ہے کہ وہ ... مصنفوں سے لمبے لمبے اقتباس نقل کرتے ہیں۔ یہ بھی غلط طریقہ ہے اور اکتا دینے والا۔ مضمون نگار اپنی تائید میں کسی ... یا معاصر مصنف کا قول یا رائے پیش کرنا چاہے تو اس کا مانی الضمیر ایک آدھ فقرے میں بیان کرکے اس کا حوالہ دے سکتا ہے لیکن یہ بالکل ... ہے کہ وہ اس سے طویل عبارت لے کر اسے اپنے مضمون کا حصہ بنالے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ خود اس موضوع کو ہضم نہیں کرسکا یا نفسِ مدعا کو اپنے لفظوں میں ادا کرنے سے قاصر ہے۔ بعض اوقات مجھے ایسے مضمونوں میں کانٹ چھانٹ کرنا پڑتی ہے اور احساس یہ ہوتا ہے کہ میں مضمون نگار سے انصاف نہیں کر رہا ہوں کیونکہ خدا معلوم وہ اس بات کو کس طرح سے کہتا۔

ایک اور مسئلہ نفسِ موضوع کا ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ اُردو رسائل میں موضوع کا تنوّع بہت کم ملتا ہے۔ کسی قدیم شاعر کی تاریخ ولادت و وفات، کسی قدیم متن کی دریافت، ایک مصنف یا شاعر کا دوسرے سے استفادہ یا سرقہ — بس یہی تحقیق کے موضوع رہ گئے ہیں۔ ... ہیں ان کے علاوہ بھی موضوعات ہیں: تاریخ، جغرافیہ، لسانیات، عمرانیات، معاشیات، نفسیات، سیاسیات۔ غرض بیسیوں ایسے موضوع ہیں جن پر مغرب میں ... نئی نئی تحقیق ہو رہی ہے، لیکن ان کے بارے میں اُردو میں برائے نام بھی کچھ ... گیا ہے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اُردو ادب اور اس کی تاریخ کے علاوہ کچھ دوسرے عنوانوں پر بھی مضمون لکھواؤں، لیکن اس میں قابلِ قدر کامیابی نہیں ہوئی۔ ... سے دو چار مضمون ملے جو شائع ہو چکے ہیں لیکن ان سے بہت زیادہ کی ضرورت ہے۔ ان میں سے چند مضمونوں کے عنوان یہ ہیں، اس سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ میرے نزدیک کس طرح کے عنوانوں کی ضرورت ہے: جادوگری زبان، ایک نیا رسم الخط: قانون ابن سینا اور اس کی شرحیں، ہندستانی دفتر خانوں میں فارسی دستاویزیں، محکمۂ آثارِ قدیمہ۔

ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی زبان کو ہر طرح کے علوم و فنون سے مالا مال کرنے کی پوری سعی کریں ... ان موضوعات پر لکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ اس میں کوتاہی نہ کریں۔ اس سے جہاں زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہوگا اور اس کا دامن وسیع ہوگا، وہیں نئے نئے لکھنے والوں کی تربیت کا سامان بھی پیدا ہوگا۔

میں نے یہاں ... محض ان مسائل کا ذکر کیا ہے جو بحیثیت مدیر میرے سامنے آئے۔ لیکن آج اُردو کے رسائل و جرائد کے سامنے دو اور مسئلے ایسے ہیں جن کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ پہلا کاتبوں کی قلت کا ہے۔ اچھا اور ذمہ دار کاتب کبریتِ احمر سے بھی زیادہ نایاب ہے۔ دوسری دشواری خریداروں کی کمی کی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے، گویا اُردو والے کتابوں اور رسالوں کو خرید کر پڑھنا فضول خرچی تصور کرتے ہیں۔ خدا خیر کرے، لیل و نہار اچھے نہیں۔

احمد سعید ملیح آبادی

مدیر روزنامہ "آزاد ہند" ۲۲ اے ساگر دت لین
کلکتہ

ایک روزانہ اخبار کے مدیر کے مسائل مختلف النوع ہوتے ہیں۔ اور اس کی بہت سی ذمہ داریاں اور پابندیاں ہوتی ہیں۔ پہلی پابندی تو وقت کی ہے۔ ریل اور ہوائی جہاز کی طرح اخبار لیٹ نہیں ہو سکتے۔ اخبار کو وقت پر نکلنا ہی چاہئے۔ اس کے لئے ایڈیٹر کو اور اس کے ساتھ اخبار کے پورے اسٹاف کو گھڑی کی سوئی کے ساتھ حرکت میں رہنا پڑتا ہے۔ اسی لئے ایڈیٹر کے وقت کو بہت قیمتی سمجھا جاتا ہے۔

اخبار چھپنے سے پہلے اور اس کے بعد، نت نئی ذمہ داریاں ایڈیٹر سے دامن گیر رہتی ہیں۔ پورے اخبار میں جو کچھ چھپتا ہے۔ خبروں اور مضامین سے لے کر اشتہارات تک، سب کے لئے ایڈیٹر ذمہ دار ہوتا ہے۔ وہ قانون کے سامنے بھی جواب دہ ہوتا ہے اور اپنے صحافتی پیشے کے ضابطۂ اخلاق کے سامنے بھی اور اپنے قارئین کے سامنے بھی۔

پبلک کی نظر میں ایڈیٹر کا تصور یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیا کی ہر خبر سے واقف ہوتا ہے! کسی جگہ کوئی واقعہ پیش آجائے اور اخبار کے کالم میں وہ خبر جگہ نہ پا سکے تو اس علاقے کے لوگ بہت ناخوش ہوتے ہیں کہ آپ کیسے ایڈیٹر ہیں، ہماری طرف ایسی ایسی واردات ہوگئی اور آپ کو کچھ خبر ہی نہیں؟ انھیں کیا معلوم کہ ایڈیٹر کو علمِ غیب حاصل نہیں ہوتا۔ وہ بھی اپنے ذرائعِ معلومات کا محتاج ہوتا ہے۔

ایڈیٹر، اپنے قارئین کے ذہن کا معلّم ہوتا ہے۔ وہ رائے عامہ بنانے والا

سب سے بڑا عیب ہے۔ وہ ذہنوں کی تعمیر کرتا ہے۔ اسلئے ایڈیٹر کی ذمہ داریاں بہت بڑی اور نازک ہوتی ہیں۔ ایڈیٹر ایک فکر اور نقطۂ نظر بناتا اور پھیلاتا ہے کوئی قاری یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ شعوری یا لاشعوری طور پر ایڈیٹر کے افکار و خیالات اور پالیسی سے متاثر نہیں ہوا۔ یہ تاثر ہمیشہ ایڈیٹوریل ہی کے ذریعہ نہیں ہوتا۔ وہ ان سے مضامین اور خبروں کی تراش خراش اور کانٹ چھانٹ سے بھی ہوتا ہے۔ خبریں کس ڈھنگ سے پیش کی جائیں۔ سرخیاں کیسی لگائی جائیں کون سی خبر نمایاں اور مفصل شائع کی جائے۔ کسے دبایا اور گھٹایا جائے۔ اس سارے عمل میں ایڈیٹر کی پالیسی اور اس کے ذہن کی کرشمہ سازیاں موجود ہوتی ہیں۔ پڑھنے والوں کا ذہن بہ حیثیت ایڈیٹر کا ذہن متشکل بناتا ہے پھر لوگ بسا اوقات نادانستہ طور پر ایڈیٹر کا نکتۂ نظر پڑھنے کے لئے کتاب کھول سکتا ہے۔

ایڈیٹر کو تمام ملکی اور غیر ملکی اہم معاملات اور واقعات پر گہری نظر رکھنا پڑتی ہے۔ کامیاب ایڈیٹر کو خوش سلوب ہونا چاہئے کہ اس کے قارئین اس سے کیا سننے کی امید رکھتے ہیں۔ ایڈیٹر کے ایک ہاتھ میں قلم اور دوسرے ہاتھ میں پبلک کی نبض ہوتی ہے۔ یہ ایک کٹھن کام ہے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایڈیٹر کو پبلک کے عام رجحان سے ہٹ کر بات کرنا ہوتی ہے۔ اس وقت خوب جرأت درکار ہوتی ہے۔ لوگ کسی خاص معاملے میں جذباتی ہو کر ایڈیٹر سے جسے وہ اپنا ترجمان سمجھتے ہیں، اپنی من بھاتی بات سننا چاہتے ہیں اور جب اخبار سامنے آتا ہے تو ایڈیٹر کا ایک دوسرا ہی روپ ہوتا ہے۔ سیاسی اور قومی معاملات میں ایسے ہیجانی مواقع اکثر آتے رہتے ہیں۔ یہ وقت ایڈیٹر کی کڑی آزمائش کا ہوتا ہے۔ اس کا فرض اسے منساوت اور پبلک کی مانگ سے مخالف آواز دیتا ہے۔ ایڈیٹر کو وہی بات کہنا چاہئے جو اس کی دانست میں حق ہو۔

انتخابی مہم کے دوران ایڈیٹر کو مختلف سیاسی طاقتوں کی طرف سے بہت زیادہ دباؤ سہنا پڑتا ہے۔ بعض گروہوں اور افراد کی طرف سے ایڈیٹر پر بیجا دباؤ پڑنے کے رجحان میں پچھلے کچھ عرصہ میں خاصا اضافہ ہوا ہے اور ایڈیٹر کو اپنے اظہار رائے کے حق کی حفاظت کے لئے جو کبھی لڑنا پڑتی ہے۔ وہ مصیبتیں جھیلتا ہے۔ قید و بند تک بات پہنچ سکتی ہے۔

کہتے ہیں کہ کامیاب ایڈیٹر وہی ہو سکتا ہے جو دن میں دس گھنٹے پڑھے اور صرف دو گھنٹے لکھے۔ جی ہاں، ایک اچھا ایڈیٹر بننے کے لئے بہت مطالعے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کتابوں، رسالوں کے علاوہ ایڈیٹر کو ملکی اور غیر ملکی اہم اخبارات کا کثرت سے روزانہ مطالعہ کرنا پڑتا ہے اور کرنا چاہیئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد جنھوں نے اپنی پبلک زندگی کا آغاز ایک مدیر کی حیثیت سے کیا تھا، اپنے کثیر اور وسیع مطالعہ کے لئے بہت مشہور تھے۔ کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہوگی کہ مولانا اخبارات میں خبروں اور مضامین کے علاوہ اشتہارات تک پڑھ ڈالتے تھے۔ حتیٰ کہ اخبار کو سونگھتے بھی تھے! جی ہاں، مختلف اخباروں کے کاغذ کی خوشبو جدا جدا ہوتی ہے۔ ایک متجسس صحافی جو ہمیشہ سیکھنے اور معلومات اکٹھا کرنے کی دھن میں رہتا ہے، بھلا یہ معلوم کئے بغیر کیسے رہ سکتا ہے کہ جو اخبار وہ پڑھ رہا ہے اس کی خوشبو کیسی ہے جو اس کے کاغذ کے کارخانے اور پرانے کا پتہ دیتی ہے۔ نوجوان صحافیوں کے لئے اس مثال میں ایک اچھا سبق ہے۔

اب ذرا ایک نظر خاص طور سے اُردو اخبار کے ایڈیٹر پر بھی ڈال لیں۔ اُردو اخبار کے ایڈیٹر کے مسائل کچھ اور بھی ہوتے ہیں مثلاً اسے اپنے اخبار کا بیشتر مواد انگریزی سے منتقل کرنا پڑتا ہے۔ خبریں اور اکثر مضامین بھی انگریزی میں آتے ہیں۔ ان کا ترجمہ بڑی تیزی اور روانی سے کرنا پڑتا ہے عام طور سے اُردو پریس کم سرمائے کی وجہ سے بہت پچھڑا ہوا ہے۔ اُردو اخبار کا ایڈیٹر، مالک اور منیجر سب کچھ ایک ہی آدمی ہوتا ہے اسے بیک وقت متضاد قسم کا ہمہ جہت کام کرنا ہوتا ہے۔ اس بیچارے پر محنت سوا ہوتی ہے۔ دوسری زبانوں کے بڑے اخبارات کے مدیران کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ ہر روز خود ہی ایڈیٹوریل لکھیں۔ ان کے ہاں مختلف موضوعات پر اداریہ لکھنے والے علاحدہ ہوتے ہیں۔ لیکن غریب اُردو اخبار کے ایڈیٹر کے پاس بڑا اسٹاف نہیں ہوتا۔ اسے خود ہی تمام ملکی و غیر ملکی معاملات پر لکھنا پڑتا ہے۔ اسے دوسروں سے زیادہ محنت اور مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لئے اُردو اخبار کے ایڈیٹر کے لئے ایک اچھا مترجم ہونا بھی ضروری ہے۔ اتنی محنت کے بعد بھی اس بیچارے کے اخبار کی اشاعت محدود ہوتی ہے۔ لیکن امید ہے کہ ایک وقت آئے گا جب اُردو کے بھی بڑے اخبار ہوں گے اور ان کا ایڈیٹر بھی اپنے ہم عصروں کے برابر ہوگا۔

بقیہ قاری کے مسائل

کیونکہ میں صرف قاری نہیں میری کچھ اور ذمہ داریاں بھی ہیں، اس لئے کتابوں کی غیر منصفانہ قیمتیں بھی ایک قاری کی حیثیت میں میرا مسئلہ ہیں جیسے یہ صحیح ہے کہ ایک تخلیق کار اپنی تخلیق کو دوسرے تک پہنچانے کے لئے بیتاب رہتا ہے، اسی طرح میرے خیال کے مطابق ایک اچھا قاری بھی ایک اچھی تخلیق پڑھ کر اپنی خوشی میں دوسروں کو شریک کرنا چاہتا ہے۔ چونکہ موجودہ دور میں قاری مختلف خانوں اور نظریوں میں بٹ گیا ہے اور اسے کتابوں کی عدم دستیابی یا پھر ان کی خرید کے مسائل درپیش ہیں، اس لئے میں بحیثیت قاری کے کم و بیش تنہائی کا شکار ہوں۔ جو میں پڑھتا ہوں یا جو میں سنتا ہوں، اس سے یا تو بہت سے ناآشنا ہوتے ہیں یا پھر اپنے نظریئے کے تحت محظوظ نہیں ہو پاتے۔ میرے خیال میں یہ مسئلہ بھی اہم ہے۔

ناشر کے مسائل

محمد حسین شمس علوی
دیانند ورما
عابد علی خاں



محمد حسین شمس علوی
(ادارۂ فروغ اُردو، امین آباد پارک،
لکھنؤ (یوپی)

جس طرح دنیا کے سب کاموں میں کچھ مشکلات ہوتی ہیں اسی طرح نشر و اشاعت اور پبلشنگ کے کام میں بھی کچھ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ناشرین کو پہلی دشواری تو یہی پیش آتی ہے کہ وہ کسی اچھے اور معیاری مصنف کو تلاش کریں تاکہ جو کتاب چھاپی جائے اس کی جلد سے جلد نکاسی ہو سکے اور کتاب کی تیاری اور اس کے اشتہار پر پبلشر جو روپیہ صرف کرے وہ جلد سے جلد سمٹ آئے۔ اسی لئے مقبول و معروف مصنف کو تلاش کرنے کے ساتھ ساتھ پبلشر کو یہ بھی خیال رکھنا پڑتا ہے کہ کتاب کسی ایسے موضوع پر ہو جو عوام کے مذاق کے مطابق ہو اور وہ اس سے دلچسپی لے سکیں۔ ان دونوں باتوں کا خیال اس لئے رکھنا پڑتا ہے تاکہ ناشر کا روپیہ کتاب کی شکل میں زیادہ عرصہ تک پھنسا نہ پڑا رہے۔ سرمایہ جتنا گردش میں رہے گا اتنا ہی فائدہ زیادہ حاصل ہوگا۔ اگر اس کتاب کا پہلا ایڈیشن جلد نکل جائے گا تو اسی روپیہ سے اسی کتاب کا دوسرا ایڈیشن یا کوئی دوسری نئی کتاب فوراً ہی چھپوائی جا سکتی ہے۔

بعض کتابوں کی نکاسی جلد ہو جاتی ہے اور بعض کی بہت دیر میں۔ ایک غیر معروف مصنف کی کتاب دیر میں نکلتی ہے اور کسی جانے پہچانے مصنف کی ہاتھوں ہاتھ بک جاتی ہے اسی طرح اگر کتاب کسی عام فہم موضوع پر ہوتی تو جلد فروخت ہو جاتی ہے اور اگر کتاب فلسفے منطق قانون یا کسی ٹھوس اور ٹھس موضوع پر ہوئی تو اس کی نکاسی بہت کم اور بتدریج ہوتی ہے۔ چنانچہ، جاسوسی اور رومانی ناول اور جنسیات کے متعلق کتابیں بڑی تیزی سے فروخت ہو جاتی ہیں۔ لٹریچر جتنا فحش اور ننگا ہوگا وہ اتنا ہی زیادہ مقبول ہوتا ہے۔

جن ناشروں کے پیش نظر صرف روپیہ کمانا ہی ہوتا ہے وہ زیادہ تر ایسی ہی مخرب اخلاق کتابیں چھاپتے ہیں وہ ایسے لٹریچر پر جو روپیہ لگاتے ہیں وہ کم وقت میں زیادہ منافع لے کر پبلشر کو واپس مل جاتا ہے۔

مگر وہ پبلشر جن کے پیش نظر روپیہ کمانا ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ علم و ادب کی خدمت بھی کرنا چاہتے ہیں وہ نسبتاً زیادہ نقصان میں رہتے ہیں۔ ان کے لئے کسی معیاری یا فنی کتاب کا پہلا ایڈیشن بھی نکالنا جوئے شیر لانے سے کم مشکل نہیں ہوتا۔

جب کسی پبلشر کو کسی ممتاز مصنف کی کوئی کتاب چھاپنے کو مل گئی تو پبلشر کے سامنے پہلا مرحلہ آتا ہے کسی اچھے کاتب کی تلاش جس کا خط اچھا ہو صحیح نویس ہو اور وعدہ کا پابند ہو۔ ہمارے کاتب حضرات ہمیں معاف کریں گے اگر ہم صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے یہ کہیں کہ ان کی اکثریت وعدہ کی پابندی نہیں کرتی۔ پیشگی اجرت لینے کے بعد بھی وہ عام طور پر لکھ کر نہیں دیتے۔ پبلشر ان کا پیچھا کرتے کرتے عاجز آ جاتا ہے۔ کاتبوں میں دوسرا نقص یہ ہوتا ہے کہ اگر انہوں نے کتابت کر بھی دی تو جب کاپیاں تصحیح کرنے کے لئے ترمیم کے لئے ان کے حوالے کی گئیں تو ترمیم بنانے میں وہ کتابت سے بھی زیادہ وقت لے لیتے ہیں اور سیکڑوں تقاضوں اور ان کے گھر کے چکر لگانے کے بعد ترمیم بنا کر کاپیاں ملتی ہیں تو وہ بھی زیادہ ناقص ہی ہوتی ہیں۔ بعض کاتب ترمیم بنانے کے چور ہوتے ہیں اور کتابت کی اجرت لینے کے بعد بھی وہ ترمیم کا بنانا بیگار سمجھتے ہیں۔ اگر بادلِ ناخواستہ وہ اس بیگار کے لئے تیار بھی ہو گئے تو بھی وہ توجہ اور دلچسپی کے ساتھ ترمیم نہیں بناتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کاپیوں میں پھر بھی بہت سی غلطیاں رہ جاتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جو کتاب بڑے اہتمام سے چھاپی جاتی ہے جس کی کتابت و طباعت دیدہ زیب ہوتی ہے جس میں بڑھیا کاغذ لگا ہوتا ہے اور جس کا "گیٹ اپ" عمدہ ہوتا ہے اس میں بھی کتابت کی غلطیاں دیکھنے میں آتی ہیں جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ کاتب نے ترمیم

توجہ سے نہیں بنائی اور بہت سی غلطیاں چھوڑ دیں اور پبلشر نے کاتب کی دیانتداری پر بھروسہ کرتے ہوئے یہ دیکھے بغیر کہ ساری غلطیاں بنا دی گئی ہیں یا نہیں کاپیاں چھپنے کے لئے دے دیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ پبلشر ان تمام کاپیوں پر پھر سے نظر ڈال لے جو ترمیم بنانے کے بعد کاتب نے اسے واپس کی ہیں۔ جو پبلشر ایسا نہیں کرتے اور غلطیوں کی جانچ کئے بغیر کاپیاں چھپنے کے لئے دے دیتے ہیں۔ انہیں بعد میں ایک غلط نامے کا اضافہ کرنا پڑتا ہے جو کتاب کے روشن چہرے پر ایک بدنما داغ کی حیثیت رکھتا ہے۔

کاپیوں کے بعد پروف ریڈنگ کی منزل آتی ہے۔ ناشر صاحب نے پروف پڑھ کر ان غلطیوں کو اگر پھر بنا دیا جو کاتب سے بھی چھوٹ گئی ہیں تو ان غلطیوں کو "مصلح سنگ" پلیٹ پر نہیں بناتا کیونکہ مصلح سنگ کی ذہنیت بھی کاتبوں جیسی ہی ہوتی ہے اور وہ بھی عموماً انہیں کی طرح "کام چور" ہوتا ہے اور کم وقت میں زیادہ سے زیادہ پیسہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اگر مصلح سنگ پر بھی بھروسہ کر کے پلیٹیں چھپنے کے لئے دے دی گئیں تو کتاب چھپنے کے بعد جب سامنے آئے گی تو اس میں بہت سی غلطیاں نظر آئیں گی اور کاتب اور مصلح سنگ کی لاپروائی کی وجہ سے غریب ناشر اور لیتھو چھپائی مفت میں بدنام ہوگی۔

اگر کتاب کسی زندہ مصنف کی ہے اور پبلشر نے اس خیال سے کہ "تصنیف را مصنف نیکو کند بیان" کے مصداق مصنف ہی کاپیاں اچھی طرح اور آسانی کے ساتھ پڑھ سکتا ہے۔ کاپیاں مصنف کے حوالے کر دیں تو مصنف نے کاپیوں میں لفظوں پر لفظ اور جملوں پر جملے بدلنا شروع کر دیئے اور بعض اوقات پیراگراف کے پیراگراف بدل ڈالے۔ اس طرح کی ترمیم بنانا کاتب کو بہت زیادہ کھلتی ہے اور پھر ترمیم بنانے کے سلسلے میں کاتب جو کاٹ چھانٹ کرتا ہے اور چیپیاں لگاتا ہے یا مصلح سنگ جو چھیل چھال کرتا ہے وہ کتابت کے حسن کو تباہ کر کے رکھ دیتا ہے اور طباعت کی خوبصورتی بالکل بگڑ جاتی ہے۔ اس قسم کی کتر بیونت وہی مصنف کرتے ہیں، جنہیں اپنے لکھے پر اعتبار نہیں ہوتا اور جو چاہتے ہیں کتاب کے پڑھنے والوں کو میری عبارت آرائی میں کوئی سقم نظر نہ آئے اور وہ بے عیب دکھائی دے۔ ممکن ہے کہ مصنف کی ادبیت بے عیب بن جائے لیکن اس کا رد عمل یہ ضرور ہوگا کہ کتاب کی لکھائی اور چھپائی داغ دار نظر آنے لگے گی اور ان تمام نقائص کا ذمہ دار غریب ناشر کو سمجھا جائے گا۔

جب کتاب چھپ گئی تو کتاب کی نکاسی کے لئے ناشر کو اس کے ذرائع ڈھونڈنا پڑتے ہیں۔ اس کے دو ہی طریقے ہو سکتے ہیں کہ یا تو پبلشر اس کتاب کا اشتہار مختلف اخبار و رسائل اور جنتریوں میں دے یا کتاب کو عوام سے متعارف کرانے کے لئے ہزارہا ہینڈبل تقسیم کرائے۔ ظاہر ہے کہ کسی ایک کتاب کے اشتہار پر ناشر کو اتنا زیادہ خرچ کرنا پڑ جائے گا جس پر "سونے سے گڑھاؤن مہنگی" کا مقولہ صادق آسکتا ہے۔ اشتہارات دے کر اگر کچھ کتابیں فروخت ہوئیں تو اس میں نقصان ہی نقصان ہوگا اور اگر اکا دکا کچھ فرمائشیں آئیں بھی تو مثلاً اگر ایک روپیہ قیمت کی کتاب ہے تو اس پر ایک روپیہ پچاس پیسے ٹکٹ ڈاک خرچ ہو جائیں گے اور اگر انہی وی پیوں میں سے کچھ واپس آگئیں تو ٹکٹ ڈاک کی رقم کا بوجھ غریب ناشر ہی کی جیب پر پڑے گا اور اس پر "آؤ پیرو گھر سے لے جاؤ" کی مثل کا پوری طرح اطلاق ہوگا۔

دوسرا نسبتاً کم خرچ طریقہ یہ ہے کہ وہ مختلف بک سیلروں سے رابطہ قائم کر کے انہیں کمیشن پر کتابیں مہیا کرے۔ اس کے لئے وہ مختلف بک سیلروں کے پاس خود جائے گا اور محض بیرونی کتب فروشوں سے خط و کتابت کرے گا۔ مقامی بک سیلروں کے پاس پبلشر کو متعدد بار جانا پڑتا ہے۔ بک سیلر بڑی شانِ استغنا سے دریافت کرتا ہے کہ اچھا یہ تو بتائیے آپ کمیشن کتنا دیں گے؟ ناشر نے ڈرتے ڈرتے کہا ۳۳ فیصدی۔ بک سیلر صاحب بولے کہ جی ۲۵، ۳۳ فیصدی تو ہم خود دوسروں کو دیتے ہیں۔ آپ اگر ۶۰ فیصدی کمیشن دیں تو دس پانچ کتابیں رکھ جائیے۔ جب کتابیں بک جائیں گی تو اس کے دام دے دیئے جائیں گے۔ ۶۰ فیصدی آپ کمیشن دیں گے تو ہم آپ کی کتاب محنت سے بیچیں گے بھی اور ہمیں بھی چار پیسے بچ رہیں گے۔ غرض مختلف کتب فروشوں کے یہاں دس دس پانچ پانچ کتابیں رکھ دی گئیں اور ناشر نے جو سیکڑوں ہزاروں روپیہ اس کتاب کی تیاری پر خرچ کیا تھا وہ کتابوں کی شکل میں متعدد کتب فروشوں کے حوالے کر دیا صرف اس امید پر کہ اس صورت سے شاید کچھ نکاسی ہو سکے۔ اگر کتب فروش خوش دہند نکلا تو اس نے دس دس پانچ پانچ روپے مختلف قسطوں میں دے دیئے اور نا دہند بک سیلروں نے سانس ڈکار تک نہ لی۔

پبلشر کو ایک زحمت اور پیش آتی ہے وہ یہ کہ اگر پبلشر کو اتفاق سے کوئی مقبول و متعارف مصنف کی تصنیف چھاپنے کو مل گئی اور کتاب کی نکاسی بھی تیزی سے ہونے لگی تو دوسرے بے ایمان اور خدا ناشناس پبلشروں کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اور ان میں سے کسی ڈھیٹ پبلشر نے اس کی کتاب کو فوٹو آفسٹ پر چھپوا لیا۔ چونکہ فوٹو آفسٹ پر چھپوانے کے بعد اصل اور نقل میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اس لئے اس بے ایمان پبلشر کے خلاف کوئی قانونی کارروائی کر کے اس میں کامیابی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ اب ہم اگر اس کتاب پر ۳۳ فیصدی کمیشن دیتے ہیں تو جعلی ایڈیشن چھاپنے والے پبلشر کو پچاس ساٹھ فیصدی کمیشن دینے میں عذر نہیں ہوتا اور دل کھول کر کمیشن دینے کے بعد بھی وہ نفع ہی میں رہتا ہے۔ کیونکہ اسے نہ مصنف کو رائلٹی دینا پڑتی ہے اور نہ بہت سے ابتدائی اخراجات اور شروع میں پیش آنے والی دشواریوں پر قابو پانے کے لئے اسے کچھ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ ایسے بے ایمان پبلشر مصنف کے ساتھ بھی مکر و فریب سے کام لیتے ہیں اور اسے رائلٹی ادا کرنے سے بچنے

کے لئے وہ پہلا ایڈیشن چھاپنے کے بعد کتابت کی پلیٹیں محفوظ کر لیتا ہے اور مصنف سے یہی کہتا رہتا ہے کہ جناب ابھی تو پہلے ایڈیشن کی کتابیں ہی نہیں نکل سکی ہیں جب دوسرے ایڈیشن کی نوبت آئے گی تو رائلٹی حاضر کردی جائے گی اور یہ پہلا ایڈیشن ختم ہونے اور دوسرا ایڈیشن چھاپنے کی نوبت کبھی نہیں آتی اور یہ چکر ایسا ہے جو کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔

فوٹو آفسٹ پر درسی کتابیں تو ضرور چھاپ لی جاتی ہیں اس لئے کہ ان کی نکاسی ضرور ہوتی ہے اور نفع کا تناسب اچھا خاصا ہوتا ہے مگر اس کی گرفت نہ پبلشر کر سکتا ہے اور نہ حکومت ہی کر سکتی ہے۔ بس گرفت اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ دورانِ طباعت میں پولیس بے ایمان ناشر کو گرفتار کرے۔

دیانند ورما

ڈائرکٹر اشا پبلیکیشنز و پنجابی پستک بھنڈار
دریبہ کلاں دہلی ۱۱۰۰۰۶

مختلف زبانوں کی کتابوں کے ناشران کے مسائل الگ الگ ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں صرف اُردو کتابیں شائع کرنے والے اداروں کے مسائل کا ذکر کرنا مقصود ہے۔ اُردو کتابوں کی نشر و اشاعت کے میدان میں کئی سرکاری، نیم سرکاری، تجارتی اور غیر تجارتی ادارے سرگرمِ عمل ہیں۔ ان میں ہر ایک کے مسائل کی نوعیت مختلف ہے۔ یہاں میں صرف ان اداروں کے مسائل کا ذکر رہا ہوں جو وسیلۂ روزگار کے طور پر ناشر کے فرائض انجام دیتے ہیں۔

جس طرح اشاعتی اداروں کی کئی قسمیں ہیں اسی طرح کتابوں کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ مثلاً نصابی کتابیں، مذہبی کتابیں، عوامی پسند کی کتابیں شعری مجموعے، ناول، افسانے اور ادبی تخلیقات۔

اُردو کی نصابی کتابیں آج کل سرے سے ہی کم چھپتی ہیں۔ اس لئے ان کتابوں کو حاصل کرنا خریدار کے لئے بجائے خود ایک ہزار مرحلہ داستان ہے۔ مذہبی کتابوں کے زمرے میں قرآن شریف کی اشاعت میں منافع بیشک کم ہے لیکن اس میں اصل لاگت کے ڈوب جانے کا اندیشہ نہیں ہوتا، علاوہ ازیں مذہبی کتابیں نسبتاً کم فروخت ہوتی ہیں۔ قصہ آرائش محفل ایسی عوامی پسند کی کتابوں کی سرپرستی دیہاتی عوام کرتے ہیں جو ہر ایک کتاب کو ایک مقدس شے سمجھتے ہیں۔ اس نوع کی کتابیں کثیر تعداد میں فروخت ہوتی ہیں۔ ان کا کاپی رائٹ کسی ایک ادارے کے پاس محفوظ نہیں ہوتا۔ لہٰذا ایک ہی کتاب کو کئی ادارے بیک وقت چھاپ لیتے ہیں۔ اس لئے کم قیمت رکھنے کے سلسلہ میں مقابلہ شدید ہوتا ہے۔ ناشر کو اصل رقم کا سود جتنا بھی ہاتھ نہیں لگتا۔ شعری مجموعے صرف نامور شعرا کے بکتے ہیں۔ لیکن نامور شعرا کی تعداد پانچ فی صدی سے بھی کم ہوتی ہے باقی ۹۵ فیصدی کے لئے مسئلہ ہی مسئلہ ہے۔ رہ گئے ناول، افسانے اور ادبی تخلیقات تو صورتِ حال یہ ہے کہ اچھے خاصے علم دوست بھی کتابیں خرید کر پڑھنے سے گریز کرتے ہیں۔ درحقیقت لفظ مسئلہ اسی نوعیت کی کتابوں کے لئے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے۔

ان مسائل کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بینک (جو اب قومی ملکیت بن چکے ہیں) کتابوں پر قرض دینا مناسب نہیں سمجھتے۔ بینک سادے کاغذ پر قرض دے سکتے ہیں۔ مطبع کی سیاہی پر اپنا روپیہ لگا سکتے ہیں کیونکہ ان اشیا کو کسی وقت بھی معمولی خسارہ اٹھا کر فروخت کیا جا سکتا ہے لیکن جب کورے کاغذ اور سیاہی میں ایک مصنف کی کوشش شامل ہو جاتی ہے۔ تو وہ اس بنا پر اپنا روپیہ لگانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ کیونکہ وہ پراڈکٹ (PRODUCT) جسے کتاب کہا جاتا ہے بوقت ضرورت سکوں میں منتقل نہیں کرائی جا سکتی۔ وہ ایک خصوصی شخص کے کام کی چیز رہ جاتی ہے۔ اس خاص شخص کو تلاش کرنا مسئلہ کی گنجلک ڈوری کا پہلا سرا ہے۔

کتاب کا ضرورت مند تلاش کرنے کے سلسلہ میں پبلسٹی بھی ایک ذریعہ ہے لیکن یہ اس قدر مہنگا ہے کہ جس قدر ایک مشہور ماہنامے میں ایک صفحہ اشتہار دوبارہ شائع کرانے پر صرف ہوتی ہے اس سے ڈیڑھ صد صفحات پر مشتمل ایک کتاب کی پانچ سو کاپیوں کا بلا جلد ایڈیشن تیار ہو جاتا ہے لہٰذا کوئی بھی ناشر اشتہارات کے مصارف برداشت نہیں کر پاتا۔

سرکار یا فہرست کتب بھی پبلسٹی کا ایک ذریعہ ہے لیکن اس وسیلہ سے ہر خاص و عام کو مطلع نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ کتب فروشوں اور لائبریریوں تک رسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ سارے ملک میں ایسے تاجران کتب کا شمار انگلیوں پر کیا جا سکتا ہے جو دیگر ناشروں کی تمام مطبوعات کا بھرپور سٹاک رکھتے ہیں۔ ورنہ زیادہ تر ایسے ہیں جو مختلف زبانوں کی درسی کتابوں اور اسٹیشنری کی دوکان کھولے بیٹھے ہیں۔ وہ لوگ دوکان کے ایک گوشہ میں اُردو کی کچھ پاپولر کتابیں بھی رکھ لیتے ہیں۔ وہ اپنے ہاں محض خریداروں کی پسند کی کتابیں رکھتے ہیں۔ مردوں میں صادق حسین سردھنوی کے تاریخی ناول اور کچھ غیر ملکی مہمی (ADVENTUROUS) ناولوں کے ترجمے مقبول ہیں۔ عورتیں خواتین کے لکھے ناول پسند کرتی ہیں۔ عورتوں کی پسند کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے کچھ ناشر مردانہ تحریروں کو خواتین کے نام سے چھاپ دیتے ہیں۔

اب رہی ادب کے معیار پر پوری اترنے والی کتابیں۔ تو اُن کی سرپرستی لائبریریوں کے ذمہ ہے۔ لیکن بیشتر لائبریریوں میں اردو کتابوں کیلئے بجٹ بہت کم ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ صرف نامور ادیبوں کی تصانیف پر حقیر سی

قسم خرچ کرنے باقی ماندہ کتابوں کو خدا کے آسرے پر چھوڑ دیتی ہیں۔

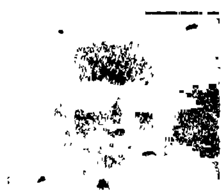
اب اس ضمن میں کچھ امور قابل ذکر ہیں کہ ادبی کتابوں سے متعلق کہنے والے زیادہ تر لوگ اقتصادی اعتبار سے خوشحال نہیں ہوتے اور استعمال کی دیگر اشیاء کی طرح کتاب (CONSUME) نہیں ہو جاتی۔ بیک وقت کئی افراد کے ذریعہ پڑھی جانے کے باوجود کتاب کا کچھ نہیں بگڑتا۔ قاری کے حق میں جہاں کتاب کی یہ ایک خوبی ہے وہاں ناشر کے لئے ایک سراسر تجارتی خسارہ ہے۔ قاری کتاب خرید کر پڑھنے کی بجائے مستعار لے کر پڑھنا پسند کرتا ہے یا پھر کسی کتب فروش کو کتاب کرائے پر اٹھا دینے کے لئے رضامند کر لیتا ہے۔ آج جا بجا ایسی دکانیں کھلی ہیں جہاں سے پچیس پیسے یومیہ پر پانچ دس روپے کی کتاب لے کر پڑھی جا سکتی ہے۔ اس سے دکاندار کا کام تو چل نکلتا ہے لیکن ناشر اور مصنف کا حق مارا جاتا ہے۔

کتابوں کی کھپت کے مذکورہ بالا محدود ذرائع کو دیکھتے ہوئے ایک اچھا خاصہ ناشر اپنی کتاب کا ایڈیشن پانچ سو جلدوں سے زیادہ کا نہیں چھاپتا۔ مقبول عام یا شہرۂ آفاق کتابوں کا ایڈیشن ایک ہزار جلدوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ نتیجتاً کاتب، پریس، آرٹسٹ وغیرہ کے اخراجات کم جلدوں پر پڑ جاتے ہیں کتاب گراں قیمت ہو جاتی ہے۔

ناشر کو یہ سہولت ہے کہ اگر ایک کتاب چھاپنے پر اس کی گزر اوقات نہ ہو تو وہ زیادہ سرمایہ لگا کر زیادہ قسم کی کتابیں چھاپ سکتا ہے۔ اپنی آمدنی میں اضافہ کر سکتا ہے لیکن ایک مصنف اپنے قلم کو انڈسٹری کی صورت میں منتقل نہیں کر سکتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اردو کا ادیب اردو کتابوں کی آمدنی پر خوشحال زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اسے معاش کے لئے دوسرا ذریعہ تلاش کرنا پڑتا ہے۔ دیگر ذریعۂ معاش کی ضرورت صرف اردو کے ادیب کو نہیں پڑتی۔ اردو کے ناشر کو بھی اقتصادی فارغ البالی کے لئے آمدنی کا کوئی دوسرا ذریعہ اپنانا پڑتا ہے۔ مثلاً کسی مقبول عام ماہنامہ کی اشاعت، دوا کا کوئی کارخانہ، ادبی معمہ یا مشغلہ یا کتابوں کی امپورٹ ایکسپورٹ کا دوسرا شعبہ۔ وہ جو ناشر صرف اردو کتابوں کی اشاعت کے نفع پر زندہ رہنا چاہتے ہیں ان کی مالی حالت زیادہ اچھی نہیں ہے۔

بہرکیف مسائل کے سبب نئے اور ابھرتے ہوئے ادیبوں کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔ پبلیل کے محدود ذرائع کو مدنظر رکھتے ہوئے جب ناشر کسی نئے مصنف کی کتاب چھاپنے کے لئے تیار نہیں ہوتا تو مصنف اپنی تحریر خود چھاپ لیتا ہے اور مسائل کے اسی گرداب میں پھنس جاتا ہے جس میں سے ابھرنے کی کوشش میں ناشر ہاتھ پاؤں مار رہا ہوتا ہے۔ مذکورہ ادیب نڈھال ہو کر اپنی کتاب کی سول ایجنسی کسی باقاعدہ ناشر کے حوالے کر کے کمبل سے جان چھڑانا چاہتا ہے۔ لیکن اس پر حقیقت اب واضح ہوتی ہے

کہ نشر و اشاعت کی تجارت میں کرنسی نوٹوں کو کتابوں کے اوراق کی صورت عطا کرنا آسان ہے لیکن ان "سنہری اوراق" کو دوبارہ کرنسی نوٹوں میں منتقل کرنا ازحد دشوار ہے۔



عابد علی خاں

روزنامہ سیاست، مہاتما گاندھی روڈ
حیدرآباد (آندھرا)

گذشتہ ماہ مئی میں بنگلور میں جناب برکت اللہ خاں صاحب چیف منسٹر راجستھان سے ملاقات ہوئی تھی جس میں اردو زبان و ادب اور حیدرآباد کے ادیبوں و شعرا کے مسائل بھی زیر بحث رہے۔ خانصاحب نے کہا کہ میں انہیں مخدوم محی الدین کا مجموعہ کلام بساط رقص فراہم کر دوں۔ ان سے میں نے وعدہ کر لیا لیکن میں جانتا تھا کہ بساط رقص کا ایک بھی نسخہ برائے فروخت موجود نہیں ہے کیونکہ پرانا ایڈیشن ختم ہو چکا اور نیا شائع نہیں ہوا ہے۔ مخدوم صاحب کی ادبی خدمات کے اعتراف کے لئے منعقدہ ایک جلسہ میں کیبنٹ کے علاوہ مخدوم کمیٹی نے انہیں ان کے مکمل کلام کا ایک مجموعہ بطور تحفہ پیش کیا تھا۔ اس کی اشاعت سے میرا ہی تعلق تھا۔ ہم نے ایک ہزار نسخے شائع کئے تھے جو ختم دسمبر ۱۹۷۰ء تک فروخت ہوتے رہے۔ مخدوم محی الدین نہ صرف آندھرا پردیش کے بلکہ دنیائے اردو کے ممتاز اور صف اول کے شعراء میں سے تھے۔ ان کی نظموں کا انتخاب تلگو اور ہندی میں بھی شائع ہوا ہے۔ غالباً سوویت یونین میں بھی ان کی نظموں کے ترجمے شائع ہوئے ہیں لیکن ان کا مکمل مجموعہ کلام جو صرف ایک ہزار کی تعداد میں شائع ہوا تھا تین چار سال تک فروخت ہوتا رہا۔ اس واقعہ سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اردو کتابوں کی رفتار فروخت کیا ہے اور جب یہ ایڈیشن ختم ہوتا ہے تو اس کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کس قدر مشکل کام ہے۔ بہرحال مجھے بازار سے ایک پرانا نسخہ خرید کر جناب برکت اللہ صاحب کی خدمت میں پیش کرنا پڑا۔

آزادی سے پہلے حیدرآباد اردو کتابوں کا بڑا مرکز رہا ہے۔ لیکن آندھرا پردیش بننے کے بعد اکثر ادارے بند ہو گئے۔ انجمن ترقی اردو کا کتب گھر اور مکتبہ ابراہیمیہ جو اردو کتابوں کی فروخت کے کل ہند اہمیت رکھنے والے ادارے تھے ختم ہو گئے۔ ان حالات کے باعث نواب مہدی نواز جنگ مرحوم نے ادبی ٹرسٹ کے تحت ایک بکڈپو بھی قائم کیا جس کا انتظام میرے تفویض تھا۔

اس بکڈپو سے یہ تجربہ حاصل ہوا کہ حیدرآباد میں اچھی کتابوں کی اشاعت اور فروخت کی رفتار بڑی سست ہے۔

ادبی ٹرسٹ کتابوں کی اشاعت کا بھی کاروبار انجام دیتا ہے۔ غالب صدی تقاریب کے موقع پر حیدر آباد کے ایک ممتاز نقاد و ادیب ضیاء الدین شکیب نے سالار جنگ لائبریری اور آرکائیوز ڈیپارٹمنٹ کی مدد سے "غالب اور حیدر آباد" پر بڑی تحقیقی کتاب لکھی اور کتاب کی تشہیر کے لئے مناسب طریقے بھی اختیار کئے گئے لیکن دو سال تک بمشکل تین سو کتابیں فروخت ہوئیں۔ بالآخر میں نے ٹرسٹ کی متعدد مطبوعات کو ریاست کے کتب خانوں کیلئے خریدنے کا انتظام کرادیا۔

"آج کل" کے سابق مدیر شہباز حسین صاحب نے ۱۹۶۸ء میں اُردو کتابوں کی اشاعت کے بارے میں سوال نامہ اور دیگر مواد کے ذریعہ یہ اندازہ لگایا تھا کہ آزادی کے بعد تقریباً دس ہزار کتابیں شائع ہوئیں۔

ایک اور تجزیہ کے بموجب اوسطاً ہر روز دو اردو کتابیں شائع ہوتی ہیں یہ اعداد مایوس کن نہیں ہیں۔ گو یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان میں بڑی تعداد "سوقیانہ" اور مذہبی ادب سے متعلق ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے باعث تحقیقی موضوعات پر مضامین کی ترتیب و تیاری بھی اچھے اعلیٰ لٹریچر کی شکل میں سامنے آرہی ہیں۔

ایم اے اور ڈاکٹریٹ کے لئے جو مقالے لکھے گئے وہ کتابی شکل میں شائع ہوئے ہیں۔ اُردو میں اچھی کتابوں کی اشاعت کے لئے کافی مواد موجود ہے۔

دو تین سال قبل ممتاز مزاحیہ نگار مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی مرحوم کے صاحبزادے مرزا شرافت اللہ بیگ نے مجھ سے کہا تھا کہ مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم کے بعض غیر مطبوعہ مضامین ان کے پاس ہیں جن کی اشاعت کا انتظام کرنا چاہیئے۔ اس طرح قدیم اور جدید دونوں قسم کے اچھے معیاری ادب کے مسودات کی کمی نہیں لیکن اصل سوال اس کی طباعت اور اشاعت کا ہے

حیدر آباد میں کوئی بڑا ناشر نہیں ہے اور ایسی کتابیں بھی شائع کرنے پر آمادہ نہیں جو جلد فروخت نہ ہو سکیں۔

بیرون حیدر آباد مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی اور گنتی کے چند ایسے ادارے ہیں جو مشہور ہیں لیکن ان کے لئے تمام مصنفین کی کتابوں کی اشاعت آسان نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصنف خود اپنی کتاب کی اشاعت کا انتظام کرتا ہے لیکن کتاب کی اشاعت کے بعد اس کی فروخت و تقسیم کا کام مصنف کے بس کی بات نہیں اردو ادب و زبان کی ترقی کے مختلف پہلوؤں پر نظر رکھنے والوں اور بالخصوص انجمن ترقی اردو کو چاہیئے کہ وہ کتابوں کی فروخت کے انتظام کو سنبھال لے۔ انجمن کی شاخیں ہر ریاست میں قائم ہیں۔ خود انجمن ایک بہت بڑی ناشر ہے اس لئے اسے ملک بھر کی اُردو تصانیف کی فروخت و نکاسی میں مدد دینی چاہیئے یا رہنمائی کرنی چاہیئے۔

اردو اداروں اور بالخصوص انجمن ترقی اردو کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ریاستی شاخوں کے تعاون سے ہر نئی کتاب کے نوٹ لے اور ان کی فروخت و نکاسی کا انتظام کرے۔

اردو بورڈ بھی اپنا فرض پورا کرے گا اگر وہ اردو کتابوں کی اشاعت کے لئے انجمن کو مالی امداد دے۔ بالخصوص اردو میں معاشی، سیاسی اور عصری مسائل پر کتابوں کی شدید ضرورت ہے۔ شاید میرا اندازہ غلط نہ ہو کہ معاشی و سیاسی مسائل پر سال بھر میں اچھی بارہ کتابیں بھی شائع نہیں ہوتیں۔

کشمیر سے مدراس تک اور جے پور سے کلکتہ تک میں نے مختلف شہروں کا دورہ کیا ہے اور کئی دوستوں نے مجھے اپنی تصانیف اپنے آٹوگراف کے ساتھ دیں۔ یہ سب معیاری ادب ہیں اور تقریباً سب ہی کتابیں مصنف نے اپنے صرفہ سے شائع کی ہیں جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ زبان و ادب اور تنقیدوں کے مسائل پر ہمارے ملک میں بہترین اردو ادب شائع ہو رہا ہے لیکن یہ غیر منظم کام ہے۔ نیز اس کی تشہیر اور نکاسی کے کوئی موزوں ذرائع نہیں ہیں۔ اب اردو بورڈ اور انجمن ترقی اُردو کو ان مسائل پر غور کرنا چاہیئے کتابوں پر انعام کے بجائے کتابوں کی نکاسی اور اس کے لئے انجمن ترقی اُردو کے اشاعت گھر اور مکتبہ جامعہ کی ہمت افزائی اور مالی مدد کرنی چاہیئے تشہیر اور نکاسی کا انتظام کیا جائے۔ ہمارے ملک میں معیاری اردو ادب میں گرانقدر اضافہ ہوگا۔ ساہتیہ اکیڈیمی کی مطبوعات اور نیشنل ٹرسٹ کی مطبوعات کے تجربے سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صرف کتابوں کی اشاعت ہی کافی نہیں بلکہ اس کی تشہیر و نکاسی بہت ضروری ہے۔

کسی زبان کی ترقی کے لئے نیا عصری ادب نہایت ضروری ہے۔ خود حکومت اور ترقی اردو بورڈ نے اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اردو انسائیکلوپیڈیا، اردو ڈکشنری اور فنی و سائنسی کتابوں کی اشاعت کی طرف توجہ کی ہے جو یقیناً ایک اہم اور اثباتی اقدام ہے۔ اب ریاستی حکومتیں بھی اردو کتابوں کی اشاعت کے لئے مالی امداد یا انعامات دے رہی ہیں۔ اتر پردیش اور آندھرا پردیش میں حکومت نے شعراء اور ادیبوں کو اُن کی تصانیف کے لئے مالی امداد دینے کا تجربہ شروع کیا ہے۔ اب اُردو کتابوں کی اشاعت بڑھ رہی ہے۔

کتابوں کی نئے انداز سے اشاعت، آفسٹ میں طباعت اور اُن کی تشہیر و نکاسی کے لئے ابھی سے منظم طریقوں کے بارے میں سوچنا ہوگا۔ اس سلسلہ میں انجمن ترقی اُردو، مکتبہ جامعہ، ترقی اردو بورڈ اور ریاستی اُردو اکیڈیمی مشترکہ طور پر غور کریں تو اردو کتابوں کی نشر و اشاعت کے مسائل کو حل کرنے میں بڑی مدد ملے گی۔

قاری کے مسائل

دیویندر اسر

وہاب دانش

حکیم منظور



دیویندر اسر
۱۱/۴۸ ایسٹ پٹیل نگر۔ نئی دہلی

میں نے افسانے لکھے بھی ہیں اور پڑھے بھی، لیکن گذشتہ چند برسوں میں میں نے بہت کم افسانے لکھے ہیں اور بہت کم پڑھے ہیں۔ میں نے بار ہا سوچنے کی کوشش کی کہ اس کا باعث کیا ہے؟ کیا یہ اس دیرینہ مرض کی نشاندہی تو نہیں جس سے "آغازِ عالمِ پیری" کا احساس ہوتا ہے؟ یا اس کا باعث "ستم ہائے روزگار" ہے۔ اور بہت ممکن ہے کہ اس کا اصلی باعث یہ ہو کہ افسانے کی تخلیق اور اس سے زیادہ افسانے کا مطالعہ ایک لایعنی اور لاحاصل عمل محسوس ہونے لگا ہو۔ اب تو بعض حضرات یہ بھی محسوس کرنے لگے ہیں کہ موجودہ دور میں ادب زندگی کے لئے ایک غیر متعلق مسئلہ ہے۔ ادب پڑھنے کی کسے فرصت اور کیا ضرورت ہے؟

اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے عمل میں میرے ذہن میں کئی اور سوالات جنم لیتے ہیں۔ میں افسانہ کیوں پڑھتا ہوں؟ اور کیوں نہیں پڑھتا۔ بحیثیت قاری میرا مسئلہ کیا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ میرا مسئلہ، ہر قاری کا مسئلہ نہ ہو۔ یا بیشتر قارئین کے لئے ادبی مطالعہ کا جواز "ادبی" نہ ہو کر "غیر ادبی" ہو۔

اگر ہم تنقید نگاروں کی اصطلاحات میں سوچنے کی کوشش کریں تو اس سوال کا جواب بہت سہل ہے۔ میں ادبی تخلیق کا مطالعہ جمالیاتی حظ یا حقیقت کا ادراک حاصل کرنے کے لئے کرتا ہوں۔ کیا میں افسانہ اس لئے پڑھتا ہوں کہ میرے علم میں اضافہ ہو۔ جس دور میں ہم زندہ ہیں اس میں حقائق کے علم کی کمی نہیں، بلکہ انفارمیشن ایکسپلوژن (INFORMATION EXPLOSION) ہے۔ ماس میڈیا ہر قسم کے علم۔ سائنس ٹیکنالوجی، عمرانیات، سماجیات وغیرہ کو نئی سے نئی تحقیقات اور اصولوں کو انسان کی رسائی کے دائرے میں لے آیا ہے۔ انسانی ذہن کے ہر گوشے، اس کی عمیق ترین نفسیات، جنسی محرکات، ذہنی ساخت، شخصیت کے پیچ و خم، شعوری، تحت الشعوری اور لاشعوری عمل، سماجی عوامل، فکر، احساس اور عمل، جبر و اختیار غرضیکہ ہر گوشے کی آگاہی دوسرے علوم سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ پھر ادب کی ہماری زندگی میں کیا اہمیت رہ جاتی ہے۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود میں افسانہ یا نظم، ناول اور ڈرامہ پڑھتا ہوں۔ کیونکہ ادب اعداد و شمار، حصولِ علم کا ذریعہ یا اس کا بدل نہیں بلکہ زندگی کی حقیقت اور فرد کی حسیت کے ایک نئے امتزاجی پیٹرن کا نام ہے جو علمِ محض سے ممکن نہیں۔ روزمرہ کی زندگی اور افسانوی کردار کے مابین ایک مہین سی جھلی ہے جو دیوارِ چین نہیں لیکن جو زندگی سے منسلک ہوتے ہوئے بھی اسے زندگی کی ریاست سے فن کی عملداری میں لے آتی ہے جس کے باعث اس کا کردار، اس کا طرزِ زندگی اور حقوقِ شہریت بدل جاتے ہیں۔ کیونکہ عام قاری ایک ریاست سے دوسری ریاست میں غیر قانونی طور پر داخل ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے فن کے ضابطے کے بہت سے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں جو فن اور زندگی دونوں کے لئے مہلک ثابت ہو سکتے ہیں۔

بحیثیت قاری میرے لئے یہ سوال بڑا اہم ہے کہ کسی فن پارے میں حقیقت اور تصور، تخیل اور ادراک، وجدان اور فلسفہ، احساس اور فکر، رومان اور صداقت، تکنیک اور موضوع، پلاٹ اور ٹیکسچر، جذبات اور علامت، پیٹرن اور تسلسل، زماں اور مکاں، لمحہ اور نقطۂ نظر، کردار اور منظر، حسن اور بصارت کے علاوہ حرکت، رنگ، بو، شکل، جذبہ، قدر ایک مکمل پیٹرن کس طرح اختیار کرتے ہیں اور احساس کی گہرائی میں کس طرح اترتے

ہیں؟ اور جب روزمرہ کی خارجی حقیقت اور حواس سے محسوس ہونے والی حقیقت سے پرے افسانہ زندگی کی اصلیت کی تمثیل بن جاتا ہے اور حقیقت کا نیا روپ، نیا تصور اور شعور پیش کرتا ہے تو اس کے تاثر میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایسا روپ، تصور اور شعور علم کے اکتسابی مطالعہ یا زندگی کے براہِ راست مشاہدے سے میسر نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ تخلیق نہ صرف ادیب کے لئے بلکہ قاری کے لئے بھی ایک مشترک داخلی تجربہ بن جاتی ہے۔ عام طور پر جب کوئی قاری ابہام کی شکایت کرتا ہے تو اس کا بیشتر باعث یہی ہوتا ہے کہ وہ اس نئے پیٹرن میں داخل ہونے کے بجائے اپنے خود ساختہ پیٹرن میں ہی رہ کر اس کی تفہیم کرنا چاہتا ہے جو مشترک داخلی تجربے کے لئے سدِ راہ ثابت ہوتا ہے اور ترسیل اور ابلاغ کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ آج کے ادب کا مطالعہ ایک مجہول عمل نہیں بلکہ فعال عمل ہے۔

میرے لئے افسانے یا ناول کی اہمیت محض تکنیک، اسٹائل یا پلاٹ (جسے کرسٹوفر اشروڈ نے افسانے یا ناول کے لئے سم قاتل قرار دیا ہے) کے باعث نہیں بلکہ کردار اور زندگی کے اصل جوہر کے انکشاف میں ہے جس کی جستجو ریسرچ کے آلہ جات سے نہیں، تخیل اور بصیرت کے جوہر سے ہی ممکن ہے۔

ادبی مطالعہ "خالص ادبی اقدار" یا "جمالیاتِ مطلق" کی تسکین کا ذریعہ نہیں ہوتا کیونکہ اسمیں دوسرے سماجی اور نفسیاتی عوامل کارفرما رہتے ہیں۔ آج فرد کو جس نوعیت اور شکل کے تجربات، مشاہدات اور حوادث نے اپنی گرفت میں لے لیا ہے اس کے لئے جمالیاتی تسکین کے بجائے مکروہ کے شعور نے لے لی ہے۔ یہ امر عین ممکن ہے کہ آج بھی قارئین کی بیشتر تعداد ادب کا مطالعہ ذاتی ذوق کی تسکین، تفننِ طبع یا جمالیاتی حظ کے لئے کرتی ہو۔ لیکن شہری اور صنعتی زندگی نے جس خوف، دہشت، تنہائی، خود علیحدگی، احساسِ گناہ، تردد، تذبذب، تشکیک، احساسِ جلاوطنی، اجنبی پن، فنا کے خطرے اور زندگی کی بے معنویت اور لغویت کو جنم دیا ہے، وہ آج جمالیاتِ محض کی تسکین کی نہیں، سوالات کی فراوانی، احساسِ گناہ اور فرد کی بے مائیگی، جھلاہٹ، غصہ اور باغیانہ جذبے کا مطالبہ کرتی ہے۔ موجودہ ادب کی ماہیت میں جو غیر معمولی تبدیلی ظہور پذیر ہوئی ہے اُسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

چونکہ ہمارا ادب ان مسائل سے نبرد آزما ہونے میں تذبذب کے دور سے گذر رہا ہے میرے اور اس کے درمیان ذہنی فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے اور جب بھی ہمارا جدید ادب اِن مسائل سے دوچار ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ تو اس میں وجودی دہشت کے بجائے نیوراتی دہشت کا عنصر زیادہ غالب رہتا ہے کیونکہ ایسے ادب میں حصولِ لذت اور حقیقت کے عناصر یکجا ہو جاتے ہیں۔ میرے نزدیک مطالعہ حقیقی تسکین کا نعم البدل نہیں اور نہ ہی نفسی دباؤ کو کم کرنے اور نفسی ضرورتوں کے درمیان توازن قائم کرنے کا ذریعہ ہے نہ ہی یہ دبی ہوئی خواہشوں کے اخراج کا راستہ یا کتھارسس (CATHARSIS) کا عمل ہے۔ کسی حد تک یہ ارتفاعی عمل ضرور ہے۔ لیکن کسی بھی صورت میں خارجی یا نفسی حالات کی تلافی کا باعث نہیں۔ ہاں اکثر ایسا ہوا ہے کہ موجودہ زندگی میں حالات کو برداشت کرنے پر مجبور ہونے کے باعث احساسِ گناہ جب شدت اختیار کر لیتا ہے تو مطالعہ کی خواہش بڑھ جاتی ہے کیونکہ جب کوئی اولین عمل کا اہل نہیں ہوتا تو وہ اس قسم کا ثانوی عمل اختیار کرتا ہے۔ ایسی صورت میں میں ایسے ادب کو پڑھنا پسند کرتا ہوں جو کلائمکس کی جانب نہیں بڑھتا بلکہ کرائسس کو ایک مستقل صورت کی شکل میں پیش کرتا ہے۔

جب فلابیر اپنے ناول مادام بووری (ایما) میں ایما کی خودکشی کا بیان تحریر کر رہا تھا تو اس نے اپنے جسم میں زہر کے اثرات محسوس کئے اور اس نے کہا "میں ایما ہوں"

جب تک افسانہ نگار کا "میں" افسانوی کردار کا "میں" اور میرا "میں" ایک دوسرے کے رگ و پے میں سرایت نہیں کر جاتے۔ ایک دوسرے کے نفس میں گہرے نہیں اتر جاتے اس وقت تک ادیب اور قاری کا ذہنی فاصلہ نہیں مٹ سکتا۔ اور اس اشتراک کے بغیر مطالعہ قاری کے لئے محض ایک بیانیہ تحریر ہے، ایک تجربہ نہیں۔ اور بغیر اس تجربے کے مطالعہ جستجو اور انکشاف کا حامل نہ ہو کر ایک لایعنی عمل بن جاتا ہے۔



وہاب دانش
ٹوٹر بازار، رانچی (بہار)

قارئین کے مسائل کیا ہیں۔ ایک عام قاری اور ادب کا بیدار طالب علم آج کن مسائل سے دوچار ہے اس پر ٹھنڈے دل سے اگر غور کیا جائے تو مندرجہ ذیل مسئلوں اور دشواریوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

۱۔ ا۔ غیر ملکی ادبی مسلک و نظریے کی آمد اور خارجی دباؤ سے اُردو ادب کے فکری اور منطقی نظام کے اندر خلفشار

۲۔ کسی بھی تحریک یا رجحان کی بڑھتی ہوئی طاقت سے متاثر ہوتے ہوئے اذہان اور مروجہ ادبی قدروں کا انہدام۔

۳۔ اُردو ادب کے اندر ادبی گروہ بندیاں، اجارہ داری، تعصب، علاقہ پرستی اور تیسرے درجے کے مکتوبی ناقدین کی بھرمار

۴۔ نظم و نثر میں شدید قسم کی داخلیت کی بنا پر معمہ نما تخلیقات کی کثرت، تجریدی اور علامتی انداز کے بہانے ناقابل فہم چیستانی تحریروں کی بہتات۔

۵۔ اُردو زبان کی نازک و ناگفتہ بہ حالت اور حکومت کی چشم پوشی و عدم توجہی۔

آج کا سہما اور ڈرا ناقاری مندرجہ بالا مسائل سے دوچار ہے۔

۱۹۳۶ء کے بعد اُردو ادب میں جس ادبی نظریئے نے اپنی جڑیں دور دور تک پیوست کر دی تھیں اور کسی حد تک ایک خاص گروہ کی ایک ذہنی تہذیب و تعمیر کا کام مکمل کر دیا تھا۔ وہ ۱۹۵۰ء کے بعد اچانک اپنے اثرات کھو کر عہدِ ماضی کی داستان بن گیا اور اس عرصے کے درمیان جن لوگوں نے اس ادبی نظریئے کی حمایت میں خود کو باذوق قارئین کے زمرے میں شامل کیا تھا اُن کے لیے آج کوئی ٹھوس زمین موجود نہیں۔ آج کے نئے ادبی رجحان کے ساتھ اُن کی وفاداریاں مشکوک سمجھی جاتی ہیں۔ حالانکہ تجربات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہر بیس پچیس سال کے اندر ادب میں اچانک تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں جن میں خود کوئی ثبات نہیں ہوتا۔ لہٰذا کون جانتا ہے کہ آج کے جدید ادب کے پرستار قارئین کا حشر کیا ہوگا بنیادی مسائل وہی رہیں گے جو آج ہیں۔ یعنی غیر ملکی ادبی مسلک و نظریئے کی آمد اور خارجی دباؤ سے اُردو ادب کے فکری اور منطقی نظام میں خلفشار اور قارئین کے لیے ذہنی کرب اور امتحان کا لمحہ۔ کیونکہ ترقی پسند ادب اور جدید ادب کی آپسی چپقلش کے باعث ادب کا کوئی واضح تصور آج کے قاری کے ذہن میں مرتسم نہیں ہو سکا۔ بلکہ اس دو دہائی کے اندر ادبی قدروں کی جس سُرعت و سختی کے ساتھ شکست و ریخت ہوئی ہے اُس نے تو آج کے ایک عام قاری کو ذہنی انتشار میں مبتلا کر دیا ہے۔

آج کے اُردو رسالوں اور پرچوں کو اُٹھا کر دیکھ لیجیے اور اندازہ لگائیے کہ قارئین کو بے وقوف بنانے، آزمائش اور ذہنی ورزش میں مبتلا کرنے اور پہیلیاں بجھانے کے کس قدر نت نئے سامان موجود ہیں۔ اگر کسی پرچے میں پچیس غزلیں ہیں تو یکسانیت کا یہ عالم ہوگا کہ اگر شعراء کے نام چھپا دیئے جائیں تو ایسا لگے گا کہ کسی ایک ہی شاعر نے ساری غزلیں ایک ہی نشست میں کہہ ڈالی ہیں۔ نظموں کا معاملہ یہ ہوگا کہ چند ایک کو چھوڑ کر باقی تمام نظمیں دوسروں کے دسترخوان سے چرائی ہوئی ہڈیاں ہوں گی۔ افسانے "میں" سے شروع ہو کر ذات کی دھند کے اندھے سفر میں نہایت بے ربط اور واہیات قسم کی تجریدیت پر تان توڑتے ملیں گے۔ اور تبصروں میں یا تو سراسر بے ایمانی اور جھنجھلاہٹ ملے گی یا پھر دل سے نکلتے ہوئے غبار کا فوارہ — یا پھر تعریف کا اتنا لمبا پُل ملے گا کہ آپ توصیفی جملوں کے ساتھ چلتے چلتے خود ہی تھک کر بیٹھ جائیں گے۔ باقی رہ گئی بات تنقید کی تو آپ کو یہ اندازہ ہی نہیں ہو سکے گا کہ ہمارے خود ساختہ ناقد کے پاس اپنا تنقیدی شعور کتنا ہے۔ مگر اس بات کا اندازہ ضرور ہو جائے گا کہ غیر ملکی ناقدین کی انتقادی آراء سے اُس نے کتنے پُرفریب جملے گڑھ کر خود کو بڑا ناقد ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

کسی بھی زبان کی تنقید حقیقت میں قارئین کی ذہنی تہذیب میں بے مثال رول ادا کرتی ہے۔ اگر ایک ناقد کی تنقید، تخلیق کی سرحدوں کو چھوتی ہے اور اگر اُس زبان کے ادب میں تخلیقی تنقید کا اچھا خاصا سرمایہ موجود ہے تو قارئین کے ذوق کی آبیاری اور صحت مندی کی گویا ضمانت مل جاتی ہے اور پھر کسی بھی ادبی دور میں باشعور اور باذوق قارئین کا مسئلہ اس قدر سنگین نہیں ہوتا۔ مگر آج کے قارئین کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ آج ایسے ناقدین کی سخت قلت ہے جو کسی بھی فن پارے کو ایک فن کار کی ذہنی اور شعوری تھرتھراہٹ کے ساتھ محسوس کر کے اُس کی خوبصورتی، بلندی، عظمت اور جمالیاتی پہلو کے رازہائے سربستہ سے لوگوں کو روشناس کرا سکیں۔ یہاں تو عالم یہ ہے کہ کسی بھی فن پارے کا عملی اور تجزیاتی مطالعہ تو کجا، سرسری جائزہ لیتے وقت بھی لوگ اپنا ناقدانہ منصب بھول جاتے ہیں اور غریب قاری کی کبھی صحیح فیصلے تک رسائی نہیں ہوتی۔

لہٰذا ایک قاری کی حیثیت سے میں نے بارہا محسوس کیا ہے کہ آج کی ادبی ہنگامہ آرائی میں اپنی رائے محفوظ رکھنا اشد ضروری ہے مگر اس کے باوجود شامت آ ہی جاتی ہے۔ لوگوں کا تقاضا ہوتا ہے کہ اس مجموعۂ کلام پر اس تخلیق پر کھُل کر رائے دی جائے۔ خاموشی وبالِ جان اور گفتگو موت کا سامان بن گئی ہے۔ یعنی گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل اس مصیبت میں میں ہی اکیلا گرفتار نہیں بلکہ اگر پورے ہندوستان کا سروے کیا جائے تو ایک اچھی خاصی تعداد ایسے قارئین کی نکل آئے گی جو فن کار یا کسی صنفِ ادب سے دلچسپی رکھنے کے باوجود آج کے ادبی اکھاڑے کے چاروں طرف خاموش تماشائی ہو کر رہ گئے ہیں۔

پورے ملک میں سنجیدہ، باشعور، اور باذوق قارئین کا فقدان نہیں ہے مگر اُن کے کیا مسائل ہیں۔ اس بات پر توجہ دینے کی زحمت کوئی مول لینا نہیں چاہتا۔ پرچوں کے مدیر صرف پرچہ بند ہو جانے کی

دھمکیاں دینا جانتے ہیں۔ ادیب اور شاعر نے خود کو ذات کے خول کے اندر بند کیا ہے۔ اُن کے سامنے قارئین کا وجود کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ظاہر ہے کہ قارئین کے وجود کو جب تک فن کار تسلیم نہیں کرتا مسئلے کا کامل ممکن نہیں اور بہت ممکن ہے کہ یہ زبان اپنی چیستانی تخلیقات اور ادب کے ساتھ صرف پرچوں میں سمٹ کر رہ جائے اور یہ پرچے اور رسالے بغیر کسی اعلان کے دم توڑ دیں۔

ایک سنجیدہ قاری کو اس سے سروکار نہیں کہ آج کا ادبی رجحان ترقی پسند تحریک کی توسیع ہے یا اپنے طور پر بالکل آزاد اور خود مختار رویّہ۔ کیونکہ قاری کے سامنے تو صرف تخلیق ہوتی ہے اور اس تخلیق کے آئینے میں وہ عوامی آگہی، عوامی شعور، اپنے دُکھ درد کی جھلک اور اجتماعی و ذاتی مسائل کا پرتو دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کا مطالبہ ایک اچھی تخلیق سے اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ فنکار نے کس حد تک وقت کی آواز کو افسانے، نظم اور غزل یا ادب کی دوسری اصناف میں مقید کرنے کی سعیٔ بلیغ کی ہے اور کس حد تک اس کے ذوقِ جمالیات کو اس فن پارے سے تسکین ملتی ہے۔ انبساط حاصل ہوتا ہے اور روح کو بالیدگی نصیب ہوتی ہے۔

حکیم منظور
۱۳۔ حکیم منزل، اخون صاحب (گوجوارہ)
سرینگر کشمیر

ایک قاری کی حیثیت سے میرے کیا مسائل ہیں؟ اُن سے بحث کرنا یا اُن کی نشاندہی کرنا جتنا آسان ہے اُتنا ہی مشکل بھی ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ بحیثیت قاری میرا کوئی مسئلہ نہیں۔ مجھے جو کچھ پڑھنے کو ملتا ہے میں پڑھتا ہوں، جتنا سمجھ میں آتا ہے وہ سمجھتا ہوں اور جو سمجھ میں نہیں آتا اُسے نظر انداز کر دیتا ہوں میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ مجھے کچھ مسائل کا احساس صرف اُس وقت ہوتا ہے جب مجھے وہ کچھ پڑھنے کو نہیں ملتا، جو میری پسند، میرے مطلب، میرے معیار اور میرے ذوق کے مطابق ہو۔ مفصّل طور سے مسائل کا تعین کرنا میرے خیال میں اس بات کے فیصلے کے تابع وابستہ ہے کہ میں کس مزاج، معیار اور ذوق کا قاری ہوں؟ اگر میں ایک ایسا قاری ہوں جو ادب کا سنجیدہ مطالعہ کر کے اُسے سمجھنے اور اُس سے کچھ اخذ کرنے کا خواہش مند ہے تو میرے مسائل یقیناً اس قاری سے مختلف ہوں گے، جو مطالعۂ ادب کو وقت گذاری کا ایک ذریعہ خیال کرتا ہے۔ میرا کام اس وقت اردو ادب کے قارئین کی اقسام گنوانا نہیں، اپنے مسائل اجمالی طور پر بیان کرنا ہے۔

پچھلے کچھ برسوں کو زندگی کے ہر شعبے میں روایات اور مسلّمات کی شکست و ریخت کا زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ چونکہ ادب اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے اس لئے اس شکست و ریخت کی زد سے ادب بھی بچ نہیں سکا ہے۔ جہاں زندگی اور اس کے مسائل کی طرف بین الاقوامی طور پر ہمارے طرزِ فکر میں ایک بنیادی تبدیلی اور فرق نمودار ہوا، وہاں ادب میں بھی اس کے ردِ عمل کے طور پر نئے اسالیب، نئے انداز اور نئے ذہن نے جنم لیا۔ موجودہ دور کی بڑھتی ہوئی ٹیکنوکریسی (TECHNOCRACY) اور مشینیت نے قوموں کے دائرے سے نکل کر افراد اور فرد کو بھی متاثر کیا ہے۔ نتیجتہً جن افراد کے ہاتھوں میں قلم تھا انہوں نے اس کرب اور درد کو صفحۂ قرطاس پر پھیلا دیا جو ان افراد کو علی الخصوص اس دور نے تحفتاً عطا کئے۔ شاید یہ حقیقت ناقابلِ تردید ہے کہ موجودہ دور کا ذہن جتنا کرب آلود اور اُلجھا ہوا ہے اُتنا کسی بھی زمانے کا ذہن نہیں رہا ہے۔ ذہن کی یہ اُلجھن اور کرب ہمارے پچھلے کئی برسوں کے تخلیق شدہ ادب کے بیشتر حصّے میں کسی نہ کسی صورت میں نمودار ہوئے ہیں۔ چونکہ ذہنوں کا یہ الجھاؤ اور کرب کم و بیش ہر ایک کو نصیب ہے، اس لئے اس میں ایک قاری اور ایک ادیب کے الجھاؤ اور کرب میں بہت زیادہ فرق نہیں ہو سکتا، لیکن اس کے باوجود جہاں اس ادب کا بیشتر حصّہ میں ایک موجودہ دور کا ذہن رکھنے والے قاری کی حیثیت سے اچھی طرح سمجھتا ہوں، وہیں کچھ حصّہ یقیناً ایسا رہ جاتا ہے جو میری سمجھ سے بالاتر نہیں بلکہ بعید بھی ہے (مثالیں دینا اصل مسئلے سے ہٹ کر تنقید کی طرف آنا ہوگا اس لئے میں اس سے گریز کر رہا ہوں) ہو سکتا ہے کہ میرا ذہن اُس سرعت کے ساتھ بدلنے میں ناکام رہا ہو جس سرعت کے ساتھ ایسا ناقابلِ فہم ادب تخلیق کرنے والے قلم کاروں کا ذہن بدل گیا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسے قلم کار تقلیداً اور شعوری طور پر ایسا ادب تخلیق کر کے خود کو نمایاں کرتے ہوں۔ بہرحال اس مشینی دور میں جب کہ تصوّرِ وقت بھی اثر انداز ہوا ہے، ادبی معمّات حل کرنے میں وقت صرف کرنا بذاتِ خود ایک مسئلہ ہے، اور فی الوقت میرے لئے ایسے ادیب اور ایسا ادب دونوں ہی ایک مسئلہ ہیں۔ اسی طرح وہ ادب بھی میرا مسئلہ ہے جو زندگی کے جدید تصوّر اور اس کے موجودہ تقاضوں سے نا آشنا، فلسفۂ ارتقاء کے انکار کی حد تک قدامت زدہ ہے۔

میرا ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ میں جس ادب کا متمنی ہوں، یعنی ایسا ادب جو ناقابلِ فہم بھی نہیں اور قدامت زدہ بھی نہیں، وہ مجھے کہیں مجموعی صورت میں نہیں ملتا۔ موجودہ دور میں ادب بھی،

تجارتی سا ہو کر رہ گیا ہے۔ اس لئے جتنے بھی رسائل ہیں وہ خریداری کے مسئلہ کے پیشِ نظر ہر قسم کی تخلیقات سے پُر ہوتے ہیں اور ان میں میرے ذوق اور معیار کا بہت کم مواد ملتا ہے۔ پستش بہ غایت پست اور بلندش بسیار بلند کے مذاق کا نمونہ بیشتر کتابیں بھی ہیں اور بحیثیت قاری کے "کیا کیا خضر نے سکندر سے" والی بات مجھ پر صادق آتی ہے کیوں کہ کوئی بھی رسالہ یا کتاب مکمل طور پر میری تشنگی بجھانے کا سامان بہم نہیں کرتی۔

ادبی رسائل اور کتابوں کی دستیابی کا مسئلہ بھی میرے لئے بہت اہم ہے۔ میرے اپنے اندازے کے مطابق ملک میں چھپنے والی ۹۰ فیصدی سے زائد کتابیں اور رسائل میرے یہاں ملتے ہی نہیں۔ نہ پبلشر ہی اپنے تجارتی اصولوں کے پیشِ نظر میرے یہاں کے بک اسٹالوں اور کتب فروشوں کو قابلِ توجہ سمجھتے ہیں اور نہ ایسے کتب فروش اور بک اسٹالوں کے مالکوں کو ہی اپنے تجارتی اصولوں کے پیشِ نظر اس طرف توجہ کرنے کی کوئی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ براہِ راست منگوانے میں پبلشرز کی بے اعتنائی اور ڈاک کی بے انتظامی کا خدشہ ہمیشہ لاحق رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ رسائل اور کتابوں کی عدم دستیابی ایک بہت بڑے مسئلے کی حیثیت میں مجھے درپیش ہے۔

موجودہ دور میں کتابوں اور رسائل کے گٹ اپ کی بات خاصی اہم ہو گئی ہے۔ ہمارے یہاں بیشتر کتابوں اور رسائل کا گٹ اپ کسی بھی معیار سے معیاری نہیں ہوتا ہے اور ایسی کتاب اور رسالہ کے مواد سے جانکاری حاصل کئے بغیر اُسے خریدنے کو جی نہیں کرتا۔ اچھی طباعت اور اچھی کتابت کی اہمیت شاید کسی تفسیر یا تشریح کی محتاج نہیں مگر اسکے باوجود اکثر کتابوں اور رسالوں کی طباعت اور کتابت اتنی ناقص ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ بحیثیت قاری رسائل اور کتابوں کا غیر معیاری گٹ اپ اور ان کی ناقص کتابت اور طباعت بھی میرے مسائل میں شامل ہیں۔

ایک اور اور شاید سب سے بڑا مسئلہ کتابوں کی قیمتیں ہیں۔ رسائل کا ذکر میں اس لئے نہیں کرتا کہ وہ ایک ESTABLISHMENT کے تحت نکلتے ہیں اور اُن کے ذرائع اور اخراجات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، اُن کی قیمتوں کو ادب کے فروغ کے نام پر برداشت کرنا ہی پڑے گا۔ لیکن کتابوں کے بارے میں یہ صورتِ حال ناقابلِ فہم ہے۔ پچھلے برسوں میں سو ڈیڑھ سو سے کم صفحات والی کتابوں کی قیمت بھی دس روپے رکھی گئی۔ پچھلے دنوں کسی صاحب نے اپنی کتاب کی قیمت ۵۰۰ روپے مقرر فرمائی۔ ظاہر ہے کہ اس امر کے باوجود کہ میں ایک صاحبِ ذوق قاری ہوں میرے لئے یہ کتاب ہزار خواہش کے باوجود خریدنا ناممکن ہے۔

(باقی صفحہ ۲۶ پر)

بقیہ: مرکزی حکومت اور اُردو

ڈی اے وی پی: ڈائریکٹوریٹ آف ایڈورٹائزنگ اینڈ ویژول پبلسٹی ترقیاتی اسکیموں کے بارے میں مختلف کتابچے، فولڈر اور اشتہارات شائع کرتا ہے۔ یہ محکمہ اخبارات و رسائل کے لئے ایک نہایت اہم ذریعۂ آمدنی بھی ہے۔ کیونکہ یہ محکمہ مختلف وزارتوں کے اشتہارات و پوسٹر کی ڈیزائن بناتا ہے بلکہ ان کو مختلف رسالوں اور اخباروں میں چھپواتا بھی ہے۔ غیر سرکاری اشتہار کمپنیاں محض اس بنا پر اشتہارات دیتی ہیں کہ کسی جریدے کے خریداروں کی تعداد کتنی ہے۔ لیکن ڈی اے وی پی اشتہارات کی تقسیم میں چھوٹے اور متوسط جریدوں کا خاص خیال رکھتا ہے اور چونکہ اُردو کے نوے فی صدی جرائد اسی نوعیت کے ہیں لہٰذا ان کو خاص طور پر فائدہ پہنچتا ہے

آل انڈیا ریڈیو: آل انڈیا ریڈیو کے ۲۱ اسٹیشنوں سے اُردو میں پروگرام نشر ہوتے ہیں۔ یہ اسٹیشن ہیں، سرینگر، جموں، جالندھر، دہلی، لکھنؤ، الہ آباد، پٹنہ، رانچی، جے پور، بنگلور، دھارواڑ، حیدرآباد، وجے واڑہ، بھوپال، اندور، بمبئی، کلکتہ، شملہ، متھرا، ناگپور اور لیہہ۔ ان کے علاوہ ریڈیو کی ایکسٹرنل سروس سے روزانہ ساڑھے نو گھنٹے کا اُردو پروگرام نشر ہوتا ہے جس سے جناب سلام مچھلی شہری صاحب وابستہ ہیں۔ دوردرشن سے بھی وقتاً فوقتاً اُردو پروگرام نشر ہوتے رہتے ہیں۔ اُردو نشریات کے خاص مراکز سری نگر، دلی، حیدرآباد، لکھنؤ، پٹنہ، بھوپال اور جموں ہیں۔ دلی سے روزانہ اردو خبریں نشر ہوتی ہیں جنہیں سرینگر، جموں، جالندھر، شملہ، لکھنؤ، پٹنہ، رانچی اور حیدرآباد سے ریلے کیا جاتا ہے۔

دلی اسٹیشن سے ایک روزانہ پروگرام اردو مجلس" کے نام سے دوردرشن کے میٹروں پر نشر ہوتا ہے اس کے پروڈیوسر جناب رفعت سروش صاحب ہیں۔ ہیڈکوارٹرس میں ایک عرصے تک جناب ساغر نظامی صاحب ڈپٹی چیف پروڈیوسر اُردو رہے۔ اب اس عہدے پر جناب کمال احمد صدیقی صاحب تعینات ہیں۔

آئندہ شمارے کے
متوقع شرکاء

• قرۃ العین حیدر	• علی جواد زیدی	• ساغر نظامی
• جاں نثار اختر	• جگن ناتھ آزاد	• گوپی چند نارنگ
• ظہیر صدیقی	• شہریار	• سلام بن رزاق

— اور دوسرے —

حسینی شاہد
پرنسپل اُردو آرٹس شبینہ کالج، حمایت نگر، حیدرآباد

درسی کتابوں کا مسئلہ

ہم بنیادی مسائل پر کم توجہ دیتے اور فروعات پر زیادہ خیال آرائی کرتے ہیں اُردو تحریک بھی اسی کوتاہی کا شکار رہی ہے جب کبھی موقع ملتا ہے ہم حکومت پر نکتہ چینی سے نہیں چوکتے لیکن خود اپنا محاسبہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مرکزی اور ریاستی حکومتوں نے اُردو کے تعلق سے غفلت برتی ہے اور نظم و نسق اس کا حق پامال کرتا رہا ہے لیکن ہم کب اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہوئے ہیں۔

اُردو نصاب اور درسی کتابوں کے مسئلہ ہی کو لیجئے۔ ناساعد حالات کے باوجود اس بارے میں بہت کچھ کیا جا سکتا تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہم نے اس مسئلہ پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُردو کے نصاب سے طالب علم کو وحشت اور درسی کتابوں سے نفرت محسوس ہونے لگی ہے۔ ہمارے مقتدر اداروں کو جھنجھوڑا جاتا ہے تو کوئی کمیٹی بنادی جاتی ہے اور بس۔ کبھی کسی کانفرنس میں یہ مسئلہ زیرِ بحث آتا ہے۔ لیکن کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ کبھی اخبار اور رسائل میں مضامین اور اداریئے شائع ہوتے ہیں لیکن ان میں جو تجویزیں پیش کی جاتی ہیں اُن کو روبہ عمل لانے کی طرف توجہ نہیں دی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو نصاب اور درسی کتابوں کا مسئلہ سنگین صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اگر اس مسئلہ کو ہمارے اہلِ علم، اساتذہ اور ادارے آج بھی درخورِ اعتنا نہ سمجھیں تو اُردو تعلیم کی تباہی یقینی ہے۔

اُردو کی درسی کتابیں تین طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو اُردو کو ایک مضمونِ اختیاری کی حیثیت سے پڑھانے کے لئے مرتب کی جاتی ہیں۔ دوسری وہ جو اُردو کو بحیثیت زبان پڑھانے کے لئے ہیں اور تیسری وہ جو اُردو ذریعہ تعلیم کے طلبا کے لئے سائنس، اور سماجی علوم کی تعلیم کے لئے تصنیف، تالیف یا ترجمہ کی جاتی ہیں۔

پہلی شق کی کتابیں تو بُری بھلی مل جاتی ہیں لیکن دوسری اور تیسری شق سے تعلق رکھنے والی کتابیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔

اُردو ایک مضمون کی حیثیت سے ابتدائی درجوں سے لے کر یونیورسٹی کی سطح تک پڑھائی جاتی ہے۔ انٹرمیڈیٹ اور ڈگری کورس میں طلبہ علاقائی زبان یا زبانِ دوم کی حیثیت سے بھی اُردو لیتے ہیں۔ مدارس اور کالجوں سے ہٹ کر بھی اُردو پڑھنے والوں کا ایک گروہ ہے جو تعلیمِ بالغان کے تحت آتا ہے اور ان سب کی استعداد، نفسیات اور ضرورتیں مختلف ہوتی ہیں۔ اس لئے ہر گروہ کی درسی کتابوں کی نوعیت بھی علیحدہ ہونی چاہئے۔

درسی کتابوں میں قاعدے کو جو اہمیت حاصل ہے وہ کسی سے بھی پوشیدہ نہیں لیکن اُردو کے طالب علم کی بدقسمتی اور اُردو تعلیم کی کم مائیگی کا پورا پورا اندازہ اُردو قاعدے سے لگایا جا سکتا ہے یوں تو بازار میں بیسیوں قاعدے مل جائیں گے لیکن ان میں ڈھنگ کا شاید ہی نظر آئے۔ اکثر قاعدوں کی کتابت ناقص، طباعت بُری، اور کاغذ اس قدر گھٹیا ہوتا ہے کہ بچہ ان کی طرف دیکھنا تک گوارا نہیں کرتا جن کی طباعت کتابت اور گٹ اپ نسبتاً بہتر ہوتا ہے وہ اپنے دقیانوسی طرز کی وجہ سے کارآمد نہیں ہوتے۔ ایسا قاعدہ آپ کو شاید ہی ملے گا جو صوری اور معنوی ہر دو اعتبار سے جدید معیار پر پورا اترتا ہو اور جس کو انگریزی زبان کے قاعدوں کے مقابل نہ سہی خود ہندوستان کی کسی اور زبان کے قاعدے کے مقابلے میں پیش کیا جا سکے۔ اِدھر چند سال پہلے حکومت مہاراشٹرا کی طرف سے "اُردو بال بھارتی" کے نام سے ایک قاعدہ شائع ہوا تھا جو بہت اچھا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس معیار کے دو ایک قاعدے اور مل جائیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ اُردو کے ادارے بالخصوص انجمن ترقی اُردو ہند اس طرف توجہ کرے اور ان قاعدوں کو بنیاد بنا کر یا اپنے طور پر جدید اصولوں کی روشنی میں کوئی ایسا قاعدہ مرتب اور شائع کرے جو دیدہ زیب اور خوبصورت بھی ہو اور ہماری بنیادی تعلیم کی ضرورتوں کو بھی بہ وجوہِ احسن پورا کرے۔

قاعدے کے بعد ابتدائی اور پھر ثانوی اور اعلیٰ ثانوی سطح کی درسی کتابوں کا مسئلہ آتا ہے۔ یہ مرحلے بہت اہم ہیں۔ درس و تدریس کے اصولوں، مقاصد اور طریقِ کار کی تفصیل میں گئے بغیر اس موقع پر صرف یہ کہنا کافی ہوگا کہ ابتدائی مدارج میں طالب علم کو زبان سکھانا اور اُس کے ذخیرہ الفاظ میں تدریجاً اضافہ کرنا مقصود ہوتا ہے یہاں تک کہ اس میں لکھنے پڑھنے کی استعداد پیدا ہو جائے۔ اس لئے درسی کتابیں ایسی ہونی چاہئیں جن کا مقصد معلومات میں اضافہ کرنا نہیں بلکہ سائنٹفک انداز میں زبان سکھانا ہو۔

ہمارے ہاں بچوں کے ادب کا وہ ذخیرہ نہیں ہے جو نصابی ضرورتوں کی تکمیل کر سکے اور ہم میں کوئی آزاد اور اسمٰعیل میرٹھی بھی نہیں جو اس کمی کو خود سے پورا کر سکے۔ اس لئے یہ کام کسی ایک فرد سے لینے کی بجائے ایسے منتخب ماہرین سے لینا چاہئے جو بچوں کی نفسیات، ان کی ذہنی استعداد اور بدلے ہوئے لسانی اور سماجی ماحول سے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ اور جن میں درس و تدریس کو دلچسپ اور شگفتہ بنانے کی صلاحیت بھی ہو۔ رائج درسی کتابوں کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے مرتب کرنے والوں میں اکثر وہ ہیں جو ان صلاحیتوں سے بڑی حد تک محروم ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کتابوں سے بچوں کو نہ کسی قسم کی دلچسپی ہوتی ہے اور نہ وہ زبان سیکھنے کی طرف مائل ہوتے ہیں۔

ثانوی سطح پر زبان کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ادب سے بھی روشناس کرایا جاتا ہے۔ توقع کی جاتی ہے کہ یہ مرحلہ ختم کرتے کرتے طالب علم کو زبان پر ایک حد تک قدرت اور ادب سے واقفیت پیدا ہو جائے گی۔ وہ آسانی کے ساتھ صحیح زبان میں اپنے مافی الضمیر کو ادا کر سکے گا۔ اس لئے ثانوی سطح کی درسی کتابوں کے مرتبین پر دوہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ایک تو زبان کی استعداد بڑھانے کی رفتار کو تیز کرنا اور دوسرے درجہ بدرجہ ادب سے متعارف کرانا۔ اس مرحلے پر زبان کے ساتھ ساتھ موضوع مواد، اور اسلوب کو بھی اہمیت حاصل ہو تی جاتی ہے۔ ابتدائی سطح کے مقابلے میں ثانوی اور اعلیٰ ثانوی کی درسی کتابوں کا مرتب کرنا آسان ہے۔ اس لئے کہ مطلوبہ مواد کی فراہمی مشکل نہیں۔ لیکن یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ مرتبین اپنی سہل انگاری، کتابیں فراہم کرنے والے اداروں کی اجارہ داری یا محکمۂ تعلیم کی پالیسی کی وجہ سے ادھر کئی برسوں سے کوئی اچھا انتخاب پیش کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ آپ کوئی سی درسی کتاب اٹھا لیجئے اور پوری کتاب آغاز سے خاتمے تک پڑھ جائیے، یہ اندازہ کرنا مشکل ہوگا کہ انتخاب کن اصولوں کے تحت اور کن مقاصد کے پیش نظر کیا گیا ہے یا وہ طلبا کی کن ضرورتوں کی تکمیل کرتا ہے۔ اس کوتاہی کی حسب ذیل وجوہ ہو سکتی ہیں۔

۱۔ درسی کتابیں کسی مقصد اور منصوبے کے تحت ترتیب نہیں دی جاتیں بلکہ فلموں کی طرح ایک فارمولے کے تحت مرتب کی جاتی ہیں۔

۲۔ مرتب تلاش، جستجو اور انتخاب کی زحمت گوارا نہیں کرتا بلکہ پانچ سات پرانی نصابی کتابیں سامنے رکھ لیتا ہے۔ کہیں سے ایک نظم لے لی اور کہیں سے ایک مضمون، کسی مجموعے سے چند غزلیں نقل کر لیں اور کسی کتاب سے مثنوی اور مرثیہ۔ لیجئے کتاب تیار ہو گئی۔ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ جوڑا۔

۳۔ بالعموم مرتبین نہ ان درجوں کا تدریسی تجربہ رکھتے ہیں اور نہ ان طلبہ کی استعداد، ضرورتوں اور نفسیات سے واقف ہوتے ہیں جن کے لئے وہ کتاب مرتب کرتے ہیں۔

۴۔ بدلے ہوئے حالات میں تعلیمی ضرورتوں اور طلبہ کی استعداد کو پیش نظر رکھنے کی بجائے مرتبین کو اپنی پسند اور اپنے معیار پر اصرار ہوتا ہے۔

آج اس بات کی ضرورت ہے کہ ابتدائی اور ثانوی جماعتوں کے نصاب کا ایک منصوبہ بنایا جائے۔ ابتدائی درجوں کی ضرورتیں اور مقاصد کچھ اور ہوتے ہیں اور ثانوی درجوں کے کچھ اور لیکن ان دونوں کے درمیان ربط ناگزیر ہے۔ اس لئے ان دونوں سطحوں کے مختلف درجوں کی درسی کتابوں کو ایک دوسرے سے بے تعلق نہیں رکھا جا سکتا بلکہ ان کا ایک جامع منصوبے کے تحت مرتب کیا جانا ضروری ہے۔

اس منصوبے کی تیاری اور اس کے تحت کتابوں کی ترتیب ایک ایسی کمیٹی کے سپرد کی جانی چاہئے۔ جو ابتدائی سے لے کر یونیورسٹی تک کے اساتذہ پر مشتمل ہو۔ اہم رول تو ابتدائی اور ثانوی مدارس کے اساتذہ کو انجام دینا ہوگا۔ لیکن یونیورسٹی کے اساتذہ کے علم اور جدید معلومات سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں یونیورسٹی کے اساتذہ جب انٹرمیڈیٹ، بی اے اور ایم اے کا نصاب تشکیل دیں گے تو اس تجربے سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔ ان کے سامنے مختلف مدارج کے طلبہ کی استعداد اور ان کے نصاب کی حقیقی اور واضح تصویر ہوگی۔ نتیجتاً مدارس اور کالج کے نصاب میں بھی ربط و تسلسل پیدا ہو جائے گا اور وہ خلیج پاٹی جا سکے گی۔ جو مختلف سطح کے نصابوں کے درمیان روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتی جا رہی ہے۔

نصاب اور درسی کتابوں کی تیاری کے موقع پر کھل کر بحث ہونی چاہئے کہ ثانوی اور اعلیٰ ثانوی کی منزل پر کس قسم کی نظم و نثر پڑھائی جائے۔ کیا یہ ضروری ہے کہ طلبہ کو تمام اصناف اور اسالیب سے واقف کرایا جائے یا چند منتخب اصناف اور اسالیب پر اکتفا کی جا سکتی ہے۔ کیا قدیم اور جدید ادب کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ غزل کو کس مرحلے پر شریک نصاب کرنا چاہئے اور کس رنگ کی غزلیں منتخب کی جانی چاہئیں کیا سودا اور ذوق کے قصائد اور فسانۂ عجائب کی نثر کے انتخاب کی روایت آج بھی جاری رہنی چاہئے ــــ ان مسائل پر حقیقت پسندانہ اور معروضی نقطۂ نظر سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ لکیر پیٹنے سے کام نہیں چلے گا۔ معیار کی دہائی دینے اور طلبہ کی بدذوقی کا ماتم کرنے سے مسائل حل نہیں ہوں گے۔ ہمیں طلبہ کے معیار کو بلند کرنے اور ان میں زبان و ادب کا شعور پیدا کرنے کے لئے

مفروضوں کی بجائے حقیقت کو رہ نما بنانا چاہئے۔

سرسری مطالعہ کی کتابوں کی حالت نکسٹ کے مقابلے میں اور زیادہ بری ہے جس کی وجہ سے ان کتابوں کی حیثیت اردو نصاب میں انگشت ششم کی ہو کر رہ گئی ہے حالانکہ ان کے ذریعہ ادب کا ذوق اور مطالعہ کا شوق پیدا کیا جا سکتا ہے۔ ذہن کی تعمیر اور سماجی شعور کی تربیت کی جا سکتی ہے، ادبیات عالیہ سے واقفیت بہم پہنچائی جا سکتی ہے، قومیت کے احساس اور انسان دوستی کے جذبات کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔

ترقی یافتہ زبانوں میں طلبا کی عمر اور استعداد کے مطابق ادبیات عالیہ کے خلاصے تیار کیے جاتے ہیں، اردو میں ان کا فقدان ہے۔ سرسری مطالعہ کے لئے ایسی کتابیں تیار کی جا سکتی ہیں۔

پری یونی ورسٹی اور انٹرمیڈیٹ دراصل ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی درمیانی کڑی ہیں۔ اس لئے اس مرحلے کے لیے ایسی درسی کتابیں تیار کی جانی چاہئیں جو ایک طرف عبوری دور کے تقاضوں کی تکمیل کرتی ہوں تو دوسری طرف اگلی منزل کے لئے طلبا کو تیار کرنے میں مدد دیتی ہوں۔ اس مرحلے پر ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے اساتذہ میں مکمل تعاون ضروری ہے۔

بی اے کے لئے بالعموم درسی کتابیں مرتب نہیں جاتیں بلکہ مستقل تصانیف یا ان کے اجزا کو نصاب میں شامل کیا جاتا ہے، مثلاً چند ہم عصر، دنیا کی کہانی، تنقیدی مضامین کا کوئی مجموعہ، نذیر احمد کا کوئی ناول، کوئی ڈرامہ، گلزار نسیم یا سحر البیان، دیوان غالب کی کوئی ردیف، بانگ درا یا بال جبریل کا ایک حصہ، اس کے علاوہ، تاریخ ادب اور عروض و بلاغت کے بعض جامعات میں ان کتابوں کے علاوہ نظم و نثر کا نمایندہ انتخاب بھی پڑھایا جاتا ہے۔ یہ طریقہ زیادہ مفید اور طلبہ کے لئے سہولت بخش ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر محمد حسن نے یونی ورسٹی کے لئے اردو نصاب کے جو خاکے پیش کئے ہیں ان کو بحث مباحثہ کے بعد قبول کیا جا سکتا ہے۔ مقامی ضروریات کے تحت ہر جامعہ اس میں ضروری ترمیم و اضافہ کر سکتی ہے۔

بی اے اور ایم اے میں جو کتابیں شریک نصاب ہیں (بالخصوص کلاسیکی ادب)، ان کے مستند تنقیدی متن کتابت و طباعت کی صحت کے ساتھ شائع ہونے چاہئیں۔ ہمارے ہاں اصول تنقید اور تاریخ ادب نصاب میں شامل ہے لیکن ان موضوعات پر مستند اور جامع کتابوں کا کال ہے۔ اس کمی کو جس قدر ممکن ہو سکے پورا ہونا چاہئے۔

زبان دوم کی درسی کتابیں ہمارے ذہنی دیوالیہ پن کا ثبوت ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اختیاری مضمون اور زبان دوم کا بنیادی فرق ہماری نظروں سے اوجھل ہے۔ یہی باعث ہے کہ اختیاری مضمون کے لئے جو درسی کتابیں رائج ہیں اکثر صورتوں میں انہیں کو اگلی جماعتوں میں زبان دوم کی حیثیت سے پڑھایا جاتا ہے۔ کالج کی سطح پر زبان دوم کے طلبا کو کم و بیش تمام اصناف سخن سے واقف کرانا ضروری سمجھا جاتا ہے اور انہیں قدیم و جدید شعرا کا اسی معیار کا کلام پڑھنا ہوتا ہے جو ادب کے طلبہ کو پڑھایا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں چند سال پہلے تو ان پر ادبی تاریخ بھی مسلط کر دی گئی تھی جو مضمون اختیاری کے طلبا کے لئے بھی ٹیڑھی کھیر ہے۔

میرے خیال میں زبان دوم کی مروجہ تمام کتابوں کو نصاب سے خارج کر کے ان کی جگہ ایسی کتابیں رائج کی جانی چاہئیں جو زبان کی تعلیم کے لئے خاص طور پر مرتب کی گئی ہوں۔ ان کتابوں کا بنیادی مقصد یہ ہونا چاہئے کہ طلبا کو زبان پر قدرت پیدا ہو اور وہ آسانی اور کامیابی کے ساتھ اپنا مافی الضمیر ادا کر سکیں۔ انہیں ادبی زبان یا تخلیقی اسلوب کے مقابلے میں سائنٹفک زبان اور اسلوب کی ضرورت ہوتی ہے مناسب تو یہ ہوگا کہ کالج کی سطح پر آرٹس اور سائنس کے طلباء کے لئے الگ الگ درسی کتابیں مرتب کی جائیں۔ اگر ہمارے ماہرین کو اصرار ہو کہ زبان دوم کے طلبا کو ادب سے بھی آشنا ہونا چاہئے تو اچھی زبان کے نمونے اس مقصد کی تکمیل کر سکتے ہیں۔

وہ طلبا جو زبان دوم کی حیثیت سے اردو لیتے ہیں ادب کا غیر ضروری بوجھ اٹھانے اور فرسودہ روایتی معیار کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کالجوں میں اردو زبان دوم کی حیثیت سے پڑھنے والے طلبا کی تعداد برابر گرتی جا رہی ہے وہ بدیسی یا کلاسیکل زبان لے رہے ہیں۔ اس صورت حال پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے اور اس کا مداوا کرنے کی ضرورت ہے۔

اردو درسی کتابوں کی دوسری شق کے تحت علوم عمرانی، سائنس اور کامرس وغیرہ کی کتابیں آتی ہیں۔ ان کتابوں کا رواج سب سے زیادہ حیدر آباد میں رہا ہے اس لئے کہ یہیں ابتدائی سے لے کر یونی ورسٹی سطح تک اردو ذریعہ تعلیم تھی۔ یہاں سائنس، طب اور انجینئرنگ جیسے مضامین بھی ایک مدت تک اردو میں پڑھائے جاتے رہے ہیں۔ اس ضمن میں دارالترجمہ اور اس کے باہر سینکڑوں درسی اور غیر درسی کتابیں ترجمہ، تالیف یا تصنیف ہوئیں۔ عثمانیہ یونی ورسٹی میں ذریعۂ تعلیم کی تبدیلی کے بعد یہ کام بڑی حد تک رک گیا۔

۱۹۶۲ء میں جامعۂ عثمانیہ کا تجربہ چھوٹے پیمانے پر دوبارہ کیا گیا۔ اور اردو آرٹس کالج قائم ہوا۔ جہاں ہیومینیٹیز اور کامرس کی تعلیم اردو میں ہوتی ہے۔ اردو آرٹس کالج کے قیام سے کالج کی سطح پر اردو ذریعۂ تعلیم کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ انوار العلوم اور ممتاز کالج نے بھی جو دراصل انگریزی ذریعۂ تعلیم کے کالج ہیں، اب اردو ذریعۂ تعلیم کی متوازی

جماعتیں کھول دی ہیں۔ پچھلے سال لڑکیوں کا ایک ڈگری کالج بھی قائم ہو چکا ہے۔ گورنمنٹ اور خانگی انٹرمیڈیٹ کالج ان کے علاوہ ہیں۔ ان تمام کالجوں کے طلبا، علوم عمرانی، سائنس اور کامرس کی درسی کتابوں سے محروم ہیں۔

ثانوی مدارس میں اُردو ذریعۂ تعلیم کا سلسلہ ٹوٹنے نہیں پایا تھا۔ اس لئے مختلف مضامین کی بھلی بُری کتابیں مل جاتی ہیں۔ مہاراشٹر گجرات، میسور، بہار، مغربی بنگال، اور دہلی میں بھی اُردو ذریعۂ تعلیم کے ثانوی مدارس ہیں۔ یہاں کے طلبا بھی درسی کتب کی دشواریوں کا سامنا کر رہے ہوں گے۔

ترقی اُردو بورڈ سے توقع تھی کہ وہ اُردو ذریعۂ تعلیم کی اب بنیادی اور فوری ضرورتوں کی تکمیل کا منصوبہ بناتا لیکن افسوس ہے کہ اس نے اب تک اس سلسلے میں کوئی توجہ نہیں دی ہے جس طرح ملک بھر میں ثانوی مدارس اور ڈگری کالجوں کا جال پھیلائے بغیر اُردو یونی ورسٹی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا اسی طرح ثانوی درجوں، انٹرمیڈیٹ اور ڈگری کورس کی نصابی کتابوں کی تیاری کے بغیر یونی ورسٹی کی اعلیٰ سطح کی کتابوں کے تراجم (جن کی فوری ضرورت نہیں ہے) سے اُردو ذریعۂ تعلیم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

زیرِ بحث کتابوں کی تیاری کے سلسلے میں اصطلاحات کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم ہے۔ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں علمی اور سائنسی ادب کی روایت اُردو میں پرانی ہے۔ قدیم دلی کالج، شمس الامراء کے ادارے، سائنٹفک سوسائٹی اور بالخصوص دارالترجمہ جامعۂ عثمانیہ نے قابل قدر ذخیرہ چھوڑا ہے جس کو بنیاد بنا کر موجودہ ضرورتوں کی تکمیل کا منصوبہ بنایا جا سکتا ہے۔ دارالترجمہ کی اصطلاحوں پر یہ تنقید کی جاتی ہے کہ وہ بہت مشکل اور ادق ہیں۔ اصطلاحات کو آسان اور مشکل کے پیمانوں سے نہیں ناپا جاتا اچھی اصطلاح وہ ہے جو صحیح مفہوم ادا کرے، زبان کے مزاج کے مطابق ہو اور اس سے مشتقات بن سکتے ہوں۔ دارالترجمے کے ذخیرے میں ایسی اصطلاحوں کی کمی نہیں۔ جو اصطلاحیں اس معیار پر پوری نہیں اُترتیں اُنہیں رد کیا جا سکتا ہے۔ معترضین کو غالباً اس کا علم نہیں ہے کہ ایسی اصطلاحوں کو خود اہلِ حیدرآباد اسی دور میں رد کر چکے ہیں۔

مختصر یہ کہ دارالترجمے کے بعد پہلی بار اُردو بورڈ نے علوم عمرانی اور سائنسی کتابوں کے تالیف و ترجمے کا کام شروع کیا ہے تو اسے ماضی کے تجربے اور موجودہ ذخیرے سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ اگر معروف اور مروّج اصطلاحوں کی جگہ نئی اصطلاحیں رائج کرنے کی کوشش کی گئی تو درسی کتابیں چیستاں بن کر رہ جائیں گی اور اُردو ذریعۂ تعلیم بحران کا شکار ہو جائے گا۔

بقیہ: مصنف کے مسائل

اور مناسب و معقول داموں تک پڑھنے والوں کے پاس پہنچیں۔ صرف اسی صورت میں ہی مصنف کی آمدنی بڑھ سکتی ہے۔

ہمارے ملک میں جہاں غریبی عام ہے۔ سرکار زیادہ سے زیادہ تعداد میں تعلیمی ادارے اور کتب خانے قائم کرے تاکہ مصنف کی تخلیق آسانی اور کفایت سے عام لوگوں تک پہنچ سکے۔ پاکٹ بکس کا سلسلہ مصنف کی کاوشوں کو عوام تک پہنچانے میں خاصہ کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔

عوام کا رجوع معیاری کتابوں کی طرف کیسے کیا جائے، یہ بذاتِ خود ایک مسئلہ ہے اور اس کا تعلق ہماری تعلیمی پالیسی اور تعلیمی اداروں سے ہے۔ ایک مصنف کی طرح جب تک اُستاد کا اقتصادی رتبہ سماج میں بلند نہ ہوگا، تعلیمی ادارے اچھے اُستادوں سے محروم رہیں گے اور تعلیم کا معیار کبھی اُونچا نہ اُٹھ سکے گا۔ اگر تعلیم میں معیار کے بجائے تعداد کو ترجیح دی گئی تو عوام میں معیاری کتابوں کا ذوق کیوں کر پیدا ہو سکتا ہے۔

مصنف کے حقوق کے تحفظ کے لئے کاپی رائٹ ایکٹ ضرور موجود ہے لیکن کتنے لوگ اس ایکٹ سے واقف ہیں اور کتنے لوگ اس سلسلہ میں قانونی چارہ جوئی کرنے کی طاقت رکھتے ہیں؟ جہاں سماج کلیان کے ادارے کمزور طبقوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے قانونی سہولتیں مہیا کرنے کے لئے سوچ رہے ہیں وہاں اس بات کی بھی اتنی ہی شدید ضرورت ہے کہ مصنف کے حقوق کے تحفظ کے لئے بھی اس طرح کے کچھ قدم اٹھائے جائیں۔

جب تک مصنف اقتصادی اُلجھنوں سے نجات نہیں پا لیتا اور وہ دوئم یا سوئم درجے کا شہری رہتا ہے، وہ سماج کی ترقی میں لائق اعتنا حصہ ادا نہیں کر سکتا۔

بقیہ: اُردو اصطلاحات

موجودہ مرحلۂ اصطلاح سازی میں اگر یہ امر بھی ملحوظ رہے تو مناسب ہوگا کہ جو مادّے منتخب کئے جائیں وہ ممکنہ حد تک ہندوستان کی زبانوں اور خصوصاً آریائی زبانوں میں مشترک ہوں۔ اگر اس سمت میں سلیقے کے ساتھ قدم اٹھایا گیا تو زبانوں کی گوناگونی کے باوجود اصطلاحات کے کل ہند روپ کے لئے بنیادیں استوار ہو سکیں گی۔ ●●

شہباز حسین
پرنسپل پبلی کیشن آفیسر، ترقی اُردو بورڈ، نئی دہلی



ترجمہ کی اہمیت اور مسائل

ترجمہ بڑا مشکل کام ہے۔ یہ نگینہ جڑنے کا فن ہے جو بڑی مہارت اور ریاضت چاہتا ہے ایک زبان کے معانی اور مطالب کو دوسری زبان میں اس طرح منتقل کرنے کے لئے کہ اصل عبارت کی خوبی اور مطلب جوں کا توں باقی رہے دونوں زبانوں پر یکساں قدرت کی ضرورت ہوتی ہے جو عام طور پر کمیاب ہوتی ہے۔ ترجمے بہت ملتے ہیں۔ اچھے ترجمے خال خال ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو دو زبانیں جانتا ہے بزعم خود مترجم بن بیٹھتا ہے اور ایسے ایسے گل بوٹے کھلاتا ہے کہ ترجمے کی اہمیت اور افادیت مجروح ہو جاتی ہے اور ترجموں پر سے اعتبار اٹھ جاتا ہے۔

ذرائع آمد و رفت میں وسعت اور سرعت آجانے کی وجہ سے دنیا کی مختلف زبانیں بولنے والوں میں ارتباط و اختلاط روز بروز بڑھتا جا رہا ہے اور ایک دوسرے کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے ضرورتاً ایک دوسرے کی زبان سیکھنی پڑتی ہے۔ دور ملوکیت میں وہ افراد یا طبقے ہمیشہ ممتاز رہے جنہوں نے حاکموں کی زبان سیکھنے میں سبقت کی۔ حاکموں نے بھی محسوس کیا کہ امن و استحکام کے لئے صرف زور بازو ہی کافی نہیں ہے، دلوں کو بھی مسخر کرنے کی ضرورت ہے اور اس کے لئے محکوم قوموں کی زبان اور ثقافت سے بھی آشنائی ضروری ہے اجنبیت اور مغائرت کو کم کرنے میں ترجموں کا بڑا ہاتھ رہا ہے

علم کی وسعت اور علمی اور سائنسی دریافتوں کی کثرت سے بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچانے میں ترجموں نے بڑی مدد کی ہے۔ یورپ کے نشاۃ ثانیہ میں عربی کے تراجم کا بھی ہاتھ ہے۔ ترجمہ وہ کنجی ہے جس کے ذریعہ علوم و فنون کے خزانے سب کے لئے کھل جاتے ہیں۔ اسی لئے روز بروز ترجموں کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے اور ترجمے نے بھی تخلیق کا درجہ پالیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ترجمہ خواہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو اس میں اصل کے تمام محاسن آ ہی نہیں سکتے۔ یہ بات مشرقی ترجمے کے لئے یا ان زبانوں کے لئے تو ٹھیک ہے جو ابھی اتنی ترقی یافتہ نہیں ہیں جو ہر قسم کے معانی و مطالب کے اظہار پر قادر ہوں مگر دنیا کی ترقی یافتہ زبانیں اب اس مرحلے پر پہنچ گئی ہیں کہ وہ کم از کم نثری تخلیقات کو بجنسہ دوسری زبانوں میں منتقل کر سکیں۔ کسی دوسری زبان سے براہ راست استفادہ کرنے والے ہمیشہ تھوڑی تعداد میں ہوتے ہیں۔ لہذا ترجمے کی ضرورت ہمیشہ باقی رہے گی کیونکہ کالیداس، عمر خیام، اقبال اور ٹیگور کی عظمت کا اعتراف ترجموں کی بدولت ہی ہوا ہے۔

مغلیہ دور میں سنسکرت سے فارسی میں کافی ترجمے ہوئے۔ انگریزوں کی آمد کے بعد انگریزی سے مقامی زبانوں میں ترجموں کا سلسلہ شروع ہوا۔ فورٹ ولیم کالج میں انگریزی سے کسی کتاب کا ترجمہ اُردو میں نہیں ہوا لیکن عربی اور فارسی اور سنسکرت کے تراجم ضرور ہوئے۔ انگریزی سے اُردو میں ترجمہ شدہ پہلی کتاب بنجمن شلز کا ترجمہ انجیل مقدس ہے جو ۱۷۴۸ء میں شائع ہوئی بعدہٗ مرزا فطرت نے ول ہنیر کی مدد سے ۱۸۰۵ء میں انجیل کے "عہد جدید" کا ترجمہ شائع کیا بعد میں اکا دکا انفرادی کوششیں ہوتی رہیں۔ بعد میں امراء اور نوابین نے جو جدید علوم کی اشاعت اور فروغ میں دلچسپی رکھتے تھے ترجموں کی سرپرستی کی جیسے حیدرآباد کے نواب فخرالدین خاں شمس الامراء کی کوششوں سے بعض رسالے شائع ہوئے۔ رسالہ مختصر جرثقیل، رسالہ کسورات اعشاریہ، رسالہ اسطرلاب کروی، کیمسٹری کا مختصر رسالہ۔ شاہان اودھ نے بھی بعض کتابوں کے ترجمے کرائے اور مطبع سلطانی سے شائع کئے جیسے رسالہ ہیئت، رسالہ علوم طبعیہ، رسالہ قوت مقناطیس، رسالہ علم الحرارۃ، رسالہ علم المناظر وغیرہ لیکن ترجموں کی پہلی باضابطہ کوشش دہلی کالج میں ہوئی کیونکہ مغربی علوم کے پڑھانے میں سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ اُردو میں کتابیں دستیاب نہیں تھیں۔ لہذا "انجمن اشاعت علوم بذریعہ السنہ ملکی" یا دیسی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی" قائم ہوئی جس کا مقصد یہ تھا کہ جدید کتابوں کی تالیف اور ترجمے کے ذریعے ہندوستانی زبانوں کو ترقی دی جائے۔ انجمن نے ترجمے کے لئے جو قاعدے مقرر کئے تھے ان کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا:

۱۔ مترادف لفظ اُردو میں نہ ملے تو اصل لفظ استعمال کیا جائے۔

۲۔ سائنس کی کتابوں کا ترجمہ انگریزی سے ہوگا اس لئے انگریزی

الفاظ کا استعمال ناگزیر ہے۔

۳۔ ترجمہ لفظی نہ ہو بلکہ اس کا مفہوم اُردو میں ادا کرنے کی کوشش کی جائے۔

اس ادارے میں بہت سی کتابوں کا ترجمہ ہوا۔ غدر کے ہنگامہ میں یہ کالج بند ہوگیا اور پھر نہ کھلا۔ اس کے بعد دوسری قدرے منظم کوشش سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی کے تحت ہوئی۔ اور تاریخ، جغرافیہ، سائنس اور معاشیات کی متعدد کتابیں ترجمہ ہوئیں۔ اس کے بعد کے زمانے میں انگریزی تعلیم کے عام ہو جانے کی وجہ سے بہت سے مترجم پیدا ہو گئے لیکن یہ تراجم زیادہ تر ناولوں، ڈراموں، کہانیوں کے تھے۔ ذریعۂ تعلیم انگریزی تھا اس لئے نصابی ضرورتوں کے لئے ملکی زبان میں علوم کی کتابوں کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔

دراصل اُردو میں ترجموں کی سب سے منظم اور باضابطہ کوشش جامعہ عثمانیہ کے قیام (۱۹۱۷ء) کے بعد شروع ہوئی۔ کیونکہ جامعۂ عثمانیہ نے ذریعۂ تعلیم اُردو کو قرار دیا تھا جامعۂ عثمانیہ میں "سررشتہ تالیف و ترجمہ" قائم ہوا جس کے تحت ۵۰۰ کے قریب کتابیں ترجمہ ہوئیں۔ یہ کتابیں آرٹس اور سائنس، انجینئرنگ اور میڈیسن تقریباً تمام جدید علوم پر حاوی تھیں۔ ہندوستان کی کسی زبان میں اعلیٰ تعلیم دینے کا یہ پہلا تجربہ تھا جو بحیثیت مجموعی کامیاب رہا۔

دارالترجمہ میں دو طرح کے رکن تھے۔ ایک وہ جو مستقل اس کے رکن تھے اور دوسرے وہ جو اجرت پر کام کرتے تھے۔ ترجمے کی تکمیل کے بعد کسی ماہرِ فن سے اس پر نظرثانی کرائی جاتی اور پھر ادبی ناظر زبان و بیان کی اصلاح کے لحاظ سے نظرثانی کرتے اور کتاب شائع ہوجاتی۔ ترجمہ کے دوران مترجمین ایسے الفاظ اور اصطلاحات کی فہرستیں متعلقہ مجالسِ وضع اصطلاحات میں بھیجتے رہتے تھے جن کے مترادف الفاظ اردو میں نہیں تھے۔ اس مجلس کے اراکین میں علم کے ماہرین کے علاوہ عربی، فارسی، اُردو اور ہندی میں دستگاہ رکھنے والے بھی شامل ہوتے تھے جو زبان کی ادبی اور لسانی خصوصیات کو مدنظر رکھتے تھے اُردو کے دامن کو مالا مال کرنے میں دارالترجمہ نے بڑا نمایاں حصہ لیا ہے۔

ترجمہ کے سلسلہ میں سب سے پہلی مشکل اصطلاحات کے سلسلے میں پیش آتی ہے۔ یہ مشکل سائنسی علوم کے سلسلے میں زیادہ محسوس ہوتی ہے کیونکہ اصطلاح ایک معین معنی دیتی ہے اور اس کے لئے ایسا متبادل لفظ ہونا چاہئے اسی طرح مخصوص معنی دیتی ہو۔ مثلاً TREATY یا AGREEMENT کے لئے اُردو میں سمجھوتہ یا معاہدہ استعمال ہوتا ہے۔ یہ طے نہیں ہے کہ AGREEMENT کے لئے معاہدہ اور TREATY کے لئے سمجھوتہ ہی استعمال ہوگا۔ لہٰذا جس کا جو جی چاہتا ہے استعمال کرلیتا ہے۔ یہ سہولت سائنس میں نہیں ہے۔ اسی طرح قوانین، اور قانون کی کتابوں یا عدالتوں کے فیصلوں کے ترجموں کے لئے بھی مخصوص اور معین الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا جہاں کہیں بھی ترجمے ہوئے اصطلاحات سازی بھی ہوئی۔ دارالترجمہ حیدرآباد نے وسیع پیمانے پر اصطلاحات وضع کیں۔ مولانا وحیدالدین سلیم نے اپنی بیش بہا تصنیف "وضع اصطلاحات" مرتب کی اور پہلی بار اصطلاحات وضع کرنے کے اصول مدون کئے جو آج بھی اتنے ہی کارآمد ہیں۔

اصطلاحات سازی کے سلسلے میں بعض ماہرین کا کہنا ہے کہ اصطلاحات کا ترجمہ نہیں کرنا چاہئے۔ ان کا کہنا ہے کہ انگریزی زبان کی اصطلاحوں کو تقریباً بین الاقوامی اصطلاحوں کا درجہ حاصل ہوگیا ہے لہٰذا ان کو جوں کا توں اپنا لینا چاہئے لیکن یہ صورت قابلِ عمل نہیں ہے۔ کیونکہ اصطلاحوں سے جو مشتقات بنتے ہیں ان کو اُردو میں جوں کا توں اپنا لینے سے بڑی قباحت پیدا ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ اب اصطلاحوں کی اتنی کثرت ہوگئی ہے کہ اُردو میں ان کے بے محابا استعمال سے عبارت بڑی عجیب و غریب ہوجائے گی۔ لہٰذا انہیں انگریزی اصطلاحوں کو اپنانا چاہئے۔ جو آسانی سے اُردو میں کھپ سکیں۔

ترجمے کے سلسلے میں بنیادی اور اولین شرط یہ ہے کہ جس زبان سے ترجمہ کرنا ہو اور جس زبان میں ترجمہ کرنا ہو دونوں پر قدرت حاصل ہو صرف اسی حد تک نہیں کہ دونوں زبان کے مطالب سمجھ میں آجائیں بلکہ زبان کی ساخت، مزاج اور اس کے تہذیبی پس منظر سے بھی اچھی آگاہی ہو۔ عام طور پر اُردو میں جو ترجمے دیکھنے میں آتے ہیں وہ ادھ کچرے سے ہوتے ہیں اور پڑھنے والا فوراً سمجھ جاتا ہے کہ عبارت ترجمہ کی ہوئی ہے کیوں کہ زبان اکھڑی اکھڑی سی ہوتی ہے اور جملوں کی ساخت بھی انگریزی جملوں کے مطابق ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ ترجمہ لفظ کا نہیں مفہوم کا کیا جاتا ہے یا دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اگر کسی بات کو اپنی زبان میں کہئے تو کس طرح کہئے۔ ایسا انداز اپنانے سے ترجمے کے عیوب دور ہوجاتے ہیں۔ یوں تو ہر معاملے میں عقلِ سلیم کی ضرورت ہوتی ہے مگر مترجم کے لیے تو یہ شرط کی حیثیت رکھتی ہے۔ عام طور پر ڈکشنری میں ایک لفظ کے کئی معنی دیئے ہوتے ہیں۔ اب سیاق و سباق کے مطابق مترجم صحیح لفظ

غزل

عارف نقشبندی ممبر پارلیمنٹ
۴، نارتھ ایونیو نئی دہلی

بن کر بگڑ رہا ہے پھر عشق کا فسانہ
تم کیوں بدل رہے ہو بدلا کرے زمانہ

کانٹے اُلجھ رہے ہیں دامن سے ہر قدم پر
کل تک تھا جن چمن میں پھولوں پہ آشیانہ

دیر و حرم میں بھٹکیں دُنیا کی خاک چھانیں
کافی ہے بندگی کو اک دل کا آستانہ

محدود کر نہ اپنی ہستی بیکراں کو
زنجیر پا ہے کیوں گلشن کہ آشیانہ

غنچے مٹا کے خود کو ہنستے ہیں پھول بن کر
آتا ہے مشکلوں سے انداز دلبرانہ

ذوقِ نظر ہی میرا زینت ہے دو جہاں کی
خونِ جگر ہے عارف رنگینیٔ فسانہ

کا انتخاب کرتا ہے اس کے لئے استعداد اور لیاقت تو خیر ضروری ہے ہی مگر سمجھ داری کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ مثلاً ایک جگہ ایک ترجمہ یہ دیکھا۔

'I solemnly dedicate myself for the service of the nation.'

'میں انتساب سے قوم کی خدمت کا عہد کرتا ہوں'

اب Dedicate کے معنی انتساب کے بھی ہیں مگر یہاں اس کا محل استعمال نہیں ہوگا جنگ کے زمانہ میں ایک ترجمہ اس طرح کیا ہوا دیکھا کہ ہوا باز بحفاظت تمام طیارے کو واپس لے آیا حالانکہ اس کی نظر کمزور تھی۔ "نظر کمزور تھی" انگریزی کے ان الفاظ کا ترجمہ تھا۔ Though the visibility was poor.' عقل سلیم سے معلوم ہو جائے گا کہ کوئی ایسا شخص ہوا باز نہیں بن سکتا جس کی نظر کمزور ہو۔ بعض دفعہ سیاق کو صحیح نہیں سمجھنے سے ترجمہ غلط ہو جاتا ہے۔ مثلاً

A Muslim is required to perform Haj without causing distress to his family.'

مفہوم یہ ہے کہ کسی مسلمان پر حج اس وقت فرض ہے جب اس کے فریضۂ حج پر چلے جانے سے اس کے خاندان کے لوگ کسی طرح کی مالی مشکلات میں نہ پھنس جائیں مگر ایک مترجم نے اس کا ترجمہ یوں کیا تھا "خاندان کو تنگ کئے بغیر حج کو جا سکتا ہے۔" بعض دفعہ عبارت کو صحیح نہ سمجھنے سے بالکل غلط ترجمہ ہو جاتا ہے جیسے Hold fast to truth کا ترجمہ سچائی کے لئے برت رکھنا۔ بعض دفعہ مترجم بالکل نا اہل ہوتا ہے جیسے Outstanding Scientist کا ترجمہ باہر نکلے ہوئے سائنسداں یا Steel Plants فولاد کے پودے۔ اس طرح کی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

ترجمہ محض ایک زبان کے خیالات کو دوسری زبان میں پلٹ دینے کا نام نہیں ہے بلکہ خیالات اور احساسات کو اس ترتیب کے ساتھ منتقل کرنے کا نام ہے کہ مصنف نے کس جگہ پر زور دیا ہے۔ کہاں پر طنز ہے۔ کہاں پر محاورہ یا روزمرہ بیان ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ صحیح ہے کہ ترجمے میں اصل کی ساری خوبیاں نہیں پیدا کی جا سکتیں لیکن بہت سی خوبیاں ضرور سمولی جا سکتی ہیں۔

اُردو میں اچھے ترجموں کی کمی رہی ہے خصوصاً علمی اور سائنسی موضوعات کے اچھے ترجمے کمیاب ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ رہی ہے کہ اُردو ذریعۂ تعلیم کبھی نہیں رہی۔ جب جامعہ عثمانیہ نے اُردو کو ذریعۂ تعلیم بنایا تو وہاں خاصی تعداد میں (۵ سو کے لگ بھگ) کتابوں کے ترجمے ہوئے اور اب ترقی اُردو بورڈ کے ذریعہ تقریباً سو کتابیں ترجمہ کرائی جا رہی ہیں۔ اس سلسلے میں مترجمین کو جو مشکلات پیش آ رہی ہیں وہ وہی ہیں جن کا ذکر اوپر آ چکا یعنی اصطلاحات کی کمی، اچھی انگریزی، اُردو ڈکشنری کی عدم موجودگی۔ عبدالحق صاحب کی ڈکشنری ۱۹۳۶ء میں تیار ہوئی تھی اس کے بعد سے لاکھوں الفاظ آ گئے ہیں یا الفاظ کے معنی اور استعمال بدل گئے ہیں۔ کسی اچھے نمونے کی کمی پھر اُردو کی اپنی نارسائی۔

فی الحال ترقی اُردو بورڈ وسیع پیمانے پر علمی اور سائنسی موضوعات پر تراجم کرا رہا ہے اس سلسلے میں تقریباً ہر موضوع کے مترجمین کو جامعۂ عثمانیہ کے دارالترجمہ کی وضع کردہ قدیم اصطلاحات مہیا کر دی گئی ہیں لیکن گزشتہ بیس سال کے عرصے میں سائنس اور علوم نے اتنی ترقی کی ہے جتنی کہ پچھلے دو سو برس میں نہیں ہوئی تھی۔ اور نہ صرف اصطلاحوں میں بے انتہا اضافہ ہوا ہے بلکہ قدیم اصطلاحوں کے معنی تک بدل گئے ہیں لہٰذا عثمانیہ کی اصطلاحیں ہماری رہنما ثابت ہو سکتی ہیں اور ایک مثال کے طور پر کام دے سکتی ہیں لیکن ہمارے لئے مکتفی نہیں ہو سکتیں۔ ہمیں تو آج خود کنواں کھود کر پانی پینا ہے۔

ترجمہ ایک مستقل فن ہے جو بڑی ریاضت چاہتا ہے۔ اخبار، ریڈیو اور اب تدریسی ضرورتوں کے تحت اردو ترجموں کی مانگ بڑھتی جا رہی ہے۔ ایک دو یونیورسٹیوں میں ترجمے کے شعبے کھل گئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ مزید یونیورسٹیوں میں یہ شعبے کھلیں۔ اُردو بورڈ کی ترجمہ کردہ کتابوں اور اصطلاحوں سے اس کام میں بہت مدد ملے گی۔

میر حسن
مدیر روزنامہ "سیاست" جواہر لال نہرو روڈ
حیدرآباد-۱



اُردو اصطلاحات
اہمیت اور مسائل

اب جب کہ اُردو کی فطری ترقی کی راہ سے رکاوٹیں دور ہو رہی ہیں۔ ملک کی مختلف ریاستوں میں مرکز کی ایما پر اُردو کی تعلیم اور اس کے علم و ادب کی نگہداشت اور توسیع کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں، اس زبان میں جدید سائنس اور علوم عمرانی سے متعلقہ معلومات کے ذخیرے میں اضافے کے لیے وسائل مہیا کئے جا رہے ہیں، مختلف مدارج کی درسی اور غیر درسی کتابیں تالیف و ترجمے کے ذریعہ مرتب کی جا رہی ہیں، نئے خیالات اور تصورات کے لئے موزوں الفاظ تلاش کرنے اور بنانے ہوں گے۔ اور حسب ضرورت وضع اصطلاحات کے کام کو آگے بڑھانا ہوگا۔

یہ امر موجب طمانیت ہے کہ ترقی اُردو بورڈ کے تحت اصطلاح سازی کا کام باضابطہ طور پر اور بڑے پیمانے پر شروع ہو چکا ہے۔ اس سے قبل راقم الحروف کو نشریات کے تعلق سے اصطلاحات سازی کے سلسلے میں اُردو ذریعۂ تعلیم کی جامعہ عثمانیہ کے ماہرین فن و زبان کی کمیٹیوں میں شریک ہونے، ان کی بحثوں میں حصہ لینے اور وضع اصطلاحات کے کام میں حتی المقدور ہاتھ بٹانے کا موقع ملا تھا۔ اس دور میں ایک رجحان یہ تھا کہ اصطلاح سازی کا جو کام پہلے ہندوستان کے مختلف حصوں میں ہو چکا ہو اس پر نظر رکھی جائے اور اس سے مناسب حد تک استفادہ کیا جائے۔

سائنس اور دوسرے کارآمد مغربی علوم کی کتابوں کے اُردو میں ترجمے کا کام آج سے کوئی پونے دو سو سال قبل ہی شروع ہو چکا تھا اور اس طویل مدت میں مختلف علوم عمرانی اور سائنس کی جو کتابیں اردو میں ترجمے کے ذریعہ داخل ہو چکی ہیں اُن کی تعداد اس قدر کثیر ہے کہ اگر صرف اُن کے نام ہی گنائے جائیں تو ایک ضخیم رسالہ تیار ہو جائے۔ مغربی تصانیف و تالیفات کے اُردو تراجم کے قدیم مراکز کلکتہ (فورٹ ولیم کالج) حیدرآباد (آندھرا پردیش) (نواب شمس الامراء) دہلی کالج، دہلی، دارالترجمۂ شاہانِ اودھ، لکھنؤ اور سائنٹفک سوسائٹی (قائم کردہ سر سید احمد خاں) علی گڑھ تھے۔ بعد کے دور میں انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد دارالمصنفین اعظم گڑھ، دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد، ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد اور اُردو اکیڈمی، جامعہ ملیہ دہلی نے اس کام کو آگے بڑھایا۔

سائنس کے موضوع پر قدیم ترین تراجم میں "بحر حکمت" مؤلفہ پادری پرکنز شامل ہے جس کا سن ترجمہ ۱۷۹۸ء ہے۔ اس میں اسٹیم یعنی بھاپ سے بحث کی گئی ہے اور اس کے کارآمد خواص پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسٹیم کے لئے دخان کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ اس میں استعمال شدہ چند اصطلاحیں، نقطۂ جوش، نقطۂ جوشش آب، نقطۂ انجماد وغیرہ ہیں۔ فیڈر کے لئے "ارزق" اور تھرمامیٹر کے لیے "تابدجہ نما" کی اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں۔ یہ کتاب لکھنؤ کے مطبع مسیحائی میں چھپی تھی جس کا ایک نسخہ کتب خانہ جامعۂ عثمانیہ میں موجود ہے ۱۸۱۱ء میں کپتان ٹامس روبک نے لغت جہازرانی شائع کی جس میں جہازرانی کی اصطلاحوں کے علاوہ ایسے الفاظ کا اُردو ترجمہ بھی کیا گیا ہے۔ جو کمانداروں کے لیے میدان جنگ اور بارکوں میں کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ انگریزی سے اُردو ترجمے کے سلسلہ میں فورٹ ولیم کالج کے ارباب کا کام زیادہ تر انگریزی اُردو لغات کی اشاعت تک محدود رہا۔ اس زمانے میں اُردو ترجمے کا دوسرا اہم مرکز حیدرآباد دکن تھا۔ امیر کبیر نواب فخر الدین خاں شمس الامراء نے مدارس اور رصدگاہ جہاں نما کے علاوہ ایک دارالترجمہ بھی ۱۸۴۴ء میں قائم کیا تھا جس کی کتابیں ان کے سنگی چھاپے خانے میں چھپتی تھیں۔ اُردو میں مغربی علوم کی کتابوں کے تراجم اور تدریس کی ایسی منظم انفرادی کوشش شاید ہی کسی اور نے کی ہوگی۔ شمس الامرا کے سررشتہ تالیف و ترجمہ سے شائع شدہ حسب ذیل کتابوں میں سے چند کتابیں حیدرآباد کے کتب خانوں میں دستیاب ہیں۔ "ستۂ شمسیہ" جو رسالۂ علم جر ثقیل، رسالۂ علم ہیئت، رسالۂ علم آب، رسالۂ علم ہوا، رسالۂ علم انظار پر مشتمل ہے۔ اور جس کے آخر میں علم مقناطیس پر مقالہ بھی شامل ہے۔ شمس الامراء کی دوسری کتابیں، کیمسٹری کا مختصر رسالہ، رسالہ مفتاح الافلاک، رسالۂ مختصر حیوانات مطلق، منتخب البصر (دوربین نما) ہیں۔ اس مرکز میں ایسڈ (ACID) کا ترجمہ "کھٹا" اور نائٹرک ایسڈ (NITRIC ACID) کا ترجمہ "شورے کا کھٹا" ہیڈرو اسٹاٹکس (HYDROSTATICS) اور آپٹکس (OPTICS) کے

لئے علم آب اور علم انظار کی اصطلاحیں وضع کی گئی تھیں جس کے لئے نوابان اودھ کے دارالترجمے کے اراکین غلام محی الدین حیدرآبادی، میرامال دہلوی، مسٹر جونس میسیو۔ بدوسی، رتن لال اور مسٹر جوزف تھے۔ بعض انگریزی اصطلاحوں کے لئے الفاظ اُردو میں نہیں ملے تو اُن کو اُن کی اصلی شکل میں برقرار رکھا گیا ہے۔ شمس الامرا کے دارالترجمہ کی وضع کردہ چند اصطلاحیں یہ ہیں۔

S"CKING P"MP	چوسنے کا پمپ
FORC" P"MP	زبردستی کا پمپ
MICROSCOP"	کلاں بیں
MONSOON	موسمی پون
R"FL"C"ING "EL"SCOPE	منعکس دُور بیں
PARALL"L RAYS	موازی شعاعیں
CONV"RG"N" RAYS	انقباضی شعاعیں
DIV"RG"N" RAYS	انبساطی شعاعیں
CON"UC"OR	موصل

'تبدیلی پون'، 'آلہ تحلیل'، 'مدامی پون'، جیسے الفاظ اور اصطلاحیں بھی استعمال کی گئی ہیں۔ چند کتابوں کے شروع میں اصطلاحات کی فہرست دی گئی ہے جن میں سے چند اصطلاحیں حسب ذیل ہیں۔

S"LPH"RIC ACID	گندھک کا کھٹا
M"RAIC ACID(?)	کھانے نمک کا کھٹا
"URM"RIC PAPER	ہلدی کے پتے کے رس میں بھگایا ہوا کاغذ

سنتھیسس (SYN"HESIS) انیلیسس (ANALYSIS)، تھرمامیٹر (THERMOM"TER) بوناميٹر (BAROM"T"R) جیسی بعض انگریزی اصطلاحیں بجنسہ استعمال کی گئی ہیں۔ اور بعض کا مطلب سمجھایا گیا ہے۔

اس عہد میں اُردو ترجمے کا کام لکھنؤ میں بھی ہوا۔ شاہان اودھ نے مغربی علوم و فنون کی بعض کتابوں کا ترجمہ کروایا جو مطبع سلطانی میں چھپ کر شائع ہوئیں۔ سید کمال الدین حیدر نے مغربی علوم کے ۱۹ رسالوں کا ترجمہ انگریزی سے اُردو میں کیا جس میں رسالہ ہیئت، رسالہ علم الہود، رسالہ علم الحرارت شامل ہیں۔

انیسویں صدی کے اواسط میں مغربی تصانیف کے اُردو تراجم کا ایک اہم دَور شروع ہوا۔ اس دَور سے قبل کی کوشش اس درجہ منظم اور وسیع پیمانے پر نہیں تھیں جتنی کہ دہلی کالج کی تھیں۔ اس کلیہ کے ارباب علم نے جس میں ماسٹر رام چندر بھی شامل تھے۔ ترجمے کی مشکلات کو حل کرنے کے لئے بعض اصول پہلی مرتبہ مرتب کئے جو یہ تھے کہ مترادف اُردو میں نہ ملے تو اصل لفظ استعمال کیا جائے۔ اُردو لفظ ملے تو وہی استعمال کیا جائے۔

سائنس کی کتابوں کا ترجمہ چونکہ انگریزی سے کیا جائے گا اس لئے انگریزی الفاظ کا اُردو میں استعمال ناگزیر ہے۔ انگریزی جملے میں اگر کسی ایسے واقع کی طرف اشارہ ہو جس سے اہل ہند ناواقف ہوں تو مترجم کو چاہئے، کہ حاشئے یا متن میں مختصر طور پر اُس کی تشریح کرے۔ ترجمہ لفظی نہ ہو بلکہ اُردو میں مفہوم ادا کرنے کی کوشش کی جائے۔ دہلی کالج کے مترجمین نے علم ہیئت، کیمسٹری، پولیٹیکل اکانومی، قانون مال، میکانیات، تاریخ عالم جغرافیہ طبیعی، مقناطیس، جراحی، حرکیات و سکونیات، علم المناظر، حرارت ہیڈرو اسٹاٹکس، علم برق اور طب سے متعلق کوئی ۱۳۰ کتابوں کا ترجمہ شائع کیا۔ رسالہ مقناطیس میں جو اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں۔

S"RONG M.GN"T	قوت ور مقناطیس
"O MAGN""IS:	مقناطیس کرنا
DIP AND INCLINA"ION	غرق و انحراف
A""RAC"ION AND R"P"LSION	جذب و اندفاع
FIBR	ریشہ
"X""RIM"N"	تجربہ

اس رسالے میں بیشتر اصطلاحات کا ترجمہ درج کیا گیا ہے صرف معدودے چند انگریزی الفاظ الیکٹریسٹی، کمپاس وغیرہ بجنسہ مستعمل ہوتے ہیں۔

سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی قائم شدہ ۱۸۶۳ء کو مغربی علوم اور سائنس کے تراجم اور اصطلاح سازی کے اعتبار سے کافی اہمیت حاصل ہے۔ اس سوسائٹی نے چھوٹی بڑی تقریباً چالیس کتابیں انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کروائیں۔ اس کی مطبوعات زیادہ تر تاریخ، سوانح، جغرافیہ، سیاسیات اور معاشیات پر مشتمل ہیں۔ سوسائٹی نے اصطلاحات کے ترجمے میں سلیقے کا ثبوت دیا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اُس کی وضع کردہ بعض اصطلاحیں یا تو اپنی اصلی حالت میں یا تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ اُردو میں مستقل طور پر داخل ہو گئیں۔ رسالہ انتظام مدن "پولیٹیکل اکانومی" POLI"ICAL "CONOMY کا ترجمہ ہے۔ ایلیمنٹس آف پولیٹیکل اکانومی (""M"NTS OF POLI"ICAL "CONOMY) کا ترجمہ جو اس سوسائٹی کی جانب سے شائع ہوا۔ اس کا نام "اصول سیاست مدن" ہے۔ اس مرکز میں وضع شدہ چند اصطلاحیں حسب ذیل ہیں۔

FAC"ORS OF PRO""C"ION	لوازم پیدائش
PRO""C"ION	پیدائش یا صنعت کاری
CONS""P"ION	صرف
"XCHANGE	مبادلہ

پیدا کرنے والی محنت	PRODUCTION LABOUR
غیر پیدا کرنے والی محنت .	UNPRODUCTIVE LABOUR
راس المال	CAPITAL
عمل بہ اتفاق	CO-OPERATION
اشیائے احتیاجات	NECESSITIES
سامانِ عیش و کامرانی	LUXURIES

اُردو میں جدید علوم عمرانی اور سائنس کی کتابوں کے ترجمے کا وسیع پیمانے پر ضروری اہتمام کے ساتھ انتظام جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ میں کیا گیا۔ جامعہ عثمانیہ کی جنرل کمیٹی نے جس میں زبان اور علم کا صحیح مذاق اور مہارت رکھنے والے بزرگ شامل تھے۔ یہ اہم مسئلہ کثرت رائے سے طے کر دیا تھا کہ انگریزی اصطلاحیں بجنسہ یا کسی تغیر و تبدل کے ساتھ اُردو زبان میں نہ لی جائیں۔ بلکہ انگریزی علمی اصطلاحوں کے مقابلے میں اُردو اصطلاحیں وضع کی جائیں۔ کمیٹی نے یہ بھی طے کیا تھا کہ جو علمی اصطلاحیں وضع کی جائیں اُن کے لئے الفاظ عربی، فارسی اور ہندی سے بے تکلف لئے جائیں۔ ان ہدایات کی روشنی میں جامعہ کے ماہرین نے اصطلاح سازی کے لئے نئی راہیں نکالی گئیں اور پروفیسر وحیدالدین سلیم پانی پتی نے محنت و کاوش سے وضع اصطلاحات کے اصول مرتب کئے۔ نئے الفاظ کی تلاش اور وضع اصطلاحات کے اغراض کے لئے اُردو کے ذخیرۂ الفاظ کا جائزہ لیا گیا مفرد اور مرکب الفاظ اور تراکیب کی ساخت اور مشتقات کے اصولوں کی جانچ کی گئی۔ حسب ضرورت دوسری زبانوں کے الفاظ کا استعمال جائز قرار پایا لیکن شرط یہ تھی کہ فارسی، عربی یا ہندی جس زبان سے بھی مادّہ لیا جائے وہ اُردو میں آنے کے بعد اُردو ہو جائے گا۔ اور اس پر اُردو قواعد کی چھاپ لگ جائے گی۔ اپنی عہد آفریں تالیف "وضع اصطلاحات" میں پروفیسر وحیدالدین سلیم نے اصطلاح سازی کے اصول، امکانات اور دشواریوں پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ وضع اصطلاحات کے میدان کو وسیع کرنے کے لئے اس امر کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ صوتی الفاظ گرامر اور دوسری خصوصیات کے اعتبار سے اُردو کا تعلق سنسکرت، ہندی، فارسی کی طرح آریائی خاندان السنہ سے ہے۔ اور اس خاندان السنہ سے تعلق کی بنا پر اس کا رشتہ انگریزی اور بعض دوسری مغربی زبانوں سے بھی جا ملتا ہے۔ نئے خیالات اور الفاظ کی تلاش اولاً خود اُردو ادب میں کی جانی چاہئے۔ یہ داخلی جائزہ مفید ثابت ہو سکتا ہے اور ممکن ہے موزوں الفاظ نئے خیالات اور اصطلاحوں کے لئے مل جائیں۔ دکنی ادب اور قدیم اُردو ادب ہندی سے قریب تر تھا جس میں سنسکرت کے الفاظ بھی مروج تھے اور مذہب و اخلاق سے متعلق ہندی اصطلاحیں اولیاء اللہ کی تحریروں میں بھی ملتی ہیں۔ یہ الفاظ بعد میں متروک ہو گئے مگر اب بہ شرطِ موزونیت انہیں پھر سے رائج کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اُردو کو آزاد ہندوستان میں ملک کی دوسری زبانوں کے دوش بدوش آگے بڑھنا ہے۔ پروفیسر سلیم اور اُن کے ہم نوا ہندی سے استفادے کے حامی تھے۔ اس بارے میں "وضع اصطلاحات" میں موصوف نے لکھا ہے۔

"(اُردو کے لئے) ہندی بمنزلہ زمین کے ہے۔ اس زمین پر فارسی اور عربی کے پودے لگائے گئے ہیں۔ اسی تختے پر غیر زبانوں نے آکر گل کاری کی ہے۔ اگر یہ زمین نکال دی جائے تو پھر اُردو کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہے گا۔ ہندی کو ہم اپنی زبان کے لئے اُم اللسان اور ہیولائے اوّل کہہ سکتے ہیں۔ اس کے بغیر ہماری زبان کی کوئی ہستی نہیں ہے۔ اس کی مدد کے بغیر ہم ایک جملہ بھی نہیں بول سکتے۔"

یہ خیال درست ہے اور وضع اصطلاحات میں اس کو رہنما بنایا جا سکتا ہے۔ وضع اصطلاحات میں اُردو کے مفرد الفاظ، مرکبات، تراکیب، اور مشتقات کا جائزہ لیا گیا ہے اور الفاظ کی ساخت کے اعتبار سے آریائی زبانوں کے مشترکہ اصولوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اُردو میں مرکب امتزاجی اور مرکب ارتباطی کی مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ جن کے نمونے پر نئی اصطلاحیں وضع کی جا سکتی ہیں۔ آریائی زبانوں کا ایک مشترک اصول سابقوں، لاحقوں، نیم سابقوں اور نیم لاحقوں کا استعمال ہے۔ جو مادے کے آگے پیچھے اضافہ کئے جاتے ہیں اور جن کی بدولت نئے مفاہیم پیدا ہوتے ہیں۔ پروفیسر سلیم نے عملاً ثابت کر دکھایا ہے کہ اس اصول کے تحت فارسی، عربی اور ہندی کے مادّوں کو استعمال کر کے بے شمار تراکیب اور اصطلاحات وضع کی جا سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر موصوف نے صرف ایک لفظ "برق" کے ساتھ سابقوں، لاحقوں، نیم سابقوں، نیم لاحقوں کا اضافہ کر کے (۲۰۰) سے زیادہ تراکیب اور اصطلاحات بنا ڈالیں۔ ایک اور اصول جو آریائی زبانوں میں مشترک ہے یہ ہے کہ ضرورت کے مطابق ہر لفظ سے فعل بنا لیا جائے جیسے انگریزی میں NATION سے NATIONALISE - NATURE سے NATURALISE . اسی طرح اُردو میں قوم سے قومانا یا قومیانہ برق سے برقانا، اُردو سے اُردوانا، ہندی سے ہندیانہ، مقناطیس سے مقنانا، ترشہ سے ترشانا، قلم سے قلمانہ، مرکز سے مرکزانا۔ نمک سے نمکانا جیسے افعال بنائے جا سکتے ہیں۔

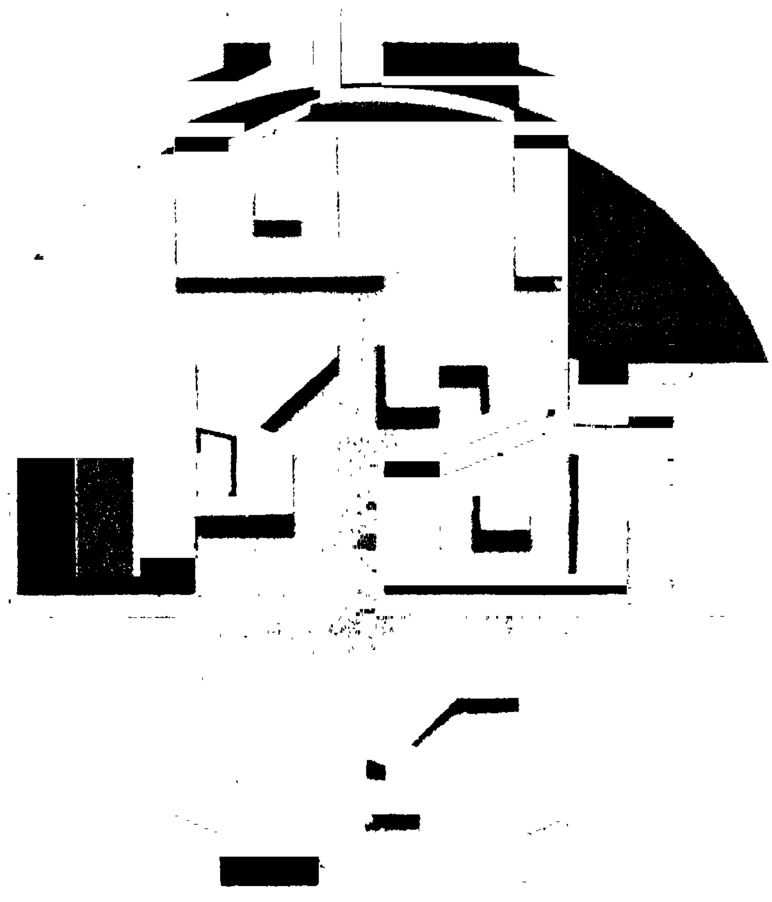
دارالترجمہ جامعۂ عثمانیہ کے طریق کار کے بارے میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ترجمہ طلب اصطلاحات کا انتخاب لغات یا گلاسری

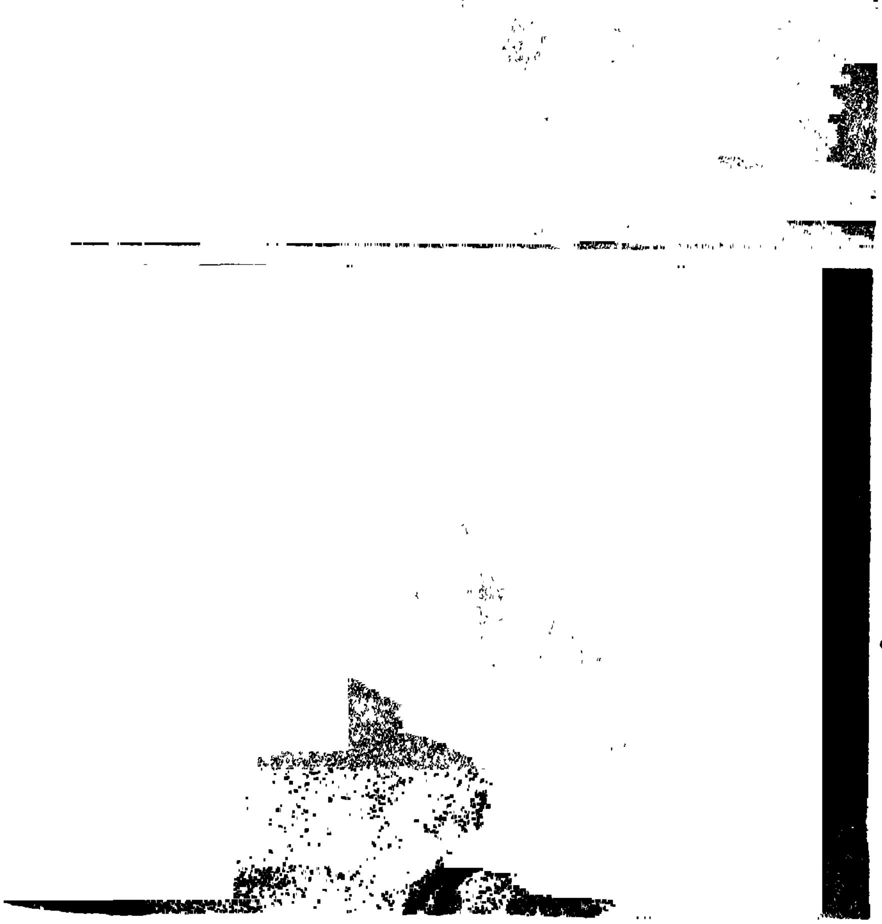
سے نہیں کیا جاتا تھا۔ جامعہ کی نصابی مجلسیں اپنی اپنی ضروریات کی کتابوں کا انتخاب کرتی تھیں جو ترجمے کے لیے دارالترجمہ روانہ کی جاتی تھیں۔ ترجمے کے دوران مترجمین ایسے الفاظ اور اصطلاحات کی فہرستیں متعلقہ مجالس وضع اصطلاحات میں بھیجتے تھے جن کے ترادفات انہیں اُردو میں نہ مل سکتے ہوں۔ مجالس وضع اصطلاحات کا کام جدید علوم کی ضروریات کے مطابق اُردو میں علمی اور فنی موزوں اور زرخیز اصطلاحیں یعنی ایسی اصطلاحیں وضع کرنا تھا جن سے مشتقات نکل سکیں۔ ان مجالس کے اراکین دو قسم کے ہوتے تھے۔ ایک وہ جو اس علم کے ماہر ہوں جس کا ترجمہ زیر غور تھا۔ اور دوسرے ایسے علما جو عربی فارسی اور اُردو میں کامل دستگاہ رکھتے ہوں۔ ماہرین زبان کی حیثیت سے مجالس وضع اصطلاحات میں شرکت کرنے والوں میں نواب حیدر یار جنگ نظم طباطبائی، علامہ عبداللہ عمادی، مولوی عبدالحق، مولانا عبدالہادی ندوی، وحید الدین سلیم پانی پتی اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور شامل تھے۔ اصطلاحات کی صحت و سقم اور اُردو کے لیے ان کے قابل قبول ہونے یا نہ ہونے کا اندازہ کالج کی جماعتوں میں تدریس کے دوران ایک حد تک ہو جاتا تھا۔

اصطلاح باہمی قرارداد اور آپس کی مفاہمت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اور اس لحاظ سے کسی لفظ یا ترکیب کے جو معنے مقرر کیے جائیں وہی متعلقہ گروہ میں سمجھے جائیں گے۔ اور یہ ضروری نہیں کہ اصطلاحی لفظ یا ترکیب میں متعلقہ تمام مفہوم موجود ہو۔ کسی چیز کے لیے چیز کے اصول کے تحت متعلق علم سے تعلق رکھنے والوں کے لیے خفیف سا اشارہ کافی ہو سکتا ہے۔ اصطلاح کی ضرورت یوں پیش آتی ہے کہ اگر اصطلاحیں جو خیالات کے تجزیے کی جانب رہبری کرتی ہیں، استعمال نہ کی جائیں تو مطالب کے اظہار میں طوالت سے بچا نہیں جا سکتا۔ اس کی ایک مثال شمس الامراء کے دارالترجمے کی کتاب "رسالہ کیمسٹری" میں ملتی ہے، جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے اور جس میں ٹرمرک پیپر کا ترجمہ نہیں کیا گیا بلکہ مطلب سمجھانے کے لیے "ہلدی کے پتے کے رس میں بھگایا ہوا کاغذ" لکھا گیا ہے۔ یہ اصلاح متن میں بار بار آتی ہے اور ہر جگہ "ہلدی کے پتے کے رس میں بھگایا ہوا کاغذ" لکھا گیا ہے اس طول لاطائل سے بچنے کے لیے اصطلاح سازی ضروری ہے۔ تجربے سے ثابت ہو چکا ہے کہ ناموزوں اور بے ضرورت اصطلاحیں مفقود ہو جاتی ہیں۔ جیسے آکسیجن (OXYGEN) کا ترجمہ مایئن ہائیڈروجن (HYDROGEN) کا ترجمہ حمیضن مقبول نہیں ہوا۔ ان ناموں کے ترجمے کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں یہ تمام بجنسہٖ مستعمل ہیں۔ اصطلاح اور معمولی طرز اظہار میں فرق بھی ضروری ہے۔ مثال کے طور پر پچھلے صفحات میں اصطلاحات کا جو ترجمہ درج کیا گیا ہے۔ ان میں سے بعض صحیح معنے میں اصطلاحیں نہیں ہیں اور ان سے مشتقات بھی نہیں نکل سکے۔ جیسے "پیدا کرنے والی محنت"، "غیر پیدا کرنے والی محنت" اور اب ان کی بجائے "محنت پیدا آور" اور "محنت غیر پیدا آور" کی اصطلاحیں مروج ہیں۔ پولیٹیکل اکانومی (POLITICAL ECONOMY) کا ترجمہ ابتداً "علم انتظام مدن" کیا گیا۔ پھر اس کے لیے "علم سیاست مدن" "علم الاقتصاد" اور "اقتصادیات" کی اصطلاحیں بنیں۔ اور بالآخر "معاشیات" کی اصطلاح مقبول ہوئی۔ ایسڈ (ACID) کا ترجمہ بھی ارتقا کی منزلیں طے کر کے کھٹے سے ترشہ اور بالآخر تیزاب بن گیا۔ تھرمامیٹر (THERMOMETER) کا ترجمہ ابتدا میں "تابدرجہ نما" تھا۔ اس کے بعد "مقیاس الحرارت" ہوا۔ پھر "حرارت پیما"، اور بالآخر "تپش پیما" لیکن تھرمامیٹر اپنی اصلی شکل میں زیادہ قابل قبول ثابت ہوا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ چیزوں کے نام کا ترجمہ ضروری نہیں جب تک یہ نام اُردو کے لیے قطعاً ناقابل قبول نہ ہوں اور کثرت ہونت کے ساتھ زبان پر رواں نہ ہو سکتے ہوں۔ اس سلسلے میں ٹرمرک پیپر کا ترجمہ بھی قابل ذکر ہے جو ابتدا میں "ہلدی کے پتے کے رس میں بھگایا ہوا کاغذ" کیا گیا۔ پھر "ہلدی رس کاغذ" ہوا۔ اور بالآخر جامعہ عثمانیہ میں "ہلدی کاغذ" ہو گیا۔

غرض وضع اصطلاحات سے متعلقہ مسائل بہت سے ہیں۔ لیکن ہندی، فارسی، عربی جس زبان سے بھی موزوں مفید اور گوش آشنا مادہ مل سکے لیا جا سکتا ہے۔ دقت زیادہ تر دو یا دو سے زیادہ لفظوں کے باہمی ربط کے معاملے میں پیش آتی ہے ضرورت ہے کہ ہندی اور دوسری آریائی زبانوں اور ہندوستان کی دوسری زبانوں کے مانوس اور موزوں الفاظ کے ساتھ عربی، فارسی جوڑ جائز سمجھا جائے۔ ان الفاظ کے ساتھ عربی، فارسی سابقے اور لاحقے بے تکلف استعمال کیے جائیں جس کی مثالیں اُردو میں موجود ہیں۔ جیسے سمجھدار۔ بے کل، بے چین، اگالدان وغیرہ۔ جو اصطلاحیں مروج ہیں ان کو برقرار رکھنے کا اہتمام بھی ضروری ہے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جائے تو اس وقت تک جو کتابیں شائع ہو چکی ہیں وہ بے کار ہو جائیں گی۔ ان سب سے بیشتر اصطلاحات کا پتہ دوسرے ذرائع کے علاوہ دارالترجمہ کی مطبوعات "فرہنگ اصطلاحات علمیہ" اور "اصطلاحات پیشہ وراں" کے علاوہ جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل ماہرین سائنس و عمرانیات کی اُردو تالیفات کی مدد سے چلایا جا سکتا ہے۔

(بقیہ صفحہ ۱۴۱ پر)





رفیقِ سفر اور جانشین

"جب سے ہم دونوں کا ساتھ ہوا
تبھی سے ہم بہت سی باتوں پر اختلاف
رائے رکھتے ہیں۔ پھر بھی میں کئی
برسوں سے کہتا آیا ہوں اور
اب پھر کہتا ہوں کہ راجاجی نہیں
بلکہ جواہر لال میرا جانشین ہوگا۔ وہ
کہتا ہے کہ نہ وہ میری زبان سمجھتا
ہے اور نہ میں اس کی۔ یہ بات چاہے
غلط ہو یا صحیح لیکن دلوں کے میل
میں زبان حائل نہیں ہو سکتی۔
اور مجھے یقین ہے کہ جب میں
نہ ہوں گا تب وہ میری ہی
بولی بولے گا۔"

مہاتما گاندھی

ترتیب

سرورق: قیصر سرمست

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر "آج کل" (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

اردو کا مقبول عام مصور ماہنامہ

آج کل

نئی دہلی

ایڈیٹر
مہدی عباس حسینی

ٹیلی فون ۳۸۷۰۶۹

سب ایڈیٹر
نند کشور وکرم

جلد ۳۲ — نمبر ۴
نومبر ۱۹۷۳ء
کارتک اگرہائن ۱۸۹۵

شرح چندہ
سالانہ: ہندوستان میں، سات روپے
دیگر ممالک میں: ۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر
فی پرچہ، ہندوستان میں: ۶۰ پیسے
دیگر ممالک میں: ۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ

شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس
نئی دہلی-۱۱۰۰۰۱

خسرو، یوسف قادری، اقبال طاہر، گل ملگنڈوی، اسمٰعیل ظریف، بوکس حیدرآبادی، صبغتہ اللہ بیباک (مرسلہ ایس ڈبلو احمد حیدرآباد)

رسائل :- ماہنامہ "گلِ نو" ہفت روزہ "زرافشاں" (مرسلہ ایس ڈبلو احمد حیدرآباد)

میسور :- صابر شاہ آبادی، شیدا رومانی، حبیب انصاری، اقبال ہاشمی، نجیر رضوی، لبنیٰ منظر، علی سرور، مختار ہاشمی، حافظ عبدالرشید، سرور مرزائی، سحر قادری، آرزو ایڈووکیٹ، وہاب عندلیب، مجاز، غوث، (مرسلہ ضیا مجاہد سیلاری) (قدیم لکھنے والے) ممتاز، نامی، فائق، ذائق، اثیم، ضیغم، کلیم دانش، نیاز وانی، سائل، مائل، کامل، عزیز، شاہد بیانی، راقم قریشی، اجل نادری، ناصر، کلیم، عطا، تحریر، رونق، صولت، صمیم، طرب، جوہر، آزاد، قمر زیدی، قمر قاسمی، کیف ذائقی، سرور ذائقی، یوسف ذائقی، مانی یوسفی، صبا شرش، محشر رہبری، عتیق، جوش، قیصر، حضرت نفیس، سیدہ اختر بیگم اور (جدید لکھنے والے) شکیل جاوید، سلیم حیدر، رضوان عسکری، اسد اعجاز، شاکر چراغ، فیض، شاہد صبوحی، نیاز وارثی، (مرسلہ: انیس احمد بنگلور) احمد شاہ (مرسلہ ایس ڈبلو احمد حیدرآباد) میر حسین علی کرمانی، عارف شاہ قادری (مرسلہ سلیم تمنائی میسور) خمار قریشی (مرسلہ خمار قریشی گلبرگہ) انیس احمد، ضیا میر، ایم اے شریف، اے آر حمید، انور داغ، وزیر عرشی، نسیم نقش بندی، ریاض عسکری، راڈ آنند، مظہر اللہ، سحر امید، (مرسلہ ضیا میر بنگلور)

اخبارات و رسائل :- ہفت روزہ "قلم کار" "قلم ایڈوانس" "معمار قوم" "شیر میسور" "رہنمائے کرناٹک" (مرسلہ: انیس احمد بنگلور) "قوم" "تنظیم" (مرسلہ: ضیا میر بنگلور)

ادبی انجمنیں :- بنگلور کی بزم ممتاز، بزم نفیس، بزم قیصر، ایوانِ ادب، وقارالادب، خیرالادب، میزانِ ادب، ذوقِ ادب، معیارالادب، عروجِ ادب، شعرستان، بزمِ سخن (مرسلہ: انیس احمد بنگلور)

مغربی بنگال :- احسان دربھنگوی، ناوک لکھنوی، نواب دہلوی، عاجز انصاری، معین اعجاز (مرسلہ ظہیر ناشاد کلکتہ) آغا رشید مرزا۔

تمل ناڈو :- حضرت انور، پروفیسر حیدر، پروفیسر سرمدی، پروفیسر محبوب، جناب کمال مدراسی، قدوی باقوی، حبیب اللہ شاہ، مرزا غلام عباس علی عباس (مرحوم) ڈاکٹر عبدالحق مرحوم، اور مولانا بخاری (بطور نثر نگار) مولانا سرخوش (مرحوم) پروفیسر محبوب پاشا، ریاض نیلوری، حضرت امال (مرحوم) عابد صفی، عبدالعزیز عادل، رشید مدراسی، اے آر حسینی، پروفیسر حبیب خاں سرخوش، (مرسلہ سید صفی اللہ مدراس) ایمان گوپاموی، نور مدراسی، مختار آفاق، (مرسلہ کاوش بدری مدراس)

راجستھان :- صاحبزادہ نازش ٹونکی، صولت ٹونکی، صاحب زونی، جوہر ٹونکی، سیف ٹونکی، ساحل ٹونکی، مولانا عبدالباری معنی اجمیری، اعجاز اجمیری، عرشی اجمیری، ساغر اجمیری، قابل اجمیری، نشاط اجمیری، سلطان اجمیری، فاخر ٹونکی، برق ٹونکی، عابد حسین ادیب، رام لال ندیم، خلیل تنویر، شاہد عزیز، سیرت اجمیری، ش۔ک۔ نظام، شمیم جے پوری (مرسلہ ممتاز راشد بمبئی)

پنجاب : کرتار سنگھ دگل، سنتوکھ سنگھ دھیر، ستیہ پال آنند، کیول دھیر، مہندر بادا، پرکاش ناتھ پرویز، پریم سینی، گوردیال سنگھ والیہ۔ ہرچرن چاولہ، آزاد گورداسپوری۔ عشرت کرت پوری۔

جموں و کشمیر :- پشکر ناتھ، ٹھاکر پونچھی، ملک رام آنند، نند گوپال بادا، دیانند کپور، شیام سندر آنند لہر، پرتپال سنگھ بیتاب، شہباز راجوری، نار دتی مضطر، احمد شناس، رہبر جدید، شام غالب، رچھپال سنگھ بیدار، سریندر ساہو، اخگر ادھمپوری، منوہر لال دل، اندرجیت لطف، راجیش گوہر، محمود الحسن محمود، دینا ناتھ رفیق

دہلی :- معیث الدین فریدی، نریندر لتھیل، مہندر سنگھ بیدی سحر، شفیع الدین نیر، م۔ک۔ مہتاب، مسعودہ حیات، انوار انجم، راج، دینا ناتھ مست، نور الحسن انصاری، شاہنواز، مہتہ درد، بیگم انیس قدوائی۔ اندر سروپ دت ناداں، انور کمال حسینی، جانباز پانی پتی، دت بھارتی، صہبا وحید، ڈاکٹر سیفی پریمی، سعید انصاری، حلیس عابدی، افتخر جمشید، منموہن تلخ، سلمان رضوی، حسرت رسالپوری، دلیپ بادل، عزیز مخدومی، یوگ راج، العفت امین آبادی، خان ارمان، امیر آغا قزلباش، نیر آتشی۔

قرۃ العین حیدر
آشا محل، نوروجی گماڈیا روڈ، بمبئی، ۲۶

کارِ جہاں دراز ہے

فصل دوم — باب ۴

گومتی

ایک خراسانی امیر نے کہ نام اُن کا میر محمد امین سعادت نیشاپوری تھا۔ ماں ان کی شاہ عباس ثانی کے وزیر رضا قلی بیگ قزلباش کی بیٹی تھیں۔ بی بی سے خانہ دامادی کا طعنہ سُن کر ایران چھوڑا۔ شاہجہاں آباد پہنچے۔ فرخ سیر سے نواب سعادت خاں خطاب پایا۔ بعد قتلِ فرخ سیر (۱۷۱۹ء) بہ عہد محمد شاہ بادشاہ سلطنت میں فتنہ و شورش بڑھی۔ سرکشی شیوخِ لکھنؤ اور بد انتظامی زمینداران اودھ میں اضافہ ہوا۔ تورانی پارٹی نے جو نواب سعادت خاں سے مخالفتِ مذہب اور ان کی ترقی جاہ سے حسد و رشک رکھتی تھی، بادشاہ کو پٹی پڑھائی کہ نواب کو بغرض بندوبست اودھ بھیجا جائے۔ بادشاہ نے خلعتِ صوبیداری و خطاب برہان الملک عطا کر کے حکم دیا کہ لکھنؤ جائیں۔

مگر سرکاری فوج ہمراہ جانے کو تیار نہ ہوئی۔ نواب والاشان منافقین کی اسکیم سمجھے۔ نظر بخدا کر ہمت باندھی۔ پایۂ تخت کے ایرانی شیعوں کو جمع کیا جو ہزاروں بیکار یا بازار میں مشغول بہ کسب تھے۔ سب نے یہ خوشخبری سُن کر ہجوم کیا۔ نواب نے کہا سنو میرے بھائیو۔ اگر اس وقت کے سوکھے ٹکڑوں پر قناعت کرو گے خدا نے چاہا ایک روز پلاؤ بھی کھاؤ گے۔

کہتے ہیں نواب کے ان سوکھے ٹکڑوں پر ہزارہا مغل (ایرانی) مفلس پریشان حال جمع ہو گیا۔ کلبی کالی ٹوپیاں سر پر رکھ، ولایتی تلوار کمر سے باندھ کر آغا صاحب بن گئے۔ نواب جب اپنی قوم کی بھرتی سے فارغ ہوئے، اپنے توپ خانے کے کچھ توپیں چنیں۔ گھر کے زیور بیچ کر بیل توپوں کے لئے خریدے۔ با جمعیتِ کثیر لکھنؤ پہنچے۔ بعد استیصال شیوخ قلعۂ مچھی بھون میں داخل ہوئے۔ ایک شاندار سلطنت کی بنیاد رکھی۔

ساداتِ لانجو؟ی مرادآباد کے سید بڑے اور سید آڑے کا قصہ ہم گزشتہ باب میں بیان کر چکے۔ سید آڑے کے ایک پوتے میر رمضان علی کی شادی ساداتِ بارہا جان سٹھ میں ہوئی تھی۔ وہ بارہ بستی میں سکونت پذیر تھے۔ جب غل ہوا کہ نواب برہان الملک شاہجہاں آباد سے نکل کر بفرمانِ محمد شاہی، ملکِ اودھ پر چڑھائی کے لیے سدھارے ہیں۔ میر رمضان علی کہ ایک باہمت اور صاحبِ فراست نوجوان تھے، اور لانجو؟ی اور بارہ بستی کی منجمد قصباتی زندگی سے اُکتا چکے تھے، فوراً ڈھال تلوار لگا گھوڑے پر سوار ہوئے اور منزلیں مارتے کہاں پہنچے۔ فرخ آباد۔ جہاں نواب برہان الملک بنگش پٹھان نواب کا مہمان تھا اور فوج کے لئے گھوڑے، یابو اور ٹٹو خریدنے میں مشغول تھا۔

میر رمضان علی بھی پچھلے حال مغلوں کے لشکر میں شامل ہو لکھنؤ روانہ ہوئے۔

بعد فتح لکھنؤ میر رمضان علی نے دربار نواب سعادت خاں تک رسائی حاصل کی۔ لشکر سے نکل کر ۱۷۳۲ء کے لگ بھگ عُمالِ سرکار[۱] میں داخل ہوئے۔ اُن کے بیٹے کا نام میر شیر علی تھا۔ ان کے بیٹے میر مہر علی درباری و مجرئی ہوئے۔ ایک علاقہ امانی حاصل کیا۔

اصلیت اس کی یہ تھی کہ اکثر علاقہ جات سرکار سے اعمال کو امانی دیئے جاتے تھے۔ لیکن کسی کو علاقہ زیادہ کا نہ ہوتا تھا کہ صاحبِ قوت نہ ہو جائیں۔ بہت شرط مشروط پر علاقہ کا اجارہ دیا جاتا تھا کہ روپیہ سرکار کا علاقے میں نہ رہ جائے۔ اگر مستاجر پورا روپیہ ادا نہ کرتا قید کر لیا جاتا تھا اور بہت کچھ درگت اس کی بنتی تھی۔ مستاجران کا منصب موروثی نہ تھا۔ جاننا چاہیئے کہ نہٹور کے ترمذی خاندان کے جلیل القدر فرزند علامہ سعد اللہ خاں وزیر اعظم شاہجہاں نے پرگنوں کو چکلوں میں تقسیم کیا تھا۔ اٹھارہویں صدی میں "سرکار" کی جگہ چکلے نے لے لی۔ ۱۷۰۲ء میں بنگال ستّرہ اور اودھ سولہ چکلوں میں منقسم تھا۔ چکلے کا حاکم، ناظم، عامل، چکلہ دار یا مستاجر کہلاتا تھا[۲]۔

۱۷۷۵ء میں نواب آصف الدولہ بہادر مسند نشینِ وزارتِ ہند ہوئے۔ انتظامِ صوبہ جات دورِ آصفی میں بہترین تھا۔ ناظم یا صوبے دار ہر سال اپنا لشکر لے کر پہنچتا اور کسانوں سے مال گزاری وصول کر کے نصف خود رکھتا نصف خزانۂ شاہی میں داخل کرتا۔ صوبے کا انتظام اس کے ذمّے تھا۔ مفتی اثنا عشری اور دیگر اعمال اس کے ماتحت تھے۔ چکلے دار کو حکومت سے تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ اس کی فوج علاقے

۱۔ فرمانروایانِ اودھ مخلوط النسل قزلباش، قراقوئن لُو اور قرا یوسف ترک تھے۔ ان کے بزرگوں کو شاہانِ صفویہ نے نیشاپور میں جاگیر دی تھی۔

۲۔ دیکھئے مغل صوبجاتی حکومت ۱۵۸۰ء - ۱۷۰۷ء از ڈاکٹر پی سرن

میں پولیس کا کام کرتی تھی۔ دیوانی اور فوجداری کے مقدمے وہی فیصل کرتا تھا۔ ایک چکلادار کے ماتحت متعدد اضلاع ہوتے تھے۔ بعد میں اس انتظام میں بہت ابتری پیدا ہوئی۔ اضلاع کی زرخیزی یا سیاسی اہمیت کی وجہ سے یہ عہدہ بعض اوقات کئی لاکھ روپے میں بادشاہ اودھ سے خریدا جاتا تھا۔ اس کے بعد چکلے دار اس علاقے کا خود مختار مالک بن جاتا تھا۔ (عہد نصیرالدین حیدر میں حکیم مہدی منتظم الدولہ نے اودھ کے اس ناقص انتظام میں اصلاحات کیں مگر اس وجہ سے بادشاہ نے ان کو برطرف کر دیا۔)

میر ببر علی ابن میر شیر علی (ابن میر رمضان علی) دورِ آصفی میں چکلے دار تھے۔

جنگ باسر ۱۷۷۴ء میں حافظ رحمت خاں کی شکست و شہادت کے بعد انگریز کے قدم باضابطہ ہندوستان میں جمے۔ حافظ[1] کا ملک روہیلکھنڈ مع مرادآباد مملکت اودھ میں شامل کر لیا گیا۔

روہیلکھنڈ کے اودھ سے الحاق کے بعد میر ببر علی اپنے دادا میر رمضان علی کے بھولے بسرے رشتے داروں سے ملنے مرادآباد محلہ لانکڑہی والان آئے۔ معلوم ہوا کہ لانکڑہی (معافی) میں ہنوز پانچویں حصے کے حقدار ہیں۔

جب میر معصوم علی ابن میر ببر علی کی بیٹی منجھو بیگم سادات لانکڑہی کے میر الفت علی سے بیاہ کر مرادآباد آئیں، اس وقت یہ شہر جان کمپنی کی عملداری میں شامل ہو چکا تھا۔

لکھنؤ میں میر ببر علی کی وفات کے بعد میر معصوم علی نے ایک عہدۂ چکلا داری و نظامت خریدا اور طریق معقول و سلامت روی سے بندوبست علاقہ جات میں مصروف ہوئے۔ میر معصوم علی کے فرزند اکبر میر قائم علی کا بیاہ بھی لانکڑہی والوں میں میر منور علی نقوی کی بیٹی امراؤ بیگم سے رچایا گیا۔

۱۸۳۸ء میں بعہد محمد علی شاہ بادشاہ اودھ بمقام لکھنؤ میر قائم علی اور امراؤ بیگم کے ہاں میر مظہر علی رضوی پیدا ہوئے۔

یہاں کا تو قصہ یہ چھوڑا یہاں
سناتے ہیں اب اک نئی داستاں

۱۔ ایک مختصر سا ٹکڑا رامپور علی محمد روہیلہ کے بیٹے فیض اللہ خاں کو بطور روٹی ریاست دیا گیا۔ نواب فیض اللہ کے فرزند محمد علی خاں کو آصف الدولہ نے اپنا بیٹا بنایا اور بقول صاحب تاریخ اودھ "ہدایت دین حق فرمائی" جب سے نوابین رامپور شیعہ چلے آتے ہیں۔

۲۔ خاکسار مصنف کے پرنانا۔ ۳۔ جنرل الٰہی بخش۔ پنجاب کے عظیم مدبر میاں سر فضل حسین مرحوم کے پردادا تھے۔

جب شیر پنجاب مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پہلی بار فوج انگریزی کی قواعد پریڈ کا مشاہدہ فرمایا سوچا اپنی جمعیت کے لشکر کو بھی اسی خوبی سے آراستہ کیا جائے۔ بعد ازاں اس عاقل و دانا حکمراں نے کمپنی بہادر کی پٹالین کے تربیت یافتہ متعدد افسران و سپاہ کو لاہور مدعو کیا۔ یہ شورما زیادہ تر پورب کے باشندے تھے۔ ان میں میر معصوم علی لکھنوی کے ایک اولوالعزم جانفشاں و جری بھتیجے میر نورالدین بھی شامل تھے جو عساکر خالصہ میں داخل ہو کر عہدۂ جلیلہ کرنیلی تک پہنچے۔ مہاراجہ نے توپ خانہ تمام تر مسلمان افسروں کے سپرد کیا۔ جنرل الٰہی بخش[3] خالصہ آرٹلری کے نامور سپہ سالار گزرے ہیں۔

"کیٹیلاگ ریکارڈز آف خالصہ دربار" فارسی سے ترجمہ از سیتارام کوہلی (پنجاب گورنمنٹ پریس-لاہور ۱۹۱۹ء) میں مختلف کمپنی ہا" اور سکھ رجمنٹوں کے PAY ROLLS کی فہرست کے ساتھ زمرہ" حاضران" کے اندر دو جگہ "ڈیرہ نورالدین" کا نام ملتا ہے جب مختلف پٹالین پشاور اور دوسری چھاؤنیوں کو روانہ کی جاتیں اس وقت جو افسران ہیڈ کوارٹرز میں موجود رہتے "حاضران" کہلاتے تھے۔ "ڈیرہ" یا کیمپ مع اپنے نشانچی، دھونسا نواز، وکیل، منشی اور سکھ گرنتھی کے افسر اعلیٰ کے تحت ہوتا تھا۔

اینگلو سکھ جنگ ۱۸۴۵-۴۶ء اور لاہور پر برطانوی قبضے کے بعد معاہدے کی رو سے رنجیت سنگھ کے نابالغ لڑکے مہاراجہ دلیپ سنگھ کو اپنے عساکر اور توپ خانے میں تخفیف کرنی پڑی۔ وہ توپیں جن کے ذریعے حملہ آوروں کا مقابلہ کیا گیا تھا انگریز کمانڈر انچیف کے حوالے کر دی گئیں۔

لاہور-۲۰ رفروری کو فتح ہوا یعنی عشرۂ محرم کے روز یہ اطلاع لکھنؤ پہنچی۔ ڈیوڈسن صاحب بہادر ریذیڈنٹ اودھ ایک بد دماغ اور تنک چڑھا انگریز تھا۔ اس نے میر حسن علی سفیر کو حکم دیا کہ توپ کی سلامی دی جائے۔ میر صاحب نے عذر محرم حسین کا کیا صاحب نے برہم ہو کر ان کو عہدۂ سفارت سے فی الفور برطرف کیا۔

اللہ اللہ۔ ابوالفتح مصلح الدین ثریا جاہ سلطانِ عادل خاقان زماں محمد امجد علی شاہ بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کی لاچاری اور بے بسی کا کیا عالم تھا کہ دسویں محرم کی رات فتح برطانیہ کی خوشی منانے کے واسطے خاص شہر لکھنؤ میں شلک سلامی چلی۔

وہ کئی سو ضرب توپ جو انگریزوں نے سکھوں سے چھینی تھیں لاہور سے کلکتہ روانہ کی گئیں تاکہ وہاں پر ہندوستانی رعایا کے سامنے ان کی نمائش کی جاوے۔ جس روز یہ توپ کانپور پہنچیں ظلِ سبحانی شاہ

جہاراجے نے نواب امین الدولہ بہادر وزیرِ اعظم اور مشیر الدولہ مہاراجہ بالکرشن بہادر جسارت جنگ کو بخاطر ریذیڈنٹ بہادر کانپور روانہ فرمایا جہاں کنپ پریڈ آراستہ ہوئی۔ کپتان فریزر نے ان اتواپ کا معائنہ کیا اور سلامی لی۔

"ریکارڈز آف خالصہ دربار" بعہدِ مفتوح مہاراجہ دلیپ سنگھ ۱۸۴۸ء فروری ۱۸۴۹ء فہرستِ حاضران[1] میں ہماری ملاقات دوبارہ نورالدین صاحب سے ہوتی ہے۔

۳۰ مارچ ۱۸۴۹ء کے روز لارڈ ڈلہوزی نے سارے پنجاب پر اختیارِ کلی حاصل کیا۔ اس کے بعد خالصہ فوج کے بیشتر افراد کی طرح کرنل نورالدین شاہ بھی انگریز سرکار کے وفادار بنے اور مختلف معرکوں میں نمایاں حصّہ لیا لیکن اس کے بعد کرنل نورالدین[2] شاہ یا ان کی آل اولاد کا کچھ اتہ پتہ نہیں ملتا۔ جانے کہاں گئے۔ اُن کے چچا میر معصوم علی نے اپنے خاندان اور اپنے زمانے کی تاریخ "انشائے[3] معصوم" کے نام سے قلمبند کی تھی۔ شاید اس میں کرنل صاحب کا ذکر کیا ہو۔

میر معصوم علی نے بعہدِ سلطانِ عالم واجد علی شاہ لکھنؤ میں انتقال فرمایا۔ ان کی اچانک وفات کے بعد حسبِ قانون علاقہ نزولِ سرکار ہوا۔ ان کے بیٹے میر قائم علی کو دربار سے خلعتِ ماتم پرسی ملی مگر نظامت چکلا داری خریدنے کے لئے روپیہ نہ تھا۔ بزرگوں نے جتنا کمایا اس سے دوگنا لُٹایا۔ فضول خرچی گھٹی میں پڑی تھی۔ اجی ہم تو یہ جانتے ہیں جس نے دریائے گومتی کا پانی پیا، بابر بہ عیش کوش کا سختی سے پابند ہوا۔

لکھنؤ میں عہدِ نواب سعادت علی خاں سے انگریزیت کی شدّت تھی۔ پہلے کوئی کوٹھی و سڑک کا نام نہ جانتا تھا اب کوٹھیاں بن رہی تھیں۔ کلکتہ سے یورپین فرنیچر منگوایا جاتا تھا۔ شاہ نصیرالدین حیدر شاہانِ برطانیہ جیسی پوشاک زیبِ تن کرتے۔ فرانسیسی عورات بیگمات کے فرانسیسی وضع کے بال آراستہ کرتیں۔ چند امراء لندن ہو آئے تھے۔ فری مسن لاج کھل گیا تھا۔ شاہی تعزیہ لندن سے بن کر آتا تھا۔ لیکن حصولِ علومِ فرنگ کا شوق کسی کو نہ تھا۔

میر قائم علی بھی انگریزی رنگ میں رنگے، مگر کمال عقلمندی سے انگریزی زبان سے بھی کچھ واقفیت حاصل کرلی۔

چراغِ سلطنت بجھا چاہتا تھا لیکن کسی کو ہوش نہ تھا۔ سب عیش و عشرت میں غافل۔ ادھر میر معصوم علی کے سپاہیوں نے ادائیگیٔ تنخواہ کا مطالبہ کیا۔ سارے خاندان اور متوسلین کی ذمہ داری کم سنی میں میر صاحب پر آن پڑی۔

ایک روز ان کی بی بی امراؤ بیگم نے کہا "عہدِ شجاع الدولہ سے لے کر آج تک وفورِ عنایاتِ شاہی رہا۔ کسی گھڑی عتابِ شاہی بھی نازل ہوسکتا ہے۔ دُنیا دامِ فریب ہے اور دشمن کمین میں ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ مولا مشکل کشا[4] کا نام لے کر یہاں سے کوچ کیجیے۔ کیا جانیے کس وقت جو کچھ باقی ہے وہ بھی ضبط کرلیا جائے۔"

میر قائم علی نے بی بی کا مشورہ قبول کرنے میں تامل کیا مگر سپاہیوں کے مطالبے میں زیادتی ہوئی۔ اسلحہ جات، اسپ ولائتی، بنگلہ، خس خانہ، حویلی اونے پونے بیچ سپاہ و ملازمین کی تنخواہیں اور قرضے ادا کئے۔ ماں، بہنوں اور بچوں کو بہلی میں سوار کیا۔ تلوار اور طپنچہ سنبھال گھوڑے پر سوار ہوئے۔ لکھنؤ کو خیرباد کہا۔ مستورات زار و قطار روتی تھیں سوائے امراؤ بیگم کے جو دل میں خوش تھیں کہ میکے واپس جاتی ہیں۔

قافلہ روہیلکھنڈ روانہ ہوا۔ اودھ سے نکلے۔ برطانوی عملداری میں داخل ہوئے۔ مراد آباد کے قریب پہنچے۔ دُور سے رام گنگا کا گھاٹ اور قلعے کی مسجد نظر آئی۔

یا حیدرِ کرّار وقتِ مدد است۔

باب ۵

رام گنگا

دوستو۔ زمانے کی سیر کرچکے۔ مراد آباد لاکڑی والان واپس پہنچیے تو معلوم ہوگا کہ اہلِ محلہ ہنوز رستم خاں اور سید بڑے کے

---

[1] حاضران کے چند مسلمان افسروں کے نام ملاحظہ ہوں۔ ڈیرہ الٰہی بخش۔ ڈیرہ حافظ بخش۔ ڈیرہ سلطان محمد خاں۔ ڈیرہ مظہر علی بیگ۔ ڈیرہ غوث الدین وغیرہ

[2] میری ننھیال کے نوجوان برطانوی دور میں سرکاری ملازمتوں کی درخواست دیتے ہوئے کرنل نورالدین شاہ کا ذکر ضرور کرتے تھے۔

[3] اس نایاب فارسی کتاب کا غالباً آخری نسخہ میر معصوم علی کے پڑپوتے میر نذر الباقر رضوی (نذر سجاد حیدر کے والد) کے انتقال کے بعد ۱۹۳۰ء تک مرحوم کے سامان کے ساتھ چودھری سر محمد ظفر اللہ خاں کے یہاں لاہور میں موجود رہا۔ چودھری صاحب کے گھر جو چوری ہوئی اس میں نذر الباقر صاحب کا اسباب بھی مع اس کتاب کے نکل گیا۔ (ق ح)

دور میں زندہ ہیں۔ قدامت پرستی ان حضرات پر ختم ہے۔ مکانات جو بزرگوں نے سترھویں صدی میں بنائے تھے انہی میں آج تک موجود ہیں۔ جو مکان ڈھے گئے ان کی جگہ نئے تعمیر کرلئے گئے یا اگر اتنا مقدور نہ ہوا تو انہی کی تھوڑی بہت مرمت کرلی گئی۔ مگر مجال ہے جو کسی نے اس محلے سے باہر قدم نکالا ہو۔ جیسا کہ پچھلے کسی باب میں عرض کیا گیا جاگیر لانکڑی میں وہ سارا علاقہ شامل تھا جہاں آج شہر کا ریلوے اسٹیشن، چوک اور گورنمنٹ کالج ہے۔ یہ ساری زمینیں دورِ تنزل میں لانکڑی والے ایک کوڑی فی گز کے حساب بیچ کھا پی کے برابر کرچکے۔ اب اسی اطمینان سے اپنی بیٹھکوں میں رونق افروز، سیاہ مخملیں ٹوپیاں اور بوٹی دار جامے یا نیم آستین پہنے حقّے گڑگڑا رہے ہیں۔

محلّے کا چوک مرکزِ کائنات ہے۔ اس کے بڑے پھاٹک کے اندر تین طرف امراؤ بیگم کے والد اور چچا میر منور علی اور میر محبوب علی، منجھو بیگم بنتِ میر معصوم علی لکھنوی کے شوہر میر الف علی اور دیگر عزیزوں کے مکانات ہیں۔

سامنے حکیم کرامت علی رہتے ہیں۔ حکیم صاحب کے دادا حکیم سید دائم علی دلی میں طبابت کرتے تھے۔ دلی کے سنی طبیبوں کا قدیم خاندان تھا۔ دائم علی کے بیٹے حکیم راحم علی تھے۔ زوالِ دلی کے بعد سید راحم علی کے دو بیٹے حکیم سید کرامت علی اور ضامن علی تلاشِ معاش میں مرادآباد پہنچے۔ پہلے پہل چوکنویں کی سرائے پر ٹکے۔ بھٹیارن سے روسائے شہر کے بارے میں دریافت کیا۔ لانکڑی والوں سے ملاقات ہوئی۔ مطب قائم کیا۔ شیعہ ہوگئے۔ میر معصوم علی لکھنوی کی نواسی یعنی میر الف علی کی لڑکی سے شادی کی۔ سید اولاد علی، مہدی علی اور اولیاء بیگم پیدا ہوئیں۔

بڑے ہوکر سید اولاد علی باپ کے مطب پر بیٹھے۔ نامی حکیم بنے۔ یہ بنگالی ڈاکٹر جو آج کل نظر آتے ہیں اس وقت کہاں تھے۔ دوا میں ڈالنے کو بھی نہ ملتا۔ سید اولاد علی ایک فرنگن بھی کہیں سے اڑا لائے کچھ عرصے زنانخانے میں پردہ نشین رہی۔ لاولد تھی۔ ایامِ غدر میں فرار ہوئی۔

سید اولاد علی کے دو بیٹے ہیں۔ فرزند علی اور ڈپٹی آلِ نبی۔ فرزند علی نے آبائی پیشہ طبابت اختیار کیا۔ ان کی شادی امیر بیگم بنتِ نواب سید داؤد علی خاں دوئم والیِ سرسی محمود پور سے ہوئی۔

ابھی محمود پور والوں کا قصہ کہاں سے شروع کروں۔ پوری الف لیلیٰ ہے۔ آج برٹش راج میں بھی اگر قلعہ محمود پور کے اندر داخل ہو سکتا ہے عہدِ مغلیہ میں پہنچ گئے۔ سچ ہے۔ ہاتھی لٹے جائے تب بھی سوا لاکھ کا۔

ضلع مرادآباد میں یہ دو بڑی ریاستیں تھیں ایک محمود پور — دوسری سہس پور بلاری۔ موخر الذکر بیشتر مسلم ریاستوں کی مانند مقروض تھی۔ اس کی آخری مالک ایک بھولی بھالی بیگم صاحبہ تھیں۔ وہ تو مَر کو گئیں پیچھے قرض خواہ مہاجن نے ڈگری کروالی۔ اس مہاجن کا بیٹا سہس پوری بلاری کا راجہ[1] بنا۔

ایک نیشاپوری فوجی مہم جو سید محمود نے سترھویں صدی میں مرادآباد سے پندرہ میل کے فاصلے پر محمود پور کی ریاست قائم کی تھی۔ سید محمود کے متعلق ایک قدیم تذکرے میں مرقوم ہے۔

"— در ملک بنگالہ مراتب یافت و بوطن رسیدہ و بو بکی و جٹ پورہ وغیرہ ہیچ موضع را مخلوط کردہ۔ محمود پور باسم خود کرد و پسرش سید داؤد قلعہ و دیگر عمارات رفیعہ آنجا بنا ساخت — ہم مصداق آثار پیداست صنادید عجم را —"



قلعۂ محمود پور کی محلسرا کا ایک حصہ۔ قلعے کی عمارات زمینداری کے خاتمے کے بعد سے رفتہ رفتہ کھنڈر ہوچکی ہیں۔ نوابینِ محمود پور کا خاندان ایک باقیماندہ حویلی میں رہتا ہے۔ کچھ افراد پاکستان جاچکے ہیں۔

[1] موجودہ رانی صاحبہ سہس پور بلاری اندرا موہنی (جنرل مصری چند کی اہلیہ) مرادآباد میں رہتی ہیں۔



محمود پور: مصنف دیوان خانے کے کھنڈر میں ـ ستمبر ۷۳ء۱۹

شاہجہاں بادشاہ نے سیّد داؤد کو نواب اور خان کا موروثی خطاب اور محمود پور معافی کی سند عنایت کی۔

محمود پور کے اصالت محمود خاں اور شاہ علی خاں کی مہروں پر "۱۱۴۰ھ محمد شاہ بادشاہ غازی فدوی سید اصالت محمود خاں اور ۱۱۸۷ھ شاہ عالم بادشاہ غازی سید شاہ علی خاں کندہ" ہیں۔ اصالت محمود خاں سنبھل کے گورنر بھی رہے۔ محلہ اصالت پورہ ان کے نام پر آباد ہے۔

عہدِ روہیلہ میں نواب دوندے خاں نے قلعہ محمود پور پر حملہ کیا۔ طرفین سے توپ چلی مگر نواب محمود پور روہیلوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ ریاست کا بیشتر حصہ پٹھانوں نے ہتھیا لیا۔ ۱۷۷۴ء میں روہیلہ شکست کے بعد جب روہیلکھنڈ کے حصے بخرے ہوئے ہیں نواب محمود پور نے جان کمپنی کے حضور میں استغاثہ کیا مگر ریاست کا قلیل حصہ اُن کو واپس ملا۔ موجودہ ریاست کی آمدنی محض تین لاکھ روپے سالانہ ہے۔

شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کے ادوار میں نوابین محمود پور دربارِ اودھ سے وابستہ رہے۔ پھر روہیلکھنڈ پر سرکارِ انگریزی کا راج ہوا۔ ۱۸۳۱ء[1] میں مراد آباد کا ڈسٹرکٹ اور سشن جج مسٹر الکاٹ اودھ کے دورِ تسلط کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ نواب وزیر الممالک بہادر کی عملداری کے تحت ایک رسالہ[1] رسالدار مرزا مدار علی بیگ کی کمان میں دیوان خانہ محمود پور میں تعینات تھا۔

[1] بشکریہ سید حسین مہدی رضوی ایڈوکیٹ مرادآباد

شاہ علی خاں اصالت محمود خاں کے بھتیجے تھے۔ شاہ علی خاں لاولد رہے۔ ان کے بھتیجے نواب نجم الدین علی خاں تھے۔ نواب محمد داؤد علی خاں نجم الدین علی خاں کے بیٹے تھے۔ انہی کی لڑکی امیر بیگم سے ہمارے حکیم سید کرامت علی کے بیٹے حکیم فرزند علی کی شادی ہوئی۔

نوابینِ محمود پور غالباً دورِ مغلیہ میں یا عروجِ روہیلہ کے زمانے میں تقیہ میں سنی ہو گئے تھے۔ یا شروع سے سُنی تھے۔ دربارِ اودھ کے تعلق سے شیعہ ہوئے۔ نواب محمد داؤد علی خاں کے بیٹے اور جانشین نواب سید محمد علی خاں کا ایک مقدمہ پریوی کونسل چلا۔ اس میں نواب صاحب نے اپنا ترکہ بموجب قانونِ محمدی شرعِ امامِ ابوحنیفہؒ طلب کیا تھا اور خود کو اس فقہ کا پابند بتایا۔

حکیم سید فرزند علی اور امیر بیگم (بنتِ نواب داود علی خاں) کے فرزندِ اکبر سید اولاد حسین کی شادی لکھنؤ میں ایک وثیقہ دار بیگم سے ہوئی ہے جو سرائے معالی خاں میں امام باڑہ الماس پہ رہتی ہیں۔ منجھلے بیٹے سید عاشق حسین ۱۸۴۷ء میں پیدا ہوئے۔ چھوٹے بھائی سید ابراہیم حسین (پیدائش۔۱۸۶۰ء) ہیں۔

نواب داؤد علی خاں کے فرزند اور جانشین نواب محمد علی خاں ہیں۔

مولوی عبدالقادر غمگین رام پوری نے اپنے تذکرے میں سرسری ذکر کیا ہے کہ "ایک دن نواب فتح اللہ ولد دوندے خاں کے صاحبزادے سرسی محمود پور کے رئیس (نواب محمود علی خاں) کو لے کر ڈاکٹر نلاٹ[2] سے ملاقات کو گئے میں بھی ساتھ ہو لیا" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپنے پرانے



نوابین محمود پور کی اطلاد اور محلسرا کے کھنڈر

[2] مطبوعہ نقوش لاہور۔ آپ بیتی نمبر

دشمن نواب دوندے خاں روہیلہ کی اولاد سے نوابین محمود پور کی دوستی ہو چکی تھی۔ کیوں نہ ہو۔ انگریز کے اقبال سے شیر بکری ایک گھاٹ پانی پی رہے ہیں۔

نواب محمدؐ علی خاں اولاد نرینہ نہیں رکھتے۔ دو بیٹیاں ہیں ولایتی بیگم اور حیدری بیگم۔ ان دونوں کی شادیاں اپنے دونوں بھانجوں۔ سید عاشق حسینؒ اور سید ابراہیم حسین سے کیں۔

حکیم فرزند علی کے دوسرے بھائی سید آل نبیؐ محلہ انہار میں ڈپٹی کلکٹر ہوئے۔ بڑی وجیہہ اور شاندار شخصیت کے مالک ہیں۔ سچ پوچھو تو عہدہ ڈپٹی کلکٹری ہندی مسلمانوں کو بفضل خدا بہت راس آیا ہے۔

حکیم فرزند علی اور ڈپٹی آل نبی کی بہن اولیاؒ بیگم سید علی جان رئیس نگینہ سے بیاہیں۔ جو کنویں پر ان کا مکان ہے۔

سید علی جان کی پانچ بے حد خوبصورت بیٹیاں ہیں۔ نام ان کے لاڈو بیگم، جانی بیگم، عمدہ بیگم، محمدی بیگم اور اشرف جہاں ہیں۔ ایام غدر میں سید علی جان نے بہنوں سے کہا کہ جب گورے یا باغی مکان پر حملہ کریں۔ توے کی سیاہی چہروں پر مل کر آنگن کے کنویں میں کود جائیو۔ دھاوے کی خبر پڑھتے ہی یہ بچیاں جگمگاتے چہروں پر کالک تھوپ (کہ دشمن کی نظر پڑے تو وہ چڑیل سمجھ کر ڈر جائے۔) باؤلی میں کودنے کو تیار ہوئیں۔

جناب عباس علمدار نے یاوری کی۔ حملہ آور باہر سے ہی لوٹ گئے۔ بہنوں کی جان بچی۔ ان پانچوں کی ایک بہن سیدو بھی تھیں کہ ان کی اماں ممنوعہ تھیں۔ باندی گلشن نام تھا۔ زچگی میں مر کے چڑیل ہو گئی تھیں۔ اکثر بھری دوپہر میں صحن کے اندر بڑے کمرے میں کودا آتی تھیں یہ کبھی پیپل کی شاخ پر بیٹھی نظر آتی تھیں۔ اب عرصے سے غائب ہیں۔

پانچوں بہنوں میں جانی بیگم کنواری جوان مر گئیں۔ کھانا پکا رہی تھیں کپڑوں میں آگ لگ گئی۔ ان کے نام کا جوڑا کنبے میں ہر لڑکی کے جہیز سے نکال کر کسی مستحق غریب لڑکی کو دیا جاتا ہے۔

دوسری بہن عمدہ بیگم پر جن کا سایہ ہو گیا۔ بیاہ کے روز جب ان کو مایوں کی کوٹھری سے باہر لایا جا رہا تھا۔ عین اس وقت وہ نامعقول جن ایک سانپ کی صورت میں نمودار ہوا اور کوٹھری کی دہلیز پر کنڈلی مار کے بیٹھ گیا۔ بارات واپس گئی۔ عمدہ بیگم اس کوٹھری سے نہ نکل پائیں۔ ساری عمر روزہ نماز میں گزار دی۔ آج تک وہ جن آس پاس موجود رہتا ہے۔

عمدہ بیگم کی چھوٹی بہن محمدی بیگم کا بیاہ میر قائمؔ علی کے بیٹے میر مظہر علی سے ۱۸۵۷ء میں ہوا۔

ناظرین آپ کو یاد ہوگا میر قائمؔ علی ابن میر معصوم علی مع اہل و عیال انتزاع سلطنت سے کچھ ہی قبل لکھنؤ سے ہجرت کر کے مراد آباد آ گئے تھے۔ اگر یاد نہ ہو تو پچھلا باب پڑھ لیجئے کہ غریب ہے۔

یہ بھی یاد کیجئے کہ میر قائمؔ علی انگریزی فیشن کے شائق تھے۔ لانکر والوں کے دقیانوسی ماحول میں ان کا دم گھبرایا۔ صندوقچہ جواہرات جو امراؤ بیگم ساتھ لائی تھیں اس میں سے چند سکے زرد و جواہر نکال کر مہاجن کے ہاتھ پر رکھے۔ سکہ سفید ملکہ توریہ کا اس سے لیا۔ انجینئر بلوایا۔ لانکری محلے کے نزدیک قلعہ کی مسجد سے چند قدم پر کوٹھی ۳ ڈاٹ کی، اونچی چھتوں اور اونچی کرسی والی بنوانا شروع کی۔

ملا نواب سید عاشق حسین خاں والدہ کے ماموں زاد بھائی تھے۔ انہوں نے طویل عمر پائی۔ راقم الحروف کو دھندلے سے یاد ہیں۔ کئی برس لوئی پھیلیو کا شل کے مہرے جیسے پچھلی صدی کے شاندار بزرگ معلوم ہوتے تھے۔ [illegible] وفات سے صرف چند ماہ قبل دیکھا تھا۔ چھپر کھٹ پر آرام کر رہے تھے۔ بڑی بڑی سفید نوکیلی مونچھیں "ہوں۔" نذر کی پونڈیا ادھر آ کہ کر تکیے کے نیچے سے شاید ایک اشرفی نکال کر دی تھی بسکٹ منگوا کر کھا لیجیو۔ اشرفی سے بسکٹ کیسے خریدے جاتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہ آیا۔ نواب محمدؐ علی خاں نے اپنے نواسے یعنی عاشق ماموں کے بیٹے معشوق علی خاں کو متبنیٰ کر کے ریاست کے تین حصے کئے۔ سید معشوق علی خاں کی شادی نواب شمس آباد کی بیٹی سلطنت آرا بیگم سے کی۔ جن کے دادا نواب دولہا شاہان صفویہ کی اولاد تھے۔ دادی جعفری بیگم اعتماد الدولہ میر فضل علی خاں وزیر اعظم اودھ کی بیٹی تھیں۔ سلطنت آرا بیگم لا ولد ہیں۔ ان کے بھتیجے موجودہ نواب شمس آباد سید فرخ حیدر ایک بیش بہا کتب خانے کے مالک ہیں۔ انہوں نے مجھے تاریخ شمس آباد پر ایک نادر کتاب بھیجی ہے جس کے لئے میں ان کی مشکور ہوں (ق ح)

۲ اولیا بیگم کے پڑپوتے ڈاکٹر سید علی مہدی نقوی فی زمانہ ایک امریکن ماہر فلکیات ہیں۔

۳ یہ کوٹھی میر قائمؔ علی ان کے وارث نذر سجاد حیدر اور سجاد سید آل حسنین کو ترکہ میں ملی تھی۔ ان دونوں کے پاکستان چلے جانے کے بعد ۱۹۴۷ء میں متروکہ جائیداد قرار پائی۔ پنجابی شرنارتھی مالک نے اسے گرا کر نئی عمارت تعمیر کر لی ہے۔

صاحب کلکٹر ضلع نے عہدہ تحصیلداری پیش کیا۔ انہوں نے فی الفور قبول کیا۔ ایک روز گھر آکر بی بی سے کہا "لیجئے صاحب ہمیں خلعت و قلمدان ملا ہے۔ ہم متصدی ہو گئے۔"

تو کیا وجہ کہ انگریزوں نے یہ رسم مغلیہ قائم رکھی تھی۔ تحصیلدار کو اس وقت متصدی کہیں تھے۔ جواب بے چارے غریب اہلکاروں کو منشی متصدی کہا جاتے ہے۔

ایک شام حسب معمول چوک میں تخت پر بیٹھے عزیزوں سے مصروف گفتگو تھے کہ کسی نوجوان عزیز سے تکرار ہوگئی۔ یہ حضرت خالص لکھنوی۔ ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیں۔ فوراً اٹھے تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھ کر بولے "اے لیجئے اب ہم مرادآباد سے بھی رخصت ہوتے ہیں جب لکھنو ہی چھوٹ گیا ساری دنیا ہمارے لئے یکساں ہے۔ اب کبھی یہاں نہ آویں گے۔"

اتفاق کی بات کہ چند روز بعد ہی کانپور تبادلے کا حکم آگیا۔ بی بی بچوں کو مرادآباد میں چھوڑ کانپور کی راہ لی۔

یادداشت۔

اب ہم دوبارہ چوکنویں پر چلتے ہیں۔ سید علی جان کی بہنوں کی خیریت دریافت کرتے ہیں۔ غدر میں اُن کی جانیں بچ گئیں پھر کیا ہوا۔

مجھلی بیگم کا بیاہ تو میر قائم علی کے بیٹے میر منظر علی سے ہوگیا۔ چھوٹی بہن اشرف جہاں کی شادی اُن ہی حکیم سید کرامت علی کے چھوٹے بیٹے سید مہدی علی سے ۱۸۶۰ء میں ہوئی۔ مرتضائی بیگم مصطفائی بیگم اور میر تفضل علی پیدا ہوئے۔ ان سب سے آئندہ ملاقات ہوگی۔ میر مہدی علی کے متعلق یہ سُننے چلے کہ اُن سے ایک جن کے بہت خوشگوار تعلقات تھے۔ مرادآباد میں قلعے کی مسجد جنات کا خاص مسکن ہے۔ روز رات کو وہاں تہجد پڑھتے ہیں۔ نہایت شستہ اُردو بولتے ہیں اور قیاس ہے کہ شیعہ ہیں۔

حضرات۔ اب ہم عنقریب مرادآباد سے رخصت ہو کر ایک اجنبی صوبے کا رُخ کرنے والے ہیں لہٰذا چلتے چلتے میر قائم علی کے برادر نسبتی یعنی امراؤ بیگم کے بھائی سید منور علی نقوی کی اولاد کا احوال بھی سُن لیجیے۔ سید منور علی کی ایک بیٹی کی شادی اورنگ زیب عالمگیر کے نامور وزیر نعمت خاں عالی کے حقیقی پڑپوتے معشوق علی[1] سے ہوئی۔



اُجڑے دیار کی ایک اور جھلک

باقی لڑکیوں کے بیاہ سُنیوں میں ہوئے کہ اس وقت تک یہ جھگڑا نہ تھا جو بعد میں لکھنؤ کے سیاست والوں نے شروع کروایا۔

۱۸۵۷ء کے بعد مسلمان انگریز سے حد درجہ متنفر تھے۔ انگریزی لباس کافر کرتی کہلاتا تھا۔ انگریزی طرز معاشرت کے لئے جذبہ حقارت کا اظہار ان عوامی گیتوں سے ہوتا ہے۔

اگلا ناچے بگلا ناچے، ناچے بوتل خانہ
پلپل صاحب کی ٹوپی ناچے میم صاحب [illegible]
اور گورا [illegible]

انگریزی تعلیم لانکڑی والوں کے نزدیک بھی حرام تھی۔ سید منور علی کے اکلوتے بیٹے سید اصغر علی نے جو ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے تھے ضد کر کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں نام لکھوالیا۔ جو ہمارے محلے کے نزدیک ۱۸۶۰ء میں قائم ہوا تھا۔

انگریز مسلمانوں کا نیا دنیا دار معاشرہ [illegible] تھا۔ ہر خاندان پر نظر رکھتا تھا [illegible] پڑھ رہے تھے کہ ایک روز کلکٹر کا چپڑاسی [illegible]

[1] سید معشوق علی کی جاگیر دھنائی ضلع علی گڑھ میں تھی۔ ایام غدر میں سرکار انگلشیہ کی تحویل میں دی گئی۔ جس کے عوض گورنمنٹ نے سید معشوق علی کے والد کی پنشن مقرر کر دی۔ یہ پرانے بزرگ انگریزی سے ناواقف تھے۔ کاغذات کی جانے کیا ہیرا پھیری دشمنوں نے کی۔ جاگیر غت ربود ہوئی۔ صرف وقائع نعمت خان عالی ہاتھ میں رہ گئے۔ سید معشوق علی کے مقدمہ کی پیروی کے سلسلے میں مرادآباد کے سر محمد یعقوب مرحوم نے گورنمنٹ کا بہت پیچھا لیا۔ مگر بے سود۔ سید معشوق علی کے بیٹے سید محسن علی [illegible] ڈائریکٹر آف ہز ہائینس [illegible] تھے۔ چند سال قبل الہ آباد میں [illegible] (ق ع)

ساغر نظامی
ڈی۔ ٹو۔ ۳۵۹ پنڈارہ روڈ، نئی دہلی ۳

غزل

جب کہیں جلسۂ غنچہ دہاں ہوتا ہے
وہیں اک محشرِ آشفتہ دِلاں ہوتا ہے

جس جگہ جشنِ گل و گلبدناں ہوتا ہے
رقص میں میں ہی نہیں سارا جہاں ہوتا ہے

جلوہ ترغیبِ گنہ اور نگہہ مجرمِ شوق
دیکھ کر آپ کو اب ضبط کہاں ہوتا ہے

حسن نے سارے حجابات تو خود پھونک دیئے
ہم پہ گستاخ نگاہی کا گماں ہوتا ہے

جتنی گیسوئے حقائق کی گرہ کھلتی ہے
جذبۂ عشق جواں اور جواں ہوتا ہے

کفر کو کفر نہ کہہ، کفر بھی ہے تحفۂ عشق
کفر کی گود میں ایمان جواں ہوتا ہے

مومنِ عمر گزیدہ، مرے ہمراہ تو چل
پہلے ہی گھونٹ میں ہر پیر جواں ہوتا ہے

ایسا عالم بھی مغنی پہ گزرتا ہے کبھی
نغمۂ عیش بھی اک سیلِ فغاں ہوتا ہے

میرے احساس پہ یہ وقت بھی آتا ہے کبھی
کہ فقط ایک کھنڈر کون و مکاں ہوتا ہے

ایسے لمحے بھی کبھی عشق میں آجاتے ہیں
کہ تصور بھی ترا بارِ گراں ہوتا ہے

کبھی بڑھ جاتی ہے افسردگیٔ دل اتنی
کہ اک ہلکا سا ترنم بھی گراں ہوتا ہے

کبھی ایسی بھی کرن پھوٹتی ہے صبح کے وقت
کہ یہ عالم مری نظروں میں دھواں ہوتا ہے

کبھی وہ لمحے بھی آجاتے ہیں روز و شب میں
کہ سما اور نہ مکاں، اور نہ زماں ہوتا ہے

کسی کروٹ بھی اُگل دیتی ہے حق کو دھرتی
ہم چھپاتے ہیں جسے خود وہ عیاں ہوتا ہے

خشک آنکھوں پہ نہ جا، میری خموشی پہ نہ جا
عشق میں یہ بھی اک اندازِ فغاں ہوتا ہے

پُرسا دیتی ہے خزاں سیج سجاتی ہے صبا
جب سرِ شاخ کوئی پھول جواں ہوتا ہے

کون کون اُس کا تماشائی ہے وقتِ رخصت
اس قدر ہوش مسافر کو کہاں ہوتا ہے

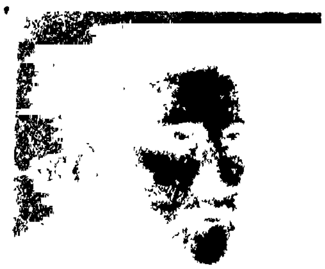
جب بھی میں سوچتا ہوں کون ہے دشمن تو مجھے
اپنی ہی ذات پہ دشمن کا گماں ہوتا ہے

ہائے تقدیر کہ اب اپنے ہی گھر میں مجھ کو
خود پہ اک لالۂ صحرا کا گماں ہوتا ہے

آج بھی حضرتِ ساغرؔ وہیں آتے ہیں نظر
جس جگہ مجمعِ سیمیں بدناں ہوتا ہے

ظہیر احمد صدیقی
صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی - دہلی

میرے والد
(ضیا احمد بدایونی)



پروفیسر
ضیا احمد بدایونی مرحوم

۵ر جولائی ۷۳ء کو دوپہر ایک بجے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور اٹھایا۔ معلوم ہوا کہ کوئی علی گڑھ سے بات کرنا چاہتا ہے۔ جب سلسلہ ملا یا گیا تو پتہ چلا کہ حضرت قبلہ وکعبہ کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔ اس لئے مجھے فوراً علی گڑھ پہونچ جانا چاہئے اسی کے ساتھ یہ بھی اطلاع ملی کہ وہ اسپتال میں ہیں۔ کس عالم میں ٹیلی فون پر بات سنی اور کیا کیفیت اس لمحہ گزر گئی اس کا تصور جب کرتا ہوں تو روح کانپ اٹھتی ہے۔ میں جانتا تھا کہ قبلہ کی کتنی ہی طبیعت خراب ہو یا پریشان ہوں۔ انھوں نے کبھی پسند نہیں کیا کہ دوسروں کو اطلاع دے کر پریشان کیا جائے۔ وہ عام طور سے ڈاکٹر کو دکھانے سے بھی گریز کرتے تھے۔ پتہ نہیں اسپتال جانے پر کیوں کر راضی ہوئے ہوں گے۔ ذہن میں برابر طوفان اٹھ رہے تھے۔ افتاں وخیزاں علی گڑھ پہنچا تو حضرت قبلہ کو بے ہوش میڈیکل کالج کے ایمرجنسی روم میں پایا۔ ڈاکٹر اپنی سی کوشش کر رہے تھے اور اعزہ سر بسجدہ تھے۔ تین دن اسی عالم میں گزر گئے۔ امید وبیم کی یہ کشمکش بھی عجیب ہوتی ہے کبھی اس قدر مایوسی کہ زندگی کے وجود کا احساس بھی ختم ہو جاتا تھا اور کبھی امید پیدا ہوتی تو بے ساختہ کان ادھر لگ جاتے تھے کہ اب کوئی آواز آئے گی کہ "بیٹے! میرے پاس آؤ۔ کیا یہ چادر اور تکیہ پاک بھی ہے جس پر تجھے لٹا دیا ہے؟" مگر ذہن یہ تصورات بنا بنا کر بگاڑ... رہا تھا۔ اور مریض زندگی سے موت کی طرف تیزی سے راستہ طے کر رہا تھا۔ ڈاکٹر کہہ رہے تھے کہ "ہم دوا کر رہے ہیں آپ دعا کیجئے" مگر

ہوتا نہیں طبیب مداوا سے دست کش
سچ ہے اجل تو ہنستی ہے سعی طبیب پر

آخر کار ۷ر اور ۸ر کی درمیانی شب میں صبح ۳ بجے وہ اپنے رفیق اعلا سے جاملے۔ ان کو اپنے آقا سے ملنے کی اس قدر جلدی تھی کہ یہ نہ سوچا کہ ان کے غلاموں پر ان کے بغیر کیا گزر جائے گی۔ اس پوری بیہوشی کے دوران صرف ایک لفظ زبان سے نکلا اور وہ نام اپنے پیدا کرنے والے کا تھا۔ جب آخری لمحہ آیا تو خود اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ لبوں پر مسکراہٹ پیدا ہوئی اور جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ عزیزوں نے ممکن ہے کہ عقیدت اور محبت کی نظر سے دیکھا ہو مگر دوسرے لوگوں نے بتایا کہ چہرے پر ایک ابدی مسکراہٹ ہویدا تھی۔ اور جس نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا اس کو مرد مومن کی اس مسکراہٹ سے تعبیر کیا جو اس کے چہرے پر اپنے رب سے ملنے کے وقت پیدا ہوتی ہے۔ چچا صاحب نے جب یہ سنا تو بے اختیار کہہ اٹھے "ان کے پروردگار کے ساتھ ان کا معاملہ بہت اچھا رہا اور ان کی پاک روح کو دربار الٰہی سے بشارت مل گئی۔ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی ؏"

پروفیسر ضیا احمد بدایونی کا انتقال نہیں ہوا بلکہ ایک دور کا خاتمہ ہو گیا۔ ایک تہذیب اور شائستگی کا اختتام ہو گیا۔ عالم کی موت عالم کی موت ہوتی ہے وہ سانچے ٹوٹ گئے جس میں قدرت ایسی ہستیوں کو ڈھالا کرتی تھی۔ میرے لئے یہ غم محض ایک باپ کا غم نہ تھا۔ آج میرا آقا مجھ سے رخصت ہو گیا۔ میرا استاد مجھ سے جدا ہو گیا۔ میرا رہنما مجھ سے بچھڑ گیا۔ زندگی

کے اس ہجوم میں کسی رہنما نے انگلی پکڑ لی تھی اور اب وہ تنہا چھوڑ کر چلا گیا۔

چوالیس سال کی زندگی میں جب سے ہوش سنبھالا ہے ایک ایک منظر نگاہ کے سامنے اس طرح آ رہا ہے جیسے پردے پر تصویریں دکھائی جا رہی ہوں! ان میں زندگی کے نشیب و فراز بھی ہیں، خوشیاں اور غم بھی۔ لوگوں کا ایک ہجوم ہے جن میں اُستاد، عزیز و اقارب، دوست سب موجود ہیں مگر ان میں سب سے نمایاں اور روشن تصویر حضرت قبلہ کی نظر آ رہی ہے جو صرف میری جسمانی نشو و نما ہی کے ذمہ دار نہ تھے بلکہ تعلیمی اور ذہنی آرائش میں بھی اپنا تمام تر وقت مجھے دیتے تھے۔ اپنے بھائیوں میں مجھے یہ سعادت زیادہ حاصل رہی ہے کہ ان کے قدموں میں بیٹھ کر کچھ حاصل کروں۔ ان کی سیرت کے مختلف گوشے ایک ایک کر کے اپنا رنگ دکھا رہے ہیں۔ یہ واقعات بے ترتیب سہی مگر کبھی کسی نے قبلہ کی تصویر میں رنگ بھرنا چاہا تو یہ بے ترتیب رنگ اس کے لئے ترتیب و تزئین کا سبب بنیں گے۔ اس وقت جب کہ میرا قلم اپنا توازن کھو چکا ہے۔ ذہن پراگندہ ہو رہا ہے۔ کسی تاریخی تسلسل اور واقعات کی ترتیب کی توقع بھی نہ کیجئے۔ زندگی کے واقعات کو بھی اس وقت اس لئے نہیں چھیڑنا چاہتا کہ ادب کے طالب علم نے کبھی گوشہ نشین ادیبوں [illegible] اور عالموں پر تحقیق کی تو قبلہ کو اس صف میں پیش کرے گا جو [illegible] تہذیب اور ادب کی جان ہیں۔ اس وقت وہ اُردو، عربی [illegible] ادب میں اُن کے مقام کو متعین کرنے کی کوشش کرے گا۔ ایک مفسر قرآن، محدث اور تاریخ اسلام پر نظر رکھنے والے عالم کا جو مرتبہ ہوتا ہے اس میں ان قدموں کے نشانات کو تلاش کرے گا تاکہ آنے والے قافلوں کو بتا سکے۔

حضرت قبلہ و کعبہ ۱۸۹۴ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ بدایوں ایک علمی [illegible] نمونہ رہا ہے۔ اور اس میں بھی جن چند خاندانوں کو خدا نے [illegible] ایک خاندان یہ بھی تھا جس میں والد صاحب نے آنکھ کھولی ان کے والد رفیع احمد عالی اور بڑے بھائی رضی احمد رضی نہ صرف یہ کہ بہت اچھے شاعر تھے بلکہ شعر کے بہت بڑے نباض تھے لغت، عروض اور فن شعر پر اس قدر گہری نظر تھی کہ ممکن نہیں کہ اس کا کوئی گوشہ نظر سے پوشیدہ رہ جائے۔ چھوٹے بھائی مولوی آفتاب احمد جوہر کی شعر گوئی کے واسطے [illegible] بدایوں کو دبستان شعر کا درجہ دیا گیا تو وہ اس کے [illegible] میں گے۔ والد صاحب اپنے بڑے بھائی رضی صاحب کے [illegible] تھے کہ جب وہ دیوان مومن کی شرح لکھ رہے تھے تو اکثر جگہ شعر کے مشکل انداز نے ان کو پریشان کیا۔ ملک کی بعض مقتدر شخصیتوں سے مطلب دریافت کیا، انہوں نے یا تو اپنی لاعلمی کا اظہار کیا اور کبھی شعر کو مہمل کہہ کے مسترد کر دیا مگر جب رضی صاحب کے سامنے شعر کو پیش کیا تو انہوں نے چند منٹ کی فکر کے بعد نکتہ کو اس طرح حل کر دیا جیسے کوئی اشکال ہی نہ تھا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس فضا میں حضرت قبلہ نے نشو و نما پائی۔ شعر و ادب کی گود میں کھیلے۔ مذہب اور علم کی آغوش میں پرورش پائی۔ اس لئے کیوں کر ممکن تھا کہ ان چیزوں سے متاثر نہ ہوتے۔ بچپن میں ایک مرتبہ سخت بیمار پڑے۔ ان کی نانی اور ماں نے منت مانی کہ اگر بچہ اچھا ہو گیا تو اس کو عربی اور مذہبیات کی باقاعدہ تعلیم دلوائی جائے گی۔ خدا کا کرنا کہ جہاں اچھے اور بڑے ڈاکٹروں کی دوا کام نہیں کر رہی تھی وہاں ایک معمولی حکیم کی دوا نے مسیحائی کی اور قبلہ صحت مند ہونے لگے اور انگریزی سے پہلے عربی کی تعلیم کے لئے بٹھا دیئے گئے۔ مولانا محب احمد صاحب سے عربی پڑھی جو اس زمانے کے جید عالم اور معلم تھے۔ ایک مرتبہ حضرت یونس علیہ السلام کو خواب میں دیکھا۔ غالباً ان سے کچھ بشارت پائی۔ چنانچہ بدایوں کے مشہور عالم اور محدث بزرگ سید یونس علی صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر سند حدیث لی۔ قرآن شریف اگرچہ حفظ نہیں کیا تھا مگر یاد اتنا اچھا تھا کہ وہ کہتے تھے کہ قرآن حکیم کا کوئی ٹکڑا سنا دو آگے کا حصہ میں پڑھ دوں گا۔

عربی اور مذہبی تعلیم کے بعد انگریزی کی طرف متوجہ ہوئے۔ ایم اے کرنے کے بعد کچھ عرصہ انہوں نے ریسرچ میں داخلہ لیا اور زبید احمد صاحب کی نگرانی میں عہد اکبری پر کچھ کام بھی کیا۔ کاش وہ کام مکمل ہو جاتا تو فارسی ادب میں بہت سے نایاب گوشے سامنے آجاتے۔ زبید احمد صاحب اپنے اس عزیز شاگرد کو اس قدر مانتے تھے کہ اکثر دوسرے شاگردوں کو رشک ہوتا تھا۔ مجھے اس کا اندازہ ان خطوط سے بھی ہوتا ہے جو آخر زمانے تک زبید صاحب قبلہ کو لکھتے رہے۔ ابتدا میں قبلہ کا تقرر دہلی کالج دہلی میں ہوا اور یہ بھی اتفاق ہے کہ ابتدا میں دہلی کالج میں رہے اور آخر زمانے میں دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے لغت سیکشن سے وابستہ رہے۔ پڑھنے پڑھانے کا شوق اس قدر رہا کہ کبھی ان کے ہاتھ سے کتاب کو جدا نہیں دیکھا۔ اس عمر میں بھی گرمیوں میں تو البتہ رات کا پڑھنا کم کر دیا تھا مگر میں نے دیکھا کہ عام طور سے مجھ سے پہلے وہ صبح کو اٹھ جاتے اور پڑھنے میں مصروف ہو جاتے اور میرے سونے کے بعد ان کی بجلی بند ہوتی۔ ایک صاحب ہمارے یہاں مہمان تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک ہفتہ میرا قیام رہا مگر ضیا صاحب

سے میں نے کتاب کو جدا نہیں دیکھا اور نہ رات کو سوتے ہوئے نظر آئے۔
علم کے سلسلہ میں اس قدر فراخ دل تھے کہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ گرمیوں کا زمانہ اور یونی ورسٹی سے آکر کھانا کھا کر آرام کرنے کے لئے لیٹ گئے۔ اتنے میں کچھ طلبا آ گئے۔ فوراً آرام کے کمرے سے ڈرائنگ روم میں آگئے۔ طلباء نے علی گڑھ کی اس صبر آزما گرمی میں ناوقت آنے کی معذرت چاہی تو بڑی خندہ پیشانی سے فرمانے لگے کہ آپ لوگ تو اپنے ہوسٹل سے راستہ طے کرکے آئے ہیں اور مجھے تو صرف ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں آنا پڑا ہے اور پھر وقت کی قید سے آزاد ہو کر پڑھانا شروع کر دیا۔

تحقیق اور جستجو کا اس قدر شوق تھا کہ کسی لفظ کا مطلب ان کو معلوم بھی ہوتا تو کہتے کہ توثیق کے لئے اس لفظ کو لغت میں بھی دیکھ لینا چاہئے۔ مجھے کل کی سی بات معلوم ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ علی گڑھ سے کسی کام کے سلسلہ میں دہلی جانا ہوا۔ وہاں ان کی بحث کسی تاریخی واقعہ پر پروفیسر رفعت حسین صدیقی مرحوم سے ہوگئی جو اس زمانہ میں دہلی میں قرول باغ میں رہتے تھے۔ رات کی گاڑی سے واپس لوٹے اور ۱۲ بجے کے قریب علی گڑھ پہنچے۔ جاڑوں کا زمانہ مگر ذہن اس واقعہ کی تصدیق کے لئے بے چین تھا۔ تانگہ کا کرایہ ادا کرکے سب سے پہلے اپنی کتابوں کی الماری پر پہنچے اور حوالے تلاش کرنا شروع کر دیئے اور جب وہ حوالا مل گیا تو کہنے لگے کہ سارے سفر کی تکان اتر گئی اب ذرا ذہن کا بوجھ بھی اتار دوں چنانچہ ڈاکٹر صاحب موصوف کو خط لکھ کر کپڑے بدل کر آرام کرنے کے لئے لیٹ گئے۔

شعبہ اردو میں بحث ہو رہی تھی کہ فلاں لفظ کا مطلب اور استعمال کیا ہے۔ بات یہاں جا کر ٹھہری کہ ضیا صاحب سے دریافت کیا جائے اور اس کو سند خیال کیا جائے۔ رشید احمد صدیقی صاحب نے غالباً نسیم قریشی صاحب کو بھیجا کہ ضیا صاحب سے جواب لے کر آئیں۔ قبلہ کو پرچہ ملا قلم برداشتہ اس لفظ کا مطلب، استعمال اور اس کے دوسرے متعلقات لکھ کر بھیج دیئے۔ اگرچہ بات پوری ہو چکی تھی مگر اس مضطرب دل کا کیا کیجئے جو خوب سے خوب تر اور بیش سے بیش تر کی تلاش میں رہتا ہے چنانچہ کلاس لینے کے بعد سیدھے لائبریری پہنچے، لغت اور فن کی کتابوں میں لفظ مذکور کو تلاش کرتے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد رشید صاحب کے پاس دوسرا خط بھیجا جا رہا ہے کہ اگرچہ میرا خیال درست ہے مگر کتابوں کے دیکھنے سے اس لفظ کے کچھ نئے SHADES نظر آئے جو تحریر کر رہا ہوں البتہ فلاں جگہ مجھے اتفاق ہے اور فلاں جگہ محلِ نظر ہے۔

مولوی اقتدار الدین صاحب بیرسٹر نے اس واقعہ کا ذکر اپنی کتاب میں بھی کیا ہے کہ جب وہ انگلستان گئے، تو پروفیسر براؤن سے ملنے کا اشتیاق ہوا۔ ملاقات کے درمیان جب پروفیسر موصوف کو یہ معلوم ہوا کہ بیرسٹر صاحب بدایوں کے ہیں تو انہوں نے دریافت کیا کہ وہ پروفیسر ضیا احمد بدایونی سے واقف ہیں جب انہوں نے اپنے تعلقاتِ خصوصی اور قرابت کا اظہار کیا تو پروفیسر براؤن اپنی شیلف پر سے دیوانِ مومن کا ایک نسخہ اٹھا کر لائے اور دیر تک اس کتاب کی اور قبلہ کے علم و فضل کی تعریف کرتے رہے۔ پروفیسر صاحب اگرچہ کبھی قبلہ سے نہیں ملے تھے مگر ان کی تحریروں سے بخوبی واقف تھے۔

اس علمیت کے ساتھ ذوقِ شعری اس قدر بلند تھا کہ اس کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ حافظہ کا یہ حال کہ مشاعرے سے اٹھے اور مشاعرے کے اچھے شعر زبان پر موجود ہوتے۔ مشہور تھا کہ جس مشاعرے میں یہ دونوں بھائی (ضیا صاحب قبلہ اور چچا صاحب آفتاب احمد جوہر قبلہ) ہوں ان سے پورا مشاعرہ دوبارہ سنا جا سکتا ہے۔ خود شعر کہتے اور اچھے شعر کا استعمال بھی اس قدر برمحل ہوتا کہ گویا شعر اسی موقع کے لئے کہا گیا ہے۔

ایک دن قبلہ رشید احمد صدیقی صاحب سے ملنے ان کے مکان پر گئے۔ ملازم جو ان کو نہیں پہچانتا تھا کہہ دیا کہ رشید صاحب گھر میں نہیں ہیں۔ قبلہ نے پرچہ پر حافظ کا ایک شعر لکھ کر ملازم کو دیدیا کہ جب رشید صاحب آئیں تو ان کو دیدیا جائے۔

مردم ز انتظار در دریں پردہ راہ نیست
یا ہست و پردہ دار نشانم نمی دہد

قبلہ واپس لوٹ ہی رہے تھے کہ ملازم نے گھر میں وہ پرچہ رشید صاحب کو دیدیا وہ فوراً گھر سے باہر نکل آئے اور ملازم کی حرکت پر معذرت خواہ ہوئے۔ رشید صاحب اس پر ہی مطمئن نہیں ہوئے اگلے دن ایک خط لکھا۔

" آپ نے یہ شعر فی الفور تصنیف فرما دیا تھا یا کسی اور کا ہے۔ جسے آپ نے اس موقع پر چسپاں کیا۔ بہرحال کچھ ہی ہو۔ میں آپ کے اس کو برمحل پیش کرنے پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ شاید ہی کوئی اور اس

سے زیادہ موزوں شعر اس محل پر پیش کر سکتا تھا۔"

ایک دوسرا واقعہ بھی کچھ اسی نوعیت کا ہے۔ ایک مرتبہ میرے پھوپی زاد بھائی مسٹر اظہر احمد کمالی نے قبلہ سے وعدہ کیا کہ وہ نگینہ کا گڑ جو خاص اہتمام سے میوہ کے ساتھ تیار کیا جاتا ہے۔ ان کے لئے بھجوائیں گے۔ مگر نگینہ پہنچ کر اپنی دوسری مصروفیات کے باعث کمالی صاحب کو وعدہ یاد نہیں رہا جب کافی دن گزر گئے تو قبلہ نے پوسٹ کارڈ پر صرف یہ شعر لکھ کر بھیجدیا۔

مرا بر سادگی ہائے دلِ خود خندہ می آید
ز شیرینی قناعت کرد بر گفتار شیرنیست

چند سال ہوئے تو مجھے خیال ہوا کہ مومن پر جب میں کام کر ہی رہا ہوں تو کیوں نہ "انشائے مومن" (مومن کے فارسی خطوط) کا اردو میں ترجمہ بھی کر ڈالوں۔ مگر دشواری یہ تھی کہ کتاب ذخیرہ حبیب گنج میں تھی اور اس کتب خانے کی شرط یہ کہ کتاب اس کتب خانہ سے باہر نہ جانے پائے چنانچہ ایک صاحب کو آمادہ کیا کہ اس کو ٹائپ کر کے مجھے نسخہ فراہم کر دیں اور ان بے چارے نے میری خاطر یہ زحمت گوارا کی مگر جب ترجمہ کرنے بیٹھا تو معلوم ہوا کہ الفاظ میری فہم سے باہر ہیں۔ قبلہ کی خدمت میں اپنا مسئلہ پیش کیا تو کہنے لگے کہ یہ ترجمہ ممکن ہی نہیں ہے۔ میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا تو مسکرا کے فرمانے لگے کہ اول تو اس مطبوعہ نسخہ میں کاتب کی اصلاحات کیا کم ہیں کہ ٹائپ میں ان غلطیوں کے ساتھ اور اضافہ ہو گیا جب تک ٹائپ شدہ نسخہ کا اس مطبوعہ نسخہ سے مقابلہ نہ کر لیا جائے تو اس کی تصحیح ممکن نہیں۔ دلی میں وہ نسخہ کس طرح فراہم کیا جائے علی گڑھ جانے کے لئے ابھی وقت درکار ہے۔ میری اس دشواری کو قبلہ نے محسوس کیا اور کہنے لگے ٹائپ شدہ نسخہ لاؤ میں صحت قیاسی کئے دیتا ہوں جب علی گڑھ جائیں گے تو مقابلہ کر لیا جائے گا۔ ٹائپ شدہ نسخہ پڑھنا شروع کیا اور حاشیہ پر تصحیح کرتے گئے اس طرح پوری کتاب پڑھ گئے اور تصحیح کر دی۔ اس ذہن اور حافظے کے قربان جائیے کہ جب علی گڑھ آ کر مقابلہ کیا تو نوے فی صدی اصلاح مطابقِ اصل تھی اور جہاں کچھ فرق تھا اس میں بھی کچھ اصلاح ذہنِ مومن سے قریب تر تھی۔ ہو سکتا ہے کہ طباعت میں کچھ تحریف ہوئی ہو۔

علی گڑھ کی ملازمت میں تیس سال گزار دیئے مگر وائس چانسلروں اور دوسرے ارباب حل و عقد سے ہمیشہ بے نیاز رہے خود کہتے تھے کہ سر راس مسعود اور سر شاہ سلیمان ان دونوں کے پاس تو اکثر جایا کرتا تھا اور یہ دونوں اتنے علم دوست تھے کہ کسی کام میں بھی مصروف ہوتے تو چھوڑ دیتے اور جتنے وقت میں موجود رہتا صرف علم و ادب کے موضوع پر گفتگو کرتے رہتے۔ ان دونوں سے قبلہ کی عقیدت اور محبت کا یہ حال تھا کہ "قصائد مومن" اور "دیوان مومن" انہی دونوں کے نام معنون کیا ہے۔ ترقی کے کون کون سے مواقع ان کو میسّر نہیں آئے۔ ان کے دوسرے ساتھی ترقی کی منزلوں پر کہیں سے کہیں جا پہنچے۔ مگر انہوں نے اپنے گوشۂ قناعت ہی کو اپنا دامن مراد سمجھا۔ پاکستان قائم ہوا لاہور اور ڈھاکے سے ارباب حل و عقد نے لکھا کہ یہاں کی پروفیسری اور کرسئ صدارت آپ کا انتظار کر رہی ہے مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ ان کو ذوق کی دلی کی گلیوں کی طرح علی گڑھ کی شاہراہیں عزیز تھیں۔ علی گڑھ سے ان کو اس قدر محبت اور عشق تھا کہ علی گڑھ میں جو ناخوشگوار واقعات پیش آئے ان پر ان کی بے چینی اور بیقراری دیکھنے کے قابل تھی۔ جذبات کے اظہار کی عادت بہت کم تھی مگر ذہن پر جو ردِ عمل ہوا اس کا اندازہ صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جو ان سے قریب رہے ہیں اس کا اندازہ صرف اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ علی گڑھ کے سلسلہ میں ان کا خیال تھا کہ اس معاملہ میں ذاکر صاحب کو مداخلت کرنا چاہئے تھی اور ان کا موجودہ طرزِ عمل نامناسب تھا۔ چنانچہ ان جذبات کا اظہار اپنی ایک نظم "ذاکر صاحب سے" میں کر دیا۔ جہاں ایک طرف ان کی عظمت اور بڑائی کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے وہاں دوسری طرف سارے کرب کا اظہار اس نظم کے آخری شعر میں کر دیا ہے۔

محکوم فتوئ خرد ذو فنوں مباش
ہر چند عقل کل شدۂ بے جنوں مباش

میں نے کئی مرتبہ عرض کیا کہ اس نظم کو شائع کروا دیجئے۔ مگر ہر مرتبہ انہوں نے انکار کر دیا۔ فرمانے لگے کہ نظم کو اپنے حالِ دل کہنے کا وسیلہ بنایا ہے اشتہار کے لئے نہیں آج جب میں اس نظم کا ذکر کر رہا ہوں۔ خدا مجھے قبلہ اور ذاکر صاحب کی روح سے شرمندہ نہ کرے۔

قبلہ کی زندگی کا خاکہ نامکمل ہے اگر ان کا مذہب سے شغف کا ذکر نہ کیا جائے۔ خدا۔ رسولؐ۔ صحابہ اور آلِ رسول کی محبت کو ہمیشہ جزوِ ایمان خیال کیا۔ محمود عباسی کی کتاب "خلافت معاویہ و یزید" شائع ہوئی تھی

ان کا بے باک قلم برداشت نہ کرسکا اور کئی مضمون اور ایک مبسوط کتاب "قولِ سدید" لکھ ڈالی۔ ایک مرتبہ کسی شیعہ عزیز نے قبلہ کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ مولانا سنی ہونے کے باوجود آلِ رسول سے محبت کرتے ہیں۔ قبلہ کے چہرے پر ناراضگی کے آثار پیدا ہوگئے اور کہنے لگے کہ ہر سنی رسول اور آلِ رسول کی محبت کو اپنا ایمان خیال کرتا ہے اس میں میری کیا تخصیص ہے۔

تاریخ ان کا کبھی موضوع نہیں رہا مگر تاریخ اسلام پر غیر معمولی بصیرت اور بصارت تھی۔ ایک ہندی اخبار "دنمان" کی فرمائش ہوئی کہ سلسلہ وار کئی مضمون سیرتِ رسول کے بارے میں اس اخبار کے لئے دے دیجئے ہم اس کو ہندی جاننے والے غیر مسلم طبقہ کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ جن بندشوں اور پابندیوں کے ساتھ ان کو مضمون لکھنا تھا ان کو انہوں نے محض اس لئے قبول کرلیا کہ وہ اپنی بات دوسروں کے سامنے رکھ سکیں۔ جب مضمون کی آخری قسط روانہ کردی تو شبلی کے وہ شعر پڑھے۔

عجم کی مدح کی، عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیمِ آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتم
خدا کا شکر ہے کہ یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

اور اتفاق دیکھئے کہ یہ اُن کا آخری مضمون ثابت ہوا۔

علم اور فضل کی اس بلندی پر ہوتے ہوئے انکسار اور عاجزی کا مجسمہ کسی کو دیکھنا ہے تو حضرت قبلہ کی مثال سامنے رکھ سکتا ہے۔ پوچھنے والے کو اس طرح جواب دیتے کہ سائل نے سوال کرکے ان پر احسان کیا ہے۔ بعض لوگوں نے خواہش کی کہ وہ مشورۂ سخن کرنا چاہتے ہیں اور باقاعدہ شاگرد ہونا چاہتے ہیں۔ قبلہ نے ہمیشہ اس سے گریز کیا اور کہا کہ خود مجھے اُستاد کی تلاش ہے ایسی صورت میں اُستادی کا دعویٰ کیوں کر کروں۔ البتہ شعر و سخن کے سلسلہ میں کبھی کچھ دریافت کرنا ہو تو ضرور آسکتے ہیں۔

جب مجھے خیال پیدا ہوا کہ قبلہ کے مضامین کتابی صورت میں شائع ہوجانا چاہئیں تو کہنے لگے کہ تنقید اور تعلیم دونوں کی رفتار اس تیزی سے آگے بڑھ چکی ہے کہ میرے مضامین OUT OF DATE معلوم ہوں گے۔ میں نے جب اصرار کیا تو کہنے لگے کہ اچھا نظرِ ثانی کرلوں۔ اس کے بعد شائع کرنے کے لئے دینا۔ جب کئی سال اس کو بھی گزر گئے اور میں نے محسوس کیا کہ وہ نظرِ ثانی نہیں کریں گے تو ان کے اُردو مضامین کو ترتیب دے پریس کے سپرد کردیا جو "مباحث و مسائل" کے نام سے اور دوسرا مجموعہ ان کے مذہبی مضامین کا "جلوۂ حقیقت" کے نام سے شائع ہوا۔ تیسرا مجموعہ جو فارسی موضوعات سے متعلق ہے۔ مکتبہ جامعہ سے شائع ہونے والا ہے۔

اس بات کا بھی کم لوگوں کو علم ہوگا کہ اکبری عہد کے مشہور مورخ ملا عبدالقادر مورخ البدایونی[1] اور مغلیہ عہد کے آخری دور کے مشہور شاعر مومن خاں مومن[2] کی قبریں جو بے نشان تھیں اور زمانے کے حادثات نے جن کو گمنامی میں ڈال دیا تھا ان کے نشان کی بازیافت کا سہرا قبلہ کے سر ہے۔ اس کے بعد ان کی کوششوں سے ان مزارات کو پختہ کروادیا گیا۔

زندگی کے کن کن واقعات کا ذکر کروں۔ ان کی سیرت کے کن گوشوں کو اُجاگر کروں۔ ان کے علم و فضل کا ذکر کیا جائے یا سادگیٔ وضع پر قلم اٹھایا جائے۔ ان کی زندگی اس سمندر کی طرح تھی جس کی گہرائی کا کون اندازہ کرسکتا ہے مگر اتنا پُرسکون کہ ظاہری نظریں نہ اس کی وسعت کا اندازہ کرسکتی ہیں اور نہ اس کی گہرائی کا۔

ع تمہاری نیکیاں زندہ تمہاری خوبیاں باقی

●●

---

[1] ملا صاحب کے مزار کے پختہ بن جانے پر انہوں نے شکریہ کے طور پر جو نظم لکھی ہے اس کے حاشیہ پر یہ نوٹ ہے: "ملا عبدالقادر بدایونی رح کا مقبرہ راقم کی تحریک پر مولوی اکرام عالم وکیل بدایونی نے تعمیر کرادیا۔"

[2] اسی طرح قبلہ کی تحریک پر پروفیسر احمد علی دہلوی نے مومن کے مزار کو پختہ بنوادیا۔

بقیہ: آسام میں اُردو

روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔ اس لئے ہمیں امید ہے کہ مستقبل قریب میں اُردو زبان کی تعلیمی سہولتوں میں خاطر خواہ اضافہ ہوگا۔

تجاویز :-

(۱) ریاست کے اسکولوں میں اُردو تعلیم و تدریس کی سہولیات فراہم کی جائیں۔

(۲) اُردو اسکولوں اور کتب خانوں کو مالی امداد دی جائے۔

(۳) اُردو کے اہلِ قلم کی انعامات اور مالی امداد کے ذریعے حوصلہ افزائی کی جائے۔

۴۔ اُردو کتابوں کی اشاعت کی سہولتیں فراہم کی جائیں۔

●●

جاں نثار اختر
پریم آلیہ ۲۴ روڈ باندرہ بمبئی ۵۰

غزل

خود بخود مئے ہے کہ شیشے میں بھری آوے ہے
کس بلا کی تمہیں جادو نظری آوے ہے

دل میں در آوے ہے ہر صبح کوئی یاد ایسے
جوں دبے پاؤں نسیمِ سحری آوے ہے

اور بھی زخم ہوئے جاتے ہیں گہرے دل کے
ہم تو سمجھے تھے تمہیں چارہ گری آوے ہے

ایک قطرہ بھی لہو جب نہ رہے سینے میں
تب کہیں عشق میں کچھ بے جگری آوے ہے

چاکِ دامان و گریباں کے بھی آداب ہیں کچھ
ہر دِوانے کو کہاں جامہ دری آوے ہے

تو کبھی راگ، کبھی رنگ، کبھی خوشبو ہے
کیسی کیسی نہ تجھے عشوہ گری آوے ہے

صاحبو! حسن کی پہچان کوئی کھیل نہیں
دل لہو ہو تو کہیں دیدہ وری آوے ہے

شجرِ عشق تو مانگے ہے لہو کے آنسو
تب کہیں جا کے، کوئی شاخ ہری آوے ہے

آپ اپنے کو بھلانا کوئی آسان نہیں
کتنی مشکل سے میاں بے خبری آوے ہے

اے مرے شہرِ نگاراں ترا کیا حال ہوا
چپّے چپّے پہ مری آنکھ بھری آوے ہے

شہریار
حامد لاج، امیر نشاں، سول لائنز، علی گڑھ (یو۔پی)

نفی سے اثبات تک

رات کا یہ سمندر تمہارے لئے
تم سمندر کی خاطر بنے ہو
دلوں میں کبھی خشکیوں کی سحر کا تصور نہ آئے
اسی واسطے تم کو بے بادباں کشتیاں دی گئی ہیں
سفر، رات کے اس سمندر کی گہرائیوں کا سفر بے کراں ہے
اکیلے ہو تم اور اکیلے رہو گے
مگر آسماں کی جگہ آسماں اور زمیں کی جگہ یہ زمیں
تم سے قائم ہے
دائم ہے یہ رات
اور رات کے تم امیں ہو
اگر آنکھ میں نور کا کوئی منظر ہے
اس کی حفاظت کرو

غزل

دھوپ کے دشت میں، بے سایہ شجر میں ہم تھے
منہمک پھر بھی سرابوں کے سفر میں ہم تھے
تیری آواز کے جادو نے خبردار کیا
نا سمجھ تھے کہ بلاؤں کے اثر میں ہم تھے
منتشر کر چکی آندھی تو یہ معلوم ہوا
اک بگولے کی طرح ریت کے گھر میں ہم تھے
تا نہ شاکی رہے دریائے ہوس کی کوئی موج
بادباں جسم کے کھولے کہ بھنور میں ہم تھے
یہ ترے قرب کا اعجاز ہے ورنہ پہلے
طاق اتنے کہاں جینے کے ہنر میں ہم تھے

گوپی چند نارنگ
ڈی ۲۵۲ سروودے انکلیو نئی دہلی - ۱۷

اُردو اور ہندی کا لسانی اشتراک

جتنا گہرا رشتہ اُردو اور ہندی میں ہے، شاید دنیا کی کسی دو زبانوں میں نہیں۔ دونوں کی بنیاد اور ڈول اور کینڈا بالکل ایک ہیں۔ یہاں تک کہ کئی بار دونوں زبانوں کو ایک سمجھ لیا جاتا ہے۔ دونوں ایک ہی سرچشمہ سے پیدا ہوئیں جس کے بعد دونوں کا ارتقا الگ الگ سمتوں میں ہوا اور دو اہم لسانی اور ادبی روایتیں وجود میں آگئیں۔ اگرچہ ہندی اپنا فیضان سنسکرت سے اور اُردو پراکرتوں کے علاوہ عربی اور فارسی سے حاصل کرتی ہے۔ جس کی وجہ سے لفظیات میں خاصا فرق ہے۔ تاہم نسبتی اعتبار سے سگی بہنیں ہونے کی وجہ سے دونوں میں گہرا لسانی اشتراک پایا جاتا ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں ہم اسی اشتراک پر اپنی توجہ صرف کریں گے۔

دونوں زبانوں کا جدامجد اِنڈک ہے ہزاروں سال پہلے جب آریہ ہندوستان آئے تھے تو وہ اِنڈک زبان بولتے تھے جس میں چاروں وید لکھے گئے۔ اسی کے معیاری رُوپ کو سنسکرت کا نام دیا گیا۔ اِنڈک کے ساتھ ساتھ پراکرتوں کا ظہور ہوا اور پراکرتیں رواج اور چلن سے بدل کر اپ بھرنشیں بنیں۔ بودھوں اور جینیوں کا زیادہ تر ادب انہیں پراکرتوں وغیرہ میں ملتا ہے۔ دسویں اور گیارہویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کے ہندوستان آنے کے بعد سیاسی نقشے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے تہذیبی اور لسانی نقشے میں بھی تیزی سے تبدیلیاں ہونے لگیں عربی فارسی اور ترکی کے اثر سے ہزاروں نئے لفظ اپ بھرنشوں میں داخل ہونے لگے اور اس طرح لین دین اور روزمرہ کی ضرورتوں کے لئے ایک ملی جلی ریختہ زبان سامنے آنے لگی۔ شمالی مغربی ہندوستان میں اس وقت شورسینی اپ بھرنش کا دَور دَورہ تھا جبکہ سندھ، ملتان، بھاول پور وغیرہ میں کیکئی اپ بھرنش رائج تھی۔ انہیں دو اُپ بھرنشوں اور اُن کی بولیوں نے مل کر نئی ہندوستان گیر ملواں زبان کے لئے کھاد کا کام دیا ہوگا۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کا پہلا باقاعدہ سابقہ پنجاب کے میدانوں میں ہوا۔ غزنویوں کی راج دھانی لاہور تھی۔ اسی زمانے میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد پنجاب میں آباد ہوگئی اور تہذیبی میل جول کے ساتھ لسانی اخذ و قبول اور اختلاط و ارتباط بھی شروع ہوگیا۔ غزنوی سلاطین کی حکومت پنجاب میں تقریباً ڈیڑھ سو سال رہی۔ چنانچہ اسی عرصہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی یکجائی سے ایک نئی ملواں زبان کا پیدا ہو جانا بالکل فطری بات تھی۔ اس زبان کو اس زمانے میں "ہندوی" کہتے تھے۔ یہ موجودہ ہندی اور اُردو کی ماں رہی ہوگی۔ اس زبان کی پیدائش کا سب سے بڑا ثبوت غزنوی دور کے فارسی شاعر مسعود سعد سلمان کا وہ کلام ہے جو محفوظ نہیں رہا لیکن محمد عوفی نے اپنے تذکرہ "لباب الالباب" اور امیر خسرو نے اپنے فارسی دیوان "غرۃ الکمال" کے دیباچے میں اس بات کی تصدیق کی ہے کہ مسعود سعد سلمان "ہندوی" میں شعر کہتے تھے۔

غزنویوں کے بعد غوریوں کی حکومت شروع ہوئی تو راج دھانی لاہور نہیں بلکہ دہلی قرار پائی۔ اسی سے ہندی اور اُردو زبان کی ملی جلی ابتدائی تاریخ کا دُوسرا دَور شروع ہوتا ہے۔ محمود شیرانی کا خیال ہے کہ غوری کے حملوں کے بعد پنجاب سے عوام کی بڑی تعداد دہلی کی طرف چلی گئی اور اپنے ساتھ اس نئی زبان "ہندوی" کو بھی لیتی گئی۔ جو غزنویوں کے زمانے میں وجود میں آچکی تھی اور جو "زبانِ لاہوری" یعنی پنجابی سے مختلف تھی۔ دہلی کے گرد و نواح میں اس زمانے میں شورسینی کی جو قدیم بولیاں رائج تھیں، ان میں سے کھڑی، ہریانی اور برج خاصی اہم تھیں۔ چونکہ پنجابی، کھڑی اور ہریانی سے قریب تھی، اس لئے پنجاب سے آنے والوں کو برج کی نسبت کھڑی اور ہریانی میں زیادہ اپنائیت محسوس ہوئی۔

اس طرح سیاسی مرکز کے دہلی منتقل ہو جانے سے زبان کی ابتدائی تاریخ پر زبردست اثر پڑا۔ اس وقت نئی زبان کی حالت ایک ایسے لوہے کی تھی، جو کسی بھی سانچے میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ پنجابی اور لہندا کا اثر تو نئی زبان پہلے ہی قبول کر چکی تھی، دہلی آنے کے بعد اس نے کھڑی

اور ہریانی بولیوں کے عناصر سے اپنی حدود کو مزید وسیع کرنا شروع کر دیا۔ ہندی اور اُردو کی مشترک نشو و نما کی تیسری کڑی اس نئی ملی جلی زبان کا تیرہویں اور چودہویں صدی میں دکن پہنچنا تھا۔ دکن کی فتح تو خلجیوں کے زمانے میں ہو گئی تھی، لیکن نئی زبان کے اس علاقے میں جڑ پکڑنے کی نوبت اس وقت پیش آئی جب محمد تغلق کے عہد میں ہندوستان کی آبادی کو دلی سے دولت آباد لے جایا گیا۔ دلی کے عوام بہت بڑی تعداد میں وہاں پہنچے اور قدرتاً نئی زبان کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ جسن گنگو کے بہمنی خاندان کے بعد اس زبان کو قطب شاہیوں اور عادل شاہیوں کی سرپرستی حاصل رہی اور اس نے خاصی ترقی کی۔ چودہویں سے سولہویں صدی تک کے اس زمانے میں یہ زبان جو شمالی ہندوستان کی "ریختہ" کے مقابلے میں "دکنی" کہلاتی تھی، اب باقاعدہ شعر و ادب کی زبان کی حیثیت سے سامنے آنے لگی۔ اس کے شاعروں میں محمد قلی قطب شاہ، وجہی، نصرتی، غواصی، مقیمی، ابن نشاطی، فائز، ولی اور سراج خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ جن کی غزلیں اور مثنویاں قدیم اُردو کا شاندار سرمایہ ہیں اور جس کو ہندی والے بھی اپنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ ان تخلیقات کی زبان پراکرتوں سے خاصی قریب تھی، اس کو نہ خالص ہندی کہا جا سکتا ہے، نہ خالص اُردو۔ اس میں ابتدائی زبان کی ایک ایسی معصومیت، سادگی اور گھلاوٹ ہے جو بعد کی زبان میں نہیں ملتی۔ مثال کے طور پر محمد قلی قطب شاہ کے یہ شعر دیکھئے:-

پیا باج پیالا پیا جائے نا
پیا باج یک تل جیا جائے نا
کہتے پیا بن صبوری کروں
کہیا جائے اما کیا جائے نا
نہیں عشق جس وہ بڑا کوڑ ہے
کدھیں اس سے مل بیسیا جائے نا
قطب شہ نہ دے مج دوانے کو پند
دوانے کو کچھ پند دیا جائے نا

یہی رنگ اس زمانے کی نثر میں بھی ملتا ہے۔ شروع کے کئی مصنفین نے نثر کو مذہبی کاموں کے لئے استعمال کیا۔ اس دور کی نثر میں بھی ہندی اُردو کا ملا جلا انداز ملتا ہے جس کا بہترین نمونہ مُلّا وجہی کی "سب رس" ہے۔ "سب رس" کی زبان ملے جلے ہندی اُردو اسلوب کی بے نظیر مثال پیش کرتی ہے،

"داناکوں یاں کیا چارا۔ نادان کی سمجھ میں ہے اندھارا۔ سمجھا سو پایا نئیں سمجھا سو گنوایا۔ جو کوئی اس شراب کی مستی نئیں سمجیا، سو اس شراب کی مستی کیا جانے ... شراب کوں آپے پینا نہ یوں اچھا کہ شراب اپس کوں پیے۔ جو شراب اسے پیا، خراب کیا تو یوں کیوں جیوے۔ گھانس آگ پر کھانے جائے تو جلنا، مچھلی خشکی پر پڑے تو تلملنا۔ چیونٹی، ہتی کا بھارا چا سکتی ہے؟ ... کنکر ڈونگر کی برابری کرے گا؟ تارا چاندسوں ہم بھرے گا؟ دیوا آفتاب کے سنمکھ آئے گا؟ شرار شعلے پر منہ سہائے گا؟ شراب پر ہر کوئی ہم نہیں بھرتا ... عاشق کی عبادت حسن دیکھنا، راگ سُننا، شراب پینا ہے۔"

دکن کے مقابلے میں شمالی ہندوستان میں ہندی اور اُردو کو پوری طرح سامنے آنے میں ابھی مزید انتظار کرنا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ سرکاری زبان فارسی تھی اور وہی تہذیب و معاشرت اور شعر و ادب پر چھائی ہوئی تھی۔ پھر بھی عوامی ضرورتوں سے نئی ریختہ زبان کی نشو و نما جاری رہی۔ ایک ملی جلی عام بول چال کی زبان کی زیادہ ضرورت بازاروں، لشکرگاہوں، درباروں اور خانقاہوں میں پڑتی تھی چنانچہ لشکر یا لشکری بازار کی رعایت سے اس نئی زبان کو جو کبھی "ہندوی" کہلاتی تھی، کبھی "ریختہ" اور کبھی "دکنی" اب لشکر کی رعایت سے "اُردو" بھی کہا جانے لگا۔ بعض لوگوں نے اسے "زبانِ ہندوستان" بھی لکھا ہے یعنی ہندوستان کی بولی اور اسی نسبت سے اُسے ہند کی بولی یعنی "ہندی" بھی کہنے لگے۔ شمالی ہندوستان میں اس زبان کے پہلے مستند نمونے امیر خسرو کی شاعری میں ملتے ہیں۔ اگرچہ یہ بھی محفوظ نہیں رہے اور سینہ بہ سینہ ہم تک پہنچے ہیں جس سے ان کی شکل میں ضرور کچھ نہ کچھ تبدیلی ہو گئی ہو گی۔ تاہم ان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت ہندی اور اُردو کا روپ کیسا تھا۔ امیر خسرو کو ہندی اور اُردو والے دونوں اپنا اپنا شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے یہ چند شعر دیکھئے:

ایک تھال موتی سے بھرا
سب کے سر پر اوندھا دھرا
چاروں اور وہ تھال پھرے
موتی اس سے ایک نہ گرے

پنکھا ہو کر میں ڈلی ساقی تیرا چاؤ
منج جلتی جنم گیا تیرے لیکھن ناؤ

ایک کہانی میں کہوں تو سُن لے میرے پوت
بنا پروں کے اُڑ گیا باندھ گلے میں سُوت

یہی وہ زبان تھی جسے بھگتوں، صوفیوں، سنتوں اور جوگیوں نے اپنے اپنے کلام اور نغموں سے آگے بڑھایا کیونکہ یہی وہ زبان تھی جس کے ذریعے وہ عوام کے دلوں تک پہنچ سکتے تھے۔ کرشن بھگتوں نے تو اپنے علاقے کی وجہ سے برج بھاشا کا سہارا لیا، لیکن نرگن وادی بھگتوں کے کلام میں کھڑی یعنی پُرانی ہندی اور اُردو کے نقوش مل جاتے ہیں۔ کبیر داس کہتے ہیں۔

آؤں گا نہ جاؤں گا مروں گا نہ جیوں گا
گرو کے سبد رم رم رہوں گا

کبیرا میرا مجھ میں کچھ نہیں جو کچھ ہے سو تیرا
تیرا تجھ کو سونپتے کیا لاگے میرا

گرو نانک کی شاعری میں بھی اسی زبان کا رُوپ جھلکتا ہوا نظر آتا ہے:

گرو پرسادی بوجھے تو ہوئی نبیرا
گھر گھر نام نرنجنا سو ٹھاکر میرا

میٹھے کو کڑوا کہیں، کڑوے کو میٹھا
رانے کو نندا کریں ایسا کل ماہیں ڈیٹھا

اس کے ساتھ ساتھ ہندی کی بعض بولیوں میں باقاعدہ شاعری کا آغاز بھی ہو گیا تھا یعنی اودھی میں ملک محمد جائسی اور تلسی داس، برج میں سور داس اور راجستھانی میں میرا بائی۔ یہ وہ شاعر ہیں جن کو ہندی کی ادبی روایت میں کلاسیکی حیثیت حاصل ہے۔ سترھویں صدی میں جب شاہجہاں نے دہلی کو نئے سرے سے بسایا تو اُردو کے چلن کو ایک معیاری رتبہ ملنے لگا، اور یہ زبان ادبی حیثیت سے سامنے آنے لگی۔ اس وقت فارسی کا زور ٹوٹ رہا تھا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ اورنگ زیب کے بعد اُردو شاعری کا باقاعدہ آغاز ہونے لگا۔ اس کے بعد اُردو، ہندی کے لسانی دھارے جو اب تک ساتھ ساتھ بہہ رہے تھے، اب کچھ الگ الگ ہو کر آگے بڑھنے لگے اور ہندی اُردو دو ادبی زبانوں کی حیثیت سے سامنے آنے لگیں۔

اوپر ہندی اور اُردو کے مشترک تاریخی پس منظر کی جو جھلک پیش کی گئی اس سے ظاہر ہے کہ ان دونوں زبانوں نے ابتدائی ارتقا کے دوران میں مِل جُل کر برج، ہریانی، پنجابی اور ہندا کئی بولیوں سے استفادہ کیا، لیکن دونوں نے سب سے زیادہ طاقت کھڑی سے حاصل کی۔ اس کے بعد ہندی اور اُردو اگرچہ الگ الگ دو زبانیں بن گئیں، لیکن چونکہ دونوں کا معیاری رُوپ کھڑی سے متاثر ہے، اور چونکہ دونوں کی ابتدائی تاریخ کئی صدیوں تک ایک رہی ہے، اس لئے جتنا اشتراک اِن دونوں کی آوازوں، اور صرفی و نحوی ڈھانچے اور روزمرّہ و محاورے میں آج بھی پایا جاتا ہے، شاید ہی دنیا کی کسی دو زبانوں میں پایا جاتا ہو۔

سب سے پہلے ایک نظر آوازوں پر ڈالئے۔ اُردو کی تقریباً چالیس آوازوں میں صرف پانچ ایسی ہیں جو فارسی عربی سے لی گئی ہیں، باقی سَب کی سَب ہندی اور اُردو میں مشترک ہیں۔ خاص طور سے سادہ اور ہکار بندشیہ آوازیں بھ، پھ، تھ، دھ، کھ، گھ، چھ، جھ وغیرہ بیس کی بیس پورے سٹ کی حیثیت سے ہندی اور اُردو میں تو موجود ہیں، لیکن ایسا سٹ نہ فارسی میں ہے نہ عربی میں۔ اس کے علاوہ معکوسی آوازیں یعنی ٹ، ڈ، ڑ اور ان کے ہکار روپ بھی ہندی اور اُردو میں مشترک ہیں، سوائے ڑ کے جس کو پراکرتوں کے تدبھو رجحان کے تحت اُردو والے سادہ بنا لیتے ہیں۔ گویا گنتی کی چند آوازوں کو چھوڑ کر اُردو اور ہندی کا مصمتوں کا ڈھانچہ تقریباً ایک جیسا ہے۔ مصوتوں میں تو صوتی ہم آہنگی سو فی صدی ہے۔ ہندی اور اُردو دونوں کے بنیادی مصوتے دس ہیں۔ اور ان میں کوئی فرق نہیں۔

اب صرف و نحو کو لیجئے اگر یہ کہا جائے "آپ کا نام کیا ہے؟" یا "آپ کہاں جائیں گے؟" یا "کیا آپ میری باتیں سُن رہے ہیں؟" یا "باہر اندھیرا ہے" یا "اس وقت کیا بجا ہے؟" یا "ارے بھئی کیا بات ہے اس کی" تو یہ ہندی بھی ہے اور اُردو بھی۔ لفظوں کا فرق ہو سکتا ہے لیکن جملے میں لفظوں کی ترتیب بالکل ایک سی ہے۔ تذکیر و تانیث کا جو فرق اُردو اور ہندی میں خال خال ہے یا روزمرہ کی وجہ سے اگر کوئی اختلاف کہیں جھلک جاتا ہے تو وہ ہندی اور اُردو سے مخصوص نہیں، بلکہ اتنا فرق تو دو بولیوں میں بھی راہ پا جاتا ہے۔ جملے کی جان تین چیزیں ہوتی ہیں۔ اسم، اسم صفت اور فعل۔

کئی اسم اور اسم صفت تو ہم نے فارسی عربی سے لیے، لیکن اردو فعل کا ہمارا سرمایہ سارا کا سارا مشترک ہے۔ فعل کے بغیر جملہ کا تصور کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اُٹھنا، بیٹھنا، کھانا، پینا، سونا، لینا، دینا، آنا، جانا، گانا، رونا، دھونا، رہنا، سہنا، سینکڑوں ہزاروں فعل جیسے ہندی میں ہیں، ویسے اردو میں۔ افعال زبان کی ریڑھ کی ہڈی ہوتے ہیں۔ ان ہزاروں افعال کو دیکھ کر جو ہندی اور اردو میں یکساں طور پر استعمال ہوتے ہیں یہ ایمان لانا پڑتا ہے کہ ہندی اور اردو دو جڑواں بہنیں ہیں جو آزادانہ طور پر ارتقا پذیر ہیں۔ لیکن دونوں کی ریڑھ کی ہڈی غیر مرئی طور پر ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہے۔ اردو کا دامن اس لحاظ سے اور بھی وسیع ہے کہ اس نے عربی فارسی لفظوں سے بھی ہندوستانی قاعدے کے مطابق کئی نئے فعل بنائے جنہیں بعد میں ہندی نے بھی قبول کیا۔ مثلاً بدلنا، فرمانا، شرمانا، رنگنا، خریدنا، آزمانا، چھینا، بخشنا، تراشنا، داغنا، بجانا، گزرنا، لرزنا، ستانا، نرمانا، گرمانا، نوازنا، بخشنا، قبولنا، کفنانا، دفنانا، خرچنا، چھٹنا وغیرہ۔

یہی معاملہ مرکب افعال کا ہے جو دونوں زبانوں میں یکساں استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً بتا دینا، گر پڑنا، اڑنے پانا، چلے آنا، لوٹ جانا، مار ڈالنا، گھر کرنا، سن لینا، بولا کرنا، کھلتے دینا وغیرہ۔ ان افعال کی حیثیت دراصل محاوروں کی سی ہے جو فعل کے دو اجزا سے مل کر بنتے ہیں اور دونوں زبانوں میں بالکل ایک طرح سے استعمال ہوتے ہیں۔ یہ بھی اردو اور ہندی کی مشترکہ خصوصیت ہے کہ مرکب افعال جس کثرت سے ان دو زبانوں میں استعمال ہوتے ہیں دنیا کی دوسری زبانوں میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

فعلیہ محاروں کے علاوہ ایسے محاوروں کی تعداد بھی ہزاروں تک پہنچے گی جو اسم یا صفت کو ملا کر بنتے ہیں اور دونوں زبانوں میں یکساں طور پر رائج ہیں۔ اختصار کے پیش نظر یہاں صرف دو اعضا یعنی آنکھ اور منہ سے بننے والے محاوروں اور روزمرہ کی مثالیں دی جاتی ہیں — منہ رکھنا، منہ بنانا، منہ اترنا، منہ بگاڑنا، منہ پھیرنا، منہ پھلانا، منہ بکنا، منہ چڑھانا، منہ کھلوانا، منہ مارنا، منہ کی کھانا، منہ ٹیڑھا کرنا، منہ آجانا، منہ اٹھ جانا، منہ بند ہونا، منہ پر مہر لگنا، منہ پر مردنی چھانا، منہ بھر آنا، منہ بھرائی دینا، منہ پر تھوک دینا، منہ پر مارنا، منہ پر خاک اڑنا، منہ پر تالا لگنا، منہ سے کہہ رہ جانا، منہ تک جگر آنا، منہ توڑ جواب دینا، منہ میں پانی بھر آنا، چھوٹا منہ بڑی بات، منہ در منہ کہنا، منہ دکھانے کے قابل نہ رہنا، منہ دھو رکھنا، منہ میں تنکا لینا، منہ دیکھتے رہ جانا، منہ ذرا سا نکل آنا، منہ لال ہو جانا، منہ پر بسنت پھولنا، منہ میں گھنگنیاں بھرنا، منہ سی دینا، منہ سے دودھ کی بو آنا، منہ کالا کرنا، منہ کو خون لگنا، منہ کے بل گرنا، منہ دیکھے کی پریت، منہ سے بولنا سر سے کھیلنا، منہ مانگی موت بھی نہیں ملتی، منہ کا میٹھا پیٹ کا کھوٹا، منہ کھائے آنکھ شرمائے، منہ پھٹ، منہ چور، منہ چٹ، منہ دکھلائی، منہ مانگے دام، منہ بولا بھائی۔

اب آنکھ سے بننے والی ترکیبوں کو بھی ایک نظر دیکھیے:۔

آنکھ آنا، آنکھ اٹھانا، آنکھ لڑنا، آنکھ بچانا، آنکھ بدلنا، آنکھ بچھانا، آنکھ پتھرانا، آنکھ پھڑکنا، آنکھ پھوٹنا، آنکھ پھوڑنا، آنکھ پھیرنا، آنکھ جھکنا، آنکھ چرانا، آنکھ ملنا، آنکھ لجانا، آنکھ لگنا، آنکھ مارنا، آنکھ ملانا، آنکھ نکالنا، آنکھیں بچھانا، آنکھیں بھر آنا، آنکھیں ٹھنڈی ہونا، آنکھیں روشن ہونا، آنکھیں موند لینا، آنکھوں میں دھول ڈالنا، آنکھوں میں رات کاٹنا، آنکھوں میں سمانا، آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا، آنکھوں میں پھرنا، آنکھوں میں چبھنا، آنکھوں میں چڑھنا، آنکھوں سے لگا لینا، آنکھوں کا پانی ڈھلنا، آنکھوں کے آگے اندھیرا آنا، آنکھوں پر قدم لینا، آنکھوں میں لہو اترنا، آنکھوں سے اوجھل ہونا، آنکھوں سے گر جانا، آنکھیں نیلی پیلی کرنا، آنکھیں کھل جانا، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا، آنکھیں چار ہونا، آنکھیں دکھانا، آنکھیں ٹکانا، آنکھوں پر بٹھانا، آنکھوں پر ٹھیکری رکھ لینا، آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنا، آنکھ اونچی نہ ہونا، آنکھ بند کر کے کچھ دینا، آنکھ بھر کر نہ دیکھنا، آنکھ پر پردہ پڑنا، آنکھ ٹھنڈی کرنا، آنکھ سے آنکھ ملانا، آنکھ سے لہو ٹپکنا، آنکھ کا پانی ڈھلنا، آنکھ کا کاجل چرانا، آنکھ کی پتلی کا پھرنا، آنکھ میلی نہ کرنا، آنکھ نہ جمنا، آنکھ نیچی کرنا، آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل، آنکھ کا اندھا گانٹھ کا پورا، آنکھ کا تارا، آنکھ مچولی، آنکھوں آنکھوں میں، آنکھوں کے اندھے نام نین سکھ، آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں، آنکھوں کے ناخن تو لو۔ یہ صرف دو لفظوں سے بننے والے محاوروں اور مرکبات کی ایک جھلک ہے۔ مکمل فہرست اس سے کئی گنا بڑی ہوگی۔ اسی سے بعض کثیر الاستعمال الفاظ سے بننے والے ہزاروں دوسرے محاروں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، جو دونوں زبانوں کے مشترک سرمایے کا بیش قیمت حصہ ہیں۔

اردو نے فارسی عربی الفاظ کو ہندی لفظوں کے ساتھ ملا کر

سینکڑوں نئے مرکب بنائے جو ہندی اور اُردو دونوں زبانوں میں استعمال ہوتے ہیں، چند یہاں درج کئے جاتے ہیں: بے سمجھ، ڈاک خانہ، راج دربار، بے کل، بدچلن، شرمیلا، رنگیلا، پان دان، عجائب گھر، بے دھڑک، چٹھی رساں، چوہے دان، گلاب جامن، جگت استاد، سبزی منڈی، گھوڑ سوار، جیب کترا، دل لگی، سمجھ دار، سدا بہار، گھردا ماد، گھڑی ساز، چڑی مار، تھانہ دار، پھول دان، بے گھر، کلاکار، تھڑ دلا، گرہ کٹ، بے ڈھب، گلے باز، لنگوٹیا یار، کمر کس، جوشیلا، منہ زور، بے ڈول، شور بے چٹ، ڈھل مل یقین، بے سرا، درشنی جوان، ٹکڑ گدا، دیوانہ پن، سنسنی خیز، کوڑھ مغز، من مست، بے بس، جیب گھڑی، کفن چور، بے عینی، لم قدا، اٹھتی جوانی، بے ڈھنگا پن، کٹور دان، بے لاگ، سنگار دان، گوند دانی، بے ٹھکانہ، پرسال، تبارہ، تماہی، تپاہی، تراہا، تسالہ، چوپایہ، چوراہا، چوگرد، چارپائی، چوگوشیہ ٹوپی، چومہری، سر چڑھانا، سر ڈوب، سر ڈھکی، سر منڈا، سر توڑ، لاپتہ، لاپرواہی، لاچارگی، ناملنسار، نوچندی، نوسکھ، امام باڑہ، اُلّو باز، دل لگی باز، اکڑ باز، دھوکے باز، دغا باز، بٹیر باز، پتنگ باز، پٹے باز، چوسر بازی، پھکڑ باز، گاڑی بان، رتھ بان، علم بردار، ہتھیار بندی، بھیج بند، لنگوٹ بند، تلوار بندی، لنگوٹیا یار، تک بندی، جکڑ بند، چھپر بندی، کھڑ بندی، مینڈھ بندی، ناکہ بندی، پاجی پرست، کنبہ پرور، بسنتی پوش، پلنگ پوش، بیاج خور، بل دار، بیل دار، بھڑک دار، پتی دار، پہرداری، پھل دار، چمکدار، توڑے دار، تھوک دار، ڈلی دار، بند دق، ٹھیکے دار، جالی دار، پھولدار، چوڑی دار، جھالر دار، دھاری دار، چھلے داری، ڈیوڑھی دار، لچھے دار، لیس دار، تھوک فروش، پھل کاری، کدو کش، گھیا کش، سرگشت، ہیجوان، نشیلا، نکیلا، جوشیلا، خرچیلا، شور وغل، بازار چودھری، باغ باڑی، تار گھر، گولر کباب، بال صفا، ہیچ فیصلہ، عید ملاپ، نقدی چٹھا، ہوتی محل، موتی مسجد، گل ٹکیہ، کفن چور، عمر پٹہ، چور محل، دماغ چٹ، پلنگ توڑ، تیس مار، مکھی مار، جیب کترا وغیرہ

اُردو اور ہندی کی بنیادی لفظیات BASIC VOCABULARY

ابھی تک تیار نہیں ہوئی لیکن اگر ایسی کوئی جامع فہرست تیار کی جائے تو اس میں فعلی مادوں (آ، جا، سو، دھو، اُٹھ، کہہ وغیرہ) مصادر (کھانا، پینا، جانا، رہنا، سونا، گانا وغیرہ) فعلیہ ترکیبوں (کھا کر، گرتے پڑتے، کر سکنا، بول چکنا، آ گیا ہوگا وغیرہ) اور فعلیہ لاحقوں (ہے، ہو، ہوں، ہیں، تھا، تھے، تھی، تھیں، جیو، جئے، گا، گے، گی) کے علاوہ جو الفاظ لازمی طور پر جگہ پائیں گے، وہ ہیں حروفِ جار (نے، سے، پر، تک، کا، کے، کی، کو، میں) حروفِ حصریہ (ہی، بھی، تو) کلماتِ استفہامیہ (کیوں، کب، کہاں، کیسے، کدھر، کن، کنھوں) کلماتِ تشبیہ (ایسے، جیسے، ویسے) کلماتِ اشاریہ (اِدھر، اُدھر، یہاں وہاں، جہاں) کلماتِ زمانی (اب، جب، تب، ابھی، جبھی، تبھی، کبھی) شخصی و غیر شخصی ضمائر (میں، ہم، تو، تم، آپ، وہ) اور ان کی تعریفی تشکلیں (مجھ، تجھ، اس، میرا، تیرا، ہمارا، تمہارا، انہیں، ہمیں، سبھی) اعدادِ بنیادی CARDINAL NUMBERS (ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ وغیرہ) اعدادِ توصیفی ORDINAL NUMBERS (پہلا، دوسرا، تیسرا، چوتھا، پانچواں، چھٹا، ساتواں، آٹھواں وغیرہ) اسی طرح سینکڑوں، ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں، اربوں، کھربوں تک یہ سب ہندی اور اُردو میں ایک ہیں اور ان میں ذرّہ برابر فرق نہیں۔ یہی معاملہ "واہ واہ" اور "ہائے ہائے" کا ہے۔ سینکڑوں گالیاں جو قدرتی طور پر منہ سے نکلتی ہیں، دونوں زبانوں میں ایک ہیں۔ جسم کے اعضاء کے ناموں میں بھی زبردست اشتراک پایا جاتا ہے۔ سر، ماتھا، آنکھیں، ناک، کان، ہونٹ، گردن، منہ، ہاتھ، پاؤں، بانہیں، ٹانگیں، پیٹ، پیٹھ، کمر، چھاتی، گھٹنا، کہنی، ایڑی وغیرہ دونوں زبانوں میں ہیں یہی حال رشتہ داریوں کا ہے۔ ماں، باپ، بیٹا، بیٹی، بھائی، بہن، دادا، دادی، نانا، نانی وغیرہ پر ہندی اور اُردو دونوں کا حق ہے۔ غرض بنیادی لفظیات دونوں زبانوں کی سو فی صد ایک ہے۔

اس سلسلے میں تلمیحوں اور کہاوتوں کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ اگرچہ اُردو نے اپنی تلمیحیں زیادہ تر اسلامی روایات سے لی ہیں لیکن بعض تلمیحیں مثلاً کرشن، رادھا، رام، لچھمن، سیتا، راون، ارجن، بھیم، ہیر، رانجھا وغیرہ ہندوستانی روایتوں سے بھی آئی ہیں۔ تلمیحوں سے کہیں زیادہ دونوں زبانوں کا اشتراک فعل اور محاورے کی طرح کہاوتوں میں جھلکتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ہندی اور اُردو میں سینکڑوں ایک ہی طرح کی کہاوتیں استعمال ہوتی ہیں۔ مثلاً جیسا دیس ویسا بھیس، لہو لگا کر شہیدوں میں شامل ہونا، ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا سوجھنا، دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا، مفت کی شراب قاضی کو بھی حلال، ہونہار بروا

لے چکنے چکنے پات، جاکو راکھے سائیاں مار نہ سکے کوئی، لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے، گھر کی مرغی دال برابر، چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات، مُلا کی دوڑ مسجد تک، ڈوبتے کو تنکے کا سہارا، یہ منہ اور مسور کی دال، دو مُلاؤں میں مرغی حرام، ٹیڑھی کھیر، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا، نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی، چور کی ڈاڑھی میں تنکا، جس کی لاٹھی اُس کی بھینس، منہ میں رام رام بغل میں چھُری، آنکھوں کے اندھے نام نین سکھ، بچہ بغل میں ڈھنڈورا شہر میں، ایک انار سو بیمار، آج مرے کل دوسرا دن، رسی جل گئی پر بل نہیں گیا، دُودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کر پیتا ہے، جوگی کس کے میت، اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت، دور کے ڈھول سہاونے، کہاں راجا بھوج کہاں گنگو تیلی، کوئلوں کی دلالی میں منہ کالا، بھاگتے چور کی لنگوٹی سہی، میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی، ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا، بگلا بھگت، گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے، سو چوہے کھا کر بلی حج کو چلی، یہ ان سینکڑوں کہاوتوں میں سے چند ہیں جو اُردو اور ہندی کے مشترکہ سرمائے کا کثرت سے استعمال ہونے والا حصہ ہے۔

سید احمد دہلوی مولف فرہنگِ آصفیہ کے اندازے کے مطابق اُردو کے پچپن ہزار الفاظ کے سرمائے میں تقریباً چالیس ہزار الفاظ ایسے ہیں جو سنسکرت اور پراکرتوں کے ماخذ سے آئے ہیں یا غیر زبانوں کے الفاظ کو اُردوا کر بنے ہیں۔ اس طرح اُردو کے ایسے الفاظ جو اُردو اور ہندی میں مشترک ہیں تقریباً بہتر فی صد یعنی اُردو کے سرمائے کا تین چوتھائی حصہ ہوئے۔ دو زبانوں میں لسانی اشتراک کی یہ غیر معمولی مثال ہے۔ اگرچہ یہ بھی صحیح ہے کہ اُردو کی اُردوئیت انہیں ایک چوتھائی الفاظ سے قائم ہوتی ہے جو عربی فارسی اور ترکی کے سرچشمے سے آئے ہیں۔ اسی طرح اُردو کی مخصوص چستی اور کھنک بھی سامی اور ایرانی ماخذ سے آئی ہوئی آوازوں سے پیدا ہوتی ہے، نیز لب ولہجہ اور تذکیر و تانیث کے جزوی اختلافات بھی ہیں۔ پھر بھی کسی دو زبانوں میں تین چوتھائی الفاظ کا مشترک ہونا، فعلیہ ڈھانچہ کا ایک ہونا، بنیادی لفظیات یعنی اعداد، ضمائر اور حروفِ جارہ کا ایک ہونا اور عوامی محاوروں اور کہاوتوں کا ایک ہونا لسانی اشتراک کی عجیب و غریب مثال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی کوئی دوسری زبان ہندی سے اتنی قریب نہیں جتنی اُردو ہے اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندی کی سب سے بڑی طاقت اُردو ہے۔

بقیہ:- کارِ جہاں دراز ہے

ان کو اپنے ساتھ کلکٹر کے بنگلے پر لے گیا صاحب نے چائے پانی سے خاطر کی۔ ملازمت کے لئے کہا۔ میاں اصغر علی بولے ابا سے پوچھ کر بتائیں گے۔ کلکٹر نے چوکڑی تیار کروائی (کلکٹر ضلع گورنر کی طرح چوکڑی پر نکلتا تھا) صاحبزادے کو پہلو میں بٹھالا اور لانگڑی والان روانہ ہوا۔

ادھر بسم اللہ کے گنبد میں بیلے لڑکے کی تلاش شروع ہوئی کسی نے اطلاع دی پیشکار صاحب کے ساتھ بازار گئے ہیں۔ کسی نے کہا ابھی ہم نے سول لین کی طرف جاتے دیکھا۔ طے پایا کہ کسی دشمن نے لڑکے کو اغوا کر لیا۔ سارے رشتے دار تلواریں سونت محلّے سے باہر نکلے۔

کلکٹر کی چوکڑی تامنی کی املی کے نزدیک پہنچی تو اُدھر سے لانگڑی والے تلواریں سونتے چلے آرہے تھے۔

کلکٹر نے گاڑی رکوائی میاں اصغر علی کا ہاتھ پکڑ کر لانگڑی والوں کے ہجوم کی طرف پیدل روانہ ہوا اُن سے بات چیت کی۔ ہمراہ اُن کے محلّے میں آیا۔ چوک میں جہاں تخت بچھے ہیں ایک تخت پر بیٹھ گیا۔ مدعا بیان کیا۔ فر فر اُردو بولتا تھا۔

میر منوّر علی نے کہا "ہم نیچے سے نوکری نا کروانے کے سینکڑوں برس گزر گئے۔ آج تک ہمارے ہاں کسی نے نوکری نہ کی۔ غضب خدا کا کیا ہمارے پاس کھانے کو نا ہے۔ اب بھی اللہ نے بہت کچھ دے رکھا ہے۔"

کلکٹر نے لڑکے کے ماموں ڈپٹی قائم علی کی مثال پیش کی۔ بہت بحث بحثی کے بعد یہ شرط پیش کی گئی اگر بچہ مرادآباد سے باہر نہ بھیجا جائے تو خیر آپ کی خوشی پوری کردیں گے۔ قصہ کوتاہ میر اصغر علی[1] بھی نائب تحصیلدار مقرر ہوئے۔

غدر کے بعد مرادآباد کی دُنیا بھی بدل گئی۔ لانگڑی والے جو محلّے سے باہر نکلنا شانِ وضعداری کے خلاف سمجھتے تھے جانے کہاں کہاں جا پہنچے۔

آئیے ان کے ساتھ ذرا ہفت کشورِ پنجاب کی سیر کر آویں۔

(مسلسل)

---

[1] خان بہادر سید اصغر علی نقوی ۱۹۲۰ء میں کلکٹر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ ۱۹۳۰ء میں انتقال ہوا۔ ان کے ایک بیٹے سید غضنفر علی نقوی (انڈین پولیس) کی شادی اُردو کے صاحبِ طرز ادیب چودھری محمد علی ردولوی کی بیٹی سے اور ایک لڑکی کی شادی سید کلب عباس اور مانی جائسی کے چھوٹے بھائی سید کلب مصطفٰے (مصنف "ملک محمد جائسی") سے ہوئی۔ پروفیسر سید تہور علی نقوی مرحوم جنہوں نے راقم الحروف کو بہت سی معلومات فراہم کیں۔ ڈپٹی اصغر علی کے بیٹے تھے۔

جگن ناتھ آزاد
پریس انفارمیشن بیورو، ریزیڈنسی روڈ، سرینگر

کتاب

اے کتاب! اے جلوۂ شرحِ وبیانِ جزو وکل — اے خموشی کی زباں پر داستانِ جزو وکل
اے کہ تجھ سے عقل پاتی ہے نشانِ جزو وکل — تیری سطروں میں ہے خوابیدہ جہانِ جزو وکل

سرِ مرگ و زندگی پنہاں ترے سینے میں ہے
جوہرِ ادراک تیرے دل کے آئینے میں ہے

ہر زمانے میں امینِ سوز و سازِ زندگی — ہر زمانے میں امانت دارِ رازِ زندگی
تجھ میں ہے محفوظ اے نازِ نیازِ زندگی — جو دلِ پیغمبراں میں تھا گدازِ زندگی

تیرا رتبہ کیا کہوں منزل کی ہے پہچان تو
وید تو، توریت تو، انجیل تو، قرآن تو

عزمِ راسخ تو کولمبس کا، زلیخا کا جمال — تو ارسطو کا تفکر، دکرمادت کا جلال
تیاگ تو گوتم کا، اکبر کے تدبر کا کمال — ہومر و ٹیگور و فردوسی کی معراجِ خیال

تو ہے گاندھی کی اہنسا، تو خودی اقبال کی
تو ہے اک تفسیر کردارِ جواہر لال کی

تو اشارہ بھی ہے اک پہیلی ہوئی روداد بھی — فلسفے میں قید بھی افکار سے آزاد بھی
تو عجب تخلیق ہے، دلشاد بھی ناشاد بھی — ارتقاء کی آخری منزل بھی ہے بنیاد بھی

تو ہے موجِ تند بھی کشتی بھی ہے ساحل بھی ہے
ذہن کی آسودگی بھی ہے، دھڑکتا دل بھی ہے

روح تیری ہے ازل کی بھی، ابد کی بھی رفیق — اے چراغِ رہنمائے شوق، اے دستِ شفیق
فاش ہے تیری نظر پر جو بھی ہے رازِ عمیق: — آشنائے عصرِ حاضر، واقفِ عہدِ عتیق

روشنی کا تو منارہ بحرِ طوفانی میں ہے
نور بن کر تو درخشاں عقلِ انسانی میں ہے

اک طرف تو میر و تلسی داس کا درد و گداز — ایک جانب فکرِ رازی و منو کا سوز و ساز
اپنے دل میں تو سنبھالے ہے کہیں گیتا کا راز — اور کہیں ہے تو نیازِ غزنوی، نازِ ایاز

تیری وسعت کا ٹھکانہ ہے نہ گہرائی کا ہے
فکر کو دعویٰ کہاں تجھ سے شناسائی کا ہے

محمد حسنین
صدر شعبۂ اُردو مگدھ یونی ورسٹی، گیا

اُردو تحقیقات کی رفتار اور سمت

اُردو زبان میں تحقیقی ادب کی عمر زیادہ نہیں۔ تاریخی لحاظ سے یہ تنقیدی ادب سے بھی کم سن ہے مگر جس انداز و شمار سے ہمارے یہاں تحقیقی کام انجام پا رہے ہیں، یہ توقع سے زیادہ ہیں۔ بالخصوص اس صدی کی دوسری اور تیسری دہائی کا جائزہ لیجئے تو حیرت ہوتی ہے کہ اُن دِنوں اَدبی تحقیقات کا شمار معدودے چند تھا، جبکہ اس دور میں یہ تعداد ہر سال درجنوں سے تجاوز کر جاتی ہے۔ میرا مقصد جذبۂ تحقیق کے اس بڑھتے ہوئے ذوق و شوق کے اسباب پر اظہارِ خیال نہیں بلکہ پچھلی دہائیوں میں جو تحقیقات ہوئی ہیں، ان کی رفتار و نہج کی شناخت ہے۔

ادبی تحقیقات کی دو قسمیں ہیں یا تحقیق اور تمیزی FACTUAL اور EVALUATIVE تحقیق۔ اوّل الذکر میں محقق کا کارنامہ نئے مواد کی دریافت ہے اور ثانی الذکر میں مروجہ حقائق کی تفہیم یا حقائق کے کسی نہفتہ پہلو کی بازدید ہے۔ ایک سے نئے ماخذ اور سالم مواد دستیاب ہوتے ہیں اور دوسرے سے عقائد و نظریات کے نئے اقدار کی نشاندہی ہوتی ہے۔ دونوں عمل تلاش و جستجو کے ایسے مفید و دور رس نتائج ہیں جن سے معلومات کے ذخیرے میں گوناگوں اضافہ ہوتا ہے اور علم کی روشنی پھیلتی ہے مگر تمیزی EVALUATIVE تحقیق میں محقق کے لئے غیر معمولی ذہانت، اعلیٰ نکتہ سنجی اور تفکر کا مادہ بھی لازمی ہے۔ بہرحال نئے زاویۂ نظر کی نشاندہی ہو یا نئے مواد کی دستیابی، محقق میں جب تک ذوقِ تجسس اور طلبِ صادق کا جذبہ نہ ہو، ثمر ہائے تحقیق کی دستیابی ممکن نہیں۔

ہمارے یہاں جس نوع کی تحقیقات منظرِ عام پر آ رہی ہیں ان کی اپنی مخصوص نوعیت ہے۔ ان تمام تحقیقی مقالوں کو جو تحقیقی اور تمیزی EVALUATIVE دونوں ہیں، میں نے چھ مختلف گروپ میں تقسیم کیا ہے۔ یہ تقسیم نفسِ تحقیق یا موضوعِ تحقیق کے تحت کی گئی ہے اور اس کے بموجب اِن تحقیقی مقالوں کو میں مندرجہ ذیل گروپ میں شامل کرتا ہوں:-

(۱) لسانیاتی مقالے (۲) علاقائی مقالے (۳) شخصیتی مقالے

(۴) تصنیفی مقالے (۵) صنفی مقالے (۶) نظریاتی مقالے

طوالت سے بچنے کے لئے میں ہر گروپ کے تحت محض ان عنوانات کی فہرست پیش کر دینا چاہتا ہوں۔ جن پر کام ہوئے ہیں اور جو نفسِ تحقیق کے بموجب اس خاص گروپ میں شامل ہیں ـــ یہ فہرست، مگر میں پہلے واضح کر دوں، مکمل ہے نہ مستحق۔ عنوانات کی اس ترتیب بندی سے آپ کو یہ شبہ نہ ہو کہ یہ تمام مقالے میری نظر سے گزر چکے ہیں۔ یا اُن کی اطلاع مجھے اُن یونی ورسٹیوں سے ملی ہے جہاں یہ کام انجام پائے ہیں یا براہِ راست مقالہ نگاروں سے حاصل ہوئی ہے۔ بدقسمتی سے ہماری زبان میں کوئی ایسا ادارہ ہے جو اس نوع کے کاموں کی روداد شائع کرتا ہو اور نہ ہماری اس انجمن کا کوئی ایسا شعبہ ہے جو اِن کاموں میں معاون ہو۔ اس فہرست کی ترتیب میں جن ذرائع سے میں نے مدد لی ہے وہ تبصرے، اشتہارات اور غیر مصدقہ خبریں ہیں۔ ظاہر ہے یہ ذرائع معتبر نہیں۔ یہ فہرست بھی اسی لئے حشو و زائد سے مبرا نہیں اور اُسے مستند سمجھنا مناسب نہیں۔

اس فہرست میں دو طرح کی تحقیقات داخل ہیں۔ اوّلاً وہ مقالے جو یونی ورسٹی کی نگرانی میں انجام پائے ہیں۔ دوئم وہ مقالے جن کے مصنف، اساتذہ نہیں اور جنہوں نے اپنے طور پر آزادانہ کام کئے ہیں۔

؎ یہ مقالہ انجمن اساتذہ اُردو جامعات ہند کی لکھنؤ کانفرنس میں پیش کیا گیا تھا۔ ۱۹۷۳ میں اورنگ آباد کانفرنس میں یہ تجویز منظور کی گئی کہ انجمن اساتذہ ان تحقیقی کاموں کی اطلاعات فراہم کرے جو ملک کی مختلف یونی ورسٹیوں میں ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ نیز مقالوں کی تفصیلات جلد از جلد انجمن کی طرف سے شائع کی جائیں تاکہ کام کرنے والوں کو سہولت ہو اور کاموں میں ہم آہنگی قائم کی جائے۔ (راقم)

۱۔ لسانیاتی مقالے :۔ یہ مقالے اُردو زبان سے وابستہ علمی و تاریخی امور سے متعلق ہیں۔ لسانیات اور صوتیات ہمارے ادب کے نئے علوم ہیں۔ اب تک انہیں ہم روایتی ڈھنگ سے پڑھاتے رہے ہیں، حالانکہ یہ مزاجاً سائنسی ہیں اور ان کا دائرۂ عمل تہذیب کے اہم صیغوں سے وابستہ ہے ــــ ان مقالوں کی تعداد گیارہ ہے۔ اور ان کے عنوانات مندرجہ ذیل ہیں :۔

تاریخ زبانِ اُردو۔ اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ۔ اُردو قواعد نویسی۔

PHONETICS AND PHONOLOGICAL STRUCTURE

اُردو زبان میں انگریزی الفاظ۔ اُردو اور ہندی عروض کا تقابلی مطالعہ۔ جدید ہندوستان میں اُردو کا ارتقا۔ اردو میں انگریزی کے "دخیل" الفاظ۔ اُردو شاعری میں تلمیحات، اُردو لغت نگاری، ہندوستان میں اُردو ادب۔

۲۔ علاقائی مقالے :۔ یہ مقالے ملک کے ان علمی و ثقافتی اداروں، علاقوں سے متعلق ہیں جن کا زبان و ادب کی نشو و نما اور ترویج و ترقی میں اہم حصہ رہا ہے۔ ان مقالوں کی تعداد چونتیس ہے اور ان میں چند معروف عنوانات مندرجہ ذیل ہیں :۔

لکھنؤ کا دبستان شاعری۔ دہلی کا دبستان شاعری، دلی سے پہلے اُردو شاعری کی دکن میں نشو و نما۔ دکنی اُردو کا توضیحی مطالعہ، شمالی ہندوستان میں شعر و شاعری کا لسانیاتی جائزہ، میسور میں اُردو۔ اُردو پنجابی کا لسانی رشتہ، اُردو زبان کے تحت میواتی بولیوں کا اجمالی مطالعہ، اودھ میں اُردو ادب کا تہذیبی و سماجی پس منظر، قدیم دہلی کالج کا اُردو زبان و ادب میں حصہ، دہلی میں داستان گوئی۔ دہلی میں اُردو نثر کی نشو و نما، لکھنؤ اسکول کی مثنویاں، انیسویں صدی میں لکھنؤ میں طنز و مزاح کا ارتقا، الہ آباد میں اُردو شاعری کا ارتقا، فورٹ ولیم کالج میں داستانوں کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ۔ کشمیر میں اُردو صحافت نگاری، جموں و کشمیر کے افسانہ نگار، بہار میں اُردو زبان و ادب کا ارتقا، بہار میں اُردو ناول نگاری، بہار میں اُردو شاعری کا ارتقا، (۱۸۵۸ تا ۱۹۱۴)، بہار میں اُردو نثر کا ارتقا (۱۸۵۸ تا ۱۹۱۴) اُردو مثنوی شمالی ہندوستان میں، اُردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ، سخن ورانِ گجرات، بمبئی میں اُردو، بیجاپور کی اُردو مثنویاں، اُردو در تامل ناڈ، لکھنؤ میں مرثیہ نگاری میر انیس تک، بہار میں افسانہ نگاری کا ارتقا، بنگال کا اُردو ادب انیسویں صدی میں۔

۳۔ شخصیتی مقالے :۔ یہ مقالے مشہور و معروف شعراء اور ادبا کی حیات اور ان کی ادبی خدمات سے متعلق ہیں۔ ان مقالوں کی تعداد ۳۴ ہے۔ جن معروف و مشہور شخصیتوں پر کام ہو چکا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں :۔

اثر، جعفر علی خاں، آتش، آرزو لکھنوی، آزاد، محمد حسین آزاد، ابو الکلام، اسماعیل میرٹھی، افسوس، اکبر، اقبال، انیس، امیر مینائی، بیدی، پریم چند، تسلیم، چکبست، حالی، میر حسن، حسرت عظیم آبادی، حسرت موہانی، حشر کاشمیری، جوش ملیح آبادی، جوش عظیم آبادی، جگر مراد آبادی، جگر بریلوی، جرأت، داغ، درد، ذوق، راسخ عظیم آبادی، راشد الخیری، رسوا، رشک، رشید احمد، ریاض خیر آبادی، سرور جہاں آبادی، سرشار، سرسید احمد، سرور، رجب علی بیگ، سید احمد دہلوی، سلیمان ندوی، سیماب اکبر آبادی، شاد عظیم آبادی، شبلی، شرر، شوق قدوائی، شیفتہ، صہبائی، صفیر بلگرامی، صوفی منیری، ظفر بہادر شاہ، عبد الحق، عشق دہلوی، شمیم عظیم آبادی، عصمت چغتائی، غالب، فانی، فدوی دہلوی، قاضی عبد الغفار، قائم چاندپوری، کرشن چندر، کنہیا لال کپور، کیفی دتاتریہ، گارساں دتاسی، گلکرسٹ، ماسٹر رام چندر، منٹو، منیر شکوہ آبادی، مصحفی، مومن، نیاز، نذیر احمد، نظیر اکبرآبادی، نصیر الدین ہاشمی، واجد علی شاہ، وحید الدین سلیم، یگانہ چنگیزی۔

۴۔ تصنیفی مقالے :۔ یہ مقالے مطبوعہ یا غیر مطبوعہ شعری یا نثری تصنیفات کی تدوین و ترتیب یا ان تصنیفات کی ادبی و تہذیبی قدر و قیمت سے متعلق ہیں۔ ان مقالوں کی تعداد پندرہ ہے۔ ان میں مندرجہ ذیل تصنیفات پر کام ہو چکا ہے :۔

اندر سبھا، تاج الحقائق، تذکرۂ بہارِ بے خزاں، تذکرۂ طبقات الشعراء، تذکرۂ گلشنِ ہند، تذکرۂ آزردہ، تذکرۂ نکات الشعرا، خطوطِ غالب، خوش معرکۂ زیبا، داستانِ امیر حمزہ، دیوانِ خواجہ میر اثر، دیوانِ جرأت، دیوانِ یقین، طلسمِ ہوش ربا

زیبا، قطب مشتری، قرآن پاک کا اُردو ترجمہ، کتاب نورس، کربل کتھا، کلام ممنون، کلیاتِ ولی، کلیات سودا، کلیاتِ غالب، گلِ رعنا، گوہرِ جوہری، معراج العاشقین، نوطرزِ مرصع۔

۵۔ صنفی مقالے: یہ مقالے ان شعری اور نثری اسالیب سے متعلق ہیں جو بساطِ ادب پر اپنا منفرد صنفی مقام رکھتے ہیں اور جن کی تاریخی حیثیت مسلم ہے۔ ان مقالوں کی تعداد اکاون ہے۔ جن اصناف پر کام ہوا ہے مندرجہ ذیل ہیں۔

غزل، مرثیہ، قصیدہ، مثنوی، واسوخت، رباعی، شہر آشوب، نظم، نظمِ آزاد، گیت۔ نثری حصے میں اسی طرح افسانہ، ناول، داستان، ڈراما، سوانح، ادبِ لطیف، انشائیہ، تمثیلیہ، میلاد نامہ۔

ان اصناف کی تاریخ اور ترویج و ترقی کا نہ صرف محققانہ جائزہ لیا گیا ہے۔ بلکہ ان ادبی سانچوں کی تعمیری اور صنفی خصوصیات کا محاکمہ بھی کیا گیا ہے۔

۶۔ نظریاتی مقالے: یہ مقالے ادبی، ثقافتی اور سیاسی رجحانات اور تحریکات سے متعلق ہیں۔ ان مقالوں کی تعداد بیس ہے اور ان کے عنوان مندرجہ ذیل ہیں۔

اُردو شاعری میں قنوطیت، اُردو ناول میں عورت کا تصور، اُردو کے صوفی شعرا کا تنقیدی مطالعہ ۱۸۵۷ء تک۔ اُردو نثر پر مغربی طنز و مزاح کے اثرات ۱۸۵۷ تا ۱۹۱۴۔ اُردو ناول میں نسوانی کردار (ابتدا تا پریم چند) اُردو شاعری میں قومیت کا تصور، وہابی تحریک کا اُردو پر اثر، اُردو ادب پر سماجی اور اقتصادی حالات کا اثر دو عالمی جنگوں کے درمیانی دور میں جنگ آزادی میں اُردو شاعری کا حصہ۔ آزادی کی جد و جہد میں اُردو کا حصہ۔ اُردو افسانہ میں عوام کی زندگی۔ اُردو شاعری کا مطالعہ بیسویں صدی کی نظریات کی روشنی میں اُردو شاعری میں رُومانی عناصر۔ اُردو شاعری میں قومی یک جہتی، ترقی پسند تنقید، اُردو ادب اور مشترکہ کلچر، اُردو شعرا کا تنقیدی شعور، اُردو کی اخلاقی شاعری۔ اُردو شاعری میں قومی یک جہتی کی روایات از آغاز تا ۱۹۴۷ء

تحقیقی کاموں کی اس فہرست کی روشنی میں جو موضوعات زیادہ مقبول نظر آتے ہیں یہ بالترتیب تین ہیں۔

(الف) شعرا و نثار۔ عنوانات کی تعداد سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ فہرست کتنی طویل ہے۔ نیز اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ تقریباً ان تمام بزرگ و برگزیدہ ہستیوں پر کام ہوا ہے جن کے فکر و فن کے چراغ سے ہمارا ادب روشن ہے۔ پر یہ سمجھنا صحیح نہ ہوگا کہ ہر صنف کے قلم کار دائرہ تحقیق میں داخل ہو چکے ہیں۔ بلکہ اب بھی ایسی متعدد چھوٹی بڑی ہستیاں موجود ہیں جن کی حیات و ادبی خدمات کو منظرِ عام پر لانے کی ضرورت ہے ــــ بہر حال اس فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ آزاد، ابوالکلام آزاد، اکبر، انیس، اقبال، انشاء، امانت، پریم چند، رسوا، غالب، سودا، قائم، مہدی افادی، میر تقی، واجد علی شاہ، جیسی اہم شخصیات پر مواد کا اچھا ذخیرہ فراہم ہو گیا ہے۔

نئے محقق کے لئے دورِ قدیم و متوسط کی ذی حیثیت شخصیتوں کو ہاتھ لگانا آسان نہیں۔ اسی لئے یہ افراد نئے اور انجانے ناموں کی طرف جلد متوجہ ہوتے ہیں۔ ان کی کوششوں سے کئی ایسے اہلِ قلم منظرِ عام آگئے ہیں جو امتدادِ زمانہ کا شکار رہتے ــــ ان شخصیتی مقالوں کی تکمیل میں مگر محقق کا طریقہ کار سوانح نگار کا ہوتا ہے جو عموماً میکانکی انداز سے انجام پاتا ہے مثلاً حالاتِ زندگی اور عصری نقوش تو اُجاگر ہو جاتے ہیں اور غیر مطبوعہ کلام یا نگارشات کا انتخاب درج کر دیا جاتا ہے مگر شاعر یا ناثر کے فکر و فن کے خط و خال نمایاں نہیں ہوتے۔

(ب) اصنافِ ادب ــ تحقیقی ادب میں جتنے کام ہوئے ہیں ان میں صنفی مقالوں کا دوسرا نمبر ہے۔ مغرب کی روشنی سے ہم ہر تحریر کی ادبی اور غیر ادبی ساخت اور ان کی قدر و قیمت کے تصور کا اندازہ ہوا۔ اُردو تنقید جس روایتی ڈگر پر چل رہی تھی اس میں تبدیلی آئی ــ ۔۔۔۔۔۔ ١۔ یہ مقالے محض تحقیقی نہیں بلکہ ان میں مقالہ نگار کا شعورِ نقد بھی ضو فشاں ہے۔

(ج) مراکزِ علم و ادب ــ یہ تیسرا اہم موضوع ہے۔ ان مقالوں کی تعداد چونتیس ہے۔ ان مقالوں کے ذریعہ ملک کے وہ منتشر علاقے سامنے آگئے جن کا اُردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں اہم حصہ رہا ہے۔

شاعر و ناثر، اصنافِ ادب اور مراکزِ ادب پر الغرض جو کچھ بھی کام ہوا ہے، بحیثیت مجموعی یہ قابلِ قدر ہے۔ یہ مقالے تاریخ ادب اُردو کی تدوین میں نہایت مفید ثابت ہوں گے ـــــ اس اعتراف کے باوجود یہ اظہار بھی ضروری ہے کہ کسی مخصوص شخصیت یا صنف یا ادبی مرکز پر کام کرنے کے لیے استواری اور وفاداری کے ساتھ وسعت نظری بھی شرط ہے۔

تحقیقی ادب میں کاموں کی اس تقسیم بندی اور مقالوں کے اعداد و شمار کی روشنی میں ہم چند دلچسپ نتائج سے دوچار ہوتے ہیں۔ میں ان کا بھی جائزہ لینا چاہتا ہوں۔

(الف) شخصیتی مقالوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے اور لسانیاتی مقالے سب سے کم ہے یعنی ایک سو بتیس اور گیارہ۔ یہ تعداد اور تفاوت اس بات کا ثبوت ہے کہ ہمارے ہاں واقعاتی ریسرچ کا رجحان بہت تیز ہے

(ب) نظریاتی اور تصنیفی مقالوں کی تعداد بیس اور اٹھائیس ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہمارے محقق عالمانہ اور فکری امور کی طرف راغب نہیں اور یہ لذتِ محنت و مشقت سے ناآشنا ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ ان کا جذبہ تحقیق ہنگامی ہوتا ہے۔ اور یہ عجلت پسندی میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ یہ ذہنیت اور طریقۂ کار اچھی علامت نہیں۔

(ج) ہمارے یہاں شخصیت پرستی کا میلان نمایاں ہے شخصیاتی اور صنفی مقالوں کی کثرت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہمارے محقق اس راہ پر تیز رو ہیں ـــــ تحقیقی ادب کی توانائی اور برنائی "جہانیاں جہاں گشت محقق" کے قدم سے قائم نہیں رہتی۔ اس ادب کو اس پیر جواں محقق کے قلم اور دم کی ضرورت ہے۔ جس نے اپنی عمر اس دشت کی سیاحی میں گزاری ہو ـــــ یہ تخصیص SPECIALIZATION کا دور ہے۔ زندگی کے ہر صیغے میں ہر باشعور اہلِ کار اسی طریقۂ فکر و عمل کا پیرو ہے۔ مگر ہمارے محقق میں تخصیص کا جذبہ مفقود نظر آتا ہے۔

(د) سب سے زیادہ تحقیقی کام علی گڑھ یونی ورسٹی میں انجام پائے ہیں۔ یہ اسے زیب بھی دیتا ہے۔ اس کے بعد بالترتیب، دہلی، الہ آباد، لکھنؤ، کشمیر اور گورکھپور کا درجہ آتا ہے۔ ریاست بہار کی پٹنہ اور بہار یونی ورسٹی میں بھی کاموں کی تعداد اچھی ہے۔ یہاں شخصیتی اور صنفی مقالوں کی تعداد زیادہ ہے بمبئی اور کلکتہ کی یونی ورسٹی میں اُردو طلبا کی تعداد قلیل ہے۔ اس کے باوجود یہاں تحقیقی کاموں کا انجام پانا قابلِ ستائش ہے

(ہ) وہ تحقیقات جو یونی ورسٹی سے باہر انجام پائی ہیں۔ ان کی تعداد خاصی ہے۔ ان میں کچھ ایسے شاندار کام بھی ہیں جنہیں سنگِ میل کہا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ہندوستانی اخبار نویسی، گل کرسٹ اور اس کا عہد۔ از محمد عتیق صدیقی۔ "دو ادبی اسکول" از علی جواد زیدی

ہمارے تحقیقی ادب کی عمر زیادہ نہیں مثالی محقق کی تعداد بھی محض دو چار ہے، مگر اس کے باوجود جن افراد نے ادبی تحقیقات میں منصبی مقام حاصل کر لیا ہے۔ اُن کی تعداد حوصلہ شکن نہیں۔ مثال کے طور پر لسانیات میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں، اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، قدیم شمالی ادب میں ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، دکنی ادب میں ڈاکٹر آمنہ خاتون، غزلیات میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور پروفیسر مجنوں گورکھپوری، مراثی میں سید مسعود حسن رضوی اور ڈاکٹر مسیح الزماں، مثنویات میں ڈاکٹر گیان چند جین، ڈرامائی ادب میں ڈاکٹر عبدالعلیم نامی، صحافتی ادب میں محمد عتیق صدیقی، غالبیات میں قاضی عبدالودود، امتیاز علی خاں عرشی، مالک رام اور ڈاکٹر مختارالدین آرزو جیسے نام بے ساختہ زبان پر آجاتے ہیں۔

ترقی اردو بورڈ کی کتابیں

شائع شدہ

۱۔ تاریخ فلسفہ سیاسیات۔ پروفیسر محمد مجیب
۲۔ تاریخ تمدن ہند۔ پروفیسر محمد مجیب
۳۔ تاریخ فلسفہ اسلام۔ مترجم۔ ڈاکٹر عابد حسین
۴۔ لسانی مطالعے۔ ڈاکٹر گیان چند
۵۔ ہمارا قدیم سماج۔ سید سخی حسن نقوی
۶۔ انقلاب ۱۸۵۷ء۔ مرتب پی۔ سی۔ جوشی
۷۔ ہندوستان میں آزادی کا دیپ۔ زمین تارا چند (؟)

اسکولوں کے لئے

۸۔ جیومیٹری حصہ اول۔ مترجم محمد یٰسین
۹۔ جیومیٹری حصہ دوم۔ مترجم تسنیم احمد
۱۰۔ حساب و الجبرا حصہ اول۔ مترجم یاور حسین

بچوں کے لئے

۱۱۔ جانور اور ان کے بچے۔ مترجم حفیظ الکبیر
۱۲۔ سب سے بابو۔ سلطانہ فیضی
۱۳۔ ہمارا جسم۔ محمد اکرام
۱۴۔ چراغ کا سفر۔ سید محمد ٹونکی
۱۵۔ چڑیاں۔ سلطانہ فیضی
۱۶۔ کچھوا اور خرگوش۔ ڈاکٹر ذاکر حسین

زیر طبع (بی۔ اے/ بی۔ ایس۔ سی/ بی۔ کام کے لئے)

۱۷۔ یورپ کے عظیم سیاسی مفکرین۔ مصنف ڈاکٹر ہاشم قدوائی
۱۸۔ تاریخ تعلیم ہند۔ نور اللہ اور نائک
۱۹۔ ہندوستانی معیشت۔ الک گھوش
۲۰۔ ہندوستانی معاشرہ عہد وسطیٰ میں۔ کنور محمد اشرف
۲۱۔ قدیم ہندوستان کی تاریخ۔ ایس۔ این۔ ترپاٹھی
۲۲۔ جدید ہندوستان میں ذات پات۔ ایم۔ این۔ سری نواس
۲۳۔ شیر شاہ اور اس کا عہد۔ کے۔ آر۔ قانون گو
۲۴۔ حیدر علی۔ نرمند کرشنا سنہا
۲۵۔ طبیعیات کے بنیادی تصورات۔ آرتھر بائزر
۲۶۔ سکونیات عملی۔ ایس۔ ایل۔ لونی
۲۷۔ مخروطات جیومیٹری۔ کو۔ کھرپرساد اور ایچ۔ سی۔ گپتا
۲۸۔ شماریات اور کاروبار میں ان کا استعمال۔ باؤنگ ٹن

۲۹۔ تعلیم و تربیت۔ برٹرنڈ رسل
۳۰۔ افریقہ اور ایشیا۔ این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی
۳۱۔ شہیدان آزادی (جنگ آزادی میں حصہ لینے والوں کی تاریخ)
۳۲۔ سر سید احمد خاں۔ میر نجابت علی
۳۳۔ راجہ رام موہن رائے۔ سچیندر لال گھوش
۳۴۔ بہروپی گاندھی

لغت، دواوین، تذکرے

۳۵۔ فرہنگ آصفیہ۔ چار جلدیں
۳۶۔ کلیات قلی قطب شاہ
۳۷۔ کلیات میر
۳۸۔ کلیات سودا
۳۹۔ کلیات ذوق
۴۰۔ کلیات اکبر الہ آبادی۔ ۴۱۔ قواعد عبد الحق
۴۲۔ وضع اصطلاحات۔ ۴۳۔ آئینہ بلاغت
۴۴۔ دریائے لطافت۔ ۴۵۔ گلشن بے خار
۴۶۔ مجموعہ نغز۔ ۴۷۔ خم خانۂ جاوید

اسکولوں کے لئے

۴۸۔ حساب الجبرا۔ حصہ دوم۔ ساتویں جماعت کے لئے
۴۹۔ جیومیٹری حصہ سوم۔ آٹھویں جماعت کے لئے
۵۰۔ طبیعیات حصہ دوم۔ ساتویں جماعت کے لئے
۵۱۔ گھریلو سائنس۔ آٹھویں جماعت کے لئے
۵۲۔ گھریلو سائنس حصہ اول۔ چھٹی جماعت کے لئے
۵۳۔ گھریلو سائنس۔ ساتویں جماعت کے لئے
۵۴۔ طبیعیات۔ حصہ اول۔ چھٹی جماعت کے لئے
۵۵۔ طبیعیات حصہ دوم۔ ساتویں جماعت کے لئے
۵۶۔ طبیعیات حصہ سوم۔ آٹھویں جماعت کے لئے
۵۷۔ کیمیا۔ حصہ اول۔ چھٹی جماعت کے لئے
۵۸۔ ہندوستان عہد وسطیٰ میں۔ ساتویں جماعت کے لئے
۵۹۔ سماجی علم حصہ اول۔ چھٹی جماعت کے لئے
۶۰۔ سماجی علم حصہ دوم۔ ساتویں جماعت کے لئے
۶۱۔ سماجی علم حصہ سوم۔ آٹھویں جماعت کے لئے
۶۲۔ ہندوستان کا معاشی اور تجارتی جغرافیہ۔ ساتویں جماعت کے لئے۔

DAVP 511(60)/73 Urdu

سلام بن رزّاق
۲/۴۸ ۔بی قریش نگر، کرلا، بمبئی ۷۰ ۔ ایس

اس دن کی بات

نہیں ۔ آپ لوگ مجھ سے میرا نام مت پوچھئے۔ مجھے اپنا نام یاد نہیں شاید آپ یقین نہ کریں مگر میں سچ کہہ رہا ہوں۔ مجھے اپنا نام کبھی بھول گیا ہے۔ آپ اسے میری گستاخی پر محمول کریں یا مجھے مغرور و متکبر سمجھیں میں اپنا نام نہیں بتاؤں گا۔ نہیں میں اپنا دھرم یا مذہب بھی نہیں بتاؤں گا۔ بتا ہی نہیں سکتا۔

نہ میں کبھی مسجد میں گیا ہوں۔ نہ میں نے کسی مندر کو دیکھا ہے۔ میرے لئے مندر، مسجد، کعبہ، کیلاش سب کنکر پتھر سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔ میں نے اللہ، ایشور، رام اور رحیم کے نام ضرور سنے ہیں مگر میرے اندران ناموں سے کبھی کوئی جوت نہیں جگی جس سے میرے وجود کے گرد پھیلا ہوا اندھیرا کم ہوتا۔ میں مادر زاد اندھا ہوں۔ میرے لئے یہ سنسار صرف آوازوں کا جنگل ہے۔ میرا وجود بھی اس جنگل میں ایک بھٹکی ہوئی آواز ہے اور بس۔ میں فلسفی نہیں ہوں مگر چونکہ میں اندھا ہوں اس لئے اپنے سے باہر کی چیزوں کو نہ میں دیکھ سکتا ہوں نہ ہی اُن کا صحیح تصور رکھتا ہوں میں ہمیشہ اپنے ہی بھیتر جھانکتا رہتا ہوں یہی وجہ ہے کہ میں اپنے آپ کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ اس خانقاہ میں اکثر بڑے بڑے سادھو فقیر آکر ٹھہرتے ہیں چند گھنٹے سستا کر یا دو چار روز ٹھہر کر پھر آگے کی راہ لیتے ہیں۔ میں سادھوؤں فقیروں کی باتیں سُن سُن کر میں اس سنسار کو جاننے سمجھنے لگا ہوں۔ ان لوگوں کی ساری باتیں تو میری سمجھ میں نہیں آتیں مگر پھر بھی جو کچھ میں سمجھ سکتا ہوں۔ اُسے سمجھنے کی میں نے کوشش کی ہے۔ وہ لوگ اکثر دھرم، آتما، پرماتما، زندگی اور موت جیسے بڑے بڑے مسئلوں پر گفتگو کرتے ہیں۔ اُن کی گفتگو نے ہی میری رُوح کو تھوڑی بہت روشنی سے آشنا کرایا ہے۔ ان سادھو فقیروں میں سبھی علم و عرفان کی باتیں کرنے والے نہیں ہوتے بلکہ اکثر جاہلوں اور معمولی لوگوں جیسی ہی باتیں کرتے ہیں۔ بلکہ میں نے محسوس کیا ہے کہ ان میں بہت سے چور، ڈاکوؤں اور بدمعاشوں سے بھی بدتر ہوتے ہیں۔

میں کسی کو دیکھ تو نہیں سکتا مگر میرے کان اب اتنے آواز شناس ہو گئے ہیں کہ میں صرف آواز سُن کر آدمی کی فطرت کا اندازہ لگا سکتا ہوں۔ باتیں سُن کر اُس کی آتما میں جھانک سکتا ہوں۔ سچ پوچھئے تو میرے کان ہی اب میری آنکھیں بن گئے ہیں جو کام آپ آنکھوں سے لیتے ہیں۔ وہی کام میرے کان بخوبی انجام دے لیتے ہیں۔ بلکہ آپ کی آنکھیں دھوکا کھا سکتی ہیں مگر میرے کان دھوکا نہیں کھا سکتے۔ مجھے نہیں معلوم، سچ، جھوٹ، نیکی، بدی، پاپ، پُن کسے کہتے ہیں۔ میں ان چیزوں کے درمیان کوئی خطِ فاصل نہیں کھینچ سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ سچ اور جھوٹ، خیر اور شر، پاپ اور پُن یہاں سمندر کے کنارے ریت کی طرح بکھرے ہوئے ہیں۔ آپ نے اُن چار اندھوں کی کہانی سنی ہوگی جن کے سامنے ہاتھی لایا گیا تھا۔ اُن اندھوں میں سے ہر ایک نے ہاتھی کے جس عضو کو چھوا۔ اُسی کو پورا ہاتھی سمجھ بیٹھا۔ یہ سنسار بھی میری طرح اندھوں کا سنسار ہے جس کے ہاتھ جو چیز لگ جائے اسی کو سچائی سمجھ بیٹھتا ہے۔ سچائی کیا ہے شاید کسی کو نہیں معلوم ۔

مجھے گیتا، وید، قرآن، بائبل اور گرنتھ صاحب کی بہت سی آیتیں اور شلوک یاد ہیں ان کتابوں میں بھی کہیں سچائی کی صحیح تفسیر نہیں ملتی البتہ یہ سب سچائی کو پانے کا راستہ ضرور بتاتی ہیں دُنیا کے سارے دھرم اور مذہب سچائی نہیں ہیں صرف سچائی کی طرف جانے کے راستے ہیں۔ یہ راستے مختلف سمتوں سے ایک ہی منزل کی طرف جاتے ہیں۔ ان میں سے کوئی راستہ کسی دوسرے راستے کو قطع نہیں کرتا۔

مجھ سے نہ پوچھئے میں تو اندھا ہوں۔ مجھے تو کوئی سا بھی راستہ سجھائی نہیں دیتا۔ ان آنکھ والوں سے پوچھئے جو اپنا راستہ چلنے کی بجائے دوسروں کے راستے میں کانٹے بچھاتے پھرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو نہ خود امن سے رہتے ہیں۔ نہ دوسروں کو رہنے دیتے ہیں۔ اگر آپ آنکھ والے ہیں تو ایسے شر پسندوں کو پہچاننے میں آپ کو ذری بھی دقت نہیں ہوگی۔

آپ نے پھر میرا نام پوچھا۔ میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ میں اپنا نام نہیں بتاؤں گا۔ چاہے آپ مجھے قتل کر دیں۔ میرے ٹکڑے اُڑا دیں۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ جس کے لئے زندگی میں کوئی کشش نہ ہو، کوئی مقصد نہ ہو، جس کے لئے جینا صرف ایک مجبوری ہو، وہ موت سے کیوں خوف کھائے۔ میری زندگی اب اس مقام پہ آکر ٹھہر گئی ہے جہاں سے موت کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ میری باتیں شاید آپ کو عجیب لگ رہی ہوں گی۔ میں اندھا ہوں نا۔ جس طرح کوئی اندھا متواتر کسی ایک سمت میں نہیں چل سکتا اسی طرح اُس کی باتوں کی بھی کوئی سمت مقرر نہیں ہوتی۔ اس کی زندگی کی طرح اس کی باتیں بھی بے ربط ہوتی ہیں۔

آپ میرا نام پوچھ رہے تھے مگر میں اپنا نام نہیں بتانا چاہتا۔ وجہ؟ ہاں وجہ ضرور بتاؤں گا۔ میں اس خانقاہ میں تقریباً چالیس برس سے رہتا ہوں۔ اس خانقاہ میں آنے سے پہلے میں خوب گھوما پھرا ہوں۔ ہندوستان کے تقریباً سبھی تیرتھ گاہوں اور متبرک مقامات پر حاضری دے چکا ہوں۔ کنیا کماری کے مندروں سے لے کر ہمالیہ کی گپھاؤں تک کی خاک چھان چکا ہوں۔ پہلی اور دوسری بڑی جنگوں کی ہولناک خبریں مجھے آج بھی یاد ہیں! 'بھارت چھوڑو' اور 'ترک موالات' کی تحریکوں نے میرے سامنے جنم لیا۔ ملک کا بٹوارہ اور بٹوارے کے بعد کی افراتفری کا بھی مجھے خوب علم ہے۔ کتنی قیامتیں گزر گئیں۔ کتنی بار موت میرے قریب سے کترا کر نکل گئی۔ مگر میں زندہ رہا۔ زندگی کا پھندا میرے گلے میں پڑا رہا اور میں موت کی خلا میں جھولتا رہا۔ ہرچند کہ زندگی میرے لئے ایک پھندا تھی۔ مگر میں کسی طور زندگی سے جڑا ہوا تھا لیکن اُس دن کے بعد سے میں محسوس کر رہا ہوں کہ اب یہ پھندا کٹ جائے تو بہتر ہے۔ زندگی کی وہ ڈور جس سے میری سانسوں کے تار بندھے ہیں اب ٹوٹ جائے تو اچھا ہو۔

اُس دن کی بات ہے۔ اُس دن اس خانقاہ میں چند سادھو ٹھہرے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے اپنے ہاتھوں سے بھوجن بنایا۔ دو روٹیاں اور تھوڑی سی سبزی مجھے بھی پروسی۔ میں اُنہیں حلق سے اُتارنے کے بعد بیڑی سلگا کر اپنے بستر پر پڑ رہا۔ وہ سادھو جن بھی کھانا کھانے کے بعد بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ وہ سب بندھیاگری کی وادی سے آئے تھے اور ہری دوار جا رہے تھے۔ میں حسب عادت اپنے بستر پر پڑا اُن لوگوں کی باتیں سُن رہا تھا۔ وہ سب شہر میں ہونے والے کسی بلوے کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ اُن میں سے ایک بھکشا مانگنے آبادی میں گیا تھا اور ابھی تک نہیں لوٹا تھا، وہ سب اسی کے بارے میں متفکر تھے۔ اُن کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ شہر میں بھاری بلوہ ہو گیا ہے۔ اور بلوہ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ کچھ کچھ اندازہ تو مجھے بھی ہو گیا تھا کیونکہ چیخ پکار اور نعروں کی آوازیں میں بھی سُن رہا تھا۔ شاید رات کے دس بجے تھے۔ یہ بات بھی اُنہیں سادھوؤں کی باتوں سے معلوم ہوئی۔ ورنہ ہم اندھوں کے لئے تو رات اور دن دونوں برابر ہیں۔ اب میں بھی بستر سے اُٹھ کر بیٹھ گیا کیونکہ چیخ پکار اور نعروں کی آوازیں لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہی جا رہی تھیں۔ وہ سادھو اپنے ساتھی کے بارے میں بہت پریشان جان پڑتے تھے۔ اُن میں سے کچھ اُسی وقت وہاں سے چل دینا چاہتے تھے۔ مگر کچھ ٹھہر گئے ہوئے ساتھی کے آجانے تک رُکنے کے لئے کہہ رہے تھے۔ ابھی وہ لوگ اس مسئلے پر باتیں کر ہی رہے تھے کہ اتنے میں اُن میں سے کوئی چیخا: "ارے وہ دیکھو رام داس آ رہا ہے!"

اتنے میں اُن کا ساتھی رام داس بھیتر آیا اور ہانپتی آواز میں بولا "ہے بھگوان! میں تو ڈر رہا تھا کہ آپ لوگ چلے نہ گئے ہوں۔" لہجے سے وہ کافی گھبرایا سا لگ رہا تھا۔ اُنہوں نے اُس پر سوالات کی بوچھار کر دی۔ وہ اُسی طرح ہانپتا ہوا بولا: "اب جلدی سے یہاں سے نکل چلو شہر میں بُری طرح بلوہ ہو گیا ہے۔ یہ جگہ بھی محفوظ نہیں ہے۔"

"پر یہ ہوا کیسے؟"

"مجھے نہیں معلوم کہ کیسے ہوا۔ مگر یہاں آتے آتے میں نے تقریباً چھ دس لاشیں دیکھی ہیں۔ لوگ پاگلوں کی طرح چاقو بھالے لئے ایک دوسرے کو قتل کر رہے ہیں۔ پورا شہر آگ میں جل رہا ہے۔ میں چھوٹی چھوٹی گلیوں سے بچتا بچاتا آیا ہوں۔"

"مگر دنگا کرنے والے کون ہیں؟"

"بھئی کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کون لوگ ہیں مگر اندازہ یہی ہے کہ ہندو مسلم بلوہ ہے۔ بلوہ اچانک شروع ہو گیا اور اب پورا شہر اس کی لپیٹ میں ہے۔ میں جلدی جلدی سڑک سے گزر رہا تھا۔ سامنے ایک مسجد بُری طرح جل رہی تھی۔ میں وہاں سے ایک گلی میں مُڑ گیا۔ چند قدم بھی نہیں چلا تھا کہ کچھ لوگ لاٹھیاں لئے ہوئے "اللہ اکبر" کے نعرے لگاتے ہوئے میری طرف لپکے۔ میں وہاں سے سرپٹ بھاگا۔ بھکشا کا جھولا اور کمنڈل بھی وہیں چھوٹ گیا۔ میں جس گلی سے بھی گزرا وہاں دو ایک مکانات جلتے ہوئے نظر آتے" اتنے

یں ان میں سے ایک موٹی آواز والا سادھو گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ارے اب یہاں سے نکل چلو۔ باقی باتیں راستے میں پوچھ لینا۔ اس آشرم سے تھوڑے ہی فاصلے پر مسلمانوں کا محلّہ ہے۔ کہیں انہوں نے ادھر کا رخ کیا تو سب کا ہوم کر کے رکھ دیں گے۔" وہ لوگ جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹنے لگے۔ اُن میں سے ایک نے مجھ سے پوچھا "کیوں سورداس تم نہیں چلوگے؟"

"نہیں بابا! میں کہاں جاؤں گا۔ ویسے بھی مجھ اندھے بڈھے کو مار کر کسی کو کیا ملے گا۔"

"ایسا نہ کہیئے سورداس! یہ مسلمان بڑے قصائی ہوتے ہیں۔ وہ کسی کو نہیں چھوڑتے۔"

سادھو کی یہ بات سُن کر مجھے بُرا لگا۔ مگر میں چُپ رہا۔ بُرا اس لیے لگا کہ میں تقریباً چالیس برس سے اُسی مسلم محلّے سے بھکشا مانگ کر اپنا پیٹ بھر رہا ہوں۔ وہاں کا بچہ بچہ مجھے جانتا ہے اور سب مجھے بابا کہتے ہیں۔ میں نے سادھو کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ لوگ جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹ کر میرے لئے بھگوان سے پرارتھنا کرتے ہوئے آشرم سے باہر نکل گئے۔ کچھ دیر اُن کے پیروں کی دُور ہوتی ہوئی آہٹیں سنائی دیتی رہیں۔ پھر وہ آوازیں رات کے سناٹے میں کہیں ڈوب گئیں اور اب شہر میں ہونے والے بلوے کا شور مجھے اور صاف سُنائی دینے لگا۔

اُس شور میں "ہر ہر مہادیو" اور "اللہ اکبر" کے نعرے برچھیوں کی طرح میرے کانوں میں کھُب رہے تھے۔ میں نے کبھی کسی آدمی کو قتل ہوتے یا مرتے نہیں دیکھا۔ نہ میں... کسی گھر، مندر یا مسجد کے جلنے کا تصور کر سکتا ہوں۔ میں نے چھُری کی دھار کو چھُو کر دیکھا ہے مگر وہ چھُری کسی کا گلا کیسے کاٹ سکتی ہے، میں نہیں جانتا۔ میں نے آگ کی گرمی کو محسوس کیا ہے مگر وہ کسی کو جلا کر راکھ کا ڈھیر کیوں کر بنا دیتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم۔ ہم اندھے دیکھ نہیں سکتے۔ مگر ہمارا احساس ہی ہماری بینائی ہے۔ ہم اندھوں کا اپنا ایک تصور ہوتا ہے۔ ہم چیزوں کو چھُو کر یا آوازوں کو سُن کر اُن کی شکلیں ترتیب دے لیتے ہیں اس لیے پل پل بڑھتے شور سے بھی میرے ذہن میں کئی تصویریں اُبھریں، بھیانک، ڈراؤنی اور بدہیئت۔ اُن تصاویر کے خد و خال میرے ذہن میں ابھرے۔ ممکن ہے وہ آپ آنکھ والوں کے تصور سے مختلف ہوں۔ مجھے یوں محسوس ہوا میں سچ مچ آوازوں کے جنگل میں کھڑا ہوں۔ ہر آواز دوسری آواز کو قطع کر رہی تھی۔ ہر چیخ دوسری چیخ کے سینے سے اُبھرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور اُن سب پر بھاری وہ پُرہیبت نعرے تھے جو چاروں طرف سے بموں کے دھاکوں کی طرح برس رہے تھے۔ میں اُس اندھیری خانقاہ میں پورے وجود کے ساتھ اُن آوازوں کو سُن رہا تھا۔ اُس وقت میرے کان اس قدر حسّاس ہو گئے تھے کہ چیونٹی کے چلنے کی آواز بھی سُن سکتے تھے۔

مجھے خانقاہ کے باہر کچھ لوگ سرگوشیاں کرتے سُنائی دیئے۔ مگر میں اُن لوگوں کی باتیں صاف طور پر نہ سُن سکا۔ شہر سے آتے شور و غل کے سیلاب میں وہ سرگوشیاں تنکوں کی طرح بہہ گئیں۔ سرگوشیوں کے ختم ہونے کے فوراً بعد "ہر ہر مہادیو" کے فلک شگاف نعرے کی آواز سُنائی دی۔ جواب میں "اللہ اکبر" کا نعرہ گونجا اور پھر دیر تک مارو، پکڑو، جانے نہ پائے، قسم کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر دھیرے دھیرے یہ آوازیں بھی دُور سے آتے بے پناہ شور میں ڈوب گئیں۔ چند لمحے نہیں گزرے تھے کہ پھر قریب سے کچھ لوگوں کے دوڑنے کی آواز آئی۔ ساتھ ہی ایک نسوانی چیخ بھی اُبھری، "بچاؤ، بچاؤ، و، وُ نہیں، نہیں،" ـــ اس "نہیں نہیں" کے ساتھ ہی کچھ وحشیانہ قہقہے گونجے اور ان قہقہوں کے بوجھ تلے وہ نسوانی چیخیں دب کر رہ گئیں، کچھ دیر بعد پھر ایک آواز سنائی دی۔

"نہیں، نہیں مجھے ذبح مت کرو۔ میں تمہارے پاؤں پڑتا ہوں۔ ائے دیکھو مجھے ذبح ... ع ع ع"

اس آواز کے ختم ہوتے ہی پھر ایک فلک شگاف نعرہ لگا۔ اور پھر وہی وحشیانہ قہقہے۔ اس طرح پتہ نہیں کب تک، آوازوں کا جنگل اُگتا اور کٹتا رہا۔ صدیاں بیت گئیں۔ مجھے لگا میں پتھر بن گیا ہوں اور وقت پنڈولم کے ٹھوکوں کی طرح میری پیشانی سے ٹکرا ٹکرا کر گزر رہا ہے اور میری پیشانی لہو لہان ہو رہی ہے۔ میں دیکھ نہیں سکتا تھا۔ مگر میں سمجھتا ہوں پوری زمین لہو سے سرخ ہو گئی ہو گی، پھر مجھے نہیں معلوم کتنا وقت بیتا۔ میں اسی طرح بے حس و حرکت بیٹھا اپنے پورے جسم پر اُن دہشت انگیز آوازوں کے وار سہتا رہا۔ تبھی اچانک میں نے محسوس کیا کہ اس اندھیری خانقاہ میں میرے علاوہ بھی کوئی اور ہے۔ شاید کوئی شکار جو شکاری کی تلاش میں ہو۔ نہیں شکاری نہیں۔ کوئی شکار جو شکاریوں کے خوف سے یہاں آ چھپا ہو۔ تب ایک عرصے کے بعد میرے ہونٹ ہلے۔

میں نے دھیرے سے پکارا "کون ہے؟" کوئی جواب نہیں ملا۔

میں نے ٹٹول کر اپنے سرہانے سے ماچس کی ڈبیہ نکالی اور تیلی جلائی۔ پھر

بولا" دیکھو گھبراؤ نہیں۔ میں اس خانقاہ کا اندھا بابا ہوں۔ تم کون ہو میرے پاس آؤ۔"

مگر پھر بھی کوئی جواب نہیں ملا۔ خانقاہ کے اندھیرے میں صرف میری آواز گونج کر رہ گئی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے سسکیوں کی آواز سُنی۔ کوئی دھیرے دھیرے رو رہا تھا۔ میں نے آواز سے اندازہ لگایا کہ رونے والا نو دس برس کا لڑکا ہے۔ اور خوف کے مارے وہ کھُل کر رو بھی نہیں پا رہا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ شکاری کتّوں کے خوف سے یہاں آکر چھپا ہے۔ پتہ نہیں بے چارے کے والدین اور عزیزوں پر کیا بیتی۔ میں کچھ دیر تک اس کی سسکیاں سُنتا رہا۔ پھر دھیرے سے بولا۔

" دیکھو بیٹے یہاں میرے پاس آجاؤ، یہاں کوئی نہیں آئے گا۔"

مگر سسکیاں برابر گونجتی رہیں۔ میں پھر بولا" دیکھو میں اندھا ہوں۔ میں تمہیں دیکھ نہیں سکتا۔ تم خود میرے پاس آجاؤ۔ ڈرو نہیں۔ یہاں میرے سوا دوسرا کوئی نہیں۔"

سسکیاں دھیرے دھیرے تھم گئیں۔ پھر مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ لڑکا اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا ہے اور اب دھیرے دھیرے میری طرف بڑھ رہا ہے۔ میں نے اپنے لہجے کو اور بھی کومل بناتے ہوئے کہا۔

"آؤ بیٹا آؤ" ڈرو نہیں میں تو اس خانقاہ کا اندھا بابا ہوں۔ آؤ میرے پاس بیٹھو۔ یہاں کوئی تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔"

پیروں کی چاپ میرے بالکل قریب آکر رُک گئی۔ میں نے پھر پچکارتے ہوئے کہا۔

"آؤ، آؤ یہاں میرے بستر پر بیٹھ جاؤ" مگر پیروں کی چاپ اسی جگہ رُکی رہی۔ کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے بے چین ہوتے ہوئے کہا "بیٹھو بیٹا، کھڑے کیوں نہ ہو" تبھی ایک انتہائی خوف بھری تھرتھراتی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

" بابا آپ ہندو ہیں یا مُسلمان ؟"

میں بیان نہیں کرسکتا کہ اس سوال سے مجھ پر کیا بیتی ؟ وہ سوال نہیں پگھلا ہوا سیسہ تھا جو میرے کانوں میں اُتر گیا۔ ایک جلتا ہوا تیر تھا جو سیدھے میرے دل میں پیوست ہوگیا۔ میں گردن اٹھائے منہ کھولے بیٹھا رہ گیا۔ مجھے لگا کہ اس چھوٹے سے سوال کے شکنجے میں میری گردن بُری طرح جکڑ گئی ہے اور میری آواز اپنے ہی حلق میں گھٹ کر مرگئی ہے۔ میرے سارے حواس ختم ہوگئے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے جادو کے زور سے مجھے ہوا میں معلق کردیا ہو۔ نہ میرے ہاتھ آسمان کو چھو سکتے تھے، نہ پیر دھرتی پر لگ رہے تھے۔ آپ کو سوگند ہے اب آپ دوبارہ مجھ سے میرا نام نہ پوچھئے۔ میرا کوئی نام نہیں ہے۔ میرا کوئی دھرم بھی نہیں نہ میرا کوئی عقیدہ ہے نہ مسلک۔ اُس دن میں اس لڑکے کے سوال کا جواب نہ دے سکا۔ وہ سوال آج بھی کسی ہزار پا کی طرح میرے وجود کو جکڑے ہوئے ہے۔ مگر چھٹکارے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ میں اس سے چھٹکارا پائے بغیر آپ کے سوال کا جواب کیوں کر دے سکتا ہوں۔ ●●

امجد نجمی
ایڈیٹر "شاخسار" بخشی بازار، کٹک (اڑیسہ)

غزل

نہ تجھ میں اُجالا نہ مجھ میں اُجالا
کہ اندھے کنویں کا ہے پانی بھی کالا
خوشی اس میں آئے تو آئے کدھر سے
غموں کا پڑا ہے دِرِ دل پہ تالا
کسی مورتی کو بسانا پڑے گا
بہت دن سے خالی ہے دل کا شوالا
پھنسا جو بھی دُنیا میں، مر کر ہی نکلا
ہے مضبوط کتنا یہ مکڑی کا جالا
اِدھر بھی نگاہِ کرم میرے ساقی
ترا بول بالا، ترا بول بالا
غم و یاس میں بھی کوئی چاند ہوں کیا
بناؤ نہ دیکھو مرے گرد ہالہ !!
بناؤگے جب تک نہ کشتی انوکھی
تو آتا ہی جائے گا طوفاں نرالا
سڑک پر کوئی شب کو چلا رہا ہے
بچاؤ، بچاؤ۔ مجھے مار ڈالا
لگا دو کنارے سے نجمیؔ کی نیا
کہاں تک یہ بیمار لے گا سنبھالا



کرامت علی کرامت



منظر حسن



حفیظ اللہ نیولپوری



سید برکت اللہ برکت



امجد نجمی



سعید رحمانی



بہار الدین ریاض



شکیل منظر حسن



حیدر نایاب

اُڑیسہ میں اُردو



مسیح اللہ مسیح

اُردو زبان کی روایت :- اڑیسہ کی علاقائی زبان اُڑیہ ہے اور یہی اکثریت کی زبان ہے مسلمانوں کی آبادی صرف ڈیڑھ فی صدی ہے۔ یہ طبقہ اُردو بولتا، لکھتا اور پڑھتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دوسری ہندوستانی زبانوں کی طرح اُڑیہ پر بھی عربی، فارسی کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ ایک زمانہ میں اڑیسہ میں عربی آمیز فارسی کا چلن رہا ہے۔

اڑیسہ میں مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ تیرھویں صدی سے شروع ہوتا ہے۔ ۱۵۶۸ء میں اور اس کے بعد جتنے مسلمان ریاست میں آئے، وہ یہاں آکے مقیم ہو گئے۔ ان میں عوام، امرا اور ان کے متوسلین کے علاوہ فقرا اور صوفیاء تھے جو تبلیغ و ہدایت کے سلسلے میں آئے۔ قرائن سے ظاہر ہے کہ اہل قلم حضرات بھی ضرور آتے رہتے ہوں گے[1]۔ مرزا عبدالقادر بیدل کا جو عہد عالمگیر کے مشہور فارسی گو شاعر تھے، اُڑیسہ آنا "چہار عنصر" سے ثابت ہے[2]۔ ان سب لوگوں کی زبان عربی آمیز فارسی تھی جو اس وقت کے ہندوستانی مسلمانوں کی زبان تھی۔ اس کے بعد بھی مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا۔ مراٹھوں کے لشکر کے ساتھ دکن سے کافی تعداد میں مسلمان آئے اور یہیں بس گئے۔ اس وقت تک یہ لوگ دکنی اُردو بولنے لگے تھے۔ شمال سے خصوصاً بہار سے جو مسلمان آئے وہ بھی اُردو ہی بولتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کے مسلمانوں کے طبقہ نے اُردو زبان ہی کو اپنی مادری زبان سمجھا۔

۱۸۳۰ء میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے فارسی کی جگہ اُردو کو عدالتی زبان قرار دیا تو اس زبان کو اور بھی تقویت حاصل ہوئی۔ مختصر یہ کہ یہاں کے مسلمانوں کی مادری زبان اُردو ہی رہی۔ اگرچہ سرکاری زبان ۱۸۳۲ء میں انگریزی ہو گئی۔

اڑیسہ کا سب سے پہلا مطبوعہ کلام جو دستیاب ہوتا ہے وہ ایک گلدستہ[3] کی شکل میں ہے۔ اس گلدستہ کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے

---

[1] پروفیسر منظر حسن دسنوی "اُڑیہ زبان میں اُردو، فارسی کے الفاظ"
[2] قاضی عبدالودود "نوائے ادب" اکتوبر ۱۹۵۰ء

کا نام "اشرف الجنن" ہے اور دوسرے کا "اظہار العشق"۔ ان میں مجملہ اور شاعروں کے اشرف کٹکی اور اولاد مرتضیٰ کٹکی کی غزلیں بھی ہیں۔ یہ گلدستہ مطبع نصرت الاسلام کلکتہ میں ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا اور پروفیسر منظر حسن دسنوی کے پاس موجود ہے۔

اس کے بعد منشی شیخ امین اللہ متخلص بہ ترخی (سالِ وفات ۱۸۷۹ء) جو بالو بیسی شہر کٹک کے رہنے والے تھے ان کا ایک اُردو دیوان موسوم بہ "دیوانِ ترخی" دستیاب ہوا ہے۔ یہ دیوان ۱۹۰۷ء میں رضوانی پریس کلکتہ میں شائع ہوا۔ اب یہ دیوان نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

معلم سبلپوری کے متعلق کرامت علی کرامت "آبِ خضر" میں لکھتے ہیں کہ ان کا کلام ۱۹۱۳-۱۴ء میں "کاخِ سخن" کے نام سے شائع ہوا تھا اور اس کی صرف ایک ہی کاپی رہ گئی ہے جو ان کے کسی رشتہ دار کے پاس سبلپور میں موجود ہے۔ "آبِ خضر" میں معلم کا نمونۂ کلام موجود ہے۔

مولا بخش شاہ مولا ایک ولی صفت بزرگ تھے۔ اُن کا انتقال ۱۹۵۸ء میں ہوا۔ آپ کبھی رشد و ہدایت بزبانِ شاعری بھی فرمایا کرتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے مریدوں نے چند کتابچے "مولا نامہ"، "خدا کی عنایت" وغیرہ شائع کرائے۔ ان حضرات کے علاوہ اس دور کے اڑیسہ کے شاعروں میں قابلِ ذکر حضرت ظہور الحق ظہوری، محمد یوسف، عبدالرحیم احسن، عبدالمجید بھوئیاں، عبدالستار عبد، محمد محسن محسن، نور علی انور، عبدالعزیز عاشق، رفیع الدین رفیع اور رحمت علی رحمت ہیں۔ اڑیسہ کے ان شعرائے قدیم کے کلام میں تصوف کا رنگ غالب ہے۔ اُن کی نعتیہ غزلیں اور قصائد خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔ اُن کے بیان کا تغزل بھی دامنِ توجہ کھینچتا ہے، اس لئے کہ اس کا حسن و عشق کی سطحی داستانوں سے کوئی علاقہ نہیں۔ یہ زندگی کے گہرے شعور اور تجربے کی پیداوار ہے۔

اُردو بولنے والوں کی تعداد:۔ جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے اڑیسہ کے مسلمانوں کی زبان اُردو ہے جن کی آبادی اس ریاست کی کل آبادی کا ڈیڑھ فی صدی ہے لیکن اُردو بولنے، لکھنے اور پڑھنے والوں کی تعداد ان ہی پر منحصر نہیں۔ ان کے علاوہ بہت سے ہندو گھرانوں میں بھی اُردو کا چلن عام ہے۔ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق اُردو مادری زبان والے افراد کی

سہ کرامت علی کرامت "آبِ خضر"

تعداد ۱،۵۹،۰۱۷ تھی۔ ۱۹۶۱ء میں یہ تعداد ۲،۱۲،۸۹۱ تک پہنچ گئی۔ گزشتہ عرصہ میں اس ریاست میں اُردو مادری زبان والی آبادی کی تعداد میں خوشگوار اضافہ ہوا چنانچہ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ اُردو آبادی ۱۹۵۱ء کے مقابلے میں تقریباً دگنی یعنی ۲،۸۶،۵۴۱ ہوگئی ہے۔

تعلیمی سہولتیں:۔ پورے صوبے میں تقریباً چھ سو ہائی اسکول ہیں جن میں سے صرف ۴۸ اسکولوں میں اُردو کی بہ حیثیت مادری زبان تعلیم کا انتظام ہے۔ پورے صوبے میں صرف ایک ہائی اسکول۔ اُردو گرلس ہائی اسکول کٹک ہے، جس میں ذریعہ تعلیم بھی اُردو ہے۔ بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن کی طرف سے اُردو پڑھنے والے طلبار کو اجازت ہے کہ وہ تاریخ، جغرافیہ، سائنس وغیرہ کے پرچوں کے جوابات اُردو میں لکھیں لیکن اس رعایت سے شہر ہی کے چند لڑکے مستفید ہوتے ہیں۔ دیہات اور قصبوں کے اسکولوں کے اُردو داں لڑکے اڑیہ زبان میں لکھنے پر مجبور ہیں کیونکہ وہاں اُردو میں پڑھائی کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان مضامین کی اُردو کتابیں جو ہائی اسکول کے نصاب کے مطابق ہوں تقریباً نایاب ہیں۔

بعض پرائمری اور مڈل اسکولوں میں اُردو صرف زبان کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے۔ ان اسکولوں کے علاوہ پورے صوبے میں چھوٹے بڑے ۷۰ مدارس ہیں جہاں اُردو کی تعلیم کا انتظام ہے۔ حال ہی میں اڑیسہ سرکار کی طرف سے ایک مدرسہ ایجوکیشن بورڈ قائم کیا گیا ہے۔ یہ بورڈ مدرسوں میں اُردو، عربی اور فارسی کی تعلیم کی نگرانی کرے گا۔

پورے صوبے میں تین یونیورسٹیاں ہیں۔ ان میں اتکل یونیورسٹی سب سے پرانی ہے۔ اس سے ملحق تقریباً ۳۰ کالج ہیں جن میں سے صرف چار کالجوں میں اُردو کی پڑھائی کا انتظام ہے۔ دو سال قبل صرف دو کالجوں میں یہ انتظام تھا۔ اگرچہ تمام لڑکوں کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ خود سے پڑھ کر اُردو مضمون کا امتحان دیں۔ خوشی کا مقام ہے کہ بڑی جد و جہد کے بعد امسال اتکل یونیورسٹی نے ایم اے کے اُردو امتحانات منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے یعنی لڑکے پرائیوٹ طور پر اُردو ایم اے کے امتحانات میں شریک ہوسکتے ہیں۔ یہ سہولت بطور آزمائش دی گئی ہے۔ باقی دو یونیورسٹیوں یعنی سبلپور اور برہمپور کے کسی کالج میں

اب تک اُردو کی پڑھائی کا انتظام نہیں ہو سکا ہے۔ لڑکے تمام دیگر مضامین باضابطہ کالج میں پڑھتے ہیں۔ لیکن اُردو کے لئے یہ سہولت دی گئی ہے کہ بطور خود پڑھیں اور یونی ورسٹی کے امتحانات میں شریک ہو جائیں۔ ان یونی ورسٹیوں میں بالترتیب ۱۷ اور ۱۲ کالج ہیں۔

اُردو کے معاملہ میں اڑیسہ کی ریاستی حکومت روا داری کا ثبوت دیتی ہے اور اس وجہ سے اڑیسہ کا اُردو داں طبقہ شمالی ہند کی دُوسری ریاستوں کے مقابلے میں اپنے کو خوش قسمت سمجھتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی کوشش بھی ہو رہی ہے کہ ان کالجوں میں جہاں اُردو پڑھنے والوں کی تعداد خاصی ہے لیکچرار مقرر کیے جائیں۔

درسی کتابیں:- جہاں تک کتابوں کی فراہمی کا مسئلہ ہے۔ کالجوں میں زیادہ دقت نہیں ہے۔ ان میں معیاری کتابیں ہوتی ہیں اور جو کتابیں دوسری یونی ورسٹیوں یا ریاستوں میں رائج ہیں دستیاب ہو جاتی ہیں مگر اسکولوں میں بڑی دقت ہے۔ ہائی اسکولوں کی کتابوں کا بھی قریب قریب یہی حال ہے۔ ان دشواریوں کے پیش نظر خاکسار نے درسی کتابوں کی تالیف کی ذمہ داری لے لی ہے۔ اب تک ایک درسی کتاب درجہ چہارم کے لئے "نخلِ اُردو" کے نام سے چھپ چکی ہے۔ دوسرا حصہ درجۂ پنجم کے لئے زیرِ طبع ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ دو تین سال کے اندر ہمیں دوسروں کا مرہونِ منت نہ ہونا پڑے گا۔

اُردو اخبارات و رسائل:- جہاں تک اُردو صحافت کا تعلق ہے اڑیسہ کی اپنی کوئی روایت نہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ شاید یہ ہے کہ ریاست بھر میں اُردو کا کوئی چھاپہ خانہ نہیں۔ ریاست سے کوئی روزنامہ یا ہفتہ وار اخبار شائع نہیں ہوتا۔ "شاخسار" اڑیسہ کا واحد ادبی رسالہ ہے۔ اس کا اجرا کٹک سے ۱۹۶۵ء میں ہوا تھا۔ یہ ابتدا دوماہی تھا اب ماہنامہ ہے۔ اس کے مدیرِ اعلیٰ اڑیسہ اور اُردو کے برگزیدہ شاعر اور ادیب جناب امجد نجمی ہیں۔ اس کے صلاح کاروں میں سید حرمت الاکرام، سید اولاد اصغر رضوی اور احمد حسین آزاد شامل ہیں اس کے معاون سالک لکھنوی ہیں۔ "شاخسار" پہلے پٹنہ سے طبع ہوتا تھا اب لکھنؤ سے ہوتا ہے۔

بعض تعلیمی ادارے یعنی اسکول اور کالج جو اپنے سالانہ میگزین شائع کرتے ہیں، ان میں علاوہ اڑیہ، انگریزی، بنگالی، تلگو وغیرہ کے اُردو کا حصہ بھی شامل رہتا ہے۔ یہ رسائل بھیانی ٹی ڈی ایس اسکول سمبلپور، "راؤنشا دیپن" (راؤنشا کالج کٹک) اور "سنت وان" (کرائسٹ کالج کٹک) ہیں۔

علمی و ادبی سرگرمیاں:

دوسری ریاستوں کی بہ نسبت اڑیسہ میں اُردو ادبا و شعراء کی تعداد کم ہے۔ اُن کی صحیح صحیح تعداد کا تعین تو شاید ممکن نہیں اور نہ ہی سب کے نام گنوائے جا سکتے ہیں۔ تاہم جو نام بار بار سامنے آتے ہیں۔ وہ حسبِ ذیل ہیں: علامہ امجد نجمی، مولانا برکت اللہ برکت، مولانا عبداللطیف عارف، کرامت علی کرامت، حیدر نایاب، خالد رحیم، اطہر عزیز، ساجد اثر، یوسف جمال، سید شکیل دسنوی، بہاء الدین ریاض، فیض سنبھلپوری، منظر دسنوی، حفیظ الباری حافظ، سعید اختر، جبار جلیل، ظہیر اللہ نور، حافظ رفیق درد، غالب فہمی، عبدالصمد پریمی، یوسف پرویز، نفیس منظر، جلال الدین بدر، محمد سعید سعید، محمود بالیسری، حفیظ اللہ نیولپوری، ناصر بلہری، شیخ حبیب اللہ، مسیح اللہ مسیح، فرحت زیدی، شہید اکرامی، عبدالرشید نقاد، عبدالرحیم راقم، ضمیر خاں ضمیر، رحمٰن کریم شاکر، خان نیازی۔

اس دَور کے شاعروں میں امجد نجمی صاحب سب سے معمّر اور کہنہ مشق ہیں۔ آپ کے کلام کے دو مجموعے "طلوعِ سحر" اور "جوئے کہکشاں" شائع ہو چکے ہیں۔ آپ ماہنامہ شاخسار کے جو کٹک سے شائع ہوتا ہے، مدیرِ اعلیٰ بھی ہیں۔ آپ شاعر ہونے کے علاوہ ڈرامہ نگار بھی ہیں۔ اور آپ کے ڈراموں کا مجموعہ عنقریب شائع ہو کر منظرِ عام پر آنے والا ہے آپ کے خطوط کا مجموعہ بھی چھپنے والا ہے۔ آپ "بزمِ سخن" کٹک کے بانی اور صدر بھی ہیں۔

راؤنشا کالج کے شعبۂ اُردو فارسی کے سابق صدر پروفیسر منظر حسن دسنوی کو بھی شعر و شاعری سے گہری دلچسپی رہی ہے آپ عام طور پر غزلیں کہتے ہیں! اور آپ کے تنقیدی مضامین پرچوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

مولانا برکت اللہ برکت ایک کہنہ مشق شاعر ہیں، کٹک کے مشاعروں کی محفلوں میں اُن کی نمایاں حیثیت رہی ہے۔ آپ غزلیں کہتے ہیں اور پڑھنے کا انداز نہایت دلکش ہوتا ہے۔ آپ کا مجموعۂ کلام اب تک شائع نہیں ہو سکا ہے۔

مولانا عبداللطیف عارف بھی ایک غزل گو شاعر ہیں۔ ان کا تخلص ان کے عارفانہ کلام کی دلالت ہے۔

حفظ الباری صاحب ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ آپ غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی کہتے ہیں۔ آپ کے کلام پر اقبال کا رنگ غالب ہے۔

نوجوان شعراء میں کرامت علی کرامتؔ شاخسارؔ کے روح رواں اور ایک ابھرتے ہوئے نوجوان شاعر ہیں۔ کرامت علی کرامتؔ شاعری کے علاوہ تنقید نگاری میں بھی دست رس رکھتے ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین ملک کے موقر رسالوں میں چھپتے رہتے ہیں۔

حیدر نایاب پیشے کے اعتبار سے انجینئر ہیں اور بڑے عہدے پر فائز ہیں۔ شاعری میں نظموں کی طرف رجحان ہے۔ ان کا مجموعۂ کلام عنقریب شائع ہونے والا ہے۔

شکیل دسنوی بھی پیشے کے لحاظ سے انجینئر ہیں۔ ملک کے اکثر رسالوں میں ان کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔ عنقریب مجموعۂ کلام شائع کرانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

نثر نگاروں میں سب سے پہلے پنڈت لکشمی نرائن مصرا کا ذکر ضروری ہے۔ آپ کی مادری زبان اڑیہ تھی۔ جیل میں آپ نے اردو سیکھی اور وہاں سے نکل کر خالص اردو میں ایک کتاب "گیتا اور اسلام" لکھی جو عام طور پر لائبریریوں میں پائی جاتی ہے۔ بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق نے اس کے مقدمہ میں کتاب کی بڑی تعریف لکھی ہے۔ شیخ حبیب اللہ نے جو محکمہ پولیس میں ملازم تھے اور اب ریٹائرڈ ہو چکے ہیں آج سے تیس سال قبل نثر میں کئی کتابیں لکھیں۔ ان میں ناول "نجمہ" "رہبر" "سچی محبت" اور ایک مقالہ "عمر خیام" مکتبہ جامعہ دہلی نے شائع کیا۔

ان کے علاوہ منظر حسن دسنوی اور راقم الحروف تنقیدی مضامین لکھتے ہیں۔

اڑیسہ میں شہر کٹک شعراء و ادبا کا مسکن ہے اور ادبی اعتبار سے یہ بڑا فعال مرکز ہے۔ یہاں ہر ماہ دو بڑے مشاعرے ہوتے ہیں۔ ایک اردو لائبریری کی سرکردگی میں اور دوسرا بزم سخن کے زیر اہتمام ہوتا ہے۔ مشاعروں کے علاوہ اردو لائبریری میں کبھی کبھی ماہرین سائنس اور طب کی معلوماتی تقریریں بھی ہوتی ہیں۔ یوم آزادی اور یوم جمہوریہ میں مشاعرے کی محفلیں بڑے تزک و احتشام سے سجائی جاتی ہیں۔ سالانہ مشاعرے بڑے پیمانے پر کئے جاتے ہیں۔ جن میں اکثر صوبہ کے گورنر یا وزیر اعلیٰ کی صدارت رہتی ہے

شہر کٹک میں اردو ڈرامے بھی اسٹیج کیے جاتے ہیں۔ اب تک جو ڈرامے کامیابی کے ساتھ اسٹیج کئے گئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

'سلور کنگ' ۔ آغا حشر، 'کشورکا نتا' ۔ امجد نجمی، 'منزل' ۔ یوسف پرویز، 'یہودی کی لڑکی' ۔ آغا حشر، 'نافرمان لڑکا' ۔ ترجمہ نورالدین احمد، 'پگھلتے پتھر' ۔ محمد محسن۔

بھدرک میں ایک ادبی محفل قائم کی گئی جس کا نام سنگم لٹریری مجلس ہے۔ اسی مجلس کے زیر اہتمام گزشتہ ماہ جون میں ایک بڑے پیمانے پر مشاعرہ کیا گیا تھا جس میں کلکتہ اور یوپی کے شعراء بھی شریک تھے۔ مشاعرہ میں اڑیہ کے شعراء نے بھی اپنا کلام پیش کیا تھا جس کا ترجمہ اردو میں سنایا گیا۔ اسی طرح پر اردو کے شعراء کے کلام کا خلاصہ اڑیہ زبان میں پڑھ کر سنایا گیا۔

سونگڑہ میں "گلشن ادب" ایک عرصے سے اردو کی خدمت انجام دیتا آ رہا ہے۔ اس دیہی مقام میں اردو ادب سے اتنی گہری دلچسپی اور مشاعروں کی منظم محفلوں کو دیکھ کر فروغ اردو کی طرف سے مایوسی نہیں ہوتی۔

اڑیسہ کے صدر مقام بھونیشور میں بھی ہر سال دو تین مشاعرے ہوتے ہیں۔

راونشا کالج صوبہ کا سب سے بڑا سرکاری کالج ہے جس میں ایک مدت سے اردو فارسی کی تعلیم کی سہولتیں موجود ہیں۔ اس کالج میں شعبہ اردو فارسی کی ایک بزم انجمن ادب کے نام سے مشہور ہے۔ بزم کی جانب سے ہر سال یوم النبی کا جلسہ منایا جاتا ہے۔ جس میں صوبہ کے مشہور ادبا و شعراء شریک ہوتے ہیں۔ اس جلسہ میں تقریری مقابلہ اور مضمون نویسی پر طلباء کو انعامات تقسیم کیے جاتے ہیں۔ دیگر مقامات میں برہمپور اور خوردہ روڈ میں بھی مشاعرے ہوتے ہیں۔ کندرا پاڑا بالوسی اور راورکیلا وغیرہ مقامات میں بھی بہت کامیاب مشاعرے ہوتے ہیں۔

ادبی انجمنیں : یکم جولائی ۱۹۲۳ء کو کٹک میں "بزم ادب" کی بنیاد پڑی۔ اس بزم کے زیر اہتمام ماہانہ مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ ایک مدت تک یہ بزم شعر و شاعری کا مرکز بنی رہی۔ آج سے تقریباً پندرہ سال قبل ایک اور بزم قائم ہوئی۔ جس کا نام "بزم سخن" رکھا گیا اور مہینے میں دو مشاعرے ہونے لگے۔ مشاعروں کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کی بنا پر اڑیسہ اردو لائبریری والوں نے بھی ماہانہ مشاعرے کا اہتمام کیا۔

جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے، اڑیسہ میں اردو کا کوئی چھاپہ خانہ نہیں اور اسی سبب سے شاید کوئی ناشر بھی نہیں۔ اس ذیل میں "اڑیسہ اردو پبلشرز" کٹک کا نام البتہ لیا جا سکتا ہے۔ اس ادارہ نے بعض کتابیں شائع کی ہیں۔ تاہم اس کا کاروبار محدود ہے۔ فی سال اوسط کو سامنے رکھا جائے تو یوں کہنا چاہیے کہ اڑیسہ میں اردو کتابوں کی اشاعت نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے تاہم اس ضمن میں گزشتہ عرصہ

میں شائع شدہ کتابیں "جوئے کہکشاں" (امجد نجمی) اور "شعاعوں کی صلیب" (کرامت علی کرامت) لائقِ ذکر ہیں۔

یہاں اُردو کا قابلِ ذکر کوئی کتب خانہ نہیں ہے۔ کنیکا لائبریری راونشا کالج ہی واحد کتب خانہ ہے، جہاں اُردو فارسی کتابوں کا قابلِ ذکر ذخیرہ ہے۔ اب اتکل یونی ورسٹی نے، توجہ دلائے جانے پر، کچھ روپے اُردو کتابوں کے لئے مخصوص کر دیئے ہیں۔ یوں چھوٹی چھوٹی لائبریریاں بالاشور اور سمبلپور ضلعوں میں ہیں لیکن یہ قابلِ ذکر نہیں ہیں۔ اب کچھ اُردو کے ہمدردوں نے اس ضمن میں دلچسپی لینی شروع کی ہے۔ اور ایک بڑی اُردو لائبریری "اڑیسہ اُردو لائبریری" کے قیام کے لئے کوششیں ہو رہی ہیں۔ معین الدین احمد صاحب ریٹائرڈ آئی اے ایس اس کے صدر ہیں اور موصوف نے اس کے لئے ایک لاکھ کے قریب چندہ فراہم کر لیا ہے اور لائبریری کی عمارت کا سنگِ بنیاد بھی پڑ چکا ہے۔ امید ہے یہ جلد مکمل ہو جائے گی۔

ریاست اڑیسہ میں اُردو کی ترقی و اشاعت کے لئے جو افراد اور ادیب اپنی مساعی کو بروئے کار لا رہے ہیں۔ ان میں سرِ فہرست جناب امجد نجمی اور جناب کرامت علی کرامت ہیں۔ درسی کتابوں کی تیاری میں جو کام راقم الحروف کر رہا ہے، ممکن ہے اس ضمن میں وہ بھی لائقِ اعتنا ہو۔

ریاستی سرکار کی امداد :۔ اُردو کتابوں کی اشاعت کے لئے ریاستی سرکار کوئی امداد نہیں دیتی۔ البتہ اڑیسہ ساہتیہ اکاڈمی نے "جوئے کہکشاں" کی اشاعت کے لئے پانچ سو روپے کی امداد دی تھی۔ ریاستی سرکار کی طرف سے اُردو ادیبوں کو انعام و اعزاز دینے کا بھی کوئی دستور نہیں ہے۔

ریاست کے جن شاعروں کو اُردو اکیڈمی اُتر پردیش نے انعامات سے نوازا ہے ان میں جناب امجد نجمی اور جناب کرامت علی کرامت شامل ہیں۔ مذکورہ اُردو اکیڈمی نے جناب امجد نجمی کے مجموعۂ کلام "جوئے کہکشاں" پر ساڑھے سات سو روپے، اور جناب کرامت علی کرامت کے مجموعۂ کلام "شعاعوں کی صلیب" پر ایک ہزار روپے



(دائیں سے) اظہر عزیز، نفیس منظر حسن، خالد رحیم

کے انعامات دیئے ہیں۔

سرکاری دفاتر میں اُردو :۔ ریاستی سرکار کے کسی محکمہ میں اُردو میں کام کاج نہیں ہوتا۔ چونکہ ریاست سے اُردو کے اخبارات شائع نہیں ہوتے۔ اس لئے محکمۂ تعلقاتِ عامہ میں اُردو کا کوئی شعبہ بھی نہیں۔ نیز ریاست اڑیسہ میں کوئی اُردو اکیڈمی نہیں ہے۔

اُردو کے فروغ کے لئے تجاویز :۔

(۱) اڑیسہ میں اب تک کوئی فعال انجمن قائم نہیں ہو سکی ہے۔ انجمن ترقی اُردو کی شاخ یہاں قائم کی جائے۔

(۲) اُردو مدارس کی کارکردگی کو بہتر اور موثر بنانے کے لئے محکمۂ تعلیمات کے تحت اُردو کے مخصوص افسران کا تقرر کیا جائے۔ فی الحال سارے اڑیسہ کے لئے ایک مسلم ایجوکیشن افسر ہیں جن پر مدرسہ بورڈ اڑیسہ کے ناظم کی ذمہ داریاں بھی سپرد کی گئی ہیں۔ اس شعبہ میں کام کرنے والے افسروں کا پایہ گزیٹیڈ کر دیا جائے۔ اور ان کے تحت دوسرے افسران مامور کئے جائیں۔

(۳) اُردو میڈیم میں پڑھنے والے طالب علم نصابی کتابیں اڑیہ میں پڑھتے ہیں اور اُردو میں جواب تحریر کرتے ہیں۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ محکمہ اطلاعات و تعلقاتِ عامہ (مرکزی) اڑیسہ میں منظور شدہ تمام درسی کتابوں کے اُردو ترجمہ کا انتظام کرے

(۴) اُردو اساتذہ کی تربیت کے لئے موثر قدم اٹھانا چاہئے تاکہ معلم و متعلم دونوں کا معیارِ ترقی متوازن ہو۔

(۵) آل انڈیا ریڈیو کٹک سے اُردو پروگرام نشر کئے جائیں۔

(۶) مشہور و معروف شعراء و ادباء کی غیر مطبوعہ تخلیقات کی طباعت کا انتظام کیا جائے۔

(۷) کالجوں میں اُردو آنرس کے شعبے کھولے جائیں۔

(۸) لائبریریوں میں اُردو کتب کی خریداری کے لئے گرانٹ میں اضافہ کیا جائے۔

(۹) اُردو جاننے والے تعلیم یافتہ بے روزگاروں کی سرکاری دفاتر میں ملازمت اور بنکوں میں ان کی کھپت کا انتظام کیا جائے۔

آسام میں اردو



احمد علی شاہ



عبدالمالک

آسام ہندوستان کی مشرقی سرحد پہ ایک وفادار سپاہی کی طرح کھڑا ہے۔ یہاں کے قدرتی مناظر بڑے ہی دل فریب ہیں۔ آسام کی علاقائی زبان آسامی کی وسعت اور قومی تہوار بیہو کی رنگینی پوری قوم کی جانداری کی نشانی ہے۔

آسام کی آبادی کا زیادہ حصہ کوہستانی قبائلیوں اور باہر سے آئے ہوئے لوگوں پر مشتمل ہے۔ یہاں بہت سی زبانیں اور کلچر پھل پھول رہے ہیں جن میں آسامی زبان ہی رابطہ کا کام کرتی ہے۔

اُردو زبان اپنی وسعت اور ہر دل عزیزی کی وجہ سے اٹھارہویں صدی کے اوائل سے ہی آسام میں پہنچنا شروع ہو گئی تھی۔ انگریز جب آسام میں چائے کے باغات کھولنے لگے تو انہوں نے ان باغات میں بہار، مدھیہ پردیش اور اُتر پردیش سے مزدوروں کو لا لاکر آباد کرنا شروع کئے۔ ان مزدوروں کے ساتھ گفتگو اور رابطہ کے لئے انہوں نے ہندوستانی زبان کا سہارا لیا جس میں اُردو اور ہندی کی آمیزش تھی۔

اُردو زبان بولنے والوں کی تعداد :۔ یہاں کے بڑے بڑے شہروں اور تجارتی مرکزوں میں اُردو جاننے والوں کی بھاری تعداد ملتی ہے۔ ان میں گوہاٹی، تین سوکیا، ڈبرو گڑھ، شیو ساگر، جورہاٹ، نوگاؤں، تیزپور، ہونگیہ، گولاگھاٹ، مران بار اور سوناری وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ اگرچہ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری رپورٹ کے مطابق ریاست میں صرف ۶۲۳۵ افراد کی مادری زبان اُردو تھی۔ تاہم آسام کے مذکورہ بالا شہروں اور چائے باغات میں اُردو بولنے اور سمجھنے والے افراد کی تعداد کم از کم دو لاکھ ہوگی۔

تعلیمی سہولتیں :۔ آسام میں مسلمانوں کی آبادی بھی کافی ہے یہ لوگ مذہبی تعلیم اور معاشرتی مراسم میں اُردو کا بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ خصوصاً ہر ایک مسجد کے ساتھ ملحقہ مکتب یا مدرسہ میں بچوں کو اُردو زبان کی تعلیم دی جاتی تھی اور آج بھی یہ سلسلہ کم و بیش جاری ہے۔ اس لئے یہاں کے عوام اُردو سے مانوس رہے ہیں۔

آسام کے تعلیمی اداروں میں خاص طور پر ابتدائی اسکولوں میں مسلمان بچوں کو ڈرائنگ کے بدلے اُردو کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ہائی اسکولوں میں درجہ ہفتم سے دہم تک اُردو، فارسی، یا عربی کوئی ایک زبان پڑھنا لازمی ہے۔ ہائی مدرسوں میں سبھی پرچوں کا جواب اُردو میں لکھ سکتے ہیں اور اسی طرح سرکاری مدرسوں میں سے عالیہ اور ٹینشل مدرسہ میں آردو ذریعہ تعلیم ہے۔ زبان دانی اور ادب کی کتابیں بھی درس میں داخل ہیں۔ ایسے مدرسے جو سرکاری امداد سے چلائے جاتے ہیں۔ کچھار ضلع کے بدرپور، ہائیلا کنڈی اور کریم گنج میں ہیں۔ اس کے علاوہ نوگاؤں اور کام روپ ضلع کے بعض جگہ میں بھی قایم ہیں۔ کچھ مدرسے بغیر کسی سرکاری امداد کے قائم ہیں۔ ان میں دارالعلوم ہائر سکنڈری اسکول اور دارالعلوم گوہاٹی سرفہرست ہیں

۱۹۶۰ء سے قبل ڈگبوئی مڈل اسکول اور ہائی اسکول میں اُردو بطور مادری زبان کے پڑھائی جاتی تھی مگر اب کہیں کہیں اُردو میں دو چار لڑکے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ کالجوں میں اُردو کی تعلیم کا سوائے نوگاؤں، گوہاٹی اور منگلدے کہیں انتظام نہیں ہے۔ لسانی کمشنر کی بارہویں رپورٹ کے مطابق ۶۸-۱۹۶۷ء میں ریاست میں پرائمری میں ۲۱۰ اور ثانوی میں ۱۵

طلبا زیر تعلیم تھے۔

اخبارات و رسائل : غالباً آسام اور ناگالینڈ ہی ملک کی وہ ریاستیں ہیں جہاں سے کوئی اُردو اخبار یا رسالہ شائع نہیں ہوتا۔ اس کی سب سے اہم وجہ ریاست میں اُردو جاننے والوں کی کمی ہے علاوہ بریں یہاں کتابت اور لیتھو پریس کی بھی سہولیات کا فقدان ہے۔ بہرحال مغربی بنگال اور بہار کے اُردو اخبارات بڑی حد تک ریاست کے اہلِ اُردو کی ضرورت پوری کرتے ہیں۔

کتب خانے :- ریاست میں کوئی اہم اور قابلِ ذکر کتب خانہ نہیں البتہ کچھ مدرسوں میں کتب خانے موجود ہیں جہاں اُردو کتابیں خاصی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ ان کتابوں کی تعداد لگ بھگ بیس ہزار ہوگی اور اس میں روزافزوں اضافہ ہو رہا ہے

علمی و ادبی سرگرمیاں :- ریاست میں ادبی سرگرمیاں بھی نہ ہونے کے برابر ہیں اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ چونکہ یہاں اُردو ادبا و شعرا کی کمی تھی لہٰذا کسی علمی یا ادبی انجمن کا قیام بھی عمل میں نہیں آیا۔ بہرحال اب مشہور اُردو ادیب ڈاکٹر تارا چرن رستوگی نے ریاست میں انجمن ترقی اُردو (ہند) کی شاخ قائم کی ہے جس سے ریاست میں علمی و ادبی سرگرمیوں کی شروعات متوقع ہے۔

غالباً آسام سے متعلق اولین اُردو تصنیف فورٹ ولیم کالج کے میر منشی میر بہادر علی حسینی کا ترجمۂ تاریخ آسام ہے جو انہوں نے شہاب الدین تالش کی فارسی تصنیف سے کیا ہے۔ اس کتاب میں اورنگ زیب کے مشہور سپہ سالار میر جملہ کے حملۂ آسام ۱۶۶۲ء کا تفصیلی ذکر ہے۔ ریاست میں اُردو ادبا و شعرا کی کمی کی وجہ سے تصنیف و تالیف کا کام بہت کم ہوا ہے۔ بہرحال سب سے پہلے آسام میں صوفی ذوالقدر علی صاحب (۱۸۹۱ تا ۱۹۶۷ء) نے تین اُردو کتابیں تصنیف کی تھیں جو آج بھی مخطوطوں کی شکل میں اُن کے خاندان والوں کے پاس محفوظ ہیں۔ انہوں نے اُردو رسم الخط میں دو آسامی کتابیں تصنیف کیں جن میں ایک حضرت محمدؐ کی سیرت پر اور دوسری حضرت رابعہ بصریؒ کی سوانح عمری ہے۔ یہ دونوں کتابیں آسامی رسم الخط میں طبع ہو چکی ہیں۔ اور ان کا اُردو رسم الخط والا مخطوطہ بھی محفوظ ہے۔

دورِ حاضر میں اُردو جاننے والوں اور کچھ کام کرنے والوں میں خاص طور پر پروفیسر سید عبدالمالک صاحب کا نام لینا ضروری ہے موصوف نے سردار جعفری کی مثنوی "نئی دنیا کو سلام" کا شعری ترجمہ آسامی میں پیش کیا ہے۔ پرنسپل عبدالستار صاحب نے بھی اُردو، عربی، فارسی اور پشتو زبان کے الفاظ جو آسامی زبان میں مستعمل ہیں۔ ان کا تفصیلی جائزہ لے کر ایک فہرست مرتب کی ہے۔ پروفیسر سید بدیع الزماں نے آسامی کے ذریعے اُردو سیکھنے کے لئے ایک کتاب لکھی ہے جو زیرِ طبع ہے۔ موصوف نے حال میں اُردو تعلیم کے فروغ کے لئے زبردست جدوجہد شروع کی ہے۔

منگلدئی کالج درنگ کے پرنسپل ڈاکٹر تارا چرن رستوگی کا وجود ریاست کے لئے بسا غنیمت ہے۔ موصوف کے گراں قدر مضامین ملک کے مختلف رسائل و جرائد میں اکثر شائع ہوتے ہیں۔ علامہ اقبال پر آپ نے ڈاکٹریٹ کی ہے اور ان سے متعلق ان کے متعدد مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

راقم الحروف کے آسامی افسانوں کے ترجمے "آج کل" دہلی اور "شاعر" بمبئی میں شائع ہو چکے ہیں۔ آسامی زبان و ادب، ایک تعارف "سب رس" حیدرآباد میں شائع ہوا اور دو افسانوں کا آسامی ترجمہ "آئینہ" اکاشر ترا" نام سے شائع ہوا ہے۔ علاوہ ازیں راقم "اضطراب" (ست پرکاش سنگر) "آمد آمد" (جوگندر پال) اور "پرچھائیوں سے پرے" (ستیش بترا) ان تین اُردو ناولوں کے آسامی میں ترجمے اور سید عبدالمالک صاحب کی مشہور ناول "بہہ بیٹیکار پھول" کا اُردو میں ترجمہ "زہریلی کیبی کا پھول" کے نام سے کر چکا ہے۔

میرے شاگرد عزیزی اُدے دت برُوا نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کا اُردو خط و کتابت کورس مکمل کر لیا ہے اور وہ اُردو شاعروں کے متعلق ایک کتاب آسامی میں مرتب کر رہے ہیں میگھالیہ میں جناب ایس ایس ہتکاری صاحب بھی ایک ایسی کتاب مرتب کر رہے ہیں جس میں ہندوستان کے سبھی زبانوں کے شاعروں کی اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی نظموں کا انتخاب شامل ہوگا۔ اس میں اُردو کے لگ بھگ ڈیڑھ سو شعرا، شامل ہیں۔

ریاستی سرکار اُردو کی ترقی و ترویج کے لئے کچھ بھی نہیں کر رہی ہے۔ نہ تو کوئی مالی امداد دی جاتی ہے اور نہ ہی کسی قسم کے انعام سے نوازا جاتا ہے۔ ریاست میں اُردو میں کام کاج کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا۔

جدید ہندوستانی زبانوں کی تعلیم و توسیع کی توقع بڑھتی جا رہی ہے۔ آسام کے لوگ بھی اُردو جیسی قیمتی اور بڑی زبان سے رابطہ قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس کے لئے اچھے کارکنوں کی کمی ہے، پھر بھی اُردو اور آسامی دونوں زبانوں کے جاننے والوں اور کام کرنے والوں کی تعداد

(بقیہ صـــ۱۷ــ پر)

غزلیات

علقمہ شبلی

۵/۹ ۸ رپن اسٹریٹ کلکتہ ۷۰۰۰۱۶

طنز کے تیر مری سمت نہ پھینکو لوگو!
شکل اپنی بھی تو آئینے میں دیکھو لوگو!

کیا کنارے پہ کھڑے سوچ رہے ہو لوگو؟
من کے ساگر میں بھی تو غوطہ لگاؤ لوگو!

چشمِ دیوار ہے جس کی نہ ٹپکتا ہو لہو
شہر میں ایک بھی گھر ایسا دکھا دو لوگو!

تا بکے یوں ہی تصور میں تراشو گے صنم
کیوں تصور کو نہ تصویر میں ڈھالو لوگو

منہ کے بل خود نہ کہیں گر پڑے سر افرازی
بے دھڑک سایہ کے پیچھے تو نہ دوڑو لوگو!

جس کا وجدان لطافت سے ہو یکسر عاری
ایسے نقادوں سے للہ بچاؤ لوگو!

نامی انصاری

۱/۹۷ پریڈ، کان پور (یوپی)

گلستاں کا ہر گوشہ اپنے حال میں گم ہے
بوئے گل کہاں پھیلے کس طرف صبا جائے

زندگی کے میلے میں اجنبی ہیں سب چہرے
کس سے کیا کہا جائے کس سے کیا سنا جائے

جانے کس سے پھیلے زلفِ یار کی خوشبو
جانے کس بہانے سے پھر بہار آ جائے

دردناک نظارے کیسے دیکھے جائیں گے
اجنبی دریچوں کو بند کر لیا جائے

قطرہ قطرہ ٹپکے ہے زہر سے ہونٹوں سے
قاتلوں کی بستی میں کس لئے رکا جائے

دھوپ کی تمازت سے گرم ہے فضا نامیؔ
گیسوؤں کے سائے میں تا بہ کے چھپا جائے

اخترؔ بستوی

روشن محل، گاندھی نگر بستی (یوپی)

نور کی موجیں ہیں یوں احساس کی ظلمات میں
جیسے جمنا میں دیئے تیریں اندھیری رات میں

ڈس کے بے سدھ ہو گئیں دل کو ہوس کی ناگنیں
زہرِ بے لطفی کا باقی رہ گیا جذبات میں

سرزمینِ حُسن سے بھی سنگ کا تحفہ ملا
چاند سے بھی چند پتھر آئے ہیں سوغات میں

صبح جو شہروں میں پژمردہ سی آتی ہے نظر
تازگی اس کی ذرا دیکھے کوئی دیہات میں

مجھ کو جس دشمن کی تھی باہر کی دنیا میں تلاش
پا لیا میں نے اُسے آخر خود اپنی ذات میں

اب تو اے اخترؔ یہی گفتار کی معراج ہے
سینکڑوں معنی چھپے ہوں ایک مہمل بات میں

اخترؔ نظمی

صدر شعبۂ اردو، کے۔ آر۔ جی کالج، گوالیار (ایم پی)

بڑھتی رہے گی بات جہاں تک بڑھائیے
اب چھوڑیئے بھی جانے بھی دیجے ہٹائیے

اوروں کا ذہن جانے کہاں رہبری کرے
اپنے ہی تجربوں کی طرف لوٹ آئیے

تنہائیاں بھی دین ہیں تقدیر کی مگر
تنہائیوں کا جشن کہاں تک منائیے

ہم کر سکے نہ خود کبھی انصاف اپنے ساتھ
اب اور کیا کسی کا خلوص آزمائیے

گھیرے ہوئے ہیں لفظوں کو معنی کے دائرے
مفہوم کے طلسم کا دھوکا نہ کھائیے

لمحوں کا کرب ٹوٹ کے صدیوں میں بٹ گیا
نظمیؔ یہ بات سچ ہے تو خوشیاں منائیے

شہزاد معصومی

کوارٹر نمبر ڈبلیو۔ آئی / بی۔۱۰، مٹھا پور، پٹنہ (بہار)

سایہ ہے کوئی اور نہ کوئی ہے سائباں
جاڑے میں دھوپ بھی سر پہ معلق ہے آسماں

ہے شہرِ آرزو میں یہی حالِ زارِ دل
جیسے کسی محلے میں خالی کوئی مکاں

اندر مکانِ جسم کے کیا جھانک کر ملے
باہر سے جب اداس ہوں آنکھوں کی کھڑکیاں

سورج بھی اپنی آگ میں آخر پگھل گیا
سیلابِ تیرگی ہوا ہر سو رواں دواں

کیا چیز ڈھونڈتی ہے ضعیفی جھکی جھکی
کیا تیر کھو گئے جو کڑکتی نہیں کماں

چہروں کی اور سروں کی بھلا بھیڑ بھاڑ میں
شہزادؔ کس کو اپنا بناؤں میں رازداں

روشنؔ پٹیالوی

سیکٹر ۱۹ اے سی، مکان نمبر ۲۱۷۶ چنڈی گڑھ

سفرِ زیست کتنا سادہ ہے
کوئی منزل نہ کوئی جادہ ہے

ہائے! مجبور آدمی کا نصیب
دشتِ ہستی میں پاپیادہ ہے

غم سما جائیں گے تمام اس میں
دامنِ دل مرا کشادہ ہے

ہم سفرِ راہِ عشق ہے دشوار
تو بتا دے کہ کیا ارادہ ہے

کیوں مری زندگی نہ ہو تاریک
غم کا پہنا ہوا لبادہ ہے

غم جھکائیں گے کیا اُسے روشنؔ
علمِ عشق ایستادہ ہے

علی جواد زیدی
ڈی ۸/۶۳ ونے مارگ نئی دہلی - ۲۱

اُردو میں ترقی پسند تحریک

(تبصرہ)

یہ کتاب اعظمی کا وہ مقالہ ہے جو انہوں نے پی ایچ ڈی کے لئے لکھا تھا۔ انجمن نے اسے پندرہ برس بعد شائع کرکے بھی ایک مفید خدمت انجام دی۔ ترقی پسند تحریک پر جس قسم کی معروضی تنقید اور تعمیری جائزے کی ضرورت تھی اُسے یہ کتاب بڑی حد تک پورا کرتی ہے۔ لیکن پندرہ برس کی طویل مدت میں خود تحریک کہیں سے کہیں جا پہنچی ہے اور اس سلسلے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اگر مصنف یہ کتاب اب لکھتے تو یقیناً اس کی شکل و صورت کچھ اور ہوتی۔ تعویق سے اس کی اہمیت میں گونہ کمی آگئی۔ مصنف کے لئے پندرہ برس کے بعد پس نقط لکھ کر اس میں خاطر خواہ حک و اضافت ناممکن ہوگئی۔ یہ اور بات ہے کہ مصنف کی تنقیدی بصیرت نے اسے کلیتہً بعد از وقت ہونے سے بچا لیا۔

خلیل الرحمٰن اعظمی خود بھی ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہ چکے ہیں۔ اور انہوں نے اس تحریک کا تفصیلی مطالعہ بہت قریب سے اور تعمیری و تشکیلی منزلوں میں ہم سفر کی حیثیت سے کیا ہے اس لئے اس کا سخت سے سخت مخالف بھی اس بھرپور جائزے کو یک طرفہ اور مخالفانہ نہیں کہہ سکتا۔ شعر و تنقید کی وادیوں میں انہوں نے ترقی پسندی کے تھوڑے سے اور صرف صالح عناصر اخذ کئے اس لئے ترقی پسندی کے مخالفین سے جانبدارانہ بھی نہیں کہہ پائیں گے۔ ایک مخالفت انگیز تحریک کے بارے میں ایسا متوازن نقطۂ نظر اپنانا بھی علمی گہرائی اور ادبی سوجھ بوجھ کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔

ترقی پسند تحریک پر یہ پہلی کتاب نہیں ہے۔ اختر حسین رائے پوری کی "ادب اور انقلاب" عزیز احمد اور سردار جعفری کی ہم نام کتاب "ترقی پسند ادب"، سجاد ظہیر کی "روشنائی"، ڈاکٹر علیم کی "اُردو ادب کے رجحانات پر ایک نظر" کے علاوہ اختر انصاری کی "افادی ادب" ڈاکٹر اعجاز حسین کی "نئے ادبی رجحانات" اور مجنوں گورکھپوری، آل احمد سرور، احتشام حسین، ممتاز حسین، ڈاکٹر محمد حسن وغیرہ کے مجموعہ ہائے مضامین میں اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ مخالفین میں کشن پرشاد کول، مولوی اختر علی، جعفر علی خاں اثر، اور گوپال متل وغیرہ نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن "ہزار نکتہ درین کار و بار دلداریست" اب بھی بہت سے گوشے تشنہ رہ گئے ہیں بعض پر میں نے اپنے چند مضامین میں روشنی ڈالی ہے اور بعض خلیل الرحمٰن اعظمی اور باقر مہدی نے اُٹھائے ہیں۔ پھر بھی اتنی بڑی تحریک کا احاطہ کر لینا آسان نہیں ہے۔ اعظمی نے سارے مواد سے استفادہ کیا ہے اور پھر اپنی بے لاگ رائے دی ہے۔

جب لوگ آغازِ داستان میں یہ کہتے ہیں کہ اُردو کی ترقی پسند ادبی تحریک عالمی تحریک کی پیداوار ہے، تو غالباً وہ یہ تصور پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ یہ بیرونی تحریک تھی، لیکن کیا ہیئت کیا مواد دونوں ہی اعتبار سے اس تحریک نے اُردو کے عام ادبی روایات کی گود میں پرورش پائی ہے اور انہیں کی روشنی میں آگے بڑھی ہے۔ اُردو نظم کے ارتقاء کی تاریخ پر نظر دوڑانے سے یہ بات فوراً صاف ہو جاتی ہے کہ اُردو نظم کا سفر قطعات، قصائد، مثنوی اور مسدس (واسوخت و مرثیہ) کے اسالیبِ اظہار سے شروع ہوا۔ انہیں مسلمہ اسالیبِ بیان پر جدید خیالات و تصورات کا اضافہ کرکے کچھ جزوی ترمیمیں کر لی گئیں۔ بیسویں صدی کے آغاز میں نظم طباطبائی، نادر کاکوروی، عبدالرحمٰن بجنوری، سجاد حیدر یلدرم، وغیرہ نے کچھ ہیئتی تجربے کئے لیکن بات آگے نہ بڑھ پائی اور یہ تجربے مسترد کر دیئے گئے۔ یہی حال عظمت اللہ خاں کے انحرافات کا بھی ہوا۔ حالی و آزاد و اسمٰعیل سے چکبست، وصفی و جوش تک یہ کارواں آہستہ آہستہ بڑھتا رہا۔ ہیئت کے اعتبار سے سبھی قدیم روایات کو کلیجے سے لگائے رہے۔ جوش کے یہاں مضامین کے تنوع کے باوجود قصیدہ و مسدس کا عام لہجہ نظیر اکبرآبادی کے آہنگ سے مل کر جس تیکھے پن کا احساس

علٰوہ خلیل الرحمٰن اعظمی ضخامت مع مثنوی ڈیمائی ۴۵۶ صفحات، قیمت بارہ روپے
ملنے کا پتہ:- انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ

دلاتا ہے۔ اس کی جڑیں روایات کی نرم زمین میں دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اقبال کے علوِ فکر نے شعرائے عجم کے علاوہ دردؔ، غالبؔ اور انیسؔ کے لہجوں سے اکتسابِ نور کر کے نئی جلا دی اور اُردو نظم کو وہ تازگی، توانائی اور حسنی جدیدیت بخشی جس سے وہ پہلے ناآشنا تھی۔ یہی نہیں بلکہ حالیؔ و آزادؔ و اسمٰعیلؔ و اکبرؔ و چکبستؔ و سرورؔ کے یہاں جو سیاسی و سماجی لغات استعمال ہونے لگے تھے انہیں نئی ادبی معنویت عطا کی۔ اقبال کے یہاں مزدور، دہقان، انقلاب، بغاوت، روسی، حبِ وطن، اتحادِ مسالک وغیرہ کا تصور ابھر چکا تھا۔ سیمابؔ، جوشؔ، جمیلؔ مظہری، ساغرؔ نظامی، روشؔ صدیقی، احسان دانشؔ کے یہاں ان آوازوں کی بازگشت دیر تک سنائی دیتی رہی۔ اقبال انقلابِ روس سے براہِ راست متاثر تھے۔ دوسروں تک یہ بات کانگریس کے بائیں بازو والوں بالخصوص جواہر لال نہرو، ایم۔ این۔ رائے، اچاریہ نریندر دیو، حسرتؔ موہانی کی وساطت سے پہنچی تھی۔ اس سلسلے میں مولانا عبید اللہ سندھی کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ انقلاب دوست شاعروں کا رویہ بیشتر جذباتی تھا اور یہ حضرات انقلاب کے منفی اور تخریبی پہلوؤں میں تسکینِ ذوق کا سامان ڈھونڈنے لگے تھے۔ اس دور کی شاعری میں فلسفیانہ تفکر کا فقدان تو نہیں لیکن واضح کمی ضرور تھی۔ اقبال کی حیثیت ایک وسیع صحرا میں اکیلے نخلستان کی ہے۔

جب ترقی پسند تحریک میدان میں آئی تو بہت سے شعرا و ادیب کو انقلابی نعروں سے روشناس کرا چکے تھے۔ نظموں اور افسانوں کے مجموعے ضبط ہو چکے تھے۔ کسان، مزدور اور طالب علم تحریکِ آزادی میں پھاند پڑے تھے اور سماجی اور اقتصادی پہلو اُبھر چکے تھے۔ اگر ترقی پسند تحریک نہ ہوتی تب بھی اشتراکیت اور اشتمالیت کے مطالب سے دانشوروں کی آگاہی انہیں اور آگے بڑھنے اور مغرب کی دوسری علمی اور فلسفیانہ تحریکوں کی طرح اثر قبول کرنے پر مجبور کرتی۔ تحریک نے تصورات کو منظم کر دیا اور ان کے پھیلانے کے لئے اجتماعی پلیٹ فارم مہیا کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ظفرؔ علی خاں اور ہری چند اخترؔ کے لہجے میں بھی ترقی پسندی کی بات ہوتی رہی۔ تحریک نے براہِ راست ادب کو دھکیل کر کسی گڑھے میں نہیں گرایا۔ اس بات کی وضاحت بے حد ضروری ہے۔ کیونکہ ترقی پسندی پر جن لوگوں نے وار کیا۔ انہوں نے اس پر خاص طور سے زور دیا۔ تحریک کی شروعات لندن میں سجاد ظہیر وغیرہ نے دورِ طالب علمی میں کی اور پھر ورلڈ کانگریس آف دی رائٹرس فار دی ڈیفنس آف کلچر" کے انعقاد سے خیالات میں استحکام آیا لیکن یہ تحریک ایک مختصر سے لندنی حلقے میں محدود تھی۔ سجاد ظہیر جب ہندوستان واپس آئے اور انہوں نے اس خیال کو آگے بڑھایا تو اس کو لوئی آراگوں کی ہدایت کے مطابق ایک متفقہ پلیٹ فارم کی حیثیت دی اور ابتدا ہی سے مولوی عبدالحق، پریم چند، جوشؔ ملیح آبادی وغیرہ جیسے غیر کمیونسٹوں کا تعاون حاصل کیا۔ فراقؔ گورکھپوری، اعجاز حسین، فیض احمد فیضؔ، صوفی غلام مصطفیٰ تبسمؔ، سہیلؔ عظیم آبادی، اخترؔ اورینوی وغیرہ کو تحریک نے جنم نہیں دیا بلکہ یہ لوگ پہلے سے خدمتِ ادب کرتے آ رہے تھے۔ ترقی پسندی کے مقاصد کے ہمدرد بعد میں بنے اور شروع ہی سے اس کے ساتھ ہو لئے۔ نوجوانوں میں علی سردار جعفری، مجازؔ، جاں نثار اخترؔ اور راقم الحروف بھی بساطِ ادب پر پہلے سے نمودار ہو چکے تھے۔ تحریک نے انہیں سمیٹا، یہ لوگ ادبی روایات اپنے ساتھ لائے۔ سیاسی رجحانات انہیں عام تعلیم اور سیاسی دلچسپی نے دیئے۔ تحریک نے انہیں صرف یکجا کر دیا اور پھر ان سب نے مل کر ایک متحدہ آواز اٹھائی جس نے قدیم حلقوں میں ہلچل مچا دی۔ اس تشریح کی ضرورت اس لئے پڑی کہ خلیل الرحمٰن اعظمی نے بھی کئی رجحانات کو "ترقی پسندی کے خام تصور" کے سر منڈھ دیا ہے۔ حال آنکہ ان کی ابتدا ترقی پسندی کی بنیاد رکھنے کے پہلے ہی ہو چکی تھی۔ جب تحریک چل پڑی تو لوگ ابتدا کو بھول گئے۔ سادر جعفر علی خاں اثرؔ اور رشید احمد صدیقی جیسے اربابِ نظر بھی انقلاب وغیرہ کے تخریبی پہلوؤں پر نکتہ چینی کرنے لگے۔ وہ بھی بھول گئے کہ "نیا ادب" کے پہلے ہی اداریئے میں یہ کہا گیا تھا کہ "ملک کے نئے ادیبوں میں، جو اپنے کو ترقی پسند بھی کہتے ہیں، ایک خطرناک رجحان پایا جاتا ہے، وہ مستارہ تخریب کی پوجا کرتے ہیں۔ ایسی تخریب کس کام کی جس کے بعد تعمیر کے لئے مسالہ ہی نہ مل سکے۔" ترقی پسندی کے تاریخی ارتقا سے بحث کرتے ہوئے اس پس منظر کو سامنے رکھنا ضروری تھا۔ اس کتاب یا کسی اور کتاب میں یہ بات کھل کر سامنے نہیں آئی۔

اگر اس تاریخی پس منظر میں ترقی پسندی کے ابتدائی دور کی افراط و تفریط دیکھی جائے تو وہ خالص مقامی حالات کی پیداوار نظر آتی ہے۔ کم و بیش یہی حال فحش نگاری کا ہے۔ علی عباس حسینی کی ایک کہانی پر فحش نگاری کا الزام لگایا گیا۔ کجا علی عباس حسینی کجا فحش نگاری؟ مولانا حسرتؔ موہانی جیسے مردِ ثقہ نے یہ فرمایا کہ "ادبی تخلیقات میں لطیف ہوسناکی کے اظہار میں کوئی مضائقہ نہیں۔" بہت سے حضرات "لطیف ہوسناکی" اور "فحش نگاری"

کا باریک فرق نہیں جانتے۔

اس کے علاوہ جو گروہ فرائڈ سے براہِ راست متاثر تھا، جیسے میراجی، وہ ترقی پسندی کے دائرے میں شامل نہ تھے بلکہ حلقۂ اربابِ ذوق کے بیشتر افراد کا یہی حال تھا۔ اس حلقے کا وجود ترقی پسندی کا ردِ عمل تھا۔ اس کے میلانات و اکتسابات کو تحریک کی تحویل میں ڈالنا غلط ہوگا۔ غلط فہمی کا منبع دراصل یہ تھا کہ اہلِ حلقہ نے اپنے ادب کو "نیا ادب" کہنا شروع کیا۔ چونکہ ترقی پسند ادب کے ترجمان کا نام بھی "نیا ادب" تھا اس لئے بعض اصحاب کو دھوکہ ہوا۔ میں نے میراجی کے جواب میں ایک مضمون "ادبِ لطیف" میں شائع کرایا تھا۔ اس میں "نیا ادب" اور "ترقی پسند ادب" کا فرق واضح کیا تھا۔ اس سے انکار کرنا درست نہ ہوگا کہ ترقی پسندوں سے ابتدا میں بعض غلطیاں ہوئیں۔ لیکن ان کا اندرونی احتساب اتنا سخت تھا کہ وہ بہت جلد اس جال سے نکل آئے۔ ترقی پسند حلقوں کی عام نشستوں میں جو کلام یا افسانہ سنایا جاتا تھا اس پر سختی سے بے رو رعایت تنقید ہوتی تھی۔ اس سے باشعور قلمکار مستفید ہوتے تھے۔

تیسرا پہلو اس تصنیف میں جو دبا دبا سا نظر آیا وہ یہ تھا کہ تحریک ابتدا ہی سے ایک مشترکہ پلیٹ فارم تھی۔ اس پر تنظیمی اعتبار سے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے ثقافتی بازو کا قبضہ ضرور تھا لیکن تخلیقی ادیب کئی سیاسی ٹولیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ساغر نظامی، حیات اللہ انصاری، علی عباس حسینی، اعجاز حسین، فراق گورکھپوری یا راقم الحروف وغیرہ کا تعلق پارٹی سے نہ تھا۔ ابتدا میں پارٹی خود متحدہ محاذ کی قائل تھی۔ اور سجاد ظہیر، پی سی جوشی، ڈاکٹر اشرف، محمود الظفر وغیرہ کانگریس اور کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے اراکین تھے۔ اس صورت حال میں سیاسی خطوطِ فاصل نمایاں نہیں ہوتے تھے۔ بعد میں ۱۹۴۲ء کے آس پاس راہیں الگ ہونے لگیں اور بھیمڑی کانفرنس نے بچے کھچے امکانی اتحاد کو بھی ختم کر دیا۔ ترقی پسندی کے احیاءِ ثانی کے بعد صورتِ حال بدلی، لیکن اس سے پہلے تحریک کے سیاسی دندانے گھس چکے تھے۔ ان حالات میں نہ ہر اچھائی کو اشتمالی کہہ کر موردِ طعن بنایا جا سکتا ہے اور نہ ہر برائی کو کمیونسٹ انٹرنیشنل کی ۲۰ویں کانگریس کے بعد خود اشتمالیت نے جرأت مندانہ خود احتسابی سے کام لینا شروع کیا اور بہت سے حد بندیاں توڑ دیں۔ مخدوم اور سردار جعفری وغیرہ کے یہاں جو نئی آواز پچھلے چند برسوں میں ابھری۔ وہ اسی احتسابی شکست کا نتیجہ ہے، لیکن اس کی طرف توجہ نہیں کی گئی ہے۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ ترقی پسندی نے اردو شاعری کو چند محدود مضامین کی کال کوٹھری سے باہر نکالا۔ ادبی صداقت اور حقیقت پسندی کا ایک نیا مفہوم دیا، سماجی معنویت دی، اجتماعی دکھ درد کو اپنانے کا حوصلہ دیا، جذباتِ مجہول کی جگہ فعال احساسات دیئے، مضامین اور موضوعات کا حیرت انگیز تنوع دیا۔ محبت کو ذاتی رکھتے ہوئے بھی اجتماعی حیثیت کا جزو بنائے رکھنے کے لئے جدوجہد کی، تقدیر پرستی اور اوہام پرستی کے چکر سے باہر نکالا۔ افسانوی ادب کی تو دنیا ہی بدل ڈالی۔ یہاں بھی بندھے ٹکے اصولوں اور مثلثوں سے نجات دلوائی۔ دراصل افسانوں ہی پر فحش نگاری کا الزام لگایا گیا اور بعض اوقات حدود سے واقعتہً تجاوز ہوا لیکن نمائش اور مصنوعی زہد کے جتنے نقاب افراد اور جماعتوں نے ڈال رکھے تھے وہ سب نوچ ڈالے گئے۔ افراد اور اجتماعی تحریکوں کے باہمی رشتے ابھار دیے گئے۔ کیا ان باتوں کو بھول جانا آسان ہے؟ تصنیف میں یہ پہلو بھی تشنہ سا رہ گیا۔

یہ سب ابتدا ہی میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ترقی پسند تحریک پر یہ پہلی بھرپور کتاب ہے اور اس میں ہر کمی کھٹکتی ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ خلیل الرحمٰن اعظمی ان تمام پہلوؤں کا مکمل جائزہ لینے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کے مختلف مضامین سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔ موجودہ کتاب ترقی پسند ادب کی تنقید تو کرتی ہے لیکن کہیں پر بھی یہ احساس نہیں ہونے پاتا کہ مصنف کا رویہ مخاصمانہ یا معاندانہ ہے۔ اعظمی نے تحریک کے اکتسابات کا جائزہ لینے میں حتی الامکان غیر جانبدارانہ رویہ اپنایا ہے۔ ترقی پسند ادب کے کارناموں اور انفرادی طور پر شاعروں اور ادیبوں کے اکتسابات پر ژرف نگاہی اور ناقدانہ بصیرت و دیانت کے ساتھ اظہارِ رائے کیا ہے۔ انہوں نے صرف شاعری ہی کے مجموعے پر نظر نہیں ڈالی ہے، بلکہ افسانہ، ناول، ڈرامہ، تنقید، سب کو اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا ہے۔ تنقیدیں بے لوث ہیں اور ستھرے ذوق، جمالیاتی احساس اور عصری میلانات کے گہرے تجزیئے کا پتہ دیتی ہیں۔ انہوں نے خصوصیت سے اس دور کے اہم شاعروں اور ادیبوں پر علیحدہ علیحدہ بھی اظہارِ رائے کیا ہے اور رجحانات کے ذیل میں بھی جا بجا ان کا ذکر آ گیا ہے۔ یہ سب خوش سلیقگی، توازن، اور ایجاز کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اور اس کامیاب کوشش پر خلیل الرحمٰن اعظمی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ترقی پسندی کی بعض بے راہ رویوں کا بیان کچھ ضرورت سے زیادہ طویل ہوگیا ہے، اس لئے اور بھی کہ جس خامی کو فرد یا تحریک خود تسلیم کرلے اُسے کم از کم اُس توبہ کا درجہ تو ملنا ہی چاہئے جو مذہب نے گناہانِ صغیرہ کے معاملے میں روا رکھا ہے۔ مثلاً وہ خطیبانہ اور متشدّدانہ انداز جو ابتدا میں بعض شعراء کے یہاں نظر آتا ہے، ایک مخصوص وقت میں مخصوص ذہنی اور جماعتی محرکات کا آئینہ دار تھا۔ اسے خود انہی شعرا نے عملی اور نظریاتی اعتبار سے رد کردیا ہے۔ اس لئے اس کو ایک مکمل بہ ارتقا تحریک کے سر تھوپ دینا اس لئے محلِ نظر ہے کہ تاریخ کے ارتقائی عمل میں اس کی حیثیت پلک کی جھپک سے زیادہ نہیں ہے۔

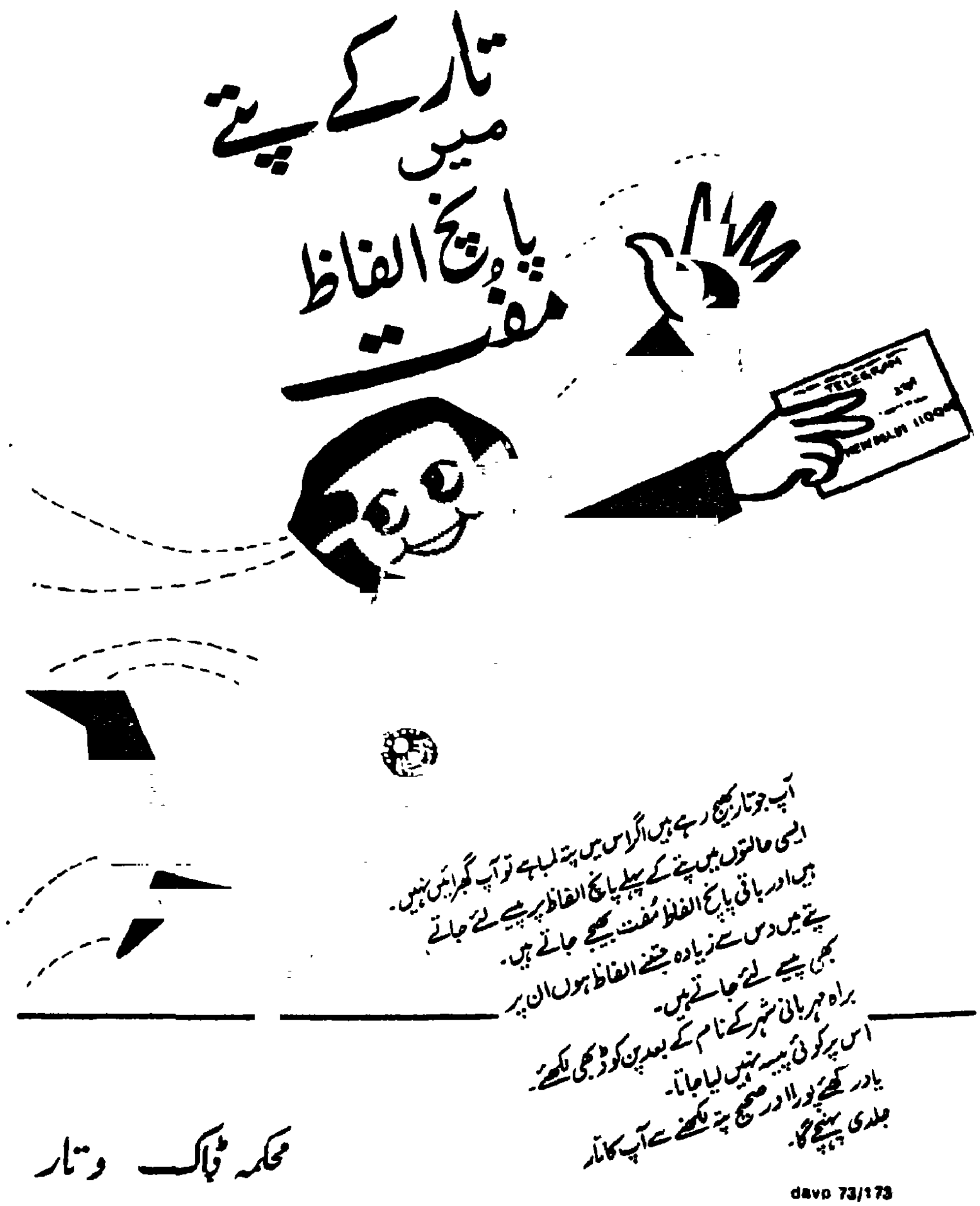
خلیل الرحمٰن اعظمی نے جوشؔ، ساغرؔ، اور روشؔ کو ترقی پسندوں کی صف میں اس لئے شامل نہیں کیا کہ وہ اس کے پہلے قوم پروری کی روایت کی آغوش میں پلے تھے۔ یہی حال پریم چند اور ان کے ساتھیوں یعنی سدرشن، علی عباس حسینی، اعظم کریوی اور سہیل عظیم آبادی کا ہے۔ یہ حضرات قومی روایت اور ترقی پسند روایت کے درمیان پل کی ہی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ یہ وہ افراد ہیں جن کی مساعی سے بہت سی راہیں نکلی ہیں اور بہت سے ترقی پسند طرزِ اظہار وغیرہ کے اعتبار سے ان کی روایتوں کو لے کر آگے بڑھے ہیں۔ خود ان فعال فن کاروں نے ترقی پسندی کے بعض رجحانات کو اپنایا ہے۔ اعظمی نے ان امور کی طرف اشارے کئے ہیں۔ لیکن میرے خیال میں یہ پہلو بھی کچھ تشنہ رہ گیا ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی نے اُن اندرونی تضادات پر بھی تفصیلی بحث نہیں کی ہے جو خود اس تحریک کے بطن سے نکلے اور جن کی تحریک و تشویق پر ترقی پسندی نے اپنے اکتسابات و مرسومات کا مخلصانہ جائزہ لینا شروع کیا۔ یہ سلسلہ ۱۹۴۸ء سے شروع ہوچکا تھا۔ کچھ انفرادی انحرافات پہلے بھی مل جائیں گے۔

پروفیسر احتشام حسین کی تنقید کے بارے میں خلیل کے بعض بنیادی اشارات سے اتفاقِ رائے رکھتے ہوئے بھی میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ یہ تنقید تفریط کا شکار ہوگئی ہے۔ احتشام کے اس مقولے سے تو خلیل الرحمٰن بھی متفق ہیں کہ مواد اور ہیئت کے میل ہی سے خوبصورت ادبی مرقعے تیار ہوسکتے ہیں لیکن اس کے بعد خلیل مواد کی تعریف میں اُلجھ گئے۔ اور انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ تخلیقی ادب میں ادیب کا ذہنی اور حسّی تجربہ ہی مواد ہے، جبکہ غیر تخلیقی ادب میں موضوع کو مواد کہا جاسکتا ہے۔ کیا دونوں کے نقطہ ہائے نظر میں بہت کم فرق نہیں ہے؟ احتشام تین عناصر کو مانتے ہیں (۱) مواد (۲) ہیئت اور (۳) ان دونوں کا میل یا امتزاج۔ اس امتزاج کی بنیاد شاعر یا ادیب کے ذہنی یا حسّی تجربے پر ہے۔ وہ اس امتزاج سے کیسے عہدہ برآ ہوتا ہے، اسی پر اس کے تخلیقی کردار کا دارومدار ہے۔ اگر ایسا ہے تو بحث صرف لفظی رہ جاتی ہے۔

رہا یہ امر کہ احتشام نے ادب پاروں کی پرکھ زیادہ تر تاریخی حوالے کے پس منظر میں کی ہے جس سے فنی اور تخلیقی عمل کے دوسرے پہلو جا بجا دب گئے ہیں اس کا احساس ہونا لازمی ہے۔ فکری تنقید میں افراد کا مرتبہ دب جاتا ہے اور فنی تنقید میں اُبھر آتا ہے اس سے فکری تنقید کا مرتبہ گھٹنے نہیں پاتا۔ بعض اوقات ایسی صورت پیدا ہوجاتی ہے، کہ ہم عہد افراد کے یہاں انفرادی رجحانات و خصوصیات کی تلاش اور نشاندہی نہ صرف مشکل بلکہ گمراہ کن بھی ہوجاتی ہے۔ بعد میں مخدوم اور سردار کے یہاں لہجے کا جو فرق نمایاں ہوگیا وہ ابتدائے سفر میں اتنا نمایاں بھی نہ تھا۔ احتشام نے ان لوگوں کے بارے میں اس وقت لکھا جب اُن کا لہجہ اور اسلوب تشکیل و تعمیر کی ارتقائی منزلوں سے گزر رہا تھا اور اس میں وہ ٹھہراؤ پیدا نہیں ہوا تھا۔ جو بعد میں نظر آیا۔ ان حالات میں احتشام کا فکری عناصر پر زیادہ زور دینا، ایک سوچا سمجھا منصوبہ بھی ہوسکتا ہے۔ اگر بین السطور میں پڑھا جائے تو ویسے لفظوں میں احتشام نے بعض انفرادی خصوصیات کا بھی کبھی کبھی اظہار کیا ہے لیکن جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے یہ پہلو کچھ دب سا گیا ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی کی تنقید جمالیاتی اقدار کی حامل ہے۔ اُن کے طرزِ گفتار میں سادگی اور پُرکاری ہے اور تحقیق کے معاملے میں وہ تلاش، جستجو، تجزیہ کسی سے پہلو تہی نہیں کرتے۔ ان کی موجودہ تصنیف ہمارے تنقیدی ادب میں ایک گراں قدر اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ انہوں نے حقائق کے چہرے سے بہت سا گرد و غبار صاف کردیا ہے اور بہت ہی مفید مواد یکجا کردیا ہے۔ انجمن ترقی اردو نے یہ کتاب شائع کرکے ہماری ادبی تاریخ کی ایک اہم کڑی پر جامع اور قابلِ اعتماد مواد ہم تک پہنچا دیا ہے۔ اس دور کے بارے میں مدتوں تک یہ کتاب مشعلِ راہ مانی جائے گی۔


تار کے پتے میں
پانچ الفاظ مفت
آپ جو تار بھیج رہے ہیں اگر اس میں پتہ لمبا ہے تو آپ گھبرائیں نہیں۔
ایسی حالتوں میں پتے کے پہلے پانچ الفاظ پر پیسے لئے جاتے
ہیں اور باقی پانچ الفاظ مفت بھیجے جاتے ہیں۔
پتے میں دس سے زیادہ جتنے الفاظ ہوں ان پر
بھی پیسے لئے جاتے ہیں۔
براہ مہربانی شہر کے نام کے بعد پن کوڈ بھی لکھئے۔
اس پر کوئی پیسہ نہیں لیا جاتا۔
یاد رکھئے پورا اور صحیح پتہ لکھنے سے آپ کا تار
جلدی پہنچے گا۔
محکمہ ڈاک و تار
davp 73/173



معزز مہمان

نیپال کے مہاراجہ اور مہارانی ۳ ستمبر ۱۹۷۰ء کو الجزائر جاتے ہوئے تھوڑی دیر کے لئے دہلی کے ہوائی اڈے پر رُکے۔ ہوائی اڈے پر وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی اور نائب صدر جمہوریہ شری جی ایس پاٹھک نے شاہی مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔



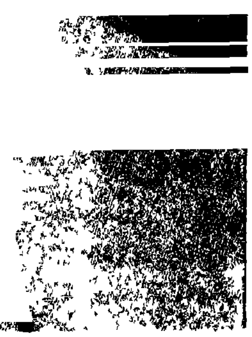
ایک ہیروین

۲۰-۲۱ اگست کی رات کو مدھیہ پردیش کا موضع مالا کھیڑی سیلاب سے گھر چکا تھا۔ تجربہ کار ملاح طغیانی میں آئے دریا میں کشتی ڈالنے پر آمادہ نہ تھے لیکن ایک ماہی گیر کی لڑکی سرسوتی بائی نے جان پر کھیل کر کشتی دریا میں ڈال دی اور سیلاب میں گھرے ایک سو پچاس لوگوں کو نکال کر حفاظت کے مقام تک پہنچا دیا۔ پردیش سرکار نے سرسوتی بائی کو پانچ سو روپے کا انعام دیا۔

REGD. NO. D 509

جواہرلال نہرو

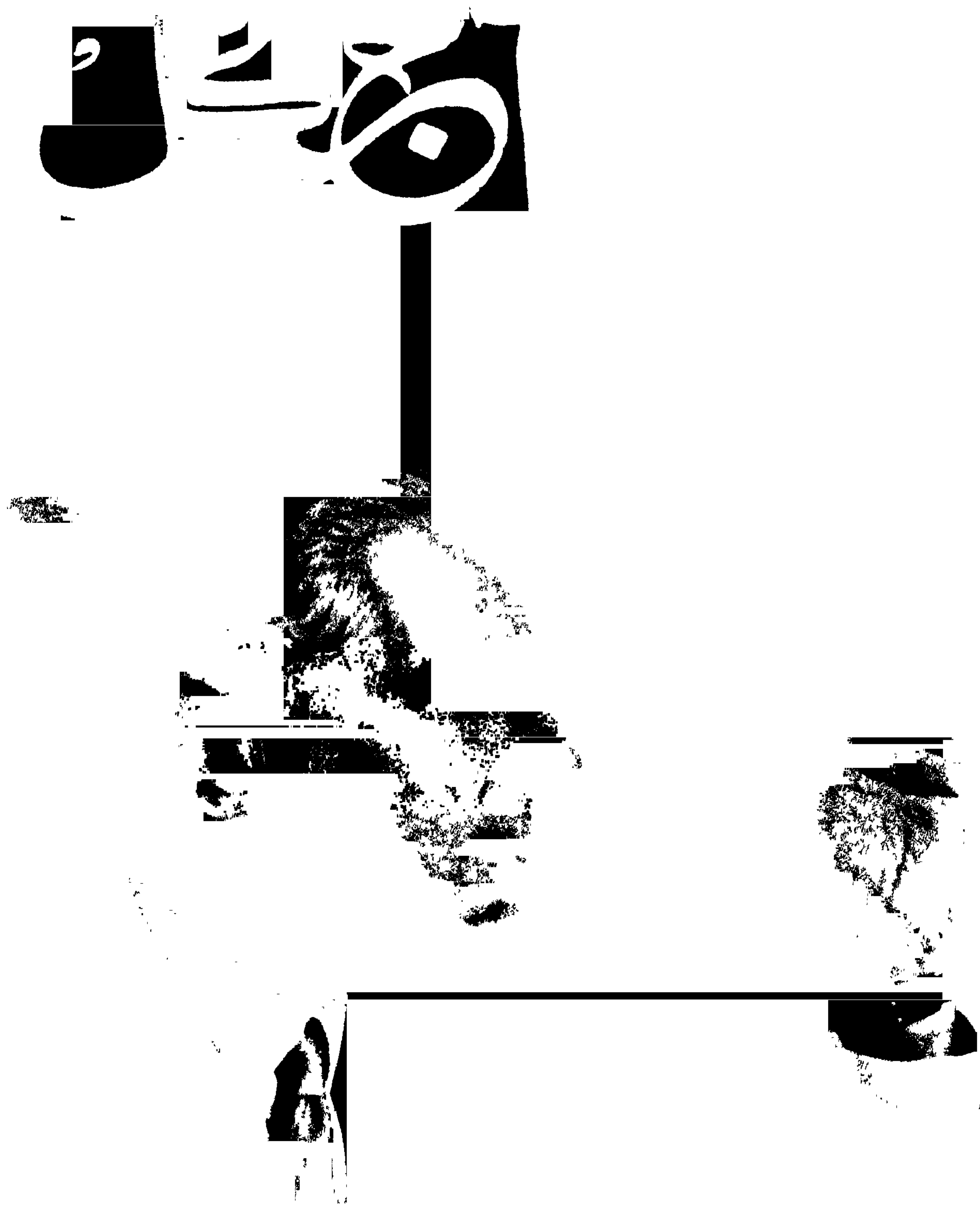
(۱۴ر نومبر ۱۸۸۹ء
۲۷ر مئی ۱۹۶۴ء)



ہزار رنگ ملے، اک سبو کی گردش میں
ہزار پیرہن آئے گئے، زمانے میں
مگر وہ صندل وگل کا غبارِ مشتِ بہار
ہوا ہے وادیٔ جنت نشاں میں آوارہ
ازل کے ہاتھ سے چھوٹا ہوا حیات کا تیر
وہ شش جہت کا اسیر
نکل گیا ہے! بہت دور جستجو بن کر

مخدوم محی الدین

NOVEMBER 1973 AJKAL (MONTHLY) VOL, 32 No. 4
Published by the Director, Publications Division, Patiala House NEW DELHI-11001
Printed by Indian Printing works, Rani Jhansi road, NEW DELHI-55
REGD. No. D 509



مرگِ گُل

سلام مچھلی شہری

"مریضہ" جس کا کمرہ میرے کمرے کے مقابل ہے
بہت بیمار ہے لیکن یقیناً صاحبِ دل ہے
امید و شوق کی ڈھالی ہوئی معلوم ہوتی ہے
مگر دیہات کی پالی ہوئی معلوم ہوتی ہے
سویرے نرس آ جائے تو کچھ گھبرانے لگتی ہے
کوئی گر بھول کر بھی دیکھ لے شرمانے لگتی ہے
پئے تیمارداری ایک لڑکا ساتھ رہتا ہے
"مریضہ" کے دلِ نازک پہ اس کا ہاتھ رہتا ہے
"مریضہ" چیختی ہے "گھر چلو" راحت نہیں مجھکو
سدا بیمار رہنے کے لئے فرصت نہیں مجھکو

وہی اک نرس کچھ مجھکو بھی گھبرایا ہوا پاکر
مرے گلدان کے پھولوں کو مرجھایا ہوا پاکر
یہی کہتی ہے یہ طرزِ جنوں اچھا نہیں ہوتا
فسردہ پھول رکھنے کا شگوں اچھا نہیں ہوتا
مگر میں نرس سے جب پوچھتا ہوں زندگی کیا ہے؟
تو وہ خود پوچھتی ہے میرے لب پر یہ ہنسی کیا ہے!
سدا سے ایک ضدی طفلکِ خوابِ بہاراں ہوں
اجل سے لڑ بھی سکتا ہوں کہ اک پُر نور انساں ہوں
سبھی کچھ بھول کر بس اس "مریضہ" کا ہے غم مجھکو
نظر آتے ہیں اس میں شعلۂ شبنم بہم مجھکو

"مقدس نرس" آج آئی تو افسردہ ترین آئی
بہت کہنے پہ جب وہ میرے بستر کے قریں آئی
تو یہ بولی "مریضہ" واقعی پھولوں کی پالی تھی
"بوقتِ نزع" بھی وہ منچلے خوابوں کی ڈھالی تھی
مثالِ ماہیٔ بے آب چپ رہ کر بھی مضطر تھا
وہی معصوم لڑکا "اُس مریضہ" کا منگیتر تھا

میں شاید توڑ ہی دوں خوابِ رقصندہ کے جھولوں کو
نہ رکھ پاؤں گا اب گلدان میں شاداب پھولوں کو



سلامِ آخر

۱۹ نومبر ۱۹۷۳ء کو جبکہ پرچہ پریس میں جا رہا تھا، اچانک خبر ملی کہ سلام مچھلی شہری کا انتقال ہو گیا۔ مرحوم کے جگر کا آپریشن ہوا تھا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔ ابھی چند ماہ قبل وہ ولنگڈن ہسپتال میں داخل تھے تو ایک مریضہ کی وفات پر انہوں نے ایک نظم لکھی تھی جو اسی صفحہ پر درج ہے۔ یہ "صاحبِ دل" یہ "ضدی طفلکِ خوابِ بہاراں" یہ "پُر نور انسان" اجل سے لڑا اور خوب لڑا مگر اس لڑائی کا انجام ایک ہی ہوتا ہے۔

سلام پیدائشی شاعر اور نغمہ نگار تھے۔ پُرخلوص، نیک، دنیا کے چھل بل سے ناواقف، خوشی اور خفگی کا برملا اظہار کرنے والے۔ اُن کا دل ہمیشہ دوسروں کے دکھ درد پر بھر آتا تھا۔ وہ ترقی پسند تحریک کے آغاز سے قبل بھی ترقی پسند تھے اور آخر دم تک انسان دوست۔

ادارہ "آج کل" انہیں اپنا سلام آخر پیش کرتے ہوئے اُن کے پس ماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔

ترتیب

سرورق۔ مل۔ جیون اڈلجہ

اُردو کا مقبولِ عام مصوّر ماہنامہ

آجکل
نئی دہلی

ایڈیٹر
مہدی عباس حسینی

ٹیلیفون نمبر:۔ ۳۸۷۰۶۹

سب ایڈیٹر
نند کشور وکرم

جلد ۳۲ — شمارہ ۵
دسمبر ۱۹۷۳ء
اگرہاین پوش تک سمہ ۱۸۹۵

سالانہ چندہ

ایک سال : — (۷) روپے
۲ سال : — (۱۲) روپے
۳ سال : — (۱۷) روپے

شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر آجکل (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی

ترسیلِ زر کا پتہ
بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی

اداریہ

مغربی ایشیا۔ صلح یا جنگ

مغربی ایشیا کی ہر جنگ کا ہندوستان پر براہ راست اثر پڑتا ہے۔ پہلی جنگ کے دوران نہر سوئز بند ہونے کے باعث ہماری درآمد و برآمد متاثر ہوئی اور ہمارے پنج سالہ منصوبے کی کارکردگی پر نمایاں اثر پڑا۔ اب کی بار عربوں نے دو غیر متوقع ہتھیار استعمال کئے۔ ایک تو انہوں نے اسرائیل کے ذریعے یہودی ہوائی جہازوں کا ناطقہ بند کر دیا۔ دوسرے انہوں نے تیل کی پیداوار میں تخفیف کر کے اس کی برآمد پر پابندیاں لگا کر لندن اور پیرس سے لے کر ٹوکیو اور نیویارک تک میں کھلبلی مچا دی۔

ہند میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو یہ سوچا کرتے ہیں کہ ہم کو عربوں سے کیا واسطہ۔ اگر اسرائیل سے دوستی کرنے اور امریکہ کی خوشنودی حاصل کرنے سے ہماری زندگی زیادہ آسائش سے بسر ہو سکتی ہے تو ہم کیوں [illegible] لوگوں کا ساتھ دیا۔

سوال محض وقتی یا آسائش کا نہیں بلکہ اصول و عقائد کا ہے۔ ہندوستان نے آزادی حاصل کرتے ہی اپنی خارجہ پالیسی کی بنا اس عقیدے پر رکھی تھی کہ ہر ملک کے عوام کو آزادی کا حق حاصل ہے اور کسی بیرونی طاقت کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ محض اپنی طاقت کے بل بوتے پر کسی کمزور یا غیر ترقی یافتہ قوم کو اپنی مرضی کا تابع رکھے۔

فلسطین ایک ایسا ملک تھا جہاں مسلم عیسائی اور یہودی امن و چین سے رہتے تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد برطانیہ نے بالفور اعلان نامہ کے ذریعے یہ فیصلہ کیا کہ فلسطین کے علاقے میں ایک ایسی یہودی ریاست قائم کی جائے جو ساری دنیا کے یہودیوں کے لئے مامن و مسکن ثابت ہو سکے۔ چنانچہ فلسطین کے حصے بخرے کر دئے گئے۔ اسرائیل اور اردن کی ریاستیں وجود میں آئیں اور فلسطین کے اصلی باشندے اپنے گھر ہی میں بے گھر ہو گئے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد ایک طرف تو اسرائیل میں ساری دنیا سے یہودیوں کو لا کر بسایا گیا اور انہیں ہر طرح کی فوجی و مادی وسائل مہیا کئے گئے، دوسری طرف مصر میں نجیب و ناصر نے جو عرب قوم پرستی کی تحریک چلائی تھی اس کا سر کچلنے کے لئے انگلینڈ، فرانس اور اسرائیل نے مل کر مصر پر حملہ بول دیا۔ اس وقت روس نے عربوں کی مکمل حمایت کا اعلان کیا اور چونکہ امریکہ روس سے الجھنا نہیں چاہتا تھا لہذا اس نے انگلینڈ فرانس اور اسرائیل پر زور ڈال کر اس جنگ کو ٹھنڈا کیا۔

۱۹۶۷ میں ایک بار پھر اسرائیل کی فضائی فوج نے مصر کے ہوائی اڈوں پر اچانک حملہ بول دیا اور اس کی فضائی طاقت کو تباہ کر دیا۔ اس کے بعد اس نے ایک ہفتے کے اندر اندر مصر، اردن اور شام کو شکستِ فاش دیدی اور ان ملکوں کا بڑا علاقہ اپنے قبضے میں کر لیا۔ مصر نے نہر سوئز میں جہاز ڈبو کر اسے بند کر دیا۔

یہ تھا منظر جب اسرائیل جنگ [illegible] اس پس منظر میں کیا ہندوستان یا کسی بھی جمہوریت پسند اور منصفانہ ملک کا سوائے اس کے کوئی اور طریق کار ہے کہ وہ عربوں کی مکمل حمایت کرے۔

یہ شمارہ

سجاد ظہیر نمبر حاضر خدمت ہے۔ اس میں ملک راج آنند، پروفیسر اعجاز حسین، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، ظ۔ انصاری، ساغر نظامی، مجروح سلطانپوری، اجمل اجملی، پریم وار برٹنی وغیرہم نے سجاد ظہیر کی دل موہ لینے والی شخصیت کے نقوش ابھارے ہیں اور ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر قمر رئیس اور ڈاکٹر شارب ردولوی نے ان کی ادبی خدمات کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔

خواجہ احمد عباس نے بجا طور پر اس نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ بنّے بھائی کی "شانِ محبوبی" کا راز یہ تھا کہ ان میں وہ تمام صفات موجود تھیں جو ہندوستانی سماج میں ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی ہیں یعنی خلوص، تیاگ، لگن اور اہنسا (یہاں اہنسا سے مراد عدم تشدد نہیں بلکہ دوسروں کو دکھ دینے کی جگہ خود دکھ سہنے کی صلاحیت کی طرف اشارہ ہے) جہاں تک ترقی پسند تحریک کی ترویج و تبلیغ کا تعلق ہے، جناب ساغر نظامی نے سجاد ظہیر کا ذکر حالی کے ساتھ اور ڈاکٹر محمد حسن نے سرسید کے ساتھ کیا ہے۔ سجاد ظہیر نے اس تحریک کو پروان چڑھانے میں نہ صرف عدیم المثال تنظیمی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا بلکہ ترقی پسند افسانہ، ناول، ڈرامہ اور تنقید لکھ کر وہ راہیں نکالیں جن کو آگے چل کر کرشن چندر، بیدی، منٹو، عباس اور احتشام حسین نے نکھارا، سنوارا اور منور کیا۔ وہ تنقیدی اور تخلیقی سرگرمیوں سے کبھی بھی کلیتاً بے تعلق نہیں ہوئے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی زندگی میں ادب کو محبت کا درجہ حاصل تھا تو تحریک کو فرض کا اور انہوں نے ہمیشہ اپنی خوشی فرض کے لئے محبت کی قربانی دی۔

ع خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

سجاد ظہیر کی طرح ڈاکٹر تاراچند بھی اتر پردیش کی گنگا جمنی کلچر کا ایک نادر نمونہ تھے۔ وہ نہ صرف ایک سچے استاد اور ایماندار مورخ تھے بلکہ جواہر لال نہرو کی طرح ایک مہذب انسان بھی تھے۔

"آج کل" کا مارچ ۱۹۷۴ء کا شمارہ "ڈاکٹر تاراچند نمبر" ہوگا۔

ساغر نظامی
ڈی۔ نو۔ پنڈارہ روڈ۔ نئی دہلی

وہ خوشبو ہی خوشبو تھا صبا لے گئی اُس کو

سید سجاد ظہیر سے میرے تعلقات کوئی خاص نہیں تھے۔ پر ایسی قربت بھی نہیں تھی۔ مگر ان کی مسکراہٹ نے ہمیشہ ایک ٹکڑے کے لئے مجھے غمِ دوراں سے کاٹ دیا۔

ہر چند سجاد ظہیر نے مولانا حالی کی طرح مقدمۂ شعر و شاعری نہیں لکھا لیکن اردو ادب میں حالی کے بعد ایک نئی تحریک کے بانی سجاد ظہیر اور صرف سجاد ظہیر تھے۔

اس تحریک نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ فرد کی انا کو بیدار کیا۔ دوسرا سب سے بڑا کارنامہ یہ کیا کہ احیاء پرستی کے تصور کو مشتبہ کر دیا اور اس کے مقابلے میں نئی پرستاری قومیت اور بین الاقوامیت کو ابھارا، جو احیاء پرستی کے مقابلے میں تصوراتی نہیں بلکہ حقیقی ہے۔ اتنی حقیقی جیسے ہم سورج کی روشنی کی طرح دیکھ سکتے ہیں، جس کے پیکر کو ہم چھو سکتے ہیں۔

موسمِ بہار میں جو پھول مرجھا کر خاک ہو جاتے ہیں ان کی خوشبو مر جاتی ہے لیکن ہر پھول مٹی کو بیج دے جاتا ہے اور ان بیجوں سے پھر پودے پھوٹتے ہیں۔ سجاد ظہیر بھی ایک پھول تھا جس کی خوشبو نے اردو ادب کے خیابان کو مہکایا اور اپنے بیج بکھیر کر آفاقِ گل میں کھو گیا۔

کیا حادثہ گذرا ہے خدارا یہ نہ پوچھو — جو خوشبو ہی خوشبو تھا صبا لے گئی اُس کو
چڑیوں کی چہک جس سے چمن گونج رہا تھا — سُورج کی کرن آ کے اُٹھا لے گئی اُس کو
دیکھو تو کوئی اُس گلِ رعنا کی نزاکت — اک سانس کے پنکھوں پہ صبا لے گئی اُس کو
اِس خواب کی وادی میں اسے کون جگاتا — خود بادِ ابد آ کے جگا لے گئی اُس کو
ہو دوسری دنیا میں بھی اک نغمۂ سرجوش — یہ آرزوئے جشنِ نوا لے گئی اُس کو
شاید کسی سیارے میں مل جائے محبت — یہ جستجوئے جنسِ وفا لے گئی اُس کو
کشتی مری گویا فقط اک شندرۂ خس تھی — اک موج اٹھی اور بہا لے گئی اُس کو
خوشبو کی یہ اک جوئے رواں خاک پہ کیوں ہے — آخر ابدیت کی صبا لے گئی اُس کو
تھیں اس پہ بقا اور فنا دونوں ہی عاشق — آپس کی کشاکش میں فنا لے گئی اُس کو

تعظیم کو اک گنجِ شہیدانِ وفا تھا
جب خاکِ شہیدانِ وفا لے گئی اُس کو

ملک راج آنند
۲۵ کف پیریڈ، بمبئی

سجاد ظہیر - چند یادیں



سجاد ظہیر اور ملک راج آنند ایک جلسے میں

ہائڈ پارک، لندن۔ اتوار، سہ پہر، چوتھے دہے کا ابتدائی حصہ۔ نیو کالج آکسفورڈ کا فیشن ایبل مفلر زیب گلو، اسمارٹ نیوی بلیو سرج سوٹ زیب بدن۔ پیلے چہرے پر جوش و خروش کے آثار۔ ہاتھ ہلا ہلا کر "بھارت" اخبار بیچتا ہوا نوجوان۔ ہائڈ پارک کے وسیع میدان میں جلسہ۔ برطانوی پارلیمنٹ کے پہلے کمیونسٹ ممبر شاپورجی سکلت والا کی تقریر۔ مجمع کے کنارے پر اخبار بیچنے والے اس نوجوان نے ایک نرم مسکراہٹ کے ساتھ مجھے ایک کاپی پیش کی۔ میں نے کاپی اس کے ہاتھ سے جھپٹ لی۔ اور اس کی قیمت ایک شلنگ ادا کر دی۔

"آپ ملک راج آنند ہیں نا"؟ اس نے لکھنؤ کے میٹھے لہجے میں پوچھا۔

"اور آپ"؟ میں نے پوچھا۔

"میں سجاد ظہیر ہوں" اس نے جواب دیا "میں نے کل آپ کو کرشنا مینن کی انڈیا لیگ کے دفتر میں دیکھا تھا"

ہم دونوں نے ہاتھ ملایا۔

اس وقت تک میں بیشتر ہندوستانی طالب علموں کا "خلیفہ" بن چکا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ فلسفہ میں تحقیقات ختم کرنے کے بعد میں لندن میں "لکھاری" اور ناول لکھنے لگا۔ چنانچہ مجھے علمی اور سیاسی معاملات میں تجربہ کار اور سینیئر سمجھا جاتا تھا۔ میں نے سجاد ظہیر کو چائے پینے کی دعوت دی۔ سکلت والا کی پاٹ دار آواز ہائڈ پارک میں اس زور سے گونج رہی تھی کہ پارک کے دوسرے کونوں پر مجتمع مقرروں کی تقریریں سننا مشکل ہو رہا تھا۔ مگر ہم بخوبی جانتے تھے کہ وہ "سیک" کیا بولے گا۔ اور جب ہمارا اندازہ صحیح ثابت ہونے لگا تو ہم ماربل آرچ کے قریب ایکسپریس ڈیری کی طرف روانہ ہو گئے۔

اس سے قبل میں یہ سن چکا تھا کہ سجاد ظہیر نے ایک افسانوں کا مجموعہ "انگارے" کے نام سے شائع کیا ہے، جس نے شمالی ہند کے اردو حلقوں میں کھلبلی مچا رکھی ہے۔ چنانچہ میں نے سجاد ظہیر سے اس کتاب کی ایک کاپی پڑھنے کو مانگی۔

"مجھے آپ سے اور "انگارے" کے دوسرے لکھنے والوں سے ملنے کی بڑی خواہش تھی" میں نے کہا۔

"ادھر ہم لوگ آپکا ناول "اچھوت" پڑھ چکے ہیں آجکل "آکسفورڈ مجلس" کے ممبر ہمہ وقت اسی ناول کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ کیوں نہ ہم لوگ مصنفوں کی ایک انجمن بنائیں، ترقی پسند مصنفوں کی" اس نے کہا۔

"سجاد ظہیر صاحب" میں نے کہا "آپکے اور میرے خیالات ایک ہی پٹری پر دوڑ رہے ہیں۔ مگر ہمارے بیشتر احباب کو یا تو خود اپنی ذات میں دلچسپی ہے۔ یا کرشنا مینن کے خلاف سازشیں کرتے ہیں۔ ہر ہندوستانی ذی شعور خاص طور پر لندن میں محض دوسرے ہندوستانی ذی شعور کو چھوٹا ثابت کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ کیا ان کو ایک انجمن میں مجتمع کرنا ممکن ہے"؟

"اردو مصنفین کو جمع کرنے کا ذمہ میرا ہے۔ اور جناب، مجھے لوگ "بنے" پکارتے ہیں۔ یہی میری عرفیت ہے"

"بنے" میں نے کہا "مجھے ہر ایک "ملک" پکارتا ہے"

سجاد ظہیر عرف بنے سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ بعد میں میں انھیں "بنے بھائی" پکارنے لگا۔ میرا دل انکی طرف یوں بھی مائل تھا کہ میں ابھی تک یو پی کے کسی بھی ہم عمر اردو مصنف سے نہیں ملا تھا۔ اگرچہ میں لاہور میں اقبال سے واقف تھا۔ اور ویسٹ اینڈ لندن میں سر عبدالقادر کے مکان پر تاثیر اور دیگر کئی پنجابی مصنفین اردو سے مل چکا تھا۔ بلکہ پچھلے سال تو میں خاص طور پر یو پی جا کر پریم چند سے بھی مل آیا تھا۔ بہرحال میں سجاد ظہیر کے دلا ویز

انداز اس کے جسم کی مدھم حرکات اور اس کے نرم چہرے سے ترشح بے ساختہ گرمجوشی سے بہت متاثر ہوا۔ پھر اس بات نے بھی مجھے متاثر کیا کہ یہ ناز و نعم میں پلا ہوا آکسفورڈ کا طالب علم خاص طور پر سکلٹ والا کی تقریر سننے آیا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ہند کے بورژوا خاندانوں کے بہتیرے لڑکے آکسفورڈ یونیورسٹی کے اکتوبر کلب کے ممبر بن چکے تھے جہاں ایک بار مجھے بھی تقریر کرنے کیلئے بلایا گیا تھا۔

دوسری بار جب بتے سے میری ملاقات ہوئی تو وہ پیرس سے واپس آچکے تھے جہاں وہ سوربون یونیورسٹی میں چند دوستوں سے ملنے گئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جے۔ سی گھوش جو آکسفورڈ میں انگریزی ادب کے لکچرار تھے، اور بتے، دونوں ساتھ ہی ساتھ بلومس بری میں واقع میرے کمرے میں آئے اور طے پایا کہ ہم مصنفوں کی جو انجمن بنانے والے تھے میں اس کیلئے ایک مینی فیسٹو تیار کردوں۔ بتے نے تاثیر سے بھی میرے یہاں آنے کو کہہ رکھا تھا اور تھوڑی دیر بعد کسی نے بڑے زور سے میرے دروازے کو کھٹکھٹایا۔ میں نے دروازہ کھولا تو لاہور کا یہ فربہ پُر رعب ہم وطن میرے کمرے میں داخل ہوا۔

"اچھا تو یہ ہے بلومس بری" تاثیر نے آتے کے ساتھ ہی کہا۔

بات یہ تھی کہ میرے کمرے میں کوئی پلنگ تو تھا نہیں۔ میں نے ہندوستانی طرز معاشرت کے مطابق بستر کو فرش پر لگا دیا تھا۔ اور اسے پھلکاری کے پلنگ پوش سے ڈھک دیا تھا۔ جب میں پچھلی بار ہند گیا تھا تو میری ماں نے اپنے مختصر اثاثے میں سے جسے اس نے سنبھال کر رکھا تھا مجھے یہ پلنگ پوش عنایت کیا تھا۔

میں اپنے چھولے سے باورچی خانے میں چائے بنانے لگا۔ غریبوں کے بارے میں گورنمنٹ کالج لاہور کے اس خاص انداز کے مظاہرے سے مجھے پسینہ چھوٹنے لگا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ ایک بار میں گورنمنٹ کالج لاہور اور خالصہ کالج امرتسر کے درمیان ایک کرکٹ میچ دیکھنے گیا تھا۔ میرے پاس کوئی پتلون نہیں تھا۔ ماں نے میرے والد کے ایک پرانے پتلون کو کانٹ چھانٹ کر میرے سائز کا بنا دیا تھا۔ اور میں یہ پتلون پہن کر شرم سے گڑا جا رہا تھا۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے بیشتر لڑکے، دولت مند خوشحال گھرانوں کے چشم و چراغ تھے لہٰذا وہ کالج کے بلیزر اور خاکی فلالین کے پینٹ پہنتے تھے جن کی سلائی مال روڈ کے نیکن اینڈ کو کے یہاں ہوتی تھی۔ ادھر میرا یہ حال کہ اس عالیشان دکان کو دیکھ کر ہی مجھ پر وہ رعب پڑتا تھا جس سے میں کبھی چھٹکارا نہ پا سکا۔ گورنمنٹ کالج کے متعدد لڑکوں کے پاس موٹر سائیکلیں تھیں اور وہاں کے پروفیسر اے ایس بخاری کا تو کیا کہنا۔ وہ ایک نفیس سوٹ میں ملبوس، بو ٹائی لگائے گھومتے تھے۔ امرتسر میں میرے مخلص پروفیسر کے۔ ایل سبھاٹیا نے مجھ سے کہہ رکھا تھا کہ "کبھی مصنف ہو تو ایسا ہو" اور مجھ پر اس بات کا یہ اثر پڑا تھا کہ میں نے ماں سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اب میں سبزی لینے نہیں جایا کرونگا۔ پھر میں نے ضد کی تھی کہ بڑے بھائی کا ایک ہاکی بلیزر کاٹ کر میرے سائز کا بنا دیا جائے۔ پہلے میں کبھی کبھار اپنے رشتہ داروں کی دکانوں پر خوش گپیوں کیلئے چلا جایا کرتا تھا۔ لیکن وہ لوگ تانبے کے برتن بنایا کرتے تھے اس لئے میں نے انکے یہاں آنا جانا بھی ترک کر دیا۔ اب میں سید حسین اور ترلوچن سنگھ کے ساتھ جو کالج میں مجھ سے سینیئر طلباء تھے، امرتسر ریلوے اسٹیشن جاتا تھا۔ اور انگلش اسٹائل کے فرسٹ کلاس ڈائننگ روم میں چائے پیتا تھا۔ قصہ مختصر میں سارے "دھوتی بند" لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگا تھا۔ اور میں نے اردو فارسی شاعری سے منہ موڑ کر ساری توجہ انگریزی ادب پر مرکوز کر دی تھی۔

لیکن ایک دن جب میری ماں بیمار پڑی اور اس نے مجھ سے ڈاکٹر بلانے کو کہا تو ایکدم میری نگاہ سے سارے پردے ہٹ گئے اور مجھے احساس ہوا کہ وہ چاہے کتنی بھی جاہل کیوں نہ ہو لیکن بہرحال میری ماں ہے۔ ہم دونوں کو ایک ہی دھرتی نے جنم دیا ہے اور دنیا کی کوئی طاقت مجھے ہندوستانی سے انگریز نہیں بنا سکتی۔ پاؤڈر اور پینٹ بھی نہیں۔ پھر جب میں انگلینڈ آیا تو مجھے اور میرے دو ہندوستانی ساتھیوں کو تین انگریز طالب علموں نے خوب مارا پیٹا۔ کیونکہ ہم ہندوستانی انگریز کان کنوں کی ہڑتال کی موافقت کر رہے تھے جو کوک نے کرائی تھی۔ اور انگریز طالب علم اسکے خلاف تھے۔ پھر میں نے یونیورسٹی کالج لندن کا بلیزر پہننا ترک کر دیا۔ کارڈرائے کا سوٹ بنوا لیا، اپنے بال لمبے چھوڑ دیئے۔ اپنا کھانا خود پکانے لگا۔ اور برطانوی ادبی رسالوں میں مضامین اور تبصرے لکھ لکھ کر روکھی سوکھی کھا کے گذارہ کرنے لگا۔

تو بتے کا آکسفورڈ یونیورسٹی کا بلیزر مجھے برا نہیں لگا۔ کیونکہ وہ بھی کثرت استعمال سے گھس چکا تھا۔ لیکن تاثیر کا بانڈ اسٹریٹ کا سلا بھورا سوٹ اور فیشن ایبل جوتے مجھے کھل گئے۔ ڈاکٹر گھوش کا گنجا سر اور پرانا سوٹ بھی میرے مزاج کے مطابق تھا۔ جب میں چائے دم دے رہا تھا تو تاثیر کی آواز گونجی۔

"کیا کچھ کیک بھی ملے گا"؟

"صرف خستہ بسکٹ" میں نے جواب دیا۔ اور ایک نہایت دلفریب لکڑی کے ٹرے میں جس پر چینی کام کی پالش تھی چائے کا سامان لے آیا۔ یہ ٹرے میں نے کیلے "ڈونین اسٹریٹ کی صنعت کی دکانوں" سے پانچ شلنگ میں خریدا تھا۔

"ماننا پڑے گا کہ اسکا ذوق صحیح ہے" ڈاکٹر گھوش بولے۔ "بھئی تمہیں یہ کانگڑہ نقاشی کی چھوٹی چھوٹی تصویریں کہاں سے ملیں"؟

"بس مل گئیں" میں نے کہا۔ "مجھے سیر و شکار سے متعلق جو موٹی موٹی کتابیں تبصرے کیلئے ملتی ہیں۔ میں انھیں بیچ دیتا ہوں۔ اور قدیم نوادر کی دکانوں سے ہندوستانی کاریگری کے کچھ بچے کھچے نمونے خرید لیتا ہوں۔ کیونکہ دراصل میں ہندوستان

کی بازیافت میں مشغول ہوں۔"

"اور میں ہمارے مینی فیسٹو کا مرکزی خیال ہوگا۔ ہند کی بازیافت۔ ہندوستانی کلچر کی بازیافت۔" سجاد ظہیر نے اپنی مدھم آواز اور نرم لہجے میں کہا۔

"بازیافت اصلاح اور تجدید میں لے کیا۔" ابنیندرناتھ ٹیگور کے شاگرد چغتائی کی طرح کا احیاء کافی نہیں۔ ہم کو ادب اور مصوری دونوں میں احیاء پرستی سے بچنا چاہیئے۔ ماضی حکایت اس میں نئے رس سے جان ڈالنا عبث ہے۔ ہمیں حال سے سروکار ہے اور اپنے زمانے کے مسائل حل کرنا ہیں۔"

"شاباش۔" ڈاکٹر گھوش نے کہا۔ "میں تم سے بالکل متفق ہوں۔"

"آپ میرے دوست چغتائی میں کیا خرابی ہے؟" تاثیر نے پوچھا۔

"مجھے مصوری کا علم نہیں لیکن وہ احیاء پرست ہے کہ نہیں؟" بنے نے کہا۔

ڈاکٹر گھوش نے احیاء پرست مصوروں کی لمبی لمبی انگلیوں اور بادام جیسی آنکھوں کا مذاق اڑانا شروع کیا۔ میں نے اس کی حمایت میں اپنا نظریہ پیش کیا کہ انیسویں صدی کے آخری دہے اور پہلی جنگ عظیم سے قبل والے بنگالی فن کاروں کو انگریزی مصوری کے "ماقبل رفائیلی" گروپ سے تشبیہہ دی جا سکتی تھی۔ تاثیر چغتائی کی مدافعت میں ڈٹا رہا۔ بحث نے طول پکڑا۔ نوگ چائے کو گویا بھول گئے۔ خستہ بسکٹ کو کسی نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ شام کے نرم دھندلکے کے باوجود کمرے میں تناؤ کی فضا تھی۔ صرف بنے آہستہ آہستہ چائے کی چسکی لگاتے رہے۔

"مینی فیسٹو کے بارے میں کیا خیال ہے؟" بنے نے موقع پا کر پوچھا۔

"تین آدمی مل کر کوئی چیز نہیں لکھ سکتے۔ ہم میں سے ایک کو یہ مسودہ تیار کرنا ہوگا۔"

"یہ پہلا مسودہ تیار کرنے دو۔" میں نے کہا۔

"ارے تم تو ناصح سمجھدار نکلے۔" تاثیر نے کہا۔

"یار میں اتنا گھامڑ نہیں جتنا کہ صورت سے لگتا ہوں۔" میں نے کہا اور اس پر ایک قہقہہ پڑا۔

"پہلا مسودہ ڈاکٹر گھوش کو تیار کرنے دو۔" بنے نے بیچ بچاؤ کراتے ہوئے کہا۔ اور سب اس پر راضی ہو گئے۔

ڈاکٹر گھوش نے کوئی ایک مہینے میں مسودہ تیار کر لیا۔ اس سے کام تو چل سکتا تھا لیکن اس میں کوئی گہرائی نہ تھی۔ پھر بھی ہوا یوں کہ اس مسودے پر بحث کے دوران ہم سبھوں کی گویا کایا ہی پلٹ گئی۔ اور اختلاف رائے کے باوجود ہماری دوستی میں پختگی آتی گئی۔

پھر یہ بھی ہوا کہ ادب کا مفہوم سمجھنے کے عمل میں ہم ادب کو اپنے عوام سے مختلف پہچان کرنے لگے معلوم ہوتا تھا جیسے کہ ہماری "روحوں" میں ایک تبدیلی آگئی ہے ہم نے اپنے، بورژوائی چھوٹے بورژوائی اور جاگیردارانہ نقطۂ نظر کو ترک کر کے تسلیم کر لیا کہ اپنی ساری خامیوں، کمزوریوں اور نقائص کے باوجود ہندوستانی بہرحال انسان ہیں۔ ہمیں احساس ہونے لگا کہ بدیسی حاکموں نے ہماری زبانوں کو نظر انداز کر کے اور ہمارے کلچر کو کچل کر ہمارے بزرگوں کو اپنے ساتھ ملانے کیلئے ان میں امارت، دولت پرستی اور انسانیت کش اقدار پھیلائی تھیں۔ سامراجیوں نے پہلے تو عوام کو جاہل رکھا۔ ہر صورت سے انکا استحصال کیا۔ اور انھیں ذلیل کیا۔ پھر وہ کہنے لگے کہ ہندوستانی تو جاہل اور گندے ہیں اور انسان کہلانے کے مستحق نہیں۔

پھر ہمیں یہ بھی احساس ہوا کہ اس سلسلے میں خود ہماری کوششوں کی حیثیت بھی رومانی اداؤں سے زیادہ نہ تھی۔ کیونکہ ہم میں سے خال خال کو اپنے عوام کے مصائب کا کوئی واقعی تجربہ تھا۔ لہٰذا ہمارے لئے ضروری تھا کہ ہم اپنے الفاظ کو عمل میں منتقل کریں۔ بالفاظ دیگر جب تک ہم اپنے عقائد پر عمل کر کے نہ دکھائیں ہم آزادی کی تحریک میں حصہ لینے کے حقدار نہیں بن سکتے تھے۔ اس سلسلے میں ہمیں اپنی بہت سی خامیوں سے چھٹکارا پانا اور انھیں دور کرنا ضروری تھا۔

جہاں تک میرا تعلق ہے میں اول تو ایک غریب متوسط گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ پھر جب میں گاندھی جی کی تحریک میں شامل ہو کر جیل چلا گیا تو میرے والد نے میری ماں کو زدوکوب کیا تھا۔ جب مجھے اسکا علم ہوا تو میں ماں کی مدد سے گھر سے بھاگ نکلا۔ اور ڈاکٹر اقبال کی مدد سے فلسفہ میں تحقیقات کرنے لگا۔ پھر جب میرا ضمیر مجھے بار بار ستانے لگا کہ میں ایک مفصل اقبال نامہ لکھوں تو میں جلا وطنی ترک کر کے وطن واپس آیا لیکن مجھے ضروری معلوم ہوا کہ میں گھر جانے کی بجائے احمد آباد میں مہاتما گاندھی کے آشرم میں داخل ہو جاؤں تاکہ تحریک آزادی کے بارے میں اپنے احساسات کو شدید تر بنا سکوں اور اپنے عہد کو پورا کرنے کیلئے ٹٹیاں صاف کر سکوں۔ تب کہیں جا کر میں نے اپنے پہلے ناول "اچھوت" کو از سر نو لکھنا شروع کیا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ میں اپنی نرگسیت سے بڑی حد تک چھٹکارا پا چکا تھا۔ لہٰذا میں اس مینی فیسٹو کو زیادہ براہ راست طور پر لکھ سکتا تھا۔

ڈاکٹر گھوش کے مسودے میں بس ایک چیز کی کمی تھی جو تمام از خود جلاوطن کردہ دانش وروں میں پائی جاتی ہے یعنی انھیں اپنے ملک کے عوام کی زندگی کا کوئی حقیقی تجربہ نہیں تھا۔ آزادی کا نظریاتی تصور تو موجود تھا لیکن انھیں اس کا مطلق علم نہیں تھا کہ ہندوستان میں ایک بچے کو اسکول تک جانے کا موقعہ نہیں ملتا کیا بیتتی ہے۔ اگر میں نے سجاد ظہیر کو صحیح طور پر سمجھا تو انکا مقصد یہی تھا کہ ان سب لوگوں میں جنھوں نے کبھی قلم ہاتھ میں نہیں پکڑا ایک بیداری اور شعور پیدا کیا جائے۔

تاثیر بھی نچلے متوسط طبقے سے حیرت انگیز طور پر واقف نکلے لیکن وہ اس طبقے کی خامیوں پر نظمیں لکھا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ ادب میں آئی اے رچرڈز، کولرج اور ایلیٹ وغیرہ سے متاثر اور ان تنقیدی نظریات

مدّاح تھے۔ اور اسی اساس پر اپنے ملک کے ادب کو فروغ دینا چاہتے تھے۔ وہ محمد اقبال کو بالکل فراموش کر چکے تھے۔ اگرچہ بنّے اودھ ہائی کورٹ کے سابق لارڈ چیف جسٹس کے بیٹے تھے۔ لیکن خیالات و تصوّرات میں دو مندوں کی نسبت وہی مجھ سے قریب ترین تھے۔ جب وہ آکسفورڈ اکتوبر کلب کے ممبر بنے تو ان میں گویا اتنی ذہنی تبدیلی تو ہو ہی چکی تھی کہ انھوں نے آبائی اعلیٰ طبقے سے اپنا ناتا توڑ کر عوام سے اپنا رشتہ جوڑ لیا تھا۔

مزید برآں وہ اودھ کے نچلے متوسط طبقے کے ذی شعور لوگوں کے بہت قریب چلے تھے۔ اور انھیں اس مہذب اور انحطاط پذیر طبقے کے دکھ درد کا سچا احساس تھا۔ جیسے وہ عرصہ سے جھیلتے آ رہا تھا۔

بنّے نے مجھے بتایا کہ انکی ماں بھی جونپور کے ایک دیہات کی رہنے والی تھیں اور ممکن ہے عوام کی محبت کا یہ جذبہ بنّے کو انہیں سے ملا ہو۔ اسی لئے گو کہ وہ اپنے دوستوں کی خامیوں کا مذاق نہیں اڑا سکتے تھے لیکن انھیں انکی حالت پر ایک پاکیزہ غصّہ آتا تھا جو ہماری اس تحریک کے بنیادی جذبے سے بہت قریب تھا جو ہم ایک جان ہو کر دلوں کو بدلنے کیلئے چلانے والے تھے۔

بنّے سے بھی بات چیت کے دوران میں نے اندازہ لگایا کہ ابھی ان میں قلبِ ماہیت کا عمل مکمل نہیں ہو پایا تھا۔ اگرچہ گھوش یا تاثیر کی بہ نسبت ان میں یہ تبدیلی زیادہ حد تک آ چکی تھی۔ چونکہ بنّے اپنے ان دوستوں کی بہ نسبت مجھ پر اپنے دلی جذبات زیادہ مکمل طور پر ظاہر کرتے تھے۔ لہٰذا انکی مشکلوں سے بھی مجھے ہمدردی تھی۔

میں خود اس موقف پر بھی تھا کہ کسی کی جانب کوئی سرپرستانہ رویہ اختیار کروں۔ لہٰذا میں بنّے کی کمزوریوں کو در گذر کرتا رہتا تھا۔ مثلاً ملاقات کا وقت طے کرنے کے بعد بھی وہ ہمیشہ تاخیر سے آتے تھے۔ اوّل تو وہ ایک بڑے گھرانے میں [illegible] کی تھی۔ پھر نیو کالج آکسفورڈ نے بھی انکی عادات و ترجیحات میں کوئی فرق نہیں ڈالا تھا۔ مثلاً وہ ہر روز دوپہر کے کھانے کے بعد تین گھنٹے قیلولہ کرتے تھے۔ اور یہ عادت اس وقت تک نہ چھوٹی جب تک کہ انھیں ہند کی جنگ آزادی کی شدید جدوجہد کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ . . اور تب جا کر انھوں نے نہ صرف دوسروں کو بلکہ خود کو بھی صحیح طور پر پہچانا۔ بنّے نے بتایا کہ چند سال قبل انھیں ایک شفاخانے میں داخل ہونا پڑا تھا۔ اور ڈاکٹروں نے صلاح دی تھی کہ وہ دوپہر کو بلا ناغہ قیلولہ کیا کریں۔ وہ شاید موت کی سرحدوں کو چھو آئے تھے۔ اور اب وہ موت کے احساس کو کبھی بھلا نہ سکتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ انھیں یہ دریافت کرنے میں ایک عرصہ لگے گا کہ خوف، تنہائی اور شخصیت کے احساس کو ہمیشہ الفاظ اور عمل میں یا بہ الفاظ دیگر تخلیقی عمل ہی میں بھلایا جا سکتا ہے۔

بہر حال میں نے انکی ساری نرگسی عادتوں کو قبول کر لیا۔ البتہ ایک پنجابی انداز سے انکا مذاق بھی اڑاتا رہا۔ اور انکے سارے رشتہ داروں اور ساتھیوں نے بھی یہی وطیرہ اختیار کیا۔

بہر حال قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ وہ اپنی عمر کے چوتھے دہے میں داخل ہو چکے تھے اور انھوں نے نہ صرف تخلیقی بلکہ عوامی تحریک کا کام بھی شروع کر دیا تھا اور بنّے کی مساعی کے باعث بہت سے ہندوستانی طالب علموں اور مصنفوں نے اپنے جاگیردارانہ خیالات اور عادتیں ترک کر دی تھیں اور ان کے دل و دماغ میں دورِ سادات کے نقیب تیرا۔ کی اہمیت کا زیادہ بہتر احساس پیدا ہو چلا تھا۔

شاید بنّے اپنے ہم عصروں سے گہرا تعلق پیدا کرنے میں اس لئے بھی کامیاب ہو گئے کیوں کہ اس وقت تک آکسفورڈ اور کیمبرج میں ہندوستانی طالب علموں کی حیثیت چاہے وہ کتنے ہی امیر گھرانے کے کیوں نہ ہوں، محض نو آبادی باشندوں کی تھی۔ ممکن ہے کہ بعض طالب علموں نے ہندوستان میں کوئی ذلت نہ اٹھائی ہو کیونکہ وہاں نو ان کے والدین بدیسی حاکموں کے معاون کار تھے۔ لیکن آکسفورڈ اور کیمبرج میں تو برطانیہ کے اعلیٰ طبقے کے اور قدامت پرست طلباء کا احساسِ برتری پر مبنی رویّہ، نسلی مغایرت کے احساسات کی ساری پرتوں کو واضح کر دیتا جو برطانیہ کے طبقاتی معاشرے میں جبلّی طور پر موجود ہیں۔ میں بذاتِ خود تین چار نسلوں سے واقف ہوں جن میں کوئی بھی ایسا ہندوستانی طالب علم آکسفورڈ اور کیمبرج میں نہیں تھا جو کم از کم برطانیہ میں اپنے قیام کے دوران قوم پرست نہ بن گیا ہو۔ ان دنوں فسطائیت نے فروغ پایا تھا اور اس نے جو مظالم ڈھائے اور ادھر سامراجیوں نے جس طرح یورپ کی جمہوری ریاستوں کے ساتھ غدّاری کی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد تک جس طور پر ایشیا اور افریقہ میں اپنا تسلط جمائے رکھا، اس سے بہتوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ اور ہمارے ذہنوں کی یعنی ہمارے عزائم اور انکی تکمیل کے دشمنوں کی صحیح فطرت گویا ایک آئینے میں منعکس ہو کر ہمارے سامنے آ گئی۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کا مینی فیسٹو ہماری ایک ماہانہ میٹنگ میں منظور ہوا جو لندن میں چیرنگ کراس روڈ سے متصل نانکنگ رسٹوران کے زیریں کمرے میں منعقد ہوئی۔

یہ منشور جس کی ہم قسم کھاتے تھے اس لئے نہیں اہم تھا کہ اس میں ہندوستان کی ثقافتی صورت حال کا کوئی مکمل تجزیہ، تعریف یا وضاحت تھی۔ مینی فیسٹو اس لحاظ سے اہم تھا کہ ہم نے صدیوں کی قدر پرستی ترک کر کے جاگیرداری اور تنزل سے منہ موڑ کر اپنی جُون بدل لی تھی۔ اور اب ہم حال اور اس اور اس کی آزادیوں پر عقیدہ رکھتے تھے۔ ہم چند مشترک اقدار کی بنا پر مختلف الخیال مصنفوں کے درمیان قرب باہم اور اتحاد کے جذبات کو قوی کرنا اور فروغ دینا چاہتے تھے۔

اور اگرچہ ہم میں سے چند بلومس بری کی کوٹھریوں میں رہتے تھے لیکن ہم نے منشور کے ذریعے اس ضرورت کا بھی اعلان کیا کہ ہمیں برطانیہ چھوڑ کر

ہندوستان واپس جانا چاہیئے اور وہاں عوام کی زندگی میں شریک ہوکر ایک ایسا ادب خلق کرنا چاہیئے جس کے کردار خیالی نہیں بلکہ گوشت پوست کے بنے ہوں جو اپنے آپ سے بخوبی آگاہ ہوں اور اپنے گرد و پیش کے انسانی حالات کے مقابل صف آرا ہوں۔

ہم نے نسطائیت کے خلاف سیاسی جدوجہد میں جو حصہ لیا اس سے ہمارے جذبات مشتعل ہو چکے تھے لیکن ابھی ساتھی لکھنے والوں پر کچھ ایسے اثرات باقی تھے (مثلاً جیمس جوائس نے اپنی زیر تصنیف کتاب میں جو زبان ظلمت : استعمال کی تھی) جبکہ سب سے اہم اور ضروری تھا۔ اس کا حل یہی تھا کہ ہم سب اپنی مادری زبانوں میں لکھنے لگیں۔ اور عوام کی بول چال کی زبان.. استعمال کریں۔

ترقی پسند مصنفین کے مینی فیسٹو کے کئی عوامل و عواقب پر سجاد ظہیر اور میں ان دنوں لمبی لمبی بحثیں کرتے تھے۔

ایک موضوع تو یہ تھا کہ خود محاسبہ کتنا ضروری ہے اور یہ معلوم کرنا فرض تھا کلاسیکی ادب سے ہم جو وابستگی رکھتے ہیں وہ تکنیک کے لحاظ سے ہے یا ماخذ کے لحاظ سے اور کہاں تک کس طور پر۔ میں نے سمجھا دیا کہ اول تو ہمیں اپنے ثقافتی ورثے کی دوبارہ تعمیر کرنی چاہیئے اور پھر یہ اعلان کرنا چاہیئے کہ ہم اس میں سے صرف وہی چیزیں لیں گے جو ہمارے موجودہ زمانے کے حالات سے نسبت رکھتی ہیں اور باقی چیزوں کو طاق پر رکھ دیں گے۔

پھر ہم اس پر بھی بحث کرتے کہ ہمارا ادب موجودہ بورژوا اور جاگیردارانہ ادب سے کس نہج سے مختلف ہوگا۔ کیا ہم حالات کو منظر عام پر لا کر اور محض ان کا مذاق اڑا کر اپنی نوبلوغیت کا اظہار کریں گے جب کہ ضرورت اس کی ہے کہ توہم پرست عوام کو تعقل پرست بنانے اور مردہ عادتوں کی جگہ پر تجدید کی نئی روشنی لانے کا ایک ولولہ پیدا کرنے کے لئے طنز کا بھرپور وار کریں مزید یہ کہ رضا کاروں یعنی مردوں اور عورتوں کی وہ بڑی تعداد کہاں سے آئے گی جو ترقی یافتہ ادب کی تخلیق کے ذریعے ہمارے ستم زدہ عوام کی آگاہی کی سطح کو اونچا کر سکے۔ آخر یہ لوگ ملیں گے کہاں سے۔ پھر ہم نے طے کیا کہ ان میں سے بیشتر سوالوں کا جواب ہندوستان میں ملے گا۔ چنانچہ سجاد ظہیر نے فیصلہ کیا کہ وہ جلد ہی بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے وطن واپس چلے جائیں گے۔ اور وہاں وہ کل ہند ترقی پسند مصنفین کا ایک کنونشن منعقد کریں گے۔ میں اُن کے جانے کے تھوڑے دن بعد آ جاؤں گا۔

مجھے یاد ہے کہ اس فیصلے کے بعد سجاد ظہیر نے قانون کی پڑھائی میں اپنے کو غرق کر دیا۔ ان کی کاہلی ہوا ہو گئی۔ وہ ملاقات کے اوقات کی پابندی کرنے لگے اور انکی قوتِ گویائی میں بھی اضافہ ہو گیا۔ جب ہم پہلی بار ملے تھے تو وہ رک رک کر ہچکچاہٹ کے ساتھ اور جھینپ جھینپ کر تقریر کرتے تھے۔

اور اب وہ یکایک بڑے بڑے مجمعوں کے سامنے نہایت وضاحت اور روانی سے تقریر کرنے لگے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مینی فیسٹو نے کم از کم سجاد ظہیر میں ایک انقلابی تبدیلی کا آغاز کر دیا تھا۔ تھوڑے دنوں بعد ہی وہ ہندوستان واپس چلے گئے۔

ترقی پسند مصنفین کی پہلی کل ہند کانفرنس ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں پریم چند کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ سجاد ظہیر نے کانفرنس کے دوران مجھے خط لکھا کہ کانفرنس کا بہت پُرجوش خیر مقدم ہوا ہے۔ اور نوجوان ذی شعوروں کی بھاری اکثریت نے اس کے اعلان نامے پر دستخط کر دیئے ہیں۔

اور جلد ہی میں ان لوگوں سے آن ملا۔ مجاز۔ جعفری۔ سبطِ حسن۔ احتشام حسین۔ فراق گورکھپوری۔ احمد علی۔ عبدالعلیم۔ سمترا نندن پنت، پی۔ سی۔ گپتا۔ ہرت رائے، ہیرن مکرجی، بشنو ڈے مکرجی، وغیرہ ان سب کو سجاد ظہیر اس تحریک میں شامل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

میں کوئی ایک سال تک سجاد ظہیر کے ساتھ وزیر منزل، بٹلر گنج، لکھنؤ میں ظہیر خاندان کے مہمان کے طور پر مقیم رہا۔ یہ دور تک پھیلا ہوا ایک بڑا بھاری مکان تھا۔ بنّے اور میں ملک کے ہر گوشے میں دوروں پر جایا کرتے تھے۔ ہم اکثر جواہر لال نہرو کے ساتھ کام کرنے الٰہ آباد بھی جایا کرتے تھے اور پنڈت جی کے لئے مختلف موضوعات پر نوٹ تیار کیا کرتے تھے۔

مجھے پتہ چلا کہ بنّے اپنے گھرانے میں بڑے ہر دلعزیز ہیں۔ چونکہ انھوں نے اپنی زندگی ایک مقصد کے لئے وقف کر دی تھی لہٰذا ہر ایک ان سے متاثر تھا۔ ان کے والد سر وزیر حسن نے لوگوں سے یہ کہنا شروع کر دیا کہ انہیں سر وزیر حسن کی جگہ سید وزیر حسن کہا جائے۔ ان کی والدہ جنھیں لوگ پیار سے "بوبو" کہتے تھے انکی شادی کے بارے میں فکرمند تھیں تاکہ ان کے بچے کی اُنہیں کیطرح ہوں۔ ان کے بھائی سیاسی معاملات میں ان سے اختلاف رائے رکھنے کے باوجود انکی عزت کرتے تھے۔ اور جب بھی وہ اپنے دوروں سے واپس آتے اُن کی بھابھیاں اُن کے لئے طرح طرح کے کھانے پکا کر خوش ہوتیں۔

میرا کمرہ وزیر منزل کے اس حصے میں تھا جس میں پروفیسر حسین ظہیر (جنھیں پیار سے "منتے" پکارا جاتا تھا) اپنی بیوی بچوں کے ساتھ رہتے تھے اُن کی بیوی کا نام ستیدہ ہے۔ کئی لحاظ سے "منتے" بنّے کے قریب ترین تھے کیونکہ منتے بھی ایک فعال شخص ہیں۔ وہ نہ صرف ایک باعمل کانگریسی اور لکھنؤ یونیورسٹی میں کیمسٹری کے پروفیسر تھے بلکہ ادب اور فنونِ لطیفہ میں بھی

گہری دلچسپی رکھتے تھے۔

کھانے کا کمرہ مشترک تھا۔ لہٰذا ہم سب کھانے کے وقت ایک ہی میز پر جمع ہو جاتے۔ نوجوان سینئر کے صدر میں بیٹھتی تھیں۔ اس طرح میں رفتہ رفتہ لکھنؤ کی تہذیب سے خاصا واقف ہو گیا کیونکہ میں اس گھرانے کے مختلف لوگوں سے ہر روز تین بار یعنی کھانے کے اوقات پر تو ضرور ملتا تھا۔ اور بعض بعض خاص ... موقعوں پر تو سجن کی بہنیں بھی اپنے بچوں سمیت آجاتی تھیں اور اس طرح میری واقفیت بڑھتی ہی گئی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار عید کے موقعہ پر کنبے کے کوئی پچاس آدمی اپنے والدین کو عید کی مبارکباد دینے اکٹھا ہو گئے تھے۔

ترقی پسند مصنفین کی دوسری کل ہند کانفرنس ۱۹۳۸ء میں منعقد ہوئی۔ اور ہم نے رابندر ناتھ ٹیگور کو اسکی صدارت کرنے پر راضی کر لیا۔ پھر سجاد ظہیر اور میں سارے ہند میں اپنی تحریک کو فروغ دینے کے لئے دورہ کرنے لگے۔ اور تقریباً ساری بڑی زبانوں کے مصنفوں نے ہماری تحریک کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا۔

اگلے دس برسوں کے دوران، چاہے وہ جیل میں ہوں یا باہر، سجاد ظہیر ترقی پسند تحریک کا محور بنے رہے۔

میں ۱۹۳۹ء کے اوائل میں تھوڑے عرصے کے لئے انگلینڈ واپس چلا گیا تھا۔ اور وہاں جا کر پھنس گیا۔ کیونکہ میری توقعات کے ایک سال قبل ہی دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی۔ نتیجتاً میرے اور سجاد ظہیر کے درمیان سات سال تک کوئی رابطہ قائم نہ رہ سکا۔

اس سے قبل جنگ آزادی کی جدوجہد زور پکڑ چکی تھی جس کے باعث ہم جواہر لال کے بہت قریب آگئے تھے۔ سجاد ظہیر نے الٰہ آباد میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے دفتر میں جواہر لال کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیا تھا اور پنڈت جی انھیں بہت چاہنے لگے تھے۔ بعد میں سجاد اور جواہر لال دونوں ایک ہی جیل میں بھی ساتھ ساتھ رہے۔ اور سجاد نے مجھے ایک خط میں بتایا کہ نہرو نوجوانوں میں نئے خیالات کو فروغ دینے میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ ہمارا ایک دوسرا ساتھی جو جیل میں ان دونوں کے ساتھ تھا، کالا کانکر کا کنور برجیش سنگھ تھا۔

میں نے انگلینڈ میں پہلے تین سال قیام کے دوران اپنا ناول "تلوار اور ہنسیا" مکمل کر لیا۔ جو در اصل میرے سلسلہ وار ناولوں کی تیسری اور آخری قسط تھی۔ اس ناول کا محل وقوع کالا کانکر تھا۔ اور اس میں اودھ کے تعلقہ داروں کے خلاف کسانوں کی بے ساختہ گوریلا جدوجہد کا ذکر تھا۔ میں نے یہ ناول سجاد ظہیر کے نام معنون کیا ہے کیونکہ ناول کا پہلا مسودہ اسی دوران لکھا گیا تھا جب کہ میں وزیر منزل، کالا کانکر اور لاہور میں سجاد ظہیر کے ساتھ تھا۔ میں نے اس انتساب کے ذریعے سجاد ظہیر اور ان کے گھر والوں کو جنھوں نے اپنی محبت، مہمان نوازی اور شفقت سے مجھے نوازا ہے خراج عقیدت پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

جنگ کے بعد ایک بار پھر بمبئی میں ہمارا ساتھ ہوا۔ یہ ایک آزمائشی دور تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ انگریز کو ہندوستان چھوڑنا پڑے گا۔ لیکن وہ جاتے جاتے ہند کو مذہب کی بنا پر تقسیم کر کے جائیگا۔

امید افزا بات یہ تھی کہ سجاد ظہیر اردو کے دانشوروں کو فرقہ پروری کے خلاف متحد کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ہر ہفتے بمبئی میں اوپیرا ہاؤس کے قریب دیودھر ہال میں ترقی پسند مصنفین کے جلسے ہوتے اور شاعروں اور افسانہ نگاروں کی ایک نئی پود اپنا کلام سناتی۔ اس میں کیفی اعظمی، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، مجروح سلطانپوری اور شیلندر بھی شامل تھے ان سے قدیم تر لکھنے والے، کرشن چندر، جعفری اور خواجہ احمد عباس بھی پختگی کیساتھ لکھ رہے تھے۔

۱۹۴۷ء میں ہندو پاکستان کے بٹوارے سے ہم گویا ایک اندھے کنوئیں میں گر گئے۔ ہم کو خون ریزی اور عزیز دوستوں مثلاً فیض احمد فیض سے جدائی پر صبر کرنا پڑا۔

اور تب سجاد ظہیر نے فیصلہ کیا کہ وہ جلد از جلد پاکستان جائیں گے تاکہ وہاں کے پرانے مجاہدینِ آزادی میں خیر سگالی پیدا ہو سکے۔ اور وہاں کے نئے ذی شعور لوگوں کو اس پر آمادہ کیا جا سکے کہ وہ ہندوستان اور پاکستان کے عوام کے مشترک مقصد یعنی غذائے جسمانی و روحانی کے حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کریں گے۔

ہم نے سجاد ظہیر کو سانتا کروز کے ہوائی اڈے پر خیر باد کہا جو اس وقت ایک چھوٹا سا ہوائی اڈہ تھا۔ ہم جانتے تھے کہ کراچی پہنچتے ہی انھیں روپوش ہو جانا پڑے گا کیونکہ جن با اقتدار لوگوں کے ہاتھ میں اس نئے ملک کی حکومت آگئی تھی وہ زمیندار رہنما اور رجعت پسندوں کے قدیم مفاد پرست طبقوں سے تعلق رکھتے تھے۔

اور ہوا بھی ایسا ہی۔ سجاد ظہیر کو بیشتر اوقات روپوشی میں رہنا اور کام کرنا پڑا۔ لیکن وہ ایک ہراول دستہ تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

چند ہی دنوں بعد ان پر، فیض احمد فیض اور چند دیگر لوگوں پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ پاکستان کی جائز حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کر رہے تھے انہیں بلوچستان میں ایک جیل میں رکھا گیا۔ اور ان کا مقدمہ کئی سال تک چلتا رہا۔ کئی ملکوں نے سفارش کی کہ وہ چھوڑ دیئے جائیں اور بالآخر کئی سال بعد عالمی رائے عامہ سے مجبور ہو کر حکومت نے انھیں رہا کر دیا۔

جواہر لال نہرو نے جو سجاد ظہیر سے بڑی محبت کرتے تھے بذاتِ خود حکومت پاکستان کو اس پر راضی کر لیا کہ انھیں ہندوستان واپس بھیج دیا جائے۔

نوحہ

مجروح
سلطان پوری
۹۔ چلنے کالونی جوہو۔
بمبئی ۔ ۵۴

دیدۂ تر چپکے رہو اب ہاتھ قرطاس و قلم ؛ ناخنِ غم سے کریدو جگر پر تحریر
نقشِ غم روزِ ازل سے ہے جو میراث اپنی ؛ اپنا سرمایہ یہی بنتی بگڑتی تصویر
سوچتا ہوں کہ کہو تم ہو کہاں ہو تو نظر ؛ ظلمتِ خاک میں لرزاں ہے یہ کس کی تنویر
آہ وہ ہاتھ کہاں ہے کہ جو اٹھ کے جیوں تو لیں ؛ جس کا اک جام ہے پیمانے ہوئے میری تقصیر
جس نے ہر سمت کا شوکی پردا اڑا رکھے ہوئے ؛ کون ہے دیس میں اب ہمارا وہ بہاراں کا سفیر
خاک و غبار ہے دل اے گلِ خورشیدِ سحر ؛ تو نے دی ہے آئنۂ شام کو اے ماہِ منیر
گیسوئے دستِ اجل چھین کے دیوانوں سے ؛ اب خموشی ہی جنوں کی شکستہ میکو زنجیر
خامشی اسکی نسیمِ سحری تھی گویا ؛ بستر اوروں کو گلشن چھاؤں تھی اسکی تقریر
جو گیا دار و گل سے جب جانے والا ؛ اب وہی راہگزر لگتی ہے زخموں کی لکیر
شاید آوارہ رہے اور ابھی خوابِ سحر ؛ گردِ مژگاں ہی رہے خوابِ سحر کی تعبیر
نقش دیوار ہے خاموش ہیں اربابِ سخن ؛ صوت افسردہ ہے الفاظ و معانی دلگیر
اشک آلودہ ہوئی بزمِ غزل اسکے بعد
نام نغمے کا ہوا نوحۂ سجاد ظہیر

۱۹۵۶ء میں نہرو کی تشویق پر پہلے ایشیائی مصنفین کی پہلی کانفرنس نئی دہلی میں منعقد کی۔ اس کام میں مجھے اور سجاد ظہیر کو ہند کے سارے مصنفوں کی تائید حاصل تھی، سوائے ان معدودے چند لکھنے والوں کے جو مستقبل کے دشمن تھے۔ سب سے بڑی خوشی کی بات یہ تھی کہ اس کانفرنس میں وہ سارے دانشور، ادیب اور فنکار آن ملے تھے جنہیں سامراج نے ایشیا کے مختلف ملکوں میں الگ تھلگ کر رکھا تھا۔

کانفرنس میں شریک ہونے والے روسی مصنفوں نے دعوت دی کہ اگلی کانفرنس تاشقند میں منعقد کی جائے۔

چنانچہ ۱۹۵۸ء میں ہم ازبکستان میں آمو دریا کے کنارے جمع ہوئے اور اس طرح افروایشیائی کانفرنس وجود میں آئی۔ روسی دانشوروں کی اعلیٰ مہمان نوازی اور فیاضی کے باعث تاشقند سے ایک عالمگیر تحریک کا آغاز ہوا جو سارے ایشیا اور افریقہ میں پھیل گئی اور جس کے اثرات جنوبی امریکہ تک بھی محسوس ہونے لگے۔

اس کے بعد سے افروایشیائی کانفرنس ہر تین برس میں ایک بار ایک مختلف ملک میں منعقد ہوتی رہی ہے۔ دوسری افروایشیائی کانفرنس قاہرہ میں منعقد ہوئی، تیسری کانفرنس بیروت میں ہوئی۔

۱۹۷۰ء میں ہند کو چوتھی افروایشیائی کانفرنس منعقد کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ اور ایک بار پھر سجاد ظہیر اور میں نے اندرا گاندھی کی مدد سے نئی دہلی میں دانشوروں کے سب سے بڑے اجتماع کا انتظام کیا۔

یہ قدرت کی ستم ظریفی نہیں تو کیا ہے؟ موزوں اور مناسب تھا کہ سجاد ظہیر کا انتقال، جس نے ساری عمر خاموشی اور لگن کے ساتھ ہماری مجاہدانہ کلچر کو تجارت بازی، جنگ اور مایوسی سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی، الما آتا میں پانچویں افروایشیائی کانفرنس کے دوران میں ہوا، جہاں اس کے چاہنے والے اور اس کا غم منانے والے بیشتر ادیب دوست موجود تھے۔ لوگوں کو اس کی اچانک موت کا دکھ اس لئے اور بھی ہوا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ شریف، خاموش اور ہمیشہ مسکرانے والی شخصیت اتنی متوازن ہے کہ اس کا کسی تناؤ سے دور کا بھی واسطہ نہ ہوگا۔ لیکن افسوس اب ہم میں وہ شخص نہیں جو بڑے مقاصد کیلئے مختلف الخیال لوگوں کو ہم آہنگ کر لیا کرتا تھا۔

سجاد ظہیر ہمارے ملک کے ان معدودے چند دانشوروں میں سے تھے جنہوں نے اپنی زندگی ایسے لوگوں کیلئے وقف کر رکھی تھی جن سے سب کچھ چھینا جا چکا تھا، جو سب سے زیادہ تہی دست تھے، جو سب سے زیادہ کچلے گئے تھے۔ ذاتی تعلقات میں وہ اخلاق و شرافت کے پتلے تھے۔ وہ ہمارے ملک کے سب سے زیادہ حساس، باکمال اور انسان دوست سوشلسٹ تھے۔

میں اپنے گرد ایک خلا سا محسوس کرتا ہوں۔ کیونکہ اب میں اس کی تازہ نظم نہیں سن پاؤں گا۔ اور جب اس سے ملنے اس کے گھر جاؤں گا تو اسے وہاں نہیں پاؤں گا۔

بہرحال مجھے یقین ہے کہ ہماری نسل، بلکہ شاید ہمارے بعد کی نئی نسل بھی اس کی تحریروں سے الہام حاصل کرتی رہے گی۔

اعجاز حسین
نشیمن۔ ۱۱ سٹور روڈ۔ الہ آباد (یو پی)

سجّاد ظہیر

شخصیت کا خاکہ

قدرت کا کوئی بھید نہیں بنتا بڑا سیدھا سادا مقولہ ہے مگر بباطن غور طلب بھی ہے۔ کچھ بھی ہو اس کی حقیقت پر غور کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس لئے کہ جذبات کی بنیاد ہل جاتی ہے۔ ہم جس کو عزیز رکھتے ہیں جس کے باقی رہنے کی تمنا کرتے ہیں، وہ بے دردی سے ہم سے چھین لیا جاتا ہے۔ اسے ہمیشہ کیلئے خاموش کر دیا جاتا ہے۔ قدرت کے ضوابط و قواعد ہماری فکر کے بے ستوں کو تیشۂ مرگ سے آنا فاناً کر گرا دیتے ہیں۔ اور لوگ کفِ افسوس مل کر رہ جاتے ہیں۔ کسی عزیز یا قابلِ قدر ہستی کی موت پر ہم لوگ محسوس کرتے ہیں کہ ؎

کہنے کو مشتِ پر کی اسیری تو تھی مگر
خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہوا

چمن خاموش ہو جائے یا مشتِ پر بے زبان ہو جائے مگر موت اتنی سفاک ہوتی ہے کہ وہ کسی کا بھی خیال نہیں کرتی۔ اس کی غارت گری کا بازار صبح سے شام تک گرم رہتا ہے۔ وہ بغیر کسی کی دل شکنی کا خیال کئے ہوئے چنگیز اور ہلاکو کی طرح اپنا کام کرتی رہتی ہے۔ یہ سلسلہ آج سے نہیں روزِ ازل سے چلا آرہا ہے۔ مگر یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ تخلیق کسی کو خدمتِ خلق کا موقع نہیں دیتی۔ ہمیشہ تو نہیں، عموماً قدر شناسی سے کام لے کر وہ ایسے افراد کو موقع دیتی رہتی ہے جن میں انسان کو بلند کرنے کا جذبہ اس کو نظر آئے لیکن یہ موقع یا دفعہ اس وقت طرادل شکن ہو جاتا ہے جب خدمتِ خلق کرنے والا راہِ عمل میں سرگرم ہوتا ہے اور دنیا اس کے کاموں سے متاثر ہو کر امید کرتی ہے کہ یہ شخص ابھی اور کام کرے گا جو ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہوگا لیکن اس کو بھی صفحۂ ہستی سے اٹھا کر عدم میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ قدرت کی یہ ستم ظریفی ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔ غم و غصہ کے جذبات آنسو بنکر اُبل پڑتے ہیں۔ سجاد ظہیر کی اچانک موت اس کی ایک خاص مثال ہے۔ مرحوم نے جو کچھ ماضی و حال میں کیا اس کا سلسلہ ہنوز جاری تھا اسی کی فکر میں وہ وطن سے دور قزاقستان ایک ایسی انجمن میں شرکت کیلئے گئے، جہاں ایشیا افریقہ دونوں براعظم کے چیدہ نمائندے علمی و ادبی مسائل پر گفت و شنید کیلئے جمع ہوئے تھے سجاد ظہیر ہمیشہ کی طرح یہاں بھی سرگرمِ کارزار تھے ضعیفی کے باوجود نوجوانوں کیطرح مصروفیت میں حصہ لیتے تھے کہ یک بیک خبر آئی ؎

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

اس افسوس ناک حادثہ کے بعد جب میں مرحوم کے اس دور کا خیال کرتا ہوں جب وہ یورپ سے ہندوستان آئے اور یہاں جذبہ کا مثالی نمونہ بنکر دلوں میں اپنا گھر کرنے لگے تو تیس سال سے بھی زیادہ کے حالات و واقعات ایک ایک کرکے سامنے آتے ہیں گویا یادداشت کا ہر ورق پردۂ سیمیں کی طرح ہر وہ پہلو جو اُن کی علمی و عملی زندگی سے وابستہ ہے اس انداز سے پیش کر دیتا ہے جیسے ساری باتیں کل کی ہوں۔ محسوس ہوتا ہے کہ مرحوم سامنے بیٹھے ہیں، احباب کا مجمع ہے اور وہ اپنے خیالات و نظریات کو ہنس ہنس کر پیش کر رہے ہیں، اختلاف و اتفاق کی بحث میں بھی تبسم زیرِ لب نمایاں ہے۔ نہ حرکات و سکنات میں خفگی کا پہلو ہے اور نہ بیان ہی واعظانہ ہے وہ اپنی بات پُراثر انداز میں کہے جا رہے ہیں۔ درمیان میں ہنستے بھی ہیں ہنساتے بھی ہیں مگر اپنی بات کہے جا رہے ہیں۔ ان کی گفتگو میں تازگی اور نظریات کی ترجمانی میں دلکشی کی وجہ سے لوگ ان کی باتیں سن رہے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل کے لئے مجھے ۱۹۳۴ء اور اس کے بعد کے بعض حالات کا بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

یہ وہ زمانہ ہے جب سجاد ظہیر صاحب یورپ سے تعلیم و ذہنی تربیت حاصل کرکے الہ آباد آئے۔ آنے کی خاص وجہ یہ تھی کہ علاوہ اور خوبیوں کے شہر صوبہ کی عدالت العالیہ کا مرکز بھی تھا۔ ان کے والد سر وزیر حسن صاحب یہاں وکالت کرتے تھے۔ انہی کے ساتھ انکا قیام تھا۔ مگر ان کیلئے یہ گھر مہمان خانہ تھا۔ مرکزِ علم و عمل نہ تھا۔ ان کی دنیا گھر کے باہر تھی۔ ان کی تفریح گاہ عوامی و سیاسی انجمنیں تھیں جہاں نئی زندگی کارفرما تھی۔ منجملہ اور وجوہات کے اس لئے بھی کہ جواہر لال نہرو اس وقت کل ہند کانگرس کے سکریٹری تھے۔ ان کے تحت کچھ ایسے ہونہار و منتخب نوجوانوں کا اجتماع تھا جو آزادئ ہند کے لئے سرفروشانہ انداز میں کام کر رہے تھے۔ ان لوگوں میں ممتاز

اور لوگوں کے ڈاکٹر کنور محمد اشرف مرحوم اور ڈاکٹر زیڈ-اے احمد بھی تھے جو نظامِ عالم کے فروغ کیلئے اشتراکی اصول وعمل ضروری سمجھتے تھے۔ اس نظریہ کی روشنی میں، انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستگی کے لئے غیر معمولی جوش وخروش کے ساتھ لوگ آنے لگے۔ سچ پوچھئے تو میرے اور سجاد ظہیر صاحب کے درمیان تعلقات کی بنیاد بھی یہی تحریک تھی۔ میں اس وقت الہ آباد یونیورسٹی میں لکچرر تھا۔ میرے اردگرد کچھ ایسے طلباء واساتذہ تھے جو ذہنی طور پر نئی زندگی کے لئے کسی نئے شعور ونظریہ کی تلاش میں تھے۔

میں جب کبھی سجاد ظہیر صاحب سے ادبی تشنگی دور کرنے کیلئے ملنے جاتا تو میرے ساتھ کوئی نہ کوئی طالب علم ضرور ہوتا۔ بظاہر تنہائی نہ ہوتی مگر باوجود ہجوم کے تنہائی کا احساس ہوتا۔ ایسے وقت ہم نفسیاتی لہر کثرت کو وحدت بنا دیتی کیونکہ میں اور میرے ساتھ کے لوگ کم وبیش ایک ہی غرض، ایک ہی جستجو، ایک ہی خیال لے کر جاتے۔ اس لئے بیگانگی کا احساس برائے نام ہوتا۔ گھریلو زندگی سے لے کر علمی وادبی مسائل پر تبصرہ ہو جاتا۔ اور ہنستے بولتے وقت گذر جاتا۔ ایسی نشستوں میں کبھی کبھی تنقید میں اختلاف بھی ہوتا مگر سجاد ظہیر پر اس خفگی یا انداز گفتگو کا کوئی اثر نہ ہوتا۔ وہ عموماً سنجیدہ رہتے، جواب دیتے وقت ان کے چہرے پر شگفتگی اور لہجہ میں نرمی رہتی۔ کبھی کبھی مسکرا بھی دیتے۔ یہ سب عوامل مخالف کو بھی رنگ بدلنے پر مجبور کرتے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ کوئی بحث کبھی ضرورت سے زیادہ سنجیدہ نہ ہوسکتی۔ باایں ہمہ کبھی کبھی ایسے موقعے آئے، جب انہوں نے مجمع سے الگ ہو کر مجھ سے رازدارانہ گفتگو کی۔ اور بتا دیا کہ کل فلاں وقت میں آپ سے ملنے نشیمن آؤں گا۔ تب کچھ اور باتیں ہونگی۔ یہ گفتگو زیادہ تر سیاسی امور پر مبنی ہوتی۔ چونکہ میں کمیونسٹ پارٹی کا ممبر نہ تھا اس لئے بعض حالات میں ان کو مجھ پر اعتماد کلی نہ ہوتا۔ نہایت خوب صورت طریقہ سے اظہارِ مطلب وحصولِ مقصد کا راستہ نکال لیتے۔ چنانچہ کئی بار انہوں نے ایسے لوگوں کو میرے یہاں مہمان رکھنے پر مجھے آمادہ کر لیا، جو اس وقت کے بدیسی راج میں حکومت کی دست برد سے بچنے کے لئے روپوش ہو جانا چاہتے تھے۔ مجھ سے صرف یہ کہا جاتا کہ میرے ایک خاص دوست ہیں جو کچھ لکھنا چاہتے ہیں۔ ان کو تنہائی وسکون کی ضرورت ہے آپ ان کو اپنے یہاں کچھ دن قیام کی اجازت دے دیجئے۔ آپ بھی اُن سے نہ ملئے یا کم ملئے کیونکہ سلسلہ خیال میں باتوں سے خلل ہوگا۔ آپ تو خود ادیب ہیں آپ جانتے ہیں کہ تخلیقی مضامین قلمبند کرنے کے لئے کتنے سکون وفرصت کی ضرورت ہوتی ہے۔"

ان باتوں سے میں بھی متاثر ہوتا اور کہنا پڑتا کہ بہت اچھا آپ ان کو بھیج دیجئے۔ کچھ عرصہ بعد مجھے علم ہوا کہ یہ سب ناخواندہ مہمان کمیونسٹ پارٹی کے مشہور رہنما تھے۔

جس دور کی یہ سرگزشت ہے، اس زمانہ میں انگریزی حکومت جنگِ آزادی کے تھپیڑوں کو روکنے کے لئے ہر نامعقول حربہ استعمال کر رہی تھی۔ کمیونسٹ پارٹی کو غیر قانونی قرار دے کر پارٹی کے سربرآوردہ لوگوں کو گرفتار کر رہی تھی۔ چنانچہ سجاد ظہیر صاحب بھی گرفتار کر لئے گئے مگر جاتے جاتے میرے لئے خطرہ سے محفوظ رہنے کا انتظام کر گئے۔ بات یہ تھی میں اسی زمانہ میں اپنی تصنیف "نئے ادبی رجحانات" مرتب کر رہا تھا۔ اس کتاب میں ایک ایسا مقام آگیا جہاں یہ لکھنا تھا کہ ہندوستان میں کمیونزم کب اور کیسے آیا۔ اس سلسلہ میں ایک ایسی کتاب دیکھنے کی ضرورت تھی، جو غیر قانونی قرار دی جا چکی تھی کہیں دستیاب نہیں ہو رہی تھی۔ سجاد ظہیر صاحب نے تلاش کر کے بہم پہونچائی اور ساتھ ہی ساتھ احتیاط برتنے کی بھی تاکید کر دی۔ جب وہ گرفتار ہوئے تو ان کو میرا خیال آیا۔ اور اندیشہ ہوا کہ نشیمن میں بارہا ایسے لوگوں کو میں مہمان رکھ چکا ہوں جو سرکاری طور پر گردن زدنی تھے ممکن ہے اس کی خبر خفیہ پولیس کو ہو گئی ہو اور بے خبر میزبان کی گرفتاری وخانہ تلاشی تک نوبت جا پہونچے۔ ایسے موقعے پر ممکن ہے کہ یہ کتاب بھی نکل آئے تو چاہے اور کوئی جرم ثابت ہو یا نہ ہو یہ ثبوت اعجاز صاحب کی گرفتاری وپریشانی کیلئے بدیسی حکومت کے ہاتھ میں ایک مضبوط آلہ ہو سکتا ہے۔ اس احساس کے ساتھ ہی انھوں نے اپنے ایک خاص ساتھی ڈاکٹر زیڈ اے احمد کو متعین کیا کہ آپ فوراً کتاب اپنے قبضہ میں کر لیجئے۔

حسبِ معمول بڑے سویرے جب میں لکھنا پڑھنا شروع کرتا ہوں اس دن بھی اسی وقت میں یہ کتاب دیکھ رہا تھا۔ میری پشت کی طرف ایک شخص ایسے روپ میں آتا دکھائی دیا کہ میں سمجھا اخبار والا ہوگا۔ ایک نظر دیکھنے کے بعد میں پھر کتاب مذکورہ بالا پڑھنے لگا۔ ناگہاں آنے والے نے کتاب میرے ہاتھ سے اس طرح جھپٹ لی جیسے کوئی چیل اوپر سے کسی کے ہاتھ سے گوشت چھین کر اُڑ جائے۔ میں ہکا بکا رہ گیا۔ وہ شخص تیزی سے سائیکل چلا کر غائب ہو گیا۔ میں آواز دیتا رہ گیا۔ مگر سنتا کون ہے۔ صرف فضا میں یہ آواز گونجی۔

"پھر ملاقات ہوگی۔"

آواز کچھ جانی پہچانی محسوس ہوئی مگر اندیشہ ہائے دُور دراز نے اس آواز کو میری شناخت سے دور ہی رکھا۔ طرح طرح کے وسوسے آئے۔ کبھی یہ سوچا کہ خفیہ پولیس کا آدمی ہوگا۔ کبھی یہ خیال ہوا کہ کوئی اور بھی ہو سکتا

ہے جو مجھے خطرے سے بچانے کے لئے کتاب چھین کر لے گیا۔ اسی خلفشار میں صبح سے شام ہوگئی۔ طلوعِ آفتاب سے یہ ڈرامہ شروع ہوا تھا۔ اور غروبِ آفتاب کے ساتھ ختم ہوا۔ شام کو ڈاکٹر زیڈ اے احمد مسکراتے ہوئے آئے۔ اور کہا۔

"دیکھا میں نے کیا کام کیا۔ آپ پہچان بھی نہ سکے اور میں اپنا کام کرکے ایک دم ذہین ہوگیا"

میں بھی ہنسنے لگا۔ ان کی تیز رفتاری و ستم ظریفی کی داد دینے لگا۔ قہقہوں کے درمیان انھوں نے مجھے بتایا۔

"جیسے ہی بنے بھائی کو پولیس نے گرفتار کیا" انھوں نے مجھے تاکر کہا "آپ فوراً اعجاز صاحب سے یہ کتاب لے کر محفوظ کر لیجئے کہیں وہ بے چارے عذاب میں نہ مبتلا ہو جائیں۔ جو کچھ میں نے کیا وہ ان کی ہدایت کا نتیجہ تھا"

میرے اور سجاد ظہیر صاحب کی شاہراہِ تعلقات پر کاروانِ ارتباط گامزن تھا کہ واقعہ مندکرہ بالا سے کبھی قبل مرحوم سے قربت کا ایک اور سلسلہ قائم ہوگیا۔ انھوں نے اپنی بیوی رضیہ کے بارے میں مجھ سے مشورہ کیا کہ کیوں نہ ان کو الٰہ آباد بلالیا جائے، یہاں رہ کر وہ یونیورسٹی میں اردو لے کر ایم اے کریں۔ ان کو اردو سے بڑی دلچسپی ہے۔ اب بھی وہ کچھ نہ کچھ لکھا پڑھا کرتی ہیں۔

میں نے کہا "اچھی بات ہے ضرور بلا لیجئے" رضیہ الٰہ آباد آگئیں یونیورسٹی میں نام لکھا لیا۔

رضیہ تہذیب و آدابِ مجلس کا مرقع تھیں۔ ایم۔ اے میں آتے ہی انھوں نے اپنے اخلاق و علمی معلومات سے اساتذہ اور ہم جماعتوں کو بہت ہی متاثر کر لیا۔ اساتذہ میں سب سے زیادہ مجھ سے ملتفت ہوئی۔ مجھے بھائی کہنے لگی۔ معذرت کا پہلو یہ نکالا کہ اچھا کہنے میں ضعیف آدمی کا تصور ہوتا ہے۔ اور آپ ابھی اتنی عمر کے نہیں ہوئے کہ میں آپ کو بوڑھا سمجھوں۔ رضیہ نہ صرف مجھ سے مانوس ہوئی بلکہ میرے خاندان میں اس طرح گھل مل گئی جیسے برسوں کی ملاقات ہو۔ عزیز خاص کی طرح بے تکلف ہو گئی۔ کبھی کبھی گھر میں آتی بھابھی کو دریافت کرتی اور سیدھے باورچی خانہ کی راہ لیتی۔ اس ارتباط سے میرا سارا گھر رضیہ کا گرویدہ ہو گیا۔

اس قرب و بے تکلفی کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ سجاد ظہیر صاحب بھی مجھ سے پہلے کی بہ نسبت زیادہ قریب ہوتے گئے۔ کیونکہ رضیہ میرا حال، میرے مزاج، میرے لڑکے لڑکیوں کی باتیں گھریلو انداز میں ان سے بیان کرتی رہتی۔ بعض واقعہ بیان کرکے خود بھی ہنستی، ان کو بھی ہنساتی۔ سجاد ظہیر صاحب مجھ سے ملتے ان باتوں کا ذکر مجھ سے کرتے۔ معلوم ہوتا کہ انکی نظر میرے گھر کے ہر فرد پر ہے۔ الٰہ آباد سے چلے جانے کے بعد بھی ایک ایک کا حال پوچھتے رہتے۔

سجاد ظہیر صاحب میرے نزدیک ان مخصوص دانشوروں میں تھے جو اپنی علمیت و ذہانت کا مظاہرہ کرنا فعل عبث سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے علم و عمل کا ذکر اپنے بیانات و کردار سے اس طرح پیش کرتے کہ کسی کو احساس نہ ہو سکتا کہ وہ خودنمائی کیلئے یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ علمی مسائل یا سیاسی موضوعات پر گفتگو کرنے میں ان کی وسیع النظری و ادراک کی سطح بلند سے بلند ہوتی جاتی۔ سنجیدگی و اندازِ بیان سے لوگ متاثر ہوتے۔ ان کی تعریف بھی ہوتی۔ مگر وہ مسکرا کر پوچھتے۔

"کیا واقعی میں نے کچھ ایسی باتیں کہیں جو آپ لوگوں کے علم میں نہ تھیں۔ میں تو یہ نہیں سوچتا۔ اب آپ لوگوں نے پسند کر لیا مجھے تسکین ہو گئی۔"

سجاد ظہیر کے پیشِ نظر دو محاذ تھے۔ ایک سیاسی اور دوسرا علمی و ادبی۔ سیاسی میدان میں فروغ حاصل کرنا آسان بھی ہے مشکل بھی۔ اس کی دنیا میں سالک کا ایک قدم عروج اور دوسرا قدم زوال سے ہمکنار ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تیزی سے شہرت و بلندی حاصل ہو جاتی ہے۔ مگر ذرا سی لغزش یا کوتاہی میں اس سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ گمنامی یا کسمپرسی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ادبی دنیا میں عموماً نام و نمود تو جلد ہوتا ہے۔ نہ بغیر شعور و تخلیقی جوہر کے فنکار دیرپا شہرت کا مالک ہوتا ہے۔ یہاں نہ پرگوئی نہ بسیار نویسی مستقل ہر دل عزیزی عطا کرتی ہے نہ کم گوئی نہ اختصار پسندی حیاتِ جاوید کی ضامن ہو سکتی ہے۔ یہ محاذ بڑا سخت گیر اور صبر آزما ہے۔ بغیر انفرادی جوہر کے اور مبلغِ علم و فن کو ناقدانہ انداز سے کسوٹی پر کسے بغیر دائمی شہرت نصیب نہیں ہوتی۔ سجاد ظہیر کی سیاسی جدوجہد کی قیمت تو اہلِ سیاست جانیں، ہاں ان کی ادبی کاوشوں کا اندازہ ہم بھی کر سکتے ہیں۔ اگر صرف ترقی پسند تحریک کی تنظیم میں جانکاہی کا سوال ہوتا، تب بھی ادبی انقلاب ان کا ممنون رہتا مگر جب یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ انھوں نے اس کی اشاعت میں عملی تنقید کے نمونے بھی پیش کئے۔ "انگارے" کی اشاعت سے ادبی جمود کو دور کرنے کی کوشش کی۔ "لندن کی ایک رات" مختصر تصنیف سہی مگر اپنے وقت کی فنکاری کی سنگ میل بھی ہے۔ اس نے ناول نگاروں کو ایک نیا راستہ دکھایا۔ ان سب باتوں کے پیشِ نظر محسوس ہوتا ہے کہ وہ سچ مچ غیر معمولی ذہن کے ساتھ سمجھ بوجھ کر ہماری رہنمائی کر رہے تھے۔

(بقیہ ص ۵۱ پر)

کرشن چندر
دی ۸ بنٹے، ایرفلور، سینٹ فرانسس ایونیو، سانتا کروز ویسٹ بمبئی ۔۵۴

بنّے بھائی ـــ ایک تاثر

سیاست تیز رفتار ہوتی ہے۔ جب کہ کلچر کا مزاج دھیما اور نرم ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ دلوں میں سرایت کرتا ہے۔ بنّے بھائی کے مزاج میں جو آہستگی یا شائستہ روی تھی وہ ان کی اعلیٰ تہذیب و تمدن کی علامت تھی۔ بنیادی اعتبار سے بنّے بھائی ایک سیاسی آدمی نہیں تھے، ایک تہذیبی فرد تھے۔ جن کی جڑیں مشرقی تہذیب کے اندر بہت دور تک پھیلی ہوئی تھیں، لیکن جس نے اپنی شاخوں اور پھول پتوں سے جدید یوروپی تہذیب کا بہترین رس بھی کھینچ لیا تھا۔

ایک بار میں اور بنّے بھائی دلی سے بمبئی فرنٹیر میل سے سفر کر رہے تھے۔ ناشتہ ساتھ کر دیا گیا تھا۔ گاڑی چلی تو سلمیٰ نے ناشتہ دان کھولا اور سب چیزیں قرینے سے لگا دیں۔ پھر ناشتہ شروع ہوا۔ کھانے کے وقت سجاد ظہیر کی آہستگی اور میری تیز رفتاری دونوں دیکھنے کی چیز ہوتی ہیں۔ میں نے جلدی سے ناشتہ ختم کر لیا اور وہ ابھی بیچ میں تھے۔ دو ایک بار انھوں نے میری طرف غور سے دیکھا مگر میں نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ دراصل میں ان کی انگلیوں کی طرف دیکھ رہا تھا جو بڑی حسن کاری سے حرکت کر رہی تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ سجاد ظہیر اگر اہل قلم نہ ہوتے تو بہت بڑے مصور ہوتے۔ شاید وہ بہت بڑے مصور تھے۔ ان کے تہذیبی عمل نے صرف اردو ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی ترقی پسند تحریک کے ذریعے جو خوبصورت نقش و نگار ابھارے ہیں۔ وہ بیک وقت مصوری بھی ہے، تہذیب بھی ہے، اور ادب بھی۔

پھر بنّے بھائی کو پیاس محسوس ہوئی۔ ان کی نگاہ اپنے گلاس پر پڑی۔ وہ پانی کا گلاس ان کے ہاتھ کی لمبائی سے چند انچ کے فاصلے پر رکھا تھا۔ دو ایک بار انھوں نے اس پانی کے گلاس کی طرف دیکھا۔ اس گلاس کے اٹھانے کے لئے انھیں کچھ جھکنا پڑتا، کچھ ٹیڑھا ہونا پڑتا، بدن کے زاویے کو کچھ گھمانا پڑتا۔ لیکن وہ اس بدسلیقگی کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ اس لئے انھوں نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں، بڑے شیریں لہجے میں مجھ سے کہا۔

"کرشن وہ گلاس اٹھا دو۔"

مجھے کچھ حیرت ہوئی۔ وہ گلاس ان کی دسترس سے چند انچ کے فاصلے پر ہی تھا۔ مگر میرے زیادہ قریب تھا۔ دوسرے لمحے میں میں نے وہ گلاس اٹھا کر انھیں دے دیا۔

بنّے بھائی نے آہستہ سے آہستہ اپنی طرف گھمایا۔ پھر نیپکن لے کر اسے چاروں طرف سے صاف کیا۔ اور آہستہ آہستہ یوں پانی پینے لگے جیسے بہترین شراب پی رہے ہوں۔

یہ چھوٹا سا واقعہ مجھے کبھی نہیں بھولتا کسی طرح کی غلط حرکت یا ناشائستگی ان کے مزاج کے خلاف تھی۔ وہ گو بھی تھے۔ تقریر کرتے وقت بھی آہستہ آہستہ رک رک کر بولتے۔ تقریر کرنے کے انداز میں نہیں سمجھانے کے انداز میں۔ پڑھتے بھی آہستہ آہستہ تھے۔ چلتے بھی آہستہ آہستہ تھے جیسے ہر قدم غور و فکر کے بعد اٹھا رہے ہوں۔ مزاج کی یہی آہستہ روی زندگی میں ان کی ثابت قدمی کی دلیل تھی۔ وہ جو بھی قدم اٹھاتے تھے بہت سوچ سمجھ کر۔ پھر اس پر سختی سے جم جاتے۔ مارکسیت کو ایک بار جو اختیار کیا تو پھر زندگی بھر اس سے نباہ کیا۔ کمیونسٹ پارٹی میں گئے تو پھر وہیں کے ہو رہے۔ ترقی پسند تحریک کو جو اپنایا تو دم تک اس کا علم تھامے رہے۔

میں نے ابھی کہا کہ بنّے بھائی سیاسی آدمی نہیں تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ سیاسی خیالات نہیں رکھتے تھے یا سیاسی جدوجہد سے کنارہ کش تھے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ سیاست کے میدان کے عملی کھلاڑی نہیں تھے۔ سیاست میں جو داؤ پیچ .... لڑنے پڑتے ہیں وہ ان کے مزاج کا حصہ نہ تھے۔ ان کے مزاج کی شائستگی انھیں عملی سیاست سے ادبی جدوجہد کی طرف لے آئی۔ کیونکہ وہ محسوس کرتے تھے کہ جب کوئی سیاسی فلسفہ نرمی، آہستگی، خوب صورتی اور فنکاری سے ادب کے بدن میں اتر جاتا ہے تو پھر ادب کا اثر دور تک سرایت کر جاتا ہے۔ ادب کا اثر سیاست سے دیرپا ہوتا ہے۔ شاید اسی لئے دھیرے دھیرے چل کر وہ سیاست کے میدان سے ادب کے میدان میں آ گئے اور بالآخر اسی کو انھوں نے اپنی صلاحیتوں کی جولان گاہ بنا لیا۔

ان کے مزاج کی شائستگی اور نرم روی سے میں سمجھتا ہوں عزرائیل بھی بہت متاثر ہوا ہوگا۔ میں سوچتا ہوں جب عزرائیل نے ان سے کہا ہوگا۔

"اٹھیئے۔ بنّے بھائی۔ چلئے وقت ہو گیا" تو انھوں نے عزرائیل سے کہا ہوگا۔

"بھئی ذرا چشمہ اٹھا دو تو چلیں۔"

خواجہ احمد عباس
فلومینا لاج - جوہو، بمبئی ۵۴

ایک انسان جو نہیں مرا

ہمارے ہاں دستور یہ ہے کہ جب تک کوئی انسان زندہ رہتا ہے اس میں ہر کوئی ہزار کیڑے نکالتا ہے، اُس کو بُرا بھلا کہا جاتا ہے، اس کو گالیاں تک دی جاتی ہیں۔۔۔ لیکن جیسے ہی وہ مر جاتا ہے ہر طرف سے اُس پر تحسین و توصیف کی بارش شروع ہوتی ہے۔ تعریفوں کے پُل باندھے جاتے ہیں۔ اس کی شان میں قصیدے لکھے جاتے ہیں، اس کی موت کو اُس سال کا، یا پچھلے دس سال کا یا ایک صدی کا سب سے بڑا سانحہ قرار دیا جاتا ہے۔ شاید ایسا ہونا قدرتی بھی ہے اور لازمی بھی۔ موت کی جھاڑو سب اختلافات کو، سب اعتراضات کو، سب نفرتوں اور کدورتوں کو سمیٹ کر لے جاتی ہے۔ کم سے کم ہم مرے ہوئے ساتھیوں کو بخش دیتے ہیں۔

سید سجاد ظہیر جن کو ہم میں سے بیشتر "بنّے بھائی" کے نام سے جانتے اور پکارتے تھے، شاید ان گنے چنے لوگوں میں سے تھے جن کو ان کی زندگی میں اور زندگی کے بعد بھی کسی نے بُرا نہیں کہا۔ میں سوچتا ہوں اس کی کیا وجہ ہے؟

شاید اس لئے کہ وہ خود دوسروں کی اچھائیوں ہی کو دیکھتے تھے۔ برائیوں کو نظر انداز کر دیتے تھے۔

شاید اس لئے کہ سیاسی اور نظریاتی اعتبار سے کمیونسٹ ہونے کے باوجود ان میں "کٹّر پن" اور کسی قسم کا بھی تعصب نہیں تھا۔ ان کی کمیونزم پر شک کیا جا سکتا تھا۔ جیسے کٹّر نکسل وادی اور مارکسٹ کمیونسٹ کرتے تھے، لیکن ان کی انسان دوستی پر آج تک کسی نے شک و شبہ نہیں کیا، بلکہ ان کا تو کہنا تھا کہ سچا کمیونسٹ انسان دوست ہی ہوتا ہے۔

شاید اس لئے کہ وہ طبعیتاً امن پسند اور صلح کُل انسان تھے۔ ان کی شخصیت کا منفی پہلو نہیں تھا۔ ان کی صلح پسندی نظریاتی یا طبقاتی "غیر جانب داری" نہیں تھی۔ وہ اپنے اصولوں پر شدت کے ساتھ قائم تھے لیکن اس شدت کا اظہار نہایت مہذب اور ملائم انداز سے کرتے تھے۔

شاید اس لئے کہ تہذیب، نفاست، شائستگی، اخلاق - یہ سب خوبیاں، یہ سب انسانی قدریں (جنہیں غلطی سے پُرانے فیوڈل سماج سے وابستہ سمجھا جاتا ہے) جواہر لال نہرو کے بعد سجاد ظہیر کی شخصیت میں بدرجۂ اتم موجود تھیں اور ہر ملنے والا چاہے وہ اُن کا کتنا ہی سیاسی یا نظریاتی مخالف کیوں نہ ہو، سجاد ظہیر سے ملنے کے بعد اُن کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔

یا شاید اس لئے کہ ان کی زبان سے کبھی کسی کی بابت کوئی سخت، درشت یا ناروا جملہ میں نے۔۔۔ شاید کسی نے بھی۔ نہیں سُنا۔ ایک بد تہذیب، بد زبان اور لیچڑ قسم کے شاعر کیلئے زیادہ سے زیادہ سجاد ظہیر کو یہ کہتے سُنا ہے کہ "بھئی عباس یہ بڑا لوڈ ہے!"

شاید اس لئے بھی کہ سجاد ظہیر ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے اپنے اصولوں اور آدرشوں کے لئے تن، من، دھن سب قربان کر دیا تھا۔۔۔ یورپین اور امریکن ملکوں کے مقابلے میں ہمارے ہندوستان میں انسانوں کی کامیابی ناپنے کے الگ پیمانے ہیں۔ امریکہ میں اس انسان کی عزت ہوتی ہے جس نے اپنی زندگی میں ایک کروڑ ڈالر کمائے ہوں۔ برخلاف اس کے ہندوستان میں اس کی عزت ہوتی ہے جس نے لاکھوں کروڑوں روپے یا جائداد خدمتِ خلق کے لئے قربان کر دیئے ہوں۔ یہ روایت ہزاروں برس سے چلی آ رہی ہے۔ مہاتما بدھ اس کے پیش رو تھے۔ محلوں کی شاہی زندگی چھوڑ کر فقیری اختیار کر لی۔

بیسویں صدی میں اس روایت کو مہاتما گاندھی، اور جواہر لال نہرو نے اور کتنے ہی کانگریسی، کمیونسٹ اور سوشلسٹ رہنماؤں نے اپنایا۔ عیش آرام کو تیاگ کر خدمت، محنت، قربانی کا راستہ اختیار کیا۔ ان ہی میں سے ایک سجاد ظہیر بھی تھے۔

لیکن بنّے بھائی کی فقیری میں بھی ایک شاہانہ شان تھی۔ وہ کھدر کا معمولی کرتا، پاجامہ اور جواہر جیکٹ اس اہتمام سے پہنتے تھے۔ جیسے کوئی لندن کا سلا ہوا ہزاروں روپے کا سوٹ۔ اُن کی سادگی میں کسی قسم کا تصنع بناوٹ یا دکھاوا نہیں تھا "شہیدانہ" پوز نہیں تھا۔ خود نمائی تھی نہ خود ستائی۔ ایک بار جب انہوں نے عوام کی سی زندگی اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا تو انہوں نے اس شانِ بے نیازی کے ساتھ فقیری کا چولا پہن لیا جیسے بچپن سے انہوں نے اس طرزِ زندگی کے سوا کچھ دیکھا ہی نہیں تھا۔

بنّے بھائی اپنے باپ سر وزیر حسن کے محل جیسے گھر میں پیدا ہوئے تھے۔ جب سر وزیر حسن کا انتقال ہو گیا اور ان کے سب بیٹے۔ مع سجاد ظہیر کے ۔ سب بھائی ہندوستان بھر میں بکھر گئے اور یہ چالیس پچاس جہازی کمروں کی کوٹھی کرایہ پر چڑھا دی گئی تو کئی برس تک سجاد ظہیر اپنی بیوی رضیہ اور اپنی چھوٹی چھوٹی بچیوں کے ساتھ اسی وزیر منزل کے شاگرد پیشہ کی تین کوٹھڑیوں میں رہتے تھے۔ جو گرمی میں بھٹی کی طرح جلتی تھیں اور جاڑے میں ٹوٹے دروازوں، کھڑکیوں میں سے جاڑے بھر برفیلی ہوائیں سائیں سائیں کرتی تھیں۔ کئی برس ہوئے جب لکھنؤ میں سیلاب آیا تو یہ کوٹھریاں اور ان میں بھرا ہوا سب سامان کئی کئی فٹ پانی میں ڈوب گیا۔ بنّے بھائی کے ماتھے پر شکن نہیں آئی ۔ افسوس کیا تو صرف اس بات کا کہ ان کی ذاتی لائبریری کی ہزاروں کتابیں سیل سے خراب ہو گئیں اور ان میں بعض نایاب قلمی نسخے بھی تھے۔

عصمت چغتائی ہفتوں وزیر منزل کی ان کوٹھڑیوں میں بنّے بھائی اور رضیہ کی مہمان رہی تھیں ۔ ایک ٹیلی وژن انٹرویو میں انہوں نے بتایا کہ جب وہ وہاں گئیں تو جاڑے کا موسم تھا اور رات کو سجاد ظہیر دروازوں اور کھڑکیوں کی درزوں کو اخبار کے کاغذوں سے بند کرتے پھرتے تھے کہ برفیلی ہوا کے جھونکے اندر نہ آسکیں۔ کھانا سب باورچی خانے میں چولہے کے پاس بیٹھ کر کھاتے تھے۔ گرم گرم روٹیاں توے سے اترتی جاتی تھیں اور ایک ایک نوالہ کر کے دال سالن کے ساتھ سب کھاتے جاتے تھے۔ رات کو سب لحافوں میں جب دبک جاتے تو دنیا بھر کی باتیں ہوتیں۔ کبھی روس کی کبھی چین کی کبھی ہندوستان کی کبھی سیاست کی کبھی ادب کی۔ کبھی نئی شاعری کی کبھی آرٹ کے نئے تجربوں کی۔ بیچ بیچ میں سجاد ظہیر اپنی بچیوں کو جو اس وقت بہت چھوٹی عمر کی تھیں قصے کہانیاں سناتے رہتے اور جنوں پریوں کی کہانیاں سنتے سنتے بچیاں باپ کی گود میں سو جاتیں اور تب سجاد ظہیر اپنی بیوی رضیہ اور عصمت کی طرف مخاطب ہوتے اور کہتے "ہاں بھئی ۔ تم نے کرشن چندر کی نئی کہانی پڑھی ہے . . . یا فیض احمد فیض کی نئی غزل یا سردار جعفری کی نئی نظم یا ملک راج آنند کا نیا ناول ۔ یا حسین کی نئی پینٹنگ اور پھر گھنٹوں ادبی یا فنی موضوعوں پر گفتگو ہوتی اور باہر ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بار بار سجاد ظہیر کا دروازہ کھٹکھٹاتے، کھڑکیوں کو جھنجھوڑتے ۔ یہاں تک کسی درز میں ٹھونسا ہوا کاغذ یا کپڑا اپنی جگہ چھوڑ دیتا اور پھر فراٹے بھرتی ہوئی برفیلی ہوا اندر آجاتی اور لحاف کو اپنی ٹھوڑی تک ڈھکتے ہوئے بنّے بھائی کہتے "اچھا بھئی اب سو جاؤ۔"

عصمت آپا ہی کی زبانی یہ بھی سنا کہ ان دنوں بنّے بھائی بڑی تنگی کی زندگی گذار رہے تھے ۔ رضیہ شاید کسی کالج میں پڑھاتی تھیں۔ سجاد ظہیر انگریزی یا فرانسیسی کی کتابوں کے ترجمے کرتے تھے۔ بڑی مشکل سے گذارا ہوتا تھا۔ لیکن مہمان داری اور مہمان نوازی میں کوئی کمی نہ ہوتی تھی۔ صبر و قناعت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ کبھی کبھی رضیہ جھنجھلا جاتیں اور اپنے شوہر کو برا بھلا کہہ ڈالتیں جو عصمت آپا کو نہایت ناگوار گذرتا۔ بچیاں بھی باپ کی طرفداری کرتیں ۔ لیکن بنّے بھائی خود مسکرا کر بڑی معصومیت سے کہتے "ارے بھئی عصمت ۔ رضیہ جو کہتی ہے ٹھیک کہتی ہے۔ ہم ہیں ہی نکھٹو۔ دیکھو نا ہم نے کچھ بھی تو نہیں کیا۔ بیوی بچوں کے لئے نہ گھر بنایا۔ نہ کوئی آرام دیا۔ . . ." اور اس وقت رضیہ سب شکایتیں بھول کر اس حیرت انگیز شخص کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہتیں جو اس کا شوہر تھا۔ اس کا محبوب تھا۔ اس کا آئیڈیل اور آدرش تھا۔

کبھی کبھی عظیم انسانی شخصیتیں ایسی ہی چھوٹی چھوٹی باتوں سے پہچانی اور پرکھی جاتی ہیں۔

جب سجاد ظہیر آکسفورڈ یونیورسٹی میں پڑھتے تھے تو ان کے سامنے دنیا کھلی پڑی تھی۔ دولت، عزت، شہرت، مکان جائداد . . . سب کچھ حاصل ہو سکتا تھا۔

چاہتے تو گھر کی اتنی بڑی جاگیر تھی کہ عمر بھر صرف شکار کھیلتے، تاش کھیلتے اور عیش و آرام کی بیکار زندگی بسر کرتے۔

چاہتے تو آئی سی ایس میں آکر ڈپٹی کمشنر سے کمشنر یہاں تک کہ گورنر ہو جاتے۔ اپنے والد کی طرح "سر" کا خطاب حاصل کرتے۔ برطانوی سامراج کا ایک ستون بن جاتے۔

چاہتے تو اپنے بڑے بھائیوں کی طرح بیرسٹری کرتے۔ ہزاروں روپے روز کے مقدمے لڑا کرتے۔ لاکھوں روپے کماتے۔ . . . . کوٹھی بنگلہ جائداد بناتے۔

مگر بنّے بھائی نے ان میں سے کچھ بھی نہیں کیا۔ ان کو زندگی میں کچھ اور ہی کرنا تھا۔

نہ جانے کہاں سے ان کو ایک محسوس کرنے والا دل مل گیا تھا۔ ایک سوچنے والا دماغ مل گیا تھا۔ شاید ان کے اپنے مشاہدے سے، اپنے تجربے سے یہ احساس پیدا ہوا تھا۔

لکھنؤ کے پاس ہی ان کی زمینداری تھی۔ کھیت تھے۔ زمینیں تھیں۔ باغ تھے۔ بچپن میں جب کبھی وہاں جاتے تو بھوکے پیاسے چیتھڑے پہنے کسانوں کو چلچلاتی دھوپ میں ہل چلاتے دیکھتے، ان کے ٹوٹے پھوٹے کچے جھونپڑوں کی طرف نظر کرتے تو ان کا دل اداس ہو جاتا۔ اور ان کا دماغ سوال کرتا

یہ کیوں ہے؟ کچھ لوگ امیر کیوں ہیں؟ اتنے بہت لوگ غریب، مفلس اور نادار کیوں ہیں؟ کیا اس امیری اور اس غریبی میں کوئی رشتہ ہے؟

یہی سوال کرتے کرتے وہ سوشلزم کی منزل تک پہنچ گئے۔ کیونسٹ ہوگئے۔ مزدور تحریک کے رہنما ہوگئے۔ جیل چلے گئے۔ ایک بار، دو بار، اور پھر بار بار۔

مگر دراصل بنّے بھائی سیاست کے لئے نہیں تخلیق کئے گئے تھے۔ ان کا دل ایک شاعر کا دل تھا۔ ایک ادیب کا، ایک آرٹسٹ کا دل تھا۔ اگر حالات اس کی اجازت دیتے تو وہ ساری عمر کتابیں پڑھا کرتے، کتابیں لکھا کرتے، ادیبوں، دانشوروں، شاعروں، فن کاروں کی محفلوں میں بیٹھ ادبی اور فنی مسئلوں پر مباحثے کیا کرتے۔

لیکن ابھی انہوں نے جوانی میں قدم ہی دھرا تھا۔ دو تین افسانے ہی تصنیف کئے تھے۔ (اور یہ افسانے بھی بڑے تیکھے اور چونکا دینے والے تھے۔) کہ ان کو معلوم ہوگیا کہ غلامی اور کس مپرسی کی حالت میں نہ کوئی قوم اچھے شاعر پیدا کرسکتی ہے نہ ادیب۔ شعر کہنے کے لئے، اچھے ناول لکھنے کے لئے عوام کا ادبی، فنی شعور جگانے کی ضرورت تھی جو بغیر آزادی اور انقلاب کے ناممکن تھا۔ اور یوں یہ حساس، شاعرانہ، فن کارانہ دل اور تخلیق کی صلاحیت رکھنے والا دماغ انقلابی سیاست کی بھٹی میں کود پڑا۔

لیکن سیاست کے ہنگاموں میں بھی جیل کی کال کوٹھریوں میں بھی بنّے بھائی کی تخلیقی کاوشیں جاری رہیں۔

سب سے پہلے انہوں نے احمد علی اور محمود الظفر مرحوم کے ساتھ مل کر "انگارے" نامی کتاب کے چونکا دینے والے نفسیاتی افسانے لکھے۔ جنہوں نے اردو افسانہ نگاری کے سوتے ہوئے تالاب میں ایک بہت بڑا پتھر پھینک کر ہلچل مچا دی۔

پھر ولایت کی طالب علمی کے زمانے میں ہی "لندن کی ایک رات" ناول میں ہندوستانی نوجوانوں کے باغیانہ اور فرار پسند دونوں قسم کے کرداروں کا خاکہ کھینچا۔

مدت کے بعد پاکستان میں نظر بندی کے دوران میں انہیں ایک ضخیم کتاب لکھنے کا موقع نکلا۔ بغیر اخباروں، رسالوں کی فائلوں کے بغیر کتابوں کے صرف اپنی یاد کے سہارے انہوں نے ہندوستان کی اور خاص کر اردو کی ترقی پسند ادبی تحریک کی ایک مستند تاریخ مرتب کردی جو برسوں بعد "روشنائی" کے نام سے شائع ہوئی۔

سجاد ظہیر ترقی پسند تھے لیکن ان کے دل میں قدیم اور کلاسیکل ادب کی تخلیق کرنے والوں کے لئے بڑا احترام تھا۔ بڑی محبت تھی۔ چاہے وہ جوش ہوں یا جگر ہوں یا فراق گورکھپوری۔ لیکن ساتھ ہی وہ سمجھتے تھے کہ زندگی کی نئی ذہنی الجھنوں کے ساتھ انصاف کرنے کے لئے شاعری کے سانچوں کو بدلنے کی ضرورت ہوگی۔ اس لئے وہ مانتے تھے کہ ترقی پسندی کی انقلابی روایتوں کو چھوڑے بغیر بھی جدید شاعری کے تجربے کرنے کی ضرورت ہے۔ اور انہوں نے اپنی کتنی ہی جدید انداز کی نظموں میں ایسے تجربے کئے جو "پگھلا نیلم" کے نام سے کتاب کی شکل میں شائع ہوئے۔

چالیس سال کی تخلیقی زندگی اور نتیجہ صرف تین کتابیں اور چند افسانے؟

سجاد ظہیر نے انقلابی تحریک میں شامل ہوکر نہ صرف دولت، شہرت، آرام، پیسہ روپیہ، جائیداد کو تیاگ دیا۔ بلکہ ان کی سب سے بڑی قربانی یہ تھی کہ انہوں نے عوام کی خاطر اپنی قدرتی ادبی صلاحیتوں کو، اپنے فن کارانہ رجحانات کو پس پشت ڈال دیا۔ کیمونسٹ پارٹی کے کارکن کی حیثیت سے انہوں نے مزدوروں کی تنظیم کی، کسانوں کی تنظیم کی، طالب علموں اور نوجوانوں کی تنظیم کی۔ برسوں پارٹی کے ہفتہ وار اخباروں "قومی جنگ"، "قومی آواز" اور "حیات" کی ایڈیٹری کی۔ ہندوستان اور پاکستان میں بار بار قید کی صعوبتیں کاٹیں۔ سختی تنگی کی زندگی بسر کی لیکن سب سے بڑا تنظیمی کام جو انہوں نے کیا وہ سارے ہندوستان کے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کو انجمن ترقی پسند مصنفین کی لڑی میں پرو دینا تھا۔ یہ اتنا بڑا کام تھا جس کے لئے سجاد ظہیر کو ہمیشہ یاد کیا جائیگا۔ اس تحریک نے ہندوستان کے کتنے ہی ادیبوں کو ترقی پسندی کا راستہ دکھایا۔ مقصدی ادب کے فن کارانہ امکانات سے روشناس کردیا۔ کتنے ہی نوجوان ادیبوں کی تخلیقی قوتوں کو جگایا، اجاگر کیا، ان کی تخلیقوں کو عوام میں مقبولیت بخشی۔ اور جتنا کام تحریک نے کیا اس کا بیشتر حصہ سجاد ظہیر کی ذاتی کاوشوں کا نتیجہ تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بہ حیثیت ادیب اور شاعر اپنی ذات کے تخلیقی امکانات کو محدود کرکے سجاد ظہیر نے پورے ترقی پسند ادب کی تحریک کو توانائی اور زندگی بخشی اور اس طرح عوام کے ادبی شعور کی ترقی کے امکانات کو لامحدود کردیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بڑی قربانی کسی تخلیقی ادیب یا فن کار کے لئے ممکن ہی نہیں ہے۔

۱۹۴۷ء سے پہلے بنّے بھائی بمبئی کی والکیشور روڈ پر سکھری بھون نامی بلڈنگ کی گراؤنڈ فلور کے ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔ وہ زمانہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی تحریک کی جوانی کا زمانہ تھا۔

اردو ہندی کے زیادہ تر ادیبوں شاعروں کا گروہ بمبئی ہی میں رہتا تھا۔ اور ہر اتوار کی شام کو بنّے بھائی کے ہاں یہ سب جمع ہوتے تھے۔

کرشن چندر   جوش ملیح آبادی

ملک راج آنند	سردار جعفری
راجندر سنگھ بیدی	سعادت حسن منٹو
اسرار الحق مجاز	اپندر ناتھ اشک
ڈاکٹر صفدر آہ سیتاپوری	اندر راج آنند
رامانند ساگر	مسند رناتھ
رضیہ سجاد ظہیر	امرت لال ناگر
عصمت چغتائی	شاہد لطیف

اور نہ جانے کون کون۔ ؛

افسانے سنائے جاتے ۔مضمون پڑھے جاتے۔شعر سنائے جاتے۔ ادبی بحثیں ہوتیں۔کبھی کبھی گرما گرمی بھی ہو جاتی۔مگر بنے بھائی جیسے مرنجاں مرنج مہمان نواز کے ہاں سب جھگڑے آخر چائے کی پیالی میں گھونٹ کر پی جاتے۔ اور جب ہم لوگ رخصت ہوتے تو بنے بھائی کہتے " اچھا عباس۔ اگلے اتوار کو آنا نہ بھولنا۔تمہارا ڈرامہ سنینگے ہم!"

پھر یہ سیکری بھون ، پاکستان چلا گیا۔ایسی ہی ادبی محفلیں وہاں کراچی اور لاہور میں ہونے لگیں۔یہاں تک کہ جن جیلوں میں بنے بھائی رکھے جاتے ان کی کال کوٹھڑیاں بھی سیکری بھون بن گئیں اور قید و بند کے اس ماحول میں بھی ادب اور شاعری کی شگفتہ پھلجھڑیاں چھوٹنے لگیں۔

پھر رہا ہونے کے بعد بنے بھائی ہندوستان آگئے ۔اب دلی کے حوض خاص میں سیکری بھون کی روایات قائم ہو گئیں ۔بنے بھائی جہاں جاتے تھے اپنا سیکری بھون کندھے پر اٹھا لیجاتے تھے۔

یہ سیکری بھون " ان کے ساتھ سات سمندر پار بھی گیا۔کبھی لندن میں ادبی محفلیں ہوئیں،کبھی ماسکو میں کبھی تاشقند میں جہاں بنے بھائی اور فیض احمد فیض مل جاتے وہیں ایک بارونق ادبی محفل قائم ہو جاتی.

لیکن ان کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ ان کی باغ و بہار شخصیت تھی جو ہر ایک نقطۂ خیال کے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی تھی ۔میں اکثر ان سے کہتا تھا کہ " بنے بھائی آپ انجمن ترقی پسند مصنفین کی فکر کیوں کرتے ہیں۔آپ تو بذاتِ خود ایک چلتی پھرتی انجمن ہیں۔جہاں آپ ہیں وہاں سب ترقی پسند ادیب اکٹھے ہو جاتے ہیں۔چاہے آپ بمبئی میں ہوں،دلی میں ہوں، لندن میں ہوں یا ماسکو میں " اور وہ ایک خاص مسکراہٹ کے ساتھ کہتے۔" بھئی عباس جب ہم نہیں ہوں گے۔تب کیا ہوگا۔؟"

میں کہتا " ایسا دن کبھی نہیں آئے گا۔بنے بھائی " مگر وہ دن آہی گیا۔کہتے ہیں بنے بھائی کا وہ مشہور شیر دل، انسانیت کے لئے دھڑکنے والا دل، محبت اور رفاقت سے بھرپور دل، چلتے چلتے تھک کر سو گیا ہندوستان سے دور۔

سوویت یونین کی وسط ایشیائی پہاڑیوں کے درمیان قزاقستان کی راجدھانی الما آتا کے شہر میں جہاں وہ افریقی ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس کے سلسلے میں گئے ہوئے تھے۔

مگر نہیں، بنے مرے نہیں۔

ان جیسا زندہ دل کبھی نہیں مرسکتا۔

آؤ ہندوستان کے ادیبوں کو اکٹھا کرو۔

اردو ادیبوں کو ہندی ادیبوں کو بنگالی ادیبوں کو مرہٹی گجراتی ادیبوں کو۔

ادیبوں کو دانشوروں کو، شاعروں کو، افسانہ نگاروں کو۔

جدیدیوں کو قدیمیوں کو۔

ان سب کو جو عوام سے اور عوامی ادب اور شاعری سے محبت کرتے ہیں۔جن کے ادب میں عوام کی زندگی جھلکتی ہے،جن کی شاعری میں عوام کا دل دھڑکتا ہوا سنائی دیتا ہے۔

اور ان سب کے درمیان آپ سید سجاد ظہیر کو ہمارے اپنے بنے بھائی کو، ہمیشہ کی طرح بیٹھا پائینگے۔ان کے چہرے پر مسکراہٹ ہوگی، اور ایک عجیب اطمینان ۔ ۔ ۔ اور ان کی زبان پر ہمیشہ کی طرح یہی جملہ ہوگا۔" بھائی عباس ۔ بھائی ملک ۔ بھئی کرشن ۔
بھئی سردار ۔ بھئی کیفی ۔ بھئی بیدی ۔
اگلے اتوار کو آنا اس بار بڑی اہم میٹنگ ہوگی"۔

" ہم ضرور آئینگے ، بنے بھائی۔"

بقیہ سجاد ظہیر۔ شخصیت کا خاکہ

ان کی نئے انداز کی شاعری قبولِ عام کا سند نہ حاصل کرسکی؛ یہ اور بات ہے ۔لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ ان کا شعری مجموعہ قابلِ قدر خصوصیات سے خالی ہو۔جذبات کی ترجمانی، خیال کی رعنائی سے ہمکنار نہ ہو۔ ان خصوصیات کے ہوتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ کارنامہ بھی ان کی ذہنی اپج کا ثبوت ہے ۔ اس قسم کی ادبی تنگ ودو وسیع النظری کو وسیع تر کرنے کی زبردست خواہش کی نشان دہی کرتی ہے دوسری زبانوں کے ادب و ادیب سے آگہی حاصل کرنے اور ان کی زبان و بیان سے اپنی زبان کو دولت مند کرنے کی فکر کا پتہ دیتی ہے ۔چنانچہ افرو ایشیائی کانفرنس میں انکی شرکت قزاقستان کی راجدھانی الما آتا تک سفر کرنے کی کاوش بھی اسی راز کی غمازی کرتی ہے ۔ کسے خبر تھی کہ یہ سفر، سفرِ آخرت ہوگا،اردو کی بدقسمتی ،احباب و اعزاء کیلئے دائمی مفارقت کا پیام ہوگا۔

اجمل اجملی
۶۹۔ اوکھلا۔ جامعہ نگر، نئی دہلی۔

سرآمد روزگارے آں فقیرے

(بنّے بھائی کی یاد میں)

دوستوں کی محفل میں
ساتھیوں کے حلقوں میں
انجمن میں جلسوں میں
اک کمی سی رہتی ہے
تشنگی سی رہتی ہے
گیت بھی ابھرتے ہیں
لفظ بھی برستے ہیں
رات بھی مہکتی ہے
جام بھی کھنکتے ہیں
لوگ بھی بہکتے ہیں
پھر بھی حلقۂ یاراں بے مزہ سا رہتا ہے
جمع رفیقاں میں اک خلا سا رہتا ہے
بزم مہوشاں میں اک کمی سی رہتی ہے
تشنگی سی رہتی ہے

—— ❖ ——

اک ذرا سی آہٹ پر
قافلے نگاہوں کے
سوئے در لپکتے ہیں
انتظار کی شمعیں
آس کی توقع کی ہر نظر میں قندیلیں
صرف ایک لمحے کو
جگمگا سی اٹھتی ہیں
جھلملا سی اٹھتی ہیں

—— ❖ ——

اور پھر اچانک ہی سب کو یاد آتا ہے
انتظار ہے جس کا
قافلے کا وہ رہبر
انقلاب کا شہپر
آفتاب کا ہمسر
اب کبھی نہ آئے گا

—— ❖ ——

وہ دلوں کا شہزادہ
آبروِ عقائد کی
آرزو نگاہوں کی
جانِ محفلِ یاراں
قبلۂ گنہگاراں"
لوٹ کر نہ آئے گا

—— ❖ ——

دار کی بلندی کو چھو کے لوٹنے والا
محبسوں کی ظلمت میں
حوصلوں کا اجیالا
ذہن کے اندھیروں کو
نور بانٹنے والا
وہم کی سلاخوں کو
لب کی ایک جنبش سے پل میں کاٹنے والا
زندگی کا متوالا
موت کی ردا تانے
جامعہ کے مدفن میں سو گیا ہے نیند ایسی
شورِ صد قیامت بھی
اب جگا نہیں سکتا

—— ❖ ——

اب ہماری محفل کو بے مزہ ہی رہنا ہے
اب ادب کی دنیا میں یہ خلا ہی رہنا ہے
حلقہ ہائے یاراں میں یہ کمی دوامی ہے
تشنگی دوامی ہے
ایسی دوامی ہے

—— ❖ ——

پریم وار برٹنی۔ ۱۱۴۹ سیکٹر ۸ سی، چنڈی گڑھ

رشتۂ لوح و قلم

(بنّے بھائی کے نام)

جسم کا ساز اگر ٹوٹ بھی جائے اے دوست
روح کا راگ نہیں مر سکتا
پابہ زنجیر نہیں ہوتی بہاروں کی مہک
لالہ و گل کی ہنسی قید نہیں ہو سکتی
وقت صیاد تو ہو سکتا ہے
زندگی صید نہیں ہو سکتی!
اے مرے مونس و ہمدم، مرے ہم راز و ندیم
آسماں کیوں نہ کرے جھک کے سلام
کہ بہت اونچا ہے اس سے مری عظمت کا مقام
گردشِ وقت کے گنبد میں ہے لرزاں اب تک
تیری آواز کا جادو، ترے لہجے کا فسوں
اور نکھرا ہے ترے بعد ترا رنگِ جنوں
تیرے خوابوں کے شفق زاروں کو
میری تخیل کے سیاروں کو
تیرگی شب کی نگل سکتی نہیں
زندگی، تیرے لہو نے ہے نکھارا جس کو
بحرِ ظلمات میں غرقاب نہیں ہو سکتی
تیری تنویر دھندلکوں میں نہیں کھو سکتی
تیری تخلیق کی عظمت کا ہمہ گیر طلسم
حسن اور عشق کا وہ قصۂ پارینہ ہے
جس کو دہرائے گی تاریخِ وفا صدیوں تک
اہلِ فن کیوں نہ کریں عظمتِ فن کی تکریم
رشتۂ لوح و قلم، رشتۂ جاں سے ہے عظیم
تو نہیں، پھر بھی تری یاد کے ہر گلشن میں
تیری خوشبو سے معطر ہے بہاروں کا دماغ
تیرہ و تار فضاؤں میں ہیں روشن اب تک
تیری شہرت، تیری عظمت کے دل آویز چراغ
تیری تخلیق کے پر نور سنہرے جلوے سے
زندگی آج بھی تابندہ و رخشندہ ہے
رشتۂ لوح و قلم زندہ و پائندہ ہے۔



سجاد ظہیر
مع
خاندان





۱۔ ۲۳ برس کی عمر میں، آکسفورڈ یونیورسٹی کے طالب علم
۲۔ ۱۹۶۸ء، نئی دہلی
۳۔۴۔ اپنی بیگم، رضیہ سجاد ظہیر اور صاحبزادیوں
(دائیں سے) نسیم، نجمہ، نور اور نادرہ کے ساتھ
۵۔ سال نو کی رات، نئی دہلی ۱۹۷۱ء













۹

۶۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کے ساتھ

۷ رضیہ سجاد ظہیر اور صاحبزادی نور کے ساتھ

۸ ۱۹۵۵ء میں پاکستان سے واپسی پر، وزیر منزل لکھنؤ میں رضیہ سجاد ظہیر کے ساتھ

۹ سال نو کی رات نئی دہلی ۱۹۷۱ء

۱۰۔ لینن گراڈ میں ۱۹۶۵ء

۱۱۔ ساٹھویں سال گرہ کے موقع پر ۱۹۶۵ء

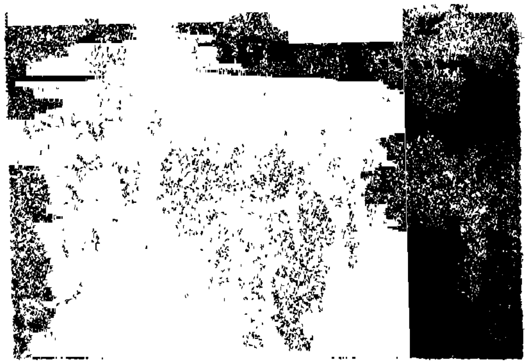
۱۱



تصاویر نمبر ۱ تا ۷، ۹ تا ۱۱، ۱۳، ۱۴، ۱۶ تا ۲۳
(بشکریہ بیگم رضیہ سجاد ظہیر)
تصاویر نمبر ۱۲، ۱۸
(بشکریہ ڈاکٹر شارب ردولوی)
تصویر نمبر ۸
(بشکریہ ڈاکٹر شمیم نکہت)
تصویر نمبر ۱۲
(بشکریہ جناب ظ انصاری)
تصویر نمبر ۱۵
(بشکریہ ڈاکٹر قمر رئیس)



۱۰







۱۲۔ سجاد ظہیر اور "نیا زمانہ" کا ادارتی عملہ
دائیں سے بائیں: محمد مہدی، ظ۔ انصاری، ضیاالحسن، مرزا اشفاق
۱۳۔ نئی دہلی میں ایک مارچ کے موقع پر
۱۴۔ سوویٹ لینڈ کی نہرو ایوارڈ کمیٹی کی ایک میٹنگ (۱۹۶۸ء)
دائیں سے بائیں: خواجہ احمد عباس، جناب کولوکولوف،
کے پی ایس مینن، میرا سلگانک، سجاد ظہیر
۱۵۔ تاشقند میں (دائیں سے بائیں) ظ۔ انصاری، احتشام حسین،
بابا جان غفوروف، سجاد ظہیر، قمر رئیس
۱۶۔ ترقی پسند مصنفین کے جلسے میں ہندی کے مشہور مصنف یشپال
(تقریر کرتے ہوئے)، دائیں خواجہ احمد عباس، بائیں سجاد ظہیر
۱۷۔ شمالی ویتنام میں (مارچ ۱۹۷۱ء)





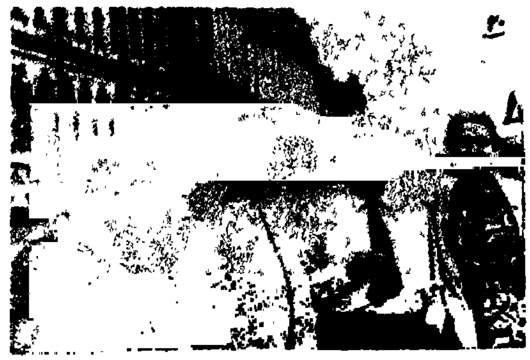




فراق گورکھپوری کے اعزاز میں منعقدہ جلسے میں اپنا کلام سناتے ہوئے



بی بی سی لندن ۱۹۶۳ء

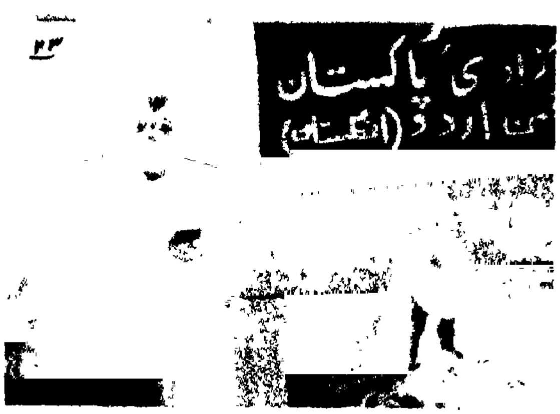


لینن گراڈ میں ۱۹۶۳ء حکیم فیض احمد فیض اور ترجمان سونٹ لانا کے ساتھ



پہلی تاشقند کانفرنس میں شمولیت کیلئے روانگی کے وقت راجندر سنگھ بیدی اور غلام ربانی تاباں کے ساتھ



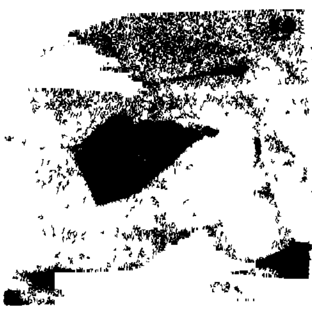


انجمن اردو (انگلستان) کے ایک مشاعرے منعقدہ لندن کی صدارت کرتے ہوئے

دائیں: مخدوم محی الدین کے ساتھ (۱۳ ستمبر ۱۹۶۳ء)

آخری سفر











اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب سے

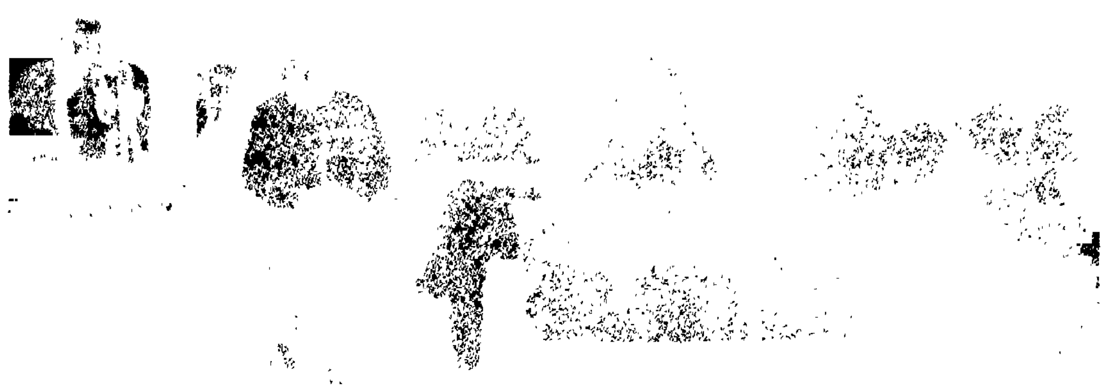


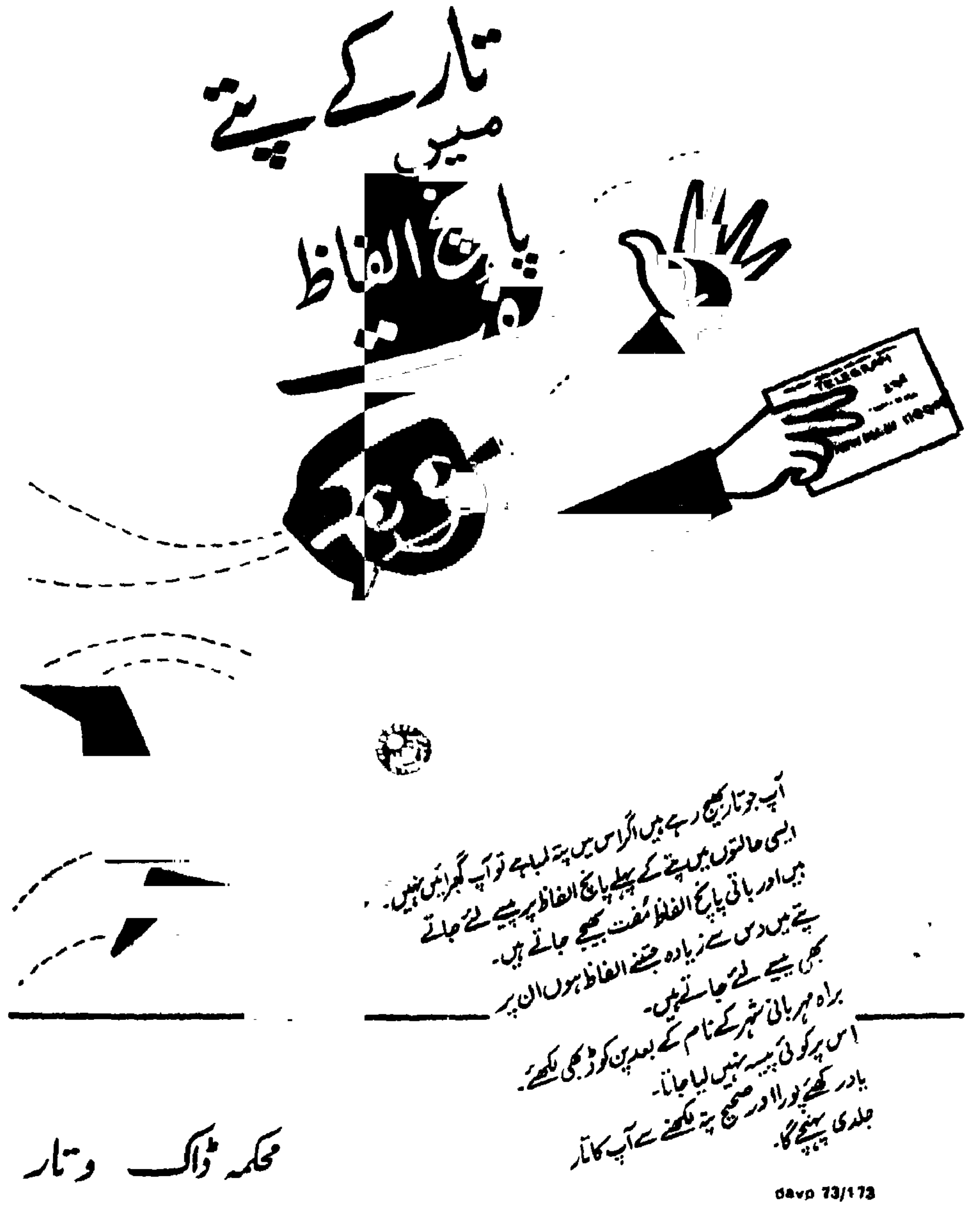


سجاد ظہیر مرحوم کی یاد میں ۱۸ ستمبر ۱۹۷۳ء کو نئی دہلی میں منعقدہ
جلسے میں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے۔

۲۹۔ رضیہ سجاد ظہیر
۳۰۔ سامعین جلسہ
۳۱۔ صدر جلسہ فیض احمد فیض
۳۲۔ دائیں سے بائیں، مرکزی وزیر تعلیم سید نورالحسن
سجاد ظہیر کے بھانجے سید علی ظہیر (برادر سجاد ظہیر)، فیض احمد فیض،
مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات جناب اندر کمار گجرال،
روسی شاعر سلیمانوف اور ترجمان
مقرر۔ ابراہیم القاضی۔ ڈائریکٹر نیشنل اسکول آف ڈرامہ، نئی دہلی






تار کے پتے
میں
پانچ الفاظ
مفت
آپ جو تار بھیج رہے ہیں اگر اس میں پتہ لمبا ہے تو آپ گھبرائیں نہیں۔
ایسی حالتوں میں پتے کے پہلے پانچ الفاظ پر پیسے لئے جاتے
ہیں اور باقی پانچ الفاظ مفت بھیجے جاتے ہیں۔
پتے میں دس سے زیادہ جتنے الفاظ ہوں ان پر
بھی پیسے لئے جاتے ہیں۔
براہ مہربانی شہر کے نام کے بعد پن کوڈ بھی لکھیے۔
اس پر کوئی پیسہ نہیں لیا جاتا۔
یاد رکھیے پورا اور صحیح پتہ لکھنے سے آپ کا تار
جلدی پہنچے گا۔
محکمہ ڈاک و تار
davp 73/173

ظ۔ انصاری
۳۲۔ خیریہ۔ بمبئی ۵

بنّے بھائی

اس پھیلی ہوئی دھرتی پر ہر طرف نظر دوڑاتا ہوں۔ کہیں کوئی ایسا نہیں جیسے بنّے بھائی تھے۔ میں نے ان پر ۱۹۴۷ء میں ایسا بیدرد مضمون لکھا، گوارا اور ناگوار کا یہ مرکب انھوں نے دیکھا۔ چہرے پر تبسم کے ساتھ ہلکی سی شکن بھی ابھری۔ تین چار سال بعد انھوں نے صاف گوئی اور تجزیے کی داد دی اور کہنے لگے کہ اگر اپنے ہمعصروں پر ایسے ہی پندرہ بیس شگفتہ سے خاکے لکھ دو تو ہم مان جائیں۔

کیا عالی ظرف صاحب نظر ہم میں سے گم ہو گیا
جو بادہ کش تھے پرانے وہ اُٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام لے ساقی!

پڑھنے والے ان سطروں کے کانٹے چن کر ہی اس دلنواز اور بھرپور شخصیت کا مطالعہ کریں تو بہتر ہے۔

(ظ۔ انصاری)

اب سے کوئی ۳۵ برس پہلے ایک زمانہ تھا جب جواہر لال نہرو زور میں تھے اور ملک کے اچھے اچھے پکھیر وچھانٹ کر اپنے اڈّے آنند بھون (الہ آباد) پر جمع کر رہے تھے۔ انہوں نے سر وزیر حسن کے کمیونسٹ بیٹے سید سجاد ظہیر کو جو انگلینڈ سے یونیورسٹی اور بیرسٹری پاس کر کے آیا تھا، اپنے دلبرانہ تبسم میں الجھا کر کانگریس سوشلسٹ فرنٹ میں کھینچ لیا۔ ہندوستان میں غلامی اور غریبی کے درد سے بھرے ہوئے ذرخیز جوان حوصلہ مند دل اور بشاش چہرے اس صف میں آ کھڑے ہو گئے جس کے لئے جیل کے پھاٹک اور ہندوستان گیر شہرت کے پلیٹ فارم یکساں فیاض تھے۔ ان میں سے کئی ایک کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی ممبری اور ایک سیاسی، سماجی یا کلچرل فرنٹ کی ذمہ داری سپرد ہوئی۔ کیسکر، اشرف، آچاریہ نریندر دیو، رام منوہر لوہیا، زیڈ اے احمد اور سجاد ظہیر اسی دور میں نمایاں ہوئے۔ اور جب چھترا زہوا تو کوئی جواہر لال کے دم سے وزارت کے محل تک پہونچا، کوئی پروفیسری میں عمر کے دن کاٹ گیا، کسی نے آل انڈیا پارٹی کی بنیاد ڈالی اور موتی لال نہرو کے خاندان کو ہی خصوصیت سے اپنا نشانہ بنایا۔ اور کسی نے کھل کر کمیونسٹ پارٹی کو اپنے جان و مال کا اختیار دے دیا۔ یہ بنّے بھائی تھے۔ وہ ایک مرنجان مرنج، قناعت پیشہ، ہر حال میں خوش، راضی برضائے مولیٰ قسم کے آدمی آج تیس سال بعد بھی اسی طرح وفاداری بشرطِ استواری کا نمونہ بنے ہوئے ہیں۔ داہنی طرف کی کمیونسٹ پارٹی ان کی مسجد ہے اور ترقی پسند مصنفین کی انجمن ان کا امام باڑہ۔ عبادت ہیں یکسوئی اور نذر نیاز میں وضعداری ان کے کردار کا بنیادی عنصر ہے۔ وہ اپنے سلجھے ہوئے شعور کی ہمراہی میں جس دامن دولت سے وابستہ ہوتے، جس خانقاہ کی سجادہ نشینی پر کمربستہ ہوتے اسے اتنے ہی خلوص اور ایک انگے پن سے نباہ جاتے۔ کسی پارٹی گروہ یا حلقے میں شامل رہنا ان کے بعض ہمعصروں کی طرح نہ تو کسی مصلحت کا تقاضا ہے، نہ کوئی ارمان نکالنے کا ذریعہ۔ وہ انجمن آرائی کے لئے بنے ہیں، انجمن کے بغیر جی نہیں سکتے۔ ع

موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

کسی فرنٹ میں ان کا آگے آگے نظر آنا دشمن کی دشمنی سے نہیں، دوست کی دوستی سے سروکار رکھتا ہے۔ یہ جنگی یا انتقامی کارروائی نہیں پختہ سماجی شعور کی پیداوار اور مزاج کی افتاد کا نتیجہ ہے۔ جن کو آدمی کے باطن میں اترنے والی نگاہ میسر ہوئی ہے، وہ سجاد ظہیر جیسی شخصیت کے اندر آسانی سے جھانک کر دیکھ سکتے ہیں کہ وہ تبرائی نہیں تولائی طبیعت کے آدمی ہیں۔ طبقاتی کش مکش کا فلسفہ بھی ان کی ملی میں اس لئے جسٹر پکڑ گیا ہے کہ وہ ہمارے سماج میں پیچ کرتی بہت چھوٹی موٹی نفرتوں اور کمینگیوں سے فکرِ انسانی کو آزاد کر دیتا ہے۔

مگر یہ بات میرے منھ تک آ گئی ہے اتنی سیدھی نہیں۔ اسے ذرا لو کان لگا کر سننا ہو گا

ہزار نکتہ دریں کاروبارِ دلداری ست

شیعی ماحول:۔ بعض سچائیاں نادان بچوں کی طرح توتلی ہوتی ہیں۔ اسی طرح کی ایک توتلی سچائی یہ ہے کہ شیعہ دہریہ ہو کر بھی شیعہ رہتا ہے۔ ڈاکٹر اشرف مرحوم چھیڑ خانی کیا کرتے تھے کہ شیعہ کمیونسٹ محترم کی مجلس سے باز نہیں

آئے گا۔ جینا تو رہا ایک طرف مرنے کا ذکر تک ان لفظوں میں کرتا ہے ؎

ہم لوبی سیس ہو کے یہاں جی لئے بہت
یارو حسین بن کے بھی مرجانا چاہیئے (باقر مہدی)

بنّے بھائی لکھنؤ کے ایک خوش حال اور ذی اثر شیعہ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ پلے بڑھے رائٹ آنریبل سر وزیر حسن کے گھر۔ سات بیٹوں بیٹیوں میں وہ چہیتے تھے۔ کھرچن سب گھر والوں کو عزیز ہوتی ہے۔ یہ بھی اپنی ماں کے سب سے لاڈلے بیٹے تھے۔ احتیاج کا بھیانک روپ جو بقول رومی شیر کو لومڑی بنا دیتا ہے، انھوں نے اپنے گھر میں نہیں دیکھا۔ گھر میں اردو فارسی پڑھانے والے مولوی صاحب کی کرخت آواز اور سختی کے سوا کسی چیز سے ڈرنا نہیں پڑا۔ (حسین کی بھوک پیاس کے علاوہ) کسی غم پر ٹوٹ کر روئے نہیں۔ خوف اور احتیاج سے جو آزادی ان کو اپنے گھر پر نصیب ہوئی وہ بعد کی روپوش سیاسی زندگی اور پھانسی کے سائے میں رہ کر بھی رفاقت کا دم بھرتی رہی۔ یہ اطمینانِ قلب ان کے کردار کا اہم حصہ ہے۔

مذہبی آزادی کے ماحول نے انھیں مولویت کے کٹرپن اور بے رحم اصول پرستی سے اتنا ہی پاک رکھا جتنا بے اصولی اور راس کی قسمت آزمائی سے۔ یہ ماحول تھا اودھ کی شیعیت کا۔

عرب کے خالص اسلام کو آریائی نسلوں نے اپنی بعض نسلی خصوصیات اور تہذیبی رسوم کا رنگ دیا تو شیعیت اور تصوف دونوں تحریکوں نے زور پکڑا اور شیعیت کے روپ میں سامی عرب اور وسط ایشیائی قبیلوں کی شدت اور حدت کا اثر اسی طرح زائل کر دیا جس طرح حافظ شیرازی اپنی خوراک معتدل کرنے کے لئے بادۂ حقیقت میں مجاز کی زعفران گھول لیتے تھے۔ یا غالب بادۂ صافی" میں عرق گلاب ملا لیتے تھے۔

آسودہ باد خاطرِ غالب کہ خوئے اوست
آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را!

یہ بادۂ صافی کا آمیختہ ہندوستان کے متمدن اور خوش حال خطوں میں پہونچ کر اور بھی زود اثر ہو گیا۔ اس نے یہاں کی "بدعتیں" بھی کوٹ چھان کر یکجا کر لیں۔ مسلمانوں کے متوسط طبقے، زمیندار، ملازمت پیشہ، اور تعلیم یافتہ حلقوں میں شیعیت مغلوں کے ابتدائی زمانے سے عام ہو رہی تھی۔ اودھ کا برج بھاشا کی رام اور کرشن کے بھجن گاتی ہوئی سرزمینوں میں اسے سیاسی طاقت بھی میسر آ گئی۔ لازم بات ہے کہ ملک کے تہذیبی ورثے میں اس نے اپنے دعوے سے بڑھ کر حصہ پایا۔ اور نتیجے میں ہند ایرانی فنون کے ہر ایک سرچشمے سے جی بھر کر فیض اٹھایا۔

ہندوستان اور پاکستان کے مسلم متوسط طبقے میں آج بھی کہیں کسی مقام پر دیکھا جا سکتا ہے کہ شیعہ نوجوانوں میں تن آسانی، ذہانت اور وسیع النظری عام ہوتی ہے۔ مذہبی عقائد سے آگاہی لیکن ان کی بجا آوری سے سخت بے پروائی۔ فنونِ لطیفہ کا احساس عموماً زیادہ نازک زبان و بیان کا ذوق، اپنے ہم سنوں سے کہیں زیادہ تربیت یافتہ اور قبولیت کا مادّہ بڑھا ہوا۔

سید سجاد ظہیر کی شخصیت کی روپ ریکھا اسی جھالردار شیعہ ماحول میں بنی اور بنتے بنتے وہ مین اسی طرح دُور کے دائروں تک پھیل گئی جس طرح ان کی شخصیت کے بیان میں شیعیت کے تذکرے کا یہ ایک پھندنا جس نے اپنے حق سے زیادہ جگہ گھیر لی ہے۔ انکی دہریت کا شیعی تربیت سے ٹکراؤ نہیں ہوتا بلکہ کمیونسٹ کٹرپن کو شیعی لوچ اور "بدعت پسندی" زیادہ قابلِ قبول بنا جاتی ہے۔

ارشا کرلیسی:۔ سجاد ظہیر کی اٹھان بڑی حد تک جواہرلال نہرو کی طرح ہوئی۔ باپ معتدل اور لبرل سیاست کے علمبردار۔ گھر میں خوش حالی، دوست احباب نہایت تعلیم یافتہ۔ خوش پوش اور خوش باش۔ حوصلہ مند اور مقناطیسی شخصیت کے جواہرلال نے ساری عمر اس کش مکش میں گذار دی کہ گاندھیائی پرم پرا بھی چلتی رہے۔ اور مارکسی سوشلزم سے بھی لو لگی رہے۔ کمیونسٹ تحریک میں تیس برس گذارنے کے بعد بھی سید سجاد ظہیر جواہرلال کے مدّاح اور عقیدتمند رہے تو کچھ بے وجہ نہیں رہے۔ راول پنڈی سازش کیس میں انھیں گرفتار کیا گیا (۱۹۵۱ء) تو فوجی سرکار نے پھانسی کی سزا تجویز کی تھی۔ بچپن کے دوست افتی میاں (افتخار الدین) اور چند احباب کے علاوہ باہر کی دنیا کو قطعاً خبر نہ تھی کہ لاہور کی سفاک جیل میں ان پر کیا گذر رہی ہے۔ جب سیاسی حالات نے پلٹا کھایا (۱۹۵۵ء) تو وہ چھوٹ کر ہندوستان آ گئے۔ جواہرلال سے ملنے گئے۔ کوئی گھنٹہ بھر تنہائی میں باتیں ہوتی رہیں۔

"اچھا تو بنّے میں پنت جی (ہوم منسٹر) سے بات کروں گا۔ تم یہیں رہ جاؤ اور کچھ کام کرو۔"

"ہاں پنڈت جی میں بھی یہی سوچتا ہوں۔"

مہینہ بھر گذرا تھا کہ جواہرلال نے بھارت سیوک سماج کی آل انڈیا کونسل سے ان کا نام خفی کر دیا۔

کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے جنرل سکرٹری، ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے مرکزی کمیٹی کے ممبر، فوجی سازش کیس کے ملزم اور کمیونسٹ نما تماہ میں راضی برضا بسر کرنے والے، بنّے بھائی بھارت سیوک سماج کی آل انڈیا کونسل میں اطمینان اور نیک نیتی کے ساتھ آنے جانے لگے۔

بصیرت ہو تو آدمی دیکھ سکتا ہے۔ کہ اس میں تقیہ یا بہروپ کا دخل نہیں۔ محض رواداری، وسعت نظر اور ہمدردی کا نقطۂ نظر ہے جو انھیں محفل میں مقبول بناتا رہا اور زبانِ طنز کا مقتول بھی۔

راولپنڈی سازش کیس :- چار برس سے اوپر وہ پاکستان کی جیلوں میں پابہ زنجیر گھماے گئے۔ سلطنتِ خداداد میں اور وہ بھی ایسے الزام میں جو کچھ بھی گذر جاتی کم تھی، لیکن معلوم ہوتا ہے انھیں نوجوانی میں "لندن کی ایک رات" اور اس کے بعد "انگارے" کے افسانے لکھتے وقت بے فکری کی جو زندگی میسر تھی وہ پندرہ برس کی بھاگ دوڑ کے بعد پھر جیل میں نصیب ہوئی۔ جواہر لال کی تاریخی تصانیف جیل کے دنوں کی یادگار ہیں۔ بنے بھائی نے بھی جی لگا کر قلم سنبھالا۔ بیوی کو دلنواز خط لکھے جو پہلے دو مکتوبوں زندگی کی گاڑی ایک پہیئے پر کھینچ رہی تھیں۔ اور بچے پال رہی تھیں۔ اسی زمانے میں انھوں نے "ذکر حافظ" لکھ کر خلوت گاہ شوق سے پردہ اٹھایا۔ "روشنائی" میں اپنی یادداشتیں جمع کیں جو بہت سے نئے پرانے چہروں کا البم ہے۔ (جیسے البم فرانسیسی رئیسوں کے خاندانوں میں محفوظ رکھے جاتے ہیں۔)

ظ۔ انصاری! غزل کے خلاف تمہارا مضمون رضیہ نے مجھے بھیجا تو تم جانو جیل میں ہر چیز غور سے پڑھی جاتی ہے۔ مجھے غصہ آگیا یہ کیا کفر پھیلایا کرتے ہو؟ غزل کی بہتات سے خیر ہم کو بھی اُبکائی آتی ہے لیکن حافظ کے متعلق ایسی سرسری رائے۔ لاحول ولاقوۃ ---!

جب شام کی تاریکی میں تین مورتی پر جواہر لال نہرو کے پھاٹک سے ہم دونوں باہر آئے (۱۹۵۶ء) تو سامنے کسی انگریز فاتح کا ایک دراز قد جلالی بت کھڑا تھا۔ اسی روز صبح کے اخباروں کی شاہ سرخی تھی کہ شرقِ اردن کے نوجوان ہاشمی شاہ حسین نے عرب لیجن کے انگریز سپہ سالار گلب پاشا کو بے اختیار کر کے ملک سے باہر نکال دیا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد سے اب تک مغربی ایشیا کا نہایت اہم واقعہ تھا۔ بنے بھائی حافظ کی غزل اور جواہر لال کی لجوئی کے ذکر سے ایک دم پھر گئے۔

"اسے دیکھا تم نے انگریز کا کتنا بڑا بت گرا ہے۔ گلب پاشا گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ جمال عبدالناصر کی شخصیت کا اثر پھیل رہا ہے عربوں میں"

"کیوں بنے بھائی آپ نے کبھی سوچا ہے۔ اگر پنڈی فوجی سازش کامیاب ہو جاتی تو ایک چھلانگ میں سوشلزم تو کیا آتا۔ مصر کی ناصر جیسی حکومت قائم ہوتی پاکستان میں۔"

"ہاں کبھی ناکامی کو سازش کہتے ہیں اور کامیابی کو انقلاب۔ یہی ہے دنیا کی ریت" اتنا کہا اور چپ ہو گئے سوچ میں۔

برسوں بعد مجھے پاکستان کمیونسٹ پارٹی کے ایک رہنما (مرحوم) کی زبانی معلوم ہوا کہ بنے بھائی شروع سے اس منصوبے کے خلاف تھے۔ منصوبے والوں نے انھیں بعد میں چوری چھپے مشورے کے لئے بلایا ضرور لیکن ان کے سیاسی شعور اور قوتِ فیصلہ نے سازش کے تصور کو پسند نہیں کیا۔ ابھی کھچڑی اندر اندر پک رہی تھی کہ خدائے جل جلالہٗ کے ایک پاکباز بندے نے نیکی کے زعم میں اس کا ڈھکنا اٹھا دیا۔ قصور وار بے قصور سب دھر لئے گئے۔ اندر پہنچ کر بعض کی طبیعت ایسی ہلی کہ درگاہِ باری میں سجدوں پر سجدے شروع کر دیئے۔ فیض احمد فیض نے اپنا ستار اٹھایا اور "نقش فریادی" کی الاپ کو بربط راگ میں بدل ڈالا۔ سجاد ظہیر اپنے اس کام میں لگ گئے جس کے آثار انھوں نے اپنی سب سے امید افزا اور قیمتی تحریر "لندن کی ایک رات" میں ظاہر کئے تھے اور جسے وہ طاقِ نسیاں پر رکھ کر کتابوں کی مقدمہ بازی" اور پمفلٹ نگاری میں پڑ گئے تھے۔

نثر میں ان کے قابلِ قدر کارنامے چند تنقیدی مضامین کے علاوہ یہی دو ننھی منی کتابیں "انگارے" اور "لندن کی ایک رات" ہیں۔ یوں تو جوشیلی عمر کی تحریریں ہیں۔ لیکن جوش کے بجائے ان میں درد کی کسک اور سادگی ہے۔ اسٹائل نیچرل اور کہانیوں کی بناوٹ نوجوانی کی تازگی اور مہک لئے ہوئے۔ وہ مہک ان کے زندہ وجود میں آج بھی باقی ہے لیکن اس طرح جیسے مولسری کے پھول کی خوشبو ایک کڑی دوپہر بسر کر لینے کے بعد۔ مہک تو ہے تازگی نہیں۔

"ذکر حافظ" اور "روشنائی" جس کا بہت چرچا ہوا۔ سجاد ظہیر کے مطالعے اور مزاج کی ہمہ گیری، وسعتِ نظر اور سینۂ بے کینہ کا نمونہ ضرور ہیں لیکن اہلِ قلم کی حیثیت سے اب تک جو مقام ان کا ہونا چاہیئے تھا وہاں تک نہیں پہنچا تیں۔

ایک بار کہیں ہوائی اڈے پر مل گئے۔ میں جا رہا تھا۔ وہ آ رہے تھے۔ چند منٹ میں کافی پیتے پیتے انھوں نے اصرار کیا کہ ہندوستان کے فلسفے اور کلچر پر دو نئی کتابیں آئی ہیں۔ لندن سے بنتے آنا اور پڑھنا مت بھولنا۔ ہمیشہ ان سے مل کر کوئی آگاہی یا امید ملتی تھی۔ بار بار مجھے ایک اچھا اخبار نکالنے یا کوئی اخبار لے کر اسے سدھارنے پر اکسایا

کرتے۔

اول روز سے انکا واسطہ اخبار نویسی سے رہا۔ بہتیرے اخبار نکالے اور نکلوائے۔ ان کے لئے لنگر لنگوٹ کس کر کام بھی کیا۔ اپنا پسینہ اور لہو بھی بہایا۔ لیکن یہاں بھی انھیں شہادت کا رتبہ حاصل نہ ہوا جیسا محمد علی جوہر یا ظفر علی خاں کو۔ موسیقار پرندہ عمر دوروزہ میں ایک ہی راگ نکالتا ہے حلق سے اور اس کی چنگاری سے جب گھونسلے میں آگ لگتی ہے تو اندر سے موسیقار کی خاکستر نکلتی ہے۔ اسے کہتے ہیں شہید یک نفس۔

نوجوانی کے والہانہ عشق سے لے کر آج جدید قسم کی شاعری تک جتنے کام وہ کرتے چلے ہیں سب میں خلوص واستواری رہی ہے، ناز برداری رہی ہے لگن رہی ہے۔ تاہم کوئی ایک شے ہے دیوانگی اور جارحانہ ولولے نام کی جو سجاد ظہیر کی شخصیت سے نباہ نہیں کرتی۔ انھیں قسطوں میں شہید ہونا آگیا ہے۔ قاش قاش کر کے خود کو بانٹنا کوئی ان سے سیکھے۔

اے پیغمبروں کے نمارے! یہ چھوٹی چھوٹی نیکیاں کسقدر معصوم ہوتی ہیں لیکن کیسی جان لیوا کہ کوئی بہت بڑی بدی آدمی کے وقت کو یوں چپکے سے ذبح نہیں کرتی جتنی یہ ننھی بے ضرر نیکیاں۔

وضعداری، اطمینان قلب :-

"رکشا والا باہر کھڑا ہے ریزگاری کے انتظار میں۔"

رکشا کی سواری یعنی ڈاکٹر رشید جہاں لکھنؤ کی دلنواز شخصیت، ... جلدی قدم بڑھاتی ہوئی اندر پارٹی آفس میں داخل ہوتی ہیں۔

"بنے تمہارے پاس بھنے ہوئے پیسے ہیں؟ ہمارا آنے نکالو جلدی سے"

مخاطب نے اطمینان کے ساتھ جیب سے ہاتھ نکالا اسے صاف کیا۔ پھر دوسری جیب میں ہاتھ ڈالا۔ جیب سے بٹوہ نکالا۔ اس کی تہہ کھولی۔ پھر ریزگاری والی تہہ میں انگلی ڈبوئی۔

"یہی تو ہے تمہاری تن آسانی، افیمچیوں کی سی، چونی نکالنے میں آدھا گھنٹہ کر دیا۔ اسی دن کو میں نے تم سے شادی نہیں کی تھی۔ سمجھے۔"

وہ پاؤں پٹکتی ہوئی دوسری طرف چلی گئیں۔

"وَجُودُکَ ذَنب" (تیرا وجود ایک گناہ ہے)

یہ تصور بعض صوفیا نے ہندو فلسفے کی اس شاخ سے لیا جسے ویدانت کہتے ہیں۔ وجود سے مراد یہ ملیا جال جس میں خرد کی بے معنی دوڑ جاری ہے اور آدمی جس قدر اس دوڑ میں شامل ہوگا اتنا ہی وہ روپ بدل بدل کر اس چکر میں جڑا ہوا مجنونانہ انداز میں گردش کرتا رہے گا۔ ویدانتوں نے اس کا توڑ نکالا۔ ... عالمانہ بے عملی میں وجود گناہ ٹھیرا تو عمل یا کرم اس گناہ کا محرک قرار پایا۔ عالمانہ عارفانہ بے عملی فرد کی روح کو ناقص پرزے کی طرح بیٹے سے نکال پھینکتی ہے تو روح جزوی روح کلی میں یا قطرہ دریا میں مل جاتا ہے پھر نہ بجے بانس نہ بجے بانسری۔

اگر سجاد ظہیر مولانائے روم کی مثنوی سے پہلے کہیں جونپور یا شیراز میں پیدا ہوگئے ہوتے تو انکی عارفانہ بے عملی اپنا فلسفہ خود تلاش کرلیتی۔ مشکل یہ ہے کہ انھوں نے ہر پہلو بھر پور زندگی بسر کرنے سے پہلے ہی "ترک ترک" (کسی لذت یا ترغیب سے ہاتھ اٹھا لینے کا خیال ہی دل سے نکال دینے) کی منزل میں چھلانگ لگا دی اور پیدا ہوئے Das Kapital اور منظم مزدور تحریک کی ولادت کے بعد۔ اس لئے چاؤ ناچار ان کی دلکش شخصیت ایک میل ہوگئی، لکھنؤ کی چھپی ہوئی پھولدار فرد اور فرانسیسی شاٹن کا۔ ایکے کردار کی استواری کا جتنا احترام بائیں بازو کے ادبی حلقوں میں کیا جاتا ہے۔ اتنا ہی ان کی عادات اور مجبوریوں کو رعایت کے قابل سمجھا اور ان پر مسکرایا جاتا ہے۔

کوئی نہیں جانتا کہ سجاد ظہیر کے وجود کی تکمیل میں رحالانکہ موصوف یک زوجگی کے اصول کو چپ چاپ "ناپسند کرتے ہیں) ان کی جاں نثار بیوی کا کتنا حصہ ہے جنھیں بحیثیت اہل قلم زیادہ توجہ کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ ان میں اگر اتنی ہمارنہ ہوتی تو بنے بھائی کے لئے ایک ہاتھ پر "جام شریعت" دوسرے ہاتھ پر "سندان عشق" لے کر عمر کے ساتھ ساتھ تیر جانا بھاری پڑتا۔ مگر بیوی آپ جانیئے بیوی ہوتی ہے۔ جس کے متعلق الہ آباد والے اکبر کہہ گئے ہیں ؎

اکبر ڈرے نہیں کسی سلطاں کی فوج سے
لیکن شہید ہو گئے بیگم کی نوج سے

"بنے بھائی اب میں رخصت ہوتا ہوں۔ آدھی رات ہونے آئی ہے"

"نہیں بھئی ہمارے گھر تک چلے چلو وہیں سو رہنا"

"سونا کیسا کل آپ تو صبح سویرے پشاور روانہ ہو جائیں گے"

"روانہ ہونے سے پہلے رضیہ کو بھی تو منانا پڑے گا۔ تم ذرا سمجھا بجھا دینا کہ دلی تک جا رہے ہیں۔ دو تین دن میں آجائیں گے۔ اطمینان کرا دینا ورنہ وہ میری گاڑی چھٹوا دیں گی۔ عورت ہیں۔ سمجھتی ہیں مشکل سے"

میرے پاس روٹھے ہوئے میاں بیوی کو منانے اور ملانے کا ایک فقیری نسخہ ہے جو فی سبیل اللہ دوسروں پر استعمال کرتا ہوں۔ وہ میں نے

لہ یہ استعارہ سجاد ظہیر کی تصنیف "روشنائی" (صفحہ ۳۴۳) سے ہے اب سے ۲۰ برس پہلے کے اس خاکسار پر صرف ہوا ہے۔ (ن۔ا)

آزمایا اور رضیہ آپا کو لے جا رہے بنے بھائی کی ذمہ داریوں پر اتنا ترس دلایا کہ نہ صرف انھوں نے بمبئی سے دلی تک ہو آنے کی اجازت دے دی۔ بلکہ دن کا باسی کھانا رات کے دو بجے گرم کرکے ہم دونوں کو کھلا بھی دیا۔

ایسے کثیر الاحباب مرد دوے کی بیوی بنکر رہنا اور اس کے بچے پال پاس کرا تھیں ایم اے پاس کرا دینا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ اگر قدرت کے کسی کرشمے سے دونوں میاں بیوی نے آپس میں اپنی جگہیں بدل لی ہوتیں تو بنے بھائی چیں بول جاتے۔

بنے بھائی کو دیکھکر بلکہ ان کا تصور کرکے مجھے سیر چشمی اور عالی ظرفی کی جیتی جاگتی تصویر دکھائی دیتی ہے۔ ان کے برتاؤ میں انسانی ہمدردی اور ٹھہراؤ میں ایک وقار ہے۔ اس خوش خصال خوش وضع اور خوش باش آدمی کی شخصیت ایک زمانے تک مقبولیت اور محبت کے گملے سنے جوڑنے کے بعد اب روز بروز نزاعی مسئلہ بنتی جا رہی ہے۔ نزاعی مسئلہ بنانے میں انکی سفید بالوں والی جدید شاعری کو دخل ہے۔ اور اس بات کو کہ بقول شخصے انجمن ترقی پسند مصنفین کی تحریک سے ان کی چاہ ایک مزار شریف اور سجادہ نشین کے تعلقات میں تبدیل ہو گئی ہے۔

حقیقت پر غور کیا جائے تو آل انڈیا انجمن کا تصور اس کے بنیادی دستور کی تیاری، اسے لئے لئے شہر بہ شہر گھومنا اور ایسی تحریک کھڑی کر دینا جس کا اثر کم و بیش ۱۹ سال تک نوجوان پیاسے ذہنوں کی تربیت کرتا رہا ہے، بڑی حد تک سجاد ظہیر کی ایک ایسی تالیف ہے جسے ان کی ادبی اور علمی زندگی کا سب سے بھاری کارنامہ قرار دیا جانا چاہیئے۔ اگر اب وہ اسے چند رفیقوں کی مدد سے قائم رکھنا، تازہ کرنا اور آگے بڑھانا چاہتے ہیں تو کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ وہ اپنا حق ادا کر رہے ہیں۔ ان سے حق طلب کرنا اور نہ ملنے کے احساس پر ان کی نیت کو نشانہ بنانا بے جا بات ہے۔

کچھ لوگ موزوں طبع اور خوش کلام ہونے کی بدولت شاعر بن گئے اور شاعری کی بدولت پاپولر ہو گئے ورنہ شخصیت کے اعتبار سے اس قدر مفلس ہوئے ہیں کہ انھیں روزناموں کی سرخیوں سے بھی سروکار نہیں ہوتا۔ بنے بھائی کے ساتھ شاعری نے الٹا سلوک کیا ہے۔ پہلے تک کی مقبولیت کو گھن لگا دیا۔

بنے بھائی نے پچاس برس تک دنیا کی بڑی زبانوں کی قدیم و جدید شاعری کا رس پینے کے بعد خود شاعری شروع کر دی تو وہ شخص جسے ہماری زبان کا بلینسکی[1] ہونا تھا، جو گرتے ہوؤں کو سنبھالنے اور سنبھلتے ہوؤں کو آگے بڑھانے کی عالی حوصلگی رکھتا تھا اپنی ہمہ گیر مقبولیت کو زبانِ طنز کے روبرو لے آیا۔ اس کی بات کا وزن کم ہونے لگا۔ اور آج مشاعرہ باز شہروں میں ایسے

کھلنڈرے بے فکروں کی کمی نہیں جو ان کا شاعری کی طرح اسکے تعلقات اور شخصیت کو بھی وزن اور آہنگ سے خارج سمجھتے ہیں۔

سائز اور تاثیر کے لحاظ سے شاعر کی طرح سانپ کی بھی بہت سی قسمیں بتائی جاتی ہیں لیکن ابھی تک غالباً سانپ کی کسی ایسی قسم کا سراغ نہیں لگا۔ جو بعض اہل قلم کی طرح پیٹ بھرے ہونے پر پھنکاریں مارتی پھرتی ہو اور شہسواروں کی راہ روک کر ان سے اپنا حق دودھ کا پیالہ طلب کرتی ہو۔ انجمن، جدید شاعری اور سجاد ظہیر کا باہمی رشتہ آجکل طبع آزمائی کے لئے مصرع طرح بنا ہوا ہے۔ حالانکہ شاعری کی اس صنف کے متعلق خود موصوف کا دیباچہ رویہ بے جوان کے روزمرہ کا موٹو ہے۔

"..... مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں اگر کوئی شاعری کے متعلق اپنے روائتی تصورات سے مجبور ہو کر ان نظموں کو نثری شعر کہتا ہے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اصلی اور اچھی شاعری بحر وزن یا قافیہ کی پابندی کے ساتھ بھی کی جا سکتی ہے۔ اور کی گئی ہے۔ اور ان کے بغیر بھی ....."

یہ اس شعری مجموعہ کے دیباچے کے الفاظ ہیں جس پر صاف صاف خطوط میں لکھا ہے "پگھلا نیلم"۔ خود ان کے قریبی دوستوں سے انھیں وہ داد نہیں ملی جس کی انھیں توقع تھی۔ پھر بھی حسبِ معمول سید سجاد ظہیر نے ان طبع آزمائیوں کے ساتھ ہار نہیں مانی ہے۔

"کیوں فیض صاحب آپ نے کچھ نہیں فرمایا بنے بھائی کی اس تازہ نظم پر"

"میں خود تجربہ کر رہا ہوں۔ مجھے کچھ نہیں کہنا۔"

"مطلب یہ کہ وزن اور آہنگ پر کچھ"

"آہنگ تو اچھی نثر کے لئے بھی اسی قدر لازم ہے انگریزی ادب دیکھ لو۔ رہا بحر و وزن کا سوال تو شاعری کے لئے ظاہری وزن کی کیا قید ہے"

"یہ قید ہے نہ ہوگی۔ کوئی اور قید ہوگی۔ آزاد سے آزاد نگار کے لیے قید و بند نہیں ہوتی۔"

میری زبان سے اتنا سنا اور فیض صاحب جو مخاطب کا ہر جملہ اپنے شانوں پر سے پھسل جانے دیتے ہیں چپک اٹھے۔

(باقی صفحہ ۷۷ پر)

[1] روسی تنقید نگار جو ۱۸۴۸ء میں عین عالم جوانی میں ایسے وقت دنیا سے اٹھ گیا جب نئے باشعور ادب کو اس کی بصیرت راہ دکھا رہی تھی اور حوصلہ بڑھا رہی تھی۔ (ظ۔ ا)

محمد حسن
ڈی ۷ - ماڈل ٹاؤن - دلی

سجاد ظہیر کی ادبی خدمات

۱۹۳۰ء سے کچھ پہلے ہی قومی اور بین الاقوامی سطح پر نوجوانوں میں ایک نیا شعور انگڑائیاں لینے لگا تھا۔ قومی سطح پر اجتماعیت کے ردِ عمل کے طور پر انفرادیت کا عروج ہوا۔ عدم تشدد اور آئینی طریق کار کے ردِ عمل کے طور پر انارکزم اور انفرادی دہشت پسندی عام ہوئی اور عقلیت پرستی کے بجائے جذباتیت ۔ ہندوستان میں گاندھی جی کی رہنمائی میں چورا چوری کی عدم تشدد کی تحریک کی ناکامی نے بھگت سنگھ کو جنم دیا۔ انفرادیت پسندی نے مردِ کامل کا تصور ابھارا جو اقبال کے مردِ کامل اور پریم چند کے تصوراتی ہیرو کی شکل میں ظاہر ہوا۔ عالم گیر سطح پر سرمایہ دارانہ جمہوریت کے متبادل راستے ڈھونڈے جانے لگے اور اس کوشش نے یورپ میں مارکس کو دریافت کیا۔ اور دوسرے گروہ نے فسطائیت کی طرف رُخ کیا۔ نوجوانوں میں ایک عجیب خلش تھی، ایک بے نام بے قراری جو زندگی کا بھرپور تصور اپنانے کا ارمان رکھتی تھی۔ زندگی کا کوئی ایسا تصور جو عام انسانوں کی بہتری کی سبیل پیدا کر سکے اور جبر و استبداد کی جگہ خیر اور فلاحِ عام کے تقاضوں کو پورا کر سکے۔

رومان اور حقیقت کی یہ کشمکش ۔ مدت تک جاری رہی۔ بیسویں صدی کی چوتھی دہائی تک اس کا سلسلہ جاری رہا۔ اسی زمانے میں اٹلی میں فسطائیت اور جرمنی میں نازیت کا عروج بھی ہوا۔ اور دیمتروف کا عہد ساز مقدمہ بھی چلا جس کے نتیجے کے طور پر دیمتروف نے سزا بھگتی۔ مگر اپنے دفاع میں کہا ہوا اس کا ایک ایک لفظ نوجوانوں کے لئے کبھی نہ بجھنے والی چنگاری کی طرح فروغ پذیر ہوا ۔ اور ایک نئے ولولے اور حوصلے کا محرک بن گیا۔

رومانویت کے حسین دھندلکوں میں کھوئے ہوئے ادیبوں کو ایک نئی صبح کی بشارت ملی۔ اور خواب دیکھنے والے ہزاروں لاکھوں دانش ور مصنف شاعر اور فنکار اپنی زندگی کو نئی معنویت سے ہمکنار پانے لگے بقول مجاز محلوں میں رہنے والے جھونپڑوں کے خواب دیکھنے لگے۔ اور جمہور کے دبے کچلے ہوئے طبقوں سے انھیں اپنا رشتہ استوار ہوتا نظر آنے لگا۔

جو نوجوان ہندوستان کے ساحل سے دور خیر و شر کا یہ تماشہ دیکھ رہے تھے ان کی آنکھوں کے سامنے یہ منظر اور زیادہ صاف تھا۔ ان میں اکثر نوجوان ایسے تھے جنھوں نے مارکسزم کا ایک فلسفے یا سیاسی حکمت عملی کی حیثیت سے بغور مطالعہ بھی نہیں کیا تھا۔ لیکن جو چیز انھیں کشاں کشاں اس محاذ کی طرف کھینچے لئے جا رہی تھی وہ جاں بازی کا ایک رومانی جذبہ تھا جس کے رشتے اس جذبے سے ملتے تھے جس کے تحت بائرن نے یونانی جنگِ آزادی میں شرکت کی تھی۔

مجاز نے "طفلی کے خواب" میں اس جذبے کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے ؎

طفلی میں آرزو تھی کسی دل میں ہم بھی ہوں
اک روز سوز و ساز کی محفل میں ہم بھی ہوں
دل ہو اسیر گیسوئے عنبر سرشت میں
الجھے انہی حسین سلاسل میں ہم بھی ہوں
اک لشکرِ عظیم ہو مصروفِ کارزار
لشکر کے پیش پیش مقابل میں ہم بھی ہوں
چمکے ہمارے ہاتھ میں بھی تیغ آبدار
ہنگامِ جنگ نرغۂ باطل میں ہم بھی ہوں

رزم و رومان کا یہ حسین مرکب اس دور کے نوجوان کی نفسیاتی کشمکش کا نشان ہے۔

سجاد ظہیر کا تعلق بھی رزم و رومان کے انہیں بانکوں کے قبیلے سے تھا۔ وہ جس خاندان کے چشم و چراغ تھے اس کی وجاہت کا اندازہ لگانا آج کی نسل کے لئے دشوار ہے۔ سر وزیر حسن اپنے زمانے کے سر برآوردہ وکیلوں میں تھے جن کا نام سر تیج بہادر سپرو کے پائے کے وکلاء کے ساتھ لیا جاتا تھا۔ مسلم سیاست پر انکا زبردست اثر تھا۔ اودھ میں انکا طوطی بول رہا تھا اور مسلمانوں کے متمول طبقے میں ان کے خاندان کا نام عزت اور احترام سے لیا جاتا تھا۔ ۔ وزیر منزل اودھ کی مشہور کوٹھیوں میں سے ایک تھی اور ان کے سبھی سپوت اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

سید سجاد ظہیر انگلستان میں زیرِ تعلیم تھے اسی زمانے میں جب حسن کی لطیف تمازت سے دلوں کے جل اُٹھنے کے دن تھے سیاست نے ایک نئی قندیل روشن کی۔ سجاد ظہیر کے بارے میں مشہور ہے کہ نوجوانی میں محبوب کی یاد میں موم بتی کی روشنی میں

دیوانِ حافظ جھوم جھوم کر پڑھتے تھے۔ دروغ برگردنِ راوی زندگی کی اچھی اور خوبصورت چیزوں سے انھوں نے آخری سانس تک محبت کی اور ٹوٹ کر محبت کی۔ ان کے کردار کے اسی رومانی پہلو کی مدد سے ان کی مروت، کامرانی اور ناکامیابی کو سمجھا سکتا ہے۔

پہلی بار 'انگارے' کے افسانوں سے وہ جانے پہچانے گئے۔ ان افسانوں میں کیا تھا۔ ایک بےقرار نوجوان کی تڑپ اور سرمستی جو سماج کے شکنجوں سے ٹکرا رہا ہے فضا میں جی بھر کر آستینیں پھیلا کے رقص کرنا چاہتا ہے۔ وجد و رقص کی اس حالت میں کبھی مذہب کے شکنجوں سے ٹکراتا ہے کبھی سماج سے۔ کبھی سیاسی اداروں سے۔ سجاد ظہیر کا افسانہ "نیند نہیں آتی"، 'انگارے' میں شامل ہے۔ یہ گویا بکھرے ہوئے خیالات کا مجموعہ تھا۔ "شعور کی رو" تکنیک کا پہلا تجربہ۔ میاں اکبر کی آپ بیتی ہے جو اس جیسے متوسط طبقے کے نوجوان کی ذہنی اور جذباتی سرگذشت کا درجہ رکھتی ہے۔ اس سرگذشت میں جنسی اور سیاسی مسائل کا ایک عجیب غریب مرکب ہے۔ بیچ بیچ میں سماجی بے انصافی اور مذہب کی تنگ نظری پر بے محابا چوٹیں بھی ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ عالم بالا کے مناظر بھی موجود ہیں۔ دوزخ کی تصویر بھی اور داروغۂ دوزخ کا کچا چٹھا بھی اور پھر اللہ تعالیٰ کا خیالی پیکر بھی:۔

"یہ کون آرہا ہے میرے سامنے سے؛ اس کے پستان کاٹے جا رہے ہیں۔۔ اے حضور آداب عرض ہے۔ اے حضور بھول گئے ہم غریبوں کو۔ میں ہوں منی جان! کوئی ٹھمری، کوئی دادرا، کوئی غزل۔ اے ہے آپ تو جیسے ڈرے جاتے ہیں حضور، یہ سانپ آپ سے کچھ نہیں بولیں گے۔ ان کا بھی عجب لطیفہ ہے۔ میں جب یہاں داخل ہوئی تو داروغہ صاحب نے کہا بی منی جان۔ سرکار کا حکم ہے پانچ بچھو تمہاری خدمت کے لئے حاضر کئے جائیں۔ میں حضور سہم گئی۔ بچپن سے مجھے بچھوؤں سے نفرت تھی۔ میں نے حضور بہت ہاتھ پیر جوڑے مگر داروغہ صاحب نے کہا کہ سرکار کے حکم کی تعمیل ان پر فرض ہے۔ تب میں نے کہا کہ اچھا آپ مجھے سرکار کے دربار میں پہنچا دیں۔ میں خود ان سے عرض داشت کروں گی۔ داروغہ صاحب بچارے بھلے آدمی تھے۔ مجھے اپنے پاس بٹھا کر میرے گالوں پر ہاتھ پھیرے۔ آخر کار راضی ہو گئے۔ پہلے تو مجھے کئی گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ داروغہ صاحب نے کہا۔ اس وقت سرکار کونسل کر رہے ہیں۔ جب اس سے فرصت ہوگی تب میری پیشی ہوگی۔ میں نے جو یہ سنا تو کوشش کی کہ جھانک کر کچھ میں بھی دیکھ لوں مگر دروازے کے دربان موٹے مسٹنڈے دیو۔ مجھے دھکا دے کر دور الگ کر دیا۔ خیر حضور، آخر کار میری باری آئی۔ میرا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا کہ دیکھوں کیا ہوتا ہے۔۔۔۔ خیر حضور بعد میں سرکار نے فرمایا کہ سزا تو مجھے ضرور ملے گی کیونکہ ان کا انصاف تو سب کے ساتھ برابر ہے۔ مگر بجائے بچھو کے مجھے دو ایسے سانپ ملے جو بس میرے پستان چاما کرتے ہیں۔"

سیاست کا تذکرہ ہے تو صرف اتنا کہ "ہاتما گاندھی لکھنؤ آئے ہیں اور غیر ملکی کپڑے کے بائیکاٹ کا چرچا ہے اور پھر آخری جملے:

"میں آزاد ہوں ہوا کی طرح سے آزادی کی آج کل اچھی ہوا چلی ہے۔ پیٹ میں آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں اور آپ ہیں کہ آزادی کے چکر میں ہیں۔ موت یا آزادی۔ نہ مجھے موت پسند ہے نہ آزادی۔ کوئی میرا پیٹ بھر دے۔"

'لندن کی ایک رات' ناولٹ چھپا۔ سجاد ظہیر نے لندن کے ان بے قرار دلوں کی تصویر کشی کی جو گویا دھوئیں اور کہرے کی اندھی سرنگ میں بند ہیں جن کے ارمان بہت سے ہیں مگر ان کی زندگیاں مفہوم سے عاری اور معنی سے خالی ہیں کیونکہ ان کے رشتے نہ اپنے عوام سے ہیں، نہ زندگی سے۔ وہ ایک بے نام خلا کے مسافر ہیں۔ چاروں طرف خواب بکھرے ہوئے ہیں، حسین اور دلفریب اور پھر ان خوابوں کی تعبیریں تلاش کرنے کا شدید کرب۔ یہاں بھی سیاست اور محبت کا امتزاج ہے بلکہ یوں کہئے کہ رومان پیش منظر ہے تو سیاست پس منظر یا محض بین السطور کی حد تک۔ لیکن اکبر میاں کو نعیم کی طرح زندگی کا یہ نیا ادراک حاصل نہیں ہوا تھا۔ یہ نیا ادراک، یہ تھا کہ زندگی اور محبت کی چھوٹی خوشیوں کے راستے میں بھی جو رکاوٹیں ہیں وہ صرف اسی صورت میں دور ہو سکتی ہیں جب دو معصوم پریمی اپنے کو ہر قسم کی سماجی بے انصافیوں سے جدوجہد کرنے والی عظیم عوامی تحریک کا حصہ بنا لیں۔

"ہمارے لئے زندگی کی اور کوئی دوسری صورت نہیں۔ دوسرے راستے ہمیں روحانی موت کے خشک ریگستان میں لے جا کر چھوڑ دیتے ہیں جہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔"

'بیمار' ڈراما ہے۔ نفسِ مضمون کا اعتبار سے وہ 'لندن کی ایک رات' سے مماثل ہے۔ ان تمام تخلیقات پر صرف ایک سوال منڈلاتا نظر آتا ہے۔ "کیا انسان کی ذہنی اور جذباتی خلش انفرادی سطح پر حل ہو سکتی ہے؟" اس منزل تک پہنچتے پہنچتے سجاد ظہیر اس کا جواب نفی میں پاتے ہیں اور آہستہ آہستہ تمام سماجی ناانصافیوں کو للکارنے والی ایک اجتماعی ہمہ گیر تحریک پر ان کا ایمان بڑھتا جاتا ہے۔ اس منزل تک آتے آتے گویا سجاد ظہیر نے بورژوا دانشور کی

وابستہ مارکسی انقلاب کے تصور تک دسترس حاصل کی تھی اور اعتماد اور ایثار کے اس جذبے کے ساتھ:

"شیلا۔ مجھے ذرا دوست۔ میرے پاس تمہارے سوالوں کا کوئی جواب نہیں۔ سوا کوشش اور امید کے۔ ہر شام کے قریب آنکھوں کی بجھاتا شکل مشلا یا کرتی ہے اگر ہم اس کو اپنے ذہن میں جگہ دیں تو موجودہ اور آنے والی دونوں زندگی بدمزہ، ناقابل برداشت ہوجائے گی۔"

"لندن کی ایک رات" صفحہ ۱۲۳، دوسرا ایڈیشن۔ آزاد کتاب گھر دلی

اس کے بعد کی داستان سب جانتے ہیں۔ سجاد ظہیر ایک بدلے ہوئے نوجوان کی شکل میں ہندوستان پہنچے۔ یورپ کے اشتراکی حلقوں سے ان کے رشتے استوار ہوچکے تھے اور آزادی کی تڑپ ہی نہیں، سماجی بے انصافی کے خلاف ایک ہمہ گیر اجتماعی جدوجہد کا تصور انہیں اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ اس جہادِ عظیم میں ادیبوں کی شرکت بھی لازمی تھی۔ اس لیے نہیں کہ اس سے یہ محاذ مضبوط ہوگا۔ اس سے کہیں زیادہ اس وجہ سے کہ اسی تحریک اور جدوجہد میں ادیب اپنی زندگی کا مفہوم اور معنویت پا سکے گا اور سماج سے کٹے رہنے اور اپنے حالوں سے جداہوں سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوجانے کے احساس سے نجات حاصل ہوسکے گی۔ ترقی پسند تحریک کا نقطۂ آغاز یہی تھا۔

اس مرحلے پر متوسط طبقے کے بعض دانشوروں کے نقطۂ نظر کو سمجھنا ضروری ہے۔ وہ سرمایہ دارانہ نظام کے دائرے میں رہتے ہوئے اس کی تمام تر عفونتوں کے خلاف جدوجہد کرتے تھے۔ وہ پرولتاریت کی بت شکنی کے ذریعہ گو یا اپنا انتقام سرمایہ دارانہ نظام سے لینا چاہتے تھے لیکن پرولتاری زندگی گزارنے کی ہمت نہ رکھتے تھے۔ اسی لئے وہ نئی انقلابی حسیت سے قریب ہوتے ہوئے اور اس سے پوری ہمدردی رکھنے کے باوجود مزدوروں اور کسانوں کی عام زندگی سے مختلف زندگی گزارتے تھے۔ ان میں سے بہت کم ایسے تھے جو اپنے طبقے کے دائرے سے قدم باہر نکال سکے۔

ترقی پسند تحریک ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ کانفرنس سے باقاعدہ شروع ہوئی۔ سجاد ظہیر ادیب کی حیثیت سے کہیں زیادہ منتظم اور تحریک ساز کی حیثیت سے نمایاں ہوئے۔ ترقی پسند تحریک کے بنیادی تصورات کیا تھے، وہ کس حد تک ادبی تھے اور کس حد تک سیاسی، اس کے بارے میں تفصیلی بحث کا یہ موقع نہیں۔ لیکن خود سجاد ظہیر کے ذہن میں اس بارے میں کون سی باتیں بنیادی تھیں ان کا اندازہ "روشنائی" کے ان اقتباسات سے ہوسکتا ہے۔

"اس اعلان کا لُبِّ لُباب دو لفظوں میں آزادی خواہی اور جمہوریت پسندی ہے۔ حیاتِ انسانی کے نمو اور ترقی کے لئے لازم ہے۔ کم از کم اس شرط کو ماننا اس کے لئے ضروری ہے۔

دوسرے لفظوں میں ایک ادیب بیک وقت وطن کی آزادی اور جمہوریت کا مخالف اور ترقی پسند نہیں ہوسکتا۔ لیکن اگر وہ آزادی خواہ اور جمہوریت پسند ہے تو اس کے بعد اسے اختیار ہے کہ چاہے وہ ہندو مت یا اسلام کے مذہبی تصور کو اپنائے، چاہے افلاطونی فلسفے کو صحیح مانے، چاہے تصوف اور بھگتی کو، چاہے مارکس کی جدلی مادیت کو، چاہے گوتم بدھ کے نروان کے تصور کو یا مہاتما گاندھی کی اہنسائیت کو۔ اسے اختیار ہے کہ اپنی ادبی کاوشوں میں وہ ان میں سے کسی بھی یا ان کے علاوہ کسی اور فلسفے یا عقیدے کی ترویج و تبلیغ کرے۔"

"روشنائی" صفحہ ۱۵۲، آزاد کتاب گھر دلی، ۱۹۵۹ء

"اگر کوئی لیکھک منوسمرتی کا حوالہ دے کر ذات پات کی وحشیانہ تفریق کو آج بھی صحیح مانتا ہے اور اپنی تحریروں میں ان تصورات کی ترویج کرتا ہے یا کوئی دوسرا شاعر اسلام کا نام لے کر اس ملک کے رہنے والے مختلف فرقوں کے مابین نفرت پھیلاتا ہے تو کیا ترقی پسند ادیب یہ کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ یہ باتیں اس شخص کے مذہبی عقائد سے تعلق رکھتی ہیں جس پر قائم رہنے کا اسے پورا اختیار ہے، اس لئے ایسے ادیبوں کو بھی ترقی پسندوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں کیا جاسکتا۔ ہمیں لوگوں کے عقائد و خیالات اور عمل کو ... اس طرح جانچنا ہوگا کہ ہمارے موجودہ معاشرتی مسائل پر ایک خاص خیال یا فنی تخلیق کس طرح سے اثر انداز ہوتی ہے۔ اگر کسی ... تخلیق سے زندگی نکھرتی اور سنورتی ہے ... تو ایسا مصنف ہمارے قبیلے میں سے ہے۔"

("روشنائی" صفحہ ۱۵۲ و ۱۵۳)

"ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض مصنفوں میں بیک وقت کئی قسم کے رجحانات ہوتے ہیں۔ بعض باتوں میں ... ترقی پسندی جھلکتی ہے ... بعض نظریے ایسے ہوتے ہیں جن میں اُلجھاؤ ہوتا ہے، جو رجعت پسند تک ہوتے ہیں۔ ایسے مصنفوں کی تحریر کا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر ان ... کا مجموعی اثر اچھا ہے، لطیف ہے ... اس سے کسی حد تک بھی معاشرتی یا انفرادی حقیقت پر اس طرح روشنی پڑتی ہے جس کی مدد سے انسان زیادہ دیکھ سکتے ہیں ... تو ہمیں ایسے مصنفین کے رجعتی پہلوؤں کو رد کرکے ان کے حیات آفریں پہلوؤں کو اپنانا چاہیئے۔" "روشنائی" صفحہ ۱۵۳

ان اقتباسات سے تین باتیں واضح ہوتی ہیں ۔پہلی یہ کہ آزادی پسندی اور جمہوریت پسندی ترقی پسندی کی بنیادی اقدار قرار دی گئی تھیں ۔دوسری یہ کہ ترقی پسند خیالات سے وہ خیالات مراد ہیں جو معاشرتی مسائل پر اثر انداز ہو سکیں اور سماج کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوں تیسری یہ کہ ایک ہی مصنف میں مختلف رجحانات ہو سکتے ہیں جن میں بعض ترقی پسند اور بعض رجعت پسند ہو سکتے ہیں اور اس مصنف کے ترقی پسند ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں فیصلہ اس کی تخلیق کے مجموعی اثر کی بنا پر کیا جائے گا ۔یہ آخری بات اپنے زمانے کے ادیبوں سے کہیں زیادہ ماضی کے ادیبوں پر صادق آتی ہے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ متعلقہ زمانے کی سماجی تاریخ کے گہرے مطالعے کی مدد سے کسی ادیب کے افکار و اقدار کا محاکمہ کیا جائے ، سماجی اقدار سے باخبر اور عہد آگاہ تنقید رواج پائے ۔

سجاد ظہیر عملی تنقید کے ان جان لیوا تقاضوں کو پورا نہیں کر سکے اور ان پر جو اعتراضات ،بعد میں وارد ہوئے اس کا سبب ان کے یہی تنقیدی محاکمے تھے ۔نیاز حیدر کی چلتی ہوئی نظموں کو انھوں نے وقتی تقاضوں کے پیش نظر اُن سے کہیں زیادہ اہم تخلیقات پر ترجیح دی ۔سماجی تنقید کے لئے زیادہ گہرے تجزیئے وسیع تر اور زیادہ ہمہ گیر مطالعے اور استقرار کی ضرورت تھی ۔عملی تنقید کے میدان میں ان کی تمام فروگذاشتیں تسلیم ، ان کا تنقید نگار کی حیثیت سے ان کا درجہ بلند نہیں ہے ۔تسلیم کہ وہ ادبی محاکموں میں غلطی کر سکتے تھے مگر تنگ نظری اور کٹھ ملائیت اُن میں نہ تھی ۔اسی لئے جب مرزا شوق کی مثنوی پر منہراج رہبر کا مقالہ چھپا اور حافظ کی غزلوں پر الٹی سیدھی بحثیں تصوف کے سیاق و سباق میں چلیں تو انھوں نے ان دونوں پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ۔مرزا شوق کی مثنوی پر ان کا مقالہ بہت عالمانہ نہیں لیکن اس سے نیا انداز نظر ضرور جھلکتا ہے ۔ان کا اصرار ہے تو اس بات پر کہ مرزا شوق کو انھیں کے زمانے کے پس منظر میں رکھ کر دیکھنا چاہئے جس زمانے میں یہ مثنوی لکھی گئی اس زمانے میں رفیقِ حیات کے انتخاب کی آزادی کے لئے سماج کے تعصبات و توہمات سے ٹکرانا ترقی پسندانہ اقدام تھا اور مثنوی میں زوال آمادہ تعیش پسندی کے بجائے اسی بت شکن ... ذی کے جذبے کو تلاش کرنا چاہیئے ۔

حافظ کی شاعری پر انھوں نے پوری کتاب لکھی : ذکرِ حافظ ۔ یہاں بھی وہ عاشق زیادہ ہیں عارف کم ۔حافظ پر ان کی نظر عالمانہ ڈھنگ سے نہیں پڑی ہے وہ تصوف میں انسان دوست فلسفے کا روپ دیکھتے ہیں ۔تصوف تنگ بند مذہبی رسوم کو رد کرتا ہے اور انسانوں کو مذہبی تفریق کی بنیاد پر تقسیم کرنے کے بجائے ان میں یک جہتی اور جمہوری مساوات قائم کرتا ہے تصوف کے اسی ترقی پسندانہ روپ پر ذکرِ حافظ میں اصرار کیا گیا ہے اور تصوف کی زوال آمادگی اور توہم پرستی کو رد کر کے اس کی صحت مندانہ روایات پر زور دیا گیا ہے ۔

ان کی تخلیقات میں "پگھلا نیلم" کو بھی ایک خاص مقام حاصل ہے ۔ یہ ان کی نثری نظموں کا مجموعہ ہے ۔ان نظموں میں آنکھیں چکاچوند کرنے والی شاعری نہیں لیکن تجربے کی حیثیت سے ان کی بڑی اہمیت ہے ۔ مثال کے طور پر ان کی یہ نظم ملاحظہ ہو عنوان ہے "دریا" ۔

آؤ میرے پاس آؤ نزدیک
یہاں سے دیکھیں
اس کھڑکی سے باہر
نیچے اک دریا بہتا ہے
دھندلی دھندلی ہلتی تصویروں کا
خاموشی سے بوجھل
زخمی سایوں میں
تیر چھپائے تھرتھراتے ، جلتے
کناروں کے پہلو میں
بے کل دکھی
اسے بھی نیند نہیں آتی

پوری نظم ایک سمبل ہے اور اس سمبل پر سے صرف ایک لفظ "بھی" نے نقاب ہٹا دی ہے ۔اس بے قراری کے پیچھے صرف شاعر کی نہیں شاید پوری کائنات کی کہانی جلوہ گر ہے اور کس رومانی رنگینی کے ساتھ ! ان کی شاعری کی یہی خصوصیت ہے ۔اس میں رومانی نوجوان کے خوابوں کی سی رنگینی اور رجائیت ہے "ارمان اور امید ہے ۔کبھی وہ اُس " باڑھ " کی امید میں گیت گاتے ہیں جو ساری دُنیا سے نفرت اور ظلم کو بہا لے جائے گی اور انسانوں کے دلوں کو معصومیت کا سویرا بخش دے گی ۔ کبھی مائیکا فسکی کی زبان سے دھرتی کے انسانوں کو گگارن اور تی توف کی طرح اونچا پھینکنے کا ارمان کرتے ہیں ۔ان کی نظموں میں صفات اور تشبیہات کا استعمال بہت ہے اور غزل کی امیجری کو اپنانے سے بھی وہ نہیں ہچکچاتے لیکن بحر اور قافیے کی مدد کے بغیر بھی ان نظموں میں ایک نرمی ، شائستگی اور لطافت قائم رکھی گئی ہے ۔جو سجاد ظہیر کی دردمندی ، انسان دوستی اور حسن دوستی کا پرتو ہے ۔

یہی نقطہ نظر " ذکرِ حافظ " کے تنقیدی رویے میں ظاہر ہوا ہے وہ لکھتے ہیں :

" ایک بڑا شاعر انسان اور اس کے حالات کے ساتھ صرف ہمدردی کا اظہار نہیں کرتا بلکہ وہ اپنی شاعری سے ہمارے دلوں میں ایسا پاکیزہ ہیجان پیدا کرتا ہے جو ہمیں انسانی

کے ساتھ مہر و محبت کے رشتوں کو اور بھی استوار کرنے کے لئے آمادہ اور مستعد کر دیتا ہے۔ وہ ہمارے مزاج میں زندگی کے حظ اور حسن کے احساس کو بڑھا کر طبیعتوں میں ایسا گداز اور ایسا کیف پیدا کرتا ہے جو ہمیں صدق و صفا کی جستجو کے لئے آمادہ کرتے ہیں۔ وہ ہمیں ایک لطیف طریقے سے بدل دیتا ہے تاکہ زیادہ حسّاس اور روشن ضمیر بن کر انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بہتر اور زیادہ طمانیت بخش تنظیم کی سعی اور جد و جہد میں ہماری نظر بلند ہو اور ہمارا قدم راست۔ شاعری کا بزرگ ترین منصب یہی ہے۔"

("ذکرِ حافظ" مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند) علی گڑھ ۱۹۵۶ء صفحہ ۲۸ ۲۹)

اس ضمن میں انہوں نے اس خیال کا اظہار بھی کیا ہے کہ ادب میں ہم جنہیں "ادبی قدروں" سے تعبیر کرتے ہیں وہ "ایسی سچائیاں ہوتی ہیں جن میں ابھی تک بہت کم تبدیلیاں ہوئی ہیں یا اگر ہوئی بھی ہیں تو سادگی سے زیادہ پیچیدگی کی جانب ہوئی ہیں یعنی ان کی نوعیت نہیں بدلی ہے۔ اسی وجہ سے یہ بالکل ممکن ہے کہ تین ہزار سال پہلے کے کسی قبائلی انسان کا برہ کا گیت آج بھی ہمارے لئے جذباتی معنویت رکھے اور ہمیں متاثر کرے لیکن اسی انسان کے سورج دیوتا کی عقیدت میں گائے ہوئے نغمے ہمیں جذباتی طور پر متاثر نہیں کریں گے۔" ("ذکرِ حافظ" صفحہ ۳۰)

حافظ نے عشق و محبت کے زمزمے گائے اور اس انداز سے گائے کہ عشق و محبت کے سامنے عقل اور علم کو خوار و زبوں قرار دے ڈالا جو بظاہر سجاد ظہیر کے ترقی پسندانہ نقطۂ نظر کے مخالف معلوم ہوتا ہے لیکن سجاد ظہیر کے نزدیک جس عقل اور علم کا مذاق حافظ نے اڑایا ہے وہ اپنے دور کے ارباب اقتدار اور ریاکاروں کے علم کا مذاق ہے کیونکہ یہ عقل اور علم انسانوں کے لئے سچی مسرت حاصل کرنے کے راستے میں رکاوٹ بنتے ہیں یا رکاوٹیں بنانے کے کام میں لائے جاتے ہیں۔

"حافظ کے نزدیک وہ قوت اور تحریک جو انسانوں کو اخلاقی، روحانی اور حسیاتی طور سے سرور و انبساط بخشتی ہے اور اس طرح ان کے باہمی تعلقات کو حسین اور پر لطف بناتی ہے، محبت و انس ہے۔ وہ محبت اور رفاقت کی فراوانی اور شدت کا مطالبہ کرتا ہے۔ تمام وہ چیزیں، ادارے، افراد اور اخلاقی و فلسفیانہ تصورات اور عقیدے جو شعلۂ عشق کی حدت کو کم کرتے ہیں جو انسان سے انسان کی رفاقت کی راہ میں رکاوٹیں ڈالتے ہیں، یا اسے منغض اور آلودہ کرتے ہیں، حافظ کے نزدیک قبیح اور مذموم ہیں ... اس کے برخلاف تمام وہ چیزیں اور حالات جو محبت و مودت میں اضافہ کرتے ہیں جن سے حسیات اور ان سے حاصل ہونے والی لذتوں کی پاکیزہ اور حسین تکمیل ہوتی ہے جو انسانی تعلقات میں لطف و سرور پیدا کرتے ہیں، حافظ ان کا پرجوش حامی اور طرفدار ہے۔" ("ذکرِ حافظ" صفحہ ۴۷)

وہ اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ حافظ نے اپنے دور کے امرا کی تعریف میں اشعار بھی لکھے اور اس کے کلام میں جا بجا سخت قسم کی تقدیر پرستی اور دنیا کو فانی اور ہیچ جاننے کا رجحان بھی پایا جاتا ہے مگر اس کے باوجود حافظ کی شاعری کا اصلی جوہر یہ منفی میلانات ہیں نہ وہ عیش کوشی ہے جسے غلطی سے عیاشی کے ہم معنی سمجھ لیا گیا، بلکہ محبت کی وہ پاکیزگی ہے جو تہذیبِ نفس کا عظیم کارنامہ ہے کہ وہ حسیاتی لذت کو ایک بلند تر اور لطیف تر سطح پر لے جا کر گویا جسم و روح دونوں کا تزکیہ کرتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"حافظ پر عیش پرستی کا الزام لگانے والوں کو غور کرنا چاہیئے کہ محبت کے جذبے کو اس کی جبلی سطح سے بلند کر کے اس میں شرافت، رفاقت اور ایک طرح کی روحانی سرفرازی کے احساسات اتنے حسین اور لطیف طریقے سے پیدا کرنا، کیا انسان کی تہذیبِ نفس کا ایک عظیم کارنامہ نہیں ہے؟"

("ذکرِ حافظ" صفحہ ۵۹)

اس سے اندازہ ہوگا کہ سجاد ظہیر شاعری ہی میں نہیں عملی تنقید میں بھی شرافت، رفاقت اور روحانی سرفرازی کی اقدار کی تلاش پر زور دیتے تھے۔

آزادی کے بعد کے دور میں سجاد ظہیر زیادہ تر کانفرنسوں اور سے می ناروں کے ہو کر رہ گئے تھے۔ افرو ایشیائی ادیبوں کی تنظیم میں خاص طور پر انہیں دلچسپی تھی۔ آزادی سے قبل ہر مکتبۂ خیال کے ادیبوں کو سامراج دشمنی کی سطح پر جمع کر لینے میں انہیں جو کامیابی حاصل ہوئی تھی وہ آزادی کے بعد کے دور میں نہیں ہوئی۔ اب زمانے کے تقاضے اور تھے اور ترقی پسندی کے مطالبے کچھ اور تھے اور ان کے بہت سے ساتھیوں اور نیازمندوں کو بھی ان سے بنیادی معاملات میں اختلاف تھا لیکن ان اختلافات کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ سر سید احمد خاں کی علی گڑھ تحریک کے بعد وہ اردو ادب کی سب سے بڑی ادبی تحریک کے بانی اور محرک تھے اور ترقی پسند تحریک کی طرح سجاد ظہیر بھی ہماری ادبی تاریخ کے آئینہ خانے میں زندہ رہیں گے۔

قمر رئیس
ریڈر شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی۔ دہلی،

سجّاد ظہیر ——— اور ——— ترقی پسند ادبی تحریک

بیسویں صدی میں جس ادبی تحریک نے ہندوستانی ادب کا رخ بدل دیا۔ اس کے آہنگ و اسلوب اور مزاج و کردار پر دُور رس اثرات ڈالے، وہ ترقی پسند تحریک ہے۔ نہ صرف اردو بلکہ دوسری ہندوستانی زبانوں میں بھی اس تحریک کو جو ہمہ گیر مقبولیت حاصل ہوئی، اس کے زیر اثر شعر و ادب میں جو نئے رجحانات رونما ہوئے، مواد، موضوع اور تکنیک کے جو کامیاب تجربے ہوئے ہندوستانی ادب کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہ حقیقت جہاں اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندوستانی تہذیب اور ادب میں اس تحریک کے پروان چڑھنے کے لئے حالات سازگار تھے وہاں اس بات کو فراموش کرنا بھی ممکن نہیں کہ اس تحریک کے رہنما اور معمار اعلیٰ درجے کی تنظیمی صلاحیت کے مالک تھے۔ اُن میں وہ سچی لگن، ایثار و استقلال کا وہ جذبہ اور دانشمندانہ قیادت کی وہ صلاحیت موجود تھی جس کے بغیر کوئی بھی تحریک اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔

اس تحریک کے اوّلین معمار اور سب سے بڑے رہنما سید سجاد ظہیر تھے۔ ان کی ذہانت بصیرت سنجیدہ انہماک اور ان کی بہترین تنظیمی اور تعمیری صلاحیت سے اس تحریک نے ہمہ گیر مقبولیت اور قوت حاصل کی۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ ہندوستانی سماج اور تہذیب میں اس تحریک کے پنپنے اور برگ و بار لانے کے آثار و علائم پہلے سے موجود تھے۔ زمین نم اور زرخیز تھی، آب و ہوا سازگار تھی، ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے تیزی سے بدلتے ہوئے ہندوستانی سماج، انسانی رشتوں اور عوامی تحریکوں میں اس تحریک کی جڑوں کو ڈھونڈ نکالا اور اس تحریک کا رشتہ آزادی، جمہوریت اور سماجی انصاف کے لئے ہندوستانی عوام اور ساری دنیا کے عوام کی بڑھتی ہوئی جدوجہد سے جوڑا اور مضبوط بنایا۔

سجاد ظہیر نے لکھا ہے۔

"ملک کے ہر ایک حصے میں ترقی پسند ادب کی تحریک ایک ناگزیر واقعہ کی طرح نمودار ہو رہی تھی۔ ہماری تہذیب کا ماضی اور حال اس نئے ارتقا کا متقاضی تھا۔ ہم باہر سے کوئی اجنبی دانا لاکر اپنے کھیتوں میں نہیں بو رہے تھے۔"

روشنائی ص۴۲

گذشتہ چالیس سال کی مدت میں یوں تو اس تحریک نے ملک کی تمام ترقی یافتہ زبانوں کے ادب کو متاثر کیا لیکن یہ واقعہ ہے کہ اردو میں اس تحریک کے اثرات کچھ زیادہ ہی وسیع اور دُور رس رہے ہیں، اس کا ایک سبب شاید یہ ہو کہ اردو شعر و ادب میں ظلم و جبر کی قوتوں کے خلاف بغاوت اور سماجی انصاف اور آزادی کی حمایت کو ہمیشہ ایک برگزیدہ قدر کا درجہ حاصل رہا ہے دوسرا یہ کہ پریم چند، اقبال، جوش، حسرت موہانی اور بعض دوسرے قوم پرست ادیبوں کی تخلیقات میں آزادی، جمہوریت، سامراج دشمنی اور اشتراکیت کے تصورات پہلے ہی اپنی جگہ بنا چکے تھے اور رومانی باغیانہ فکر کی ایک توانا لہر سارے ادب میں دوڑ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اردو میں اس تحریک کی مقبولیت کا ایک بڑا سبب یہ بھی رہا ہے کہ اس کے سب سے بڑے رہنما سید سجاد ظہیر خود اردو کے ادیب تھے۔ اردو ادیبوں اور دانشوروں کے حلقوں میں ان کی کوششیں اور سرگرمیاں زیادہ موثر ثابت ہوئیں اور اس لئے اردو میں اس تحریک کو نسبتاً زیادہ فروغ حاصل ہوا۔

سجاد ظہیر کی زندگی کا بیشتر اور بہترین زمانہ اسی تحریک کی تعمیر اور تہذیب میں بسر ہوا۔ ان کی شخصیت اس کی متحرک روح تھی۔ ایک بار لینن کے ایک طاقتور حریف اور منشویک جماعت کے رہنما نے اعتراف کیا تھا کہ مخالف نظریہ و فکر کا مقابلہ اور بطلان تو دشوار نہیں لیکن ایک ایسے انسان (لینن) پر فتح پانا ناممکن ہے جو مارکسی نظریہ و فکر کی زندہ مورت ہو، جو ہر لحظہ اپنے نظریہ کی ترویج و دفاع کے لئے سائنسی استدلال سے مسلح رہتا ہو۔ سجاد ظہیر بھی ترقی پسند نظریۂ ادب کی ترویج و اشاعت کیلئے ہمیشہ اسی طرح کمربستہ رہتے تھے۔ جو لوگ انھیں قریب سے جانتے ہیں، ان سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ کوئی بھی صحبت یا محفل ہو وہ ترقی پسند ادب، اقدار اور آدرشوں پر بات کرتے تھے۔ فن و ادب کے ان مسائل کو چھیڑتے تھے جن پر انھوں نے ترقی پسند نقطۂ نگاہ سے غور و فکر کیا تھا، یا جو انھیں بے چین رکھتے تھے۔ عالمی ادب اور انسانی تہذیب کی تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی۔ قانون کی اعلیٰ تعلیم نے ان کے ذہن کو منطقی استدلال کی قوت دی تھی۔ پھر ان کے طرز گفتگو میں ایسی سادگی، نرمی، شائستگی اور خود اعتمادی ہوتی تھی کہ بات مخاطب کے دل میں بیٹھ جاتی تھی۔ اکثر ان کے حریف بھی جب ان سے ملتے تو ان کے نقطۂ نگاہ اور خیالات سے

متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے۔ ان کی شخصیت خودپسندی، خودنمائی اور ادعائیت کے اس سمارحانہ احساس سے عاری تھی جو عام طور پر بڑے دانشوروں اور رہناؤں میں پیدا ہوجاتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کو مقبول بنانے میں ان کی پُرخلوص اور پُروقار شخصیت کی سحرکاری اور دلداری کا بھی بڑا دخل رہا ہے۔

ترقی پسند ادیبوں کی تنظیم کا خیال کب پیدا ہوا۔ اور کن حالات میں اس تحریک نے جنم لیا۔ اس کی تفصیلی روداد سجاد ظہیر نے اپنے مضمون "یادیں" ۱۹۴۰ء اور اپنی کتاب "روشنائی" میں لکھی ہے۔ اس صدی کے چوتھے عشرہ میں وہ انگلستان میں قانون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جرمنی میں ہٹلری فاشزم کا طلوع ساری دنیا کی امن پسند جمہوری قوتوں کے لئے ایک سنگین خطرہ بنتا جا رہا تھا۔ جرمنی، اسپین، اطالیہ اور آسٹریلیا کے بعد فرانس میں بھی فاشسٹ اور رجعت پسند طاقتیں سر اٹھا رہی تھیں۔ عالمی معاشی بحران کی گرفت مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ ہندوستان میں ۱۹۳۰ء اور پھر ۱۹۳۲ء کی ستیہ گرہ کی تحریک کو بڑی بیدردی سے کچلا جا چکا تھا۔ تحریکِ آزادی کے کم و بیش تمام رہنما قید کئے جا چکے تھے۔ ہنگامی قوانین اور حکومت کے جبر و تشدد سے ہر طرف خوف و ہراس کی فضا طاری تھی۔ نوجوانوں میں غم و غصہ اور احساسِ بے چارگی نے عجیب ہیجانی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اور انگلستان میں رہنے والے ہندوستانی نوجوانوں میں بھی غلامی اور جبر و استبداد کے وحشیانہ نظام سے آزادی حاصل کرنے کے جذبات پرورش پا رہے تھے۔ ان حالات کا ذکر کرتے ہوئے سجاد ظہیر نے لکھا ہے۔

"ہم رفتہ رفتہ سوشلزم کی طرف مائل ہوتے جا رہے تھے ہمارا دماغ ایک ایسے فلسفہ کی جستجو میں تھا۔ جو ہمیں سماج کی دن بدن بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں کو سمجھنے اور ان کے سلجھانے میں مدد دے سکے ... مارکس اور دوسرے اشتراکی مصنفین کی کتابیں ہم نے بڑے شوق سے پڑھنا شروع کیں۔ جیسے جیسے ہم اپنے مطالعہ کو بڑھاتے آپس میں بحثیں کرکے تاریخی سماجی اور فلسفیانہ مسئلوں کو حل کرتے۔ اسی نسبت سے ہمارے دماغ اور روشن ہوتے اور ہمارے قلب کو سکون ہوتا جاتا تھا۔ یونیورسٹی کی تعلیم ختم کرنے کے بعد یہ ایک نئے لامتناہی تحصیلِ علم کی ابتدا تھی۔"

نیا ادب اور کلیم۔ جلد ۲ نمبر ۱ صفحہ ۷

یہ ان کے اُس ذہنی سفر اور اُس تحریک کا نقطہ آغاز تھا جو آج ہمارے ادب اور ادبی تاریخ کا قابلِ فخر حصہ ہے۔ سجاد ظہیر ۱۹۳۱-۳۲ء میں چھ ماہ کی رخصت پر ہندوستان آئے تھے۔ یہاں ۱۹۳۲ء ہی میں انھوں نے اپنے ہم خیال اور ہم عمر نوجوان ادیبوں کی دس کہانیوں کا مجموعہ "انگارے" کے نام سے لکھنؤ سے شائع کیا۔ جس میں پانچ کہانیاں خود ان کی اور باقی احمد علی، رشید جہاں اور محمود الظفر کی تھیں۔ فنی نقطہ نگاہ سے یہ کہانیاں خام اور کمزور رہی لیکن اُن کے ذریعے اردو میں حقیقت نگاری کی ایک نئی روایت کی داغ بیل پڑی جو پریم چند اور سدرشن کی اصلاحی اور عینیت پسندانہ حقیقت نگاری سے بہت مختلف تھی۔ اس میں بقول سجاد ظہیر سماجی رجعت پرستی اور دقیانوسیت کے خلاف غصہ اور ہیجان کا بے باکانہ اور باغیانہ اظہار تھا۔ اختر حسین رائے پوری نے ایک فرضی نام سے رسالہ "اردو" میں اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے اس نئے رجحان کو سراہا۔ ہر چند کہ یہ کتاب قدامت پسندوں کے احتجاج پر حکومت نے ضبط کرلی لیکن اردو افسانوی ادب میں اس نے ایک نئے موڑ کی نشاندہی ضرور کی۔ اس کے اثرات خاموشی سے اپنی جگہ بناتے رہے۔ پریم چند جیسے کہنہ مشق ادیب بھی نوجوانوں کی ان سرگرمیوں میں گہری دلچسپی لے رہے تھے۔

سجاد ظہیر اس مختصر قیام کے بعد جب لندن واپس گئے تو اس کتاب کی اشاعت سے ہی نہیں اس کی ضبطی سے بھی ان کے حوصلے بلند تھے۔ انھیں یقین ہو گیا تھا کہ ادیب اور دانشور بھی اپنے وطن کے مقدر کو بدلنے اور بنانے میں اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ انھوں نے ہندوستان کے چند انقلابی نوجوانوں کے تعاون سے لندن میں ترقی پسند ادیبوں کا ایک حلقہ بنایا جسے ۱۹۳۵ء میں باضابطہ "ہندوستانی ترقی پسند مصنفین کی انجمن" کا نام دیا گیا۔ اس کے جلسے پابندی سے ہونے لگے۔ اور اس کا ایک مینی فیسٹو بھی سائیکلو اسٹائل کرا کے سجاد ظہیر نے ہندوستانی مصنفین کو بھیجا۔ منشی پریم چند کو جب یہ مینی فیسٹو ملا تو انھوں نے نہ صرف یہ کہ اسے اپنے رسالہ "ہنس" میں شائع کیا بلکہ ایک ادارتی نوٹ میں ترقی پسند مصنفین کی اس انجمن اور اس کے مقاصد کو لبیک کہا۔

"ہم اس 'تنظیم' کا دل سے خیر مقدم کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ زندہ و تابندہ ہو۔ ہمیں اصل میں ایسے ہی ادب کی ضرورت ہے۔ اور ہم نے یہی آدرش اپنے سامنے رکھا ہے۔ 'ہنس' بھی ان ہی مقاصد کیلئے جاری کیا گیا ہے۔"

ساہتیہ کا اُدیشن صفحہ ۲۵۶

اسی زمانہ میں پریم چند نے اپنی مشہور کہانی "کفن" لکھی جو دسمبر ۱۹۳۵ء کے رسالہ "جامعہ" میں شائع ہوئی۔ انگارے کی کہانیوں میں بے لاگ اور باغیانہ حقیقت نگاری کا جو انداز سامنے آیا تھا یہ کہانی اس کی نکھری ہوئی اور فنی اعتبار سے زیادہ ترقی یافتہ صورت تھی۔ گویا اس طرح پریم چند نے اپنی اصلاحی اور عینیت پسندانہ حقیقت نگاری کی روایت سے خود ہی انحراف کیا تھا۔

منشی پریم چند کی طرح ہندوستان کے دوسرے ادیبوں نے بھی اس تحریک اور اس کے مقاصد کی تائید کی۔ انھیں محسوس ہوا کہ یہ ان کے دل کی بھی نہیں وقت کی آواز ہے۔ اس سے سجاد ظہیر کو مزید حوصلہ ملا۔ اسی زمانہ میں پیرس میں فاشزم کے بڑھتے ہوئے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے نئے ادیبوں کا ایک عالمی اجتماع ہوا جس میں میکسم گورکی، رومین رولاں، ہنری باربس اور ٹامس مان جیسے عالمی شہرت رکھنے والے ادیبوں نے شرکت کی۔ اجتماع میں اس پر زور دیا گیا کہ رجعت پسند طاقتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے اور تہذیب و انسانیت کی اعلیٰ قدروں کے تحفظ کے لئے ساری دنیا کے روشن خیال ادیبوں کو متحد اور بیدار ہو جانا چاہئے۔ سجاد ظہیر نے لکھا ہے کہ اس عالمی اجتماع کی کامیابی سے ان کے عزائم اور بھی بلند ہو گئے۔

۱۹۳۵ء میں جب تعلیم سے فارغ ہو کر سجاد ظہیر وطن واپس آئے تو ملک میں اس تحریک کو پھیلانے اور اسے کامیاب بنانے کا نصب العین ان کے سامنے تھا۔ اپنے والدین کے ساتھ وہ الٰہ آباد میں رہنے لگے وہاں پریم چند، احمد علی، فراق گورکھپوری اور ڈاکٹر اعجاز حسین پہلے ہی اس تحریک کے ہم نوا ہو چکے تھے۔

سجاد ظہیر ان سے اور پھر مولوی عبدالحق، جوش ملیح آبادی، ڈاکٹر تارا چند، رشید جہاں اور دوسرے نوجوان ادیبوں سے رابطہ قائم کیا۔ سب نے ان کی تائید کی۔ ہمت بڑھائی۔ وہ اس تحریک کو صرف اردو تک محدود دیکھنا نہیں چاہتے تھے بلکہ دوسری بڑی زبانوں میں بھی اسے فروغ دینے کی خواہش رکھتے تھے۔ اس مقصد سے انھوں نے چند ماہ کے اندر ہندی، پنجابی، بنگالی اور گجراتی زبان کے ادیبوں سے رابطہ قائم کیا۔ وہ بڑی سرگرمی، مستعدی اور جنونانہ لگن سے کام کر رہے تھے۔ اس تحریک کی تنظیم اور ادیبوں کے اشتراکِ فکر و عمل کے بارے میں بہت سے مسائل اگر ان کے ذہن میں روشن تھے تو کچھ نیم روشن اور غیر واضح بھی تھے۔

"روشنائی" میں انھوں نے لکھا ہے، جب ہم نے ترقی پسند ادبی تحریک کی تنظیم کی جانب قدم اٹھایا تو چند باتیں خصوصیت کے ساتھ ہمارے سامنے تھیں۔ پہلی تو یہ کہ ترقی پسند ادبی تحریک کا رخ ملک کے عوام کی جانب، مزدوروں، کسانوں اور درمیانے طبقے کی طرف ہونا چاہئے۔ ان کو لوٹنے والوں اور ان پر ظلم کرنے والوں کی مخالفت کرنا، اپنی ادبی کاوش سے عوام میں شعور، حس، حرکت، جوشِ عمل اور اتحاد پیدا کرنا اور تمام ان آثار و رجحانات کی مخالفت کرنا جو جمود، رجعت، پست ہمتی پیدا کرتے ہیں، ہمارا اولین فرض ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس عہد کے ہندوستان میں ایک ترقی پسند ادیب کا منصب کم از کم ان کے ذہن میں واضح تھا اور ان کا خیال تھا کہ ادیبوں کی تنظیم کے ذریعے اس تصور کو زیادہ سے زیادہ ادیبوں کی تائید اور حمایت حاصل ہو سکتی ہے۔ چنانچہ چند ماہ کی تیاری کے بعد انھوں نے ترقی پسند ادیبوں کی پہلی کانفرنس کا اعلان کر دیا۔ جو اپریل ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں منعقد ہوئی۔ اس کی صدارت منشی پریم چند نے کی اور اس میں حسرت موہانی، چودھری محمد علی ردولوی، ڈاکٹر عبدالعلیم، احمد علی، فیض احمد فیض، فراق گورکھپوری، ساغر نظامی، رشید جہاں اور دوسرے نوجوان ادیبوں نے شرکت کی۔ کانفرنس عام توقعات سے زیادہ کامیاب رہی۔ اس میں پریم چند نے جو خطبہ پڑھا وہ ترقی پسند نظریۂ ادب کی وضاحت کے سلسلہ میں ان کے منشور سے بھی زیادہ جامع اور مؤثر ثابت ہوا۔ بعد میں سجاد ظہیر نے اس کا انگریزی ترجمہ اور کانفرنس کی روداد کتابی شکل میں

Towards Progressive Litrature

کے نام سے شائع کی۔ کانفرنس میں سجاد ظہیر کو ہی اس کا جنرل سکریٹری چنا گیا تھا اس لئے اس کی قرار دادوں اور پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کی ذمہ داری انہی کی تھی۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا کام مختلف شہروں میں انجمن کی شاخوں کا قیام تھا۔ ملک میں ادیبوں کی یہ پہلی انجمن تھی جس کی تنظیم زندگی اور ادب کے بارے میں کچھ واضح اور مشترک مقاصد کے تحت عمل میں آ رہی تھی۔ سجاد ظہیر نے مسلسل تگ و دو کے بعد چند ماہ کے عرصہ میں الٰہ آباد، بنارس، لکھنؤ، کانپور، علیگڑھ، پٹنہ، لاہور، دہلی اور امرتسر میں اس کی شاخیں قائم کر لیں۔ نوجوان ادیبوں کے ساتھ ساتھ پریم چند جیسے بزرگ اور نامور ادیب بھی جو اس زمانہ میں سخت علیل تھے، بڑی مستعدی اور جوش سے تنظیمی کاموں میں سجاد ظہیر کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔

اپنے ۱۰ر مئی ۱۹۳۶ء کے ایک خط میں پریم چند نے بنارس سے سجاد ظہیر کو لکھا تھا۔

"میں نے یہاں ایک برانچ قائم کرنے کی کوشش کی ہے تم اس کے متعلق جتنا لٹریچر ہو، وہ سب بھیج دو۔ تو میں یہاں کے لکھنے والوں کو ایک دن جمع کر کے بات چیت کروں۔ بنارس قدامت پرستی کا اڈا ہے اور یہیں شاید مخالفت کا بھی سامنا کرنا پڑے۔ لیکن دو چار بھلے آدمی تو مل ہی جائیں گے جو ہمارے ساتھ اشتراک کر سکیں۔ پھر میں پٹنہ بھی جاؤں گا اور وہاں بھی ایک شاخ قائم کرنے کی کوشش کروں گا۔"

'روشنائی' ص ۱۷۳

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب پریم چند جیسی عمر اور مرتبہ کے ادیب اس تحریک کو فروغ دینے میں ایسے والہانہ شغف سے کام کر رہے تھے تو دوسرے نوجوان ادیب کیسی لگن اور دلچسپی سے اسے کامیاب بنانے کی کوشش کر رہے ہوں گے۔ ایک سال بھی مشکل سے گذرا

تھا کہ کرشن چندر، علی سردار جعفری، راجندر سنگھ بیدی، مجاز، جذبی، سید احتشام حسین، مخدوم محی الدین، اختر انصاری، احمد ندیم قاسمی، مرزا ادیب کیفی اعظمی اور سبط حسن جیسے با صلاحیت ادیب اس تحریک کے سرگرم رکن بن گئے۔ اس کے ساتھ ہی ایسے نوجوان ادیب بھی اس تحریک سے متاثر ہوئے اور اس کے قریب آئے جو گاندھیائی یا قوم پرستانہ نقطۂ نظر رکھتے تھے مثلاً حیات اللہ انصاری، آنند نرائن ملا، علی عباس حسینی، ساغر نظامی، علی جواد زیدی، سہیل عظیم آبادی وغیرہ۔

سجاد ظہیر کی کوشش یہی تھی، اور ا نکا خیال تھا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے دروازے ان تمام ادیبوں کے لئے کھلے ہوں۔ جو ملک کی آزادی، سماجی انصاف اور جمہوریت کے لئے عوام کی جدوجہد کی حمایت کرتے ہیں، جو زندگی کے بارے میں ایک واضح سائنسی اور عقلی نقطۂ نگاہ رکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس تحریک اور تنظیم نے بھی ایک متحدہ محاذ کی صورت اختیار کرلی جس میں ہر فکر و خیال اور ہر سیاسی مسلک کے ادیب شریک تھے۔ جواہر لال نہرو، سروجنی نائیڈو، رابندر ناتھ ٹیگور، اچاریہ نریندر دیو، جے پرکاش نرائن، مولوی عبدالحق، ڈاکٹر عابد حسین، ڈاکٹر محمد اشرف سب کی حمایت اور سرپرستی اسے حاصل تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ان مختلف الخیال اور ممتاز دانشوروں کو ترقی پسند تحریک کے پلیٹ فارم پر جمع کر لینا آسان نہیں تھا۔ پھر یہ تحریک صرف اردو ہندی تک محدود نہیں تھی۔ بنگالی، گجراتی، مراٹھی، تامل اور دوسری زبانوں میں بھی یہ پودا برگ و بار لا رہا تھا۔ سجاد ظہیر نے بار بار اس پر زور دیا کہ اس تحریک کا بڑا مقصد ملک کی تمام زبانوں کے عوام دوست ادیبوں کو متحد کرنا اور انھیں مل جل کر اپنے مشترکہ مسائل پر غور و فکر کرنے کی دعوت دینا ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اس طرح علاقائی اور لسانی حدیں ٹوٹیں گی۔ علیحدگی تفریق اور تعصب کا احساس کم ہوگا اور قومی ادب کو فروغ ہوگا۔ مختلف شہروں میں انجمن کی جو شاخیں قائم ہوئی تھیں انکے جلسوں میں مختلف زبانوں کے ادیب حصہ لیتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اس مقصد میں انجمن کو قابلِ لحاظ کامیابی حاصل ہوئی۔

تحریک کی ابتدائی تشکیل کے دوران سجاد ظہیر نے ایک دوسرے اہم پہلو پر بھی خاص زور دیا۔ وہ تھا ادب کو محنت کش عوام کی زندگی ان کے مسائل ان کی آرزؤں اور حوصلوں کا ترجمان بنانا۔ ہندی، بنگالی اور گجراتی کے بہت سے ادیب دیہاتوں اور محنت کش عوام کی صفوں سے نکل کر آئے تھے اور ان کے دکھ سکھ کی موثر ترجمانی کر رہے تھے۔ سجاد ظہیر کی کوشش اور خواہش یہی تھی کہ اُردو کے نوجوان ادیب بھی پریم چند کی طرح محنت کش عوام کی زندگی اور ان کی تحریکوں کے قریب آئیں۔ اُن کا خیال تھا کہ اُردو ادب میں، جس کا بڑا سرمایہ اُمرا اور متوسط طبقہ کی تہذیبی اور جذباتی فضا کا ترجمان رہا ہے، اس طرح زیادہ وسعت، زیادہ قوت پیدا ہوگی اور اردو کی ادبی زبان عام بول چال کی زبان سے قریب آئے گی۔

سردار جعفری، کیفی اعظمی اور مخدوم جیسے ادیب و شاعر، مزدوروں کی تحریکوں میں سرگرمی سے حصہ لے رہے تھے۔ اس مقصد کے پیش نظر عام ادبی جلسوں کے علاوہ ایسے شہروں اور علاقوں میں بھی ترقی پسند ادیبوں کے اجتماع ہونے لگے جہاں مزدوروں کی تحریکیں زیادہ منظم تھیں۔ چنانچہ کلکتہ، بمبئی، احمد آباد، سورت، کانپور، مالیگاؤں اور مشرقی یوپی کے بعض علاقوں میں ترقی پسند ادیبوں کے جو اجتماع ہوئے ان کی کامیابی کا ایک سبب وہاں کے محنت کش عوام کی بیداری اور ان کی سرگرم شرکت بھی تھی بقول سجاد ظہیر "بیدار اور باشعور محنت کشوں نے ہماری ادبی تحریک کو پھیلانے اور مقبول بنانے اور اس کی پشت پناہی کرنے میں بہت بڑا حصہ لیا۔"

حقیقت یہ ہے کہ گذشتہ چالیس سال میں ترقی پسند ادیبوں کے ہاتھوں اُردو شعر و ادب کی مختلف اصناف میں جو وسعت، تازگی اور رنگا رنگی پیدا ہوئی، مشاہدہ و تخیل کی جو گہرائی اور نیرنگی آئی، جو جاندار تجربے ہوئے وہ ملک کے عوام کی زندگی سے اسی قربت کا نتیجہ ہیں۔ ترقی پسند ادیبوں نے حقیقت نگاری کا جو تصور پیش کیا، اس میں زندگی اپنی ساری گہماگہمی، تہہ داری اور تنوع کے ساتھ ایک کل کے طور پر سمٹ آئی ہے۔ اس سے اردو شعر و ادب میں نئی سمتوں اور نئے امکانات کے دروازے کھل گئے۔

سجاد ظہیر کی شخصیت کا جوہر اعتدال و توازن کا ایک عجیب و غریب احساس تھا۔ عجیب اس لئے کہ وہ مارکسزم کے جس مسلک اور جس سیاسی جماعت سے وابستہ تھے اس میں سمجھوتہ کی گنجائش نہیں تھی۔ پھر جس دور میں انھوں نے اسے قبول کیا وہ انتہا پسندی کا دور تھا اور ادب میں بھی نظری اور عملی طور پر مارکسزم کا اطلاق بہت میکانکی ڈھنگ سے کیا جا رہا تھا۔ سجاد ظہیر ابتدا ہی سے اس افراط و تفریط سے نہ صرف خود بچے رہے بلکہ تحریک کو بھی اس سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی۔ ۱۹۳۹ء میں ہی انھوں نے اپنے ایک مضمون "اُردو کی جدید انقلابی شاعری" میں ان شعراء کو "ادبی دہشت انگیزی" کا مرتکب قرار دیا تھا اور ان کی کڑی نکتہ چینی کی تھی جو انقلاب کی ایک رومانی اور بھیانک تصویر کھینچ رہے تھے اور ایک "بلند منبر" پر کھڑے ہوکر مزدوروں، کسانوں اور نوجوانوں کو خطاب کر رہے تھے۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ اس تحریک میں انتہا پسندی اور ادعائیت کا دور اس وقت آیا جب سجاد ظہیر پاکستان جا چکے تھے اور مئی ۱۹۴۹ء کی بھیونڈی کانفرنس میں پرانے منشور کو رد کرکے ایک نیا منشور منظور کیا گیا، جس کے نتیجے میں ترقی پسند ادیبوں میں باہمی اختلاف، ادعائیت، انتشار اور کم نگاہی کی ایسی فضا پیدا ہوئی جس سے تحریک کو نقصان پہنچا، اگر سجاد ظہیر ہندوستان میں ہوتے تو کم از کم ادبی سطح پر "دار و گیر" کی وہ صورت پیدا نہ ہوتی جو ہوئی۔

مارکسی ہونے کے باوجود سجاد ظہیر کا نظریۂ ادب اُس تنگ نظری اور انتہا پسندی سے پاک تھا جو اس دور کے بعض دوسرے مارکسی نقادوں کی تحریروں میں نظر آتا ہے۔ وہ قدیم کلاسیکی ادب یا علامتی اور غنائی شعر و ادب کو محض جاگیردارانہ یا بورژوا مذاق و فکر کا کرشمہ کہہ کر رد نہیں کرتے تھے بلکہ اس کے اعلیٰ نمونوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ صرف مواد، موضوع یا انقلابی فکر پر نہیں تکنیک، فن اور زبان و بیان کی لطافتوں پر بھی یکساں نظر رکھتے تھے۔

"روشنائی" میں ایک موقع پر لکھتے ہیں۔

"ہماری تحریک کے پھیلاؤ اور عوام سے ہماری بڑھتی ہوئی قربت اور ان سے براہ راست تعلق کے پیش نظر اب یہ اور بھی ضروری ہو گیا تھا کہ نئے حالات میں ترقی پسند ادب کے تمام تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے فن اور تکنیک کے مسائل پر مسلسل غور و فکر کیا جائے۔ تنقید بہتر ہو۔ زبان و بیان پر عبور حاصل کرنے کی سعی کی جائے۔ ہمارے مبلغ علم میں اضافہ ہو۔ اور پیہم مشق اور تجربے کے ذریعے سے اپنی خامیاں اور کمزوریاں دور کر کے ادبی تخلیق کی تمام اصناف کی سطح کو بلند اور معیار کو اونچا کرنے کی کوشش برابر جاری رہے"

(روشنائی ص ۳۸۹)

ترقی پسند ادیبوں کے ایک اجتماع میں جب مولانا حسرت موہانی نے اپنی غزل کی شاعری کو ہوسناکی کی شاعری قرار دیا اور کہا کہ ترقی پسند ادیبوں کی تخلیقات سنجیدہ اور بلند مقاصد کی ترجمان ہوں تو سجاد ظہیر نے انکی رائے سے اختلاف کیا اور لکھا کہ ہمیں غزل کی شاعری، غنائی شاعری کی بھی ضرورت ہے شعر و ادب کے بارے میں ان کے اس صحت مند اور متوازن رویے کا مطالعہ اُن کی قابلِ قدر کتاب "ذکرِ حافظ" اور مضمون "اُردو غزل" میں بھی کیا جا سکتا ہے۔

سجاد ظہیر کی وسیع المشربی اور بلند خیالی اپنی جگہ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ تحریک کے بنیادی مقاصد کا سودا یا رجعت پسند خیالات سے سمجھوتہ کر سکتے تھے۔ جب اثر لکھنوی، ماہر القادری، خواجہ شفیع اور دوسرے بزرگ ادیبوں نے ترقی پسند ادب اور نظریۂ ادب پر حملے کئے تو انھوں نے مدلل طریقے سے ان اعتراضات کا جواب دیا۔

اپنے مختلف مضامین میں انھوں نے نہ صرف زندگی، تہذیب اور ادب کے بارے میں ترقی پسند نظریات کی وضاحت کی بلکہ ان رجعت پسند اور عوام دشمن خیالات اور رجحانات کو بھی بے نقاب کیا جو دبے پاؤں ادب میں در آتے یا لائے جاتے ہیں۔ انھیں احساس تھا کہ قدامت پسندوں یا تحریک کے مخالفوں کے پاس نشر و اشاعت کے بہتر ذرائع ہیں اس لئے ترقی پسند ادب اور ادبی تصورات کی اشاعت کے لئے انھوں نے اشاعتی اداروں کے قیام اور ترقی پسند رسالوں کے اجراء پر بھی بہت زور دیا۔ ان ہی کی کوشش سے لکھنؤ میں حلقہ ادب کے نام سے ترقی پسندوں کا اشاعت گھر قائم ہوا۔

ترقی پسند تحریک کے آغاز و ارتقا کا زمانہ ملک میں فرقہ وارانہ کشیدگی اور اردو ہندی کی بڑھتی ہوئی چشمک اور نزاع کا دور تھا۔ علاقائی، فرقہ وارانہ اور لسانی تنگ نظری اور عصبیت سے سجاد ظہیر سخت برہم اور بے زار رہتے تھے۔ انھوں نے کوشش کی کہ ان مسائل کے بارے میں ادیبوں کا ذہن صاف ہو اور اس کا زہر ادب میں نہ پھیلے۔ ملک کی قومی زبانوں خاص طور سے اردو ہندی کے مسئلہ پر وہ ایک وسیع علمی اور عوامی نقطۂ نگاہ سے غور و فکر کرتے تھے جس کا ثبوت اردو ہندی اور ہندوستانی کے مسئلہ پر ان کا وہ وقیع خطبہ ہے جو ۱۹۴۵ء کی حیدرآباد کانفرنس میں انھوں نے پڑھا تھا۔ مہاتما گاندھی اور پریم چند کی طرح وہ بھی مستقبل کے ہندوستان میں ہندوستانی کو کل ہند رابطہ کی زبان بنانے کے حامی تھے لیکن اس سلسلہ میں وہ کسی جبر کے قائل نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جب تک اردو ہندی ایک دوسرے کے قریب آ کر بالکل ایک زبان کا روپ اختیار نہ کریں تعلیم اور حکومت کے کاموں میں دونوں کو مساوی درجہ دیا جائے۔

تحریک کے بعض دوسرے ممتاز اراکین مثلاً رام بلاس شرما، ملک راج آنند اور سید احتشام حسین نے بھی ملک کے لسانی مسائل، خاص طور پر اُردو ہندی کے بارے میں علمی معروضیت اور عوامی نقطۂ نگاہ سے لکھا۔ ان کے عقلی اور واضح نقطۂ نگاہ سے لسانی تعصب اور تنگ نظری کی طاقتوں کو صدمہ پہنچا۔ آزادی کے بعد اگر ملک کے لسانی مسائل کو سلجھانے میں سجاد ظہیر اور دوسرے ترقی پسند دانشوروں کے نقطۂ نگاہ کا احترام کیا جاتا تو کم از کم اُردو اس کسمپرسی کا شکار نہ ہوتی۔

سجاد ظہیر کا ایک بڑا کارنامہ اردو میں اور ملک کی دوسری زبانوں میں بین الاقوامیت کے احساس و تصور کی اشاعت ہے۔ انھوں نے ہمیشہ کوشش کی کہ نوجوان ادیب نہ صرف یہ کہ دنیا کے محنت کش عوام کی انقلابی جد و جہد سے بلکہ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے ادبی رجحانات اور بلند پایہ انقلابی تخلیقات سے بھی روشناس ہوں۔ "جدید فرانسیسی شعراء" اور "لوئی اراگاں" کے عنوان سے انھوں نے جو مقالے لکھے ان میں فرانسیسی شاعری کے نئے رجحانات اور لوئی اراگاں کی انقلابی

فکر و تخیل کا بڑی خوبی سے مطالعہ کیا۔ دوسرے نوجوان ترقی پسند ادیبوں سے بھی انھوں نے ایسے ہی موضوعات پر مضامین لکھوائے اور ترجمے کرائے۔

دوسری طرف انھوں نے اردو کے باصلاحیت ترقی پسند ادیبوں کو سوویت یونین اور دوسرے اشتراکی ملکوں میں روشناس کرایا اور ان کی تصانیف کے ترجموں کی سفارش کی۔ تاشقند اور ماسکو میں کئی بار مجھے سوویت ادیبوں سے ان کی ملاقاتوں میں شریک ہونے کا موقع ملا اور کبھی کبھی مترجم کے فرائض بھی انجام دینا پڑے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ نہایت کھلے دل سے اور کبھی کبھی مبالغے کے ساتھ اپنے ترقی پسند ادیبوں کو سراہتے ہیں۔ اکثر ادیبوں میں معاصرین سے چشمک یا کینہ اور حسد کی جو خاصیت ہوتی ہے، ان کا وجود اس سے پاک تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ بعض ادیبوں مثلاً کرشن چندر اور فیض احمد فیض کو وہ زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ شاید اس کا سبب بھی یہ ہو کہ انھوں نے زندگی اور ادب کے ترقی پسند نظریہ و اقدار سے زیادہ استقلال کے ساتھ وفاداری برتی۔

ایک بار کہنے لگے کہ پاکستان میں پارٹی کے تنظیمی کاموں کے دوران میں نے پارٹی کی رکنیت چاہنے والے نوجوانوں سے ایک سوالنامہ پُر کرایا، جس میں ایک کالم یہ بھی تھا کہ کس طرح کے محرکات انھیں اشتراکی نظریے کے قریب لائے۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ بیشتر نوجوانوں نے کرشن چندر کی تصانیف کو اپنی اشتراکیت دوستی کا اصل محرک قرار دیا تھا۔

پاکستان کے زمانۂ قیام میں اگرچہ ان کا زیادہ وقت سیاسی کاموں میں اور روپوشی یا قید و بند میں گذرا لیکن وہاں بھی اپنی تصنیف "روشنائی" مکمل کر کے انھوں نے اس تحریک کی گرانقدر خدمت انجام دی۔

"روشنائی" دراصل [illegible] تک اس تحریک کے نشیب و فراز کی تاریخ ہے۔ اس کے علاوہ وہاں سے انھوں نے جو خطوط لکھے، ان میں ترقی پسند ادیبوں کی نگارشات پر جو تبصرے کئے، انقلابی ادیب کے کردار و منصب کا جو بلند آدرش پیش کیا وہ بھی اس تحریک سے ان کی بے مثل وفاداری کا ثبوت ہیں۔

ہندوستان واپس آنے کے بعد انھوں نے محسوس کیا کہ اگرچہ ترقی پسند ادیبوں کے فن میں اب زیادہ پختگی اور گہرائی پیدا ہو گئی ہے اور ترقی پسندی کے آدرش ہمارے تخلیقی ادب کی شریانوں میں گرم خون کی طرح رواں دواں ہیں، تاہم اس کی تنظیم کا شیرازہ بکھر گیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ اب اس تحریک کو باضابطہ تنظیم کی ضرورت نہیں۔ لیکن [illegible] میں جب انھوں نے محسوس کیا کہ ملک کے سیاسی اور سماجی نظام کی طرح ادب میں بھی رجعت پسند طاقتوں کا نفوذ و اثر بڑھ رہا ہے، نوجوان ادیب بے یقینی، بیزاری، بے جہتی اور خود پرستی کا شکار ہیں۔ ملک کے اور ساری دنیا کے بدلے ہوئے حالات دانشوروں کو مل کر غور و فکر کرنے کی دعوت دیتے ہیں، تو دسمبر [illegible] میں آخری بار انھوں نے ترقی پسند ادیبوں کی ایک کل ہند کانفرنس بلائی، جو مندوبین اور مباحثوں کی گرمی اور دلچسپی کے لحاظ سے بے حد کامیاب رہی۔ اس میں انجمن کا ایک نیا دستور اور منشور منظور کیا گیا جس کے مطابق ترقی پسند مصنفین کی انجمن کو ایک غیر الحاقی اور مرکزی تنظیم کی صورت دی گئی۔

اس دوران سجاد ظہیر ترقی پسند ادیبوں کی عالمی تحریک، خاص طور پر ایفرو ایشیائی ادیبوں کی تحریک میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیتے رہے۔ اس کے اجتماعوں میں مقالے پڑھے اور اس کی تنظیم کو مضبوط بنایا۔ وہ سامراجی غلامی اور ہر طرح کے استحصال سے اقوام عالم کی نجات اور آزادی کے علم بردار تھے اور ہر اس تحریک کے حامی جو ان بلند مقصد کے حصول میں مدد کرتی ہو۔

وہ بے مثل تنظیمی صلاحیت، ذہانت اور اعلیٰ درجہ کی تخلیقی قوت کے مالک تھے۔ ان کی تصنیفی زندگی کے اولیں نقوش "انگارے" کے افسانے اور ناولٹ "لندن کی ایک رات" شاہد ہیں کہ اگر وہ تخلیقی کام جاری رکھتے تو بلاشبہ آج ہندوستانی ادب میں صفِ اول کے فنکار ہوتے۔ ان کے تنقیدی مضامین بھی ذوقِ ادب کی پختگی، فکر و نظر کی گہرائی اور اعلیٰ تنقیدی شعور کے گواہ ہیں۔ ان کی نثر میں ہر جگہ اظہار و اسلوب کی سادگی، پُرکاری، شگفتگی، علمیت اور فطری ذہانت کے عناصر نمایاں نظر آتے ہیں۔

اُن کی تصانیف اور تحریروں کا سرمایہ کتنا ہی محدود اور مختصر سہی اردو ادب میں ان کی بقا کا ضامن ہے۔ لیکن فی الحقیقت اُن کا عظیم کارنامہ ہندوستانی ادب میں اس صدی کی سب سے بڑی تحریک کی قیادت ہے۔ تحریک جو ہندوستانی ادب کی تاریخ کا ایک مہتم بالشان باب ہے۔ ایسے عہد آفریں دانشور اور دیدہ ور صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

شارب ردولوی
ڈی ۵/۱۸، ماڈل ٹاؤن، دہلی

سجاد ظہیر کی تنقید نگاری

سجاد ظہیر ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں ہیں، وہ صرف اُردو کے ایک خوش فکر ادیب و نقاد ہی نہیں بلکہ اپنی ذات سے ایک عظیم تحریک اور ادارہ تھے جس نے اپنی ساری عمر مختلف ہندوستانی زبانوں اور تہذیبوں کے درمیان ایک رابطہ اور قدر مشترک کا کام انجام دیا۔ وہ اپنی ذات سے ایک عہد تھے جو ہندوستان کی مختلف زبانوں اس کے ادیبوں اور نوجوان لکھنے والوں میں بیداری، سماجی شعور، اور صحت مند ادبی رجحانات ہی نہیں لایا بلکہ ان کی ذہنی و فکری تربیت بھی کی۔ انہوں نے اپنی زبان و قلم اور تحریک کے ذریعہ ادب اور زندگی کے اہم رشتے کو سمجھایا اور مارکسی و اشتراکی نظریۂ ادب و تنقید کو تمام ہندوستانی زبانوں اور خصوصیت کے ساتھ اُردو میں عام کیا۔

دراصل سجاد ظہیر کی شخصیت کے بہت سے پہلو ہیں اور ان کی خوبی یہ ہے کہ ہر پہلو اپنی جگہ اتنا ہی تابدار اور پُرکشش ہے جتنا کہ کوئی دوسرا۔ انہوں نے ایک عظیم ادبی تحریک کی بنیاد ڈالی۔ افسانے لکھے، ناولٹ لکھا، ڈراما لکھا، شاعری کی اور تنقیدی مضامین لکھے ان میں کس پہلو کی ان کی زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت ہے اس کا اس وقت فیصلہ کرنا مشکل ہے لیکن اس میں شک کی گنجائش نہیں کہ انہوں نے ہر شعبہ میں اپنے لئے ایک اہم جگہ بنالی ہے اور ادب کا مورخ جس بات کا بھی ذکر کرے گا، خواہ وہ ادبی تحریکات ہوں، تخلیق ہو یا تنقید یہ ذکر سجاد ظہیر کے نام کے بغیر مکمل نہیں ہوگا۔

یہاں پر ان کی شخصیت ان کی عظیم تنظیمی صلاحیتوں، ان کی افسانہ نگاری یا شاعری کا جائزہ لینا مقصود نہیں ہے انکی شخصیت کے ان تمام پہلوؤں سے الگ اُردو میں ان کی اہمیت ایک صحت مند، بالغ نظر مارکسی نقاد کی بھی ہے اور شاید یہ بات غلط نہ ہو کہ ترقی پسند تحریک کے بانی کی حیثیت کے بعد وہ سب سے زیادہ قدآور اپنی تنقیدوں میں نظر آتے ہیں، انہوں نے صحیح معنوں میں اُردو میں مارکسی تنقید کی وہ شکل پیش کی ہے جسے سائنٹفک تنقید کہا جانا چاہیئے۔

اُردو میں مارکسی تنقید ترقی پسند تحریک کے ساتھ بلکہ اس کے اثر کے تحت آئی۔ تاریخی اعتبار سے غیر شعوری طور پر ادب میں سماجی اثرات کا مطالعہ پہلے سے کیا جانے لگا تھا لیکن اس مطالعہ کی اہمیت نظریاتی نہیں تھی۔ ترقی پسند تحریک نے اس کو ایک نظریاتی بنیاد دی، یہ تحریک چونکہ براہِ راست مارکس کے اشتراکی نظریات سے متاثر تھی۔ اس لئے ادبی مطالعہ میں بھی انہیں باتوں پر زیادہ زور دیا گیا۔ مارکس نے خاص طور سے ادب کے بارے میں بہت کم لکھا ہے لیکن اس کی نظریاتی بنیاد ادب اور سماج کے تعلق پر منحصر ہے۔ مارکس نے خود کہا ہے کہ ثقافت کے دوسرے شعبوں کی طرح ادب بھی جدلیاتی عمل اور تفاعل (INTERACTION) کے ذریعہ پیداوار کے رشتوں کو منسلک کرتا ہے اور ان کی اصلاح کرتا ہے۔ ادب چونکہ انسان کے خیالات و جذبات کے اظہار کا نام ہے اور اس کے خیالات و جذبات کی بنیاد تجربات پر ہوتی ہے۔ اور جب ادب کے لئے یہ بات کہی جاتی ہے تو اس کا رشتہ خود بخود زندگی اور اس کے مادّی حالات و خواہش سے مل جاتا ہے کیونکہ بقول فیرل (FARELL) ادب اور فن کا ارتقاء خلاء میں وجود رکھنے والا خود مختار عمل نہیں ہے، یعنی فن کار کی تخلیقات انہیں روایات اور تاریخی و سماجی ماحول سے وابستہ ہوتی ہیں جن میں وہ سانس لیتا ہے جن حالات سے اس کی زندگی دوچار ہوتی ہے اُس کے نقوش خیالات کے ذریعہ ادب میں بھی دکھائی دیتے ہیں مارکس اسی خیال و عمل کی مطابقت پر زور دیتا ہے۔

ادب فن کار کے خیالات و جذبات کا اظہار ہے [illegible] نظریات نے پُرزور الفاظ میں اس بات کی وضاحت کی کہ ادب ساکن یا جامد تصورات کا اظہار نہیں ہے بلکہ وہ لمحہ بہ لمحہ بدلتے ہوئے معاشرتی نظام تہذیبی اقدار اور سماج کے ارتقا کا ایک جز ہے۔ جس طرح ایک عام آدمی خارجی اسباب و حالات سے متاثر ہوتا ہے اسی طرح ایک فن کار اس اثر سے اپنے کو الگ نہیں [illegible] کسی نہ کسی شکل میں اس کے افکار و خیالات، جذبات [illegible] ان کا اثر پڑنا لازمی ہے اسی لئے ادب کو زندگی کا آئینہ [illegible] ادب کے بارے میں لینن نے کہا ہے کہ اس کو عام لوگوں [illegible]

سے متعلق حقیقت کا آئینہ دار اور ترقی پسند رجحانات کا ترجمان ہونا چاہیے، اس لئے کہ وہ سماجی ارتقا کے مطالعہ کا ایک ذریعہ اور معاشرے کی جدوجہد کا کامیاب ہتھیار ہے۔ لینن کی نگاہ میں ادب کو اسی وقت سمجھا جاسکتا ہے جب کہ ہم فن کار کو ایک سماجی ہستی تسلیم کریں اور یہ مانیں کہ ادب پر حالات کا اثر پڑتا ہے، اور ادیب اپنے دور کے خیالات و معاشرے کی عکاسی کرتا ہے۔

اُردو تنقید میں ان نظریات کو پیش کرنے والے یا ان نظریات کی بنیاد پر ادبی قدروں کا تعین کرنے والے کئی اہم ناقدین ہیں۔ لیکن ان نظریات کو افراط و تفریط اور انتہاپسندی سے الگ کرکے ادب کا مطالعہ کرنے والے ناقدین میں سجاد ظہیر کا نام سرفہرست ہے۔ انہوں نے مارکس اور لینن کے نظریات کے تحت اُردو کے قدیم و جدید ادب کا مطالعہ کیا۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت جو انہیں دوسرے مارکسی نقادوں سے ممتاز کرتی ہے، یہ ہے کہ انہوں نے کوئی انتہاپسندانہ رویہ اختیار کرنے کے بجائے سائنٹیفک طور پر ان نظریات کو ادب کے مطالعے کے لئے بنیاد بنایا۔ انہوں نے فن کار، اس کے ماحول سے تعلق اور ادب پر پڑنے والے تاریخی و سماجی اثرات کا واضح الفاظ میں جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ

"(فنکار) کی تخلیق اسی روایت اور اسی سماجی ماحول سے پیدا ہوتی ہے جو انہیں ورثہ میں ملتے ہیں، اور جن میں ان کی تعلیم و تربیت ہوتی ہے۔ وہ مسائل فنکاروں اور ادیبوں کو بھی درپیش ہوتے ہیں جو ایک خاص عہد یا موقع پر کسی قوم کو خاص طور پر یا نوعِ انسانی کو عام طور پر پیش ہوتے ہیں اگر کسی قوم میں یا قوم کے ایک بڑے حصّہ میں بھوک، غریبی، افلاس یا جہالت پھیلی ہو یا اس قوم کو کسی دوسری قوم کے کچھ لوگوں نے غلام بنالیا ہو اگر وہ قوم جاہلیت، لوٹ، غارتگری کا شکار ہو یا بڑے پیمانے پر ہلاکت کا کوئی خطرہ درپیش ہو تو ظاہر ہے اس قوم میں ادیبوں پر بھی ان کیفیات کا اثر پڑے گا اور ان کے فن میں بھی اس کی جھلک ہوگی"

سجاد ظہیر نے ادبی مطالعہ کے لئے مارکس کے سماجی نظریات کو پیش کرکے اُردو میں مارکسی تنقید کی بنیاد رکھی ہے، لیکن جس طرح ہر تحریک اپنی ابتدا میں بعض انتہاپسندیوں کی شکار ہوتی ہے، اسی طرح ترقی پسند تحریک بھی سماجی نظریات کی شدت اور افراط و تفریط کا شکار ہوئی۔ یہ انتہاپسندی اس وقت کے نوجوان ترقی پسند شاعروں اور افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ ناقدین کے یہاں بھی نظر آتی ہے۔ انہوں نے مارکس کے سماجی نظریات کو غلط طریقہ پر ادب پر منطبق کرنے کی کوشش کی اور اپنے انتہاپسندانہ رویہ کے تحت تمام کلاسیکی اور قدیم ادب کو حقیر اور کمتر درجہ کا ٹھہرایا۔ اس انتہاپسندانہ رویہ پر شدید اعتراضات اور بحثیں ہوئیں۔ یہ مباحث دونوں طرف سے انتہاپسندی کا شکار رہتے۔ پرانے لوگ نئے لوگوں کے نظریات کو کوئی اہمیت دینے کو تیار نہیں تھے اور ترقی پسند ادیب اور ناقدین ہر پُرانی چیز کو سوختنی قرار دے رہے تھے۔ اس موقع پر سجاد ظہیر نے صحیح ترقی پسندی، اور مارکسی نظریات کے صحیح مفہوم کو واضح کیا۔ انہوں نے اپنے تنقیدی مضامین کے ذریعہ تہذیبی اقدار کی اہمیت، ادب پر سماجی، سیاسی، تاریخی و اخلاقی اثرات اور روایات کے تقاضوں کی اہمیت کو واضح کرکے یہ بتایا کہ فنی اور ادبی تخلیق پر ان چیزوں کے کیا اثرات ہوتے ہیں، ادب کس طرح وجود میں آتا ہے اور انسانی رشتوں کے عمل اور ردِعمل کی کیفیتوں اور سماجی زندگی کے اثرات کو کس طرح ظاہر کرتا ہے۔

سجاد ظہیر نے تنقیدی نظریات یا اُصولوں پر کوئی باقاعدہ کتاب نہیں لکھی ہے، لیکن "روشنائی" "ذکرِ حافظ" اور وقتاً فوقتاً "نیا ادب"، "عوامی دَور" "حیات" اور دوسرے رسائل میں شائع ہونے والے ان کے مضامین صرف ان کی تنقیدی بصیرت پر ہی روشنی نہیں ڈالتے بلکہ ایک متوازن اور سلجھے ہوئے مارکسی سائنٹیفک نظریۂ تنقید کو بھی پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے مضامین کے ذریعے مارکسی تنقید اور ادب کے سماجی نظریہ کے بارے میں ان غلط فہمیوں کو دُور کیا جو عام طور پر انتہاپسندانہ رویہ کے تحت پیدا ہوگئی تھیں۔ اس طرح ان کے چند مضامین نے اُردو میں مارکسی تنقید کے اُصولوں کو مرتب کرنے میں مدد دی۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو تنقید کی تاریخ میں ان کے نام کی اہمیت کو نظرانداز کرنا ممکن نہیں ہے۔ تنقید میں سجاد ظہیر کا تصنیفی کام زیادہ نہ ہونے کے باوجود ان کی حیثیت مارکسی تنقید میں ایک بنیادی ستون کی ہے۔ ان مضامین نے صرف مارکسی نظریات کو سمجھنے میں ہی مدد نہیں کی بلکہ اُردو تنقید میں سائنٹفک اصولِ نقد مرتب کرنے کے لئے راہ ہموار کی۔ وہ اُردو کے پہلے نقاد ہیں جس نے انقلابی، سماجی اقدار، سیاسی اثرات اور مختلف طبقات کے مسائل اور ادب پر اُن کے اثرات کو بہت واضح شکل میں پیش کیا۔ اس وقت کے شاعر و ادیب انقلاب کی جو تصویر پیش کررہے تھے وہ بڑی ہیبت ناک اور بھیانک تھی اور وہ اسی تصویر کو ترقی پسند

اور مارکسی نقطۂ نظر سے تعبیر کرتے تھے اس کم فہمی کی وجہ سے ادبی تخلیق و تنقید دونوں پر غلط اثر پڑ رہا تھا اور وہ اندازِ نظر مارکسی نظریہ اور ترقی پسندی سے منسوب ہوتا جا رہا تھا جسے صحیح معنوں میں مارکسی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ سجاد ظہیر نے ان خامیوں اور کم فہمیوں کا احساس دلایا۔ انہوں نے انقلاب کے اس تصور کے بارے میں جو اس وقت کے ادیب و شاعر پیش کر رہے تھے لکھا کہ :۔

"انقلاب کے اس خونی تصور میں رومانیت جھلکتی ہے۔ یہ ایک طرح کی ادبی دہشت انگیزی ہے یہ ایک ذہنی اور جذباتی بلوہ ہے جو ایک درمیانی طبقہ کے انقلاب پرست نوجوان کے لئے ابتدا میں تو شاید جائز ہو لیکن اشتراکی شاعر کو اس سے دُور رہنا چاہئے"

وہ ادب کو ایک فنِ لطیف سمجھتے تھے جس کا کام ان کی نگاہ میں زندگی کو زیادہ حسین اور زیادہ بامعنی بنانا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ دہشت انگیزی کو غلط سمجھتے تھے۔ وہ مارکسی نظریات کو صحیح انداز میں ادب و تنقید کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ ان نظریات کے سطحی معنی لے کر ہنگامہ خیزی اور دہشت انگیزی کو عام کرنا یا سماجی نظریات کو سمجھے بغیر ادب کو خالص سیاست یا پروپگنڈے کے لئے استعمال کرنے کو غلط سمجھتے تھے۔ انہوں نے صحیح ترقی پسند ادبی نظریہ کی بار بار وضاحت کی اور بتایا کہ :۔

"......ترقی پسندوں کے نزدیک ادب ایک فنِ لطیف ہے زندگی کو زیادہ حسین زیادہ معنی خیز زیادہ پُر لطف بنانے کا ایک وسیلہ ہے......ترقی پسند ادیبوں کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ایک ادیب یا فنکار کا شعور اپنی قوم، اس کے مختلف طبقوں کے کردار اور ان کے سامنے درپیش مسائل کے متعلق جس قدر گہرا ہوگا حقیقت اور سچائی کا اسے جس قدر علم ہوگا، اسی قدر اسے فنی تخلیقات کو بہتر بنانے کا موقع ملے گا"

سجاد ظہیر نے "سراج مبینؔ" کے نام سے ۱۹۴۰ء میں سنٹرل جیل لکھنؤ میں ایک مضمون لکھا تھا جس میں نئے ادب پر بعض اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے قدیم اصنافِ سخن کی اہمیت کا اعتراف کیا تھا اور قصیدہ، غزل، مرثیہ، مثنوی، واسوخت، قطعہ، اور گیت وغیرہ کو اہم ادبی ترکہ قرار دیا تھا۔

سجاد ظہیر کا خیال تھا کہ ساکت اور ابدی کوئی چیز نہیں ہے۔ ہر چیز میں وقت کی تبدیلی کے ساتھ فطری طور پر تبدیلی آتی رہتی ہے اور نئی چیز پرانی چیز سے ہی وجود میں آتی ہے اس لئے پرانی قدروں سے نفرت غلط ہے، اور نہ ہی ان قدیم روایات کو ختم کر کے نئے ادب اور سماج کی تشکیل ہو سکتی ہے۔

ترقی پسند تحریک کی ابتدا میں ہر نوجوان ادیب و شاعر اشتراکیت اور انقلاب کا نقیب اور ادب کی مقصدیت کا عَلَم بردار بن گیا تھا اور یہی خصوصیات ترقی پسندی و مارکسسٹ کی شناخت سمجھی جانے لگی تھیں۔ اس نظریہ کی وجہ سے ادبی و فنی خصوصیات اور ادب و شاعری میں جمالیاتی اقدار، فنی حُسن، لطافت ترنم اور موسیقی کی اہمیت کم ہونے لگی تھی۔ سجاد ظہیر نے اس وقت کے ادیبوں اور شاعروں کی اس کمزوری کو محسوس کیا اور صحیح انقلابی شاعری کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا :

شاعر کا پہلا کام شاعری ہے، وعظ دینا نہیں، اشتراکیت و انقلاب کے اصول سمجھانا نہیں۔ اصول سمجھنے کے لئے کتابیں موجود ہیں اس کے لئے ہم کو نظمیں نہیں چاہییں۔ شاعر کا تعلق جذبات کی دنیا سے ہے اگر وہ اپنے تمام ساز و سامان تمام رنگ و بُو تمام ترنم و موسیقی کو پوری طرح کام میں نہیں لائے گا اگر فن کے اعتبار سے اس میں بھونڈاپن ہوگا اگر وہ ہمارے احساسات کو لطافت کے ساتھ بیدار کرنے میں قاصر ہوگا تو اچھے سے اچھے خیال کا وہی حشر ہوگا جو دانے کا بنجر میں ہوتا ہے"

سجاد ظہیر نے اپنے نظریاتی مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اور ادبی مطالعہ یا فنی اقدار کے تعین کے لئے جو اصول پیش کئے ہیں انہیں اپنی عملی تنقید میں بڑی دیانتداری کے ساتھ برتا بھی ہے۔ اس طرح ان کے مضامین میں صرف مارکسی تنقید کے اصول ہی نہیں ملتے بلکہ ان کی عملی شکل بھی مل جاتی ہے۔ عملی تنقید کے سلسلے میں ان کی سب سے اہم تصنیف "ذکرِ حافظ" ہے، جسے اُردو میں مارکسی تنقید کا ایک اہم صحیفہ کہا جا سکتا ہے۔ "ذکرِ حافظ" حافظ کے کلام کا ایک مطالعہ ہے، لیکن اس کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ اس سے قدیم شعراء اور خصوصیت سے غزل کے بارے میں ترقی پسند نظریات کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ "ذکرِ حافظ" مارکسی نظریاتِ نقد کی عملی تصویر ہے، ترقی پسند تحریک کے ایک دَور میں جہاں بہت سی قدیم اصناف اور شاعری کی مذمت کی گئی وہیں غزل کی شدید مخالفت ہوئی اور اسے نئے رجحانات، خیالات اور زندگی کے نئے مطالبات کو پورا کرنے کا اہل نہیں سمجھا گیا۔ غزل کے بارے میں سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ وہ "فراریوں کی پناہ گاہ اور بھٹکے ہوئے مسافروں کا نہاں خانہ

ہے،" یا وہ اپنی ہیئت کی وجہ سے ہماری موجودہ زندگی کی تیز رفتاری کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اس میں صرف متفرق مضامین کو پیش کیا جا سکتا ہے یا وہ صرف داستانِ گل و رخسار، ناکامی و حرماں نصیبی، عیش پرستی و مے نوشی کا بیان ہے اور زندگی کے حقائق سے فرار کا ایک ذریعہ ہے۔ غزل اُردو شاعری کی ایک بڑی دل آویز اور نازک صنفِ سخن ہے لیکن اس وقت کے ناقدین نے انقلاب اور ترقی پسندی کے جوش میں اسے گردن زدنی قرار دیا۔ سجاد ظہیر نے غزل پر اس طرح کے تمام اعتراضات کا جواب ذکرِ حافظ میں بڑی معقولیت کے ساتھ دیا ہے۔ ان کے نظریہ میں بڑا توازن ہے انہوں نے غزل پر اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے:۔

"اچھی غزل کے منفرد اشعار دل میں بڑی جلدی جاگزیں
ہو جاتے ہیں وہ بجلی کی طرح چمک کر دل و دماغ میں
حرارت پیدا کر دیتے ہیں اشاروں اور کنایوں سے
خیال کا رُخ ایک درخشاں نکتے پر مرکوز کر دیتے ہیں
اور اس لحاظ سے ان کی خوبی و افادیت مسلّم ہے۔"

انہوں نے اس بات کا بھی اظہار کیا ہے کہ اچھی شاعری کو صرف غزل کے دائرے میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ اچھی نظم غزل سے بہتر بھی ہو سکتی ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ایک صنفِ سخن کو دوسرے صنفِ سخن پر فوقیت دی جائے جو چیز جس جگہ پر اہم ہے اس کو وہاں پر اہمیت ملنی چاہیئے نہ کوئی صنفِ سخن صرف اس لئے اہم ہو سکتی ہے کہ وہ انقلابی صنعت ہے اور نہ کسی صنف کو صرف اس بنیاد پر ختم کر دینے کا فتویٰ دیا جا سکتا ہے کہ وہ جاگیرداری عہد اور انحطاط پذیر زمانہ کی پیداوار ہے

"عہدِ حاضر میں ایسی عظیم یا اچھی شاعری
جس سے آجکل مکمل ذہنی اور روحانی تسکین ہو غزل
کے سانچے میں محدود نہیں کی جا سکتی لیکن بعض لوگ
جب ان باتوں سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ گذشتہ
چھ سو سال میں فارسی اور اردو غزل کے جو بہترین نمونے
ہیں وہ لازمی طور پر عظیم شاعری نہیں ہو سکتے اور یہ کہ
غزل ایک صنف کی حیثیت سے بیشتر جاگیری دور کے
انحطاط اور افراتفری اور انتشار کی عکاسی کرتی ہے
تب میرے خیال میں ہم سخت غلطی کرتے ہیں یہ
اس طرح کی غلطی اسی وقت ہوتا ہے جب مادی و سماجی

حالات و فنی تخلیق کے رشتہ کو غلط طریقے پر سمجھا جائے۔ سجاد ظہیر اس رشتہ کو میکانکی ڈھنگ سے سمجھنے کے سخت خلاف تھے اور وہ اسے ترقی پسندوں کی تنگ نظری اور تعصب سمجھتے تھے ان کا خیال تھا کہ ہر فنی تخلیق یا فن کار کو اس کے ماحول اور ان خاص حالات میں دیکھنا چاہیئے جو اس کے چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے ان کا خیال تھا کہ تضاد ہر فن کار کے یہاں ہو سکتا ہے لیکن اگر اس تضاد کی بنیاد پر ہم نے ان تمام چیزوں سے اپنا رشتہ منقطع کر لیا تو نقصان ہمارا ہی ہوگا اس لئے کہ صحت مند عناصر اچھی اقدار اور زندگی کا بہتر تصور اس فن کار کے یہاں بھی ہو سکتا ہے جس کے یہاں کسی وقت روائتی خیالات بھی نظر آ جاتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کو ان غلط اور رسمی پہلوؤں سے الگ کر کے دیکھا جائے اور یہی صحیح طریقہ ہوگا اس کو سمجھنے اور اس کے صحیح مقام کے تعین کرنے کا۔ سجاد ظہیر نے لکھا ہے کہ:۔

"اپنے زمانے کے بعض روائتی خیالات و عقائد کا
اگر وہ اظہار بھی کرتا ہے لیکن انہیں مرکزی حیثیت نہیں
دیتا اور مجموعی طور سے ان عوامل اور محرکات کا متعفی ہے
جو ہماری انفرادی و معاشرتی زندگی میں ان جذبات
کو اُبھارتے ہیں جن سے زندگی بار آور ہوتی اور سنورتی
ہے تب اس تضاد کے باوجود جو اپنے طبقہ دار
سماج کے ہر فنکار ادیب، فلسفی اور شاعر میں ہمیں
ملے گا، ہمیں اس کی فن کارانہ عظمت کے اس حقیقی
پہلو کو اس کے رسمی اور غلط پہلوؤں سے الگ کر کے
دیکھنا چاہیئے بغیر اس طریقہ پر چلے ہوئے گذشتہ
زمانوں کے فنونِ لطیفہ اور فنکار کی تخلیقات کو نہ ہم
اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں اور نہ ان سے مستفید اور
محظوظ ہو سکتے ہیں اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو اپنے ماضی
کی بیشتر تخلیقات سے ہم اپنے کو منقطع کر لیں گے،
اور اس طرح ہم اپنی سب سے بڑی اور قیمتی روحانی
اور تہذیبی دولت کو اپنی کم فہمی کے سبب بیکار بنا
دیں گے، اور ایسا کرنے سے خود ہمارے جدید جمہوری
اور انسان پرور ادب اور فن کا مضبوط اور بھرپور
ارتقا ناممکن ہو جائے گا"

کسی فن کار یا شاعر کے بارے میں فیصلہ کرتے وقت اس کے کلام کے مجموعی تاثر اور اس کے عہد کے عقائد و نظریات پر نگاہ رکھنے

پر سجاد ظہیر نے بار بار زور دیا ہے ان کا خیال ہے کہ کسی چیز کے بارے میں سطحی طور پر کوئی فیصلہ کر لینا غلط ہے بعض ناقدین کسی شاعر کے یہاں صوفیانہ انداز نظر دیکھتے ہی اس پر فراریت کا الزام لگا دیتے ہیں۔ یہ بات صحت مند نظریۂ تنقید کے خلاف ہے۔ کسی فن کار کے مقام کا تعین کرتے وقت اس کے کلام کے مجموعی تاثر کو دیکھنا ضروری ہے اور یہ مجموعی تاثر اس کے کلام کے تفصیلی مطالعہ اور مفصل حالات کی روشنی میں پیدا ہوتا ہے جب تک ہم یہ نہ دیکھیں کہ فن کار نے اپنے زمانہ کے حالات کو کس طرح دیکھا اور پیش کیا ہے اور اس کی تخلیقات سے زندگی کا کس طرح کا تصور سامنے آتا ہے اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا غلط ہوگا۔

سجاد ظہیر مارکسی واشتراکی نقطۂ نظر کے ماننے والے ہیں انہوں نے سیاست میں عملی زندگی میں اور ادب و تنقید میں ہر جگہ اسی نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے احتشام حسین نے ان کے نظریات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "سجاد ظہیر تخلیق و تنقید دونوں میں مارکسی نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتے ہیں"۔ اس میں شک نہیں کہ انہوں نے اپنے تنقیدی مضامین کے ذریعہ مارکسی نقطۂ نگاہ کو عام کیا ہے لیکن ان کی تنقید کی سب سے بڑی خوبی وہ توازن اور منصفانہ انداز نظر ہے جو ان کے ہر مضمون میں نمایاں ہے۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اگر سجاد ظہیر کے یہ مضامین اس وقت کی انقلابی نسل کی رہنمائی نہ کرتے تو آج مارکسی و سماجی تنقید کو وہ وقار اور مقبولیت نہ ملتی جو اسے حاصل ہوئی۔ سجاد ظہیر کو اپنی تنقیدوں کے ذریعہ دو کام انجام دینے پڑے جو شاید کسی دوسرے نقاد نے نہیں کئے ہوں گے، اوّل یہ کہ انہوں نے صحت مند انداز فکر اور سنجیدہ، متوازن، مدلّل اور غیر جانب دار تنقیدی نقطۂ نظر کو پیش کیا جس کی بنیاد انسانیت پرستی، دنیا کو زیادہ حسین اور دلکش، زندگی کو زیادہ بامعنی اور پُر کشش بنانے پر تھی دوسرے یہ کہ ترقی پسند اور مارکسی ادیبوں اور ناقدوں کے غلط رویوں اور تنگ نظری کی اصلاح کی اور انہیں ترقی پسندی کے جوش میں تنگ نظری اور تعصب سے بچنے کی تلقین کی۔ یہ کام بہت سخت اور مشکل تھا۔ لیکن اپنے تنقیدی مضامین کے ذریعہ انہوں نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ یہ کام انجام دیا ان کی یہی انصاف پسندی اور توازن، ان کے خیال کی وسعت اور ہمہ گیری، جمالیاتی احساس اور شعور فن، لطافت بیاں اور شدید احساس حسن، سنجیدگی مدلل انداز اور وسیع ا[illegible] نے نہیں اُردو کا ایک اہم مارکسی نقاد بنا دیا ہے انہوں نے کم ضرور لکھا ہے لیکن جو کچھ لکھا ہے وہ ادبی مطالعہ، فنی اقدار کے تعین، قدیم و جدید ادب کی اہمیت، فنی تخلیق کے حسن، اس کی سماجی اقدار، مقصدیت اور زندگی سے اس کے تعلق کے سلسلہ میں ہمیشہ رہنمائی کرتا رہے گا۔

بقیہ بنّے بھائی

"بھئی ہم تو سمجھتے ہیں کہ شاعری جوانوں کا کام ہے جوانی یا نوجوانی میں اس کا شوق ہو جائے تو ذرا آسان رہتا ہے۔"

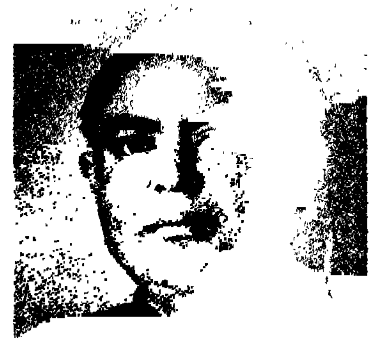
"ارے ظ۔ انصاری وہاں تم کیا کھسر پھسر کر رہے ہو تم نے فیض کی وہ تازہ نظم سنی؟ دیکھو کیا شاندار موڑ آ رہا ہے۔ ان کے یہاں بنے بھائی نے ماسکو ہوٹل کے شاندار کمرے میں گونجتی ہوئی آواز سے فیض کی تازہ نظم کا مژدہ سنایا۔

یہ ہمارے بنّے بھائی پیر مغان ہیں داد دینے میں آتا ہی دلیر ہے۔ جتنا دوسروں کو داد دینے میں سامنے آتے کرتے وقت گوارا نہیں گذرتا کہ یہ جوانوں میں جوان اب عمر کی اس منزل کو پہونچ رہا ہے جہاں اس نے ایک "پیر تسمہ پا پوش" کی طرح محبت کی پائے گی جس نے زندگی کی بہت سی نعمتوں سے اس کارن ہاتھ کھینچ لیا کہ ان میں وہ بہتوں کو شریک نہیں کر سکتا تھا جس نے زندگی کی بہت سی دستیاب راحتوں کو سینے سے لگایا اور اپنایا کیونکہ اس کی شخصیت کی تعمیر میں جن اخلاقیات نے شرکت کی ہے وہ مادّی لذتوں اور مسرتوں سے منہ موڑنے کو گناہ و گناہ کی بدترین قسم یعنی کفران نعمت شمار کرتی ہیں۔ لکھنؤ کے محرم، تعزیہ داری، زہر عشق کے افسانے، حافظ، لوئی اراگاں پابلو نیرودا کی شاعری جیل کے بھتے۔ پارلی ہیڈ کوارٹر کے دال بھات، لندن کے پب، پیرس کے عطر ور لوور میں آرٹسٹوں کی بے اصولی، ہندو فلسفے کی انفرادیت پسندی، ا۔ کوکی وودکا، روی شنکر کے ستار، اونکار ناتھ کی الاپ، یاروں کے درد اور خوش باشوں کے لطف صحبت نے اس شخصیت میں ایسا زری گوٹا لگاتی رنگا رنگ ہے الرٹا کمک دی ہے کہ ان سے ملتے وقت ... دل کو ایمان کی دولت ملتی ہے۔

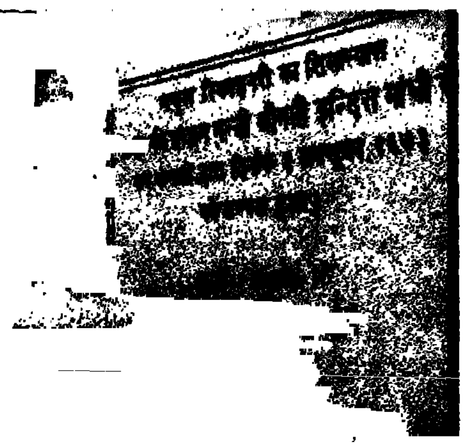
"میاں کئی پھٹی شخصیتوں کے مقتل ہیں تم آج پورے آدمی سے مل رہے ہو"



حال میں حکومت ہند نے سرسید احمد خاں کی یادگار میں ایک خصوصی
ڈاک ٹکٹ جاری کیا۔



راجستھان کے ہردل عزیز وزیر اعلیٰ، جناب برکت اللہ خاں
صاحب کی وفات نے مُلک کے ایک ہونہار سپوت کو
ہم سے چھین لیا۔

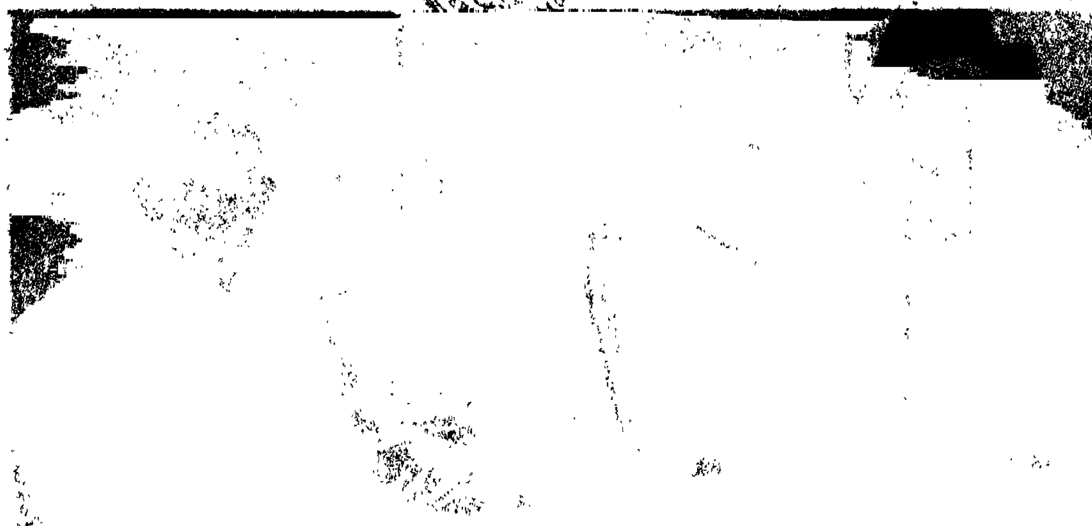




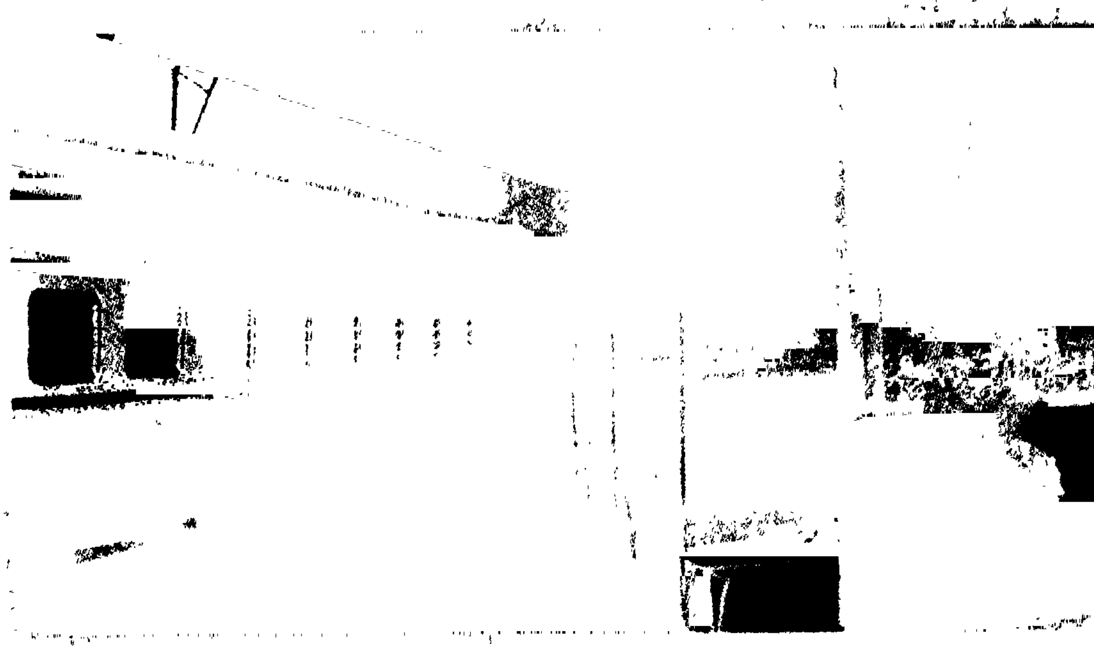
وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی متھرا (اتر پردیش)
میں تیل صاف کرنے کے ایک کارخانے کا سنگ بنیاد
رکھ رہی ہیں۔ یہ تقریب مہاتما گاندھی کے مبارک
جنم دن یعنی ۲ر اکتوبر کو انجام پائی۔

۲ر اکتوبر کو آنجہانی
لال بہادر شاستری کا
بھی جنم دن ہے۔ اس
سال اس موقع پر
شریمتی شاستری نے
لال بہادر شاستری سے
متعلق ایک نمائش کا
افتتاح کیا۔

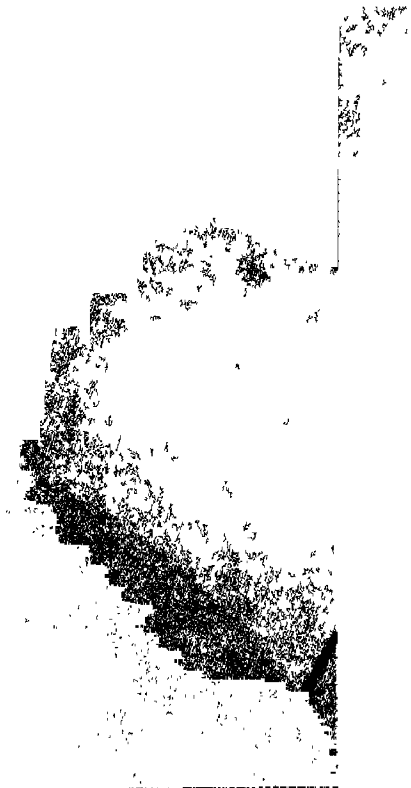
REGD. No. D 509



سری نگر میں اقبال نمائش: ۲۷ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو شری اندر کمار گجرال مرکزی وزیر برائے اطلاعات و نشریات نے سری نگر میں علامہ اقبال سے متعلق ایک نمائش کا افتتاح کیا۔
تصویر میں بائیں سے دائیں: شری اندر کمار گجرال، میر قاسم، وزیر اعلیٰ ریاست جموں و کشمیر، شری ایل کے جھا، گورنر ریاست اور رہنمائے خصوصی شیخ عبداللہ۔
ایک نئی ٹرین: ۱۳ اکتوبر ۱۹۷۳ء سے دلی اور سمستی پور کے درمیان براہ کانپور، الہ آباد، مغل سرائے، پٹنہ، موکامہ اور برونی ایک نئی ٹرین چالو ہوگئی۔ تصویر میں ٹرین کے ایک ڈبے کا
(دائیں) بیرونی اور (بائیں) اندرونی منظر۔



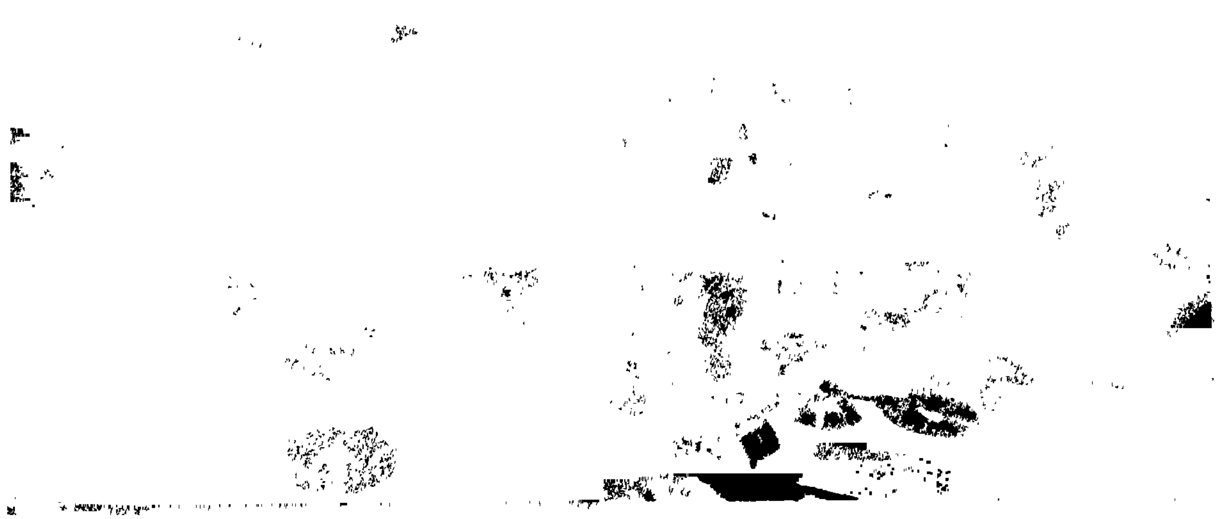
DECEMBER 1973 AJKAL (MONTHLY) VOL. 32 No. 5
Published by the Director, Publications Division, Patiala House NEW DELHI-11001
Printed by Indian Printing works, Rani Jhansi road, NEW DELHI-55



سربراہوں کی ملاقات: سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے جنرل سکریٹری عزت مآب جناب لیونڈ بریژنیف ۲۶ نومبر ۱۹۷۳ء کو ہندوستان کے پانچ روزہ سرکاری دورے پر تشریف لائے تھے۔ موصوف ۲۷ نومبر کو صدر جمہوریہ شری وی وی گری سے ملاقات کیلئے راشٹرپتی بھون گئے۔

(اوپر) تصویر میں جناب بریژنیف شری وی وی گری سے ہم کلام ہیں۔ بائیں جانب روس کے وزیر خارجہ جناب اے گرومیکو کھڑے ہیں۔

(نیچے) ہندروس مذاکرات کا ایک منظر: جناب بریژنیف (دائیں سے چوتھے) اور ان کی پارٹی کے ارکان، شریمتی اندرا گاندھی اور وزرا مع مشیران سے بات کر رہے ہیں۔



اُردو کا مقبولِ عام مصوّر ماہنامہ

آجکل

نئی دہلی

ایڈیٹر
مہدی عباس حُسینی

ٹیلیفون نمبر :- ۳۸۷۰۶۹

سب ایڈیٹر
نند کشور وکرم

جلد ۳۲ شمارہ ۶
جنوری ۱۹۷۴ء
پوش ماگھ شک ۱۸۹۵

سالانہ چندہ
۱۰ روپے یا ۳ ڈالر یا ۱ پاؤنڈ

ترتیب

سرورق ؛ عمل : برہم دیو شرما

شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر آجکل، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی

ترسیلِ زر کا پتہ
بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

پانچویں منصوبے کا خاکہ

آج ملک کے سامنے چار بڑے بڑے مسائل ہیں۔ گرانی، بڑھتی ہوئی آبادی، وسائل کی کمی اور غربت و بے روزگاری۔

گرانی اس وقت ہوتی ہے جب پیداوار کم ہو اور طلب زیادہ۔ گرانی کا سب سے بڑا سبب ہمارا وہ زرعی نظام ہے جو بارش پر منحصر ہے۔ ساتھ ہی ساتھ درآمد ہونے والی اشیاء جن میں تیل، پٹرول، مصنوعی کھاد وغیرہ شامل ہیں۔ ان کی قیمتیں بھی ساری دُنیا میں بڑھتی جارہی ہیں۔

جہاں تک ہند میں غلّے کی پیداوار کا تعلق ہے اس میں شک نہیں کہ پچھلے سال قحط و سیلاب کے باعث کم پیداوار ہوئی لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ملک میں غلّے کی کوئی حقیقی کمی تھی۔ نہ صرف سرکار کے پاس بلکہ غلّے کے تھوک بیوپاریوں کے پاس بھی غلّے کا بڑا ذخیرہ موجود تھا لیکن جب سرکار نے گیہوں کے تھوک بیوپار کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تو نہ صرف بڑے بیوپاریوں نے بلکہ اُن کے اکسانے پر بڑے کسانوں نے بھی غلّہ دبا دیا اور اسے سرکار کے ہاتھ مناسب دام پر بیچنے کی جگہ چور بازار میں مہنگے داموں فروخت کرنا شروع کر دیا۔ ان بیوپاریوں نے غلّہ کے علاوہ روزمرّہ کی ضرورت کی دیگر اشیا یعنی گھی، تیل، شکر، مٹّی کا تیل اور سستا کپڑا بھی دبا دیا۔ لہٰذا اب یہ ہمیشہ سے زیادہ ضروری ہو گیا ہے کہ پیداوار کے ساتھ اسکی تقسیم کے طریقے اور نظام پر بھی حکومت نہ صرف کڑی نظر رکھے بلکہ ان کو ہاتھ میں لینے سے دریغ نہ کرے۔

آبادی کا مسئلہ بھی بہت واضح ہے۔ ۱۹۷۱ء میں ہندوستان کی آبادی تقریباً ۵۵ کروڑ تھی۔ عالمی بینک کے ایک حالیہ اندازے کے مطابق ہند کی خاندانی منصوبہ بندی کی کوششوں کے باوجود ۱۹۸۰ء میں یہ آبادی ۶۷ کروڑ، ۱۹۹۰ء میں کوئی ۸۱ کروڑ اور ۲۰۰۰ء میں تقریباً ۹۶ کروڑ ہو جائے گی۔ آبادی میں اضافے کے معنی ہیں غربت میں اضافہ۔ ہماری آبادی میں اضافے کی شرح ڈھائی فیصد سالانہ کے لگ بھگ ہے۔ ہر سال کوئی ۱۲ لاکھ آدمیوں کا اضافہ ہو جاتا ہے جن میں کوئی چالیس فیصدی پیدائشیں اس نادار طبقے میں ہوتی ہیں جس کی تعداد اب بھی بائیس کروڑ ہے اور جس کے گرے ہوئے معیارِ زندگی کو بلند کرنا ہمارا فرضِ اوّلین ہے۔

کیا ہمارے پاس اس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے وسائل ہیں اسکا جواب ہاں اور نہیں دونوں میں ہے۔ اوّل تو اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ۱۹۷۲-۷۳ء تک ہندوستان بین الاقوامی اداروں سمیت کوئی ۲۷ ملکوں کا ۱۷ ارب ۱۱ کروڑ روپیوں کا مقروض تھا۔ اسی سال ہند نے کوئی تین ارب چودہ کروڑ روپیہ ان قرضوں کی ادائیگی میں ادا کی جن میں ایک ارب ۹۸ کروڑ روپیہ بطور سود ادا کیا اور یہ سب بیرونی سکوں میں۔

لیکن جہاں تک اندرونی وسائل کا تعلق ہے ہم غریب نہیں بلکہ ایک مصنف نے تو اپنی کتاب کا آغاز ہی اس جملے سے کیا ہے کہ ہندوستان ایک امیر ملک ہے جس میں غریب لوگ بستے ہیں۔ در اصل دولت صرف روپے پیسوں میں نہیں گنی جاتی۔ ہماری ساری زمین، پہاڑ، دریا، جنگل، زراعت، صنعت، معدنیات، معدنیات، پانی، بجلی، سڑکیں، ریلیں، ذرائع آمد و رفت اور ان سب سے بڑھکر ہماری زبردست آبادی کے ہاتھوں اور دماغوں کی طاقت۔ یہ ہے ہماری اصلی دولت۔

پانچویں پنج سالہ منصوبے کے خاکے میں جسے حال میں قومی ترقیاتی کونسل نے منظور کیا ہے اس حقیقت کو مانا اور پہچانا گیا ہے اور غربت کے خاتمے اور خود کفالت کے حصول پر خاص طور پر زور دیا گیا ہے۔

پچھلے منصوبوں کے دوران نئی صنعتیں قائم کر کے بے روزگار دیہاتیوں کو دیہات چھوڑ کر شہر آنے کی ترغیب دی گئی تھی لیکن "سبز انقلاب" کی بدولت یہ ممکن ہو گیا ہے کہ بے روزگار دیہاتیوں کو دیہاتوں میں روزگار مہیا کیا جائے۔ انکی بے روزگاری دُور کرنے کے لئے پہلا قدم ہے زمینی شعار یعنی اراضی کی ملکیت کی حد بندی کر کے فاضل زمین کو بے زمین کھیت مزدوروں میں تقسیم کیا جائے۔ پھر ان لوگوں کو زرعی قرضے دے کر اور کھیتی کے جدید طریقوں سے آگاہ کر کے چھوٹی زمینوں پر بھی اچھی پیداوار لینے کے قابل بنایا جائے۔

جہاں تک تعلیم یافتہ بے روزگاروں کا تعلق ہے، اُن میں سے کچھ تو مخصوص پیشوں کے لئے تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔ اُن کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کے لئے قرضے وغیرہ دیئے جا سکتے ہیں اور اگر وہ دیہاتوں میں کام کرنے پر تیار ہوں تو اُن کی کھپت بہت آسانی سے ہو سکتی ہے۔ اصل مسئلہ اُن بے روزگاروں کا ہے جو آرٹس کے طالب علم رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کا مقصدِ حیات محض سرکاری نوکری ہوتا ہے جس میں ان لوگوں کی تعداد اس وقت بھی ۵ لاکھ ہے لیکن سرکاری ملازمتیں اندھا دھند تو بڑھائی نہیں جا سکتیں۔ لہٰذا اس کا واحد علاج یہ ہے کہ ان لوگوں کو بھی مخصوص پیشوں اور کاموں کی از سرِ نو تربیت دی جائے۔

خاکے میں پانچویں منصوبے پر ۵ کھرب ۳۴ ارب ۱۱ کروڑ روپے کا سرمایہ لگا کر حسب ذیل بڑے مقاصد حاصل کرنے کی تجویز رکھی گئی ہے۔

۱۔ گھریلو پیداوار میں ۵½ فیصد شرح اضافہ۔
۲۔ ایسے روزگار کی توسیع جس سے پیداوار میں اضافہ ہو۔
۳۔ کم سے کم بنیادی ضروریات پوری کرنے کا قومی پروگرام۔
۴۔ سماجی فلاح کے پروگرام کی توسیع۔
۵۔ زراعت اور ایسی کلیدی اور بنیادی صنعتوں پر زیادہ توجہ جو عام استعمال کی چیزیں پیدا کرتی ہیں۔
۔ غربا کو مناسب دام پر ضروری استعمال کی چیزیں مہیا کرنے کے لئے سرکاری وصولی و تقسیم کا معقول انتظام۔
۷۔ برآمدات کی توسیع اور درآمدات کا بدل ڈھونڈنے کا پرجوش پروگرام۔
۸۔ غیر ضروری اخراجات پر سخت پابندی۔
۹۔ قیمت، اُجرت اور آمدنی کا منصفانہ توازن۔
۱۰۔ سماجی، اقتصادی اور علاقائی نابرابریوں کو کم کرنے کے لئے [illegible]

کرتار سنگھ دُگل
مشیر اطلاعات، پلاننگ کمیشن۔ یوجنا بھون، نئی دہلی — ۱۱۰۰۰۱

نیا منصوبہ

ہمارے ملک کی اندازاً چالیس فی صد آبادی یا کوئی بائیس کروڑ انسان انتہائی غربت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ایک ایسے ملک کے لئے جسے آزاد ہوئے پچیس سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا، یہ کوئی خوش آئند بات نہیں۔ ہم نے بہت سوچ بچار کر چار منصوبے بنائے تھے جن سے مجموعی طور پر ہماری آمدنی میں کوئی چار فی صد سالانہ کی شرح سے اضافہ ہوا۔ لیکن اسی دوران میں ہماری آبادی کے اضافے کی شرح بھی کوئی ڈھائی فی صد رہی۔ لہٰذا بہتری کی بہت کم گنجائش باقی رہی۔ جبھی آج کا عام ہندوستانی اپنی اقتصادی حالت میں کوئی نمایاں فرق محسوس نہیں کرتا۔ اس کے برعکس اُسے یہ گمان ہوتا ہے کہ امیر زیادہ امیر اور غریب زیادہ غریب ہو گئے۔ یہ نابرابری نہ صرف آبادی کے مختلف طبقوں میں بلکہ ملک کے مختلف علاقوں میں بھی بڑھتی دکھائی دیتی ہے۔

چنانچہ آج ہمارے لئے دو مسائل کا حل اشد ضروری ہو گیا ہے، ایک تو غریبی دُور کرنا، دوسرے نابرابری کم کرنا۔

یہ مدِّ نظر رکھتے ہوئے کہ ہم ایک باعزت آزاد قوم ہیں اور کسی ناجائز خارجی دباؤ سے متاثر نہیں ہوں گے یہی مناسب سمجھا جاتا ہے کہ ہم ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے ایک عزمِ مستحکم کے ساتھ خود کفیل بننے کی کوشش کریں۔

پانچویں [illegible] نظر رکھتے ہوئے بنایا گیا ہو۔ پلان کا [illegible] مشکل [illegible] گیا تھا کہ چوتھے پلان [illegible] اسباب کے باعث ہم کوئی قابلِ ذکر اقتصادی [illegible] بارش کی کمی کے کارن دو سال متواتر یعنی [illegible] فصل [illegible] اس کے علاوہ قحط سے پیدا شدہ [illegible] کرنے پڑے۔ اس کے بعد بنگلہ دیش [illegible] جنگ کے باعث اور بھی اخراجات سر پر آ پڑے۔ لہٰذا اقتصادیات پر افراطِ زر کا دباؤ پڑا۔ نتیجتاً پچھلے سال کے لگ بھگ قیمتیں اتنی بڑھ گئیں جتنی کبھی نہ بڑھی تھیں۔ بارش نہ ہونے کی وجہ سے بجلی کی سپلائی پر بھی اثر پڑا جس کے باعث صنعتوں کی رفتارِ ترقی بھی مدھم پڑ گئی۔ چوتھے پلان کی شروعات بہت اچھی ہوئی تھی۔ اس کے پہلے سال کے دوران صنعتوں کی شرح ترقی سات فی صد تھی تو دوسرے سال کے دوران پانچ فی صد کے لگ بھگ۔ لیکن اگلے ہر دو برسوں میں قومی آمدنی دو دو فی صد سے زیادہ ترقی نہ کر پائی۔ پھر بھی چوتھے پلان کے آخری سال میں صورتِ حال کافی امید افزا دکھائی دیتی ہے۔ اب کی بارشیں اچھی ہوئیں ہیں اور توقع ہے کہ زرعی پیداوار پلان کے نشانوں کے مطابق ہوگی۔ صنعتی پیداوار میں ابھی سے ترقی کے آثار دکھائی دے رہے ہیں۔ چنانچہ ۷۴-۱۹۷۳ء کے دوران اقتصادی سرگرمیوں کو تیز تر بنانے کے اسباب مہیا ہیں اور اس طرح اس سال پانچواں پلان شروع کرنے کے لئے موافق نفسیاتی فضا موجود ہوگی۔

فضا یوں بھی سازگار ہو چکی ہے کیونکہ قومی ترقیاتی کونسل نے جو کہ ملک کی ایک اعلیٰ ترین مجلس ہے اور جس میں وزیرِاعظم کی صدارت میں ملک کے سارے وزرائے اعلیٰ شامل ہیں، پانچویں پلان کی حکمتِ عملی اور سرمایہ کاری کو اتفاق رائے سے منظور کر لیا ہے۔ قومی ترقیاتی کونسل نے یہ بھی منظوری دے دی ہو کہ پانچویں پلان میں مجموعی طور پر پانچ کھرب، چونتیس ارب، گیارہ کروڑ روپیہ کا سرمایہ لگا کر اس سے فی کس آمدنی میں ساڑھے پانچ فی صد سالانہ کا اضافہ کیا جائے۔ مجموعی سرمایہ کا تین کھرب، بہتر ارب، پچاس کروڑ روپیہ قومی سیکٹر میں لگایا جائے گا۔ اور ایک کھرب، اکسٹھ ارب، اکسٹھ کروڑ روپیہ پرائیویٹ سیکٹر میں۔ قومی ترقیاتی کونسل کا خیال تھا کہ اس سے کم شرح ترقی سے قوم کی توقعات پوری نہ ہو سکیں گی۔ وزرائے اعلیٰ نے عہد کیا کہ وہ مزید ذرائع آمدنی اکٹھا کرنے اور ملک کو خود کفالت کی راہ پر لگانے کے لئے کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھیں گے۔

کونسل نے پانچویں پلان کے خاص مقاصد یعنی غربت کو دور کرنے اور نابرابریوں کو کم کرنے اور اقتصادی طور پر خود کفیل ہونے کی بھی توثیق کی۔

اس میں شک نہیں کہ پانچویں پلان کی بعض خصوصیات پچھلے پلان میں بھی پائی جاتی تھیں۔ لیکن ہماری ترقی کی تاریخ میں پہلی بار ہو رہا ہے کہ غریبی کے مسئلے کو خاص طور پر حملے کا نشانہ بنایا جائے گا۔ غریبی کے اسباب ہیں پسماندگی اور نابرابری، اور اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے ان دونوں اسباب پر بیک وقت حملہ کرنا پڑے گا۔ چنانچہ غربت دور کرنے کے لئے پانچویں پلان کی حکمتِ عملی یہ ہے کہ اقتصادی ترقی کی رفتار تیز تر کی جائے، نابرابری کم کی جائے اور غریبوں کی بھلائی کے لئے براہِ راست اقدام کئے جائیں۔

یہ یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ محض اقتصادی ترقی سے ہی غریبوں کے معیارِ زندگی میں بہتری آ جائے گی۔

اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کرنا پڑے گا۔ بے روزگاروں اور کم روزگار پانے والوں کو نفع بخش روزگار مہیا کرنا ہوگا۔ اور یہ روزگار کے مواقع بہت وسیع پیمانے پر مہیا کئے جائیں گے۔ تعلیم یافتہ بے روزگاروں کو نفع بخش سرگرمیوں میں لگانے کے لئے خصوصی پروگرام بنائے گئے ہیں۔ موجودہ ڈھانچہ کو بدلنے کے لئے نظام تعلیم میں بھی ضروری تبدیلیاں لانا پڑیں گی۔

جہاں تک سماج کے غریب طبقوں کا تعلق ہے، یہ ضروری نہیں کہ محض روزگار ملنے سے ان کی کم سے کم ضرورتیں پوری ہو جائیں۔ لہذا یہ بھی لازمی ہے کہ اس طبقہ کو تعلیم، صحت، قوت بخش غذائیں، پینے کا پانی، رہائش، سڑکیں اور بجلی کی سہولتیں مہیا کی جائیں اور گندی بستیوں کی صفائی کی جائے۔ چنانچہ کم سے کم بنیادی ضرورتیں پوری کرنے سے متعلق ایک قومی پروگرام کی تشکیل کی گئی ہے اور پانچویں پلان میں اس کام کے لئے تیس ارب روپے کی رقم رکھی گئی ہے۔

خود کفالت کے مقاصد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ پلان کے آخری سال تک کسی بیرونی ملک سے کوئی رعائتی امداد لینے کی ضرورت باقی نہ رہے۔ اس کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ ۷۹-۱۹۷۸ء کے دوران اور اس کے بعد کے عرصے میں ہمیں صرف موجودہ قرضوں اور ان کے سود کی ادائیگی کے لئے کوئی امداد درکار ہوگی۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے پلان میں یہ تجویز کیا گیا ہے کہ غلہ، کپاس، تلہن، غیر آہنی دھاتوں، مصنوعی کھاد، خام تیل، پٹرولیم کی مصنوعات، انجینئرنگ کی معاون مصنوعات اور بنیادی کیمیاوی اشیاء کی پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ کیا جائے۔ شرح برآمدات میں ۷٫۶ فی صد سالانہ کا اضافہ کیا جائے گا۔ یہی چوتھے پلان کی شرح اضافہ تھی۔ غیر ملکی امداد ابھی سے کم ہونا شروع ہو گئی ہے۔ ۶۹-۱۹۶۸ء میں جتنی غیر ملکی امداد لی گئی تھی ۷۳-۱۹۷۲ء میں اس کی ایک چوتھائی بھی امداد لینے کی ضرورت نہ پڑی۔

پلاننگ کمیشن نے مختلف اندازے لگانے کے بعد سفارش کی ہے کہ سالانہ شرح ترقی کا اوسط ساڑھے پانچ فی صد ہونا چاہیئے۔ امید کی جاتی ہے کہ ۷۳-۱۹۷۲ء کی قیمتوں کے مطابق ۷۹-۱۹۷۸ء تک ہماری آبادی کے غریب ترین تیس فی صد حصے کا فی کس صرفہ دیہی علاقوں میں چالیس روپے ماہانہ اور شہری علاقوں میں تینتالیس روپے ماہانہ ہو جائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مجموعی طور پر ان کے صرفے کی سطح غربت کی سطح سے اونچی ہو جائے گی۔ بہ الفاظ دیگر دیہی غرباء کے صرفے میں ۴۲ فی صد اور شہری غرباء کے صرفے میں ۴۰ فی صد کا اضافہ ہو جائے گا۔ غرباء کے صرفے میں اتنے زبردست اضافے کو حاصل کرنے کے لئے امیر طبقہ کے صرفے کو کم کرنا پڑے گا۔

چنانچہ پانچویں پلان میں مختلف امور کی ترقی کے لئے جو رقمیں مخصوص کی گئی ہیں وہ برابری اور خود کفالت کے حصول سے متعلق بنیادی مقاصد کے عین مطابق ہیں۔ مجوزہ ترقیاں حسب ذیل ہیں۔

۱—	زراعت	۴٫۷ فی صد
۲—	معدنیات اور مصنوعات	۸٫۲ 〃 〃
۳—	بجلی	۱۰٫۸ فی صد
۴—	تعمیرات	۸٫۸ 〃 〃
۵—	ذرائع نقل و حرکت	۸٫۸ 〃 〃
۶—	خدمات	۴٫۶ 〃 〃

اس کا خیال رکھا گیا ہے کہ بچت اور سرمایہ کاری میں ایسا توازن رکھا جائے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے پلان میں روپے لگانے سے افراط زر پیدا نہ ہو سکے۔ یہ بھی سفارش کی گئی ہے کہ اشیاء کی تقسیم کا ایک ایسا تسلی بخش انتظام کیا جائے کہ کم از کم غریب طبقوں کو ضروری اشیاء مناسب قیمتوں پر ضرور مل جایا کریں۔ یہ بھی ارادہ ہے کہ اجرتوں کا ایک منصفانہ قومی ڈھانچہ تیار کیا جائے جو قومی اور پرائیویٹ دونوں سیکٹروں پر لاگو ہو۔

جو لوگ جائداد اور سرمایہ کاری سے آمدنی حاصل کرتے ہیں ان سے کچھ سختی برتنی پڑے گی تاکہ اصراف بیجا کی روک تھام ہو سکے۔

پچھڑے ہوئے علاقوں اور پہاڑی علاقوں کے لئے بھی ایک مربوط پروگرام تیار ہو رہا ہے۔ کم سے کم بنیادی ضرورتیں پوری کرنے کے قومی پروگرام کو بھی اس پروگرام سے مربوط کیا جائے گا۔ پچھڑے ہوئے طبقوں کی ترقی کے لئے زیادہ سرگرمی سے کام کیا جائے گا۔ پچھڑے علاقوں میں پچھڑے لوگوں کے لئے چند بڑے ترقیاتی پروگرام بنائے جائیں گے۔ پلان میں ضرورت مند کنبوں کے بچوں کی دیکھ بھال کا بھی انتظام رکھا گیا ہے۔ ہونہار طالب علموں کی حوصلہ افزائی کے پروگرام بھی موجود ہیں جو لوگ گندے پیشوں سے روزگار حاصل کرتے ہیں ان کے رہن سہن کو بہتر بنانے کی طرف سب سے پہلے توجہ دی جائے گی۔ قبائلی علاقوں پر بھی خصوصی توجہ مرکوز کی جائے گی۔

جب پلان کو آخری شکل دی جا رہی تھی تب وزیر اعظم نے جو پلاننگ کمیشن کی چیئرمین بھی ہیں یہ صلاح دی کہ پلان پر عمل درآمد کرانے کی حکمت عملی پر خاص توجہ دی جانی چاہیئے۔ چنانچہ پلان میں گنجائش رکھی گئی ہے کہ مختلف سطحوں پر جلد فیصلے کئے جا سکیں۔ وہ اسکیمیں اور پروگرام جن پر کام شروع ہو چکا ہے انہیں جلد از جلد مکمل کیا جائے اور پیداوار کی جو بھی صلاحیتیں اور امکانات مہیا کئے جا چکے ہیں ان کا بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیئے تاکہ ان میں جو روپیہ لگا ہے اس کا بہترین نفع مل سکے۔

پانچواں پلان ایک عوامی منصوبے کے طور پر وضع کیا گیا ہے ہم اسے محض اس لئے عوامی منصوبہ نہیں کہتے کیونکہ اس میں عوام کی کم سے کم بنیادی ضرورتیں پوری کرنے سے متعلق متعدد پروگرام شامل ہیں بلکہ اس لحاظ سے بھی کیونکہ سرکار اس منصوبہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے عوام کا اشتراک حاصل کرنے کے لئے انتہائی مخلصانہ کوشش کرے گی۔ متعدد ایسے پروگرام تیار کئے جا رہے ہیں جو عوام میں یہ احساس پیدا کر سکیں کہ یہ پلان انہیں کے لئے ہے۔ پانچواں پلان اسی حد تک کامیاب ہوگا جس حد تک عوام کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگا۔

قرۃ العین حیدر
آشا محل۔ نوروجی گماڈیا روڈ۔ بمبئی ۲۶

کارِ جہاں دراز ہے

فصلِ دوم۔ باب ۶

راوی

۱۸۴۹ء میں تسخیرِ پنجاب کے بعد گورنمنٹ نے اس صوبے میں نہریں نکالنا شروع کیں۔ ۱۸۵۱ء سے بڑی دوآب یا ستلج راوی کنال کی کھدائی کا آغاز ہوا۔ یہ کام ۱۸۵۸ء تک جاری رہا۔ ۱۸۵۹ء میں ملتان سے امرتسر تک ریل چلنے لگی۔

صوبے کے بندوبست کے لئے سرکار نے جو متعدد ہوشیار اور مستعد "ہندوستانی افسر پنجاب بھیجے" ان میں میر قائم علی بھی شامل تھے۔ ستلج راوی کنال کا مستقر گورداسپور تھا۔ ڈپٹی قائم علی وہیں تعینات کئے گئے۔ مارے ضد کے کانپور سے روانہ ہوتے وقت بیوی بچوں سے ملنے بھی مراد آباد نہ آئے۔ خط بھجوا دیا۔ اب ہم پردیس جاتے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو جلد از جلد تم لوگوں کو وہاں بلوا لیں گے۔

امراؤ بیگم رو دھو کر چپ ہو رہیں۔ کوٹھی بن کر تیار ہو چکی تھی۔ اس میں میاں کے ساتھ چین سے رہنا نصیب نہ ہوا۔ میاں کے انتظار میں چپ بیٹھی ٹکر ٹکر سب کا منہ دیکھا کرتیں۔ کبھی سوچتیں میری گھڑی لکھنؤ سے قدم نکالا تھا۔ منتیں مانیں۔ فریادی ماتم کئے۔ مگر میاں اب آتے ہیں نہ تب۔ عزیز و اقارب نے تلاش کرنے کی بہت کوشش کی۔ مگر بے سود۔ نگوڑے پنجاب میں نہ جانے کہاں اللہ میاں کے پچھواڑے بھیج دیئے گئے تھے۔

اب خدا کی قدرت کا ایک تماشہ دیکھئے۔ ہمارا ایک خاندانی قصاب تھا۔ لاکڑی والوں کے یہاں گوشت لاتا تھا۔ فصل ہوا اس کا حساب کیا جاتا تھا۔ ایک مقدمے کے سلسلے میں سرکاری گواہ بنا کر اسے گورداسپور پنجاب بھیجا گیا۔ گورداسپور۔ وہاں ڈپٹی قائم علی کی عدالت میں پیش ہوا۔

(ڈپٹی کمشنر کو پنجاب میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کہتے ہیں)۔ قصاب نے گواہی دی۔ لب و لہجے سے فوراً پہچان گئے۔ پوچھا: "کہاں کے ہو؟"

بولا: "میاں وہیں کا ہوں۔ مراد آباد کا۔"

شکستہ محرابیں،

پوچھا: "فلاں فلاں گھروں میں گوشت لاتے تھے؟"

بولا: "جی ہاں۔ میاں اب بھی لاتا ہوں۔"

ڈپٹی صاحب نے عدالت برخواست کی۔ قصاب کو اپنے کمرے میں لے گئے۔ گلے لگایا۔ خاطر تواضع کی۔ گھر لے جا کر کئی دن مہمان رکھا۔

قصاب بات کرنے کا موقع تلاش کر رہا تھا۔ ڈرتا بھی تھا کہ کہیں بگڑ نہ جائیں۔ ایک روز شام کو ڈپٹی صاحب کوٹھی کے باہر لان کے گول چبوترے پر مونڈھا بچھائے حسب معمول پیچوان کے کش لگا رہے تھے۔ قصاب آ کر فرش پر گاؤدوں بیٹھ گیا۔

ڈپٹی صاحب اس سے مراد آباد کے حالات دریافت کرتے رہے۔

"اجی میاں کیا پوچھو ہو۔ غدر کے بعد واں کا تو نقشہ ہی پلٹ گیا۔ لوگ باگ بڑی بڑی جاگیریں لے کے بیٹھ گئے۔ ہم سے ذلیل جیسے بدحال پہلے تھے ویسے ہی اب بھی ہیں۔"

"ہوں۔ ٹھیک کہتے ہو۔"

قصاب اب مطلب کی بات پہ آنا چاہتا تھا کہ ڈپٹی صاحب نے پوچھا۔

"کس کس کو جاگیریں مل گئیں بھئی؟"

"اجی میاں وہ آپ کے پڑوس میں بھتیسیا والے نا، ہیں، وہی بھتیسیا گاؤں جو آگرے والے خان بہادر تراب علی کی ملکیت ہے۔ (واضح ہو کہ ہمارے صوبے میں مراد آباد اور بجنور ایسے اضلاع ہیں جہاں نوّے فیصدی عوام اردو بولتے ہیں اور خاص مفرس اردو بولتے ہیں)۔

"ہاں۔ ہاں وہی ڈپٹی تراب علی۔ جانتا ہوں۔ کیا ہوا اُن کو؟"

ڈپٹی قائم علی نے پوچھا۔

"اجی ہونا ہوانا کیا تھا۔ غدر کے دنوں میں یہ ڈپٹی تراب علی مرزا عابد علی اور سیّد احمد دہلوی تین پکے دوست تھے۔ سیّد احمد بجنور میں تھے۔ تینوں نے سرکار کی بڑی خدمت کی۔ تراب علی صاحب کو موضع بچھراؤں ملا۔ اور مرزا عابد علی کو موضع نواڈی۔ اجی میاں!" قصّاب نے بات کا رخ پلٹا۔

"آپ گھر چل کر وہاں کا نیا نقشہ خود دیکھیے نا۔ دنیا بھر میں آپ کو تلاش کر لیا۔ اب غصّہ تھوک دیجئے۔ چلے چلیئے۔ اب تو ریل گاڑیاں بھی چلنے لگی ہیں جگہ جگہ۔"

ڈپٹی صاحب چپ۔

قصّاب نے ہمّت کر کے پوچھا۔

"میاں یہاں کسی پنجابن سے تو نکاح نا کر لیا آپ نے؟"

ڈپٹی صاحب نے نفی میں سر ہلا دیا۔

قصہ کوتاہ۔ قصّاب نے اپنی چرب زبانی سے ڈپٹی صاحب کو گھر چلنے پر رضامند کر ہی لیا۔ حقیقت یہ تھی کہ پردیس میں انھیں گھر والے شدّت سے یاد آ رہے تھے۔

کچھ عرصے بعد ڈپٹی قائم علی مراد آباد آئے۔ جن صاحبزادے سے تکرار ہوئی تھی ان سے صلح صفائی کی۔ بیوی بچوں کے علاوہ اپنی بھابھی کے لڑکے میر مہدی علی کو بھی ہمراہ لے کر پنجاب آ گئے۔ پنجاب ایڈمنسٹریشن کے بارسوخ افسر تھے۔ مہدی علی اور بیٹے میر مظہر علی دونوں کو تحصیلدار لگوا دیا۔[3]

دکھیا امراؤ بیگم کو اب بھی میاں کے ساتھ بسنا نصیب نہ ہوا۔ پنجاب کے ایک دُور افتادہ ضلع میں جہاں ڈپٹی صاحب کا تبادلہ ہوا تھا ایک ڈاک بنگلے میں مقیم تھیں۔ برسات کا زمانہ تھا۔ جس کمرے میں مع خورد سال بچوں کے سو رہی تھیں، اس کی چھت گر پڑی۔ ماں بچے سب ایک ساتھ اللہ کو پیارے ہوئے۔ ڈپٹی قائم علی پر قیامت گذر گئی۔

یہ لکھنؤ میں رام گنگا کے پل کے پاس "تاروالا مکان" نئیں ہے جو محل کہلاتا ہے۔ یہ مکان سیّد نجف علی رسالدار کا ہے۔ یہ غدر سے پہلے کمپنی کے ایجنٹ کے ماتحت لوکل فورس کے رسالدار تھے۔ ان کے بیٹے سیّد حسین علی تھرڈ بنگال کیولری میں رسالدار رہے۔ سنّی خاندان تھا۔ سیّد حسین کی بیٹی سے ڈپٹی قائم علی نے عقدِ ثانی کیا۔ اپنے سالے اولاد حسین کو ساتھ پنجاب لے گئے۔ وہ بھی خان بہادر اور ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہوئے۔

خان بہادر میر قائم علی سی۔ آئی۔ ای ایڈیشنل کمشنر صوبہ پنجاب کی ایک نامور ہستی ہے۔ دنیا جانتی ہے۔ پنجاب کے قوانین اراضی کی تشکیل میں اُن کا حصّہ اُن کا سب سے مشہور کارنامہ ہے۔

ایک بار ان کی عدالت میں ایک مقدمہ پیش ہوا۔ ایک کسان نے ایک مہاجن سے دو سو (۲۰۰) روپے قرض لئے تھے۔ مہاجن بارہ سو روپیہ مانگتا تھا۔ میر قائم علی نے اس معاملے کی اطلاع لفٹیننٹ گورنر کو بھجوائی۔ اور اراضی و مال کے قوانین مرتب کئے۔ ان کی ایک اہم شق یہ تھی کہ زمیندار کی جائداد غیر زمیندار (پنجاب میں زمیندار کسان کو کہتے ہیں) نہیں خرید سکتا۔ مہاجنوں کے پاس زمیندارا بہت کم تھا۔ اس وجہ سے اب وہ اس نئے قانون کے تحت مقروض کسانوں کو ان کی زمینوں سے بیدخل نہیں کر سکتے۔

امپیریل گزیٹیر برائے ۱۸۹۱ء میں تفصیل درج ہے۔ کس طرح قائم علی ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر گورداسپور نے ۱۸۷۰ء میں نیا قاعدہ مرتب کیا اور مسٹر پرنسپ کے بنائے ہوئے قوانین میں ترمیم کی۔

نواب رضا علی خاں قزلباش ان کے گہرے دوست تھے۔ رضا علی خاں کابل سے ۱۸۴۱ء میں لاہور آئے۔ انھوں نے اینگلو افغان جنگ کے بعد امیر یعقوب خاں والی کابل کو گرفتار کرنے میں انگریز کی مدد کی جس کے صلے میں انھیں بہرائچ میں زمین دی گئی۔ میر قائم علی جب لاہور جاتے نواب قزلباش کی حویلی مبارک منزل موچی دروازہ میں قیام کرتے۔ اس زمانے میں سو مربع (۱۰۰) یعنی ڈھائی ہزار ایکڑ زمین جو لفٹیننٹ گورنر ان کو دے رہا تھا انھوں نے نواب قزلباش کو دلوا دی۔ ہم اگر ان کی جگہ ہوتے ایسا ہرگز نہ کرتے بلکہ کمال عقلمندی سے وہ سو مربعے خود قبول کر لیتے۔

امراؤ بیگم جو صندوقچہ جواہرات لکھنؤ سے لے کر چلی تھیں بہت چلا۔ اسی میں آخری جواہرات فروخت کر کے میر قائم علی نے ضلع گورداسپور میں دو گاؤں تمیر پور اور جیت پور خریدے۔ دریا کے کنارے کوٹھی اور کنواں۔

---

[1] موجودہ نواب مظفر علی قزلباش پاکستانی سیاستداں کے جدِ بزرگ۔

[2] دیکھئے کڑیوں سے کڑیاں کس طرح ملتی ہیں۔ امیر یعقوب علی خاں سابق والی کابل کا اس داستان سے کس طرح تعلق پیدا ہوتا ہے۔ اس کی تفصیل کے لئے آنے والے ابواب کا انتظار فرمائیے۔

[3] یہ ساری جائداد بھی جو والدہ اولاد حسین کو ترکے میں ملی تھی ۱۹۴۷ء کے بعد متروکہ جائیداد قرار پائی۔

بنوائیں۔ اپنے بیٹے میر مظہر علی کی اولاد بھی دیکھ لی۔ مارچ ۱۸۷۴ء میں بمقام گورداسپور وفات پائی۔ کرنل جے ایل سٹر نے اپنے روزنامچے میں لکھا میر قائم علیشاہ کے انتقال کی وجہ سے سارا گورداسپور سوگوار ہے۔

میر قائم علی کی ہر دلعزیزی کی سب سے بڑی وجہ ان کے قوانین اراضی تھے دوسرے یہ کہ نجیب الطرفین سید تھے۔ اور سید پرستی پنجابی عوام کی سرشت میں داخل ہے۔

چنانچہ میر قائم علیشاہ کا مزار ان کی کوٹھی کے احاطے میں بنایا گیا۔ سبز جھنڈیاں لہرانے لگیں۔ عرس[1] شروع ہو گیا۔ ہندو، مسلمان، سکھ عقیدت مندوں کی بھیڑ لگ گئی۔ ان کے فیوض و برکات میں سے ایک یہ خصوصیت بتائی جاتی ہے کہ مزار کی خاک تھوڑی سی چاٹ لو۔ چوتھی کی باری تپ جو تھیا جاڑا اتار رہتا۔ اور بچھو کے ڈنک کا اثر بھی چلا جاتا ہے۔

ناظرین! عربستان میں آلِ حسن و حسین شریف کہلاتی تھی۔ ایران میں امام زادے اور توران میں خواجہ او خوجہ کہلائے۔ ہند میں آکر میراں اور میر ہوئے۔ سندھ و پنجاب میں شاہ صاحب اب انگریزی دو دیں "ایس" اپنے نام سے پہلے لکھ کر خوش ہوتے ہیں۔

یہ زمانہ ڈپٹی قائم علی کے پوتے ایس ظہور حسین کا ہے جو اس وقت مدرسۃ العلوم علیگڑھ کے میدان میں فٹ بال کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ مجھ آغا کربلائی کی طویل داستان ختم ہوئی۔ اب ایس ظہور حسین (مشہدی مراد آبادی) اور ایس سجاد حیدر (ترمذی نہٹوری) کے ساتھیوں سے علیگڑھ کا افسانہ سنیئے گا۔

والسلام

فصلِ دوم تمام شد (مسلسل)

---

[1] یہ عرس ۱۹۴۷ء تک بڑی دھوم دھام سے ہوتا تھا۔ میر قائم علیشاہ یقیناً ایک افسانوی ہستی رہے ہونگے۔ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی (بٹالہ ضلع گورداسپور کی ایک تحصیل ہے) کے بزرگوں نے انھیں دیکھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے ایک مضمون میں جو چند سال ہوئے ایک پاکستانی رسالے میں چھپا تھا۔ یہ بھی لکھا کہ میر قائم علیشاہ کے خاندان کو پنجاب میں "باودی یعنی باون گاؤں والے کہا جاتا تھا" مجھانے اس لقب کی وجہ تسمیہ کیا تھی۔

آج کل کا چندہ

ایک سال کیلئے ۱۰ روپے، دو سالہ ۱۷ روپے، سہ سالہ ۲۴ روپے طالب علموں، اساتذہ اور لائبریریوں کو ثبوت فراہم کرنے پر ۲۵٪ فیصد رعایت دی جائے گی۔

محض یہ ہے کہ چھپے چھند کے مصرعوں میں تُلسی کی مدح سرائی کر دی گئی ہے۔ اس نظم میں نہ تو تُلسی کے سوانح حیات کی کوئی تاریخیں ہیں نہ ان کی زندگی کے کوئی واقعات بیان ہوئے ہیں غالباً "مول گسائیں چرت" ہی کی بنیاد پر عام طور سے تُلسی کا سالِ ولادت سمبت ۱۵۵۴ بکرمی مان لیا گیا ہے۔ لیکن یہ سال قطعاً اور حتماً غلط ہے۔

دلیلِ اوّل: یہ متفقہ اور مسلّمہ ہے کہ تُلسی کا سالِ ارتحال سمبت ۱۶۸۰ بکرمی ہے۔ اگر سمبت ۱۵۵۴ بکرمی کو ان کا سالِ ولادت مانا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ ایک سو چھبیس[126] سال زندہ رہے۔ اتنی عمر شاذ و نادر ہی کسی کو ملتی ہے۔ یہ غیر معمولی طویل عمر کسی بے انتہا معتبر شہادت کے بغیر ناقابلِ قبول ہے۔

دلیلِ دوم: تُلسی کی پہلی نظم "رام للّا نہچھو" سمبت ۱۶۱۱ بکرمی میں تصنیف ہوئی۔ اگر ان کا سالِ ولادت سمبت ۱۵۵۴ بکرمی مانا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ انہوں نے شاعری ۵۷ سال کی عمر میں شروع کی۔ یہ بات معقول نہیں ہو سکتی۔

دلیلِ سوم: تُلسی کی آخر عمر کی تصانیف "بروئے راماین"، "دوہاولی" اور "کوتیاولی" سمبت ۱۶۶۰ اور ۱۶۸۰ بکرمی کے درمیان گزری ہیں۔ تُلسی کا سالِ ولادت اگر سمبت ۱۵۵۴ بکرمی مانا جائے تو یہ تینوں گرنتھ ۱۰۶ اور ۱۲۶ سال کی عمر کے درمیان لکھے گئے۔ مین راسی کی سنیچری کی نحوست کی وجہ جو وبا چلی تھی اس کے لئے دعائیہ نظم "کوتیاولی" میں موجود ہے۔ سنیچر میں راسی مین سمبت ۱۶۷۰ سے ۱۶۷۲ بکرمی تک رہا۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ تُلسی نے یہ نظم ۱۱۵ سال کی عمر میں کہی۔ عقل اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتی۔

دلیلِ چہارم: خود تُلسی "رام چرت مانس" کا سالِ تصنیف سمبت ۱۶۳۱ بکرمی بتاتے ہیں:

سمبت سولہ سو اکتیسا   کروں کتھا ہر پد دھر سیسا   (بال۔ ۲۰۳)

سمبت ۱۵۵۴ بکرمی اگر تُلسی کا سالِ ولادت مانا جائے تو "مانس" کی تصنیف کے وقت وہ ۷۷ سال کے تھے۔ میں یہ مان سکتا ہوں کہ سورج پچھم سے نکلنے لگا۔ لیکن یہ ماننا میرے لئے بے حد مشکل ہے کہ مانس جیسی توانا نظم ایک ۷۷ سال کا بوڑھا لکھ سکتا ہے۔

دلیلِ پنجم: "مول گسائیں چرت" میں تُلسی کی تاریخ ولادت شکلا ساون سپتمی سمبت ۱۵۵۴ بکرمی بتا کر ان کے زائچے کے کچھ ستارے اس طرح بتائے ہیں:

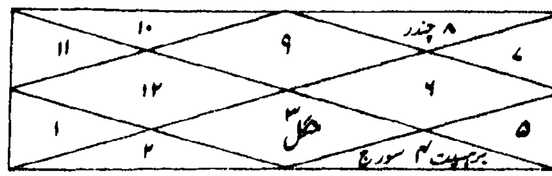
تنکے دوادس ماس پرے   جب کرک کے جیو ہما سو چرے
بچ سپتم آٹھم بھانو تنے   ابھو بت سٹھ سندر سانجھ سمے

ان مصرعوں کا ترجمہ ڈاکٹر ماتا پرشاد گپت نے اپنی تصنیف "تُلسی داس" کے ص ۵۴ پر یہ درج فرمایا ہے:

"جب برہسپت اور چندرما کرک کے تھے، منگل تلا کے تھے اور شنی ورسچک کے تھے۔"

مجھے ڈاکٹر گپت ایسے ذی علم مصنف کا یہ ترجمہ دیکھ کر حیرت سی ہوتی ہے۔ موصوف نے اپنے بے جوڑ اور غلط ترجمے میں سنیچر کو بھی شامل کر لیا حالانکہ ان

مصرعوں میں اشارتاً بھی سنیچر کا ذکر نہیں ہے۔ صحیح ترجمہ درج ذیل کیا جاتا ہے۔
"ان کے بارھویں خانے میں چندر پڑا ہے۔ جب کہ برہسپت چندر راشی کے گھر کرک میں ہے۔ منگل ساتویں گھر میں ہے۔ آٹھویں میں سورج بیٹھا ہے۔ کہتے ہیں بے حد خوب صورت شام کا وقت تھا۔"
اس معلومات کی روشنی میں زائچے کا تعین اس طرح ہوگا کہ ساون شکلا سپتمی کو سورج بہر حال کرک میں ہوگا جسے آٹھواں گھر قرار دیا گیا ہے۔ شام کے وقت کے زائچوں میں سورج یوں بھی آٹھواں ہوتا ہے۔ کرک کو خانۂ ہشتم قرار دے کر بارھویں گھر میں چندر، کرک میں برہسپت اور ساتویں گھر میں منگل کر دیا گیا۔ اس طرح زائچہ یہ شکل اختیار کر لیتا ہے:



مندرجہ بالا مصرعوں میں صرف چار ستارے بتائے گئے ہیں۔ لیکن بدھ، شکر، سنیچر، راہو اور کیتو پانچ ستاروں کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ حساب کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ سمبت ۱۵۵۴ بکرمی میں شکلا ساون سپتمی کو نہ چندر ورشچک کا ہوگا نہ برہسپت ہی کرک کا ہوگا۔ تھن میں منگل ہونا بھی مشکوک ہے۔ ایسی حالت میں مجوزہ تھی اور سمبت کا غلط ہونا یقینی ہے۔
آچاریہ سیتارام چترویدی نے اپنی نئی تالیف "تلسی گرنتھولی" میں تلسی کے جنم کے لئے سمبت ۱۵۵۴ بکرمی کی واضح تائید تو نہیں کی ہے۔ لیکن جے سمبت کی بحث کچھ اس انداز سے شروع کی ہے جس سے یہ مسئلہ اُلجھ جاتا ہے۔ میں اچاریہ چترویدی کی وسعتِ نظر کا معترف ہوں لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں جے سمبت کے معاملے میں ان سے اور ان کے ہم خیال حضرات سے متفق نہیں ہوں۔ جے سمبت کی توضیح یہ ہے۔
ہر ساٹھ سال کے بعد چونکہ قریب قریب تمام ستیارے اُنہی مقامات پر آجاتے ہیں، جہاں وہ ساٹھ سال پہلے تھے۔ لہٰذا ساٹھی یعنی ساٹھ سال کے دَور کو جیوتش میں ایک خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ بکرمی سمبت کے پہلے سال سے شروع کر کے جیوتشیوں نے ساٹھ ساٹھ سال کے دَور قائم کئے ہیں اور ان میں سے ہر سمبت کے الگ الگ نام معین کئے ہیں۔ ہر ساٹھی کے پہلے سمبت کو پربھو (प्रभव) سمبت اٹھائیسویں سمت کو جے (जय) سمبت اور ساٹھویں اور آخری سمبت کو کشئے (क्षय) سمبت کہتے ہیں۔
سمبت ۱۵۰۰ بکرمی تک ساٹھ ساٹھ سال کے پچیس دَور پورے ہو جاتے ہیں اور سمبت ۱۵۰۱ بکرمی سے پھر پربھو سمبت شروع ہوتا ہے۔ اس کے اٹھائیسویں سال سمبت ۱۵۲۸ بکرمی جے سمبت ہوگا۔ ساٹھ سال مزید گذرنے کے بعد اس صدی میں سمبت ۱۵۸۸ بکرمی دوسرا جے سمبت ہوگا اس کے ساٹھ سال بعد آئندہ صدی میں سمبت ۱۶۴۸ بکرمی پھر جے سمبت ہوگا۔ اچاریہ چترویدی سمبت ۱۵۸۲ اور ۱۶۴۲ بکرمی کو جے سمبت مانتے ہیں جو دُرست نہیں ہو سکتا
سمبت ۱۵۵۴ بکرمی کے علاوہ تلسی کے سنواتِ ولادت ۱۵۸۰، ۱۵۸۱، ۱۵۸۳ اور ۱۵۸۹ بکرمی بھی بتائے گئے ہیں۔ ان میں سے اوپر کے تین سمبت انفرادی اندازے ہیں۔ لیکن آخری سمبت ۱۵۸۹ بکرمی کی تائید میں کافی شہادتیں ملتی ہیں۔ میرے علم میں یہ سال سب سے پہلے ہاتھرس کے تلسی صاحب (سمبت ۱۸۲۰ سے ۱۹۰۰ بکرمی تک) نے اپنی تصنیف "گھٹ رامائن" میں بتایا ہے۔
تلسی صاحب خود کو تلسی داس کا اوتار کہتے تھے۔ اپنی "گھٹ رامائن" کا اصلی سالِ تصنیف وہ سمبت ۱۶۱۸ بکرمی بتاتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ اپنے پچھلے جنم میں جب وہ تلسی داس تھے تو انہوں نے پہلے "گھٹ رامائن" تصنیف کی۔ اس پر جین، ہندو اور مسلمان سب بگڑ گئے۔ تلسی صاحب یعنی تلسی داس نے "گھٹ رامائن" چھپا دی اور "رام چرت مانس" لکھی۔ اس سے جین ہندو اور مسلمان خوش ہو گئے۔ "گھٹ رامائن" جو بقول تلسی صاحب سمبت ۱۶۱۸ بکرمی میں لکھی گئی تھی اسے تلسی صاحب نے اس جنم میں نکال کر سنت دھرم کی سیوا کی ہے۔ اسی "گھٹ رامائن" میں انہوں نے اپنے پچھلے جنم کے سوانح بھی لکھے ہیں اور اپنے گذشتہ جنم کا سالِ ولادت سمبت ۱۵۸۹ بکرمی بتایا ہے۔
بظاہر تلسی صاحب جیسے غیر متوازن آدمی کی بات کسی توجہ کی مستحق نہیں ہو سکتی۔ لیکن عجیب بات ہے کہ نئے اہلِ تحقیق نے بیشتر اسی سال کو تلسی کا سالِ ولادت مانا ہے۔ ڈبلیو ڈگلس پی ہل، جارج گریرسن، پروفیسر برانی کاف وغیرہ نے سمبت ۱۵۸۹ بکرمی ہی کو تلسی کا سالِ ولادت تحریر کیا ہے۔ راہل سنکرتائن نے مانس کی روسی بھومیکا کے مقدمہ میں تلسی کو اکبر بادشاہ سے دس سال بڑا بتایا ہے۔ اس طرح بھی تلسی کا جنم ۱۵۸۹ بکرمی قرار پاتا ہے۔ یہ یقینی ہے کہ اتنی شہادتیں تلسی صاحب ایسے وہمی کی تائید میں نہیں ہو سکتی تھیں۔ ان میں سے بیشتر لوگوں نے گھٹ رامائن دیکھی بھی نہ ہوگی۔ ان محققین کو یہ سال کہاں سے ملا اس کے متعلق میں کچھ نہیں لکھ سکتا۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ میرے مندرجہ بالا حساب سے سمبت ۱۵۸۹ بکرمی جے سمبت بھی ہے۔ اس سال تلسی جیسے کروڑوں انسانوں کا دل جیت لینے والے شاعر کی ولادت جے سمبت کے لئے عقیدۂ سعادت کے عین مطابق ہے۔
مین اس مندرجہ سال کو حتمی طور پر درست کہنے کی جرأت تو نہیں کر سکتا لیکن تلسی کے جتنے سنواتِ ولادت بیان ہوئے ہیں ان میں معقول ترین یہی سال ہے۔ اس سال کو تسلیم کر لینے کے بعد تلسی کے واقعاتِ حیات ایک معقولیت کے رشتے میں منسلک ہو جاتے ہیں۔
تلسی کے مقاماتِ ولادت جمنا کے کنارے راجاپور ضلع باندہ یا گنگا کے کنارے سورون ضلع ایٹہ کے مانے جاتے ہیں۔ میں ان میں سے آخر الذکر مقام کا موید ہوں۔ باندہ ضلع گزیٹیر سمبت ۱۹۶۱ بکرمی اور ۱۹۶۶ بکرمی

ہے کہ تلسی اکبر بادشاہ کے عہد میں سوروں سے آکر راجا پور میں رہنے لگے۔ بیان اس بات کی واضح حمایت کرتا ہے کہ تلسی کا مولد سوروں ہے۔ اس کے سوروں کے نواح میں آج بھی تلسی کے چچا زاد بھائی نند داس کی اولادیں خاندان والے آباد ہیں۔ سنکر کھیت جہاں تلسی نے بچپن میں اپنے گرو سے رام کتھا سوروں میں ہے۔ "سنکر کھیت مہتم" تصنیف سمبت ۱۶۷۰ بکرمی اور نقل کردہ سمبت ۱۸۰۰ بکرمی جس میں تلسی کی نسباولی (شجرہ) بھی موجود ہے سوروں میں ملا ہے۔ تلسی کی بیوی رتناولی کی منظوم جیونی کا مخطوطہ تصنیف سمبت ۱۸۲۹ بکرمی نقل کردہ سمبت ۱۸۶۴ بکرمی نیز رتناولی کے دوہے نقل سمبت ۱۸۰۴ بکرمی بھی سوروں میں ملے ہیں۔ سوروں ایک قدیم تیرتھ ہے۔ یہاں تلسی کے گرو نرہرداس کا آنا بھی قرین قیاس ہے۔ غرض یہ سب باتیں جن پر تفصیل سے بحث کرنے کی یہاں گنجائش نہیں، یہ ثابت کرتی ہیں کہ سوروں ضلع ایٹہ ہی میں تلسی کی ولادت ہوئی ہے۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ ہندوستان کا ایک اور عظیم شاعر امیر خسرو بھی اس ایٹہ ضلع میں گنگا کے کنارے قصبہ پٹیالی میں پیدا ہوا تھا۔

تلسی کی حیات عجیب و غریب واقعات سے بھری پڑی ہے۔ ان کی ولادت کے متعلق دوسروں کے بیان کئے ہوئے فوق الفطرت واقعات کو نظر انداز کرنے کے باوجود خود تلسی کے بیان سے یہ انکشاف کتنا حیرتناک ہے کہ ان کے ماں باپ نے کٹل کیٹ (بچھو) کی طرح جنم دے کر ان کو تج دیا۔

تنو جنیو کٹل کیٹ جیوں   تجیو مات پتا ہوں (دونے ۲۷۵)

وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ:-

مات پتا جگ جائی تجیو   بدھو نہ لکھی کچھ بھال بھلائی (کوتیاولی۔ اتر۔ ۵۷)

اپنی کتاب تلسی کے ص ۴۰ پر ڈاکٹر ماتا پرشاد گپت نے تج دینے کا مطلب چھوڑ کر مر جانا قرار دیا ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کے بتائے ہوئے معنی نہ تو تلسی کے سیاق کلام سے مطابقت کرتے ہیں نہ لغت سے۔ ہندی شبد کوش شبد ساگر نے بھی تجنا کے معنی تیاگنا اور چھوڑنا ہی بتائے ہیں۔ کٹل کیٹ کی طرح جنم دے کر تج دینے کی تلخ تشبیہہ سے ماں باپ کے غیر انسانی برتاؤ کی مزید شہادت مل جاتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ تلسی کے ماں باپ نے انہیں اس لئے تج دیا کہ وہ خوفناک علامات کے ساتھ منوس مولا نکشتر میں پیدا ہوئے تھے۔ تلسی کا کوئی زائچہ نہیں ملتا۔ مگر خود ان کے کلام میں مولا نکشتر میں جنم لینے کی طرف واضح اشارہ موجود ہے۔

جایو کل منگن بدھاونو بجا
بھیو پرتاپ پاپ جننی جنک کو   (کوتیاولی۔ اتر۔ ۷۳)

قاعدہ ہے کہ اگر مولا نکشتر میں بچے پیدا ہو تو مولا کی شانتی کئے بغیر ماں باپ بدھائی کا باجا نہیں بجاتے۔ اس آسمانی قانون کی خلاف ورزی کرنے سے ماں باپ کو پاپ لگتا ہے۔ تلسی کہتے ہیں کہ میرے جنم پر بدھائی کا باجا بجانے کی وجہ سے میرے ماں باپ کو تکلیف ہوئی اور پاپ لگا۔ مولود کی بدھائی کا باجا بجا کر ماں باپ کو پاپ لگے، یہ صورت صرف مولا نکشتر کے جنم ہی سے ہو سکتی ہے۔ تلسی نے اسی حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ یہاں کسی دوسری قیاس آرائی کی گنجائش نہیں۔

کہتے ہیں تلسی کی ماں نے اس بچے کو اپنی داسی کی سسرال بھجوا دیا اور خود مر گئیں۔ داسی نے اس بچے کو بڑے پیار سے پالا لیکن جب یہ پانچ برس کا ہوا تو وہ بھی مر گئیں۔ اب تلسی کا کوئی سہارا نہ رہا اور وہ دروازے دروازے گداگری کرنے لگے۔ خود تلسی کہتے ہیں:-

بارے تے للات بلات دُوار دُوار
جانت ہو چار پھل چار ہی چنک کو   (کوتیاولی۔ اتر۔ ۷۳)

اسی زمانے میں تلسی کے گرو نرہرداس وارد ہوئے جن کے لئے تلسی نے کہا ہے:-

بندوں گرو پد کنج، کرپا سندھو، نر روپ ہری   (مانس، بال۔ ۵)

انہی گرو نے تلسی کو گداگری سے نجات دلا کر اپنے زیر سایہ لے لیا۔ ان کا جنیو کیا اور انہیں رام نام کا گرو منتر دے کر ان کی ضروری تعلیم شروع کی۔

تلسی رام کا نام بہت لیتے تھے۔ لہٰذا ان کا نام رام بولا ہو گیا۔

رام کو گلام نام رام بولا راکھیو رام
کام یہے نام روے ہوں کبھوں کہت ہوں   (دونے ۴۳)

ان کا نام تلسی بھی تھا۔ داس شاید گرو نرہرداس کی رعایت سے انہوں نے خود بڑھایا۔

نام تلسی پے بھونڈے بھاگ   سو کہایو تلسی داس (کوتیاولی۔ اتر۔ ۱۳)

سوروں میں سنکر کھیت ہے۔ جہاں گرو نرہرداس رام کتھا لوگوں کو سناتے تھے۔ یہ کتھا تلسی بھی سنتے تھے۔

میں پن نج گرو سن سنی کتھا سو سنکر کھیت
سمجھی نہیں تس بال پن تب اتی رہون اچیت   (مانس بال۔ ۳۰ کا)

گرو کے چیلے ہو کر اپنی رام کتھا سننے کی عمر کو تلسی اچیت کہتے ہیں۔ اچیت عمر تقریباً سات آٹھ سال تک مانی جاتی ہے جس کے یہ معنی ہوئے کہ گرو کے زیر سایہ آکر گداگری سے نجات حاصل کرنے اور گرو سے رام کتھا سننے کا سال سمبت ۱۵۹۷ بکرمی قرار پائے گا۔

کہا جاتا ہے کہ تلسی چار پانچ سال تک گرو کے ساتھ تیرتھوں کی یاترا کرتے رہے۔ تقریباً سمبت ۱۶۰۱ بکرمی میں وہ بنارس پہنچے اور گرو کے حکم سے شیش سناتن کے دارالعلوم میں اعلیٰ سنسکرت اور ویدانت وغیرہ کی تعلیم کے لئے داخل ہو گئے۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً ۱۱ سال کی ہو چکی ہوگی۔

شیش سناتن کے دارالعلوم کا کورس آٹھ دس سال کا تھا۔ لہٰذا تلسی تقریباً سمبت ۱۶۱۰ بکرمی تک فارغ التحصیل ہو گئے ہوں گے۔ اس وقت ان کی عمر اکیس بائیس سال کی ہوگی۔ بہ تقاضائے عمر انہیں گرہست جیون

میں جانے کی خواہش ہوئی۔ وہ ودیا گرو سے اجازت لے کر اپنے وطن گرون چلے آئے اور یہاں پرانوں کی کتھائیں کہنے کا پیشہ شروع کر دیا۔

تلسی کے علم، خوش بیانی اور خوش گلوئی نے انہیں دور دور تک مشہور کر دیا۔ گنگا پار کے گاؤں بدریا کے پنڈت دین بندھو پاٹھک تلسی سے اتنا متاثر ہوئے کہ انہوں نے اپنی حسین اور تعلیم یافتہ ۱۲ سال کی لڑکی رتناولی کی شادی سمبت ۱۶۱۲ بکرمی میں تلسی سے کر دی۔ گونا چار سال بعد سمبت ۱۶۱۶ بکرمی میں ہوا۔ گونے کے وقت رتناولی ۱۶ سال کی اور تلسی ۲۰ سال کے تھے۔ اس خیال کی شہادت رتناولی کے اس دوہے سے ملتی ہے۔

بیس بارہین کر گیو سورہین گون کرائے
ستائس لاگت کری ناتھ رتن اسہائے

تلسی کی گرہست زندگی کے گیارہ سال بیوی کی والہانہ محبت میں گذرے لیکن سمبت ۱۶۲۷ بکرمی میں جس وقت رتناولی ۲۷ سال کی تھی تو مندرجہ دوہے کے دوسرے مصرعہ کے مطابق تلسی اُسے چھوڑ کر چلے گئے اور سنیاس لے لیا۔

محبت کے بھڑکتے ہوئے شعلے گیروے کپڑوں میں بجھ نہ سکے۔ تلسی چار سال تک سرگرداں رہے۔ آخر انہوں نے اپنے دل کے درد کو سیتا کے لئے رام کا درد بنا کر سمبت ۱۶۳۱ بکرمی میں اپنے غیر فانی گرنتھ رام چرت مانس کی رچنا شروع کی۔ ہندوستان میں اس سے زیادہ مقبول نظم آج تک نہیں کہی گئی ہے۔

یوں تو تلسی کی قریب ۲۶ تصنیفیں بازار میں نظر آتی ہیں۔ لیکن ناگری پرچارنی سبھا کاشی نے ماہر عالموں کی ایک کمیٹی مقرر کر کے ان کی جانچ کروائی۔ کمیٹی نے تفصیلی جانچ پڑتال کے بعد صرف بارہ کتابوں کو مستند قرار دیا اور باقی کو رد کر دیا۔ سبھا نے یہ بارہ مستند گرنتھ تلسی گرنتھاولی کے نام سے دو حصوں میں شائع کر دیئے ہیں۔ ان بارہ گرنتھوں کے سنوات تصنیف سمبت بکرمی میں درج ذیل ہیں۔

رام للا نہچھو	بیراگ سندیپنی	رام آگیا پرشن	جانکی منگل
۱۶۱۱	۱۶۱۴	۱۶۲۱	۱۶۲۷
رام چرت مانس	پاروتی منگل	گیتاولی	ونے پترکا
۱۶۳۱	۱۶۴۹	۱۶۵۳	۱۶۵۳
شری کرشن گیتاولی	(بروئے رامائن	دوہاولی	کوتاولی،
۱۶۵۸	۱۶۶۰)	سے	۱۶۸۰ تک،

عام طور پر تلسی کے تین دوست مانے جاتے ہیں۔ ایک پرہلاد گھاٹ کے گنگا رام جوتشی جو غالباً شیش سناتن کے دارالعلوم سے ان کے ہم سبق تھے اور جن کے لئے انہوں نے رام آگیا پرشن لکھی۔ دوسرے راجا ٹوڈرمل جن کا محل تلسی گھاٹ کے قریب تھا۔ تیسرے اس عہد کے مستند بھاکھا شاعر نواب رحیم خاں خانخاناں جو عہد اکبر بادشاہ میں سمبت ۱۶۴۶ سے ۱۶۴۸ بکرمی تک بنارس کے حاکم رہے تھے۔

سمبت ۱۶۷۲ بکرمی میں ایک وبائے عظیم چلی جو پہلا طاعون سمجھا جاتا ہے۔ اس کا سبب مین راسی کی سنیچری کی نحوست بتائی جاتی ہے۔ ہزاروں آدمی اس بیماری میں مر گئے۔ دفع وبا کے لئے تلسی نے ایک دعائیہ نظم بھی لکھی۔ خود تلسی بھی اس وبا کا شکار ہوئے لیکن وہ ان چند افراد میں سے ایک تھے جو شفایاب ہو سکے۔

تلسی گھاٹ بنارس کے پاس ایک جگہ لولارک کنڈ ہے۔ وہیں پر ایک مٹھ تھا جس کے مٹھادھیش تلسی ہو گئے تھے۔ اب تک لولارک کنڈ پر اس مٹھ کے کھنڈر موجود ہیں۔ تلسی کو اپنے مٹھادھیش بننے پر آخر عمر تک بے حد پچھتاوا تھا۔ آخری ایام میں ان کا خون خراب ہو گیا تھا۔ جسم پر پھوڑے نکلتے تھے جن سے لہو بہتا رہتا تھا۔ بہت علاج کیا مگر شفا نہ ہوئی۔ وہ اس بیماری کو مٹھادھیش بننے کی سزا سمجھتے تھے اور کہا ہے:

پھوٹ پھوٹ نکست لون رام رائے کو (باہوک۔ ۴۱)

تلسی نے ۹۱ سال کی عمر پائی۔ ایک تو وہ عہد ہی توہم پرستی کا تھا پھر مسلسل علالت اور بڑھاپے کی وجہ سے آخر میں وہ بہت زیادہ وہمی ہو گئے تھے۔ انہیں اپنی بیماری کا سبب کال اور بھوت پریت معلوم ہوتے تھے۔ اور واہمہ کے یہ سائے ان کو نظر بھی آتے تھے!

روگ بھیو بھوت سوکسوت بھیو تلسی کو (کوتاولی۔ اتر۔ ۱۶۷)

تلسی کا سال ارتحال ۱۶۸۰ بکرمی متفقہ ہے۔

سمبت سورا اسی گنگ کے تیر

لیکن ان کی پنیہ تتھی کے لئے دو قول ہیں۔

ساون شکلا سپتمی تلسی تجیو شریر

اور

ساون سیاما تیج شنی تلسی تجیو شریر

دوسرا قول یعنی ساون سیاما تیج سنیچر معتبر مانا جاتا ہے۔ ان کے دوست ٹوڈرمل کے یہاں اس دن ان کی پنیہ تتھی منائی جاتی تھی۔

سب سے آخر میں ایک بڑی خوب صورت اعتقادی روایت درج کرنا چاہتا ہوں جو بھگتی بھاؤ رکھنے والوں کے لئے بڑی دلچسپ ہوگی۔ رام کتھا کے مصنف اوّل والمیک بھگت نہ تھے۔ انہوں نے تعقل اور علم سے رام تتو جاننے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ اس پر ہنومان نے انہیں شاپ دیا کہ تم کو پھر ایک جنم لینا پڑے گا جب تم بھگتی اور پریم سے رام تتو کا کھوج کرو گے۔ اسی شاپ کی وجہ سے والمیک کو تلسی داس کی صورت میں جنم لینا پڑا۔ انہوں نے تمام عمر والہانہ بھگتی اور پریم میں گذار کر اس رام تتو کی تلاش کی جو رمز کائنات ہے۔ آخر وقت جب وہ اس جسم خاکی کو چھوڑ رہے تھے تو ہنومان ظاہر ہوئے اور انہیں رام تتو بتا دیا۔ مقصد حیات حاصل ہوتے ہی وہ اس دار فانی سے رخصت ہو کر عالم جاوداں میں پہنچ گئے۔

گیان چند
صدر شعبۂ اُردو جموں یونیورسٹی جموں

اُردو تحقیق پر ایک نظر

اُردو میں تحقیق کی بُری بھلی داغ بیل تذکروں ہی میں نظر آتی ہے۔ میں مانتا ہوں کہ اُن میں تحقیق سے زیادہ عدمِ تحقیق کا ثبوت دیا گیا ہے۔ لیکن انہیں میں تحقیق کے لئے مواد ملتا ہے۔ تحقیق کے سفر کی دوسری منزل ادبی تاریخیں ہیں۔ ان میں کسی قدر ترقی ہوئی ہے لیکن یہاں بھی عدمِ احتیاط عام ہے۔ ان میں مختلف ذریعوں سے مواد لے کر چھان پھٹک کے بغیر جمع کر دیا گیا ہے۔ بعد کی تاریخیں شروع کی تاریخوں سے بہتر ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ اہلِ اردو کے لئے ادبی تحقیق کے کھرے اُصول علمِ تدوینِ احادیث میں موجود تھے۔ محدثین نے روایت اور درایت کو پرکھنے کے لئے جو اصول وضع کئے تھے ادبی تحقیق کے سلسلے میں ان پر اضافہ نہیں ہو سکتا لیکن ان کا معیار اتنا سخت تھا کہ اُردو ادب کی تاریخ پر اس کا اطلاق کیا جائے تو پھر کسی ادبی روایت پر بھروسہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال محققوں کو محدثین کے حزم و احتیاط کو مثالی نمونے کے طور پر ہمیشہ نظر میں رکھنا چاہیئے۔

اردو میں جدید ادبی تحقیق مغربی تعلیم کا فیضان ہے۔ ابتدائی محققوں میں ہم مولوی عبدالحق، ڈاکٹر سید محمود شیرانی اور شیخ چاند کا نام لے سکتے ہیں شیخ چاند کی کتاب "سودا" اردو میں تحقیقی و تنقیدی مقالوں کی پیش رو تھی۔ ان کے بعد ہمارے پانچ چھ عظیم محققین کے کارنامے سامنے آئے۔ یونی ورسٹیوں میں ریسرچ ہونے لگی۔ چنانچہ آزادی سے قبل مغربی اور ہندوستانی یونیورسٹیوں سے دس کے لگ بھگ علماء اُردو میں ڈاکٹریٹ لے چکے تھے۔

آزادی کے بعد درسگاہوں کے اندر اور باہر دونوں جگہ ادبی تحقیق کو بہت فروغ ہوا اور یہ تعلیم کے عام فروغ کا حصہ تھا۔ تقسیم کے بعد ہم

ہندوستان کے تحقیقی کاموں کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ پاکستانی نگارشات پہلے بھی دیکھنے کو کم ملتی تھیں یحییٰ شاہی نے دونوں ملکوں کے علم و ادب کے بیچ ایک لوہے کی دیوار کھڑی کر دی۔ ہم ہندوستان ہی کے اکتسابات کو نظر میں رکھیں تو بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھرپور ہیں۔

تقسیم کے بعد ہمارے دیار میں اُردو کی ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم کا تناسب بالکل بدل گیا۔ آزادی[2] سے پہلے ابتدائی جماعتوں میں فرض کیجئے اُردو پڑھنے والوں کی سالانہ تعداد دو کروڑ اور ایم، اے اُردو کرنے والوں کی سو تھی تو آزادی کے بعد ابتدائی جماعتوں میں اُردو پڑھنے والے اگر پچاس لاکھ ہوں تو ایم اے کرنے والے تین سو ہوں گے۔ اُردو میں صرف ایک کلاس ہے جس میں طلبا ہمارے وسائل سے بڑھ کر میسر آتے ہیں اور وہ سب سے اونچی جماعت یعنی ریسرچ کی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اسے فالِ نیک کہوں یا فالِ بد۔ یہ جانتا ہوں کہ ان میں سے بیشتر امیدوار ذوقِ تحقیق کے مارے نہیں ہوتے، بے روزگاری کے ستائے ہوتے ہیں۔

تحقیق کی اس مقبولیت کے باعث پچھلے دہے (۱۹۶۱ء تا ۱۹۷۰ء) میں بڑی معرکے کی دریافتیں ہوئی ہیں۔ اس دہے میں اٹھارویں صدی کے تین نثری شاہکاروں کا متن دریافت اور شائع ہوا یعنی:-

ہندوستان میں فضلی کی "کربل کتھا" اور عیسوی خاں کی قصۂ مہر و لبر" اور پاکستان میں شاہ عالم ثانی کی داستان "عجائب القصص"۔

پچھلے پانچ سال کی کمائی کچھ اور بھی وقیع ہے۔ اس دوران میں دو تاریخ ساز تحقیقی انکشافات ہوئے۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل نے اپنی کتاب "معراج العاشقین کا مصنف" میں ثابت کیا کہ "معراج العاشقین" خواجہ بندہ نواز کی تصنیف نہیں بلکہ بہت بعد کے ایک بزرگ کا کارنامہ ہے۔ دیوی سنگھ چوہان سابق ممبر مہاراشٹر پبلک سروس کمیشن نے دریافت کیا کہ قصہ حسن و دل (فارسی مثنوی دستورِ عشاق اور اُردو سب رس) کا آخری ماخذ کرشن مشر کا سنسکرت ڈراما "پربودھ چندر ودیے" ہے۔ ان کی اس تحقیق سے اہلِ اُردو کو ڈاکٹر نور السعید اختر نے روشناس کرایا۔ قصہ حسن و دل پربودھ چندر ودیے کا لفظی ترجمہ نہیں لیکن اس پر مبنی ہے۔

۱۹۶۹ء میں غالب صدی نے غالبیات کے ساتھ ساتھ ادبی تحقیق کا مذاق عام کر دیا۔ بھوپال میں غالب کے خود نوشت اولین دیوان اور لاہور میں گل رعنا کے خود نوشت مخطوطے کی دریافت گل سر سبد ہے۔ ان کتابوں کی اشاعت اور دیوان کے مخطوطے پر ڈاکٹر انصار اللہ نظر کے اعتراضات نے ادبی تحقیق کو خواص کی انجمن سے نکال کر عوام کے مجمع تک پہنچا دیا۔ مخطوطے

---

[1] ملاحظہ ہو ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں: "فنِ تحقیق" نقوش جنوری ۱۹۶۶ء ص ۱۴۶

[2] میں نے یہ تعداد اپنی بات سمجھانے کے لئے لکھ دی ہے کسی اعداد و شمار کی بنا پر نہیں۔

کا کاتب غالب ہے کہ کوئی اور، ا در بن کتابت کیا ہے۔ ان امور کی لاتمناہی بحث نے تحقیق کو بہت فائدہ پہنچایا۔ کاتب اور سنہ کے علاوہ جعل اور الحاق کے جملہ امکانات کا بڑی دقتِ نظر سے جائزہ لیا گیا جس سے عام قاری کو تحقیق متن کے رموز سے دل بستگی ہوگئی۔ ہمیں نو دریافت نسخے کے دونوں ایڈیشنوں کے مرتبوں، معترضوں اور وکیلوں کا ممنون ہونا چاہئے۔

اردو کے موجودہ محققوں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلے میں ہمارے وہ بزرگ محقق ہیں جو تحقیق کی آبرو ہیں۔ جناب سید مسعود حسن رضوی، مولانا عرشی، قاضی عبدالودود اور مالک رام صاحب، ہم سب کے لئے مشعلِ راہ ہیں۔ ان کی کبرسنی اور صحت کے پیشِ نظر ہم اب ان سے نئے وسیع کاموں کی توقع نہیں کر سکتے۔ خوشی کی بات ہے کہ محققوں کی دوسری اور تیسری نسل میں کئی ایسے اہلِ نظر افراد ہیں جن کے کاموں پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

دوسری نسل میں ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر مختارالدین احمد اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں وغیرہ ہیں۔

اور تیسری نسل میں وہ اہلِ نظر تحقیق کار آتے ہیں جو پچھلے دس بارہ سال سے لکھ رہے ہیں۔ ان دونوں نسلوں پر تحقیق کی پاسبانی کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہے۔ اور ان کے بعد تحقیق کنندوں کی وہ نوخیز نسل آتی ہے جو یونی ورسٹیوں اور کالجوں میں ریسرچ اسکالر یا مبتدی لکچرر کے طور پر کام کر رہی ہے۔ ان کی تعداد پیشرو گروہوں سے زیادہ ہے۔ اب ہمیں تعداد سے زیادہ معیار پر توجہ کرنی ہے۔ تحقیق کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ پھیلاؤ کے باوجود گہرائی کس طرح برقرار رکھی جائے۔ ذیل کے مآخذ سے معیارِ تحقیق کی ترقی میں مدد مل سکتی ہے:-

(۱) درس گاہوں میں نئے ریسرچ اسکالروں کو نگراں کی ہدایت اور طریقِ تحقیق کے نصاب۔

(۲) اصولِ تحقیق پر کتابیں اور مضامین۔

(۳) کہنہ مشق محققین کے تحقیقی کاموں کا مطالعہ۔

(۴) بزرگ محققین کی نئی تحقیق کے تسامحات کی نشان دہی۔

چونکہ تحقیقی کاموں کی سب سے زیادہ تعداد پی۔ ایچ۔ ڈی کے ریسرچ اسکالروں کی دین ہوتی ہے۔ اس لئے نگراں کی صحیح ہدایت کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ نگراں خود صراطِ مستقیم سے واقف ہو اور اس کے پاس اتنا وقت ہو کہ وہ اپنے شاگردوں کی رہبری کر سکے۔ نگراں کی مناسب ہدایت نہ ملنے سے شاگرد کو جو خسارہ ہوتا ہے اس کی مثال میں اپنا تجربہ پیش کرتا ہوں:

۱۹۴۵ء میں جب میں نے ریسرچ شروع کی مجھے یہ نہیں بتایا گیا کہ فٹ نوٹ میں حوالے اور اسناد درج کرنے چاہئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پورا مقالہ حوالوں سے معرّا تھا صرف آخر میں کتابیات کی فہرست تھی۔ ڈگری ملنے کے بعد میں چندے بے روزگار رہا۔ ملازم ہونے پر ۱۹۵۰ء میں میں نے یہ مقالہ جیوں کا تیوں انجمن ترقی اردو پاکستان کو اشاعت کے لئے بھیج دیا۔ اس طرح "اردو کی نثری داستانیں" کی طبع اول میں کوئی صفحہ حوالوں سے داغدار نہیں۔ اگر میرے نگراں نے مجھ پر یہ رمز افشا کیا ہوتا تو ایسی خامی کیوں راہ پاتی۔ دوسرے ایڈیشن میں یہ سقم دور کر دیا گیا ہے۔

طریقِ تحقیق کا کورس عثمانیہ اور دلی یونیورسٹیوں میں رائج ہے۔ دلی میں یہ ایم لٹ حصہ اول کی شکل میں ہے۔ میں نے دونوں درسگاہوں کا نصاب دیکھا ہے جو بہت خوب ہے۔ عملاً اس کے اطلاق کا کیا تجربہ رہا، مجھے معلوم نہیں۔

مناسب نگرانی نہ ملنے کی کسی قدر تلافی اصولِ تحقیق کی کتابوں سے ہو سکتی ہے۔ انگریزی میں اس موضوع پر متعدد کتابیں ہیں . . . . . .

لیکن ۔ افسوس ہے کہ یہ کتابیں بازار میں بآسانی دستیاب نہیں۔ اردو میں اس موضوع پر لکھنے کی تحریک بہت کچھ انجمن اساتذۂ اردو کے شعبۂ تحقیق سے ہوئی۔ حیرت ہے کہ اردو میں تحقیق کی اتنی بھرپور روایت کے باوجود ابھی تک اصولِ تحقیق پر صرف دو کتابیں ملتی ہیں:-

(۱) ڈاکٹر خلیق انجم: "متنی تنقید"۔ (۲) عبدالرزاق قریشی: "مبادیاتِ تحقیق"

دونوں کتابیں ایسی ہیں کہ ہر تحقیق کرنے اور کرانے والے کو انھیں پڑھنا چاہیئے۔ ان کے علاوہ مضامین خاصی تعداد میں ملتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر اس انجمن کے اس شعبے کی بدولت وجود میں آئے۔ پہلی کانفرنس منعقدہ دہلی کے مقالات کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ اس میں شامل نظریاتی تحقیق پر دو مضامین کا ذکر کروں گا۔

(۱) ڈاکٹر تنویر احمد علوی: قدیم دواوین کی ترتیب کے مسائل۔

(۲) ڈاکٹر خلیق انجم: "اردو تحقیق اور حقائق"

دوسری اور تیسری کانفرنس کے مجموعے ابھی شائع نہیں ہوئے۔ ان میں بھی بعض بہت اچھے مضامین پڑھے گئے تھے لیکن میں محض حافظے پر تکیہ کر کے ان کے بارے میں کچھ کہنے کے قابل نہیں۔

اگر ان سب کانفرنسوں کے شعبۂ تحقیق میں پڑھے گئے مقالوں کا ایک مجموعۂ انتخاب شائع کر دیا جائے تو یہ اصولِ تحقیق پر اچھی پُرمغز کتاب ہوگی۔ اسی موضوع کا ایک اور اہم کارنامہ رسالہ "آج کل" کا اردو تحقیق نمبر بابت اگست ۱۹۶۷ء ہے۔ اس کے تین مضامین نظریاتی ہیں:-

(۱) قاضی عبدالودود : اصولِ تحقیق۔
(۲) مالک رام : مخطوطات۔ تلاش قرأت اور ترتیب۔
(۳) ڈاکٹر محمد حسن : ادبی تحقیق کے بعض مسائل۔
ان پر چند جستہ جستہ مضامین کا اضافہ کر لیجئے۔
(۴) ڈاکٹر سید عبداللہ : تحقیق و تنقید "نیا دور" ۵، ۶ کراچی ۱۹۵۶ء۔
(۵) ڈاکٹر سید عبداللہ : تحقیق و تنقید کے مقامات اتصال "اُردو نامہ کراچی"، اپریل تا جون ۱۹۶۰ء۔
(۶) قاضی عبدالودود : صحت متن "تحریک" دہلی ستمبر ۱۹۶۲ء۔
(۷) ڈاکٹر نذیر احمد : تحقیق و تصحیح متن کے مسائل "نقوش" مارچ ۱۹۶۳ء۔
(۸) گیان چند : تحقیق کے تقاضے "شیرازہ" سری نگر جنوری ۱۹۶۳ء۔
(۹) ڈاکٹر نذیر احمد : تاریخی تحقیق کے بنیادی مسائل "جواربھاٹا" دہلی اپریل ۱۹۶۵ء۔
(۱۰) ڈاکٹر غلام مصطفٰی خاں : فن تحقیق "نقوش" جنوری ۱۹۶۶ء۔
(۱۱) ڈاکٹر سید محمد عقیل : تحقیق و مواد کی فراہمی کا مسئلہ "نقوش" مئی ۱۹۶۷ء

یقین ہے کہ اور بہت سے مفید مضامین شائع ہوئے ہوں گے لیکن میری کم نظری کی اُن تک رسائی نہیں ہو سکی۔

معیارِ تحقیق کو بلند کرنے کا تیسرا وسیلہ کہنہ مشق محققین کے تحقیقی کاموں کا مطالعہ ہے۔ اگلے زمانے میں مبتدی شاعر جب اُستاد کے پاس زانوئے تلمذ تہہ کرنے جاتا تھا تو اُسے مشورہ دیا جاتا تھا کہ قدیم شعراء کے زیادہ سے زیادہ دواوین شروع سے آخر تک پڑھ جائے۔ تحقیقی نظر پیدا کرنے اور تیز کرنے کے لئے ضروری ہے کہ بزرگ محققین کے کاموں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے تاکہ ان کے لائحہ کار کا اندازہ ہو اور ان کی تقلید کی کوشش کی جائے۔

یہ ضرور ہے کہ تقلید میں محض جزوی کامیابی ہی ہو سکتی ہے کیونکہ نئے مصنفین کے پاس بزرگ محققین کا تبحرِ علمی ہے نہ تجربہ۔ نہ ان جیسے وسائل ہی فراہم ہیں، پھر بھی آدرش کو بلند رکھنے میں کوئی نقصان نہیں، فائدہ ہی ہے۔

معیار کی بہتری کا چوتھا سرچشمہ غلطیوں کی نشان دہی ہے۔ اگر زیادہ تجربہ کار محقق کم تجربہ کار محققوں کے کاموں کی خامیوں کی طرف اشارہ کریں تو اس میں آخر الذکر کا نفع ہے نقصان نہیں۔

قاضی عبدالودود اور رشید حسن خاں کی گوش مالیوں نے کتنے جلد بازوں کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا سکھایا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ اغلاط کی نشان دہی میں احساسِ برتری یا طنز و تمسخر کا شائبہ نہ ہو۔ غلطی کون نہیں کرتا۔ اغلاط کی طرف ہمدردی و دل سوزی کے ساتھ اشارہ کیا جائے تو اس سے اصلاح ہو گی۔ چبھتے ہوئے الفاظ میں وہی بات کہی گئی تو متاثر الیہ چڑھ کر اپنی بات پر اُڑ جائیگا اور اپنا موقف بدلنے سے انکار کر دے گا۔ گویا انشائیہ کا حق تو ادا ہو جائے گا لیکن اعتراض کا مدعا خبط ہو جائے گا۔ یہ نہایت ضروری ہے کہ تحقیقی بحث میں ذاتی حملے نہ کئے جائیں۔ دشتِ تحقیق کو انشاء و مصحفی کے معرکوں کا میدان نہ بنایئے۔ فریقِ ثانی کا بھی فرض ہے کہ علمی انداز کے اعتراضوں پر بُرا نہ مانے اور انہیں ذاتی تعلقات پر اثر انداز نہ ہونے دے۔

اور اس سلسلے میں دُو رجحانات کی طرف اشارہ کیا چاہتا ہوں۔

یونی ورسٹیوں کے باہر کی بعض مقتدر ہستیوں کو یہ کہتے سُنا گیا ہے کہ یونیورسٹیوں میں اُردو ریسرچ کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے وہ محض ننگِ تحقیق ہے۔ قابلِ قدر تحقیق صرف مدرسے کے باہر ہو رہی ہے۔ میں اس سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ نئے ریسرچ اسکالروں کے ابتدائی تحقیقی کاموں کو دیکھ کر ایسا عام فیصلہ صادر کر دینا ویسی ہی بات ہے جیسے بعض اہلِ ہندی اردو غزل کے معمولی اشعار کو دیکھ کر فتویٰ صادر کر دیتے ہیں کہ اُردو شاعری میں عاشقی معشوقی اور شراب و کباب کے سوا دھرا ہی کیا ہے۔

اگر درسگاہوں کے باہر چند علماء (جن کو ایک ہاتھ کی اُنگلیوں پر شمار کیا جا سکتا ہے) دادِ تحقیق دے رہے ہیں تو درس گاہوں نے بھی مرحومین میں پروفیسر محمود شیرانی، ڈاکٹر عبدالحق، منشی مہیش پرشاد، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، ڈاکٹر زور اور پروفیسر عبدالقادر سروری کو اور زندوں میں پروفیسر مسعود حسن رضوی، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر مختارالدین احمد آرزو وغیرہ کو پیدا کیا ہے۔ اور جہاں تک میرا سوال ہے میں اس احساسِ برتری سے محروم ہوں کہ رشید حسن خاں، نثار فاروقی، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، ڈاکٹر مسیح الزماں، ڈاکٹر ابو محمد سحر، ڈاکٹر محمود الٰہی، ڈاکٹر حنیف نقوی، ڈاکٹر تنویر علوی، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر انصار اللہ نظر اور ان جیسے دوسرے حضرات کی تحقیقات کو نظر انداز کر سکوں۔

میں یہ دعویٰ کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ میری نظر سے نئے محققوں کے ایسے چند غیر مطبوعہ اور کئی مطبوعہ پی، ایچ۔ ڈی کے مقالے گذرے ہیں جن کا مصنف ہونے میں مجھے فخر ہوتا۔ اگر ان کے مقابلے میں ساقط المعیار مقالوں کی تعداد زیادہ ہے تو ایسا کس میدان میں نہیں ہوتا؟ کیا شاعری، تنقید، افسانہ، ناول، صحافت وغیرہ میں اکثریت کم رتبہ کاموں کی نہیں؟ پھر تحقیق ہی میں منتخب کاموں سے چشم پوشی کر کے پست کاموں کے انبار کی بنا پر کیوں مخالفانہ فیصلہ کیا جائے۔

دوسرا رجحان یہ ہے کہ جس طرح زندگی کے دوسرے شعبوں میں نوجوانوں نے بزرگوں کی سرداری کو تسلیم کرنے سے بغاوت کر دی ہے اسی طرح تحقیق میں جواں سال محققوں نے بزرگ تر محققوں کی دریافتوں پر آنکھ موند کر آمنّا و صدّقنا کہنے سے انکار کر دیا ہے۔ انھیں پرکھنے کے بعد ہی قبول کرتے ہیں چنانچہ بعض اوقات خورد لوگ بزرگوں کے سہو پر اُنگلی رکھ دیتے

ہیں۔ اب کوئی بزرگ کوئی بڑا پروفیسر محض اپنے منصب اور رُتبے کی بنا پر اپنی بات نہیں منوا سکتا۔

میں استفہامی باغیانہ ذہنیت کا خیر مقدم کرتا ہوں کہ یہ آزادیٔ نظر و جرأت دانشوری کی نشان دہ ہے۔ صرف یہ التماس کرتا ہوں کہ خورد بزرگوں کی غلطیوں کی نشان دہی کرتے وقت آدابِ مراتب ملحوظ رکھیں اور بزرگ اپنی واقعی غلطیوں کو علم و بردباری کے ساتھ قبول کرلیں۔ چھوٹوں کے جانی دشمن نہ ہوجائیں۔ غلطی کس سے نہیں ہوسکتی۔

حال میں ترتیبِ متن پر کافی توجہ کی جا رہی ہے۔ دراصل جدید تحقیق کی بسم اللہ ہی دکنیات اور تذکروں کے خطی متن کی اشاعت سے ہوئی لیکن یہ مسلّم ہے کہ ان ابتدائی کاموں میں ترتیبِ متن کے ان اصولوں کو پیشِ نظر نہیں رکھا گیا اور وہ تقاضے پورے نہیں کئے گئے جن کا آجکل مطالبہ کیا جاتا ہے۔ رشید حسن خاں[1] نے مولوی عبدالحق کے مرتبہ "تذکرہ نکات الشعراء" کی کچھ غلطیوں کی طرف اشارہ کیا۔ مولوی صاحب نے مصحفی کے تذکرہ ہندی کی اشاعت کے وقت ندوۃ العلماء لکھنؤ کے کتب خانے کا نسخہ بھی پیشِ نظر رکھا تھا۔

حال ہی میں میرے رفیق کار شام لال کالڑا عابد پشاوری نے اس مخطوطے کو دیکھا تو اس میں انشاء کے احوال کا ایک ورق غلط جگہ لگا ہوا تھا جس میں انشاء اور عظیم بیگ کے معرکے کی اصل وجہ درج تھی۔ مولوی عبدالحق نے اسے نظر انداز کردیا کیونکہ وہ بہ یک وقت کئی متون بڑی عجلت کے ساتھ مرتب کررہے تھے۔

اور اس سے تحقیق کے اس نکتے کی طرف توجہ جاتی ہے کہ موضوع تحقیق بہت وسیع نہ ہونا چاہیئے۔ اگر وہ پھیلا ہوا ہوگا تو اس کے مطالعے میں گہرائی نہ آسکے گی۔ اگر وہ محدود ہوگا تو ارتکازِ نظر کی وجہ سے کچھ اہم انکشافات ہوسکیں گے۔ کچھ مروّجہ غلط فہمیوں کی اصلاح ہو سکے گی۔

راقم الحروف نے اُردو داستانوں اور اُردو مثنویوں پر ریسرچ کی۔ اگر یہ کام کسی ایک مصنف کی داستانوں یا مثنویوں یا کسی مخصوص داستان مثلاً "قصہ چہار درویش" یا "داستانِ امیر حمزہ" سے متعلق ہوتا تو اس کی تمام جزئیات کا عمیق مطالعہ کیا جاسکتا تھا۔ اگر وسعتِ موضوع کے باوجود دقّتِ نظر کو بھی شعار بنایا جائے تو پھر تیس چالیس سال کے لئے زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہوجائیے۔ جیسے قبلہ سید مسعود حسن رضوی اُردو مرثیے کی تاریخ ختم نہیں کر پا رہے ہیں ع

ہرچہ گیرید مختصر گیرید

ترتیبِ متن سے متعلق میں دو نکتوں پر توجہ چاہوں گا۔

۱۔ اگر ایک متن کے متعلق کئی نسخے میسر ہوں تو مرتب کیا طریقہ اختیار کرے۔ مالک رام صاحب کا قول ہے:

"اگر آپ نے تمام شرطوں کا لحاظ رکھتے ہوئے اساسی نسخے کا انتخاب کرلیا تو آپ اسی کے متن کو بنیادی قرار دیں اور دوسرے تمام نسخوں کو اختلاف کے لئے استعمال کیجئے إلّا یہ کہ بداہتہً معلوم ہوجائے کہ اساسی نسخے کا متن ناقص ہے اور کسی دوسرے نسخے کا ٹھیک ہے۔ اس صورت میں آپ دوسرے متن کو لے کر اساسی نسخے کے الفاظ حاشیے میں رکھ سکتے ہیں لیکن یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے اور اس کا جواز ثابت کرنے کے لئے آپ کو مضبوط دلائل پیش کرنا پڑیں گے[2]"

ڈاکٹر نذیر احمد نے کئی سال قبل اس طریقے کی سخت نکتہ چینی کی:[3]

"اس طریقۂ کار میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ اگر ایک نسخہ کو پورے کا پورا متن قرار دے دیا جائے اور دوسرے تمام نسخوں کے اختلافات کو حاشیے میں جگہ دی جائے تو یہ کام ایسا شخص بھی کرسکتا ہے جو زبانِ متعلقہ سے بہت ہی کم واقفیت رکھتا ہو۔ دوسرے نسخوں کے اختلافات دکو، خواہ وہ کتنے ہی وقیع کیوں نہ ہوں ثانوی حیثیت دینا ایک طرف تو مصنف کے بجائے کاتب تک پہنچنے کی کوشش ہے تو دوسری طرف خود محققِ متن کا مرتبہ گھٹ کر ایک کاتب کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے . . . . . .

حاصل کلام اگر ایک نسخے کو متن قرار دیا گیا تو پھر غور و فکر کا دروازہ بند ہوجاتا ہے۔ اس بنا پر میرے نزدیک ایسا متن نہ قابلِ توجہ ہے اور نہ ایسے محققِ متن کی کوشش قابلِ ستائش۔"

ڈاکٹر خلیق انجم[4] نے مخطوطوں کو مصنف کے اصلی نسخے تک واسطوں کے لحاظ سے گروہوں میں تقسیم کرنے کی سفارش کی ہے۔ ان میں سے ہر گروہ

---

[1] رشید حسن خاں: "تحقیق سے متعلق بعض مسائل" نوائے ادب" اپریل، جولائی ۱۹۶۲ء ص۱۷

[2] مالک رام: "مخطوطات۔ تلاش قرارت، ترتیب" "آجکل" تحقیق نمبر، بابت اگست ۱۹۶۷ء ص۱۹

[3] ڈاکٹر نذیر احمد: "تحقیق و تصحیح متن کے مسائل" "نقوش" مارچ ۱۹۶۳ء، ص۱۸ و ص۱۹

[4] ڈاکٹر خلیق انجم: "متنی تنقید" طبع اول ص۴۹

کو لے کر ایک مشترک بنیادی نسخہ تیار کیا جائے اور پھر ان بنیادی نسخوں کو پیش نظر رکھ کر ان سب کا نچوڑ مرتب کیا جائے۔

اس طریق کار میں دو قباحتیں ہیں:۔

اول تو مختلف مخطوطوں اور مصنف کے نسخے کے درمیان کے واسطوں کا علم نہیں ہو سکتا۔

دوسرے اس بار دہ طریقہ میں بہت طولِ امل ہے۔

میں ڈاکٹر نذیر احمد کے طریقۂ کار سے متفق ہوں۔ مرتب کو تمام نسخوں کا عطر مجموعہ لے کر ان سب سے جدا ایک اور متن تیار کرنا چاہیئے وہ ہر جملے اور ہر مصرع کے لئے تمام نسخوں کے اندراجات پر غور کرے اور پھر ایسا نسخہ تیار کرے جو مصنف کے نسخے کے نزدیک ترین ہو۔ اگر ایک اساسی متن ہی کو مرکزی متن کے طور پر درج کر دیا گیا تو اس سے قاری کی رہبری کہاں ہوئی۔ قاری کو خود ہر جملے یا مصرع کے اختلافات نسخ کے بیچ بھٹک کر طے کرنا ہوگا کہ کسے پسند کرے۔ بہت ممکن ہے کہ کوئی مخصوص نسخہ دوسروں سے زیادہ اہم ہو اور دوسرے تمام نسخوں کے مقابلے میں اس کے مندرجات کو اکثر موقعوں پر قبول کیا جائے لیکن اسے پورے کا پورا مرکزی متن نہیں قرار دیا جا سکتا۔

متن کی اشاعت میں قدیم املا برقرار رکھا جائے یا جدید، اس بارے میں، میں ذیل کے چند اصول پیش کرنا چاہتا ہوں

(الف) جن مقامات پر مخطوطے کا املا موجودہ تلفظ سے کوئی فرق ظاہر نہیں کرتا بلکہ محض فرسودگی املا ہے، وہاں جدید املا اختیار کیا جائے

مثلاً:۔

اوس۔ فرسنک۔ کنکا۔ خوشے۔ آتاہی۔ ساتہی۔ کہیں۔ کو

بالترتیب:۔

اُس۔ فرسنگ۔ گنگا۔ خوشی۔ آتا ہے۔ ساتھی۔ کہیں لکھا جائے۔

اگر ایسا نہ کیا گیا تو مطبوعہ نسخے کے ہر قاری کو مرتب متن کا سا علم درکار رہو گا۔

(ب) جن مقامات پر فرسودہ املا کسی فرسودہ تلفظ کی ترجمانی کرتا ہے اور جسے بدلنے سے مصنف کا پیش کردہ تلفظ بدل جائے گا وہاں مخطوطے کا اصل املا ہی برقرار رکھا جائے مثلاً:۔

کوں۔ سوں۔ منیں۔ کبھو۔ کسو۔ جد۔ تد۔ تلپھنا۔ کو بالترتیب:

کو۔ سے۔ میں۔ کبھی۔ کسی۔ جب۔ تب۔ تڑپنا نہ لکھا جائے۔

جیسا کہ پہلے بھی کئی بار کہا گیا ہے، تحقیق کے بڑے کاموں کے لیئے اجتماعی منصوبہ بند طریق کار کی ضرورت ہے۔ ترتیب متن کے علاوہ تاریخ ادب اُردو، انسائیکلو پیڈیا اور مختلف قسم کی ببلیوگرافیوں کی کتنی کمی ہے، اس سلسلے میں بہت سے منصوبے پیش کئے گئے ہیں۔ لیکن ان پر عمل کون کرے! اس لئے مجھے مزید منصوبے پیش کرنے کی جرأت نہیں جن درسگاہوں کے شعبۂ اُردو توانا ہیں اور جن کے وسائل کافی ہیں، وہ شعبے نیز دوسرے ادارے اس سلسلے میں کچھ توجہ کریں۔

اُردو نمبر کے باب میں

اعجاز حسین۔ الہ آباد

یہ نمبر جس محنت سے مرتب کیا گیا ہے وہ اس لحاظ سے بھی قابلِ قدر ہے کہ عصر حاضر میں اردو کی نشو و نما کس مپرسی کا تاریخی جائزہ یکجا ملجاتا ہے جو ادبی مورخ کے لئے گنج بار آور کا کام دے سکتا ہے۔ اہلِ علم کے لئے دعوتِ فکر و نظر بھی ہے اور اس زبان اور ادب سے ہمدردی رکھنے والوں کے لئے ایک ایسا آلۂ کار ہے جو ان کے جذبۂ خلوص کو مزید سہارا دے کر زیادہ سے زیادہ توجہ کا سامان فراہم کر رہا ہے۔

میکش اکبرآبادی۔ آگرہ

یہ نمبر اردو ادب کی مکمل اور ہمہ جہتی روداد ہے۔ اس کی ضرورتوں کی تفصیل اور ادیبوں کے کارناموں اور نمائندوں کی مفصل اور تاریخی دستاویز ہے۔ امید ہے کہ اردو کے متعلق واقفیت حاصل کرنے والے اور اردو کے متعلق جدوجہد کرنے والے اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھائیں گے۔ اسی طرح مرکز اور صوبائی حکومتیں اردو کے حقوق اور ضرورتوں سے پوری طرح واقفیت حاصل کر کے اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کی کوشش کر سکیں گی۔ یہ اپنی نوع کی پہلی اور کامیاب ترین کوشش ہے۔

مالک رام۔ دہلی

ہندوستان میں اُردو کا مسئلہ کچھ الجھ سا گیا ہے۔ بہت حد تک یہ ناواقفیت پر مبنی ہے اور یہ دونوں طرف سے ہے۔ خود اردو والوں کو یہ معلوم نہیں کہ اب تک مختلف ریاستوں میں کتنا کام ہو چکا ہے اور جو مخالف ہیں وہ اس سے خوش ہیں کہ اُردو اس ملک سے ختم ہو رہی ہے یا ہو گئی ہے۔
"آجکل" کا یہ شمارہ ان دونوں گروہوں کے لئے بہت معلومات افزا ہوگا۔ اسے جس سلیقہ سے مرتب کیا گیا ہے وہ ہر طرح "آجکل" کی روایات کے مطابق ہے۔

(مزید آرا ص ۲۹ پر)

جمنا داس اختر
ایڈیٹر روزنامہ "سویرا" پٹودی ہاؤس فیض گنج، دریا گنج، دہلی ۱۱۰۰۰۶

اُردو ایڈیٹروں کی کُل ہند کانفرنس

دسمبر ۱۹۱۶ء میں علم و ادب کی راجدھانی اور تہذیب و تمدن کے گہوارہ لکھنؤ میں مُلک گیر اُردو اخبار نویسوں کا ایک عظیم تاریخی اجتماع منعقد ہوا تھا، جس کی صدارت اُس دَور کے مشہور اخبار نویس منشی رام رچپال سنگھ شیدا دہلوی ایڈیٹر روزنامہ "ہندوستان" لاہور نے کی تھی۔ ستاون سال بعد اسی لکھنؤ میں ۱۷، ۱۸، ۱۹ نومبر کو آزاد ہندوستان کے اُردو کے اخبار نویسوں کو آل انڈیا اُردو ایڈیٹرز کانفرنس کے خصوصی اجلاس میں اکٹھا ہونے کا موقع ملا۔ اسے ہر لحاظ سے ایک تاریخی اجتماع سمجھنا چاہیئے کیونکہ مُلک کی آزادی کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ مُلک کے تمام حصّوں سے اُردو اخباروں کے مُدیر اُردو زبان اور اُردو صحافت کے مسائل پر غور کرنے کے لئے اِکٹھا ہوئے۔

اُردو اخباروں کے ایڈیٹروں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کے لئے لگ بھگ ایک سال پہلے بہار کے چند ممتاز صحافیوں نے تحریک شروع کی تھی۔ ان کی جدوجہد کے نتیجہ میں پٹنہ میں ایک اجتماع میں آل انڈیا اُردو ایڈیٹرز کانفرنس کی بنیاد رکھی گئی۔ اُس وقت عارضی نوعیت کی ایک مرکزی کمیٹی قائم کی گئی۔ اس کے بعد نئی دہلی میں اس کمیٹی کا ایک خصوصی اجلاس منعقد ہوا۔ اس میں اُردو اخباروں کے مسائل پر غور کیا گیا۔ چند قراردادیں منظور کی گئیں اور اس کے بعد اس کمیٹی کے ممبروں نے وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی اور وزیرِ اطلاعات و نشریات شری اندر کمار گجرال سے مُلاقاتیں کیں۔ ان کے سامنے کمیٹی کے اراکین نے کچھ شکایات رکھیں۔ مثال کے طور پر ایک شکایت یہ تھی کہ اُتر پردیش اور دہلی کے کچھ اخبار نویسوں کے خلاف دفعہ [illegible] کے تحت مقدمات دائر کر کے انہیں خواہ مخواہ پریشان کیا جا رہا ہے۔ وزیرِ اعظم اور وزیرِ اطلاعات و نشریات نے شکایات پر توجہ دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زیادہ تر مقدمات واپس لے لئے گئے۔ اس سلسلے میں اس بات کا اعتراف نہ کرنا ناشکر گذاری ہوگی کہ اُتر پردیش کے موجودہ وزیرِ اعلیٰ شری ہیم وتی نندن بہوگنا نے جو اُن دنوں مرکزی وزارت کے رُکن تھے اس معاملے میں خاص طور پر دلچسپی لی۔ لکھنؤ کانفرنس میں بھی انہوں نے اُردو زبان اور اُردو صحافیوں کے کام سے ہمدردی کا اظہار کیا۔

نئی دہلی میں منعقدہ اسی اجلاس میں فیصلہ کیا گیا تھا کہ اُردو اخبار نویسوں کے مسائل کا جائزہ لینے کے لئے لکھنؤ میں مرکزی کمیٹی کا ایک خصوصی اجلاس منعقد کیا جائے۔ اُتر پردیش کے اُردو کے صحافیوں نے اس سلسلے میں نمایاں جوش و خروش کا اظہار کیا اور یہ ان کی دلچسپی اور جدوجہد کا نتیجہ تھا کہ مرکزی کمیٹی کے خصوصی اجلاس نے آل انڈیا اُردو ایڈیٹرز کانفرنس کے دوسرے سالانہ اجلاس کی صورت اختیار کر لی۔ اس اجلاس کی خصوصیت اور اہمیت کا اندازہ اس بات سے بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ ملک کے مختلف حصّوں سے چار سو سے زیادہ صحافی اور ایک سو سے زیادہ مُمتاز مُدیر شریک ہوئے۔ ملک کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ وزیرِ اعظم نے اُردو کے صحافیوں کی کانفرنس کا افتتاح کیا۔ کانفرنس کی صدارت ممتاز اور بزرگ صحافی مولانا محمد عثمان فارقلیط نے کی۔ ۸۲ سالہ بزرگ صحافی مولانا عبدالماجد دریا بادی مُدیر "صدق جدید" نے لکھنؤ کی زبان کی طرف سے مندوبین کا خیر مقدم کیا۔ لکھنؤ کی اُردو زبان نے گویا اُردو صحافت کی تاریخ قلم بند کر دی تھی۔ مولانا نے اپنی ذاتی یادداشتوں سے کام لیا اور نہایت شگفتہ الفاظ میں منشی نول کشور سے لے کر منشی عبدالحلیم شرر، منشی رتن ناتھ سرشار، سجاد حسین کاکوروی، برج نرائن چکبست، جوالا پرشاد برق، اکبر الٰہ آبادی، منشی رام سہائے تمنا، منشی نثار حسین، مولانا ظفر الملک، مولانا شبلی، مولانا آزاد، مولانا محمد علی جوہر، سید سلیمان ندوی، منشی گنگا پرشاد ورما، پنڈت کشن پرشاد کول، سید جالب دہلوی، اور چودھری خلیق الزماں تک کی صحافتی سرگرمیوں کا تذکرہ کیا۔ وزیرِ اطلاعات و نشریات شری اندر کمار گجرال نے اُردو کے پُرانے اور نئے اخبارات اور رسائل کی نمائش کا افتتاح کیا یہ اخبار مولانا امداد صابری اور بنگال کے ممتاز اُردو صحافی شری شانتی رنجن بھٹا چاریہ نے مہیا کئے۔ دونوں اصحاب نے اُردو صحافت کی تاریخ پر کانفرنس میں اپنے مقالے پڑھے۔

اِس سلسلے میں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ مولانا امداد صابری کئی برس سے اُردو صحافت کی تاریخ قلم بند کرنے کے لئے ریسرچ کر رہے ہیں اور اس موضوع پر اُن کی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

اس موقع پر مشاعرہ اور سیمینار کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ جس میں چوٹی کے شعرا، صحافیوں اور ادیبوں نے شرکت کی۔ جموں و کشمیر کے سابق وزیرِ اعظم شیخ محمد عبداللہ نے اُردو صحافت اور اُردو زبان پر ایک مقالہ پڑھا۔ اس سلسلے میں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اُردو صحافت سے شیخ صاحب کا گہرا تعلق رہا ہے۔ نیشنل کانفرنس کے بانی اور صدر کی حیثیت سے انہوں نے سری نگر میں اُردو کا ہفت روزہ "ہمدرد" جاری کیا تھا۔ چند سال بعد ان کی ہدایت پر سری نگر میں روزنامہ "خدمت" شائع ہونا شروع ہوا تھا۔

وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے پُرزور تالیوں کے درمیان کانفرنس کا افتتاح

کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"بدقسمتی سے میں اُردو بالکل نہیں جانتی اور جو تھوڑی بہت جانتی تھی وہ دِلّی جانے کے بعد بھول گئی۔"

اس پر کئی اصحاب نے کہا — "یہی اُردو زبان ہے" یہ حقیقت تھی کہ وزیرِاعظم جس زبان میں تقریر کر رہی تھیں وہ عام فہم اُردو ہی تھی۔

وزیرِاعظم نے مسکراکر اس کا اعتراف کیا۔ اس کے بعد انہوں نے اُردو سے اپنی دلچسپی اور اُردو زبان کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"جب بھی مجھے (اُردو زبان) سننے کا موقعہ ملتا ہے اس سے مجھے بے حد خوشی ہوتی ہے۔ اُردو ایک نہایت جان دار زبان ہے۔ اس میں ایک خاص طاقت بھی ہے اور خوبصورتی بھی۔ اور میں تو اسے سارے ہندوستان کی زبان مانتی ہوں۔ یہ کسی ایک قوم کی نہیں کسی ایک ریاست کی نہیں بلکہ تمام مُلک کی زبان ہے۔"

اس نکتے کی مزید وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ — "اگر اُردو زبان کمزور ہو جائے تو اس سے تمام مُلک کو نقصان پہنچے گا۔ میں نے ایک اور جگہ کہا تھا کہ اگر کسی کے پاس کچھ جواہرات ہوں اور انہیں پھینک دے اور یہ جان نہ سکے کہ ان کی کیا قدر و قیمت ہے تو اس کی جو حالت ہوگی وہی اُردو کو کمزور کرنے کی حالت میں ہماری بھی ہو سکتی ہے۔"

اُردو کو تمام ملک کی زبان اور ایک جان دار زبان تسلیم کرنے کے ساتھ ہی وزیرِاعظم نے صاف بیانی سے کام لیتے ہوئے کہا کہ:

"مجھے یقین ہے کہ اُردو مُلک میں یک جہتی اور اتحاد لانے کا کام کرے گی۔ کیونکہ اُردو ہی خاص طور پر ایسی زبان ہے جو پورے ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہے۔ اِسے طاقت ور بنانے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ یہ پہلے ہی ایک طاقت ور زبان ہے مگر اسے کیسے اور پھیلائیں تاکہ بڑی تعداد میں ہمارے بچے اسے سیکھیں اور لوگوں کے خیالات اس زبان میں ظاہر کئے جائیں یہ کام ہمیں آگے بڑھانا ہے اور جو بھی رکاوٹیں آئیں انہیں دور کرنا ہے۔"

یہ الفاظ اس بات کا ثبوت پیش کرتے ہیں کہ اُردو زبان کی بقاء سے وزیرِاعظم شریمتی اندرا گاندھی کو بے حد دلچسپی ہے۔ وہ چاہتی ہیں کہ اُردو زبان پڑھنے بولنے اور لکھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو اور اس کے راستے میں پیش آنے والی رکاوٹیں دُور ہوں۔ اس سلسلے میں انہوں نے اعلان کیا کہ "مرکزی حکومت اور ریاستی حکومتیں جو بھی مدد کر سکتی ہیں کریں گی۔"

وزیرِاعظم نے جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا کہ:

"جو غلطیاں ہو چکی ہیں، اُن پر بحث کرنے اور انہیں دہرانے کی بجائے اب کیا ہو سکتا ہے، اس پر آپ روشنی ڈالیں تو ہم اور آپ مل کر شاید ان مسائل کا حل تلاش کر سکیں۔"

ایڈیٹرز کانفرنس کا تعلق اُردو صحافت اور اس کے مسائل سے تھا۔ وزیرِاعظم کے اپنے الفاظ میں یہ مسائل وزیرِ اطلاعات و نشریات شری اندرکمار گجرال کے محکمہ سے تعلق رکھتے ہیں اور وزیرِ موصوف کو ان کے حل کے لئے کوئی بھی قدم اُٹھانے کا اختیار ہے۔ اس کے باوجود وزیرِاعظم نے کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے اُردو زبان کے مسائل کا ذکر کیا تو ظاہر ہے کہ وہ اُردو داں طبقہ کو یقین دلانا چاہتی ہیں کہ اُن کی حکومت اُردو کی ترقی کے لئے اُس کے راستے میں پیش آنے والی رکاوٹیں معلوم کرنا اور انہیں دُور کرنا چاہتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اُردو صحافت کا مستقبل اُردو زبان کے مستقبل سے وابستہ ہے۔ اس لئے کانفرنس میں شامل ہونے والے اصحاب نے اُردو کی ترقی میں پیش آنے والی مشکلات کا جائزہ لیا۔ وزیرِاعظم نے اپنی تقریر میں جن "غلطیوں" کی طرف اشارہ کیا تھا۔ ان کا ذکر کانفرنس میں شرکت کرنے والے اصحاب نے کیا مگر وزیرِاعظم نے اپنی تقریر میں بھی دُور اندیشی، تدبّر اور وسیع النظری سے کام لیا اس کے نتیجہ میں تقریروں اور قراردادوں میں کسی قسم کی تلخی نہیں پائی گئی۔ اس بات پر ضرور زور دیا گیا کہ اُردو اخباروں کی بقا، اور ترقی کے لئے ضروری ہے کہ اُردو زبان زندہ رہے اور ملک کی زندگی میں اسے مناسب مقام حاصل ہو۔ ایک قرارداد میں کئی ریاستوں میں اُردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیئے جانے کا مطالبہ کیا گیا۔

وزیرِاعظم نے اپنی تقریر میں اُردو صحافت کا ذکر کیا۔ مُلک کی سیاسی، مجلسی اور اقتصادی زندگی میں اُردو صحافت کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے انہوں نے اُردو اخباروں کی مشکلات دور کرنے کے لئے مناسب قدم اُٹھانے کا یقین دلاتے ہوئے کہا کہ — "ہماری ہمدردی ہمیشہ ان لوگوں کے ساتھ رہتی ہے جو کسی طرح بھی کمزور ہوں۔" ظاہر ہے کہ ان الفاظ میں انہوں نے اُردو کے صحافیوں کی مشکلات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ انہیں معلوم تھا کہ یہ کانفرنس اُردو کے صحافیوں کے ان مسائل پر بحث کرنے کے لئے ہی منعقد ہوئی ہے جن کا ذکر اکثر اخباروں میں ہوتا رہتا ہے۔

وزیرِ اطلاعات و نشریات شری گجرال کو اردو زبان، ادب اور شاعری سے گہری دلچسپی ہے۔ انہیں انگریزی اور اردو دونوں پر عبور حاصل ہے۔ گجرال صاحب نہایت شستہ اور شگفتہ اُردو میں تقریر کرنے کے عادی ہیں۔ انہوں نے اپنی تقریر میں اُردو زبان کو مشترکہ تہذیب کی ترجمان قرار دیتے ہوئے جہاں یہ یقین دلایا کہ وہ اُردو اخبار نویسوں کی مشکلات دور کرنے کے فیصلے فراخدلی سے توجہ دیں گے، وہاں انہوں نے معنی خیز الفاظ میں صحافت کے ایک خاص پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ:

"ہندوستان کی اخبار نویسی ایک بڑے کرائسس سے گذر رہی ہے۔ میری مُراد کاغذ کا کرائسس نہیں، نہ ہی میرا اشارہ بڑے اخباروں کی ملکیت کے مستقبل کی طرف

"یہ میں جس کرائسس کا ذکر کر رہا ہوں وہ اخباروں کا
اپنی شخصیت کو پہچاننے کا ہے۔ اگر پیغام دینے والے خود
اپنے آپ کو پہچان نہ سکیں تو دوسروں کو کیا پیغام دیں گے؟"

اس خاص نکتے کی طرف وزیرِ موصوف نے اپنی تقریر کی ابتدا میں بھی اشارہ کیا تھا۔ قدیم اخباروں کی نمائش کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ ۱۸۲۵ء میں اخبار "جامِ جہاں نما" شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ اس اخبار نے اپنے پہلے شمارے میں نہ تو مذہب کا سوال اٹھایا اور نہ کوئی اور جذباتی بات اٹھائی بلکہ اس نے اپنے قارئین کو یہ بات بتانے کی کوشش کی کہ اس زمانے میں اسٹیم کا جہاز کیسے بنتا تھا۔ ان دنوں اسٹیم کا جہاز پہلی بار کلکتہ کی بندرگاہ میں لنگر انداز ہوا تھا اور پہلی بار سائنس ایک نیا رنگ روپ لے کر ہندوستان کی سرحد پر آئی تھی۔ اس وقت اس دَور کے اردو اخبار نویس نے اپنا فرض سمجھا کہ اس کے قارئین یہ جان لیں کہ ہندوستان ایک نئے دور میں داخل ہو رہا ہے اور وہ نیا دَور سائنس اور ترقی کا دَور تھا۔ شری اندر کمار گجرال کا مقصد اس بات پر زور دینا تھا کہ صحافیوں کا فرض ہے کہ وہ ملک کے عوام کی معلومات میں اضافہ کریں۔ انہیں مذہب اور فرقہ کے نام پر تنگ نظری کے راستے پر لے جانے کی کوشش نہ کریں۔

کانفرنس کے صدر مولانا محمد عثمان فارقلیط نے اپنے خطبے میں اس بات کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "اگر اردو کے صحافی اپنے ملک کے دوسرے اخبارات سے اپنے اخبارات کا موازنہ کریں تو انہیں اپنی پسماندگی کا آسانی سے اندازہ ہو جائے گا۔ اس نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ:

"کالم نویسی، فیچر نویسی، تجارت، صنعت، جنگ اور اقتصادیات کے ماہرین اور تحقیقی مقالہ نگار آپ کے ہم عصر اخبارات اور رسائل کی زینت ہیں، مگر ہمیں اردو کے لئے چبے چبائے نوالوں پر ہی اکتفا کرنا پڑتا ہے۔"

پچیس تیس سال پہلے یہ حالت نہیں تھی کیونکہ اس دَور میں اردو کے صحافی صحافت کو کاروبار کی بجائے ایک مقدس مشن سمجھتے تھے۔ مولانا آزاد نے "الہلال" کے ذریعہ، مولانا ظفر علی خاں نے "زمیندار" کے ذریعہ، مولانا محمد علی جوہر نے "ہمدرد" کے ذریعہ، لالہ لاجپت رائے نے "بندے ماترم" کے ذریعہ لالہ رام رچھپال سنگھ شیدا دہلوی، پنڈت بانکے دیال اور لالہ دینا ناتھ نے "ہندوستان" کے ذریعہ عوام کو غلامی اور سامراج کے خلاف جدوجہد کے لئے تیار کیا۔ بلاشبہ انہیں بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر عوام ان کے اخبارات کی قدر کرتے تھے۔ سرکاری اشتہارات سے محروم رہنے کے باوجود عوام کا اعتماد حاصل ہونے کی وجہ سے ان کے اخبارات زندہ رہے۔ یہ اخبار عوام کے جذبات سے کھیلنے کی بجائے ان کی صحیح رہنمائی کرتے تھے اور اس کے لئے بڑی سے بڑی مشکل کی پروا نہ کرتے تھے۔ اسی لئے غیرملکی حکومت پے در پے وار کرنے کے باوجود انہیں کچل دینے یا ان کی مقبولیت ختم کر دینے میں کامیاب نہیں ہوئی۔

شیخ محمد عبداللہ نے بھی اپنے مقالے میں صورتِ حال کے اس پہلو کا خاص طور سے ذکر کیا۔ انہوں نے کہا کہ اردو کو مذہب اور فرقہ پرستی کی سیاسیات سے وابستہ کرنے والوں نے اسے بے حد نقصان پہنچایا ہے۔ اردو کو ان لوگوں نے بھی نقصان پہنچایا ہے جنہوں نے اس میں فارسی اور عربی کے ثقیل الفاظ شامل کرنے کی کوشش کی۔ شیخ صاحب کا یہ تجزیہ نہایت درست تھا کہ اگر اردو کو عام فہم زبان بنا یا جائے اور اردو کے صحافی اخبار نویسی کو ایک مقدس قومی مشن سمجھیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اردو اخبارات عوام کی ترجمانی نہ کریں۔ اور ملک کے مسائل حل کرنے میں ان کا کردار نمایاں نہ ہو۔

اس میں شک نہیں کہ اردو صحافت نہایت مشکل دَور سے گذر رہی ہے اور اردو اخباروں کو اپ ٹو ڈیٹ بنانے کے لئے ایسے اخبار نویسوں کی ضرورت ہے جو سائنس، ٹیکنالوجی، ادب، آرٹ، قانون، زراعت، سیاست، اخلاق، غرض کہ ہر موضوع پر قارئین کو معلومات بہم پہنچا سکیں۔ اعتراف کرنا ہوگا کہ جہاں اردو میں ان موضوعات پر لکھنے والوں کی کمی ہے وہاں خوشنویسوں کی کمی اردو صحافت کے مستقبل کے لئے بہت بڑے خطرے کا سبب بن رہی ہے۔ ۱۰۔۱۵ برس پہلے یہ حالت نہیں تھی۔ بی اے، ایم اے، پاس کر کے اردو جاننے والے نوجوان اخباروں میں کام کرنا پسند کرتے تھے۔ آج بہت کم نوجوان کالجوں میں اردو کو ذریعۂ تعلیم بنا کر امتحانوں میں شامل ہوتے ہیں۔ اردو خوش نویسی نوجوانوں کے لئے باعثِ کشش نہیں رہی۔ خوشنویسی ایک آرٹ ہے اس لئے اسے زندہ رکھنے کے لئے حکومت امداد دے سکتی ہے۔ اردو ایڈیٹرز کانفرنس نے ایک قرارداد میں مطالبہ کیا ہے کہ حکومت اردو خوشنویسی کے لئے تربیت دینے والے ادارے قائم کرے اور اس کے لئے امیدواروں کو وظائف دے کر ان کی حوصلہ افزائی کرے۔ اسی طرح اگر مختلف موضوعات پر اردو میں کتابیں لکھوانے اور شائع کرنے کا انتظام کیا جائے اور مختلف یونیورسٹیوں میں اخبار نویسوں کے لئے تربیت کا انتظام کیا جائے تو اس سے اردو اخباروں کو یقیناً قابل صحافی دستیاب ہو سکیں گے۔ اس سلسلے میں پنجاب یونیورسٹی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کے اخبار نویسی کے شعبہ نے گذشتہ ۲۶ برس میں سینکڑوں نوجوانوں کو انگریزی، ہندی اور اردو صحافت کی تربیت دی ہے۔ پنجاب یونیورسٹی سے صحافت کا ڈپلوما حاصل کرنے والے اردو کے کئی صحافی اخباروں اور سرکاری اور نیم سرکاری اداروں میں کام کر رہے ہیں۔

وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی، وزیرِ اطلاعات و نشریات شری اندر کمار گجرال اور اتر پردیش کے وزیرِ اعلیٰ شری ہیم وتی نندن بہوگنا کی

تقریروں سے کانفرنس میں شامل ہونے والے اخبار نویسوں کو بلاشبہ اس بات کا یقین ہوا ہے کہ حکومت اُردو کے اخبار نویسوں کے مسائل حل کرنے کے لئے صدق دلی سے کوشش کرے گی۔

بلاشبہ کچھ مسائل اور مشکلات کا حل حکومت کی امداد سے ہو سکتا ہے۔ خوشنویسوں اور صحافیوں کی تربیت کے لئے حکومت کو قدم اُٹھانا چاہیئے۔ چھپائی کے معاملہ میں اخبارات اور رسائل کی ایک مشکل کا حل کرنے کے لئے چند دن پہلے جالندھر میں وزیر داخلہ شری اوماشنکر دیکشت نے اس تجویز کا ذکر کیا تھا کہ حکومت اپنے طور پر جدید ترین چھاپے خانے جاری کرے اور برائے نام منافع پر چھوٹے اخباروں کی چھپائی کا انتظام کرے۔ ظاہر ہے کہ اس تجویز کو عملی صورت دی جائے تو اُردو کے اخباروں کی ایک بڑی مشکل حل ہو جائے گی۔

اُردو کے اخبارات کو حکومت کے مختلف محکموں اور پبلک سیکٹر کے اداروں کے اشتہارات ملنے چاہئیں۔ انہیں اخباری کاغذ حاصل کرنے میں مشکل کا سامنا نہیں ہونا چاہیئے۔ اس معاملے میں مجھے ذاتی طور پر مرکزی وزراء اور کچھ ریاستی وزراء سے بات چیت کرنے کا موقع ملا ہے اور میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جہاں حکومت اُردو زبان کی بقاء کی خواہش مند ہے۔ وہاں اُردو کے صحافیوں اور اخباروں کے مسائل حل کرنے کے لئے اسکی صدق دلی کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ اُردو کے صحافی اپنے مسائل حکومت کے سامنے رکھیں۔ یہ کام کسی تنظیم کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ اُردو کے صحافیوں نے باضابطہ طور پر اپنی تنظیم کی بنیاد رکھ کر اس مقصد کے لئے صحیح راستہ اختیار کیا ہے۔

آل انڈیا اُردو ایڈیٹرز کانفرنس نے اپنے ممبروں کے لئے ایک ضابطۂ اخلاق وضع کر کے فرض شناسی سے کام لیا۔ اس ضابطۂ اخلاق میں فرقہ پرستی کی آگ بھڑکانے اور فحش نگاری کی مذمت کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے اُردو اخبار نویسوں کی لیڈرشپ یقیناً مبارکباد کی مستحق ہے کہ اس نے مطالبات پیش کرنے کے ساتھ ہی اپنی ذمہ داریوں کا بھی خیال رکھا ہے۔

کانفرنس کے سرکردہ رُکن جناب شمیم احمد شمیم نے اپنی جاندار تقریر میں بلاشبہ دُرست کہا کہ اُردو کے صحافیوں کو اپنی صحافت کا معیار بلند کرنے کے لئے جدوجہد کرنا چاہیئے۔ صحافت ایک مقدس فرض اور مقدس پیشہ ہے۔ اسے ذریعۂ معاش بنانا گناہ نہیں لیکن اسے عام تجارت کا درجہ دینا یقیناً گناہ ہے۔ اخبار نویس کو اپنی انفرادیت قائم رکھنی چاہیئے۔ عوام کے جذبات بھڑکانے کی بجائے اسے عوام کی رہنمائی کرنی چاہیئے۔ اُردو زبان اور اُردو کے صحافیوں نے ملک کی آزادی کی جدوجہد میں نمایاں پارٹ ادا کیا ہے۔ اُردو نے آزادی کی جدوجہد کو "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ دیا۔ آزادی کی جدوجہد میں اُردو کے اخبار نویس بڑھ چڑھ کر گرفتار ہوئے اور اُردو کے اخباروں نے بڑھ چڑھ کر اپنی ضمانتیں ضبط کروائیں۔ اب جب کہ ملک تعمیر، ترقی اور مجلسی انقلاب کی جدوجہد سے گذر رہا ہے۔ اس انقلابی زبان کے اخبار نویسوں کی ذمہ داریاں اور بھی بڑھ گئی ہیں۔ اگر اُردو کے صحافی عام فہم زبان استعمال کرتے ہوئے عوام کے مسائل پر براہ راست توجہ دیں گے تو یقیناً اُردو زبان اور اُردو صحافت کا مستقبل روشن ہوگا۔

مانش پرتاب گڑھی

غزل

بے چہرگیٔ غم سے پریشان کھڑے ہیں
ہم پھر بھی وہ انساں ہیں کہ جینے پہ اڑے ہیں

غم سے جو بلند اور مسرت سے بڑے ہیں
ایسے بھی کئی داغ مرے دل پہ پڑے ہیں

تاریخ کے صفحوں پہ جو انسان بڑے ہیں
اُن میں بہت ایسے ہیں جو لاشوں پہ کھڑے ہیں

ٹوٹے وہ چراغ انجمن نو میں پڑے ہیں
ماحول کی ظلمت سے جو تا صبح لڑے ہیں

کیا کیا نہ ہمیں گھر کی اُداسی سے گلا تھا
اب شہر میں نکلے ہیں تو حیران کھڑے ہیں

حالات کے پتھراؤ سے بچ نکلیں تو جانو
شیشے کی طرح ہم بھی فریموں میں جڑے ہیں

یادوں کے گھنے شہر میں کیوں کر کوئی نکلے
ہر فرد کے پیچھے کئی افراد کھڑے ہیں

رونا تو یہ ہے حلقۂ زنجیر کی صورت
حالات کے پیروں میں ہمیں لوگ پڑے ہیں

سورج جو چڑھے گا تو سمٹ جائیں گے یہ لوگ
سائے کی طرح قد سے جو دو ہاتھ بڑے ہیں

اس دورِ خرد کا ہے یہ المیّہ کہ انسان
آپ اپنی ہی لاشیں لئے کاندھوں پہ کھڑے ہیں

صدیاں ہیں کہ گزری ہی چلی جاتی ہیں نازش
لمحے ہیں کہ اِک عمر سے چپ چاپ کھڑے ہیں

غیر مسلم مصنفینِ اردو کانفرنس

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ اردو کسی مذہب یا کسی ایک خاص مذہب کے ماننے والوں کی زبان نہیں اور نہ ہندوستان کی اس چھوٹی بڑی زبان کا ادب کسی ایک مخصوص فرقے کا ادب ہے۔ ہندوستانی تہذیب کی طرح اردو زبان اور اس کا ادب بھی مختلف متنوع اور رنگا رنگ عناصر کا حامل ہے۔ اس میں اسی دھرتی کی بو باس ہے۔ اس کی ایک اور خصوصیت بھی قابلِ توجہ ہے۔ وہ یہ کہ اردو زبان کسی ایک علاقے میں محدود نہیں۔ اس کے بولنے پڑھنے اور لکھنے والے سارے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں ایک خاصی تعداد ایسے افراد کی ہے جن کی مادری زبان ہندوستان کی کوئی دوسری قومی زبان ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ مختلف فرقوں کے مختلف عقائد رکھنے والوں نے اس زبان میں اپنے نظریات و عقائد پیش کئے۔ لیکن جب بھی پورے ملک کا معاملہ درپیش آیا تو سارے دل ایک ساتھ دھڑکے ہیں۔ گویا اردو زبان سب فرقوں کی زبان اور اردو ادب سارے ملک کا مشترک ادب ہے۔

تاہم صورتِ حال کے برعکس بعض مفاد پرستوں نے گزشتہ کچھ عرصے سے اس زبان کو عوام کے ایک خاص فرقے یعنی مسلمانوں کی اور پاکستان کی زبان کہنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے نزدیک یہ ایک غیر ملکی زبان ہے۔ جو ہمارے ملک و معاشرے میں کسی قسم کی مراعات اور حقوق کا استحقاق نہیں رکھتی۔ وہ اس بات کو لائقِ اعتنا نہیں سمجھتے کہ پاکستان میں اردو مادری و ثانوی زبان والوں کی تعداد ہمارے ملک کی اردو آبادی کا کوئی آٹھواں حصہ ہے۔

مفاد پرستوں کے ذہنوں میں پرورش پانے نیز ان کی جانب سے پھیلائی جانے والی غلط فہمیوں کو ختم کرنا ضروری تھا۔ اتنا ہی ضروری اردو کے واسطے واجب مراعات و حقوق کی مانگ کے لئے کوئی ٹھوس اقدام کرنا تھا۔ ایسا اقدام غیر مسلموں کی جانب سے اور بھی مستحسن اور مشکور تھا۔

اسی امر کے پیشِ نظر اردو کے افسانہ نگار جناب رام لال نے اردو کے ادیبوں ڈاکٹر امرت لال عشرت، جناب بشیشر پردیپ، جناب کلدیپ تلوار اور ڈاکٹر نریش کے اشتراک سے لکھنؤ میں اردو زبان کے غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں کے ایک کل ہند اجتماع کا اہتمام کیا۔ جو دس اور گیارہ نومبر کو منعقد ہوا۔

یہ کانفرنس تاریخی نوعیت کی حامل ہے۔ اس میں سارے ملک کے مختلف حصوں اور علاقوں سے اردو کے ڈیڑھ سو غیر مسلم افسانہ نگار، شاعر، نقاد اور محققین اور اہم مشاہدین نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں بحیثیت مندوب شریک ہونے والوں میں بمبئی سے کرشن چندر، شام کشن نگم، جموں سے ڈاکٹر گیان چند، دہلی سے پنڈت آنند نرائن ملا، جناب عرش ملسیانی، جناب بلراج کومل، جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، جناب وی شنکر، جناب ساحر ہوشیارپوری، جناب کرشن موہن، جناب کرشن مراری، جناب ستیش بترا، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، امرتسر سے جناب شردن کمار ورما، جناب پورن سنگھ ہنر، جالندھر سے پنڈت میلارام وفا، شملہ سے جناب کرشن کمار طور، کلکتہ سے ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹا چاریہ، سرینگر سے جناب جگن ناتھ آزاد، کیتھل سے جناب رانا گنوری، چندی گڑھ سے جناب کشمیری لال ذاکر، حیدرآباد سے جناب طالب شاہ آبادی، الٰہ آباد سے جناب فراق گورکھپوری، نابھہ سے جناب آزاد گلاٹی، فرید کوٹ سے جناب ایس کے رامپال، اور اورنگ آباد سے جناب جوگندر پال سرفہرست ہیں۔ مشاہدین میں پروفیسر آلِ احمد سرور، جناب سہیل عظیم آبادی، جناب سردار جعفری، جناب مجروح سلطانپوری جناب ساحر لدھیانوی ڈاکٹر ظ۔ انصاری، جناب کلام حیدری، جناب مظہر امام، ڈاکٹر محمد حسن خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ اُتر پردیش کے متعدد شہروں اور قصبوں سے غیر مسلم ادیب و شاعر اس کانفرنس میں شرکت کرنے کیلئے آئے تھے۔

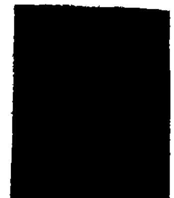
۱۰ نومبر کو صبح ساڑھے دس بجے کانفرنس کی سبجکٹس کمیٹی کا اجلاس ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر گیان چند نے فرمائی۔ اس اجلاس میں جناب رام لال نے کانفرنس کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اور پروگرام کی تفصیل بتائی۔

جناب ستیش بترا نے مندوبین کو خوش آمدید کہا اور فرمایا کہ "اب اُردو کے حق میں حالات ساز گار ہیں اور سرکار ہمارے مطالبات کو سننے اور ان پر عمل پیرا ہونے کے لئے آمادہ نظر آرہی ہے۔ اس لئے ہمارا یہ کام ہے کہ اُردو کے تحفظ کے لئے ہم اپنے مطالبات کو واضح اور غیر مبہم الفاظ میں سرکار کے سامنے رکھیں اور کوشش کریں کہ اُردو کو اس کا جائز مقام حاصل ہو جائے۔"

ڈاکٹر گیان چند نے اپنی تقریر میں کہا کہ "اُردو صرف مسلمانوں ہی کی نہیں بلکہ لاکھوں غیر مسلم حضرات کی بھی زبان ہے۔ اُردو کے اہلِ قلم حضرات غیر مسلم بھی ہیں جن میں سے بہت سے حضرات صفِ اول میں شامل ہیں۔"

سبجکٹس کمیٹی کے اس اجلاس نے سات ریزولیوشنوں کے مسودے تیار کئے، جو مندوبین کے عام جلسے میں پیش اور پاس کئے جانے والے تھے۔

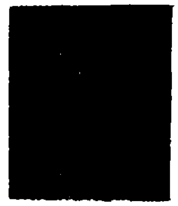
دس نومبر کو سہ پہر میں اسی رویندرالیہ میں ڈیلی گیٹ اجلاس اردو کے مشہور شاعر پنڈت آنند نرائن ملا کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس ڈیلی گیٹ اجلاس نے سات ریزولیوشن پاس کئے جن میں مراعات و حقوق کی مانگ کی گئی۔ ایک



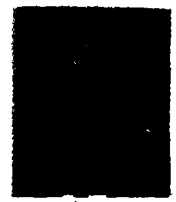
آنند نرائن ملّا



فراق گورکھپوری



کرشن چندر



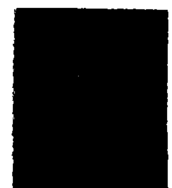
شام کشن نگم



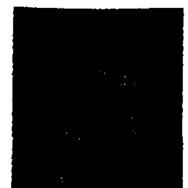
رام لال



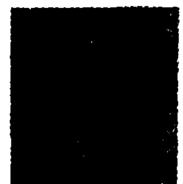
کنور مہندر سنگھ بیدی سحر



ڈاکٹر نریش



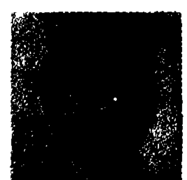
ستیش بترا



شانتی رنجن بھٹاچاریہ



بلراج کومل



جگن ناتھ آزاد



ساحر ہوشیارپوری

ریزولیوشن میں ڈیلی گیٹ اجلاس نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ جن ریاستوں کی سرکاری زبان ہندی قرار دی جا چکی ہے وہاں اردو کو ثانوی زبان قرار دیا جائے اور وہاں کے تعلیمی اداروں میں میٹرک یا ہائر سیکنڈری درجوں تک اردو کی تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے پیش کردہ اس ریزولیوشن کی تائید مشہور جدید شاعر بلراج کومل نے کی۔ اس قرارداد کی حمایت میں مشہور افسانہ نگار کشمیری لال ذاکر، جناب جہر گیرا اور ڈاکٹر نریش نے تقریریں کیں۔

اجلاس نے مشہور غزل گو شاعر جناب ساحر ہوشیارپوری کے پیش کئے ہوئے ایک دوسرے ریزولیوشن کے ذریعہ مرکزی اور ریاستی حکومتوں سے مطالبہ کیا کہ ان تمام ریاستوں میں جن کی سرکاری زبان ہندی نہیں ہے۔ اُن علاقوں کی نشاندہی کی جائے جہاں اردو بولنے یا جاننے والے رہتے ہیں اور اُن علاقوں میں اردو کی تعلیم کا مناسب انتظام کیا جائے۔

ریزولیوشن کی تائید اردو کے بنگالی ادیب ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے کی۔ جناب سوشیل رام پال نے بھی ریزولیوشن کی حمایت میں تقریر کی۔

اجلاس نے کانفرنس کے کنوینر ڈاکٹر نریش کے پیش کئے ہوئے ایک اور ریزولیوشن کے ذریعے اس امر کی تائید و تصدیق کی کہ اردو کسی ایک فرقے یا قوم کی زبان نہیں بلکہ ملک کے تمام لوگوں کی زبان ہے۔ ریزولیوشن میں ملک کی تمام سیاسی پارٹیوں اور ان کے لیڈروں سے اپیل کی گئی کہ وہ اردو کو کسی خاص فرقہ یا مذہب سے منسلک نہ کریں اور اردو کو اس کا حق دلوانے میں مدد کریں۔ اس ریزولیوشن کی تائید مشہور اردو شاعر جگن ناتھ آزاد نے کی۔

اجلاس نے اپنے چوتھے ریزولیوشن میں جسے ڈاکٹر طالب شاہ آبادی نے پیش کیا تھا مرکزی حکومت سے مطالبہ کیا کہ ان تمام ریاستوں میں جن کی سرکاری زبان ہندی ہے، سرکاری ملازمت دیتے وقت امیدواروں کے لئے میٹرک یا ہائر سیکنڈری درجات تک اردو کی تعلیم لازمی قرار دی جائے اور حکومت اس امر کو یقینی بنائے کہ اس کے احکام یا ہدایات پر ریاستی حکومتیں عمل درآمد کرتی ہیں۔

ریزولیوشن کی تائید بنگالی اردو شاعرہ کمل چٹرجی شبنم نے کی جناب اجیر سنگھ سینی اور کشمیری لال ذاکر نے بھی حمایت میں تقریریں کیں۔

ممتاز اردو افسانہ نگار کرشن چندر کے پیش کئے ہوئے ایک ریزولیوشن کے ذریعہ ڈیلی گیٹ اجلاس نے مرکزی حکومت سے مطالبہ کیا کہ آل انڈیا ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں اردو کے پروگراموں کا وقت بڑھایا جائے اور مختلف ریاستوں میں ریڈیو اسٹیشنوں پر متعلقہ علاقے کے ادبا اور شعرا کو یکساں نمائندگی دی جائے۔

ریزولیوشن کی تائید اور حمایت میں جدید اردو شعرا جناب کرشن موہن اور جناب مظہر امام نے اظہارِ خیال کیا۔

ڈیلی گیٹ اجلاس نے اپنے چھٹے ریزولیوشن میں ملک کی تمام یونیورسٹیوں سے اپیل کی کہ وہ اپنے یہاں طلبا کو پرائیوٹ امیدوار کی حیثیت سے اردو کا کوئی بھی امتحان دینے کی اجازت دیں اور اس سلسلے میں ضروری سہولتیں فراہم کریں۔

جدید شاعر آزاد گلاٹی کے پیش کئے ہوئے اس ریزولیوشن کی تائید جناب سوشیل رتن چوپڑہ نے کی۔

اجلاس نے جس ساتویں ریزولیوشن کو منظوری دی اس میں مرکزی حکومت سے کہا گیا ہے کہ چونکہ مرکزی نظم و نسق کے علاقہ چنڈی گڑھ کی علاقائی زبان سرکاری طور پر اردو قرار دی جا چکی ہے اس لئے چنڈی گڑھ کے تمام اسکولوں میں بلا تاخیر اردو کی تعلیم کو لازمی قرار دے کر اردو کی تعلیم کے لئے مناسب انتظامات کئے جائیں۔ ریزولیوشن پیش کرتے ہوئے جناب گیہ پرشاد جزل نے کہا کہ اردو کو علاقائی زبان کی حیثیت سے سرکاری طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے مگر حیرت کی بات ہے کہ تعلیمی اداروں میں اردو کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ تائید جناب مہر گیرا

نے کی۔ ڈاکٹر نریش نے جو چندی گڑھ سے تعلق رکھتے ہیں کہا کہ اردو کے مطالبات کے سلسلے میں کسی دوسرے علاقے یا ریاست کا نام نہیں لیا گیا۔ چندی گڑھ کے سلسلے میں خاص طور پر ریزولیوشن اس خیال سے لایا جا رہا ہے کہ وہاں اردو کا ایک بھی مسلمان ادیب یا شاعر نہیں رہتا اور ہندو، سکھ، عیسائی ادیبوں شاعروں کی کانفرنس اس مطالبے کے لئے موزوں ترین پلیٹ فارم ہے۔

شام کے اجلاس میں کانفرنس کے چیف کنوینر جناب رام لال نے کہا کہ اردو کو وہ درجہ نہیں دیا جا رہا ہے، جس کی وہ مستحق ہے۔ اجلاس کے صدر پنڈت آنند نرائن ملا نے اپنی تقریر میں اس بات پر خوشی ظاہر کی کہ آج اردو کے معاملے میں ملک کی فضا پہلے سے بہتر ہے۔ ملا صاحب نے کہا "ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہم پر جو ناجائز جبر کیا گیا ہے، اسے ہٹایا جائے اور ہم کو اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کا موقع دیا جائے۔"

دس نومبر کی شام کو طے شدہ پروگرام کے مطابق کرسچین کالج کے ہال میں کہانیوں کی شام کا پروگرام پیش کیا گیا۔ صدارت لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے کی۔ افتتاحی تقریر بیگم حامدہ حبیب اللہ نے اور پنڈت آنند نرائن ملا نے پروگرام کا افتتاح فرمایا۔ اس نشست میں ستیش بترا، جوگندر پال، کرشن چندر، آنند رومانی، شرون کمار ورما، کوثر چاندپوری، کشمیری لال ذاکر اور سہیل عظیم آبادی نے اپنی کہانیاں پڑھیں۔

غیر مسلم اردو مصنفین کانفرنس کے پہلے دن، رات میں ۹ بجے ایک عظیم الشان مشاعرہ ہوا۔ اس مشاعرے کا افتتاح اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ جناب ہیم وتی نندن بہوگنا نے کیا۔ موصوف نے اپنی تقریر میں کہا کہ اردو، تامل، تیلگو، گجراتی، مراٹھی وغیرہ کی طرح ہمارے ملک کی ایک زبان ہے جسے آئین میں تسلیم کیا گیا ہے اور جس نے ہمارے ملک کی زندگی میں آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد ایک نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ شری بہوگنا نے ہر مسئلے کو سیاست سے جوڑ دیئے جانے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ فرقہ وارانہ تصور بھی عام ہو گیا کہ ہندی ہندوؤں کی ہے اور اردو مسلمانوں کی۔ اس بات کو جب تک ذہنوں سے دور نہ کیا جائے گا، مسئلے کو حل کرنے میں دشواریاں حائل رہیں گی۔ انہوں نے مزید کہا کہ "انقلاب کے ترانے گانے والی زبان آزادی کے بعد بے گھر ہو جائے اس سے زیادہ دکھ کی بات اور کوئی نہیں ہو سکتی"۔ اس سے پیشتر انہوں نے فرمایا کہ وہ سال ڈیڑھ سال سے اردو کی کھلم کھلا حمایت کرتے رہے ہیں اس لئے نہیں کہ ان کا مقصد کسی کو خوش کرنا ہے بلکہ اس لئے کہ اردو ادب ہمارے قیمتی ثقافتی ورثہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ فرقہ پروری کے باعث اگر اردو بے گھر ہونے لگے تو ہر شخص کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اردو کی حمایت کرے اور اسے بچائے۔

مشاعرے کے آغاز سے پہلے جناب رام لال نے اور آل انڈیا میر اکیڈیمی کے صدر جناب مقبول احمد لاری نے مشاعرہ کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے اپنے خطبے میں یہ امید ظاہر کی کہ جناب بہوگنا کے عہدِ حکومت میں اردو کی ترقی میں پیش آنے والی رکاوٹوں کو دور کیا جائے گا۔

مشاعرے کی صدارت جناب شام کشن نگم نے کی۔ مشاعرے میں ساحر لدھیانوی، سردار جعفری، خمار بارہ بنکوی، جگن ناتھ آزاد، آل احمد سرور، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، پریم لال شفا، گیان سنگھ شاطر، ساحر سنامی، ساحر ہوشیارپوری، کرشن موہن، پنڈت میلا رام وفا، ناظر خیامی، دواکر راہی، رانا گنوری، ثاقب بریلوی، آزاد گلاٹی، کرشن مراری اور دوسرے مشہور شعرا نے اپنا کلام سنایا۔

کانفرنس کے دوسرے دن یعنی گیارہ نومبر کو دو مذاکرے ہوئے۔ صبح کے اجلاس میں، پہلا مذاکرہ "اردو سے ہمارے رشتے" کے عنوان پر ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت ریٹائرڈ آئی۔ سی۔ ایس اور وزارتِ دفاع کے سابق سکریٹری جناب وی شنکر نے کی۔ اس اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے اردو کے ممتاز ناقد پروفیسر آل احمد سرور نے کہا کہ مچھلی جو دریا میں رہتی ہے، بعض اوقات محسوس نہیں کر پاتی کہ اس کا دریا سے کیا رشتہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے اور ہماری زبان کے رشتے کی نوعیت بھی یہی ہے۔ پروفیسر موصوف نے اردو کی خدمات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ "انقلاب زندہ باد" سے "انگریزی ہٹاؤ" تک ہر نعرے کے لئے اردو کا سہارا لینا پڑا ہے۔ سرور صاحب نے امید ظاہر کی کہ جو بات سورج کی طرح روشن تھی، وہ اس کانفرنس سے کچھ اور زیادہ آئینہ ہو جائے گی۔ انہوں نے کہا کہ اگرچہ فضا کچھ بدلی ہے، کچھ بادل چھٹ رہے ہیں پھر بھی ہمیں اردو کے لئے اپنی جدوجہد جاری رکھنی ہوگی۔

اس اجلاس میں جموں یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر گیان چند اور دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے ریڈر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اپنے مقالات پیش کئے۔ بحث میں حصہ لیتے ہوئے ترقی پسند شاعر جناب علی سردار جعفری نے کہا کہ وہ ہندی والوں کے سامنے اردو کو ایک حریف کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ہندوستانی زبان کی حیثیت سے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اسے کاروبار اور نظم و نسق میں ایک مقام اور اس کی تعلیم کی سہولتیں بہرحال ملنی چاہئیں۔

مشہور شاعر جناب عرش ملسیانی نے کہا کہ اردو سے ہمارا رشتہ بہت مضبوط اور مستحکم ہے اور ہم اردو کے لئے اس وقت تک جدوجہد جاری رکھیں گے جب تک اردو کو اس کا جائز حق نہیں مل جاتا۔ ڈاکٹر محمد حسن نے بحث کے دوران میں کہا کہ ہم اردو کے لئے مراعات نہیں، بلکہ ہندوستان کے آزاد شہری کی حیثیت سے اپنا حق چاہتے ہیں۔ بحث میں جناب بلراج کومل، جناب سلامت علی مہدی، جناب دواکر راہی اور جناب کوثر چاندپوری نے بھی حصہ لیا۔

آخر میں اجلاس کے صدر جناب وی شنکر نے اپنی تقریر میں کہا کہ اردو ہر اعتبار سے اس بات کی مستحق ہے کہ وہ قومی زبان بنے کیونکہ یہ کئی زبانوں سے مل کر بنی ہے اور اس کی وسعت اس سمندر جیسی ہے جس میں بہت سے دریا آکر گرتے ہیں۔ موصوف نے مزید کہا کہ اردو نے تین چار سو برسوں میں [illegible]

کی ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔ قوم کے سامنے کوئی بھی ایسا نازک وقت نہیں آیا جب اُردو نے بہ آوازِ بلند وطن کا ساتھ نہ دیا ہو۔ نیز تحریک آزادی کے دوراں میں قومی ولولوں کی جتنی ترجمانی اُردو نے کی ہے، اتنی کسی اور زبان نے نہیں کی۔

سہ پہر میں "ہم اُردو کے طرف دار کیوں ہیں" کے عنوان پر مذاکرہ ہوا اس کھلے اجلاس میں حضرت فراق گورکھپوری اور پنڈت آنند نرائن ملّا نے تقریریں کیں۔ آخر میں جناب کرشن چندر نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا کہ جو لوگ اردو زبان سے نفرت کرتے ہیں یا اس کے وجود سے انکار کرتے ہیں وہ ہماری مشترکہ تہذیب اور کلچر سے انکار کرتے ہیں۔" انہوں نے مطالبہ کیا کہ "پرائمری سطح سے سرکاری سطح تک وہ تمام حقوق جو دوسری قومی زبانوں کو مل چکے ہیں وہی تمام حقوق اُردو کو بھی ملنا چاہییں۔ یہی اس کانفرنس کی آواز ہے۔" (ا د ا ر ہ)

بقیہ 'پانچویں منصوبے کا خاکہ

دیگر ذرائع اختیار کرنا۔

قومی ترقیاتی کونسل میں وزیر اعظم نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ منصوبے کی کامیابی یا ناکامی عوام کے حوصلے پر منحصر ہے۔ اگر وہ دل و جان سے اس مہم میں شریک ہوں گے تو اس کی کامیابی لازمی ہے۔ وزیر اعظم نے ریاستی وزرائے اعلیٰ کو صلاح دی کہ وہ چھوٹی چھوٹی اسکیموں کو نظر انداز نہ کریں کیونکہ ایسی ہی اسکیموں میں عوام کا زیادہ سے زیادہ اور پرجوش تعاون حاصل ہو سکتا ہے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ عوام میں محض کسان اور مزدور ہی نہیں بلکہ سیاسی لیڈر، سرکاری ملازم، سرمایہ دار اور صنعت کار بھی شامل ہیں۔ اگر سبھی خلوصِ نیت، محنت، ایمانداری اور لگن سے کام کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارا منصوبہ کامیاب اور ہمارا مستقبل درخشاں نہ ہو سکے۔

بیلا رمڑنیک لال بچپن ہی میں کامیاب مصوّر

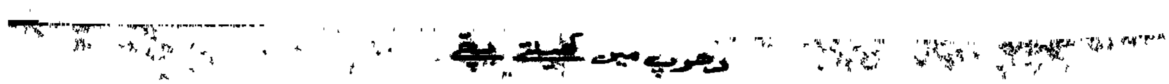
گجرات میں پالن پور کی سات سالہ بچی بیلا رمڑنیک لال کی بنائی ہوئی ایک تصویر ڈاک ٹکٹ پر چھاپنے کے لئے منتخب کی گئی ہے۔ ڈاک تار محکمے نے ۱۴ رنومبر کو یوم اطفال کے موقع پر ۲۰ پیسے والا ایک ڈاک ٹکٹ جاری کیا ہے جس پر اُس کی بنائی ہوئی تصویر "دھوپ میں کھیلتے بچے" چھاپی گئی ہے۔

بیلا کے والد مصوّری کے اُستاد ہیں۔

بیلا کو ۱۹۷۰ء کے بعد سے لگاتار تین مرتبہ شنکر کے تصویروں کے بین الاقوامی مقابلے میں انعام مل رہے ہیں۔ اِس مرتبہ ڈاک ٹکٹ پر چھاپنے کے لئے چُنی گئی اُس کی تصویر نے پچھلے برس کے مقابلے میں پہلا انعام حاصل کیا تھا۔ اُس کی ایک اور تصویر کو گجرات للت کلا اکاڈمی کی تصویروں کی ۱۳ویں نمائش میں بھی انعام مل چکا ہے۔



بیلا رمڑنیک لال اور اس کی بنائی ہوئی تصویر



دھوپ میں کھیلتے بچے

نفیسہ منظور الامین
بتوسط جناب منظہر الامین صاحب۔ اسٹیشن ڈائرکٹر، آل انڈیا ریڈیو۔ جے پور

آنکھوں کی زبانی

آرام دہ خوابگاہ کے پردے صبح کی ہلکی ہواؤں میں دھوئیں کے مرغولوں کی طرح اڑ اڑ کر بے نام سی شکلیں بنا رہے تھے۔ گہری نیلی دیوار پر لگے میورل کی ابسٹریکٹ شکلوں کی وجہ وجود سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل پر رکھے ماں اور بچہ کے مجسمے میں وہی ہاتھ لاٹ گیا تھا جس سے ماں نے بچے کو سہارا دیا ہوا تھا۔ ابھی مہینہ بھر پہلے جہاں ہر چیز ملیف کے رنگوں میں جگمگاتی تھی۔ اب اس پر بس ایک ہی رنگ چھا رہا تھا۔ اداسی کا رنگ کیونکہ جو ہاتھ اس میں رنگ بھرتے تھے وہ ساکت تھے۔ جو زبان گھر میں نغمے بکھیرتی تھی وہ خاموش تھی۔ کیونکہ نفیسہ بیمار تھی۔ اچانک فالج کے حملے نے اس کی زبان بند کر دی تھی۔ اور ہاتھوں کو بے جان کر دیا تھا۔ اس کی گھومتی جھپکتی آنکھیں کمرے میں ایک سوال سا بنتیں۔ یا پھر پیروں کی ہلکی سی جنبش اس کے ذی روح ہونے کا پتہ دیتی۔ تکیئے پر بکھرے اس کے سیاہ ملائم بال اب الجھنے لگے تھے۔

نفیسہ نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں اور ماں اور بچے کے مجسمے کو دیکھ کر سوچا۔ کوئی اس ٹوٹے ہوئے ہاتھ کو تو جوڑ دیتا۔ لیکن جوڑتا کون۔ اس کے ہاتھ کے بنائے آرٹ کے سب ہی نمونے اس کی انگلیوں کے لمس کے لئے بیتاب تھے۔

اس کے شوہر عادل نے ــــ جو مردانہ وجاہت کا نمونہ تھا۔ جھک کر اس کی پیشانی چومی۔ اور پانچ سالہ مکرم کا ہاتھ پکڑے باہر نکل گیا۔ وہ مکرم کو اس کے اسکول چھوڑ کر اپنے آفس جایا کرتا تھا۔

نفیسہ سے اس نے بڑے چاؤ سے بیاہ کیا تھا۔ وہ دونوں آرکیٹکچر کے طالب علم تھے۔ اور اپنے فن میں ماہر۔ لیکن نفیسہ کے فن میں نسوانی نزاکت اور تخیل کی فطری گہرائی بھی تھی۔ اس لئے اس نے آرکیٹکچر کا میدان چھوڑ کر انٹیریئر ڈیکوریشن INTERIOR DECORATION اور دوسرے فنون لطیفہ کو اپنا لیا تھا۔ اس کا ثبوت ان کے خوبصورت اور آرام دہ گھر کی ایک ایک چیز سے جھلکتا تھا۔ لیکن اب فالج کی بے لبستہ گرفت نے اس کے ہاتھوں اور زبان کو ساکت کر دیا تو عادل کو بھی یوں محسوس ہوا جیسے شور مچاتا۔ ہنستا کھیلتا جو چشمہ اس کی زندگی کو سیراب کرتا تھا وہ دفعتاً سوکھ گیا۔ اس نے نفیسہ کے علاج میں زمین آسمان ایک کر ڈالا۔ لیکن ان کی بد نصیبی کا پہاڑ ٹس سے مس نہیں ہوا۔

آخر کار عادل نے ایک روز نفیسہ کا سر اپنی گود میں رکھ کر اس کی آنسو بھری آنکھوں میں جھانکا۔ اور کہا۔

"ان آنکھوں میں اب کبھی آنسو نہیں آنے چاہئیں جس مرض کو اکھیڑا نہیں جا سکتا۔ اب ہم اسے پیار سے زیر کریں گے۔ ہم دونوں تم اور میں۔"

دنیا میں سب سے زیادہ باتونی آنکھیں ہوتی ہیں۔ زبان تو یونہی بدنام ہے۔ عادل اب آنکھوں کی زبان اچھی طرح سمجھنے لگا تھا۔ نفیسہ کی آنکھیں اس سے بہت کچھ کہتی تھیں۔ ان میں تشکر تھا۔ محبت تھی دکھ کا اتھاہ احساس تھا۔ لیکن ساتھ ہی بہادری اور ہمت سے کیا گیا کوئی وعدہ بھی تھا۔ نرس ڈیوٹی پر آ چکی تھی۔ عادل نے نرمی سے اس کا سر تکیئے پر رکھا۔ اس کے بے حس ہاتھوں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر دبایا۔ یہ وہی ہاتھ تھا وہی انگلیاں تھیں جو فطرت کی بے جان چیزوں میں جادو جگایا کرتی تھیں۔ اب وہ اس کے ہاتھوں کے گرمجوش لمس سے بے بہرہ تھیں۔ لیکن ان کا یہ بے جان لمس ہی تو اس کے لئے اب بھی اہمیت رکھتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد نرس نے نفیسہ کے بال سلجھائے۔ اسے دوائی دی اور ہاتھوں کی مالش کرنے لگی۔ وہ ساتھ ساتھ نفیسہ کو ادھر ادھر کی دلچسپ باتیں بتاتی رہی جنہیں سنکر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آجاتی تھی۔ نرس نے اپنے فرائض انجام دینے کے بعد تپائی پر رکھے تازہ رسالوں میں سے ایک چھانٹا۔ اور کچھ دیر نفیسہ کو پڑھکر سناتی رہی اور ساتھ ہی ساتھ ان کے اوراق الٹ کر نفیسہ کو تصویریں بھی دکھاتی رہی۔

مریضوں کی دیکھ بھال کرتے کرتے اب نرس کے بال پک گئے تھے۔ لیکن کسی مریض کی اس نے اسی جی جان سے خدمت نہیں کی تھی جتنی وہ نفیسہ کی کر رہی تھی۔ نفیسہ کی صورت کے بھولپن اور ساتھ ہی اس کی بے چارگی دیکھ کر اس کا دل امنڈ آتا تھا۔ وہ سویرے ساڑھے نو بجے آتی اور عادل کے جانے کے بعد دن بھر نفیسہ کے ساتھ رہتی اور پھر رات سے [illegible] جاتی۔ وہ خاکیلی تھی۔ اپنی تنہائی کے ساتھ ہی رہا کرتی تھی۔ اور اب تو اسی

کی ڈلیوری کے بعد اس نے عادل کی درخواست پر نفیسہ کے ساتھ رہنا منظور کر لیا تھا۔ مکرم بھی اس سے کافی گھل مل گیا تھا۔

عادل نے کام کرتے کرتے بورڈ کو بے دلی سے آگے دھکیل دیا جس پر وہ کسی کالونی کا نقشہ بنا رہا تھا۔ اس کا دل کام میں بالکل نہیں لگا۔ آفس روم سے نکل کر وہ لاؤنج میں چلا آیا۔

اس نے سویرے نفیسہ سے کوئی وعدہ لیا تھا۔

اس سے کوئی عہد کیا تھا۔

اس نے کہا تھا کہ وہ بھی نفیسہ کے ساتھ اس کے مرض کا مقابلہ کریگا

لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

ڈاکٹروں نے اسے کسی طرح کی امید دلانے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ اپنی مفلوج بیوی کے ساتھ زندگی گذارنے کے لئے تیار تھا۔ کیونکہ اس نے نفیسہ سے محبت اور پھر شادی کی تھی۔

لیکن کیا وہ ہمیشہ ایسا کر سکے گا۔؟

وہ جوان تھا۔ خوبصورت تھا۔ اس کے پیشے کی کامیابی نے اُسے سوسائٹی میں کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔ نفیسہ کی بیماری حال ہی کی تو بات تھی۔ لیکن لڑکیوں کی حریص نظریں ابھی سے اس کی طرف اٹھنی شروع ہو گئی تھیں۔ اس نے ہر پارٹی اور ہر سجیلی محفل میں جانا چھوڑ دیا تھا۔ جس کا اثر اس کے کامیاب پیشے پر بھی پڑ سکتا تھا۔ لیکن نفیسہ کے بغیر اسے وہاں ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ ایک تر و تازہ گلاب ہو جس کی آدھی پنکھڑیاں کسی نے نوچ کر اسے بھونڈا بنا دیا ہو۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ اور سامنے ایکویریم میں دیکھنے لگا جہاں ایک خوش رنگ مچھلی کا پیچھا کئی خوش رنگ مچھلیاں کر رہی تھیں۔ کیا وہ دوسری مچھلیاں اس خوش رنگ مچھلی کو کبھی پکڑ پائیں گی، جو بظاہر ان مچھلیوں کی کاوش سے بے خبر، بے مقصد چکر لگا رہی تھی؟،

کیا ہوگا جب وہ تھک جائے گی۔؟

جو بھی ہوگا دیکھا جائیگا۔ اس نے سر کو جھٹکا دے کر سوچا۔ اب تو وہ صرف اس مسکراہٹ کو دیکھنا چاہتا تھا۔ جو گھر لوٹنے پر اسے دیکھ کر نفیسہ کے لبوں پر کھیل جاتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آئی اس چمک کو دیکھنا چاہتا تھا جو اس کے ہونٹوں سے مکرم کو گال چھوانے پر اتر آتی تھی۔ وہ نرس کی اس بات پر کیسے یقین کر لیتا کہ دن کا بیشتر حصہ نفیسہ کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہتے تھے۔

اس روز جب وہ مکرم کو لے کر گھر لوٹا تو مکرم بہت خاموش تھا۔ اس نے روز کی طرح اپنا کتابوں کا بیگ پچھلی سیٹ پر پھینکا۔ اور چپ چاپ گھٹنے موڑے اگلی سیٹ پر اس کے برابر بیٹھ گیا۔

"کیوں ماسٹر کیا بات ہے۔ کیا مدھو سے لڑائی ہو گئی ہے"؟

مکرم خاموش رہا۔

عادل نے جیب سے چاکلیٹ نکالے۔ اور دوسری طرف دیکھتا ہوا بولا۔

"کوئی ڈیڈی سے ناراض ہو تو ہو۔ اگر کوئی چاہے تو چاکلیٹ ہی لے لے"

لیکن کوئی ردِ عمل نہ پا کر وہ پلٹا تو مکرم اپنا گال سیٹ سے لگائے اسی طرح خاموش بیٹھا تھا۔

"اوہ۔ یہ بڑا بابا تو سچ مچ ہی ناراض معلوم ہوتا ہے" اس نے کار سٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"چلو اب جلدی سے گھر چلتے ہیں۔ اور اس کی ممی کو بھی ساتھ لے کر پارک چلتے ہیں۔ سنا ہے وہاں پہاڑ ساری آئسکریم رکھی ہے اور سارے بچے چوہے بنے اسے جلدی جلدی کھا رہے ہیں۔ اگر ہمیں دیر ہو جائیگی تو پھر ساری آئسکریم ختم ہو جائیگی"

"میری آئس کریم فریج میں رکھی ہے۔" مکرم نے لاپرواہی سے یہ پانسا بھی پلٹ دیا۔

کار ابھی عادل نے پورٹیکو میں روکی ہی تھی کہ مکرم اتر کر تیر کی طرح بھاگا۔ عادل جب نفیسہ کے کمرے میں پہونچا تو ٹھٹک گیا۔ مکرم نفیسہ کے سینے پر سر رکھے سسکیاں لے رہا تھا۔ نرس اسے نرمی سے ہٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن اس نے اپنے دونوں ننھے ہاتھوں سے نفیسہ کو دبوچ رکھا تھا۔

"نہیں نہیں، تمہیں کہنا پڑے گا" وہ نفیسہ کے دونوں گالوں پر اپنے ہاتھ رکھے عاجزی کر رہا تھا "سب کی ممیاں کہانیاں کہا کرتی ہیں تم کیوں نہیں مجھے کہتیں"؟

نفیسہ کی آنکھوں کے کنارے تیزی سے بھیگنے لگے تھے۔ اس کے ہونٹ پھڑک رہے تھے۔ عادل نے اس کرب کو محسوس کیا جو نفیسہ کو بولنے کی کوشش کرتے ہوئے ہو رہا ہوگا۔ ان بے حس ہاتھوں میں کانپتے ممتا کے جوش کو محسوس کیا جو مکرم کو سینے سے بھینچ لینے کے لئے بیتاب ہوں گے۔ وہ دم بخود کھڑا ان آنسوؤں کو دیکھتا رہا جو نفیسہ کے گالوں پر بہنے لگے تھے۔ اس کا دل چاہا کہ اپنی زبان کاٹ کر نفیسہ کی نذر کر دے لیکن بعض مرتبہ اپنوں کی بھی کچھ چیزیں پرائی ہو جاتی ہیں۔ اس کا یہ جذبہ بے سود ہی تھا۔

اس نے بڑی مشکل سے مکرم کو الگ کیا۔

اس رات وہ بہت دیر تک نہ سو پایا۔ دل کے قریب کوئی پھانس

سی تھی۔ جو رہ رہ کر کھٹک جاتی۔ وہ نفیسہ کے بالوں میں شانہ کرتا رہا۔ وہ جاگ رہی تھی۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ اس سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔

"کچھ کہنا چاہتی ہو نا؟" عادل نے پیار سے پوچھا۔

نفیسہ نے بیڈ لیمپ کی روشنی میں آنکھوں کے اشارے سے کہا۔

"ہاں۔"

عادل نے بجلی جلادی۔ اور اسے غور سے دیکھنے لگا۔ نفیسہ سامنے دیوار کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ عادل اٹھ کھڑا ہوا۔ دیوار کے تقریباً ہر حصے کو چھونے کے بعد پتہ چلا کہ وہ سامنے لگا کیلنڈر مانگ رہی ہے۔ وہ اسے نکال لایا۔ اب نفیسہ کے دونوں پاؤں ہل رہے تھے۔ اس اشارے کو سمجھنے میں عادل کو دیر نہیں لگی۔ اس نے وہ کیلنڈر نفیسہ کے پاؤں سے لگا دیا۔ اور جھک کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ بظاہر اس پر اپنے انگوٹھے سے کچھ لکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ عادل خوشی سے چونک پڑا۔ ترسیل کے اس طریقہ کار کے بارے میں اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ دوسرے دن ایک کارڈ بورڈ اس نے نفیسہ کے پاؤں کے پاس کھڑا کر دیا۔ نفیسہ نے لکھا کہ وہ نرس کو سمجھا دے کہ بورڈ پر جو نشان نفیسہ بناتی جائے وہ لکھتی جائے۔ اور اتنی سی بات سمجھنے کیلئے اسے آدھا گھنٹہ لگا۔ لیکن وہ خوش تھا کہ اب نفیسہ خود کو اتنا بے کس اور بے سہارا نہیں سمجھتی۔ اس میں ا   سمجھنے اور سمجھنے کی امنگ باقی تھی۔

اس روز سے مکرّم کی کہانی کا آغاز ہوگیا۔ نفیسہ اپنے انگوٹھے بورڈ پر الفاظ لکھتی جاتی اور نرس پنسل لئے کاغذ پر اتارتی جاتی۔

کچھ دنوں بعد نرس نے اس کے انگوٹھے اور انگلی کے درمیان چارکول رکھ دیا۔ اور بورڈ پر ایک کاغذ چپکا دیا۔ اس طرح کام بہت آسان ہوگیا۔ اور وہ گرتے پڑتے آڑھے ترچھے الفاظ جلد جلد نوٹ بک میں اتارتی گئی۔

"مکرّم سے کہو کہ اس کی ممی اس کے لئے بڑی لمبی کہانی لکھ رہی ہے"

اور اس خبر نے مکرّم کو اس کے ساتھیوں میں نمایاں جگہ دیدی۔

"تمہاری ممیاں تو سب سنی سنائی کہانیاں سناتی ہیں۔ میری ممی تو خود میرے لئے کہانیاں لکھتی ہیں" ایک روز اس نے اترا کر اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"تیری ممی تو بول بھی نہیں سکتی۔ ہاتھ بھی نہیں ہلا سکتی" ایک ننھے ظالم نے کہا۔ اس کی ماں نفیسہ کی سہیلی تھی۔

"لکھتی ہے جی وہ۔ پاؤں سے لکھتی ہے۔ بولنا اچھی بات تھوڑے ہی ہے۔ میرے ڈیڈی کہتے ہیں بہت بولنے والی عورتیں بور ہوتی ہیں۔"

"بور کیا ہوتا ہے؟" انور بولا۔

"BOAR بور۔ سور کو کہتے ہیں" انیل نے قابلیت دکھائی۔

"تو نے میری ماں کو سور کہا۔" انور نے مکرّم کا گلا پکڑ لیا۔

"چھوڑ دے مجھے۔ میں نے کب تیری ماں کو سور کہا ہے" مکرّم خود کو چھڑاتا ہوا بولا۔

"میری ممی کہتی تو۔ بہت بولتی ہے۔ تو نے ضرور اسی کو کہا ہوگا۔ گونگی کے بیٹے"

"بھاگو۔ بھاگو مس آرہی ہے" انیل نے مس گریگ کو آتے دیکھ کر خبردار کیا۔

اس روز جب مکرّم گھر پہونچا تو وہ حسب معمول اشتیاق سے بھاگ کر کہانی کی قسط سننے کے لئے نہیں پہنچا۔ کتابوں کا بیگ اپنے کمرے میں رکھکر دیر تک وہ کھڑکی سے سورج کی ڈوبتی کرنوں کو دیکھتا رہا۔ آج اسے اپنی ماں کے پاس جاتے جھجک سی ہو رہی تھی۔

دروازے پر کھٹکا ہوا۔ نرس کھڑی تھی۔

"ممی تمکو یاد کرتی ہیں بابا" نرس نے کہا۔ وہ خاموشی سے نرس کے ساتھ ہولیا۔

نفیسہ چپ چاپ بستر پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے خوبصورت چہرے کو دیکھکر کون کہہ سکتا تھا کہ وہ کسی موذی مرض میں مبتلا تھی۔ وہ اب کہانی کو آگے نہیں بڑھا سکتی تھی۔ کیونکہ آج اس کے پیروں کی جنبش بھی ختم ہو چکی تھی۔ اس کے پیر کے پاس کارڈ بورڈ اور چارکول بے جان اور ساکت پڑے ہوئے تھے۔ وہ اب کسی ہاری ہوئی فوج کے بے جان ہتھیاروں کی طرح تھے۔ نفیسہ نے آنکھیں گھما کر مکرم کو دیکھا۔ مکرّم نے اسے دیکھا۔ نفیسہ کی آنکھوں میں معذرت تھی۔ دکھ تھا۔ کیونکہ آج اسکی کہانی رک گئی تھی۔ کسی نے جیسے اندھیری کوٹھری میں جھانکتی کرن کا راستہ بھی بند کر دیا تھا۔ مکرّم مجرم سا اس کے پاس پہونچا۔ اس سے لپٹ کر اپنا سر اس کے ماتھے پر رکھدیا۔

"ممی اب میرے لئے کہانی مت لکھو۔ میں کہانی نہیں سنوں گا۔"

آئندہ شمارے میں

خصوصی مضامین: غالب اور تلسی داس۔ ستوقع شرکار، قرۃ العین حیدر، عرش ملسیانی، محمد حسن، علی عباس اُمید، سری نواس لاہوتی، تیر مسعود، کالی داس گپتا رضا، مظہر امام، بمل کشن اشک۔

ایجنٹ حضرات

سرکولیشن منیجر پبلی کیشنز ڈویژن، اولڈ سکریٹریٹ دہلی ۱۱۰۰۰۶ سے رجوع کریں

خلیل مامون
۱۲۴ ملے سرائے کالے خاں، نظام الدین ایسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

مبادیاتِ معانیات

فلسفۂ جدید میں وجودیت کے نظریات، ادب اور تھیٹر میں اہمال کی طرف مراجعت، اور جدید ریاستی سماج کے اصولوں اور عمل کا تضاد، تمام انسانی وجود کے لئے ایک دیگر نشاۃ الثانیہ کے بالکل ابتدائی اور عبوری عصر کی سی اہمیت رکھتے ہیں۔ اور یہ عصر ہمارے تمام تہذیبی سرمائے کی بنیادوں کے از سرِ نو مطالعہ، تحقیق اور تدوین و تطبیق کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس تحقیق و تطبیق میں مطالعۂ لسان اوّلین اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی وجہِ عمومی یہ ہے کہ ہماری تمام تہذیب اور ہمارے تمام تمدّن کے ارتقاء اور نشو و نما میں لسان کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ وجہِ خصوصی یہ ہے کہ دو جدید فلسفۂ لسان کے ماہرین، ارنسٹ کیسرر ERNST CASSIRER اور بنجامن لی وارف BENJAMIN LEE WHORFE کے نظریات کے مطابق کوئی مخصوص لسانی ڈھانچہ اس کے بولنے والوں پر، ان کے نظریات، اور اصولوں پر اور تقریباً تمام تمدنی زندگی پر قابلِ قدر اثرات رکھتا ہے۔ اس تمام بحث سے ہم "معانیات" کے مطالعہ کی اہمیت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

لسانی فلسفہ کے جدید ماہرین فلسفۂ لسان کے مطالعہ کو تین واضح حصوں میں تقسیم کرتے ہیں:-

اوّل: نتائجیت
دوئم: معانیات
سوئم: منطقی صرف و نحو۔

ان تینوں شاخوں کی تشریح اور توضیح اِس طرح ہے۔

نتائجیت کسی لسان اور اس کے قائل کے تجرباتی اور مشاہداتی تعلق کا مطالعہ کرتی ہے۔

معانیات محض الفاظ، جملوں اور فقروں کا ان اشیاء، افعال، حالات، واقعات، اور کیفیات کی منطقی اور حقیقی صداقت کا اور ان کے مربوط رشتوں کی تطبیق اور مطالعہ کا علم ہے جن کا کہ وہ الفاظ جملے یا فقرے حوالہ دیتے ہیں یا نمائندگی کرتے ہیں۔

منطقی صرف و نحو کے تحت لسان کے الفاظ، جملوں اور فقروں کا محض مفرد اور تجریدی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ یہاں لسان اور قائل اور لسان اور اشیا، افعال، حالات، واقعات، اور کیفیات کے رشتوں کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ بلکہ الفاظ اور جملوں کی طبقہ بندی، اور ان کے در و بست اور قواعدی تفریق کی تشریح اور توضیح کی جاتی ہے۔

معانی کا مطالعہ اس کی تطبیق اور حقیقی کائنات اور دیگر سماجی اور تمدّنی پہلوؤں سے اس کے رشتہ کی تحقیق محض فلسفۂ لسان تک محدود نہیں ہے۔ جدید دُنیا میں معنویت کی تلاش اور اس کی تطبیق، جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے، تمام علوم و فنون اور تمام انسانی وجود کا احصا کرتی ہے، ہر وہ شئے فعل، حالت، کیفیت اور تعلق جو کسی مفہوم، مطلب اور معنیٰ سے عاری ہے ہمارے حسّی تجربات اور علم کے دائرہ سے خارج ہے۔ اس لحاظ سے تمام علوم کی صداقت اور سچائی (اپنے وجود کے لئے) اپنی معنویت پر منحصر ہوتی ہے۔

معانی کیا ہیں؟ روزمرّہ زندگی میں ہم عام طور پر ان اشیاء، حالات، اعمال اور تعلقات کو بے معنی قرار دیتے ہیں جو ہمارے شعور کی حد سے باہر ہوں، مثلاً فقرہ "یہ دُنیا بے معنی ہے"، ایک طرف تو قائل کی شعوری بصیرت کی حد اور دوسری طرف دُنیا کی اشیاء، حالات، قائل سے اس کے رشتہ کے گنجلک اور تکثیری ہونے کی دلالت کرتا ہے۔ (اس فقرہ کے متعدد معنی نکل سکتے ہیں، میں نے صرف ایک کا اظہار کیا ہے) اسی طرح جب ہم کسی علمی نظریہ کو بے معنی قرار دیتے ہیں تو ہم اُس نظریہ اور اس سے متعلق حقائق یا اشیاء پر اس کے اطلاق اور تعلق کو یا تو سمجھ نہیں پاتے یا پھر ہمارے اپنے تجربات اور علم کی روشنی میں اس نظریہ اور اس کے اطلاق کی منطقی یا حقیقی صداقت پر ہمیں شبہ ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا بحث کے بعد عمومی سطح پر معانی کی تشریح یہ ہو سکتی ہے۔

"معانی اس رشتہ کی حقیقی یا منطقی صداقت کا عقلی تطابق ہے جو کسی شے، کسی حالت، کسی عمل، کسی منطقی نسبت اور لسانی جملوں، فقروں اور الفاظ کے درمیان قائم رہتا ہے۔"

یہی حقیقی یا منطقی صداقت، الفاظ اور جملوں کی ترسیل اور شعور کی بنیاد بنتی ہے۔

لسانی الفاظ کو بنیادی طور پر دو واضح طبقات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ وہ الفاظ جو مستقل معنویت کے حامل ہوں، اور جن کا ٹھوس یا تجریدی، اشیاء، حالات، کیفیات اور افعال وغیرہ سے تعلق ہو۔
۲۔ وہ الفاظ جو غیر مستقل معنویت کے حامل ہوں اور جن کا کسی ٹھوس یا تجریدی حقیقت سے تعلق نہ ہو اور جو محض مستقل معنویت کے حامل الفاظ کا منطقی یا حقیقی تعلق ظاہر کرتے ہوں۔

مستقل الفاظ کے زمرہ میں تمام اسماء اور صفات آتے ہیں۔ ان میں ضمائر کا شمار بھی کیا جا سکتا ہے۔ ان الفاظ کو توضیحی الفاظ کہا جاتا ہے۔

غیر مستقل الفاظ جن میں کہ افعال اور دیگر طبقات حرف ذ نحو آتے ہیں، چونکہ اسماء اور صفات کے تعلق کو ظاہر کرتے ہیں انھیں "منطقی نسبتیں" کہا گیا ہے۔

توضیحی معانی کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان کا ٹھوس تجزیہ تو کیا جا سکتا ہے لیکن معانی کی اصل اصطلاح کے مطابق ان کی تفسیر مشکل ہے۔

مثلاً! "سیب" رحیم" ندی" یا پھر گرم، سرد، ہرا، سرخ کے ہم محض تجزیاتی معانی بیان کر سکتے ہیں۔

اس کی تفصیل اس طرح سے ہے۔

سیب :۔ ٹھوس شئے، گول، سرخ، نرم، میٹھا۔

رحیم :۔ اس لفظ کا تجزیہ محض اسلامی الوہیات تک محدود ہے۔

ندی :۔ ٹھوس مائع شئے، پانی، حرکت، بے رنگ وغیرہ۔

اس کے برخلاف "منطقی نسبتیں" اسماء اور صفات کے ربط اور تعلق کا اظہار کرنے کے نشان ہیں۔ توضیحی الفاظ یا نشانات کی معنوی صداقت ان کے حقیقی وجود اور ہمارے اپنے علم کی صداقت پر مبنی ہے۔ "منطقی نسبتوں" کی صداقت کا دار و مدار اس تعلق یا نسبت کی صداقت پر مبنی ہے جس کا کہ وہ اظہار کرتے ہیں۔

لغت اور معانی

ہمارے علمی معاشرہ میں کسی لفظ کے معانی کی تلاش محض لغت تک محدود ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ معانی جو لغت کا خاصہ ہیں ان معانیاتی پہلوؤں سے مطابقت رکھتے ہیں کہ جنہیں معانیات، معانی کی روح سمجھتی ہے۔ اس آئینہ میں دیکھیں تو لغوی معانی کی تشکیل محض کسی لفظ کے ہم معنٰی الفاظ کے شمار کرا دیئے جانے سے ہی پوری ہو جاتی ہے۔ مثلاً لغات میں اگر معانی کا مطالعہ کیا جائے تو اس کی نوعیت اس طرح ہوگی۔

سبز :۔ ہرا، اخضری، وغیرہ وغیرہ۔

سیب :۔ ایک پھل۔

تعلق :۔ ربط، میل، سلسلہ وغیرہ۔

جبکہ معانیات کے بنیادی اصول اس امر کا اقتضا کرتے ہیں کہ اشیاء، حالات، افعال، واقعات اور کیفیات کے لفظی علائم کے وجودی، زمانی، غیر زمانی، مکانی پہلوؤں کی حقیقی یا منطقی صداقت کا تجزیہ کیا جائے۔ ان تمام باتوں کو ملحوظ رکھ کر اگر الفاظ کی تشریح کی جائے تو اس کی شکل یوں ہوگی۔

سبز :۔ صفت۔ بصارتی کیفیت، سات حقیقی رنگوں میں سے ایک گہرا، روشنی سے منعکس، دوسرے رنگوں سے مختلف، اشیاء جاتی۔

سیب :۔ اسم، ٹھوس شے، ایک پھل، گول، سرخ، نرم، اندر سے سفید، میٹھا۔

تعلق :۔ منطقی نسبت، زمانی و مکانی تصور۔

اس کے علاوہ معانی کی اُن کے صداقتی منصب کے اعتبار سے بھی تفریق کی جا سکتی ہے۔ بنیادی طور پر معانی کی صداقت دو طرح کی تسلیم کی گئی ہے۔

۱۔ حقیقی صداقت۔

۲۔ منطقی صداقت۔

حقیقی صداقت، ہمارے حسی تجربات کے دائرہ میں وجود رکھتی ہے۔ منطقی صداقت کا ہمارے تجربات پر انحصار نہ ہو کر الفاظ و جملوں کے منتجی پہلوؤں پر دار و مدار ہوتا ہے۔

اس کی تشریح اس طرح سے کی جا سکتی ہے۔

ذیل کے جملے ملاحظہ ہوں۔

۱۔ مثلاً :۔ "ہندوستان، ایک عظیم ملک ہے"

۲۔ "ہندوستان، ہندوستان ہے"

ان دو جملوں پر اگر غور کیا جائے تو حقیقی صداقت، اور منطقی صداقت کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ اوّل الذکر جملے میں ایک تجرباتی حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے، جو کہ ہندوستان کے ماضی، اس کے تمدن، اور اس کی رنگا رنگی کے تجرباتی خاکے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے برعکس موخر الذکر جملہ محض ہندوستان کے ہندوستان ہونے کی تصدیق کرتا ہے۔ اس جملے کا ہندوستان کی کسی صفت سے علاقہ نہیں۔ یہ منتجی منطق ہے "قانونِ یکسانیت" LAW OF IDENTITY. یعنی "الف۔ الف ہے" پر اپنی صداقت کا انحصار رکھتا ہے۔ تو اس اعتبار سے معانی مشاہداتی اعتبار سے صحیح یا غلط، یا منطقی اعتبار سے صحیح یا غلط ہو سکتے ہیں۔

تقسیمی تجزیہ

الفاظ کی معنویت کا انحصار، حقیقی صداقت، اور منطقی صداقت کے علاوہ جملوں اور فقروں میں ان کے دروبست پر بھی مبنی ہوتا ہے۔ بہت سے ایسے منطقی فطرت کے الفاظ جو توضیحی الفاظ کا تعلق ظاہر کرتے ہیں، مجرّد طور پر خود بے معنی ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ الگ الگ الفاظ کے ساتھ اپنی نشست و برخاست کے ساتھ ساتھ ان کی معنویت میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ مثلاً۔ ذیل میں حرفِ ربط "سے" کی مختلف جملوں میں معنوی تبدیلی نمایاں ہے۔

۱۔ شیام دفتر سے آیا۔

۲۔ شیام مجھ سے ملا۔

۳۔ میں شوق سے پڑھتا ہوں۔

جملۂ اوّل میں "سے" شیام کی آمد کی جہت کی نشاندہی کرتا ہے جبکہ

جملہ دوئم میں" مجھ سے" "کا" "سے" اس سے مختلف معنی کا حامل نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ، ضمیر کی مفعولی حالت" مجھ" ہے جو یہاں " سے" کو جہت کا نشان نہ بنا کر خود اپنی معنویت میں اضافہ کرنے کا آلہ بناتا ہے۔ اب جملہ سوئم کو لیجئے یہاں اسم کیفیت شوق،" سے" "کو" جملۂ اول اور دوئم کے معانی میں استعمال نہیں کرتا۔ یہاں "سے" اصلاً بطور، حرف ربط کے آتا ہے اور قائل اور اس کے فعل، "بڑھنے" اور کیفیت "شوق" کی حقیقی صداقت کی "منطقی نسبت"، کا کام کرتا ہے۔ ان تینوں جملوں میں "سے"، کا معنوی اختلاف ہی معانیات کی اصطلاح میں الفاظ کی تقسیم کا ایک پہلو کہا جاسکتا ہے۔ معانی کی تشکیل میں (جیسا کہ ہم نے دیکھا) الفاظ کی تقسیم کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے معنوی تقسیم کے تجزیہ کی تفاصیل اس طرح ہیں۔

۱۔ عنصر: تقسیم معانی کا اول پہلو یہ ہے کہ ہم کسی بھی فقرہ یا جملے کو اس طرح سے الگ الگ حصوں میں بانٹ سکتے ہیں جن میں کہ ہمیں ایک حصہ کی آمد دوسرے حصہ کی آمد سے متعلق نظر آتی ہو۔ یہی حصے وہ مجرد عناصر ہیں جو کسی حد تک منقسم ہو سکتے ہیں یا ایک مخصوص حالت میں جملوں یا فقروں میں نمودار ہوتے ہیں۔ اور یہ بات بھی خصوصی اہمیت کی حامل ہے کہ جملوں یا فقروں کا ہر حصہ انہی عناصر کی خصوصی ترکیب کا نتیجہ ہوتا ہے۔

۲۔ مماثلت: تقسیم معانی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ کچھ "عناصر" ایسے ہیں جو اصطلاحًا دوسرے "عناصر" سے مشابہت رکھتے ہیں۔ اس طرح سے کہ ہم انہیں معانی کا ایک طبقہ قرار دے سکیں۔

۳۔ انحصار: کچھ "عناصر"، سلسلہ وار کئی دوسرے "عناصر" پر منحصر ہوتے ہیں۔ مثلاً بادشاہت، شاہی، شاہانہ وغیرہ۔ اپنا معنوی انحصار "بادشاہ" پر رکھتے ہیں۔

۴۔ متوازیت: بہت سے ایسے "عناصر" بھی ہیں جن کی آمدی حالت اور دوسرے "عناصر" کی آمدی حالت میں بڑی مطابقت پائی جاتی ہے۔ مثلاً بہت سے اسمائے کیفیت کے آخر میں "ت" لگتا ہے جیسے: بادشاہت، غنیمت، شیطنت وغیرہ وغیرہ، لیکن اس کے متوازی بہت سے دیگر اسمائے کیفیت میں "ی" بھی لگتا ہے۔ مثلاً فقیری، امیری، ضعیفی وغیرہ وغیرہ۔

لیکن ایک بات ملحوظ رکھنی چاہئے کہ یہ تمام تقسیمی اصول محض ایک خاص لفظی و لسانی علاقہ میں ہی صادق آتے ہیں۔ علاوہ ازیں، لسان میں معنویت ان نظریات، تصورات، جذبات، اور احساسات سے بھی ہم آہنگ ہوتی ہے جو انسان، وجود اور عدم وجود، کائنات اور اس سے متعلق اشیا، زمان و مکان، اور اسی طرح کے دیگر حقائق کے بارے میں اور ان تمام کے باہمی رشتوں کے متعلق رکھتا ہے۔ لسان میں معنوی تبدیلیاں انہیں نظریات، تصورات جذبات اور احساسات کے تبدل کی وجہ سے عمل میں آتی ہیں، جو تاریخی شعور کے ارتقا کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ مثلاً آج کی نئی طبیعی فکر سے آشنا کوئی ذہن، لفظ "آسمان" کی صداقت کو قبول نہیں کرسکتا۔

مابعد اللسان

معانی کی تفسیر میں " مابعد اللسان" کا استعمال اور اس کی اہمیت ناگزیر ہے۔ کسی ایک لسان میں اسی لسان کی معانیات کا مطالعہ چونکہ بعض اوقات وقت طلب اور کبھی کبھی ناممکن بھی ہوتا ہے، اسی لئے ماہرین لسانیات نے معانیات کے مطالعہ کے لئے" مابعد اللسان" کی ضرورت پر بہت زور دیا ہے اور معانی کی مختلف اصناف و اصطلاحات وضع کر کے ان کے منطقی اور حقیقی علائم اور نشان مقرر کئے ہیں۔ اس ضمن میں رڈولف کارنیپ RUDOLF CARNAP کی تحقیقات و تطبیقات علم اللسان میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ "مابعد اللسان"، کے مطالعہ میں علامتی منطق SYMBOLIC LOGIC اور ریاضی کا مطالعہ لازمی اور ناگزیر ہے۔ اس سطح پر" مابعد اللسان" تمام السنہ کی معانیات کے حقائق کلی کے مطالعہ کیلئے مخصوص ہے۔ تمام السنہ کے لئے ایک واحد" مابعد اللسان"، کی موجودگی کے باوجود ہم اس کسی بھی لسان کو" مابعد اللسان"، کہہ سکتے ہیں۔ جس میں کہ ہم معانی کی تشریح و تصریح کرتے ہیں۔ جس لسان کے معانی کی ہم تشریح کرتے ہیں، اسے "مفعول لسان" کہتے ہیں۔ مثلاً اگر ہم انگریزی میں اردو کے معانی کی تشریح کرتے ہیں تو انگریزی" مابعد اللسان" ہوئی اور اردو "مفعول لسان"، اگر ہم کسی ایک لسان ہی میں اسی لسان کی معانیات کا مطالعہ کریں تو وہ لسان بیک وقت" مابعد اللسان" اور "مفعول لسان" کہلائے گی۔

مختصراً کسی لسان کی معانیات کے مطالعہ کے لئے۔

۱۔ معانیات اور قواعد صرف و نحو کا فرق۔

۲۔ معانیات میں نظریۂ معانی اور لغوی معانی کا فرق

۳۔ معانیات میں تقسیم عناصر کی اہمیت اور بالآخر

۴۔ معانیات کے مطالعہ میں "مابعد اللسان" کی تشکیل، اس کی افادیت اور اہمیت کا لحاظ، ناگزیر اور لازمی ہے۔

قارئین کا شکریہ

اُردو نمبر اور اس کے ضمیمے کے بارے میں ہمیں بے شمار قارئین نے خطوط لکھے ہیں جن میں نہ صرف ان شماروں کی تعریف و تحسین ہے بلکہ اُن کی خامیوں کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے اور ان کو دُور کرنے کے لئے مفید مشورے بھی دیئے گئے ہیں۔ ہم نے حتی الوسع ان خطوط کی رسید بھی بھیجی ہے۔ لیکن ان تمام خطوط کی فرداً فرداً رسید بھیجنا ہمارے بس کے باہر ہوتا جارہا ہے۔ بہر حال جن قارئین نے بھی ہمیں اس سلسلے میں خطوط بھیجے ہیں۔ ہم ان سب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انہیں یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ان کے خطوط ہمارے پاس محفوظ ہیں اور اگر ان شماروں کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے گا (اور یہ اگر" محض کاغذ کی کمیابی کی وجہ سے ہے)، تو ان خطوط کا پورا فائدہ اٹھایا جائے گا۔

ادارہ

غزلیں

خالد حافظی
محلہ لودھے گنج، باغ آئینہ بی بی لکھنؤ (یوپی)

سفر طویل تھا کتنا یہ کیا کہوں لیکن
تھکا ہوا ہوں بہت ہے ابھی تکان مجھے
خلوص جسم کے شیشہ گری سے بڑھکر ہیں
بلا رہی ہے تخیل میں اک نئی اڑان مجھے
تمہارا غم جو ہے سارے غموں کا دیباچہ
بنا گیا ہے حقیقت میں اک چٹان مجھے
ذرا سا آب و ہوا تک بگاڑ سکتی ہے
ملا ہے خاک کے پردے میں وہ مکان مجھے
مرا شعور ہو پختہ، مرا قلم تازہ،
عطا کرے جو خدا اُردو کی زبان مجھے

اسد ظہیر
محلہ آبگلہ - ڈاک خانہ بنیاد گنج، گیا (بہار)

فرصت جو دیتی گردشِ دوراں کبھی کبھی
کرتے خیالِ یار کو مہماں کبھی کبھی
ناکردہ جرم کا بھی وہ کرتے ہیں اعتراف
رہتے ہیں اس طرح بھی پشیماں کبھی کبھی
طوفانِ رنج و غم میں جو بجھتے ہیں سو چراغ
ہوتی ہے ایک شمع فروزاں کبھی کبھی
اک خار ہی نہیں کہ اُلجھتا رہا مُدام
پھولوں نے بھی کیا ہے ہراساں کبھی کبھی
ایسے مقام بھی اسد آئے ہیں راہ میں
اُن سے ہمیں رہے ہیں گریزاں کبھی کبھی

مختار شمیم
لکچرر شعبہ اُردو، گورنمنٹ گرلز کالج و موتی طبلہ، اندور، (ایم پی)

فریبِ حسنِ نظر کا دکھائی دیتا ہے
ہمیں ہر ایک جو اچھا دکھائی دیتا ہے
شعورِ غم کے دریچے تو وا کرو یارو!
فصیلِ شب پہ اُجالا دکھائی دیتا ہے
یہاں سب اپنی صلیبیں اُٹھائے پھرتے ہیں
ہر ایک شخص مسیحا دکھائی دیتا ہے
ہمارے درد کو پڑھو جو کھلی کتاب ہیں ہم
ہر ایک شخص یہ کہتا دکھائی دیتا ہے
شگفتہ آتا ہے فکر و فن نکھار کریں
یہی نکھار کا رستہ دکھائی دیتا ہے

مجید فیض آبادی
۹، انصاری مارکیٹ، دریا گنج دہلی ۱۱۰۰۰۶

لوٹے ہیں بزم میں اغیار دیکھنا
یہ بھی ہوئے ہیں غم کے طلبگار دیکھنا
گل کاریاں چمن کی چمن سے پرے بھی ہیں
پھولوں کا رنگ آج سرِ دار دیکھنا
اہلِ نظر کا کام محبت کا کام ہے
اہلِ ہوس کی گرمیِ بازار دیکھنا
اے محتسب سنبھال کے رکھنا قدم یہاں
میخانے کی فضا ہے شرر بار دیکھنا
کاشی کی صبح، شام اودھ اشکبار ہے
اپنا وطن یہی ہے دلِ زار دیکھنا
ہے تلخیٔ حیات لئے ساری کائنات
گر ہو سکے تو مجھ کو بھی اک بار دیکھنا

صبا محمد رسولی
لکچرر اہیر ڈگری کالج شکوہ آباد (یوپی)

یہ نصیب اپنا اپنا جو پہنچ سکے جہاں تک
کوئی گردِ کارواں تک کوئی میرِ کارواں تک
مجھے پاس تھا چمن کا نہ کھلی میری زباں تک
مرا جل گیا نشیمن نہ اُٹھا کہیں دھواں تک
تری جستجو میں ایسی کئی منزلوں سے گذرے
کبھی بڑھ گئے یقیں سے کبھی رہ گئے گماں تک
مرے عرضِ حال پر جو ابھی مسکرا رہے تھے
نہ سنا گیا پھر اُن سے کوئی حرفِ داستاں تک
مجھے احتیاط لازم مجھے ضبط بھی گوارا
ترا غم رہے سلامت مری مرگِ ناگہاں تک
رہِ جستجو میں قیصر مجھے یہ بھی دیکھنا ہے
مرا ساتھ دے سکے گی مری تشنگی کہاں تک

سراج الحسن سراج ادیبی
شعبۂ اُردو، مہاراجہ کالج، میسور (کرناٹک)

نہ گھبرائے جو آفاتِ جہاں سے
الٰہی میں وہ دل لاؤں کہاں سے
ہوا ہے واقعہ دلدوز کوئی
بھڑک اُٹھے ہیں شعلے آشیاں سے
چلا جاتا نہیں ہے دو قدم بھی
بچھڑ کر رہ گیا ہوں کارواں سے
نظر آتی ہے محفل سونی سونی
یہ کون اُٹھ کر گیا ہے درمیاں سے
نہ ہوگی کیا یہ دنیا تنگ ہم پر
اگر اُٹھ جائیں تیرے آستاں سے
جو دل جل کر ہوا ہے خاک اُس کو
سراج اب ڈھونڈ کر لاؤں کہاں سے

او۔ پی۔ شرما سارتھی
۵۹۔ جین بازار (وجے گڑھ) جموں توی

بعد کی قید

کسی بھی آواز سے دل میں بے چینی کی لہر پیدا ہو جاتی ہے۔ سیڑھیاں جو عمر گزشتہ بنا ہو چکی ہیں چڑھتے ہوئے ان کو اب ہر روز یہ فکر آ گھیرتی ہے کہ اب ان کی عمر کی سیڑھیاں ختم ہیں۔ ایک آدھ سیڑھی پر قدم رکھنا باقی ہے مگر قدم رکھتے ہی اوپر جا پہنچتا ہے، اس بوڑھے بیل کو ٹوٹی ہوئی ٹانگ یا بازو لے کر گھسٹتے رہنا ہے۔ ادھ مرا ہو کر دم سسکتا ہے کوئی بات نہ پوچھے۔ پھر بیچ ہی آخری سیڑھی پر پہنچ کر وہ اپنے اُس کمرے کے دروازے کی چوکھٹ کو مضبوطی سے پکڑ لیتے ہیں جو برسوں تک ڈیوڑھی کے طور برتا جاتا رہا ہے۔ کئی بار دل اس طرح دھڑکتا ہے کہ ٹھنڈا پسینہ آکر شرابور کر دیتا ہے۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ بڑی مشکل سے وہ تخت پوش تک پہنچ سکے ہیں۔ تخت پوش پر دوہری چادر اس لیے بچھی ہوئی ہے کہ اس کا پھٹا حصہ نظر نہ آئے۔ دوسرے تخت پوش کی سختی جسم کو کچھ کم ہو کر چبھے۔

وجود کو ڈھیلا چھوڑ کر، ہاتھوں کی ہتھیلیوں پر کندھوں کا بوجھ ڈال کر، گردن ایک طرف لڑھکا کر وہ فرش کی درازوں کو پہروں ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رہتے ہیں۔ رفتہ رفتہ اُن کے ذہن میں ماضی کے بند دریچے کھلتے جاتے ہیں۔ سائیکل پوری رفتار سے سڑک کی ڈھلان میں لڑھکتا جا رہا ہے۔ سامنے کچھ دور، بڑی سڑک کے اس پار، ریشم گھر کی چمنی یک بیک چاموڑ، ببول اور آم کے پیڑوں میں سے اوپر اٹھ آتی دکھائی دیتی ہے۔ پھر ایک پھاٹک . . . جلدی۔ جلدی۔ سلام بابو جی — کتنے۔ آنا ولے قدم . . .

آ گئے آپ ؟

جی۔ جی ہاں

خیالوں کی ڈور ٹوٹ گئی ہے۔ سرے ٹوٹ کر دور جا گرے ہیں۔ ایک سرے کے ساتھ ان کی جوانی کے تیس برسوں کا تل تل کر کے اپنا بندھا ہوا ہے۔ دوسرا سرا اُس دھوئیں کو باہر نکالے گا جو دن بہ دن چھاتی میں بڑھ رہا ہے۔ وہ سرا اس عمر کو بار بار چھونے کی سعی کرتا ہے۔

کھڑکی میں سے تیزی سے کوئی گزر گیا ہے۔ پہچانا نہیں گیا۔ بغل کے کمرے کا دروازہ بجا ہے۔ ریڈیو نے شور برپا کر دیا ہے۔ وہ جان گئے ہیں کون ہے اس کمرے میں۔ کچھ دیر تک وہ انتظار میں رہتے ہیں اور ہر آہٹ سنتے ہیں۔ اس امید سے کہ اُن سے پوچھا جائے گا۔ "آپ صبح سویرے گھر سے نکلے تھے۔ اب آ رہے ہیں؟ سب فکر مند ہو گئے تھے۔ آپ کی عمر بھی اب کون سی ہے۔ کہیں کوئی حادثہ پیش آ جائے تو؟ خیر چھوڑیئے۔ آپ نے چائے نہیں پی ہو گی ابھی بنوا کر بھجوا دیتے ہیں۔"

نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں ہوتا۔ کوئی بھی پوچھنے نہیں آتا۔ ویران آنکھیں دائیں بائیں کلاک کے پینڈولم کی مانند گھومتی رہتی ہیں۔ دفعتاً اُنہیں بات یاد آتی ہے۔ کسی ڈاکٹر کی کہی ہوئی۔ ایسے حالات پہلے کچھ کم تھے۔ اب جلدی جلدی ہر بات سامنے آتی جاتی ہے تو وہ بات شدت سے یاد آنے لگتی ہے۔

چھوٹے بچے روتے ہیں لیکن آنسو نہیں اُترتے۔ کیونکہ ایک خاص مدت تک بچوں کی آنکھوں کو پانی مہیا نہیں ہوتا۔ وہ مسکراتے ہیں۔ کتنی یکسانیت ہے۔ میں بھی بغیر آنسوؤں کے روتا ہوں۔ فرق اتنا ہے کہ میرے آنسو سوکھ چکے ہیں۔

"آپ کہاں تھے؟"

بیٹے کے الفاظ کے تیز نشتر چھاتی میں پہنچ کر اُنہیں کاٹنے لگتے ہیں۔ وہ نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھتے ہیں۔ مُنہ سے کہتے کچھ نہیں۔ وہ جبڑوں کو کس کر دوبارہ روکھے لہجے میں کہتا ہے "گیتا اور میں باہر جانے کا پروگرام بنائے ہوئے تھے۔ آپ کا انتظار کرتے رہے۔ جب دوپہر ڈھل گئی تو امید چھوڑ دی۔" وہ جانے لگتا ہے۔ پھر ایک پاؤں دہلیز کے باہر اور ایک اندر رکھ کر کہتا ہے "آپ کو جانا ہو تو کہہ کر جایا کریں۔ ہم کوئی اور انتظام کر کے جا سکتے ہیں۔"

"کوئی اور انتظام؟" وہ سر جھٹک دیتے ہیں۔ پھر بھی یہ بات ان کے منہ میں زہر گھولتی رہتی ہے۔ زہر بڑھتا جاتا ہے۔ پھر اُن کے باطن میں ایک آگ آہستہ آہستہ سلگتی محسوس ہوتی ہے۔

بالشت بھر کے صحن کو، جس کے دو طرف دو چھوٹے کمرے ہیں، پہلی چھت کے برآمدے نے گھیر کر اندھیرا کر رکھا ہے۔ نیچے بڑا بیٹا

اور اس کی بیوی رہتے ہیں۔ او پر چھوٹا اور وہ بستر کی پٹی پر سر ٹکائے وہ کھڑکی کے پار دیکھ رہے ہیں۔ اس کمرے کا بلب جل گیا ہے۔

گیتا آکر چائے کا کپ رکھ گئی ہے۔ ان کا دل چاہتا ہے کہ چلا کر کہہ دیں ہمیں چار بجے گھر پر نہیں تھا۔ لیکن مجھے آتے ہوئے بہر ہوگیا ہے۔ چائے کا وقت ہے کیا؟ لیکن کہیں کس کو۔ گیتا جا چکی ہے۔ وہ کپ اٹھاتے ہیں، کانپتے ہاتھوں سے منہ تک لے جاتے ہیں۔ وہ گرم چائے پینے کے عادی ہیں۔ چائے ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ پھر ایک ٹیس اٹھتی ہے

تخت پوش کے سرہانے پرانی تپائی پڑی ہے جس پر چھیڑے سے ڈھکا ہارمونیم پڑا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ اٹھتے ہیں۔ باجے کا ڈھکن ہٹا کر اُسے جھاڑتے ہیں۔ بکسے کا لاک بڑا سخت ہوگیا ہے۔ انگوٹھے کے ناخن سے کھلتا نہیں۔ باجے کو اٹھا کر تخت پوش پر رکھ لیتے ہیں چاقو کو ڈھونڈتے وقت دل کو ایک اور جھٹکا لگتا ہے۔

جب کبھی میں ہارمونیم سے دل بہلانے کی سوچتا ہوں۔ ان میں سے کوئی آکر ٹوک دیتا ہے۔ اس کے بجنے کو یہ لوگ شور اٹھنا سمجھتے ہیں۔ ناک منہ چڑھاتے ہیں۔ یہ تو گدھے ہیں۔ موسیقی ایک عظیم فن ہے۔ کیسے سیکھا جاتا ہے۔ یہ کیا جانیں۔ فقیر بننا پڑتا ہے۔ کتنا کچھ تجنا پڑتا ہے۔ منہ پر غصے کی لکیریں گہری ہوجاتی ہیں۔ تیوری تن جاتے ہیں۔

چاقو مل گیا ہے۔ پرانا زنگ آلود ہے۔ ایک بار دورے پر ... گئے تھے۔ وہاں سے لائے تھے۔ چاقو کھل نہیں رہا تھا۔ پھٹے ہوئے رومال سے پکڑ کر کھولتے ہیں۔ سر بھاری ہوجاتا ہے۔ جیسے ٹانگوں کی کمزوری کا احساس غبار بن کر سر کو چڑھ گیا ہے۔

ہارمونیم کے بریکٹ میں چاقو کی دھار پھنسا کر جھٹکا دیتے ہیں۔ اس طرف ہارمونیم کا پنکھا کھل جاتا ہے۔ پنکھے میں چھپ کر بیٹھے ہوئے کیڑے بھاگنے لگتے ہیں۔ ادھر انگلی کٹ جاتی ہے۔ خون کسا کسا سا بہتا ہے۔ چاقو کی دھار کو بغور دیکھتے ہوئے سوچنے لگتے ہیں۔ اتنا تیز نہیں تھا، انگلی کیسے کٹ گئی!

انگلی کے پور میں سرسراہٹ ہونے لگتی ہے۔

"باوجی ۔ اس بلا کو رہنے دیجئے۔ یہ ہنگامہ نہ کیجئے اس کی آواز سن کر آپ کے صوبے دار صاحب بھی چلے آئیں گے۔"

صوبے دار صاحب ریٹائرڈ ہیں۔ سچ پوچھئے تو وہی ان کے درد و غم کے شریک رہ گئے ہیں۔ جسم ابھی توانا ہے۔ ان کو بھجن اور پرانی کافیاں یاد ہیں۔ جب بھی آتے ہیں گاتے تو کیا ہیں آواز بہت بیچ میں ہے۔ اور گھر گھری بھی گھنٹوں مشق کرتے ہیں۔ پاس پڑوس والے جان جاتے ہیں کہ صوبے دار صاحب موڈ میں ہیں۔

بڑے لڑکے نے ہارمونیم بند کرکے تپائی پر رکھ دیا ہے۔ اور یہ کہتا ہوا باہر نکل جاتا ہے "میرے دوست گھر پر آ رہے ہیں" جاتے ہوئے وہ دروازہ بھی بند کرتا گیا ہے۔

اُن کے دل میں پہلے ہی سے بہت کچھ جمع ہے۔ جس آدمی کو روز ایک ٹھوکر لگتی ہو اور خون بہہ نکلتا ہو اگر چھوٹی ٹھوکر لگے تو خوشی ہونی چاہئے۔

میں اگر کچھ کہتا تو جواب میں خدا جانے کیا کفر تول دیتا۔ یہ تسلی بھی دھوئیں کا ایک بگولا اٹھا دیتی ہے۔

میں کیسی زندگی جینے پر مجبور ہوگیا ہوں؟

وہ ہر اُس واقعے کے بعد خود سے پوچھتے ہیں۔ جو کالی سیاہی کی بھری دوات کی مانند چھلک کر اُن کے دل کے اوراق پر بکھر جاتا ہے۔

جانے کیوں؟ وہ "میں" کے بارے میں جب سوچنے لگتے ہیں۔ تو محسوس کرتے ہیں کہ اُن کے لمبے چوڑے جسم کی مشین میں "میں" نام کا کوئی پرزہ ہے جو گھِس گھِس کر ناکارہ ہوگیا ہے۔ اب کام نہیں دے سکتا۔

کھڑکی سے باہر دیکھتے ہیں۔ مندر کے کلس کا دھندلا سا عکس باقی گیا ہے۔ اندھیرا اُتر رہا ہے۔ دور بھی اور قریب بھی۔ کھنڈر میں سے سر نکالے جو درخت صلیب نما بجلی کے کھمبے کو پہنچتا ہوا نظر آتا ہے اس کے پتے بھی سوکھ کر لٹک گئے ہیں۔ آنکھیں بند کرکے وہ لمبی سانس لیتے ہیں۔ سانس بوجھل محسوس ہوتی ہے جیسے قریب ہی کہیں دیودار کے پرانے شہتیر سلگ رہے ہوں۔ پھر انہیں محسوس ہونے لگتا ہے کہ گلے کے نیچے دور تک کوئلے بھرے ہوئے ہیں۔ پتھر کے کوئلے ڈھانچے کے اندر تارکول تپتا ہوا ہے۔ اندر باہر سیاہ ہوچکا ہے۔ گلا دُکھتا رہتا ہے۔ گرم سانسیں نکلتی رہتی ہیں۔ ریشم گھر کی چمنی کی مانند۔

کتنے بج گئے ہیں؟ وہ طاقچے میں پڑے ٹائم پیس کی طرف نگاہ اٹھاتے ہیں۔ سوئیوں کو گھورتے ہیں۔ جو پچھلے دو ماہ سے سات بجا رہی ہیں۔ انہوں نے بڑے سے کہا تھا "ٹائم پیس بند ہوگیا ہے" بڑے نے چلا کر جواب دیا تھا "دن میں بیس بار اگر آپ کو دھیان آجائے تو بیس بار اسے چابی دے دیتے ہیں۔ یہ بند رہے تو اچھا ہے"

اندھیرے نے اپنے کھونٹے گاڑ لئے ہیں۔ گلی کی جانب کھلنے والی کھڑکیاں اندھی ہوگئی ہیں۔

پژمردہ سا زرد بلب اُن کے سر پر جل گیا ہے۔ چند لمحوں تک

وہ بلب کو دیکھتے ہیں۔ پھر طاقچے میں رکھی پرانی جلد کی موٹی کتاب اٹھا لیتے ہیں۔ عینک لے کر گھڑی ساز کی طرح فوکس کر کر کے الفاظ کو ڈھونڈنے لگتے ہیں۔ سیڑھیوں میں قدموں کی آہٹ سن کر ہلکا سا جھٹکا لگتا ہے۔ جب بھی بڑا یا چھوٹا انہیں ہاتھ میں کتاب پکڑے ہوئے دیکھتا ہے تو سختی سے ان کے قریب آکر کتاب چھین کر بند کرتا ہوا کہہ دیتا ہے:۔

"ہر وقت کتابوں سے مغز پچی کرنے کا کیا مطلب ہے۔ اب نہ تو اسکول، کالج جانا ہے۔ نہ ہی کسی امتحان میں بیٹھنا ہے۔"

لیکن ایسا ہوتا نہیں۔ گھونگھٹ نکالے ہوئے گیتا سامنے کھڑی ہے۔ شاید کھانے کے لئے کہہ رہی ہے۔

"یہیں لا دو۔ کھا لوں گا!"

گیتا لوٹ جاتی ہے۔ کھانے کی بات سنتے ہی گلے تک کچھ بھرا ہوا محسوس ہوتا ہے انہیں۔ شاید کالی سیاہی؛ یا پتھری کوئلے؛ یا تارکول؛ کئی طرح کے خیالات بے چین کرنے لگتے ہیں۔ یہ لوگ مجھ پر ترس کھاتے ہیں؟ نہیں۔ لوک لاج رکھ رہے ہیں۔ ایسا بھی نہیں اس لئے کہ مجھے چالیس، پچاس روپے پنشن کے جو ملتے ہیں ان سے تو میری دوائیاں ہی چلتی ہیں۔ یہ لوگ مجھے کھانا دے کر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ہمیں آپ سے کچھ لالچ نہیں۔ ہم آپ جیسے کئی ایک کو کھلا سکتے ہیں۔

کھاتے وقت نوالہ ہاتھ میں رہ جاتا ہے۔ سوچتے ہیں یہ لوگ میرا کہنا نہیں مانتے۔ دکھ سکھ کے شریک نہیں ہیں۔ نہ سنتے ہیں۔ بات تک نہیں پوچھتے۔ یہ روٹی نہیں، زہر ہے زہر۔

دو روٹی کھا کر ہاتھ دھونے لگتے ہیں وہ۔ تھالی میں بچی ہوئی دو روٹیوں کو دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں۔ ابھی شور مچ جائے گا کہ روٹی چھوڑ دیتے ہیں۔ پہلے سنا نا چاہئے اتنی ہی پکائی جائے۔ آٹا کیا بھاؤ مل رہا ہے!

کانپتے ہوئے ہاتھوں سے وہ روٹیاں اٹھا لیتے ہیں اور طاقچے میں کتاب کے پیچھے چھپا دیتے ہیں۔

روٹی کھا کر دوا لے کر انہیں چہل قدمی کرنی پڑتی ہے۔ کمرے میں ٹہلنے لگے۔ ہی کچھ ہی دیر ٹہل کر تھک جاتے ہیں۔ انہیں ٹانگیں اپنی لگتی ہیں اور ان پر لدے ہوئے جسم کا بوجھ پرایا۔ تخت پوش پر بیٹھتے ہیں کہ بڑا لڑکا ہاتھ میں خط پکڑے کھڑا دکھائی دیتا ہے۔

"بابو جی آپ کا خط۔"

خط کھلا ہے۔ پہلے ہی سے۔ شاید انہوں نے پڑھ لیا ہے۔ خط ان کی بڑی لڑکی ترپتی کا ہے۔ وہ کہیں کبھی مرے بابو جی کو بھلاتی نہیں۔

"پڑھ کر سنا دو" وہ کہتے ہیں

"آپ کا ہے خود پڑھ لیجئے۔"

وہ مسکرا کر بلب کو دیکھتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں: "مجھ سے پڑھا نہیں جاتا۔"

لڑکا خط کو بند کر دیتا ہے "لکھا ہے۔ ترپتی آئے گی۔"

خوشی کی ہلکی سی تہہ ان کے چہرے پر یک بیک چڑھ جاتی ہے۔

"میری بچی آ رہی ہے۔"

ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ لے کر لڑکا ان کو گھورتا ہے۔ پھر سختی سے کہتا ہے "ہاں! وہی تو ہے جو آپ کی سیوا کر سکتی ہے۔ آ رہی ہے۔" وہ چلا جاتا ہے۔

خاموشی سب کچھ نگل رہی ہے۔ طاقچے سے روٹیاں اٹھا کر وہ گلی میں پھینک دیتے ہیں۔ بلب بجھاتے ہیں۔ بائیں کروٹ لیٹ جاتے ہیں۔ کھڑکی میں سے باہر کھلے ہوئے اندھیرے کو دیکھنے لگتے ہیں۔ سر کے نیچے بازو رکھنے لگتے ہیں تو انگلی کا درد جاگ اٹھتا ہے۔

نظر لگاتار رات کے آسمان پر جمی رہتی ہے۔ دھندلا سا ستارہ نظر کے گھیرے میں آ جاتا ہے۔ چمکنے لگتا ہے۔ جیسے لکشمی کی یاد دھندلا سا ستارہ بن کر چمک رہی ہے۔ ستارہ بجھ جاتا ہے۔

نہ جانے کتنے بجے ہیں۔ ان کی آنکھ لگ رہی ہے۔ ٹائم پیس کا ڈائل چمک رہا ہے۔ اس پر اس وقت بھی سات بج رہے ہیں۔

بقیہ 'دیر دس سال کی'

"ہاں کیوں۔ تمہیں تعجب کس بات کا ہے؟"

"اور میں مری داس ہی ہوں نا؟"

"ہاں میں نے تمہیں اندھیرے میں بڑی مشکل سے پہچانا تھا۔"

"لیکن تمہاری اور میری عمر میں اتنا تضاد کیوں نظر آ رہا ہے۔"

"تضاد کیسا تضاد؟"

"میں بہت بوڑھا، بہت کمزور اور تم اتنے جوان بنے گئے۔"

"شاید اس کی ایک ہی وجہ ہے!"

"کیا ہے؟ کیا ہے! کیا ہے وہ وجہ؟"

بے چین ہو کر مری داس نے اس کے شانے پکڑ جھنجھوڑ دیے۔

"یہی کہ میں نے یہاں کچھ نہیں بیچا۔"

انور قمر
۱۴ اے مہر آباد۔ ہل روڈ۔ باندرہ۔ بمبئی۔ ۴۰۰۰۵۰

دس سال کی دیر

"تم مری داس تو نہیں؟" اُس نے لالٹین کی لَو اونچی کی اور لالٹین اس کے چہرے کے قریب لاکر پوچھا۔

"ہاں میں مری داس ہی ہوں لیکن تم نے کیسے پہچانا؟" وہ اپنی جھکی ہوئی پیٹھ پر سے نیچے سرکتا ہوا بوجھ سنبھالتا ہوا بولا۔

"میں پچھلے دس سال سے تمہارا منتظر تھا اور ہر رات دو بجے اس اسٹیمر سے آنے والے مسافروں پر نظر رکھتا تھا۔"

"ہاں، میں دس سال پہلے آنے والا تھا . . . لیکن،

"لیکن کیا . . . ؟" اُس نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"لیکن . . . مجھے دیر ہو گئی۔"

"دس سال کی دیر" وہ بڑبڑایا۔

"ہاں، دس سال کی۔ میں جس کام سے اس گاؤں سے نکلا تھا اُسے پورا ہونے میں وقت لگ گیا۔"

یہ کہہ کر مری داس رُک گیا۔ پھر بولا۔

"کیا ہمیں یہاں سے کورلم (CORLIM) جانے کے لئے کوئی سواری نہیں ملے گی؟"

"سواری . . . نہیں کوئی نہیں۔ دراصل اس اسٹیمر سے اِکّا دُکّا مسافر ہی آتے ہیں اور وہ صبح تک آس پاس کے کسی جھونپڑے میں قیام کر لیتے ہیں۔"

"ہُوں . . . اگر تم سہارا دو تو میں اپنے تھیلے میں سے شراب نکالوں . . . اس کے بغیر تو مجھے چلنا دوبھر ہوا جاتا ہے۔"

"ہاں . . . سو قدم پر ایک غیر آباد مکان ہے تم چاہو تو ہم دو گھڑی وہیں آرام کر لیں گے۔ کیا تمہارا بوجھ میں اپنے سر لے لوں؟"

"ہاں بہتر ہوگا۔ ویسے یہ اتنا وزنی بھی نہیں لیکن میری صحت اب اسے بھی گوارا نہیں کر رہی ہے۔"

اُس نے اپنا سر جھکا کر مری داس کا بوجھ اپنے سر پر رکھ لیا اور راستہ چلنے لگا۔

"اِس میں تم کیا لائے ہو؟"

مری داس نے آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھا۔ پھر مسکرایا۔ "بہت سا سامان ہے۔ مالتی کے لئے ساڑیاں، دھنراج کے لئے سوٹ کا کپڑا۔ شانتا رام کے لئے نیکریں اور قمیص اور رادھا کے لئے فراکیں۔"

رات کی گہری تاریکی میں سڑک سنسان پڑی تھی۔ آسمان پر صرف ایک ستارا کبھی چمکتا اور کبھی بجھتا نظر آتا تھا اور اُن کے دائیں بائیں اُگی ہوئی گھنی جھاڑیوں میں سے کبھی جھینگروں کی پراسرار سیٹیاں اور کبھی لومڑیوں کے رونے کی دردناک صدائیں سنائی دے جاتی تھیں۔

"تم خاموش کیوں ہو؟ کیا تمہیں میری لائی ہوئی چیزیں پسند نہیں آئیں۔ ارے، میں اپنے ساتھ بہت ساری مٹھائی بھی لایا ہوں۔ ایک ٹرانسسٹر (TRANSISTOR) لایا ہوں۔ ایک ٹیپ ریکارڈر لایا ہوں۔ اور گوری گوری میموں کے ننگے فوٹو بھی لایا ہوں وہ صرف اپنے دوستوں کو دکھاؤں گا۔ ٹرانزسسٹر بستی کے تمام لوگ سن سکتے ہیں اور ٹیپ ریکارڈر پر میں سبھوں کی آواز قید کر کے انہیں حیرت میں ڈال دوں گا۔"

سڑک پر اُن کے قدموں کی آواز دبکتی رہی۔ ایک چمگادڑ دائیں طرف کے درخت سے اُڑی اور بائیں طرف کے درخت پر جا بیٹھی۔

"ٹھیک ہے مجھے تمہاری لائی ہوئی چیزیں بھی پسند اور ناپسند سے کیا واسطہ! چیزیں تمہاری ہیں اور تم انہیں اپنے لوگوں کے لئے لائے ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ . . . ؟"

"تم خاموش ہو گئے۔ کچھ کہتے کیوں نہیں؟"

وہ جواب دینے سے پہلے بڑی دیر تک خاموش رہا پھر بولا۔

"وہ رہا مکان۔ تم ذرا دم لے لو۔ پھر بتاؤں گا۔"

وہ اُس ویران مکان کے چبوترے پر چڑھ گئے۔ لالٹین کی روشنی میں انہوں نے مکان کے ورانڈے کا ایک گوشہ منتخب کیا۔ اُس نے اپنا بوجھ بہ آہستگی سر سے اُتارا۔ مری داس نے بڑھ کر تھیلا کھولا۔ اُس میں سے ٹٹول کر ایک سیاہ بوتل نکالی۔ پھر ٹٹول کر پلاسٹک کے دو ٹمبلر TUMBLER نکالے۔ ایک دیوار سے ٹیک لگائے اپنے ساتھی کی طرف بڑھایا اور دوسرا اپنی گود میں رکھ لیا۔ کھٹ کی آواز ہوئی اور بوتل میں بھری ہوئی شراب کی تیز بو ہوا میں منتشر ہو گئی۔

مبڑ . . . مبڑ . . . کی آواز کے ساتھ اُس نے شراب دونوں ٹمبلروں

میں انڈیلی۔ سگریٹ سلگائی اور اطمینان سے اپنی ساتھی کے برابر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور اپنے پیر پھیلا دیئے۔

"ہاں تو تم کیا کہنے جا رہے تھے؟" مری داس نے پوچھا۔ اس کی آواز شراب کے زیر اثر واضح ہو گئی تھی اور لہجہ نرم پڑ گیا تھا۔

"نہیں پہلے تم بتاؤ" اس کے ساتھی نے اصرار کیا کہ "تمہاری وہاں کیسے گذری"

مری داس گویا ہوا۔

"تم جانتے ہو کہ میں یہاں مانڈوی ہوٹل میں کام کرتا تھا۔ پرتگالیوں کا زمانہ تھا۔ ہر چیز سستی تھی۔ چاول چار آنے کا سیر بھر اور مچھلی دو آنے کی پاؤ بھر فینی ایک آنہ پیگ اور سوڈا آدھ آنے کا غرض کہ سو روپے کی تنخواہ میں میرا، میری بیوی کا اور تینوں بچوں کا اچھا گذر ہو جاتا تھا۔

"لیکن"۔ ۔ ۔ وہ کہتے کہتے رُک گیا۔ پھر اس نے اپنے ساتھی کو اپنے ہاتھ سے چھو کر، پھر آنکھوں سے بغور دیکھ کر محسوس کیا اور یہ یقین کر کے کہ وہ اس کے بچپن کا یار ہے کہنے لگا۔

"سنہ ۔ ۔ میں گوا آزاد ہوا۔ ہمارا راج ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہر چیز مہنگی ہو گئی۔ لوگوں نے دوسری ریاستوں سے یہاں آنا شروع کیا۔ کاروبار شروع کیا۔ یہاں کی سستی چیزیں وہاں لے گئے اور وہاں کی چیزیں یہاں مہنگے داموں بیچنے لگے۔ تو پھر ہمارا جینا دشوار ہوا۔ سو روپے تو انتہائی ضروری کھانے، پکانے، پینے، اوڑھنے کی چیزوں کے لئے ناکافی ہونے لگے اور کچھ نہ بن پڑا تو میں نے ایک انگریز سیاح سے جو کہ میرے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا، رائے لی کہ اگر میں یورپ کی کسی ہوٹل میں ملازم ہو گیا تو مجھے کیا تنخواہ ملے گی؟ جانتے ہو اس نے مجھے کیا بتایا؟"

"نہیں"

"دس پاؤنڈ ہفتہ وار۔ یعنی دو سو روپے ہفتہ وار تنخواہ یعنی آٹھ سو روپے ماہانہ۔ میں نے فوراً اپنا پاسپورٹ بنوایا۔ ویزا کے لئے عرضی دی۔ دو ہفتے میں مجھے یورپ جانے کی اجازت مل گئی اور ایک رات میں اسی دو بجے آنے والے اسٹیمر سے یہاں سے رخصت ہوا۔"

"ہاں مجھے یاد ہے تمہیں وداع کرنے تمہاری بیوی، تمہاری بیٹی اور تمہارے دونوں بیٹے بھی یہاں آئے تھے۔ گاؤں کے آٹھ دس لوگ بھی اُن کے ساتھ تھے۔"

"ہاں یار . . . وہ پہلا موقع تھا کہ ہمارے گاؤں کو رلم کا کوئی شخص سمندر پار جا رہا تھا۔"

یہ سُن کر اُس کی آنکھوں کے سامنے تیرہ سال پہلے کی رات کا وہ منظر گھوم گیا۔ کتنے بجھے ہوئے دل سے کتنے آنسوؤں کو اپنی آنکھوں میں روکے اور کتنے بھاری قدموں سے وہ اسٹیمر کی ڈولتی ہوئی سیڑھیوں پر چڑھا تھا۔ اُس کی بیوی میلی کچیلی ساڑی میں ملبوس، اپنے پلّو سے اپنی آنکھیں خشک کر رہی تھی اور اُس کی لڑکی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ البتہ اُسکے دونوں شرارتی لڑکے دل ہی دل میں خوش ہو رہے تھے کہ اُن کا سخت دل باپ لمبے عرصہ کے لئے دوسرے ملک جا رہا ہے۔

پھر اسٹیمر کی ہوٹ نے اُس کا کلیجہ دہلا دیا۔ وہ انجانے ملک میں انجانے لوگوں کے درمیان کے تصور ہی سے اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے لگا اور اُس تنہائی کے خوف اور اپنی بے چارگی و کسمپرسی کے ڈر کے تحت اُس نے چاہا کہ لپک کر کنارے پر کود جائے اور اپنی بیوی بچوں کو گلے لگا کر کہے کہ کیا تم ایک وقت کا فاقہ نہیں کر سکتے کیا موٹا جھوٹا نہیں پہن سکتے؟ کیا یہ ضروری ہے کہ تمہارا اپنی اور تمہارا باپ تم سے ہزاروں میل دُور محض اسلئے چلا جائے کہ وہ تمہیں سونے کا نوالہ اور اطلس کا لباس پہنا سکے۔ کیا تم اس کی رفاقت اور اُس کی سرپرستی میں خوش نہیں ہو؟

لیکن اسٹیمر کنارہ چھوڑ چکا تھا اور وہ اپنے عزیزوں کو جیٹی (JETTY) پر ننگے بلبوں کی زرد روشنی میں اپنی دھندلائی ہوئی آنکھوں سے بڑی دیر تک دیکھتا رہا تھا۔

"تم دس سال پہلے آنے والے تھے . . ." اُس کے ساتھی نے اپنی بھرائی ہوئی نشہ آلود آواز میں اپنا سوال دہرایا۔

"ہاں دس سال پہلے آنے والا تھا لیکن مجھے دیر ہو گئی"

اُس نے بھی اپنا جواب دہرایا۔

"دس سال کی دیر؟" اُس کے ساتھی نے پھر حیرت و استعجاب سے پوچھا۔

"ہاں دس سال۔ کوئی ضروری تو نہیں کہ دیر منٹ، گھنٹہ، دن، ہفتہ اور مہینہ کی ہو۔ سال بھر کی ہو سکتی ہے اور دس سال کی بھی ہو سکتی ہے"

اُس نے شراب کا آخری قطرہ بھی اپنے گلاس میں انڈیل لیا وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ اُس کی پلکیں بوجھل ہو رہی ہیں اور وہ باوجود کوشش کے انہیں پل دو پل کھلی نہیں رکھ پا رہا ہے اور اُسے اس کا پتہ نہیں تھا کہ اُس کے ذہن کے پچھلے کواڑ کھل چکے ہیں جن کے راستے یادوں کی بارات بڑھی چلی آ رہی ہے۔

"تین سال لزبن LISBON میں میں کیا کماتا؟ اور . . . وہاں تو ہر چیز بہت مہنگی تھی۔ بہت مہنگی۔ بیر تین شلنگ کی ایک پنٹ (PINT) وہسکی دس شلنگ کی اور . . . . اور کھانا۔ یار تیرے ہاں آج کیا کیا پکا تھا؟"

"ادگرشا رائیس (PEGR) اور ویلری (VELRY) مچھلی کا سالن"
"اوہ"... وہ اسی انگلیاں چاٹنے لگا۔ تیرہ سال بیت گئے تھے اور اس نے اُبلا ہوا بھات اور مچھلی کا چٹپٹا سالن نہیں کھایا تھا۔
"پھر میں لزبن سے لندن گیا۔ لندن سے پیرس۔ پیرس سے ہانگ کانگ۔ اور وہاں سے سیدھا سنگاپور۔ ایک بات بتاؤں یار . . . میری زندگی وہاں بڑی غیر مطمئن اور بڑی غیر محفوظ سی گذری۔"
"ہزار بارہ سو کی نوکری ہوتے ہوئے تم یہ کیونکر کہہ سکتے ہو؟"
"یہی بات تو تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتی! یہاں ہماری نظر میں روپے پیسے کی بڑی اہمیت ہے۔ لیکن وہاں اُس کی کوئی اہمیت نہیں۔ وہاں کام بہت ہے۔ کام کرنے والے نہیں۔ اس لئے ہزار بارہ سو کی نوکری تو ہر کس و ناکس کو مل جاتی ہے لیکن بحیثیت ایک انسان کے میری کوئی عزت نہیں تھی وہاں۔ کوئی قدر نہیں تھی۔ وہاں مشین کے کسی کل پرزے کی طرح کام کرتا تھا۔ بغیر کسی جذبے کے، بغیر کسی احساس کے، بغیر کسی شوق کے۔ یہاں تو میں کبھی CARAMEL CUSTARD کیرامل کسٹرڈ تیار کر دیتا اور وہ کسی گاہک کو پسند آجاتا تو ویٹر آکر مجھے شاباش دیتا۔ میرا دل بڑھاتا۔ مجھے اس کی پروا بھی نہیں ہوتی کہ گاہک نے ویٹر کو جو روپیہ بطور ٹپ دیا ہے اُس میں میرا بھی حصہ نکلتا ہے۔ وہاں ٹپ ملتی تھی لیکن دل کو بڑھاوا نہیں ملتا تھا۔ وہاں تو ایک قاعدہ تھا کہ ٹپ (TIPS) ایک ڈبے میں جمع کر دی جاتی تھی۔ ہر ہفتہ ہر چھوٹے بڑے کو اس کا حصہ مل جاتا تھا۔ جو میری ہفتہ بھر کی تنخواہ سے زیادہ ہوتا تھا۔"
"کیا کہا ہفتہ بھر کی تنخواہ سے زیادہ ہوتا تھا؟"
"ہاں"
"اس کے باوجود تم وہاں خوش نہیں تھے؟"
"ہاں"
"کیا بکتے ہو۔ تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا؟"
"چاہے تم جو سمجھو لیکن میں ہوش میں ہوں اور سچ کہہ رہا ہوں۔ وہاں جاکر ہی مجھے افسوس ہوا کہ روپیہ پیسہ اتنا اہم نہیں جتنا اہم ہمارا وجود ہے۔ اپنا آپ ہے۔ اپنی انا ہے۔ اور یہ وہ چیزیں بھی نہیں جنہیں داموں خریدا جا سکے۔ تمہیں اس دنیا میں ایسے لوگ مل جائیں گے جو اپنا سب کچھ بیچ دینے کو ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ لیکن میں اُن میں سے نہیں۔ لیکن یہ بات مجھے اپنے وطن، اپنی بیوی، اپنے بچوں، اپنے دوستوں، اپنے عزیزوں سے ہزاروں میل دُور جاکر معلوم پڑی۔"
"تو پھر تم فوراً واپس ہو جاتے۔ تمہیں وہاں تیرہ سال تک رکنے کی کیا ضرورت تھی؟ تم نے تو اپنی بیوی کو دس سال پہلے لکھا تھا کہ تم جولائی کی ۲۸ تک واپس ہو رہے ہو؟"

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو، مجھے فوراً لوٹ آنا چاہیئے تھا لیکن یہ سوچ کر وہاں رُک گیا کہ میرے آنے جانے پر پانچ ہزار روپے خرچ ہو جائیں گے۔ پیسے میں نے بڑی کٹ کسر سے جمع کئے تھے اور یہ بچت میں سالہا سال سے کرتا چلا آیا تھا۔ اس لئے اتنی رقم میں وہیں رُک کر جمع کر لینا چاہتا تھا۔"
"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم پانچ ہزار کے لئے تیرہ سال تک بکتے رہے؟"
"نہیں یہ بات نہیں۔ تیرہ سال تک پانچ ہزار کے لئے نہیں۔ بلکہ ایک سال تک اُن پانچ ہزار روپیوں کے لئے بہ سبب مجبوری ایک اور بارہ سال تک ساٹھ ہزار کے لئے اپنے شوق سے بکا۔"
"کیا کہہ رہے ہو؟ کیا تم ساٹھ ہزار کے آسامی بن گئے ہو؟"
"بڑا غلط لفظ استعمال کیا ہے تم نے۔ جس شخص کے پاس ساٹھ ہزار ہوں اُسے آسامی نہیں کہتے، آسامی ساٹھ لاکھ اور ساٹھ کروڑ کے مالک کو کہتے ہیں۔ ان ساٹھ ہزار سے میں کون سے ہوٹل اور ریسٹورانس تعمیر کرلوں گا۔ یہ تو میرے بال بچوں کی پرورش، اُن کی پڑھائی لکھائی پر صرف ہو جانے والے ہیں۔ میرے اور میری بیوی کے بڑھاپے اور بیماریوں کے علاج معالجے پر خرچ ہو جانے والے ہیں۔"
"اور تم محسوس کر رہے ہوگے کہ اب میرے جسم میں، میرے دماغ میں اور میرے دل میں بیچنے کو کچھ بھی باقی نہیں بچا؟"
سینٹ فرانسس زیویر چرچ کی بالائی منزل پر نصب دس من وزنی پیتل کا گھنٹہ بجا۔ ٹن . . . ٹن . . . ٹن . . . ٹن . . . ٹن . . . .

پھر دُور بہت دُور کوئی مرغ اذان دینے لگا۔ ککڑوں کوں . . . ککڑوں کوں . . .
"لو باتوں باتوں میں صبح ہوگئی۔ چلو اب گھر چلیں۔"
اُس کے ساتھی نے تھیلا باندھا اور سر پر اٹھا لیا۔ ایک ہاتھ سے بجھی ہوئی قندیل اٹھائی اور دوسرے سے مری داس کو سہارا دیا۔ اُون کے تھیلے اور کوٹ میں ملبوس مری داس لڑکھڑا کر اٹھا اور ڈگمگاتے قدموں سے چلنے لگا۔
کچھ دُور چل کر وہ اچانک رُک گیا۔ پھر اُس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ پھر اپنے ساتھی کو بغور دیکھا۔ پھر اپنے سفید بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔
پھر کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر چلنے لگا۔ پھر رُک گیا اور بولا۔
"تم کپتان فرنانڈیس (CAPTAIN FERNANDES) ہی ہو نا۔"

(بقیہ صفحہ ۳۵ پر)

اُردو نمبر پر چند رائیں

کرشن چندر - بمبئی

"آج کل" کا اردو نمبر خاصے کی چیز ہے۔ اسے پڑھ کر یہ احساس اور بھی گہرا ہو جاتا ہے کہ اردو ہندوستان گیر زبان ہے۔ اور اس کی جڑیں سارے ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اور کسی ایک صوبے تک محدود نہیں ہیں۔ اس خصوصی نمبر سے ادارتی بورڈ کی عرق ریزی کا اندازہ ہوتا ہے۔ میرے خیال میں اس نمبر کو کچھ اضافے کے بعد کتابی شکل میں بھی شائع کرنا چاہیئے۔

صالحہ عابد حسین، نئی دہلی

"آج کل" کا اُردو نمبر اور اس کا ضمیمہ دونوں ملے۔ اول سے آخر تک پڑھا۔ آپ نے جس محنت، کاوش اور لگن سے ہندوستان کی تقریباً ہر ریاست میں اُردو کی جو حالت ہے اور وہاں کے جو اُردو کے ادیب و خادم ہیں ان کے بارے میں معلومات فراہم کرا کے مضامین شائع کئے ہیں، وہ قابل ستائش ہے۔ کئی لحاظ سے یہ نمبر اُردو ادب کی تاریخ میں اپنا حصہ ادا کرے گا۔ بعض مضامین بہت دلچسپ بھی ہیں اور فکر کی دعوت بھی دیتے ہیں۔ بعض خیالات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن افادیت سے انکار نہیں۔

قرۃ العین حیدر کا مضمون "ادیب کے مسائل" میں سیدھے سادے انداز میں ادیب کی جو مشکلات اور مسائل بیان کئے گئے ہیں وہ آپ بیتی بھی ہیں اور ہر ادیب کی جگ بیتی بھی۔ اور یہ حال تو اُن کا ہے جو چوٹی کے ادیب سمجھے جاتے ہیں۔ ہم جیسے معمولی ادیبوں کی مشکلات پر کوئی ہمارے مقابلے کا ادیب اور زیادہ روشنی ڈال سکتا تھا۔ یہ تو میں نہیں سمجھتی کہ اُردو کا ناشر اور پبلشر نادہند ہے لیکن اکثریت انہیں کی ہے۔ شاید یہ بات بھی قابلِ غور اور دلچسپ سمجھی جائے کہ آج کل کاتب کو فی صفحہ اچھے ناول نگار سے زیادہ معاوضہ ملتا ہے اور فوراً جبکہ ادیب کو جوشؔ آئندہ وعدوں پر رکھا جا سکتا ہے لیکن اُردو پبلشر اور ناشر کے مسائل بھی ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ وہ بھی اس بحرانی دَور میں سخت اُلجھنوں کا شکار ہے۔ اور کاغذ کا جو مسئلہ اس وقت درپیش ہے، اگر اس کا جلد حل تلاش نہ کیا گیا تو ادب کی کتابیں ہندوستان کی شاید سبھی زبانوں کی، زبانِ حال سے یہ کہتی سنائی دیں گی۔

اب ہمیں ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لے کر

بہر حال "آج کل" جو ادبی رسالہ بھی ہے اور سرکاری بھی، اُردو کی بقا اور ترقی کے لئے اپنی جدوجہد جاری رکھے گھپ اندھیرے میں ایسی ہی چند شمعیں ہیں جو امید کی کرن بن کر اردو کے ادیب و خادم اور پرستاروں کو نا اُمید ہونے سے بچا لیتی ہے۔

علی جواد زیدی - نئی دہلی

اردو زبان کے مسائل اور اردو والوں کے عزائم کتنے متنوع ہیں اور اس تنوع کے باوجود ان میں کتنی یک رنگی ہے اس کا اندازہ کچھ انہیں اصحاب کو ہو سکتا ہے جنہوں نے تمام مسائل کا معروضی جائزہ لیا ہو۔ بدقسمتی سے وہ بنیادی مواد جس سے صورتِ حال واضح ہو سکے تمام اردو دوستوں کی دسترس میں نہ تھا۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ "آج کل" نے یہ خدمت انجام دی۔ "اردو نمبر"، "ضمیمہ اردو نمبر" اور پھر نومبر کے شمارے میں بڑی خوش سلیقگی سے اعداد و شمار اور حقائق یکجا کر دیئے گئے ہیں۔ مدیر محترم نے پہلے سے سوالات قائم کر کے حشو و زوائد کا دروازہ بند کر دیا تھا۔ کہیں کہیں مضمون نگاروں کی رائے سے اختلاف تو ہو سکتا ہے لیکن انھوں نے جو دیدہ ریزی کی ہے بہر حال جاذبِ توجہ ہے۔

اب تک اردو کے مسائل کا اس سے زیادہ جامع تبصرہ شائع نہیں ہوا ہے۔ کارکنانِ "آج کل" کی محنت، وقتِ نظر اور ان کا حسنِ ترتیب قابلِ داد ہے۔ مجھے یقین ہے کہ سبھی حلقوں میں یہ شمارے پسندیدگی کی نظروں سے دیکھے جائیں گے اور اردو کے بارے میں صحیح نقطۂ نظر کی تشکیل میں ممد ثابت ہوں گے۔

محمد حسن ـــ دہلی

اُردو دنیا میں معروضی نقطۂ نظر کی کمی ہے۔ "آج کل" نے اُردو نمبر شائع کرکے ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔ اُردو ملک کے مختلف علاقوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور ہر علاقے میں اس کے مصنّف، ادیب اور شاعر موجود ہیں۔ لیکن ان کے بارے میں ضروری معلومات آج تک اتنے اہتمام اور حُسنِ ترتیب کے ساتھ یکجا نہیں کی گئی تھیں۔ اِس لحاظ سے "آج کل" اُردو دنیا کے شکریے کا مستحق ہے۔ امید ہے اس معلومات کے یکجا ہونے سے اُردو کے علمی اور ادبی حلقوں میں ایک ہندوستان گیر نقطۂ نظر پیدا ہوگا اور اُردو کے فروغ میں مدد ملے گی۔

گوپال مِتّل، دہلی

اُردو نمبر دیرپا اہمیت کا حامل ہے۔ جو معلومات اس میں فراہم کی گئی ہیں وہ اُردو والوں کے لئے ہمیشہ کارآمد رہیں گی۔ موجودہ دَور کے نئے پُرانے لکھنے والوں کے اجمالی تذکرے کی حیثیت سے بھی اس کی افادیت ہمیشہ برقرار رہے گی۔ مختلف صوبوں میں اُردو کی موجودہ پوزیشن کو نظر میں رکھتے ہوئے اس کی توسیع اور ترقی کے لئے جو تجاویز پیش کی گئی ہیں وہ اُردو تحریک کے کارکنوں کی سنجیدہ توجہ کی مستحق ہیں اور امید کی جاسکتی ہے کہ ان پر عملدرآمد اُردو کے حق میں مفید ثابت ہوگا۔

عبدالقوی دسنوی۔ بھوپال

"آج کل" کا موجودہ نمبر بہت خوب ہے۔ اگرچہ کچھ تشنگی محسوس ہوتی ہے لیکن پھر بھی سارے ہندوستان میں اردو کے سلسلے میں کسی نہ کسی حد تک واقفیت ضرور حاصل ہو جاتی ہے۔ کم صفحات میں ان سے زیادہ طویل مضامین شائع کس طرح ہو سکتے تھے اور پھر اس قدر مختصر وقت میں بہر حال دلی مبارکباد قبول کیجئے۔

جگن ناتھ آزاد۔ سرینگر

اردو نمبر ہماری ادبی صحافت میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اردو نمبر کیا ہے ملک کی مختلف ریاستوں میں اردو سے متعلق ایک اچھی خاصی کتاب العلم ہے۔ اردو کے بارے میں کام کرنے والے طالبعلموں کے لئے اس خاص نمبر نے تحقیق و تجسّس کی کتنی راہیں کھول دی ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اکثر ان نام نہاد تحقیقی مقالوں کے مقابلوں میں جن پر یونیورسٹیوں کی طرف سے آئے دن پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں دی جارہی ہیں، اس خاص نمبر کا ہر ایک مقالہ کہیں بہتر زیادہ وسیع اور زیادہ جامع ہے۔

قمر رئیس۔ دہلی

"آج کل" کا اردو نمبر اور اس کا ضمیمہ نظر سے گذرے۔ موجودہ ہندوستان میں اردو کی صحیح صورتِ حال کے مطالعہ کے لئے یہ بڑی اہم اور مستند دستاویز ہے۔ جو اردو والوں کو پتہ نہیں کہ ہم کہاں کہاں اور کتنے پانی میں ہیں۔ آپ نے اچھا کیا کہ اردو کے بارے میں اور مختلف ریاستوں میں اس کی شکست یا انحطاط پذیر ترقی کے بارے میں جو اعداد و شمار ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے انھیں سلیقے کے ساتھ بعض مضامین میں جمع کر دیا۔ اسی طرح ضمیمہ میں اردو کے مصنف قاری ناشر اور مدیر کے مسائل کے بارے میں جو مذاکرہ ہے وہ نہایت دلچسپ اور معلوماتی ہے۔

شارب ردولوی، دہلی

"آج کل" کے یہ شمارے بلاشبہ ایک تاریخی دستاویز ہیں۔ اُردو کے بارے میں اتنی وسیع معلومات اور تفصیلات پہلی بار "آج کل" کے ذریعہ ہمارے سامنے آئی ہیں۔ اب تک انہیں کسی نے اس طرح مرتّب کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

میں آپ کو اُردو نمبر کی اشاعت پر مبارکباد دینے کی بجائے صحیح معنوں میں اس غیر جانب دارانہ انداز اور APPROACH کے لئے مبارکباد دینا چاہتا ہوں جسے اردو نمبر (نمبروں) میں اختیار کیا گیا ہے۔

میں ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن نئی دہلی سے اس پر اصرار کرنا چاہتا ہوں کہ ان تمام مضامین کو نظرِ ثانی اور ضروری اضافوں کے بعد کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے۔

عابد سہیل۔ لکھنؤ

مجھ کو آپ نے بہت اچھا نکالا ہے اور سارے زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بہت سا کام کا مواد یکجا کر دیا ہے۔ ریاستوں میں اردو کو ملی ہوئی سہولتوں اور ضرورتوں کے تقابلی مطالعہ سے ان لوگوں کو جو اس شیریں زبان کو زندہ رکھنے کی جد و جہد میں لگے ہوئے ہیں، لائحہ عمل طے کرنے اور اپنی کوتاہیوں پر نظر ڈالنے میں مدد ملے گی۔ میری مبارکباد۔

عمران انصاری۔ بھوپال

اردو نمبر دیکھا اس کی ترتیب و تدوین میں سعیٔ بلیغ فرمائی گئی ہے اور اردو نوازی کی اعلیٰ ترین مثال قائم کی گئی ہے۔ خاص طور پر مجھے یہ بات بہت پسند آئی کہ فنکاروں کی خدمات کا ان کی زندگی میں ہی اعتراف کیا گیا ہے

گربچن چندن ۔ نئی دہلی

اردو زبان کی صورتِ حال کا یہ ایک بے نظیر جائزہ ہے۔ موجودہ نمبر میں مختلف ریاستوں میں اردو زبان کی روایت کا جو تاریخی پس منظر پیش کیا گیا ہے، اس سے زبان کی قدامت، وسعت اور افادیت خوب نمایاں ہوئی ہے۔ حقائق کا اتنا اچھا مرقع پیش کرنے پر میری مبارکباد قبول فرمائیے۔

فضا ابن فیضی ۔ مئو ناتھ بھنجن

ابھی مشمولات پر بس ایک سرسری نگاہ ڈال سکا ہوں جس سے اندازہ ہوا کہ مضمون نگار حضرات نے بڑے خلوص اور دلچسپی سے تعاون کیا ہے۔ مختلف صوبوں میں اردو کے حالات، رسائل اور دوسرے متعلقہ عواقب و عوامل کے متعلق آپ نے تمام ضروری تفصیلات اس شمارہ میں اکٹھا کر دی ہیں۔ اردو کے قارئین اسے بڑی دلچسپی سے پڑھیں گے۔

عمیق حنفی ۔ نئی دہلی

"آج کل" کا اردو نمبر نظر سے گزرا۔ خلوص، محنت اور ذہانت کی مشترک کوشش کا اچھا نتیجہ نکلا ہے۔ نمبر دیکھ کر معلوم ہوا کہ یہ سخت جان زبان ہندوستان کے کن کن گوشوں تک پہنچ چکی ہے اور اس کے اثرات کی نشان دہی ہندوستان کے قلب و جگر میں اب بھی کی جا سکتی ہے۔ اتنے بڑے کام میں بعض فروگذاشتیں تو ہو ہی جاتی ہیں اور فہرست سازی میں بھی گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ بعض لطیفے بھی ہو جاتے ہیں، جن سے ناراض ہونے کی بجائے لطف اندوز ہونا چاہئے مثلاً مجھے اپنی صورت دیکھنے کے لئے مدھیہ پردیش سے رجوع ہونا پڑتا ہے اور اپنا نام ڈھونڈنے کے لئے دلّی کے (اوراقِ مصور کے بجائے) گلی کوچوں میں گھومنا پڑتا ہے۔ ایسے اور کئی مذاق ہیں لیکن ان سے مرتبین کی نیت اور ان کے ارادوں پر کوئی شک نہیں کیا جا سکتا۔ یوں بھی نمبر کی تکمیل اس کے ضمیمے اور نومبر کے شمارے سے ہوتی ہے۔ مصنف، قاری اور ناشر کے مسائل پر بحث اچھی رہی اور اس بحث نے اس اونگھتے ہوئے یقین کو پھر جگا دیا کہ اردو میں مصنف کے علاوہ قاری اور ناشر بھی موجود ہیں۔ ایک بار کان میں کہہ دیجئے کہ یہ قاری اور ناشر ادب ہی کے ہیں!

محمود ہاشمی ۔ نئی دلی

"آج کل" کا اردو نمبر اردو زبان و ادب کے سلسلے کی وہ پہلی دستاویز ہے جس سے ہندوستان کے تمام صوبوں میں اس زبان کے ماضی، حال اور مستقبل کے امکانات کا اندازہ ہوتا ہے۔ گزشتہ پچیس برسوں میں اردو رسائل اور اخبارات نے "اردو نمبر" کے نام سے بہت سے خصوصی شمارے شائع کئے۔ لیکن ان تمام شماروں میں اردو کے ماضی کا قصیدہ اور اردو والوں کے خدشات اور احتجاجات کو ہی پیش کیا جاتا رہا۔ سرکاری سطح پر لسانی مسئلہ کو حل کرانے کے لئے جس طرح کے سائنٹفک اور معروضی مطالعوں کی ضرورت تھی ان کی طرف کسی رسالے، کسی اخبار یا کسی انجمن نے توجہ نہیں دی۔

"آج کل" کا اردو نمبر۔ اردو صحافت کی تاریخ میں پہلا سائنٹفک جائزہ ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کے تمام علاقوں میں اردو زبان و ادب اور اس زبان سے مختص کلچر کی بنیادیں کتنی گہری اور کس قدر ہمہ گیر ہیں۔

مجھے یاد آتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے زمانے میں فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی نے اپنے خطبات میں اردو زبان، ادب، صحافت اور چھاپہ خانوں کے بارے میں تاریخ ساز جائزے پیش کئے تھے۔ اس کے بعد گزشتہ بیس پچیس برسوں میں جب اردو کی لسانی تحریک مختلف قسم کے مراحل سے گذرتی رہی اس دور میں اس قسم کے جائزے کی ضرورت کے باوجود کسی رسالے نے وقت کی اس اہم ضرورت کو محسوس نہ کیا۔ "آج کل" نے اس نمبر کے ذریعہ اردو رسائل کی اس کوتاہی کا تدارک کیا ہے۔ میں اس کام کے لئے ادارہ "آج کل" کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

مظہر امام ۔ پٹنہ

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ نمبر تاریخی نوعیت کے حامل ہیں۔ اور ان سے آئندہ محققین کو استفادہ کرنے کا موقع ملے گا۔

کیول دھیر کھمانو (ضلع لدھیانہ)

یہ خاص نمبر محض سرکاری پروپیگنڈہ ہے۔ اگر میں کہوں کہ اس کی اشاعت سے اردو زبان و ادب کو کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں ہوا تو غلط نہ ہوگا۔ یہ نمبر محض ایک 'REFERENCE BOOK' ہے۔

سلیم تمنائی ۔ میسور

نمبر صوری و معنوی دونوں لحاظ سے اچھا ہے۔ اس کی حیثیت بالکل دستاویز کی سی ہے۔ مدیر "نشیمن" کا نام عثمان اسد کے بجائے اسما اسد چھپ گیا۔ اخبار "الکلام" اب شائع نہیں ہوتا۔ "کوثر" بنگلور کے بجائے میسور سے شائع ہوتا ہے۔ میرے عزیز دوست عزیز تمنائی مدراس میں رہتے ہیں۔ ان کی تصویر میسور کے حصے میں دی گئی ہے۔ حمید سہروردی شاید اورنگ آباد کے ہیں۔ رفعت زہرہ، مظہر امام اور رفعت عرفان کے نام چھوٹ گئے ہیں۔

نئی کتابیں

اپنی اپنی صلیب

صالحہ عابد حسین   مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، جامعہ نگر نئی دہلی-۲۵

۱۹۶۴ء صفحات ۲۹۴ قیمت آٹھ روپے

"اپنی اپنی صلیب" صالحہ عابد حسین کا تازہ ناول ہے۔ اس سے پہلے ان کے تین ناول شائع ہو چکے ہیں، لیکن زیرِ نظر ناول اپنی بعض خوبیوں کی وجہ سے پہلے ناولوں سے زیادہ توجہ کا مستحق ہے۔ صالحہ عابد حسین متوسط طبقے کی گھریلو معاشرت اور زندگی کے المیے کو جیسا وہ انسان کا اور عورت کا مقدر ہے پیش کرنے میں امتیاز رکھتی ہیں۔ "اپنی اپنی صلیب" کا موضوع بھی زندگی کا یہی درد اور کرب ہے جس کی آگ میں کہیں تو وجود جل کر بھسم ہو جاتا ہے اور کہیں اندر ہی اندر سلگتا رہتا ہے۔ نیز یہ کہ دکھ کی نوعیت انفرادی ہے۔ دوسرے لاکھ ہمدردی کریں انسان کو اپنا دکھ خود ہی سہنا پڑتا ہے یعنی سب کو "اپنی اپنی صلیب" خود ہی اٹھانی پڑتی ہے اور اس میں کوئی کسی کی جگہ نہیں لے سکتا۔

ناول میں تین باتیں خاص ہیں۔ اوّل یہ کہ اس میں عام ناولوں کی طرح واقعات تاریخی ترتیب سے بیان نہیں ہوئے۔ ناول علی اصغر کی علالت سے شروع ہوتا ہے اور ان کی موت پر ختم ہو جاتا ہے۔ اور اس چند مہینے کے وقفے میں پوری ایک زندگی بلکہ پورے ایک خاندان کی بھرپور زندگی کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ مصنفہ نے جگہ جگہ FLASH BACK سے کام لیا ہے اور شعور کے بہاؤ (STREAM OF CONSCIOUSNESS) کی مدد سے کڑی سے کڑی ملی چلی گئی ہے۔ یہ تکنیک خاصی مشکل ہے لیکن مصنفہ نے اسے بڑی خوبی سے نبھایا ہے۔ دوسرے یہ کہ مصنفہ کے پہلے ناولوں میں جزئیات نگاری اور تفصیل پرستی کا جو رجحان ملتا ہے، زیرِ نظر ناول میں اس پر قابو پانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگرچہ FLASH BACK کی وجہ سے کہیں کہیں تکرار راہ پا گئی ہے اور تفصیل کو بعض جگہ کم کیا جا سکتا تھا تاہم یہ حقیقت ہے کہ مصنفہ غیر ضروری جزئیات نگاری سے بچنے میں بڑی حد تک کامیاب رہی ہیں۔ تیسری اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ ناول واقعاتی نہیں، کرداروں کا ناول ہے۔ اس میں یادیں، واقعات، مکالمے سب کرداروں کی تکمیل کے لئے آتے ہیں۔ یا مرکزی خیال کی توضیح اور توسیع کے لئے۔

ناول کے بنیادی کردار چار ہیں۔ ایک مرد کا، تین عورتوں کے۔ مرد کی حیثیت سورج کی ہے اور عورتوں کی ثوابت و سیارگان کی۔ یہ چاروں کردار اتنے جاندار، اتنے سچے اور جذبات اور زندگی کی سچائیوں سے اس قدر تھرتھراتے ہوئے ہیں کہ ان کی تخلیق پر مصنفہ کو جتنی مبارکباد دی جائے کم ہے۔ ان کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ ان کی تعمیر کاری (DELINEATION) کے لئے مصنفہ نے نہ تو کسی بڑی ڈرامائی حالت DRAMATIC SITUATION کا سہارا لیا ہے، اور نہ نظریاتی بحثوں کا، نہ جنس، تشدد، یا تحیر (SUSPENSE) کا جو فکشن کی دنیا میں آج کے ادیب کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں۔ صالحہ عابد حسین کے ہاں ڈرامائیت اور تحیر صرف اتنا ہے جتنا روزمرہ کی زندگی میں ملتا ہے۔ اس کے باوجود وہ بنیادی انسانی قدروں یعنی انسانیت، شرافت، محبت، خدمت، اور قربانی و ایثار کی شمع روشن کرنے اور ان کی مدد سے دردمندی کی ایسی فضا پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئی ہیں جس میں قاری کرداروں کے ساتھ ہو جاتا ہے اور کرداروں کے دل کی دھڑکن قاری کے دل کی دھڑکن بن جاتی ہے۔ یہاں ان کرداروں کے تفصیلی تجزیہ کی گنجائش نہیں۔ البتہ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ علی اصغر اور ان کی بہن زہرا دونوں مثبت کردار ہیں۔ نرم دل، خلیق و وسیع، دوسروں پر جان نثار کرنے والے، محبت، شفقت، اور خلوص کے پتلے اور سیرت اور اخلاق کی خوبیوں سے ہیرے کی طرح دمکتے ہوئے۔ ان کے مقابلے میں علی اصغر کی بیوی رضوانہ منفی کردار ہے، بدمزاج اور چڑچڑی، جس کی میاں سے کبھی نہ بنی۔ خالہ زاد بہن حمرا اگرچہ مثبت کردار ہے، جو علی اصغر کی یاد کو دل سے لگا کر اپنی زندگی مقصود کی خدمت میں کھپا دیتی ہے لیکن حمرا کی قربانی اور ایثار کی سطح وہ نہیں جو زہرا کی ہے۔ یہاں ایک بات غور طلب ہے۔ ناول کے ہیرو علی اصغر ہیں اور ہیروئن اُن کی بہن زہرہ۔ مصنفہ نے جن اعلیٰ انسانی اقدار یعنی درد و کرب میں ضبط و صبر اور [illegible] محبت کے

نفوذ اور ترفع کے لئے علی اصغر اور زہرا کی تخلیق کی ہے، یہ کردار بلاشبہ ان اقدار کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں، لیکن اس کے باوصف یہ کردار ابھرے ہیں۔ زہرا کے ہاں پھر بھی سچی کشمکش ہے اور زندگی سے نبرد آزمائی کا حوصلہ بھی ملتا ہے۔ لیکن علی اصغر خاصے بے نیاز انسان ہیں جن کا ماں اور بہنوں سے محبت کا جذبہ تو راسخ ہے لیکن زندگی کرنے کا عزم کمل کر ظاہر نہیں ہوتا۔ ان کے ایک ملازمت کے جاتے رہنے کے بعد دوسری ملازمت نہ کر سکنے اور اس کے بعد بزنس میں ناکام ہونے سے جو تصویر ابھرتا ہے وہ ایک ایسے مثالیت پسند انسان کا ہے۔ جس میں عمل کی قوتیں خاصی کمزور ہیں۔ اپنی بیوی کی بدمزاجی کے خلاف ان کا ردِ عمل سوائے خاموشی کے کیا تھا؟ یا اسے بدلنے کی انہوں نے کیا کوشش کی؟ ان کی شخصیت کا دلکش ترین پہلو زہرا اور حمرا سے ان کا لگاؤ ہے۔ بہن کی محبت بڑی چیز ہے لیکن زندگی سے بڑی نہیں۔ بیچارے علی اصغر اور زہرا دونوں کے مقابلے میں فنی اعتبار سے کہیں زیادہ مکمل کردار رضوانہ کا ہے۔ اس کردار میں ارتقاء کی شان بھی ہے، گہری کشمکش بھی۔ اور یہ ڈرامائی تطہیر باطن ... (CATHARSIS) کے عمل سے بھی گزرتا ہے۔ رضوانہ کی بدمزاجی اس کی اپنی ہے۔ لیکن ازدواجی زندگی کی ناکامی میں اس کے ماں باپ کے لاڈ پیار کا بھی ہاتھ ہے اور اس کے شوہر کے اپنی ماں اور بہنوں سے شدید جذباتی لگاؤ کا بھی۔ شوہر کی طبیعت کے زیادہ خراب ہونے کی اطلاع ملنے پر (بادلِ ناخواستہ ہی سہی) وہ راتوں رات شہر سے گاؤں پہنچتی ہے، راہ میں شوہر کی موت کے تصور سے اس کے دل کا بھر آنا، پوری زندگی کے دکھوں اور شدائد کو یاد کر کے اس کا باطنی تبدیلی کے عمل سے گزرنا اسے ایک ایسا انسان ثابت کرتا ہے جسے زندگی کی سچائیوں کا احساس ہو گیا تھا۔ اثر انگیزی کے اعتبار سے یہ باب ناول کا نقطۂ عروج (CLIMAX) ہے۔ ناول کا انجام علی اصغر کی موت نہیں، بلکہ انجام کی پرچھائیں تو وہیں سے پڑنا شروع ہو جاتی ہے جب علی اصغر اپنی خالہ اور ماں کی نشانی اپنی عزیز ترین انگوٹھی حمرا کو پہناتے ہیں! یہ ایک طرح سے مرد اور عورت کے درمیان اس ازلی اور ابدی رشتہ کی علامت ہے جو حالات کی مجبوریوں کی وجہ سے مترفع ..... (SUBLIMATE) ..... ہو جاتا ہے۔

ناول کے آخر میں علی اصغر کے انتقال کے بعد زہرا اور حمرا دونوں ایک دوسرے کو سہارا دیتی ہیں کہ زندگی کے غم وہ بوجھ نہیں جو بانٹ لئے جائیں۔ یہی ناول کا مرکزی خیال ہے۔

"Every one has to bear his own cross"

"کتنی سچی بات: ہر ایک کو اپنی اپنی صلیب خود ہی اٹھانی پڑتی ہے؟"

"ہاں باجی: بھیّا تو اپنی صلیب اٹھائے منزل تک پہنچ گئے؟"

"آہ کتنی بھاری تھی اُن کی صلیب"

"ہاں باجی ـــ وہ تو منزل پر آرام کر رہے ہیں۔ اور ہم۔ ہم۔"

"مگر ہم ابھی اپنی اپنی صلیب اٹھائے چل رہے ہیں بھنو۔"

زہرا نے کھوئے لہجے میں کہا اور ابھی جانے کب تک چلنا ہے۔ کتنی دور ہے ہماری منزل باجی۔؟"

رضوانہ کی صلیب بھی اتنی ہی بھاری تھی اور جانے اس کی منزل بھی کتنی دور تھی۔ خوشی سب انسان ایک سی چاہتے ہیں لیکن دکھ سب کے الگ الگ ہیں اور ہر انسان کو خود اپنے دکھوں کے ساتھ جینا اور خود اپنے دکھوں کے ساتھ مرنا پڑتا ہے۔ اس بنیادی حقیقت کا احساس پورے ناول میں ایک زیریں لہر کی طرح موجود ہے۔ گہری دردمندی، اعلیٰ انسانی اقدار کی پاسداری اور زبان و بیان کی صفائی اور فنکارانہ مہارت کے اعتبار سے یہ ناول اردو کے ان ناولوں کے ساتھ جگہ پائے گا جو بار بار پڑھے جائیں گے اور یاد رکھے جائیں گے۔ (گوپی چند نارنگ)

چنبل کی چمیلی، کرشن چندر، ہند پاکٹ بکس دہلی

قیمت:۔ ساڑھے تین روپئے۔

کرشن چندر کا یہ ناول بہ یک وقت کئی متضاد اور مختلف رجحانات کا مجموعہ ہے۔ اس میں سستے جاسوسی ناولوں کی سنسنی خیزیت بھی ہے اور رومانوی ادب کی سی خیالی رنگینی اور ایک ماورائی فضا بھی۔ اس میں ترقی پسند ادب کی تنقیدی ذہنیت کے اظہار کے لیے کہیں کہیں موجودہ معاشرہ کی خامیوں پر طنز اور تبصرہ بھی ہے اور اس کو مقصدی ناول بنانے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔

تِتلی بائی کو اس ناول کی ہیروئن کی حیثیت کے علاوہ اس طرح پیش کیا گیا ہے گویا وہ دوسری لکشمی بائی یا رضیہ سلطانہ ہے جو ہمارے ملک سے بددیانتی، رشوت خوری اور ہر طرح کی برائیوں کو دور کرنے کی خاطر شہید ہو گئیں۔

ایک طرف تو ناول کے واقعات اور ماحول ہمیں ایک ایسی دنیا میں پہنچا دیتے ہیں جہاں ہر ناممکن چیز ممکن ہے اور جہاں کسی قسم کا کوئی قانون نہیں چلتا لیکن قدم قدم پر اس دنیا کا مقابلہ ہماری اپنی دنیا سے کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے نہ تو ہم اس کو خالص رومانوی ناول کہہ سکتے ہیں اور نہ خالص مقصدی۔

دو بوند پانی، خواجہ احمد عباس

ہند پاکٹ بکس، دہلی ص ۱۶۰ ڈھائی روپے۔

خواجہ احمد عباس کا یہ ناول اگرچہ ناول کے اعتبار سے کمزور سہی لیکن فلمی دنیا میں یقیناً ایک اہم کارنامہ اور تعریف کا مستحق ہے۔ ویسے بھی خواجہ صاحب کی لکھی ہوئی فلمی کہانیاں اردو فلموں کے ایک اہم موڑ کی نشاندہی کرتی ہیں: "شہر اور سپنا" "بمبئی رات کی بانہوں میں" اور اس کے بعد "دو بوند پانی" ان سب فلموں کی کہانیاں ایک طرف تو ہندوستان کے بعض حصوں کی زندگی کی بہت سچی تصویریں پیش کرتی ہیں۔ اور دوسری طرف ان میں کوئی اہم پیغام اور آدرش بھی ملتا ہے۔ اور اگر ہمارے یہاں اس طرح کی فلمیں بننے لگیں تو اس میں کوئی شک نہیں کہ ملکی ترقی کے پروگرام میں بہت مدد ملے۔ فلمیں بجائے نئی نسلوں کو جرائم اور اخلاق سے راہ روی سکھانے کے ان کی ذہنی نشوونما کا ذریعہ بن جائیں۔

اس میں راجستھان کی زندگی کے ایک مسئلہ، جو وہاں کا ایک المیہ بھی ہے یعنی پانی کی کمی کو بڑے موثر اور دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ دیہاتی زندگی کے معصوم اور بے لوث مناظر میں بڑی جان ہے۔ ناول کا ہیرو اور ہیروئن دونوں عزم اور ایثار کے مجسمے ہیں۔ ہندوستانی تاریخ کی بعض روایتوں کو شامل کر کے قصہ کی اثر پذیری میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اس مسئلہ کا حل بھی کہانی میں پیش کر دیا گیا ہے یعنی عزم عمل اور یک جہتی۔

مقصدی کہانیوں کی ایک خامی اس ناول میں بھی نمایاں ہے۔ وہ ہے کرداروں کی اٹل اور جنبش نہ کرنے والی شخصیت۔ مثلاً ہیرو اور اس کے گھر والوں اور بیوی کا کردار جو بعض اوقات ناقابل یقین حد تک مثالی ہو جاتا ہے۔ اس طرح کشمیری انجینئر کی شخصیت جو اس حد تک مثالی ہے کہ وہ ہمیں اس دنیا کی نہیں کسی اور دنیا کی مخلوق معلوم ہونے لگتا ہے۔

چوپٹ راجہ فکر تونسوی

لاجپت رائے اینڈ سنز، اردو بازار، دہلی۔ چھ روپے

ہمارے طنزیہ اور مزاحیہ ادب میں فکر تونسوی کا نام خاص اہمیت رکھتا ہے مگر ان کا یہ طنز و مزاح ان طنز نگاروں سے مختلف ہے جس ذیل میں رشید احمد صدیقی، عظیم بیگ یا شفیق الرحمٰن وغیرہ کا نام آتا ہے۔ فکر تونسوی کا طنز ہلکا پھلکا ہے بلکہ صحافی قسم کا طنز ہے جو عام فہم ہے جس کا نشانہ تو بھرپور ہوتا ہے مگر اثر دیرپا نہیں ہوتا۔

چوپٹ راجہ ان کا ایک مسلسل سیاسی طنز ہے اور انہوں نے اس کتاب میں اس طنز سے کام لیا ہے جو کسی ایسے سماج میں ضرورت پڑتی ہے جس کا نظام ابتر ہو گیا ہو۔ ہمارے ہندوستانی مزاج کی لغویات کا مطالعہ کیا جائے تو یہ دلچسپ انکشاف ہو گا کہ یہاں الفاظ کے وہ معنی نہیں لیے جاتے جو اصلی ہیں بلکہ اس کے بالکل برعکس معنی مراد لیے جاتے ہیں یہ دوسرے الفاظ میں الفاظ کے جو معنی بتلائے جاتے ہیں عمل کی زندگی میں ان کے معنی بدل جاتے ہیں مثلاً سیکولرزم، نیشنلزم، قومی یک جہتی، جمہوریت وغیرہ۔ فکر تونسوی نے دراصل اس سیاسی مکتب دوعملی کو اپنا ہدف بنایا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

" جمہوریت کی یہ ستم ظریفی ہمیں بہت پسند آئی کہ جس شخص کو جمہوریت کی کتاب سمجھ میں نہ آئی وہ جمہوریت کی حفاظت کا فرمان جاری کرتا ہے "

" ہم خواہ مخواہ ڈر رہے تھے ورنہ جمہوریت کوئی غیر معمولی چیز نہیں ہے بالکل ایسی ہے جیسے کسی کتاب کا ڈسٹ کور رنگین اور خوشنما ہو، طباعت اور کاغذ بھی دیدہ زیب کا مواد انتہائی معمولی اور عام ہو "

موجودہ دور میں سیاسی نظام کے عدم استحکام سے زندگی کے جو شعبے متاثر ہوتے ہیں ان کو ایک زبردست المیہ کہا جا سکتا ہے۔ سماجیات، اقتصادیات، مذہبیات، اخلاقیات یہ سب اس بے اطمینانی کے سیلاب میں ہچکولے کھا رہے ہیں، ایسے موقع پر مصنف کے قلم میں طنز کے ساتھ جس طرح شدت کے ساتھ تلخی پیدا ہو گئی ہے وہ ناگزیر ہے۔

کتاب کی خوبیوں میں جہاں مصنف کی جرأت و بے باکی، شگفتہ انداز، حقائق کی بصیرت اور قدرت زبان کو نمایاں حیثیت حاصل ہے وہاں دوسری طرف اس کمی کا بھی شدت سے احساس ہوتا ہے کہ طنز کے لیے جس رمزیہ انداز کی ضرورت ہوتی ہے وہ فکر تونسوی کے یہاں مفقود ہے۔ انہوں نے ہر بات کو اس طرح کھول کر کہہ دیا کہ پڑھنے والے کے لیے دل و دماغ پر زور ڈالنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ ایک اچھے اور کاری طنز کے لیے ضروری ہے کہ اس کا وار بھرپور ہو اور مضروب اس کی شدت پر تو غور کرتا رہ جائے، مگر یہ نہ سمجھ سکے کہ وار کس طرف سے ہوا ہے۔

یادوں کی برات مصنف: جوش ملیح آبادی

ہند پاکٹ بکس، دہلی ۶ ص ۴۴۰ ساڑھے تین روپے

جوش کی "یادوں کی برات" واقعی یادوں کی برات ہی ہے۔ وہی دھوم دھڑکا، وہی رنگینی اور جگمگاہٹ، وہی مسرت و سرشاری اور وہی افراتفری اور بدنظمی جو کسی برات میں ہوتی ہے اس میں بھی ہے۔

جو چیز اس کتاب میں سب سے نمایاں محسوس ہوتی ہے وہ مصنف کی زبردست انانیت ہے۔ پوری کتاب ان کی اور ان کے خاندان کی بڑائی کے واقعات سے بھری ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی کمزوریوں کا ذکر بھی اس انداز سے کرتے ہیں گویا وہ ان کی کمزوریاں نہیں بلکہ ان کے لئے طغرائے امتیاز ہیں۔ اپنی بچپن کی خودسری اور شعلہ خوئی کو وہ "سورما پن" اور پٹھانی تیور کہہ کر فخر کرتے ہیں اور جوانی کی بے راہ روی کو اپنی دولت اور مردانگی کے سرٹیفکیٹ کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ پوری کتاب میں "پدرم سلطان بود" اور "منم افراسیاب" کا انداز چھایا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

جوش کو الفاظ پر جو قدرت حاصل ہے اس سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ یہ قدرت الفاظ شاعری میں بھی نمایاں ہے اور نثر میں بھی بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ کتاب نثر میں شاعری ہے۔ تخیل، مبالغہ، رنگین بیانی، جذباتیت جو چیزیں شاعری کے لوازمات ہیں، سب اس میں موجود ہیں بلکہ بعض جگہ تو قافیہ کی پابندی بھی ہے۔ اس کا انداز بیان ہی کتاب کی دلچسپی کا اولین سبب ہے۔

پھر بھی ایک سوانح عمری کی جو بنیادی خصوصیات ہونا چاہییں وہ اس میں موجود ہے یعنی مصنف کی زندگی کا ہر عکس اس میں جلوہ گر ہے خواہ وہ حسین ہو یا بدمنظر۔ اپنے بچپن سے لے کر زمانہ حال تک کے واقعات کو جوش نے اس میں پیش کر دیا ہے اور ان کی شخصیت اپنے پورے جلال و جمال کے ساتھ اس میں دکھائی دیتی ہے۔ اپنے حال کے بارے میں ان کی بے اطمینانی دیکھ کر کچھ زیادہ افسوس یا تعجب نہیں ہوتا کیونکہ ماحول کے وہ ہمیشہ شاکی رہے ہیں۔ ماضی کا ذکر وہ جس چٹخارے سے کرتے ہیں اس کو پڑھ کر بے ساختہ یہ شعر زبان پر آ جاتا ہے:

عہد پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

واقعات کی صحت کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت اس لئے نہیں محسوس ہوتی کہ جوش صاحب نے اپنے حافظہ کی کمزوری کا اعتراف ابتدا ہی میں کر لیا ہے۔ اس تلخیص سے جوش صاحب کے معاشقوں کا باب صاف کر دیا گیا؟

مطالعہ ذکی کاکوروی

مرکز ادب اردو لکھنؤ چار روپے

"مطالعہ" ذکی کاکوروی کے چار مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین واجد علی شاہ اختر، انتخاب کلام آتش پر تبصرہ، آتش لکھنوی اور اودھ کے تین حکمران ہیں۔ اول الذکر دونوں مضمون پروفیسر مسعود حسن رضوی صاحب اور پروفیسر اعجاز حسین کے جواب میں ہیں، اور موخر الذکر مضامین انہیں دونوں مضامین کے ردِ عمل کے طور پر وجود میں آئے ہیں۔

مضامین کے بارے میں اتفاق اور اختلاف ممکن ہے۔ مواد کی فراہمی کے لئے مصنف کو جو کاوش کرنا پڑی ہے، اس کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہے۔ ہمارے یہاں تنقید کا معاملہ عجیب ہے ہم یا تو تعریف کے پھولوں سے چہرے کو ڈھانپ دیں گے یا کسی کی برائی کریں گے تو چہرے کو گرد و غبار سے چھپا دیں گے۔ مگر نتیجہ دونوں کا ایک ہے یعنی چہرے کے نقوش عوام کی نظروں سے مخفی رہیں گے۔ ہمارے یہاں بت پرستی اور بت شکنی دونوں کی روایت شدت پسندی کے ساتھ ہے۔ ذکی صاحب نے مسعود حسن رضوی صاحب پر یہی الزام لگایا ہے کہ انہوں نے عقیدت کی بنا پر واجد علی شاہ اور دوسرے نوابین اودھ کو ہیرو بنا کر پیش کیا ہے لیکن ذکی صاحب نے بھی مخالفت کی رو میں ان تصویروں کو تاریک تر بنا دیا ہے۔ غازی الدین حیدر ہوں یا واجد علی شاہ یہ سب ہمارے زوال آمادہ دور کی تصویریں ہیں۔ اگر ہم اس پورے ماحول کے پس منظر میں ان اشخاص کا مطالعہ کریں تو شاید زیادہ بہتر انصاف کر سکیں گے۔ ان نوابین کی تعیش پسندی، سماج کی بے عملی، نظام سلطنت کا کھوکھلا پن، عوام کی توہم پرستی، مذہب کے غلط تصورات، غرض یہ ایک ایسا دائرہ تھا کہ جس میں کسی ایک کو موردِ الزام ٹھہرانا غلط ہے۔ اگر ایک طرف ان نوابین کی عیاشیاں مشہور ہیں، اس دور میں اگر شاعری میں ہجویات کو عروج ملا، طوائفوں اور طبلچیوں کو درباروں میں بار ملا تو دوسری طرف شعر و ادب کی سرپرستی، غریبوں کی امداد، فنکاروں کی قدردانی کے واقعات بھی تاریخ کے اوراق میں ثبت ہیں۔

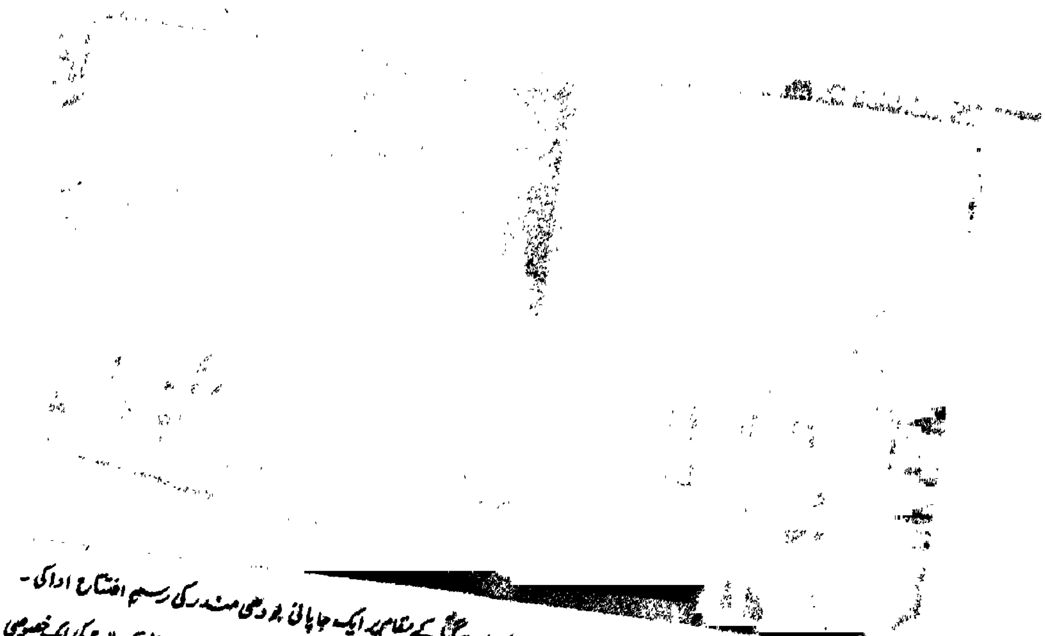
"انتخاب کلام آتش" کی اہمیت اس نقطۂ نظر سے بڑھ جاتی ہے کہ صحت متن کے ساتھ اس مشہور اور اہم شاعر کا دیوان ابھی تک منصۂ شہود پر مفقود تھا۔ آتش کے سلسلہ میں اس کام کی نوعیت آئندہ کام کرنے والوں کے لئے آغاز کی ہے۔ غالباً یہ کہنا کافی ہے کہ آتش نے لکھنؤ کی شاعری میں غزل کی آبرو رکھ لی۔

بیاض بدیع الزماں خاور چار روپے

پبلشر: بلی کے پبلیکیشنز، دریا گنج دہلی۔

بیاض بدیع الزماں خاور کی منتخب غزلوں کا مجموعہ ہے۔ اس پر محمود سعیدی صاحب کا پیش لفظ ہے۔ جس میں خاور کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں ہمدردانہ اور غیر جانبدارانہ تبصرہ ہے۔

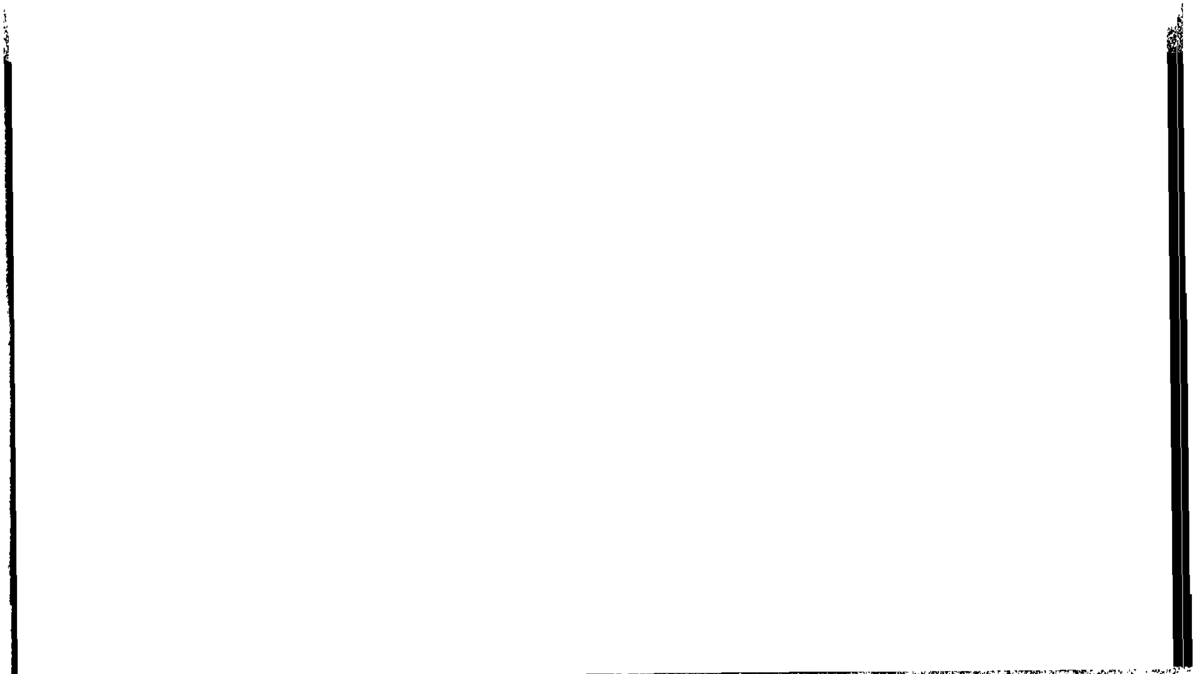
خاور غزل کے شاعر ہیں اور غزل کی ان کلاسیکی روایات کا احترام



▲ صدر جمہوریہ شری وی.وی گری نے ۶ر دسمبر ۱۹۷۲ء کو بہار میں بودھ گیا کے مقام پر ایک جاپانی بودھی مندر کی رسم افتتاح ادا کی۔

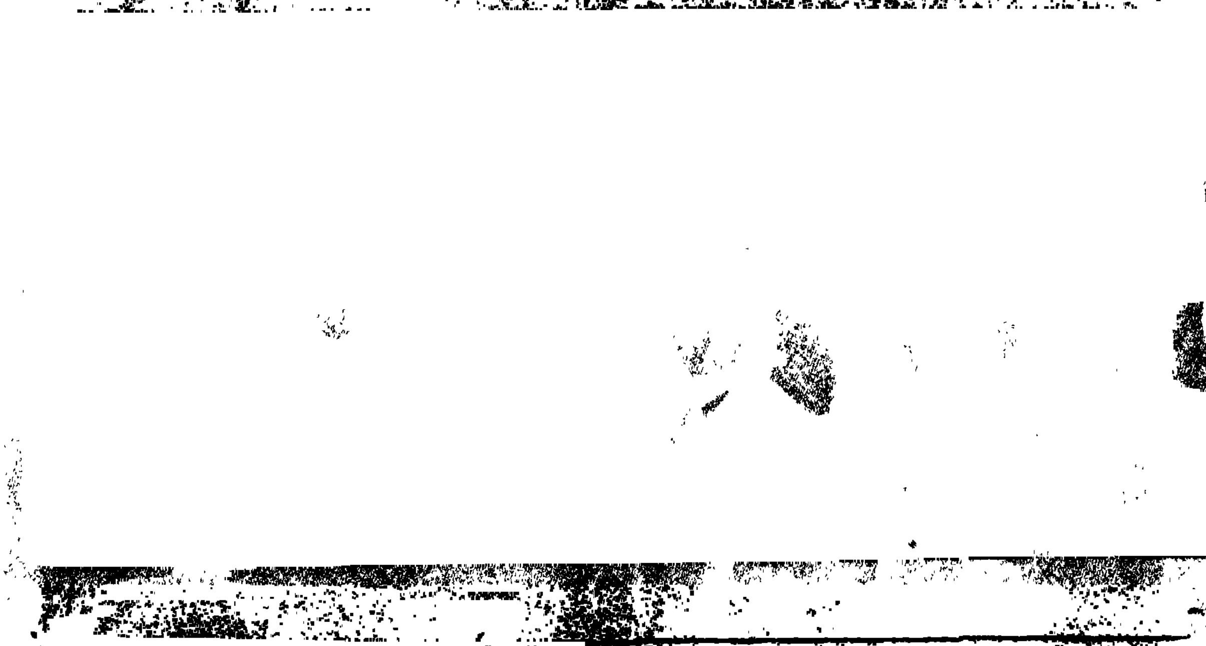
▼ صحت اور خاندانی منصوبہ بندی کے مرکزی وزیر ڈاکٹر کرن سنگھ نے ۱۱ دسمبر ۱۹۷۲ء کو آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز نئی دہلی میں دل کے امراض کے علاج کی ایک خصوصی یونٹ کا افتتاح فرمایا۔ اس یونٹ کے اعلیٰ اور جدید ترین آلات دل کے ان مریضوں کی ہمہ وقت دیکھ بھال میں مدد دیتے ہیں جن کی حالت انتہائی نازک ہوتی ہے





ہز ہائی نس پرنس کریم آغا خان اور ہر ہائی نس بیگم آغا خان نئی دہلی میں شریمتی اندرا گاندھی کے ساتھ۔

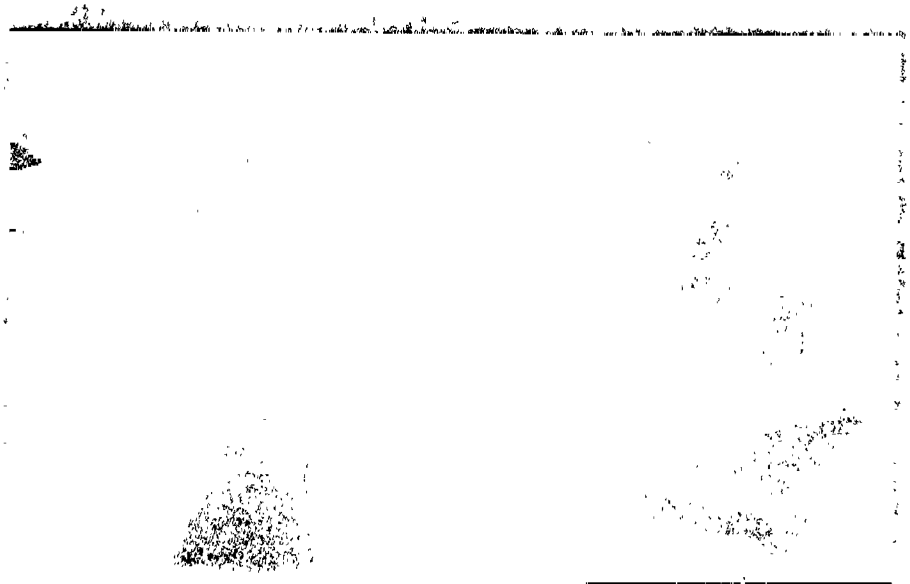
وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی نے [illegible] نئی دہلی میں [illegible] ایک بین الاقوامی مذاکرے کا افتتاح فرمایا۔



AJKAL [illegible] VOL. [illegible]
[illegible] by the [illegible], Publications [illegible], Patiala House NEW DELHI [illegible]

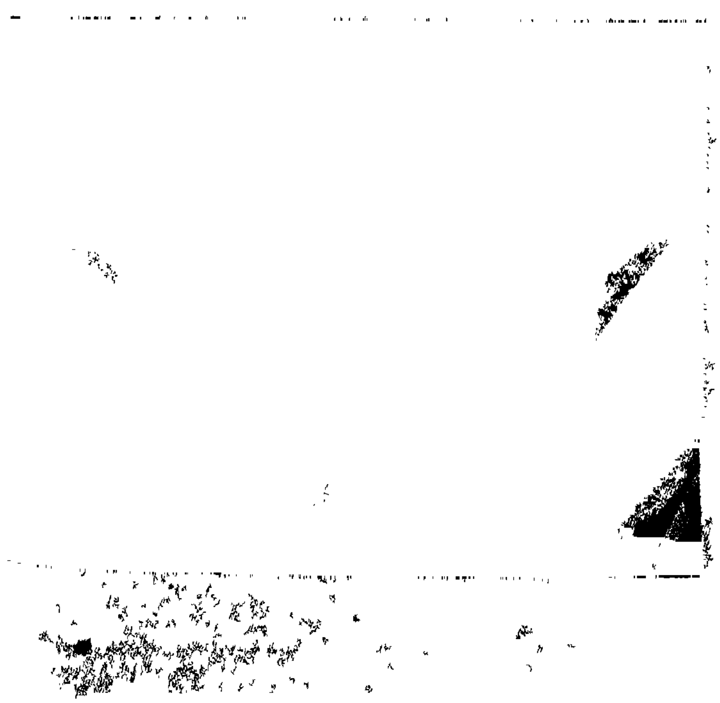
آجکل

قرۃ العین حیدر ۔ محمد حسن ۔ فیض احمد فیض ۔ عرش ملسیانی



شری مالویہ کی واپسی

۱۱ جنوری ۱۹۷۴ء کو شری کیشو دیو مالویہ ایک بار پھر مرکزی کابینہ میں شامل ہوگئے۔ اب کی بار انہیں فولاد اور معدنیات کی وزارت سپرد کی گئی ہے۔ تصویر میں صدر جمہوریہ شری وی وی گری انہیں عہدے کا حلف دلا رہے ہیں۔



توانائی کی تلاش میں ہند روسی اشتراک

کوئلہ نکالنے کی صنعت سے متعلق روسی وزارت کے وزیر ہز ایکسی لینسی مسٹر بورس فیودوروچ بریچنکو اور ہند کی بھاری صنعتوں، فولاد اور کانوں کے مرکزی وزیر شری ٹی اے پائی نے سنگرولی اور رانی گنج میں کوئلہ کی کانوں کا معائنہ کرنے کے بعد ہند میں کوئلہ کی پیداوار بڑھانے کے سلسلے میں ہند روسی تعاون پر بات چیت کی۔

اُردو کا مقبولِ عام مصوّر ماہنامہ

نئی دہلی

آج کل

ایڈیٹر

مہدی عباس حسینی

ٹیلیفون نمبر :- ۳۸۷۰۶۹

سب ایڈیٹر

نند کشور وکرم

جلد (۳۲) شمارہ (۷)

فروری ۱۹۷۴ء

ماگھ پھاگن شک سمت ۱۸۹۵

سالانہ چندہ

ایک سال :——— ۱۰ روپے

۲ سال :——— ۱۷ روپے

۳ سال :——— ۲۴ روپے

ترتیب

سرورق ـ عکس ـ برہم دیو شرما

شائع کردہ

ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیلِ زر کا پتہ

بزنس منیجر پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱

[illegible]

اداریہ

اُردو ایڈیٹروں کے مطالبے

آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس منعقدہ ۱۸ تا ۱۹ نومبر ۱۹۷۲ء لکھنؤ کی مفصّل قرار دادیں اب طبع ہوکر سامنے آئی ہیں۔

اجلاس میں پچاس سے زیادہ تجاویز منظور ہوئیں۔ کاش کہ کوئی سینیئر مدیران تجاویز کو ایڈٹ کر دیتا تو ان کی تعداد بھی کم ہو جاتی، تاثر بھی بڑھ جاتا اور ان پر عمل درآمد کرنے اور کرانے میں بھی آسانی ہوتی۔ بہرحال ان تجویزوں میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ اُردو صحافت کے مسائل پر غور کرنے کے لئے ایک کمیشن قائم کیا جائے۔ صحافیوں اور خوشنویسوں کے لئے تربیتی کورس قائم کئے جائیں جو علی گڑھ، جامعہ ملیہ، دِلّی اور عثمانیہ یونیورسٹی میں کھولے جاسکتے ہیں۔ خوش نویسی کو دستکاری کی طرح امداد دی جائے۔ چھوٹے اُردو اخباروں کے عملے کو مفت طبی امداد فراہم کی جائے۔ اُردو صحافیوں کو سرکاری تسلیم شدگی ACCREDITION ؛ حاصل کرنے میں سہولت دی جائے۔ نہ صرف ڈی اے وی پی بلکہ ریاستی سرکاروں اور مقامی اداروں سے اردو پریس میں زیادہ فراخ دلی سے اشتہارات دیئے جائیں۔ اُردو اخبارات کے خلاف دفعہ ۱۵۳ الف کے تحت جو کارروائی ہو رہی ہے اس کا جلد تصفیہ کیا جائے جس طرح سنڈیکیٹ بینک حیدرآباد نے صحافیوں کو قرضے دینے کی سہولتوں کا اعلان کیا ویسے ہی دوسرے بینکوں سے بھی یہ قرضے ملنے چاہئیں، بلکہ پریس قائم کرنے کے لئے بھی۔ اُردو ٹیلی پرنٹر سروس مہیا کی جائے۔

ایک اور اہم تجویز یہ ہے کہ اُتر پردیش کے عام انتخابات سے پہلے حکومتِ ہند اردو کو اُتر پردیش، بہار، پنجاب، دہلی، راجستھان، مدھیہ پردیش، آندھرا پردیش، کرناٹک، مغربی بنگال، ہریانہ وغیرہ میں دوسری سرکاری زبان قرار دینے کے لئے قانون سازی کرے۔

اُردو صحافیوں نے یہ طے کیا کہ اُردو مدیروں کا ایک کمیشن اس کی دیکھ بھال کرے گا کہ اُردو صحافیوں کو وقتاً فوقتاً جو یقین دہانیاں دی جاتی ہیں ان پر کہاں تک عمل ہو رہا ہے۔ اسی طرح ایک کمیٹی اس پر نگاہ رکھے گی کہ اُردو تعلیم کے متعلق ریاستی حکومتیں جو سرکلر وغیرہ جاری کرتی ہیں ان پر واقعی عمل ہوتا ہے یا نہیں۔ کانفرنس کی کچھ اور تعمیری تجویزیں یہ ہیں: اُردو صحافت کی تاریخ مرتب کرنا، اُردو اخبارات کی خریداری کے فروغ کا ہفتہ منانا، اُردو میں پتے لکھنے کی مہم چلانا، اخبارات میں معلوماتی مضامین شائع کرنا اور جمہور و مزدور کے حقوق کے تحفظ کے لئے ہمیشہ کوشاں رہنا۔ ہمیں ان تمام تعمیری تجاویز سے مکمل اتفاق ہے۔

ریاستی الیکشن

فروری میں کئی ریاستوں میں نئے الیکشن ہوں گے اور ایک بار پھر عوام کو ذمہ داری سے فیصلہ کرنا ہوگا کہ انہوں نے جن نمائندوں کے ہاتھ میں اپنی تقدیر سونپی تھی وہ اور اُن کی پارٹی اور اس پارٹی کی پالیسیاں کس حد تک ان کی حالت کو بہتر بنا سکی ہیں۔ کس حد تک اُن کی کوششیں ناکام ثابت ہوئی ہیں اور کیا ان لیڈروں اور اُس پارٹی کا کوئی نعم البدل ممکن ہے۔

الیکشن کے پہلے جو وعدے کئے جاتے ہیں یا جو پروگرام سامنے رکھے جاتے ہیں ہمیں ان سے سروکار نہیں۔ ہماری رائے میں تو ہر ہندوستانی کے بنیادی مسائل حسب ذیل ہیں:

۱۔ پیداوار بڑھا کر غریبی اور بے روزگاری کو کم کرنا۔
۲۔ قومی کردار کی تشکیل۔
۳۔ قومی یکجہتی کو فروغ دینا
۴۔ سماجی انصاف یا دولت کی غیر برابر تقسیم کو کم کرنا۔
۵۔ سب پچھڑے ہوئے طبقے کو آگے بڑھانا۔

ان میں سے دو مقاصد اقتصادی نوعیت کے ہیں تو تین انسانی نوعیت کے۔ دراصل بنیادی طور پر ہر انسان ہنسی خوشی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے شرطِ اول بہرحال ضروریاتِ زندگی کا پورا ہونا ہے۔ آج ہمیں جو ضروریاتِ زندگی کی کمی محسوس ہو رہی ہے، اس کی اصلی وجہ یہ نہیں ہے کہ خدانخواستہ ۱۹۴۷ء کے مقابلہ میں ہمارے پاس غلّہ، کپڑا، مکان، گھی، تیل، نون لکڑی وغیرہ کم ہے۔ دراصل یہ چیزیں ہمارے پاس پہلے سے کہیں وافر ہیں لیکن چونکہ ہمارا معیارِ زندگی بلند تر ہو چکا ہے، لہٰذا ہمیں ان کی کمی کا احساس ہونے لگا ہے اور یہ احساس اچھا بھی ہے بشرطیکہ اسے مثبت طور پر استعمال کیا جائے، یعنی اور زیادہ محنت کرکے پیداوار اور آمدنی میں اضافہ کیا جائے نہ کہ اسے منفی طور پر ایک بہانہ بنا کر دوسروں پر غصہ اُتارا جائے۔ اقتصادی پہلو کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سے بھی زیادہ سچّی خوشی انسانی تعلقات پر منحصر ہے اگر گھر کا ماحول اچھا ہے کنبہ (کنبہ) چھوٹا ہے، بچوں کو تعلیم اور صحت میسر ہے پڑوسیوں سے تعلقات اچھے ہیں، حاجتمندوں کی مدد کرنے کا حوصلہ ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمیں وہ اطمینانِ قلب حاصل نہ ہو سکے جس کے لئے بقول مشرق ہمیشہ مالدار مغرب سے زیادہ مشہور رہا ہے۔ ... یہی باتیں مل کر وہ پانچ مقاصد بن جاتے ہیں جن کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے اور جو ہمیشہ ہمارے سامنے رہنے چاہئیں۔

قرۃ العین حیدر
آشا محل۔ نوروجی۔ گمباڈیا روڈ۔ بمبئی ۳۶

کارِ جہاں دراز ہے

فصل سوم

باب ۱ نیچری فوج

چوگوشیہ ٹوپی اوڑھے بوسیدہ فرغل میں ملبوس تاجیک نژاد بوڑھا پھونس قصہ گو اب قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے۔ مقبرۂ مبارز اللہ خاں کے گنبد اور میر بندے علی ترمذی کے پھاٹک کے سائے طویل ہو چلے۔ دہشت زدہ ہو کر جھیل پار شہرِ خموشاں پر نظر ڈالتا ہے۔ اس کے قدردان محوِ خواب ہوئے۔ اوروں نے دنیا سنبھالی۔ اپنے بھی اب اجنبی سے نظر آتے ہیں —— یہ پیر مرد اس جہانِ گذراں کے ایک مختصر سے دَور یعنی صرف بارہ سو (۱۲۰۰) سال کی ایک کہانی سنا رہا تھا لیکن دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ نئے لوگ اس سے اکتا گئے۔ کسی کو اس کی حکایات کی مطلق ضرورت نہیں۔ لہٰذا کرم خوردہ خبروں کا بستہ لپیٹ کر عدم کی تاریکی میں لامکاں میں داخل ہو جائے گا جہاں نہ گفتگو ہے نہ جستجو۔

یہ دل شکستہ فاقہ کش بوڑھا دوبارہ کبھی نظر آئے گا کہ صورتیں، شخصیتیں اور انجمنیں اسی طرح مٹتی ہیں۔

محلۂ سادات، حکیمان، رسولدارا ن، تیرگران وغیرہ وغیرہ کے ٹکڑوں پر نئی ٹاؤن ایریا کمیٹی کے نصب کئے ہوئے لیمپ ٹمٹماتے ہیں۔ گو کہ کہیں کہیں اکا دکا مشعل اب بھی جل رہی ہے۔

فصلِ اول میں اس قصبہ نہٹور ضلع بجنور کے دو بھائیوں میر بندے علی ترمذی و میر احمد علی کا قصہ بیان کے بزرگوں کی داستان کے بیان کیا گیا۔ غدر میں میر احمد علی کالے خاں کی باغی فوج میں شامل ہو گئے تھے۔ پھانسی کی سزا ملی۔ جاں بخشی ہوئی۔ احمد علی کے بیٹے جلال الدین حیدر نے اپنے لڑکوں کو ان کے بچپنے ہی میں نیچری فوج میں بھرتی کر دیا کہ زمانے کا تقاضا یہی ہے۔ کول کی نئی چھاؤنی میں یہ فوج تعینات ہے۔ اس کے سالارِ اعلیٰ نے چالیس سال قبل میر احمد علی اور ان کے رفقاء کی زبردست مخالفت کی تھی۔ وہ بھی وقت کا تقاضا تھا۔ مؤرخین۔ نقاد۔ سیاستدان۔ اہلِ بصیرت اپنے اپنے فیصلے بعد میں صادر کریں گے۔ اکبر نے فرمایا:۔

علی گڑھ کو شرف بخشا ہے اقبالِ نصاریٰ نے
کہ جو مسلم اٹھا شوقِ ترقی میں یہیں آیا

اس صورتِ حال میں مجبوری اور تضاد یہ ہے کہ لسان العصر خود بھی خان بہادر اور جج ہیں۔ اپنے بیٹے کو گویا مئو یا خیرآباد کے مدرسے بھیجنے کے بجائے لندن میں پڑھوا رہے ہیں۔

ع کہ عجم کے میکدوں میں نہ رہی مئے مغانہ

اکبر موجودہ المیے کے لئے گویا یونانی کورس ہیں۔ سماجی شعور بھی رکھتے ہیں۔ شیخ جی۔ بدھو۔ فتو۔ وفاتی اور بھائی صتو کا غم کھاتے ہیں۔ گورنر۔ کیمپ۔ ڈنر۔ مس۔ کلیسا۔ بشپ۔ آنر۔ پائنیر اخبار۔ کونسل۔ چندہ۔ بینڈ۔ مال روڈ۔ ہوٹل۔ نئی المناک علامتیں ہیں۔ ہر شعر پر دل خون ہوتا ہے۔

چند سال بعد آنہ ایک اور دیوزاد کے ذریعے گرج کے پوچھے گا۔ اگر نہ سمتا تو شریکِ محفل ــ وغیرہ اور وہ دیوزاد بھی بقیہ دانشوروں کی مانند مشرق کے اس اجتماعی نوسٹلجیا کا شکار رہے گا۔

ایک بات پوچھوں۔ سب مغل۔ مرہٹے۔ سکھ یورپین۔ فوجی ماہرین سے اپنے لشکروں کی تربیت کروانے میں جٹ گئے تاکہ مزید ایک دو سے کا خون بہا کر سکیں۔ کسی کو روس کے پیٹرِ اعظم یا مصر کے محمد علی کی مانند یورپ کی یونیورسٹیوں اور جدید صنعتوں سے فائدہ اٹھانے کی کیوں نہ سوجھی۔ اب جو مارسین۔ براؤن بک۔ آرنلڈ۔ ایونگ وغیرہ صاحبان گماگ امپیریلسٹ یا متعصب مشنری آپ کی ہونہار اولاد کو پٹی پڑھا رہے ہیں۔ ان پر اعتراض کیوں۔ صاحب بات یہ ہے کہ گستاخی معاف۔ آپ کے محترم اجداد کو محض جاہ پرستی، ملوکیت اور اقتدار سے دلچسپی تھی۔

کہنے لگے "تحقیرِ مولوی نہ کرائیے گریجویٹ"
مگر صاحب معاف فرمائیے گا آج کی دُنیا مولوی کے بس کا روگ نہیں۔

کشورِ ہند یک بیک قرونِ وسطیٰ سے نکل کر دورِ جدید میں داخل ہو چکا ہے۔ سید اور اس کے ساتھی سب کے سب جدید مولوی ہیں اور نئی دُنیا کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان نئے مولویوں کی عظمت کا اندازہ آج سے نصف صدی بعد ہی ہو سکے گا۔ علاوہ ازیں اگر آپ صاحبان ابھی غدر سے پہلے کی دنیا لئے بیٹھے ہیں آج ۱۹۰۰ء کے برٹش انڈیا کے انڈر گریجویٹ نوجوانوں کے ذہنوں ان کے ولولوں دلچسپیوں کا اندازہ کس طرح کر سکتے ہیں۔

۱۹۰۰ء کے لگ بھگ نوجوان میر بندے علی ترمذی بیل تانگے میں سوار ہو کر نہٹور سے دلی مدرسۂ فتحپوری میں درسِ نظامیہ کی تکمیل کے لئے تشریف لے گئے تھے۔

بڈھا قصہ گو ۱۸۹۸ء کی ایک رات لالٹین ہاتھ میں لے کر اس کچے راستے پر چلتا نہٹور سے روانہ ہو کر دلی کے نواح میں کول پہنچا ہے۔

دونوں وقت مل رہے ہیں۔ کالج کی مسجد سے ابھی اذان کی صدا بلند ہوگی۔ میدان میں کرکٹ کھیلنے کے بعد لڑکے اپنے کمروں کی طرف جا چکے ہیں۔ لالٹین کی لو ذرا اونچی کرو تو سامنے کلی پارک ہے۔ ایک اور علامت۔ علامتوں سے بچو خطرناک ہیں۔ جب مرہٹے دلی کے حاکم تھے۔ سندھیا کی فوج یہاں تعینات تھی۔ اب مرہٹے پونا اور بمبئی کے نئے کالجوں میں سر جھکائے وہی انگریزی نصاب پڑھنے میں منہمک ہیں جو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ میں پڑھایا جا رہا ہے۔ میرے عزیزو۔ اس نکتے پر بھی غور کرو اور سوچو۔

بارش ابھی ہو تھمی ہے۔ سوندھی سوندھی خوشبو فضا میں طاری ہے۔ کالج کی عمارتیں اندھیری رات میں برساتی جگنوؤں کی طرح مدھم مدھم جھلملا رہی ہیں۔ جب سید گزٹ لے کر اُٹھے گھر گھر جا کر بھیک مانگی تب یہ چند گھروندے جا کر کھڑے کیے۔

پیر مرد تاجیک نژاد بیوقوف نہیں ہے۔ میکالے کا نام سن چکا ہے۔ عصا ٹیکتا سیدھا لائبریری پہنچا ہے۔ جہاں لیمپ روشن ہیں۔ ایک میز پر بیٹھ کر قلم اٹھاتا ہے۔ بستے سے پیلے کاغذات نکالتا ہے۔ اچانک غصے سے ان کو نیچے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتا ہے۔ پھر ذرا کی ذرا توقف کرتا ہے۔ ممکن ہے حاشیوں کے لئے ان قدیم ملفوظات، شجروں، حکایتوں، عجائب القصص کی حاجت ہو۔ جھک کر لرزاں ہاتھوں سے وہ کاغذ چنتا ہے۔ واپس داخلِ دفتر کر دیتا ہے۔ جب تک زندہ ہے انہیں حرزِ جان بنائے رہے گا۔ گو خراسان کے قدیم داستان طرازوں کی طرح جان گیا ہے کہ اس کا زمانہ ختم ہوا۔ اور اب کوئی ابوالقاسم فردوسی طوسی اس کی ترجمانی اور ہمنوائی کے لئے نہیں آئے گا۔

لیکن یہ کہن سال قصہ گو جس کا دوسرا نام وقت ہے بڑا کائیاں ہے۔ فرنگیوں کے بنوائے ہوئے اس کتب خانے میں داخل ہو کر اسے معلوم ہو چکا ہے کہ اندازِ بیان، موضوع اور اسالیب بدل گئے۔ یہ بہادر شاہ ہے نہ ہندوستان جنت نشان۔ یہ برٹش انڈین ایمپائر ہے اور وہ خود اب وکٹورین انگلستان کے باسی تہامس اسالیب کی نقل کرنے والا ایک کولونیل ادیب۔

چنانچہ اب وہ "بطرز جدید" ناول لکھے گا۔

باب ۲ - پکی بارک کے "چہار درویش"

ع بیا لے خانۂ نیرنگ پرواز ——— آہا ہا مہتاب عالم تاب نے اچانک زمین و آسمان منور کر دیئے۔ ہوا لطیف و خوشگوار۔ دل میں عجیب مسرت و فرحت پیدا کر رہی ہے۔ ہمارا ناولسٹ دوست مناظرِ فطرت سے لطف اندوز ہوتا لائبریری سے نکل کر صحن چمن سے گذرتا ایک بورڈنگ ہاؤس کی سمت روانہ ہوتا ہے۔ چہار طرف زمین زمرد رنگ، کوہ زمرد کے ہم سنگ۔ تبارک اللہ یہ باغ جنات ہے یا روضۂ رضوان۔ در و دیوار ندرت بار۔ مشاطۂ صبا گلکار۔ سلیمانی ٹوپی پہن کر ہمارا ناولسٹ دوست ایک بلڈنگ کے ورانڈے میں پہنچ کر کمروں میں جھانکتا ہے۔ ہر روم کے اندر نوجوانانِ چمن مصروفِ مطالعہ ہیں۔ ایک دروازے پر پہنچ کر ٹھٹکتا ہے۔ اندر کا سین دیکھتا ہے۔ اینٹوں کا فرش، سیلی ہوئی دیواروں کے نزدیک تین چارپائیاں سرہانے بے روغن کی میزیں، ایک ایک کرسی، کھونٹیوں پر کپڑے۔ ٹرکش کوٹ، ترکی ٹوپیاں، چارپائیوں کے نیچے ٹرنک اور مُدّاسن کے بوٹ۔

پچھلے سال ترکی اور یونان میں پھر جنگ چھڑی۔ ادہم پاشا یونانیوں کو شکستِ فاش دے چکے ہیں۔ بارہ تیرہ سال قبل جنگِ روس و ترکیہ نے ہندی مسلمانوں کے لئے بہت ہیرو سپلائی کئے تھے۔ اس وقت وہ دیکھئے۔ دیوار پر جنرل ادہم پاشا کی تصویر فریم میں مسکرا رہی ہے۔ یہ وہ بدبخت زمانہ ہے جب ہندوستان ۱۸۵۷ء کے سورماؤں کا نام بھی نہیں لے سکتا۔ ان پر فخر کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ترکی بہرحال سلطنتِ مغلیہ کا بہترین جذباتی نعم البدل ثابت ہوا ہے۔

اسی تصویر کے نیچے ایک تپائی پر بڑا لیمپ روشن ہے۔ اس کے چینی گلوب پر انگور کے خوشے بنے ہیں اور ایک قدیم یونانی حسینہ بربط بجا رہی ہے۔

برسات کی رت پتنگے اور اللہ میاں کی بھینسیں یعنی جھینگل (انگریزی نام) لیمپ کے طواف میں مصروف۔ فرش پر لال بیگ یعنی کاکروچ (انگریزی نام) رواں ہے۔

سچ پوچھئے تو بڑا خستہ حال سا ماحول ہے۔ مگر ایک نادار قوم نے اپنے نونہالوں کے لئے یہی میسر کر لیا۔ غنیمت ہے اسی سال چند ماہ قبل ہمارے قابلِ فخر محسنِ قوم ایجوکیشنسٹ آنریبل سر سید احمد خاں نے رحلت فرمائی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

تین نوجوان جنٹلمین اپنی اپنی چارپائیوں پر نیم دراز اسٹڈی میں مشغول نظر آتے ہیں۔ آئیے ذرا نزدیک جا کر دیکھیں کیا پڑھ رہے ہیں۔ ادھر یہ شکیل سرخ و سفید خوبرو نوجوان کون ہے۔ ہو نہ ہو یہی ہمارا ہیرو ہے۔ یعنی مسٹر ایس ایس حیدر[1] ہاتھ میں ایک ناول ہے جو کسی اجنبی زبان میں لکھا ہے۔ حروف مانوس نہیں لیکن زبان نہ عربی نہ فارسی، آہا ہا۔ کیا خوب یاد آیا ؎

نہ عربی نہ فارسی نہ ترکی۔ یہ تاریخ کہی ہے کس اُلّو کی

تو شاید یہ ترکی ہے۔ خیر جو بھی ہے ابھی ہم اس کا پتہ چلا لیں گے۔

دوسرا ینگ جنٹلمین پانیر اخبار پڑھ رہا ہے۔ شکل سے بہت جوشیلا اور ذہین معلوم ہوتا ہے۔ کیوں نہ ہو۔ اس کا نام محمد علی جوہر ہے۔ تیسرا نوجوان البتہ ہم نہ پہچان سکے۔ محمد علی اس سے مخاطب ہوتے ہیں۔

بھلا: سنیں تو سہی یہ علی گڑھ کے کھلنڈرے کیا باتیں کر رہے ہیں؟

محمد علی: دیا نیر اخبار زمین پر پھینک کر بھائی سجاد کیوں نہ اب سویا جائے۔

سجاد: ضرور۔ لیمپ بجھا دو۔

---

[1] یہ قصہ یلدرم نے مجھے خود سنایا تھا۔ (ق ح)

محمد علی (دوسرے نوجوان سے) میاں صاحبزادے، لیمپ بجھا دیجئے۔

دوسرا نوجوان: آپ خود بجھا دیجئے۔ ہم سو رہے ہیں۔

محمد علی: لیمپ بجھا دو میاں صاحبزادے۔

نوجوان پھر اپنی بات دہراتا ہے۔ محمد علی زقند بھر کر میز کے قریب پہنچتے ہیں لیمپ اٹھا کر لڑکے کے پاس لے جاتے ہیں۔ یہ اصرار کرتے ہیں وہ انکار۔ پھر چشم زدن میں وہ بھی پلنگ سے کود کے لڑکے سے باہر۔ محمد علی لیمپ ہاتھ میں لئے پیچھے۔ سجاد حیدر ان دونوں کے تعاقب میں۔ تینوں کا جلوس صحن میں پہنچتا ہے۔ دوسرے کمروں سے لڑکے نکل کر جلوس میں شامل ہو جاتے ہیں۔ لڑکا سب سے آگے۔ چراغ بکف محمد علی نعرہ لگاتے اس کے پیچھے۔

اس نوع کے چند اور چٹکلے، لطائف و ظرائف اس دور کے علی گڑھ کی سٹوڈنٹ لائف کے قابل شنید ہیں مگر چونکہ اس قصے کے پلاٹ کا تعلق ہمارے ینگ ہیرو سجاد حیدر سے ہے جو ہمارے اولڈ ہیرو میر احمد علی ترمذی کے پوتے ہیں لہذا کیوں نہ ہم اُن کے ہم صفیران چمن سے درخواست کریں کہ وہ اپنے دوست کے بارے میں فرمائیں۔

ہمارے یہ ذکی و فہیم و خوش رو ہیرو جو ۱۸۸۰ء (قمری حساب سے غالباً ۱۸۷۹ء) میں بمقام نہٹور پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم شہر بنارس میں حاصل کی جہاں اُن کے والد ماجد بحیثیت ڈی ایس پی و کوتوال شہر تعینات تھے۔ ۱۸۹۴ء میں ذیلی جماعت میں مدرسۃ العلوم میں شامل ہوئے۔ سید کے کالج کے ذہین ترین اور سب سے خوش پوش طلبا میں شمار کئے جاتے ہیں۔ فی الوقت بی اے میں پڑھ رہے ہیں حیدر حسن، محمد حیات، رمضان علی اور سجاد حیدر "چہار درویش" کہلاتے ہیں۔

رضا علی ایف اے میں سجاد حیدر کے منجھلے بھائی نصیر الدین حیدر کے ہم جماعت ہیں۔ سب سے چھوٹے بھائی وحید الدین حیدر کے ایک ہم جماعت اور یار غار سید محمودؒ ابھی سے ابھی سے "محمود قوم" کہلا رہے ہیں۔

اب ہم آپ کو مسٹر ایس رضا علی سے انٹروڈیوس کراتے ہیں۔ یہ بلند اقبال صاحبزادے کندرکی ضلع مراد آباد سے آئے ہیں اور اس ماحول کے پروردہ ہیں جس کا نقشہ فصل دوم کے ابواب میں کھینچا گیا ہے۔ لہٰذا راوی اب چینی کی تڑی گویا لیمپ محمد علی جوہر کے ہاتھ سے لے کر سید رضا علی کے سامنے رکھتا ہے۔

ع مطرب بگو کہ کارِ جہاں شد بکامِ ما

سید رضا علی: میری پہلی ملاقات سجاد حیدر سے جولائی ۱۸۹۰ء میں ہوئی حیدر حسن اور سجاد حیدر فرسٹ ایئر میں پہنچ گئے تھے۔ محمد حیات کی شگفتہ مزاجی کا اظہار خاص خاص دوستوں ہی میں ہوتا تھا۔ یہ تینوں بی اے میں پڑھ رہے تھے۔ سجاد حیدر انگریزی اور اردو دونوں بڑی اچھی لکھتے اور بولتے تھے۔ انشا پردازی کی سنہری لڑیوں میں موقع محل سے ظرافت اور بذلہ سنجی کے موتی پروتے تھے۔ انگریزی زبان کا اچھا ناول شاید ہی کوئی پڑھنے سے بچا ہو۔

نصیر الدین حیدر کے دوست محمد ادریس، عبدالوہاب (ر لے۔ ڈاکٹر ضیا الدین) اور محمد سبطین تھے۔ نصیر کا بھی انٹرنس کے امتحان میں سارے صوبے میں دوسرا نمبر تھا مگر علی گڑھ کے ماحول میں پڑھنے والوں کی قدر نہ تھی۔ نصیر پر بھی اس کا اثر یہ ہوا کہ پڑھنے میں ڈھیل ڈال دی اور پھر کسی امتحان میں کوئی امتیاز حاصل نہیں کیا۔

" محمد ادریس کے بڑے بھائی محمد ابراہیم سجاد حیدر کے دوست تھے۔ ایک قصہ سناؤں جس سے معلوم ہوگا کہ اس دور کے علی گڑھ کا کیا رنگ تھا۔ ۱۸۹۶ء کی بات ہے۔ ادریس ابھی علی گڑھ پہنچے ہیں۔ سجاد حیدر کے کمرے میں آکر بیٹھے ہیں۔ کچھ اور طالب علم بھی وہاں موجود ہیں۔ جن میں محمد شاکر کے فرزند بھی ہیں جو بعد میں بیرسٹر ہوئے۔ شاکرؔ بڑے نٹ کھٹ تھے۔ ادریس سے پوچھا

"آپ کا نام؟"

" ادریس نے جواب دیا " محمد ادریس۔"

" کہنے لگے "بجا ہے"۔ کوئی دو منٹ تک خاموش رہے۔ اس کے بعد ایک چپت غریب ادریس کو رسید کیا۔ ادریس نے ایک آدھ منٹ غور کیا کہ اس تواضع کا جواب زبان سے دوں یا ہاتھ سے، اگر تشدد کا جواب تشدد سے دیا تو شاکر کا کچھ نہ بگڑے گا۔ سالان سے یہاں سب واقف ہیں۔ بدنامی میری ہوگی کہ آتے ہی ہاتھا پائی شروع کر دی۔ بگڑ کر کہا "یہ کیا بدتمیزی ہے۔ مجھ سے آپ کی بے تکلفی نہیں ہے۔"

شاکر کا خیال صحیح نکلا۔ اس دن سے دونوں بے تکلف دوست ہو گئے۔

"ظفر عمر نئی بارک میں رہتے تھے۔ فٹ بال خوب کھیلتے تھے۔ بارہ بنکی کے چودھری نعمت اللہ اور پنجاب کے ملک زماں مہدی ہم سے تین درجے اوپر تھے۔ سید ابو محمد بھی اسی زمانے میں تھے وہ بعد میں خان بہادر اور ممبر یو۔پی پبلک کمیشن ہوئے۔ بارہ بنکی کے ولایت علی بمبوق بھی ہم عصر تھے۔ انہوں نے بمبوق کلب قائم کیا۔ تحریر میں بلا کی شوخی تھی۔ بعد میں کامریڈ میں طنزیہ اور مزاحیہ مضامین لکھتے رہے۔ عین جوانی میں انتقال کیا۔ مسعود الحسن (مسعود تمامی) بھی جواں سال مرے۔ مراد آباد کے محمد یعقوب (بعد میں سر یعقوب) میر ولایت حسین، سردار محمد حیات سجاد حیدر کے دوسرے ساتھی تھے۔

"محمد حیات خاں، مشتاق احمد زاہدی اور حیدر حسن مرحوم بھی اس زمانے کے علمی ذوق رکھنے والے طلبا میں سے تھے بی اے پاس کرنے کے بعد مشتاق احمد

ڈاکٹر سید محمود

نے علی گڑھ چھوڑ دیا مگر دوستوں سے ملنے اکثر علی گڑھ آتے تھے۔ یہ سب حضرات علی گڑھ کی زندگی کے بڑے نقاد تھے۔ علی گڑھ میں اس وقت تک کوئی ایسا انتظام نہ تھا کہ کوئی ہونہار طالب علم کسی خاص مضمون میں کمزور ہو تو اس کمزور مضمون کی طرف اساتذہ خاص توجہ کرتے۔ سجاد حیدر ریاضی سے بہت گھبراتے تھے۔

نواب حاجی اسمٰعیل خاں رئیس دتاؤلی سرسید کے بہت مخلص اور روشن خیال دوست تھے۔ ان کے والد ہجرت کر کے ترکی چلے گئے تھے۔ جو اس زمانہ میں دولت عثمانیہ شامل تھا۔ وہیں نواب اسمٰعیل خاں نے ترکی پڑھی جو عربستان کی سرکاری زبان تھی ترکی کے ماہر ہو کر ہندوستان لوٹے۔ سرسید کے شائع کردہ "تماشائے عبرت" میں ترک کا پارٹ انھوں نے ہی ادا کیا۔ یلدرم اس وقت ایف اے کے طالب علم تھے جب نواب اسمٰعیل خاں کے سکریٹری بن گئے۔ ان کو انگریزی پڑھاتے اور خود ان سے ترکی سیکھتے۔

نواب اسمٰعیل خاں اردو اور فارسی میں بڑا ذوق رکھتے تھے اور علی گڑھ سے ایک رسالہ نکالتے تھے جس کا نام "معارف" تھا۔ اس کے ایڈیٹر مولوی وحیدالدین سلیم تھے اور اسسٹنٹ ایڈیٹر سجاد حیدر۔ مولوی صاحب اور محمد علی نے سب سے پہلے اردو داں اخبار بیں حضرات کو سیاسی مسائل کے سادہ دسترخوان پر ادب کی چاشنی کی لذت سے آشنا کیا۔

سجاد حیدر معارف[1] میں خود بھی مضمون لکھتے تھے اور انگریزی رسالوں کے اعلیٰ مضامین کا ترجمہ بھی کرتے تھے۔ ۱۸۹۶ء سے ۱۸۹۹ء تک "معارف" میں سجاد نے چند طبعزاد افسانے لکھے۔ علی گڑھ کا پہلا دور ۱۸۷۵ء سے شروع ہو کر ۱۸۹۵ء میں ختم ہوا۔ دوسرے دور کا آخری سال ۱۹۱۵ء اور تیسرے کا ۱۹۲۵ء سمجھنا چاہیے۔

دوسرے دور کے طلبا میں سجاد حیدر کا مرتبہ بلحاظ علمی قابلیت بہت بلند تھا۔ مطالعے کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ ہماری قومی زندگی میں جن نئے خیالات کو مفید سمجھتے تھے ان کی زبردست تائید تحریر و تقریر کے ذریعے کرتے تھے۔ رواداری کا یہ عالم تھا کہ دوسرے کی بات سننے اور اس پر عمل کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ بڑے خوش خلق اور سادہ مزاج تھے۔ تعلیم نسواں کے بڑے زبردست حامی تھے کھیل کود سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ مسٹر تھیوڈور بیک کے چہیتے طلبا سب کھلاڑی تھے جن کو علمی مذاق سے کوئی سروکار نہ تھا۔ انگریز کی پالیسی تھی کہ علی گڑھ کے لڑکوں کو سنجیدہ علمی مذاق سے دور رکھا جائے اور کھیل کود کا شوقین بنایا جائے۔ مسٹر بیک کہتے تھے کہ رنجیت سنگھ اور جام صاحب نوانگر کرکٹ کے کھلاڑی دادا بھائی نوروجی ممبر برطانوی پارلیمنٹ سے زیادہ اہم ہیں۔ جو انجمن الفرض کے لئے زیادہ چندہ جمع کرے اس کی بھی قدر کی جاتی تھی۔

محمد علی کی قدر اس وجہ سے تھی کہ وہ کرکٹ کے کپتان تھے۔ مسٹر بیک کی زبردست شخصیت نے اس مذموم رجحان کو یہاں تک پھیلایا کہ ذوق ادب اور کھیل کی قدر و قیمت کا جائزہ لینے کے بحث پر شوکت علی نے "تہجاب انبوہ" میں ایک مضمون لکھا تو بجائے اپنا نام لکھنے کے اپنا ادبی لقب بڑے فخر سے "مستنڈا وحشی" مضمون کے آخر میں درج کیا۔

"اس ماحول میں سجاد حیدر کتاب کے کیڑے تھے۔ ادبی ذوق رکھنے والے طلبا کی موجودگی روا رکھی جاتی تھی مگر قابل تحسین نہ سمجھے جاتے تھے۔ خواجہ غلام الثقلین مورد عتاب رہے۔ مسٹر ماریسن نے ایک حد تک اور نواب محسن الملک نے طلبا کی قدر ان کی علمی قابلیت کے بموجب کی۔

"بقول پروفیسر آرنلڈ سجاد حیدر کا شمار کالج کے ہونہار ترین طلبا میں تھا اور وہ اپنی قابلیت کی وجہ سے معاصرین میں ممتاز تھے۔ سجاد حیدر "انجمن اخوان الصفا" ممبر تھے جو پروفیسر آرنلڈ نے قائم کی تھی۔ پروفیسر صاحب موصوف عربی جبہ پہن کر کالج کے جلسوں میں شرکت کرتے تھے۔ اس سال یعنی ۱۸۹۸ء میں سر طامس آرنلڈ لاہور چلے گئے جہاں وہ اقبال کے استاد بنے۔ ۱۸۹۹ء میں پرنسپل تھیوڈور بیک کا انتقال ہوا اور ان کی جگہ سر تھیوڈور ماریسن (بعد میں لارڈ ماریسن) کالج کے پرنسپل ہوئے۔

"لیڈی ماریسن نے چند طلبا کو ستھرے مذاق کی تعلیم دلوانے کے لئے درجہ کھولا۔ سجاد حیدر، ابو محمد، اعجاز علی، محمد عظمت اللہ وغیرہ موصوفہ سے درس لیتے تھے۔ طریقہ تعلیم یہ تھا کہ ہم ہفتہ میں ایک دن لیڈی صاحبہ کے بنگلے

---

[1] مقالہ "ناول نویسی" معارف یکم اکتوبر ۱۸۹۸ء میں انگریزی ناولوں کا تذکرہ کرتے ہوئے یلدرم نے لکھا "اس بیس پچیس برس کے عرصہ میں ہر اخبار، ہر رسالہ، ہر چھاپہ خانہ اور اگر مبالغہ نہ ہو تو ہر دماغ ناولوں سے بھر گیا ہے۔ اس سے زیادہ اس کے تسلط کا کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ علوم تہذیب [illegible] کو بھی اس جبروت حاکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا [illegible] ہندوستان [illegible] باوجودیکہ کل ملک اس طرف کو جھکا ہوا ہے پھر بھی اعلیٰ درجہ کے ناول نویس پیدا نہ ہوئے۔ اعلیٰ درجہ کے تو کیا معمولی اور ادنیٰ درجہ کے بھی پیدا نہیں ہوئے۔ اس وقت اردو میں ناول لکھنے والے انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ ان میں سے جو چوٹی کے شمار کئے جاتے ہیں وہ افسوس کہ اسفل درجے سے بھی کم ہیں۔"

"ایک اور بات ہے جس کی طرف ہمارے ناول نویسوں نے توجہ نہیں کی یعنی یہ کہ ناول کے ہیرو کے لئے تعلیم یافتہ اور امیر ہونا کوئی شرط نہیں ہے۔ غریب اور غیر تعلیم یافتہ بھی اتنا ہی اچھا ہیرو ہو سکتا ہے۔ نیکی اور دوسری صفات کچھ علم اور امارت کے ساتھ ہی وابستہ نہیں مگر ہمارے ناول نویسوں نے یہ خیال کر لیا ہے کہ ہیرو کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ایک نہایت ہی اعلیٰ خاندان کا ہو، نواب زادہ یا شہزادہ ہو [illegible] ابھی تک اردو میں غریبوں کی زندگی کا قصہ لکھا جانا باقی ہے۔ یہ ایک بہت وسیع مضمون ہے جس کو اب تک کسی قلم نے نہیں اٹھایا۔ [illegible] ہمارے ناول نویس ہر باب کا [illegible] میں چاہتا ہوں کہ ترکی کے تمام ناول کبھی اردو میں لائے جائیں مگر وہ ناول نہیں جو خود ہی ترکی میں ترجمہ ہیں [illegible] ناولوں سے بھی اردو خواں پبلک کو آشنا کرنا چاہیے" یہ مضمون لکھتے وقت مصنف کی عمر اٹھارہ انیس سال کی تھی اور وہ بی اے فرسٹ ایر کا طالب علم تھا۔

برجمع ہوتے لیکن چند روز بعد معلوم ہوا کہ لیڈی صاحبہ ہمارے شائستہ خطوط نویسی کی تعلیم کے یہ درس دے رہی ہیں کہ ہندوستانی جب انگریز کو خط لکھے تو کیا طرز اختیار کرنی چاہیئے۔

" ہماری اس بدگمانی کی ایک وجہ یہ تھی کہ موصوفہ کے مزاج کی افتاد شاہانہ واقع ہوئی تھی یعنی تو وہ پرنسپل کی بیوی مگر چاہتی تھیں کہ طلبا ان کے ساتھ وہی برتاؤ کریں جو اس زمانے کے رئیس، کلکٹر، مجسٹریٹ ضلع کی میم کے ساتھ کرتے تھے۔ ساتھ ہی اس زمانے میں جو جلیل القدر انگریز علی گڈھ آتے اکثر سر تھیوڈور کے مہمان ہوتے اور پرنسپل صاحب ان سے اپنے خاص طلبا کو ملواتے۔

سجاد حیدر کی طبیعت میں بلا کی شوخی تھی۔ طالب علمی کے زمانے میں جو نظمیں اور مضامین انھوں نے لکھے وہ بڑے پُرلطف ہیں اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر زمانہ چین سے بیٹھنے دیتا تو وہ ملک و قوم کی عظیم الشان ادبی خدمت انجام دیتے۔ "مرزا پھویا" سجاد نے ۱۹۰۰ء میں لکھی۔ اس کی کہانی یہ ہے کہ سرسید احمد خاں کی وفات کے بعد علی گڈھ کالج کی امداد کے لئے سرسید میموریل فنڈ قائم کیا گیا۔ محسن الملک نے ملک کا دورہ کیا اور بہت سے شہروں میں جلسے کرکے تقریریں کیں کہ قوم کا فرض ہے کہ اپنے کالج کی امداد کرے اور اپنے لڑکوں کو تعلیم کیلئے علیگڈھ بھیجے۔ مرزا پھویا بڑے ناز و نعمت میں پلے تھے۔ گھر سے باہر نکلنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ محسن الملک کی سحر بیانی کا یہ اثر ہوا کہ باپ نے مرزا کو علی گڈھ بھیجنے کا تہیہ کرلیا۔"

مشتاق احمد زاہدی[1] نے مرزا پھویا کے شانِ نزول کے متعلق بتایا ہے کہ جس دن پہلی دفعہ یہ حضرت یکے سے اُتر کر بورڈنگ میں داخل ہوئے ہیں تو ڈھیلا پاجامہ پہنے ہوئے تھے۔ پاؤں میں گھیتلی جوتی۔ ہاتھ میں پاندان۔ اس ہیئت کذائی کو دیکھتے ہی یار لوگوں نے ان پر خالہ اماں کی پھبتی کہہ دی جو ہمیشہ کے لئے چپک کر رہ گئی مگر سید صاحب نے اپنی نظم میں ان کو 'مرزا پھویا' کا خطاب دے کر ان کے حلیے کو بدل دیا۔[2]

یہ موہان ضلع کانپور سے آئے ہوئے ایک صاحبزادے تھے جو آگے چل کر مولانا حسرت موہانی بنے۔

زاہدی صاحب سے اب مزید قصہ سنئے۔

---

[1] مجا زاہدی یلدرم کے عزیز ترین دوستوں میں تھے۔ صادق ایگرٹن کالج بہاولپور کے پرنسپل تھے۔ مختلف رسالوں میں لکھتے رہے۔ ۴۷ء میں دلی سے پاکستان ہجرت کی۔ ۱۹۶۰ء میں کراچی میں انتقال ہوا۔

[2] "مرزا پھویا" سب سے پہلے علی گڈھ کالج کے ایک دو ورقی اخبار میں چھپی جو نکلن ٹیلر کے خفیہ طور پر دستی یا چھپا ہوا نکلتا تھا۔

مسٹر مشتاق احمد زاہدی:۔ سید سجاد حیدر سے میری دوستی کی ابتدا ۹۷-۱۸۹۶ء میں ہوئی۔ ہم دونوں مدرستہ العلوم علیگڈھ میں ایف اے میں پڑھتے تھے۔ اتفاق کی بات ہے کہ ہمارے ساتھ بہت سے جماعتی تھے جنھوں نے اپنے اپنے فن میں بہت نام پایا۔ مسٹر محمد علی جو بعد میں مسٹر محمد علی آکسن اور مولانا بنے اور اپنی قابلیت و قوم پرستی میں شہرہ آفاق ہوئے۔ مقصود علی خاں اور ملک زماں مہدی اگرچہ ذہین تھے مگر کتابی کیڑے بھی تھے۔ سجاد اِدھر اُدھر کی کتابوں کا مطالعہ تو بہت کرتے تھے۔ مگر امتحان والی کتابوں کو محض ضرورتاً پڑھ لیتے تھے۔ باوجود اس کے جب ایف اے کا نتیجہ آیا تو معلوم ہوا کہ سجاد صاحب انگریزی اور فارسی میں تمام الہ آباد یونیورسٹی میں اوّل مگر ریاضی میں صفر۔

محمد علی کا وقت بھی کرکٹ کھیلنے والوں کی صحبت میں ضائع ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ عبداللہ کرکٹ کپتان کے ساتھ رہتے تھے۔ تاہم محمد علی بہت ذہین تھے۔ اس لئے امتحان میں پاس تو ہو گئے۔ مگر نمبروں میں سجاد کا لگا بھی نہ کھا سکے۔ محمد علی کی قابلیت آکسفورڈ میں داخل ہو کر چمکی۔ سجاد کی خاموش قابلیت اور طبعی انکساری کی وجہ سے کالج والے ان کی دل سے قدر کرتے تھے اور ان کے ریاضی میں فیل ہو جانے سے ہر شخص اس مضمون کو بد دعا دیتا تھا۔ ریاضی نے ان کا بہت قیمتی وقت ضائع کردیا جس کی وجہ سے وہ ساری عمر نہ پنپ سکے اور ملازمت کی دوڑ میں مقصود علی خاں اور زماں مہدی سے پیچھے رہ گئے۔ مگر طالب علمی کے زمانے میں ان باتوں پر کوئی غور نہیں کرتا اور باوجود اس ناکامی کے سجاد کی ہردلعزیزی اور شہرت میں کوئی کمی نہ آتی۔ بلکہ طلبا اور پروفیسروں کو سجاد سے ہمدردی اور زیادہ ہوگئی۔ کہ افسوس ایسا قابل شخص ریاضی کی وجہ سے رہ جائے۔ چنانچہ جب بی اے میں ریاضی سے پیچھا چھوٹا تو سجاد تمام الہ آباد یونیورسٹی میں چوتھے نمبر پر پاس ہوئے۔

یونین میں تقریر کرنے کا شوق سجاد کو اسکول کے زمانے سے تھا۔ اخبار بینی کا بھی مرض تھا۔ اس لئے یونین کے سب اعزازی عہدے ان کو حاصل ہوگئے۔ یعنی وہ سلیکٹ کمیٹی کے ممبر ہوئے پھر لائبریرین ہوگئے۔ پھر سکریٹری مقرر ہوئے۔ تقریر کرنے کا انعام اور کیمبرج پرائز حاصل کیا۔

مضمون نگاری[1] ایف اے سے بھی قبل شروع کی۔ انگریزی انشا پردازی میں بھی سجاد بی اے کرنے سے پہلے ہی اپنے ہم عصروں میں ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ کالج کے طلبا اس زمانے میں انگریزی اچھی ہونے کا معیار یہ سمجھتے تھے کہ "پاینیر" میں مضمون

---

[1] مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی کا خیال ہے کہ غالباً سب سے پہلے "اودھ اخبار" میں انگریزی مختصر افسانہ کے تراجم شائع ہوتے اور بعد میں خود ان کے رسالے "معارف" میں جس میں سید سجاد حیدر نے بھی افسانے لکھے اس لحاظ سے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ جس طرح دنیائے مغرب میں ایڈگر ایلن پو کو مختصر افسانہ نویسی کا موجد کہا گیا ہے سید سجاد حیدر اردو زبان میں غالباً پہلے مختصر افسانے لکھنے والے پہلے شخص ہیں۔" (شمس العلما تاجور نجیب آبادی)

جب جاتے ہیں۔[1] اکثر طلبا نے جن کو اپنی انگریزی پر ناز تھا سعی و حاصل کی مگر سب سے پہلے سجاد کا ہی ایک مضمون شائع ہوا۔ ان کے بعد حسن صاحب کا مضمون شائع ہوا و محمود علی کے، جو ان کے کلاس فیلو تھے۔ اس کے کئی سال بعد سید وحید الدین کے خطوط جو اچھا طول ہوتے تھے چھپنے لگے۔

سجاد حیدر کی والدہ سعید بانو بنت بندے علی ترمذی کا انتقال ہو چکا تھا۔ تعطیلات میں سجاد حیدر اور ان کے چھوٹے بھائی اکثر محمد علی جوہر کے ساتھ اپنے چچا خان بہادر سید اکبر حیدر کے ہاں جاتے۔ ۱۸۹۸ء میں ڈاکٹر صاحب بارہ بنکی میں متعین تھے۔ جہاں جولائی کے مہینے میں گھوڑے سے گر کر جان بحق تسلیم ہوئے۔ صرف ۴۵ سال عمر پائی۔ خان بہادر جلال الدین حیدر نے بھائی کی یاد میں بیٹے کیا۔ عزیزم اصغر میاں وحید کو بھی لاہور میڈیکل کالج بھیج گئے۔ جہاں ڈاکٹر اکبر حیدر مرحوم نے پڑھا تھا۔

لاہور میں اس وقت کا یلدرم، ادیبوں، صحافیوں، اخباروں اور رسالوں کا پورا شہرہ بن چکا تھا۔ اس زمانے میں ہمارے ایک اور قابل قدر دوست شیخ عبدالقادر چند روز کے لئے لاہور سے علی گڑھ آتے ہیں اور سجاد کی لائیٹ کی ایک جھلک آپ کو دکھاتے ہیں۔

شیخ عبدالقادر

"میرے دوست سید سجاد حیدر جن کا غلغلہ بعد میں یلدرم کے نام سے ادبی دنیا میں بلند ہوا ابھی یلدرم نہیں بنے تھے اور نہ میں مدیر مخزن تھا۔ جب ان سے میری پہلی ملاقات ہوئی، میں کالج سے نکل کر انگریزی اخبار "ابزرور" کا اسسٹنٹ اڈیٹر تھا اور وہ علی گڑھ میں بی اے کر رہے تھے اور اپنے اوقات فرصت میں حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب رئیس دتاولی ضلع علی گڑھ کے سکریٹری کا کام کرتے تھے۔ ایک دن میں علی گڑھ میں حاجی صاحب سے ملنے گیا تو سجاد حیدر ایک کونے میں علیحدہ میز کرسی لگائے بیٹھے کام کر رہے تھے۔ حاجی صاحب نے ان سے میری ملاقات کرائی۔ جب میں حاجی صاحب سے بات کر کے فارغ ہوا تو سجاد میرے پیچھے پیچھے آئے اور کہنے لگے آئیے میں آپ کو ایک دلچسپ چیز دکھاؤں"۔

"آپ شبلی نعمانی کو مشق سخن کرتے دیکھنا چاہتے ہیں؟"

میں نے کہا: "ہاں۔ مگر کیسے اور کہاں"

انہوں نے کہا "ابھی اور یہیں"

مولانا شبلی اس وقت حاجی صاحب کے ہاں مہمان تھے۔ اور اس بنگلہ کے ایک کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ سجاد مجھے ایک کمرے کی طرف لے گئے۔ جس کا ایک دروازہ کھلتا تھا۔ مولانا شبلی دروازے کی طرف پیٹھ کئے بیٹھے تھے اور کچھ لکھ رہے تھے۔ ہم دروازے کے آئینوں میں سے جھانک کر دیکھ سکتے تھے۔ ان کا قلم کبھی کاغذ پر چلتا تھا اور کبھی قلم کا ایک سرا ہونٹ کے قریب ہوتا تھا۔ جیسے فکر سخن ہو رہی ہے۔

"معلوم نہیں ہم دونوں کا یہ فعل کہاں تک مناسب یا جائز تھا۔ مگر مجھے کبھی افسوس نہیں ہوا کہ ہم نے یہ حرکت کی۔ مجھے تو انہیں مصروف سخن دیکھنا ایسا دلچسپ معلوم ہوا کہ مدتوں نہیں بھولا۔ اور سجاد حیدر کا یہ جذبہ مجھے بہت بھایا کہ مولانا کو فکر سخن کرتے دیکھنے سے انہیں جو لطف آیا اس میں انہوں نے مجھے بھی شریک کرنا ضروری سمجھا۔ اور پہلی ہی ملاقات میں ہم دونوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ ہم کس قدر ہم مذاق ہیں۔

"مولانا شبلی اپنے شاگردوں میں "شبلی فرزدہ" کے نام سے مشہور تھے کیونکہ وہ اپنے نام کے ساتھ "فرزدہ" لکھا کرتے تھے۔ زمانۂ طالب علمی میں ایسے استاد فن کو دیکھنا اور اس سے سجاد حیدر کے مذاق کو مستحکم اور تیز بنانے کا باعث ہوا۔

"ایک واقعہ مجھے خاص طور پر یاد ہے کیونکہ اس سے ان کی طبیعت کے ایک میلان کا پتہ چلتا ہے جس سے میں پہلے بے خبر تھا۔ وہ اس وقت تعلیم یافتہ نوجوانوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو آزادیٔ نسواں کا بہت حامی تھا اور کسی عورت میں آزادی کا شوق دیکھ کر بہت متاثر ہوتا تھا۔ اور اس شوق کی بے حد تعریف کرتا تھا ۱۹۰۷ء میں مسلمانوں کی تعلیمی کانفرنس کراچی میں ہو رہی تھی جس کے صدر اس سال مولانا حالی تھے۔ ان کے نام کی کشش مجھے بھی وہاں لے گئی اور سجاد حیدر بھی اس میں شریک تھے۔

"ایک دن جب جلسہ دوپہر کے کھانے کے لئے برخاست ہوا اور میں اپنی قیام گاہ کی طرف جا رہا تھا تو سامنے سے سجاد صاحب آتے نظر آئے مجھے دیکھتے ہی انہوں نے ایک دو چکر اپنے گرد لگائے۔ جیسے خوشی سے رقص کر رہے ہوں اور مجھ سے کہنے لگے "کچھ نہ پوچھئے کہ میرا دماغ اس وقت آسمان پر ہے اور زمین پر کسی سے بات کرنے کو تیار نہیں"۔

"میں نے پوچھا کچھ تو بتائیے کیا دیکھا ہے کہ طبیعت اس طرح زوروں پر ہے"۔ کہنے لگے "ایک ایسی عورت[1] سے باتیں کر کے آ رہا ہوں جو آزادی کی حامی اور خود بھی آزادی پر مائل ہے"۔

یہاں پر اب ہم کو یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ اس وقت ہماری نیشن کی معزز پردہ نشین لیڈیوں کا کیا حال تھا۔ آہ۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ ہماری بیبیاں اس زمانے میں ظالم سماج کے جور و ستم کا شکار تھیں اور زیورِ تعلیم سے محروم رکھی جاتی تھیں۔ آئندہ باب میں مشتاق احمد زاہدی اور شیخ محمد عبداللہ بانی گرلز کالج علی گڑھ آپ کو بتلائیں گے کہ ان نامور نوجوانوں نے تحریکِ تعلیم نسواں کے سلسلے میں کس طرح جد و جہد کی۔ (مسلسل)

---

[1] دیکھو جسے وہ پانیر آفس میں ہے وقتاً بہر خدا مجھے بھی کہیں چھاپ دیجئے (اکبر الٰہ آبادی)

[1] عطیہ فیضی [2] "میرے احباب" از سر عبدالقادر، لاہور [illegible] ۱۹۴۹ء مطبوعہ "آہنگ" ریڈیو پاکستان، کراچی

محمد حسن
ڈی ۷ - ماڈل ٹاؤن - دلی ۱۱۰۰۰۹

غالب کا نثری اسلوب

اسلوب مطلق نہیں اضافی اصطلاح ہے ۔ اس کے حسن کا دارومدار اس کے باطنی ربط و ترتیب پر نہیں بلکہ متعلقہ صنف اور اس کے ذریعے ادا ہونے والی کیفیت اور نفسِ مضمون سے مطابقت اور ہم آہنگی پر ہے جو اسلوب جس قدر کیفیت اور وضاحت کے ساتھ متعلقہ نفسِ مضمون کو ادا کر سکے وہ اتنا ہی کامیاب کہا جائے گا ۔ نثری اسلوب میں یہ اضافی پہلو نظم سے کہیں زیادہ ہے کیونکہ نثری اصناف رنگارنگی اور اختلافِ مزاج کے اعتبار سے نظم کے اصناف سے کہیں زیادہ بھی ہیں اور زیادہ متنوع بھی ۔ جو نثری اسلوب ناول کے لئے موزوں ہوگا وہ علمی فلسفیانہ تحریروں کے لئے موزوں قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ نفسیاتی ناول کے لئے جو اسلوب موزوں ہوگا وہ تاریخی ناول کے لئے نامناسب ٹھہرے گا البتہ نثری اسلوب کی پرکھ میں وضاحت اور ربط کو کیفیت اور رنگینی پر یقیناً فوقیت حاصل ہوگی ۔ اچھی نثر کا کیفیت اور رنگینی سے عاری ہونا لازم نہیں، لیکن یہ اس کی اولین اقدار نہیں ہو سکتیں ۔ نظم میں کیفیت کو وضاحت اور ربط دونوں پر اولیت حاصل رہتی ہے نثر میں وضاحت اور ربط مقدم ہیں ــــ کیفیت ان کا نتیجہ ہو سکتی ہے ان کا سبب نہیں بن سکتی ۔

نثر کا لفظ گمراہ کن سا ہے ۔ پہلے یہ خیال آتا ہے کہ نثر بول چال کی زبان ہے ، موتی بکھرے ہوئے ، بکھری ہوئی ، بے ربط ۔ نحوی ترتیب سے جڑے ہوئے فقرے اور جملے ہی نثر ہوتے ہیں ، وہ بھی ایسے فقرے اور جملے جن پر روزمرہ کی مہر ہو اور جنہیں قبولِ عام کی سند حاصل ہو ۔ اسی لحاظ سے نثر کے عروج کو جمہوریت سے وابستہ کیا گیا ہے ۔ یورپ کے صنعتی انقلاب نے جب اعلیٰ ادب کی زمام اعلیٰ طبقوں کے بجائے درمیانہ طبقہ کے تاجر اور ملازمت پیشہ لوگوں کے ہاتھ میں دے دی (جنہیں اس دور میں 'عوام' کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا اور جو اب 'بورژوا' یا 'پیٹی بورژوا' کہلائے جانے لگے) تو کلاسیکی شاعری کی جگہ ناول کا رواج ہوا اور نثر تخلیقی اظہار کا وسیلہ بن کر ادب کی صنف میں شمار ہونے لگی ۔ اس سے قبل یورپی نثر کو تخلیقی اظہار کا یہ اعزاز حاصل نہ تھا ۔ اس توجیہ سے ایسا لگتا ہے کہ نثر نظم کے مقابلے میں زیادہ براہ راست ، کھرا اور سادہ طرزِ اظہار ہے ۔ یہ بات بڑی حد تک صحیح بھی ہے مگر ادھوری ہے ، کیونکہ ہر زبان کی نثر میں نہایت رنگین اور شاعرانہ نمونے بکثرت ملتے ہیں خصوصاً جاگیردارانہ دور میں پروان چڑھنے والی زبانوں کے ادب میں ۔ خود اردو ادب میں رنگین ، شاعرانہ ، سجیلی ، رسیلی نثر کے کیسے کیسے نمونے موجود ہیں جو کیفیت ، جوش اور رنگینی میں اچھی سی اچھی شاعری سے پہلو مارتے ہیں ۔ ایسی نثر بھی ہے جسے ایک نثر کے بجائے بری نظم کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے ۔ یوں بھی اردو ادب پر جاگیردارانہ مزاج کی آرائشگی اور رومانیت کچھ ایسی چھائی رہی ہے کہ ہمیں وضاحت اور قطعیت ، ربط و ترتیب کے مقابلے میں کیفیت ، رنگینی اور بکھراؤ زیادہ عزیز رہا ہے ۔

غالب نے ۱۸۵۰ء کے لگ بھگ اردو نثر لکھنا شروع کی ۔ ان کی اردو نثر چند تقریظوں کو چھوڑ کر ان کے اردو رقعات تک محدود ہے جن کی تصنیف کا سبب الطاف حسین حالی نے یہ بتایا ہے کہ وہ تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور کئے گئے اور "مہر نیم روز" لکھنے میں ہمہ تن مصروف ہو گئے ۔ وہ فارسی نثر یا اکثر فارسی خطوط جن میں قوتِ متخیلہ کا عمل اور شاعری کا عنصر نظم سے بھی کسی قدر زیادہ معلوم ہوتا ہے ۔ نہایت کاوش سے لکھتے تھے ۔ پس جب ان کی ہمت "مہر نیم روز" کی ترتیب و انشا میں مصروف تھی ضرور ہے کہ اس وقت ان کو فارسی زبان میں خط و کتابت کرنی اور وہ بھی اپنی طرزِ خاص میں شاق معلوم ہوتی ہوگی ۔"
(یادگارِ غالب نثر اردو) ۔ غالب ایک خط میں لکھتے ہیں ؛

"زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے ۔
پیرانہ سری اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی
اور جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی ۔ حرارت غریزی
کو زوال ہے ۔"

یہاں اس بحث کا موقع نہیں کہ غالب نے اردو رقعات کب اور کیوں لکھنے شروع کئے ۔ البتہ ان خطوط پر غور کرنے سے یہ اندازہ ضرور ہوگا کہ انہیں تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ پہلے وہ ٹکڑے جو کسی علمی مسئلے کی وضاحت یا کسی شعر کا مطلب سمجھانے کے لئے لکھے گئے ہیں ، ان میں سے اکثر اقتباسات مرزا محمد عسکری نے "ادبی خطوطِ غالب" میں یکجا کر دیے ہیں ۔ دوسرے وہ ٹکڑے ہیں جن کا انداز بیانیہ ہے یا معلوماتی ۔

مثلاً اپنے دیوان کی طباعت اور متعلقہ امور کے سلسلے میں خط و کتابت۔ تیسرے وہ ٹکڑے ہیں جن میں غالب کی شخصیت کا بھرپور اظہار ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ نثری اسلوب کے سلسلے میں تیسری قسم کے اقتباسات ہی زیر بحث آئیں گے اور ان اقتباسات کو سامنے رکھ کر یہ دیکھنا ہوگا کہ (۱) غالب کے سامنے فارسی اور اُردو نثر کے کونسے نمونے موجود تھے اور ان کی ادبی خصوصیات کیا تھیں (۲) غالب نے ان اسالیب سے کیا کچھ لیا اور کس حد تک ان پر اضافہ کر کے نثری اسلوب کی نئی روایت قائم کی اور (۳) غالب نے اپنے نثری اسلوب میں وضاحت، ربط، کیفیت اور لطف پیدا کرنے کے لئے کونسی تدابیر اور کونسی تکنیک برتی ہیں۔ یہی زیر نظر مقالہ کا دائرہ بحث ہے۔

غالب کے سامنے ۱۸۵۰ء تک جو اہم فارسی اسالیب موجود تھے۔ ان میں ایک ابوالفضل کا تھا دوسرا اورنگ زیب عالمگیر کا۔ گو ان کے ساتھ ساتھ ظہوری، نعمت خان عالی اور بیدل کے نثری اسلوب کا تذکرہ بھی واجب ہے مگر ابوالفضل اور عالمگیر کے نثری اسالیب عہد آفریں ثابت ہوئے۔ ابوالفضل کی نثر میں سجاوٹ اور جمال ہے۔ عالمگیر کی نثر مقابلۃً زیادہ واضح اور قطعیت سے مالامال ہے۔ ابوالفضل تخیل اور مضمون آفرینی کا قائل ہے۔ عالمگیر ان سے خاصہ بے نیاز ہے۔ لیکن ان تمام اسالیب کا سراغ غالب کی فارسی نثر میں تلاش کرنے سے پہلے حالی کا یہ بیان پیش نظر رکھنا لازم ہے۔

"متاخرین میں ابوالفضل، ظہوری، طاہر وحید اور جلالائے طباطبا بڑے نثار مانے جاتے ہیں۔ مرزا بیدل کی نثر اگرچہ ان کی نظم کی طرح ایک دوسرا عالم رکھتی ہے مگر وہ بھی اپنی شان اور آن بان میں بے نظیر ہے۔ اگر یہ بات تسلیم کرلی جائے (اور ضرور تسلیم کرنی چاہیئے) کہ مرزا نے متاخرین کی طرز انشا پردازی سے استفادہ کیا ہے تو بھی متاخرین کی نثروں میں مرزا کی طرز کا سراغ لگانا ایسا ہی ہے جیسا تخمی آم میں پیوندی آم کا مزہ ڈھونڈھنا۔

تقریباً ساٹھ برس گزرے کہ لکھنؤ کے ایک نہایت لائق آدمی نے مرزا کی نثر کی نسبت یہ بات کہی تھی کہ شیخ ابوالفضل اور مرزا بیدل دونوں کے اسٹائلوں سے کچھ کچھ مختلف باتیں اخذ کر کے ایک جدا اسٹائل پیدا کیا گیا ہے۔ لیکن جب مرزا کی نثر کا ان دونوں کی نثروں سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو مرزا کی کوئی ادا ان کی طرز ادا سے میل نہیں کھاتی"

("یادگار غالب"، نثر فارسی)

غالب کی فارسی نثر کا اسلوب یہاں خارج از بحث ہے۔ یوں بھی ابوالفضل کے تخیل اور مضمون آفرینی کے انداز سے غالب کی اردو نثر کو کوئی علاقہ نہیں۔ غالب کے بارے میں رشید احمد صدیقی کا نہایت کلاسیکل جملہ ہے کہ غالب نے اردو شاعری کو اپنا نسب نامہ دیا۔ یعنی اس کا رشتہ ترک اور ایرانی روایت سے جا ملایا۔ مگر اس جملہ کی بلاغت غالب کی اردو شاعری تک محدود ہے۔ اُردو نثر کا کوچہ اس سے بالکل جُداگانہ ہے۔

اُردو نثر کی روایت پر نظر ڈالئے تو "کربل کتھا" اور "داستان مہر افروز دلبر" "رانی کیتکی کی کہانی" سے قطع نظر اس دور میں فورٹ ولیم کالج اور دلی کالج کے گرد جو نثر پروان چڑھ رہی تھی صرف وہی غالب کے پیش نظر رہی ہوگی۔ فورٹ ولیم کالج کی کتابوں بالخصوص میر امّن کی "باغ و بہار" کے نثری اسلوب کا ذکر آگے آئیگا۔ یہاں غالب کے سفر کلکتہ اور اسکے ادبی اثرات کا ذکر ضروری ہے۔ ابوالکلام نے غلام رسول مہر کی کتاب "غالب" کے حواشی میں مرزا کے سفر کلکتہ کو انکی ادبی زندگی کا بڑا اہم موڑ قرار دیا ہے اور ان کی نثر کی سادگی کے سلسلے میں میر حسن علی کے VICAR OF WAKEFIELD کے اُردو ترجمہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ میر حسن علی جو میر لندنی کے نام سے مشہور تھے۔ اودھ کے ریزیڈنسی وکیل تھے اور ۱۸۱۳ء یا ۱۸۲۴ء میں ADISCOMBE ادیس کومب میں اُردو پڑھاتے تھے۔ ان کی انگریزی بیوی شہزادی آگسٹا کی ملازم تھیں۔ یہ بارہ برس لکھنؤ میں رہنے کے بعد ولایت چلی گئیں اور دو جلدوں میں شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کے بارے میں OBSERVATIONS ON THE MUSSULMANS OF INDIA (LONDON 1832) کے نام سے ایک ضخیم کتاب شائع کی جو اس دور کی اہم ترین تہذیبی دستاویزوں میں شمار کی جاتی ہے۔ انہیں میر حسن علی نے گولڈ سمتھ کے ناول VICAR OF WAKEFIELD کا اردو ترجمہ کیا تھا۔ جو آسان زبان میں تھا۔ اس کے علاوہ یوسف خاں کمبل پوش ۱۸۳۷ء میں انگلستان گئے تھے ان کا مطبوعہ سفر نامہ نیشنل لائبریری کلکتہ میں موجود ہے۔ نثری اسلوب سادہ اور رواں ہے۔ اس سفر نامے کا کچھ حصہ ماسٹر رام چندر کے "محب ہند" مورخہ پہلی نومبر ۱۸۴۹ء میں شائع ہوا۔ خواجہ احمد فاروقی نے "ماسٹر رام چندر" مصنفہ صدیق الرحمٰن قدوائی کے مقدمہ میں غالب کے ادبی مزاج کی تشکیل میں کلکتہ سے زیادہ دہلی کی فضا کو اہم قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک "غالب کے ہاں جو مغرب کی خیر و برکت کا احساس انگریزوں کے علم و آئین کی تعریف ملتی ہے وہ بھی دراصل مولانا ابوالکلام آزاد کی صراحت کے خلاف کلکتہ سے زیادہ دہلی کی فضا کی پروردہ ہے" (صفحہ ۲۵)

غالب کے طرز فکر اور ادبی مزاج کی تشکیل کا رشتہ کلکتہ اور VICAR OF WAKEFIELD کے اردو ترجمے سے ہے یا دہلی اور دلی کالج سے۔ اس کے بارے میں کوئی قطعی نتیجہ نکالنا دشوار ہے۔ البتہ یہ مسئلہ اہم ہے کہ آسان نثر لکھنے کی طرف غالب کیوں راغب ہوئے اور اس دور میں آسان اُردو نثر کے جو نمونے موجود تھے ان سے غالب کے نثری اسلوب کا کوئی تعلق قائم کیا جا سکتا ہے یا نہیں!

غالب کا آسان نثر کی طرف رجوع ہونا اس لحاظ سے بہت دلچسپ اور قابل غور ہے کہ شاعری میں یہی غالب دشوار پسندی اور فارسیت کی طرف

مائل نظر آتے ہیں۔ آخر اس کا کیا سبب ہے کہ ایک ہی شخص شاعری میں مشکل پسند ہو اور نثر میں آسان پسند اور دونوں اصناف میں نئے عہد اور نئے مزاج کا آغاز کرتا ہے۔ شاعری میں مشکل پسندی سے اور نثر میں سادگی آسان پسندی سے۔ الی ساندرا بوسانی نے غالب کی فارسی شاعری سے بحث کرتے ہوئے یہ سوال اٹھایا ہے۔

> "غالب کے کلام کو مکمل طور پر پڑھنے کے بعد پہلی نظر میں دو عجیب اسلوبیاتی تضاد نظر آتے ہیں۔ ایک اُفقی جو اردو اور فارسی کلام کے درمیان ہے۔ دوسرا عمودی جو نثر اور نظم کے درمیان ہے اس بات کو نہایت آسان بلکہ آسان ترین طریقے سے کہا جائے تو ان کی اردو شاعری، فارسی شاعری کے مقابلے میں زیادہ پیچیدہ اور بیدل پسندانہ ہے۔ اس کے برعکس غالب کی فارسی نثر نہایت پیچیدہ اور بیدل زدہ ہے جبکہ اسکے مقابلے میں اُردو نثر سادگی کا ... نمونہ ہے۔

اور اس اسلوبیاتی تضاد کی توجیہہ اس طرح کی ہے:

> "غالب کو فارسی شاعری میں کوئی نئی بات نہیں کہنی تھی اور اسی لئے انہوں نے نسبتہً سادہ اسلوب میں قدیم روایت کے مطابق لکھنے کی اور فارسی نثر میں مشکل اور پیچیدہ نثر نگاری کی مشق کی ... اس کے برعکس اُردو میں غالب یہ محسوس کرتے تھے کہ انہیں نئی بات کہنی ہے اور اسلوب کے اعتبار سے غالب کے دور کے مغلیہ ہندوستان کی تاریخی صورتِ حال اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتی تھی کہ بیدل کی ندرت کو نئے اور زیادہ جدید طرز پر تاریخی تسلسل عطا کیا جاتے (اور جاری رکھا جائے) ... اُردو نثر میں غالب کو پڑھنے اور سمجھنے والے عوام تھے۔ اسلئے اُردو نثر سادگی اور آسان نثر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ ان سب باتوں کا خود ادراک و شعور نہ رکھتے تھے۔" (ارمغانِ معنی' غالب حصہ سوم شعبہ اُردو دہلی یونیورسٹی، صفحہ ۵۰۵ و ۵۱۵)

حالی کا یہ بیان بھی اس ضمن میں قابلِ غور ہے:

> "مرزا کی عام شہرت ہندوستان میں جس قدر ان کی اردو نثر کی اشاعت سے ہوئی ہے۔ ویسی نظمِ اردو اور نظمِ فارسی اور نثرِ فارسی سے نہیں ہوئی۔" (یادگارِ غالب' نثر اُردو)

اس سے یہ ہرگز مراد نہیں کہ غالب نے اپنے مکاتیب عوام کو کوئی اصلاحی پیغام دینے کے لئے یا اپنی ادبی شہرت قائم کرنے کے لئے لکھے۔ مراد صرف یہ ہے کہ غالب کو اپنی شخصیت کا بہتر اظہار اُردو نثر کے اسی بے محابا اسلوب میں نظر آیا۔ ان کے مخاطب نہ عام قاری تھے نہ عوام بلکہ ان کے اپنے بے تکلف دوست تھے۔ قارئین محض پسِ دیوار ان باتوں کو کان لگا کر سُن رہے ہیں اور مزا لے رہے ہیں۔ لیکن ادیب چونکہ قلم اٹھاتے وقت بھی شعوری یا نیم شعوری طور پر ترسیل کے مسئلے سے دوچار ہوتا ہے، اسی لئے غالب نے بھی اپنی شخصیت کا بہتر اظہار اسی آسان نثر میں پایا جس کی نزاکتوں کو سمجھنے اور لطافتوں کی داد دینے کے لئے قاموسی تبحر کی ضرورت نہیں تھی۔ ایک خط میں خود لکھتے ہیں کہ:

> "تاریخ تحریر (تیمور بہ یعنی مہرِ نیم روز) کے پان سات جزو جو آپ کے پاس بھیجے ہیں میری خاطر نہ کیجئے انصاف سے کہئے کہ یہ نثر کہیں اور ہے اور پھر اس نثر کا کوئی مشتاق نہ ہو۔" (ایضاً)

اُردو نثر کے لئے نہ اس داد کی ضرورت تھی نہ اہمیت۔ کیونکہ یہاں کوئی ظہوری یا ابوالفضل نہ تھا۔ شاید اس کا تصور بھی نہ تھا کہ اردو نثر ان مشاہیر کی قدو قامت تک کبھی پہنچ سکتی ہے۔ لہذا غالب نے تبحر کا جامہ اتارا اور اپنی شخصیت کو بے تکان، بے تصنع اپنے مکاتیب میں ڈھال دیا۔

شعوری اظہار ہمیشہ شخصیت کے خوشگوار پہلوؤں کا ہوتا ہے۔ ورنہ کون چاہتا ہے کہ اس کی شخصیت کے کُوبڑ دوسروں کو نظر آئیں۔ ہم اپنے کو محدّب شیشوں کے سامنے رکھنے سے جھجکتے ہیں۔ ہاں رنگین شیشوں سے اپنے آپ کو دیکھے جانا ہی نہیں خود اپنے آپ کو دیکھنا بھی پسند کرتے ہیں۔ ۱۸۵۰ء کا زمانہ ہے جب مرزا کو پنشن کے معاملے سے کسی قدر مایوسی ہو چکی ہے اور قید و بند کا سانحہ ان پر گزرنے کے سبب دہلی کی ثقہ سوسائٹی میں مرزا کو کچھ سبکی محسوس ہونے لگی ہے حالات مساعد نہیں۔ بقول رشید احمد صدیقی:

> "کلکتے سے واپسی پر بقیہ تمام عمر دہلی میں بسر ہوئی زندگی کے طرح طرح کے نشیب و فراز سے گزرنا پڑا۔ فراز سے کم نشیب سے زیادہ۔ قمار بازی کی پاداش میں قید خانے جانے کا حادثہ بڑا سخت تھا۔ اس وقت کی دہلی کی اشراف سوسائٹی میں اس قسم کی لغزش ناقابل معافی تھی ... غالب کی کوئی اولاد نہ تھی۔ بتایا جاتا ہے کہ گھریلو زندگی بھی خوشگوار نہ تھی ... اکابر و اقربا ویسے ہی ثابت ہوئے جیسا کہ آلام و ادبار میں اکثر ہو جایا کرتے ہیں۔ کتنی اور کلفتوں کا سامنا رہا جس کے ذمہ دار کبھی یہ خود ہوئے کبھی دوسرے۔ ان سب کا مداوا اور تلافی غالب نے دوستوں اور شاگردوں سے محبت بڑھانے اور ان کی عقیدت و اعتبار حاصل کرنے میں ڈھونڈی اور پائی ... انہوں نے اپنے کلام کی طرح اپنی پہلودار شخصیت سے ہر طبقے اور ہر مسلک کے عزیزوں اور دوستوں سے اپنے

کیسے کیسے ویرانے آباد کر لئے تھے۔ غالب کا ہر خط ان کی شخصیت کے کسی نہ کسی پہلو کی ترجمانی کرتا ہے۔"

("اردوئے معلیٰ" دہلی غالب نمبر حصہ سوم صفحہ ۱۲۸)

غالب کے ان مکاتیب میں ایک مکمل ذہنی فضا ہے کہ یہی مکمل ذہنی فضا آلامِ روزگار سے ان کا انتقام بھی ہے اور ان کی جائے پناہ بھی۔ یہ دنیا اُن کی اپنی ہے۔ یہاں سوائے اُن کے اور ان کے چند مخصوص دوستوں کے اور کوئی نہیں۔ رعایت شہرت اور اعزاز کے ہنگامے یہاں سے کوسوں دور ہیں اور اس خلوتِ خاص سے وہ خلوص کی چاندنی اور بے تکلفی کا کندن جھلکاتے گزرتے ہیں۔ زندگی کی چھوٹی موٹی باتیں یہاں کسی آسودگی بخش تعلق کا ... کسی کے ہاں غمی ہوئی غالب نے کبھی دلدوزی سے، کبھی شوخی سے تعزیت کی۔ اپنی تکلیفوں کا، ارمانوں کا، خوابوں اور ان کی تعبیروں کا بیان کیا اور خوش ہولئے۔ یہاں باتیں سرگوشی کی سی ہیں لیکن لہجہ سرگوشی کا نہیں۔ ان کا دریچہ سرِ راہ کھلتا ہے اور ہر گزرنے والے سے غالب ہنس بول رہے ہیں کبھی اپنی کہتے ہیں کبھی دوسرے کی سنتے ہیں، کبھی ہنستے ہیں کبھی روتے ہیں اور اپنے دکھ درد اس ہنستی گاتی زندگی میں گھلا دیتے ہیں۔

غالب کے خطوط کی دنیا دردمندانہ سرخوشی کی دنیا ہے جس میں کہ غم کی تاریکی زندگی کی کشادہ جبینی پر فتح حاصل نہیں کر سکتی — غالب نے اس دنیا کے لئے نثری اسلوب بھی سوچ سمجھ کر منتخب کیا ہے۔ یہاں یہ سوال ناگزیر ہے کہ اس اسلوب کے انتخاب کرنے والے غالب اور شاعر غالب کے درمیان کونسی اقدار مشترک ہیں۔ بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ یہ اقدار ہیں شوخی اور ڈرامائیت جن کی طرف بجا طور پر حالی نے اشارہ کیا ہے:

"وہ چیز جس نے ان کے مکاتبات کو ناول اور ڈراما سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے۔ وہ شوخیٔ تحریر ہے جو اکتساب یا مشق و مہارت یا پیروی و تقلید سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ . . مرزا کی طبیعت میں شوخی ایسی بھری ہوئی تھی جیسے ستار کے تار میں سُر بھرے ہوئے ہوتے ہیں اور قوتِ متخیلہ جو شاعری اور ظرافت کی خلّاق ہے اس کو مرزا کے دماغ کے ساتھ وہی نسبت تھی جو قوتِ پرواز کو طائر کے ساتھ۔"

("یادگارِ غالب" نثرِ اردو۔ بکڈپو مدرسۃ العلوم علی گڑھ، ۱۹۲۲ء صفحہ ۱۹۰)

اس شوخیٔ تحریر کی مثالیں گنوانا تحصیلِ حاصل ہے۔[1]

---

[1] مثلاً حاتم علی مہر کی محبوبہ چنا جان کی وفات پر غالب کے تعزیتی خطوط

"عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہو۔ لیلیٰ اس کے سامنے مری تھی۔ تمہاری محبوبہ تمہارے سامنے مری بلکہ تم اس سے بڑھ کر ہوئے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں اور تمہاری معشوقہ تمہارے گھر میں مری۔ ... ماتمی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے کیسی ... کی ... کا ...شور فراق"

("یادگارِ غالب" ... صفحہ ۲۱۵ و ۲۲۲)

یہی صورت ڈرامائیت کی ہے۔ غالب واقعہ نگاری کو بھی ڈرامائی رنگ دے دیتے ہیں جس کی وجہ سے خطوط کی یکسانیت اور سطحیت اچانک ایک خوبصورت موڑ اختیار کر لیتی ہے اور فقط ذرا سی باتیں پُر لطف ہو جاتی ہیں۔ مثال کے لئے میر مہدی مجروح کو خط کا جواب دیر سے دینے کے [illegible] کیا جا سکتا ہے۔[2] یا اسی طرح سال کے آخر میں لکھے ہوئے خط کا جواب [illegible] سال کے شروع میں [illegible] پر لطیف نکتہ پیدا کر لیتے [illegible] [illegible] مثالیں ہر صفحہ پر [illegible] کہ بات کہاں تک بڑھا لے جاتے۔ مرزا نے جگہ جگہ مراسلے کو مکالمہ بنانے کا اقرار کیا۔ یہاں مکالمے سے مراد غالبا یہی ڈرامائیت ہے جسے [illegible] محض انداز تک ہی محدود نہیں رکھتے بلکہ ڈرامے کی واقعہ نگاری اور ماجرا کے ساتھ کامیابی سے برتتے ہیں۔ اس ضمن میں یہ خطوط خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جن کی حیثیت خود نوشت سوانح عمری کی ہو گئی ہے۔ یہاں ان کی زندگی کا پورا المیاتی شخصیت اور کردار کی پوری عظمت، دردمندی اور [illegible] ... اپنے حسن کے ساتھ سامنے آ گیا ہے۔

"یہاں خدا سے بھی توقع نہیں۔ مخلوق کا کیا ذکر ہے۔ کچھ بن نہیں آتی۔ اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں۔ یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کر لیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب تو قرض داروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا بڑا ملحد مرا۔ بڑا کافر مرا۔ ہم نے ازراہِ تعظیم جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے جنت آرام گاہ و عرش نشیمن کا خطاب دیتے ہیں، چونکہ یہ اپنے کو شاہ قلمرو سخن جانتا تھا سقر مقر اور ہاویہ زاویہ خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ آئیے نجم الدولہ بہادر۔ ایک قرض دار کا گریبان میں ہاتھ۔ ایک قرض دار بھوگ سُنا رہا ہے۔ میں اُن سے پوچھ رہا ہوں "اجی حضرت نواب صاحب۔ نواب صاحب

---

[1] "اے میرن صاحب السلام علیکم۔ حضرت آداب۔ کہو صاحب آج اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی۔" ("یادگارِ غالب" ... صفحہ ۱۵۸)

[2] "دیکھو صاحب ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔ ... کے خط کا جواب ... میں بھیجو اور مزا یہ کہ جب تم سے کہا جائے گا تو یہ کہو گے کہ میں نے دوسرے ہی دن جواب لکھا۔ ... صفحہ ..."

کیسے اوغلان صاحب آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں۔ یہ کیا بے حرمتی ہورہی ہے۔ کچھ تو اکسو، کچھ تو بولو، بولے کیا بے حیا، بے غیرت۔ کرگٹی سے خراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم۔ صراف سے دام قرض لے جاتا ہے۔ یہ بھی تو سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا۔"

اس عبارت کی ڈرامائیت، مکالموں کی شان بلفس مضمون کی حزنیہ اور طنزیہ کیفیت سے قطع نظر نثری اسلوب کے اعتبار سے اس کی خصوصیات پر غور کیجئے۔ سب سے نمایاں خصوصیت چھوٹے چھوٹے جملوں کا استعمال ہے۔

یہاں خدا سے بھی توقع نہیں۔
مخلوق کا کیا ذکر ہے۔
کچھ بن نہیں آتی۔
اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔

یہ چھوٹے چھوٹے جملوں سے بڑے کام نکال لینے اور کیفیت اور فضا پیدا کرنے کی خصوصیت غالب کا امتیاز ہے۔ انشا اور میر امن کی نثر تک چھوٹے جملوں کا چلن کم ہے یہ بات اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس دور میں فارسی کی جو انشا رائج تھی وہ بھی چھوٹے جملوں کو پسند نہیں کرتی تھی اور اکثر طویل اور مرکب جملوں سے عبارت ہوتی تھی۔

"سر جھکا کر ناک رگڑتا ہوں اس بنانے والے کے سامنے جس نے ہم سب کو بنایا اور بات کی بات میں ویسا کر دکھایا جس کا بھید کسی نے نہ پایا۔" (رانی کیتکی کی کہانی)

"ایک دن وہ بہن جو بجائے والدہ کے میری خاطر رکھتی تھی کہنے لگی۔ اے بیرن۔ تو میری آنکھوں کی پتلی اور ماں باپ کی موئی مٹی کی نشانی ہے۔ تیرے آنے سے میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔ جب تجھے دیکھتی ہوں باغ باغ ہوتی ہوں۔ تو نے مجھے نہال کیا لیکن مردوں کو خدا نے کمانے کے لئے بنایا ہے۔ گھر میں بیٹھا رہنا ان کو لازم نہیں۔ جو مرد نکھٹو ہو کر گھر سیتا ہے اس کو دنیا کے لوگ طعنہ مہنا دیتے ہیں۔" ("باغ و بہار"۔ سیر پہلے درویش کی)

ان تینوں عبارتوں کا موازنہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ غالب اکثر چھوٹے جملے لکھنے کے حق میں ہیں اور مرکب جملے ان کے نثری اسلوب میں کم ہوتے گئے ہیں۔ اس ضمن میں یہ بات بھی اہم ہے کہ جملے کی نحوی ساخت غالب کے نثری اسلوب میں انشا اور میر امن دونوں سے زیادہ جدید اور ترقی یافتہ ہے۔ یعنی فارسی کا سانچہ

چھوڑ کر جدید اردو کے لب و لہجے اور نحوی سانچے سے قریب آگئی ہے۔ انشار کے ہاں زیادہ اور امن کے ہاں کم ہر فعل پہلے آجاتا ہے اور یہ اتنی بار ہوا ہے کہ گریرسن نے اپنی معرکۃ الآرا "لسانیاتی جائزے" LINGUISTIC SURVEY OF INDIA) میں انہی کی بنیاد پر اس نحوی ساخت کو اردو کے ادبی اسلوب کی خصوصیت قرار دے دیا جو ظاہر ہے کہ غلط ہے۔ غالب کے نثری اسلوب میں اسی قسم کا اشتباہ کم ہے۔ البتہ مرکب جملے اور فارسی انشار کی طرز کے پیچیدہ جملے ان کے ہاں بھی ملتے ہیں جس کی ایک مثال اوپر کے اقتباس میں موجود ہے:

"ہم نے از راہِ تعظیم جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے جنت آرام گاہ و عرش نشیمن خطاب دیتے ہیں چونکہ یہ اپنے کو شاہ قلمرو سخن جانتا تھا سقر مقر ہاویہ زاویہ خطاب تجویز کر رکھا ہے۔"

یہ مرکب بلکہ پیچیدہ جملہ PARENTHETICAL جملے سے مل کر بنا ہے اور در حقیقت تین جملوں کا آمیزہ ہے اور ان تینوں کا منطقی ربط توڑ کر گفتگو کا سا بکھراؤ اختیار کر گیا ہے۔

'چونکہ اپنے کو شاہ قلمرو سخن جانتا تھا،
'ہم نے از راہ تعظیم (اس کے لئے، سقر مقر ہاویہ زاویہ خطاب تجویز کر رکھا ہے':
'جیسا بادشاہوں کو (بعد ان کے) جنت آرام گاہ و عرش نشیمن خطاب دیتے ہیں':

طرزِ فارسی کے ایک جملے سے اس کا موازنہ مفید ہوگا۔

"روشن ضمیران اگرچہ سند پوشان کوئے افلاس جمالِ بے تمثال آں صورت نمائے شاہدِ معنی ہموارہ در آئینۂ خیال معائنہ می نماید" (مخزن العلوم مطبع العلوم، ۹، ۱۸۴ صفحہ ۲۵)

اس قسم کے جملے غالب کی فارسی عبارت میں اکثر اور اردو نثر میں کم تر ملیں گے۔

غالب کے نثری اسلوب میں جملوں کے اختصار اور ان کی نحوی ساخت کے بعد ان مختصر جملوں کے باہمی ربط و تعلق پر غور کرنا چاہئے۔ انشا کی نثر کی بنیاد رعایتِ لفظی ہے اور میر امن کی "باغ و بہار" میں محاورے کی ٹیک ہے۔ پھر دونوں نے اشعار کا استعمال جا بجا کیا ہے اور اس طرح کیا ہے کہ نثر میں شاعری سے کشش اور لطف پیدا ہو۔ غالب ان دونوں سہاروں سے بے نیاز ہیں۔ ان کی لطافت اور کشش صرف شوخی، ڈرامائیت اور روزمرہ کی زندگی کے بے محابا اور پُرلطف اظہار سے ہے۔ غالب اپنی نثر میں نظیر اکبرآبادی ہیں جس کے ہاں جیتی

دھوپ، برسات میں بے طرح برستی چھت۔ زندگی کی شاہراہ پر اقتاں خیزاں گزرتے راہ رو، جامع مسجد کی سیڑھیوں کی دردناک تصویریں، کوچہ و بازار کے مرقعے سبھی ہیں اور ایک ایسی شان کے ساتھ ہیں جس میں زندگی کی گراں باریاں بھی گوارا ہو جاتی ہیں۔

چھوٹے جملوں کے باہمی ربط و ترتیب پر غور کریں تو ان میں وضاحت کا رشتہ ملے گا۔ اگر پہلے جملے میں کوئی بات یا بات کا کوئی پہلو مبہم یا ادھورا رہ گیا ہے تو دوسرا جملہ اُسے پورا کرے گا۔ اگر پہلے جملے میں کسی نئی ڈرامائی صورتِ حال کی گنجائش ہے تو آنے والا جملہ یا جملے اس صورتِ حال کو اور اُبھاریں گے اور اس کی تفصیل فراہم کریں گے۔ تکرار کا عیب ان میں کم ہے مگر کہیں کہیں ہے ضرور۔ لیکن اس تکرار سے غالب خاص CLIMAX یا ڈرامائی آخر کی انتہا تک پہنچنے میں مدد لیتے ہیں۔ اوپر کے اقتباس کے مندرجہ ذیل ٹکڑے ملاحظہ ہوں:

سچ تو یوں ہے غالب کیا مرا

بڑا ملحد مرا
بڑا کافر مرا } (تکرار)

آگے چل کر لکھتے ہیں:

اجی حضرت نواب صاحب
نواب صاحب کیسے
او فلاں صاحب
آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں۔

ان میں تکرار ہے۔ "کچھ تو اکسو کچھ تو بولو" میں بھی تکرار ہی کا پہلو ہے۔ مگر یہ سب ایک کلائمکس تک پہنچنے کے لئے ہے جسے غالب نے بڑی کامیابی سے تکمیل تک پہنچایا ہے۔

پھر ان جملوں میں ایک اور ربط بھی ہوتا ہے جسے منطقی نہیں تلازمی کہا جا سکتا ہے۔ جس طرح ہماری گفتگو اکثر منطقی نہیں تلازمی سمت اختیار کر لیتی ہے اور ہم ایک مسئلے پر گفتگو کرتے کرتے اس سے ملتے جلتے مسائل کے بارے میں بات کرنے لگتے ہیں۔ یہی انداز غالب کے نثری اسلوب میں بھی ہے۔ اس کی یہاں صرف دو مثالیں کافی ہوں گی۔ اوپر کے اقتباس سے یہ ٹکڑا ملاحظہ کیجئے:

(۱) "میں ان سے پوچھ رہا ہوں ... یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے۔ کچھ تو اکسو، کچھ تو بولو" / بولے کیا بے حیا، بے غیرت"۔

یہاں پہلا ٹکڑا غالب اور مرزا نوشہ کے درمیان مکالمے اور طنز و تعریض کا حصہ ہے اور دوسرا پھر مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے درمیان کا۔ اچانک گفتگو کرتے کرتے حالتِ زار پر تبصرہ کرنے لگتے ہیں جو گویا پوری صورتِ حال پر اظہارِ رائے کا درجہ رکھتا ہے۔ "بولے کیا بے حیا، بے غیرت... یہ بھی تو سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا"۔

لہجوں کی یہ تبدیلی غالب نے اپنے چھوٹے چھوٹے جملوں میں موج تہ نشیں بلکہ دامِ ہم رنگ زمین کی طرح پھیلا رکھی ہے۔ اس سے ان کی مضمون آفرینی اور تخیل کی بے مثال پرواز کا ثبوت ہی نہیں ملتا بلکہ جملوں کو نت نئے آہنگ سے مرتب کرنے اور ان کی ترتیب سے رنگ برنگی کیفیات پیدا کرنے کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ حاتم علی مہر کی محبوبہ کی تعزیت والے خط کی اس عبارت پر غور کیجئے:

(۲) "سنو صاحب، شعرا میں فردوسی اور فقرا میں حسن بصری اور عشاق میں مجنوں۔ یہ تین آدمی تین فن میں سرِ دفتر اور پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے۔ فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھائے۔ عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہو/ لیلیٰ اس کے سامنے مری تھی۔ تمہاری محبوبہ تمہارے سامنے مری بلکہ تم اس سے بڑھ کر ہوئے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں اور تمہاری معشوقہ تمہارے گھر میں مری/ بھئی مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں جس پر مرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں/ میں بھی مغل بچہ ہوں۔ عمر بھر میں ایک ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا تھا۔ خدا اُن دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی کہ زخمِ مرگِ دوست کھائے ہوئے ہیں، مغفرت کرے۔ چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے...."

اس اقتباس کی ترتیب پر غور کیجئے تو پہلا حصہ مضمون آفرینی کی مثال ہے۔ مہر کو ان کے صدمۂ جانکاہ پر تسکین دینے کا کوئی پہلو نکالنا چاہتے ہیں اور انہیں مجنوں سے جا ملاتے ہیں۔ دونوں میں مشترک خصوصیت یہ ہے کہ دونوں کی محبوبائیں اُن کے سامنے مریں (جملۂ معترضہ کے طور پر یہ عرض کر دوں کہ مکتوب الیہ کی شخصیت مزاج اور ذوق کا جس قدر گہرا پرتو غالب کے مکاتیب میں پایا جاتا ہے وہ کسی اور کے مکاتیب میں نہیں ملتا۔ ابوالکلام آزاد تک کے مکاتیب، مکتوب الیہ کی شخصیت کے نقش سے یکسر عاری ہیں۔ غالب کے خطوں میں مکتوب الیہ کی انفرادیت نمایاں ہے۔ میر مہدی مجروح کے نام کے خط حاتم علی مہر کے نام نہیں لکھے جا سکتے تھے۔ اسی طرح مہر کے نام کے خط تفتہ کے نام نہیں لکھے جا سکتے تھے۔ میر مہدی کے ساتھ اُن کی چہلیں، حاتم علی مہر سے ان کی شوخیاں اور تفتہ سے بے تکلفی سب کا انداز جدا ہے۔ ہر خط میں مکتوب الیہ کے مزاج کا انوکھا پن صاف جھلکتا ہے)

اس اقتباس کے دوسرے ٹکڑے میں غالب کے اس شعر کا سا اسلوب ہے۔

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل　　جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

یعنی تین مختلف النوع اشیا میں ایک خصوصیت کی بنا پر اشتراک ڈھونڈھ نکالا گیا ہے۔ یہاں مجنوں اور حاتم علی مہر میں ایک مشترک خصوصیت ڈھونڈھی ہے اور اس بہانے الم میں افتخار کا ایک پہلو پیدا کر لیا ہے۔ پھر اسی مماثلت سے گریز کر کے مغل بچوں کے 'غضب' ہونے کا ذکر کرنے لگے ہیں اور پھر اپنا ذکر کر کے حاتم علی مہر کا دل ہلکا کرنا چاہتے ہیں کہ 'زخمِ مرگِ دوست' صرف انہیں کا مقدر نہیں دوسرے بھی اس غم میں ان کے شریک ہیں۔ گویا پورا نثری اسلوب ایسے جملوں سے عبارت ہے جس میں تلازمے کا ربط ہے اور تفصیل، صراحت اور واقعہ نگاری کا لطف ہے۔

اس ضمن میں الفاظ اور جملوں کی بصری جہت سے غالب کی خصوصی دلچسپی کا تذکرہ بھی لازم ہے۔ غالب الفاظ کے ذریعے مصوّری یا مجسمہ سازی کا کام نہیں لینا چاہتے۔ واقعہ نگاری اور ڈرامائی پیش کش REPRESENTATION کا لطف پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ آنکھوں کے سامنے چلتی پھرتی زندگی کو جوں کا توں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں وہ عالمِ خیال کے اور دُنیائے افکار کے صورت گر نہیں بلکہ ایک متحرک اور تابناک زندگی کے مبصر اور راوی ہیں۔ باطنی کشمکش اور جذباتی کرب کی غیر مرئی کیفیات کو بھی وہ مرئی اور واقعاتی بلکہ VISUAL بصری شکلوں میں پیش کرتے ہیں مثلاً

"سنو عالم دو ہیں ایک عالمِ ارواح، ایک عالمِ آب و گل
حاکم ان دونوں کا وہ ایک ہے۔۔۔ ہر چند قاعدہ عام یہ ہے
کہ عالمِ آب و گل کے مجرم عالمِ ارواح میں سزا پاتے ہیں
لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالمِ ارواح کے گنہگار کو دنیا میں
بھیج کر سزا دیتے ہیں چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں
روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔ تیرہ برس حوالات میں
رہا۔ ساتویں رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوامِ حبس
صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی
شہر کو زنداں مقرر کیا اور مجھے اس زنداں میں ڈال دیا۔
فکرِ نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔۔۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی
گریز پا ہے۔ دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں"

یہاں پیدائش، شادی اور دو بچوں کی ذمہ داری کو بصری تاثر VISUAL EFFECT کا اسلوب دیا گیا ہے۔ یہ واقعہ نگاری ہمارا بالا اقتباس میں بھی ہے جہاں قرض خواہوں کے گریباں گیر ہونے اور اپنے خاموش رہنے کا تذکرہ ہے۔ چنا جان کے تعزیت نامے میں بھی ہے:

"۔۔۔ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگی ہے۔

اس تصور سے جی گھبراتا اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی۔ وہی زمردیں کاخ اور طوبیٰ کی ایک شاخ چشم بددور وہی ایک حور۔ بھائی ہوش میں آؤ کہیں اور دل لگاؤ"

قافیہ کی کھنک سے قطع نظر جو یہاں محض لطفِ سخن اور مزاح پیدا کرنے کے لئے روا رکھی گئی ہے، جنت کے غیر مرئی نشاط کو بھی غالب نے مرئی شکل دے دی ہے۔

غالب کا نثری اسلوب آہنگ سے خالی نہیں لیکن یہ آہنگ ہر جگہ اتنا کھلا ڈُلا اور اتنا سیدھا سادا نہیں جیسے مندرجہ ذیل مقفّیٰ ٹکڑوں میں نظر آتا ہے:

اس تصور سے جی گھبراتا ہے۔
کلیجہ منہ کو آتا ہے۔
وہ حور اجیرن ہو جائے گی
طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی
وہی زمردیں کاخ
اور طوبیٰ کی ایک شاخ
چشم بددور
وہی ایک حور
بھائی ہوش میں آؤ
کہیں اور دل لگاؤ

اس واضح آہنگ کے بجائے اکثر خطوں میں ایک باطنی آہنگ ہے جس میں قافیے کی لاگ نہیں۔ کہیں چھوٹے بڑے ٹکڑوں کو سلیقے سے سجا کر ہلکی سی چاشنی پیدا کی گئی ہے اور اسی مدھم آہنگ کو قائم رکھا گیا ہے اس اہتمام سے کہ اس سحر کو توڑنے والی کوئی آواز یا کوئی شوخ جذبہ پاس نہ پھٹکنے پائے۔ کہیں تخیل اور مضمون آفرینی سے کارگہِ شیشہ گری کا التزام ہے۔ کہیں فضا آفرینی ہے تو کہیں مرقع سازی۔ غالب کے نثری آہنگ کا تجزیہ شاید ان کے شعری آہنگ سے کہیں زیادہ دشوار ہے اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ غالب کی شاعری نوجوانی سے لے کر بڑھاپے تک مختلف کچے۔ ادھ پکے اور پختہ رنگوں سے گزری جب کہ ان کی نثر کو ان کی پختگی کا زمانہ ہی ملا۔ اس دور یعنی ۱۸۵۰ء کے بعد والے دور کی چند غزلوں کو پیش نظر رکھئے تو ان دونوں اسالیب کے درمیان ایک گہرا رشتہ نظر آئے گا۔ مثلاً

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

(بقیہ صفحہ ۲۳ پر)

فیض احمد فیض

غالب کی ایک اردو غزل

غالب کے شعر و ذات اور فکر کے عمومی پہلوؤں پر اس قدر تفصیل سے اور اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اس پر اضافہ شاید محال ہو۔ اس لئے میں آج غالب کی ایک غزل کے متعلق آپ سے کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔

غزل پر عام اعتراض یہ ہے کہ اس میں وحدت یعنی یونٹی کا کوئی عنصر نہیں پایا جاتا۔ بلکہ یہ متفرق خیالات اور جذبات کو محض بحر، ردیف اور قافیہ کی رسی میں ٹانکنے کا نام ہے اور اس میں کسی قسم کا تسلسل یا ربط نہیں ہوتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ تاثر صحیح نہیں ہے۔ دوسرے یا تیسرے درجے کے غزلیہ کلام کے بارے میں تو یہ بات کہی جا سکتی ہے اس لئے کہ اس نوع کے شاعر تو محض قافیہ بندی کرتے ہیں۔ لیکن جو اچھا اور سنجیدہ غزلیہ کلام ہے اس کے بارے میں شاید یہ اعتراض صحیح نہ ہو۔ اور غالب کے بارے میں تو یقیناً صحیح نہیں ہے۔ غالب تو قافیہ بند شاعر نہیں تھے چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

غالب نبود شیوۂ من قافیہ بندی
ظلمیست کہ بر کلک و ورق می کنم امشب

وہ تو کلک و ورق پر یہ ظلم کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ محض متفرق مضامین کو یک جا کرنا غالب کو اچھا نہیں لگا ہوگا۔ اتنا ضرور ہے کہ غزل میں جس قسم کی وحدت پائی جاتی ہے وہ مضمون یا خیال کی وحدت نہیں ہوتی بلکہ اس چیز کی وحدت ہوتی ہے جس کو آپ موڈ کہہ لیں یا ایک کیفیت کہہ لیں۔

آپ اگر غالب کے کلام پر نظر ڈالیں تو اکثر بڑے شاعروں کے کلام میں دیکھیں گے کہ ہر غزل قریب قریب ایک ہی موڈ کی ہے۔ یا ایک ہی کیفیت کی حامل ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس موڈ کی بھی جو مختلف کیفیتیں ہیں ان میں بھی ایک ترتیب پائی جاتی ہے اور اسی کی ایک مثال میں اس وقت پیش کرنے والا ہوں۔ لیکن ظاہر ہے کہ وحدت کا یہ عنصر داخلی ہے اور جلی نہیں بلکہ غزل کا یہ تسلسل باطنی ہوتا ہے جو محض محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ظاہری طور سے اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو بحر کا انتخاب دوسرے زمین یعنی قافیہ اور ردیف کا انتخاب۔ یہ بالکل واضح بات ہے کہ آپ کوئی بہت اداس مضمون کسی چلتی ہوئی دھن میں نہیں گا سکتے۔ اس میں وہ آہنگ پیدا نہ ہوگا جو مقصود ہے۔ بحر کا انتخاب اپنی جگہ پر متعین کرتا ہے کہ اس غزل کا موڈ کیا ہے؟ یا غزل کی کیفیت اس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ اس کے لئے کونسی بحر موزوں ہے۔ دوسرے یہ کہ جو زمین یا قافیہ، ردیف اور خاص طور سے ردیف انتخاب کی جاتی ہے اس سے بھی ایک خاص تلازمہ ہوتا ہے اس جذبے یا کیفیت کا جس کے تحت وہ غزل وارد ہوئی اور لکھی گئی ہے۔

جس غزل کا میں آپ سے ذکر کرنا چاہتا ہوں، وہ غالب (غالب کی سب سے طویل اور ان کی فکر و تکنیک کی سب سے نمائندہ غزل ہے۔ سترہ اشعار کی یہ مشہور غزل آپ کو ضرور یاد ہوگی۔

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

اس غزل میں شروع سے آخر تک ایک ہی بنیادی مضمون اور ایک بنیادی کیفیت ہے۔ بلکہ یہ بالکل ایک راگ یا ایک میوزیکل کامپوزیشن یا ایک نظم کی طرح ہے۔ اس کے مختلف ٹکڑے اور سیک وینس ہیں جن کی اپنی جگہ الگ ایک ترتیب بھی ہے اور اپنی اپنی جگہ ان کی ایک الگ نوعیت بھی۔

میں نے اس پوری غزل کو اس طرح تقسیم کیا ہے۔ پہلے تو اس کا مطلع ہے۔ اسے آپ موسیقی کی زبان میں یوں کہہ لیں کہ مطلع سے گویا کا سُر قائم کیا گیا ہے یا اس سے تمہید قائم کی ہے اس ساری کیفیت کی جو کہ بعد میں تحریر میں آئی ہے یا اس کو بنیادی موضوع کہہ لیجئے۔

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

اس شعر میں سوچنے کی بات یہ ہے کہ مدت ہوئی ہے یار سے ملے ہوئے اور یار سے خلوت میں ملاقات کئے ہوئے نہیں بلکہ یار کو مہماں کئے ہوئے مدت گزر چکی ہے۔ مہماں کا جو لفظ استعمال کیا گیا ہے اس کے دو پہلو طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ کسی اجنبی کو یا کسی ایسے شخص کو مہمان نہیں رکھا جاتا جس سے کبھی کبھار ملاقات ہوئی ہو۔ مہمان تو اسی کو رکھا جاتا ہے جس سے کافی میل ہو۔ جس سے ایک پرانا ساتھ ہو جس سے بے تکلفی کا ایک رشتہ ہو۔ چنانچہ غالب محبوب سے خلوت میں ملاقات یا وصال کا ذکر نہیں کر رہے ہیں بلکہ ایک تو وہ ایسے شخص کا ذکر کر رہے ہیں جس سے پرانا تعلق ظاہر ہے بے تکلفی ہے۔ جس کا آنا جانا ہے اور جس سے محض ملاقات نہیں بلکہ مہمانی مقصود ہے۔ مہمانداری کا اپنا ایک لطف ہے جو کہ ملاقات کے لطف کا مستزاد ہے۔ دوسرا پہلو جس کی طرف میں آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں یہ ہے کہ یار یا محبوب کی مہمانداری تخلیے میں نہیں ہے بلکہ جوش قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے ہے۔ بات یہ نہیں ہے کہ کوئی اکیلا ملنے کے لئے آیا ہو بلکہ محفل ہے، بزم ہے اور غالب جس چیز کو یاد کر رہے ہیں وہ وصال یار نہیں بلکہ محفل یاراں ہے۔ انہیں محبوب کے بچھڑ جانے کا نہیں بلکہ محفل کے اجڑ جانے کا دکھ ہے جس بات کے لئے غالب اداس ہیں اور جسے وہ یاد کر رہے ہیں۔ وہ ایک ذاتی ملاقات کا یا کسی سے ان کے ذاتی تعلق کا ذکر نہیں ہے۔ بلکہ وہ تو ایک پورے طریق زندگی اور بساط محفل اور پورے نظام زندگی کا رونا ہے جس کو وہ اس غزل کے بعد کے اشعار میں بیان کرتے ہیں۔ یہ غالب کی ذاتی کیفیت نہیں تھی۔ یہ اس زمانے کے معاشرے کی اجتماعی کیفیت تھی۔

غالب ایک خاص نظام حیات اور طریق زندگی سے واقف تھے۔ انگریزوں کے آنے اور ملک کے غلامی میں چلے جانے کی وجہ سے وہ پرانا نظام زندگی کے طریقے اور پرانے آداب محفل رخصت ہو چکے تھے۔ اور ان کی جگہ ابھی کوئی نیا نظام یا زندگی کے نئے آداب قائم نہیں ہوئے تھے۔ چنانچہ انیسویں صدی میں ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں سے پہلے اور ان ہنگاموں کے بعد کا جو زمانہ ہے اور اس زمانے کے لوگوں کی جو اجتماعی، دماغی اور جذباتی کیفیت ہے اسے ایک طریقہ سے غالب نے شعر میں بیان کیا ہے کہ مدت سے نہ وہ محفلیں رہی ہیں نہ وہ آداب باقی ہیں اور نہ وہ یار دوست بچے ہیں جن کی وجہ سے ہماری زندگی میں شادمانی اور انبساط کے سامان بہم تھے۔

بزم چراغاں کئے ہوئے والی تمہید کے بعد کیا ہوں جیسے پھر جگر لخت لخت کو سے ایک وینس شروع ہوتا ہے یعنی مطلع کے بعد کے سات اشعار کا پہلا سیک وینس۔ دوسرا جس کو وہ سیکو وینس یا ٹکڑا ہے جو اشعار کا جو شروع کر رہا ہے خریدار کی طلب سے شروع ہو کر ناک تو بہار تا ز [illegible] اس کے بعد غزل کے آخری [illegible]

اختتامیہ ہیں۔

ابھی میں عرض کر چکا ہوں کہ محفل کے برہم ہو جانے اور دوستوں کے بچھڑ جانے کی وجہ سے غالب غمگین ہیں، اداس ہیں، کیونکہ ان ہی کی وجہ سے غالب کی زندگی میں رونق تھی۔ پہلا سیکونیس "کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو" والے شعر سے شروع ہو کر "پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے" والے شعر پر ختم ہوتا ہے۔

کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو
مدت ہوئی ہے دعوت مژگاں کیے ہوئے

جب برہم شدہ محفل غالب کو یاد آتی ہے تو ان کا جی چاہتا ہے کہ وہ کیفیت جو کہ محفل کے زمانے میں ان کے قلب و دماغ پر تھی اور وہ موڈ اور جذبہ پھر کسی طرح سے دوبارہ وجود میں لایا جائے تاکہ اس کے اپنے آپ پر دوبارہ وارد ہونے سے شاید وہ پرانی محفل کسی طرح واپس آجائے۔

اس سیکونیس کے باقی شعر اسی موڈ پر ہیں کہ وہ شوق، وہ حسرت، وہ طلب اور وہ ہوس جو پرانی محفل کے لوازمات میں سے تھے انہیں اپنے آپ پر دوبارہ طاری کیا جائے چنانچہ اس شعر پر غور کیجئے۔

کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوت مژگاں کیے ہوئے

الگ الگ ٹکڑا تو کوئی چیز محسوس نہیں کرتا اس لئے پہلے تو ان جگر کے الگ الگ ٹکڑوں کو یکجا کریں تاکہ اس میں درد کی کوئی ٹیس اٹھے اور اس کی وجہ سے آنکھیں نم ہو جائیں تو پھر وہ محفل کم از کم یادوں ہی میں تازہ ہو جائے۔ اس کے بعد کا شعر ہے۔

پھر وضع احتیاط سے گھٹنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے

کہتے ہیں کہ ایک زمانہ سے صبر اور احتیاط کا دامن جو پکڑ رکھا ہے اب یہ دامن کسی طریقے سے چھوڑیں اور پھر اپنا گریبان چاک کریں تاکہ جنون وجد اور وجدان کی جو کیفیت اس محفل میں ہوتی تھی وہ لوٹ آئے۔ اس شعر پر غور فرمائیے

پھر گرم نالہ ہائے شرر بار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیر چراغاں کیے ہوئے

یعنی اپنے نطق سے الفاظ کے بجائے شعلے برسنے لگیں تاکہ ان شعلوں سے اس جذبہ اور شوق کی کیفیت پیدا ہو جو کہ اس محفل سے وابستہ تھی۔ یہ شعر بھی آپ کی توجہ کا طالب ہے۔

پھر پرسش جراحت دل کو چلا ہے عشق
سامان صد ہزار نمک داں کیے ہوئے

یہاں غالب کہتے ہیں کہ پھر دل کے زخموں پر نمک چھڑکیں اور اس سے اتنا درد ہو کہ شوق کی پرانی کیفیت واپس آجائے۔ اسی طرح کے یہ تین شعر بھی ہیں۔

پھر بھر رہا ہے خامہ مژگاں بخون دل
ساز چمن طرازی داماں کیے ہوئے

باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے

دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

آخری شعر کے الفاظ غور طلب ہیں۔ جس میں کوئے ملامت کے طواف اور پندار کے صنم کدہ کا ذکر ہے۔ کوئے ملامت سے مراد کوئے یار کو تو کعبہ ٹھہرایا ہے جس کا طواف کرنے کو جی چاہتا ہے، اور اپنے پندار اور اپنی انا کو صنم کدہ قرار دیا ہے۔ کوئے یار اور عشق یار تو حقیقت ہے اور اپنے آپ پر جو گھمنڈ ہے اور اپنا جو پندار ہے وہ صنم کی طرح باطل ہے عاشق حقیقت ہے اور خود پسندی ایک کعبہ ہے اور دوسرا صنم کدہ۔ الفاظ میں جو حسن طلب رعایت رکھی گئی ہے وہ دیکھنے کے قابل ہے اس شعر پر پہلا سیکونیس ختم ہوتا ہے۔ اس کے بعد دوسرا سیکونیس اس شعر سے شروع ہوتا ہے۔

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرض متاع عقل و دل و جاں کیے ہوئے

عقل، دل اور جان وارنے کا شوق چاہتا ہے کہ اب کوئی ایسا خریدار پیدا ہو جس پر وہ کیفیتیں طاری ہوں جو پہلے بیان کی گئی ہیں یعنی طلب اس بات کی کہ جگر کے ٹکڑے یکجا ہوں، طلب اس بات کی کہ صبر کو چھوڑ کر جنون اختیار کر لیں۔ اس بات کی طلب کہ الفاظ سے شعلے بھڑکنے لگیں، اس بات کی طلب کہ آنکھیں خون سے بھر جائیں، اس کا جواب میں بیان کرتے ہیں۔ یہ سیکونیس یا منظر نامہ اتنا مربوط اور مسلسل ہے کہ اگر آپ کسی شعر کی جگہ بدل دیں یعنی اوپر کا شعر نیچے یا نیچے کا شعر اوپر کر دیں تو تسلسل ٹوٹ جائے گا۔ منظر نامہ بگڑ جائے گا اور سیکونیس غلط ہو جائے گا۔ حضرت غالب کی اس غزل پر بلکہ ہر سیکونیس کے اشعار میں تسلسل اور ربط ہے چونکہ

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے

یہ تو ایڈا سکیپ ہے۔ یک گرا ونڈ اس میں غالب بتاتے ہیں۔ دنیا ایک گلستاں ہے، ہر طرف پھول کھلے ہوئے ہیں اور ہر پھول نہایت حسین اور خوب صورت ہے۔ یہ پس منظر ہے اس واردات کا جس کا ذکر وہ بعد کے اشعار میں کرتے ہیں۔ اس گلستان میں کیا ہوتا ہے یا غالب کیا چاہتے ہیں اسے وہ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
جاں نذر دلفریبی عنواں کیے ہوئے

آگے ذاتی کیفیت شروع ہوتی ہے۔ جو کہ اس لحاظ سے ذاتی نہیں ہے کہ یہی کیفیت بہت پہلے سے اور آج تک لوگوں پر گزرتی آئی ہے۔ اس کیفیت کی پہلی منزل تو یہ ہے کہ محبوب نہ سامنے ہے اور نہ کہیں آس پاس بلکہ نظروں سے دور اور غائب ہے۔ اس لئے غالب نامہ کا ذکر کرتے ہیں کہ نامۂ دلدار آتا ہے، چونکہ نامۂ دلدار پر عنوان محبوب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اس لئے دوست کے حسن اور اس کی محبوبیت کی صرف ایک نشانی ہے اور وہ نامۂ دلدار کا عنوان اور سرنامہ ہے۔ یہ عنوان بجائے خود اتنا دلفریب ہے کہ غالب کا اس پر جان چھڑکنے کو جی چاہتا ہے۔ نہ محبوب کا قرب، نہ اس کا دیدار، نہ اس کا وصال صرف اس کا خط آیا ہے۔ اب دوسری منزل کی طرف چلئے۔

مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس
زلف سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

محبوب ہے تو سہی مگر بام پر ہے، پاس نہیں دور بام پر ہے اور جب بام پر ہے تو وہاں سے صرف اس کی زلف سیاہ ہی نظر آسکتی ہے، باقی نقوش پر نظر نہیں پہنچ سکتی زلف سیاہ کا صرف ایک سایہ سا نظر آتا ہے رخ محبوب کی دوسری تفاصیل نظر سے اوجھل ہیں۔ پہلی منزل میں نامۂ دلدار کا ذکر، اور دوسری منزل میں دور سے دیدار یار کا ذکر اب تیسری منزل یا تیسرا مرحلہ یوں بیان ہوتا ہے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

محبوب اب بام سے اتر کر سامنے آگیا ہے، مقابل میں ہے۔ اگر مقابل میں ہے تو جس طرح بام پر سب سے نمایاں چیز زلف سیاہ تھی اسی طرح اپنے سامنے ہونے پر سب سے نمایاں چیز ظاہر ہے کہ دشنۂ مژگان ہے۔ چہرے کے نقوش میں سب سے جاذب نظر اور دلکش چیز محبوب کی آنکھیں ہی ہو سکتی ہیں۔ اس کے بعد ملاقات کا بیان ہے یہ چوتھی منزل ہے۔

اک نوبہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغ مے سے گلستاں کیے ہوئے

ملنے کے بعد دیدار، دیدار کے بعد ہم نشینی ہم نشینی کے بعد ہم پیالگی یعنی بے تکلفی کی یہ صورت ہے کہ اب چہرہ فروغ مے سے گلستاں کیے ہوئے ہیں۔

مقابل ہونے اور ملاقات کے بعد محفل آرائی اور یاروں کے ساتھ ہم نشینی کی طرف اشارہ ہے۔ اس غزل کا مطلع اگر آپ پھر ایک بار یاد کر لیں تو محسوس کریں گے کہ جوش قدح کے بعد اب کسی قسم کا ابہام یا دھندلکا باقی نہیں رہتا۔ اگر موسیقی کی اصطلاح استعمال کی جائیں تو کہیں گے کہ اس دوسرے سیکونیس کے سارے شعر جیسے سرگم ہیں، سیکونیس اونچے سُر کی طرف جا رہا ہے۔

اب آخری سیکونیس شروع ہوتا ہے جس کے اشعار اترتے ہوئے سُر ہیں۔ یہاں پہنچ کر غالب کو یہ خیال آتا ہے کہ یہ سب باتیں ہیں نہ تو محبوب آنے کا اور نہ وہ شوق کا وہ عالم پھر طاری ہوگا کہ جس کے لئے ہم ترستے ہیں۔ بلکہ غالب اعتراف شکست کرتے ہیں۔ اس سیکونیس میں تین شعر ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۴۶ پر)

شمیم کرہانی
اینگلو عربک ہائر سیکنڈری اسکول - اجمیری گیٹ نئی دہلی

غزل

ہنسو نہ تم رُخِ دشمن جو زرد ہے یارو
کسی کا درد ہو، اپنا ہی درد ہے یارو

دلوں سے شکوۂ باہم کو دور کرنے میں
لگے کا وقت کہ برسوں کی گرد ہے یارو

ہم اہلِ شہر کی فطرت سے خوب واقف ہے
وہ اک غریب جو صحرا نورد ہے یارو

جہاں متاعِ ہنر کی خرید ہوتی تھی
بہت دنوں سے وہ بازار سرد ہے یارو

عجب نہیں کہ بیاباں کے ہونٹ تر ہو جائیں
فضا میں آج سمندر کی گرد ہے یارو

خطا کسی سے ہوئی ہو کوئی بھی مجرم ہو
جواب دہ تو یہاں فرد فرد ہے یارو

خیالِ سود، نہ اندیشۂ زیاں کوئی
شمیم بھی کوئی آزاد مرد ہے یارو

غلام ربانی تاباں
جامعہ ملیہ، نئی دہلی ۲۵

غزل

یوں تو اصطلا میں ہیں چارہ گر بھی قاتل بھی
ذوق کے جوارح بھی، شوق کے مراحل بھی

میں کہ بحرِ ہستی میں ایک موجِ آوارہ
بے نیازِ طوفاں بھی، بے نیازِ ساحل بھی

ورنہ اک قیامت تھے زندگی کے ہنگامے
بجھ گیا ہے دل جب سے بجھ گئی ہے محفل بھی

کیا خبر تھی ٹوٹے گا جب طلسم سمتوں کا
میری طرح آوارہ ہو گی میری منزل بھی

اس ادائے دل کش کا کوئی نام تو ہوگا
دوستی پہ نازاں بھی دوستوں سے غافل بھی

تیری زلفِ پیچاں کی طرح اُلجھے اُلجھے
دل فریب ہیں کتنے آج کے مسائل بھی

خوبیِ مقدر کا کیا گلہ کروں تاباں
میں کہ اپنی راہوں میں خود سراپا حائل بھی

عرش ملسیانی
ایف ۳۲ ماڈل ٹاؤن، دلی

غالب کے چند باکمال شاگرد

مرزا غالب کی انا پسندی تو ضرب المثل ہے۔ انھیں اپنے متعلق اپنے ہمعصروں کے مقابلے میں کوئی خوش فہمی نہیں تھی بلکہ ایک احساسِ برتری تھا جس کے نشے سے وہ سرشار رہتے تھے۔ اسے ان کا پندارِ طبعی کہیے یا جودت، بہرحال وہ بات بات میں اس کا ذکر ضرور کرتے تھے کہ وہ کہاں اور کس زمانے میں پیدا ہو گئے۔ وہ اپنے عہد کے لوگوں کو یوں بھی ہر لحاظ سے کم رتبہ سمجھتے ہوئے خود کو "آدم گزیدہ" کہہ گئے۔ احساسِ برتری کی اس سے بڑی مثال کیا ہو گی کہ انھوں نے ایک فارسی شعر میں یہاں کہہ دیا کہ اگر انھیں کسی شاعرِ پیشیں سے توارد بھی ہوا ہے تو اس میں ان کا قصور نہیں، مضمون تو دراصل ان کا تھا۔ نہاں خانۂ ازل سے ان کا پیش رو اس مضمون کو لے اڑا۔ غالب کی بھی یہی ان کے شاگرد بھی معتقد تھے اور جنھیں صحیح جوہر کی تلاش تھی وہ دیکھتے تھے کہ دلی کے محلہ بلیماران میں لوہارو خاندان کا میرزا نوشہ اپنی پوری شان جلال سے جلوہ گر ہے۔

ان کے شاگردوں میں بڑے بڑے باکمال شاعر اور ادیب پیدا ہوئے ہیں جن کی تعداد مالک رام نے تلامذۂ غالب میں ۱۴۶ درج کی ہے۔ یہاں ہم غالب کے چند شاگردوں کی استاد سے عقیدت کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی کسی نہ کسی نادرہ کاری کا ذکر کریں گے یا کسی چیز کو پیش کریں گے جو یا تو غیر معلوم ہے، یا اہلِ نظر کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکی ہے۔

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ رئیس جہانگیر آباد کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دلی کی زبان پر ناز فرماتے ہیں ؎

شیفتہ اور ستائش کے نہیں ہم خواہاں
یہی بس ہے کہ کہیں ہے یہ زبانِ دہلی

فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے، اور اپنے کلام پر کیا ناز ہے۔

حسرتی گو سخن خواجہ بلند است ولے
کلکِ ما تیز زبانے و بیانے دارد

حسرتی نازشِ ہند است بشیریں سخنی
ایں چنیں طوطیٔ خوش لہجہ بہ ہر جا نبود

حسرتی بادۂ ما نشۂ عرفی دارد
می رسد دہلی، اگر نازشِ شیراز کند

جز حسرتی بپایہ از و کس نمی رسید
در حیرتم کہ کارِ نظیری کجا رسید

اپنے استاد کو کب کم رتبہ کہہ سکتے تھے۔ اسے سب سے بڑھا دیا

از حسرتی شنیدم در بزمِ نکتہ سنجاں
خوشتر ز طرزِ غالب طرزِ دگر نباشد

منشی بالمکند بے صبر منشی ہرگوپال تفتہ کے بھانجے تھے۔ پہلے تفتہ سے مشورہ کرتے تھے پھر ان کی وساطت سے مرزا غالب کے دامنِ فیض سے وابستہ ہو گئے۔ دو تین خطوں میں مرزا نے تفتہ کو لکھا ہے کہ بے صبر کا کلام پہنچ گیا ہے، فرصت ملنے پر دیکھوں گا اور واپس کر دوں گا۔ بے صبر بڑے پُرگو شاعر تھے ان کے غیر مطبوعہ کلیات میں چون قصیدے اور غزلیات کا ایک انبار ہے۔ وہ ہر صنفِ سخن پر قادر تھے۔ غالب کی مدح میں انھوں نے ایک قصیدہ لکھا ہے جس کا عنوان "پرکالۂ آتش" ہے۔

جس کا غالب ہے تخلص اسد اللہ ہے نام   یہ تو ہے کفر جو کہیے کہ ہے یزداں میرا
پر ہے ہادی مرا، رہبر مرا، استاد مرا   قبلہ ہے کعبہ ہے، دیں میرا ہے ایماں میرا

اسی طرح پانچ چھ تمہیدی شعروں کے بعد سولہ سترہ شعروں کا قصیدہ ہے اس کے بعد ایک اور زمین میں مدحِ غالب میں اپنی عقیدتمندی ظاہر کرتے ہیں۔

میں اپنے جان و دل سے ہوں فدائے میرزا غالب
سر اپنا ہے سدا قربان پائے میرزا غالب
برابر ہے توام مدعا سے میرزا غالب
تمنا ہے اجابت ہو دعا سے میرزا غالب

نہ کیوں نام اس کا سب نامور میں غالب ہوئے دنیا میں
ہوئی نام آوری پیدا برائے میرزا غالب
اگر ملکِ سخن کی سلطنت بخشے مجھے خسرو
نہ لوں میں کیوں کہ ہوں میں تو گدائے میرزا غالب

کسی کی طبع لے بے صبر ایسی ہے نہ فکر ایسی
زہے فکر و زہے طبعِ رسائے میرزا غالب

کمالِ سخنوری ان کے ہر شعر سے نمایاں ہے۔ ایک قصیدہ ہندوستان کی مدح میں بڑا دلچسپ ہے۔

ایک اور شاگرد شاہ باقر علی بہاری فارسی کے بڑے قادر الکلام شاعر تھے انھوں نے

اپنی فارسی شاعری میں تفاخر اور تعلّی کے بہت اشعار لکھے ہیں۔

نہ حزیں ماند نہ عرفی نہ نظیری باقر
تا شود شیفتۂ طرزِ غزل خوانیٔ ما
کجاست عرفی و صائب کجا کلیم و حزیں
منم فتادہ دریں جا زہمزباں تنہا
باقر از کلکِ گہر ریزت نہ تنہا ایں غزل
ہر کلامے چوں کلامِ سعدی و خاقانی است
بشرِ عرفی و صائب نیافتم باقر
فصاحتے کہ باندازِ ایں سخن پیداست
ہمنوایم بہ بلبلِ شیراز   طوطیٔ ہند[1] ہمزبانِ من است
می گفت حزیں باقر با عجز و ادب با من
یک شعر چو شعرِ تو موزوں نتوانم کرد
کے حزیں پیشت زند دم ہم پر جائے عرفی است
باقر اشعارِ خوشت از شعرِ سلماں شد لذیذ

تعلّی کے یہ شعر شاہ باقر علی بہاری کو زیب بھی دیتے ہیں۔ ان کے فارسی کلام کا دیوان ضخیم ہے اور زبان و بیان کی فصاحت کے ساتھ مضمون آفرینی بھی ہے۔

(دیوانِ باقر مرتبہ سید عطا حسین حیدرآباد دکن)

حبیب اللہ ذکا حیدرآبادی کا مجموعۂ نظم و نثر ۱۲۸۰ھ میں چھپا تھا اس میں غالب کا ایک رقعہ اردو ذکا کی مدح میں ہے۔ ذکا نے غالب کی مدح میں ایک شعر اپنے رقعہ میں لکھا ہے۔

آنکہ در خدمتِ او خامہ بعرضِ ادب است
شاہِ مردانِ سخن غالبِ عالی نسب است

غالب کا رقعہ یوں ہے:

سوادِ عبارتی کہ والا جناب مستطاب نواب اسداللہ خاں
غالب دہلوی در سال ہزار و دو صد و ہشتاد و یک بر
پشتِ مجموعہ نظم و نثر کہ بغرضِ اصلاح خدمت والاشان
فرستادہ شدہ بود بقلمِ خویش رقم فرمودہ اند پایان
آں مہرِ خود زدہ اند۔

"یہ کلام کسی بادشاہ کا نہیں، کسی امیر کا نہیں، کسی شیخ شیاد کا نہیں، یہ کلام میرے ایک دوست کا ہے اور فقیر اپنے دوست کے کلام کو معرضِ اصلاح میں بنظرِ دشمن دیکھتا ہے۔ جب تملّق نہیں، مدارا نہیں تو جو کچھ نظر آیا ہے بے حیف و میل کہوں گا۔ نثر میں نصرت خانِ عالی کے انداز کا احیا کیا ہے مگر پیرایہ کچھ اوس سے بہتر دیا ہے۔ قصائد میں انوری کا چربہ اُٹھایا ہے مگر طبیعت نے اچھا زور دکھایا ہے۔ غزل میں متأخرین کا انداز عاشقانہ سوز و گداز منشی حبیب اللہ ذکا سخنور ہمہ دان یکتا، نقطہ طراز معنی آفریں آفریں، صدا آفریں، صد ہزار آفریں۔ (غالب ۱۲۸۰ھ)

تعلّی ہمیں بہادر شاہ ظفر کے یہاں بھی ملتی ہے۔

اے ظفر ایک ہے تو فنِ سخن میں استاد
کیوں نہ قائل ہوں ترے ناسخ و آتش دونوں
بلکہ گر ہوتے نظیری و ظہوری بھی آج
کرتے ہر شعر کو سن کر ترے عش عش دونوں

نواب یوسف علی خاں ناظم نے ایک ہی شعر میں اپنی اور استاد دونوں کی تعریف کی ہے:

مبداءِ فیاض سے ناظم ہیں دونوں بہرہ یاب
میں بھی ہوں استاد کے حسنِ طبیعت کا شریک

سید غلام حسنین قدر بلگرامی غالب کے ایک اور باکمال شاگرد ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنے لکھنوی استادوں کے ساتھ غالب کا بھی ذکر ایک رباعی میں کیا ہے:

سیکھے سحر و برق سے بندش کے بند
پھر غالب و تحریر نے بتائے پیوند
مجھ سا بھی زمانے میں نہ ہوگا اے قدر
بدنام کنندۂ نکو نامے چند

قدر سحر اور غالب دونوں سے اصلاح لیتے تھے۔ دہلی کی سادگی اور لکھنو..... کی ادا آپ کے کلام میں موجود ہے۔ "کلیاتِ قدر" ۱۸۹۱ء میں شائع ہوا۔ تمام اصنافِ سخن پر قادر تھے۔ کلیات ضخیم ہے۔ تاریخ گوئی میں ملکۂ خاص ہے۔ بسلسلۂ ملازمت مہاراجہ ... [illegible] تھی۔ تو تا رام شایاں نے مہابھارت کا جو منظوم ترجمہ کیا ہے اس کی تاریخ کہی ہے۔

مہابھارت کبھی شایاں نے جس دم	ہوئی بس دھوم اس کی جا بجا خوب
ٹپکتی ہے فصاحت وہ روانی	معانی خوب، بندش خوب ادا خوب
شنیدہ کے بود مانندِ دیدہ	وہ قصہ میرا دیکھا ہے کہا خوب
جو پوچھی قدر سے تاریخ اس کی	جھکا کر سر کہا "کیا خوب کیا خوب"

۱۲۹۵ھ

مرزا غالب کی تاریخِ وفات کا قطعہ پندرہ اشعار پر مشتمل ہے۔ ہر شعر کے پہلے مصرعے سے عیسوی سن ۱۸۶۹ء اور دوسرے مصرعے سے ہجری سن ۱۲۸۵ھ نکلتا ہے۔

مرادِ حشر کیا دہلی کا غل تھا (۱۸۶۹ء)
فلک ٹوٹا یہ مجھ پہ آہ ناگاہ (۱۲۸۵ھ)

ختم تیر کرنٹ سوا لکھنو کا قطعہ تاریخ بھی ایسا ہی لاجواب ہے وہ مکمل درج ہے:

[1] غالباً یہ امیر خسرو کی طرف اشارہ ہے۔

قطعۂ لاجواب ہدیۂ سید غلام حسنین قدر (۱۸۶۳ء)

گورنر جنرل عالی ڈنش لارنس صاحب (۱۸۰۰) بعہد جہد کل اٹھارہ سو سرسٹھ نومبر میں (۱۸۰۰)
نوی ڈالی بنائے خیر خود کیننگ کالج کی معمار بگر ستر سکندر جس طرح وقت سکندر میں
عمارت بن چلی وہ جتنے بنتے بن گیا کالج (۰) زمانِ عدل و رزیر سپرنٹنڈ نٹ جارج کوپر میں
ہو باتسکین ہیں کرنل ریڈ صاحب متہم لائق (۰) ملک پہلو نشیں ہیں پاس رواتِ ارتحج میں
نئی دل سر جمارا جابہادر نصف لائق (۰) ہے زیبائے شجاعت دیکھے سمجھو اسم د فتر میں
پریسیڈنٹ مہر برج طاقت کے سی ایس آئی (۰) کفیل حالِ کالج ہیں یہ دانا بخشش ار میں
سید الملک امیر الدولہ والا نجم ذی ہمت (۰) یہ عالی رکن امیر حسن ہیں فتح مگر میں
یہ عمانِ سخاوت اُس پریسیڈنٹ سابق ہیں (۰) کوئی ہمسر نہیں جاہ و عروج و شوکت و فر میں
ہے زیبا پایہ ارلیس اوج شنکر بخش رانا کا (۰) ہیں یہ وائس پریسیڈنٹ داخل اہل جوہر میں

ہمایوں مہر ڈپٹی میر زا عباس خاں صاحب — ہیں سرکاری یہ ممبر مجمرِ دانش جبلہ ممبر میں
ہوئی میر عمارت نیک دل کرنل ہوش امین — دلِ افزا ہے صفائی خوب ہر دیوار و پتھر میں
ہیں نعمان خرد "ولور" صاحب نامی انجنیئر — لکھی تھی قطع صنعت ان کے کالج کے مقدر میں
نکو خوام ہی ہوائٹ صاحب ایم اے اس میں افسر ہیں — سراپا فرد ہے کیننگ کالج ہفت کشور میں
سلامت یا خدا حکام منصور اور یہ کالج — ہیں جب تک نجم و ماہ افلاک پر موتی سمندر میں
مکمل نظم وہ لکھی ہے قدر بلگرامی نے — ہیں سال عیسوی مقصود ہر اک مصرعِ تر میں

قدرتِ کلام اور قدرتِ تاریخ گوئی کی انتہا ہے۔ اس نظم کے ہر مصرعے سے ۱۸۶۸ء نکلتا ہے۔ ایسے ہی قطعاتِ تاریخ حکیم ضامن علی جلالؔ لکھنوی کی تالیف "گلشنِ فیض" اور امام باڑہ مصرہ حکیم شیخ علی محمد واقع فرنگی محل کے متعلق ہیں۔

غالبؔ نے اپنی زندگی میں اپنی جانشینی کی سندِ اول نواب ضیاء الدین احمد خاں نیرؔ رخشاں کو اور سندِ دوم نواب علاء الدین احمد خاں علائیؔ کو لکھ کر دے دی تھی۔ ان کے کلام میں ان کا ذکر بھی آتا ہے۔ علائیؔ کے نام "اردوئے معلّٰی" میں بہت سے خطوط بھی ہیں۔ ان کے علاوہ ایک منظوم رقعہ جو لوہارو آنے کی دعوت کے جواب میں ہے شائع ہو چکا ہے۔ غالبؔ کا یہ زندۂ جاوید قطعہ علائیؔ کو زندۂ جاوید کر گیا ہے۔

مجھ سے غالبؔ یہ علائیؔ نے غزل لکھوائی
ایک بیداد گرِ رنج فزا اور سہی!

علائیؔ کا کلام شائع نہیں ہوا۔ اب نواب صاحب لوہارو نے ان کی بیاضیں اور ڈائریاں رضا لائبریری رام پور کی نذر کر دی ہیں، انہیں کے شکریے اور اجازت سے ان کا یہ قطعہ درج ہے:

کل عالمِ اسرار میں عبرت کی نظر سے
گلگشت کا موقع مجھے اسرار میں آیا
دیکھا کہ عجب واد ی پرخار ہے دنیا
رہرو جو گیا واں سے [illegible]

اک شور تھا بس بات سمجھ میں نہیں آئی
آیا جو سمجھ میں تو یہی اک سخن آیا
جو صبح کو گلگونہ قبا راہ سے گزرا
وہ شام کو پڑ مردہ بہ زیرِ کفن آیا

اس قطعے کا دوسرا حصہ بہاریہ ہے۔ علائیؔ بھی غزلوں میں غالبؔ کے معتقد ہیں۔ ان کا ایک مقطع ہے:

ہے علائیؔ یہ غزل کچھ فیضِ غالبؔ ورنہ میں
بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس جو گلخن میں نہیں

شاہزادہ زین العابدین صوفی بھی تلامذۂ غالبؔ میں سے ہیں۔ فرماتے ہیں:

سب تیغِ زباں سے انھیں پہچانتے ہیں — غالبؔ ہیں وہ سب اہلِ سخن جانتے ہیں
یہ شیرِ خدا کے نام کی ہے برکت — لوہا اسد اللہ کا سب مانتے ہیں

ہیں شعر کے معرکے میں صفدر غالبؔ — ہاتھ ان کے ہے یہ کمیت ہیں سب پر غالب
اس نام کا پاس ہے خدا کو صوفیؔ — پھر ہوں اسد اللہ نہ کیوں کر غالب

منشی ہر گوپال تفتہؔ سکندر آبادی کے نام غالبؔ کے خطوں سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں تفتہؔ سے کس قدر محبت تھی۔ تفتہؔ فارسی کے بڑے پُرگو شاعر ہوئے ہیں۔ فارسی میں چار دیوان ہیں اور کسی میں بارہ تیرہ ہزار شعر سے کم نہیں۔ دیوانِ دوم ۱۸۵۷ء میں کوہ نور پریس لاہور سے بہت خوبصورت چھپا ہے۔ قلم جلی ہے تقطیع بڑی۔ آخر میں آٹھ صفحوں پر مشتمل غلط نامہ بھی ہے۔ اس زمانے کی حُسنِ طباعت کی ایسی اچھی مثال کم دیکھنے میں آتی ہے۔ اساتذۂ ماضی کی زمینوں میں سہ غزلے اور چہار غزلے بھی ہیں۔ کچھ مثالیں درج ہیں:

سعدیؔ۔ سرو سیمینا بصحرا می روی — نیک بد عہدی کہ بے ما می روی
تفتہؔ۔ لے کہ بہرِ سیرِ دریا می روی — گریہ می آید کہ تنہا می روی
خوشترا از دانائیت نادانیت — آمدی از سہو و عمداً می روی
اسیرؔ۔ گر سراسر حیرت ما نیستی — نیستی مردِ تماشا نیستی
تفتہؔ۔ خاک بر سر خار در پا نیستی — اے دلِ ما تو دلِ ما نیستی
تا زِ غیرت تفتہؔ بر جانت چہ رفت — جو کمت ہر جا و پیدا نیستی
ظہوریؔ۔ اشک پردازی کن از گوہر براے — تشنۂ اوگر دو از کوثر براے
تفتہؔ۔ کار کن را کار فرما لازم است — چشم تو افسون و افسون گر براے
ایں نظام لے دل باز وحشت گریز — کشش جہت شش شد بتار شستہ دلے

اپنے بیٹے کی وفات پر انہیں قریب تین سو شعر کا درد انگیز مرثیہ لکھا ہے۔ غالبؔ نے بھی اس مرثیے کو دیکھ کر انھیں لکھا تھا کہ کسی صاحب نے اپنے بیٹے کے مرثیے کی فرمائش کی ہے۔ تم سے زیادہ درد انگیز مرثیہ کون کہہ سکے گا تمھیں دس بیس شعر کہہ دو۔

یہاں صرف پانچ شعر درج ہیں۔

چشمہ آنکہ رفت و بجز ا ہرز — رحمے بخستہ جانی مسکیں پدر نہ کرد
چشمہ آنکہ قافلاش راسپہر زد — در نیم رہ وے بہ برادر خبر نہ کرد
چشمہ آنکہ بر دہ بخشش شبک هاں — گفتم بہ وے قیام دگرزن دگر نہ کرد
چشمہ آنکہ بود تنہا سے دریں — آئینہ آیہ شد بریدہ کہ پیدا اثر نہ کرد

حق ایں کہ او نمرد و دل افگار تغتہ مرد
صد بار تغتہ مرد و دو صد بار تغتہ مرد

غالب کو خلعت ملی تو مرزا قربان علی بیگ سالک نے تاریخ کہی۔

اسد اللہ خاں بہادر را — رہبری کرد بخت و اقبالش
داد خلعت گورنر پنجاب — مہربانی نمود بر حالش

عیسوی گفتم از سر عشرت
خلعت ہفت پارچہ سالش

(از بہار سالک مطبوعہ ۱۸۷۰ء)

اس کے بعد مولانا حالی کی ایک تقریظ دیکھئے جو انھوں نے کتاب "معلم الشطرنج" پر لکھی تھی۔ یہ کتاب منشی راجا بابو دہلوی نے پٹیالے سے ۱۹۰۱ء میں شائع کی تھی۔ اب تک یہ تقریظ کسی مجموعے میں شائع نہیں ہوئی، اور نہ کسی کو یہ علم بھی ہے کہ مولانا کو اس کھیل سے بھی دلچسپی تھی۔

ھُوَ القَدِیر

تقریظ از قلم اعجاز رقم، شاعر بے مثال سخنور باکمال سعدیٔ ہند جناب مولانا مولوی الطاف حسین صاحب حالی پانی پتی۔

مُعلم الشطرنج

مصنفہ منشی راجا بابو صاحب دہلوی

(خلف الرشید ماسٹر چھنی لال صاحب مرحوم ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم ریاست پٹیالہ)

اس کتاب کو بقدر ضرورت میں نے مختلف مقامات سے دیکھا۔ اگرچہ میرا یہ منصب نہیں ہے کہ ایک ایسی کتاب کی نسبت جس کا موضوع فن شطرنج بازی ہو اس کے مضمون کی حیثیت سے کچھ چون و چرا کر سکوں، کیونکہ یہ درحقیقت ایک ماہر و مشاق شاطر کا کام ہے جو اس فن میں ید طولیٰ رکھتا ہو۔ لیکن چونکہ یہ کتاب اُردو زبان میں لکھی گئی ہے اس لئے ہر شخص جو اردو زبان کو سمجھ سکتا ہے وہ کم سے کم اسی کا حق رکھتا ہے کہ مصنف کی طرز تصنیف و طرز بیان یا کتاب کے مفید و غیر مفید ہونے کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرے۔

جہاں تک مجھ کو معلوم ہے آج تک کوئی کتاب ہماری زبان میں شطرنج پر ایسی جامعیت کے ساتھ نہیں لکھی گئی۔ اور اس فن کے متعلق اس قدر معلومات کا ذخیرہ عام ہندوستانیوں کے واسطے کبھی جمع نہیں کیا گیا۔ ممکن ہے کہ بعض ہموطن اس کتاب کے مفید ہونے میں تامل کریں۔ مسلمان تو اس وجہ سے کہ ان کے مذہب میں لہو و لعب میں مشغول ہونا ممنوع ہے اور ہندو اس وجہ سے کہ جن لوگوں کو اس کھیل کا چسکا پڑ جاتا ہے وہ اکثر اپنے ضروری اور بڑے بڑے فرائض کو شطرنج بازی پر قربان کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ان کو کھانے پینے بلکہ اپنے آپے کی بھی خبر نہیں رہتی۔ لیکن لعب کا اطلاق ان کھیلوں پر ہوتا ہے جو کسی عمدہ مقصد کے لئے نہیں بلکہ صرف تضیع اوقات کے طور پر کھیلے جاتے ہیں۔ پس شطرنج اگر خاص خاص اوقات میں اس غرض سے کھیلی جائے کہ مآل اندیشی اور تدبر کی عادت پڑے اور دماغ میں سوچنے اور غور کرنے کا ملکہ پیدا ہو تو ہرگز لعب میں شمار نہیں ہو سکتی اس کے سوا کوئی کام صرف اس وجہ سے مذموم نہیں ٹھہر سکتا کہ بعض اشخاص اس کو بُری طرح کرتے ہیں۔

کتاب کا مطالعہ بالاتفاق ایک نہایت مفید اور عمدہ مشغلہ ہے، وہ صرف اس وجہ سے قابل اعتراض نہیں ہو سکتا کہ بعضے لوگ اسی کے ہو رہتے ہیں اور تمام دینی اور دنیاوی کاموں کو مطالعہ کے شوق پر قربان کر دیتے ہیں۔ اس کتاب کی نسبت صرف اس قدر لکھنا کافی ہے جو کچھ اس کے متعلق لالہ جیون لال صاحب منیجر امپیریل بک ڈپو چاندنی چوک بازار دہلی نے اپنے اشتہار میں لکھا ہے اس میں ہرگز مبالغہ نہیں کیا گیا بلکہ جس طرح اکثر عمدہ کتابوں کے اشتہارات میں بسبب اختصار کے ان کتابوں کی اصل خوبیاں پوری پوری بیان نہیں ہو سکتیں اسی طرح صاحب منیجر امپیریل بک ڈپو کا اشتہار کتاب "معلم الشطرنج" کی بہت سی خوبیاں بیان کرنے سے قاصر رہا ہے۔ لیکن اس کتاب میں ایک بات کی کسر معلوم ہوتی ہے یعنی جبکہ اس میں بہت سے یورپین شاطروں کے کمالِ شطرنج بازی کا ذکر جابجا کیا گیا ہے تو مقتضائے مقام یہ تھا کہ ہندوستان کے نہایت نامور اور باکمال شاطروں کا بھی کسی قدر تذکرہ کیا جاتا۔ خصوصاً انیسویں صدی کے مشہور شاطر مثل کرامت علی خان و میر ابراہیم الدین میاں و امام علی خان وغیرہم ضرور اس بات کے مستحق تھے کہ جو کتاب ہندوستان کی کی زبان میں ایک ہندوستان ہی کے ایجاد کئے ہوئے کھیل پر لکھی جائے اس میں ان کی خاص خاص بازیوں اور نقشوں کا ذکر کیا جائے۔ لیکن حق یہ ہے کہ ہمارے لٹریچر میں کوئی ذریعہ ایسا موجود نہیں ہے جس سے ہندوستانی شاطروں کی کسی بازی یا کسی نقشے کا سراغ لگانا ممکن ہو۔ جو شاطر مر گیا اس کی بازیاں اور اس کے نقشے بھی اس کے ساتھ مر گئے۔ البتہ ہمارے عزیز دوست راجا بابو صاحب نے اُردو لٹریچر میں ایک ایسی مثال قائم کی ہے کہ اگر اس کی [illegible] تو آئندہ شاطروں

کے عمدہ عمدہ نقشے آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ رہ سکیں گے۔

دلی میں عبدالحکیم نامی ایک مشہور غائب باز تھا جس کو ہم نے خود حاضر و غائب دونوں طرح کھیلتے دیکھا ہے۔ اس کی نسبت یہ بات مشہور تھی کہ وہ حاضر بازی میں تو مات بھی ہو جاتا ہے مگر غائب بازی میں کبھی مغلوب نہیں ہوتا۔ لیکن افسوس ہے کہ آج اس کی ایک بازی کا نقشہ بھی کسی کو یاد نہیں۔ اسی لئے جیسا کہ راجہ بابو صاحب نے اکثر کتاب میں تصریح کی ہے اس ملک میں فن شطرنج بازی روز بروز تنزل کرتا جاتا ہے۔ شاید بعض نکتہ چین اس جدید تصنیف پر ریمارک کریں کہ اگر فن شطرنج بازی کو غیر مفید تسلیم کر لیا جائے تو بھی اس موضوع پر کتاب لکھنا اس وقت زیبا تھا جب کہ ہمارا لٹریچر اور ہماری زبان تمام ضروری علوم و فنون سے مالا مال ہو جاتی اور مصنفین کے لئے کوئی میدان اس کے سوا باقی نہ رہتا کہ کھیلوں اور بازیوں کے قواعد منضبط کر کے ان کو کتابوں کے لباس میں جلوہ گر کریں۔

اس قسم کا اعتراض اس کتاب پر کیا گیا تھا جو حال ہی میں فرانس اور روس کی جنگ کے بیان میں انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کی گئی ہے۔ اگر چہ یہ اعتراض بھی ہوں کی نسبت ایک حد تک صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ مترجم مختلف مضامین میں سے جس مضمون کو سب سے مقدم اور ضروری سمجھے ترجمہ کے لئے انتخاب کر سکتا ہے مگر اوریجنل تصنیف کے لئے کسی مضمون کا اس طرح انتخاب کرنا ممکن نہیں۔ کیونکہ ایسی تصنیف اُسی مضمون پر سرانجام ہو سکتی ہے جس میں مصنف نے کم و بیش کمال حاصل کیا ہو اور اس کی ممارست میں ایک معتد بہ حصہ عمر صرف کیا ہو۔ پس درحقیقت ایک اوریجنل مصنف کا یہ کام نہیں ہے کہ جو مضمون مُلک کے لئے سب سے زیادہ ضروری اور مفید ہو اس پر خواہی نہ خواہی طبع آزمائی کرے، بلکہ براہ راست اس کا کام یہ ہے کہ جس فن میں اس نے کمال حاصل کیا ہے اس میں جو کچھ تجربہ اور معلومات اس نے بہم پہنچائی ہوں اُس کو قدیم مصنفوں کی معلومات میں شامل کر کے اس سے مُلک کو مستفید کرے۔

ہم کو امید ہے کہ راجا بابو صاحب کی کتاب "معلم الشطرنج" اُن تصانیف کے لئے جو آئندہ اس فن پر خاص کر اُردو زبان میں لکھی جائیں گی بمنزلہ اساس اور بنیاد کے ہوگی اور جتنی عمارتیں اس بنیاد پر چُنی جائیں گی ان کے بانی ہونے کا فخر ہمارے لائق مصنف کو ہوگا۔

راقم

خاکسار الطاف حسین حالی

از پانی پت۔ (۱۹۰۱ء)

بقیہ غالب کا نثری اسلوب

یہ ۱۸۵۲ء کی غزل ہے۔ اس غزل میں سادگی، صراحت اور دردمندی کے جو نقوش موجود ہیں وہ ان کے خطوط کی فضا اور اس کے نثری آہنگ سے ملتے جلتے ہیں۔ اس قسم کا موازنہ ہر لحاظ سے مفید ہوگا اور غالباً دور رس نتائج پیدا کرے گا۔

غالب کی شاعری ان کے غم روزگار سے ہزیمت کا بدل ہے وہ افراسیاب اور فریدوں کے علم تو کیا اپنے بگڑے ہوئے خاندان کی پوزیشن بھی حاصل نہ کر سکے۔ اسی لئے انہوں نے اس کے بدلے میں قلمرو شعر کی حکمرانی سنبھال لی۔ شاعری کی دنیا میں جو دکھ درد ملے یا مناسب داد نہ پانے اور مناسب درجہ حاصل نہ کر سکنے کا جو قلق تھا اس کا بدل انہوں نے مکاتیب میں تلاش کیا۔ یہ نثری اسلوب اُن کی پناہ گاہ بھی ہے اور دریافت بھی۔ دریافت اس لحاظ سے کہ جس طرح ان کی شاعری میں یہ احساس موجود ہے کہ ہرچند آنے والی زندگی کی برکتوں اور نعمتوں میں ان کا یا ان کی طرح کے امراء و شرفا کا کوئی حصہ نہیں مگر مستقبل میں نئی تابناکی ہے ضرور (''نہیں نگار کو الفت نہ ہو نگار تو ہے'' والی غزل اس کی ایک مثال ہے) اسی طرح اردو نثر کے اس سادہ اسلوب کے ذریعے انہوں نے مستقبل کے تیور پہچاننے بلکہ اسے جان لینے کی کوشش کی ہے۔ وہ نثر جو انشا، امّن اور ماسٹر رام چندر کی تحریروں میں بن سنور رہی تھی اس میں ایسی تہہ داری، لطافت، شوخی اور ڈرامائیت۔ مختصر یہ کہ ایسی پہنائی اور گیرائی پیدا کر دینا کہ وہ تخلیقی فن کا جوہر بن جائے، مرزا کے خلاقانہ ذہن اور فطری جودت کا کرشمہ ہے۔

دورِ حاضر کے تنہا صاحب طرز نثر نگار رشید احمد صدیقی کا قول ہے کہ نثری آہنگ نغمہ نہیں آرکسٹرا کی سمفنی ہے۔ یہ صحیح بھی ہے غزل میں اور نظم میں ایک شعر یا ایک نغمہ کافی ہے۔ لیکن نثر کی لطافت قائم رکھنے اور اس میں عظمت کے آثار پیدا کرنے کے لئے آرکسٹرا کی سمفنی کی ہمہ جہتی اور ہفت آہنگ نغمگی لازمی ہے۔ کہیں طنز کا رنگ کہیں شوخی کی جھلک، کہیں چھوٹے چھوٹے جملوں کے گل بوٹے، کہیں الفاظ کا تطابق اور تخالف، کہیں شخصیت کی لاگ، کہیں تخیل کی رنگینی، کہیں مضمون آفرینی کا کیف، کہیں دردمندی کی جھلک، غالب کو اس آرکسٹرا کی سمفنی کے سب سے بڑے ماہروں میں شمار کیا جائے تو شاید قرض کا وہ بار کچھ ہلکا ہو سکے جس کے لئے اُردو نثر اُن کی مرہونِ منت ہے۔

قمر رئیس
سی ۱۹۲ ووڈیک وہار، دہلی ۳۴

سوویت یونین میں غالب کا مطالعہ

سوویت یونین (روس) میں اردو زبان وادب سے دلچسپی اور اس کے مطالعہ کا آغاز انیسویں صدی میں ہی ہوگیا تھا۔ ۱۸۰۸ء میں روسی سیاح لبیدیف نے اردو کی گرامر شائع کی۔ اس کے بعد مشہور روسی ہندشناس پتروف نے اردو کی گرامر، صوتیات اور لغت کے بارے میں کئی مقالے لکھے۔ اکتوبر انقلاب کے بعد لینن گراڈ اور ماسکو کی دانشگاہوں اور علوم شرقیہ کے اداروں میں زیادہ منظم طریقہ سے اردو زبان وادب کے مطالعہ کا آغاز ہوا۔ اس سلسلہ میں پروفیسر برانیکوف کی خدمات قابلِ ستائش ہیں۔ جنھوں نے اردو زبان کا ابتدائی نصاب تیار کرکے اور روسی اردو لغت پر کام کرکے اس زبان کی تعلیم وتدریس کے کام کو نسبتہً آسان بنادیا۔

ہندوستان کی آزادی اور سوویت یونین سے سفارتی تعلقات کے قیام کے بعد وہاں اردو اور دوسری ہندوستانی زبانوں کی تعلیم وتدریس کے کاموں میں مزید توسیع وترقی ہوئی۔ اب ماسکو اور لینن گراڈ ہی نہیں تاشقند سمرقند اور دوشنبے (تاجکستان) بھی اردو کی تعلیم اور تحقیق کے مرکز بن گئے۔ دانشگاہوں کے علاوہ سوویت یونین کے متعدد اسکولوں میں بھی اردو لازمی مضمون کے طور پر پڑھائی جانے لگی۔ زبان وادب کی تحقیق کا کام بھی زیادہ سائنٹفک ڈھنگ سے ہونے لگا۔ گزشتہ دس سال میں کم وبیش پندرہ سوویت اسکالر اردو زبان یا ادب کے کسی اہم موضوع پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کرچکے ہیں۔ صرف یہی نہیں سوویت یونین میں اردو مصنفین کی کتابیں ترجمہ ہوکر لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوتی ہیں۔ اردو کی اس روزافزوں مقبولیت میں بڑھتی ہوئی ہند سوویت دوستی اور ثقافتی تبادلہ کے پروگراموں کا بھی بڑا حصہ رہا ہے۔

چند سال قبل جب ہندوستان میں قومی شاعر کی حیثیت سے مرزا غالب کی صد سالہ برسی منائی گئی تو سوویت یونین میں بھی بابا جان غفوروف (ڈائرکٹر اورینٹل انسٹی ٹیوٹ، ماسکو) کی سربراہی میں ایک کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی جس کا مقصد سوویت یونین کے ہندشناسوں اور دوستوں کی طرف سے ہندوستان کے اس عظیم شاعر کو خراجِ تحسین پیش کرنا اور اس کے کارناموں کو سوویت زبانوں میں متعارف کرانا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے دو عظیم شاعر امیر خسرو اور مرزا غالب نسلی اور جدی اعتبار سے سوویت یونین کے اس علاقہ سے تعلق رکھتے ہیں جسے آج ازبکستان کہا جاتا ہے۔ مرزا غالب نے ہمیشہ خاکِ پاکِ توران اور سمرقند سے اپنی وابستگی پر فخر کیا ہے۔ اس لئے بقول پروفیسر شا اسلام شاہ محمودوف مرزا غالب پر سوویت عوام کا بھی تقریباً اتنا ہی حق ہے جتنا ہندوستان کے عوام کا۔ مرزا غالب اور ان کے کارنامے دونوں ملکوں کے قدیم ثقافتی روابط اور لین دین کی زندہ شہادت ہیں۔

سوویت یونین میں غالب صدی کی تقریبات ماسکو، لینن گراڈ، تاشقند اور دوشنبے میں خاص اہتمام سے منائی گئیں۔ مرزا غالب کے فکروفن کے بارے میں منعقد ہونے والے مذاکروں اور عام جلسوں میں نہ صرف یہ کہ سوویٹ عالموں نے حصہ لیا بلکہ ان کی دعوت پر ہندوستان سے بھی ایک وفد گیا جو ڈاکٹر عبدالعلیم، سید احتشام حسین اور مالک رام جیسے عالموں پر مشتمل تھا۔

جلسوں اور مذاکروں کے علاوہ اس موقع پر روسی زبان میں کلام غالب کے ترجمہ پر دو کتابیں شائع ہوئیں جن میں سے ایک غالب کے کم وبیش ایک ہزار اشعار کا منظوم ترجمہ ہے اور دوسری میں غالب کے دو ہزار دو سو اشعار کا آزاد ترجمہ پیش کیا گیا ہے پہلی کتاب کی مترجمہ محترمہ نینا پیپوا ہیں۔ دوسری کتاب میں جو تراجم شامل ہیں وہ محترمہ نتاسا پیری گارینا، گلیبوف اور ظ انصاری کی محنت کا ثمرہ ہیں۔ یہ تراجم مرزا غالب کی اردو اور فارسی شاعری کے نمائندہ انتخاب پر مشتمل ہیں۔ روسی زبان میں کلام غالب کے ترجمے کے جو مسائل اور جو مشکلات رہی ہیں۔ ان کے بارے میں محترمہ نینا پیپوا اور دوسرے مترجمین نے اظہار خیال کیا ہے اور پروفیسر چیلی شیت نے اپنے عالمانہ مقدمہ میں غالب کی شاعری کے فکری پہلوؤں اور شاعرانہ عظمت پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کتابوں نے اردو کے اس محبوب شاعر کو بڑے موثر ڈھنگ سے روسی قارئین سے روشناس کرایا۔ اس سلسلہ کی ایک اہم علمی کتاب جو روسی زبان میں شائع ہوئی "غالب مشرق کا

عظیم شاعر" ہے۔ جس میں غالب کے فکر و فن کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس میں جن ممتاز سوویٹ عالموں کے مقالے شامل ہیں ان میں پروفیسر چیلی شیعت، محترمہ نتاشا پری گارینا، محترمہ گ۔ پلانسکایا، پروفیسر دیاکوف، ڈاکٹر ستخاچوف اور گلیبوف کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ہندوستانی ادیبوں میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی اور ظ انصاری کے مقالے بھی کتاب میں شامل ہیں۔

تاشقند میں پروفیسر شا اسلام شا محمود، رحمان بیردی محمد جانف، ڈاکٹر تش مرزا غالمرزائف اور ڈاکٹر نبی محمود نے غالب کے کارناموں کو ازبکستان کے قارئین سے متعارف کرایا۔ غالب صدی کے موقع پر مقامی ادبی رسائل میں ان کے متعدد مضامین اور تراجم شائع ہوئے۔ رحمان بیردی محمد جانف نے جو تاشقند یونیورسٹی کے شعبۂ ہندوستانی میں اردو کے معلم اور ہندوستانی لسانیات کے ماہر ہیں، غالب کے کم و بیش ڈیڑھ ہزار اردو اشعار کا ترجمہ ازبکی زبان میں کیا۔ اس کتاب کا مقدمہ راقم الحروف نے لکھا ہے۔ غالب کے اس ترجمے کی پینتیس ہزار جلدیں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئیں۔ اب اس کے دوسرے اڈیشن میں جو زیر طبع ہے مزید سو اشعار کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

ازبکی (چغتائی ترکی) زبان میں کلام غالب کی مقبولیت کا ایک بڑا سبب شاید ترجمہ کی کامیابی ہو۔ مترجم کی کوشش یہ رہی ہے کہ ترجمہ میں نہ صرف شاعر کے خیال و فکر بلکہ اشعار کے فنی حسن کو بھی منتقل کیا جائے۔ شاعری کے ترجمہ میں ایک بنیادی ضرورت اس موڈ یا کیفیت کو گرفت میں لینا اور دوسری زبان میں اس کی بازآفرینی ہے جو اصل نظم یا شعر میں موجود ہو۔ غزل کے ترجمہ میں ایک مشکل یہ بھی ہے کہ پوری غزل کے موڈ کے ساتھ ساتھ ہر شعر کی اپنی مزاجی کیفیت بھی ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اصل شعر کی امیجری اس کے رموز و علائم اور اس کے ہیئتی تار و پود کو (جو ناگزیر طور پر اس کے خیال یا مضمون ہی کا ایک حصہ ہوتے ہیں) دوسری زبان میں منتقل کرنے کا نہایت دشوار اور نازک کام بھی ہے۔ ازبکی زبان میں غالب کا ترجمہ شاید اس لئے بھی کامیاب ہو سکا کہ اس کی شاعری میں بھی غزل سب سے زیادہ محبوب صنف رہی ہے۔ اور اردو کی طرح اس پر بھی فارسی کی غزلیہ شاعری کی روایات کا نمایاں اثر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو اور ازبکی زبانوں میں فارسی عربی اور خود ترکی کے بے شمار الفاظ اور تراکیب ہی نہیں، تشبیہات، استعارات، تلمیحات، صنائع اور اوزان کا بڑا سرمایہ مشترک ہے۔ غالب کے مترجم رحمان بیردی دونوں زبانوں کے کلاسیکی سرمایہ سے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ (کبھی کبھی اردو میں بھی شعر کہتے ہیں) شاید اسی سبب سے انہیں غالب کی اردو غزلوں کے ترجمہ میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ پھر یہ کہ تاشقند کے بعض مستند شعرا نے ان کے ترجموں پر نظر ثانی بھی کی۔ ترجمہ کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ بہت سی غزلوں میں صرف چند الفاظ یا ردیف و قوافی کی تبدیلی سے ہی ترجمہ کا کام مکمل ہو گیا۔ مثال کے طور پر ایک مشہور غزل کے یہ چند اشعار دیکھئے جن میں فارسی کی تراکیب بھی نسبتاً کم ہیں۔ ازبکی زبان میں ان اشعار کے ترجمہ کی صورت یہ ہے:

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے!	اے دلِ ناداں بو سودا نادُر؟
آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟	بو دردگا آخر آیت دوا نادُر؟
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار	بزکر مشتاق مِز اُوْ اُزر بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟	پروردگارم۔ ماجرا نادُر؟
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں	من دا ہم بار کو تِل زباں آخر
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے؟	کاش کہ بسِن سر سنگ مدعا نادُر؟
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟	کم بو پریزاد، بو ناز نیں لر
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟	بو غمزہ بو ناز بو ادا نادُر

یہاں پچاس فیصد سے زائد الفاظ حتیٰ کہ بیشتر قوافی بھی بجنسہ وہی ہیں جو اصل غزل میں ہیں۔ دوسری غزلوں کے تراجم سے بھی ایسی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

سوویت یونین کی عوامی جمہوریہ تاجکستان میں غالب کا تعارف ایک فارسی شاعر کی حیثیت سے ہوا ہے۔ اس جمہوریہ کی قومی زبان تاجکی ہے جو قدیم فارسی ہی کی ایک صورت ہے۔ البتہ اب روسی رسم الخط ضروری تبدیلیوں کے ساتھ اس کے رسم الخط کے طور پر اختیار کر لیا گیا ہے۔ تاجکی ہند شناس عبداللہ غفاروف اور شاعر میر سعید میر شکر نے غالب کے فارسی کلام کا ایک جامع انتخاب نئے تاجکی رسم الخط میں شائع کیا۔ اس کے علاوہ غالب کی فارسی رباعیات کا ایک مختصر سا مجموعہ الگ سے شائع ہوا۔ اول الذکر کتاب میں پروفیسر چیلی شیعت کا ایک مبسوط مقدمہ بھی شامل ہے۔ تاجکستان کے ادارۂ علوم شرقیہ کے علمی مجلّے میں بھی غالب کی نظم و نثر کے موضوع پر کئی وقیع مضامین شائع ہوئے۔ عبداللہ غفاروف نے غالب کے بعض دلچسپ ادبی مکاتیب کے ترجمے بھی کئے۔

اس طرح سوویت یونین میں غالب شناسی کا آغاز ہوا۔ یہاں

(بقیہ صفحہ ۳۶ پر)

نیر مسعود
ادبستان - دین دیال روڈ، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳

غالب کے دو شعر

(الف)

کیا کہوں تاریکیٔ زندانِ غم اندھیر ہے
پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

(ب)

بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی
شبِ مہ ہو جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں

شعر ب کو پڑھتے ہی شعر الف اور شعر الف کو پڑھتے ہی شعر ب ذہن میں آجاتا ہے، اس لئے کہ دونوں شعروں میں گھر، تاریکی، روشنی، پنبہ، روزن کا ذکر ہے اور دونوں شعروں میں پنبہ اپنے اصل عمل یعنی روشنی کو روکنے کے برخلاف روشنی کا سبب بنتا ہے۔ الف میں پنبہ نورِ صبح سے کم نہیں ہے، ب میں پنبہ شبِ ماہ کا عالم کر دیتا ہے۔

چنانچہ غالب کے شارحین کو شعر ب کی تشریح میں شعر الف اور الف کی تشریح میں ب یاد آگیا ہے۔ اور انھوں نے ایک شعر کی تشریح میں دوسرے شعر سے مدد لی ہے۔ وہ اس طرح کہ دونوں شعروں کو ہم مضمون سمجھ کر دونوں کا یکساں مفہوم بیان کر رہا ہے۔ وہ یکساں مفہوم یہ ہے:

"میرے گھر میں اس قدر اندھیرا ہے کہ اگر اس کے روزنوں میں پنبہ رکھ دیا جائے (جو باہر کی روشنی کو اندر آنے سے روکنے کے لئے رکھا جاتا ہے) تو یہ پنبہ اپنی سفیدی کی وجہ سے میرے گھر کی تاریکی میں روشنی کی طرح معلوم ہوگا"

لیکن دراصل یہ مفہوم صرف شعر الف کا ہے۔

تاہم یہ واقعہ ہے کہ شعر ب کا مفہوم بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا نظر آتا ہے کہ اس شعر میں پنبہ نورِ صبح کے بجائے شبِ ماہ کا تاثر پیدا کرتا ہے۔ لہٰذا اگر شارحین نے دونوں شعروں کا یکساں مفہوم بیان کیا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ لیکن حقیقتاً دونوں شعروں کے مفہوم میں بڑا فرق ہے۔ اوپر بیان ہونے والے شعر الف کے مفہوم سے شعر ب کا مفہوم بہت مختلف ہے۔

مفہوم کا یہ اختلاف صرف اس سے پیدا ہوا ہے کہ غالب نے شعر ب کے پہلے مصرعے میں محض "ظلمت" کہنے کے بجائے "ظلمت گستری" کہا ہے۔ محض "ظلمت" کہا ہوتا تو شاید دونوں شعر ہم مضمون سمجھے جا سکتے تھے۔ شارحین نے "ظلمت" اور "ظلمت گستری" کے فرق پر غور نہیں کیا لہٰذا شعر کے صحیح مفہوم تک نہیں پہنچ سکے۔ شارحین اس پر متفق ہیں کہ "شبِ مہ ہو" کا مطلب ہے میرے گھر میں چاندنی سی پھیل جائے، حالانکہ شعر اس کے خلاف کہتا ہے۔ آیئے اب شعر کا صحیح مفہوم دیکھیں۔

مصدر "گستردن" کے معنی ہیں بچھانا یا پھیلانا۔ "ظلمت گستری" کا مطلب ہوا اندھیرا پھیلانا۔ شعر میں گھر کے اندر پھیلے ہوئے اندھیرے کا ذکر نہیں کیا جا رہا ہے۔ بلکہ یہ بتایا جا رہا ہے کہ میرا گھر اندھیرا پھیلا رہا ہے۔ محض "ظلمت" کی صورت میں گھر اندھیرے کا مخزن ہوتا، "ظلمت گستری" کی صورت میں گھر اندھیرے کا منبع ہے۔ میرے گھر سے اندھیرا نکل نکل کر باہر دور دور تک پھیلتا جا رہا ہے۔ باہر پھیلتا ہوا یہ اندھیرا میرے گھر کی دیواروں کے روزن سے نکل رہا ہے۔ اگر روزن کو پنبہ رکھ کر بند کر دیا جائے تو اندھیرا میرے گھر سے نکل کر باہر کی فضا کو تاریک نہ کرے۔ جب میرے گھر کے روزن سے اندھیرا نکل کر پھیلنا بند ہو جائے گا تو باہر شبِ ماہ کا عالم ہو جائے گا۔ باہر، میرے شبستاں میں نہیں۔

اگر باہر واقعی شبِ ماہ ہے تو میرے گھر سے نکل کر پھیلنے والا اندھیرا چاند کی روشنی پر غالب آ رہا ہے۔ اگر باہر پہلے ہی سے اندھیرا ہے تو بھی میرے گھر کی پھیلائی ہوئی تاریکی اتنی گہری ہے کہ اس کے مقابلے میں باہر کا نسبتاً ہلکا اندھیرا روشنی کی طرح ہے، اس لئے اگر میرے گھر سے نکل کر پھیلنے والی تاریکی دور ہو جائے تو باہر کا اندھیرا چاندنی معلوم ہونے لگے گا۔

آپ نے دونوں شعروں کے مفہوم کا فرق محسوس کیا؟ ایک شعر محض گھر کی تاریکی کا ذکر کرتا ہے، دوسرا گھر کے تاریکی پھیلانے کا ذکر کرتا ہے۔

چند باتیں دونوں شعروں میں مشترک بھی ہیں۔ دونوں شعروں میں پنبہ و روزن کے وسیلے سے مضمون ادا کیا گیا ہے۔ دونوں میں سے کسی میں تاریکی کی کیفیت براہِ راست بیان نہیں کی گئی ہے (مثلاً ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا وغیرہ) بلکہ تاریکی کے مقابل روشنی کے بیان سے تاریکی کا اندازہ کرایا گیا ہے (ایک شعر میں پنبہ گھر کی سیاہی کے مقابل اپنی سفیدی کی وجہ سے نورِ صبح کی طرح ہے، دوسرے میں پنبہ شبستان کے روزن سے باہر نکل کر پھیلنے والے اندھیرے کو روک کر شبِ ماہ کا عالم کر دیتا ہے)۔ دونوں شعروں میں پنبہ اپنے اصل عمل کے

لے اگر آپ اس کے قائل ہوں کہ [illegible] اختلاف [illegible] دونوں شعر ہم مضمون [illegible] سکتے ہیں۔

برعکس عمل کرتا ہے یعنی روشنی کا مانع ہونے کے بجائے روشنی کا موجب بنتا ہے۔

اندھیرا بجائے خود دونوں شعروں میں ایسا ہے کہ اس کا براہِ راست بیان ہو ہی نہیں سکتا۔ اسی لئے دونوں شعروں کے پہلے مصرعوں میں عجزِ بیان کا اعتراف موجود ہے۔ "کیا کہوں تاریکیٔ زندانِ غم اندھیر ہے" اور "بیان کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی" لیکن دونوں شعروں میں عجزِ بیان کا یہ اعتراف بڑی معنویت رکھتا ہے۔ اور یہاں پھر دونوں جگہ اس معنویت میں فرق ہے۔ پہلے ہم شعر ب کو دیکھتے ہیں۔

"بیان کس سے ہو" کے دو مفہوم ہیں۔ ایک یہ کہ ظلمت گستری کا حال کون بتائے، یعنی کوئی نہیں بتا سکتا۔ دوسرا یہ کہ کس کو بتایا جائے، یعنی کسی کو نہیں بتایا جا سکتا۔

پھیلی ہوئی روشنی میں سب کچھ صاف نظر آتا ہے، لہٰذا خود اس روشنی کا منبع بھی نظر آ جاتا ہے اور یہ معلوم کرنے میں مشکل نہیں پڑتی کہ روشنی کہاں سے آ رہی ہے۔ اس کے برخلاف اگر گھپ اندھیرا پھیلا ہوا ہو تو پورا منظر یکساں سیاہ ہو جاتا ہے۔ اگر روشنی ہی کی طرح اس سیاہی کا بھی کوئی منبع ہے تو گھپ اندھیرے میں وہ منبع خود بھی گم ہو جائے گا۔ ظاہر ہے اس صورت میں کون بتا سکتا ہے کہ یہ تاریکی کدھر سے آ رہی ہے۔ اور اگر کوئی بتائے بھی تو کس کو بتائے؟ اس بات پر یقین کون کرے گا کہ تاریکی کا بھی کوئی منبع ہو سکتا ہے اور اندھیرا بھی روشنی کی طرح ایک جگہ سے باہر نکل کر دور دور تک پھیل سکتا ہے۔

اب دوسرا مصرع بیان کے اسی مسئلے کا حل ہو جاتا ہے۔ صرف کہنے سننے سے نہ تو کوئی یقین دلا سکتا ہے نہ کسی کو یقین آ سکتا ہے کہ میرا شبستان تاریکی پھیلا رہا ہے۔ ہاں یقین کی ایک ہی صورت ہے۔ وہ یہ کہ میرے شبستان کے روزن کو پنبے سے بند کر دیا جائے، فوراً چاندنی پھیل جائے گی۔ اور اسی حل میں اس کے برعکس صورت بھی مضمر ہے، یعنی میرے شبستان کے روزن سے پنبہ ہٹا لیا جائے، دیکھتے دیکھتے چاندنی پر تاریکی کی چادر بچھتی چلی جائے گی۔ اب شبستان کی ظلمت گستری بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔

آپ اس شعر کو تاریکی کا مبالغہ کہہ سکتے ہیں لیکن غالب نے تاریکی کی جو تصویر کھینچی ہے اس کے پیچھے چھپے ہوئے شبستان کی کیفیت کا تصور کیجیے۔

. . . .

آپ نے دیکھا کہ خود آپ کا ذہن سنجیدگی سے مبالغے کی طرف مائل ہو رہا ہے!

شبستان میں تاریکی انتہا سے زیادہ ہے۔ تاریکی کی انتہا یہ ہے کہ پورا منظر یکساں سیاہ ہو جائے۔ مگر شبستان میں تاریکی طوفان کی طرح موجیں مار رہی ہے، بھر بھر کر روزنوں سے باہر نکل رہی ہے جیسے کسی آتش زدہ مکان کی کھڑکیوں سے دھواں باہر نکلتا ہے۔ اگر شبستان کے روزنوں کو بند کر دیں تو باہر چاندنی پھیل جائے گی، بے شک، مگر روزن بند ہو جانے کے بعد خود شبستان کے اندر تاریکی کا طوفان کیا ہو جائے گا! اگر کسی آتش زدہ مکان کی کھڑکیاں بند ہو جائیں اور دھواں باہر نہ نکل سکے؟

اب آپ چاہیں تو غالب کو اس شعر میں تاریکی کے مبالغے پر مطعون کریں، چاہیں تو شبستان کے اندر تاریکی کے گھٹتے اور امڈتے ہوئے طوفان کا اندازہ کریں۔ شعر یہی تقاضا کر رہا ہے کہ آپ تاریکی کے اس طوفان کا اندازہ کریں۔ مگر یہ اندازہ کرتے وقت آپ مبالغے میں غالب کو بہت پیچھے چھوڑ جائیں گے۔ بہر حال اندھیرے کے تموج اور تلاطم کا تصور آپ کو غالب کے اسی شعر سے ملے گا۔

o o o

شعر الف: "کیا کہوں تاریکیٔ زندانِ غم اندھیر ہے"۔ اس مصرعے کا عجزِ بیان بھی کم معنی خیز نہیں ہے۔ یہ معنویت "اندھیر ہے" کی بدولت ہے، اس لئے کہ "اندھیر" کا لفظ نہ تو محض تاریکی کی رعایت سے آیا ہے نہ تاریکی کی شدت ظاہر کرنے کے لئے۔ "اندھیر ہے" کہہ کر غالب نے بیانِ واقعہ کی دشواری کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اندھیر یہ ہے کہ زندانِ غم میں پنبہ بھی نورِ صبح سے کم نہیں۔ یعنی پنبے کی اس چمک کا نتیجہ یہ ہے کہ زندانِ غم میں تاریکی ہے ہی نہیں۔ تو یہ کس طرح بتایا جائے کہ زندانِ غم بہت تاریک ہے۔ روزن میں پنبہ باہر کی روشنی کو اندر آنے سے روکنے کے لئے رکھا جاتا ہے، یعنی اگر زندانِ غم کے روزن سے پنبہ ہٹا لیا جائے تو بھی صورتِ حال وہی رہے گی اس لئے کہ زندانِ غم کی تاریکی کے مقابلے میں باہر کی فضا روشن ہے اور پنبہ ہٹا لینے سے باہر کی روشنی زندانِ غم کے اندر آ جائے گی۔ خود زندانِ غم کی تاریکی کا اظہار پھر بھی نہ ہو سکے گا۔ یہ مزید اندھیر ہے۔

شعر الف کے برخلاف یہاں تاریکی کے اظہار کی کوئی صورت نہیں، نہ قولاً نہ فعلاً۔ یہاں پنبہ رکھنے یا ہٹانے سے کوئی فرق نہیں ہوتا۔ کہنے والا جانتا ہے کہ زندانِ غم کتنا تاریک ہے لیکن وہ کسی پر کسی بھی طریقے سے اس تاریکی کا اظہار نہیں کر سکتا۔

اور اس اظہار میں حائل کیا چیز ہے؟ خود زندانِ غم کی تاریکی!

یہ وہی معنوی کشمکش ہے جو غالب کے یہاں فراواں اور دوسروں کے یہاں بہت کم یاب ہے۔

آئندہ شمارے میں

• قرۃ العین حیدر • خواجہ احمد عباس • کوثر چاند پوری •

• ساغر نظامی • جگن ناتھ آزاد • حرمت الاکرام •

کالیداس گپتا رضا

۱۰۰۔ جالی بھون۔ فلیٹ پہلی منزل۔ ۱۰ نیو میرین لائنز۔ چرچ گیٹ بمبئی ۲۰ (ڈی آر)

غزل قدسی اور تضمینِ غالب

۱۵ر فروری ۱۹۴۶ء کا "آج کل" کا شمارہ میرے سامنے ہے۔ جس میں صفحہ ۴۰ پر ایک مضمون بعنوان "دلی کے ایک اہم نعتیہ مشاعرے کی تضمینیں[1]" شائع ہوا ہے۔ ربع صدی پہلے کا یہ مضمون سید وزیر الحسن کے قلم سے نکلا ہے۔ سید صاحب شاہ جہانی دربار کے ملک الشعراء قدسی کی مشہورِ زمانہ نعتیہ[2] غزل اور اس کی سینکڑوں تضمینوں کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

> "مجھے اس سلسلے میں ان تضمینوں کے صرف ایک مجموعے کا ذکر کرنا ہے جسے قاضی محمد عمر ساکن دہلی نے ۱۸۵۶ء کے اواخر میں "حدیثِ قدسی" کے نام سے مرتب کیا تھا۔ مگر اس کی طباعت ایک مدت بعد ہوئی۔ یہ مجموعہ دلی کے ایک نعتیہ مشاعرے کا گلدستہ ہے جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے پہلے کا غالباً آخری نعتیہ مشاعرہ تھا۔"

ان تضمینوں میں غالب کی تضمین بھی شامل ہے جو ان کے مطبوعہ یا غیر مطبوعہ کلام میں شامل نہیں۔ البتہ سبدِ[3] باغ دو در اور بیاضِ فرحت[4] میں

---

[1] یہی مضمون "ہما" کے غالب نمبر ۱۹۶۹ء میں دوبارہ چھپا ہے۔

[2] مطلع یہ ہے ؎

مرحبا سید مکی مدنی العربی — دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

[3] یہ غالب کی فارسی نظم و نثر کا ذخیرہ ہے۔ اس کی کتابت طباعت کی غرض سے غالب کی زندگی میں ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۸ء) میں شروع ہوئی تھی۔ مگر مصنف کی وفات کے ایک سال چار مہینے بائیس دن بعد ربیع الآخر ۱۲۸۶ھ (باقی اگلے کالم میں)

موجود ہے۔ غالب کی تضمین کو اس مجموعے "حدیثِ قدسی" میں پاکر سید صاحب بے اختیار کہہ اٹھے:

> "تضمین غالب کے ادبی آثار میں ایک نادر چیز ہے..... ان کی فنی غیرت نے کبھی گوارا نہیں کیا کہ وہ..... کسی کے کلام پر تضمین کریں..... ادبی طفیلیہ ہونا ان کی اجتہادی شان کے خلاف تھا..... تضمین مستقل نظم کی حیثیت سے غالب کے فنِ سخن میں گویا صنفِ ممنوعہ ہے۔ انہوں نے صرف نعت گوئی کے لئے اپنا یہ اصول توڑا ہے۔"

وزیر الحسن صاحب کے اوپر دیئے ہوئے اقتباسات سے مندرجۂ ذیل نتائج اخذ کئے جاسکتے ہیں:

(اول) دلی میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے کچھ ہی مدت پہلے ایک نعتیہ مشاعرہ منعقد ہوا تھا جس میں اس وقت کے مشاہیر شعراء نے ملک الشعراء قدسی کی مشہور نعتیہ غزل پر تضمینیں پڑھی تھیں اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے پہلے کا غالباً یہ آخری نعتیہ مشاعرہ تھا۔

(دوم) ان تمام تضمینوں کو قاضی محمد عمر ساکنِ دہلی نے ۱۸۵۶ء کے اواخر میں ایک گلدستے کی شکل دے کر "حدیثِ قدسی" کے نام سے مرتب کر دیا تھا، جس کی طباعت ایک مدت بعد ہوئی۔

(سوم) غالب کبھی تضمین نہیں کرتے تھے یہ اصول انہوں نے صرف نعت گوئی کے لئے توڑا ہے۔

جس وثوق سے وزیر الحسن صاحب نے یہ سب کچھ کہدیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ہر ہر لفظ حقیقت ہے۔ اور ان سے اختلاف کی ذرہ بھر گنجائش نہیں حالانکہ جائے اختلاف اتنی عریض ہے کہ اسے پاٹا ہی نہیں جاسکتا کیوں کہ نہ اس مفروضہ نعتیہ مشاعرے کا انعقاد ہی کبھی ہوا نہ قاضی محمد عمر صاحب "حدیثِ قدسی" کے اولین مرتب ہی ہیں۔ "حدیثِ قدسی"

(بقیہ گزشتہ کالم) (۱۰ر جولائی ۱۸۶۹ء) کو ختم ہوئی اور ۱۹۵۹ء تک اس کے طبع ہونے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ "سبدِ باغ دو در" غالب کا رکھا ہوا تاریخی نام ہے۔ کاتب نے یہ نسخہ (مملوکہ سید وزیر الحسن) غالب کے شاگرد منشی ہیرا سنگھ کمتری کی فرمائش پر لکھا تھا۔ جو حوض قاضی کے قریب گندی گلی میں رہتے تھے۔ قیاس ہے کہ اس کا بیشتر حصہ غالب کی نظر سے گزرا ہے۔ اب اسے سید وزیر الحسن صاحب نے اورینٹل کالج میگزین لاہور اگست ۱۹۵۹ء اور اگست ۱۹۶۰ء میں شائع کر دیا ہے اور اب کتابی صورت میں بھی یکجا کر دیا گیا ہے

[4] عہدِ غالب کی ایک قلمی بیاض۔

کے اصل مرتب ہیں محمد حسین خاں تحسینؔ جو اُس عہد میں مطبع مصطفائی دہلی کے مالک اور مہتمم تھے۔ اور اچھے شاعر تھے۔ انہوں نے کسی مشاعرے کی غرض سے نہیں بلکہ اس خیال سے کہ "بعد چھوڑ جانے اِس دارِ فانی کے واسطہ بقائے نام اور وسیلۂ نیکی سرانجام کا ہو؛" اُس وقت کے نامی گرامی شعرائے ہند سے کچھ ذاتی تعارف کی بنا پر اور کچھ بذریعہ خط و کتابت قدسیؔ کی مشہور نعتیہ غزل پر تضمین کرا کے ۱۲۶۹ھ (۱۸۵۲ء) میں ایک کتاب ترتیب دی۔ اور اس کا نام بہ رعایت مضامینِ رنگیں "چمنِ مدحِ نبی" رکھا۔ اِس کام میں اُنہیں دو سال لگے اور طباعت میں مزید دو سال کا عرصہ صرف ہوا یعنی ۳ صفر ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۴ء) کو یہ کتاب "مجموعۂ خمسہ ہائے غزلِ قدسی" کے نام سے پہلی بار شائع ہوئی۔ خاتمۃ الطبع میں فرماتے ہیں۔

"بفضل خدا دو سال کے عرصہ میں نامی گرامی شعرائے ہند
سے جن صاحبوں سے کہ تعارف تھا اور جن سے نہ تھا
تو اُن سے بذریعہ خطوط خمسے تضمین کرا کر بہم پہنچائے
..... اور بہ رعایتِ مضامینِ رنگیں اس (مجموعے)
کا نام "چمنِ مدحِ نبی" رکھا؛"

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ تضامینِ غزلِ قدسیؔ کا نعتیہ مشاعرہ ایک من گھڑت داستان ہے۔ اور "حدیثِ قدسی" بطور مجموعۂ تضامینِ مشاعرۂ مفروضہ محض ایک قیاس ہے۔

سید وزیر الحسن کا یہ کہنا بھی کہ غالبؔ کے ہاں تضمین گویا ممنوع تھی اور انہوں نے یہ اصول صرف نعت گوئی کے لئے توڑا ہے، درست نہیں ہے۔ فنِ سخن میں عموماً تضمین مستقل نظم کا درجہ نہیں رکھتی۔ کوئی دیوان اُٹھا کے دیکھ لیجیے۔ تضمین کا حصہ بہت کم ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں غالبؔ کے ہاں اگر ایک دو تضمین بھی مل جائیں تو وہ اِس فن میں ایک عمومی شاعر کے برابر آ جاتے ہیں: اس طرح فنِ تضمین کے ضمن میں غالبؔ کی انفرادیت اس بنا پر ڈھونڈھنا کہ اُن کے ہاں تضامین کم ہیں یا بالکل نہیں ہیں بے کار سی بات ہو جاتی ہے۔ غالبؔ کے ہم عصر مشاہیر میں مومنؔ کے ہاں پندرہ بیس تضمین ضرور مل جاتی ہیں، مگر ذوقؔ کے ہاں تو یہ صنف سوائے آ... کے چند بیان کردہ معمولی واقعات کے بالکل ہی مفقود ہے۔

غالبؔ کے ہاں بھی نعتیہ تخمیس کے علاوہ تخمیس اور تضمین (جس سے مراد ایک شاعر کا دوسرے شاعر کے پورے شعر یا مصرع یا اُس کا ٹکڑا اپنے کلام میں باندھنا ہے) کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ تخمیس میں قدسیؔ نعتیہ غزل کی تضمین کے علاوہ بادشاہ ظفرؔ کی مشہور غزل[1] بردیف وقافیہ "آدمی رہ گئی، دلگیر آدمی رہ گئی" پر غالبؔ کا خمسہ موجود ہے۔ مقطع ملاحظہ فرمائیے:

تم جو فرماتے ہو، "دیکھ اے غالبؔ آشفتہ سر
ہم نہ تجھ کو منع کرتے تھے، گیا کیوں اُس کے گھر؟"
جان کی پاؤں اماں، باتیں یہ سب سچ ہیں، مگر
دل نے کی ساری خرابی، لے گیا مجھ کو، ظفرؔ
وہاں کے جانے میں مری توقیر آدھی رہ گئی

"ایک دن مثلِ پتنگِ کاغذی" والی گیارہ شعر کی مثنوی سے ا... کون واقف نہیں۔ یہ بھی فارسی کے اس پورے شعر کو ضامن بنا کر کہ... گئی ہے:

"رشتۂ درگردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست"

پورے مصرع کی تضمینیں تو غالبؔ کے ہاں متعدد ہیں۔ چ... مثالیں ملاحظہ ہوں:

آہنگِ اسدؔ میں نہیں جز نغمۂ بیدلؔ
"عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ"

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخؔ
"آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں"

مجھے جنوں نہیں غالبؔ ولے بقولِ حضور
"فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو"

قول حافظؔ کا ہے بجائے دوست
"ہر کرا پنج روز نوبت اوست"

گشتہ ام غالبؔ طرف با مشربِ عرفیؔ کہ گفت
"روئے دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش است"

لہ (۱) "....... مالک مطبع مصطفائی دہلی۔ غدر سے پہلے ان کا چھاپہ خانہ دہلی میں بہت مشہور تھا۔ غدر کے بعد میرٹھ میں مطبع احمدی جاری کیا۔ فنِ سخن میں حضرت ذوقؔ سے فیض پایا تھا۔ نہایت خلیق، با مروت اور کارگزار شخص تھے ان کے مطبع کی کتابیں نہایت شوق سے خریدی جاتی تھیں...... "..... خمخانۂ جاوید۔ جلد دوم ص ۱۵

(۲) غالبؔ نے اپنے دیوان کا ایک ایڈیشن ۱۸۶۱ء میں انہیں محمد حسین خاں تحسینؔ سے چھپوایا تھا جو بعد میں دوبارہ مطبع مصطفائی (۱۸۶۲ء) میں چھپا۔

لہ زمانہ ماہنامہ اخبار (تحفہ)، جلد ۸ نمبر ۵ (بحوالہ دیوان غالب اردو، نسخۂ عرشی ص ۹۰)

اب رہے قاضی محمد عمر صاحب جنھیں وزیر الحسن صاحب نے اِس مفروضہ نعتیہ مشاعرے کی نظموں کے گلدستے کا مرتب بتایا ہے تو اُن کی حیثیت سوا ایک ناقل کے اور کچھ نہیں۔ میرے اس بیان کی تصدیق کے لئے ضروری ہے کہ 'حدیثِ قدسی' کے ارتقاء پر ایک اجمالی نظر ڈالی جائے۔ مختلف ایڈیشنوں کے تقابلی مطالعے سے جو میرے ذاتی کتب خانے میں موجود ہیں، حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی:۔

ا۔ 'خمسہائے غزلِ قدسی' یا 'چمنِ مدحِ نبی'

مطبع مصطفائی دہلی سے محمد حسین خاں تحسین کے اہتمام سے طبع ہوئی۔ مطبع کے اندراج کے علاوہ سالِ تاریخ محمد نظام الدین جوشش[1] کے قطعۂ سرورق سے بھی ثابت ہوتا ہے ؎

جب ہوئی زیب دہ طبع خوشا صلِّ علےٰ
فکرِ تاریخ میں گلشن کی طرف میں جو گیا
بلبل از جوشش طرب خواند بشاخِ گلہا
وہ چہ گردید شگفتہ چمنِ مدحِ نبی

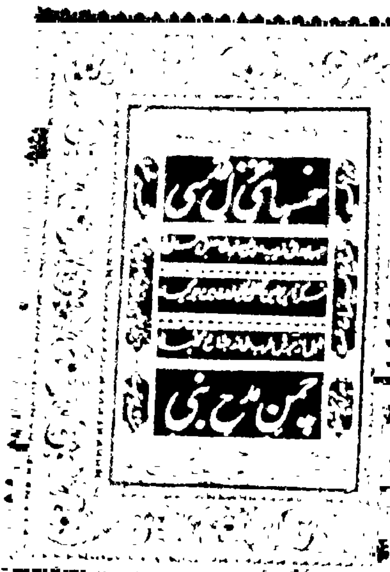
۵ ۱ ۲ ۶ ۹

اِس قطعے میں نزاکت یہ ہے کہ یہ قدسی ہی کی غزل پر خمسے کا ایک بند معلوم ہوتا ہے۔ چوں کہ کتاب ۱۲۶۹ھ میں مرتب ہو کر ۱۲۷۱ھ میں شائع ہوئی تھی اِس لئے اس میں ۱۲۶۹ھ، ۱۲۷۰ھ اور ۱۲۷۱ھ تینوں سالوں کے قطعہ ہائے تاریخ ملتے ہیں۔ خاتمۃ الطبع میں ایک قطعۂ تاریخ جس سے ۱۲۷۰ھ برآمد ہوتا ہے بہت دلچسپ ہے۔ یہ میرزا علی صاحب دہلوی نازنین تخلص کا طبع زاد ہے۔ اور جیسا کہ تخلص سے ظاہر ہے ریختی میں ہے ؎

نازنین تجھ کو اک بتاؤں بات
کہ نگوڑی بڑی ہو بات تری
سال چھپنے کے اِس کتاب کے لکھ
"اے بُوا اِس میں ہے نجات تری"

کتاب کے آخری صفحات میں تحسین کا ایک طویل اور معنی خیز قطعہ "در ذکرِ شعراء" بھی موجود ہے جس میں مرتب سمیت کل ایک سو سات شعراء کا ذکر ہے جن کے خمسے زینتِ کتاب ہیں۔ حالاں کہ تحسین استاد ذوق کے شاگرد تھے تاہم وہ ذوق کو تضمین غزل قدسی پر آمادہ نہیں کر سکے۔

[1] منشی نظام الدین جوشش خلف وجیہہ الدین پنجابی۔ شگفتہ طبیعت پائی تھی۔ آپ علی گڑھ میں رہا کرتے تھے ....۔ خمخانۂ جاوید۔ جلد دوم صہ ۳۸۵



وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ شاہ ظفر کی تضمین کے ہوتے ہوئے ذوق نے اپنی شمولیت کو بادشاہ کے احترام کے منافی خیال کیا ہوگا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ ذوق ہی کی تضمین ہو اور بادشاہ ظفر کے نام سے شائع ہوئی ہو۔ قطعہ اِس شعر سے شروع ہوتا ہے ؎

معنیِ بیتِ دو عالم شہِ ذی جاہ ظفر
لفظِ معنیِ سخاوت شہِ با فتح و ظفر

غالبؔ کا ذکر اِس طرح آتا ہے ؎

ماہرِ فنِ سخن یعنی جناب غالبؔ
کہ ہیں حبِ اسد اللہ کے بے شک مظہر

پھر بہت سے شعراء کا ایک ساتھ ذکر کر کے کہا ہے ؎

یہ سخن رس ہیں سخن سنج ہیں بے مثل و عدیل
ہیں یہ مشہور سب اقلیمِ سخن کے سرور

اور مقطعے میں خود تحسین مجسّم انکسار بنے یوں دست بستہ کھڑے ہیں ؎

ان میں تحسین بھی داخل ہے مگر جیسے فقیر
آگے شاہوں کے کھڑا ہووے بحالِ ابتر

۲۔ 'حدیثِ قدسی'

مطبع مصطفائی واقع کانپور سے بدیع الزماں کے اہتمام سے ۱۲۸۱ھ میں طبع ہوئی۔ سرورق پر یہ قطعہ درج ہے ؎

طالبِ مدحِ نبی را ہر طرف
نعرۂ ہٰذا حدیثِ قدسی است
شکرِ خالق را کہ از طبعِ بدیع
شہرۂ ہٰذا حدیثِ قدسی است

خاتمۃ الطبع میں یہ قطعۂ تاریخ درج ہے ؎

چوں دریں آواں بعونِ کردگار
نعتِ شاہِ انبیا مطبوع شد
گفت شائق[1] سالِ آں از روئے طبع
وصفِ محبوبِ خدا مطبوع شد

مادّہ درج نہیں ہے مگر شمار کرنے پر چوتھے مصرع (۱۲۷۰) میں 'ط' کے نو عدد ملانے سے ۱۲۷۹ھ برآمد ہوتا ہے۔ یہ قطعہ آغاز طبع میں کہا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کتاب کی ترتیب کا دعویٰ قاضی محمد عمر صاحب نے ان لفظوں میں (حدیثِ قدسی ص۲) کیا ہے:

"..... ۱۲۷۲ھ بارہ سو بہتر ہجری قدسی میں فقیر احقر قاضی محمد عمر کے خاطر میں اس اندیشہ نے خطور کیا اور فکرِ رسا نے اس کوچہ میں رہنمائی کی کہ اگر مخمساتِ غزلِ قدسی ...... جس قدر دستیاب ہو سکیں جمع کر کے اس صورت سے یہ مجموعہ مرتب کیا جائے، کہ شاعر کے نام کے نیچے مختصر حال بھی اس کا مرقوم ہو تو البتہ لطف سے خالی نہ ہوگا اور اسی اندیشہ کی ممد و معاون ہوئی رائے ...... حافظ انعام اللہ[2] ساکن پانی پت کی۔ جس طرح جی چاہتا تھا صورتِ مراد نے نقش باندھا ... اس مجموعہ کی تالیف و ترتیب سے فراغت ہوئی اور نام اس کا 'حدیثِ قدسی' رکھا۔"

یاد رہے کہ 'خمسہ ہائے غزلِ قدسی' مرتبہ محمد حسین خاں تحسین ۱۲۶۱ھ میں شائع ہوئی اور 'حدیثِ قدسی' کی ترتیب کا خیال قاضی محمد عمر صاحب کو ۱۲۷۲ھ میں آیا جو ۱۲۷۹ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ دراصل قاضی صاحب کو اتنی مدت انتظار کرنے کی بھی ضرورت نہ تھی کیونکہ انہوں نے اس کی ترتیب میں ذرہ بھر مشقت نہیں اٹھائی۔ 'خمسہ ہائے غزلِ قدسی' مرتبہ محمد حسین تحسین چھپی چھپائی سامنے تھی۔ انہوں نے اس کی اشاعت کے پورے دس سال بعد بہت معمولی حذف اور اضافے کے ساتھ اسی کو اپنی تالیف کہہ کر 'حدیثِ قدسی' کے نام سے چھاپ دیا۔ حذف یہ کیا کہ تحسین کی کتاب کے سرورق کی جگہ 'حدیثِ قدسی' کا ٹائٹل اور 'غزل ذکرِ شعراء' کی جگہ اپنے رنگ میں 'غزل ذکرِ شعراء' کہہ کر ڈال دیئے اور اضافہ یہ کیا کہ تحسین کے ایک سو سات شعراء کے علاوہ تیرہ دیگر شعراء کے خمسے بڑھا کر تعدادِ مخمسات ایک سو بیس کر دی اور تاریخ خاتمۂ کتاب درج کر دی۔ بعد ازاں دس مزید خمسے بھی بدیع الزماں مہتمم مطبع مصطفائی کانپور کے ذریعے موزوں کروا کے کتاب کے آخر میں بعنوان ملحقات شامل کر دیئے۔ تحسین نے 'خمسہ ہائے غزلِ قدسی' کے اختتام پر 'ناظرین سے امید' کی تھی کہ آن کی محنت پر نظر کر کے وہ انہیں دعائے خیر سے یاد فرمائیں گے مگر انجام برعکس ہوا۔ قاضی محمد عمر صاحب تحسین کو دعائے خیر سے یاد تو کیا فرماتے انہوں نے تو اُن کی 'خمسہ ہائے غزلِ قدسی در مدحِ نبی' کو مستقبل کے ذہنوں ہی سے فراموش کر دیا اور کہیں جھوٹ موٹ بھی اُن کا ذکر نہیں آنے دیا۔

قاضی صاحب نے پیش لفظ میں کہا تھا کہ وہ ہر شاعر کے نام کے نیچے اُس کا مختصر حال بھی مرقوم کریں گے اور دعویٰ بھی کیا تھا کہ جیسا وہ چاہتے تھے ویسا ہی 'صورتِ مراد نے نقش باندھا' مگر قاضی صاحب کی ہر بات کا انحصار غلط بیانی پر ہے۔ آپ کو اپنے کہے کا پاس کیوں کر ہو سکتا تھا۔ چنانچہ شعراء کے نام وغیرہ بعینہ وہی ہیں جو تحسین نے 'خمسہ ہائے غزلِ قدسی' میں دیئے ہیں۔ قاضی صاحب نے ایک لفظ بھی اپنی طرف سے نہیں بڑھایا۔

۳۔ حدیثِ قدسی

یہ ایڈیشن قاضی صاحب والے ایڈیشن ہی کا نقشِ اوّل معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس میں 'ملحقات' شامل نہیں ہیں۔ باقی ہر چیز وہی ہے۔ چوں کہ اس کے پہلے چھ صفحے غائب ہیں اس لئے اسے حدیثِ قدسی ۲ کے بعد درج کیا گیا ہے۔ ورنہ خاتمۃ الطبع میں قطعۂ تاریخ وہی ہے جو ایڈیشن

[1] 'شائق'۔ حافظ الٰہی بخش خلف شیخ محمد حاجی باشندہ کانپور۔ سید وارث علی سیفی کے شاگرد تھے۔ ان کا دیوان ۱۲۹۵ھ میں چھپا تھا۔ تاریخ گوئی میں خاص مہارت تھی۔ ایک کتاب بھی فنِ تاریخ گوئی میں 'آئینہ تواریخ' کے نام سے ۱۲۹۵ھ (۱۸۷۸ء) میں چھپی تھی۔ جس میں صرف ۱۲۰۰ تک کے مادّے شامل تھے۔ دوسرے ایڈیشن (۱۸۹۸ء) میں مادّوں کی تعداد ۲۰۰۰ تک کے اعداد تک کر دی گئی تھی۔ (یہ دونوں ایڈیشن میرے کتاب خانے میں موجود ہیں) کتاب میں ۷۹۶ کے تحت بطور مادّہ 'حدیثِ قدسی' بھی شامل ہے۔

[2] ان صاحب کے متعلق اس سے زیادہ تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔

۷۲ میں ہے۔ مطبع کا علم نہ ہو سکا۔

۴۔ حدیثِ قدسی

یہ ایڈیشن مطبع فتح الکریم بمبئی سے شائع ہوا۔ غالباً ۱۲۹۹ھ میں چھپنا شروع ہوا۔ اور ۱۳۰۰ھ میں

"..... بعد تصحیح تام و خوش خطی مالا کلام باہتمام
جناب قاضی محمد فتح محمد و صالح محمد و عبدالکریم صاحبان
برادران قاضی ابراہیم صاحب مرحوم فرزندان الفضل
الحاج قاضی نور محمد صاحب مغفور ......"

شائع ہوا۔ یہ قاضی محمد عمر ہی کے ملحقات والے ایڈیشن کا ری پرنٹ ہے۔ صرف شائق کے قطعۂ تاریخ میں 'ط' کی جگہ 'ل' کے اعداد ڈال دیئے گئے ہیں۔ اور 'شائق' کی جگہ ہاتف لکھ دیا گیا ہے۔ تیسرا اور چوتھا مصرع ملاحظہ ہو ؎

گفت ہاتف سال آں از روئے لطف
وصف محبوب خدا مطبوع شد

۱۲۷۰ + ۳۰ = ۱۳۰۰ھ

۵۔ صحیفۂ قدسی حصہ دوم حدیثِ قدسی

سرورق سے ظاہر ہے کہ اس کتاب کو حاجی سید شمشیر علی ولد میر عزیز اللہ صاحب ساکن گوہانہ ضلع روہتک نے (جو اس وقت دہلی میں مقیم تھے) ۱۳۰۳ھ (۱۸۸۶ء) میں جمع کیا اور محمود المطابع دہلی سے طبع کرا کے شائع کیا۔ پیش لفظ ص۲ پر فرماتے ہیں کہ انہیں شوق مدح خوانی حضرت سرور کائنات بدرجہ غایت ہے۔ اس لئے انہیں اکثر خمسے اور قصیدے یاد ہیں جنہیں وہ جلسوں وغیرہ میں سنایا کرتے تھے اور لوگ اس بات کے طالب رہتے تھے کہ وہ یہ خمسے انہیں نقل کر دیں۔ چوں کہ یہ ممکن نہ تھا اس لئے انہوں نے ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۶ء) میں مجموعہ نعت کے نام سے انہیں دو حصوں میں چھپوا دیا پھر

"..... مری نظر سے 'حدیثِ قدسی' گزری جو کہ ۱۲۷۳ھ (۱۸۵۶ء) میں قاضی محمد عمر صاحب نے[1] جمع کر کے چھپوائی تھی۔ اس کو دیکھ کر بے اختیار دل نے چاہا کہ میں بھی قدسی کی غزل کے خمسے جمع کر کے چھپوا دوں۔ بس میں نے بھی بعنایت الٰہی کمر ہمت کو باندھ کر جنوری ۱۸۸۵ء کو دہلی کے اخباروں میں اشتہار دینے شروع کئے اور کثرت سے شاعروں کو بیرونجات میں خط لکھے اب فضل ایزدی سے عرصہ دو سال میں یہ مجموعہ تیار ہو گیا..... اس کے پڑھنے والوں سے امید ہے کہ اس کو پڑھ کر ...... بندہ کو دعائے خیر سے یاد فرمائیں۔ اور بندہ نے ...... التزام کیا ہے کہ جس قدر خمسے پہلے مجموعہ حدیث قدسی میں چھپ چکے ہیں وہ اس میں شامل نہیں کئے گئے۔ فقط"

حاجی شمشیر علی بھی محمد حسین خاں تحسین کا جو غزل قدسی کے مخمسات کے اصل مؤلف ہیں نام نہیں لیتے۔ اور قاضی محمد عمر کی طرح غلط دعوے کرنے سے نہیں ہچکچاتے۔ میں اُن کی غلط بیانیوں کا پردہ پوری طرح چاک کرتا اگر اُن کی 'حدیثِ قدسی حصہ دوم' کا مکمل نسخہ میرے پاس موجود ہوتا۔ میرے نسخے کے چند آخری اوراق ضائع ہو چکے ہیں۔ اس لئے خاتمۃ الطبع اور قطعہ ہائے تاریخ کا علم نہیں تاہم اُن کا یہ دعوے کہ پہلے مجموعۂ حدیثِ قدسی کے خمسے اُن کے رسالے میں شامل نہیں کئے گئے درست نہیں۔ حافظ عبدالرحمٰن خاں احسانؔ، مرزا صفدر علی بیگ بلندؔ، زین العابدین خاں حزیںؔ، مرزا قادر بخش صابرؔ، قادر علی عبدؔ، میاں ناجیؔ وغیرہم کے خمسے حاجی شمشیر علی نے قاضی محمد عمر ہی کے مجموعے سے اڑائے اور قاضی محمد عمر صاحب نے تو محمد حسین خاں تحسین کے خزانے پر دن دہاڑے ڈاکہ ڈالا تھا۔

حاجی صاحب رقم طراز ہیں کہ انہوں نے جنوری ۱۸۸۵ء کو دہلی کے اخبارات میں اشتہار دینا شروع کئے اور کثرت سے شعراء بیرونجات کو خط لکھے اور نتیجے کے طور پر خدا کے فضل و کرم سے دو سال میں یہ مجموعہ (حدیث قدسی حصہ دوم) تیار ہو گیا۔ مندرجہ بالا سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دسمبر ۱۸۸۶ء یا جنوری ۱۸۸۷ء تک حاجی صاحب کے پاس اُن کی کوششوں سے خمسوں کی ایک معتد بہ تعداد جمع ہو گئی تھی۔

اگر یہ سچ ہوتا تو واقعی یہ ایک قابل قدر کارنامہ ہوتا۔ مگر یہ سچ نہیں ہے۔ حاجی صاحب بھی قاضی محمد عمر صاحب ہی کے مقلد و ہم مسلک تھے اور

(بقیہ صفحہ [illegible])

[1] 'حدیثِ قدسی' کا قاضی محمد عمر کے اہتمام سے ۱۲۷۳ھ میں چھپنا قرینِ قیاس نہیں کیونکہ یہ رسالہ 'خمسہ ہائے غزل قدسی (رحمٰن مدح نبی)' از محمد حسین خاں تحسین ہی کی نقل ہے جو ۱۲۸۳ھ میں شائع ہوا تھا۔ قاضی صاحب یہ جرأت رندانہ نہیں کر سکتے تھے کہ دس ہی سال کے اندر اندر اس سرقے کو اپنے نام سے طبع کروا کے خاص و عام کے لئے شائع کریں۔ اور تحسین کا نام تک نہ لیں۔

علی عباس اُمید
انیس منزل۔ نور محل۔ بھوپال (مدھیہ پردیش)

غالبؔ اور علیٔ کُلِّ غالب

میں نے "نگارِ غالبؔ"[1] میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ غالبؔ کے یہاں ہند فارسی شاعری کی روایت کے سلسلہ کی تکمیل ہوتی ہے۔ ابتدائی مغل شعرا فیضیؔ، نظیریؔ، عرفیؔ، صائبؔ، طالبِ آملی کے بلند آہنگ رجائیت وامید اور عزم و حوصلہ سے بھرپور افکار سے غالبؔ بھی متاثر ہوئے تھے دار القضا کی سخت گیریوں، بندشوں اور پابندیوں کے ردِ عمل کے طور پر ان شعرا کے یہاں وسیع المشربی، آزادہ روی اور سرکشی کے وہ رجحانات جنہوں نے ان کے لئے تکفیر کے فتوے فراہم کئے تھے، غالبؔ کے یہاں مذہب سے بے پروائی کے رجحان کی شکل میں ظاہر ہوئے۔ اس پر مستزاد تھا غالبؔ کے ذہن کا تشکیک پسند رویہ۔ "جو یوں ہوتا تو کیا ہوتا" کے انداز پر سوچنے والا غالبؔ کا ذہن مذہب کے اعتقادات پر سوالیہ نشان قائم کرتا رہا اور دَیر و حرم کو واماندگیٔ شوق کی تراشی ہوئی پناہ گاہ سمجھتا رہا۔ اعتقادات کا رشتہ دل سے استوار ہوتا ہے مگر غالبؔ عقل فعالؔ کی درخشندگی سے شمع فروزاں کرتے رہے لہٰذا مذہب سے لاپروائی ان کی زندگی کا جزو بن گئی۔ جنّت کا تصور ان کے نزدیک دل کے بہلانے کا اچھا خیال بن گیا اور اس کی حیثیت بے خردوں کے طاقِ نسیاں کے گلدستے سے زیادہ نہ رہی۔ جنت کے اس تصور کے نتیجہ میں وسیع المشربی اور آزادہ روی میں جو خلل پڑتا ہے وہ انھیں بہشت کو دوزخ میں جھونک دینے کے اقدام کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔ یہی نہیں وہ رسوم ترک کر کے ملّتیں مٹا دینے کو ایمان کی پختگی کی دلیل سمجھتے ہیں۔ ظاہری طور پر وہ زندگی بھر مذہب اور اس کے رسوم سے بے گانہ رہے۔ ان کے نزدیک صاحبِ نظر ہونے کی یہ شرط بھی تھی چنانچہ وہ خود کہتے ہیں[2]

ہر کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نہ کرد۔

غالبؔ نے صوم و صلوٰۃ کی کبھی پابندی نہ کی، شراب زندگی بھر پیتے رہے اور قمار بازی کا مشغلہ آخر عمر تک جاری رہا۔ مذہب سے اس بے پروائی کے باوجود انھیں حضرت علی علیہ السلام سے بے پناہ عقیدت تھی۔ اسلامی دنیا میں مولائے کائنات کی شخصیت کا کوئی ثانی نہیں ملتا۔ اسلامی علوم و فنون کے تمام تر سلسلوں کا آغاز حضرت علیؓ سے ہوتا ہے۔ اسلام میں سابق، ایمان میں کامل، میدانِ جنگ میں کرّار غیر فرار، محرابِ عبادت میں عابدِ شب زندہ دار، آیاتِ "اِنّما"، "ھل اتیٰ" و "قل کفیٰ" کے مصداق، صوفیا میں اکمل، اصحاب میں افضل، مورخین، مفسرین و محدثین کے لئے مایۂ ناز، بابِ شہرِ علم، مرکزِ ادب، خطابت میں بے نظیر، رشد و ہدایت کے مینار، عدل و انصاف کے معیار، مشکل کشائے خلق، امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب کی ذات بابرکات ہر دور میں لوگوں کے لئے باعثِ عقیدت و احترام رہی ہے۔ غالبؔ کا عقلیت و عینیت پسند ذہن بھی مولائے کائنات کے کردار کی عظمت کے قدموں میں سر بسجود نظر آتا ہے۔ وہ جب مولا علیؑ کا ذکر کرتے ہیں تو زبان سے عقیدت و شیفتگی کا دریا سا موجیں مارنے لگتا ہے۔ خلا نصاری کے لفظوں میں "حضرت علیؑ کا نام زبان پر آجائے تو غالبؔ کی روح جھوم اٹھتی ہے۔" مولانا حالیؔ جو غالبؔ کے تشیع ہونے کا اظہار نہیں کرتے وہ بھی اہلِ بیتِ اطہار سے ان کی مودّت اور عقیدت کے موید ہیں۔ چنانچہ 'یادگارِ غالب' میں تحریر کرتے ہیں "انھوں نے تمام عبادات و فرائض میں سے صرف دو چیزیں لے لی تھیں ایک توحیدِ وجودی اور دوسرے نبیؐ اور آلِ نبیؐ کی محبت اور اس کو وہ وسیلۂ نجات سمجھتے تھے۔" حالیؔ کے اس قول کی تائید مرزا کے اپنے بیانات سے بھی ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنے مذہبی عقائد کا اپنے خطوط میں بہت وضاحت کے ساتھ اظہار کیا ہے۔ اس سلسلہ کا سب سے مکمل اور واضح اُن کا وہ خط ہے جو مولوی حمزہ خاں کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ دہلی کے اُن مبلّغ نامدار کو غالبؔ کی بدعقیدگی سے بہت تکلیف پہنچی اور انہوں نے ان کی عاقبت کا خیال کر کے تنبیہ کی "بوڑھے ہو گئے، اللہ اللہ کرو ......

چوں پیر شدی حافظا از میکدہ بیروں شو
رندی و خراباتی در عہدِ شباب اولیٰ ...."

آزاد منش غالبؔ کی روح اس نصیحت سے بے چین ہو گئی۔ حمزہ خاں کے خط کا جواب انھوں نے علاء الدین احمد خاں علائی کے نام ۸ جولائی ۱۸۶۳ء کو لکھا۔ اس خط میں اپنے عقیدے کا بہت کھل کر اظہار کیا ہے۔ لکھتے ہیں ..... میں موحدِ خالص اور مومنِ کامل ہوں۔ زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجود الا اللہ لا موثر فی الوجود الا اللہ سمجھے ہوا ہوں۔ انبیا سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعت تھے ... منقطع نبوت کا مطلع امامت

---

[1] ناشر ع۔ ج۔ عابدی، حسن منزل لشکاہ، غازی پور (یو۔ پی)
[2] چوں ہمہ خود نشانم ہمہ شمع فروزندہ بہشتی۔ در رفتنہ گی جوہر عقل فعال

اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہے ثم حسنؓ ثم حسینؓ۔ اسی طرح تا مہدیٔ موعود علیہ السلام۔ بریں زیستم، ہم بریں بگذرم۔ ...... شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں .... اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہوگا بلکہ دوزخ کا ایندھن بنوں گا اور دوزخ کی آنچ کو تیز کر دوں گا تاکہ مشرکین و منکرین نبوت مصطفویؐ اور امامت مرتضویؐ اس میں جلیں ...... صاحب بندۂ اثنا عشری ہوں۔ ہر مطلب کے خاتمے پر بارہ کا ہندسہ کرتا ہوں۔ خدا کرے میرا بھی خاتمہ اسی عقیدے پر ہو بارہ ......"

اہلِ بیتِ پاک میں بھی جتنی اور جیسی عقیدت انھیں مولائے کائنات کی ذات سے ہے ویسی کسی اور سے نہیں۔ پنشن بند ہونے کے بعد اپنی مالی مشکلات کا اظہار کرتے ہوئے ایک خط میں لکھا ہے "علیؑ کا بندہ ہوں، اس کی قسم کبھی جھوٹ نہیں کھاتا"۔ وہ اپنی ذات کو حضرت علیؓ سے وابستہ کرنا باعثِ سعادت سمجھتے تھے۔ ان کا نام اسد اللہ خاں تھا اور حضرت علیؑ کا تذکرہ اسد اللہ الغالب علی ابن ابی طالب کے لقب سے کیا گیا ہے، اسی مناسبت سے انھوں نے اپنا تخلص تبدیل کر کے غالب رکھ لیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چونکہ تخلص کے طور پر غالب، مروّج نہ تھا اور غالب کو رسم و رہِ عام سے نفرت تھی لہذا انھوں نے اسے اپنے تخلص کے لئے منتخب کیا۔ مگر پروفیسر عندلیب شادانی مرحوم کی تحقیق کے مطابق غالب تخلص والے تقریباً ایک درجن شعراء خود غالب کے زمانے میں موجود تھے۔ اسد کے غالب ہونے کا واحد سبب حضرت علیؓ سے اسد اللہ خاں کی عقیدت و شیفتگی ہی تھی۔ یہی نہیں وہ خطوط میں بھی اپنے نام کے ساتھ 'حیدری' لکھنا پسند کرتے تھے۔ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں ذخیرۂ حبیب گنج میں قدر بلگرامی کے نام مرزا غالب کا تحریر کردہ ایک خط ہے جس میں ان کے دستخط اس طرح ہیں " غالب اثنا عشری حیدری"

غالب نے اشعار میں کہیں بھی مولا علیؓ کی منقبت کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ایک مشہور غزل کا مطلع و مقطع ہے :۔

کل کے لئے کر آج نہ خسّت شراب میں
یہ سوءِ ظن ہے ساقیٔ کوثر کے باب میں

غالب ندیمِ دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگیٔ بوتراب میں

مقطع میں جس ارادت، عقیدت اور شیفتگی کا اظہار ہوا ہے وہ محتاجِ تشریح نہیں۔ "بندگی" کی وسعت ان کے عقیدے کی غماز ہے۔

حضرت علیؓ سے غالب کی یہ عقیدت اوائلِ عمری ہی سے تھی۔ اپنی شاعری کے پہلے دور یعنی پچیس سال کی عمر سے قبل جو دو قصیدے انھوں نے اردو میں لکھے ہیں، دونوں ہی حضرت علیؓ کی شان میں ہیں۔ ان قصائد میں منقبت کا جو خلوص سے بھرپور انداز اور عقیدت کا پُرجوش اظہار ملتا ہے وہ اُردو کی قصیدہ گوئی کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ پہلے قصیدہ کا مطلع ہے :۔

سازِ یک ذرّہ نہیں فیضِ چمن سے بے کار
سایۂ لالۂ بے داغ سویدائے بہار

اس قصیدے کی تشبیب بہاریہ ہے۔ تشبیب سے ممدوح کی منقبت کی طرف اس انداز میں گریز کیا ہے کہ بات سے بات نکلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے :

عل سے کی ہے پئے زمزمۂ مدحتِ شاہ
طوطیٔ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار

اور پھر بے حد عقیدت و محبت اور جوش و خروش کے ساتھ مدح کی ہے۔ ان اشعار سے ان کی والہانگی کا اندازہ ہوتا ہے :

وہ شہنشاہ کہ جس کی پئے تعمیرِ سرا
چشمِ جبریل ہوئی قالبِ خشتِ دیوار

فلک العرش ہجومِ خمِ دوشِ مزدور
رشتۂ فیضِ ازل سازِ طنابِ معمار

سبزۂ نہ چمن و یک خطِ پشتِ لبِ بام
رفعتِ ہمّتِ صد عارف و یک اوجِ حصار

ذرہ اس گرد کا خورشید کو آئینۂ ناز
گرد اس دشت کی امید کو احرامِ بہار

مدح میں تیری نہاں زمزمۂ ذاتِ نبیؐ
جام سے تیرے عیاں بادۂ جوشِ اسرار

دوسرے قصیدے کا مطلع ہے :

دہر جز جلوۂ یکتائیٔ معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

اس قصیدے میں انھوں نے پہلے قصیدے سے زیادہ جوشِ عقیدت اور شیفتگی کے ساتھ مدح نظم کی ہے اور اس شعر پر خاتمہ کیا ہے :

صَرفِ اعدا اثرِ شعلۂ دُودِ دوزخ !
وقفِ احباب گل و سنبلِ فردوسِ بریں

اس شعر میں وہ انداز ہے جو صوفیائے کرام اور تفضیلیہ حضراتِ اہلِ سنّت کے یہاں بھی ناپید ہے۔ دعا کا یہ انداز اہلِ تشیع سے مخصوص ہے اور ان کے نزدیک جزوِ ایمان کا درجہ رکھتا ہے۔ غالب کی حضرت علیؓ سے ارادت و عقیدت کا اس سے بہتر اظہار اور کیا ہو سکتا ہے !

حضرت علیؓ سے غالب کی والہانگی اور بے پایاں عقیدت کا صحیح اور واضح اندازہ مثنوی "ابر گہر بار" کے مطالعے سے ہوتا ہے۔ ایک ہزار اٹھانوے اشعار پر مشتمل یہ نامکمل مثنوی ان کے کلکتے کے سفر (۲۹-۱۸۲۷ء) کے دوران لوگوں

کی نظروں میں آئی۔ اس مثنوی کا آغاز خدائے بزرگ و برتر کے شکر سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد معبودِ حقیقی کی عظمت، کثرت میں یکتائی اور ذہنِ انسانی کی پرواز کا بیان ہے۔ خدا اور خدا پرستوں کے ذکر کے بعد 'مناجات' کے عنوان سے وہ معرکۃ الآرا حمد نظم کی ہے جس کی مثال ہند فارسی شعراء کے دواوین میں نہیں ملتی۔ حمد کے اختتام پر نعتِ رسولؐ ہے۔ انسانوں کے اس قبلہ گاہ کی ثنا بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں :

زخونے کہ در کربلا شد سبیل ادا کرد وامِ زبانِ خلیل

(وہ خون جو کربلا میں پانی کی طرح بہہ گیا، وہ خون نذر دے کر انہوں نے (رسولؐ مقبول) حضرت ابراہیمؑ کے زمانے کا قرض ادا کر دیا)

اس کے بعد دو سو چوہتر (۲۷۴) اشعار معراجِ نبوی کے تفصیلی بیان کے بعد لکھتے ہیں :

شب از بادۂ قدس ساغر گرفت صبوحی ز دیدارِ حیدرؑ گرفت
دو چشمست و ہر چشم را بینشے ست ولی انچہ بینند ہر دو یکے ست

حضور سرورِ کائنات نے شب میں تو اس روحانی محفل کا جام پیا اور صبح کی لذت حضرت علی کے دیدار سے ہو گئی۔ غالب کا عقیدہ ہے کہ محمدؐ اور علیؑ دونوں بظاہر تو دو روشن آنکھیں ہیں لیکن یہ آنکھیں جو کچھ دیکھتی ہیں وہ ایک ہی ہوتا ہے۔ اپنے اس عقیدت کو مزید تقویت پہنچانے کے خیال سے کہتے ہیں :

نہ گنجد دوئی در نبیؐ و امامؑ علیہ الصلوٰۃ و علیہ السلام

وہ رسولؐ اور امامؑ میں کوئی فرق نہیں مانتے، ان کے نزدیک ان کے درمیان کوئی علاحدگی نہیں ہے۔ وہ دونوں ہی پر درود و سلام بھیجتے ہیں۔

اس کے بعد حضرت علی کی مدح شروع ہو گئی ہے۔ حضرت علیؑ کا نام آتے ہی غالب کی روح وجد میں آجاتی ہے۔ اپنی عقیدت کے بہاؤ میں وہ مسلسل ایک سو اٹھائیس (۱۲۸) اشعار حضرت علی کی منقبت میں لکھتے چلے گئے ہیں، ہر شعر اپنا جواب آپ ہے۔ ایک جگہ تو انہوں نے انتہا کر دی ہے، کہتے ہیں :

نبیؐ را پذیرم بہ پیمانِ او خدا را پرستم بہ ایمانِ او
خدائش روا نیست ہر چند گفت علیؑ را توانم خداوند گفت

خدا اور رسولؐ دونوں کو وہ صرف اس لئے مانتے ہیں کہ ہر دو پر حضرت علیؑ کا ایمان تھا۔ اگر حضرت علیؑ نبیؐ سے پیمان نہ باندھتے تو غالب کبھی رسول کے قائل نہ ہوتے۔ اسی طرح چونکہ حضرت علیؑ کا ایمان خدا پر ہے لہٰذا وہ بھی اسے مان لیتے ہیں۔ ان کے لفظوں میں "میں تو علیؑ کو اپنا مالک و آقا یا خدا کہتا ہوں وہ بھی یوں کہ انہیں خدا نہیں کہا جا سکتا"۔ خدا نہ کہنے کی وجہ ظاہر ہے، یعنی حضرت علیؑ خود ایک خدا کے قائل ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا اور رسولؐ پر غالب کا ایمان محض مجبوری کے سبب تھا۔ اگر ذرا بھی گنجائش ہوتی تو وہ سب کو چھوڑ کر حضرت علیؑ کو اپنا معبود مان لیتے۔

اس مادی دنیا کے طلسم میں جو تجلی ہے۔ بقول غالب اس کے مختلف روپ اور مختلف نام ہیں۔ وہ خدا سے علی کا نام دیتے ہیں[۱]۔ اپنے عقیدے کی وضاحت کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ نہ تو میں عقل میں بہت اونچی اُڑان کرتا ہوں اور نہ کچھ گیا بیتا ہوں بلکہ حق کی پرستش علیؑ کے نام کے ساتھ کرتا ہوں[۲]۔ ان کی یہ والہانگی بے سبب نہیں ہے۔ اس کی وجہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حضرت علیؑ کی شخصیت کے نور نے انہیں خیرہ کر دیا ہے حضرت علیؑ وہ ہیں، عقل جن کے دسترخوان کی ٹکڑ گدا ہے اور جن کی شجاعت کے روبرو موت دست بستہ حاضر ہے[۳]۔ غالب عقل انسانی اور انسانی روح دونوں ہی کو حضرت علیؑ کی بیکراں شخصیت کے راستے کا غبار مانتے ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ اگر حضرت علیؑ کو خدا بھی نہ مانا جائے تو بھی وہ اس مقام پر ہیں جہاں کو ان کی سمجھنا چاہیے[۴]۔

حضرت علیؑ سے غالب کی بے پناہ عقیدت پر اس زمانہ میں بڑی بڑی چہ میگوئیاں ہوئیں۔ قلعہ کی ملازمت (۱۸۵۰ء) سے پہلے ہی لوگوں نے یہ مشہور کر دیا تھا کہ غالب "ماوراء النہری سنی" سے شیعہ ہو گئے ہیں۔ کچھ لوگوں نے عقیدت کے اس اظہار کو سخن طرازی پر محمول کیا۔ ایسے تمام لوگوں کا منہ بند کرنے کے لئے انہوں نے کہا کہ 'ایسے تمام لوگ جو ناپ تول کے بہت عادی ہیں اور مذہب و عقیدت کی نوعیت کے سوالات اٹھاتے ہیں، وہ میرے بہت زیادہ علیؑ علیؑ کرنے پر یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ میں علیؑ کی تعریف صرف آرائشِ گفتگو کی خاطر کرتا ہوں اور گفتگو کا موضوع بننے کے لئے اس کی تعریف میں مبالغے کی حد سے گذر جاتا ہوں[۵]۔ پھر انہوں نے افسوس ظاہر کیا کہ 'مبالغہ کس کا اور کیسا؟ مجھے تو یہ شرم مارے ڈالتی ہے کہ پورے طور پر علیؑ کی مدح نہیں کر پاتا'۔ وہ لوگوں کی چہ می گوئیوں اور طعنوں سے یکسر بے نیاز ہیں، انہیں کسی کے کہنے سننے کی پروا نہیں ہے کیونکہ وہ اپنے ممدوح کی ثنا خوانی بلا شرکت غیرے کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ جب وہ علیؑ کی مدح کریں تو کوئی اور درمیان میں نہ ہو بلکہ وہ کہتے رہیں اور حضرت علیؑ سنتے رہیں[۶]۔

---

[۱] بہر گوشہ از عرصۂ این طلسم دہد روشنائی جداگانہ اسم
[۲] بلندم بہ دانش نہ پستم ہمی بدین نام یزداں پرستم ہمی
[۳] خرد ز آخورش سبزہ زار نگی قضا پیشکارش بہ مردانگی
[۴] دہان و خرد گرد راہ او نزاید رہ ے کمبہ در گاہ او
[۵] کسانے کہ اندازہ پیش آورند سخن از آئین و کیش آورند
بہ ناوانی از شور گفتار من سگالند کہ اکنون نہ ہنجار من
کہ آرائشِ گفتگو کردہ ام بہ حیدر ستائی غلو کردہ ام
[۶] چو خواہم صیتے سر و دن تازہ بود گفتن از من شنو دن ازو

معترضین کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ "جب سے مجھے اتنا شعور ہوا ہے کہ محبت اور نفرت کے درمیان تمیز کر سکوں، تب سے میں نے حیدرؑ کے سوا کسی سے لو نہیں لگائی۔ اسی دروازے پر میں نے جوانی کا زمانہ گذار دیا، گویا وہ رات تھی جو ان کے تصور میں ہی بسر ہوگئی"

غالب کے مخالفین نے یہ مشہور کر دیا تھا کہ غالب اپنا آبائی مذہب ترک کر کے شیعہ ہو گئے ہیں۔ ممکن ہے اس پروپیگنڈے میں مصلحت وقت کا دخل رہا ہو۔ بہرحال انہوں نے اپنے عقیدے کی وضاحت میں کہا:

تو غافل ز ذوقِ ثنا گوئیم   سزا گوئی و ناسزا گوئیم
مرا ناسزا گفتن آئیں مباد   لبِ من رگِ سازِ نفریں مباد

تمہیں کیا خبر کہ مجھے علیؑ کی ثنا گوئی کا ذوق و شوق کتنا ہے۔ میری تولا اور تبرا کو تم کیا جانو گے! بُرا کہنا، نا واجب کلمے زبان سے نکالنا میرا طریق کبھی نہ ہوگا۔ میرے لبوں پر تبرائی حرف نہیں آسکتے اور یہیں غالب کے عقیدے کا صحیح پتہ لگ جاتا ہے۔ جو لوگ انہیں سُنّی کہتے ہیں ان کی رائے یوں غلط ہو جاتی ہے کہ غالب حضرت علیؑ کے علاوہ کسی کو مانتے ہی نہیں۔ جو فرقہ ان کی شیعت کے دلائل دیتا ہے اس کی تردید یوں ہو جاتی ہے کہ تبرا شیعیت کا جزو لازم ہے۔ دشمنانِ اہلِ بیت اطہار پر تبرا کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ خدا کے مدِ مقابل ابلیس پر لعن کرنا۔ عقیدے کی تکمیل کے لئے تبرا لازمی ہے۔ غالب اس کے بالکل برعکس ہیں، وہ بُرا کہنے کو بُرا مانتے ہیں۔ انہیں صرف تولا کا شوق ہے وہ بھی محض ایک ذات کے لئے مخصوص ہے۔ اس لحاظ سے انہیں 'نصیری' کہا جاسکتا ہے۔ نصیری وہ فرقہ ہے جو حضرت علیؑ کو خدا کہتا ہے۔ اس کا ایمان ہے کہ خدائے بزرگ و برتر نے اپنے رسول کی نبوت کو تقویت پہنچانے اور کارِ نبوت کو پروان چڑھانے کے لئے اپنے آپ کو حضرت علیؑ کے روپ میں ڈھال لیا تھا۔ حضرت علیؑ ہی در اصل معبودِ حقیقی ہیں۔ غالب بڑی حد تک اس خیال کے پیرو ہیں۔

اس مثنوی میں جب وہ اپنے عقیدہ کے اظہار اور مدح حضرتِ علیؑ کے اختتام پر پہنچتے ہیں تو اپنی تمنا ظاہر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ خواہ وہ ہند میں ہوں خواہ عراق میں، باغ میں رہیں یا بیابان میں، ان کی بازگشت علیؑ کی طرف ہو۔ اکبر کے عہد کے جواں مرگ شاعر عرفیؔ شیرازی پر انہیں رشک بھی آیا ہے کیونکہ وہ علیؑ علیؑ کہتا دنیا سے گیا اور نجفِ اشرف میں جہاں حضرت علیؑ کا روضہ ہے اپنے کو دفن کرالیا۔ آخر میں اپنے خدا سے التجا کرتے ہیں کہ دہلی شہر کا یہ دل شکستہ باشندہ غالب، نجف کی مٹی میں مل جائے اور اسی چوکھٹ پر اس کا آخری نشان باقی رہے، اس کے سوا کوئی اور انجام نہ ہونے پائے۔

ظ۔ انصاری لکھتے ہیں کہ "حضرت علیؑ کا تصور ان کے لئے ایسا ہی ہے جیسے میرا بائی کے لئے کرشن کا دھیان، اسد الغالب، علیؑ اسد اللہ کے بھگت ہیں۔ یہاں سُنّی شیعہ، جنگِ جمل اور باغِ فدک کی کوئی سمائی نہیں۔ علیؑ جیسے ایک سپہ گر، شاعر اور شریف النفس ہیرو کا دامن تھام کر وہ اہلِ شریعت کی مائتھولوجی اور فتووں سے اہلِ طریقت کی ریاضتِ نفس سے اور فلسفہ۔ غسطہ کی دماغ پاشی سے سبک دوش ہو جاتے ہیں"

ان کی تمام نظم و نثر کا جائزہ لیجئے اور مثنوی 'ابرِ گہر بار' کے ایک سو اٹھائیس اشعار، جو کہ حضرت علیؑ کی مدح میں ہیں، کی روشنی میں گو کہ وہ شیعہ عقیدے کے بیحد قریب نظر آتے ہیں۔ لیکن کچھ اشعار اور جملے ان کے نصیری ہونے کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ غالب کے مذہب و عقیدے کے اہلِ نظر حضرات جو بھی رائے قائم کریں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ غالب کی نظروں میں حضرت علیؑ جتنی محترم، مقدس اور یکتا کوئی اور ذات نہیں ہے اور یہی سبب ہے کہ انہوں نے صرف اسی ذات سے لو لگائی اور اپنے کو علیؑ کا بندہ مانا۔

کرتا کینہ از مہر بشناختم   بکس غیر حیدرؑ نہ پرداختم
جوانی بدیں در بسر کردہ ام   شبے در خیالش سحر کردہ ام

کہ دل خستۂ دہلوی مسکنے   ز خاکِ نجف باشدش مدفنے
ز غالب نشاں جز بداں در مباد   چنیں باد فرجام و دیگر مباد

غالب شناسی صفحہ ۱۶۲

بقیہ سوویت یونین میں غالب کا مطالعہ

صرف گذشتہ چند سال کے کاموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ امید ہے کہ مستقبل میں غالب کے کارناموں کا مطالعہ زیادہ شوق و انہماک سے کیا جائے گا۔

سوویت یونین کے علاوہ مشرقی یورپ کے دوسرے اشتراکی ملکوں میں بھی غالب سے دلچسپی بڑھی ہے۔ چیکوسلواکیہ کی نوجوان خاتون ڈاکٹر ملینا ہبش مانوا نے غالب کے اردو کلام کا ترجمہ چیک زبان میں کیا۔ ان کے کچھ تراجم منظوم ہیں اور کچھ آزاد۔ غالب کی شاعری میں وجودی فکر کے عناصر پر بھی انہوں نے ایک ضخیم مقالہ لکھا۔ ان کے علاوہ چیک ہند شناس اور اردو دوست ڈاکٹر یان مارک نے بھی غالب کی اُردو اور فارسی شاعری پر کئی گراں قدر مضامین لکھے جن کے تراجم اُردو میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔

رُباعیات

بمل کرشن اشک
۷ ، یونی ورسٹی کیمپس ، رہتک (ہریانہ)

اجر کو تکے ہے آنکھ کھولے دھرتی
دیکھے سے جو بھی بھرے تو بولے دھرتی
یوں ٹپکے ہے اوس جیسے امرت برسے
کُھل کھیلے اِسی پہلے جسم دھولے دھرتی

سونے کی گھڑی بھی ہو تو دفتر کیا ہے؟
ہیروں میں بھی تُل سکے تو لمحہ کیا ہے؟
گزرا نہیں ، اور زخم بن کر لوٹا
ظالم ہے یہ وقت اِس سے رشتہ کیا ہے؟

ہر چند کہ ابر تھا گھنیرا اُس پار
ہر چند دبیز تھا اندھیرا اُس پار
دھوکا تھا کہ کیا تھا دوست کیسے کہتے
چہرہ سا دکھائی دے تھا تیرا اُس پار

اک سر پھری سی ہوا ہوں مجھ سے مت پوچھ
الجھا ہوا راستا ہوں مجھ سے مت پوچھ
یہ پاؤں مرے نہیں ہیں مَیں کیا جانوں
میں اشک کہاں چلا ہوں مجھ سے مت پوچھ

مُڑ مُڑ کے نہیں چلا تو دریا کیسا؟
خالی ہی نہ رہ سکا تو کاسا کیسا؟
سسکی سے نہیں ملے تو کیسے انفاس
گاتے ہوئے کٹ گیا تو رستا کیسا؟

مظہر امام
مسکن کوٹھی ، باقر گنج ، پٹنہ ۴ (بہار)

بے چہرہ منظروں کو بھی کچھ خط و خال دے
اس تیرگی کے منہ پہ سویرا اچھال دے
ایسا نہ ہو کہ ظاہر و باطن کھنگال دے
ہر صاحبِ نگاہ کی آنکھیں نکال دے
بدشکل ساعتوں کو فسونِ جمال دے
ان کو بھی اپنے جسم کے سانچے میں ڈھال دے
شاید فرازِ کوہ سے لوٹے کوئی جواب
لب بستہ وادیوں کو متاعِ سوال دے
گرنے نہ پائے نقد کا معیار سطح سے
وہ بے مثال ہے تو ہماری مثال دے
قیدِ تکلفات سے باہر نکل کے آ
ہر واہمہ دماغ سے اپنے نکال دے
گرمیٔ لفظ و صوت سے یہ بھی پگھل نہ جائے
فکرِ برہنہ جسم پہ چادر تو ڈال دے

نجیب رامش

ہر ایک یار بے شمار تلخیاں بدست ہے
یہ زندگی تو جیسے کوئی زہر کا درخت ہے
بتا نہ پائے گی جبیں کہ ذات لخت لخت ہے
نقابِ درد ، رُخ کا ماتحت ہے اور سخت ہے
حیات لمحۂ صفر پہ ہے ، کبھی پہاڑ پر
رکا تو اک پہاڑ ہے گذر گیا تو وقت ہے
زباں کو غم نگار جیسا ذائقہ تو دے گیا
مگر یہ موم جیسا دل ابھی تلک کتنا سخت ہے
اتر رہے اپنی تہہ میں بھی ہزار وسوسے لئے
کہاں پہ جالے کیا چھپا ہو دشت پھر بھی درخت ہے
مجھی سے پا گئی زباں مرا ہی منہ چڑا گئی
خموش ہوں کہ تاک میں صدائے بازگشت ہے
کپاس کا وہ کھیت داغ داغ ہو گیا مگر!
نہ جانے کیوں دماغ اب بھی تجربہ پرست ہے

سری نواس لاہوٹی
"اردو ہال" - حمایت نگر - حیدرآباد (۲۹)

سنت تلسی داس اور اُن کا عہد

آدب اور زندگی ان دو لفظوں کو سنتے ہی آج بھی کچھ لوگوں کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے نزدیک یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی ادب کو ہضم کر جائے گی اور اس کے بعد تخلیقات میں اگر کوئی چیز باقی رہے گی تو وہ صرف ادب کی صدائے بازگشت ہوا کرے گی۔ مگر میرے خیال میں ادب اور زندگی میں امتیاز کرنا مشکل ہے۔ امتیاز پیدا کرنے کی بات ان لوگوں کے دماغوں پیدا ہوتی ہے جو زندگی کو صرف خیالی سمجھتے ہیں اور جن کے نزدیک زندگی مختلف خانوں میں بٹی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ادب میں عوامی مسائل کے ذکر پر زور دیتے ہیں تو لکھنے والے کے سامنے بہت ہی پیچیدہ سوال اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ہر ادیب اپنے اپنے شعور کے مطابق ان مسائل پر اپنی تخلیقات کی بنیادوں کو استوار کرتا ہے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی سنت تلسی داس کی شاعری ہے۔ ہندی کے کلاسیکل شعرا میں تلسی داس کو وہی مرتبہ حاصل ہے جو فارسی میں فردوسی اور نظامی اور یونانی میں ہومر کو حاصل ہے۔ تلسی کی بہترین تصنیف "رام چرتر مانس" ہے۔ "رام چرتر مانس" کا ترجمہ دُنیا کی تقریباً تمام بڑی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اُردو کے کئی شعرا نے رامائن کے کئی کرداروں کو نظم کیا ہے جن میں چکبست اور سرور جہاں آبادی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ میرے اس مضمون کا موضوع تلسی داس جی کی شاعری نہیں ہے بلکہ وہ عہد ہے جس میں انہوں نے شاعری کی ہے اور اپنے عہد کے "عوامی مسائل" کو اس میں سمویا ہے۔

سنت تلسی داس ہندوستان کے لافانی شاعر ہیں۔ اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے لیکن وہ دورِ وسطیٰ کے نمائندہ شاعر ہیں اس کے بارے میں لوگوں کی دو رائیں ہو سکتی ہیں۔ ملک کے سماجی ارتقاء میں ان کا کیا مقام ہے؟ انہیں ارتقاء کا موئید کہا جائے یا رجعت پسندی کا پاسبان؟ ہمیں ان سوالوں پر بھی غور کرنا ہے۔ ہندو سماج پر ان کی تبلیغ کی گہری چھاپ ہے۔ اس سے ملک کا فائدہ ہوا یا نقصان؟ ان سوالوں کو لے کر بھی لوگوں میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ سنت تلسی داس طبقہ واری مذہب (برہمن، چھتری، ویشیہ اور شودر) کے حامی تھے۔ راجہ رامچندر جی کو پوجنے والے تھے تو پھر ان کا سماجی ارتقاء سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ ڈاکٹر تارا چند (مرحوم) نے اپنی کتاب "ہندوستانی تہذیب پر اسلامی اثرات" میں سوامی رامانند کے ماننے والوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک کو "کنزرویٹو" اور دوسرے کو "ریڈیکل" بتلایا ہے۔ اول الذکر گروہ کے قائد سنت تلسی داس ہیں اور دوسرے گروہ کے کبیر داس۔ اس کے برعکس ہندی کے مشہور نقاد پنڈت رامچندر شکل، ان لوگوں کو "ڈھونگی اور سماج کو دغا دینے والا سمجھتے ہیں۔" وہ تلسی داس جی کو نہ تو "کنزرویٹو" سمجھتے اور نہ "ریڈیکل" بلکہ "عوامی مفاد کی پاسبانی کرنے والا" خیال کرتے ہیں۔ چونکہ شکل جی خود طبقہ واری مذہب کے حامی تھے، اس لئے وہ اس کو ختم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔ ان کے نزدیک "عوامی مفاد" ایسے مذہب کی بنیاد پر کھڑا ہوا ہے جسے کبیر داس وغیرہ نے اپنایا تھا۔ یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا سنت تلسی داس عوامی مفادات کو طبقہ واری مذہب ہی میں محفوظ سمجھتے تھے!

ہر شاعر اور ادیب اپنے دَور سے متاثر ہوا کرتا ہے۔ زمانے کی حقیقتیں اس کے ادب میں پائی جاتی ہیں اور انہیں حقیقتوں کو بیان کر کے شاعر اور ادیب زمانے کو متاثر کیا کرتے ہیں۔ زمانے کی تبدیلی اور ترقی میں ان کا ہاتھ ہوتا ہے اور ایسا ہی ادیب اور شاعر عظیم ترین فن کار کہلاتا ہے لیکن اس عہد کو پرکھنے، حالات کو جانچنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ مثلاً روسی ادیب ٹالسٹائی، انقلابی تصورات کے حامی نہیں تھے۔ لیکن پھر بھی لینن نے ان کو "روسی انقلاب کا آئینہ" کہا ہے۔ یہ بات لینن نے اس لئے کہی تھی کہ ٹالسٹائی نے اپنے عہد کے سماجی ارتقاء کے کئی پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ شکسپیر عوامی اقتدار کا قائل نہیں تھا۔ لیکن مارکس نے اس کے ادب اور خیالات کو خوش آمدید کہا تھا اس لئے کہ جاگیردارانہ سامنتی تہذیب کے خلاف نئی بیداری کا ادبی قائد بلاشبہ شکسپیر تھا۔ فرانسیسی انقلاب کے دَور کے فلسفی بھی شکسپیر کے پیرو تھے اور ان فلسفیوں کی اہمیت اس لئے تھی کہ ان لوگوں نے طرزِ فکر میں ایک انقلاب برپا کر دیا تھا۔ اسی طرح سے تلسی داس جی کے طبقہ واری مذہب پر غور کرتے وقت ان نظریوں کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ سنت تلسی داس کی شخصیت عظیم تر حیثیت کی مالک تھی۔ اس لئے ان کے ادب عالیہ کی سماجی اہمیت پر غور کرنے سے پہلے اس کے تاریخی پس منظر پر نظر رکھنا بہت ضروری ہے۔

ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ میں پیداواری طاقت کا خاص مرکز

غریب کسان تھے اور ان کی زندگی میں بنیادی تبدیلی لائے بغیر ترقی ناممکن تھی۔ ذرائع پیداوار میں کوئی خاص تبدیلی نہ ہونے کی وجہ سے کسانوں کی گری ہوئی حالت میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ اس دور میں طبقہ واری جدوجہد کو کچل کر دوسری الجھنوں نے اس کی جگہ لے لی تھی۔ اس لئے ہم دور وسطیٰ کے کسی شاعر یا ادیب سے یہ امید نہیں رکھ سکتے کہ وہ طبقہ واری جدوجہد کی کوئی واضح مثال ہمارے سامنے پیش کرے۔ اس بہت بڑی کمی کے باوجود بھی ہمیں اس عہد کے بڑے ادیبوں کی تخلیقات میں اس کی ہلکی سی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اکبر اور جہانگیر کی بھی زندگی کو، ان کے زمانے میں ہونے والی لڑائیوں کو، ان کے ذرائع پیداوار کے نظام کو مورخوں نے صرف ایک ہی شکل میں پیش کیا ہے جس کی وجہ سے طبقاتی جدوجہد کو، کوئی خاص شعوری حیثیت نہیں دی جا سکتی۔ مگر اس کے برعکس جو کام مورخوں نے نہیں کیا اس کو ایک باشعور شاعر اور صوفی ——— تلسی داس نے کر دکھایا ہے

تلسی داس جی نے اپنی شاعری میں کئی جگہ اس بات کا ذکر کیا ہے کہ "زمین کسان ہی کی ملکیت ہے اس پر کسی دوسرے طبقہ کی اجارہ داری قائم نہیں کی جا سکتی"۔ ان خیالات کو پیش کرتے وقت جس جدلی شعور کا پتہ ہمیں شاعر کے جذبات میں ملتا ہے اسے بہت سے نقاد آنکھ بچا کر ٹال دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ جیسا کہ پنڈت رامچندر شکل نے کہا ہے کہ "تلسی داس جی کی شاعری میں جس آنے والے کل کا ذکر ہے۔ وہ اپنے ہی حالات سے بھرا پورا دکھائی دیتا ہے"۔ یہ کہہ کر وہ اس حقیقت کو بیان کرنے سے گریز کرتے ہیں کہ "یہ حقیقی خیالات نہیں ہیں"۔ مگر یہ خیال تلسی داس جی کی شاعری کا حاصل ہے اور تاریخ کے اوراق اس کی شہادت پیش کرتے ہیں۔ بچپن میں شاعر نے جو مصیبتیں برداشت کی ہیں اس کا ذکر ان کی "چوپائیوں" میں ملتا ہے۔ ان کے بارے میں کچھ عالموں کا خیال ہے کہ "یہ باتیں بھگوان کو پھسلانے کے لئے کہی گئی ہیں"۔ ان لوگوں کی سمجھ کے مطابق تلسی داس جی کے بارے میں یہ کہنا کہ "بچپن میں ان کو روٹی کے لئے ترسنا پڑا" ان کی توہین کے مترادف ہے ایسے عالموں اور نقادوں کی سمجھ میں تو یہ بات خیالی ہے"۔ لیکن وہ اس کو بھول جاتے ہیں کہ جب کاشی (بنارس)، میں قحط پڑا تو غریب عوام کو اس مصیبت سے نجات دلانے کے لئے انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ ملک والوں سے اپیل کی کہ "دکھی دلوں کی مدد کرو"۔ یہ صحیح ہے کہ تلسی داس جی مدت العمر مصیبتوں میں گھرے رہے اور ہمارے لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ زندگی میں انہیں کبھی مصیبتوں سے نجات بھی ملی تھی یا نہیں۔ اسی بنا پر ان کے کلام میں دکھیوں اور مصیبت زدوں سے متعلق بہت زیادہ ہمدردی پائی جاتی ہے اور اس حیثیت سے ہم انہیں اپنے دور کا نمائندہ شاعر کہہ سکتے ہیں۔ تلسی داس جی کی انسانیت سے لافانی محبت کا ذکر ہمیں رامائن کے "ایودھیا کانڈ" میں ملتا ہے۔

اپنے دور کی انتہائی گری ہوئی حالت کا جائزہ لے کر انہوں نے "رام راجیہ" کے تصور کو پیش کیا تھا مگر اس کے ساتھ جہاں انہوں نے "رام راجیہ" کا ذکر کیا ہے وہاں آنے والے کل کے لئے بھی ایک نئی دنیا کو تخلیق کرنے کا پیام دیا ہے۔ ان کے پیام میں حال کو بدلنے کی جو بے چین روح تڑپتی نظر آتی ہے وہ اس دور کے کسی دوسرے شاعر کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ انہوں نے قوم دشمن عناصر کے خلاف اپنی آواز بلند کرتے ہوئے کہا تھا کہ مستقبل میں "راون" اور "کوروں" جیسے ظالموں کا کوئی مقام نہیں ہوگا۔ اور ایسے لوگ عوام کی متحدہ طاقت سے ٹکرا کر فنا ہو جائیں گے ——— اور یہی ان کی شاعری کا حاصل ہے۔ انہوں نے عیش کرنے والے راجاؤں کو "شگتے" لفظ سے مخاطب کرتے ہوئے ان کے فنا ہونے کی دعا مانگی تھی اور ان سب سے بڑھ کر انہوں نے خود غرض دیوی، دیوتاؤں کو "نشانِ ملامت" قرار دے کر بتلایا ہے کہ ایسے دیوتاؤں اور راجاؤں میں کوئی فرق نہیں ہے ——— دیوی، دیوتا قربانی کے طلبگار ہیں اور راجا لگان کے۔ عوام کی مصیبتوں سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔ راجاؤں سے متعلق سب سے معرکہ کی بات جو ان کی شاعری میں پائی جاتی ہے وہ یہ کہ "خداوند تعالیٰ نے ہیرا موتی جیسی اشیاء کو اس لئے بیش قیمت بنایا ہے کہ صرف رئیس اور راجا ہی انہیں خریدتے ہیں اس کے برعکس خدا نے اناج پانی سستا کر دیا ورنہ سارے لوگ بھوکوں مر جاتے"۔

یہ صحیح ہے کہ آنے والے کل کے بیان میں تلسی داس جی نے طبقہ واری مذہب کے فنا ہونے کی نسبت افسوس کا اظہار کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ سماج اور اس میں پیدا ہونے والی برائیوں سے بھی منہ نہیں پھیرا ہے۔ ان کی شاعری میں مقصد اور حاصلات کا عجیب امتزاج پایا جاتا ہے۔ اور اگر ہم گہری نظر سے ان کی چھان بین کریں تو پتہ چلتا ہے کہ اس میں حاصلات کا پلہ بھاری ہے جس میں بنیادی زندگی سے متعلق نمایاں بیداری کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

اس بیداری کی حدیں ضرور متعین ہیں اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے پیدا شدہ مسائل سے باخبر تھے۔ مگر ان مسائل کا تجزیہ واضح نقطۂ نظر سے نہیں کیا گیا ہے۔ کسان دکھی ہیں، عوام مصائب کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہیں اور ان کو ان مصیبتوں سے نجات حاصل کرنے کا راستہ انہوں نے "رام راجیہ" کے تصوری نظام میں بتلایا ہے۔ اس میں انہوں نے یہ محسوس نہیں کیا تھا کہ جاگیرداریت اور شخصی اقتدار کے فنا ہو جانے پر بھی عوام کی ان مصیبتوں کا خاتمہ نہیں ہوگا کیونکہ جاگیرداریت کے ساتھ ساتھ

طبقات اور طبقہ واری مذہب بھی بندھا ہوا ہے اور جب تک یہ فنا نہ ہو جائیں عوام کی مصیبتیں اس طرح برقرار رہیں گی۔ جس جگہ بھی جاگیرداریت موجود رہے گی وہاں کسی نہ کسی شکل میں طبقہ اور مذہب بھی باقی رہے گا اور یہ بندھن اسی وقت ٹوٹ سکتے ہیں جب صنعت و حرفت کے ارتقا کے ساتھ ساتھ نئی طاقتیں وجود میں آئیں۔ اگر عہدِ وسطیٰ کی جاگیرداری حدوں سے الگ ہو کر جمہوریت کا تصور پیدا کرنا تلسی داس جی کے لئے ناممکن تھا تو ہم ان سے اس بات کی بھی کیسے توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ طبقہ واری مذہب کی مخالفت کریں گے۔ ایسی حالت میں وہ ناانصافی اور استحصال کو ختم کرنے کے لئے قدیم نظام ہی کا سہارا لے سکتے تھے ——— راجا ہوں، مگر انصاف پسند اور عوام پسند ہوں، یہ ان کی فکر کی حدیں تھی ——— ان حدوں نے تلسی داس جی کی فکر کے اطراف آہنی دیوار کھڑی کر دی تھی اور اس دیوار کو توڑ دینا تلسی داس جیسے شاعر اور نرم دل انسان کے لئے بہت ہی مشکل کام تھا۔ یہاں سب سے بڑا سوال ان کے فلسفۂ "بھکتی" کا ہے۔ وہ ہندوؤں میں بکھری ہوئی قوم کو بھکتی (فلسفۂ عبادت) کی گھونٹی دے کر بیدار کرنا چاہتے تھے۔ یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا بھکتی انسان کو باعمل بنا سکتی ہے؟ مگر ان کی بھکتی کا فلسفہ فقیروں اور عیش پسندوں کی بھکتی سے مختلف تھا۔ ان کی بھکتی انسان کی آہوں سے لبریز بھکتی تھی جو دوسروں کی مصیبت میں نجات دہندہ کی حیثیت سے کام کیا کرتی تھی۔ رامچندر جی پر اعتقاد رکھتے ہوئے بھی انہوں نے، ان کے پوجنے والوں کو بڑا بتایا ہے ——— بھرت کو رامچندر جی کے مقابلہ میں بڑا بتلایا ہے ——— بھرت کی قربانی کے مقابلے میں رامچندر جی کی قربانی ماند پڑ جاتی ہے۔ بھکتی یا عبادت رجعت پسندی کی اندرونی پیداوار ہے۔ اس لئے کہ وہ دنیا کے کٹھن مسائل سے منہ پھیر کر انسانی خیال کو دوسری طرف لگا دیتی ہے۔ اس نکتہ پر پہنچ کر ہمیں ان کی شاعری کی ایک اور خصوصیت ہاتھ لگتی ہے۔

——— عام لوگوں کی بھگتی اور تلسی داس جی کی بھکتی کا بنیادی فرق یہ ہے کہ تلسی داس جی دنیا کے کٹھن مسائل سے منہ نہیں پھیر لیتے ہیں بلکہ ان مصائب سے باخبر ہو کر ان کو سلجھانے کی کوشش کرتے رہے۔ اس لئے ان کی بھکتی کا رجعت پسند پہلو فنا ہو جاتا ہے اور وہ دنیاوی مسائل کو حل کرنے میں معروف نظر آتے ہیں۔ اس طرح ان کی اخلاقیات بھی بھگتی سے ملی ہوئی ہیں اور ان دونوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر کے دیکھنے کی کوشش کرنا بے سود ہے۔ ان کی اخلاقیات کے اس پہلو نے ایک جگہ شاعر سے یہ بھی کہلوا دیا ہے کہ راون اور رامچندر جی پیٹ کی آگ بجھانے والے فرد ہیں اور جس فلسفۂ بھگتی میں پیٹ کی آگ کو سمندری تپش سے بھی زیادہ بڑی بتلایا ہو وہ سماجی ارتقا کی راہ میں رخنہ نہیں بن سکتی ہے اور یہی چیز ان کے ترقی پسند ہونے کی سب سے بڑی علامت ہے۔

آخر میں ان کی شاعری کی زبان کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں اور یہی ان کی سب سے بڑی ترقی پسندی کی دلیل ہے۔ تلسی داس جی نے سنسکرت زبان و ادب کے عالم ہوتے ہوئے بھی 'برج بھاشا' میں شاعری کی۔ راماین کے لئے انہوں نے 'اودھی' بولی کو اپنا کر عوام کی بول چال کی بھاشا پر اس کی بنیاد رکھی اور سنسکرت کے لفظوں سے بچتے ہوئے انہوں نے اس میں "جھروکے" اور "محراب" جیسے الفاظ استعمال کئے۔ یہ بات اسی وقت ممکن ہو سکتی ہے جب کہ ایسے الفاظ کے استعمال کرنے والے کے دل میں عوام کے لئے جگہ ہو۔ ان کی شاعری کا مقصد عوام کو بیدار کرنا تھا اس لئے انہوں نے عوام کی بھاشا کو اپنایا۔ اس کے علاوہ بھی اگر ہم اس دور کی اَدبی روایات کی چھان بین کریں تو ہمیں تلسی داس جی کی انقلابی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس طرح تلسی داس جی ہندوستان کے لافانی شاعر ہی نہیں بلکہ دورِ وسطیٰ کے نمائندہ شاعر بھی ہیں اور انہوں نے اس عہد کی حقیقتوں کو بیان کر کے انسانی ارتقا کے لئے رہنمائی کا فرض انجام دیا ہے۔

(بقیہ 'غزل قدسی اور تضمین غالب')

اخلاقی جرأت میں ان کے صحیح جانشین تھے۔ انہوں نے کچھ خمسے قاضی محمد عمر کے یہاں سے نقل کر دیئے، کچھ بذریعہ خط و کتابت یا ذاتی تعلقات کی بنا پر حاصل کئے اور باقی کی ایک بڑی تعداد ہفتہ وار 'جریدۂ روزگار' مدراس سے لے کر بغیر کسی حوالے کے درج کتاب کر دی۔ اس بڑی چوری کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۸ اگست ۱۸۸۵ء سے ۱۴ جولائی ۱۸۸۶ء کے پرچوں سے کم از کم بیس خمسے لے کر زیبِ حدیث قدسی حصہ دوئم کئے گئے ہیں۔

۶۔ جریدہ روزگار

پہلے اس اخبار کا مختصر حال سن لیجئے۔ بارہ بڑے صفحوں کا یہ اخبار مدراس سے ۱۸۷۵ء سے نکلنا شروع ہوا تھا۔ مالک سید میر تقی شاہ قادری آفندی تھے۔ ۱۹۰۳ء تک جاری رہا۔ اور اس وقت اس کے مالک سید مرتضیٰ تھے۔ غزل قدسی پر جتنی تضمینیں اس اخبار میں شائع ہوئی ہیں شاید ہی کہیں نہیں ہوئیں۔ چار سال ۱۸۸۵ء، ۱۸۸۶ء، ۱۸۸۸ء اور ۱۸۹۰ء کے پرچوں میں دو سو سے زائد خمسے تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ قیاس غالب ہے کہ خمسوں کا یہ سلسلہ ۱۸۸۵ء سے بہت پہلے شاید ۱۸۸۱ء سے شروع کیا گیا ہوگا اور خمسوں کی مجموعی تعداد پانچ سو کے قریب ہوگی۔ کوئی صاحب حدیث قدسی حصہ سوم بھی تیار کرنا چاہیں تو وہ اس جریدے کی مدد سے باسانی کر سکتے ہیں۔ مگر ان سے میری گذارش ہے کہ وہ 'جریدۂ روزگار' کے حوالے کو نظر انداز نہ کریں اور محمد حسین خاں تحسین مرحوم کو دعائے خیر سے یاد کرنا بھی نہ بھولیں۔

حسن الدین احمد
او۔ایس۔ڈی (اوقاف)، وزارت قانون، شاستری بھون، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۱

لفظ نوردی

بہت سے الفاظ ہیں جن کی تاریخی توجیہ کی جا سکتی ہے، اور وجہ تسمیہ بیان کی جا سکتی ہے۔ الفاظ کے ماخذ پر غور کرنا اور ان کی تشکیل کی تاریخی توجیہ کرنا ایک اہم ضرورت اور بیان کی بڑی خدمت ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد بن عمر "اب وقت آگیا ہے کہ اردو زبان کے ادیب نقاد اور ماہر لسانیات تحقیق و تحلیل اور ناقد و تحمل کے علاوہ اس لیلائے لسانیات کی تلاش میں بھی گامزن ہو جائیں۔"[1]

جب سے انسان نے بول چال شروع کی اپنے ماحول کے مطابق الفاظ وضع کئے۔ ماحول بدل گیا لیکن الفاظ باقی رہے اور سابقہ ماحول کی یاد دلاتے رہے ایک عرصہ بعد یہ بتلانا مشکل ہو گیا کہ کوئی خاص لفظ کب اور کیسے وضع کیا گیا۔ ہر لفظ اپنی تاریخ رکھتا ہے۔ بعض کی تاریخ بتلائی جا سکتی ہے۔ اور اکثر کی نہیں۔ جن الفاظ کی تاریخ بتلائی جا سکتی ہے ان پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان کی تاریخ دراصل انسانی تاریخ سے وابستہ رہی ہے۔ انسانی رسم و رواج اور طریق جنگ وغیرہ نے الفاظ کو جنم دیا۔ رسم و رواج، طور طریق بدل گئے، سماجی پس منظر بدل گیا لیکن الفاظ جو رسم و رواج اور طور طریق کی دین ہیں وہ باقی رہ گئے۔

مخلوقات عالم میں الفاظ عجیب و غریب زندگی رکھتے ہیں۔ بظاہر مثل دوسری بے جان اشیاء کے بے حس معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن جب کوئی شخص اپنے دماغی عمل سے ان میں روح پھونک دیتا ہے تو وہ جاندار اور شاندار بن جاتے ہیں۔[2] یہ ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ یہ پیدا ہوتے ہیں پھلتے پھولتے ہیں اور اپنی شکلیں اور معنی بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی زبان زد خاص و عام ہو جاتے ہیں تو کبھی متروک و مفقود ہو جاتے ہیں۔

لفظ کائنات ادب و علم کے حروف تہجی ہیں۔ یہ جذبات احساسات تصورات کی نمائندگی کرتے ہیں۔[2] یہ دنیا کی بڑی طاقتور چیزوں میں سے ہیں۔ یہ تہذیب کا بہت اہم عنصر ہوتے ہیں۔ الفاظ میں اجتماعی زندگی کی تصویریں، سماج کے تصورات و معتقدات۔ انسانی فطرت اور کائنات کے متعلق سماج کا رویہ یہ سب باتیں جھلکتی ہیں۔ الفاظ گویا اجتماعی تجربات کے ٹکڑے ہیں۔ ان میں سماج کی پوری شخصیت موجود ہوتی ہے۔

ہر لفظ کے پیچھے جو تاریخ ہوتی ہے اس کو جاننے کی کوشش اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ ہم ماضی کی زندگی سے کس حد تک جذباتی تعلق رکھتے ہیں۔ کسی شخص کو جتنے زیادہ الفاظ یاد ہوں گے یا ادیب جتنے زیادہ الفاظ استعمال کرے گا، زندگی کے عوامل اور مظاہر سے اس کا اتنا ہی جذباتی تعلق ظاہر ہوگا۔ ہر لفظ کی تاریخ معلوم کرنا مشکل ہے لیکن بہت سارے الفاظ جن کی تاریخ معلوم کی جا سکتی ہے، یہ کام بہت دلچسپ ہے۔

ماہرین فن لغت میں سید احمد دہلوی مولف "فرہنگ آصفیہ" پہلے شخص ہیں جنہوں نے یہ واضح کیا کہ اکثر الفاظ اپنی تاریخ خود بتلاتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔ "جب آبادی بڑھی . . . . . اور ادھر اُدھر کے گشت کی سوجھی تو ہر ایک جگہ نئی بات نئی نئی چیزیں نئی نئی شکلیں دیکھنے میں آئیں۔ اگر ان کے نام اصلی باشندوں سے ہاتھ لگے تو انہیں اپنی زبان میں بڑھایا ورنہ ان کے نام ان کے اثر یا شناخت یا مشابہت وغیرہ سے تجویز کرکے خاص اپنا کام نکالنے اور اپنے وطن کے لوگوں کو پھر جا کر سمجھانے کی نیت سے چاہا سو رکھ لیا۔ آبادی کی ترقی کے ساتھ زبان کی بھی ترقی ہوتی گئی، جوں جوں زمانہ گزرتا گیا پچھلے الفاظ زبان کے رگڑے کھا کھا کر منجھے صاف ہوتے اور گھل گھل کر سلیس بنتے گئے۔ جس طرح سانپ ہر سال اپنی کینچلی بدل کر نئی نئی پوشاک پہنتا ہے اسی طرح الفاظ بھی خراد پر چڑھ چڑھ کر تراش خراش پاتے اور ڈھانے کا رنگ دکھاتے چلے گئے۔ اگر ذرا توجہ سے دیکھا جائے تو بخوبی ثابت ہو جائے کہ جن الفاظ کو ہم مردہ یا ایک قالب بے جان تصور کر رہے ہیں یہ سب بڑے بڑے واقعات کا مرقع یعنی زندہ تاریخ اور کل انسانوں کے خیالات عمری واقعات دنیوی اور دینی تاریخ، ہر زمانہ کے اخلاق و رواج اور جملہ سرگزشتوں کا ایک بے حد و مجرہ ہیں۔ ہر لفظ بالانفراد اپنے اپنے زمانہ کی تاریخ اپنے ساتھ لئے ہوئے ہے۔ تصنیف میں تو صرف اس کے مصنف کے خیالات کا اظہار

[1] اردو صرف و نحو۔ مرتبہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق۔ جولائی ۱۹۶۷ء صفحہ ۹

[2] کیفیہ از برج موہن دتاتریہ کیفی ۱۹۴۲ء صفحہ ۱۰

ہوتا ہے کہ الفاظ میں جس قدر لوگ از آدم تا ایں دم دنیا پر پیدا ہوئے اور انہوں نے اپنے اپنے موقع پر جو لفظ تراشے سب کا نوٹ موجود ہے بالخصوص جس طرح سکوں کے نام اپنے اپنے ملک کی ابتدائی تاریخ آپ ہی بتا رہے ہیں اسی طرح بہت سی رسمیں، مذہبی تہوار، محاورے، کہاوتیں، ذاتی صفاتی نام، اسمائے مذاہب وغیرہ بھی اپنی اپنی تاریخ اپنے ہاتھوں میں لئے ہوئے ہیں۔[1]

پھر آگے چل کر فرماتے ہیں: "جس طرح پرانی بوسیدہ ہڈیاں...... ہمیں اپنے پرانے حالات اس زمانے کی صنعت اور خیالات وغیرہ سے آگاہ کرتی ہیں۔ اسی طرح پرانے لغت اور الفاظ بھی اپنے اپنے زمانہ کی ایک عمدہ قابل قدر تاریخ سناتے ہیں یعنی ملکی واقعات گزشتہ حالات ان سے معلوم ہوتے ہیں۔ دیس دیس کی رسموں کا پتہ ان سے لگتا ہے ...... ہر زمانے کے ہتھیاروں کا پتہ ان سے چلتا ہے۔ ان ہتھیاروں کی آوازوں کے خاص خاص کام ان سے معلوم ہوتے ہیں......

گویا ایک ایک لفظ صحیح فوٹو یا مرقع عالم ہے اگر گوش شنوا طبع نقاد اور دل شناسا نہ ہو تو اس میں ان کا کیا قصور بقول شخصے

گوش شنوا نہیں اس باغ جہاں میں غافل
ورنہ ہر برگ ہے یاں نغمہ سرائی کرتا[2]

"جس طرح ہوشیار کی نظر میں برگ درختان سبز کا ہر ورق اپنے اندر معرفت کردگار کا دفتر رکھتا ہے اسی طرح الفاظ رسم و رواج اور سابقہ واقعات کی نمائندگی کرتے ہیں ان پر جتنی گہری اور غائر نظر ڈالی جائے اتنے ہی حقائق سامنے آتے ہیں۔ الفاظ غور و فکر کرنے والوں کو اپنی ساری داستان سناتے ہیں۔ ان کی داستان دراصل ان تمام انسانوں اور تمدنوں کی داستان ہوتی ہے، جنہوں نے ان کو استعمال کیا۔"

صاحب فرہنگ آصفیہ نے یہ تسلیم تو فرمایا کہ الفاظ تاریخ کی دین ہیں لیکن اس نوعیت کی تحقیق کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے بھی اپنی مثالوں کو شہروں کے ناموں اور دوسرے اسم ہائے خاص تک محدود رکھا اور اپنے بیان کی تائید میں الفاظ مثال کے طور پر بیان نہیں فرمائے انہوں نے جو حوالے دیئے ہیں اور جو مثالیں بیان کی ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

کناگت دشرادہ کی رسم، بہ بخت نصر دبابل کے ایک ظالم بادشاہ کا نام ہے آئینہ سکندری، نوشیروان، مرغ سلیمان، مرغ عیسیٰ اور نگ [illegible] چھپانا، داؤد خانی گیہوں، اصفہان، قاہرہ، بغداد، ناسک، دہلی، قسطنطنیہ، لدھیانہ، الہ آباد، سلیم گڑھ وغیرہ اس طرح زیادہ تر اسم خاص بطور مثال پیش فرمائے ہیں جن پر الفاظ کی تعریف صادق نہیں آتی۔

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے بھی تسلیم فرمایا ہے کہ الفاظ اپنے اندر سیاسی و معاشرتی روداد رکھتے ہیں۔ اپنی تصنیف کیفیہ میں وہ فرماتے ہیں کہ "لفظ زمانہ کے انقلابوں اور قوم کے سانحوں کی تاریخ کے امانت دار ہیں بہت لفظ ایسے ہیں جو ایک قوم کی سیاسی اخلاقی یا معاشرتی ترقی یا زوال کی روداد اپنے میں لئے ہوئے ہیں۔"[3]

آپ نے صرف چند الفاظ مثال کے طور پر بیان کئے ہیں۔ مثلاً ناؤ، بیڑا، لانچ، نیچ، بندہ جو ہندوستانی زبانوں سے غیر ملکی زبانوں میں منتقل ہوئے۔ لیکن وجہ تسمیہ کی حد تک کیفی صاحب آگے چل کر فرماتے ہیں "ہماری جیسی زبانوں میں بہت تھوڑے نام ایسے ہیں جن کی وجہ تسمیہ تحقیق ہو سکے ہوں گے[4] لیکن یہ درست نہیں ہے ہماری زبان میں بھی کئی الفاظ ایسے ہیں جن کی وجہ تسمیہ بیان کی جا سکتی ہے۔ ان کی تحقیق یقیناً مفید ہے اور اس کو تضیع وقت نہیں کہا جا سکتا جیسا کہ کیفی صاحب نے کہا ہے۔

ڈاکٹر زور نے بسمل کی یوں توضیح کی ہے کہ یہ بسم اللہ کا مخفف ہے جو ذبح کرنے کے وقت کہتے ہیں۔

میں نے اردو زبان کی حد تک یہ کوشش کی ہے کہ ایسے الفاظ کو پیش کیا جائے جن کی وجہ تسمیہ بیان کی جا سکے ہے اور تاریخی توجیہ کی جا سکتی ہے۔ یہ بڑا دلچسپ لیکن دشوار کام ہے۔ بیسیوں کتابوں کے مطالعہ کے بعد ایک کام کا لفظ ہاتھ آتا ہے اور ذخیرہ میں شامل ہونے کے بعد اس کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ مطالعہ کے دوران میں الفاظ فراہم ہوں بعض وقت خود الفاظ سامنے آ کر اپنی تاریخ بیان کرتے ہیں اور خواہش کرتے ہیں کہ ان کا انتخاب کیا جائے۔

لیجئے اردو کے چند الفاظ کی تاریخ یا پس منظر پیش ہے۔ اپنی بیانات کی تائید میں میں کوئی حوالہ دینے سے اس لئے قاصر ہوں کہ یہ تحقیق طبعزاد ہے اور اس کے لئے میں خود ذمہ دار ہوں۔ ہر لفظ کے پس منظر کے متعلق سے میری رائے اس وقت تک درست قرار پانی چاہیئے تاوقتیکہ اس کو غلط قرار نہ دیا جائے۔

---

[1] مقدمہ فرہنگ آصفیہ جلد اول صفحہ [illegible]
[2] مقدمہ فرہنگ آصفیہ جلد اول صفحہ [illegible]
[3] [illegible]

گوتم سدھارتا کو "روشنی" حاصل ہونے کے بعد مہاتما بدھ کہا جانے لگا۔ لیکن مہاتما بدھ کے بعد ان کی تعلیمات کو اہمیت دینے کی بجائے خود ان کی پرستش ہونے لگی۔ مہاتما بدھ کے مجسمے بنائے جانے لگے۔ چنانچہ لفظ 'بت' بدھ سے مشتق ہے۔ بدھ مذہب کو زوال ہوا تو برہمنوں نے بدھ کے ماننے والوں کو حقارت سے دیکھا اور لفظ بدھو بیوقوف کے ہم معنی بن گیا۔ اسی طرح لفظ بھوت بھی بدھ سے نکلا جس میں بدھ مت کی مخالفت کا پہلو ہے۔

ٹوڈرمل نے جو اصلاحات کیں ان میں چار ہزار یکہ سوار خاص رکاب شاہی کے قرار دیئے۔ ان کو احدی کہتے ہیں جو یکہ کا ترجمہ ہے انہیں کوئی کام نہ ہوتا اور بیکار رہتے۔ اس لئے احدی سست کاہل کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔

ٹانک ایک وزن کو کہتے تھے۔ ۹۶ ٹانک کا ایک سیر ہوتا چھٹانک یعنی سیر کا سولہواں حصہ زیادہ استعمال ہوتا تھا اس طرح چھٹانک کا لفظ وجود میں آیا۔

ایران میں ایک قدیم نسل پہلو خود کو دلیر تصور کرتی تھی۔ اس طرح لفظ پہلوان (پہلو = دلیر۔ وان = بان = شخص) وجود میں آیا۔ جنگوں یا مقابلوں میں جو شخص ابتدا کرتا وہ بہادر سمجھا جاتا اس طرح پہل اقدام کے ہم معنی بن گیا۔ اس سے لفظ پہلا 'ابتدائی' کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔

عربوں میں قبلِ اسلام سے یہ رواج تھا کہ کمزور آدمی قوی سے اور چھوٹا قبیلہ بڑے سے مستقل دوستی کر لیا کرتا تھا۔ "موالی" کا لفظ اسلام کے مشاہیر اور علم و فن کے اکابر کے ناموں کے ساتھ لیا جاتا ہے تو ہمیں اس کی یاد دلاتا ہے کہ وہ عرب قبائل کے ایسے ہی غیرِ عرب حلیف اشخاص تھے۔ موالات کے ذریعہ عرب اپنی مفتوح اقوام سے برادری اور برابری کے رشتے جوڑتے اور حاکم و محکوم کے امتیازات کو مٹا دیتے تھے۔ افریقہ میں جہاں اسلام کی تبلیغ عربوں کے ذریعہ ہوئی اس پر کثرت سے عمل کیا گیا۔ لفظ ترک موالات حاکم و محکوم کے امتیاز کو نمایاں کرتے ہوئے موالات کے رواج کی تاریخ اپنے میں لئے ہوئے ہے۔

"بانک" فنِ سپاہ گری میں سے ایک ہے جیسے بنوٹ اور پکیتی بھی کہتے ہیں۔ اسے کٹار نما ٹیڑھی چھریوں سے کھیلتے ہیں۔ بانک کے لغوی معنی ترچھا یا کج کے ہیں اس سے بانکپن ٹیڑھاپن چھیلاپن کے معنوں میں استعمال ہوا۔

افریقہ کے ایک قبیلہ کا نام بربر ہے جو ظالم اور سفاک تصور کیا جاتا تھا اس طرح بربریت کے لفظ نے جنم لیا۔

لفظ بریانی ترکی لفظ ہے اور مرکب ہے "بر" اور "یانی" سے۔ "بر" ترکی زبان میں ایک کو کہتے ہیں اور "یانی" یخنی کو کیونکہ "خ" ساکن ہوتا ہے اس لئے بریانی کے معنی ہوئے ایک گوشتہ۔ اس لئے ایک گوشتہ یا دو گوشتہ بریانی کہنا درست نہیں ہے۔

بساط، مات، چال، شطر، گردش شطرنج کی اصطلاحات ہیں جو عام زبان کا جز بن چکی ہیں اور اُس دور کی یاد دلاتی ہیں جب اس بازی کا رواج عام تھا۔

بھاشا یا بھاکا وہ ہندی بولی ہے جو سنسکرت سے نکلی اور عوام کی بول چال میں استعمال ہونے لگی اس لفظ سے 'بھاکنا' نکلا جس کے معنی بولنا ہیں اس کی بدلی ہوئی شکل 'بکنا' ہے جو بھاکا سے مشتق ہے۔ بھونکنا بھی بھاکا سے مشتق ہے۔ ان دونوں میں حقارت کا پہلو عوام کی بولی ہونے کی وجہ سے ہے۔

پُران ہندوستان کی بہت قدیم مذہبی کتاب ہے جب کسی چیز کے متعلق یہ ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ بہت قدیم ہے تو کہتے ہیں پُرانے زمانے کی ہے۔ یعنی پران کے دَور کی اس طرح لفظ پُرانا وجود میں آیا۔

ہندوستان کے دیہات میں قدیم زمانہ سے پنچایت کا طریقہ رائج ہے۔ ہر مقامی مسئلہ یا نزاع کو گاؤں کے معمّر اور سربرآوردہ اشخاص کی کمیٹی کے سامنے پیش کیا جاتا اور اس کے تصفیہ کو قبول کرنا ضروری سمجھا جاتا تھا لیکن عموماً خود اس کمیٹی کے اراکین باہمی رقابتوں کے باعث کسی مسئلہ کو سلجھانے کی بجائے الجھا دیتے اس طرح اہم اور بنیادی جمہوری ادارہ کے طریقہ کار میں انحطاط کے ساتھ پنچایت کے معنی بدلتے گئے جب ہم یہ کہتے ہیں کہ زیادہ "پنچایت" نہ کرو تو اس کا مفہوم ہوتا ہے غیر ضروری حجت نہ کرو۔ واضح رہے کہ لفظ پنچایت نے موجودہ معنی پنچایت راج کے قیام سے قبل ہی اختیار کر لئے اس لئے معنوں میں اس تبدیلی کی ذمہ داری پنچایت راج کے موجودہ بھرم پر نہیں ڈالی جا سکتی۔

ہندوستان میں قدیم سے علم جیوتش یعنی علم نجوم کا رواج رہا۔ جس میں انسانوں کی زندگی پر ستاروں کے اثرات کا جو چارٹ بنایا جاتا ہے اس کو زائچہ اور اس سے جو نتیجے قائم کئے جاتے ہیں ان کو پوتھی کہا جاتا ہے اس طرح پوتھی کھولنا کسی کی زندگی کے پوشیدہ حالات کو ظاہر کرنے کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔

لفظ پوست کندہ اس زمانہ کی یاد دلاتا ہے جب انسانوں کے

جسم پر نشان لگا دیئے جاتے تھے کہ ان سے فلاں سنگین جرم سرزد ہوا ہے تاکہ ان سے احتیاط برتی جا سکے۔ یہ نشان ناقابلِ تردید ہوتا اس طرح "پوست کندہ" ناقابلِ تردید کے لئے استعمال ہونے لگا۔

"پیسہ والا" مالدار کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور اس زمانہ کی یاد دلاتا ہے جبکہ پیسہ کی قوتِ خرید آج کے روپیہ کی قوتِ خرید کے برابر یا اس سے بھی کچھ زیادہ ہی تھی۔ آج اس شخص کا شمار جس کے پاس پیسے ہوں غریبوں میں ہوتا ہے لیکن پھر بھی "پیسہ والا" مالدار کو کہتے ہیں۔

"ٹنکہ" ایک قدیم سکہ تھا جو ۱۰۰ رتی یا ۸۰ رتی کا ہوتا تھا۔ سنسکرت میں اس کو ٹنک کہتے تھے کیونکہ یہ بہت چھوٹا ہوتا تھا اس لئے بہت چھوٹی چیز کو ٹنکہ کہتے ہیں۔ کوڑی دمڑی۔ ٹولی یہ بھی سکے تھے۔

"چٹھا" اس رجسٹر کو کہتے ہیں جس میں پٹواری روزانہ جو جو رقم جمع ہوتی ہے اس کا اندراج کرتا ہے۔ چٹھا تیار کرنے سے قبل تمام تفصیلات کو فراہم کیا جاتا ہے تاکہ جو اندراجات ضروری ہوں ان کو چٹھے میں درج کیا جا سکے اس خام مواد کو کچا چٹھا کہا جاتا ہے بعد میں کچا چٹھا ایسے واقعات کے لئے جو منظرِ عام پر نہ ہوں استعمال ہونے لگا اور پوست کندہ واقعات کے ہم معنی بن گیا۔

چین کی تہذیب کا شمار دنیا کی قدیم تہذیبوں میں کیا جاتا ہے۔ اہلِ یونان اور اہلِ روما شکر سے ناواقف تھے۔ وہ صرف شہد کی مٹھاس سے واقف تھے۔ گنے کے رس سے گڑ بنانے کا طریقہ ہندوستان میں رائج تھا۔ زرعی پیداوار سے مٹھاس اور کپڑا حاصل کرنا ہندوستان کا امتیاز تصور کیا جاتا تھا۔ گڑ کو صاف کر کے سفید اور شفاف شکر بنانے کا سہرا اہلِ چین کے سر ہے۔ اس لئے شکر کو "چینی" کہتے ہیں۔ اہلِ چین چکنی مٹی کے برتن بناتے اور اس پر خاص قسم کا روغن کرتے۔ یہ برتن چینی کے برتن کہلائے اور اس نام سے مشہور ہوئے خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں کیوں نہ بنائے گئے ہوں۔ اسی طرح چینیوں نے مضبوطی کے خیال سے دھات کے بنے ہوئے برتنوں پر چینی کے کام کی صنعت کو فروغ دیا یہ برتن "تام چینی" کے برتن کہلائے۔ (تام بمعنی تانبہ) چین میں ایک خاص قسم کے پودے کی چھال کو جو خود چین میں بالکل نہیں ہوتی تھی اور جسے عرب تاجر سومالی کے ملک سے لے جاتے تھے بطور گرم مسالہ استعمال کیا جاتا تھا۔ عرب تاجروں نے اسے دار چینی کا نام دیا۔ "دار" کے معنی درخت کے ہیں۔

"بیہودہ" ہودہ کا بگڑا ہوا لفظ ہے۔ ہودہ اس عماری کو کہتے ہیں جو اوپر سے کھلی ہو یہ شائستگی کی علامت سمجھی جاتی ہے اس سے لفظ "بے ہودہ" وجود میں آیا جس کے معنی ہیں ناشائستہ اور غیر مہذب۔

عہدِ وسطیٰ میں پیدلوں کی ڈاک کا یہ انتظام تھا کہ ایک میل میں تین چوکیاں ہرکاروں کی ہوتی تھیں اس چوکی کو دادہ کہتے تھے جنگ کی تیاری کے وقت ہر دادہ کو اطلاع دی جاتی تھی جس سے لفظ "دھاوہ" وجود میں آیا۔

لفظ "دھونس" کو لیجئے اس کے معنی ہیں رعب جمانا، کام نکالنے کے لئے اپنی حیثیت یا طاقت کو حقیقت سے زیادہ باور کرانا جب فرخ مرزا نے جس کا خاندانی لقب دھونس تھا۔ نظام علی خاں (آصف جاہ ثانی)، کے خلاف بغاوت کی تو اپنی طاقت کا نہ صرف بر خود غلط اندازہ لگایا بلکہ مبالغہ سے کام لے کر دوسروں پر بھی ویسا ہی تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی اس کے بعد ان کے خاندانی لقب (دھونس) نے موجودہ معنی حاصل کئے۔

مختلف مشغلوں مثلاً شطرنج۔ پتنگ بازی۔ شکار موسیقی وغیرہ کی سینکڑوں اصطلاحات ہیں اور زبان میں ان کو استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً ڈھیل۔ کھینچ پتنگ بازی کی اصطلاحات ہیں جب کسی کام کو التوا میں ڈالا جاتا ہے تو ڈھیل دینا کہتے ہیں۔ اس طرح جب کسی سے مقابلہ ہو تو کہتے ہیں "کھینچ تان ہو رہی ہے۔"

مصر کے بادشاہوں کا لقب "فرعون" تھا یہ بادشاہ مطلق العنان اور جابر تھے اس طرح لفظ "فرعونیت" وجود میں آیا۔ لفظ "رعونت" بھی اس کی بدلی ہوئی شکل ہے جس کے معنی سرکشی گھمنڈ کے ہیں۔

افریقہ کے قبیلہ بربر کے ذیلی قبیلہ کا نام زنانہ ہے عربوں نے ان کی عادات و اطوار اور طریقہ لباس کو نسوانی قرار دیا اور اس طرح لفظ زنانہ وجود میں آیا۔

لیکن یہ سمجھنا چاہیے کہ عرب مفتوحہ قوموں کو کمتر سمجھتے تھے، ہندی کا لفظ جو عام طور پر حبشیوں کے لئے بولا جاتا ہے یہ بتلاتا ہے کہ مغربوں کے برخلاف عرب حبشیوں کو معزز اور مساوات کا مستحق سمجھتے تھے اور سیدی سے مخاطب کرتے تھے جو بعد میں چل کر سِدی ہو گیا۔

افریقہ کے ریگستان سہارا سے لفظ صحرا وجود میں آیا اور بعد میں ہر ایسے علاقہ کے لئے استعمال ہونے لگا جس میں میلوں انسان کا نام و نشان نہ ہو۔ رفتہ رفتہ جنگل کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہونے لگا یہی وجہ ہے کہ فرہنگ آصفیہ میں صحرا کے متضاد معنی چٹیل میدان جس میں درخت یا گھاس وغیرہ نہ ہو اور جنگل بتلائے گئے ہیں۔

سیتا پھل شری رام چندر جی کی شریکِ حیات کے نام سے موسوم کیا گیا۔ مسلمان دوسرے مذاہب کی مقدس ہستیوں کا بالالتزام احترام کرتے ہیں احترام کا ایک پہلو یہ ہے کہ اپنی مخصوص تہذیب کے زیر اثر

وہ محترم خواتین کا نام عام طور پر استعمال کرنا پسند نہیں کرتے۔ اس لئے انہوں نے سیتا چل کو شریمتی کہا دیکھا آپ نے ایک لفظ ایک نقطۂ نظر کی ترجمانی کر رہا ہے اور اس کے پیچھے تمدن کی تاریخ ہے۔

ہم روز مرہ کی بول چال میں لفظ طرفدار یا طرفداری استعمال کرتے ہیں اور یہ لفظ جانبداری کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ بہمنی اور قطب شاہی دور میں طرف صوبہ کو کہتے تھے طرفدار گویا صوبہ دار کے مماثل ایک عہدہ دار ہوتا تھا۔ مال گذاری تعہداری کے ذریعہ وصول کی جاتی تھی اور طرفدار یا تو تعہداروں کی تائید کر کے حکومت کو نقصان پہنچاتے یا حکومت کی تائید کر کے تعہداروں کو نقصان پہنچاتے تھے اس طرح طرفداری کرنا جانبداری کے ہم معنی ہو گیا۔ طرفدار سے طرفداری ایسے ہی ہے جیسے جمعدار سے جمعداری۔

اسی طرح سے لفظ طرہ بازخاں کو لیجئے، آپ کہیں گے یہ لفظ نہیں بلکہ ایک نام ہے۔ ہاں۔ یہ ایک نام ہی تھا، چنچل گوڑا کے منچلے طرہ بازخاں نے جسے انگریزوں سے نفرت تھی ایک جمعیت لے کر ریذیڈنسی پر حملہ کیا انگریزوں اور نظام کی فوج نے اسے پسپا کیا اس کے بعد سے "طرہ بازخاں" چھوٹا منہ بڑی بات کے مترادف لفظ بن گیا۔ جب ہم کہتے ہیں بڑے آئے طرہ بازخاں تو اس کے پیچھے حیدرآباد کا زائد از ایک سو سال قبل کا ایک اہم واقعہ ہوتا ہے۔

ترکی کے ساحل پر ایک قصبہ کا نام علانیہ ہے، جہاں بلند سنگی فصیل بنی ہوئی ہے جو بہت دور سے نظر آتی ہے۔ جب کوئی چیز واضح طور پر نظر آئے تو کہتے ہیں "علانیہ نظر آ رہی ہے"۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ ویسے ہی کھلم کھلا اور صاف نظر آ رہی ہے جیسے علانیہ کی فصیل۔

عربی میں کھولنے کو "فتح" کہتے ہیں، قدیم زمانہ میں کمزور فریق قلعہ میں بند ہو جاتا تھا اور کامیابی کا دار و مدار قلعہ کے دروازہ کو کھولنے پر تھا اس طرح لفظ فتح کامیابی کا مترادف بن گیا۔

ملک مالی کے امیروں کو "فراری" کہتے ہیں جس کا ذکر ابن بطوطہ نے بھی کیا ہے جب فاتح عرب جاتے تو یہ مور کر بھاگ جاتے "لفظ" فراری اسی کی یاد دلاتا ہے۔

یہودی علماء فریس کہلاتے تھے چونکہ وہ نہایت ہوشیار اور عیار ہوتے تھے اس لئے لفظ فریس "ہوشیار" کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔

افریقہ کے قبیلہ کے ایک گروہ کا نام "کافر" تھا اس قبیلہ کی عادات و خصوصیات کے پیشِ نظر عربی میں ڈھانکنے چھپانے کے لئے لفظ کفر کا استعمال ہوا اسلام نے اس لفظ کو اللہ کے وجود کے انکار کے لئے استعمال کیا۔ یعنی حقیقت کو چھپانا اور یہی معنی اردو میں بھی لئے گئے۔ قرآن میں ہے جب حق آتا ہے تو باطل غائب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ کفر کو بھی ایسی چیز تصور کیا گیا جو دیکھتے دیکھتے غائب ہو جائے گا کافور بھی ایسی چیز ہے جو رکھے رکھے غائب ہو جاتی ہے۔ اس لئے اس کو "کافور" کہا گیا۔

"کوٹ" قلعہ کو کہتے ہیں "کوٹ پال" یا کوٹ وال" قلعہ دار کو کہتے ہیں بعد میں یہ لفظ پولیس افسر کے لئے استعمال کیا جانے لگا۔

"کوکو" ایک شہر کا نام ہے جو دریائے نیل کے کنارے واقع ہے۔ یہاں ایک خاص قسم کے پودے پائے جاتے ہیں ان پودوں سے جو چیز حاصل ہوتی ہے اس کو کوکو کا نام دیا گیا۔

قدیم زمانہ میں گو مذہبی اور قومی ادب کو زبانی یاد رکھا جاتا تھا پھر بھی لوگ روز مرہ کی اکثر باتوں کو گرہوں کی مدد سے یاد رکھتے تھے اس سے بات کو گرہ میں باندھنا محاورہ قرار پایا۔

ترکی میں درہ دانیال کے قریب مرمارا نامی ایک جزیرہ ہے جہاں سفید چمکدار پتھر کی چٹانیں ہیں۔ ان چٹانوں سے گزشتہ تین ہزار سالوں سے پتھر نکالا جا رہا ہے۔ اس خاص قسم کے پتھر کو سنگِ مرمر کہا جاتا ہے خواہ وہ دنیا کے کسی علاقہ کا ہو بالکل ویسے ہی ہے جیسے دکن میں ایک خاص قسم کے لائم اسٹون کو سنگِ سیلو یا شاہ آباد کا پتھر کہتے ہیں خواہ وہ کوڑنگل کی کسی کان ہی سے کیوں نہ نکالا گیا ہو۔

مغل دور میں لفظ "مغلی" برتری اور لائقِ عزت کے مترادف تھا جب مغلوں کے ہاتھوں قطب شاہی حکومت کا خاتمہ ہوا تو لفظ "تانا شاہی" عیش کوشی اور نازک دماغی کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد مغلی کمتری اور حقارت کے طور پر استعمال ہونے لگا۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں انگریزوں کو نقصانات برداشت کرنے پڑے بعد میں انہوں نے کامیابی حاصل کر کے ہولناک مظالم ڈھائے اور جنگِ آزادی میں حصہ لینے والوں سے خوب بدلے لئے۔ یہ جنگ آخری مغل شہنشاہ کے پرچم تلے لڑی گئی تھی تو شاہی خاندان کو بھی سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ خانوادۂ شاہی کو چھپ چھپ کر اپنی جانیں بچانی پڑیں۔ بیگمات اور شہزادیوں کو گھریلو ملازمتیں اختیار کرنی پڑیں۔ شرفاء ان کو ازراہِ ہمدردی انہیں رکھ لیتے اور ان سے ماماؤں اور خادماؤں جیسا کام نہ لیتے بلکہ سینے پرونے اور بچوں کی تربیت وغیرہ کا کام لیتے۔ ان کو "مغلانی" کہا جاتا اس طرح لفظ "مغلانی" وجود میں آیا۔

انگریزی راج میں دفاتر میں نئے طریقے رائج کئے گئے، تاجر

پیشہ ہونے کی وجہ سے جس کھاتہ کو انہوں نے رواج دیا وہ زیادہ واضح اور سہولت بخش تھا اور مغلی کھاتہ از کار رفتہ اور ناقص سمجھا جانے لگا۔ اس طرح لفظ "مغلی کھاتہ" ہر بےسماندگی اور بے ترتیبی کے لئے استعمال ہونے لگا۔

بعض ملکوں میں اونچے مقامات پر آگ جلا کر لوگوں کو خطرے سے آگاہ کیا جاتا تھا۔ قدیم عرب میں یہ قاعدہ تھا کہ رات کو راستہ دکھانے کے لئے اونچے مقام پر آگ روشن کرتے تھے جنہیں "مینار" کہتے یعنی آگ یا نار کی جگہ۔ بعد میں یہ لفظ لائٹ ہاؤس کے لئے استعمال کیا جانے لگا۔ پھر مینار اس اونچی عمارت کو کہنے لگے جہاں سے اذان دی جاتی ہے۔ اس طرح لفظ "مینار" سے قدیم رواج کی یاد وابستہ ہے۔

"میوہ" ترکی لفظ ہے اور اس زمانہ کی یاد دلاتا ہے جب ترکی زبان کے بے شمار الفاظ ہماری زبان میں داخل ہوئے۔ یہی حال لفظ "سماوَر" کا ہے جو روسی زبان کا لفظ ہے لیکن ترکی زبان کے توسط سے ہماری زبان میں آیا۔ روس اور ترکی میں سماور چاء بنانے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

ناچ، کوپ، توال اور ایسے ہی بیسیوں الفاظ یورپی زبانوں سے اردو ادب میں داخل ہوئے۔ وہ اس دور کی یاد دلاتے ہیں جب ہمارے ملک کے مختلف حصے ان کے زیر نگین تھے۔

صاحب فرہنگِ آصفیہ نے حضرت نوح کے نام کی وجہ تسمیہ بیان فرمائی ہے کہ آپ اپنی قوم کی بد افعالی پر بہت رویا کرتے تھے اس سبب سے آپ کا لقب نوح یعنی نوحہ کرنے والا پڑ گیا۔ میں عرض کرتا ہوں کہ نوح بھی ایک نام ہے جیسے کہ دوسرے نام ہیں چونکہ حضرت نوح قوم کی بد اعمالی پر رویا کرتے تھے اس لئے لفظ نوحہ وجود میں آیا جس کے معنی رونے کے ہوئے۔ یہ استدلال لفظ نوحہ کی وجہ تسمیہ بیان کرتا ہے نہ کہ حضرت نوح کے نام کی۔

ریگستان سہارا میں کسی کسی مقام پر پانی اور سبزی کا نشان ملتا ہے اس کو واہ کہتے ہیں۔ تھکے ماندے مسافروں کو ان نخلستانوں کو دیکھنے سے جو خوشی ہوتی ہے اس کیفیت کے لئے لفظ "واہ" وجود میں آیا۔

ہندوستان میں سو سال پہلے مونگ پھلی یا ٹماٹر کو کوئی جانتا ہی نہ تھا۔ پرتگیزیوں نے اپنے دوسرے مقبوضات سے ان ہر دو کو لاکر ہندوستان میں رواج دیا۔ اول الذکر کی ظاہر شکل مونگ کی دال، اور موخر الذکر کی بیگن سے مشابہہ تھی اس لئے ان کو علی الترتیب ولایتی مونگ اور ولایتی بیگن نام دیا گیا۔

صفر کی ایجاد ہندوستان میں ہوئی۔ گنتی کو آسان کرنے کے لئے ۹ عدد تک علیحدہ علیحدہ نشانات قرار دیئے گئے اور اس کے بعد صفر کے ذریعہ لامتناہی تک گنتی کو ضبط تحریر میں لانا ممکن ہو سکا۔ اس طریقہ کے تحت اکائی، دہائی، سینکڑہ میں اعداد لکھے جاتے ہیں۔ اس طرح جو اعداد لکھے جاتے ہیں ان کو "ہندسے" کہا جاتا ہے۔ یعنی ہند کے ہیں۔

اب خود لفظ "ہند" کو دیکھئے۔ سنسکرت میں سندھ دریا کو کہتے ہیں جب آریا لوگ شمال مغرب کی طرف آئے تو انہوں نے پہلے جو سب سے بڑا دریا دیکھا اس کا نام سندھ رکھ دیا۔ فارسی اور سنسکرت کے الفاظ میں ہ اور س کی تبدیلی ہو جاتی ہے اس لئے اہل فارسی اس ملک کو جو دریائے سندھ پار کرنے کے بعد شروع ہوتا ہے "ہند" کہنے لگے جو بعد میں انڈیا ہوا۔

بقیہ غالب کی ایک اردو غزل

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیر بار منت درباں کئے ہوئے

نہ محبوب یا اس کے گھر [illegible] آئے گا، نہ قرب حاصل ہو گا، [illegible] کی [illegible] دوست جمع ہوں گے اس لئے کم از کم اتنا تو ہو کہ سر زیر بار منت درباں کئے ہوئے ہم یار کے در پر پڑے رہیں۔ اس شعر میں کوئی اشارہ نہیں ہے کہ در کے اندر جانے کی کوئی خواہش ہے۔ شوق اور اضطراب ختم ہو چکا ہے اس لئے اب صرف اتنی اجازت مل جائے کہ ہم اس کے در پر پڑے رہیں [illegible] محبوب سے کچھ نہ [illegible] اور [illegible] اگر یہ بھی نہیں ہو سکتا تو

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے

اگر در جاناں [illegible] تو پھر اتنی فرصت تو ملے کہ ہم تصور جاناں کئے بیٹھے رہیں [illegible] غور فرمائیں کہ در پہ پڑے رہنے والا شعر بعد میں اور تصور جاناں والا شعر [illegible] بیان کیا جائے تو صرف اس کے [illegible] بلکہ ساری کیفیت اور [illegible] آجائے گا۔ آخر میں غالب نتیجہ [illegible]۔

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوش اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیہ طوفاں کئے ہوئے

غالب یہ سب فضول باتیں ہیں کیوں
یہ قصے چھیڑتے ہو، کیوں محبوب کی یاد دلاتے

ہو، کیوں عشق کا ذکر کرتے ہو، [illegible] تمام باتوں کو۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم تہیہ طوفاں کریں۔ رونا دھونا کریں۔ دل کا غبار [illegible] کریں۔ اب کچھ ہوتا ہوا تا نہیں ہے اس لئے غالب بہتر یہی ہے کہ تم سارے ذکر [illegible] پرہیز کرو تا کہ یہ طوفان تم [illegible] ختم ہو جائے۔

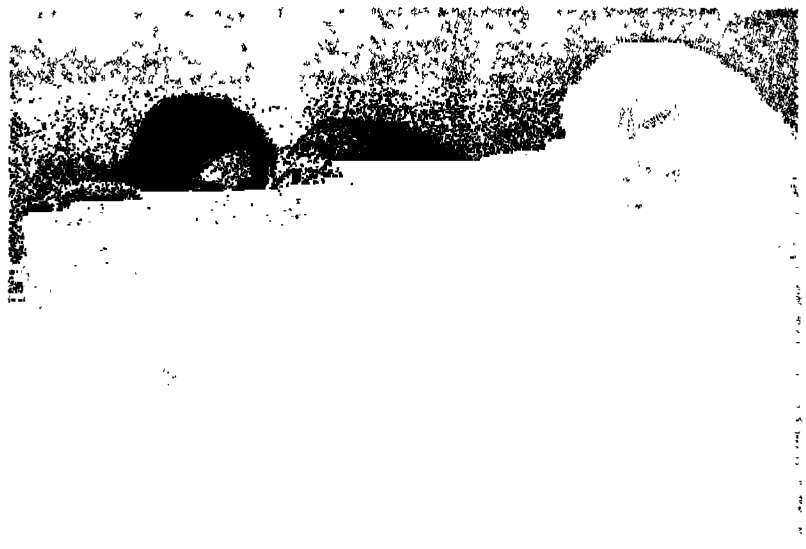
میں نے بہت سی باتیں [illegible] کی طرف سے نظر انداز کر دی ہیں۔ بس ایک مختصر سا جائزہ آپ کے غور و فکر کے لئے [illegible] کیا ہے۔ [illegible] غالب کی کسی بھی [illegible] اس میں آپ کو [illegible] اور [illegible] کیفیت کے [illegible] پہلوؤں کا [illegible] ہو جائے گا۔ [illegible] کا وہ بار بار مطالعہ کریں اور تجزیہ کریں تو اور بہت سے نکات جو [illegible] آپ کے [illegible] آئیں گے [illegible] صورتیں نظر آئیں گی۔

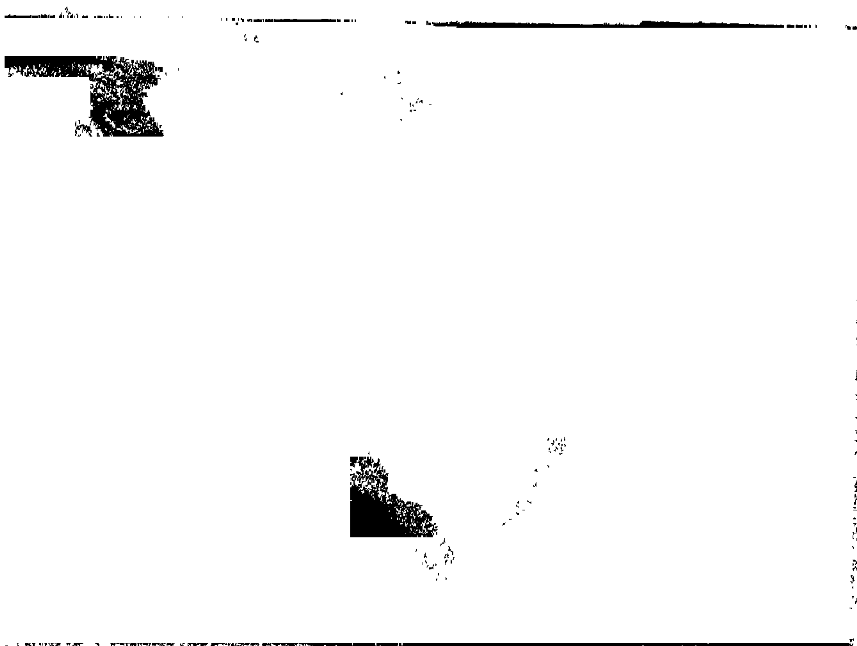
(بہ شکریہ "سب رس" [illegible])


خوراک
ضائع نہ کریں
دوسرے کئی لوگوں کو خوراک کی ضرورت ہے۔
گھروں، پارٹیوں، ہوٹلوں اور کلبوں میں کھانا ضرورت کے مطابق ہی لیجئے۔
بچوں کو بھی یہی سکھائیے۔
اس طرح آپ اپنا پیسہ بچائیں گے
اور ملک کا بھی۔
دانہ دانہ قیمتی ہے
اسے ضائع نہ کریں
davp 73/32

بھارت میں کناڈین فلموں کا جشن

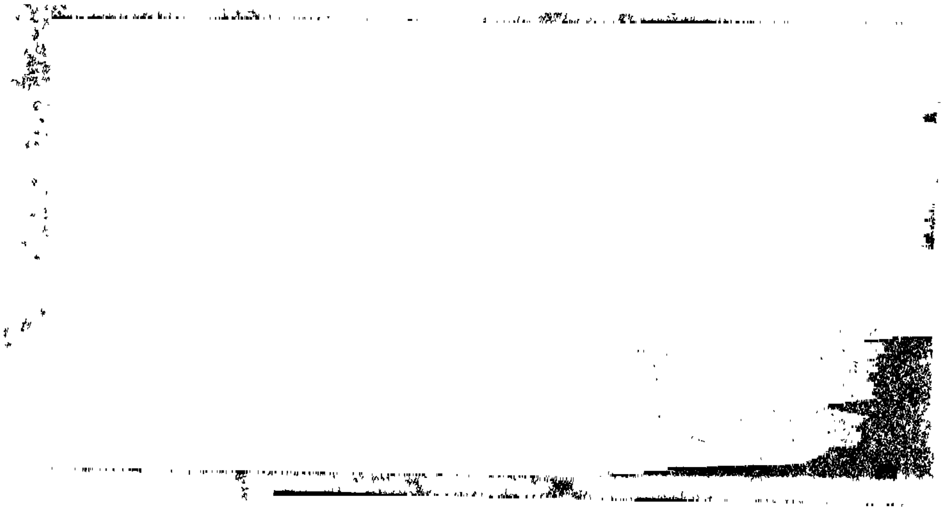
جنوری ۱۹۷۴ کے پہلے ہفتے میں دہلی میں کناڈا میں بننے والی فلموں کا ایک جشن ہوا جس کا افتتاح وزیر اطلاعات و نشریات شری اندر کمار گجرال نے کیا۔ اس تقریب میں شرکت کے لئے کناڈا کے نامور اداکار جیلس کارے اور اداکارہ کیرول لور بھی آئے۔ پالم کے ہوائی اڈے پر ان کا خیر مقدم ہندوستانی طریقے سے ہار پہنا کر کیا گیا۔





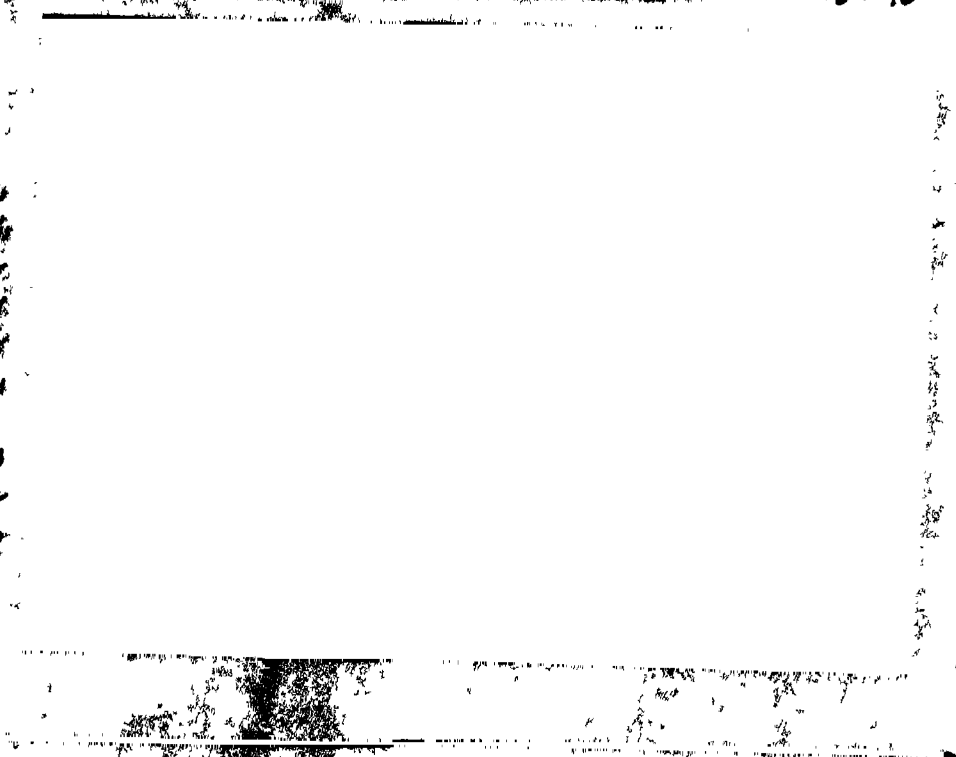
نیوزی لینڈ کے وزیر اعظم گاندھی سمادھی پر

ہز ایکسی لنسی مسٹر نارمن ای کرک، وزیر اعظم نیوزی لینڈ نے دلی میں اپنے حالیہ دورے کے دوران مہاتما گاندھی کی سمادھی پر پھولوں کا ہار چڑھایا اور سمادھی کے احاطے میں یادگار کے طور پر ایک پودا لگایا۔



اتر پردیش شاہراہِ ترقی پر

ملک میں ایٹمی توانائی کا چوتھا بجلی گھر نرورا اتر پردیش میں قائم ہوگا۔ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ۳۱ جنوری ۱۹۷۴ کو بجلی کا ایک ایٹمی ری ایکٹر اقتصادی ترقی سے متعلق ایک کتبے کی نقاب کشائی کی۔ یہ کارخانہ تقریباً ۲۱۰ کروڑ روپے کی لاگت سے تیار ہوگا اور کمشن ہونے پر اس سے ۴۴۰ میگا واٹ بجلی حاصل ہو سکے گی۔



وزیر اعظم نے غازی آباد (اتر پردیش) میں ۷ جنوری ۱۹۷۴ کو بھارت الیکٹرانکس کے دوسرے کارخانے کا افتتاح کیا۔ اس کارخانے میں اعلیٰ قسم کے ریڈار اور دیگر دفاعی آلات تیار ہوں گے۔ تصویر میں وزیر اعظم کو اسی قسم کے ریڈار کا ایک ماڈل دکھایا جا رہا ہے جو اس کارخانے میں تیار ہوگا۔

Vol. 32 No. 7 AJKAL (MONTHLY) FEBRUARY 1974
Published by the Director, Publications Division, Patiala House NEW DELHI-110001
Printed by Indian Printing works, Kasi Jhansi road, NEW DELHI-55

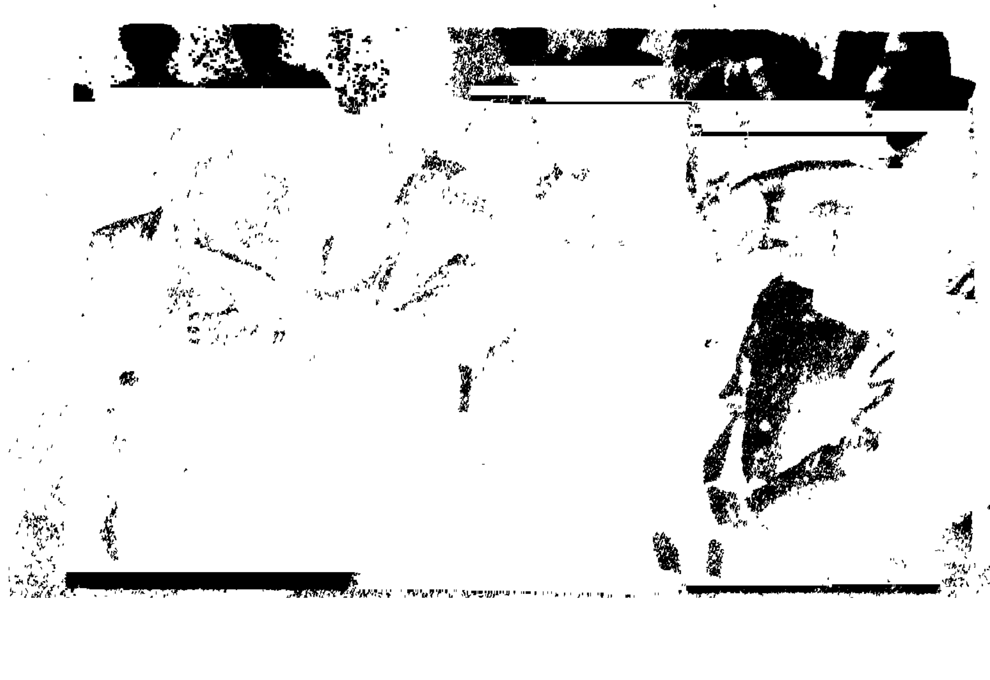




دو پڑوسی ۔ دو دوست

وزیراعظم سری لنکا ہز ایکسی لنسی مسز سری ماوو بندرا نائکے نے اپنے حالیہ دورۂ ہند میں ۲۳ر جنوری ۷۴ء۱۹ء کو راشٹرپتی شری وی وی گری سے ملاقات کی۔

یوگوسلاویہ کی سوشلسٹ فیڈرل ری پبلک کے صدر ہز ایکسی لنسی مسٹر جوزف بروز ٹیٹو مع مادام ٹیٹو ۲۴ر جنوری سنہ ۷۴ء۱۹ء ہند کے چھ روزہ دورے پر نئی دلّی تشریف لائے۔ ہوائی اڈے پر صدرِ جمہوریہ شری وی وی گری نے ان کا گرمجوشی سے خیر مقدم کیا۔



اُردو کا مقبولِ عام مصوّر ماہنامہ

نئی دہلی

آجکل

ایڈیٹر

مہدی عباس حسینی

ٹیلیفون نمبر :- ۳۸۷۰۶۹

سب ایڈیٹر

نند کشور وکرم

جلد (۳۲) شمارہ (۸)

مارچ ۱۹۷۴ء

پھالگن چیت شک سمت ۹۶-۱۸۹۵

سالانہ چندہ

ایک سال :—— ۱۰ روپے

۲ سال :—— ۱۷ روپے

۳ سال :—— ۲۴ روپے

ترتیب

سرورق عمل - برہم دیو شرما

شائع کردہ

ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ

ایڈیٹر "آجکل" (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیلِ زر کا پتہ

بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

نہرو ایوارڈ

ناوابستگی اور پرامن بقائے باہم کے جنم داتا جواہر لال نہرو، صدر ناصر اور مارشل ٹیٹو تھے۔ ان تینوں نے اپنے اپنے ملک میں قومی تحریک کو فروغ دیا اور انھیں بدیسی بڑی طاقتوں کے اقتدار سے نجات دلائی۔ نہرو نے پہلی بار یہ آواز اٹھائی کہ دنیا کے ہر غلام ملک کو آزاد ہونا چاہیئے اور ہر نو آزاد ملک کو یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ وہ بڑی طاقتوں کی گٹ بندیوں سے جس کا لازمی نتیجہ سرد یا گرم جنگ ہوتی ہے، الگ رہ کر امن چین سے اپنی اقتصادی اور سماجی ترقی کے لئے کوشاں رہے۔ یہ نہایت موزوں اور مناسب ہے کہ اس سال بین الاقوامی مفاہمت کا نہرو ایوارڈ یوگوسلاویکی سوشلسٹ فیڈرل ری پبلک کے صدر ہز ایکسی لنسی مسٹر جوزف بروز ٹیٹو کو دیا گیا جو ہماری یوم جمہوریہ کی تقریبات میں بھی شریک ہوئے۔

ہند لنکا تعلقات

نہرو، ناصر، ٹیٹو پالیسی کی کامیابی کا ایک راز یہ بھی تھا کہ ان تینوں میں ذاتی طور پر انتہائی دوستی، یگانگی اور ہم خیالی تھی اور انہیں ایک دوسرے پر مکمل بھروسہ تھا۔ یہی جذبہ ہند اور سری لنکا کے تعلقات میں کارفرما ہے جہاں کی وزیر اعظم ہز ایکسی لنسی مسز بندارا نائکے بھی اس سال جشن جمہوریہ کی تقریبات میں شریک ہوئیں۔ مسز بندارا نائکے کو دنیا کی پہلی خاتون وزیر اعظم بننے کا اعزاز حاصل ہے۔ ان کے دورے کے خاتمے پر جو مشترکہ اعلان شائع ہوا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں ملک بحر ہند کو خطۂ امن بنائے رکھنا چاہتے ہیں۔ دونوں ملکوں کے درمیان اقتصادی تعاون کو فروغ دیا جائے گا۔ لنکا میں رہنے والے ڈیڑھ لاکھ ہندی الاصل باشندوں کے بارے میں جو ۱۹۶۴ء کے بھارت لنکا معاہدے کے تحت نہیں آئے تھے، یہ طے پایا کہ ان میں سے نصف کو لنکا کی شہریت دیدی جائے گی اور بقیہ کو بھارت واپس بلایا جائے گا۔

اعزازات

اس سال یوم جمہوریہ کے مبارک موقع پر صدر جمہوریہ نے جن لوگوں کو پدم وبھوشن، پدم بھوشن اور پدم شری کے اعزازات سے نوازا ہے ان میں شری وی۔ کے۔ آر۔ وی۔ راؤ سابق مرکزی وزیر تعلیم شری خوشونت سنگھ، شری حبیب رحمٰن، چیف آرکیٹکٹ حکومت ہند، شری جے پی نائک مشیر تعلیم اور ڈاکٹر رام کمار کرولی، ماہر امراض قلب سے دلی والے بخوبی واقف ہیں۔ جہاں تک اردو ادیبوں اور صحافیوں کا تعلق ہے جناب کیفی اعظمی، جناب عشرت علی صدیقی مدیر "قومی آواز" لکھنو اور مشہور افسانہ نگار قاضی عبدالستار کو پدم شری سے نوازا گیا ہے۔ یہی اعزاز آندھرا پردیش کی مشہور سماجی کارکن معصومہ بیگم اور ریڈیو کشمیر کی مریم بیگم کو بھی عطا ہوا ہے۔ "آج کل" ان سب خواتین و حضرات کی خدمت میں دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔

"مجمع البحرین"

داراشکوہ (۱۶۱۵ء تا ۱۶۵۹ء) "سفینۃ الاولیاء" "سکینۃ الاولیاء"۔ "رسالۂ حق نما"۔ "شطحیات یا حسنات العارفین" اور "مجمع البحرین" کا مصنف اور "اپانشد یا سرّ اکبر" (اپنشد کے پچاس ابواب کا فارسی ترجمہ) اور "بھگوت گیتا" (فارسی ترجمہ) کا مترجم تھا۔ ان کے علاوہ اس کی فرمائش پر حسب ذیل کتابیں لکھی گئیں: "مکالمۂ داراشکوہ و بابالال"۔ "جوگ وششٹ" (فارسی ترجمہ)۔ "تاریخ شیر خانی" (تلخیص "شاہ نامہ")

مختلف مذاہب کے مطالعے کے بعد دارا اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ حقیقت تک پہنچنے کے اعلیٰ مدارج میں ہندو دھرم اور اسلام میں کوئی بنیادی فرق نہیں اور یہی "مجمع البحرین" کا موضوع ہے لیکن اُسے احساس تھا کہ اس رائے کا واضح اظہار دونوں فرقوں میں غلط فہمی پیدا کر سکتا ہے۔ لہذا اُس نے یہ اعلان کیا "میں نے یہ کتاب (مجمع البحرین) اپنے خاندان کے ارکان کے لئے لکھی ہے اور مجھے دونوں مذاہب کے عوام سے کوئی سروکار نہیں"۔ دارا کی کسی کتاب سے کہیں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اسلام سے منحرف ہوگیا ہو۔ اس نے جو روادارانہ باتیں لکھیں اُن سے کہیں زیادہ روادارانہ باتیں دوسرے صوفیا نے کہیں لیکن اُس کا انجام بھی منصور اور سرمد کا سا ہوا۔ اس کے بھائی اورنگ زیب نے چند علماء سے یہ فتویٰ حاصل کیا کہ وہ ملحد و مرتد ہوگیا تھا اور اُسے قتل کروا دیا۔

"مجمع البحرین" کا انگریزی ترجمہ (مع مقدمہ و حواشی) محمد محفوظ الحق ایم اے لکچرر عربی و فارسی، پریسیڈنسی کالج کلکتہ نے کیا تھا جو فارسی اصل کے ساتھ رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، کلکتہ نے ۱۹۲۹ء میں شائع کیا تھا۔

"آج کل" اس شمارے میں داراشکوہ کے رسالہ "مجمع البحرین" کا پہلا اردو ترجمہ پیش کرتا ہے جو ڈاکٹر محمد عمر، ریڈر، شعبۂ تاریخ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے کیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اب زمانہ اتنا روشن خیال ہو چکا ہے کہ اس ترجمے سے کوئی غلط فہمی نہیں پھیلے گی بلکہ قومی یک جہتی کو فروغ حاصل ہوگا۔

ساغر نظامی
ڈی ۲/۲۵۹ پنڈارہ فلیٹس، ہمایوں روڈ، نئی دہلی

غـــزل

دوستو اور پلاؤ کہ کڑی رات کٹے
مے میں کچھ اور ملاؤ کہ کڑی رات کٹے

جام میں نور ہے، شبنم ہے شفق ہے نہ گداز
سرخ ہونٹوں سے پلاؤ کہ کڑی رات کٹے

آنسوؤں سے یہ کڑی رات نہیں کٹ سکتی
آج مے خانہ لنڈھاؤ کہ کڑی رات کٹے

تشنگی اب مئے کہنہ سے کہیں گھٹتی ہے
اس سے بھی تند پلاؤ کہ کڑی رات کٹے

نغمے بازار میں بکتے ہیں تو کیا غم یارو
نوحے کو نغمہ بناؤ کہ کڑی رات کٹے

میکدوں میں ہے اگر کال مے و مینا کا
انکی آنکھوں کی پلاؤ کہ کڑی رات کٹے

زیست اور موت اساطیر کہن ہیں یارو
نیا افسانہ سناؤ کہ کڑی رات کٹے

روشنی اور بھی کچھ درد بڑھا دیتی ہے
ان ستاروں کو بجھاؤ کہ کڑی رات کٹے

کوئی مشہود ہے اب اور نہ کوئی شاہد
اور اگر ہے تو دکھاؤ کہ کڑی رات کٹے

تمہیں آئین بغاوت ابھی معلوم نہیں
صبح کو لوٹ کے لاؤ کہ کڑی رات کٹے

اپنے پیکر سے میں گھبرا کے نکل آؤں گا
مجھے خود مجھ میں چھپاؤ کہ کڑی رات کٹے

یہ بھی ایمان ہی کا دوسرا رخ ہے لوگو
کفر کو دین بناؤ کہ کڑی رات کٹے

یوں اندھیروں کی چٹانوں میں سماؤ اور پھر
میرے اندر چلی آؤ کہ کڑی رات کٹے

وقت کے دوش پہ یہ رات بہت بھاری ہے
انکے آنچل کو سنگھاؤ کہ کڑی رات کٹے

سنگ دل۔ بے وفا۔ یہ ساکت و جامد چہرے
ان چٹانوں کو ہٹاؤ کہ کڑی رات کٹے

زندگی ہم نے بتائی ہے بڑے ماتم میں
جشن پہ جشن مناؤ کہ کڑی رات کٹے

یہ اندھیرا۔ یہ سمندر، یہ تلاطم آؤ
آؤ اور مجھ میں سماؤ کہ کڑی رات کٹے

جاں نثار اختر
،، پریم آلیہ ۲۴ روڈ، باندرہ بمبئی ۵۰

غزل

وہ ہم سے آج بھی دامن کشاں چلے ہے میاں
کسی پہ زور ہمارا کہاں چلے ہے میاں

جہاں بھی تھک کے کوئی کارواں ٹھہرتا ہے
وہیں سے ایک نیا کارواں چلے ہے میاں

جو ایک سمت گماں ہے تو ایک سمت یقیں
یہ زندگی تو یونہی درمیاں چلے ہے میاں

بدلتے رہتے ہیں بس نام، اور تو کیا ہے
ہزاروں سال سے اک داستاں چلے ہے میاں

یقیں نہیں ہے تو اہلِ یقیں کی بات نہ کر
نظر اٹھائیں تو کوہِ گراں چلے ہے میاں

ہر اک قدم ہے نئی آزمائشوں کا ہجوم
تمام عمر کوئی امتحاں چلے ہے میاں

ہماری آنکھوں میں اک چاندنی اترتی ہے
جہاں بھی تذکرۂ مہ رخاں چلے ہے میاں

وہیں پہ گھومتے رہنا تو کوئی بات نہیں
زمیں چلے ہے تو آگے کہاں چلے ہے میاں

وہ ایک لمحۂ حیرت کہ لفظ ساتھ نہ دیں
"نہیں" چلے ہے، نہ ایسے میں "ہاں" چلے ہے میاں

قرۃ العین حیدر
آشا محل، نوروجی گماڈیا روڈ، بمبئی ۲۶

کارِ جہاں دراز ہے

فصلِ سوم ۔ باب ۳

بیچلرز لاج کی "خاتون"

مشتاق احمد زاہدی داستان جاری رکھتے ہیں۔ "بی اے کے بعد سجاد راجہ اعظم شاہ کے اتالیق مقرر ہو کر ناگپور گئے۔ مگر بعد میں گورنمنٹ نے راجہ صاحب کو علی گڑھ کالج بھیجدیا۔ ایک کوٹھی کرایہ پر لی گئی۔ اس میں دو کمرے قانون کے طلبار کے لئے مخصوص کئے گئے۔ سجاد کی کوشش سے مجھے اور مرحوم انعام الحق کو (جو بعد میں گورنمنٹ آف انڈیا پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے انڈر سکریٹری ہوئے) جگہ ملی۔ ساری کوٹھی ہم تین دوستوں کے قبضے میں آگئی۔ راجہ صاحب بے چارے شاگرد تھے، علیحدہ کونے میں پڑے رہتے۔

"کوٹھی کا نام بیچلرز لاج رکھا گیا۔ ہم تینوں کنوارے تھے اور یہ خیال زیر بحث رہتا تھا کہ دنیا میں ترقی کرنے اور آرام سے رہنے کے لئے متاہل زندگی موزوں نہیں۔

"اس خیال کی حقیقی وجہ یہ تھی کہ ہم لوگوں کو نئی تہذیب بہت بھا گئی تھی۔ مسلمان عورتیں انگریزی تعلیم سے محض نابلد تھیں۔ اُردو لکھنا پڑھنا بھی کسی کسی کو آتا تھا اور مغربی طرز زندگی سے سارے ہندوستان میں سوائے چند خواتین کے کسی کو واسطہ نہ تھا۔ ہم لوگ یہ چاہتے تھے کہ بیچلرز لاج میں جس طرح ہم صاحبانہ زندگی بسر کرتے ہیں ہماری رفیقۂ حیات بھی اس کی اہل ہو اور چونکہ یہ بات ناممکن معلوم ہوتی تھی، اس لئے یہ خیال دل نشین ہو گیا تھا کہ جب تک اس قسم کی بیوی نہ ملے شادی کرنی ہی نہیں چاہیئے۔

"ہم لوگ عورت کی بہت عزت کرتے تھے اور مسلمان ہندی عورت کو تعلیم کے ذریعہ بتدریج معراجِ ترقی تک پہنچانا ہم نے اپنا مقصدِ زندگی قائم کیا تھا۔

"ڈگری لینے کے بعد ہم لوگ تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے۔ قانون کی کلاسیں محض علی گڑھ کالج سے وابستہ رہنے کا ایک بہانہ تھا۔ سوائے نئی دنیا بنانے کے کسی قسم کا فکر نہ تھا۔ کالج کے نئے اور پرانے سربرآوردہ طلبا کو ہر ہفتے کھانے یا چار پر مدعو کیا جاتا۔ قوم کی کوئی مقتدر ہستی کالج کے ملاحظے کے لئے علی گڑھ میں موجود ہوتی ان کے فیضانِ صحبت سے استفادہ حاصل کیا جاتا۔

"تعلیم نسواں، پردہ، مغربی طرزِ معاشرت، احکامِ شریعت، اسلام، بحث کے موضوع ہوا کرتے تھے۔ سجاد ان مباحثوں میں پیش پیش ہوتے۔ جو تجاویز وہ پیش کرتے اس وقت وہ ناقابلِ عمل معلوم ہوتی تھیں مثلاً اُن کا خیال تھا کہ نماز دیسی زبان میں ہوا کرے۔ اور قرآن شریف کا ترجمہ بغیر عربی عبارت کے شائع کیا جائے۔ مسجدوں میں ایسے غسل خانے بنائے جائیں جن میں کوٹ پتلون اور ہیٹ استعمال کرنے والے مسلمانوں کو وضو کرنے میں سہولت ہو۔ اگر جوتوں سمیت نماز پڑھی جائے تو بوٹ پر چڑھانے کے لئے غلاف موجود ہوں۔ اسلامی قانونِ وراثت میں وہ مشترکہ خاندان کے طرز پر تبدیلی چاہتے تھے۔ اُردو قرآن شریف، اُردو نماز اور تقسیم وراثت پر سجاد کے مضامین رسالوں میں شائع ہوئے۔ اُن کے خلاف بہت کچھ لے دے ہوئی۔

"شیخ محمد عبداللہ کے رسالے "خاتون" کے پہلے نمبر میں ہمارے کنوار گڑھ کے ممبر انعام الحق نے حقوقِ نسواں پر ایسا مضمون لکھا کہ جس کی دھوم ہو گئی اور ہم تینوں ہمیشہ اس رسالے میں لکھتے رہے۔"

(زاہدی کا قاعدہ یہاں ختم ہوا۔)

"شیخ محمد عبداللہ ایک کشمیری نوجوان سجاد حیدر سے چند سال سینئر تھے اور سرسید کے منظورِ نظر طالب علم رہ چکے تھے۔ کسی کا سرسید اور بک صاحب پرنسپل کے یہاں مقرب ہونا آسان نہ تھا۔ تاہم عبداللہ اپنی ہوشمندی اور قومی دردمندی کے سبب سے سرسید کے حاضر باش اور بک صاحب کے عزیز شاگرد رہ چکے تھے۔ قانون کی تعلیم کے دوران لائبریرین اور پرنسپل بک کے سکریٹری بھی رہے۔ بانیٔ کالج کے انتقال کے بعد "سرسید میموریل فنڈ" اور "ون روپی فنڈ" کے سکریٹری بنے۔"[1]

شیخ عبداللہ علی گڑھ میں وکالت شروع کر چکے تھے ۔ جب

---

[1] محمد مقتدیٰ خاں شیروانی کے ایک مضمون سے اقتباس

صاحبزادہ آفتاب خاں نے انہیں شادی کی رائے دی، ۱۹۰۲ء میں دلّی کے ایک مغل گھرانے کی تعلیم یافتہ لڑکی وحید جہاں بیگم بنتِ مرزا ابراہیم بیگ سے شادی ہوئی۔ بارات میں نواب محسن الملک، آفتاب احمد خاں، نواب صدر یار جنگ، مولوی حبیب الرحمٰن شیروانی، نواب سر سلطان احمد خاں اور خواجہ عبدالمجید کے والد خواجہ محمد یوسف وغیرہ شامل تھے۔

دلّی میں شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ، حکیم اجمل خاں وغیرہ نے تقریب میں شرکت کی اور شیخ عبداللہ "اعلیٰ بی" کو بیاہ کر علی گڑھ لائے اب خود شیخ صاحب آپ کو قصّہ سنائیں گے[1]

"اس وقت قوم کے بزرگوں میں مولوی سید کرامت حسین پروفیسر قانون علی گڑھ کالج، جسٹس سید امیر علی اور بدرالدین طیب جی اور نوجوانوں سید سجاد حیدر اور اُن کے چند ساتھیوں کے علاوہ تعلیم نسواں کا کوئی حامی نہ تھا۔ سر سید لڑکیوں کی تعلیم کے مخالف تھے۔ ۱۸۹۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا شعبہ تعلیم قائم ہوا تھا مگر اس نے کچھ نہ کیا۔

" ۱۹۰۳ء میں ایڈورڈ ہفتم کے جشن تاجپوشی کے موقع پر آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا، جس کے لئے سر آغا خاں اور علیا حضرت سلطان جہاں بیگم فرمانروائے بھوپال تشریف لائیں۔ ایک شام میں نے دوستوں کو جمع کیا، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، نواب سلطان احمد خاں، سید سجاد حیدر اور دوسرے اولڈ بوائز سے میں نے کہا کہ میں شعبۂ تعلیم نسواں کو زندہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ صاحبوں سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے اس کا سکریٹری مقرر کر دیجئے۔ سب نے بالاتفاق رائے مجھے سکریٹری مقرر کیا۔

" عبداللہ بیگم نے بیبیوں کا جلسہ منعقد کیا۔ اس میں مسز رضاء اللہ (شمس العلماء ذکاء اللہ کی بہو) اور سعید احمد بیگم نے نمایاں حصہ لیا۔ میں نے اخبارات میں تعلیم نسواں پر مضمون لکھنے شروع کئے۔ بیحد مخالفت کی گئی۔

"۱۹۰۴ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ بمبئی پر منعقد ہوا اور پہلی بار عورتوں کو پردے کے پیچھے سے کانفرنس کی تقریریں سننے کا موقع دیا گیا۔ کانفرنس میں طیب جی خاندان کی عطیہ اور زہرا فیضی شریک ہوئیں۔ شمس العلماء مولوی ممتاز علی اور مولوی محبوب عالم اڈیٹر "پیسہ اخبار" بھی موجود تھے۔ میں نے ان سے کہ لاہور میں زنانہ نارمل اسکول جاری کریں مگر انہوں نے لاہور واپس جاکر اطلاع دی کہ اسکول جاری کرنے کا کوئی حامی نہیں۔ اسکے بعد میں نے اور عبداللہ بیگم نے طے کیا کہ علی گڑھ میں مدرسہ قائم کیا جائے۔

" مجھ کو ۲۴ دسمبر ۱۹۰۵ء کو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی شرکت کے لئے لکھنؤ جانا تھا۔ اس وقت تک مدرسہ جاری کرنے کا کوئی انتظام نہیں ہوا۔ میں بہت پریشان تھا لیکن ۲۰ دسمبر کو ڈاک کے ذریعے بھوپال سے ایک سرکاری لفافہ ملا۔ علیا حضرت مرحومہ و مغفورہ عرش آشیانی نے میری ناچیز درخواست کو شرفِ قبولیت بخشا اور مدرسے کے لئے سو روپے ماہوار کی مستقل امداد کا اعلان فرمایا۔ میں عطیہ نامہ لے کر لکھنؤ پہنچا اور مجھے امید تھی کہ نواب محسن الملک ضرور اس سے خوش ہوں گے۔ میں نواب صاحب سے راجہ سر تصدق رسول خاں صاحب مرحوم کی کوٹھی پر جاکر ملا۔ نواب صاحب اس وقت کسی بات پر ناخوش بیٹھے تھے۔ بہت سے احباب ان کے پاس موجود تھے۔ میں نے نواب صاحب مرحوم سے بھوپال کے عطیے اور علی گڑھ میں لڑکیوں کا مدرسہ جاری کرنے کا ذکر کیا۔ نواب صاحب مرحوم نے اپنے غیظ و غضب میں یہ سنتے ہی اپنی ترکی ٹوپی سر سے اُتار کر چبوترے پر پھینک دی اور کہا 'اب میرا علی گڑھ میں رہنا دشوار ہے۔ لوگ یوں ہی کالج کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ اب نہ جانے کیا کہیں گے!' راجہ صاحب نے مجھے سمجھانا شروع کیا 'آپ نوجوانوں کو مناسب نہیں ہے کہ بڈھوں کی مرضی کے خلاف کوئی کام کریں۔ آپ کو پہلے نواب صاحب سے مشورہ کر لینا چاہیئے تھا'، میں بالکل خاموش بیٹھا رہا۔ پھر چبوترے پر سے نواب صاحب کی ٹوپی اٹھا کر لایا اور انکے سامنے میز پر رکھ دی۔ نواب صاحب اسی غصّے کی حالت میں اُٹھ کر گاڑی میں سوار ہونے لگے۔ میں نے ان سے کہا 'گو پُرانے خیال کے لوگ تعلیم نسواں کے خلاف ہیں لیکن جدید نسل کے خیالات کا آپ نے بالکل کوئی لحاظ نہیں کیا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ دل سے تعلیم نسواں کے حامی ہیں'۔ نواب صاحب مسکرانے لگے اور فرمایا 'جو کچھ میں نے کہا وہ بھی ٹھیک تھا اور جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ بھی ٹھیک ہے۔ اپنا کام کئے جاؤ'[2]

"۱۹۰۴ء ہی میں میں نے ارادہ کیا کہ تحریکِ تعلیم نسواں میں جان ڈالنے کے لئے ایک رسالہ جاری کرنا چاہیئے۔ سید سجاد حیدر، سید ابو محمد، احتشام الحق اور انعام الحق نے مجھ سے اتفاق کیا۔ رسالے کا

---

[1] "سوانح عمری عبداللہ بیگم" از شیخ محمد عبداللہ مرحوم۔ طبع ثانی باہتمام و نگرانی محمد مقتدیٰ خاں شیروانی علی گڑھ ۱۹۵۴ء

[2] مدرسۂ نسواں (علی گڑھ) ۱۹۰۶ء میں قائم ہوا۔

نام غالباً سید سجاد حیدر یا خان بہادر ابو محمد نے تجویز کیا کہ "خاتون" ہونا چاہیئے۔ "خاتون" کا پہلا شمارہ جولائی ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا۔" ۱۹۰۵ء ہی میں علی گڑھ میں پہلی زنانہ کانفرنس منعقد ہوئی

میں۔ حامیانِ طبقۂ نسواں کو مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔

"اسی زمانے میں پروفیسر تھیوڈور ماریسن (بعد میں لارڈ ماریسن) پرنسپل ایم اے او کالج کے پاس برطانوی قونصل اور پولیٹیکل ریذیڈنٹ



ایم اے او کالج یونین

کرسیوں پر دائیں سے بائیں - سید سجاد حیدر (وائس پریسیڈنٹ - سٹوڈنٹ یونین) سر تھیوڈور ماریسن - سر طامس آرنلڈ - پچھلی قطار (سٹوڈنٹ یونین) سید نصیر الدین حیدر
شناخت از پروفیسر ہارون خان شیروانی - حیدرآباد - نشستہ - دائیں سے ضیاء الدین خان صاحب - سجاد حیدر - لیمان فنگ - تھیوڈوریک - سید حسن کرکٹ کپتان (۲)
آخری صف - وسط میں بڑی مونچھوں والے - ابوالحسن -

قارئینِ "آج کل" سے گزارش ہے کہ باقی ماندہ حضرات کی شناخت میں مدد فرمائیں۔ (ادارہ)

جس کے بانی شیخ عبداللہ تھے۔ بیچلرز لاج والے زاہدی صاحب فرماتے ہیں: "ہم تینوں نے اسے کامیاب بنانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ یہ کانفرنس ہمارے لئے کئی معنوں میں دلچسپ اور نرالی تھی۔ ہمیں معلوم ہوا کہ ہندوستان میں عطیہ فیضی جیسی ترقی یافتہ خواتین اور آبرو بیگم جیسی مشرقی علم و فضل میں یگانۂ روزگار مستورات موجود

بغداد کے ہاں سے ترجمان کی مانگ آئی۔ بہت سے طلبا نے درخواستیں دیں۔ جن میں سے بعض ایسے تھے جن کا کام روزانہ پرنسپل کو سلام کرنا تھا اور جو عربی کے ایم اے تھے۔ سجاد نے بھی درخواست دی۔ گو سجاد محض بی اے تھے اور پرنسپل ماریسن سے کبھی ملتے بھی نہ تھے مگر ماریسن نے سب سے زیادہ سجاد کی سفارش کی۔ نیز ان کو ترکی بھی آتی

تھی۔ چنانچہ ہم لوگوں کے خیال میں غیر متوقع طور پر ان کا تقرر ہوگیا۔ ان کے بغداد جانے سے بیچلرز لاج کا خاتمہ ہوگیا۔"

باب ۴۔ بابِ عالی

"۲۶ر مارچ [illegible] کو ہم کولار جہاز کے ذریعے کراچی سے روانہ ہوئے۔ ۱۵۔ اپریل کو مسقط پہنچے۔ پہاڑ ہی پہاڑ جن پر درخت کیا سوکھی گھاس کے پتے کا نشان نہیں اور اس پر مسقط کو دعوے سلطانی ہے۔ ۸ر اپریل کو بوشہر۔ دوربین سے شہر کو دیکھا اور کچھ اچھا نہ پایا۔ ۹ر اپریل ۷ بجے صبح۔ سبحان اللہ۔ سبحان اللہ ہم کس خطے میں جا رہے ہیں۔ رات بھر میں کیا طلسم ہوا۔ دو طرفہ خرمے کے درختوں کی مسلسل قطاریں۔ گلاب۔ نارنگی اور انار کے درخت۔ ہمارا سفینہ دجلہ و فرات کے مجموعہ پانی پر چل رہا ہے۔ ایک طرف ساحل ترکی ہے۔ دوسری طرف ایران۔ یہ سرسبز سلسلہ یہاں سے بغداد چار سو میل تک جاری رہے گا۔

"یہ حجاز یا سوڈان[1] کے خرمے کے درخت نہیں کہ چار پانچ ایک جگہ کھڑے ہیں۔ اردگرد سینکڑوں میل تک ریت کا چٹیل میدان۔ یہ عراقین کے نخلستان اور خرمستان ہیں جن کے سایہ میں ہر قسم کے پھل اور پھول موجود ہیں۔

"محمرہ کے بعد بصرہ کے مضافات شروع ہوجاتے ہیں۔ دریا کے کنارے درختوں کے جھنڈ، امرائے بصرہ کے مکانات حسین یہودی، ارمنی اور خال خال ترک عورتیں، لڑکے اور لڑکیاں دوڑ دوڑ کر لب دریا آتے ہیں۔ ہم دوڑ دوڑ کر ڈیک کے کنارے ان کو دیکھنے جاتے ہیں۔ مگر وہ تو ایک دو گھنٹے ہی میں جہاز بصرہ پہنچ گیا اور وہاں سے سرکاری کشتی میں بٹھا کر ہم قرنطینہ پہنچا دیے گئے۔

زنداں کو چلے مچل مچل کر"[2]

اب وجد بارہ سو سال قبل مدینہ، کوفہ اور دمشق سے نکل کر افتاں و خیزاں دجلہ کے کنارے پہنچے تھے۔ کشتیوں میں سوار ہوکر عجم کی راہِ فرار اختیار کی تھی۔ دشتِ لوط کے اس پار ماوراء النہر جیحون کے اس پار داغستان، قراچل[3]۔ جاگیری دور میں مدتِ مدید تک جہاں از گنگ تا سنگ[4] اجداد کا تسلط رہا۔ چھپن[5] سال بعد دلی دروازہ، خونی دروازہ بنا۔ توکول میں وکٹوریہ گیٹ تعمیر ہوا۔ اس کی محراب کے نیچے سے کئی راستے نکلے۔ ان پر چلتے ترکی ٹوپی فراک کوٹ پہنے نئے رہروؤں نے نئی دنیا میں قدم رکھا۔

اجداد کی قدیم دنیا اب برطانوی کولونیل آفس کی نئی اصطلاح "مڈل ایسٹ" اور محمد فاتح اور سلیمان اعظم کی سلطنت۔ لارڈ کرزن کے "ایسٹرن کوئسچین" میں تبدیل ہوچکی تھی۔

دجلہ و فرات وہی ہیں۔ وہی سواحلِ عراقین۔ زوالِ بغداد کو آٹھ سو سال گزر چکے۔ لیکن دیکھو سلطان المعظم کا پرچم ہلالی بندرگاہ پر کس شان سے لہرا رہا ہے۔ برطانوی جہاز پر ضابطے کے مطابق یونین جیک کے ساتھ عثمانی نشان لگا دیا گیا ہے۔ ترک کسٹم افسر جہاز پر آگئے ہیں۔ قرنطینہ کی عمارت میں ٹرپ ٹرپ پھر رہے ہیں۔ بابِ[6] عالی کے حکام۔ بابِ عالی کا نام سن کر ہی پھریری سی آتی ہے۔ جذبات میں تلاطم پیدا ہوتا ہے۔ آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ چوق[7] یشا خلیفۃ المسلمین، چوق یشا دولتِ عثمانیہ۔

لیکن وہ بھی دیکھو جہاز کے ڈیک پر مدقّق برطانوی افسر، سیاح، مشنری سولا ہیٹ اوڑھے، سفید کوٹ پتلون میں ملبوس کہ خلیج فارس میں گرمی شروع ہوگئی ہے۔ کھڑے مونچھوں پر تاؤ دے رہے ہیں۔ جانتے ہیں سارا عالمِ اسلام ان کا ہے۔

اے رودِ دجلہ۔ اے رودِ دجلہ۔

ہندی نوجوان مدرسۃ العلوم علی گڑھ کا گریجویٹ، نیا ادیب، سرخ و سفید رنگ، سیاہ سوٹ، بغیر فریم کی عینک، برطانوی کولونیل معاشرے کا ہونہار سپوت۔ کارپٹ بیگ ہاتھ میں لئے قرنطینہ کی عمارت سے نکل کر بصرے سے روانہ ہو، ہارون الرشید کے شہر میں داخل ہوتا ہے۔ گھوڑا گاڑی سڑک پر سکون سے رواں ہے۔ دونوں طرف نیم یوروپین وضع کے مکانات، اوائل بیسویں صدی کا بغداد۔ ترکی ناولوں کے کردار اکا دکا نظر آجاتے ہیں۔ حکمران طبقے کے یوروپین ترک، نوکیلی شاندار مونچھیں۔ نیلی آنکھیں۔ بابِ عالی کے بانکے افسر۔ ان کی مہ جبین نقاب پوش خاتمین۔ زہرا، حمرا، خالدہ۔

گاڑی برطانوی قونصل خانے کے پھاٹک میں داخل ہوتی ہے۔

صرف سو سال قبل تک عثمانیوں کی شان و شوکت و سطوت و جاہ و جلال کا یہ عالم تھا کہ وہ برطانیہ، فرانس، روس اور دوسرے مغربی ممالک میں اپنے سفیر متعین کرنا کسرِ شان سمجھتے تھے۔

قونصل خانے میں شاہ ایڈورڈ ہفتم اور ملکہ الگزینڈرا کی تصویر کے نیچے خرّانٹ قونصل جنرل بیٹھا ٹیلی فون پر وائٹ ہال سے بات کر رہا ہے۔

---

[1] یلدرم کے ایک مضمون سے اقتباس [2] سلسلہ ہمالیہ [3] روہیلکھنڈ کا شمالی علاقہ [4] امپیریل حکومت ترکیہ کے لئے یوروپین اصطلاح [5] زندہ باد

پھر نووارد نوجوان ہندوستانی ڈریگومین کے ذریعے مغرورعثمانی افسروں سے گفتگو کرتا ہے جو صرف فرینچ یا ترکی بولتے ہیں اور دل میں استہزا سے سوچتے ہیں ۔ ابے سالے تاجرو ہم غازی لوگ خدا کے پراسرار بندے سات سو برس سے جہانبانی اور کشورکشائی میں مصروف ہیں ۔ چھ سو برس ہم نے تم تک چڑھے گوروں کو یورپ میں زیرنگیں رکھا ۔ بحیرہ روم ہمارے لیے محض ایک ننھی جھیل تھی ۔ ہم تم نودولتوں کو بھلا کیا خاطر میں لائیں گے ۔

برطانوی قونصل جنرل ایڈورڈین مونچھوں کے نیچے مسکراتا ہے ۔

مرد بیمار پر عالم نزع طاری ہے مگر میں نہیں جاتی ۔

بغداد کی گلیوں میں درویشوں ، بھکاریوں اور فاقہ کش حمالوں کی ریل پیل ہے ۔ کربلا میں امام حسین اور جناب عباس اور بغداد میں غوث الاعظم کے روضوں میں ہندی اور ایرانی زائرین کا ہجوم ۔ غیور مسلمان محض دعاؤں اور عظمت رفتہ کے خوابوں کے سہارے جی رہا ہے ۔ نئی دنیا اس کی سمجھ میں نہیں آتی ۔ کربلائے معلی ، نجفِ اشرف اور مشہد ، ہر جگہ سے حسب معمول گریہ وزاری کا شور بلند ہو رہا ہے اور بغداد طہران ، قاہرہ کے یوروپین کلبوں میں آرکسٹرا بجتا ہے تو کہنے لگے مستقبل کے علامہ اقبال کہ

ساز عشرت کی صدا مغرب کے ایوانوں میں سن   اور ایراں میں ذرا ماتم کی تیاری بھی دیکھ

ارے صاحب ہم تو جانے کب سے بی بی معصومہؑ کے روضۂ مقدسہ کی ضریح مبارک سے لپٹ کر چیخ رہے ہیں ۔ السلام علیکِ یا بنتِ رسول اللہ ۔ السلام علیکِ یا بی بی یا خواہر امامؑ ۔ یا معصومہؑ فریاد ہے ۔ کوئی فریاد ہی نہیں سنتا ۔ طہران کے کاخِ گلستاں میں خسروِ کجکلاہ مظفر الدین شاہ قاچار جلالۃ الملکۃ والدین کا نازنینوں کی طرف حسب معمول کمال استغراق ہے ، اور صاحب لوگ ، مشنری لوگ ، فوجی ، سویلین اور تاجر پی اینڈ او کے جہازوں پر سوار جبل الطارق اور سوئیز سے گذرتے مراقش سے لے کر افغانستان تک بادیہ نشینوں کے خیمے لوٹنے میں مصروف ہیں ۔ مشرق میں ہر سمت سوا جہالت سوا پسماندگی ، درماندگی غلامی ، ناداری ، تباہی اور کیا نظر آتا ہے ۔ السلام علیکِ یا معصومہؑ یا بنتِ رسول اللہ ۔

چھ سو برس قبل ابن بطوطہ نے رپورٹ کیا تھا کہ کنارِ فرات شہر حلہ میں مسجد کے دروازے پر حریر کا پردہ لگا ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ امام مہدی قائم آلِ محمدؐ اسی مسجد میں داخل ہو کر مستور ہوئے ۔ روز شام کو غروبِ آفتاب کے وقت شیعہ وہاں جمع ہو کر گریہ و بکا کرتے ہیں ۔ اخرج یا صاحب الزماں ۔ اخرج یا قائم المنتظر ۔۔ رات گئے تک روتے چلاتے رہتے ہیں ۔ حریر کا پردہ اسی طرح ساکت رہتا ہے ۔ پھر وہ مایوس ہو کر اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں ۔

مگر آج اے پاشا و ہز ایکسیلینسی ... آغا و سیدو ۔۔ خان بہادرو ۔ آج سارا دارالسلام سرنگوں ہے ۔ سب مل کر پکارو ۔۔ اخرج یا صاحب الزماں ۔ اخرج یا حجت اللہ ، یا قائم المنتظر ۔

خفیہ کارروائیاں ہو رہی ہیں ۔ جگہ جگہ چپکے چپکے میٹنگیں کی جا رہی ہیں ۔ طہران ، استانبول ، قاہرہ ، بغداد کے قہوہ خانوں میں سازشیں ہو رہی ہیں ۔ زمانہ نازک ہے اور دیکھو کل کی بات ہے جب بنی اُمیہ کے خلاف ، بنی عباس کے خلاف ، بنو فاطمہ کے خلاف ، کیا کیا خفیہ میٹنگیں نہ ہوئیں ۔ یہی کوچہ و بازار ، یہی دشت و صحرا ۔ یہی انسان ۔ ان کے اب وجد ۔

آج شاہانِ قاچار اور آلِ عثمان اور خاندانِ رامنوف اور وارولادِ وکٹوریہ کی باری ہے ۔

طہران ، استانبول سینٹ پیٹرز برگ ۔ ماسکو ۔ باکو ۔ لندن پیرس کلکتہ ۔ ہر شہر میں سرپھرے لونڈے خفیہ مسکوٹ کر رہے ہیں ۔ زمانہ خطرناک ہے ۔ مستقبل کی محراب پر حریر کا پردہ اس طرح ساکت ہے ۔ اور نوجوان ایشیا و افریقہ اس کے سامنے کھڑا چلا چلا کر پکار رہا ہے ۔ اخرج یا صاحب الزماں ۔ اخرج یا روحِ انقلاب ۔ ٭

(مسلسل)

تصحیح برائے فصل دوم باب ۴ گومتی

نواب سعد اللہ خاں (عہد شاہجہاں و اورنگ زیب) کے بجائے اُنکے ہمنام نواب سید سعد اللہ (عہدِ اورنگ زیب) خاندان ترمذی نہٹور کے ایک فرد تھے ۔ ان کے متعلق ایک باب آئندہ شائع کیا جائے گا ۔

بقیہ   نئی کتابیں

شعورِ ذات کی ہلکی ہلکی لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے ۔ انکی شاعری کا تیسرا غالب رنگ ، بدن کی خوشبو ، رنگ ، لوچ اور اس کے لمس کی تجرباتی کیفیات کی پیش کش سے بنتا ہے اور کہیں کہیں یہ خاصا شوخ ہو گیا ہے ۔

اشک نے اپنے فکر و احساس کی صورت گری کے لئے نئی لفظیات اور نئی امیجری کی تلاش کی ہے ۔ یہ نئے عناصر اُن کی غزلوں کے مزاج سے بہت ہم آہنگ ہیں لیکن اُن میں تنوع کی کمی ہے اور اُن کا ذخیرۂ الفاظ بھی محدود نظر آتا ہے ۔ استعاروں اور پیکروں کا بیشتر حصہ گرد و پیش کی خارجی حقیقتوں سے ماخوذ ہے اس لئے ان کے اشعار ترسیلی قوت سے پوری طرح بہرہ ور ہیں ۔

(منور سعیدی)

جگن ناتھ آزاد
پریس انفارمیشن بیورو، ریذیڈنسی روڈ، سری نگر (کشمیر)

مرا دُشمن، مرا دوست

(سلام مچھلی شہری کی یاد میں)

وہ خرد مند کہ دیوانہ رہا ساری عمر　　اپنی محفل کا وہ دیوانۂ ہشیار گیا
یارِ جانی کہ جو تھا ہوش میں اک پیکرِ حلم　　اور تھا نشے میں چلتی ہوئی تلوار گیا
ہائے وہ دوست کہ مجموعۂ اضداد تھا ایک　　پیکرِ خلق گیا پیکرِ آزار گیا
کتنے آداب ترے جینے کے یاد آتے ہیں　　خاکِ خاموش گئی شعلۂ گفتار گیا
تجھ سے لینا تھا مجھے کتنے ہی جھگڑوں کا حساب　　اب تو ہوتا ہے گماں جیسے کہیں ہار گیا

عمرِ آزاد! تری جس سے لڑائی میں کٹی
وہ ترا ایک عدو وہ ترا اک یار گیا

نیک تھا، بد تھا کہ اچھا کہ بُرا یار سلام　　آج کے دور میں تجھ ایسے کہاں ملتے ہیں
تیرے دُشنام سے لبریز مرے نام خطوط　　اُن میں بھی عظمتِ آدم کے نشاں ملتے ہیں
جیسے ظلمات کے عالم میں بلندی پہ رواں　　نور برسانے ستاروں کے جہاں ملتے ہیں
پھر مرے دل کو ہے ظالم! اُسی لذت کی تلاش　　تیرے ہر لفظ میں جو تیرِ نہاں ملتے ہیں
تو نے ہم کو نہ کبھی ہم نے تجھے پہچانا　　وہم جس طرح دماغوں میں رواں ملتے ہیں
کیا کوئی جذبہ حسد کا ہے کہ ہے جذبِ خلوص　　جس میں ہوتے ہیں فقط وہم و گماں ملتے ہیں

ہم میں دو رشتے تھے اک قرب کا اک بُعد کا تھا
دورِ کم ظرف میں یہ رشتے کہاں ملتے ہیں

یاد آتی ہے ترا جوشِ رقابت مجھے آج　　کتنی دلچسپ یہ سب بات نظر آتی ہے
اس کو جو بیس برس آج گذرتے ہیں مگر　　رات وہ آج کی ہی رات نظر آتی ہے
درحقیقت وہ سخنوری ہوئی کشمیر کی رات　　محض تصویرِ خیالات نظر آتی ہے
اب بھی وہ پھول کراچی میں شگفتہ ہے سلام　　اب بھی اس پھول میں اک بات نظر آتی ہے
دورہ ختم ہوا آج مگر اب بھی وہ آنکھ　　ایک تصویرِ مدارات نظر آتی ہے

"آ کہ وابستہ ہیں اُس حسن کی یادیں تجھ سے"　　جس سے ہر رات وہی رات نظر آتی ہے

جیت کیسی تھی وہ کیا ہار تھی اب تو پیارے
بازیٔ بزمِ وفا مات نظر آتی ہے

کشورِ ہند کے فن کار یہ سچ ہے کہ نہیں　　تجھ کو عنواں نہ ملا تیرے فسانے کے لئے
جو کھلونے تو نے بنائے تھے ترے پاس مگر　　کوئی تصویر نہ تھی ان میں سجانے کے لئے
تجھ کو وہ لمحۂ نایاب میسر نہ ہوا　　تو نے جس کے لئے الزام زمانے کے لئے
صرف تیرا ہی نہیں ہے یہ ہے میرا بھی خیال　　وقت سازش ہے فقط ہم کو مٹانے کے لئے
ترکِ مے نوشی ہو یا کثرتِ مے نوشی ہو　　مضطرب ہے ملک الموت بہانے کے لئے
ترے انجام کو دیکھا ہے تو پایا ہے ثبوت　　قدردانی ہے یہاں محض دکھانے کے لئے

فقط آماجگۂ تیر و تبر ہے یہ چمن
نہ تو نالے کے لئے ہے نہ ترانے کے لئے

موت فن کار کی اعزاز لئے آتی ہے　　زندگی بے کسیٔ غم کے سوا کچھ بھی نہیں
آشنا موت ہے فن کار کی ہر خواہش سے　　زیست بے چاری پہ یہ بھید کھلا کچھ بھی نہیں
ہم فقیروں کی سمجھ میں نہ کبھی آئی یہ بات　　نام ہے محض ہوا اور ہوا کچھ بھی نہیں
یہ جو توصیفِ سخن ہے یہ جو ہے شعر کی داد　　غور سے دیکھیں تو جھولی میں پڑا کچھ بھی نہیں
خار تلووں کو ملے ہیں کہ نہیں آنکھوں کو پھول　　کیوں تجھے وہم ہے یہ تجھ کو ملا کچھ بھی نہیں
موت جس راز کے ہر نکتے کو پہچان گئی　　زندگی کو ابھی اُس شے کا پتہ کچھ بھی نہیں

موت لائے گی صلہ تیری جگر کاوی کا
زندگی میں ترا فن کا رِ صلہ کچھ بھی نہیں

خواجہ احمد عباس
فلومینا لاج، چرچ روڈ، جوہو، بمبئی

بھارت کے نوجوانوں سے چند سوال

آپ کو یقین آئے یا نہ آئے کبھی ہم بھی جوان تھے (ویسے میں سمجھتا ہوں کہ اُنسٹھ برس کی عمر میں دل میرا اب بھی جوان ہے۔)

کبھی ہم بھی فیشن ایبل کپڑے پہننا پسند کرتے تھے (یہ اور بات ہے کہ اُس زمانے میں چوبیس انچ مُہری کی غرارہ نما پتلونوں کا فیشن تھا، آج کل دس انچ مُہری کی چوڑی دار پتلونوں یا غرارے جیسے بیل باٹمز BALL BOTTOMS کا فیشن ہے۔ اُس زمانے میں لڑکیاں لمبے بال رکھتی تھیں اور لڑکے چھوٹے بال۔ آج کل لڑکیاں چھوٹے بال کترواتی ہیں۔ لڑکے لمبے لمبے بال رکھتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں اگر کوئی داڑھی رکھتا تھا تو سب اُس کا مذاق اُڑاتے تھے۔ آج کل "ہپی" اور "بیٹنکس" کہلانے کے لئے سولہ سترہ سال کے لڑکے داڑھی رکھتے ہیں!)

چوری بلکہ ڈاکہ

کبھی ہم میں بھی جوانی کا جوش تھا، سرکشی کا مادّہ تھا، سماج کے خلاف بغاوت ہم بھی کرتے تھے۔ پولیس والوں سے ٹکر ہم بھی لیتے تھے، ہم بھی چوری کرتے تھے، ڈاکے ڈالتے تھے توڑ پھوڑ کرتے تھے۔

آپ کو یقین آئے یا نہ آئے چوری میں نے بھی کی ہے۔ جی ہاں چوری بلکہ ڈاکہ۔ ہماری یونیورسٹی کے ایک ہال میں بادشاہ اور ملکہ کی بھاری بھرکم قدِ آدم تصویریں لگی تھیں۔ ایک رات کو ایک باتھ روم کا شیشہ توڑ کر ہاتھ ڈال کر چٹخنی کھولی (ٹوٹے ہوئے شیشے سے رگڑ کھا کر جو زخم کھایا تھا اُس کا نشان ہاتھ پر آج بھی ہے) اور چار نوجوانوں نے اندر جا کر ایک کے اوپر ایک چڑھ کر بھاری فریموں میں لگی تصویروں کو اُتارا۔ پھر اُن کو سر پر اُٹھا کر باہر لے گئے۔ ایک اندھے کنوئیں کے پاس تصویروں کے شیشے توڑ کر فریم اور شیشے کے ٹکڑوں کو کنوئیں میں پھینکا، تصویروں کو فریم سے باہر نکالا اُن پر لال پنسل سے "انقلاب زندہ باد" "برطانوی سامراج مُردہ باد" لکھ کر انگریز پرو وائس چانسلر کی کوٹھی کے احاطے کے باہر لگے ہوئے جنگلے کی سلاخوں پر اُن کو لٹکا دیا۔ اپنے خیال میں ان کو پھانسی دیدی! حرکت بیوقوفی کی تھی لیکن جوشِ جوانی کا تھا جس کا اظہار ایسی ہی انقلابی حماقتوں میں ہوتا تھا۔

ابتدا اور انتہا

حکومت اور یونیورسٹی کے قوانین کے خلاف ورزی ہم بھی کرتے تھے۔ بلا ٹکٹ سفر کرنا اپنی شان سمجھتے تھے۔ پولیس والے کہتے تھے اِکّے میں تین سے زیادہ نہ بیٹھیں، ہم چار چار بلکہ پانچ پانچ بیٹھتے تھے بائسکلے تھے۔ پولیس والے کہتے، سائیکل پر ایک آدمی سوار ہو، ہم بیک وقت تین تین سوار ہوتے تھے۔ رات کو سائیکل پر لیمپ ہم نے آج تک لگایا ہی نہیں (بغاوت کا اتنا مادّہ تو نوجوانوں میں ہونا ہی چاہیئے) پولیس، فوج، ریلوے کے افسر، ٹکٹ کلکٹر سب کو ہم انگریزی سامراج کا نمائندہ سمجھتے تھے اور اس لئے اُن کے خلاف بغاوت اپنا قومی فرض سمجھتے تھے۔

جب یونین ہال پر سے کلکٹر اور وائس چانسلر کے حکم سے قومی جھنڈا اُتار دیا گیا اور یونین ہال بند کر دیا گیا تو ہم نے جان پر کھیل کر بندر کی طرح پائپ سے چھت پر چڑھ کر اتنا بڑا ترنگا جھنڈا لگا دیا جو یونیورسٹی کے کونے کونے سے نظر آتا تھا۔ جواہرلال نہرو کی تقریر کرانے کے لئے (جس کی وائس چانسلر نے ممانعت کر دی تھی)، ہم نے یونین ہال کے شیشے توڑ کر دروازے کھول ڈالے اور ان کو اندر لے آئے۔ کوئی ٹوڈی قسم کا لیڈر بھولے بھٹکے تقریر کرنے آ جاتا تھا تو ہم اس سے اوندھے سیدھے سوال کر کے اس کو اتنا پریشان کرتے تھے کہ وہ بیچارہ جان بچا کر بھاگ جانے میں ہی اپنی خیریت سمجھتا۔

یہ سب میں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ آج کے نوجوان (جن سے میں چند سوال کرنا چاہتا ہوں)، یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ یہ کوئی دقیانوسی، پرانے خیال کا "بڈھا" ہے جس میں سماج کے خلاف بغاوت کرنے کا مادّہ نہ ہے، نہ کبھی تھا۔ ایک شاعر کا شعر کسی قدر تبدیلی کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔

سکھایا تھا ہمیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا
جو اس کی انتہا تم ہو تو اس کی ابتدا ہم تھے

اور اس تمہید کے ساتھ اب میں چند سوال کرتا ہوں جن کو پڑھ کر

آج کل کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں چونکیں گے جھپکیں گے۔ بھڑکیں گے مگر پھر بھی (اُمید ہے) اُن کو پڑھیں گے۔ اُن کے بارے میں سوچیں گے۔ اُن کے جواب مجھے یا ایڈیٹر صاحب کو دینے کی بجائے سب نوجوان اپنے من میں اپنے آپ ہی کو جواب دیں تو بہتر ہوگا۔ اُن کے لئے، ہمارے لئے، ہمارے ملک اور قوم اور سماج کے لئے۔

(۱) آپ کا نام ؟ باپ کا نام ؟ (کیا اپنے ماں باپ کا نام نشان بتاتے ہوئے آپ ہچکچاتے ہیں ؟)

(۲) آپ کی عمر (سکول کے سرٹیفکٹ کے حساب سے) ؟ شکل و صورت سے آپ کتنی عمر کے لگتے ہیں ؟ آپ کی اصلی عمر ؟

(۳) آپ دل اور دماغ کے حساب سے اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں ؟

—— جوان ؟ —— نوجوان ؟ —— زندہ دل جوان ؟ —— مردہ دل نوجوان ؟ —— بوڑھا دماغ مگر نوجوان دل —— جوان دماغ مگر بوڑھا دل ؟

(۴) آپ کرتے کیا ہیں ؟

پڑھتے ہیں (اسکول نائٹ سکول، یونیورسٹی یا ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ میں) ؟

کام کرتے ہیں (مل میں، فیکٹری میں، دفتر میں، دکان پر، ریلوے یا فوج میں ؟)

—— بیکار ہیں، کیونکہ کوئی کام نہیں ملا ؟

—— بیکار ہیں، کیونکہ جو کام مل سکتا ہے وہ آپ کی شان کے خلاف ہے ؟ کیونکہ آپ ہاتھ سے کام کرنا نہیں چاہتے ؟

—— بیکار ہیں، کیونکہ آپ کام کرنا چاہتے ہی نہیں ؟

(۵) آپ مذہبی عقیدے سے کیا ہیں ؟

—— کٹّر ہندو ؟ —— پکّے مسلمان ؟ —— چرچ جانے والے عیسائی ؟ گوردوارے جانے والے سکھ ؟ —— اگیاری جانے والے پارسی ؟ —— لا مذہب۔ ناستک ؟ —— انسانیت میں وشواس رکھنے والے انسان ؟

(۶) آپ کی ذات کیا ہے ؟

—— برہمن ؟ —— غیر برہمن ؟ —— ہریجن ؟ —— چھوت ؟ —— اچھوت ؟
—— شیخ ؟ —— سیّد ؟ —— مغل ؟ —— پٹھان ؟ —— انصاری ؟

—— کیا آپ واقعی ذات پات کے ان ڈھکوسلوں کو مانتے ہیں ؟

(۷) آپ کونسا کھیل کھیلنا پسند کرتے ہیں ؟

—— کرکٹ ؟ —— فٹ بال ؟ —— ہاکی ؟ —— ٹینس ؟ —— ہماری وزن اٹھانا ؟ —— پتھر پھینکنا ؟ —— ٹرینیں روکنا ؟ اُن کے شیشے توڑنا ؟ —— راستہ چلتی لڑکیوں کو چھیڑنا ؟ —— سینما گھروں اور کھیل کود کے میدانوں میں بلوا کرنا ؟

(۸) آپ کیا پڑھنا پسند کرتے ہیں ؟

—— کورس کی کتابیں ؟ —— غیر ملکی کلاسیکل لٹریچر ؟ —— اپنی زبان کا بہترین ادب ؟ —— بین الاقوامی سیاست پر کتابیں ؟ —— شاعروں کے دیوان ؟ —— جنسیات سے بھرے افسانے ؟ —— گھٹیا جاسوسی ناول ؟

—— مار دھاڑ اور فحش تصویروں سے بھرے امریکن میگزین ؟ —— بچوں کے کامکس (COMICS) ؟ —— ریس بکس ؟ —— ریلوے ٹائم ٹیبل ؟

(۹) آپ کیا لکھنا پسند کرتے ہیں ؟

—— اپنے ماتا پتا کو خط کہ اور روپیہ بھیجیں ؟

—— اپنے کالج میگزین کے لئے افسانے اور مضمون ؟

—— رومان بھری شاعری اور کویتا جو رات کے سناٹے میں آپ لکھتے ہیں اور حفاظت سے تکیے کے نیچے رکھ کر رومانی سپنے دیکھتے ہوئے آپ سو جاتے ہیں ؟

—— انقلابی نظمیں جو سیاسی جلسوں میں پڑھی جاتی ہیں ؟

—— "انگریزی ہٹاؤ" کے نعرے جو سڑکوں کے کنارے سفید پینٹ سے لکھے جاتے ہیں ؟

—— "ہندی مُردہ باد" کے نعرے جو تارکول سے ریلوے اسٹیشنوں کی دیواروں پر لکھے جاتے ہیں ؟

—— پاخانوں اور موتریوں کی دیواروں پر گندے الفاظ اور گندے کارٹون جو کسی گندی پنسل سے بنائے جاتے ہیں اور کسی گندے دماغ سے نکلتے ہیں ؟

(۱۰) آپ کے خیال میں نوجوان اپنے جوش اور ہمت اور جوانمردی کا ثبوت کس طرح دے سکتے ہیں ؟

—— مہر سین کی طرح سات سمندروں کو تیر کر پار کر کے ؟
—— ٹین سنگھ کی طرح ایورسٹ کی فتح کر کے ؟
—— پیدل یا سائیکل پر دُنیا بھر میں گھوم پھر کے ؟
—— گاؤں میں سڑک بنا کر یا کال اور سوکھا کے علاقے میں کنویں کھود کر ؟
—— ایک سیاسی میٹنگ میں ہنگامہ کھڑا کر کے ؟
—— فلم اسٹاروں کے گرد بھیڑ اکٹھی کر کے۔ بھیڑ میں اُن کے جہاں خصوصی کی ہتک کر کے، چٹکیاں بھر کے۔ ان کی ٹرین پر پتھراؤ کر کے، کانووکیشن میں سے واک آوٹ کر کے اُس کے خلاف نعرے لگا کے ؟

—— بس کنڈکٹروں، رکشا کھینچنے والوں، سینما کے گیٹ کیپروں

(بقیہ صفحہ ۳۱ پر)

کوثر چاندپوری
ہمدرد نرسنگ ہوم، آصف علی روڈ۔ نئی دہلی

رات میں دن!

واشش بے سن کے سامنے کھڑے ہوکر ہاتھ دھوتے وقت نگاہیں بے ارادہ آئینہ پر جم گئیں گہرے سیاہ رنگ کا چہرہ چمک رہا تھا۔ سر پر دودھیا ٹوپی تھی۔ اس کے وسط میں کالی پٹی لگی ہوئی تھی۔ جسم بادلوں میں لپٹا نظر آرہا تھا۔ سفید ٹوپی اور اس سے ملتی جلتی یونیفارم کے درمیان چہرے کی سیاہی اور گہری ہوگئی تھی۔ بالکل اس پٹی کی طرح جو ٹوپی کے بیچ میں لگی ہوئی تھی۔ اسے یہ نظارہ دیکھ کر مایوسی نہیں ہوئی۔ وہ جنم ہی سے اپنی یہی تصویر دیکھتی آئی تھی۔ بس میں ٹوپی اور یونیفارم ہی کا اضافہ ہوا تھا۔ جو احساس پہلے دن اسے دیکھنے کے بعد شعور پر اُبھرا تھا وہ پائیدار ہوچکا تھا۔ مایوسی اور دل شکنی کا کوئی سوال ہی باقی نہ رہا تھا۔ ایک بار یہ بات صاف ہوچکی تھی کہ اس کا شمار ان لڑکیوں میں ہے جو کسی کی نگاہیں جذب نہیں کر سکتیں۔ وہ دن اور رات کے فرق سے واقف تھی۔ یہ بھی جانتی تھی کہ رات کے دھندلکوں سے کبھی دامن نہیں چھوٹ سکے گا۔ اسی لئے وہ مستقبل کے لئے ایسا خاکہ بنا چکی تھی جس میں کوئی شوخ اور دلکش رنگ نہیں تھا۔ بس بے ہنگم سی چند لکیریں ہی تھیں کئی بار دل میں اُمنگ پیدا ہوئی کاش میرا بھی کوئی ساتھی ہوتا جسے اپنا مالک سمجھ کر خوش ہوتی، اس سے ٹوٹ کر محبت کرتی اور اپنے کالے کلوٹے وجود کو اس کے حوالے کرکے ایک ایسی جنت تعمیر کرلیتی جس میں آرام و اطمینان اور مسرتوں کے علاوہ کچھ نہ ہوتا۔ کبھی رخساروں پر آنسو ڈھلکتے تو کسی کے ٹپکتے ہوئے دامن میں جذب ہوجاتے۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ آتی تو کوئی اپنے میٹھے لبوں سے چوس لیتا جب یہ خیالات دل میں آتے آئینہ کا وہ عکس آنکھوں میں گھوم جاتا جو آج تک کبھی بدلا ہی نہ تھا۔ اس کی رات میں ایک مرتبہ بھی آفتاب طلوع نہ ہوا تھا۔ وہ سوچتی یہ سب چیزیں خوبصورت عورتوں کا حصہ ہیں جن کے رخسار گل و لالہ کی پتیوں پر طنز کیا کرتے ہیں اور آنکھیں نرگس شہلا کے حسن کا جواب دیا کرتی ہیں۔ اس نے ہزار بار آئینہ دیکھا اور ہمیشہ یہی طے کیا کہ اسے اپنی آرزوؤں کا گلا گھونٹ دینا چاہیے مکڑی کی طرح جالوں میں اُلجھنے سے کوئی فائدہ نہیں اس نے آپ ہی امنگوں کے آبگینہ کو مایوسی کی چٹان پر پٹک کر چکنا چور کردیا تھا ایسا کرنے سے رنج نہیں ہوا تھا ایک طرح کا سکون مل گیا تھا جس کو وہ دائمی سمجھ رہی تھی دنیا میں نت نئی تبدیلیاں آرہی تھیں ہر گوشہ میں ترقی کی روشنی پھیل رہی تھی مگر اس کی تصویر کے نقوش وہی تھے ان میں کوئی تغیر نہیں ہوا تھا۔ اس نے اپنی بدقسمتی پر بچھتانا چھوڑ دیا تھا اور وقت کے مقابلہ میں شکست تسلیم کرلی تھی۔ وہ فیصلہ کرچکی تھی کہ ساتھی کی تلاش کے جذبہ کو کبھی اپنے اندر سر نہ ابھارنے دے گی۔ زندگی کے دشوار اور لمبے راستے پر تن تنہا چلتی رہے گی۔ یہی سمجھ کر کہ اس کی کوئی منزل نہیں ہے۔ صدا بھٹکتے رہنا ہی مقدر بن چکا ہے، ایک ایک قدم چلتی وہ عمر کی تیس سیڑھیاں طے کرچکی تھی۔ اب کسی کی رفاقت کا تصور ہی نہ آتا تھا۔ تصورات کی ساری کلیاں مرجھا گئی تھیں۔ اس وقت اس نے واش بے سن کے اوپر لگا ہوا آئینہ دیکھا تو کالے ہونٹوں کے نیچے چھوٹے مہاسوں کی بے آب لڑی دیکھ کر حیرت نہیں ہوئی۔ یہی سب کچھ وہی تھا جسے چھٹ پن سے ہی دیکھتی آئی تھی۔ نقش و نگار میں بال برابر فرق نہ آیا تھا۔ ہاتھ دھوکر باہر نکلی۔ ایک نوجوان آستین چڑھائے کرسی پر بیٹھا تھا۔ بارہ بجے تک اُسے اُن لوگوں کا بلڈ پریشر چیک کرنا تھا جو ڈاکٹر ارجن ایم ٹی کے کلینک میں صحت و تندرستی کے پھول چننے آتے تھے۔ یہاں پانچ سال سے وہ نوکری کررہی تھی۔ اس نے غور سے نوجوان کو دیکھا۔ آنکھوں میں کچھ ڈھونڈا، غالباً وہ نفرت و حقارت کے اس انداز کو تلاش کررہی تھی جو ماڈرن قسم کے اکثر لڑکوں کی آنکھوں میں اُسے دیکھ کر رقص کرنے لگتا تھا، وہ اپنی کالی کلائیوں پر سیاہ اُنگلیوں کا لمس محسوس کرکے ٹوہ کرتے تھے کہیں اُن پہ کالے دھبے نہ پڑ جائیں ایسے ہی ایک مریض کا یہ جملہ کانوں میں گونج اٹھتا جو اس نے اپنے دوست کی جانب بلند آواز سے ادا کیا تھا۔ "یار اس ہسپتال میں ایک نرس بھی تو ڈھنگ کی نہیں" جب اس نے نوجوان کی چوڑی اور گوری چٹی پیشانی پر

اُبھری ہوئی ان لکیروں کو دیکھا جو نہ جانے کیوں اسے اچھی معلوم ہو رہی تھیں۔ یہ جان کر بھی کہ ان میں نفرت کے علاوہ کچھ اور نہ ہوگا۔ اس کے بھرے ہوئے سرخ و سفید گالوں میں بڑی دلکشی تھی۔ ان میں تازہ خون جھلک رہا تھا۔ جلدی سے اس نے ذہن کو جھٹک کر اپنے آپ سے کہا:-

"ہوش میں آؤ مس روز۔ تم اس کلینک میں سب نرسوں سے زیادہ بدصورت ہو، تمہیں کسی کو شوق کی نگاہوں سے دیکھنے کا حق نہیں۔" خوبصورتی کے شیشے میں کچھ نظروں کی چوٹ ہی سے بال آجاتا ہے۔

... اپنا کام کرو مس روز۔ کام ہی کی تنخواہ ملتی ہے۔ وہ نرسیں اور ہوتی ہیں جو حسن کا معاوضہ پایا کرتی ہیں۔"

مس روز نے جلدی سے بی پی آپریٹس کا ڈبہ کھول کر نوجوان کے بازو پر ربر لپیٹ دی۔ نیلگوں رگوں کا جال اس کے گورے چٹے بازو پر نمایاں تھا۔ اس میں خون کی جگہ رعنائی خوبصورتی اور پاکیزگی دوڑ رہی تھی۔ مس روز پل بھر کے لئے کھوسی گئی۔ پھر جلدی اپنے آپ کو سنبھال کر چٹ اس کے حوالے کردی جس پر ایک سو تیس بٹا اسّی لکھا ہوا تھا۔

"نارمل ہے!" وہ خوشی سے اچھل پڑا اوپر دیکھا تو اُسے مس روز کی پتلیوں پر خاص قسم کی چمک دکھائی دی، ایسی چمک جو اب تک کسی دوشیزہ کی پتلیوں میں نظر نہ آئی تھی۔ وہ سیکڑوں زرد، نیلی، نارنجی اور کالی پتلیاں دیکھ چکا تھا۔ یہ چمک بالکل نئی تھی، اُسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔

"دستخط کر دیئے آپ نے؟" اس نے سوال کیا

"جی ہاں کر دیئے۔" مس روز گھٹی ہوئی پست آواز میں بولی۔

"کیا نام ہے، پڑھا نہیں جاتا۔"

"مس روز۔"

"ساؤتھ انڈیا کی معلوم ہوتی ہیں آپ۔"

اس کی بات میں طنز کی چبھن محسوس کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"نہیں، بہار اشٹر کی۔"

وہ مسکرایا، مس روز کے لمبے اور سیدھے قد کو نیچے سے اوپر تک دیکھا اور ڈاکٹر ارجن کے روم میں جانے کے لئے باری کا انتظار کرنے لگا۔

مس روز بولی:

"آپ کا نام رپورٹ پہ نہیں لکھا۔ میں پوچھنا بھول گئی۔"

"لکھئے، مراد نفیس۔"

مس روز نے قلم کو خفیف سا جھٹکا دیا اور بہت سنبھال کر لکھا۔

"مراد نفیس!"

اس کے ہاتھ میں ہلکی سی کپکپی تھی۔ رنگ کے دھندلکوں میں شفق کی سرخی جھلک رہی تھی، اُسے یوں لگا جیسے بہت ہی حسین خواب دیکھ لیا ہو۔ کسی خواب کی تعبیر کبھی اُسے نہیں ملی تھی۔ یہ سپنا بھی آن کی آن میں ہوا کے تیز جھونکے کی مانند خلا میں بکھر گیا۔

دسویں دن وہ میز پر بی پی آپریٹس رکھے بیٹھی تھی۔ دل کے کئی بوڑھے مریضوں کا بلڈ پریشر چیک کر چکی تھی، سب کے بازوؤں پر سوکھی اور خالی کھوکھلی سی رگیں اُبھری ہوئی تھیں، اُن میں صرف بڑھاپے کی افسردگی دم توڑ رہی تھی۔ دس بج چکے تھے۔ بظاہر اُسے کسی کا انتظار نہیں تھا۔ پھر بھی آنکھوں میں انجانا سا تجسس تھا۔ وہ اس طرح بھٹک رہی تھیں جیسے تتلیاں پھولوں کی تلاش میں اِدھر اُدھر اُڑتی پھرا کرتی ہیں۔ گیارہ بجنے سے قبل ہی مراد نفیس پھر آیا اور آستین چڑھاتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"مس روز دیکھئے، سر کچھ بھاری بھاری معلوم ہو رہا ہے۔"

"اب تک جو لوگ آئے ان کی جیبیں بھاری تھیں سر ہلکا تھا۔ غنیمت ہے کہ آپ کا سر بھاری ہے"

"میری جیب کبھی سر سے بھاری نہیں ہوتی۔" وہ ہنس کر بولا۔

مراد نفیس کے بازو پر نیلی رگوں کا جال یوں نظر آ رہا تھا جیسے مصور نے کوئی خوبصورت خاکہ ادھورا چھوڑ دیا ہے۔ اس کا موقلم کسی تصویر کے نقوش واضح نہیں کر سکا ہے۔

مس روز نے ربر لپیٹ کر پمپ کرنا شروع کیا۔ کانوں میں آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ دل کی تڑپ غائب ہو گئی تو مٹھی کا دباؤ ہلکا کر دیا اور خوشی کے لہجہ میں بولی:

"نہ جانے آپ کس وہم میں مبتلا ہیں۔ بلڈ پریشر نارمل ہے۔"

"نارمل! تعجب ہے۔"

"کیا نیند نہیں آتی؟"

"پلپی ٹیشن ہوتا ہے۔" "صرف دو گھنٹے سوتا ہوں۔"

"کچھ سوچتے ہیں؟"

"کچھ نہیں، بہت کچھ"

"کیا؟"

"میں خود نہیں جانتا کیا سوچا کرتا ہوں۔"

کہانیوں کے پلاٹ بُنا کرتے ہیں؟"

"نہیں۔"

"کویتائیں بناتے ہیں۔"

"نہیں بس جاگتا ہوں اور سوچتا ہوں، یوں ہی بے مقصد، یہی بیماری ہے۔"

اب مس روز واش بیسن پہ جاتی ہے تو منہ نہیں دیکھتی، ڈر لگتا ہے کہیں آرزوؤں کا رنگ محل چکنا چور نہ ہو جائے۔ رنگ محل جو اینٹ گارے کے بغیر ہی چند لمحوں میں تیار ہو گیا تھا، جس کی کوئی بنیاد نہیں تھی، مراد نفیس کا خیال اکثر دماغ میں آگھستا، ایک ہوائی قلعہ بنتا اور بگڑ جاتا۔ اسے اپنے وجود سے گھن آنے لگتی، وہ سوچتی قدرت بڑی ستم ظریف ہے، دنیا بھر کی سیاہی اس نے میرے ہی وجود میں گھول دی، سمندر میں قطرے گرا کرتے ہیں اس نے سارا سمندر ایک قطرے میں انڈیل دیا۔ دفعتاً اسے اپنے کالے ہونٹوں پر پیار آ جاتا۔ ان کی سیاہی میں بہت سے جگنو چمکتے نظر آتے، چراغ سے جھلملانے لگتے، وہ اس دورنگی کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتی لیکن پہنچ نہ سکتی — کام کے دوران میں بھی اسی ادھیڑ بن میں لگی رہتی، صبح سویرے ہی نہا دھو کر بال درست کر کے سر پہ ٹوپی رکھتی، یونیفارم پہنتی اور ٹھیک وقت پر کلینک پہنچ جاتی، پانچ برس سے یہی یکسانیت قسمت بن چکی تھی۔ اس میں کوئی رنگ، مہک اور تبدیلی نہ تھی۔ بعض اوقات وہ بُری طرح اُکتا جاتی۔ جی چاہتا یونیفارم اتار کر پھینک دے اور پلاسٹک سرجن سے کہے میرے اوپر لپٹی ہوئی اس رات کو کھرچ کر پھینک دو، اُسے دن بنا دو ورنہ میں یہ ملازمت چھوڑ کر اسکول میں چپراسن بن جاؤں گی یا کھلائی بن کر بچوں کا پالنا ہلایا کروں گی۔ ان کی معصوم مسکراہٹوں میں ڈوب جانے کی مجھے بڑی آرزو ہے، جی چاہتا ہے کوئی کالا کلوٹا بچہ گود میں اور میں مہاراشٹر کی طرح اس سے محبت کروں، سارا وقت اسکے سجانے اور سنوارنے ہی میں صرف ہو۔ ہر لمحہ اسکے نازک اور میٹھے ہونٹوں کا رس چوستی رہا کروں، اسکے چھوٹے چھوٹے کپڑے سرف اور صابون لگا کر دھویا کروں، بلڈ پریشر چیک کرتے کرتے تو اُوب گئی ہوں، گورے چٹے بچوں کا اسے خیال تک نہ آتا تھا۔ اُس رنگ سے وہ ڈرنے لگی تھی یہی اسکی آرزوؤں کا قاتل تھا۔ کاش چٹا رنگ دنیا میں باقی نہ رہتا، ہر طرف کالے چہرے دکھائی دیتے، وہ سپنوں میں بھی ایسے ہی بچے دیکھتی جو حبشیوں کی نسل کے ہوتے، موٹے ہونٹ، کالے رخسار اور گہرے سیاہ رنگ کے بال۔ یہی اس کے اپنے دیس کی خوبصورتی تھی۔ ایک روز مراد آیا، اُس دن ڈاکٹر ارجن کا آف تھا۔ اس کی جگہ جونیئر ڈاکٹر کام کر رہا تھا۔ مس روز اپنی کرسی پر سمٹی بیٹھی اپنے فرائض ادا کر رہی تھی۔ وہ ہر شخص کی کلائی پر رگوں کا وہی جال ٹٹولتی جو مراد کے بازو پر نظر آ رہا تھا۔ مراد کرسی پہ بیٹھ گیا۔ آستین نہیں چڑھائی۔ مس روز کی آنکھوں میں اسی کرن کی جستجو کرتا رہا جو اندھیری پر غالب آنے کی کوشش میں ہر مرتبہ ناکام ہو جاتی تھی۔

"آئیے بلڈ پریشر چیک کروں آپ کا۔"

"نہیں اب اس کی ضرورت نہیں۔"

"کیوں؟"

"نیند آنے لگی ہے۔ نو بجے سے صبح کے سات بجے تک سوتا ہوں کوئی سپنا تک نہیں دیکھتا، زندگی عمر بھر کے سپنوں کی تعبیر میں ڈھل گئی ہے۔"

"کس کو دکھا رہے ہیں آجکل، اپنے فیملی ڈاکٹر کو۔"

"میں آپ ہی دیکھ رہا ہوں اپنے آپ کو۔"

"ڈاکٹر ہیں آپ؟"

"نفسیات کا ماہر ہوں، جانتا ہوں شعور اور لاشعور میں کن مسائل پر جھگڑا ہو رہا ہے۔"

"میرے متعلق کچھ بتا سکیں گے؟"

"آپکی نفسیات بہت گہرائی تک پڑھ چکا ہوں، بڑی دلچسپ کتاب ہیں آپ"

"سچ، بتائیے جلدی سے میں کیا ہوں۔"

"ابھی نہیں، شام کو، جوہو کی نمناک ریت پر سمندر کی نمکین ہواؤں میں آئیے آج، مگر یونیفارم میں نہیں سادہ لباس میں، یونیفارم آپ کے اندر چھپی ہوئی عورت پر شرم کا احساس بن کر چھا جاتی ہے۔"

مس روز جوہو پر پہنچی، مراد نفیس وہاں ٹہل رہا تھا۔ انداز خرام میں اضطراب اور کرب بھرا ہوا تھا۔

"آگئیں آپ!"

"کیا نہیں آنا چاہیے تھا مجھے؟"

"کیوں نہیں، میں بڑی بے چینی سے منتظر تھا آپ کا"

"کیوں؟"

"صرف اس لئے کہ لطف آ رہا تھا انتظار میں، وائن سے زیادہ تحریک کی طاقت ہوتی ہے۔"

"طنز کر رہے ہیں آپ، — کیا پتہ نہیں میرا وجود ہی ایک مستقل طنز ہے قدرت کا۔"

"بالکل نہیں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا، کل میں مجھے آپ کی ایک چیز بہت پسند ہے۔"

"میرے اندر کوئی ایسی چیز نہیں۔ اس بات کو میں خوب جانتی ہوں۔ میں کسی کے فریب میں نہیں آسکتی۔"

"مجھے اس چمک سے عشق ہے جو آپ کی پتلیوں پر ہر وقت رقص کرتی رہتی ہے۔ اس کی بنیاد احساسِ کمتری پر ہے میں اس احساس میں تبدیلی لانا چاہتا ہوں۔"

مس روز مسکرانے لگی اور یہ دل فریب مسکراہٹ آہستہ آہستہ ابدی بن گئی۔

حرمت الاکرام
رام باغ ۔ مرزاپور ۔ (اُتر پردیش)

وقت

وقت کا عرفان کس کو ہو سکا!
وقت کتنوں کی انا ہے
وقت کتنوں کا خدا

○

چہروں کی پہچان

آہٹ اُبھری
پگڈنڈی الفاظ کی گونجی
گھر میں ڈوبے چہرے بولے
صبح ہوئی
ہم کو پہچانو

○

ساتھ چلوں گا

دستک دے کے لوٹ نہ جانا
ٹھہرو ٹھہرو
آتا ہوں میں
پاگل لمحو!
میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا
ورنہ کہیں تم بھول نہ جاؤ
راہ ابد کی

○

اندھی محبوبہ

آگ کی بیٹی رقص کُناں ہے
گھنگھرو باندھے اونچی اونچی نیلی نیلی موجوں کا
آنکھوں سے محروم ہے لیکن باہیں کھولے
ڈھونڈ رہی ہے جانے کس کو؟

کون ہے اس کا چاہنے والا
شاید آدم!

○

آنکھیں ہی آنکھیں

جبیں خم کئے کیوں کھڑا ہے؟
کسے چاند کی آنکھ سے تک رہا ہے؟
(زمیں پر خدا ہے!)
نہ یہ آنکھ بھی نور کھو بیٹھے سورج کی مانند!
لیکن کسی کو کہاں یہ خبر
تیرے سینے کا ہر داغ اک جاگتی آنکھ ہے

○

رام پرکاش راہی
سی ۱۷۰ قدوائی نگر ۔ نئی دہلی

غزل

دلِ ناداں اندھیرے میں اُجالے ڈھونڈتا ہے
زمیں پر آسماں کے رہنے والے ڈھونڈتا ہے

ہوا ہی میں کلیدیں عقل کی گھستا رہے گا
مرے خاموش ہونٹوں پر جو تالے ڈھونڈتا ہے

خدا حافظ ہے اس کی سادگی کا بے بسی کا
مصیبت میں جو اپنے دیکھے بھالے ڈھونڈتا ہے

سفیدی ہی سفیدی خون کی باقی ہے ہمدم
یہ کن چہروں پہ تو سرخی کے ہالے ڈھونڈتا ہے

تری منزل، تری جانب رواں لگتی ہے راہی
کہ ہر کانٹا ترے پاؤں کے چھالے ڈھونڈتا ہے

○

افسر آذری
۲۱۲۷ رانی باغ ۔ دہلی ۱۱۰۰۳۴

غزل

اُن سے اقرارِ وفا ہو جیسے
سامنے پھول کھلا ہو جیسے
زندگی ہے کہ مسافر کوئی
راستہ بھول گیا ہو جیسے
ایک اندازِ تغافل ایسا
قبر پر پھول چڑھا ہو جیسے
ہلکی ہلکی سی ہنسی ہونٹوں پر
دوج کا چاند کھلا ہو جیسے
دل میں بے وضع سی بے ترتیبی
رکھ کے کچھ بھول گیا ہو جیسے
جوق در جوق وہ شیریں یادیں
ایک بازار سجا ہو جیسے
یوں گذرگاہ پہ آ بیٹھا ہوں
اپنا گھر پھونک دیا ہو جیسے
پھر وہی درد، وہی درد کی لہر
دل مرا ڈوب چلا ہو جیسے
ایک احساس کہ شہنازِ خیال
آئینہ دیکھ رہا ہو جیسے
زندگی کرنے کے آداب ہیں یہ
ہم نے کچھ سوچ لیا ہو جیسے

احمد شمیم
شعبۂ اُردو۔ دی گریجویٹ اسکول کالج فار وومن ،ساکچی جمشید پور (بہار)

"کاشف الحقائق"

ایک جائزہ

حالی کا دیوان پہلی بار ۱۸۹۳ء میں شائع ہوا تھا۔ حالی نے سرسید کے زیرِ اثر اردو شاعری میں جو انقلاب لانے کی کوشش کی تھی، وہ بلاشبہ اپنے دور کی ایک جدید تحریک تھی۔ اُن کے جدید خیالات نے لوگوں کو کسی نہ کسی ڈھنگ سے متاثر کیا تھا۔ کچھ لوگ حالی کے ساتھ تھے اور کچھ ان کے مخالف۔ حالی اور حالی کے رفقاء غزل کی کم مائگی اور تنگ دامنی کو محسوس کر رہے تھے اور اس لئے غزل کی اصلاح کی طرف متوجہ تھے ـــــ دوسری طرف ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو اصلاحات کی ان کوششوں کو شبہ کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ طبقہ روایت پرستوں کا تھا۔ ویسے حالی اور حالی کے دور کی ادبی اور شعری کوششوں کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ بعض معاملات میں حالی اور حالی کے ہمنوا اور اُن کے مخالفین دونوں ہی شدّت پسندی کے شکار تھے۔ حالی نے اکثر اصلاحات کی کوششوں میں اپنی شاعری کو بھی نقصان پہنچایا ہے۔ اُن کی شاعری کا ایک حصہ محض تبلیغی اور سادگی کے شوق میں بے نمک بن کر رہ گیا ہے۔ اور ان کمزوریوں کی طرف ظاہر ہے۔ ان کے مخالفین نے طنز و طعن کے تیر پھینکے ہوں گے۔ اور سنجیدہ ہمدردوں نے بھی ان کی طرف اشارہ کیا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ حالی نے اپنے دیوان کے ساتھ ایک عالمانہ مقدّمہ بھی شامل کیا جو بعد میں اپنی منفرد حیثیت سے اس قدر شہرت پا گیا کہ خود حالی کی شاعری جس کی وکالت کے لئے یہ مقدّمہ لکھا گیا تھا، مقدّمہ کی شہرت کے مقابلے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دھند میں غائب ہو گئی۔ شاید یہ بھی اپنی نوعیت کا ایک سانحہ ہے۔

مقدّمۂ دیوانِ حالی کو اب تک اُردو کی اوّلین تنقیدی کتاب کہا جاتا ہے۔ لیکن اس پر بہت کم لوگوں نے غور کیا ہے کہ وہ چیز جسے خود حالی نے بنیادی طور پر اپنی شاعری کی تفسیر و تشریح کے لئے لکھا تھا مستقل کتاب کا درجہ کیسے پا سکتی ہے، جبکہ حالی نے اس میں بعض بنیادی تنقیدی مسائل کو چھوا تک نہیں۔ انھوں نے جو کچھ زور دیا ہے اس کا رُخ ان اصلاحات کی طرف ہے جو وہ خود بروئے کار لا رہے تھے۔ اور جن میں جدتِ طبع اور داخلی تجربوں سے زیادہ "پیرویٔ مغربی" کے شوق کو دخل ہے۔ اس سلسلے میں اُن سے کتنی لغزشیں سرزد ہوئی ہیں ان سے کم و بیش اُردو کا ہر طالبِعلم واقف ہے۔ کلیم الدین احمد نے جو حالی کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ "خیالات ماخوذ، واقفیت محدود، نظر سطحی، فہم و ادراک معمولی، غور و فکر ناکافی، تمیز ادنیٰ، ذہن و شخصیت اوسط، یہ ہے حالی کی کل کائنات" جملے کی تیزی اور نوکیلے پن کے باوجود غلط نہیں۔

اردو تنقید کی کڑیوں میں ایک اہم تصنیف امداد امام اثر کی "کاشف الحقائق" بھی ہے جس کے حوالے اُردو تنقید کی بیشتر کتابوں میں ملتے ہیں لیکن جس پر اب تک تفصیل سے کچھ نہیں لکھا گیا ہے۔ یہاں تک کہ کلیم الدین احمد نے بھی اپنی تہلکہ خیز کتاب "اردو تنقید پر ایک نظر" میں اسے نظرانداز کر دیا ہے۔ ایسی حالت میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ "کاشف الحقائق" کے سلسلے میں بہار اور بیرونِ بہار کے اہلِ نظر حضرات نے بالقصد خاموشی اختیار کی۔

امداد امام اثر کی اس تصنیف کی پہلی اشاعت ۱۸۹۷ء میں ہوئی ـــ یعنی حالی کے مقدّمے کے ٹھیک تین سال بعد، لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ امداد امام اثر نے حالی کے مقدّمۂ شعر و شاعری سے متاثر ہو کر لکھا ہوگا۔ کیونکہ یہ بڑے سائز کی دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد ۴۹۴ صفحات کو احاطہ کرتی ہے اور دوسری ۵۰۴ صفحات میں پھیلی ہوئی ہے۔ پہلی جلد اصولوں سے متعلق ہے اور دوسری جلد میں ان اصولوں کی روشنی میں شاعری کی فنّی خصوصیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ بات ممکن نہیں ہے کہ صرف تین سال کے قلیل عرصے میں ۱۰۰۴ صفحات کا یہ عظیم و ضخیم کارنامہ لکھا جائے اور شائع بھی کر دیا جائے۔ کلیم الدین احمد نے اپنی کتاب "اُردو تنقید پر ایک نظر" کی ابتدا میں جس لب و لہجہ کے ساتھ اُردو میں تنقید کے وجود سے انکار کیا ہے، اسے لوگ اب تک بھولے نہیں ہیں۔ لیکن یہ بات کم لوگ جانتے ہیں کہ امداد امام اثر نے کلیم الدین احمد سے پہلے یہ بات کہی تھی:

" وہ فن جسے انگریزی میں CRITICISM کہتے ہیں فارسی اور اُردو میں مروّج نہیں ہے۔ وہ فن جو سخن سنجوں کی کیفیتِ کلام سے بحث کرتا ہے مثلاً اگر کوئی شخص یہ دریافت کرنا چاہے کہ POPE جو انگریزی کا شاعر ہے کس قابلیت کا سخن سنج ہے تو اس کی شاعری کا پورا اندازہ بیان انگریزی شاعری میں ملے گا۔ یہ کیفیت اردو اور فارسی کے تذکروں میں نہیں ہے۔ ایشیا کے تذکروں میں اگر دس نامور شاعروں کی حقیقتِ کلام

معلوم کرنا چاہیں تو سب کی تعریف مبالغہ آمیزی کے ساتھ ایسے انداز میں ملے گی کہ بات واضح طور پر سمجھ میں نہ آئے گی کہ جامی کیا اور نظامی کون تھے اور ناسخ کس قسم کے شاعر تھے۔"

ان سطور کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امداد امام اثر تذکرہ اور تنقید کو دو مختلف چیزیں مانتے تھے۔ اور تذکرہ سے ہٹ کر تنقید کی طرف متوجہ ہوئے تھے، چنانچہ "کاشف الحقائق" کے ابتدائی صفحات میں لکھتے ہیں کہ:

"یہ رسالہ بسبیلِ تذکرہ لکھا گیا ہے اور نہ علمِ عروض سے اسے کسی طرح کا تعلق ہے۔ اس رسالہ کے ملاحظہ سے حضرات ناظرین پر روشن ہوگا کہ شاعری کیا شے ہے اور اس کی کے قسمیں ہیں۔ ہر قسم کا کیا تقاضہ ہے۔ فطری اور غیر فطری شاعری میں کیا فرق ہے۔ بلکہ دونوں سے کیا نتائج مرتب ہوتے ہیں۔"

یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ تنقید کا کام کیفیتِ کلام کی شناخت اور اس کے تجزیہ سے الگ نہیں ہے۔ اور کیفیتِ کلام علمِ عروض اور زبان کی صحت سے الگ ایک چیز ہے۔ بات یہ ہے کہ امداد امام اثر کے خیالات ماخوذ نہ تھے۔ انہوں نے مغربی ادب سے استفادہ ضرور کیا تھا مگر اندھی تقلید نہ کی تھی۔ مغربی شاعری کا جلوہ ان کے لئے دور کا جلوہ نہ تھا۔ انہوں نے اس کا مطالعہ نزدیک سے کیا تھا۔ اس لئے ان کی آنکھیں چکا چوند نہ ہو سکی تھیں بلکہ خوبیوں اور خامیوں سے آشنا تھیں۔ اور اس بات سے بھی ناواقف نہ تھیں کہ ہر قوم کی شاعری اس کے مزاج کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ حالی نے مغربی شاعری کا جلوہ دور سے دیکھا تھا۔ اور اس سے متاثر ہی نہیں بلکہ مرعوب بھی ہوئے تھے۔ لیکن جب ہم کاشف الحقائق کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس کے مصنف کے ذہن کی انفرادیت تسلیم کرنی پڑتی ہے، خاص کر اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ حالی تو خیر مغربی شاعری کا براہِ راست علم نہیں رکھتے تھے، ہمارے آج کے نقاد بھی جو مغربی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں، مرعوب ہیں اور اپنی تنقیدی بصیرت سے کام نہیں لیتے۔ ہم "کاشف الحقائق" کی یہ سطریں پڑھتے ہیں تو ان کے انفرادی تنقیدی مزاج کا قائل ہونا پڑتا ہے:

"یوروپین شاعری ایسی شاعری نہیں ہے کہ آنکھ بند کر کے شعرائے یورپ کا تتبع کیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ یوروپین شاعری کی آگہی سے ہم ایشیائیوں کو بہت کچھ فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ نئے نئے مضامین دستیاب ہو سکتے ہیں مگر یہ فائدہ یوروپین شاعری کو بھی ہماری شاعری سے پہنچ سکتا ہے۔"

یہی وہ نگاہ ہے جو حالی کو نہیں ملی تھی۔ حالی پیرویٔ مغربی کو اپنی معراج سمجھتے تھے، اس پر فخر کرتے تھے۔ اور دوسروں کو بھی پیرویٔ مغربی کی دعوت دیتے تھے۔

مقدمۂ شعر و شاعری میں حالی نے انگریزی، فارسی اور عربی شاعری کے حوالوں سے گفتگو کی ہے۔ مصنف "کاشف الحقائق" کا دائرہ حالی سے کئی گنا بڑا ہے۔ اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جس میں انگریزی، عربی اور فارسی کے علاوہ سنسکرت، انڈونیشیائی، چینی، فرانسیسی، جرمن اور یونانی وغیرہ زبانوں کی شاعری کا تفصیلی تعارف دیا گیا ہے۔ اور انکی خصوصیات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یہی نہیں، امداد امام اثر نے شاعری، مصوری، موسیقی، رقص، غناد وغیرہ کا جو آپس میں گہرا تعلق ہے، اس پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔ اور کسی پہلو کو ٹالا نہیں ہے۔ اور اس کے بعد انہوں نے ان کے مقابلے میں شاعری کی انفرادیت اور اس کی وسعت کو کافی تفصیل سے سمجھایا ہے۔

امداد امام اثر وزن اور قافیہ کو شاعری کے لئے لازمی نہیں سمجھتے تھے۔ حالی کا بھی کچھ ایسا ہی خیال تھا۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ حالی نے شعر اور نظم کی بحث کو درمیان میں لاکر خود ہی اپنے نقطۂ نظر کو الجھا دیا ہے۔ برخلاف اس کے امداد امام اثر لکھتے ہیں:

"شاعری کے لئے نظم کی پابندی کوئی ضروری نہیں یعنی بخوبی ممکن ہے کہ ایک کتاب منظوم ہو اور لطفِ شعر سے بالکل مبرا ہو اور دوسری ایسی ہو جو نثر میں ہو اور مذاقِ شاعری سے تمام تر مملو ہو۔"

اور آگے چل کر زیادہ وضاحت سے لکھتے ہیں:

"یہ درحقیقت بڑی تنگ نظری ہے کہ انسان جب شاعری کو تصور کرتا ہے تو صرف منظوم پیرایہ میں تصور کرے۔ نفس امر کے لئے پیرایہ کیا شے ہے۔ شراب سو قسم کے ظروف میں رکھی جا سکتی ہے۔"

یہیں آکر "کاشف الحقائق" کا مصنف جدید تر ذہن سے قریب ہو جاتا ہے۔ آج کی نثری شاعری امداد امام اثر کی ان سطور کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ "کاشف الحقائق" اس لحاظ سے بھی اردو تنقید کی پہلی کتاب ہے جس میں SUBJECTIVE اور OBJECTIVE شاعری کی قسمیں بتائی گئی ہیں اور ہر صنف کے تقاضے کی وضاحت کی گئی ہے۔

"ہر صنف کا تقاضائے خاص ہے، ضرور کوئی امر ایسا ہے کہ ہر صنف کے برتنے میں شاعر کا ملحوظ رکھنا واجبات سے ہے۔"

امداد امام اثر اس لحاظ سے بھی نئی نسل کے لوگوں سے زیادہ قریب ہیں کہ وہ شاعری کا تعلق شعور سے نہیں وجدان سے سمجھتے ہیں:

"شاعری حسبِ خیالِ راقم رضائے الٰہی کی ایسی نقل ہے جو الفاظ کے بامعنی اظہار سے ظہور میں آتی ہے۔"

پھر آگے رقم طراز ہیں:

"جو شاعری الہام سے خالی ہو وہ شاعری نہیں تک بندی ہے۔"

حالی نے سب سے زیادہ زور اخلاق اور اصلاح کے پہلو پر دیا ہے

وہ شاعری کو اخلاق کا "نائب مناب اور قائم مقام" قرار دیتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ حالی کا زمانہ اصلاح اور تنظیم کا زمانہ تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کا براہِ راست اثر مسلمانوں پر پڑا تھا۔ ایک طرف تو ان کی رہی سہی ساکھ اکھڑ گئی تھی۔ دوسری جانب نئے تعلیمی ریلے میں ان کی مذہبی اور روحانی قدریں متزلزل ہو چکی تھیں۔ ایسے بے یقینی اور انتشار کے دور میں ہر چیز اصلاح، ترتیب اور تنظیم کی طرف رخ موڑ لیتی ہے۔ اس لئے حالی کے اصلاحی دور میں اگر کوئی نقاد شاعری کے داخلی پہلو پر زور دیتا ہے تو یقیناً اس پر حیرت بھی ہوتی ہے اور مسرت بھی۔ امداد امام اثر کی یہ سطریں قابلِ غور ہیں:

"اگر کسی کو منظور ہے کہ پند و نصائح کھلے ڈھکے طور پر داخلِ غزل کی جائے تو اسے اس امر کو فی الذہن رکھنا چاہئے کہ یہ صنفِ شاعری اس کام کے لئے موضوع نہیں ہے اور اصنافِ شاعری درکار ہے۔"

غزل سے حالی کو سنڈاس کی بو آتی تھی۔ وہ اس بات پر بھی نالاں تھے کہ ہمارے شعرا بہت زیادہ دروغ بیانی سے کام لیتے ہیں۔ امداد امام اثر یہاں حالی سے متفق نہیں۔ ان کا خیال ہے:

"اس میں شک نہیں کہ ملکی شاعری میں معائب ہیں مگر یوروپین شاعری بھی عیوب سے پاک نہیں ہے۔ ملکی شاعری تنگ چشموں کی نظر میں ذلیل اور خوار نظر آتی ہے۔ انھوں نے غزل سرائی کی خوبیوں کو عجزِ طبیعت کے باعث درک نہیں کیا ہے۔ ان پر انگریزی شاعری کا جہلِ مرکب سوار ہے۔"

حالی شاعری کے مستقبل سے ہی مایوس تھے۔ ان کا خیال تھا کہ سائنسی ترقی کے ساتھ ساتھ مذاقِ شاعری مٹتا چلا جائے گا۔ اور حقیقت پسندی کے دور میں تخیل کے پنکھ پر اڑنے والوں کے لئے جگہ نہیں رہ جائے گی۔ زمانہ (TECHNOLOGY) سے قریب تر اور شاعری سے دور ہوتا چلا جائے گا۔ حالی کو شاید اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ سائنسی اور تکنیکی اعتبار سے انسان لاکھ بدل جائے اور ترقی کر جائے لیکن سینے میں دل کی دھڑکنیں کبھی نہیں مٹیں گی۔ خم کھاتی ہوئی زلفیں، چمکتی ہوئی آنکھیں اور مہکتے ہوئے لب اور دہکتے ہوئے رخسار، زمین پر بہتے ہوئے دریا، آسمان پر پھیلی ہوئی شفق، جنگلوں کی ہریالی، نکلتے ہوئے سورج کی سرخی اور نیلگوں آسمان پر ٹمٹماتے ہوئے ستاروں کے کارواں ہر دور میں انسان کو اپنی طرف متوجہ کرتے رہیں گے۔ مصنفِ "کاشف الحقائق" اس اعتبار سے بھی حالی سے بالغ نظر تھے۔ ان کا کہنا تھا:

"شاعری با عہدِ گذشتہ تا حال زندہ اور مقبول ہے .... شاعری نے لباس بدل دیا ہے۔ ورنہ شاعری معزول نہیں ہوئی ہے۔ انسان کا جو کام شاعری پہلے کرتی تھی اس صدی میں بھی کرتی ہے۔ آئندہ زمانے میں بھی کرتی رہے گی۔"

ایک جگہ اور ان کے قلم سے یہ معنی خیز جملہ ٹپک پڑا ہے:

"جو شے درحقیقت حکم شاعری کا رکھتی ہے، بجائے خود ایک عبادت ہے۔"

"کاشف الحقائق" وہ پہلی تنقیدی کتاب ہے جس میں ایک معروضی نقطۂ نظر ملتا ہے۔ وہ کافی غور و فکر کے بعد حقائق تک پہنچتے ہیں۔ حالی نے مقدمہ میں مختلف اصنافِ سخن کا ذکر کیا ہے۔ امداد امام اثر نے بھی اپنی تصنیف میں اردو شاعری کی تمام اصناف کی نوعیت، اصلیت اور مزاج کی تشریح و تعریف کی ہے اور اس کی روشنی میں مختلف شعرا کے کلام کا جائزہ لیا ہے۔ اور یہ حصہ اردو میں عملی تنقید کا غالباً اولین نقش ہے۔ یہ بات کس درجہ حیرت انگیز ہے کہ اثر نے اشعار کی عملی تنقید کا جو نمونہ پیش کیا ہے آج بھی نقاد ان کا ذکر کرتے ہیں۔ اور یہی نہیں شعرا پر امداد امام اثر نے جو جچی تلی رائے دی ہے اس رائے کو آج بھی نقل کیا جاتا ہے۔ اور مجنوں گورکھپوری سے لے کر خلیل الرحمٰن اعظمی تک امداد امام اثر کی آرا کو بطور سند پیش کرتے ہیں۔ مصنفِ "کاشف الحقائق" کی چند رائیں نمونتہً پیش کی جاتی ہیں:

"خواجہ صاحب (درد) کی شاعری الہامی شاعری کا نمونہ ہے۔ ان کے کلام میں متانت، نفاست، شیرینی، ملاحت، رنگینی کسقدر پیدا ہے۔"

"میر صاحب کی شاعری تمام تر داخلی پہلو رکھتی ہے۔ ان کے کلام میں سوز و گداز، خستگی، نشتریت، رنگینی و ملاحت، شیرینی و شوخی کی کیفیت بدرجہ کثیر پائی جاتی ہے۔"

"کوئی شک نہیں کہ ذوق ایک ممتاز شاعر گزرے ہیں لیکن اُن کی ... غزل سرائی تقاضوں کے مطابق پورے طور پر نہیں اترتی۔"

"جب تک بہ غور ان کے (مومن) کلام پر نظر نہ ڈالئے لطفِ کلام حاصل نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے بعض بے مغزوں نے مومن کے کلام کو مہمل قرار دیا ہے۔"

"زیادہ حصہ ان کے (غالب) کلام کا استعارات سے بھرا ہے۔ اضافتوں کی بھرمار ہے۔ بعض وقت جی گھبرا اٹھتا ہے کہ الٰہی اضافتوں کا سلسلہ کب ختم ہوگا ..... کبھی کبھی اغلاقِ مضامین کا وہ عالم دکھائی دیتا ہے کہ ادراک اپنے فعل میں قاصر ہونے لگتا ہے .... لیکن ان مصائب سے گزر کر اس یکتائے روزگار کو انصاف کی آنکھ سے دیکھئے تو پھر حسن کی کوئی انتہا بھی نظر نہیں آتی۔"

مصنفِ "کاشف الحقائق" نے ان مصائب سے گزرنے والوں کی نشاندہی بھی کر دی ہے:

"شعر فہمی ایک دشوار امر ہے۔ کس واسطے کہ اس کے واسطے بڑے

رضا تبسم
۲۲/۱۲۸ پٹکاپور - کانپور

فرات

صبح کی آنکھ کھلی
یاس و حسرت سے بھری
آئی گلبانگِ سحر اور بڑھی
روشنی اخگرِ خوابیدہ کی۔
اور بڑھتی ہی گئی حدتِ سیارۂ عہدِ سحری
عرصۂ حشرِ کہن
ایسی فضا
سرخ ذرّات کی چادر میں ہَوا
لو بگولے بھی بڑھے
قلبِ صحرا پہ ہوا رقصِ تپاں
رُک گئی نبضِ فضا کانپ کے اک بار وہیں
وہ تمازت وہ تپش، سرخ وہ روئے صحرا
سرخ کرنوں کی زبانوں پہ وہ ذرّوں کی چمک
خوں میں ڈوبے ہوئے اک لعل کی مانند زمیں کا چہرہ
اور ماضی کی وہ تابندہ ظفر
کتنے ہی معرکے مغلوب کئے
صولت و جاہ و حشم، فتح و ظفر، رعب و جلال
وہ اُبلتی ہوئی موت
اور مچلتے بازو
وہ توازن، وہ تحمّل، وہ رضا
دو رکابہ وہ فرس اور حمائل تلوار
پشت پر دُور تلک
وہ عماری، وہ کجاوے ہر سو
دھوپ میں جلتے ہوئے ماہِ تمام
تر پسینے سے گلاب
دجلۂ وقت کی پیشانی پر
کوئی تحریر کرے جیسے جواب
اور آوازِ جرس
ساتھ صحرا کے وہ سنّاٹے کا صوتی ہیجان
اور تعاقب میں وہ موت
جو حیاتِ ابدی۔
وہ کھجوروں کے درخت
تودۂ خاک پہ سینہ تانے
پیشوائی کو جھکے
چند پیاسوں کے لئے
موجیں سینے پہ لئے
وہ حبابوں کے کنول
طشتِ گرداب میں
آتی ہے لئے موجِ فرات
اور اک قافلہ رُک جاتا ہے
اُف ہمیشہ کے لئے

مذاقِ صحیح کی ضرورت ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ شعر فہمی کا مذاقِ صحیح کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ جب تک معاملاتِ خارجیہ اور اُمورِ ذہنیہ کی دانست اور ان کے تقاضوں سے آگہی بدرجہ اتم حاصل نہ ہو۔"

ان سطور کا اگر بہ غور مطالعہ کیا جائے تو چند باتیں سامنے آتی ہیں۔ وہ یہ کہ مصنف کے خیال میں نقّاد کے لئے اوّلین شرط شعر فہمی ہے اور شعر فہمی کے لئے معاملاتِ خارجیہ اور اُمورِ ذہنیہ، دونوں کی آگہی ناگزیر ہے۔ نقّاد کے لئے یہ ایک ایسی شرط ہے کہ جس سے آج بھی اختلاف ممکن نہیں لیکن یہ بات کتنے افسوس کی ہے کہ اردو تنقید کی اس پہلی عظیم الشان تصنیف کی طرف لوگوں نے اب تک باضابطہ توجہ نہیں دی ہے اور نہ اس کا حق ادا کیا ہے۔ یہاں تک کہ کلیم الدین احمد نے بھی "اردو تنقید پر ایک نظر" میں تیسرے درجے کی کتابوں پر تو بحث کی ہے۔ لیکن کاشف الحقائق کا ذکر تک نہیں کیا جبکہ خود ان کی تنقید پر بالواسطہ یا بلاواسطہ کاشف الحقائق کے اثرات موجود ہیں۔ ●●

تاباںؔ نقوی امروہوی
ایڈیٹر، نوائے ہند ویکلی۔ امروہہ (اتر پردیش)

تذکرۂ سراپا سخن اور غالبؔ کا قطعۂ تاریخ

بطور تقریظ و تحسین یا بطور یادگار کسی بڑے حادثہ، کسی کتاب کی اشاعت کسی اہم شخصیت کی وفات یا کسی تقریبِ مسرت پر بحساب ابجد ایک جملہ یا ایک مکمل مصرع مادۂ تاریخ نکال کر اسے دو یا دو سے زائد اشعار میں قطعہ بند کر کے تاریخ گوئی کا رواج زمانۂ قدیم سے چلا آتا ہے۔ ایسے قطعات اُردو اور فارسی میں بھی کہے گئے ہیں۔ ان میں بعض معمولی اور بعض ادبی شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں۔ مادہ تاریخ نکالنا اگرچہ بڑی ریاضیاتی محنت کا کام ہے مگر کبھی کبھی آگ کی تلاش میں پیمبری بھی مل جاتی ہے۔ ایسے مادہ تاریخ کا نکل آنا جو ادبی کشش بھی رکھتا ہو حُسنِ اتفاق کا نتیجہ ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی شناور کو سمندر کی تہہ میں اچانک کوئی موتی ہاتھ آجائے یا کسی کان کن کو کھدائی کے دوران کوئی نایاب ہیرا۔

شعرا نے اگرچہ ہر دَور میں قطعاتِ تاریخ کہے ہیں لیکن اس فن کی جمع تفریق والی منشی گیری نے جو کسی حد تک ایک غیر شاعرانہ کام ہے۔ اسے اصنافِ سخن میں کوئی مستقل مقام حاصل نہیں ہونے دیا۔ بعض قطعات جو بطور اظہارِ واقعہ یا حقیقی جذباتِ غم کے اظہار کے لئے کہے گئے ہیں انہیں ادبی اعتبار سے اتنا پُرکشش بنا دیا گیا ہے کہ عوام جو واقعات کو جلد بھول جانے کے عادی ہوتے ہیں اس واقعہ کو اس کے سنہ وقوع کے ساتھ یاد رکھ سکیں۔ اس کے باوجود بھی طبقۂ شعرا میں اس فن کو صرف اسی قدر شرفِ قبول حاصل ہے جتنا کسی آرٹسٹ کے خوبصورت آرٹ کو۔

غالبؔ نے مادۂ تاریخ نکالنے کے کام کو اس قدر غیر علمی اور غیر شاعرانہ سمجھا کہ ان کے متعلق یہ شبہ کیا جانے لگا کہ وہ اکثر دوسروں کے نکالے ہوئے مادہ ہائے تاریخ اپنے قطعات میں نظم کر دیا کرتے ہیں لیکن یہ شبہ سو فیصدی صحیح نہیں تھا۔ ایک بار تو انہوں نے خود اپنے انتقال کی تاریخ کہہ ڈالی اور سنہ معین پر وہ بقیدِ حیات رہے اور لوگوں نے تاریخ کی طرف توجہ دلائی تو ان کی بذلہ سنج طبیعت نے اس کا یہ جواز ڈھونڈ نکالا کہ ”وبائے عام نہیں مرنا مجھے پسند نہیں۔“

تقریظ اور تاریخ گوئی سے غالبؔ جیسے فقیر منش کی بے تعلقی کی حقیقی وجہ یہ ہے کہ اس ذیل میں عموماً غیر حقیقی اور مبالغہ آمیز مدح کی جاتی ہے جو طبعاً ان کے نزدیک ایک ناپسندیدہ اور غیر شاعرانہ کام ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مرزا نے بہادر شاہ ظفرؔ، نواب رام پور اور انگریز گورنر جنرلوں کی مدح میں بہت سے قصائد لکھے ہیں لیکن مدح و ستائش کا یہ کاروبار مطبوع دلی جذبات اور رجحانات کا آئینہ دار نہیں۔ یہ کام صرف معاشی پریشانیوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے کیا گیا ہے۔ دربار سے وظیفہ کا اور برطانوی حکمرانوں سے بحالیٔ پنشن کا سوال وابستہ تھا۔ بادشاہ کی مدح تو ظل اللہ کے تصور کے ساتھ رواجی حیثیت رکھتی تھی مگر انگریزوں کی مدح کے بارے میں مرزا نے اپنے حقیقی نقطۂ نظر کو اس تاریخی جملہ میں سمو دیا ہے کہ:

”گورنمنٹ کا بھانڈ تھا بھبٹی کرتا تھا خلعت پاتا تھا۔ خلعت موقوف بھبٹی متروک۔“

مرزا نے اپنے لئے بھانڈ جیسا مکروہ لفظ استعمال کر کے عزتِ نفس کے احساس اور معاشی مجبوری کے درمیان اپنی ذہنی کشمکش کو پوری طرح نمایاں کر دیا ہے۔

جو شاعر بطور خود ستائی نہیں بلکہ باندازِ اعتماد و خودشناسی یہ اعلان کرتا ہے کہ

عمرہا چرخ بگردد کہ جگر سوختۂ
چوں من از دودۂ آتش نفساں خیزد

نفسیاتی تجزیہ کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ کارِ مداحی کو بطیبِ خاطر اختیار نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر مرزا کو کبھی بمجبوری قطعاتِ تاریخ کہنے پڑے ہیں تو ان میں رواجی اندازِ مدح و ستائش سے کام نہیں لیا، زمین آسمان کے قلابے نہیں ملاتے ان کی طبع خوددار نے صرف اتنی ہی مدح کی ہے جتنی مبنی بر حقیقت ہے۔ مرزا جعفر کی شادی پر ”مخطوط“ ۱۲۵۸ھ اور ”انشراحِ جشنِ جمشید“ ۱۲۷۰ھ مادہ ہائے تاریخ نکالے ہیں جن کے بارے میں شک کیا جاتا ہے کہ یہ بھی ان کے نکالے ہوئے نہیں۔ باقر علی خاں کی صاحبزادی کی ولادت اور برادرِ حقیقی

مرزا یوسف کی وفات کی تاریخیں بطرز تعمیہ ہیں جو اس فن کا کوئی پسندیدہ طریقہ نہیں لیکن مرزا کا ایک قطعۂ تاریخ ایسا ہی ہے جس میں اگرچہ ابجد کے رواجی طریقے سے مادۂ تاریخ نکالنے کی زحمت نہیں برداشت کی گئی لیکن حقیقی پسندیدگی اور عقیدت کا اظہار ہوتا ہے اور جو ماہرین غالبیات کی نظر سے دانستہ یا نادانستہ ابھی تک اوجھل رہا ہے یہ قطعۂ تاریخ سید محسن علی محسنؔ لکھنوی کے تذکرۂ سراپا سخنؔ کی تقریظ ہے محسنؔ نے یہ تذکرہ ۱۲۷۷ھ میں مکمل کیا اور مرزا سے تاریخ کی فرمائش کی مرزا نے درخواست کو شرفِ قبول بخشا اور اسے خصوصی توجہ سے نظم کیا اور اپنے اس دعویٰ کا ثبوت بھی پیش کیا کہ:

ہمچو من شاعر و صوفی و نجومی و حکیم
نیست در دہر قلم مدّعی و نحتہ گواہ است

مرزا کے اس تذکرہ پر خصوصی توجہ کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ رواج سے ہٹ کر ایک بالکل ہی نئے اور انوکھے انداز سے ترتیب دیا گیا ہے اور چونکہ ہر ندرت خواہ وہ کسی کی ہو مرزا کی طبع نادرہ کار کے لئے پسندیدہ ہے اور یہ تذکرہ بھی اپنے عہد کی اوّلیں اور اچھوتی کوشش ہے اس لئے اس کی تاریخ کہنے میں بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ یہ تذکرہ اگرچہ عرفِ عام میں شعراء کا ایک تذکرہ ہے لیکن درحقیقت یہ تذکرہ کم اور سراپائے محبوب پر شعراء کی نازک خیالیوں کا مرقع زیادہ ہے، صاحب تذکرہ نے یہ اہتمام کیا ہے کہ سر، دماغ، بال، زلف، کاکل، عارض، جبین، ابرو، چشم، مژگان، ناک، لب، دنداں، زبان، دہن اور ذقن سے لے کر پائے نازک کے تلووں تک پچاس اعضاء بدن کو علیحدہ علیحدہ موضوع قرار دے کر اس پر شعراء کے کلام کو یکجا کیا ہے اور بطور تعارف ان کے کچھ مختصر حالات و سوانح بھی شامل کر دے گئے ہیں۔ شعراء نے محبوب کے کسی عضو کو ردیف یا جزوِ ردیف یا قافیہ قرار دے کر اس عضو کے بارے میں جتنا بھی زورِ طبع صرف کیا ہے وہ سب اس تذکرہ میں یکجا ہو کر سامنے آگیا ہے۔ اس تذکرہ سے مختلف شعراء کے فن اور ذوقِ سراپا نگاری کا لطیف فرق بھی واضح ہوتا ہے اور اس طرح یہ تذکرہ مشرقی شعراء کے جمالیاتی رجحان کا ایک خوبصورت مرقع بن گیا ہے۔

چار سو صفحے کے اس دلچسپ اور رنگا رنگ تذکرہ میں تقریباً ساڑھے چھ سو شعراء کا ایسا کلام موجود ہے جو عضویاتی محاسن پر انسانی فکر کا بڑا حسین اور تاریخی مجموعہ کہلا سکتا ہے اس تذکرہ میں چالیس کے قریب قطعاتِ تاریخ کی شمولیت اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ آج سے ایک صدی قبل محسنؔ لکھنوی کی اس کوشش کو شعراء معاصرین نے ایک نئی چیز سمجھ کر کافی پسند کیا ہے اور بطور اظہارِ پسندیدگی اس پر قطعاتِ تاریخ لکھے ہیں۔ غالبؔ کا قطعۂ تاریخ بھی انہی قطعاتِ تاریخ میں سے ایک ہے اور عین ممکن ہے کہ غالبؔ کے لئے تذکرہ کی یہ ندرت ہی تاریخ گوئی کی سفارش بن گئی ہو۔ غالبؔ نے ایک نامطبوع صنفِ سخن میں زورِ طبع صرف کیا ہے لیکن اس کی طبعِ تنوّع پسند نے اس قطعہ پر بھی اپنے مخصوص طرزِ فکر اور اسلوب کی چھاپ لگا دی ہے قطعہ کا اندازِ نگارش روشِ عام سے الگ اور اس کے اس دعویٰ کا مصداق ہے کہ

زلہ بردارِ کسی چرا باشم ؛ من ہمایم مگس چرا باشم

عام دستور یہ ہے کہ قطعۂ تاریخ میں کتاب اور صاحبِ کتاب کی مبالغہ آمیز مدح کی جاتی ہے۔ لیکن غالبؔ نے صرف کتاب کی مدح کی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ مدح بجائے خود مولفِ کتاب کی بھی مدح ہے۔ یہ مدح اتنی مختصر ہے جتنی کہ اس کے قصائد میں عام طور پر ہوتی ہے تشبیب طویل اور شاندار، مدح مختصر اور محدود۔ اس قطعہ میں ساری مدح صرف ایک خوبصورت اور معنی خیز ترکیب میں سمٹ آئی ہے۔ یہ ترکیب ہے "طرب نصاب"۔ محلِ استعمال ملاحظہ ہو۔

اس کتابِ طرب نصاب نے جب
آب و تابِ انطباع کی پائی

غالبؔ کے ترکیب ساز دماغ نے یہ ترکیب ضرورت کے عین مطابق وضع کی ہے اور اس کی بے شمار دوسری ترکیبوں کی طرح اس میں بھی صوتی حسن اور معنوی تاثر پوری طرح موجود ہے۔ "نصاب" اس سرمایہ کو کہتے ہیں جس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ بعض فارسی کتابوں میں اس لفظ کو فقط سرمایہ کے معنی میں بھی استعمال کیا گیا ہے۔ بہر حال نصاب کا مفہوم ایک ایسے سرمایہ سے ہے جو عددی اعتبار سے کافی وقیع ہو۔ اب اس لفظ کے ساتھ طرب کا اضافہ کر دیجئے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کتاب ایک مکمل سرمایۂ طرب ہے اور حق بھی یہ ہے کہ ایک ایسی کتاب جس میں محبوب کے سراپائے رنگین کی مکمل تصویر کشی کی گئی ہو۔ صحیح معنیٰ میں طرب نصاب بھی ہو سکتی ہے۔ غالبؔ کی یہ مدح بالکل واقعاتی ہے اور اس کے بعد کوئی بھی اور تعریف پُر کشش نہیں ہو سکتی بلکہ غیر ضروری اضافہ محسوس ہوگی۔ یہ ایک مسلّمہ ہے کہ ایجاز و اختصار فن کی جان ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اس مدح کو مکمل مدح نہ سمجھا جائے، غالبؔ نے مدح میں صرف ایک ترکیب استعمال کر کے نہ صرف فن کی متعین قدروں کا احترام کیا ہے بلکہ مدح بیجا کے رجحان کے خلاف ایک عمدہ مثال بھی قائم کی ہے۔

"تذکرۂ سراپا سخن ۱۲۷۱ھ میں مکمل ہوا۔ غالب نے اس کی تاریخ حروف کے اعداد سے نہیں بلکہ لفظوں سے ظاہر کی ہے۔ سات سات کے دو اور بارہ کے ایک ہندسہ کا لفظوں میں ذکر کر کے پڑھنے والوں کو ریاضیاتی الجھن سے بچا لیا ہے۔ پورے قطعہ میں حسنِ ترتیب اور شوخیٔ فکر ملاحظہ ہو:۔

اس کتابِ "طرب نصاب" نے جب   آب و تابِ انطباع کی پائی
فکرِ تاریخ سال میں مجھکو   ایک صورت نئی نظر آئی
ہندسے پہلے سات سات کے دو   دیئے ناگاہ مجھکو دکھلائی
اور پھر ہندسہ تھا بارہ کا   با ہزاراں ہزار زیبائی
سالِ ہجری تو ہو گیا معلوم   بے شمولِ عبارت آرائی
مگر اب ذوقِ بذلہ سنجی کو   ہے جداگانہ کارفرمائی
سات اور سات ہوتے ہیں چودہ   با امیدِ سعادت افزائی
غرض اس سے ہیں چاردہ معصوم   جن سے ہے چشمِ جاں کو بینائی
اور بارہ امام ہیں بارہ   جن سے ایماں کو ہے توانائی

غالب ان کو یہ سال اچھا ہے
جو آئمہ کے ہیں تولائی

قطعہ کا پہلا مصرعہ کتاب کے حسنِ باطن کا اور دوسرا حسنِ ظاہر کا مظہر ہے۔ "طرب نصاب" میں کتاب کی ساری رنگینی معنویت اور مدح موجود ہے اور "آب و تاب انطباع" میں کتاب کی نظر نوازی کا اعتراف۔ اور ان دونوں اعترافات کے بعد مدح کا سوال یکسر ختم۔ دوسرے شعر میں فکرِ تاریخ سال کے ساتھ نئی صورت نظر آنے سے غالب کے مخصوص اندازِ فکر و نظر کا آغاز ہوتا ہے۔ جس شاعر کو وبائے عام میں عوام کے ساتھ مرنا تک پسند نہ ہو وہ اپنے کلام میں جب تک کوئی نئی صورت نہ دیکھے اس کے مقام کا تحفظ کس طرح ہو سکتا ہے لہٰذا بذلہ سنجی بروئے کار آئی۔ سات سات کے دو اور بارہ کا ایک ہندسہ عام حالت میں نہیں بلکہ ہزاراں ہزار زیبائی کے ساتھ نظر آیا۔ یہ زیبائی کا اہتمام مقدمہ ہے۔ اس مقدس نسبت کا جو ابھی ذہنِ شاعر میں ہے اس طرح سالِ ہجری بڑی سادگی سے معلوم ہو گیا جو تاریخ گوئی کا مقصدِ اصلی ہے مگر بغیر شمولِ عبارت آرائی ہوا اور اس طرح کی سہل انگاری شاعر کی طبع دقت پسند کے ساتھ ساز نہیں کرتی سادگی بغیر پرکاری کے مزا نہیں دیتی۔ لہٰذا فوراً ذوقِ بذلہ سنجی بروئے کار آیا سات اور سات کو جمع کر لیا گیا۔ بے ضرورت نہیں بلکہ سعادت افزائی کے خیال سے۔ حاصلِ جمع چودہ کا ہندسہ ہے جو چاردہ معصومین سے مناسبت رکھتا ہے اور چاردہ معصومین سے چشمِ جان کو بینائی نصیب ہوتی ہے لہٰذا جمع کرنے کا جواز ثابت۔ اس کے بعد بارہ کا ہندسہ ہے جو کسی جمع تفریق کے بغیر خود ہی اپنی منفرد حیثیت میں وجہ سعادت و برکت ہے اس لئے اثنا عشری عقیدہ کے مطابق آئمہ معصومین بارہ ہیں جو توانائی ایمان کا باعث ہیں۔ گویا اعداد کی یہ سعادت و برکت خوبیٔ بخت ہے کتاب اور صاحبِ کتاب کی کہ ان کو ایسا سنہ تالیف نصیب ہوا۔ آخری شعر کا پہلا مصرعہ:۔

"ان کو غالب یہ سال اچھا ہے" غالب کا اپنا ادّعا ہے۔ بتوں سے فیض کے بارے میں تو برہمن کا قول سند تھا لیکن آئمہ سے فیض کے بارے میں مردِ مومن کی رائے سند ہے۔ برہمن کے قول پر تو اتنا شک بھی تھا کہ "دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض"

لیکن یہاں مقامِ شک نہیں منزلِ یقین ہے

ان کو غالب یہ سال اچھا ہے۔ جو آئمہ کے ہیں تولائی

قرینہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محسن لکھنوی صاحب تذکرہ اثنا عشری عقیدہ رکھتے تھے اور غالب کو ان کے عقیدہ کا پہلے سے علم تھا اسی لئے یہ غیر معمولی اہتمام قطعۂ تاریخ میں کیا گیا۔

غالب چوں کہ خود بھی آئمہ کے تولائی تھے اس لئے یہ بھی ممکن ہے کہ اس بہانہ سے انہوں نے ہم خرما و ہم ثواب والے مقولہ پر عمل کیا ہو یعنی محسن لکھنوی کو ممنونِ کرم کرنا اور اپنے لئے حصولِ ثواب کا موقع نکالنا۔

بہرحال غالب کا یہ قطعۂ تاریخ رواجی قطعات سے قطعی مختلف ہے اور اس میں ان کے اندازِ بیان اور والی بات پوری طرح موجود ہے۔ مدحِ بیجا اور مبالغہ کے ناپسندیدہ عناصر کا اس میں کہیں پتہ نہیں۔

تنقید و تبصرہ کی متعین قدر یہ ہے کہ نقد و بصر اظہارِ واقعیت تک محدود ہو۔ غالب کے یہاں تقریظ لکھتے وقت یہ قدر پوری دیانت کے ساتھ موجود تھی۔

جناب آمجد نجمی کا انتقالِ پُر ملال

پرچہ پریس میں جا رہا تھا کہ خبر ملی کہ اڑیسہ کے بزرگ ادیب، شاعر، نکتہ داں اور "شاخسار" (کٹک) کے مدیر، علامہ امجد نجمی کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ مرحوم کی ذات اڑیسہ میں زبان و ادب کے لئے مغتنمات میں سے تھی۔ ہمیں مرحوم کے پس ماندگان، شاگردوں اور دوستوں سے دلی ہمدردی ہے۔

غزلیات

دلؔ ایوبی ٹونکی
چھوٹی حویلی قافلہ، ٹونک، راجستھان

قفس کی تیلیاں کیا ہیں اگر عزمِ جواں جاگے
کوئی ذکرِ چمن چھیڑو کہ یادِ آشیاں جاگے
زمین و آسماں جاگے مکان و لامکاں جاگے
مگر خوابِ گراں سے حضرتِ انساں کہاں جاگے
سرورِ بیکراں بھی تلخیٔ صہبا میں مضمر ہے
حقیقت کی زباں سمجھو تو حُسنِ داستاں جاگے
نگہباں پھر سکوتِ مرگ کی دینے لگے تہمت
جیالو پھر تڑپ اٹھو کہ زنجیرِ گراں جاگے
کوئی حد بھی ہے آخر ہمسفر کب تک جھنجھوڑیں گے!
چلیں منزل کو جالیں، جب تلک اپنا کارواں جاگے!
کوئی نغمہ کوئی آہنگِ دل آویز ہو یارو!
صدائے صور سے کیا کشتۂ نازِ بتاں جاگے!
یہ صحرا تو نہیں اے دل یہاں جولانیاں کیسی!
دبے پاؤں گذر جاؤ، نہ شہرِ مہوشاں جاگے

عبدالوحید خاں وحیدؔ
سید راجے، رائے بریلی (یو۔پی)

سوادِ مشرق سے تا بہ مغرب ہر اک نفس انتشار میں ہے
مرے نشیمن کا تذکرہ کیا مرا چمن کس شمار میں ہے
نہ ماہ و انجم کی رفعتوں میں، نہ خلد کے لالہ زار میں ہے
نظامِ فطرت کی جو تجلّی فروغِ مشتِ غبار میں ہے
چمن میں غنچے نہ مسکرائے تو یہ ہے خامی صلاحیت کی
جہاں عیسیٰ نفس تو اب بھی نسیمِ فصلِ بہار میں ہے
غبارِ منزل کہو تو کہدیں فضائے نجم و قمر کو ورنہ
وجودِ انساں کی سر بلندی نگاہِ گردوں شکار میں ہے
جنوں نوازی کا بانکپن ہے فضائے گلشن کی نکہتوں میں
مگر وقارِ برہنہ پائی وفاؤں کے خارزار میں ہے
مرے شعورِ خودی نے آخر وہاں پہ پہنچا دیا ہے مجھ کو
جہاں خرد بھی ہے دسترس میں، جہاں جنوں اختیار میں ہے

ناظرؔ الحسینی
۲۸/۱ آغا مہدی اسٹریٹ، کلکتہ ۱۶ (مغربی بنگال)

شمع سے کہدو کہ ماتم دارِ پروانہ بنے
زندگی عنواں بنے پھر ایک افسانہ بنے
ہو رہا ہے آج گلشن میں یہ اعلانِ بہار
جس کا دل چاہے وہ اس عالم میں دیوانہ بنے
اب مرے ذوقِ جنوں کو اور وسعت چاہیئے
دل کی بستی بستے بستے کوئے جانانہ بنے
اور ہونگے وہ جو نقشِ پا کو سمجھیں نقشِ راہ
ہم وہ ہیں جس کے لئے منزل بھی دیوانہ بنے
بادۂ عشرت سمجھ کر میں نے آنسو پی لئے
آگے دل کا کام ہے شیشہ کہ پیمانہ بنے
آج ناظرؔ ہو گیا بادہ گساروں میں شریک
اب نگاہِ مست سے کہدو کہ میخانہ بنے

محبوب انورؔ
۴۱، اقبال ہوسٹل۔ پٹنہ ۵ (بہار)

ہاں رسم و روِ عشق کا ادنیٰ یہ صلہ ہے
مجبورِ محبت کا تبسم بھی گِلہ ہے
کچھ غم نہیں گر راہوں میں پڑتی ہے کڑی دھوپ
دیوانہ تری یاد کے سائے میں چلا ہے
آنکھوں سے مری اشک کے بہتے ہوئے دھارو
تھم جاؤ کہ دامن مرا اب بھیگ چکا ہے
میں جام اٹھاؤں تو پسِ جام نہ دیکھو
محسوس یہ ہوتا ہے کوئی دیکھ رہا ہے
وہ صحنِ گلستاں ہو کہ یہ کنجِ قفس ہو
انورؔ تو بہر حال حوادث میں پلا ہے

ظفرؔ رضوی کاکوی
سب رجسٹرار آفس، سہسرام ضلع شاہ آباد (بہار)

دیوانہ لگے ہے کبھی فرزانہ لگے ہے
ظالم تری نظروں میں وہ کیا کیا نہ لگے ہے
اس عہدِ پُر آشوب کا ہے ایک کرشمہ
اپنا جسے سمجھو وہی بیگانہ لگے ہے
گفتار کی تقصیر ہے یا وقت کی افتاد
ہر چند حقیقت کہو، افسانہ لگے ہے
سرشارِ محبت کا یہ دل بھی ہے عجب چیز
مینا، کبھی شیشہ، کبھی پیمانہ لگے ہے
سُن کر ترے اشعار ظفرؔ لوگ ہیں کہتے
کچھ کچھ ترا انداز جداگانہ لگے ہے

اشرفؔ قادری
پوسٹ آفس بیتیا، (چمپارن۔ بہار)

میں وقفِ رنج ہوں، دل وقف ہے فغاں کے لئے
ہزار درد ہیں اک جانِ ناتواں کے لئے
تمہارا نام نہ آئے مرے فسانے میں
میں ڈھونڈتا ہوں وہ عنوان داستاں کے لئے
اسیرِ مرگ رہا زندگی کا ہر لمحہ
بہار آئی چمن میں مگر خزاں کے لئے
ہزار بار زمانے میں انقلاب آئے
یہ سر تو وقف ہے بس اُن کے آستاں کے لئے
چمن میں برق چمکتی ہے دیکھ لے اشرفؔ
دعا خدا سے کرو اپنے آشیاں کے لئے

ضیاء الدین اصلاحی
دار المصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

مرزا احسان احمد

مرزا احسان احمد کا ۲۳ر دسمبر ۱۹۷۲ء کو انتقال ہو گیا۔ وہ اعظم گڑھ (اتر پردیش) کے مشہور اور کامیاب وکیل تھے۔ وکالت کے علم و ادب گریز پیشے سے تعلق رکھنے کے باوجود انھوں نے اپنے ذوق شعر و ادب کو نہ صرف قائم اور برقرار رکھا بلکہ درحقیقت وہ ملک کے ممتاز شاعر، اور مایۂ ناز ادیب اور بلند پایہ نقاد تھے۔ مرزا صاحب کا گھر خاص طور پر شعر و ادب کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ان کے یہاں پابندی سے نشستیں ہوا کرتی تھیں۔ ان میں دار المصنفین (اعظم گڑھ) کے ارباب فضل و کمال، مولانا سہیل اور دوسرے مقامی شعرا کے علاوہ عموماً اصغر و جگر اور کبھی کبھی بعض دوسرے ممتاز غیر مقامی شعرا بھی شریک رہا کرتے تھے۔

وہ ۱۸۹۵ء میں اعظم گڑھ کے ایک مشہور گاؤں مسلم پٹی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی مرزا محمد سلیم صاحب ایک کامیاب وکیل، موزوں طبع شخص اور علامہ شبلی کے احباب میں تھے۔ وہ باقاعدہ عالم دین بھی تھے۔ وکالت کا امتحان پاس کرنے سے پہلے دار العلوم دیوبند میں انھوں نے علوم عربیہ کی تحصیل کی تھی۔

مرزا احسان احمد ۱۹۱۲ء انٹرنس پاس کرنے کے بعد حصول تعلیم کے لیے ایم اے او کالج علی گڑھ میں داخل ہوئے اور ۱۹۱۸ء میں ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی اور اسی سال دسمبر سے وکالت شروع کی، آخر عمر میں ضعف و علالت اور حصول زر سے طبیعت کی عام بے نیازی اور بے رغبتی کی بنا پر وہ اس پیشہ کو چھوڑ کر تقریباً خانہ نشین ہو گئے تھے۔

مرزا صاحب کی اردو اور فارسی تعلیم اسکول اور کالج میں ہوئی تھی، مگر انھوں نے اپنے فطری ذوق اور ذاتی محنت و مطالعہ سے دونوں زبانوں میں بڑی اچھی استعداد پیدا کر لی تھی۔ ان کے اردو کلام کا مجموعہ "پیامِ کیف" ۱۹۴۰ء میں اور ادبی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا ہے۔ موخر الذکر پر اتر پردیش کی حکومت نے بارہ سو روپے کا انعام دیا تھا۔ وہ غیر مطبوعہ مضامین نظم و نثر کا ذخیرہ بھی چھوڑ گئے ہیں۔ ان کی نگارشات "شعر و ادب"، "معارف"، "نگار"، "مخزن" اور "ہمایوں" وغیرہ جیسے ممتاز اور بلند پایہ رسالوں میں چھپتی تھیں۔

مرزا احسان احمد فطری ادیب و شاعر تھے اس لیے ان کو کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کی ضرورت نہ پیش آئی۔ ان کا حقیقی استاد اور رہبر صرف ان کا ذوقِ صحیح اور وجدانِ سلیم تھا۔ تاہم شبلی کی صہبائے علم و ادب ان کی رگ و پے میں رقص کر رہی تھی۔ انہوں نے شبلی کی بارگاہِ فیض سے اپنی وابستگی اور تعلق کا ذکر کرتے ہوئے خود لکھا ہے:

"میرے نزدیک اردو انشا پردازی کا بہترین اور اعلیٰ ترین نمونہ علامہ شبلی مرحوم کا طرزِ تحریر ہے۔ میں نے اپنے مضامین میں اسی اندازِ انشا کی تقلید کی ہے اور بہت کچھ فائدہ اٹھایا ہے لیکن کبھی کسی سے مضامین پر اصلاح نہیں لی ـــــ اس سے بڑھ کر کوئی ناشکری نہیں ہو سکتی اگر میں اس امر کا اعتراف نہ کروں کہ میرے ناچیز قلم کو نثر نگاری کا جو کچھ سلیقہ ہاتھ آیا ہے وہ سب علامہ شبلی ہی کی عدیم المثال طرزِ انشا کے مطالعہ اور تتبع کا غائبانہ فیض ہے۔"

مرزا صاحب کو اصلاحِ شعر و سخن سے دلچسپی تھی۔ انہوں نے اپنے اکثر مضامین میں شعر و سخن اور شعرا کے کلام کے متعلق اظہارِ خیال کیا ہے مگر ان کا قلم علمی تحقیق و تجزیہ اور بحث و استدلال میں بھی عجز و درماندگی کی کیفیت محسوس نہیں کرتا تھا۔ ان کے علمی و تحقیقی مقالات بھی نہایت جامع، مدلل، دل نشیں اور ادبی و تنقیدی مضامین کی طرح بھرپور اور بلند پایہ ہیں۔

ان کے نزدیک ادب کو حیاتِ انسانی کی تہذیب و اصلاح سے ایک خاص اور غیر معمولی تعلق ہے۔ ایک ادیب، ایک شاعر، ایک افسانہ نگار کے قلم پر بہت کچھ اخلاقی ذمہ داریوں کا بار بھی ہے۔ وہ شاعری کو محض تفریحِ خاطر اور گرمیٔ محفل کا سامان نہیں سمجھتے تھے بلکہ قوموں کو زیر و زبر کرنے والی، ملک میں ہلچل ڈالنے والی اور اخلاق و تمدن اور سیاست میں انقلابات پیدا کرنے والی قوت خیال کرتے تھے۔ ان کے نزدیک لفظی صناعی، ظاہری زینت و آرائش اور ایک ہی قافیہ و ردیف پر دو غزلہ سہ غزلہ لکھنے کا نام شاعری نہیں ہے بلکہ شاعری نام ہے جذبات کی تپش کا، احساس کی حرارت کا، دل کی تڑپ اور روح کے سوز و گداز کا، تڑپنے اور تڑپانے کا، ایک زندہ اور بیدا

دماغ کی آتش فشانی کا، فطرتِ انسان کی بلند اور شریفانہ احساسات کی مصوری کا اور مہیب کائنات کے پُر اسرار حقائق کی گرہ کشائی کا۔"

احسان صاحب محض احساسات وخیالات کی لطافت وبلندی اور داخلی محاسن اور پاکیزگی ہی کے قائل نہ تھے بلکہ خارجی محاسن اور اندازِ بیان کی رعنائی ودلکشی اور طرزِ ادا کی جدّت وندرت اور دلآویزی کو بھی کلام کا ضروری عنصر خیال کرتے تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:-

"تاثیر شعر کی جان ہے اس کے لئے حسنِ خیال کے علاوہ حسنِ بیان نہایت ضروری چیز ہے۔ اکثر بلند اور لطیف خیالات صرف اس لئے غارت ہو جاتے ہیں کہ شاعر اپنی طرزِ ادا میں کوئی خاص ندرت اور طرفگی پیدا نہیں کر سکا، اس بنا پر جو شعرا نکتہ رس اور بلاغت شناس ہوتے ہیں وہ لطافتِ خیال کے ساتھ اندازِ بیان کی خوبی اور دلکشی کا خاص لحاظ رکھتے ہیں اور ہمیشہ اس کوشش میں رہتے ہیں کہ معمولی خیال بھی ایسے اچھوتے طریقے سے ادا کیا جائے کہ سننے والا وجد کرنے لگے۔ اس کے لئے غیر معمولی قدرتِ زبان درکار ہے۔ خواجہ حافظ کو دیکھو ایک معمولی سی بات کو لیتے ہیں اور اپنے حسنِ بیان سے معجزہ بنا دیتے ہیں۔ مولانا روم کی نکتہ سنجی اور دقیقہ رسی سے کس کو انکار ہو سکتا ہے لیکن اگر ان کو خواجہ حافظ کی قدرتِ زبان ملی ہوتی تو تم اندازہ کر سکتے ہو کہ ان کے کلام کا حسن کہاں سے کہاں پہنچ جاتا — غرض شاعر کو یہ نہ بھولنا چاہیے کہ وہ شاعر ہے، ناصح یا واعظ نہیں، خواہ وہ فلسفہ لکھے یا علمی یا اخلاقی نکتے بیان کرے خواہ اسرارِ محبت کی گرہ کشائی کرے یا مناظرِ قدرت کی تصویر کھینچے، ہر موقع پر اس کا اندازِ بیان شاعرانہ رہنا چاہیے، ورنہ اس کی تمام جدت طرازیاں برباد ہو جائیں گی اور سننے والے پر کوئی اثر نہ ہوگا، خواجہ حافظ کا کمال یہی ہے کہ وہ ہر قسم کے علمی، اخلاقی، فلسفیانہ مضامین ادا کرتے ہیں، لیکن اندازِ بیان کی شاعرانہ رنگینی اور لطافت میں فرق نہیں آنے پاتا۔"

احسان صاحب شاعری میں اسکولوں اور جماعتوں کے قائل نہیں تھے۔ ان کے نزدیک شاعری کا صرف ایک ہی اصول اور محض ایک ہی معیار تھا اور یہ اسکول ومعیار ذوقِ صحیح اور وجدانِ سلیم تھا۔ جب بعض ادبی حلقوں سے یہ آواز بڑی شدّ ومد کے ساتھ اٹھائی گئی کہ اردو شاعری کے اصناف سے غزل کو خارج اور قافیہ وردیف کی قدیم پابندیوں کو غیر ضروری اور متروک قرار دینا چاہیے کیونکہ ان سے ادائے مطالب میں خلل اور دشواری واقع ہوتی ہے تو انہوں نے اس رائے کی نہایت پُر زور تردید کی، وہ تغزل کے وجود کو اردو شاعری کی وسعت کے لئے سدِّ راہ نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ منطق صحیح نہیں ہے کہ اگر کسی نا اہل اور بدمذاق کے غلط طریقہ استعمال کی وجہ سے کوئی حسین اور دلفریب چیز بدمنظر ہو جائے تو بجائے اس کے کہ نا اہلی اور بدمذاقی کی اصلاح کی جائے، سرے سے اس چیز ہی کو فنا کر دیا جائے۔ ان کا خیال ہے کہ تغزل فطرتِ انسانی کے لطیف ترین جذبۂ عشق ومحبت کی مصوری ہے۔ اس لئے اگر ہمارے شعرا کی کوئی خاص جماعت اس سے صحیح طور پر کام نہ لے سکی یا اس کے حقیقی مفہوم کو سمجھنے سے قاصر رہی تو اس سے یہ کیونکر استدلال کیا جا سکتا ہے کہ خود تغزل ہی ایک بدمزہ اور بے کیف چیز ہے اس بنا پر وہ کہتے ہیں کہ نفسِ تغزل کی مخالفت صحیح نہیں، البتہ ذوقِ صحیح اور وجدانِ سلیم کی فقدان کی وجہ سے اس میں جو معائب پیدا ہو گئے ہیں ان کی اصلاح کا بجا طور پر مطالبہ کیا جا سکتا ہے تاکہ شاعری کے صحیح اور فطری نشو ونما کی راہیں کھل جائیں۔

نثر نگاری کے بعد اب ہم دبستانِ شبلی کے اس بلبلِ رنگیں نوا کے چمنستانِ تغزل کی سیر کرنا چاہتے ہیں۔

احسان صاحب کو دیگر اصنافِ کلام پر بھی قدرت تھی۔ مگر ان کے طائرِ خیال کی اصل پرواز گاہ اور شاعرانہ رنگینی ولطافت کی خاص تماشا گاہ صنفِ غزل ہے۔ انہوں نے اس زمانے میں شاعری شروع کی تھی جب داغ، امیر اور جلال کا طوطی بول رہا تھا اور ان اساتذہ اور ان کے تلامذہ کے نغموں سے فضا گونج رہی تھی، رندی وہوسناکی، زلف وکمر، خط وخال اور ناز وادا کی عامیانہ مصوری ہی کو تغزل کی معراج سمجھا جاتا تھا، عشق کی اخلاقی عظمت وبرتری اور روحانی لطافت ونظافت کو نظر انداز کر کے اس کو فضائل ومحاسن سے عاری اور رذائل ومفاسد کا سرچشمہ خیال کیا جاتا تھا۔ دوسری جانب فانی اور ان کے ہمنوا شعرا کے نالہ وشیون اور فریاد وماتم نے تغزل کی بزمِ کیف وسرور کو تمام تر بزمِ حزن وملال میں تبدیل کر دیا تھا۔ مرزا صاحب نے ان دونوں رنگوں سے الگ اپنا ایک مستقل رنگ وآہنگ اختیار کیا۔ انہوں نے غزل کو پاکیزہ اور ستھرے خیالات اور بلند اور شریفانہ جذبات عطا کئے اور اپنی بزمِ تغزل میں رقیب، وعدہ، وصل وہم آغوشی اور نفس پرستی اور اوباشی کے شرمناک جذبات کو بار پانے کا موقع نہ دیا۔ ان کا محبوب کوئی بے شرم پیکرِ جسمانی نہ تھا جو بالائے بام علانیہ جلوہ فروشیاں کرتا ہوا بلکہ خوبی ولطافت کا وہ پیکرِ سادہ اور نورِ مجسّم تھا جس سے کائناتِ ہستی کا ہر ہر گوشہ روشن ہے:

بارگاہِ حسن کے بندے ذرا عظمت شناس
اب نہ یوں ذوقِ ہوس کو اپنے عریاں کیجئے

زخم کھاتے جائیے اور مسکراتے جائیے
عشق کی شانِ حقیقی اب نمایاں کیجیے
کیجیے آباد پھر معمورۂ کیف و سرور
یاس و حسرت کی بنائے کہنہ ویراں کیجیے
چھیڑیئے وہ نغمہ جس سے مست ہوں قلب و دماغ
ختم اب افسانۂ گورِ غریباں کیجیے

وہ غزل کو آسان نہیں بلکہ سب سے زیادہ دشوار اور مشکل ترین صنفِ شاعری خیال کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک غزل گو شاعر کے لئے قادر الکلام ہونا ہی ضروری نہیں ہے بلکہ دردمند دل، بیدار قلب، بے چین اور مضطرب روح اور نکتہ شناس نظر والا ہونا بھی ضروری ہے تاکہ وہ عشق و محبت کے شدائد و آلام کو کشادہ پیشانی اور خندہ روئی سے انگیز کر کے لطف اندوز اور لذت یاب ہو سکے اور اسکا کلام سوز و گداز کا مرقع بن جائے۔ وہ غزل گو شاعر کے لئے حسن و عشق کا عظمت شناس ہونا بھی ضروری سمجھتے تھے تاکہ وہ عشق کی اداؤں کو بلند اور حسن کی اداؤں کو لطیف خیال کرے اور محبوب کی چشمِ قہر و عتاب میں لطف و مسرت، غیض و غضب میں رحمت و راحت اور جور و ستم میں لذت و حلاوت محسوس کرے۔ مگر وہ حسن کے اس درجہ مرتبہ شناس ہونے کے باوجود عشق کی عظمت و برتری کے احساس سے کبھی غافل نہیں ہوتے۔ غیرت و خودداری کو عشق کی سرشت خیال کرتے تھے۔ اس لئے سراپا عجز و نیاز کے عالم میں بھی ان سے کیسی عامیانہ اور مبتذل اداؤں کا ظہور نہیں ہوتا جو عشق و محبت کی عظمت و بلندی کے منافی ہیں۔

طوالت مانع ہے تاہم ان دعووں کے ثبوت کے لئے مرزا صاحب کے کلام کے کچھ گہہائے آبدار پیش کئے بغیر طبیعت آگے بڑھنے کے لئے آمادہ نہیں ہے،

لے کر آیا ہوں ازل سے وہ دلِ آتش فشاں
جس میں ہیں قندیلِ بامِ عرش کے شعلے نہاں
ہوں وہ حقیقت آشنا جسکی نگاہِ شوق میں
حسن کی ہر ادا لطیف، عشق کی ہر ادا بلند
ہے جبینِ عشق میری وہ جبینِ خود شناس
جس کے سجدوں کا ہے طالب خود وہ حسنِ دلربا
اپنی ہستی کو مٹا کر ان کا جلوہ دیکھنا
یہ نہیں اہلِ حقیقت کا طریقِ جستجو
جو ہلا دیتی ہے بامِ عرش کے بھی کنگرے
عشق کی فطرت میں ہے وہ مستی و آشفتگی
ادائے ناز سے مجروح ہو کے مر جانا
کمال ہو، مگر یہ عشق کا کمال نہیں

کر دیا سیراب رگ رگ کو نشاطِ درد سے
دیکھ چشمِ قہر کا لطفِ کریمانہ ذرا
دیکھنے والا ہوں میں اس پیکرِ بے رنگ کا
جس کا حسن سادگی محتاجِ آرائش نہیں
کچھ عجب شوریدگانِ عشق کا بھی حال ہے
آنکھ محرومِ تماشا، دل میں جوشِ آرزو
ہے یہی شوریدگانِ عشق کا رازِ حیات
غم نہ گھٹ جائے کہیں، یہ درد ہو جائے نہ کم
دل میں اک طوفانِ غم اور لب تبسم در کنار
کوئی سمجھے تو مرا یہ رنگِ مستانہ ذرا

بارگاہِ حُسن کا وہ ہوں گدائے بے نیاز
جس کے آئینِ جنوں میں ہے تقاضا ناروا

عاصی و مجرم ہوں، لیکن ہوں وہ رندِ خود شناس
جس کا ذوقِ تشنگی منت کشِ ساغر نہیں

بیخودی میں ہاں گذر جا اے جنونِ آرزو
آستانِ حُسن سے بھی بے نیازانہ ذرا

احسان صاحب اصغر کی شاعری کو تغزل کا بہترین معیار سمجھتے تھے مگر کبھی کبھی وہ ڈاکٹر اقبال کا لب و لہجہ بھی اختیار کر لیتے ہیں، چند شعر ملاحظہ ہوں:

بزمِ اسرار کے پردوں کو اٹھنا تھا جسے — رہ گیا ہاتھ وہ پابندِ گریباں ہو کر

کہاں ہے آج وہ شاہینِ آرزو میرا — کہ جبرئیل بھی جس کا ہے بستۂ فتراک

بے نوائی میں وہ شانِ کجکلاہی ہے مری — جس کے آگے سرنگوں ہے سطوتِ تاجِ کئیں

وہ نشیمن ہے مرا گہوارۂ فکرِ بلند — جسکی گردِ راہ ہیں، یہ مہر و ماہ و کہکشاں

اٹھا نہ شیشہ و ساغر کی منتِ بیجا — خود اپنے کیفِ نظر سے شراب پیدا کر

دیکھ اپنے دل کی خونریز نگہباں — یہ بہارِ لالۂ صحرا نہ دیکھ
تو ہے خود اک شعلۂ عالم فروز — جلوہ گاہِ وادیِ سینا نہ دیکھ
اُٹھ لپٹ جا موجِ طوفاں خیز سے — یہ سکونِ ساحلِ دریا نہ دیکھ

مرزا صاحب کے تغزل میں عشق و محبت کے پاکیزہ اور شریفانہ جذبات کی مصوری کے علاوہ کہیں فلسفیانہ حقائق بھی بیان کئے گئے ہیں اور وہ بادۂ معرفت کے بھی لذت شناس تھے اسلئے شرابِ دو آتشہ کی گرمی و مستی بھی انکے کلام میں نظر آتی ہے علاوہ ازیں انہوں نے چند نظمیں بھی کہی ہیں جو انکے قومی و ملی درد اور حب الوطنی کی غماز ہیں۔ یہ نظمیں فکر و خیال کی لطافت و بلندی کے علاوہ احساسات و جذبات کی غیر معمولی شدت و تاثر کا نتیجہ اور شان و شکوہ اور زورِ بیان کے لحاظ سے نہایت اہم ہیں۔

انکے فنی اور ادبی کمالات کی طرح انکی سیرت و شخصیت کے جلوے بھی نہایت دل کش ہیں اس لئے ان کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔

احسان صاحب نہایت شریف النفس، پاک طینت اور بڑے سنجیدہ، متین اور باوقار شخص تھے۔ انکی زندگی بڑی سادہ اور فقیرانہ تھی وہ کسی قسم کا تکلف پسند نہیں کرتے تھے۔ بڑے کم سخن اور خلوت پسند تھے بیکار اور فضول باتیں کرنے کے مطلق عادی نہ تھے۔ ان کی جلوت میں بھی خلوت کا منظر ہوتا تھا۔ اہلِ علم و ادب کے سوا اور کسی طبقہ کے لوگوں سے زیادہ ربط و ضبط نہیں رکھتے تھے۔ دار المصنفین کے لوگوں سے ان کے مخلصانہ روابط و تعلقات تھے علامہ شبلی کی یادگار ہونے کی بنا پر ان کو اس سے بڑی محبت تھی اور وہ اسکی مجلسِ انتظامیہ کے ممبر بھی تھے۔

انہوں نے بڑی بے نیاز اور مستغنی طبیعت پائی تھی، نام و نمود اور شہرت و جاہ طلبی کی ان میں کوئی ہوس نہ تھی، انکو کبھی اپنی بے نوائی اور تہی دستی کا غم نہ ہوا، مدح گستری سے خود ان کی غیرت پسند طبیعت کو سخت اِبا اور نفرت تھی، مدۃ العمر میں انہوں نے کوئی قصیدہ نہیں لکھا۔ ان کی سعیِ قلم کا محرک کبھی کسی صاحبِ کلام کا ذاتی تعلق نہ ہوتا اور نہ وہ واقعیت و حقیقت سے خالی تحریروں کی مدح و ستائش کرتے تھے۔ البتہ کسی صاحبِ کمال اور جوہرِ قابل کی ناقدری کو سخت ناانصافی خیال کرتے تھے اسلئے جن ادیبوں اور شاعروں کی نگارشات میں انکو کوئی امتیازی خصوصیت اور مخصوص کیف نظر آتا تھا انکے بارے میں خاموشی کو ادبی جرم خیال کرتے تھے، اسی جوہر شناسی اور قدر دانی نے انکو جگر و اصغر کے مجموعے ترتیب دینے اور ان پر مقدمے لکھ کر شائع کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ ان حضرات کو گوشۂ گمنامی سے نکال کر ادبی دنیا میں متعارف کرانے میں ان کا بڑا دخل رہا ہے خصوصاً جگر کی شہرت کا آغاز تو مرزا صاحب کے مقدمہ ہی سے ہوا۔

احسان صاحب بڑے راسخ العقیدہ مسلمان تھے ان کا دل اسلامی جوش اور ملی حرارت سے لبریز تھا مگر اپنے عقیدہ و مسلک میں اسقدر پختگی اور شدت کے باوجود ان میں تعصب و تنگ نظری اور ضد اور ہٹ دھرمی نہ تھی بلکہ ان کا عمل اس پر تھا کہ ع مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا۔ اسلئے انکو جہاں کہیں انسانیت کی عظمت و شرافت اور اخلاص و محبت کا کوئی نقش یا جلوہ نظر آتا تھا اسکے سامنے بلا لحاظِ قوم و مذہب اپنی جبینِ نیاز خم کر دیتے تھے۔ انکی حق شناس نگاہ اور حقیقت پسند دل نے بھگوت گیتا کے بارے میں پوری فراخ دلی سے اس امر کی شہادت دی کہ "وہ کوئی افسانہ نہیں ہے بلکہ حقائق و اسرار کا ایک زریں صحیفہ ہے جسکے نقوشِ محبت ہمیشہ چمکتے رہیں گے۔ ایسی ہی مقدس کتاب کی تعلیم و ہدایت پر عمل کرنے سے انسان کے افقِ حیات پر چھائی مادہ پرستی کی تاریکی بہت کچھ زائل ہو سکتی ہے۔"

مذہب و ملت کی طرح انکے نزدیک علم و فن اور تحقیق و تنقید کے میدان میں بھی ہر قسم کی بیجا عصبیت سے خالی ہونا ضروری ہے، لکھتے ہیں: "ایک کامیاب محقق کی سب سے بڑی خوبی بلکہ سب سے زیادہ ضروری اور مقدم شرط یہ ہے کہ تحقیق و تنقید کے وقت اسکا دماغ ہر قسم کے قومی و مذہبی جذبات کی حکومت سے آزاد ہو، یعنی اس کو یہ سمجھنا چاہیے کہ اس کی حیثیت ایک وکیل کی نہیں جو اپنے فریق کے بیان کو خواہ وہ کتنا ہی غلط اور بے بنیاد ہو صحیح ثابت کرنے کے لئے ہر قسم کی کوشش کرتا ہے بلکہ اسکی حیثیت ایک حاکم عدالت کی ہے جسکو ایک غیر جانبدار انسان کی طرح صرف یہ دیکھنا ہے کہ واقعہ زیرِ تحقیق کی اصل کیا ہے اور اسکی تائید میں جو طرزِ استدلال اختیار کیا گیا ہے اس میں کچھ جان بھی ہے یا محض باد رہوا ہے۔"

اس مختصر اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا دل انسانی شرافت اور اخلاقی خوبیوں کا کسقدر مخزن تھا۔

●●

خلیل اللہ خاں تکیم پوری
لیکچرر گورنمنٹ پولی ٹیکنک گورکھپور (اتر پردیش)

ریاضؔ خیرآبادی کا "فتنہ و عطرِ فتنہ"

کہا جاتا ہے کہ انسان کمزور ہے اور اس کا ماحول سنگ دل۔ انسان حسّاس ہے اس لئے اس کا دل بہ آسانی رنج والم کا نشانہ ہو جاتا ہے۔ اس کے دل میں فطرت نے ایسی امنگیں، ایسی تمنائیں پیدا کر دی ہیں کہ وہ فطری طور پر ان امنگوں، ان تمناؤں کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتا ہے لیکن جہاں اس کی تمناؤں نے عملی صورت اختیار کی وہیں اس کی تکلیفوں کی داستان شروع ہو جاتی ہے۔ دنیا اس کی تمناؤں کی پروا نہیں کرتی۔ حسّاس انسان اس بے حس طاقتور اور ظالم دنیا سے ٹکراتا ہے اور مصائب جھیلتا ہے۔ یہ زندگی کی حقیقت ہے لیکن شاید پوری نہیں۔

دوسرا خیال یہ ہے کہ انسان ہنسنے ہنسانے والا جانور ہے۔ یہ بھی پوری حقیقت نہیں۔ فطرت نے انسان کو ہنسی کا مادہ عطا کیا ہے۔ جسے ہنسی نہیں آتی اس کو انسان نہ کہنا چاہئے۔ ادب انسان کے تمام دماغی اوصاف کو بروئے کار لاتا ہے۔ ہنسی بھی ایک انسانی خصوصیت اور زندگی کی ناتمامی کا نتیجہ ہے اس لئے ادب میں اس کا وجود ناگریز ہے۔ ادب ہنسی کا بھی ترجمان ہے۔ اور رقت انگیز پہلو کا بھی۔

ہنسی عدم تکمیل اور بے ڈھنگے پن کے احساس کا نتیجہ ہے۔ ظرافت نگار کسی بے ڈھنگی چیز کو دیکھ کر ہنستا ہے اور دوسروں کو ہنساتا ہے۔ ظرافت نگار ہو یا ہجو گو۔ دونوں صنّاع ہیں ان کا مقصد ایک حسین مکمل و موزوں کارنامے کی تخلیق ہے۔ طنز نگار ایک بلند پایہ اخلاق کا حامل ہوتا ہے جو اپنے بلند مقام سے انسانی کمزوریوں، خامیوں اور فریب کاریوں کو اپنے طنز کا نشانہ بناتا ہے اس کے کارنامے ہماری تفریح کا باعث سہی لیکن اس کا اصل مقصد ایک حسین اور مکمل کارنامے کی تخلیق ہے۔

ریاضؔ خیرآبادی ایک کامیاب ظرافت نگار ہیں ان کی صحافی سرگرمیاں طنز و مزاح سے بھرپور رہیں۔

"گلکدۂ ریاض"، "ریاض الاخبار"، "صلح کل" اور "فتنہ و عطرِ فتنہ"، سب ایک ہی تصویر کے مختلف روپ ہیں جو انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد سے ابھرا بھر کر مٹتے رہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جس قسم کی سوسائٹی نے جنم لیا اس میں صحت مند ظرافت کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اس زمانے کے خاص اخبارات سرسیّد کا "تہذیب الاخلاق"، "انتخاب اودھ پنچ" اور "زمیندار" لاہور کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ "اپریل فول" ہیں۔ اس وقت کچھ گھٹیا قسم کے ظریفانہ اخبار "ملّا دوپیازہ" (لاہور) "جعفر زٹلی"، "بالے خاں"، اور "رفیق ہندوستان" بھی شائع ہوتے تھے۔ انیسویں صدی کے اختتام تک مزاحیہ اخبارات کی تعداد ہندوستان بھر میں پچاس سے اوپر پہنچ چکی تھی ان میں زیادہ تر اخبارات ایسے تھے جن کی نہ کوئی پالیسی تھی نہ پروگرام، "موج ظرافت" (ہوشنگ آباد) "ظریف" بنارس، "ظریف ہند" (دہلی) "شیخ چلی" (سیالکوٹ) وغیرہ جیسے مزاحیہ اخبارات اسی زمرے میں آتے ہیں۔ ان کے علاوہ کہیں کہیں مزاحیہ صحافت کے بکھرے ہوئے اوراق اور بھی مل جاتے ہیں لیکن انہیں کسی مستقل تالیف کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔

"فتنہ" کے پس منظر میں وہ چھیڑ خانیاں ہیں جو دلّی اور لکھنؤ کے لوگوں نے بزم میں رزم کے طور پر پیدا کرنا شروع کر دی تھیں۔ اہلِ دلّی کہتے تھے۔

دلّی کے لوگ لکھنؤ والوں کے سامنے
چلتے ہیں جیسے شیر غزالوں کے سامنے

اور لکھنؤ والوں کا یہ دعویٰ تھا۔

دعویٰ زباں کا لکھنؤ والوں کے سامنے
اظہارِ بو ہے مشک غزالوں کے سامنے

اس رزم آرائی میں اس وقت "اودھ پنچ" اکیلا حصہ لے رہا تھا "ریاض الاخبار" اس حد تک ان مباحثوں میں حصہ لیتا تھا جہاں تک سنجیدہ صحافت کا تعلق تھا اس لئے "ریاض الاخبار" کے ضمیمے کے طور پر "فتنہ" جاری کیا گیا۔ "اخترِ شاہنشاہی" میں تحریر ہے کہ "فتنہ" کا پہلا شمارہ ۸ جولائی ۱۸۸۲ء کو نکلا۔ "فتنہ" کی نوعیت و اجرا کے بارے میں نادم سیتاپوری کے ذیل کے بیان سے کافی روشنی پڑتی ہے۔

"فتنہ گورکھپور۔ محلہ نخاس۔ ہفتہ وار۔ آٹھ ورق خورد۔ چندہ سالانہ ایک روپیہ آٹھ آنے۔ مجاریہ ریاض الدولہ بہارالملک منشی سیّد ریاض احمد رئیس خیرآبادی۔ مہتمم منشی نظام احمد انداز رئیس خیرآباد۔ پرنٹر لالہ ستیلا بخش۔ کاتب رام بخش۔ از مطبع ریاض الاخبار۔ اجرا ۸ جولائی ۱۸۸۲ء"

("انتخاب فتنہ" نادم سیتاپوری ص ۲۹)

"فتنہ" کا پہلا دور ۱۸۸۲ء سے شروع ہو کر ۱۸۹۲ء پر ختم ہو جاتا ہے "فتنہ" کا دوسرا دور ۱۹۰۳ء سے شروع ہوتا ہے جس کا تعلق حکیم برہم سے ہے جو ہمارے موضوع سے کچھ دور ہے۔ "فتنہ" کی بہت سی فائلیں میری نظر سے

بھی گذری ہیں۔ یہ جیبی سائز کا رنگ برنگا ضمیمہ چہارشنبہ کے دن "ریاض الاخبار" کے ساتھ شائع ہوتا تھا جس کے سرورق پر "گل قصیدۂ فتنہ" "اڈیشن ریاض الاخبار" تحریر ہوتا تھا۔ شروع شروع میں اس کی ضخامت سولہ صفحے تھی۔ مگر یکم جنوری ۱۸۸۵ء سے مزید سولہ صفحات "عطرِ فتنہ" کے نام سے اور بڑھا دیئے گئے۔ "عطرِ فتنہ" اصل میں ایک گلدستۂ شعر و سخن تھا جس میں اس دور کے مشہور گلدستوں کا انتخاب شامل ہوتا۔ اس کے سرورق پر یہ شعر چھپا ہوتا ؎

چھانٹا وہ دل کہ جس کی ازل میں نمود تھی
پسلی پھڑک اٹھی نظرِ انتخاب کی

"عطرِ فتنہ" کے سولہ صفحات کے اضافہ ہونے کے بعد "فتنہ" اور "عطرِ فتنہ" ایک چیز ہو گئے۔ صفحات کا اضافہ تو ہو گیا لیکن سالانہ چندہ میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا۔ جن گلدستوں سے "عطرِ فتنہ" میں انتخاب کیا جاتا ان میں "گلچینِ زبانِ فغاں"، "ارمغان"، "ریاضِ سخن"، "پیامِ یار"، "سراجِ سخن" وغیرہ شامل تھے۔

"فتنہ" کو پوچھتا ہے کوئی اس ادا کے ساتھ
چھوٹا سا دہ ریاض کا اخبار کیا ہوا

"فتنہ" اتنا مقبولِ عام تھا کہ ذرا بھی پہنچنے میں دیر ہو جاتی تو خریداروں کی بے چینی بڑھ جاتی۔ خط پر خط بھیجتے۔ یہاں تک کہ رجسٹری اور تار کی بھی نوبت آ جاتی۔ نازنینانِ پری تمثال تو "فتنہ" کو اتنا پسند کرتی تھیں کہ پاتے ہی اپنی چولی میں رکھ لیتی تھیں۔ ریاض خیرآبادی کا یہ چھوٹا سا اخبار معیاری صحافت و ظرافت کا ایک اعلیٰ نمونہ تھا جس کے متعلق پہلے دن ہی سے یہ خیال تھا۔ ؏

ابھی فتنہ ہے کسی دن یہ قیامت ہوگا

ریاض کا یہ چھوٹا سا اخبار مذاق، شگفتگی اور پختگیٔ تخیل کی جدّت، ندرت اور نزاکت کی گویا کھنچی ہوئی روح تھی۔ ہلکے سے رنگ اور کٹے ہوئے ورق جیسے ورقِ گل۔ پاکیزہ خط۔ حسین و دلکش سیاسی کارٹون۔ دلچسپ اسکیچ۔ منتخب اشعار اور چھوٹے چھوٹے پیارے پیارے ادبی سیاسی، ظریفانہ مضامین۔ ہلکی ہلکی مذہبی چوٹیں۔ زبان کی نزاکت۔ عنوان کی جدّت، خبروں کی لطافت۔ یہ تھا "فتنہ"، جو پیامِ یار کو زبان پر لانے کا ایک ذریعہ تھا۔ "فتنہ و عطرِ فتنہ" کا مقصد انقلاب یا اصلاح میں آسودگی تھا۔

محمد طفیل صاحب ایڈیٹر "نقوش"، لاہور، "نقوش" کے "طنز و مزاح نمبر" میں "فتنہ" اور "عطرِ فتنہ" کی ادبی فضیلت کے بارے میں اپنی رائے اس طرح پیش کرتے ہیں:

"یہ پرچے ریاض خیرآبادی نے نکالے اور "اودھ پنچ" کے زمانے میں ہی نکالے۔ یہ پرچے "اودھ پنچ" کی ٹکر کے تو نہ تھے مگر ریاض کی شگفتہ بیانیوں نے ان کی حیثیت کو مزید منوا لیا تھا۔ "اودھ پنچ" کے ساتھ تو لکھنے والوں کی ایک بہت بڑی ٹیم تھی۔ یہی اس کی حیثیت بھی تھی ورنہ اکیلے سجاد حسین کیا کرتے۔ مگر ادھر قریب قریب ریاض اکیلے ہی تھے۔ ان پرچوں کے بارے میں بھی ہماری یہی کوشش رہی کہ ان پرچوں کے انتخاب سے زیادہ اس پرچے کے عام معیار اور روش کا اندازہ ہو سکے بہرحال طنز و مزاح کے سلسلے میں ان پرچوں کو کوئی بھی نظرانداز نہیں کر سکتا۔ جب خضر صورت ریاض نے اپنے آپ کو بھی نہ بخشا ہو تو اوروں کی تو بات ہی جانے دیں۔ اگر آپ نے ریاض کی تصویر دیکھی ہے تو پھر ان کا یہ شعر بھی دیکھئے۔

بڑے نیک طینت، بڑے صاف باطن
ریاض آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں

"فتنہ" کو اس دور کی ظریفانہ صحافت میں جو اہم مقام حاصل ہے اس کو اردو ادب میں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

عقیل احمد جعفری کے الفاظ میں "فتنہ" کی تعریف خود "فتنہ" کی زبان سے سنئے جس سے "فتنہ" کے ادبی مرتبہ پر روشنی پڑتی ہے۔

"فتنۂ عالم کے اس بوٹے سے قد اور پھندنے سے ڈیل پر کہیں فتنہ قامتوں کی نظر نہ لگ جائے۔ ایک تو ماشاء اللہ حسن خداداد۔ نوک کا جوان اس پر خوشنما لباس۔ گلے میں طلائی جدول کا جڑاؤ کنٹھا۔ سہرے۔ لفظوں کا نازک نازک زیور، بین السطور چھوٹے چھوٹے پھولوں کے ہار اللہ رے نکھار۔ اللہ ری بہار۔ ہزار چمن صدقے کر دو جب بھی جی نہ بھرے"

(نقوش لاہور "طنز و مزاح نمبر" ص ۳۷۰)

ریاض کے مزاح کی سب سے بڑی خوبی اس کی گلکاریاں ہیں۔ ریاض کا طنز صاف ستھرا ہے اور ذاتی اغراض اور ہنگاموں اور فسادات سے کافی دور ہے۔ "فتنہ" اور "عطرِ فتنہ" اپنی گلکاریوں سے عوام کے دلوں کو مسرّت اور اعلیٰ قسم کا طنزیہ ادب بخشتا رہا۔ ریاض یہ ادبی خدمت قریب قریب سنہ ۱۹۰۲ء تک انجام دیتے رہے۔ فتنہ کا دوسرا دور ۱۹۰۲ء سے شروع ہو کر سنہ ۱۹۱۱ء تک چلتا ہے پھر بھی سنہ ۱۹۰۲ء سے سنہ ۱۹۰۷ء تک "فتنہ" اور "عطرِ فتنہ" کی ادبی سرگرمیوں کی ذمہ داری کافی حد تک ریاض ہی پر ہے۔ سنہ ۱۹۰۷ء کے بعد سے "فتنہ اور عطرِ فتنہ" کی سرگرمیوں کا سہرا صرف حکیم برہم کے سر ہے۔ گاہے بگاہے کچھ ریاض کی نظم و نثر کے بارے میں نکل جاتا تھا غرضیکہ "فتنہ" سنہ ۱۹۱۱ء میں نکلنا بند ہو گیا اور حکیم برہم کی تمام صلاحیتیں "مشرق" کے چمکانے میں صرف ہونے لگیں۔

اب ہم اس دور کے "فتنہ" کی فائلیں پیش نظر رکھ کر ریاض کے طنز و مزاح کے چند نمونے پیش کرتے ہیں۔ لیجئے سب سے پہلے فتنہ کا القاب و آداب ہی ملاحظہ ہو۔

"ڈبیرہ فتنہ" توکردں تسلیم اور کارڈ بوں سلام۔"

(فتنہ ۱۲ فروری ۱۸۸۶ء)

"فتنہ و عطرِ فتنہ" اپنی ادبی چوٹوں کیلئے ہمیشہ طنز و مزاح کی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتا رہے گا۔ ذیل کا ایک ادبی لطیفہ بہ عنوان "بارِ شتر" ملاحظہ ہو۔

"پیارے لال جو امتحان "بارسٹری" پاس کر کے آئے ہیں ان کے نام کے ساتھ لکھا ہوا تھا بارسٹر، مگر پڑھا گیا "بارِ شتر" پڑھنے والے صاحب ہمارے دفتر میں پوچھنے آئے کہ صاحب "بارِ شتر" کون عہدہ ہے جو ولایت سے امتحان پاس کرنا پڑتا ہے۔ ہم یہ سن کر اس لئے خوش ہوئے کہ ترقی کا زمانہ ہے "بارِ خر" نے بھی "بارِ شتر" پہ ترقی کی!"

(فتنہ جلد نمبر ۴ شمارہ نمبر ۸ ۱۲ فروری ۱۸۸۶ء)

ایک مضمون زیرِ عنوان "پہچان" "فتنہ" سے ہم نقل کرتے ہیں۔

۱۔ لندن کے شریف کی پہچان۔ جو داڑھی منڈائے برلب سڑک نہائے۔

۲۔ روس کے شریف کی پہچان۔ جو عورت بغیر شادی لڑکا جنے۔ وہ لڑکا اول درجے کا شریف ہے۔

۳۔ ہندوستان کے شریف کی پہچان۔ جس کا نام مندرج گزٹ ہو عہدیدار انگریزی ہو۔

۴۔ شائستہ کی پہچان۔ کالا منہ، لال سر، پاؤں میں بوٹ، ہاتھ میں چرٹ کشادہ رد، لہجہ انگریزی۔

(راقم شوخ نگار "فتنہ" ۱۲ فروری ۱۸۸۶ء)

کچھ شوخ نگار کے مضامین اور ملاحظہ ہوں۔

"چین لکھتی ہے مرے واسطے قسمت میری"

(۱) کہاں کس کو چین ہے؟
پولیس میں تحقیقاتی کو
دیوانی میں، امین عدالت کو
لگن بیاہ میں، نیک بانوں کو
جنگِ سلاطین میں، اہلِ اخبار کو

. . . .

بھول جانا چاہیئے
اپنی — عطا کو
دوست کی — خطا کو

عزیز — آوارہ کو
خواہش — نفسِ امّارہ کو

(۳) ناقابلِ اعتبار
حیاتِ مستعار
دولتِ بے شمار
زن فرمانبردار
اسپِ شائستہ اطوار
شمشیرِ آبدار۔ دوستیٔ شاہان۔ چاپلوسیٔ دشمناں

(فتنہ ۱۲ فروری ۱۸۸۶ء)

چند چیزیں چند چیزوں کو بڑھاتی ہیں۔
بحث — علم کو
علم — عزت کو
خلق — محبت کو
تجارت — مال کو
عبادت — کمال کو

(راقم رخشاں جھجھری)

"فتنہ و عطرِ فتنہ" کے کچھ اور اقتباسات پیش خدمت ہیں۔

"موسمی رت" راقم "حق شناس"

آئی بہار ساقیا۔ جامِ شراب دے پلا
پھول کھلے۔ پھلے شجر۔ ابر اٹھا ہوا چلی

(۱) پہلا خیال
کیا کیا خوشامدیں ہیں کہ پی لوں بہار میں
بادل کے ٹکڑے سر پہ مرے چھائے جاتے ہیں

(۲) اب
وہ رت بدل گئی، وہ ہوائیں بدل گئیں
رندی سے اتقا کی بنائیں بدل گئیں

(۳) نہ جوانی نہ شباب۔ نہ روپیہ۔ کسی تھیٹریکل کمپنی کے مینیجر سے سانٹھ گانٹھ ہوتی تو پھر یہ ہم سے نہ بھاگتے۔

زمانے میں ڈرنے کی اک شے ہمیں تھے
ہمیں لوٹ لیتے ہیں جو بن کسی کا!

(۲۰ جون ۱۸۹۵ء جلد ۱۲ شمارہ ۲۵)

"فتنہ و عطرِ فتنہ میں اکثر اکبر الہ آبادی کا مزاحیہ کلام بھی شائع ہوتا رہتا تھا۔ چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

لیجیۓ اب آگے ملاحظہ فرمائیے۔

کالج کے سماں میں مست ہو جاتے ہیں
گھر کی حالت میں پست ہو جاتے ہیں
آخر اس کشمکش سے بچنے کے لئے
خود بیں یا مئے پرست ہو جاتے ہیں

دنیا سے میل کی ضرورت ہی نہیں
مجھ کو اس کھیل کی ضرورت ہی نہیں
درپیش ہے منزلِ عدم اے اکبر
اس راہ میں ریل کی ضرورت ہی نہیں

(جون ۱۸۹۵ء)

"فتنہ" کی نثر بھی معیاری تھی۔ "فتنہ و عطرِ فتنہ" سے ہم ایک ادبی پارہ نقل کرتے ہیں۔ جو "ریاض الاخبار" کو مبارکباد کے سلسلہ میں لکھا گیا ہے۔ ذرا بیان اور زبان ملاحظہ ہو۔

• دروازۂ باغ مثلِ آغوشِ عاشق کھلا ہوا تھا۔ اندر داخل ہوئے۔ ہر تختۂ چمن پری بنا ہوا تھا۔ ہر درخت قسم قسم کے پھلوں پھولوں سے لدا نظر آتا تھا۔ گلہائے رنگا رنگ و شگوفہائے بوقلموں۔ عندلیبان خوشنما پھولے ہوئے پہلوئے گل میں زمزمہ سرا۔ نرگسِ مست تازہ آنکھیں کھولے ہوئے۔ قمریاں ہر سرو پر نعرہ زن، ہر گل آبِ شبنم سے منہ دھوئے ہوئے سنبل زلفِ عنبریں کھولے ہوئے۔ ہر روش آراستہ، باغ اسبابِ نشاط سے پیراستہ۔ صبح کا سہانا سماں، نسیمِ سحر ادائے مستانہ سے اٹکھیلیاں کرتی ہوئی، ساتھ ہی حسینانِ نازک کمر پائینچے اٹھائے ایک دوسرے کا ہاتھ میں ہاتھ لیئے۔ ہنستے مسکراتے کھلکھلاتے چلے آتے ہیں۔

بال زلفوں کے پیچ کھائے ہوئے
پائنچے ہاتھ میں اٹھائے ہوئے
اپنے دامن کو سنبھالے ہوئے بھولے پن سے
وہ چلے آتے ہیں دل لے کے مکرنے والے (ریاض)

دنیا کی پڑ رہی ہیں نگاہیں ریاض پر
کس نوک کا جوان ہے کس آن بان کا

قیامت کو نہ دوں تشبیہ اس کی چال سے کیونکر
اٹھا کر راہ میں چلتے ہیں فتنے جس کے داماں کو

عدم کا بھی رستہ نہ سیدھا رہا
کہ اس کی کمر آج بل کھا گئی

تم جوانی کے مزے لوٹو ریاض
عیب بھی زیبا ہے اس سن کے لئے

دُنیا میں اس کے ہاتھ کا پالا رکھے
منہ حاسدِ کمبخت کا کالا رکھے
(تہنیت کا گیت گایا۔ ریاض الاخبار کو مبارک باد کئے ختنے کو کیوں)

(۸ جولائی ۱۸۹۰ء، جلد ۱۶ شمارہ ۴۴)

"فتنہ" کا طنز و مزاح صرف ریاض کی ذات تک محدود نہ تھا بلکہ اس طنز و مزاح کے رنگ میں اس دور کے کچھ لکھنے والوں کو رنگ دیا گیا تھا۔ اور اس طرح سے ریاض نے اُردو ادب میں طنز و مزاح سے متعلق نامہ نگاروں کی ایک ٹیم بھی تیار کرنے کی کوشش کی جن کی قلم فرسائی ہمیشہ کے لئے ادب میں جاوداں رہے گی۔

ریاض نے "فتنہ اور عطرِ فتنہ" سے اس وقت کے سماج میں سنجیدہ مزاح کے عناصر پیدا کئے اور اُردو ادب کی ایسی خدمت کی جو کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی۔

بقیہ: بھارت کے نوجوانوں سے چند سوال

اور پولیس کانسٹبلوں سے جھگڑا کر کے، اُن سے ہاتھا پائی کر کے؟

(۱۱) آپ کا محبوب لباس کیا ہے؟

— نیکر اور قمیص یا خاکی پتلون اور بش شرٹ (جیسا ہماری فوج کے جوان پہنتے ہیں)؟

— چوڑی دار پاجامہ اور شیروانی (جیسا کہ جواہر لال نہرو پہنتے تھے)؟

— کھدر کا کرتا، دھوتی، جواہر جیکٹ اور گاندھی ٹوپی جیسے جے پرکاش نارائن پہنتے ہیں)؟

— پتلی مُہری کی چُست پتلون یا ڈھیلا ڈھالا بیل باٹم BELL BOTTOM، لال پیلی، پھولوں، پتوں چڑیوں والی بش شرٹ جیسے کہ ٹیڈی بوائز، بیٹل اور ہپنگ پہنتے ہیں)؟

— گندی جیکٹ "جینز" (JEANS) پرزنانہ کڑھا ہوا کرتا اور گلے میں جوگیوں والی مالا اور بیلوں کے گلے کی گھنٹیاں (جیسا کہ "ہپی" پہنتے ہیں)؟

نوٹ: ان سوالوں کے جواب دیجیے۔ پھر اُن جوابوں کی جانچ کر کے اپنے آپ کو نمبر دیجیے۔ کتنے نمبر پائے آپ نے؟ یہ راز اپنے دماغ میں محفوظ رکھیے۔

غزلیں

لطف الرحمٰن

خاتون منزل، محلہ سرائے بھاگل پور (بہار)

کسے خبر ہے کہ یہ سانحہ ہوا کیسے
میں اپنی ذات کا ڈر ہو کے رہ گیا کیسے
تمہارے بعد یہ چپ کے حصار ہی میں آ با
تمہیں کہو کہ تمہیں پھر پکارتا کیسے
ترا کرم ہے کہ اظہار ہو گیا آساں
میں اپنے درد کا لہجہ سنوارتا کیسے
عجیب راز ہے کھلتا نہیں ہونے پر
میں حادثہ ہوں تو یہ حادثہ ہوا کیسے
گیا نہ دل سے اداسی کا سخت سناٹا
تمہارے پاس بھی رہ کر ہوں بے صدا کیسے
وہ مجھ سے دور، مجھے لے کے چلنے والا تھا
وہ اپنے آپ کو اس وقت پا گیا کیسے

مانوس سہسرامی

محلہ الٰہی آدم خاں، پوسٹ سہسرام ضلع آرہ (بہار)

دل پہ اُن کی سرد مہری کا اثر کیا کیا ہوا
چیخ اٹھی زندگی احساسِ غم اتنا ہوا
ہر طلب کا کچھ نہ کچھ معیار ہونا چاہیے
راہ میں کیا کیا عذابِ جستجو رسوا ہوا
گردِ ناکامی نے منزل کا نشاں گم کر دیا
کاش مل جاتا مسافر ہی کوئی بھٹکا ہوا
شدتِ احساس کیا یہ مستقل اک روگ ہے
اتنی کوشش پہ بھی دل کا بوجھ کب ہلکا ہوا
دل پہ کیا گزری ہے اسکے یہ اسی سے پوچھیے
جس نے خود دیکھا ہوا اپنا کارواں لٹتا ہوا
اس کہانی کے لئے تو ایک دفتر چاہیے
زندگی کیا زخم اک مانوس ہے رِستا ہوا

اخگر مشتاق رحیم آبادی

ینگر وزر لاج، پوسٹ رحیم آباد، ضلع لکھنؤ، (اتر پردیش)

کب دل سے کوئی آہ نکلنے کے لئے ہے
جو درد ہے اشکوں ہی میں ڈھلنے کے لئے ہے
ہلکا سا تبسم بھی لبوں پر دمِ وعدہ
اقرار کا مفہوم بدلنے کے لئے ہے
حیراں نہ ہوں سرکار مری لغزشِ پا پر
یہ لغزشِ پا بھی تو سنبھلنے کے لئے ہے
تارے کو بھی اُس پھول پہ رشک آئے نہ کیونکر
جو پھول سرِ زلف ہی کھِلنے کے لئے ہے
کیا کیجیے شرحِ دلِ آوارۂ غربت
اک پھول ہے جو دشت میں کھِلنے کے لئے ہے
اخگر دلِ خود رفتہ کا ہر عقدۂ دشوار
اک ناخنِ رنگیں ہی سے کھُلنے کے لئے ہے

کمالؔ مالیر کوٹلوی

معرفت اختر پرویز، لوہاراں اسٹریٹ مالیر کوٹلہ (پنجاب)

رنگینیاں دکھائیں چمن میں ہزار پھول
ہونگے نہ پھر بھی ہمسرِ روئے نگار پھول
ہر پھول گو حسین ہے باغِ حیات کا
تم سا مگر دکھائے کوئی پُر بہار پھول
گلکاریاں تو دیکھیے رفتارِ یار کی
گویا بکھر گئے ہیں سرِ رہ گذار پھول
پھولوں کے حسن پر ہے زمانہ فریفتہ
اے جانِ آرزو تجھے کرتے ہیں پیار پھول
ذکر آ گیا کمالؔ یہ کس کے شباب کا
شاخوں پہ مسکرائے ہیں بے اختیار پھول

نازؔ قادری

جیل روڈ۔ مظفر پور (بہار)

نظر نظر میں کوئی شوخ گلبدن تو نہیں
نفس نفس میں بسی نکہتِ چمن تو نہیں
شبِ فراق بہلتا ہے جس سے دل میرا
یہ چاندنی بھی ترا عکسِ پیرہن تو نہیں
جلا رہا ہوں جہاں خونِ دل سے شمعِ وفا
وہ تیرے حسنِ تغافل کی انجمن تو نہیں
سفرِ حیات کا جاری ہے آج بھی لیکن
نگارِ زیست میں پہلا سا بانکپن تو نہیں
قلم بدست رہوں گا میں عمر بھر اے نازؔ
جو رکھ دے ہاتھ سے تیشہ وہ کوہکن تو نہیں

ثمرؔ کبسوانی

۳۷۔ امین آباد پارک، لکھنؤ (اتر پردیش)

یہ کون میکدہ بردوش بادہ خوار اُٹھا
صراحی جھوم اُٹھی ابر کوہسار اُٹھا
ہمارے جہدِ مسلسل کا نام ہے منزل
قدم رکا ہی نہیں پھر جو ایک بار اُٹھا
خرامِ یار بھی اے دوست اک قیامت ہے
چلا وہ دو ہی قدم حشر بار بار اُٹھا
چمن کے پھول بھی کیا پست حوصلہ نکلے
کہ چار دن بھی نہیں زندگی کا بار اُٹھا
ثمرؔ کی آہ کا سوزِ دروں بھٹکتا تھا
بگولا بن کے جو صحرا میں بار بار اُٹھا

نئی کتابیں

میرا وطن ہندوستان (مجموعۂ کلام) شاعر: بدیع الزماں خاور
ناشر: پی کے پبلیکیشنز، ۳۰۷۴ پرتاپ اسٹریٹ، دریا گنج دہلی
قیمت چار روپے

یہ بدیع الزماں خاور کی قومی اور وطنی نظموں کا مجموعہ ہے جیسا کہ دیباچے میں کہا گیا ہے: خاور کو اپنے وطن کی سرزمین سے والہانہ لگاؤ ہے اور سرزمین وطن اور اس کی تہذیبی روایات سے اس جذباتی لگاؤ کے ساتھ ساتھ انہیں اُس جدوجہد سے بھی گہری دلچسپی ہے جو اُن کے ہم وطن ملک کی آزادی اور سالمیت کو قائم رکھنے اور عوامی زندگی کو نئی بلندیوں تک لے جانے کے لئے کر رہے ہیں۔ اس جدوجہد سے اُن کی دلچسپی ہی کا ایک اظہار ان کی وہ نظمیں ہیں جن میں اُنہوں نے اُن سیاسی شخصیتوں کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے جنہوں نے آزادیٔ وطن کی تحریک کو کامیابی کی منزل تک پہنچانے کے بعد آزادی کے بعد کی تعمیرِ نو کی جدوجہد کی رہنمائی کا فریضہ بھی انجام دیا اور آخری دموں تک وطن کی سربلندی کے لئے کوشاں رہیں۔ یہ نظمیں اُن شخصیتوں پر ہیں جو اب ہم میں نہیں رہیں، لیکن ان کا اختتام اُنھوں نے مایوسانہ انداز میں نہیں کیا اور اس نکتے پر زور دیا ہے کہ ان شخصیتوں کی دائمی رخصت حوصلہ شکنی پر منتج نہیں ہونی چاہیئے۔ زندگی کے قافلے کو بہر صورت ارتقا کی راہ پر گامزن رہنا ہے۔

موضوعاتی نظمیں بالعموم کیف و اثر سے خالی ہوتی ہیں لیکن اس مجموعے میں شامل نظموں کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جا سکتی۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ ان موضوعات پر خاور نے صرف رسمی انداز میں توجہ نہیں کی ہے اور یہ نظمیں ان کے حقیقی جذبات کی آئینہ دار ہیں۔

معجونِ نشاط مصنف: نواب حیدر علی خاں حشم۔
ناشر: سید مہدی حسین اختر بلگرامی، صادق منزل، ۲۸ حکمت نرائن روڈ، لکھنؤ۔

جیسا کہ سید مسعود حسن ممتاز رضوی نے اس پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا ہے، یہ کتاب واقعی اسم بامسمیٰ ہے حشم صاحب نے اُردو کے مختلف اُدوار کے ممتاز شاعروں کی مشہور و مقبول غزلوں میں ایسی دلچسپ تحریفات کی ہیں کہ اُنھیں پڑھ کر حشم صاحب کی بذلہ سنجی اور ان کے ذہنِ رسا کی خلاقانہ شوخی کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ ان تحریفات کے تنوع سے قطع نظر کہ یہ بھی ایک داد طلب وصف ہے، اُن کی جو خوبی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے، وہ یہ ہے کہ جس شاعر کے کلام میں تحریف کی گئی ہے اُس کے رنگِ سخن کو حشم صاحب نے ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے مثال کے طور پر یہ چند شعر دیکھئے۔ ان میں واوین میں جو مصرع ہے وہ اصل شاعر کا ہے اور دوسرا حشم صاحب کا۔ مصرعے بالترتیب میر، آتش، غالب اور مومن کے ہیں:

بڑھا تو ہوگا حشم آج تم نے پیری میں
"جو کچھ کہ میر کا اس عاشقی نے حال کیا"

"ڈھیلے کھاتے ہیں بے ثمار درخت"
قدِ جاناں ہے میوہ دار درخت

پہلے آتی تھی بات بات پہ شرم
"اب کسی بات پر نہیں آتی"

پارسا تجھ کو سمجھ کر آئی تھی بنت العنب
"تجھ سے اے مومن خدا سمجھے یہ تو نے کیا کیا"

کہیں کہیں شوخی اپنی حد سے گزر کر رکاکت کو پہنچ گئی ہے، جو سنجیدہ ظرافت کی اس مجموعی فضا میں جس کی یہ کتاب حامل ہے، گراں گزرتی ہے اس طرح کے اشعار حذف کر دیئے جاتے تو مناسب تھا۔ سرورق کا ڈیزائن بھی کچھ زیادہ شوخ ہو گیا ہے۔

پیاسے لفظ (مجموعۂ کلام)، شاعر: راہی پرتاپ گڑھی۔
اشاعت: زیرِ اہتمام آل انڈیا اُردو سوسائٹی لکھنؤ۔ قیمت تین روپے۔
راہی پرتاپ گڑھی صاحب کے اس مجموعۂ کلام میں نظمیں

غزلیں، قطعات اور ایک مختصر عشقیہ مثنوی شامل ہے۔ اُن کے نزدیک شاعری دل بہلاوے کی چیز ہے۔ ان کا خیال ہے کہ غم غلط کرنے کے لئے شعرگوئی سے بہتر کوئی شغل نہیں اور اپنی شاعری سے اُنہوں نے یہی کام لیا ہے۔ کسی شادی میں کوئی خوبصورت لڑکی نظر پڑی، انہیں اچھی لگی مگر اس نے ان کی طرف کچھ توجہ نہ کی۔ مگر اگر انہوں نے ایک نظم لکھ ڈالی اور یہ کہہ کر اپنا دُکھ دُور کر لیا ؎

آپ نے گو کہ مجھے پیار سے دیکھا بھی نہیں　　کوئی پیغام محبت مجھے بھیجا بھی نہیں
آپ کو ڈھال لیا پھر بھی غزل میں اپنی　　آپ کو میں لئے پھرتا ہوں بغل میں اپنی

یا اُن کی بیگم صاحبہ میکے گئیں۔ اُن کے بغیر اکیلے گھر میں اُن کا جی گھبرایا اور اُنہوں نے وقت گزاری کے لئے ایک منظوم خط اُن کے نام لکھ ڈالا۔ ان کی غزلیں بھی اسی طرح کے معاملات کی ترجمان ہیں۔ جو چیز دلچسپی کے ساتھ ان کے مطالعے کا سبب ہو سکتی ہے، وہ شاعر کے جذبات کی سچائی اور اسلوب کی سادگی ہے۔ ان کے جذبات میں گہرائی نہیں مگر سچائی ضرور ہے اور شاید اسی لئے یہ نظمیں اور غزلیں جن کا انداز عموماً بیانیہ ہے کہیں کہیں پُراثر ہو گئی ہیں۔

رُوحِ افکار (منتخب اشعار) مرتب واجد سحری۔ قیمت چھ روپے

ملنے کا پتہ: بھارتی پبلیکیشنز ۴۰۵ گلی گڑھیا، جامع مسجد دہلی ۶

چالیس پچاس سال پہلے تک شعر و شاعری سے دلچسپی رکھنے والے باذوق لوگوں میں مختلف موضوعات پر اپنی پسند کے اشعار جمع کرنے اور استطاعت ہو تو انہیں کتابی صُورت میں شائع کر دینے کا شوق خاصا عام تھا۔ اب اس شوق کا اظہار بالعموم نیم ادبی قسم کے رسائل کے صفحات پر ہوتا ہے جو اپنی ہر اشاعت میں کسی ایک موضوع پر اپنے قارئین سے اُن کی پسند کے اشعار طلب کر کے شائع کر دیتے ہیں۔ رسائل کو ان کالموں کے لئے ایک موضوع پر ایک شعر بھیج دینا کافی ہوتا ہے۔ لیکن واجد سحری صاحب نے بہت سے موضوعات پر دس دس شعر فراہم کئے ہیں اور پھر اُنہیں ایک ترتیب کے ساتھ کتابی صورت دی ہے۔ ظاہر ہے اس کے لئے انہیں کافی محنت کرنی پڑی ہوگی۔ چنانچہ کتاب کے شروع میں ساغر نظامی، اسلام مچھلی شہری اور رفعت سروش سے لے کر ابر احسنی گنوری اور جرار چھولسی تک کئی حضرات نے اُن کی محنت کی اُنہیں داد دی ہے۔ جو اشعار منتخب کئے گئے ہیں ان میں معروف، غیر معروف سبھی طرح کے شعراء کے اشعار شامل ہیں۔ ہر موضوع کے اشعار کے لئے ایک جداگانہ صفحہ رکھا گیا ہے اور ہر صفحہ کا آغاز بیشتر صُورتوں میں جناب سحر رامپوری یا جناب جرار چھولسی کے اشعار سے ہوا ہے جن سے مرتب نے دیباچے میں اپنے خصوصی تعلق اور عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ خود مرتب صاحب کے بھی اشعار شامل انتخاب ہیں۔ جن عنوانات کے تحت اشعار تقسیم کئے گئے ہیں ان میں ایک عنوان بہت دلچسپ ہے یعنی "بیٹھا ہے، بیٹھے ہیں"۔ ان الفاظ کو ایک موضوع قرار دینے کی ایک خاص وجہ معلوم ہوتی ہے۔ مرتب یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کسی شعر میں کچھ لفظ زور و تاکید کے ساتھ آئے ہیں تو وہی اس کا موضوع ہیں۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیکھئے جو انہوں نے دیر و حرم کے زیر عنوان درج کیا ہے:

کیا دیر و حرم کے دیوانے کیا دیر و حرم میں پائیں گے
ہم نے تو اُسے ہر منزل میں نزدیک رگِ جاں دیکھا ہے

ظاہر ہے کہ اس شعر میں صرف دیر و حرم کے الفاظ کی تکرار ہے۔ اس کا موضوع کچھ اور ہی ہے۔ یہی صورت اکثر اشعار میں ملتی ہے۔

آئینہ اور پرچھائیں (شعری مجموعہ) بمل کرشن اشک

ناشر: مکیش پبلیکیشنز، یونیورسٹی کیمپس، ریجنل سنٹر رہتک۔ صفحات ۱۴۰ قیمت دس روپے۔

"آئینہ اور پرچھائیں" بمل کرشن اشک کی ۱۰۵ منتخب غزلوں پر مشتمل ہے منتخب اسلئے کہ اشک کی شعرگوئی کی عمر بیس سال کے قریب ہے اور ظاہر ہے کہ اس مدت میں اُنہوں نے جو غزلیں کہی ہوں گی ان کی تعداد مجموعے میں شامل غزلوں سے بہت زیادہ ہوگی۔

اشک کی غزلوں میں تین رنگ نمایاں ہیں۔ پہلا رنگ جو سب سے گہرا ہے مقامی فضا کی تخلیق کا ہے۔ دوسرا مطالعۂ ذات اور تیسرا حسیت کا رنگ ہے اُن کی پوری غزلیہ شاعری اسی مثلث کے گرد گھومتی ہے اور یوں بھی ہے کہ اُن کی ہر غزل میں یہ تینوں رنگ دیکھے جا سکتے ہیں۔ مقامی رنگ کی تخلیق کے لئے اُنہوں نے گرد و پیش کی تمام زندگی، دیہی ماحول اور گھریلو فضا، تہذیب کی پہلی سطح پر آدمی اور آدمی، نیز آدمی اور فطرت کے باہمی رشتوں کی کشش کا سہارا لیا ہے۔ فطرت کی آغوش میں پلنے والی آہستہ خرام زندگی کا تصور انہیں بہت عزیز ہے اور موجودہ صنعتی دور نے زندگی کے معمولات میں جو برق رفتاری پیدا کر دی ہے اس سے وہ پریشان نظر آتے ہیں جیسا کہ میں نے عرض کیا ان کی شاعری کا دوسرا قوی رجحان مطالعۂ ذات کا رجحان ہے جسے بھری زندگی کی داخلیت سے بے تعلقی کا ردِ عمل بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اشک نے ذات کو معروضی انداز سے دیکھنے کی کوشش کی ہے جو اُن کے اکثر ہم عصروں کا خاصہ ہے مگر اُن کی غزلوں میں ذات کے المیے کی شدید حزینے کی جگہ ایک خاص قسم کی دردمندی اور

(بقیہ صفحہ ۸ پر)

داراشکوہ ——— ترجمہ: محمد عمر
ریڈر شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ،

مجمع البحرین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بنام آنکہ او نامی ندارد — بہر نامی کہ خوانی سر برآرد

(اس کے نام پر جس کا کوئی نام نہیں ہے جس کسی نام سے بھی تم اس کو پکارتے ہو، وہ اپنا سر اوپر اٹھاتا ہے)

اس یگانۂ روزگار پر بے انتہا حمد و سلام، جس نے اپنے حسین، بے مثل و بے نظیر چہرے پر دو متضاد باتوں سے ایمان اور کفر کو ظاہر کیا اور اس نے ان دونوں ہی سے کسی ایک سے اپنا چہرہ نہیں چھپایا۔ (نظم)

کفر و اسلام در رہش پویان — وحدہٗ لاشریک لہٗ گویان

(کفر اور ایمان اس راستہ پر رواں دواں ہیں جو اس کی طرف لے جاتا ہے دونوں اعلان کرتے ہیں کہ وہ واحد ہے، کوئی اس کا رشتہ دار نہیں ہے۔"

وہ تمام میں ظاہر ہے اور تمام چیزیں اس سے جلوہ گر ہیں، اول وہ ہے آخر وہ ہے اور اس کے علاوہ کوئی اور چیز موجود نہیں ہے۔

ہمسایہ و ہم نشیں و ہمرہ ہمہ اوست — در دلق گدا و اطلس شہ ہمہ اوست

در انجمن فرق و نہاں خانۂ جمع — باللہ ہمہ اوست ثم باللہ ہمہ اوست

وہ ہمسایہ ہے، ہم نشیں اور ہم سفر ہے، فقیروں کی گدڑی میں اور شاہوں کے اطلس میں وہی ہے۔

بلند انجمنوں میں اور نیچے کے نہاں خانوں میں، اللہ کی قسم، وہ سب کچھ ہے، اور یقیناً اللہ کی قسم، وہ سب کچھ ہے۔"

لامحدود درود مظہر اتم پر، عالم کی تخلیق پر، محمد صاحب پر، اور ان کی افضل اولاد اور ساتھیوں پر۔ اس کے بعد یہ بے اندوہ وحزن فقیر داراشکوہ کہتا ہے کہ حقیقت الحقائق کی دریافت کے اور صوفیوں کے مالک کے رموز کی تحقیق کے بعد، اور اس عطیۂ عظمیٰ سے متصف ہونے کے بعد موحدانِ ہند کے مذہب کے بارے میں جاننے کی اس کی پیاس میں شدت ہوئی۔ اور اس قوم کے بعض محققوں اور کاملین کی جو بے حد زہد، ادراک، اور فہمیدگی کی صفات سے متصف اور خدا رسیدہ تھے، صحبت سے بار بار فیض یاب ہوا اور ان سے گفتگو کی۔ لہٰذا لفظی اختلاف کے علاوہ حق تعالیٰ کی تحقیق اور شناخت کے بارے میں ان دونوں فرقوں میں کوئی تفاوت نہ پایا اس لئے دونوں کے اقوال کو باہم منطبق کیا۔ اور بعض باتوں کو جن کا جاننا حق کے متلاشیوں کے لئے ناگزیر ہے۔ یکجا جمع کر کے ایک رسالہ ترتیب دیا اور چونکہ یہ رسالہ دونوں فرقوں کے حقائق شناسوں اور عارفوں کی سچائی اور عقلمندی کا مجموعہ ہے۔ اس لئے اس کا نام "مجمع البحرین" رکھا۔ پس جو شخص منصف مزاج، اور اہلِ فکر اور ادراک ہے۔ وہ اس بات کو سمجھ جائے گا کہ ان دونوں کے نکات میں مماثلت ثابت کرنے میں مجھے کس قدر مغز سوزی کرنی پڑی ہوگی اور یقیناً ایک صاحب نظر اور ہوشیار شخص اس رسالے کو پڑھ کر بہت محظوظ ہوگا۔ جبکہ دونوں فرقوں کے تنگ دل اور کند ذہن لوگ اس سے کوئی استفادہ نہ کر سکیں گے۔ میں نے اپنی یہ تحقیقات اپنے ذوق اور وجدان کے مطابق اپنے خاندان کے افراد کے استفادہ کے لئے قلم بند کی ہیں اور مجھے دونوں فرقوں کے عوام سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ جیسا کہ خواجہ عبید اللہ احرار نے کہا ہے "اگر مجھے معلوم ہو کہ ایک کافر گناہوں میں ملوث ہونے کے باوجود توحید کے گیت گا رہا ہے تو میں اس کے پاس جاتا ہوں اس کا کلام سنتا ہوں، اور میں اس کا مرہونِ منت ہوں۔

(۱) بیانِ عناصر

عناصر پانچ ہیں، اور تمام دنیاوی مخلوقات کا مادۂ وجود یہی پانچ عناصر ہیں۔ پہلا عنصرِ اعظم، جس کو اہلِ شریعت عرشِ اکبر کہتے ہیں۔ دوسرا ہوا، تیسرا آگ، چوتھا پانی اور پانچواں خاک۔ ہندوستانی زبان میں ان عناصر کو پانچ بھوت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اکاس، وایو، تیج، جل، اور پرتھوی۔ اکاس تین طرح کے ہیں۔ بھوت اکاس، من اکاس، اور چد اکاس، جو عناصر کو احاطہ کرنے والا ہے اس کو بھوت اکاس کہتے ہیں اور جو تمام موجودات کو احاطہ کئے ہوئے ہے من اکاس کہلاتا ہے اور جو سب پر محیط ہے اور ہر جگہ موجود ہے چد اکاس کہلاتا ہے۔ چد اکاس قائم و دائم ہے۔ قرآن اور بید میں کوئی ایسی آیت یا اشلوک نہیں ہے جس سے اس کا فنا ہونا یا نیست و نابود ہونا ثابت ہوتا ہو۔ چد اکاس جو سب سے پہلے ظہور میں آیا وہ عشق یا محبت تھا جو ہندوستانیوں کی زبان میں مایا کے نام سے موسوم ہے۔ قرآن میں اس کی دلیل موجود ہے جس کا ترجمہ یہ ہے "میں ایک

پنہاں خزانہ تھا۔ بعد میں یہ میری خواہش ہوئی کہ مجھے جانا جائے اس لئے میں نے اپنی شناخت کے لئے مخلوق کو پیدا کیا۔" اور عشق سے روحِ اعظم، یعنی جیو آتما پیدا ہوئی جس کو حقیقتِ محمدی یعنی روحِ محمدی کہتے ہیں اور اس آیت میں اس "روحِ کل" کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ہندوستانی موحدین اس کو ہرن گربھ اور ادستھات آتمان کہتے ہیں جو ان کی افضلیت کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اس کے بعد ہوا کا عنصر ہے جس کو نفس الرحمٰن کہتے ہیں اور جس سے دنیوی ہوا جنم لیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے وجود سے جب وہ باہر نکلی تو جسم میں قیود کی بنا پر گرم نکلی اور اس سے آگ پیدا ہوئی۔ چونکہ اس ہوا (نفس) میں شفقت اور اتحاد و یگانگی کے اوصاف موجود تھے اس لئے سرد ہوگئی اور آگ سے پانی پیدا ہوا۔ چونکہ آگ اور پانی اپنی لطافت کی وجہ سے محسوس نہیں کئے جا سکتے اور آگ کی بہ نسبت پانی کو محسوس کیا جا سکتا ہے اس لئے بعضوں کا کہنا ہے کہ پہلے پانی پیدا ہوا اور اس کے بعد خاک کا عنصر وجود میں آیا۔ اس خاک کو پانی کے جھاگ کے مانند بتایا جاتا ہے اور وہ دودھ کی طرح ہے جیسے اگر آگ رکھا جائے تو وہ اُبلتا ہے اور اس میں جھاگ نکل آتا ہے۔ (اشعار)

چہ دانستم کہ ایں دریای بی پایاں چنیں باشد بخارش آسمان گردد کفش دریا زمیں باشد

(میں اس بات سے بالکل بے خبر تھا کہ یہ لامحدود سمندر ایسا ہوگا کہ اس کے بخارات آسمان میں بدل جائیں گے اور اس کا جھاگ زمین بن جائیگا)

یک قطرہ چوں بیضہ جوشید گشت دریا
کف کرد و کف زمیں شد و دودش سما شد

(بیضہ نما قطرے نے سانس لی اور سمندر بن گیا۔ اس کے جھاگ نے زمین اور دھوئیں نے آسمان پیدا کیا)

اس کے برعکس قیامتِ کبریٰ، جس کو اہلِ ہنود مہاپرلے کہتے ہیں، کے دن پہلے خاک کو فنا کیا جائے گا اور پانی اس کو اپنے میں جذب کریگا اور پانی کو آگ خشک کر دے گی۔ اور آگ کو ہوا ٹھنڈا کر دے گی اور ہوا مہا آکاس میں "روحِ اعظم" کے ساتھ جذب اور متحد ہو جائے گی۔ یعنی ہر چیز فنا ہو جائے گی۔ ماسوا روئے مبارک خدائے تعالیٰ کے جو مہا آکاس ہے۔ جو شے بھی دنیا میں ہے وہ فنا ہو جائے گی۔ صرف اللہ تعالیٰ کا وجود باقی رہ جائے گا جو صاحبِ جلال اور کرم کرنے والا ہے۔ ان دونوں آیتوں میں ماسوا اللہ تعالیٰ کے روئے مبارک کے ہر چیز کے فنا ہونے کی دلیل موجود ہے اور اسی مہا آکاس کی نشان دہی کرتی ہیں جو لافانی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو خداوند تعالیٰ نے یہ نہ فرمایا ہوتا۔ "ذاتِ واحد کے علاوہ ہر چیز فانی ہے۔" لیکن رُوح کی قید مہا آکاس کے بارے میں ہے کیونکہ مہا آکاس سے مراد "اس ذاتِ مقدس کے جسم سے ہے۔" ہندی زبان میں خاک کو دیوی کہتے ہیں۔ کیونکہ تمام چیزیں اس سے پیدا ہوتی ہیں اور پھر وہ تمام چیزیں اسی میں واپس چلی جاتی ہیں۔ قرآن کریم میں آیا ہے: "میں نے تم کو خاک سے پیدا کیا، دوبارہ تم کو خاک میں ملا دوں گا اور پھر تم کو اسی خاک سے زندہ کروں گا۔"

(۲) حواس کا بیان

ان پانچ عناصر کے مطابق پانچ حواس (حواسِ خمسہ) ہیں جن کو اہلِ ہند پنچ اِندری کہتے ہیں۔ شامّہ، ذائقہ، باصرہ، سامعہ اور لامسہ۔ ان کو ہندی زبان میں گھران، رسنا، چچھو، سروتر اور توک کہتے ہیں اور ان کے احساسات کو گند، رس، روپ، سبد اور سپرس کے ناموں سے موسوم کرتے ہیں۔ حواسِ خمسہ میں سے ہر ایک حس کا مخرج ایک ہی مادّہ ہے اور یہ ایک دوسرے سے منسوب ہیں۔ اس لئے شامّہ کا خاک سے ہے کیونکہ خاک کے علاوہ حواسِ خمسہ میں سے کسی حس میں بھی سونگھنے کی قوت نہیں پائی جاتی۔ ذائقہ کا تعلق پانی سے ہے کیونکہ پانی کا ذائقہ ہماری زبان محسوس کر سکتی ہے۔ باصرہ کا تعلق آگ سے ہے۔ کیونکہ رنگوں کا احساس صرف آنکھ کر سکتی ہے اور نورانیت دونوں میں ظاہر ہے اور ہوا کو لامسہ سے نسبت ہے کیونکہ تمام ظاہری چیزوں کا احساس ہوا کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے اور سامعہ کا تعلق عنصرِ اعظم سے ہے یعنی مہا آکاس سے، جس کے ذریعہ ہم آوازیں سنتے ہیں اور کان کے راستہ سے صرف اہلِ دل لوگوں پر مہا آکاس کی حقیقت ظاہر ہوتی ہے۔ جبکہ کوئی دوسرا اس کا احساس نہیں کر سکتا۔ یہ شغل صوفیوں اور ہندو موحدین میں مشترک ہے۔ صوفیا اس کو "شغلِ پاسِ انفاس" کہتے ہیں اور ہندو اپنی اصطلاح میں دھیان کہتے ہیں۔

لیکن حواسِ باطنی بھی پانچ ہیں یعنی مشترک، متخیلہ، متفکرہ، حافظہ اور واہمہ۔ اور ہندوؤں میں چار ہیں۔ بدھ، مَن، اہنکار، چِت اور ان چاروں کے مجموعہ کو انتہکرن کہتے ہیں اور آخر الذکر کو پانچویں حس سمجھنا چاہیئے۔ چِت کو ست پرکرت کہتے ہیں اور اس کی یہ عادت پیر کے مانند ہے۔ اگر پیر نہ ہوں تو چِت دوڑنے سے محروم رہتا ہے اور بدھ عقل ہے اور بدھ وہ ہے جو خیر کی طرف جاتی ہے اور شر سے باز رہتی ہے۔ دوسرا مَن ہے جس کے معنی دل کے ہیں۔ اس میں دو قوتیں پائی جاتی ہیں، سنکلپ اور بکلپ یعنی عزم و فسخ۔ تیسرا چِت ہے جو دل کا پیغامبر ہے۔ اس کا کام اِدھر اُدھر دوڑنا ہے اور وہ خیر و شر کی تمیز نہیں کرتا۔ چوتھا اہنکار ہے جو چیزوں کو خود سے منسوب کرتا ہے۔ اہنکار، پرم آتما کی صفت ہے کیونکہ

اس میں مایا کے اوصاف موجود ہیں، جس کو انہوں نے اپنی اصطلاح میں عشق کا نام دیا ہے۔ اور اہنکار بھی تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ساتک، راجس، اور تامس۔ اہنکار ساتک یعنی گیان سروپ جمالی مراتب کے مترادف ہے۔ جب پرم آتما کہتی ہے کہ "ہرچہ ہست ہم منم" (جو کچھ بھی ہے وہ میں ہوں اور یہ وہ مرتبہ ہے جب ہر شے احاطہ میں آجاتی ہے (محیط ہو جاتی ہے) "وہ یقیناً ہر شے کو اپنے احاطے میں لے لیتا ہے۔" قرآن کریم میں آیا ہے۔ "وہی اول ہے، وہی آخر ہے، وہی ظاہر ہے، وہی باطن کا جاننے والا ہے" دوسرا اہنکار راجس ہے، جو مادھیم یا متوسط درجہ ہے۔ جب (ایک عابد) جیو آتما کو نظر میں رکھ کر کہتا ہے "میری ذات جسم اور عناصر کی قیود سے آزاد ہے اور جسمانیت کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے"۔ قرآن کریم میں آیا ہے "اس کے مثل کوئی دوسری شے نہیں ہے" اور اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے اور دنیا کی کسی شے کی اسے ضرورت نہیں ہے۔"

تیسرا اہنکار تامس، ادھم ہے، یعنی اودیا کا نچلا طبقہ یا درجہ ہے یعنی خدا تعالیٰ کی عبودیت کا مرتبہ اور اس کی کثیریت اس حقیقت کے سبب سے ہے کہ انسان اپنی نہایت تنزلی، تقلید اور غلامی کی وجہ سے اپنی نادانی، جہالت اور غفلت کے اوصاف کو خود سے منسوب کر لیتا ہے۔ اپنی حیات کے احساس پر نظر رکھتے ہوئے کہہ اٹھتا ہے "من" "و تو" اور اس طرح یگانگی اور اتحاد کے مرتبہ سے دور ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم میں آیا ہے کہ اے محمد کہہ دے، میں تمہاری طرح سے خالی ہوں کہ میں تمہاری طرح سے ہی ایک انسان ہوں"۔ چنانچہ وششٹ کا کہنا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ اس کا تعین ہو تو اس بات کے سوچتے ہی وہ فوری پرم آتما کے سروپ میں منتقل ہو گیا۔ اور جب یہ ارادہ اور زیادہ پختہ ہو گیا تو اہنکار کا مرتبہ حاصل کر لیا اور جب دوسری مرتبہ اس میں ارادے کا اضافہ کر دیا گیا تو مہاتت یعنی "عقل کل" کا نام پایا۔ اور سنکلپ و مہاتت سے من کو پیدا کیا گیا جس کو پرکرت بھی کہتے ہیں۔ اور سنکلپ من سے پانچ گیان اندریاں یعنی شامتہ، لامسہ، باصرہ، سامعہ اور ذائقہ وجود میں آئیں اور سنکلپ اور پانچ گیان اندریوں کے مجموعہ سے اعضاء اور اجسام تخلیق کئے گئے جن کو مجموعی طور پر بدن کہتے ہیں۔ اس لئے پرم آتما نے جس کو ابوالارواح بھی کہتے ہیں، (جس کا پہلا ظہور حقیقت محمدی میں اور ثانوی ظہور روح القدس یعنی جبرئیل امین میں ہوا)۔ یہ تمام قیود اپنی مرضی سے اپنے اوپر لازم کر لئے اور اپنے کو ان میں مقید کر لیا، اور یہ اس طرح ہے جیسے ریشم کا کیڑا اپنے لعاب دہن سے ریشم کے تانے نکالتا ہے لیکن ان میں خود بھی مقید ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے یہ تمام حجابات قیود خود سے پیدا کئے اور خود ہی ان میں مقید ہو گیا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ایک درخت کا بیج اپنی ذات سے درخت پیدا کرتا ہے، درخت میں داخل ہوتا ہے۔ شاخوں، پتوں اور پھولوں میں رہتا ہے (اسی طرح ہمارے خدا نے اپنے کو دنیا میں محصور کر لیا ہے) لہٰذا یہ بات سمجھ لینی چاہئے، اور اس حقیقت سے باخبر رہنا چاہیے کہ ہماری دنیا کی تخلیق سے ماقبل خداوند اپنی ذات میں نہاں تھا اور اب اس کی ذاتِ مقدس اس دنیا میں پنہاں ہے۔

۳۔ اشغال کا بیان

حالانکہ ہندوستانی موحدین کے نزدیک کئی طرح کے اشغال ہیں تاہم وہ ان سب میں بہتر شغل آجپا کو سمجھتے ہیں اور وہ شغل اس طرح کا ہے کہ جو ہر ذی حس شے سے، سوتے میں، جاگتے میں، بلا کسی ارادے کے یا اختیار کے، ہمیشہ اور ہر گھڑی صادر ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے قرآن کریم میں آیا ہے "کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اس کی حمد و ثنا میں رطب اللسان نہ ہو، لیکن تم ان کی حمدوں کو نہیں سمجھ سکتے۔" اس آیت میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ سانس کی آمد و رفت کی دو صورتوں میں وضاحت کی گئی ہے۔ جو سانس باہر آتی ہے "او" کہلاتی ہے اور جو اندر جاتی ہے "من" کہلاتی ہے یعنی "اومنم" یعنی "وہ میں ہوں"۔ صوفیا دو الفاظ کا شغل کرتے ہیں۔ ہواللہ (وہ خدا ہے) اور ان کا خیال ہے کہ جب سانس اندر جاتی ہے تو "ہو" ظاہر ہوتا ہے اور "اللہ" جب سانس باہر آتی ہے۔ یہ دو الفاظ ہر ذی حیات کی سانس کے ساتھ جاری و ساری ہیں لیکن انہیں اس حقیقت کا احساس نہیں ہے۔

۴۔ اللہ کی صفات کا بیان

صوفیاء کرام کے نزدیک اللہ تعالیٰ میں دو صفات پائے جاتے ہیں، جلال اور جمال، جو تمام موجودات عالم کو احاطہ میں لئے ہوئے ہیں۔ ہندوستانی فقرا کے نزدیک (اللہ تعالیٰ کے) تین اوصاف ہیں جن کو مجموعی طور پر ترگن کہتے ہیں۔ ست، رج اور تم یعنی تخلیق، بقا اور فنا (اس کے برعکس) صوفیاء کرام نے بقا کی صفت کو دیکھا، اس کا اقرار کیا کہ وہ جمال کی صفت ہے۔ لیکن چونکہ ان تینوں قوتوں میں سے ہر ایک، ایک دوسرے میں پائی جاتی ہیں، اس لئے ہندو فقرا نے ان تینوں صفتوں کو ترمورت کا نام دے دیا یا برہما، بشن اور مہیش، جو صوفیا کی اصطلاحات کے مطابق جبرائیل، میکائیل اور اسرافیل کے مترادف ہیں۔ برہما یا جبرائیل میں چیزوں کے تخلیق کرنے کی قوت پائی جاتی ہے۔ دوسری قوت اشیائے موجودہ کی حفاظت کی ہے، جس کا نام کو بشن یا میکائیل سے منسوب کیا جاتا ہے اور تیسری

قوت ہر شے کو فنا کرنے کی ہے جس کے لئے مہیش یا اسرافیل شہرت رکھتے ہیں۔

پانی، ہوا اور آگ بھی انہی تینوں محافظ موکلوں سے منسوب ہیں۔ پانی کا تعلق جبرائیل سے، ہوا کا اسرافیل سے، اور آگ کا میکائیل سے اور یہ تینوں خصائص تمام جانداروں میں پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا برھما، جو پانی (لعاب دہن) کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے وہ کلام الٰہی کے مظہر کا سبب بنا، اور قوت گویائی بھی اس سے ظاہر ہوئی اور بشن جو آنکھوں میں آگ کے مانند ہے، روشنی، نور اور بینائی کا ماخذ ہے اور مہیش (جو ناک میں سانس یا ہوا ہے) دونوں نتھنوں کے تخلیق کا باعث ہوا یعنی دو سانس اگر وہ بند ہو جائیں تو موت واقع ہو جاتی ہے۔

اور ترگن جو خدا تعالیٰ کے تین اوصاف یعنی تخلیق، بقا اور فنا ہیں برھما، بشن اور مہیش کے روپ میں ظاہر ہوئے جن کے اوصاف تمام موجودات عالم میں ظاہر ہیں۔ پس جب ایک طرح کی خلقت وجود میں آتی ہے تو وہ مقررہ وقت تک قائم رہتی ہے اور پھر اس کو فنا کر دیا جاتا ہے۔ تشکت یا تینوں محولہ بالا اوصاف کی داخلی قوت کو تردیوی کہتے ہیں۔ اس کے بعد ترمورت نے برھما، بشن اور مہیش کو جنم دیا۔ جبکہ تردیوی سے سرستی، لکھمی اور پاربتی کو جنم ملا۔ اول الذکر سرستی کا تعلق رجوگن اور برھما سے ہے اور پاربتی کا تموگن اور مہیش سے اور لکھمی کا ست گن اور بشن سے تعلق ہے۔

(۵) روح کا بیان

روح دو قسم کی ہیں۔ پہلی عام روح اور دوسری ابوالارواح جن کو ہندو فقرا علی الترتیب آتما اور پرم آتما کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ جب ذات پاک (ذات بحت) محدود اور مقید ہو جاتی ہے تو چاہے پاکی یا ناپاکی کی صورت میں اور لطافت کے مرتبہ میں مجرد ہونے کی وجہ سے اس کو روح اور آتما کہتے ہیں اور کثافت کے درجہ میں جسد (جسم) اور سریر کہتے ہیں۔ اور وہ ذات جس کا ازل سے تعین ہو گیا ہے، روح اعظم کہلاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ جمع الصفات ذات خداوندی سے بالکل مترادف ہے اور وہ روح جس میں یہ تمام روحیں شامل ہیں پرم آتما یا ابوالارواح کہلاتی ہے۔ پانی اور اس کی موجوں کے آپسی تعلق کی طرح جسم اور روح کا تعلق ہے یا جیسا تعلق سریر اور آتما کا ہے۔ مکمل طور پر موجوں کے آپس میں امتزاج کو ابوالارواح یا پرم آتما کہا جا سکتا ہے اور خالص پانی حضرت وجود یا سدھ یا چیتن کے مانند ہے۔

(۶) ہوا کا بیان

انسانی جسم میں ہوا محرک ہے۔ اس کے پانچ مقامات ہیں۔ اس لئے ان کے پانچ نام ہیں۔ پران، آپان، سمان، اودان اور دیان۔ پران وہ ہوا ہے جو نتھنوں سے پیر کے انگوٹھوں تک محرک ہے اور اس میں سانس لینے کی خاصیت پائی جاتی ہے۔ آپان، یہ ہوا سرین سے عضو مخصوص تک حرکت کرتی ہے اور یہ ہوا ناف کے گرد بھی حلقہ کئے ہوئے ہے اور یہی زندگی کا سبب ہے۔ سمان، سینہ اور ناف کے اندر حرکت کرتی ہے۔ اودان، وہ ہوا ہے جو حلق سے دماغ کے مغز تک حرکت کرتی ہے اور دیان، وہ ہوا ہے جو ظاہر اور مخفی ہر چیز میں سرایت کرتی ہے۔

(۷) چار عالموں کا بیان

بعض صوفیا کے اقوال کے مطابق عالم تعداد میں چار ہیں جن سے ہر شخص اور جاندار کا گذر ناگزیر ہے۔ یعنی ناسوت، ملکوت، جبروت اور لاہوت اور دوسرے بعض لوگ پانچ بتاتے ہیں اور ان چاروں میں عالم مثال کو بھی شامل کر لیتے ہیں اور جو لوگ عالم مثال کو ملکوت کے مترادف سمجھتے ہیں۔ وہ صرف چار عالم مانتے ہیں۔ ہندو فقرا کے مطابق، اوستھات جو چار عالموں کے لئے مستعمل ہے، صرف چار عالم یہ ہیں۔ جاگرت، سپن، سکھوپت، اور تریا۔ جاگرت، ناسوت کے مساوی ہے (جو عالم بیداری ہے) سپن، ملکوت کے مترادف ہے۔ (عالم ارواح اور خواب) سکھوپت جبروت کے برابر ہے۔ یہ وہ مقام ہے جس میں ہر دو عالم کے نقوش مٹ جاتے ہیں اور "من" (میں)، "تو" (تم)، کی تمیز باقی نہیں رہتی۔ چاہے تم اپنی آنکھ کھول کر دیکھو اور چاہے بند کر کے۔ ان دو فرقوں کے فقرا اس عالم سے بے خبر ہیں۔ چنانچہ سید الطائفہ استاد ابوالقاسم جنید بغدادی قدس سرہ فرماتے ہیں "تصوف آں بود کہ ساعتی بنشینی بی تیماری" شیخ الاسلام نے دریافت کیا کہ "بی تیماری" کا کیا مطلب ہے۔ انہوں نے اسکی وضاحت یوں کی کہ اس وقت عالم ناسوت اور ملکوت کا خیال تک شاہد کے ذہن میں نہ آئے۔ مولانا روم قدس اللہ سرہ نے بھی اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے

خواہی کہ بیابی یک لحظہ مجو ایش خواہی کہ بدانی یک لحظہ مدانش
(اگر تم اس کے تلاش کرنے کے خواہش مند ہو تو ایک لمحہ تلاش کرنا ترک کر دو اور اگر تم اس کو جاننے کی خواہش رکھتے ہو تو ایک لمحہ اس کو نہ جانو)
چوں در نہانش جوئی دوری ز آشکارش چوں آشکار جوئی مہجوری از نہانش
چوں آشکار و نہاں بیروں شدی بمیراں پا را دراز میکن خوش خسپ در امانش
(جب تم خفیہ طور پر اس کی تلاش کرتے ہو، تو تم اس کے مظہر سے بہت پرے ہو جاتے ہو اور جب تم ظاہر میں اس کی تلاش کرتے ہو

توتم اس کے رموز میں پنہاں ہو جاتے ہو اور جب تم نہاں سے باہر آجاتے ہو، اور اس طرح ظاہر ہو جاتے ہو تو بلا شبہ اپنے پیر پھیلا کر اور اس کی حفاظت سے چین سے سوؤ)

اور ثریا، لاہوت کے برابر ہے جس سے ذاتِ محض مراد ہے جو ہر چیز پر محیط ، مشترک اور سہ عالموں پر جامع ہے۔ اگر کوئی سالک ناسوت سے ملکوت تک سفر کرتا ہے اور ملکوت سے جبروت تک اور اس آخری منزل سے لاہوت تک تو اس کو اس کی ترقی سمجھا جائے گا۔ لیکن اگر حقیقت الحقائق، جس کو ہندو فقراء اوسان کہتے ہیں، لاہوت کی منزل سے ملکوت میں اور پھر جبروت کی منزل کی طرف بڑھتا ہے تو اس کا یہ سفر ناسوت پر ختم ہو جاتا ہے۔ اور یہ حقیقت کہ بعض صوفیا نے مقامِ نزول چار اور بعض نے پانچ بتائے ہیں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

(۸) آواز کا بیان

آواز کا ماخذ وہی نفس الرحمٰن ہے جو لفظِ "کُن" کے ساتھ ظہور پذیر ہوئی تھی۔ ہندوستانی فقرا اِس آواز کو سرستی کہتے ہیں اور ان کے قول کے مطابق وہ آواز تمام آوازوں، صوتوں اور صداؤں کا مخرج ہے۔

ہر کجا بشنوی چو نغمۂ اوست	کہ شنید این چنیں صدائی دراز

(جہاں کہیں بھی تم کوئی آواز سنتے ہو وہ اس (خدا) کی مدھر آواز ہے۔
کس نے کوئی ایسی رواں دواں آواز سنی تھی)

ہندو فقراء کے اقوال کے مطابق اس آواز کی تین قسمیں ہیں جو ناد کہلاتی ہے۔ پہلی اناہت یعنی وہ آواز جو ہمیشہ سے تھی۔ اب بھی ہے اور مستقبل میں بھی رہیگی۔ اور صوفیاء کرام اس آواز کو "آوازِ مطلق" اور "سلطان الاذکار" کہتے ہیں جو ازلی و ابدی ہے اور مہا اکاس کے احساس کا ذریعہ ہے اور اس آواز سے ہر شخص واقف نہیں ہے، لیکن ان دونوں قوموں کے اکابر اس سے آگاہ ہیں۔ دوسری آہت، یہ وہ بے ترتیب آواز ہے جو دو چیزوں کے آپس میں ٹکراؤ سے پیدا ہوتی ہے۔ تیسری سبد، جو الفاظ کی ترکیب سے پیدا ہوتی ہے۔ سبد کا سرستی سے گہرا تعلق ہے۔ مسلمانوں کے عقیدے کے [illegible] یہی اسم اعظم کا منبع ہے جس کو اہلِ ہنود کے فقراء بید مکھ یا اوم کہتے ہیں۔ اسم اعظم سے یہ مراد ہے کہ وہ تخلیق، بقا اور فنا تینوں اوصاف سے متصف ہے اور فتحہ، ضمہ اور کسرہ بھی جن کے مترادف اکار، وکار اور مکار ہیں، اسی (اسم اعظم) سے ظہور میں آئے ہیں۔ ہندو فقرا اس آواز کو ایک مخصوص علامت سے تعبیر کرتے ہیں۔ جو ہمارے اسمِ اعظم کے بہت مشابہ ہے اور جس میں پانی، ہوا، خاک اور ذاتِ واحد کے عناصر کی علامتیں پائی جاتی ہے۔

(۹) نُور کا بیان

نُور کی تین قسمیں ہیں۔ اگر یہ جلال کی صورت میں نمودار ہوتا ہے تو اس کا رنگ یا تو آفتابی، یا یاقوتی اور آگ کے رنگ کا ہوتا ہے اور اگر جمال کے اوصاف میں ظاہر ہوتا ہے تو اس کا رنگ یا تو چاند، یا مروارید کے رنگ میں نقرئی یا پانی کے رنگ میں اور آخر میں نورِ ذات جو ان تمام صفات سے عاری ہے اور سوائے اولیاء اللہ کے کسی پر ظاہر نہیں ہوتا ہے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اللہ تعالیٰ اپنے نور سے اس کی ہدایت کرتا ہے جس کی وہ کرنا چاہتا ہے"۔ اور وہ نور یہ ہے جو کہ اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب ایک شخص یا سویا ہوا ہو، یا آنکھیں موندے ہو، نہ تو وہ اپنی آنکھوں سے کچھ دیکھتا ہو، نہ اپنے کانوں سے سنتا ہو، نہ اپنی زبان سے بولتا ہو، نہ اپنی ناک سے سونگھتا ہو، اور نہ چھونے سے محسوس کر سکتا ہو، اور درحقیقت نہ تو اُسے اعضاء کی، باہری قوتوں کی اور نہ چراغ کی روشنی کی مدد کی ضرورت ہو اور باصرہ، سامعہ، ذائقہ، شامہ، اور لامسہ کی قوتیں ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتی ہیں اور ایک ذات ہو جاتے ہیں اور اسکو نورِ ذات کہتے ہیں اور وہ خدا کا نُور ہے۔ اللہ تعالیٰ بڑے جلال اور بڑی شان والا ہے۔ اے میرے عزیز۔ اس کے بارے میں غور و فکر کرو جو کچھ میں نے کہا ہے۔ کیونکہ یہ بصیرت اور تفکر کی بات ہے۔ آنحضرت رسول اللہ نے اس طرح کے مراقبے (تفکر) کی تعریف میں کہا ہے "ایک گھڑی کا مراقبہ سارے سال کی عبادت سے بہتر ہے" یعنی انسانوں اور پریوں کے عمل سے۔ قرآن کریم میں آیا ہے "اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمینوں کا نُور ہے"۔ اہلِ ہنود اس کو جن سروپ، اور سوا پرکاس اور سپن پرکاس کہتے ہیں۔ وہ نُور جو خود بخود دنیا میں یا اُس کے ماسوا میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ اس طرح صوفیاء نے نُور کی وضاحت مُنوّر کے لفظ سے کی ہے۔ اور اہلِ ہنود نے بھی اس کی وضاحت لفظ مُنوّر سے کی ہے۔ اس سلسلے میں قرآنِ کریم کی آیت یہ ہے "اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمینوں کا نُور ہے اور وہ نُور طاق میں رکھے ہوئے اس چراغ کی روشنی کی مانند ہے جو چمنی کے اندر رکھا ہوا اور چمنی گویا ایک درخشاں ستارہ کے مثل ہے جو زیتون کے مبارک درختوں سے روشن ہے جس کی نہ تو شرقی اور نہ غربی سمتیں ہیں اور اس سے برآمد تیل (روغن) اُسے روشنی عطا کرتا ہے۔ حالانکہ آگ کا اس تک

گذر نہیں ہے اور نُورٌ علیٰ نُور، نُور کے اوپر نور ہے اور اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہتا ہے اپنے نُور سے اس کی رہنمائی کرتا ہے۔"

لیکن محولہ بالا آیت سے جو کچھ اس فقیر نے سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ مشکوٰۃ (طاق) سے جسمانی زندگی (عالمِ اجسام) کی دنیا مراد ہے اور مصباح (یا چراغ) نورِ ذات ہے اور شیشہ (چمنی) سے مراد روح ہے جو درخشاں ستارہ کے مانند ہے اور اس مصباح کی وجہ سے شیشہ بھی چراغ (مصباح) کے مانند ہوجاتا ہے اور "وہ چراغ روشن ہے" سے نورِ وجود عبارت ہے اور "شجرۂ مبارکہ" سے حق سبحانہ تعالیٰ مراد ہے جو مشرق اور مغرب کے قیود سے آزاد ہے۔ اور "زیت" سے مراد روحِ اعظم ہے جو نہ کہ ازلی ہے اور نہ ابدی۔ وہ روغن (زیت) اپنی بے حد لطافت اور صفائی کی وجہ سے خود بخود روشن و تابندہ ہے اور روشن کئے جانے کا محتاج نہیں ہے چنانچہ استاد ابوبکر واسطی روح کی تعریف میں فرماتے ہیں کہ روح کا نور اتنا روشن ہے کہ وہ ناسوت کی آگ اور شعاع کے لمس کی محتاج نہیں ہے اور اپنی ذاتی بے حد قوت کی وجہ سے یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ خود بخود روشن ہو جائے اور یہ نورِ زیت "نُورٌ علیٰ نُور" ہے یعنی روشنی اور صفائی کی وجہ سے نور پر نور ہے اور کوئی شخص اس روشنی سے خدا تعالیٰ کو نہیں دیکھتا تاوقتیکہ وہ خود اپنے نورِ وحدت سے اس کی ہدایت نہ کرے۔ لہٰذا ان آیتوں کے مجموعے کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ اپنے ذاتی نور سے لطیف اور نورانی پردوں میں ظاہر ہے اور اس کو چھپانے کے لئے نہ تو کوئی پردہ ہے اور نہ ہی تاریکی اور اس کا نور روح الارواح کے پردے میں ظاہر ہے اور روح الارواح، ارواح کے پردے میں اور روح جسم کے پردے میں اس طرح ظاہر ہے جس طرح چراغ فانوس کے اندر روشن اور ظہور پذیر ہے۔ چمنی کو ایک طاق کے پردے میں رکھ دیا گیا اور نورِ ذات سے روشنی اخذ کرتا ہے۔ لہٰذا روشنی پر روشنی کا اضافہ کرتا ہے (نُورٌ علیٰ نُور)

(۱۰) رویت کا بیان

ہندو موحدین رویتِ خدا تعالیٰ کو ساچھات کار کہتے ہیں۔ یعنی پیشانی کی آنکھوں سے خدا تعالیٰ کا مشاہدہ کرنا۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے اور اس بات میں کسی کو کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ انبیا علیہ السلام اور اولیا کامل اس دنیا میں یا آخرت میں ظاہری آنکھوں سے یا باطنی آنکھوں سے دیدار کرتے ہیں۔ اور تمام اہلِ کتاب اور اولیار کامل اور ہر مذہب و ملت کے خداشناس بزرگوں کا چاہے وہ قرآن کے پیرو ہوں یا ویدوں کے یا توریت انجیل اور زبور کے پیرو ہوں، اس سلسلہ میں یکساں عقیدہ ہے۔ جو شخص خدا کے دیدار سے انکار کرتا ہے وہ اپنے فرقہ کا نابینا اور ناسمجھ رکن ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جب ذاتِ مقدس ہر چیز پر قادر ہے تو پھر اپنے کو ظاہر کرنے کے لئے اس میں قدرت کیسے نہ ہوگی اور سُنّی علمار نے اس موضوع کی بڑی صاف تشریح و وضاحت کی ہے۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ ذاتِ بحت کو دیکھا جا سکتا ہے تو یہ ناممکنات میں سے ہے کیونکہ ذاتِ بحت لطیف اور غیر متعین ہے اور چونکہ اس کا تعین نہیں ہو سکتا لہٰذا وہ صرف لطافت کے پردے پر جلوہ گر ہے اور اسی لئے اس کا مشاہدہ نہیں کیا جا سکتا اور اس طرح کا مشاہدہ کرنا ناممکنات میں سے ہے اور یہ خیال کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار اس دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں کیا جا سکتا ہے، بے بنیاد ہے۔ کیونکہ اگر وہ صاحبِ قدرت ہے تو اس میں اس بات کی بھی قدرت ہے کہ اگر وہ چاہے تو ہر شکل میں، ہر جگہ اور کسی وقت بھی ظاہر ہو سکتا ہے۔ (میرا خیال ہے) کہ جس کے لئے اس کا دیدار کرنا اس دنیا میں مشکل ہے، اس کے لئے آخرت میں مشاہدہ کرنا ممکن نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے۔ جو کوئی اس دنیا میں میرے دیدار سے محروم ہے وہ آخرت میں بھی میرے جمال کے مشاہدہ کی نعمت سے محروم رہے گا۔

شیعی اور معتزلی علمار نے جو دیدار کے منکر ہیں اس مسئلہ کے بارے میں بڑی بھاری غلطی کی ہے۔ کیونکہ انہوں نے اگر صرف یہ کہا ہوتا کہ ذاتِ بحت کا دیدار کرنا ممکن نہیں ہے تو کوئی وجہ معقول ہو سکتی تھی (یعنی وہ حق بجانب ہو سکتے تھے) لیکن ہر صورت میں دیدار سے اُن کا یہ انکار بڑی بھاری بھول ہے کیونکہ اکثر انبیا اور اولیا نے اپنی ظاہری آنکھوں سے خدا تعالیٰ کا دیدار کیا ہے اور بلاواسطہ اُس کا متبرک کلام سُنا ہے اور جب وہ ہر طرح خدا تعالیٰ کے الفاظ سننے کے اہل ہیں، تو پھر اس کے دیدار کی قوت ان میں کیوں نہیں ہے؟ یقیناً ان میں یہ قوت پائی جاتی ہے اور جس طرح سے خدا تعالیٰ، ملائکہ، کتابوں، انبیار، قیامت، قضا و قدر، خیر و شر اور متبرک مقامات پر ایمان رکھنا فرض ہے، اسی طرح رویت پر ایمان رکھنا فرض اور لازم ہے اور بے علم سُنّی علمار جنہوں نے اس حدیث کے معنی اور الفاظ میں اختلاف کیا ہے کہ عائشہ صدیقہ نے آنحضرت سے دریافت کیا۔ "هَلْ رَأَيْتَ رَبَّكَ" یعنی کیا تو نے اپنے پروردگار کا دیدار کیا؟ فرمایا "نُورٌ أَنَّىٰ أَرَاهُ" یعنی وہ نور ہے جو میں دیکھتا ہوں۔ جنہوں نے اس حدیث کو

"نُورٌ اِنّیٰ اَرَاہُ" پڑھا ہے یعنی کہ وہ نور ہے میں کس طرح اس کو دیکھوں۔ لیکن اس دلیل سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ آنحضرت نے دیدار نہیں کیا تھا۔ اگر اس آیت کے پہلے معنی لئے جائیں تو اس کی رویتِ تام کی طرف اشارہ ہے یعنی پردۂ نور میں اس کا ظہور پذیر ہونا اور اگر اس طرح پڑھا جائے کہ وہ نور ہے میں کس طرح دیدار کروں تو یہ اشارہ ذاتِ بحت اور بارنگ کی طرف ہے۔ یہ عبارت کا اختلاف نہیں ہے بلکہ آنحضرت کا معجزہ ہے کہ انہوں نے ایک حدیث میں دو مطالب بیان فرمائے تھے۔ قرآنِ کریم میں آیا ہے "اس دن کچھ چہرے تاباں ہوں گے جو اپنے خدا کا مشاہدہ کر رہے ہوں گے۔" یہ دلیل خدا تعالیٰ کے رویت کی تائید میں ہے اور اس آیت میں "لَا تُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ یُدْرِکُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ" اس کی بے رنگی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ یعنی آنکھیں اس کو بے رنگی اور مرتبۂ اطلاق میں نہیں دیکھ سکتیں۔ حالانکہ وہ سب کو دیکھتا ہے اور وہ بہت لطیف اور بے رنگ ہے۔ اس آیت میں اسم "ھو" (وہ) آیا ہے جو ذاتِ بحت کے نہ دیکھنے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ کے دیدار کی پانچ قسمیں ہیں (۱) خواب کی صورت میں دل کی آنکھ سے (۲) بیداری کی حالت میں ظاہری آنکھوں سے (۳) بیداری اور خواب کے درمیان جو بے خودیٔ خاص کی حالت ہے (۴) ایک خاص تعین کی حالت میں (۵) ظاہری اور باطنی دنیاؤں کی تعینات کی کثرت میں ذاتِ واحد کا دیکھنا۔ اس طرح کا دیدار ہمارے رسولِ مقبولؐ نے کیا تھا جن کی ذات ان کے درمیان سے غائب ہو گئی تھی اور شاہد اور مشہود دونوں ایک ہی میں جذب ہو گئے تھے اور ان کا خواب، بیداری اور بے غرضی سب ایک معلوم ہوتی تھیں اور ان کی باطنی اور ظاہری آنکھیں واحد فعل ہو گئی تھیں۔ یہ مکمل رویت کی صورت ہے جس دیدار کے لئے نہ تو اس دُنیا کی نہ آخرت کی شرط ہے۔ بلکہ ہر وقت اور ہر زمانے میں ممکن ہے

(۱۱) اللہ تعالیٰ کے نام

اللہ تعالیٰ کے لاتعداد اور بے شمار اسمائے گرامی ہیں۔ فقرائے ہنود کی زبان میں اس ذاتِ مطلق، پاک، غیب الغیب اور حضرتِ واجب الوجود کو اَسن، نرگن، نرنکار، نرنجن، ست اور چیت دستا کہتے ہیں۔ اگر علم کو بھی اس سے منسوب کر دیا جائے تو فقرائے ہنود اُسے چیتن کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور اسم الحق کو اننت اور قادر کو سمرتھ اور سمیع کو سروتا اور بصیر کو درشتا کہتے ہیں اور اگر حق تعالیٰ کو کلام سے منسوب کریں تو وہ اس کو وکتا کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو اوم اور ہو کو سَہ اور فرشتہ کو ان کی زبان میں دیوتا کہتے ہیں اور مظہرِ اتم کو اوتار۔ اور اوتار کے معنی مظہر کے ہیں۔ یعنی قدرتِ الٰہی جو اس میں ظاہر ہو، اور اس کے وجود میں نظر آئے وہ چیز بنی نوعِ انسان میں سے کسی اور میں اس وقت ظاہر نہ ہو۔ وحی کو جو پیغمبر پہ نازل ہوتی ہے، اکاس بانی کہتے ہیں۔ اس کو اکاس بانی اس وجہ سے کہتے ہیں کہ ہمارے رسولِ مقبولؐ نے فرمایا کہ میرے لئے سخت ترین وہ لمحہ ہوتا ہے جب میں وحی سنتا ہوں۔ کیونکہ میں وحی اس طرح سنتا ہوں جس طرح جرس کی آواز ہو یا زنبور کی بھنبھناہٹ۔ چونکہ یہ آواز اکاس (آسمان) سے نازل ہوتی ہے اس لئے اُسے اکاس بانی کہتے ہیں۔ آسمانی کتاب کو ہندو بید (ویدا) کہتے ہیں اور جنوں کی جنیوں کو، جو پریاں ہیں، اچھرا (اپسرا) کہتے ہیں اور ان شر پسندوں کو جو دیو اور شیطان ہیں، راکھس کہتے ہیں۔ آدمی کو منکھ، ولی کو رکھی (رِشی) اور نبی کو مہاسدھ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

(۱۲) نبوت اور ولایت کا بیان

پیغمبروں کی تین قسمیں ہیں۔ پہلے وہ جنہوں نے خدا کا دیدار آنکھوں سے، چاہے ظاہری آنکھوں سے یا باطنی آنکھوں سے کیا ہو، دوسرے وہ جنہوں نے خدا کی آواز سنی ہو، صرف آواز یا مرکب آواز، جو کلمات پر مشتمل ہو، تیسرے وہ جنہوں نے فرشتوں کو دیکھا ہو یا ان کی آواز سنی ہو۔ لہٰذا نبوت اور ولایت تین قسم کی ہیں (۱) تنزیہی ولایت اور نبوت (۲) تشبیہی نبوت اور ولایت (۳) جو مجموعہ التشبیہ والتنزیہ ہو

پہلی نبوت تنزیہی، جس طرح کی نبوت نوح علیہ السلام کی تھی جنہوں نے خدا کو تنزیہہ کی صورت میں دیکھا ہو اور لوگوں کو اپنے دین کی طرف دعوت دی لیکن چند لوگوں کے علاوہ، اُن لوگوں نے ان کے دین کو قبول نہ کیا۔ کیونکہ نوح نے تنزیہی مشاہدہ کیا تھا۔ لہٰذا وہ لوگ فنا کے سمندر میں غرق ہو گئے۔ اس طرح ہمارے زمانے کے زاہد تنزیہی صورت میں خدا کا دیدار کرتے ہیں اور اپنے مریدوں کو پیروی کی دعوت دیتے ہیں لیکن ان کے ارادت مندوں میں سے کوئی بھی معرفت کا درجہ حاصل نہیں کرتا اور نہ ہی انہیں اُن لوگوں کی باتوں سے کچھ فائدہ ہی پہنچتا اور وہ لوگ طریقت اور سلوک کے راستے میں فنا اور ہلاک ہو جاتے ہیں اور خدا تک نہیں پہنچ پاتے

دوسری نبوت تشبیہی، اس طرح کی نبوت موسیٰ علیہ السلام کی تھی۔ انہوں نے خود خدا کو درخت کی آگ میں دیکھا تھا اور بادلوں

سے خدا کا کلام سنا، موسیٰ کے پیروؤں کی ایک بڑی تعداد اصنام پرست ہوگئی اور انہوں نے گائے کی پرستش شروع کردی اور ان سے گنہ سرزد ہوئے۔ موجودہ زمانہ میں ہمارے کچھ مقلدین جن کی زندگی کا واحد پیشہ اندھی تقلید ہے، تنزیہہ کے راستے سے گمراہ ہوگئے۔ اس لئے خوبصورت اور مرغوب صورتوں اور شکلوں کے دیدار کرنے کا شغل کرتے ہیں اور اپنا وقت لہو ولعب میں صرف کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی پیروی نہ کرنا چاہئے۔

ہر صورتِ دلکش کہ ترا روی نمود   خواہد فلک از چشمِ تو اش زود ربود
رو دل بکسی دہ کہ در اطوارِ وجود   بوداست وہمیشہ باتو خواہد بود

(ہر وہ مرغوب صورت جو تم دیکھتے ہو، آسمان جلد ہی تمہاری آنکھوں کے سامنے سے غائب کردے گا۔ جاؤ، اپنا دل ایک ایسے فرد سے لگاؤ جو زندگی کے ادوار میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہا ہے اور ہمیشہ ساتھ رہے گا)

تیسری قسم کی نبوت، جامع التنزیہہ و التشبیہ ہے۔ یعنی تنزیہہ اور تشبیہ کا مرکب اور مجموعہ اور ویسی نبوت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی، جنہوں نے مطلق اور مقید، رنگ اور بے رنگ، قریب اور بعید سب کو یک جا کردیا۔ قرآن کریم میں اس مرتبہ کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے .... یعنی "اس کے مثل کوئی دوسری شے نہیں ہے۔ وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے"۔ اوّل الذکر یعنی "اس کے مثل کوئی چیز نہیں ہے"۔ اس کی تنزیہہ کی طرف اشارہ کرتا ہے اور آخر الذکر "وہ سننے اور دیکھنے والا ہے"، تشبیہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ مرتبہ جامعیت اور آخریت کا بلندترین اور اعلیٰ ترین مرتبہ ہے اور یہ مقام آنحضرت کے لئے مخصوص ہے۔ لہٰذا ہمارے رسول نے تمام عالم کو از مشرق تا مغرب اپنے احاطے میں لے لیا جبکہ تنزیہی نبوت، تشبیہ سے محروم ہے اور تشبیہی نبوت، نبوتِ تنزیہی سے عاری ہے اور نبوتِ جامع التشبیہ اور تنزیہہ میں میں شامل ہے جیسے کہ قرآن کریم میں آیا ہے۔ "وہ اوّل اور آخر ہے، سب پر ظاہر ہے اور باطن کی چیزوں کو جاننے والا ہے" اور اسی طرح ولایت اس اُمّت کے لوگوں کے لئے مخصوص ہے جن کے وصف کے بارے میں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ تمام امتوں میں یہ اُمّت بہتر ہے کیونکہ وہ تشبیہ اور تنزیہہ کو یکجا جمع کرنے والے ہیں۔

پس ہمارے رسول کے زمانہ میں اولیا یہ حضرات تھے۔ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت حسن وحسین، و ستہ باقیہ، و عشرۂ بشرہ اکابر، مہاجرین و انصار، اور اہل صوفیہ۔ ان کے تابعین کے زمانہ میں ایسے صوفی تھے جیسے اویس قرنی وغیرہ۔ ان کے بعد ذوالنون مصری، فضیل عیاض، معروف کرخی، ابراہیم ادھم، بشر حافی، سری السقطی، بایزید بسطامی، استاد ابوالقاسم جنیدی، سہل بن عبداللہ التستری، ابوسعید خراز، رویم، ابوالحسین النوری، ابراہیم خواص، ابوبکر شبلی، ابوبکر واسطی اور ان جیسے دوسرے۔ اور دوسرے زمانہ میں ابوسعید ابوالخیر، شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری، شیخ احمد جام، محمد معشوق طوسی، احمد غزالی، ابوالقاسم گرگانی، اور دوسرے زمانہ میں جیسے میرے پیر شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی، ابو مدین المغربی، شیخ محی الدین ابن العربی، شیخ نجم الدین کبریٰ، شیخ فریدالدین عطار، مولانا جلال الدین رومی، دوسرے زمانہ میں جیسے خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ بہاءالدین نقشبندی، خواجہ احرار، مولانا عبدالرحمٰن جامی، اور دوسرے زمانہ میں جیسے میرے شیخ جنید ثانی، شاہ میر اور میرے استاد میاں باری اور میرے مرشد ملا شاہ اور شاہ محمد دلربا شیخ طیب سرہندی اور بابا لال بیراگی تھے۔

(۱۳) برہمانڈ کا بیان

برہمانڈ سے مراد کل کے ہیں۔ اس لفظ کا استعمال حضرتِ وجود کا کرۂ مدور کی صورت میں تقید ہونے کے معنی میں ہوتا ہے اور چونکہ وہ کسی طرف مائل نہیں ہے اور نہ کسی سے رغبت رکھتا ہے اور اس کا تعلق اور نسبت سب کے ساتھ برابر ہے اور تمام تولید اور نمائش اس کے درمیان وقوع پذیر ہوتی ہے، اس لئے ہندو فقرا اس کو برہمانڈ کہتے ہیں۔

(۱۴) سمتوں کا بیان

مسلم موحدین نے مشرق و مغرب، شمال اور جنوب، فراز اور نشیب کو علٰحدہ علٰحدہ سمتیں سمجھتے ہوئے چھ سمتیں متعین کی ہیں۔ جبکہ ہندو فقرا کے حساب سے مجموعی طور پر دس سمتیں ہیں۔ وہ مشرق اور مغرب، شمال اور جنوب کے درمیانی حصوں کو بھی الگ الگ سمت جانتے ہیں، اس لئے وہ ان کو دہا دِشا کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

(۱۵) آسمانوں کا بیان

آسمان جن کو گگن کہتے ہیں۔ ہندوؤں کے مطابق تعداد میں آٹھ ہیں۔ اُن میں سے سات ساتوں سیاروں کے مقامات ہیں یعنی زحل، مشتری، مریخ، شمس، زہرہ، عطارد اور قمر۔ اہل ہند اُن سات سیاروں کو سات نچھتر یعنی سنیچر، برہسپت، منگل، سورج،

شکر، بدھ اور چندر ماس کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اور آسمان جس میں ساتوں سیارے ہیں، آٹھواں شمار کیا جاتا ہے۔ اس آسمان کو حکماءِ فلکِ ہشتم یا فلکِ ثابت کہتے ہیں۔ اور اہلِ شرع مسلمان اپنی اصطلاح میں اس کو کرسی کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں آیا ہے۔ اس کی کرسی (تخت)، زمینوں اور آسمانوں کے اوپر محیط ہے نویں کو جو مہا اکاس کہلاتا ہے، آسمانوں کے شمار میں شامل نہیں کیا جاتا، کیونکہ وہ سب پر محیط ہے اور کرسی آسمانوں اور زمینوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

(۱۶) زمین کا بیان

اہل ہنود نے زمین کو سات طبقوں یعنی سپت تال میں تقسیم کیا ہے اور ان میں سے ہر ایک طبقے کا الگ الگ نام ہے۔ اتل، بتل، سوتل، تلاتل، مہاتل، رساتل اور پاتال۔ مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق بھی زمین کے سات طبقات ہیں جیساکہ قرآن کریم میں آیا ہے اللہ تعالیٰ وہ خدا ہے جس نے سات آسمان خلق کئے اور آسمانوں ہی کی طرح زمینیں پیدا کی ہیں۔

(۱۷) زمین کی تقسیم

حکماء نے کرۂ زمین کو سات طبقات میں تقسیم کیا ہے اور ان کو ہفت اقلیم کہتے ہیں۔ اہل ہنود انہیں سپت دیپ کہتے ہیں۔ اور وہ لوگ اُن سات طبقوں کو پیاز کی پرتوں کی طرح نہیں سمجھتے بلکہ ایک سیڑھی کے پادانوں کے مثل سمجھتے ہیں اور سات پہاڑ جن کو اہل ہنود سپت کلاچل کہتے ہیں تمام کرۂ زمین کو احاطہ کئے ہوئے ہیں ان کے نام یہ ہیں۔ سمیرو، سموبت، ہم کوٹ، ہم ون، نکدھ، پارجاتر اور کیلاس۔ قرآنِ کریم میں آیا ہے۔" پہاڑ زمین کے اوپر میخوں کی طرح ہیں۔"

ان ساتوں پہاڑوں کے چاروں طرف سمندر ہیں جو ایک پہاڑ کو احاطہ کئے ہوئے ہیں اور ان کو سپت سمندر کہتے ہیں۔ ان سات سمندروں کے نام یہ ہیں۔ پہلا' لون سمندر' یعنی دریائے شور، دوسرا' انچھ رس سمندر' یعنی دریائے آب نیشکر، تیسرا سُرا سمندر یعنی دریائے شراب، چوتھا گھرت سمندر، یعنی دریائے گھی، پانچواں دَدہ سمندر یعنی دریائے دہی۔ چھٹا کھِر سمندر یعنی دریائے شیر، ساتواں سوادجل یعنی دریائے آبِ زلال۔ قرآن کریم میں ان سات سمندروں کے ہونے کا ذکر ملتا ہے کہ اگر زمین کے تمام درخت قلم بن جائیں اور سات اور سمندر روشنائی ہو بھی اللہ تعالیٰ کے کلمات یا مقدرات قلم بند نہیں ہو سکتے۔ اور ہر ایک پہاڑ، زمین اور ندی میں مختلف النوع خلقت پائی جاتی ہے۔ زمین، پہاڑ اور دریا جو تمام زمینوں کے اوپر ہیں، اُن پہاڑوں اور دریاؤں کو ہندوستانی محقق سرگ کہتے ہیں جو بالفاظ دیگر بہشت و جنت کے مترادف ہیں اور اس زمین اور دریا کو جو زمینوں، پہاڑوں اور دریاؤں کے نیچے ہیں نرگ کہتے ہیں۔ جس سے دوزخ یا جہنم مراد ہے۔ ہندو محققوں کی رائے ہے کہ جنت اور دوزخ کا تعلق اسی دنیا سے ہے جس کو برھمانڈ کہتے ہیں اور وہ اس سے باہر نہیں ہیں اور ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ یہ سات آسمان جن پر یہ سات سیارے مقیم ہیں، بہشت کے گرد چکر لگاتے ہیں نہ کہ بہشت کے اوپر۔ بہشت کی چھت کو مہا اکاس کہتے ہیں جو عرش کے مساوی ہے اور بہشت کے فرش کو کرسی کہتے ہیں۔

(۱۸) عالمِ برزخ کا بیان

ہمارے پیغمبر نے فرمایا ہے "جس کسی کی بھی موت واقع ہوتی ہے' یقیناً اس کے لئے قیامت ہے۔" موت کے بعد آتما (روح) اجزار سے مرکب جسم کو چھوڑ کر بلا توقف مکتی کے جسم میں داخل ہو جاتی ہے۔ جس کو سوچھم سریر کہتے ہیں اور وہ عمدہ جسم ہے جس کی تشکیل ہمارے افعال سے ہوتی ہے۔ اچھے اعمال سے اچھا اور بُرے افعال سے بُرا جسم بنتا ہے۔ اس کے بعد سوال وجواب کے بعد بلا توقف اُسے جو بہشت کا مستحق ہوتا ہے بہشت میں اور جو دوزخ کا مستحق ہوتا ہے دوزخ میں لے جایا جائے گا۔ اس بات کا ذکر قرآن کریم میں ہے۔ یعنی جو بدبخت ہیں وہ آگ میں ہیں اور آگ میں ان کے لئے دائمی فریاد، نالہ وزاری ہوگی اور اس آگ میں وہ اُس وقت تک رہیں گے جب تک کہ زمین اور آسمان باقی ہیں سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ جیسا چاہے' کیونکہ تمہارا پروردگار ویسا ہی کرتا ہے جیساکہ وہ چاہتا ہے اور جو نیک بخت ہیں وہ جنت میں اس وقت تک رہیں گے جب تک کہ زمین و آسمان ہیں یا جب تک پروردگار چاہتا ہے کہ وہ ان کو اس جگہ سے باہر نکال لے اور اس کی بخشش لامحدود ہے۔

دوزخ سے نکالنے کا مطلب یہ ہے کہ آسمانوں اور زمینوں کے فنا ہونے سے پہلے اگر وہ چاہتا ہے تو وہ ملعون اشخاص کو دوزخ سے نکال کر جنت میں لے جائے گا۔ اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے ابن مسعودؓ نے کہا ہے کہ "دوزخ کی زندگی میں ایسا بھی ایک وقت آئے گا کہ ایک طویل مدت کے بعد، اس میں کوئی بھی نہ رہے گا۔" اور "جنت سے باہر نکالنے سے" یہ مراد ہے کہ آسمانوں اور زمینوں کے فنا ہونے سے پہلے اگر اللہ تعالیٰ چاہتا ہے تو وہ

اس کے نیکیوں کو فردوسِ اعلیٰ میں پہنچا دے گا کیونکہ اس کی سخاوت لامحدود ہے۔ یہ آیت بھی محولہ بالا بیان کی تصدیق و تائید کرتی ہے "سب سے افضل چیز اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہے۔ یہ بڑی کامیابی ہے" یعنی خدا کی جنت دوسری جنتوں سے وسیع تر ہے۔

اہلِ ہنود اس کو بیکنٹھ کہتے ہیں جو اُن کے عقیدہ کے مطابق سب سے بڑی نجات ہے۔

(۱۹) قیامت کا بیان

اہلِ ہنود کا خیال ہے کہ بہت زمانے تک بہشت یا دوزخ میں مقیم رہنے کے بعد مہاپرلے (بڑی قیامت) وقوع پذیر ہوگی۔ اس کا ذکر قرآن کریم میں بھی آیا ہے "لیکن قیامت کبریٰ وقوع پذیر ہوتی ہے" اور دوسری آیت کا بھی یہی مطلب ہے: "اور صور بجایا جائے گا، اس کی وجہ سے تمام لوگ جو آسمانوں پر ہیں اور جو زمین پر ہیں بے ہوش ہو جائیں گے، سوائے اُن کے جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔"

مستثنیات میں سے عارفوں کا وہ گروہ ہے جو اس دنیا اور آخرت میں بے ہوشی اور بےخودی سے محفوظ ہیں۔ آسمانوں، جنتوں اور دوزخوں کی تباہی کے بعد اور برھمانڈ کے زمانے کی تکمیل کے بعد دوزخ اور جنت کے نیکیوں کو مکتی (نجات) مل جائے گی یعنی دونوں خدا تعالیٰ کی ذات میں حلول اور فنا ہو جائیں گے۔ قرآنِ کریم میں آیا ہے "ہر شخص جو اس دنیا میں ہے، فنا ہوگا۔ صرف اللہ تعالیٰ کا وجود ہمیشہ قائم و دائم رہے گا، جو شان اور عزت والا ہے۔"

(۲۰) مکت کا بیان

مکتی سے مراد تمام تعینات کا ذاتِ باری تعالیٰ میں جذب اور حلول ہونا ہے۔ جیسا کہ قرآن میں آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی بہترین بخشش ہے اور یہ سب سے بڑی کامیابی ہے۔ رضوانِ اکبر یعنی فردوسِ اعلیٰ میں داخل ہونا سب سے بڑی نجات ہے۔ جو مکتی کہلاتی ہے مکتی کی تین قسمیں ہیں۔ پہلی جیون مکت یا زندگی میں نجات، اہلِ ہنود کے مطابق جیون مکت کا یہ مطلب ہے کہ زندگی میں عرفان اور شناسی کے ذریعہ حق تعالیٰ کو پہچانے اور اس دنیا کی ہر چیز کو واحد اور مساوی سمجھے اور اعمال و افعال، حرکات و سکنات، نیک و بد کو دوسرے کے بجائے خود سے منسوب کرے اور اس میں خود کو شریک کرتے ہوئے تمام موجوداتِ کو عینِ ذاتِ خداوندی سمجھے اور ہر شے میں خدا کو جلوہ گر سمجھے اور تمام برھمانڈ کو، جس کو صوفیائے کرام نے عالمِ کبریٰ سے تعبیر کیا ہے، اور جو خدا تعالیٰ کی مکمل صورت کے مانند ہے، اللہ تعالیٰ کا جسمانی بدن سمجھے اور عنصرِ اعظم یعنی مہا اکاس کو سوکھم سریر یعنی خدا تعالیٰ کا بدنِ لطیف سمجھے اور ذاتِ خداوندی کو اُس جسم کی رُوح کی طرح جانے۔ مزید براں خداوند کو ایک قائم دائم فرد تصور کرتے ہوئے وہ ذرّہ میں، پہاڑ میں، عالمِ ظاہر و باطن میں سوائے ذات یگانہ و بےہمتا نہ کچھ دیکھ سکے گا اور نہ جان سکے گا۔ چونکہ ایک انسان جو عالمِ صغیر کہلاتا ہے ایک فرد ہے، باوجود اس کے کہ اس کے اعضا مختلف اور کثیر ہیں اور اعضا کی کثرت کی بنا پر اس کی ذات متعدد نہیں ہے۔ اس لئے اس ذاتِ واحد کو تعینات کی کثرت کی وجہ سے متعدد نہیں سمجھنا چاہیے

جہاں یکسر چہ ارواح و چہ اجسام   بود شخصی معین عالمش نام

(تمام دنیا، روحانی یا جسمانی ایک قائم فرد ہے جس کو عالم کہتے ہیں)

لہٰذا حق تعالیٰ کو اس معین فرد کی روح اور جان سمجھے جو ایک بال کے برابر بھی علیحدہ نہیں ہے۔ چنانچہ شیخ سعدالدین حموی فرماتے ہیں

حق جانِ جہاں است و جہاں جملہ بدن
ارواح و ملائک و حواس ایں ہمہ تن
افلاک و عناصر و موالید و اعضاء
توحید ہمیں است و دگر شیوہ و فن

(حق دنیا کی روح ہے اور تمام دنیا بدن ہے۔ ارواح ملائک، اور حواس اجسام ہیں۔ آسمان، عناصر اور قدرت کی تینوں ملکتیں حیوانات، نباتات اور جمادات)، اور اجسام، یہی توحید ہیں اور بقیہ تمام چیزیں تدابیر اور حکمتیں ہیں)

اسی طرح ہندو موحدین مثلاً ویاس اور دوسرے مہا پرسوں نے برھمانڈ یعنی عالمِ کبیر کو فردِ واحد مانا ہے اور اس برھمانڈ کے جسمانی اعضا کو اسی طرح بیان کیا ہے۔ اس کے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جب کوئی صوفی صافی کسی شے پر اپنی نظر ڈالے تو ایسا محسوس کرے کہ وہ مہاپرس کے فلاں عضو کو دیکھ رہا ہے۔ یہاں اس سے مراد حق تعالیٰ کی ذات ہے۔ پاتال جو زمین کا ساتواں طبقہ ہے، مہاپرس کے پیر کا تلوا ہے اور رساتل جو زمین کا چھٹا طبقہ ہے مہاپرس کے پیر کا اوپری حصہ ہے اور شیطان، مہاپرس کے پیروں کی انگلیاں ہیں۔ اور شیطان کی سواری کے جانور مہاپرس کے پیروں کے ناخن ہیں۔ مہاتل جو زمین کا پانچواں طبقہ ہے، مہاپرس کا ٹخنہ ہے، تلاتل، زمین کا چوتھا طبقہ مہاپرس کی پنڈلی ہے، سوتل، تیسرا طبقہ، مہاپرس کا زانو ہے۔ بتل، دوسرا طبقہ، مہاپرس کی ران ہے اتل، پہلا طبقہ، مہاپرس کا عضوِ مخصوص ہے۔ کال یعنی زمانہ

مہاپرس کی رفتار ہے۔ پرجاپت دیوتا، جو تمام عالم کا خالق ہے، مہاپرس کی مردانگی اور قوّتِ رجولیت کی علامت ہے۔ بارش مہاپرس کا نطفہ ہے۔ بھولوک یعنی زمین سے آسمان تک مہاپرس کے ناف کا نچلا حصہ ہے۔ جنوبی تین پہاڑ، مہاپرس کے دائیں ہاتھ، اور شمالی تین پہاڑ مہاپرس کے بائیں ہاتھ ہیں اور سمیر پربت، مہاپرس کی سُرین ہے۔ اور صبح کاذب کی روشنی مہاپرس کے جامے کا تار ہے اور صبح صادق کی روشنی اس کے جامے کی چادر کی سفیدی ہے (اس سے اشارہ ہے کہ خدا میری ردا ہے) اور شام کی شفق کا رنگ مہاپرس کا لباس جو اس کے ستر کو ڈھکتا ہے (اسکے ازار کی عظمت کا کنایہ ہے) سمندر یعنی بحرِ محیط اس کی ناف کا حلقہ اور گہرائی ہے اور بدوا نل اسکی آگ کا مکان ہے۔ جو ساتوں دریاؤں کا پانی فوراً جذب کر لیتا ہے۔ اور اُن میں طغیانی نہیں آنے دیتا۔ اور قیامتِ کبریٰ کے دن تمام پانی کو خشک کر دے گا۔ اور یہ حرارت اور گرمی مہاپرس کا معدہ ہے۔ اور دوسرے دریا اسکی رگیں ہیں۔ جس طرح تمام رگیں ناف تک جاتی ہیں اسی طرح تمام دریا سمندر سے جا کر مل جاتے ہیں۔ گنگا، جمنا، سرستی، مہاپرس کی شہ رگ ہے۔ انکلا، جنمان، بیکلا، جھونا سکمنا، سرستی، بھولوک، جو بھولوک کے اوپر ہے وہاں گندھرپ دیوتاؤں کا مسکن ہے اور جہاں سے تمام آوازوں کا نکاس ہوتا ہے، مہاپرس کا پیٹ ہیں اور قیامتِ کبریٰ کی آگ مہاپرس کی معدے کی بھوک ہے اور قیامتِ صغریٰ میں پانی کا خشک ہونا مہاپرس کی پیاس اور آب نوشی ہے۔ سرگ لوک جو بھولوک کے اوپر ہے، اور بہشت کے طبقوں میں سے ایک طبقہ ہے، مہاپرس کا سینہ ہے جس میں ہمیشہ خوشحالی، شادکامی اور سکون قیام کرتا ہے۔ اور تمام ستارے مہاپرس کے مختلف جوہر ہیں۔ سوال سے پہلے کی بخشش اور فضل مہاپرس کا دایاں پستان اور سوال کے بعد کی عنایات مہاپرس کا بایاں پستان ہے۔ اعتدال یعنی رجوگن، ستوگن اور تموگن (کو پرکرت بھی کہتے ہیں) مجموعی طور پر مہاپرس کا دل ہے جس طرح کہ کنول میں تین رنگ، سفید، سرخ اور بنفشی ہوتے ہیں، اسی طرح دل ہے جس کا رنگ کنول کی طرح ہوتا ہے۔ اس کے تین اوصاف ہیں اور تینوں رنگوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ جن کے مظاہر برھما، بشن اور مہیش ہیں۔ برھما جن کا نام من بھی ہے مہاپرس کے دل کی حرکت اور ارادہ ہے۔ بشن، مہاپرس کے رحم اور مہر کا مظہر ہے اور مہاپرس کے قہر و غضب کا مظہر مہیش ہے۔ چاند مہاپرس کا تبسم اور خوش خصالی ہے کہ الم و اندوہ کو دور کرتا ہے اور رات مہاپرس کی کمان ہے۔ سمیر پربت

مہاپرس کے ریڑھ کی ہڈی ہے اور اس کے بائیں، دائیں جانب کے پہاڑ مہاپرس کی پسلیاں۔ اور مہاپرس کے دونوں ہاتھ، آٹھ محافظ فرشتے ہیں اور اندر ان کا پیشوا ہے۔ بارش کرنے اور نہ کرنے کی پوری قوت رکھتا ہے۔ مہاپرس کا دایاں ہاتھ بخشش اور بارش کرنے والا اور بایاں بارش کو روکنے والا ہے۔ اپچھرا بہشت کی حوریں۔ مہاپرس کے ہاتھوں کی لکیریں ہیں۔ اور فرشتے جن کو وہ چھپکش کہتے ہیں۔ مہاپرس کے ہاتھ کی انگلیوں کے ناخن ہیں اور تین فرشتے، مہاپرس کے دائیں ہاتھ کے لوک پال ہیں (کلائی سے انگلی تک اگن نام کا فرشتہ) اور جم نامی فرشتہ مہاپرس کا بازو ہے اور بقیہ فرشتے مہاپرس کے بائیں ہاتھ کے لوک پال ہیں۔ کُبیر فرشتہ مہاپرس کا گھٹنا ہے اور کلپ برچھ یعنی طوبیٰ کا درخت، مہاپرس کا عصا ہے۔ قطب شمالی اور قطب جنوبی مہاپرس کے بالترتیب بائیں اور دائیں کاندھے ہیں۔ لوک پال فرشتہ موسومہ برن جو پانی کا نگراں ہے، اور مغرب میں رہتا ہے، مہاپرس کے گردن کی ہڈی ہے۔ اناہت یا سلطان اذکار مہاپرس کی باریک (سُریلی) آواز ہے۔ مہرلوک، جو سرگ لوک کے اوپر ہے، مہاپرس کی گردن اور گلا ہے۔ جن لوک، جو مہرلوک کے اوپر ہے، مہاپرس کا روئے مبارک ہے۔ دنیا کی خواہش مہاپرس کا چاہِ زنخداں ہے۔ دُنیا کی بُرائی مہاپرس کا نچلا ہونٹ اور شرم و حیا کا احساس مہاپرس کا اوپری ہونٹ ہے۔ سینہ یعنی الفت و محبت (کا مقام) مہاپرس کا مسوڑھا ہے۔ تمام دنیا کا کھانا مہاپرس کا کھانا ہے۔ پانی کا عنصر مہاپرس کا کام و دہن ہے۔ آگ کا عنصر مہاپرس کی زبان ہے، سرستی مہاپرس کی قوتِ گویائی ہے۔ چار وید (حقیقت کی چار کتابیں) مہاپرس کی تقاریر ہیں۔ مایا یا محبت، جو دُنیا کی تخلیق کی وجہ تھی، مہاپرس کی ہنسی اور خوش طبعی ہے اور دنیا کی آٹھ سمتیں، مہاپرس کے دونوں کان ہیں۔ اشنی کمار، جو دو بہت خوبصورت فرشتے ہیں، مہاپرس کے دونوں نتھنے ہیں۔ گندھرتن ماتر یا خاک کے عناصر، مہاپرس کی قوتِ شامّہ ہے۔ ہوا کا عنصر مہاپرس کے سانس لینے کی قوت ہے۔ جن لوک اور تپ لوک جو بہشت کے پانچویں اور چھٹے طبقے ہیں ذاتِ واحد کے نور سے منوّر ہیں اور ان کے شمالی اور جنوبی نصف حصّے مہاپرس کی بالترتیب بائیں اور دائیں آنکھ ہیں۔ اصل نور جس کو آفتابِ ازل کہتے ہیں۔ مہاپرس کی قوتِ بینائی ہے اور تمام موجودات مہاپرس کی نگاہِ لطیف ہے اور دنیا دی شب و روز مہاپرس کی پلک کا جھپکنا ہے۔ متر فرشتہ جو دوستی اور اخوت کا موکل ہے اور توستا نامی فرشتہ جو قہر و غضب

کا موتکل ہے، مہاپرس کے دونوں آبرو ہیں۔ تپ لوک جو جن لوک کے اوپر ہے، مہاپرس کی پیشانی ہے اور ست لوک جو تمام لوکوں کے اوپر ہے، مہاپرس کی کھوپڑی ہے۔ آیاتِ توحید اور کتاب اللہ مہاپرس کا کلام القدیم ہے۔ کالے بادل، جو مہاپرلے کا پانی لے جاتے ہیں، مہاپرس کے بال ہیں اور سارے پہاڑوں کے درخت مہاپرس کے بدن کے بال ہیں۔ نجھی جو تمام عالم کی خوبی اور دولت ہے، مہاپرس کا حسن ہے۔ روشن آفتاب مہاپرس کے بدن کی تابانی ہے۔ بھوت اکاس مہاپرس کے بدن کے مسامات ہیں۔ چدا کاس مہاپرس کے بدن کی روح ہے۔ ہر فرد کی صورت مہاپرس کا مکان ہے۔ انسان کامل مہاپرس کی خلوت گاہ اور خاص محل ہے۔ جیسا کہ خدا تعالیٰ نے داؤد (علیہ السلام) سے ارشاد فرمایا: "اے داؤد میرے لئے ایک گھر تعمیر کرو" انہوں نے جواب دیا: "اے خداوند آپ مکان سے مبرا ہیں" خداوند تعالیٰ نے پھر ارشاد فرمایا "میرا گھر تیرا دل ہے تم اس گھر کو دوسروں سے خالی کر دو"۔ اور اس برہمانڈ میں جو اوصاف کثرت سے پائے جاتے ہیں وہ سب انسان میں موجود ہیں، جو عالم کبیر کا خلاصہ ہیں۔ جو شخص اس طرح سمجھتا ہے اور اس طرح دیکھتا ہے، جیون مکت حاصل کرتا ہے۔ قرآن کریم کی یہ آیت اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے "خوشحال وہ جماعت ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل عطا کیا ہے"۔

دوم، سرب مکت کی حالت سے تمام قیود سے خلاصی اور ذاتِ باری تعالیٰ میں جذب ہونا مراد ہے۔ اور یہ نجات تمام موجودات میں پائی جاتی ہے اور آسمان، زمین، بہشت، دوزخ، برہمانڈ، شب و روز کی تباہی کے بعد تمام چیزیں ذاتِ واحد میں فنا ہو کر نجات حاصل کریں گی اور قرآن کریم کی ان آیتوں میں اسی نجات کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ سب سے عمدہ بات اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہے۔ یعنی یہ بڑی شاندار کامیابی ہے اور یقیناً اللہ تعالیٰ کے محبوب کو نہ تو ڈر ہوگا نہ اندوہ۔

سوم، سربدا مکت، یعنی بعد کی نجات، کا ہونا عارف ہونے پر منحصر ہے اور ترقی کی منزل آزادی اور نجات حاصل کرنا ہے۔ چاہے یہ ترقی دن کو بہار آت کو، چاہے عالم ظاہر یا عالم باطن میں۔ چاہے برہمانڈ ظاہر ہو یا نہ ہو، چاہے یہ ماضی، حال اور مستقبل میں وقوع پذیر ہو۔ قرآن کریم میں جہاں کہیں بھی جنت کا ذکر ملتا ہے، وہاں یہ بتایا گیا ہے "ہمیشہ اس جنت میں رہیں گے" یہاں جنت سے مراد معرفت الٰہی ہے اور لفظ "ابدا" سے مراد اس نجات و مکت کی ابدیت سے ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ایک فرد جس کسی بھی حالت میں کیوں نہ ہو، اس میں معرفت حاصل کرنے اور ابدی فضل پانے کی قوت لازمی ہے۔ لہٰذا قرآن کریم کی یہ دو آیتیں ان گروہوں کے بارے میں نازل ہوئی تھیں جو مکت یا نجات پاتے ہیں: "خداوند بذاتِ خود ان کو اپنے رحم، رحمت اور باغوں کی خوشخبری دیتا ہے، جہاں ان کو ابدی مسرت حاصل ہوگی، وہاں ہمیشہ رہیں گے، اور یقیناً اللہ تعالیٰ کے پاس ایک اعلیٰ تحفہ ہے"۔

اور "اے پیغمبر یہ خوشخبری اپنے پیرؤں کو سنا دو جو اچھے اعمال اس لئے کرتے ہیں کہ ان کو اچھا صلہ (معرفت) ملے گا اور درحقیقت ایک عارف کے لئے فردوسِ اعلیٰ میں دوامی قیام ایک بہت عمدہ صلہ ہے"۔

(۲۱) روز و شب کا بیان

الوہیت، ظہور و باطن۔ اہلِ ہنود کے عقیدہ کے مطابق برہما کا، جو جبرئیل کے مشابہ ہیں، زمانہ اور برہمانڈ کا فنا ہونا اور موجودات کے تخلیق کے دن کا اختتام، دنیا کے اٹھارہ لُج کے برابر ہے۔ ہر ایک لُج ایک ہزار سال کے برابر ہوتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کی دو آیتوں میں بیان کیا گیا ہے: "یقیناً پروردگار کے ساتھ ایک دن ایک ہزار سال کے برابر ہے"۔ "اور ایک وہ دن جب فرشتے اور روح اپنے پروردگار کی طرف مائل ہوتے ہیں (جن سے جبرئیل اور برہما مراد ہے) کی مدت پچاس ہزار سال کے برابر ہے اور جس کا ہر ایک دن ایک ہزار سال کے مساوی ہے۔ اس لئے میرے (دارا شکوہ) شمار کے مطابق جبرئیل کا زمانہ اور ایک دن عالم کی زندگی کی مدت جو برہمانڈ کے مشابہ ہے، دنیا کے اٹھارہ لُج سالوں کے برابر ہے اور ہر ایک لُج ایک ہزار سال کے برابر ہے۔ اس میں کسی قسم کی کمی بیشی نہیں ہوتی کہ ہندوستان کے موحدین کے شمار کرنے کا یہ طریقہ ہے۔ یہ بات بھی دھیان میں رکھنی چاہیے کہ اُن کے (اہلِ ہنود) اٹھارہ کے عدد کی بنیاد آٹھ اور دس پر ہے کیوں کہ اُن کے گننے کے مطابق، اس کے بعد کسی چیز کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ پس قیامتِ صغریٰ جو ماقبل وقوع پذیر ہو چکی ہیں اور بعد میں ہوں گی، اُن قیامتوں کو کھنڈ پرلے کہتے ہیں جو طوفان، طغیانی اور آتش زدگی کی صورت میں نمایاں ہوتی ہیں اور اس زمانہ کے اختتام کے بعد، یہ دھارام دن شام میں بدل جائے گا اور قیامتِ کبریٰ، جس کو (اہلِ ہنود) مہاپرلے کہتے ہیں، وقوع پذیر ہوگی۔ جیسا کہ قرآن کریم کی ان دو آیتوں میں مذکور ہے: "اس دن جب زمین ایک دوسری زمین میں تبدیل کر دی جائے گی" اور

"اس دن جب ہم کتابت کے کاغذوں کی طرح سے آسمان کو لپیٹ دیں گے" پس، شب بطون میں، جو روز ظہور کے برابر ہے، قیامتِ کبریٰ ہوگی اور تمام تعینات ذاتِ باری تعالیٰ میں جذب ہوجائیں گے۔ اور اس کی مجموعی مدت دنیا کے اٹھارہ انجوں کے برابر ہے۔ اور استمام جو سکھوپت اور جبروت کے مترادف ہے، اس سکھوپت کی مدت حضرت ذاتِ کی عمر کے برابر ہے۔ جو خلقت کی تخلیق یا عالم کے معدوم ہونے سے فارغ ہے۔ قرآن کریم کی آیت میں آیا ہے۔ "اے جن و انس میں جلد ہی تم دونوں سے فارغ ہوجاؤں گا۔" یہ سکھوپت کی طرف اشارہ ہے۔ دنیا کے ظہور کے زمانے میں خداوند ناسوت کے مقام پر رہتا ہے اور چھوٹی قیامتوں کے زمانے میں مقام ملکوت میں اور قیامت کبریٰ کے بعد مقام جبروت میں ہوتا ہے۔

اے میرے دوست، اس باب میں میں نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ بڑی تحقیق و تدقیق اور بے حد محنت کا ماحصل ہے اور میرے وجدان (روحانی فیضان) کے عین مناسب ہے۔ جو، حالانکہ تم نہ تو کسی کتاب میں پڑھ سکو گے یا نہ کسی سے سن سکو گے۔ قرآن کی محولہ بالا آیتوں کے عین مطابق بھی ہے۔ اگر وضاحت بعض خام لوگوں کے کانوں کو گراں گزرے تو اس بنا پر مجھے کوئی خوف نہیں ہے: "اللہ تعالیٰ یقیناً خود کفیل ہے، دنیا کی چیزوں کی ضرورت سے بالاتر ہے۔" (فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ)

(۲۲) بیان بی نہایتی ادوار

اہلِ ہنود کے عقیدے کے مطابق حق تعالیٰ نہ تو ایک رات اور نہ ایک دن کا پابند ہے بلکہ جب یہ رات ختم ہوجاتی ہے تو دوبارہ دن نکل آتا ہے اور جب دن ختم ہوجاتا ہے تو رات آجاتی ہے۔ یہ سلسلہ نہ ختم ہونے والا ہے۔ اس عمل کو اناد پرواہ کہتے ہیں۔ خواجہ حافظ شیرازی نے ادوار کے نہ ختم ہونے والے عمل کو نظر میں رکھتے ہوئے کہا ہے

ماجرای من و معشوق مرا پایان نیست
ہرچہ آغاز ندارد نہ پذیرد انجام

اور ظہور اور مخفیاتِ ذاتِ باری تعالیٰ میں جو خصوصیات پچھلے روز و شب میں نمودار ہوئی ہیں، آنے والے دن اور رات میں بعینہ، اسی طریقے پر دوبارہ ظاہر ہوں گی جیسا کہ قرآن کریم کی اس آیت میں ارشاد ہوا ہے "جیسی کہ ہم نے پہلی خلقت تخلیق کی ہے ویسی ہی ہم پھر پیدا کریں گے۔"

اس لئے اس دور کے اختتام کے بعد، انسانوں کے باوا آدم کی دنیا بالکل بعینہٖ صورت میں ظاہر ہوگی اور اس بنا پر، اس کی کوئی انتہا نہ ہوگی اور قرآن کریم میں آیا ہے "جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں ابتدا میں پیدا کیا تھا، اسی طرح تم واپس جاؤ گے۔" محولہ بالا بیان کی تائید کے لئے یہ بھی ایک دلیل ہے۔ پھر بھی اگر کوئی یہ شبہ کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ اس وضاحت سے ہمارے رسول کا خاتم الرسول ہونا ثابت نہیں ہوتا، تو میں اس سے کہوں گا کہ دوسرے دن بھی، ہمارے رسول بعینہٖ اسی صورت میں دوبارہ ظاہر ہوں گے، اور اس دن بھی ان کو "ملے خاتم الرسل" کہہ کر بلایا جائے گا۔ شبِ معراج سے متعلق حدیث بھی اس معنی پر دلالت کرتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہمارے رسول نے اونٹوں کی ایک قطار دیکھی جو بلا اختتام کے آگے پیچھے چلے جارہے ہیں، اور ان میں سے ہر ایک پر دو صندوق لدے ہوئے تھے۔ ان دونوں میں سے ایک میں ہماری جیسی دنیا تھی اور ہر ایک ایسی دنیا میں ان جیسے ایک محمدؐ تھے۔ ہمارے رسول نے جبرئیل سے دریافت کیا "یہ کیا ہے؟" جبرئیل نے جواب دیا "اے اللہ کے رسول، میں اپنی پیدائش کے وقت سے صندوقوں سے لدے اونٹوں کی قطار کو آگے بڑھتے ہوئے دیکھتا آرہا ہوں لیکن میں خود بھی ان کی اصل اہمیت سے ناواقف ہوں۔" یہ اشارہ بھی ادوار کے لانہایتی کی طرف ہے۔

تعریف اس خدا کی اس کے فضل و کرم کے لئے جس نے مجھے اس رسالہ، موسومہ "مجمع البحرین" کے ختم کرنے کی توفیق عطا کی۔ یہ کام ۱۰۶۵ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچا جس وقت اس بے اندوہ فقیر محمد دارا شکوہ کی عمر بیالیس سال کی تھی۔ والسلام۔ ●●



جشنِ جمہوریت کی چند جھلکیاں



نئی دلی میں اب کے سال جشنِ جمہوریہ کی تقریبات جوش و خروش لیکن کفایت سے منائی گئیں۔ ریاستی جھانکیوں میں آزادی سے آج تک کے کارناموں کو موضوع بنایا گیا تھا چنانچہ تامل ناڈو کی جھانکی کا موضوع تھا سیکولرازم اور ہر ایک کو یکساں رتبہ دینا اور یکساں مواقع مہیا کرنا۔ ترازو سے ظاہر ہے کہ سیکولرازم تو حاصل ہو چکی ہے لیکن نابرابری ابھی دور نہیں ہو سکی۔



مہاراشٹر کی جھانکی کا موضوع تھا بھاری صنعتوں کا قیام اور خودکفالت۔ کیرالا کی جھانکی میں بھی سیکولرزم کو پیش کیا گیا۔ تصویر میں عیسائی، یہودی، ہندو، مسلم اور سکھ مذہب کے امتیازی نشان یعنی صلیب، چراغ، اوم، محراب و ہلال اور نشان صاحب کے بعد قومی نشان اشوک چکر بھی موجود ہے۔



جشن جمہوریہ کی تقریبات کا خاتمہ بیٹنگ ریٹریٹ پر ہوا جس میں [illegible] بحری اور ہوائی فوج کے مختلف بینڈوں نے پر جوش دھنیں سنائیں جسے بے مثال [illegible] گیا۔ اس کے بعد توپوں کے گولوں سے آتش بازی دکھائی گئی۔ کفایت شعاری کے پیش نظر اس سال سرکاری عمارتوں پر چراغاں نہیں ہوا۔

VOL. 32 No. 8 AJKAL (MONTHLY) MARCH, 1974
Published by the Director, Publications Division, Patiala House, NEW DELHI-110001 Printed by [illegible] Printing Works, Rani Jhansi Road, NEW DELHI-55

وزیر اعظم کو "ڈکتورِ ادب" کی اعزازی ڈگری

جامعہ اردو علی گڑھ کی جانب سے

۲ مارچ ۱۹۷۴ء

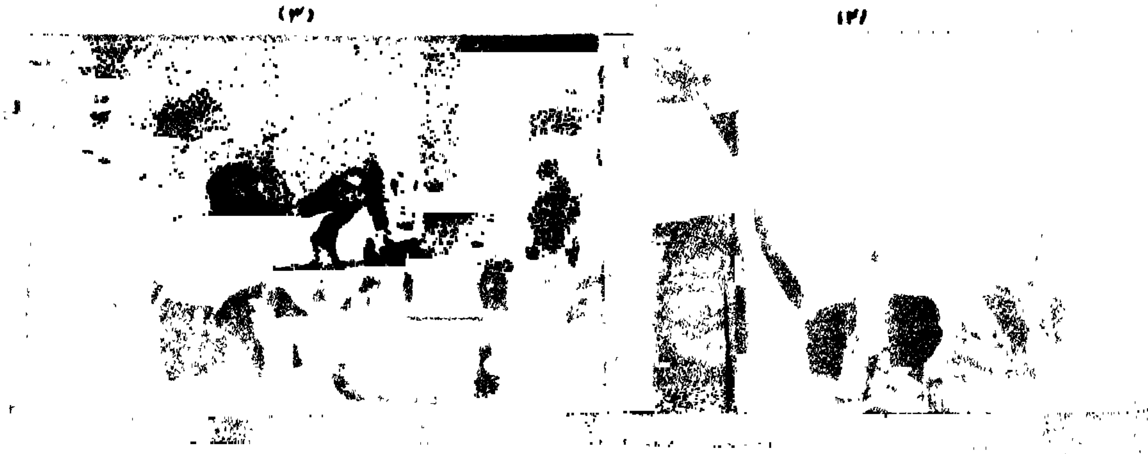
۱۔ بائیں سے دائیں۔
ڈاکٹر مسعود حسین خاں،
پنڈت آنند نرائن مُلا
ڈاکٹر رفیق ذکریا، چانسلر جامعہ
اُردو علی گڑھ، وزیر اعظم
شریمتی اندرا گاندھی،
اعزازی ڈگری کے گاؤن میں
۲۔ ڈاکٹر رفیق ذکریا کی تقریر۔
۳۔ وزیر اعظم کا جواب
۴۔ وزیر اعظم کو ڈگری کی پیش کش

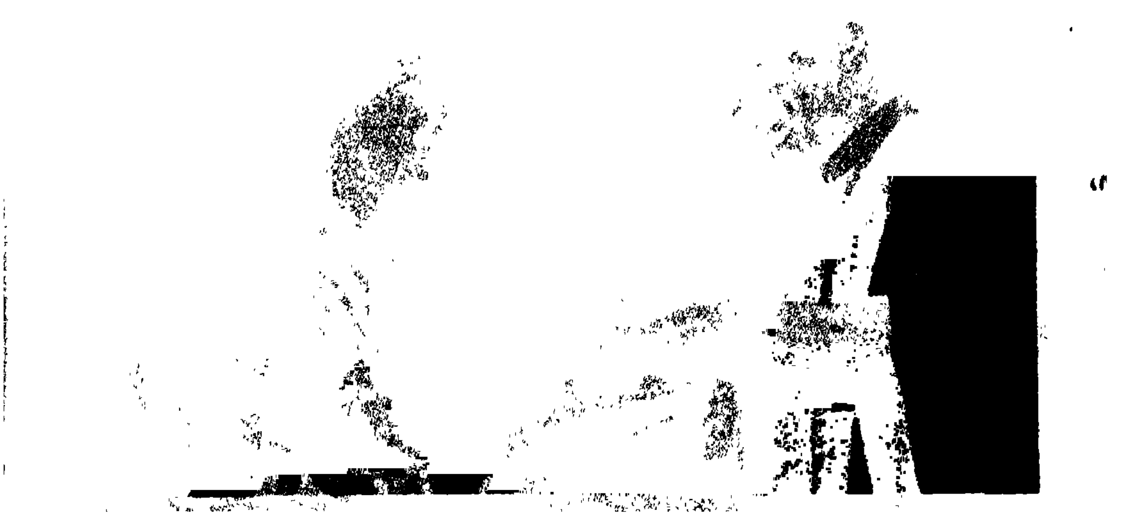


(۳)



(۲)





۱

اُردو کا مقبولِ عام مصوّر ماہنامہ

آج کل

نئی دہلی

ایڈیٹر
مہدی عباس حسینی

ٹیلیفون نمبر :- ۳۸۷۰۶۹

سب ایڈیٹر
نند کشور وکرم

جلد ۳۲ شمارہ ۹
اپریل ۱۹۷۴ء
چیترا ویساکھ شک ۱۸۹۶

شرحِ چندہ

سالانہ	۱۰ روپیہ	۳ ڈالر	۱ پاؤنڈ
دوسالہ	۱۸ روپیہ	۵ ڈالر	۱.۷۰ پاؤنڈ
سہ سالہ	۲۴ روپیہ	۷ ڈالر	۲.۴۰ پاؤنڈ
فی کاپی	ایک روپیہ	۳۰ سنٹ	۱۰ پنی

ترتیب

سرورق، عمل: پی۔ کے۔ سین گپتا

شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر آج کل (اُردو) پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیلِ زر کا پتہ
بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

یہ شمارہ

آج کل جبکہ زندگی مشکل سے مشکل تر ہوتی جا رہی ہے، ہم نے یہی مناسب سمجھا کہ تلخیِ غمِ دوراں کا علاج ایک قہقہے سے کیا جائے۔ طنز و مزاح زندگی کے المیے سے گریز نہیں بلکہ اس کو خندہ پیشانی اور حوصلے کے ساتھ سہنا اور اس پر قابو پانا سکھاتا ہے۔ بنیادی طور پر شاعری اور طنز و مزاح میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ دونوں کے برتنے کے لئے اوّل ایک حساس دل ہونا چاہیئے اور پھر وہ قوتِ متخیلہ جو بظاہر 'انمل' بے جوڑ چیزوں میں ایک ربط و مناسبت تلاش کر کے اسے فن کارانہ طور پر قاری کے سامنے پیش کر دے۔

طنز و مزاح، زبان کی بلوغیت اور شائستگی کا پیمانہ ہوتا ہے۔ اُردو میں طنز و مزاح کا سرمایہ نہ صرف مقدار بلکہ معیار کے لحاظ سے بھی گراں مایہ ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے جبکہ ہند کی دیگر زبانوں نے محض سنسکرت روایات کو ورثے میں پایا ہے، اُردو نے سنسکرت کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی طنز و مزاح کی روایت سے بھی خوشہ چینی کی ہے۔

اس نمبر کے لئے سواد اتنا زیادہ فراہم ہو گیا کہ ہمیں مجبوراً اسے دو حصوں میں تقسیم کرنا پڑا۔ پہلے حصے میں ہم محض معاصرین کو شامل کرنا چاہتے تھے اور اُن سے گزارش کی گئی تھی کہ وہ اپنی پسند کی اپنی کوئی مطبوعہ یا غیر مطبوعہ نگارش بھیجیں۔ پھر محسوس ہوا کہ حصۂ نثر کو نظم سے الگ کرنا ہوگا۔ پھر یہ کہ دورِ جدید میں جیسے طنز کی کوئی محفل رشید احمد صدیقی کے بغیر تشنہ رہے گی ویسے ہی خاص مزاح کی کوئی بات بغیر پطرس کے بنتی نظر نہیں آتی۔ لہٰذا ان زندۂ جاوید لے دیگر متاخرین، معاصرین اور شعراء کو ہمارے حصۂ دوم میں دھکیل دیا۔ یوں بھی مرحوم کو کبھی مار کر آگے بڑھنے کا فن خوب آتا تھا۔ ہم بہرحال اُن حضرات سے معذرت خواہ ہیں جن کی نگارشات موجودہ شمارے میں شامل نہ ہو سکیں لیکن ہمیں یقین ہے کہ ہمارے قارئین اگلے شمارے کا اور بھی گرمجوشی سے خیر مقدم کریں گے کیونکہ اس طرح انہیں دو مہینوں تک ہنستا ہنسانا نصیب ہوگا۔

اس شمارے کی ترتیب میں مشہور مزاح نویس مجتبیٰ حسین صاحب ہمارے خصوصی صلاح کار رہے ہیں لیکن قبل اس کے کہ اُن کے تعلقات "اہلِ قلم" سے "ناخوشگوار" ہو جائیں یہ وضاحت ضروری ہے کہ آخری فیصلہ اور کتر بیونت ادارے نے کی ہے نہ کہ مجتبیٰ صاحب نے۔

لگے ہاتھوں ہمارے آئندہ شماروں کے بارے میں بھی سُن لیجئے۔ جون کا شمارہ ڈاکٹر تاراچند سے مخصوص ہوگا، اگست کا لوک گیتوں سے، اور نومبر کا حضرت امیر خسرو سے۔ اس سال حضرت امیر خسرو کی سات سو سالہ برسی منانے کے لئے ایک خصوصی کمیٹی بنائی گئی ہے جس کے صدر جناب فخرالدین علی احمد صاحب اور سکریٹری جناب حسن الدین احمد اور جناب ظ انصاری صاحبان ہیں۔

جشنِ ڈاکٹر عابد حسین

پہلی مارچ ۱۹۷۳ء کو ڈاکٹر عابد حسین کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر "جشنِ عابد حسین کمیٹی" کی جانب سے انہیں اُردو اور انگریزی میں ایک ایک یادگاری کتاب پیش کی گئی۔ یہ تقریب مشہور عالم اور ماہرِ لسانیات ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی کے ہاتھوں انجام پائی۔ ہم اس کمیٹی کے صدر کرنل سید بشیر حسین زیدی صاحب اور کنوینر جناب مالک رام صاحب کو مبارکباد پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے ایک عالم کی زندگی میں ہی اس کی خدمات کا اعتراف کرنے کا اہتمام کیا۔ ڈاکٹر عابد حسین کی بصیرت، اندازِ فکر، اثابت رائے، قوتِ فیصلہ، خوش طبعی اور منفرد طرزِ انشاء کے سبھی قائل ہیں۔ اسّی سالہ ہونے کے باوجود وہ جس سرگرمی اور سچی لگن سے ملک و قوم اور ادب کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں اس سے نوجوانوں کو سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ خدا ان کا سایہ ہمارے سروں پر تادیر قائم رکھے۔

شریمتی اندرا گاندھی کو اُردو کی اعزازی ڈگری

دوسری مارچ ۱۹۷۳ء کو دلّی میں جامعہ مِلّیہ اسلامیہ کی جانب سے وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی کو "دکتورِ ادب" کی اعزازی ڈگری دی گئی۔ جامعہ کے چانسلر، ڈاکٹر رفیق زکریا، وزیرِ ریاست حکومتِ مہاراشٹر نے بجا طور پر فرمایا کہ شریمتی اندرا گاندھی کے آٹھ سالہ دورِ حکومت میں اُردو کی بقا اور فروغ کے لئے جتنا کچھ کیا گیا اتنا اس سے پہلے کے ۱۸ سال میں نہ ہو پایا۔

شریمتی اندرا گاندھی نے ایک بار پھر اعلان کیا کہ اُردو ہند کی ایک ممتاز اور منفرد زبان ہے اور حکومت اس کے فروغ کے لئے ہر ممکن کوشش کرے گی۔ ساتھ ہی انہوں نے یاد دلایا کہ اُردو نے اسی لئے ترقی کی کیونکہ وہ عوام کی زبان تھی۔ لہٰذا آج بھی حکومت کے علاوہ اُردو داں عوام کو بھی اس کے فروغ کے لئے کوشاں رہنا چاہیئے۔

محمد حسن
ڈی۔ ۲، ماڈل ٹاؤن۔ دہلی ۹...



طنز و مزاح کے نئے رجحانات

جس سماج میں ہم آپ رہتے ہیں وہاں ہنسنے ہنسانے کو بہ چشمِ نم دیکھا جاتا ہے۔ کوئی شریف آدمی ہشاش بشاش خوش و خرم نظر آئے تو یوں سمجھا جاتا ہے جیسے شارعِ عام پر کوئی سنگین جرم کرتے پکڑا گیا ہے۔ روتی صورت عموماً احترام سے دیکھی جاتی ہے اور جو جتنا سنجیدہ رنجیدہ یا غم دیدہ نظر آئے گا اتنا ہی بڑا مفکر، فلسفی یا عارفِ کائنات سمجھا جائے گا۔ اسی لئے رنج و غم نے فیشن کی شکل اختیار کر لی ہے اور ہمارے ادب اور فلسفے کو اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے۔ بچے کی پیدائش ہو، دلہن کی رخصتی ہو، عزیز و اقارب کا آنا یا جانا ہو، ہر موقعے پر آنسو کا چلن اور رقت آمیزی کا چرچا ہے۔ پھر بھی اگر ہنسنے ہنسانے کا چلن باقی رہ گیا تو یہ حسنِ اتفاق ہے یا ہنسنے ہنسانے کی فطری حس کی سخت جانی۔

مثل مشہور ہے رونا گانا سب کو آتا ہے۔ ممکن ہے یہ صحیح ہو لیکن ہنسنا ہنسانا سب کو نہیں آتا۔ یہ وہ فنِ شریف ہے جو ریاضت چاہتا ہے اور ظرف اور حوصلہ مانگتا ہے۔ اردو ادب کو یہ شرف حاصل ہے کہ طنز و مزاح کی روایت پرانی بھی ہے اور اعلیٰ سطح کی بھی ہے۔ یہ اس کے ادبی مزاج کی شائستگی اور بالیدگی کا ثبوت ہے۔ اس روایت کے اہم نشانات کو گنوانا تحصیلِ حاصل ہے۔ لیکن پچھلے چند سال میں اس ادبی روایت کی جہات میں جو اضافے ہوئے ہیں ان کی پہچان البتہ اس مختصر سے مقالے کے دائرے میں رہ کر بھی کی جا سکتی ہے۔

علاوہ بریں مختلف اقوام کی ذہنی سطح اور تہذیبی پختگی کا اندازہ ان باتوں سے لگایا جا سکتا ہے جن پر وہ ہنستی ہیں یا جن سے لطف لیتی ہیں۔ سنجیدہ مشاغل میں مصروف اپنے کو کامیابی سے مختلف پردوں میں چھپا لیتا ہے۔ لیکن تفریحات اور لطیفوں میں وہ بے محابا ظاہر ہو جاتا ہے۔ اسی لئے کسی قوم کے مزاج کا اندازہ اس کے مقبول لطیفوں سے بہ آسانی کیا جا سکتا ہے۔

اردو ادب پر پچھلے چند سال قیامت کے گزرے۔ یوں تو یہ قیامت اب اپنی سلور جوبلی منا چکی ہے اور ابھی تک تھمنے کا نام نہیں لیتی مگر اس "رستخیز بے جا" کے باوجود اردو دنیا ہنسنا نہیں بھولی اور اس کے قہقہے کھوکھلے اور بے جان نہیں تھے۔ اس ہنسی میں زہرناکی بھی تھی اور فکر انگیزی بھی، دلسوزی بھی اور دردمندی بھی۔ مبالغہ نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ اس دور کے طنز و مزاح کی فکری سطح بحیثیت مجموعی پچھلے دور سے بلند تر ہے۔

طنز و مزاح کا سب سے بڑا دشمن ہے مسخرہ پن۔ جسے مسخرے پن کی جتنی فکر ہوگی اتنی ہی وہ طنز و مزاح کی پست سطح تک اترے گا۔ اعلیٰ طنز و مزاح فنکار کی درّاکی، قوتِ مشاہدہ اور قوتِ اظہار کا مرہونِ منت ہوتا ہے، اس کے مسخرہ پن کا نہیں۔ طنز نگار یا مزاح نگار سر کے بل کھڑا ہو کر دوسروں کو ہنسانے کی کوشش کرنے کے بجائے صرف دیکھنے والی آنکھوں کے سامنے سے پردہ اٹھاتا ہے کہ وہ ارد گرد کی ناہمواریوں کو دیکھ سکیں اور ان کے مضحک پہلوؤں پر ہنس سکیں۔

ہنسنا سماجی اقدار کی مدد کے بغیر ممکن نہیں۔ ہم صرف سماجی اقدار سے انحراف پر ہنستے ہیں۔ ان چیزوں پر قہقہہ لگاتے ہیں جو سماج کے مروجہ اور مسلمہ طریق کے خلاف ہوں۔ اسی لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ قہقہہ سماج کا تادیبی ہتھیار ہے۔ جب سماج تبدیلیوں کی زد میں ہو اور انتہاؤں کے درمیان معلق رہا ہو تو طنز و مزاح کو نیا تیکھا پن ملتا ہے اور قہقہے نئی رنگینی پاتے ہیں۔ اس اعتبار سے موجودہ دور طنز و مزاح کے لئے بڑا موزوں ہے۔ پچھلے ۲۶ برس سے ہمارا پورا سماج ناہمواریوں کی زد میں ہے اور اکثر و بیشتر حالتوں میں ہم ان ناہمواریوں سے بے خبر ایک عجیب و غریب خوش فہمی میں مبتلا زندگی گزار رہے ہیں۔ کبھی کبھی ان پر نظر پڑتی بھی ہے تو بے نیازانہ ان سے گزر جاتے ہیں۔ اسی لئے اگر یہ کہا جائے کہ ہمارے دور کی سب سے بڑی قدر HYPOCRISY یا منافقت ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ ہم دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں کچھ اور اور کہتے اور لکھتے ہیں کچھ اور۔ ان ناہمواریوں کو بے نقاب کرنے کے لئے جس سماجی آگہی کی ضرورت ہے اس کی پرچھائیاں ہمارے مزاحیہ ادب میں کہیں کہیں دکھائی دے جاتی ہیں گو بہ لحاظ

سوفٹ جیسے طنز نگار کے لئے امکانات رکھتا ہے۔

ہماری حالیہ روایت کا سب سے بڑا ستون ہیں رشید احمد صدیقی جنہوں نے طنز و مزاح کو تفکر و تامل کے آداب سکھائے۔ یہ تعجب کی بات نہیں کہ رشید احمد صدیقی غالب کے عاشق و عارف ہیں کیونکہ ان کے طنز و مزاح میں وہی آزاد روی اور دردمندی کی جھلک ہے جو غالب کی شاعری میں موجِ تہ نشین کی طرح جاری و ساری ہے۔ رشید صاحب کے مجموعی کارنامے کا جائزہ الگ مبحث ہے۔ ان کی اشارت عبارت اور ادا کی رمز شناسی زیادہ ریاضت اور تفصیل چاہتی ہے۔ ادھر ان کے مضامین سنجیدہ تہذیبی مسائل کے لئے وقف رہے ہیں اور ان مسائل کی خشکی و سنجیدگی کو مزاح کے لطیف سہاروں سے گوارا بنانے کا ہنر ان کے ہاں خاص طور پر ابھرا ہے۔ جس کی توجیہ انہوں نے ایک بار نجی گفتگو میں بڑے دلچسپ پیرائے میں کی تھی۔ ذکر تھا ان کے ایک مجوزہ مضمون کا جو ہنوز لکھا نہیں گیا ہے۔ عنوان تھا "جوکر کیا نہ کرتا، بہ وزن "مرتا کیا نہ کرتا"۔ موضوع یہ تھا کہ آخر مزاح نگار کو سنجیدہ تہذیبی اور سماجی امور پر قلم فرسائی کیا ضرور ہے۔ جواب یہ تھا کہ جب تاش کی بازی میں بادشاہ، بیگم اور غلام سبھی کٹ جائیں تو جوکر ہی کو اپنا فرض ادا کرنا ہوتا ہے۔ یہ تو خیر رشید احمد صدیقی کا روایتی UNDERSTATEMENT اور منکسر مزاجانہ توجیہہ تھی لیکن اس سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ جو آگہی طنز و مزاح کے نقش و نگار کے پیچھے چھپی رہتی ہے وہ کیسی بے محابا، بسیط اور دردمندانہ ہے اور سماجی رنگ و آہنگ سے کیسی آگاہ اور باخبر ہے۔ نہایت دقیق مباحث اور موضوعات پر قلم اٹھاتے ہوئے بھی ان کا قلم طنز و مزاح کے گل کترتا جاتا ہے اور مزاح میں نئی گہرائی اور عجیب و غریب کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ "غالب، فن اور شخصیت"، "سلام ہو نجد پر"، "دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے"، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے جلسۂ تقسیم اسناد کے خطبے کے بعض حصے ان کی فکر و بصیرت کے علاوہ مزاح نگاری کے بھی اعلیٰ ترین نمونے ہیں۔ ایک اور خصوصیت ان کی تحریروں میں رمز و علامت کے لطیف اور بلیغ استعمال سے پیدا ہوئی ہے جو پہلے کی تحریروں میں نایاب ہے۔ مثلاً ایک مضمون طلبا کی بدنظمی اور انتشار کے متعلق ہے۔ خاتمے پر اس نالے کا تذکرہ ہے جو یونیورسٹی اور مصنف کے گھر کے درمیان بہتا ہے اور جسے ہر بار کانووکیشن ختم ہونے کے بعد گھر جاتے ہوئے پار کرنا ہوتا ہے۔ اس نالے میں صاف شفاف پانی بہتا دیکھ کر ہمیشہ خیال آتا تھا کہ یہ پانی اگر گھر کے پائیں باغ کے پودوں اور پھولوں کو ملتا تو لہلہا اٹھتے۔ اس بار جب نالے پر سے گزرے تو اس نالے میں گندا اور متعفن پانی بہہ رہا تھا۔ خیال آیا کیسی خوش بختی ہے کہ ابھی تک پائیں باغ کے پھول اور پودے اس گندگی سے محفوظ ہیں۔

رشید احمد صدیقی کا طنز و مزاح اقدار کی تنقید پر مبنی ہے۔ وہ ہر قسم کے گڑبڑ کا مذاق اڑاتے ہیں اور سماج میں ایک صحت مند توازن کے متلاشی ہیں۔ اس لئے ان کے مزاح میں فکری آہنگ سب سے زیادہ ہے۔ ان کی ہنسی صرف قہقہہ لگانے پر مجبور نہیں کرتی بلکہ بہت کچھ سوچنے سمجھنے پر آمادہ کرتی ہے۔ وہ لفظوں کے رمز شناس ہیں اور ان کے سیاق و سباق کی تبدیلی سے طرح طرح کے لطیف پیرائے پیدا کر لیتے ہیں۔ اسی لئے شاید وہ اس دور کے تنہا صاحب اسلوب انشا پرداز کہے جا سکتے ہیں۔ ان کی تقلید دشوار بلکہ ناممکن ہے۔ اسی راہ میں "چراغ تلے" کے مشتاق احمد یوسفی اور "مسرت کی تلاش" کے نظیر صدیقی کے علاوہ کسی کو کامیابی نہیں ہوئی ہے۔

طنز و مزاح کی روایت کے ایک اور اہم رکن ہیں حضرت 'آوارہ' جن کے مزاح میں سرشار کے پکارسک ناولوں کا سا انداز ہے۔ زبان دانی اور سماجی تصویر کشی، تہذیبی رنگا رنگی اور ہر موقعے اور ماحول کی فضا آفرینی ان کا کمال ہے۔ حضرت آوارہ دورِ قدیم کی عکاسی پر بے مثال قدرت رکھتے ہیں اور حال میں ماضی کے وہ آئینہ خانے سجاتے ہیں جن کی چمک دمک اور آب و تاب مدتوں زندہ رہے گی۔ کبوتر بازی، پتنگ بازی، پرانے مشاغل اور محفلیں، میلے ٹھیلے، تقریبیں جیتی جاگتی آنکھوں کے سامنے سے گزر جاتی ہیں۔ قدیم طنز و مزاح کی روایت کی تشکیل میں دو اہم نام علی عباس حسینی اور ڈاکٹر عابد حسین کے بھی ہیں۔ حسینی صاحب افسانہ نگار کی حیثیت سے جانے پہچانے گئے مگر حکیم بانا جیسے کردار بھی ان کی تخلیق ہیں۔ خوش دلی اور زندگی کی ناہمواریوں سے لطف لینا ان کا مشغلہ۔ عابد صاحب کی "بزم بے تکلف" میں بزمیہ رنگ بھی ہے اور بے تکلفی بھی۔ ان کے مزاح میں ایک باوقار اور پرلطف انداز موجود ہے جو شگفتگی اور تازگی قائم رکھتا ہے اور بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

طنز و مزاح کا ایک اور رخ کرشن چندر کی تحریروں میں سامنے آیا۔ پطرس اور شفیق الرحمن سے قطع نظر طنز و مزاح کو عہدِ جدید کا لب و لہجہ کرشن چندر ہی نے دیا۔ کرشن نے مزاح کو عصری زندگی کی فضا اور روزمرہ کے واقعات سے جا ملایا۔ پطرس کی "ہوائی قلعے" میں بھی یہ رنگ جھلکتا ہے مگر وہاں واقعات اور افکار کی مدد سے

مزاح پیدا کرنے کی کوشش زیادہ ہے۔ "گدھے کی سرگزشت" میں کرشن چندر کا یہ رنگ اُبھر کر سامنے آیا ہے۔ ہماری پوری سوسائٹی کیسی کیسی ناہمواریوں پر ایک چادر ڈال کر چپ چاپ جی رہی ہے اس کا کچھ حال کرشن نے اپنے 'گدھے' کی زبانی بیان کیا ہے اور اس اوبڑ کھابڑ سماج کے مختلف گوشے بے محابا اپنے قارئین کی آنکھوں کے سامنے بے نقاب کر دیئے ہیں۔ کرشن چندر نے مزاح کو TOPICAL بنا دیا اور اس کا رشتہ روز مرہ کے حادثات سے ایسا جوڑا کہ "گدھے کی سرگزشت" میں آج کے ہندوستان کی سرگزشت دکھائی دینے لگی۔

فکر تونسوی کے مزاحیہ مضامین بھی عصری زندگی کی ناہمواریوں پر مبنی ہیں۔ یوں تو "پیاز کے چھلکے" روزنامہ "ملاپ" کے مزاحیہ کالم سے شروع ہوئے۔ لیکن بقولِ میر "یہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا" فکر کی وہ تحریریں بھی جو ان کالموں کے باہر شائع ہوئیں پیاز کے انہی چھلکوں کے طرز پر تھیں۔ سوسائٹی کے داخلی MECHANISM اور باہری رکھ رکھاؤ میں ایک عجیب و غریب قسم کا پُر لطف تضاد ہے۔ 'دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا'۔ اسی تضاد کو فکر مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں جیسے بلّی چوہے کو کھانے سے پہلے اس سے کھیلتی رہتی ہے۔ کچھ وہی انداز فکر کا ہے۔

سوسائٹی سے کھیل لینا یا اس کی بعض ناہمواریوں کو بے نقاب کرنا نسبتاً بے ضرر سا ہے۔ افراد اور وہ بھی نام اور پتے والے افراد کی ناہمواریوں کا تذکرہ خصوصاً اس وقت جب ان سے دوستی کا رشتہ بھی ہو، نہایت جوکھم کا سودا ہے۔ یوں تو شوکت تھانوی مرحوم نے "شیش محل" لکھ کر اس رسم کی بنا ڈالی تھی، پھر فرقت کاکوروی نے غالب کے قلم سے مختلف خطوط اپنے مختلف دوستوں کے نام لکھوا کر لطفِ سخن کا سامان پیدا کیا، لیکن اس روایت کو باقر مہدی پر یوسف ناظم کے مضمون اور مجتبیٰ حسین کے خاکوں نے آگے بڑھایا۔ باقر مہدی ہمارے دور کی آتش گیر شخصیتوں میں سے ہیں جنہیں برتنے کے لئے سخت احتیاط لازم ہے۔ یوسف ناظم نے جراَتِ رندانہ کے ساتھ ان کی شخصیت پر قلم اٹھایا اور ایسے ایسے خوبصورت جملے صرف کئے جو صرف انہیں کا حصہ تھے۔ ابراہیم جلیس پر مجتبیٰ حسین کا مضمون بھی اسی نوع کا ہے، عارفانہ اور قلندرانہ۔ طنز و مزاح میں یادگار شخصیتوں کو نئی جہت بخشنے کا سہرہ ان دونوں کے سر ہے۔ سیرت نگاری میں یہ تیکھا پن منٹو کے "گنجے فرشتے" کے بعد کم یاب ہے۔

طنز و مزاح کی روایت کی تشکیل میں ایک اور نہایت اہم نام فرقت کاکوروی کا ہے۔ فرقت کے مزاح کا رنگ کلاسیکی ہے۔ سرشار انہیں عزیز ہیں اور "فسانۂ آزاد" کے جملوں کی تراش، مکالموں کا لکھنواپن اور کرداروں کا قلندرانہ انداز سب کچھ اسی ڈھب کا ہے۔ فرق ہے تو یہ کہ فرقت عہدِ جدید کے سانچے میں ان سب کو نرالے ڈھنگ سے ڈھال لیتے ہیں اور انہیں فرسودگی سے بچا لیتے ہیں۔ فرقت ہنگامی موضوعات پر بے محابا لکھتے ہیں اور قدیم اور کلاسیکل وراثت سے بہت کچھ اخذ و اختیار کرتے چلے جاتے ہیں۔

کنہیا لال کپور کا فن طنز و مزاح کی ایک نئی جہت کا نام ہے۔ ہنگامی موضوعات سے کسی قدر بے نیاز ہو کر وہ انسانی فطرت کے دلچسپ اور متضاد پہلوؤں کی نکتہ رسی سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ ان کو شہرت ایک مضمون سے ملی جس کا عنوان تھا "غالب جدید شعرا کی محفل میں" لیکن ان کا فن محض پیروڈی کا نہیں بلکہ زیادہ گہری کاٹ اور زیادہ بلیغ نکتہ رسی کا ہے جس کا ثبوت اُردو کے بارے میں ان کے نہایت لطیف رمزیہ مضمون "برج بانو" اور بھارت یاترا پر ان کے چھوٹے سے مضمونچے سے دستیاب ہو سکتا ہے۔ "دو کولڑانا" انسانی نفسیات سے ان کی دل بستگی کا مظہر ہے۔

یوسف ناظم جملوں کی تراش خراش اور لفظوں کی شوخی اور جملوں کے باہمی تضاد سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ "سہرا" اور "آسمان سے کھجور میں"، ان کے طرز کی بہترین مثالیں ہیں۔ پطرس سے اثر پذیری نمایاں ہے لیکن اس انداز میں کوشش اور آورد کی جگہ بے ساختگی اور آمد ہے مثلاً اس قسم کے جملوں میں:

"دلی میں بسوں کی رفتار نہیں ہوا کرتی، ان کی صرف آمد ہوتی ہے"۔

یا "دلی میں بس میں سفر کرنے کا سب سے زیادہ فائدہ وانٹیڈ قسم کے لوگوں کو ہوتا ہے۔ بس کے سفر میں حلیہ اتنا بگڑ جاتا ہے کہ آدمی پہچانا ہی نہیں جا سکتا۔ جرائم پیشہ لوگ بڑے مزے سے ایک روپیہ کا ٹکٹ لے کر دن میں گھوم سکتے ہیں"۔ (آسمان سے کھجور میں)

یوسف ناظم واقعات اور کرداروں کے بجائے ندرتِ احساس اور اندازِ بیان سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ ان کے مضامین ایک ایسے خوش دل انسان کا پتہ دیتے ہیں جس نے زندگی کے نشیب و فراز سے سمجھوتہ کر لیا ہے اور ستم ظریفی کو زندگی کا قانون مان کر سرد و گرم عالم سے لطف لے لے کر گزارنے کا عہد کر رکھا ہے۔

مجتبیٰ حسین اس دور کے سب سے نئے اور شاید سب سے اہم مزاح نگار کی حیثیت سے اُبھر رہے ہیں۔ اب وہ پطرس بخاری کے روایتی "مرزا صاحب" کی گرفت سے کچھ آزاد ہو چلے ہیں [illegible]

سعید بن محمد اور ایم الیف حسین پر مضامین کے باوجود ان کے اچھے مضامین وہی ہیں جو سیرت نگاری اور واقعات نگاری کی ٹیک سے آزاد ہیں۔ ابھی اس وادی میں انہیں اور بھی بے سہارا گھومنے کی ضرورت ہے جہاں بقول غالب "بہ سینہ می سپرم رہ اگرچہ بخفت است" کا مضمون صادق آتا ہے۔ مجتبیٰ حسین زندگی اور الفاظ کے پیچھے بنتی بگڑتی لطافتوں سے پیکر تراشی کا ہنر رکھتے ہیں اور طنز سے نہیں خوش دلی سے لطفِ سخن پیدا کر لیتے ہیں۔

احمد جمال پاشا ایک زمانے میں طنز و مزاح کی دنیا میں تیزی سے ابھرے۔ "رستم میدانِ امتحان میں"، "چائے کی پیالی" اور "مارشل لا" جیسے مضامین نے ایک دھوم مچا دی، مگر اس کے بعد ان کے موضوعات میں وہ تازگی اور طرزِ بیان میں وہ شگفتگی نہ رہی۔ مخلص بھوپالی کی "پاندان والی خالہ" اور "غفور میاں" بھی مدتوں مقبول رہے لیکن ان کا سلسلۂ نسب کچھ آگے نہ بڑھا۔ مخلص نے بھوپال کی زندگی اور وہاں کے لب و لہجے کو بڑی بے ساختگی اور لطف کے ساتھ ابھارا تھا اور اس کے امکانات ابھی باقی ہیں، خاص طور پر اس نئی زندگی کے پیشِ نظر جو بھوپال میں قدیم طرزِ حیات سے دست و گریباں نظر آتی ہے۔ وجاہت علی سندیلوی کے انشائیے لطف سے خالی نہیں اور ان کے طنز و مزاح میں خوشگوار تازگی بھی ہے اور سماجی معنویت بھی۔ مجیب سہالوی لکھنؤ کے متوسط طبقے کی زندگی سے طنز و مزاح کا ساز و سامان حاصل کرتے ہیں اور مضحک اور عبرت آموز کارگزاریوں سے اپنے مضامین سجاتے ہیں۔ بھارت چند کھنہ گھریلو زندگی کے مصور ہیں۔ ان کے ہاں لفظوں سے زیادہ اہمیت چھوٹے چھوٹے واقعات کو حاصل ہے۔ عموماً یہ واقعات مضحک نہیں ہوتے مگر سیاق و سباق کا انوکھا پن اور پیرایۂ بیان انہیں تازگی بخش دیتا ہے۔

سلمیٰ صدیقی کے بعض خاکے اور مضامین بھی مزاحیہ اسلوب کی اچھی مثالیں ہیں۔ ان کے علاوہ خواجہ عبدالغفور، نجم الحسن رضوی، نریندر لوتھر اور مسیح انجم کے نام بھی قابلِ ذکر ہیں۔

شاعری میں بھی طنز و مزاح کا چرچا پچھلے دس پندرہ برس میں خوب رہا مگر اعلیٰ شاعری یا اعلیٰ مزاح کے نمونے کم ہی ملتے ہیں۔ حقیقت میں لے دے کر چند ہی مزاحیہ شاعر قابلِ اعتنا ہیں: ایک راجہ مہدی علی خاں، دوسرے فرقت اور تیسرے دلاور فگار اور سید محمد جعفری۔ یوں تو شاد عارفی کے کلام کے تیر و نشتر بھی اسی زمانے کی یادگار رہیں اور مظفر حنفی نے "آپ سے ملیے" کا سلسلہ بھی اسی زمانے میں شروع کیا اور اپنی شاعری میں شاد کے انداز کو برقرار رکھنے کی بھی کوشش کی، مگر یہاں مقصد طنزیہ یا مزاحیہ ہونے کے بجائے سنجیدہ ادب کو ایک نیا پیرایۂ بیان بخشنا معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے ان کا تفصیلی ذکر کیا جائے تو سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی سے کرشن چندر تک سبھی کا ذکر لازم آئے گا کیونکہ اردو کے اکثر سنجیدہ فنکار اپنے فن میں طنزیہ اور مزاحیہ عناصر سے برابر کام لیتے آئے ہیں۔

راجہ مہدی علی خاں کی شاعری سب سے زیادہ تیکھی اور باکی ہے۔ وہ نوجوانوں کی زندگی سے موضوعات چنتے ہیں اور متوسط طبقے میں اقدار کی تبدیلی سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ ان کا محبوب موضوع نوجوان مرد اور عورتوں کی بدلتی ہوئی نفسیات ہے جو حالات کے ساتھ ساتھ نئے سانچوں میں ڈھلتی جاتی ہے اور نئے تضادات کو بے نقاب کرتی جاتی ہے۔ لڑکے لڑکیوں کے رشتے اخبارات کے ذریعے طے ہوتے ہیں اور لڑکے لڑکیاں امیدواروں کی موصولہ تصاویر پر تیکھے انداز میں تبصرہ کرتے جاتے ہیں۔ کبھی باپ بیٹے شراب خانے میں ٹکرا جاتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ دونوں ایک ہی گھر میں رہتے ہیں اور "مسرت" ایک کی بیوی اور دوسرے کی ماں کا نام ہے۔ نظم "راجندر سنگھ بیدی اور چودھری" انشائیہ سیرت نگاری کے بہترین نمونوں میں شمار ہونے کے قابل ہے۔

فرقت پیروڈی نگار کی حیثیت سے بہت مشہور ہوئے۔ "ناروا" اور "مداوا" اور "پھر قدمچے" ان کی پیروڈیوں کے مجموعے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی مزاحیہ نظمیں ایک منفرد حیثیت رکھتی ہیں۔ علی گڑھ کے وقار الملک ہال پر ان کی نظم جس کا ٹیپ کا مصرعہ تھا، "شاید یہ وی ایم ہال ہے" یا الگزینڈر کیس پران کی نظم ان کی تخیل کی اڑان، قدرتِ بیان اور لطافتِ احساس کی مظہر ہیں۔ فرقت کی مزاحیہ شاعری میں عصری واقعات اور ادبی رجحانات سے ان کی واقفیت اور آگہی کا ثبوت ملتا ہے۔ مجید لاہوری اور سید محمد جعفری سے قطعِ نظر، اردو میں یہ لطفِ سخن فرقت کا حصہ ہے۔

دلاور فگار ۱۹۵۰ء کے لگ بھگ "شاعرِ اعظم" نظم سے مشہور ہوئے لیکن جلد ہی انہوں نے خاص طور پیرایۂ بیان دونوں میں وسعت پیدا کی اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کی زندگی کی مختلف جہات کو موضوعِ سخن بنایا۔ کالج کی زندگی، تفریحات و مشاغل، امتحانات، کرکٹ میچ، انٹرویو، رومانی سرگرمیاں، غرض ہر قسم کے مسائل و مراحل ان کی قلم کی زد میں آئے اور طرح طرح کے نقش و نگار بناتے گزرے۔ فگار نے ادبی اور سماجی زندگی کی شعبدہ بازیوں کو بھی اپنا موضوع بنایا۔ مشاعرے ہوں یا جدید شاعری کی بے اعتدالیاں، [illegible]

تبصرہ نگاروں کی ادعائیت ہو یا محققین کی علمی موشگافیاں، ان سب کے مضحک پہلو واہی کا موضوعِ سخن ہیں۔ سیاست اور تہذیبی زندگی کی کروٹیں بھی انہیں متاثر کرتی ہیں مگر ادب کی سماجیات اور ادیبوں کی نجی شخصیات سے ان کی دلچسپی زیادہ ہے۔ انکی شاعری میں البتہ بھاری پن سا ہے جو شاید ان کے براہ راست اور بیانیہ لہجے کی وجہ سے ہوئی۔ اسی وجہ سے ان کی شاعری میں لہجے کی یکسانیت پڑھنے والوں کو جلد تھکا دیتی ہے اور مزاح کی شگفتگی کو بھی مجروح کرتی ہے۔

ایک اور مزاح نگار شاعر جو بہت کم لکھتا ہے مگر جب لکھتا ہے تو اچھا لکھتا ہے، قاضی غلام محمد ہے۔ ان کی مزاحیہ شاعری کا مجموعہ "حرفِ شیریں" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ پیروڈی ان کا خاص موضوع ہے۔ یوں بھی، وہ اپنی مزاحیہ شاعری میں کلاسیکی پیرایۂ بیان میں لطفِ مزاح کو سمونے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً غالب کی مشہور غزل "پھر اس انداز سے بہار آئی" کی پیروڈی کا ایک شعر ہے۔

اب کے موسم خماری میں میں نے — بے زبانی زبان لکھوائی

یا غالب کے دو مصرعوں سے پیروڈی کا مفہوم فراہم کیا گیا ہے

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں — یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟!

اس کے علاوہ ماچس لکھنوی ہیں جن کے صرف دو اشعار ہی ان کی ادبی شہرت کے لئے کافی ہیں:

اُف رے چالاکیاں اُن سے [illegible] — لومڑی کیا ہوئی مولوی ہو گئی

ڈومنی تو چل ہی دے گی گا بجا کے لے کے نیگ
عمر بھر دولہا میاں ناچیں گے اس گانے کے بعد

ماچس نے اقبال کے "شکوہ و جوابِ شکوہ" کے بعض بندوں کی نہایت دلچسپ اور کامیاب پیروڈی لکھی تھی جس کا صرف ایک بند درج ذیل ہے بعنوان ہے "شکوۂ فکر":

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں — ناؤ پہ لاد کے بھیجا تجھے دریاؤں میں
کیک میں ڈھال کے بیچا کبھی [illegible] — کاٹے جیب [illegible]
کہیں فہرست میں ہوتے جو جہاں [illegible] کی
تیرا دم بھرتے یوں ہی جیالوں میں [illegible] کی

ہلال، [illegible] اور آفتاب لکھنوی کی مزاحیہ شاعری بھی لطف سے خالی نہیں۔

ایک اور اہم جہت دکنی اردو میں مزاحیہ شاعری کا فروغ ہے

جس کی اچھی مثالیں سرور ڈنڈا، علی صائب میاں، حمایت اللہ اور سلیمان خطیب کی شاعری میں ملتی ہیں۔ سرور ڈنڈا اپنے دور کے مقبول ترین شعرا میں سے تھے اور ان کا دائرہ فن سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر محیط تھا۔ نچلے متوسط طبقے کی مایوسیاں اور ارمان، خوش فہمی اور بقراطیت، داخلی اور خارجی زندگی کا تضاد ان کی شاعری میں ابھر کر سامنے آتا ہے۔ علی صائب میاں اور سلیمان خطیب کے ہاں زبان کا اٹ پٹاپن اور اندازِ بیان کا تیکھاپن عجیب لطف پیدا کر دیتا ہے۔

اس ضمن میں زندہ دلانِ حیدرآباد کی خدمات کا ذکر بے محل نہ ہوگا جنہوں نے طنز و مزاح کی طرف ادبی دنیا کی توجہ مبذول کی، کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی سے خطباتِ صدارت لکھوا کر طنز و مزاح کے قابلِ قدر مجموعے شائع کئے اور خوش دلی اور خوش طبعی کو سکۂ رائج الوقت بنا دیا۔

طنز و مزاح کے اس مختصر سے جائزے کے بعد چند مسائل پر غور کرنا لازم ہے۔ اول یہ کہ اس پورے دور میں طنزیہ اور مزاحیہ ادب کی ادبی قدر و قیمت کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس دور کے طنز و مزاح نے موضوع، نفسِ مضمون اور پیرایۂ بیان کے نقطۂ نظر سے اپنے پیش رو ادب میں کیا اضافہ کیا ہے۔ طنز و مزاح کا ایک بالواسطہ فائدہ یہ ہے کہ فلسفے کے علاوہ شاید ہی کوئی مضمون طنز و مزاح سے زیادہ الفاظ شناسی پر زور دیتا ہو۔ مزاح نگار کو تمام دوسرے فن کاروں سے زیادہ الفاظ کا مزاج شناس ہونا پڑتا ہے کیونکہ اس کا سارا کاروبار الفاظ کے بدلتے ہوئے *HADES اور مفاہیم پر ہے۔ اس لحاظ سے الفاظ کے معانی، فضا اور تلازموں میں جو توسیع "ہجویاتِ سودا" "کلیاتِ اکبر" اور "مضامینِ رشید" سے ہوئی وہ اس پیمانے کی سنجیدہ تصانیف کے بس کی نہ تھی۔ طنز و مزاح میں الفاظ محض معنی ادا کرنے یا فضا پیدا کرنے یا تلازموں کا سلسلہ قائم کرنے کے کام نہیں آتے بلکہ خود دنیائے مزاح ہوتے ہیں۔ کبھی ان کے مفاہیم کا باہمی اختلاف، کبھی ان کے تلازمے اور مفہوم کا تضاد، کبھی سیاق و سباق میں ان کی بدلتی ہوئی معنویت مزاح پیدا کرتی ہے تو کبھی ان کا صوتی آہنگ کام میں لایا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے اس دور کے طنز و مزاح نے زبان اور بیان کی توسیع میں خاطر خواہ حصہ لیا ہے۔ مثلاً رشید احمد صدیقی کے مضمون "ایک سڑک، ایک ستون، ایک اسکول" کے یہ جملے ملاحظہ فرمائیں:

"جہاں تک حافظہ ساتھ دیتا ہے سڑک کا اتہام لگنے سے پہلے یہ ایک موہن لائن قسم کی کوئی چیز تھی، کبھی موجود کبھی معدوم۔ یہاں وہاں ہر جگہ بقول غالب "سیمیا کی سی نمود"۔ یہ معلوم نہیں کب سے چلا

آ رہا ہے کہ آس پاس کے بسنے والے اس پر کوڑا
کرکٹ اور دُور دراز رہنے والی بھنگنیں آنکھ بچاکر
کبھی آنکھ میں دھول جھونک کر اس پر غلاظت ڈال
دیا کرتی تھیں جن کو مرغیاں اور آنے جانے والے روندتے،

بکھیرتے یا ہموار کرتے رہتے۔ کبھی کبھی یہ دونوں بھی اس پر
کچھ گفتنی باقی ناگفتنی کا اضافہ کر دیا کرتے۔"

(مطبوعہ عصری ادب دہلی شمارہ ۵ صفحہ ۱۸)

اسی ایک ٹکڑے میں علاوہ جہاں تک حافظہ ساتھ دیتا ہے "ٹیرٹرک کا انہدام بکنے سے پہلے" جیسے پرلطف ٹکڑوں کے معنی اور لطف میں جو توسیع ہوئی ہے اس سے قطع نظر غالب کے مصرعے "سیمیا کی سی نمود" اور اکبر کے مصرعے "گفتنی درج گزٹ، باقی جو ہے ناگفتنی" کو جو توسیع معنی ملی ہے اور میک موہن لائن کی سیاسی اصطلاح کی جو ادبی آباد کاری ہوئی ہے اور آنکھ بچانے اور آنکھ میں دھول ڈالنے کے محاورے کے جوڈو سیٹ بقول غالب مقابل اور متقابل آئے ہیں، وہ مزاحیہ ادب کے الفاظ اور اسلوب دونوں کو پہنائی بخشنے کی مثال ہیں۔

نظم میں جس طرح شاد عارفی نے روزمرہ کی بول چال کی زبان کو شاعری میں ڈھال دیا ہے یا راجہ مہدی علی خاں نے جس روانی اور بے ساختگی سے مکالمے اور "گزارشِ احوالِ واقعی" کو شاعری کا روپ دے دیا وہ قابلِ غور ہے۔ ممکن ہے یہ روزمرہ کا لہجہ بعض کو "سوقیانہ" لگے لیکن اس کا بھی اپنا ایک لطف اور اہمیت ہے۔ "دو شرابی" کے مکالمے اس کی مثال ہیں۔ فرقت کی شاعری میں زبان کا نیا آہنگ دوسرے روپ میں ہے۔

اور کس ٹھاٹھ سے اوڑھے ہوئے گھر بیٹھے ہیں
چند دروازے ہیں بالکل ننگے
ایک دالان ہیں تہمد باندھے
سوکھے پتے ہیں کئی دن سے اداس
زخم دو روز سے سوئے بھی نہیں
خواب لیٹے ہیں انگوچھا باندھے (نظم ہائے کی الجھن)

ادبی قدر و قیمت کے اعتبار سے اس دَور کا طنزیہ اور مزاحیہ ادب یقیناً اپنے دورِ پیشیں کے مقابلے میں کم تر ہے کہ یہ دور طنز و مزاح کے پانچ قدآوروں کا دور نہیں ہے۔ پطرس، عظیم بیگ، فرحت اللہ بیگ، شوکت تھانوی اور رشید احمد صدیقی جیسی دیوقامت شخصیتیں ہر دَور میں پیدا نہیں ہوتیں۔ ان میں رشید احمد صدیقی کا اسلوب ہنوز تازگی اور شگفتگی کا امین ہے۔ بایں ہمہ اس دَور میں واقعاتی اور بیانیہ مزاح کے بجائے سماجی اور تہذیبی زندگی کی عکاسی سے مزاح پیدا کرنے کا رواج عام ہوا ہے۔ اب زور واقعات اور کردار کے بجائے اندازِ بیان اور الفاظ اور محاورے کی تراش خراش اور موشگافی پر ہے۔ رمزیہ اسلوب نے اس میں اور لطف پیدا کیا ہے۔ موضوعِ بیان کے اعتبار سے بھی طنز و مزاح میں گھریلو دنیا کی بہ نسبت اب زور سماجی زندگی کے رُخ پر زیادہ ہوا ہے۔ ہماری شاعری ذات کے تنگنائے کی طرف چلی ہے تو ہمارا طنز و مزاح ذات اور گھر سے باہر نکل کر سماج کی طرف گامزن ہوا ہے۔ یہ فالِ نیک ہے اس راستے سے آگہی اور بصیرت تک رسائی ممکن ہے جو شاید ہمارے طنزیہ اور مزاحیہ ادب کو عصری حسیت سے ہم کنار کر سکتی ہے اور اس میں نئے اسلوب ہی نہیں، نئی پہنائی اور نئی وسعت لاسکتی ہے۔

●●

"آج کل" کا آئندہ شمارہ

طنز و مزاح نمبر (حصہ دوم) ہوگا

ماضی و حال کے بہترین طنز و مزاح نگاروں کا سنگم

شعر و نثر کا مثالی انتخاب

طنزیہ و مزاحیہ ادب کے جائزوں کے ساتھ

متوقع شرکاء: نظیر اکبرآبادی۔ غالب۔ سرسید۔ نذیر احمد۔ سرشار۔ سجاد حسین۔ ابوالکلام آزاد۔ ظفر علی خاں۔ منٹو۔ شوکت تھانوی۔ مجید لاہوری، راجا مہدی علی خاں۔ فرقت کاکوروی۔ سرور ڈنڈا۔ واقف مراد آبادی۔ ماچس لکھنوی۔ واہی۔ ہلال رامپوری۔ رشید قریشی۔ سلیمان خطیب۔ حمایت اللہ۔ شفیقہ فرحت۔ برق آشیانوی۔ سگار لکھنوی۔ حشم لکھنوی۔ مسیح انجم۔

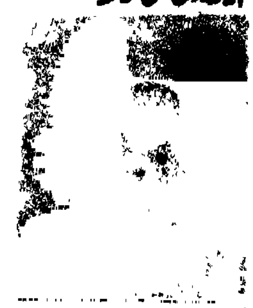
جائزے: نثار احمد فاروقی۔ ڈاکٹر سید جعفر

ایجنٹ و خریدار صاحبان مزید کاپیوں کے لئے حسبِ ذیل پتے پر رجوع کریں:

بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۱

رشید احمد صدیقی

ذاکر باغ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ



(جس طرح انگریزی میں پی جی ووڈ ہاوس کے مزاح اور برٹرنڈرسل کی نثر کا صحیح لطف اٹھانے کے لئے انجیل مقدس اور شیکسپیئر کے کلام سے بخوبی واقف ہونا ضروری ہے اسی طرح رشید احمد صدیقی کا پورا لطف اٹھانے کے لئے غالب، اقبال، فارسی، ہندی، دینیات، دیہات اور علی گڑھ سے مساوات لازمی ہے۔ رشید احمد صدیقی کو نہ صرف طنز و مزاح پر یکساں قدرت ہے بلکہ زندگی کے طربیہ اور المیہ دونوں رخوں کا صحیح ادراک و احساس ہے۔ ان کے کردار نگاری کے کمال پر افسانہ نگار سر دھنتے ہیں اور ان کی انسان دوستی کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ انہوں نے ذاکر صاحب اور اقبال سہیل سے لے کر حاجی صاحب دبکٹ والے اور بابا بدل تک کو لازوال کر دیا۔

رشید صاحب (پیدائش ۱۸۹۰ء) جن پور ساہتیہ اکاڈمی اور اردو اکیڈمی اتر پردیش کے انعام یافتہ ہیں۔ ذیل میں ہم انکی ایک حالیہ تقریر کے چند ٹکڑے اور تبرکاً ایک ایسے مضمون سے چند پیراگراف پیش کرتے ہیں جو اردو ادب میں کلاسک کا رتبہ حاصل کر چکا ہے۔ (ادارہ)

اُردو کا المیہ

کچھ دنوں سے میرا مشغلہ یا مصرف یہ رہ گیا ہے کہ آس پاس کے نوجوانوں کو یہ سناتا بتاتا رہوں کہ وہ کیا تھے اور کیا ہو گئے۔ ضمناً یہ بے محل اور دور از کار بات بھی کہ ان کو کیا چھوڑنا اور کیا اختیار کرنا ہے۔ بے محل اور دور از کار اس لئے کہ پہلے کبھی کسی بات کو چھوڑنے یا اختیار کرنے کی صلاح نوجوانوں کو بوڑھوں سے ملتی تھی۔ اب یہ احکام بوڑھوں کو نوجوانوں سے ملنے لگے ہیں۔ بوڑھوں کی تعداد بڑھنے اور مصرف گھٹنے لگا ہے۔ اس سے اندیشہ ہوتا ہے کہ ان کی قسمت میں نوجوانوں کی طرف سے کسی طرح کی پلاننگ لکھی ہوئی ہے۔ بوڑھوں کی نامرادی کا اظہار اپنے خاص انداز میں اکبر آج سے بہت پہلے کر چکے ہیں۔ یعنی

بوڑھے بھی مرنہ پائیں تو ناچار کیا کریں

بر ایں ہمہ آپ کتنے اچھے ہیں کہ پہلے زمانہ کے خلاف آج کل کوئی خدا کا نام لیتا ہے تو آپ رپٹ لکھوانے تھانے نہیں پہنچتے بلکہ سیمینار منعقد کرتے ہیں۔ فنون لطیفہ کے نئے پیچ و خم اور شعر و ادب کے نئے نشیب و فراز دریافت کرتے ہیں اور ہم کو مذہب و اخلاق کے تصورات اور تاویلوں سے آشنا کراتے ہیں۔ اکثر صلح و عافیت کی تبلیغ میں جلوس نکالتے ہیں جس کا اختتام مشاعرے ورنہ انجام لاٹھی چارج پر ہوتا ہے۔ جس معاشرے کے شب و روز نوجوانوں کی شورانگیزی اور پولیس کے لاٹھی چارج میں گذرتے ہوں وہ اس پر آنسو گیس بہانے کا نتیجہ کیا۔

کلیۂ علی گڑھ سے وابستہ رہ کر اردو کا میرا کاروبار بہت پرانا ہے۔ اتنا پرانا کہ آج اردو کا پرانے سے پرانا گنہگار بھی اسکی تردید نہیں کر سکتا۔ ۱۹۱۵ء سے آج ۱۹۷۳ء تک بتاؤ یہ سب کے دن ہوئے؟ کیا عجب اسی امتیاز کے احترام میں آپ نے آج کی اس تقریب میں Lay of the last Minstrel (آخری مغنی کا نغمہ) کا رول ادا کرنے کے لئے مجھے یاد فرمایا ہو۔ یہ رول کتنا شاندار اور کیسا خصوصی ہے جو ایک بوڑھے مغنی ہی کے حصہ میں آسکتا تھا۔ کیسے کیسے نغمے جن کی بازیافت صرف مغنی اور اس کا بوڑھا ساز ہی کر سکتا ہے۔ وہ نغمے جن کے سننے کی نئی نسل میں شاید تاب ہے نہ توفیق۔ تاریخ کی سنگیت پر تقدیر کے نقوش کو پہچاننا اور اپنانا ان کے بس کی بات نہیں۔ لیکن بوڑھا مغنی اپنے نغمے جگاتا رہے گا۔ اس لئے کہ وقت آنے پر انہیں نغموں سے مطرب خوش نوا برآمد ہوگا اور اس کے تازہ بتازہ نو بنو نغمے ہم سب کی اعلیٰ صلاحیتوں کو بیدار اور بالیدہ کریں گے اور رکھیں گے۔

صاحبو! اردو تنہا وہ زبان ہے جس نے تمام علاقائی موانع سے باہر اور بے نیاز ہو کر تاریخ میں پہلی بار ہندوستان کو لسانی اتحاد، جغرافیائی وحدت اور بیرون ملکی رشتہ سے آشنا کیا۔ یہ اس کے جمہوری نژاد ہونے کا فیضان ہے کہ آج ان موانع اور محرومیوں کے باوجود جو اس پر تقریباً چوتھائی صدی سے حاوی ہیں وہ صرف اپنی خدمات اور خوبیوں کی بنا پر ہر طرف مقبول و محترم ہے۔ کوچہ و بازار، سینما، مشاعرے، جلسہ، جلوس غرض

تحریر و تقریر، تُو تُو بیں میں، من تُو شدم تُو من شُدی، غرض ہر موقع اور محل پر اسی کا سہارا لیتے ہیں لیکن کہتے یہ ہیں کہ یہ اُردو نہیں کچھ اور ہے۔ جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے ۔ خرد کو جنوں اور جنوں کو خرد بتائے تو غریب حسرت موہانی کیا کر لیں گے۔

اُردو کی ابتدائی اشاعت صوفیائے کرام کی رشد و ہدایت کے مشن، دہلی کے حکمرانوں کی کسی نہ کسی شکل میں دکن سے آویزش و آمیزش اور پھیلتی ہوئی معاشرت کے نوع بہ نوع تقاضوں کی بنا پر ہوئی۔ قطب شاہی اور عادل شاہی درباروں میں اس کو غالباً سب سے پہلے حکمرانِ وقت کی سرپرستی نصیب ہوئی اور تصانیف کا آغاز ہوا۔ یہ تصانیف بیشتر مذہب و اخلاق سے متعلق تھیں۔ طویل تاریخی سفر پر کیسے شب و روز اور نشیب و فراز سے گزرتی، نوحہ و نغمہ کو اپناتی، ہمدمی اور یک جہتی کا پیام لئے ہوئے کہاں سے کہاں پہنچی۔ دربار میں مستحقِ اکرام اور بازار میں وسیلۂ کاروبار ٹھیری۔ کیسا زر مبادلہ اس کے پاس تھا، کیسا یہ سودا تھا جس نے اسے ہر لین دین میں متعین اور کسی کاروبار میں اسے بند نہ پایا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ اپنی پیدائش و تربیت کی کتنی کم مدت میں یہ اس قابل ہوگئی کہ ایک طرف کوچہ و بازار میں سب کی منہ بولی مانی گئی۔ دوسری طرف سرکار دربار میں منزلت پاتی ہے۔ تیسری جانب خانقاہوں میں بھولے بھٹکوں اور درماندہ و پس ماندہ کو نجات و نیکی کا مژدہ سناتی ہے۔

اِن دنوں رسم الخط کا مسئلہ ہماری توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اس موضوع پر آج سے پہلے اپنے خیالات کا کسی قدر تفصیل سے اظہار کر چکا ہوں۔ ان کو یہاں دہرانا نہیں چاہتا۔ میں اُردو رسم خط کو کسی اور رسم خط سے بدل دینے کے حق میں نہیں ہوں۔ البتہ دل سے یہ چاہتا ہوں کہ اُردو کتابیں زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسری زبانوں کے رسمِ خط میں بھی شائع کی جائیں۔ اُردو رسمِ خط میں جہاں کہیں اصلاح کی ضرورت سمجھی جائے اس کو رسمِ خط کے ماہرین اور اُردو کے مخلصین باہمی مشاورت سے طے کر سکتے ہیں۔ رسمِ خط کے معاملے میں اتنا بدعقل یا جذباتی واقع ہوا ہوں کہ اپنے مشاہیر شعرا کا اُردو شعر کسی اور رسمِ خط میں پڑھنا پڑتا ہے اور کس مصیبت سے پڑھ پاتا ہوں تو کچھ دیر کے لئے شعر کی وقعت کم ہو جاتی ہے اور پہلے سے یاد نہ ہو تو اس کے الفاظ اور اوزان کو قابو میں لانا مشکل ہو جاتا ہے۔ کبھی تو یہاں تک محسوس ہوتا ہے جیسے اپنا کوئی عزیز دوست ایسے حلئے اور حالت میں مجھ سے مل رہا ہے، جیسے کسی بڑے ہی ناموافق حالات کا شکار اور مدد کا خواستگار ہو۔ یہ کوئی دلیل نہیں ہے اپیل ہو سکتی ہے۔

دوستو اور عزیزو! رسمِ خط کے بدلنے کے مسئلہ پر سوچتے ہوئے کبھی آپ کا خیال اس طرف بھی گیا یا نہیں کہ مسلمانوں کی تاریخی عمارات مثلاً مساجد، مقبرے، زیارت گاہیں، دانش کدے، قصر و ایوان اور محراب و میناروں پر بے نظیر خطاطی کے جو نمونے اور نقوش ملتے ہیں، نیز کلامِ پاک کی صحتِ متن، سالمیت اور ساویت کو انتہائی حسن آفرینی اور حسن کاری کے ساتھ ہمارے معجز رقم خوشنویسوں نے جس طرح محفوظ کر دیا ہے یا اپنے بڑے بڑے شعرا کے جواہر پاروں کو جس قدرتِ فن، احترام اور احساسِ نزاکت و نفاست سے ہم رنگ کلام کر دیا ہے، یہ سب کیوں اور کس لئے؟ اس لئے کہ اس رسمِ خط سے اپنے آثارِ عالیہ کو اور آثارِ عالیہ سے اس رسمِ خط کو محفوظ کر دینا چاہتے تھے۔ اعلیٰ اور عظیم تعمیر و تخلیق کو اعلیٰ اور عظیم خطاطی سے جس طرح مسلمان فن کاروں نے آراستہ کیا اور اس طرح انسان کو سب سے عظیم فن کی تمجید و تکریم کا شاہد عادل بنایا۔ اس حسنِ خدمت اور عبادت میں شاید ہی کوئی دوسرا اُن کا ہمسر ہو۔ آگرہ اور دہلی کی مشہورِ عالم عمارات جس عظمتِ رفتہ کا رسمِ خط ہیں اُس کو مٹانے کا سانحہ معمولی نہ ہوگا۔

. . . . . .

مادری زبان سے میری مراد صرف معمولی گفتگو کی زبان نہیں بلکہ اِس زبان یعنی اُردو کے پیچھے تاریخ و تہذیب کا جو گراں قدر اثاثہ اور ورثہ ہے اس کا پورے طور سے پر احساس بھی دلاتا ہے جو زندگی کے مکائد و مصائب میں آنے والی نسلوں کی رہنمائی کرے گا اور ان کو حوصلہ مند رکھے گا۔ زندگی میں آج کل جو عالم آشوب افراتفری ملتی ہے اور بے حیائی، بے ایمانی اور بے رحمی کا جیسا طوفان اُمنڈ رہا ہے اس کا ایک سبب یہ ہے کہ مائیں اپنے بچوں اور معلم اپنے طالب علموں کی طرف سے غافل ہو گئے ہیں اور کیسے کہوں کہ اس میں ماؤں کی آزادہ روی یا بے راہ روی کو کہاں تک دخل ہے۔ اس بحث کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا لیکن آج کی تقریب میں لڑکیوں اور ماؤں کو تاکید سے بتانا چاہتا ہوں کہ بچوں کو مادری زبان سے پورے طور پر آشنا کرنے اور رکھنے اور اس طور پر اُردو جیسی عظیم الشان زبان کو زندہ اور کار آمد رکھنے کی ذمہ داری تمام تر اُن پر عائد ہوتی ہے۔ بغیر اُن کی تائید و تعاون کے مادری زبان کا تصور بے معنی ہے۔ اس مسئلے کی اہمیت کا اندازہ اس

ساتھ ہی یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ آج کل خود ماؤں کی زبان اُن کے بچّوں کی مادری زبان بننے کے قابل نہیں رہی ہے۔ ــ

(اقتباسات از خطبۂ تقسیم اسناد، جامعۂ اُردو۔ علی گڑھ، ۱۹۷۳ء)

ارہر کا کھیت

"وہ گلیاں یاد آتی ہیں جوانی جن میں کھوئی ہے۔"

دیہات میں ارہر کے کھیت کو وہی اہمیت حاصل ہے جو ہائیڈ پارک کو لندن میں ہے۔ دیہات اور دیہاتیوں کے سارے منصبی فرائض فطری حوائج اور معاشرتی حوادث یہیں پیش آتے ہیں۔ ہائیڈ پارک کے خطیب مشہور ہیں لیکن لوگوں کو نہیں معلوم کہ اس کی داغ بیل ہندوستان کے ارہر کے کھیت ہی میں پڑی تھی۔

پارلیمنٹ اور کونسلوں کی "ہیر ہیر" اور "چیرز" جواب "رقصِ پروانہ اور پرفشانیٔ شمع" سے زیادہ گرمیٔ محفل کا باعث تصور کی جاتی ہیں وہ صدائے بازگشت ہیں جو شاید سب سے پہلے کسی آلۂ مکبّر الصّوت نے ارہر کے کھیت سے بلند کی تھیں۔ ہائیڈ پارک کی خوش فعلیاں اکثر آرٹ یا اُس کی عریانیوں پر ختم ہو جاتی ہیں - ارہر کے کھیت کی عریانیاں اکثر وائٹرلو پر تمام ہوتی ہیں۔ یورپ کی عورتوں کو حقوق طلبی کا خیال بہت بعد میں پیدا ہوا لیکن ارہر کے کھیت میں کتنی گاؤں والیاں مسز پنکھرسٹ کی پیش رو گذر چکی ہیں۔ یہ دیہاتیوں کی اسمبلی ہے جہاں عورتوں اور بچّوں کو گاؤں کی انتظامی حکومت میں اتنا ہی دخل ہوتا ہے جتنا ہندوستانی پارلیمنٹ میں اراکین پارلیمنٹ کو۔ دونوں بولتے ہیں ضد کرتے ہیں جھگڑتے ہیں روتے ہیں اور اپنے اپنے گھر کا راستہ لیتے ہیں۔ دیہاتی عورتیں اور بچّے کچھ اور مفید کام کر جاتے ہیں جس سے اُن کو اور کھیت دونوں کو فائدہ پہنچتا ہے اور ہندوستانی اراکین پارلیمنٹ جو کرتے ہیں جس سے اُن کو اور ہندوستان دونوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ ایک تقاضائے حاجت کرتا ہے اور دوسرا ان کو ایریشن ...

ناظرین سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ لشکر کس مہم پر روانہ ہوا تھا۔ یہاں وہ سب کچھ ہو گیا جس کے لئے ہم چوری یا مار کھاتے ہیں یہیں سے شاعری کا انتقام اور تحریکات کا آغاز ہوتا ہے یہیں حفظانِ صحت جنم لیتے ہیں یہاں تک کہ یہ معلوم ہوگا کہ بہت سے منچلے یا مظلوم پہلے سے گھیرے ہوئے ہیں کبھی کبھی یہاں تک نوبت آتی ہے ... بچھ گیا ہے وہ اس کے لئے افتاں و خیزاں یہاں تک پہنچا ہے۔ کسی سے وعدۂ ... کے مزید کا قول و اقرار ہے۔ وہ سر پا شوق چلا آ رہا ہے اور کسی کا گدھا کھو گیا ہے، وہ بھی بھٹکتا ہوا آ پہنچا ہے۔ یہ اُس بھول بھلیاں کا کرشمہ ہے کہ بچھڑے یہاں ضرور ملتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کبھی گدھے والے کا ہاتھ عشاق کی گردن پر ہوتا ہے یا خود گدھا کسی محبوب کے ... آخر یورپ کے ازمنۂ وسطیٰ میں ماسکو یا جشن نقاب پوشی کیا جاتا تھا جس پر یورپ والے ناز کرتے ہیں اور ہم روتے ہیں یا گالیاں دیتے ہیں۔ ہندوستان کی سرزمین صرف دو چیزوں کے لئے موزوں ہے۔ مہابھارت یا ارہر کا کھیت۔ مہابھارت تو شاید اختتام پر ہے سائمن کمیشن کی سفارش اور ارہر کے کھیت کا اور انتظار ہے۔

جوانی کا کھونا اور وہ بھی ارہر کے کھیت میں ایسا مسئلہ ہے جس پر نکتہ سنجوں پر زور دینے سے پہلے دل و دماغ پر زور دینا زیادہ ضروری ہے ہندوستان میں جوانی کا انجام دو طریقوں پر ہوتا ہے۔ اکثر شفا خانے میں اور جیل خانے میں۔ جیل خانے کا راستہ تو اکثر ارہر کے کھیت ہی سے گزرتا ہے اور شفا خانے کا شہروں کی صاف شفاف سڑکوں سے جس پر سے موٹر بھی گذرتے ہیں یا لوری بھی۔ یہ ہندوستان کی بدنصیبی ہے کہ اُس کے نوجوانوں نے اسرافِ شباب کے لئے شفا خانوں کو جیل خانوں پر ترجیح دی۔ زندگی کے آثار اپریشن ہال کے نشتر سے زیادہ جیل خانے کے ڈنڈے میں پائے جاتے ہیں شفا خانہ سے زندگی اور جیل خانہ سے موت گھبراتی ہے۔

شباب اور مفلسی کا اجتماع اتنا ہی بے کیف ہے جتنا بے مرچ کا سالن یا بے تمباکو کا پان۔ مانا کہ مرچ اور تمباکو مضرِ صحت ہیں لیکن تندرستی کا مصرف محض تندرستی نہیں بلکہ اس سے لطف اندوز ہونا ہے۔ شباب میں پیرانہ سالی کا لطف دیگرے لطف کہہ سکتے ہیں اٹھانا ممکن ہے لیکن پیرانہ سالی میں شباب کا کیف کیسے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ شباب اور پیری دونوں حالات منتظرہ میں۔ ایک کا مقصود انتظارِ "دشمنِ ایمان و آگہی" یا "رہزنِ تمکین و ہوش" ہے دوسرے کا؟

لیکن یہ ستم یعنی ہندوستان کے مطالبۂ آزادی سے زیادہ دلچسپ ہے کہ شباب ایک طرف تو عقل سے شرمسار ہونے پر مصر رہتا ہے اور دوسری طرف سب کا انتقام بھی پورا پورا لیتا ہے۔ ارہر کے کھیت میں عقل سے شرمساری کی نوبت آتی ہے تو گاؤں والے ... سے کام لیتے ہیں اور عدالت زندے سے خبر لیتی ہے کبھی منچلے شہری کا ارہر کے کھیت میں دیہاتیوں کے ہاتھ سے مار کھانا اتنا ہی دلچسپ اور شاید ہی اتنا پُر منظر ہے جتنا کسی پبلک مشاعرے میں بھلے مانس شاعر کا اپنا کلام سُنانا! ــ

پطرس (سید احمد شاہ بخاری)



مرحوم کی یاد میں

ایک دن مرزا صاحب اور میں برآمدے میں ساتھ ساتھ کرسیاں ڈالے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ جب دوستی بہت پرانی ہو جائے تو گفتگو کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی اور دوست ایک دوسرے کی خاموشی سے بھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ یہی حالت ہماری تھی۔ ہم دونوں اپنے اپنے خیالات میں غرق تھے۔ مرزا صاحب تو خدا جانے کیا سوچ رہے تھے لیکن میں زمانے کی ناسازگاری پر غور کر رہا تھا۔ دور سڑک پر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایک موٹر کار گزر جاتی تھی۔ میری طبیعت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ میں جب کبھی کسی موٹر کار کو دیکھوں، مجھے زمانے کی ناسازگاری کا خیال ضرور ستانے لگتا ہے اور میں کوئی ایسی ترکیب سوچنے لگتا ہوں جس سے دنیا کی تمام دولت سب انسانوں میں برابر تقسیم کی جا سکے۔ اگر میں سڑک پر پیدل جا رہا ہوں اور کوئی موٹر اس ادا سے گزر جائے کہ گرد و غبار میرے پھیپھڑوں، میرے دماغ، میرے معدے اور میری تلی تک پہنچ جائے تو اس دن میں گھر آ کر علم کیمیا کی وہ کتاب نکال لیتا ہوں جو میں نے ایف اے میں پڑھی تھی اور اس غرض سے اس کا مطالعہ کرنے لگتا ہوں کہ شاید بم بنانے کا کوئی نسخہ ہاتھ آ جائے۔

میں کچھ دیر تک آہیں بھرتا رہا۔ مرزا صاحب نے کچھ توجہ نہ کی۔ آخر میں نے خاموشی کو توڑا اور مرزا سے مخاطب ہو کر بولا:

"مرزا ہم میں اور حیوانوں میں کیا فرق ہے؟"

مرزا صاحب بولے "بھئی کچھ ہوگا ہی آخر۔"

میں نے کہا "میں بتاؤں تمہیں؟"

کہنے لگے "بولو۔"

میں نے کہا "کوئی فرق نہیں۔ سنتے ہو مرزا کوئی فرق نہیں۔ ہم میں اور حیوانوں میں۔ . . . کم از کم مجھ میں اور حیوانوں میں کوئی فرق نہیں۔ ہاں ہاں میں جانتا ہوں۔ تم مین میخ نکالنے میں بڑے طاق ہو۔ کہہ دو گے۔ حیوان جگالی کرتے ہیں۔ تم جگالی نہیں کرتے۔ اُن کی دُم ہوتی ہے۔ تمہاری دُم نہیں۔ لیکن ان باتوں سے کیا ہوتا ہے۔ ان سے تو صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے افضل ہیں۔ لیکن ایک بات میں مَیں اور وہ بالکل برابر ہیں۔ وہ بھی پیدل چلتے ہیں۔ میں بھی پیدل چلتا ہوں۔ اس کا تمہارے پاس کیا جواب ہے۔ جواب نہیں۔ کچھ ہے تو کہو ـــــ تم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ جب سے میں پیدا ہوا ہوں اس دن سے پیدل چل رہا ہوں۔ پیدل۔ تم پیدل کے معنی نہیں جانتے۔ پیدل کے معنی ہیں سینۂ زمین پر اس طرح حرکت کرنا کہ دونوں پاؤں میں سے ایک ضرور زمین پر رہے۔ یعنی تمام عمر میرے حرکت کرنے کا طریقہ یہی رہا ہے کہ ایک پاؤں زمین پر رکھتا ہوں اور دوسرا اُٹھاتا ہوں۔ دوسرا رکھتا ہوں پہلا اُٹھاتا ہوں۔ ایک آگے ایک پیچھے۔ ایک پیچھے ایک آگے۔ خدا کی قسم اس طرح کی زندگی سے دماغ سوچنے کے قابل نہیں رہتا۔ حواس بیکار ہو جاتے ہیں۔ تخیل مر جاتا ہے۔ آدمی گدھے سے بدتر ہو جاتا ہے۔"

مرزا صاحب میری اس تقریر کے دوران بکمال بے پروائی سے سگریٹ پیتے رہے کہ دوستوں کی بے پروائی پر رونے کو دل چاہتا تھا۔ میں نے از حد حقارت اور نفرت کے ساتھ منہ ان کی طرف سے پھیر لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مرزا کو میری باتوں پر یقین نہیں آتا گویا میں جو تکالیف بیان کر رہا ہوں۔ وہ محض خیالی ہیں۔ یعنی میرا پیدل چلنے کے خلاف شکایت کرنا قابل توجہ ہی نہیں۔ یعنی میں کسی سواری کا مستحق ہی نہیں۔ میں نے دل میں کہا "اچھا مرزا یوں ہی سہی۔ دیکھو تو میں کیا کرتا ہوں۔"

میں نے اپنے دانت پیچ کر لئے اور کرسی کے بازو پر سے جھک کر مرزا کے قریب پہنچ گیا۔ مرزا نے بھی سر میری طرف موڑا۔ میں مسکرایا لیکن میرے تبسم میں زہر ملا ہوا تھا۔ جب مرزا سننے کے لئے بالکل تیار ہو گیا تو میں نے چبا چبا کر کہا:

"مرزا میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں بڑے استغنا کے ساتھ دوسری طرف دیکھنے لگا۔

مرزا بولے "کیا کہا تم نے۔ کیا خریدنے لگے ہو؟"

میں نے کہا "سنا نہیں تم نے۔ میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں۔ موٹر کار ایک ایسی گاڑی ہے جس کو بعض لوگ موٹر کہتے ہیں

بعض لوگ کار کہتے ہیں۔ لیکن چونکہ تم خداکند ذہن ہو اس لئے میں نے دونوں الفاظ استعمال کر دیئے تاکہ تمہیں سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔"

مرزا بولے "ہوں"۔

اب کے مرزا نہیں میں بے پروائی سے سگریٹ پینے لگا۔ بھویں میں نے اوپر کو چڑھالیں۔ سگریٹ والا ہاتھ میں منہ تک اس انداز سے لاتا اور ہٹاتا تھا کہ بڑے بڑے ایکٹر اس پر رشک کریں۔

تھوڑی دیر کے بعد مرزا پھر بولے "ہوں"

میں نے سوچا اثر ہو رہا ہے۔ مرزا صاحب پر رعب پڑ رہا ہے۔ میں چاہتا تھا مرزا کچھ بولے تاکہ مجھے معلوم ہو کہاں تک مرعوب ہوا ہے۔ لیکن مرزا نے پھر کہا "ہوں"۔

میں نے کہا "مرزا جہاں تک مجھے معلوم ہے تم نے اسکول اور کالج اور گھر پر دو تین زبانیں سیکھی ہیں اور اس کے علاوہ تمہیں کئی ایسے الفاظ بھی آتے ہیں جو کسی اسکول اور کالج یا شریف گھرانے میں نہیں بولے جاتے۔ پھر بھی اس وقت تمہارا کلام "ہوں" سے آگے نہیں بڑھتا۔ تم جانتے ہو مرزا اس وقت تمہاری جو ذہنی کیفیت ہے اس کو عربی زبان میں حسد کہتے ہیں۔"

مرزا صاحب کہنے لگے "نہیں یہ بات نہیں۔ میں تو صرف خریدنے کے لفظ پر غور کر رہا تھا۔ تم نے کہا میں ایک موٹر خریدنے لگا ہوں۔ تو میاں صاحبزادے خریدنا تو ایک ایسا فعل ہے کہ اس کے لئے روپے وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ وغیرہ کا بندوبست تو بخوبی ہو جائے گا لیکن روپے کا بندوبست کیسے کرو گے؟"

یہ نکتہ مجھے بھی نہیں سوجھا تھا لیکن میں نے ہمت نہ ہاری۔ میں نے کہا "میں اپنی کئی قیمتی اشیا بیچ سکتا ہوں"

مرزا بولے "کون کون سی مثلاً؟"

میں نے کہا "ایک تو میں اپنا سگریٹ کیس بیچ ڈالوں گا"

مرزا کہنے لگے "چلو دس آنے تو یہ ہو گئے۔ باقی ڈھائی تین ہزار کا انتظام بھی اسی طرح ہو جائے تو سب کام ٹھیک ہو جائے گا"

اس کے بعد ضروری یہی معلوم ہوا کہ گفتگو کا سلسلہ کچھ دیر کے لئے روک دیا جائے۔ چنانچہ میں مرزا سے بیزار ہو کر خاموش ہو رہا۔ یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ لوگ روپیہ کہاں سے لاتے ہیں۔ بہت سوچا۔ آخر اس نتیجہ پر پہنچا کہ لوگ چوری کرتے ہیں۔ اس سے ایک گونہ اطمینان ہوا۔

مرزا بولے "میں تمہیں ایک ترکیب بتاؤں۔ ایک بائیسکل لے لو۔"

میں نے کہا "وہ روپیہ کا مسئلہ تو پھر جوں کا توں رہا۔"

کہنے لگے "مفت"

میں نے حیران ہو کر پوچھا "مفت وہ کیسے؟"

کہنے لگے "مفت ہی سمجھو۔ آخر دوست سے قیمت لینا بھی کہاں کی شرافت ہے۔ البتہ تم احسان قبول کرنا گوارا نہ کرو تو اور بات ہے۔"

ایسے موقع پر جو ہنسی میں ہنستا ہوں اس میں معصوم بچے کی مسرت جوانی کی خوش دلی، اُبلتے فواروں کی موسیقی، اور بلبلوں کا نغمہ سب ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں یہ ہنسی ہنسا اور اس طرح ہنسا کہ کھلی ہوئی باچھیں پھر گھنٹوں تک اپنی اصلی جگہ پر واپس نہ آئیں۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ یک لخت کوئی خوشخبری سننے سے دل کی حرکت بند ہو جانے کا جو خطرہ ہوتا ہے اس سے محفوظ ہوں تو میں نے پوچھا "ہے کس کی؟"

مرزا بولے "میرے پاس ایک بائیسکل پڑی ہے تم لے لو۔"

میں نے کہا "پھر کہنا، پھر کہنا"

کہنے لگے "بھئی ایک بائیسکل میرے پاس ہے جو میری ہے تو تمہاری ہے، تم لے لو"

یقین مانئے مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ شرم کے مارے میں پسینہ پسینہ ہو گیا۔ چودھویں صدی میں ایسی بے غرضی اور ایثار بھلا کہاں دیکھنے میں آتا ہے۔ میں نے کرسی سرکا کر مرزا کے پاس کر لی۔ سمجھ میں نہ آیا کہ اپنی ندامت اور ممنونیت کا اظہار کن الفاظ میں کروں۔

میں نے کہا "مرزا سب سے پہلے میں اس گستاخی اور درشتی اور بے ادبی کے لئے معافی مانگتا ہوں جو ابھی ابھی میں نے تمہارے ساتھ گفتگو میں روا رکھی۔ دوسرے میں آج تمہارے سامنے ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ تم میری صاف گوئی کی داد دو گے اور مجھے اپنی رحم دلی کے صدقے معاف کر دو گے۔ میں ہمیشہ تم کو ازحد کمینہ، مکار، خود غرض اور عیار انسان سمجھتا رہا ہوں۔ دیکھو ناراض مت ہو۔ انسان سے غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ لیکن آج تم نے اپنی شرافت اور دوست پروری کا ثبوت دیا ہے اور مجھ پر ثابت کر دیا ہے کہ میں کتنا قابل نفرت، تنگ خیال اور حقیر شخص ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔"

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ قریب تھا کہ میں مرزا کے ہاتھ کو بوسہ دیتا اور اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لئے اس کی گود میں سر رکھ دیتا لیکن مرزا صاحب کہنے لگے:

"واہ اس میں میری فیاضی کیا ہوئی۔ میرے پاس ایک بائیسکل ہے جیسے میں سوار ہوا، ویسے تم سوار ہوئے۔"

میں نے کہا "مرزا مفت میں نہ لوں گا، یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

مرزا کہنے لگے: "بس اسی بات سے میں ڈرتا تھا۔ تم حساس لڑکے ہو کہ کسی کا احسان لینا گوارا نہیں کرتے۔ حالانکہ خدا گواہ ہے احسان اس میں کوئی نہیں۔"

میں نے کہا: "خیر کچھ بھی سہی، تم بتا دو مجھے اس کی قیمت بتا دو۔"

مرزا بولے: "قیمت کا ذکر کر کے تم گویا مجھے کانٹوں میں گھسیٹتے ہو اور جس قیمت پر میں نے خریدی تھی وہ تو بہت زیادہ تھی اور اب تو وہ اتنے کی رہی بھی نہیں۔"

میں نے پوچھا: "تم نے کتنے میں خریدی تھی؟"

کہنے لگے: "میں نے پونے دو سو روپے میں لی تھی لیکن اس زمانے میں بائیسکلوں کا رواج ذرا کم تھا۔ اس لئے قیمتیں ذرا زیادہ تھیں۔"

میں نے کہا: "کیا بہت پرانی ہے؟"

بولے: "نہیں، ایسی پرانی بھی کیا ہوگی۔ میرا لڑکا اس پر کالج آیا جایا کرتا تھا اور اسے کالج چھوڑے ابھی دو سال بھی نہیں ہوئے لیکن اتنا ضرور ہے کہ آج کل کی بائیسکلوں سے ذرا مختلف ہے۔ آج کل تو بائیسکلیں ٹین کی بنتی ہیں جنہیں کالج کے سر پھرے لونڈے سستی سمجھ کر خرید لیتے ہیں۔ پرانی بائیسکلوں کے ڈھانچے مضبوط ہوا کرتے تھے۔"

"مگر مرزا پونے دو سو روپے تو میں ہرگز نہیں دے سکتا۔ اتنے روپے میرے پاس کہاں سے آئے، میں تو اس سے آدھی قیمت بھی نہیں دے سکتا۔"

مرزا کہنے لگے: "تو میں تم سے پوری قیمت تھوڑی مانگتا ہوں۔ اول تو قیمت لینا نہیں چاہتا لیکن ..."

میں نے کہا: "نہ مرزا قیمت تو تمہیں لینی پڑے گی۔ اچھا تم یوں کرو۔ میں تمہاری جیب میں کچھ روپے ڈال دیتا ہوں۔ تم گھر جا کے گن لینا اگر تمہیں منظور ہوئے تو کل بائیسکل بھجوا دینا ورنہ روپے واپس کر دینا۔ اب یہاں بیٹھ کر میں تم سے سودا چکاؤں، یہ کچھ دکانداروں کی سی بات معلوم ہوتی ہے۔"

مرزا بولے: "بھئی جیسے تمہاری مرضی۔ میں تو یہی کہتا ہوں کہ قیمت ویمت جانے دو۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ تم نہ مانو گے۔"

میں اٹھ کر اندر کمرے میں آیا۔ میں نے سوچا استعمال شدہ چیز کی لوگ عام طور پر آدھی قیمت دیتے ہیں لیکن جب میں نے مرزا سے کہا تھا کہ مرزا میں تو آدھی قیمت بھی نہیں دے سکتا، تو مرزا اس پر معترض نہ ہوا تھا، وہ بیچارا تو بلکہ یہی کہتا تھا کہ تم مفت ہی لے لو، لیکن مفت میں کیسے لے لوں، آخر بائیسکل ہے، ایک سواری ہے۔ فٹنوں اور گھوڑوں اور موٹروں اور تانگوں کے زمرے میں شمار ہوتی ہے۔ بکس کو کھولا تو معلوم ہوا کہ ہست و بود کل چھیالیس روپے ہیں۔ چھیالیس روپے تو کچھ ٹھیک رقم نہیں، پینتالیس یا پچاس ہوں جب بھی بات ہے۔ پچاس تو ہو نہیں سکتے اور اگر پینتالیس ہی دینے ہیں تو چالیس ہی کیوں نہ دیئے جائیں، جن رقموں کے آخر میں صفر آتا ہے وہ رقمیں کچھ زیادہ معقول ہوتی ہیں۔ بس ٹھیک ہے۔ چالیس روپے دیدوں گا۔ خدا کرے مرزا قبول کرے۔

باہر آیا۔ چالیس روپے مٹھی میں بند کر کے میں نے مرزا کی جیب میں ڈال دیے اور کہا: "مرزا اس کو قیمت نہ سمجھنا۔ لیکن اگر ایک مفلس دوست کی حقیر سی رقم منظور کرنا تمہیں اپنی توہین معلوم نہ ہو تو کل بائیسکل بھجوا دینا۔"

مرزا چلنے لگے تو میں نے پھر کہا کہ مرزا کل ضرور صبح ہی صبح بھجوا دینا۔ رخصت ہونے سے پہلے میں نے پھر ایک دفعہ کہا: "کل صبح آٹھ نو بجے تک پہنچ جائے۔ دیر نہ کرنا ... خدا حافظ ... اور دیکھو مرزا میرے تھوڑے سے روپیوں کو بھی زیادہ سمجھنا ... خدا حافظ ... اور تمہارا بہت بہت شکریہ، میں تمہارا بہت ممنون ہوں۔ اور میری گستاخی کو معاف کر دینا، دیکھو نا کبھی کبھی یونہی بے تکلفی میں ... کل صبح آٹھ نو بجے تک ... ضرور ... خدا حافظ۔"

مرزا کہنے لگے: "ذرا اس کو جھاڑ پونچھ لینا اور تیل وغیرہ ڈلوا لینا، میرے نوکر کو فرصت ہوئی تو میں خود ہی ڈلوا دوں گا ورنہ تم خود ڈلوا لینا۔"

میں نے کہا: "ہاں ہاں وہ سب کچھ ہو جائے گا تم کل ضرور بھیج دینا، اور دیکھنا آٹھ بجے تک یا ساڑھے سات بجے تک پہنچ جائے۔ اچھا ... خدا حافظ۔"

رات کو بستر پر لیٹا تو بائیسکل پر سیر کرنے کے مختلف پروگرام تجویز کرتا رہا، یہ ارادہ تو پختہ کر لیا کہ دو تین دن کے اندر اندر ارد گرد کی تمام مشہور تاریخی عمارات اور کھنڈروں کو نئے سرے سے دیکھ ڈالوں گا۔ اس کے بعد اگلے گرمی کے موسم میں ہو سکا تو بائیسکل پر کشمیر وغیرہ کی سیر کروں گا۔ صبح صبح ہوا خوری کے لئے ہر روز نہر تک جایا کروں گا۔ شام کو ٹھنڈی سڑک پر جہاں اور لوگ سیر کو نکلیں گے، میں بھی سڑک کی صاف شفاف سطح پر ہلکے ہلکے خاموشی کے ساتھ ہاتھی دانت کی ایک گیند کی مانند گزر جاؤں گا۔ ڈوبتے ہوئے آفتاب کی روشنی بائیسکل کے چمکیلے حصوں پر پڑے گی تو بائیسکل جگمگا اٹھے گی اور ایسا معلوم ہوگا جیسے ایک راج ہنس زمین کے ساتھ ساتھ اڑ رہا ہے، وہ مسکراہٹ جس کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں ابھی تک میرے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔ بارہا دل چاہا کہ ابھی بھاگ کر جاؤں اور اسی وقت مرزا کو گلے لگا لوں۔ رات کو خواب میں دعائیں مانگتا رہا کہ خدا یا مرزا بائیسکل دینے پر

رضامند ہوجائے۔

صبح اٹھا تو اُٹھنے کے ساتھ ہی نوکر نے یہ خوشخبری بھی سُنائی کہ حضور وہ بائیسکل آگئی ہے۔"

میں نے کہا "اتنی سویرے؟"

نوکر نے کہا "وہ تو رات ہی کو آگئی تھی۔ آپ سو گئے تھے، میں نے جگانا مناسب نہ سمجھا اور ساتھ ہی مرزا صاحب کا آدمی ڈھبریاں کسنے کا ایک اوزار بھی دے گیا ہے۔"

میں حیران تو ہوا کہ مرزا صاحب نے سائیکل بھجوا دینے میں اس قدر عجلت سے کیوں کام لیا۔ لیکن اس نتیجے پر پہنچا کہ آدمی نہایت شریف اور دیانت دار ہیں، روپے لے لئے تھے تو بائیسکل کیوں روک رکھتے۔

نوکر سے کہا "دیکھو یہ اوزار یہیں چھوڑ جاؤ اور دیکھو بائیسکل کو کسی کپڑے سے خوب اچھی طرح جھاڑو، اور یہ موڑ پر جو بائیسکل والا بیٹھتا ہے، اس سے جا کر بائیسکل میں ڈالنے کا تیل لے آؤ، اور دیکھو، ابے بھاگا کہاں جا رہا ہے، اہم ضروری بات تم سے کہہ رہے ہیں۔ بائیسکل والے سے تیل کی ایک کپی بھی لے آنا اور جہاں جہاں تیل دینے کی جگہ ہے وہاں تیل دے دینا اور بائسکلوں والے سے کہنا کہ کوئی گھٹیا سا تیل نہ دے دے جس سے تمام پرزے ہی خراب ہو جائیں۔ بائیسکل کے پرزے بڑے نازک ہوتے ہیں اور بائیسکل باہر نکال کر رکھو، ہم ابھی کپڑے پہن کر آتے ہیں، ہم ذرا سیر کو جا رہے ہیں۔

"اور دیکھو صاف کر دینا اور بہت زور زور سے کپڑا بھی مت رگڑنا، بائیسکل کا پالش گھس جاتا ہے۔"

جلدی جلدی چائے پی، غسل خانے میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ "چل چل چنبیلی باغ میں" گاتا رہا۔ اس کے بعد کپڑے بدلے۔ ا ۔ ! کو جیب میں ڈالا اور کمرے سے باہر نکلا۔

برآمدے میں آیا تو برآمدے کے ساتھ ہی ایک عجیب و غریب مشین نظر پڑی۔ ٹھیک طرح پہچان نہ سکا کہ کیا چیز ہے۔ نوکر سے دریافت کیا "کیوں بے یہ کیا چیز ہے؟"

نوکر بولا "حضور یہ بائیسکل ہے۔"

میں نے کہا "بائیسکل؟ کس کی بائیسکل؟"

کہنے لگا "مرزا صاحب نے بھجوائی ہے آپ کے لئے۔"

میں نے کہا "اور جو بائیسکل رات کو انہوں نے بھیجی تھی وہ کہاں گئی؟"

کہنے لگا "یہی تو ہے۔"

میں نے کہا "کیا بکتا ہے۔ جو بائیسکل مرزا صاحب نے کل رات کو بھیجی تھی، وہ بائیسکل یہی ہے؟"

کہنے لگا "جی ہاں۔"

میں نے کہا "اچھا!" اور پھر اُسے دیکھنے لگا۔

"اس کو صاف کیوں نہیں کیا؟"

"حضور دو تین دفعہ صاف کیا ہے۔"

"تو یہ میل کیوں ہے؟"

نوکر نے اس کا جواب دینا شاید مناسب نہ سمجھا۔

"اور تیل لایا؟"

ہاں حضور لایا ہوں۔"

"دیا؟"

"حضور وہ جو تیل دینے کے چھید ہوتے ہیں، وہ نہیں ملتے۔"

"کیا وجہ؟"

"حضور دھروں پہ میل اور زنگ جما ہے۔ وہ سوراخ کہیں بیچ میں ہی دب دبا گئے ہیں۔"

رفتہ رفتہ میں اُس چیز کے قریب آیا، جس کو میرا نوکر بائیسکل بتا رہا تھا۔ اس کے مختلف پرزوں پر غور کیا، تو اتنا ثابت ہو گیا کہ بائیسکل ہے۔ لیکن مجمل ہیئت سے یہ صاف ظاہر تھا کہ کلی اور راہٹ اور چرخہ اور اسی طرح کی اور جدید ایجادات سے پہلے کی بنی ہوئی ہے۔ پہیے کو گھما گھما کر وہ سوراخ تلاش کیا جہاں کسی زمانے میں تیل دیا جاتا تھا۔ لیکن اب اس سوراخ میں سے آمد و رفت کا سلسلہ بند تھا۔ چنانچہ نوکر بولا "حضور وہ تیل تو سب اِدھر اُدھر بہہ جاتا ہے، بیچ میں تو جاتا ہی نہیں۔"

میں نے کہا "اچھا اُوپر اُوپر ہی ڈال دو۔ یہ بھی مفید ہوتا ہے۔"

آخرکار بائیسکل پر سوار ہوا۔ پہلا ہی پاؤں چلایا تو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی مُردہ اپنی ہڈیاں چٹخا چٹخا کر اپنی مرضی کے خلاف زندہ ہو رہا ہے۔ گھر سے نکلتے ہی کچھ تھوڑی سی اُترائی تھی۔ اس پر بائیسکل خود بخود چلنے لگی۔ لیکن اس رفتار سے جیسے تارکول زمین پر بہتا ہے، اور ساتھ ہی مختلف حصوں سے طرح طرح کی آوازیں برآمد ہونی شروع ہوئیں۔ ان آوازوں کے مختلف گروہ تھے۔ "چیں چاں چوں" قسم کی آوازیں زیادہ تر گدی کے نیچے اور پچھلے پہیے سے نکلتی تھیں۔ "کھٹ کھٹ۔ کھڑ کھڑ۔ کھڑ" کے قبیل کی آوازیں مڈگارڈوں سے آتی تھیں۔ "چر۔ چرخ۔ چر چرخ" قسم کے سُر زنجیر اور پیڈل سے نکلتے تھے۔ زنجیر ڈھیلی ڈھیلی تھی۔ میں جب کبھی پیڈل پر زور ڈالتا

تھا اور ٹھیک ایک انگڑائی سی پیدا ہوتی تھی جس سے وہ تن جاتی تھی اور پھر بھڑ بھڑانے لگتی تھی اور پھر ڈھیلی ہو جاتی تھی۔ پچھلا پہیہ گھومنے کے علاوہ جھومتا بھی تھا۔ یعنی ایک تو آگے کو چلتا تھا اور اس کے علاوہ داہنے سے بائیں اور بائیں سے داہنے کو بھی حرکت کرتا تھا چنانچہ سڑک پر جو نشان پڑتا جاتا تھا، اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی مخمور سانپ لہرا کر نکل گیا ہے۔ مڈگارڈ تھے تو سہی لیکن پہیوں کے عین اوپر نہ تھے۔ ان کا فائدہ صرف یہ معلوم ہوتا تھا کہ انسان شمال کی سمت سیر کو نکلے اور آفتاب مغرب میں غروب ہو رہا ہو تو مڈگارڈوں کی بدولت ٹائر دھوپ سے بچے رہیں گے۔ اگلے پہیے کے ٹائر میں ایک بڑا سا پیوند لگا تھا جس کی وجہ سے پہیہ ہر چکر میں ایک دفعہ لمحہ بھر کو زور سے اوپر اٹھ جاتا تھا، اور میرا سر پیچھے کو یوں جھٹکے کھا رہا تھا جیسے کوئی متواتر ٹھوڑی کے نیچے مکے مارے جا رہا ہو۔ پچھلے اور اگلے پہیے کو ملا کر "چوں چوں پھٹ۔ چوں چوں پھٹ"... کی صدا نکل رہی تھی۔ جب اتار پر بائیسکل ذرا زیادہ تیز ہوئی تو فضا میں ایک بھونچال سا آگیا اور بائیسکل کے کئی اور پرزے جو اب تک سو رہے تھے بیدار ہو کر گویا ہوئے۔ ادھر ادھر کے لوگ چونکے، ماؤں نے اپنے بچوں کو سینے سے لگا لیا۔ "کھڑڑ کھڑڑ" کے بیچ میں پہیوں کی آواز جدا سنائی دے رہی تھی۔ لیکن چونکہ بائیسکل اب پہلے سے تیز تھی اس لئے "چوں چوں پھٹ" کی آواز نے اب "چچوں چچوں پھٹ، چچوں پھٹ" کی صورت اختیار کر لی تھی۔ تمام بائیسکل کسی ادق افریقی زبان کی گردانیں دہرا رہی تھی۔

اس قدر تیز رفتاری بائیسکل کی طبع نازک پر گراں گزری چنانچہ اس میں یک لخت دو تبدیلیاں واقع ہو گئیں۔ ایک تو ہینڈل ایک طرف کو مڑ گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں جا تو سامنے رہا تھا لیکن میرا تمام جسم دائیں طرف کو مڑا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ بائیسکل کی گدی دفعتاً چھ انچ کے قریب نیچے بیٹھ گئی چنانچہ جب پیڈل چلانے کے لئے میں ٹانگیں اوپر نیچے کر رہا تھا تو میرے گھٹنے میری ٹھوڑی تک پہنچ جاتے تھے، کمر دہری ہو کر باہر کو نکلی ہوئی تھی اور ساتھ ہی اگلے پہیے کی اٹکھیلیوں کی وجہ سے سر برابر جھٹکے کھا رہا تھا۔

گدی کا نیچا ہونا از حد تکلیف دہ ثابت ہوا۔ اس لئے میں نے مناسب یہی سمجھا کہ اس کو ٹھیک کر لوں۔ چنانچہ میں نے بائیسکل کو ٹھہرا لیا اور نیچے اترا۔ بائیسکل کے ٹھہر جانے سے یک لخت جیسے دنیا میں ایک خاموشی سی چھا گئی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے میں کسی ریل کے اسٹیشن سے نکل کر باہر آ گیا ہوں۔ جیب سے میں نے اوزار نکالا۔ گدی کو اونچا کیا۔ کچھ ہینڈل کو ٹھیک کیا اور دوبارہ سوار ہو گیا۔

دس قدم بھی چلنے نہ پایا تھا کہ اب ہینڈل یک لخت نیچا ہو گیا۔ اتنا کہ گدی اب ہینڈل سے کوئی فٹ بھر اونچی تھی۔ میرا تمام جسم آگے کو جھکا ہوا تھا۔ تمام بوجھ دونوں ہاتھوں پر تھا، جو ہینڈل پر رکھے تھے، اور برابر جھٹکے کھا رہے تھے۔ آپ میری حالت کو تصور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ میں دور سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی عورت آٹا گوندھ رہی ہو۔ اس مشابہت کا احساس تیز تھا جس کی وجہ سے میرے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ میں دائیں بائیں جانب لوگوں کو کنکھیوں سے دیکھتا جاتا تھا۔ یوں تو ہر شخص میل بھر پہلے ہی مڑ مڑ کر دیکھنے لگتا تھا لیکن ان میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کے لئے میری مصیبت ضیافتِ طبع کا باعث نہ ہو۔

ہینڈل تو نیچا ہو ہی گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد گدی بھی پھر نیچی ہو گئی اور میں ہمہ تن زمین کے قریب پہنچ گیا۔ ایک لڑکے نے کہا۔ "دیکھو یہ آدمی کیا کر رہا ہے۔" گویا اس بدتمیز کے نزدیک میں کوئی کرتب دکھا رہا تھا۔ میں نے اتر کر پھر ہینڈل اور گدی کو اونچا کیا۔

لیکن تھوڑی دیر کے بعد ان میں سے ایک نہ ایک پھر نیچا ہو جاتا۔ وہ لمحے جن کے دوران میں میرے ہاتھ اور میرا جسم برابر ایک ہی بلندی پر واقع ہوں بہت ہی کم تھے اور ان میں بھی میں یہی سوچتا رہتا تھا کہ اب کے گدی پہلے بیٹھے گی یا ہینڈل۔ چنانچہ نڈر ہو کر نہ بیٹھتا بلکہ جسم کو گدی سے قدرے اوپر ہی رکھتا۔ لیکن اس سے ہینڈل پر اتنا بوجھ پڑتا کہ وہ نیچا ہو جاتا۔

جب دو میل گزر گئے اور بائیسکل کی اٹھک بیٹھک نے ایک مقرر باقاعدگی اختیار کر لی تو فیصلہ کیا کہ کسی مستری سے پیچ کسوا لینے چاہئیں۔ چنانچہ بائیسکل کو ایک دکان پر لے گیا۔

بائیسکل کی "کھڑکھڑ" سے جتنے لوگ کام کر رہے تھے سب کے سب سر اٹھا کر میری طرف دیکھنے لگے۔ لیکن میں نے جی کڑا کر کے کہا: "ذرا اس کی مرمت کر دیجئے۔"

ایک مستری آگے بڑھا۔ لوہے کی ایک سلاخ اس کے ہاتھ میں تھی جس سے اس نے مختلف حصوں کو بڑی بے دردی کے ساتھ ٹھوک بجا کر دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا اس نے بڑی تیزی کے ساتھ سب حالات کا اندازہ لگا لیا ہے۔ لیکن پھر مجھ سے پوچھنے لگا: "کس کس پرزے کی مرمت کرائیے گا؟"

میں نے کہا: "بڑے گستاخ ہو تم۔ دیکھتے نہیں کہ صرف ہینڈل اور گدی کو ذرا اونچا کروا کے کسوانا ہے۔ بس اور کیا۔ ان کو مہربانی کر کے فوراً ٹھیک کر دو اور بتاؤ کتنے پیسے ہوئے؟"

مستری کہنے لگا: "مڈگارڈ بھی ٹھیک نہ کر دوں؟"

میں نے کہا: "ہاں، وہ بھی ٹھیک کر دو۔"

کہنے لگا:" اگر باقی چیزیں بھی ٹھیک کرالیں تو اچھا ہو"

میں نے کہا:" اچھا کر دو"

بولا:" یوں تھوڑی ہو سکتا ہے۔ دس پندرہ دن کا کام ہے۔ آپ اسے ہمارے پاس چھوڑ جائیے "

" اور پیسے کتنے لوگے "

کہنے لگا:" بس تیس چالیس روپے لگیں گے"

ہم نے کہا:" بس جی۔ جو کام تم سے کہا ہے کر دو اور باقی ہمارے معاملات میں دخل مت دو"

تھوڑی دیر میں ہینڈل اور گدی پھر اونچی کر کے کس دی گئی۔ میں چلنے لگا تو مستری نے کہا:" میں نے کس تو دیا ہے لیکن پیچ سب گھسے ہوئے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں پھر ڈھیلے ہو جائیں گے"

میں نے کہا:" ہیں بدتمیز کہیں کا دو آنے پیسے مفت میں لے لئے "

بولا:" جناب آپ کو بائیسکل بھی تو مفت میں ملی ہوگی۔ یہ آپ کے دوست مرزا صاحب کی ہے نا ____ للو یہ وہی بائیسکل ہے جو پچھلے سال مرزا صاحب یہاں بیچنے کو لائے تھے۔ پہچانی تم نے بھئی صدیاں ہی گزر گئیں۔ لیکن اس بائیسکل کی خطا معاف ہونے میں نہیں آتی"

میں نے کہا:" واہ مرزا صاحب کے لڑکے اس پر کالج آیا جایا کرتے تھے اور ان کو ابھی کالج چھوڑے دو سال بھی نہیں ہوئے"

مستری نے کہا:" ہاں وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن مرزا صاحب خود جب کالج میں پڑھتے تھے تو ان کے پاس بھی تو یہی سائیکل تھی "

میری طبیعت یہ سن کر کچھ مُردہ سی ہو گئی۔ میں بائیسکل کو ساتھ لئے آہستہ آہستہ پیدل چل پڑا۔ لیکن پیدل چلنا بھی مشکل تھا۔ اس بائیسکل کے چلانے میں ایسے ایسے پٹھوں پر زور پڑتا تھا جو عام بائیسکلوں کے چلانے میں استعمال نہیں ہوتے۔ اس لئے ٹانگوں اور کندھوں اور کمر اور بازوؤں میں جا بجا درد ہو رہا تھا۔ مرزا کا خیال رہ رہ کر آتا تھا۔ لیکن میں ہر بار کوشش کر کے اسے دل سے ہٹا دیتا تھا ورنہ میں پاگل ہو جاتا اور جنون کی حالت میں پہلی حرکت مجھ سے یہ سرزد ہوتی کہ مرزا کے مکان کے سامنے بازار میں ایک جلسہ منعقد کرتا جس میں مرزا کی مکاری، بے ایمانی اور دغابازی پر ایک طویل تقریر کرتا کہ نسل نو انسانی اور آئندہ آنے والی نسلوں کو مرزا کی ناپاک فطرت سے آگاہ کر دیتا اور اس کے بعد ایک چتا جلا کر اس میں زندہ جل کر مر جاتا۔

میں نے بہتر یہی سمجھا کہ جس طرح ہو سکے اب اس بائیسکل کو اونے پونے داموں بیچ کر جو وصول ہو اسی پر صبر شکر کروں۔ بلا سے دس پندرہ روپے کا خسارہ سہی۔ چالیس کے چالیس روپے تو ضائع نہ ہوں گے۔

راستے میں بائیسکلوں کی ایک دکان آئی، وہاں ٹھہر گیا۔

دکاندار بڑھ کر میرے پاس آیا۔ لیکن میری زبان کو جیسے قفل لگ گیا تھا۔ عمر بھر کبھی کسی چیز کے بیچنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ ایسے موقع پر کیا کہتے ہیں۔ آخر بڑے سوچ بچار اور بڑے تامل کے بعد منہ سے صرف اتنا نکلا کہ:" یہ بائیسکل ہے"

دکاندار کہنے لگا:" پھر؟"

میں نے کہا:" لوگے؟"

کہنے لگا:" کیا مطلب؟"

میں نے کہا:" بیچتے ہیں ہم"

دکاندار نے مجھے ایسی نظر سے دیکھا کہ مجھے یہ محسوس ہوا مجھ پر چوری کا شبہ کر رہا ہے۔ پھر بائیسکل کو دیکھا۔ پھر مجھے دیکھا۔ پھر بائیسکل کو دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فیصلہ نہیں کر سکتا آدمی کون سا ہے اور بائیسکل کون سی ہے۔ آخر کار بولا:" کیا کریں گے آپ اس کو بیچ کر؟"

ایسے سوالوں کا خدا جانے کیا جواب ہوتا ہے۔ میں نے کہا:" کیا تم یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ جو روپے مجھے وصول ہوں گے ان کا مصرف کیا ہوگا؟"

کہنے لگا:" وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر کوئی اس کو لے کر کرے گا کیا؟"

میں نے کہا:" اس پر چڑھے گا اور کیا کرے گا"

دکاندار بولا:" اچھا چڑھ گیا، پھر؟"

میں نے کہا:" پھر کیا، پھر چلائے اور کیا؟"

دکاندار بولا" اچھا۔ ہوں۔ خدا بخش ذرا یہاں آنا۔ یہ بائیسکل بکنے آئی ہے"

جن حضرت کا اسم گرامی خدا بخش تھا انہوں نے بائیسکل کو دور ہی سے یوں دیکھا جیسے بو سونگھ رہے ہیں۔ اس کے بعد دونوں نے آپس میں مشورہ کیا۔ آخر میں وہ جن کا نام خدا بخش نہیں تھا میرے پاس آئے اور کہنے لگے" تو آپ سچ مچ بیچ رہے ہیں؟"

میں نے کہا:" تو اور کیا محض آپ سے ہم کلام ہونے کا فخر حاصل کرنے کے لئے میں گھر سے یہ بہانہ گھڑ کر لایا تھا؟"

کہنے لگا:" تو کیا لیں گے آپ؟"

میں نے کہا:" تمہیں بتاؤ"

کہنے لگا:" سچ مچ بتاؤں؟"

میں نے کہا:" ہاں"

پھر کہنے لگا:" سچ سچ بتاؤں؟"

میں نے کہا:" اب بتاؤ گے بھی یا یونہی ترساتے رہو گے؟"

کہنے لگا "میں رو پیہ دوں گا اس کے "۔

میرا خون کھول اٹھا اور میرے ہاتھ پاؤں اور ہونٹ غصّے کے مارے کانپنے لگے۔ میں نے کہا۔

"او صنعت و حرفت سے پیٹ پالنے والے نچلے طبقے کے انسان مجھے اپنی توہین کی پرواہ نہیں۔ لیکن تو نے اپنی بیہودہ گفتاری سے اس بےزبان چیز کو جو صدمہ پہنچایا ہے اس کے لئے میں تجھے قیامت تک معاف نہیں کر سکتا" یہ کہہ کر میں بائیسکل پر سوار ہو گیا اور اندھا دھند پاؤں چلانے لگا۔

مشکل سے بیس قدم گیا ہوں گا کہ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے زمین یک لخت اچھل کے مجھ سے آ لگی ہے۔ آسمان میرے سر پر سے ہٹ کر میری ٹانگوں کے بیچ میں سے گزر گیا اور اِدھر اُدھر کی عمارتوں نے ایک دوسرے کے ساتھ اپنی اپنی جگہ بدل لی ہے۔ حواس بجا ہوئے تو معلوم ہوا میں زمین پر اس بے تکلفی سے بیٹھا ہوں گویا بڑی مدت سے مجھے اس بات کا شوق تھا جو آج پورا ہوا۔ اردگرد کچھ لوگ جمع تھے، جن میں سے اکثر ہنس رہے تھے۔ سامنے وہ دکان تھی جہاں ابھی ابھی میں نے اپنی ناکام گفت و شنید کا سلسلہ منقطع کیا تھا۔ میں نے اپنے گردوپیش پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ میری بائیسکل کا اگلا پہیہ بالکل الگ ہو کر لڑھکتا ہوا سڑک کے اس پار جا پہنچا ہے اور باقی بائیسکل میرے پاس پڑی ہے۔ میں نے فوراً اپنے آپ کو سنبھالا، جو پہیہ الگ ہو گیا تھا اُس کو ایک ہاتھ میں اٹھایا۔ دوسرے ہاتھ میں باقی ماندہ بائیسکل کو تھاما اور چل کھڑا ہوا۔ یہ محض ایک اضطراری حرکت تھی ورنہ حاشا وکلّا وہ بائیسکل مجھے ہرگز اتنی عزیز نہ تھی کہ میں اسکو اس حالت میں ساتھ ساتھ لئے پھرتا۔

جب میں سب کچھ اُٹھا کر چل دیا تو میں نے اپنے آپ سے پوچھا کہ "یہ تم کیا کر رہے ہو۔ کہاں جا رہے ہو۔ تمہارا ارادہ کیا ہے۔ یہ دو پہیے کاہے کو لئے جا رہے ہو۔"

سب سوالوں کا جواب یہی ملا کہ دیکھا جائے گا۔ فی الحال تم یہاں سے چل دو۔ سب لوگ تمہیں دیکھ رہے ہیں۔ سر اونچا رکھو اور چلتے جاؤ۔ جو ہنس رہے ہیں ان کو ہنسنے دو۔ اس قسم کے بیہودہ لوگ ہر قوم اور ہر ملک میں پائے جاتے ہیں۔ آخر ہوا کیا محض ایک حادثہ۔ بس دائیں بائیں مت دیکھو۔ چلتے جاؤ۔

لوگوں کے ناشائستہ کلمات بھی سنائی دے رہے تھے۔ ایک آواز آئی "بس حضرت غصّہ تھوک ڈالیے"۔ ایک دوسرے صاحب بولے "بے حیا بائیسکل گھر پہنچ کے تجھے مزہ چکھاؤں گا"۔ ایک والد اپنے لختِ جگر کی انگلی پکڑے جا رہے تھے۔ میری طرف اشارہ کر کے کہنے لگے "دیکھو بیٹا، یہ سرکس کی بائیسکل ہے۔ اس کے دونوں پہیے الگ الگ ہوتے ہیں"۔

لیکن میں چلتا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں آبادی سے دور نکل گیا۔ اب میری رفتار میں ایک عزیمت پائی جاتی تھی۔ میرا دل جو کئی گھنٹوں سے ایک کشمکش میں پیچ و تاب کھا رہا تھا اب بہت ہلکا ہو گیا تھا۔ میں چلتا گیا۔ چلتا گیا حتیٰ کہ دریا پر جا پہنچا۔ پُل کے اوپر کھڑے ہو کر میں نے دونوں پہیوں کو ایک ایک کر کے اس بے پرواہی کے ساتھ دریا میں پھینک دیا جیسے کوئی لیٹر بکس میں خط ڈالتا ہے اور واپس شہر کو روانہ ہو گیا۔

سب سے پہلے مرزا کے گھر گیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ مرزا بولے "اندر آ جاؤ"۔

میں نے کہا "آپ ذرا باہر تشریف لائیے۔ میں آپ جیسے خدا رسیدہ بزرگ کے گھر میں وضو کئے بغیر کیسے داخل ہو سکتا ہوں"۔

باہر تشریف لائے تو میں نے وہ اوزار اُن کی خدمت میں پیش کیا جو انہوں نے بائیسکل کے ساتھ مفت ہی مجھ کو عنایت فرمایا تھا۔

اور کہا۔

"مرزا صاحب آپ ہی اس اوزار سے شوق فرمایا کیجئے۔ میں اب اس سے بے نیاز ہو چکا ہوں"۔

گھر پہنچ کر میں نے پھر علمِ کیمیا کی اُس کتاب کا مطالعہ شروع کیا جو میں نے ایف اے میں پڑھی تھی۔

ایجنٹ اور خریداروں

سے

درخواست

آج کل کے خریداروں سے درخواست ہے کہ وہ اپنے منی آرڈر، پوسٹل آرڈر وغیرہ بزنس منیجر پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱ کے نام بھیجیں۔ مدیر "آج کل" کے نام نہ بھیجیں ورنہ پہنچنے کا اس میں تاخیر ہونے کا اندیشہ ہے۔ اسی طرح ایجنٹ حضرات مزید کاپیوں کے آرڈر اور وی۔ پی کی فرمائش اور ایجنسی کی شرائط کے بارے میں بھی بزنس منیجر سے رجوع کریں۔ البتہ اگر کوئی تاخیر ہو تو مدیر کو اپنے نمبر خریداری یا نمبر ایجنسی کے حوالے سے مطلع کریں۔

حضرت آوارہ
بڑی سرکار۔ مارہرہ (ضلع ایٹہ) اترپردیش

مونچھیں



(مضمون کے ساتھ اپنی زندگی کے "مختصر حالات" لکھنے کی فرمائش، میرے لئے آپ جانو کوزہ پیمودن ہے۔ بندہ پرور جس زندگی کو برتتے ہوئے کچھ کم تو ے برس ہونے کو آئے، اس کی روداد بیچ پوچھتے ہیں آپ تو اب یاد بھی نہیں۔ اتنا جانتا ہوں کہ شروع سن تیرہ سو آٹھ ہجری میں سیتاپور (اودھ) میں پیدا ہوا۔ نانی کی آغوش میں پرورش پائی۔ گیارہ میں ایک تھا۔ بڑے لاڈ پیار سے پالا گیا۔ مکتب کا وقت آیا کلام پاک ختم ہوا۔ اور دستور کے مطابق سعدی کی کریما سے فردوسی کے شاہنامہ تک فارسی، اور میزان الصرف سے متوسطات عربی کا درس نظامی پڑھا تھا، جو انگریزی شروع کرائی گئی۔ گورنمنٹ ہائی اسکول سیتاپور سے میٹرک کر کے جامعہ عثمانیہ میں تعلیم کی تکمیل کی۔ اس دور میں جن اساتذہ سے مجھے فیض پہنچا ان کا ذکر میری زندگی کا ایک مستقل باب ہے۔ نہایت تابناک۔ عمر نے وفا کی تو کبھی سناؤں گا۔

بی اے کا آخری پرچہ دے کر امتحان گاہ سے نکلا تھا اور ابھی قلم کی سیاہی سوکھنے نہ پائی تھی کہ حیدرآباد کے پوسٹ ماسٹر جنرل کا پرسنل اسسٹنٹ ہو گیا۔ پندرہ سولہ برس گذر گئے۔ اچانک ایک جانکاہ حادثے نے ملازمت سے کنارہ کش ہونے پر مجبور کر دیا۔ وطن کی سوجھی، آ گیا اور کچھ ہی دن بے کاری میں گزرے تھے کہ اوائل مئی ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا ریڈیو نئی دلی میں جا پکڑا گیا۔ قریب ایک چوتھائی صدی کے یہ زندگی گذار کر اب وطن میں چین کی بنسی بجاتا ہوں۔

لکھتا ہوں اور شکار کھیلتا ہوں۔ شکر ہے کہ سیاست اور شاعری سے بے بہرہ ہوں۔ اپنی خاندانی روایات کا سختی سے معتقد اور ہندوستان کا آزاد شہری ہونا میرے لئے فخر ہے۔

تفریحاً لکھا تو بہت کچھ ہے۔ اشاعت کا شوق نہیں۔ آتشیں جزیرہ، چڑیل، سفاک دلہن، اسرار ہند، اپنی صرح میں، اور بے چھپے۔ متعدد ڈرامے میرے اسباب حیات میں جھینگروں کا آذوقہ حیات بنے رکھے ہیں۔ خدا ہم دونوں کی مغفرت کرے۔
آوارہ)

میں اب تک اس غلط فہمی میں تھا کہ مونچھیں جو آج تک جنگ تین جیسی ساٹھ برس سے دم کے ساتھ چلی آ رہی ہیں، میری اپنی جائداد ہیں اور نائی کو چھوڑ کر، جسے صرف اتنی چھوٹ ملی ہے کہ ہر دوسرے تیسرے، وہ بھی اپنی رائے سے نہیں، میری مرضی کے مطابق ان کی نوک پلک ٹھیک کر دے، اور کسی کو ان کی کتر بیونت، کاٹ چھانٹ میں دخل دینے، مین میکھ نکالنے کا حق نہیں۔ ان کا آن داتا ہوں تو میں، پالن ہار ہوں تو میں، اور میرے اس پیدائشی حق میں کوئی ساجھی نہیں، یہ میری ہی اور صرف میری ہیں۔

چنانچہ میں ان مونچھوں کی شکست و ریخت میں اپنی من مانی کرتا رہا، اور کسی بڑے سے بڑے افلاطون خاں کو بھی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ اب ایک خدائی فوجدار، دخل در معقولات، مان نہ مان، میں تیرا مہمان قسم کا گروہ نکلا ہے جو لوٹ کھسوٹ اور ان مونچھوں پر بھی اپنا عملہ دخلہ جتاتا ہے۔

جب سے میں برت رہا ہوں، ان مونچھوں پر کئی دور بیتے ہیں۔ برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن، جو اوپر کے ہونٹ پر ریشمی رواں چھایا اور مسیں بھیگیں تب شبھ گھڑی نیک ساعت دیکھ کر کنبے برادری کی بیویوں کو بلاوا دیا گیا۔ سورج ڈھلنے سے پہلے کورے کونڈوں میں گرم گرم جلیبیاں بھر کے چوکیوں پر جما یا گیا۔ مہمانوں میں سب سے بڑی بوڑھی سہاگن نانی دادی نے نیاز دے کے پہلی جلیبی کھائی پھر باقی بیویاں جٹ پڑیں اور دم کے دم میں کونڈے صاف کر کے مبارک سلامت کہتی رخصت ہو گئیں۔

اس رسم نے گویا اعلان کر دیا کہ صاحبزادے نام خدا جوان ہو گئے۔ چڑھتا خون، مونچھوں کی فصل دن دونی، رات چوگنی بڑھنے لگی اور میں سوچتا رہا کہ انہیں کس سانچے میں ڈھالوں، اور چہرے کا کینڈا دیکھتے ہوئے کس فیشن کی پالوں۔ پڑوس میں ڈولی کا اڈا تھا۔ مونچھوں کے فرق سے اپنی اور ایک کہار کے چہرے کی کاٹ ملتی جلتی پائی۔ دس پندرہ دن کی لگاتار ایکشن میں اپنی مونچھوں کا روپ بھی وہی بن گیا، میری اور للتوا کہار کی مونچھیں جڑواں بہنیں دکھائی دینے لگیں۔ وہی کڑوے تیل سے چکنائے، چمکیلے بال، وہی نوکیں چھلے دار۔

کچھ دن بعد ایکا ایکی ان سے جی بھر گیا۔ جانتے ہیں آپ کیا کیا میں نے؟ ان چھلوں کو ریورس گیئر میں ڈال دیا۔ انگلیوں کے پورے سن پڑ گئے۔ تب کہیں ان چھلوں کے بل نکلے۔ نئے نمونے کی تلاش میں تھا جو اپنے ایک اسکول ماسٹر کی مونچھیں پسند آئیں۔ ماسٹر صاحب پڑھاتے کم تھے، کاسمیٹک کی بٹ دی ہوئی پچھیائی دُم مونچھوں کا رعب زیادہ جماتے

بیٹھے۔ یہ وضع قطع ممنوعہ تھی۔ کوسینگ کی جڑ سے بار بار جھگڑوں کی بارش چلنے لگی، اور ذکام نے ناک میں دم کر دیا۔ ناچار انہیں سلام کرنا پڑا۔ اب جو فیشن میں نے بدلا، اس سے مونچھوں کی شکل مثل بریکٹ جیسی بنتی تھی۔ اس کے لئے دونوں نوکیں اکھاڑ کر گالوں سے چپکانا، اوپر سے پٹی باندھنا پڑتی۔ یہاں کسی نے جانا نہیں کہ پٹی تلے کیا بھید ہے۔ ہونٹ پر بل کیوں۔ ملا ہمیں کسی نے پلستر باندھنے کی صلاح دی تو کسی نے آپریشن کرالینے کی۔ پٹی بندھتی رہی۔ پٹی کھلی تو تھے ٹھیٹ کی مونچھیں تیار تھیں۔ نہایت شاندار، بڑے رعب داب کی، قیصر ولیم کی مونچھوں سے ٹکر لینے والی۔

ارے صاحب ایک قانونی دوست سے ملاقات ہونے پر یہ خطرناک نکتہ کھلا کہ کلوری لوگوں کی یہ آن دار مونچھیں، انسانی کمزوری کے کسی نازک لمحے میں نقضِ امن اور جرم قابل دست اندازی پولیس بن سکتی تھیں، اور میں بیٹھے بٹھائے تعزیرات کی دفعہ فلاں کی رو سے، پہلے حوالات، پھر ترقی پاکے جیل خانے بھیجا جا سکتا تھا۔

سوچا۔ بات لگی ہوئی تھی۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ، ایک دم استرا پھروا دیا۔ یہ عمل مدتوں جاری رہا۔ شامت جو آئے تو دفعتاً ایک پنچنگ اٹھی کہ مونچھیں پھر سے پالی جائیں۔ اس فیصلے کا اعلان کرنا کیا تھا، بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنا تھا۔ جہاں تہاں کرکے دس بارہ شہری جھٹ ہی تو گئے۔ سب نے ایک آواز ہو کر کہا "بسنت کی کچھ خبر ہے جناب کو؟ آپ اب اپنے بس میں تھوڑا ہی رہے۔ بس میں ہیں۔ جگ بھاتا پہننا تو پڑتا ہی ہے۔ اب من بھاتا کھانے پر بھی ہم پنچوں کی مہر ہوگی۔ تب ہی نوالہ توڑنا ہوگا۔" ان میں سے ایک نے فرمایا "بارہ برس سے منڈنے والی مونچھیں اب تا عمر بار ہو گئیں۔ آپ نے رکھ لیں تو پنچوں کی آنکھ میں پھانس کی طرح کھٹکیں گی۔ اور بھی سنئے آپ نے مونچھیں پال لیں تو ہر جگہ اپنا حلیہ بدلوانا پڑے گا۔ پھر محلے بھر کے کتے آپ کو اجنبی جان کر بھونکیں گے۔ پچاس جگہ بیان حلفی دینا ہوگا کہ آپ ہی ہیں کوئی مشتاط ٹھگ آپ پر جاسوس ہونے کا شبہ کریں گے۔" اس پر سب نے مل کر ایک مسٹر سے کی ہاں میں ہاں ملائی اور نہ بھی پھر میں ایک بڑی کمزوری ہے، وہ یہ کہ میں امن پسند شہری ہوں۔ ان پنچوں کی دھونس میں آ گیا، مگر رہ رہ کے سوچتا ہوں کہ آخر یہ مونچھیں ہیں کس کی، میری یا ان پنچوں کی!

آنکے کو تو پنچوں کی دھونس میں آ گیا، مگر اپنی بے بسی پر اندر ہی اندر کڑھتا رہا۔ سوچا تھانے میں رپٹ کر دوں، اور مونچھوں میں خوامخواہ در معقولات کے ارتکاب پا اور کسی دفعہ کے تحت قرقی کرا کے ان پنچوں کی مُشکیں کسوا دوں۔ پھر یوں کے کہنے ایک منشی جی سے مشورہ کیا جنہوں نے حق الحق کے طور پر بڑے شاہی جتیا کے بتایا کہ مداخلت بے جا کا معاملہ ہوتا تو آپ کا کیس سولہ آنے ہرا تھا مگر دخل در معقولات کے بارے میں قانون ساکت ہے کہ آپ پنچوں کا بال بیکا کر سکیں گے۔ پھر بڑی اپنایت سے شہری تعلقات کا رشتہ جتا کر فرمایا "اس مشورہ کی فیس نہ لوں گا، آپ ہمارے صاحب سے مل لیں۔ وہ عدالت کو زیچ کر دینے کے بادشاہ ہیں، ایسے ایسے قانونی گُر اور نایاب چٹکلے انہیں از بر ہیں کہ ایک نہ ایک داؤں سے آپ کے حریف کو یوں چاروں شانے چت کر دیں گے کہ پریوی کونسل تک آپ کا بول بالا رہے گا اور آپ خم ٹھونک کے اپنی من مانی مونچھیں پالنے میں آزاد ہوں گے۔"

منشی جی کی بات کچھ جچی نہیں۔ "صاحب" کے چنگل میں پھنس کر جیب ہلکی ہونے کا مزید خطرہ تھا۔

انتقام کی آگ بھڑکتی رہی اور میں مونچھوں کے غم میں جھلستا رہا جو نہ وہ بابندہ۔ اب کے ایک بڑے مقدمہ باز، بلکہ یوں کہیے کہ مقدمہ ساز سے اپنا دکھڑا رونے کا موقع ملا۔ ساری داستان گہری آنکھوں سے سن کر بے ساختہ فرمایا "پنچوں کے فیصلے پر خاموش بیٹھنے میں تمادی عارض ہونے کا اندیشہ ہے۔ فوراً احتجاج کیجئے۔" احتجاج اگرچہ خاصا بھاری بھرکم لفظ ہے مگر ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں۔ اسے برتنے اور عمل میں لانے کی ڈھنگ بالکل کورا ہوں۔ وضاحت چاہی، طریقہ پوچھا۔ کہنے لگے "اپنے حق کے لئے آواز اٹھانے، رفع حاجت کے لئے بگڑ جانے کو احتجاج کہتے ہیں۔ دو گرہ کالے کپڑے کی دھجی بازو پر باندھئے اور گلی گلی، کوچے کوچے "مونچھیں زندہ باد" کے نعرے لگاتے پھریے۔ اپنا مہرہ دو نمبر اکرنا ہو تو دو چار رُپے کا خرچہ نہ کیجئے۔ آس پاس کے دس بارہ مادر پدر آزاد لونڈوں کو پھکی دے کے اپنا ہم نوا بنائیے اور سمجھ لیجئے کہ بازی جیت لی۔"

تجویز بظاہر سولہ آنے کارگر تھی مگر امن عامہ میں خلل ڈالنے، یا دماغی توازن کھو بیٹھنے کی پاداش میں اپنی پیدائشی آزادی سے ہاتھ دھونے کی ہمت نہ ہوئی۔ آدمی تھے قیافہ شناس، تیور دیکھ کے تاڑ گئے کہ یہ بس کی بات نہ تھی۔ بولے "اچھا احتجاج کی کڑیاں آپ نہیں جھیل سکتے، جانے دیجئے۔ دوسرا سستا نہایت مجرب نسخہ بتاتا ہوں۔ بھوک ہڑتال۔ سورج نکلنے سے پہلے ڈٹ کر ناشتہ کرنا اور پنچوں کی چوپال کے سامنے چبوترے پر آلتی پالتی مار کے چپ چاپ بیٹھ جانا۔ دن چڑھتے چڑھتے شہر میں بات پھیل جائے گی۔ اپنے پرائے ہمدردی کرنے لگیں گے۔ فاقہ کشی کے لئے پنچوں پر دباؤ پڑے گا اور شام ہوتے ہوتے آپ پھر سے مونچھ پالنے کا پروانہ لے کر ہار پھول سے لدے ہوئے گھر آ چکیں گے۔"

میں نے کہا "یہ بھی تو ممکن ہے کہ میں بھوک کا کچا ہوں، دوپہر تک بیٹھک نہ سنبھال سکوں گا۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ کھانا دیر سے ملنے پر بچوں کی کہن سال ماں کے لئے طلاق ہونٹوں تک آ کے لوٹی ہے" انہوں نے اپنے مشورہ کی یوں توہین ہوتے دیکھ کے جھلا گئے اور بولے "یہ نہیں، وہ نہیں، اللہ مجھے جائیں جہنم میں، تمہیں اتنا کچھ چھینا جاتا تو اپنا اشرفی تولنے کا وقت کبھی ضائع نہ کرتا"

الغرض دن سرکتے گئے اور گتھی نہ سلجھی۔ لب لباب یہ کہ ایک دن جیسے الہام ہوا، دیوانِ حافظؔ نکالا اور دل میں کہا کہ ان رحمۃ اللہ علیہ سے بھی مشورہ کر دیکھوں۔ شاید کہ ہمیں بعینہٖ برآرد بال۔ بڑے خشوع خضوع سے فاتحہ کا ہفت خواں سر کیا اور شاخِ نبات کے ہزاروں واسطے دے کر فال طلب کی۔ دل دھڑک رہا تھا۔ ہاتھ میں لرزش تھی جو دیوان کھلا، اور صفحے کی پہلی ہی سطر میں ع مژدہ اے دل کہ مسیحا نفسے می آید۔ ع مردے از غیب بروں آید و کارے بکند کی خوشخبری دیتا ہوا یہ مصرع نکلا۔

اس "مردے از غیب" کے انتظار نے دماغ میں قیامت کی ہلچل ڈال دی، یعنی ع جو کوئی بولا صدا کانوں میں آئی آپ کی۔ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا "وہ آیا" کہہ کے لپکا۔ ڈاکیہ تھا۔ بیرنگ خط لایا تھا۔ لاحول ولا قوۃ۔ پھر زنجیر کھڑکی۔ اس بار حلال خور تھا۔ دوپہر کی روٹی لینے آیا تھا۔ اسی طرح کئی بار مردے از غیب کے سلسلے میں گھن چکر بنا رہا، قریب تھا کہ صبر کا پیالہ چھلک جائے۔ اور حافظ جی کا دیوان دریا برد کر دوں جو دروازے پر کسی نے دستک دی۔ منہ سے کچھ اول فول نکلنے کو تھا جو سنائی دیا "آداب میاں جی" باہر آیا۔ میرا دیہی کاشتکار کریم بخش کھڑا تھا۔ "کیا ہے کریم بخش" "دہائی ہے میاں جی، بیگھا بھر گوبھی کی پود لگائی تھی۔ نکاول کا مکھیا اللہ بندے کنوئیں پہ بیٹھا ہے، پانی روک رکھا ہے، پود مرجھا کے زمین ناپنے لگی ہے، چل کے پانی دلوا دیجئے۔"

مکھیا شوریدہ پشت تھا، فوجداری کی نوبت آتی تو اپنا دامن بھی الجھنے کا ڈر تھا، جانا پڑا۔ قضیہ رفع دفع ہوا۔ وہ کسی کام نکل آئے، اور حافظ جی کا مردے از غیب "توہین" سے اتر گیا۔

شہر میں کہاں تو مونچھوں کو ترس گیا تھا یا اب گاؤں کی فضا میں اُدھر کریم بخش کا کھیت شاداب ہوا، اُدھر میری مونچھیں چمکیں۔ پانی کو دیکھ کر جیسے مرگی کا دورہ پڑتا ہے، ویسے ہی بچوں کو نہ دیکھ کر مجھے کبھی نئے سرے سے مونچھیں پالنے کی ہڑک اٹھتی اور اس بار نئے ماحول کی سوجھی یعنی تھنوں کے عین نیچے ناک کے ہونٹ کے بیچ ریخ اتنا سا جو گرا ہوتا ہے آسے چھوڑ کر دائیں بائیں ادھر ادھر صفا کروا دیے۔ نہ پوچھئے اس دن کی بے پایاں مسرت جب آئینے میں ہونٹ کا گوشہ بالوں سے بھرا پایا، گھر آیا۔ رات

تھی، اطمینان کی نیند سویا۔ سویرے منہ ہاتھ دھو کے سودا سلف لانے بازار سے گزرتے ہوئے یہ مژدہ سنا کہ پرانے بچوں کی ٹولی ٹوٹ گئی اور ایک ایک سے بچھڑ جانے پر چھینے جھپٹے کتراکے نکل گئے۔

ایک گلی میں کئی لونڈے گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے۔ ایک نے ٹھٹک کے غور سے مجھے دیکھا اور پکار کے اپنے ساتھی سے کہا "ابے چھتّو دیکھ مونچھ منڈے آ گئے" چھتّو بولا "اندھا ہے بے۔ تو نے کیا دیکھا۔ ان کی مونچھ نے بچہ دیا تھا" اس پر سب نے قہقہہ لگایا اور میں یہ کہتا ہوا جھٹک کر منہ پھٹ لونڈے ہیں، آغا تو نہیں"

اب سوال جواب طلب ہے کہ کارِ مجدد کسی کو کبڑا تھا یا گو کبھی تصور بھی میں "مردے از غیب" نے جنم لیا تھا؟

"آج کل" کے سالانہ چندے میں رعایتیں

طلبا، اساتذہ اور کتب خانوں کو "آج کل" کے سالانہ، دوسالہ اور سہ سالہ چندے میں ۲۵ فی صدی کی رعایت دی جائے گی۔ یعنی اُن سے حسب ذیل چندہ لیا جائے گا۔

سالانہ۔ سات روپے پچاس پیسے	(۷٫۵۰)
دوسالہ۔ بارہ روپے پچھتر پیسے	(۱۲٫۷۵)
سہ سالہ۔ اٹھارہ روپے	(۱۸٫۰۰)

طلبا اور اساتذہ کو احتیاطاً پرچہ گھر کے پتہ سے منگوانا چاہیے۔ انہیں اپنے تعلیمی ادارے سے ایک تصدیق نامہ بھیجنا ہوگا کہ وہ اس ادارے سے وابستہ ہیں۔

مزید براں "آج کل" کے سالانہ خریداروں کو پبلی کیشنز ڈویژن کی مطبوعات پر پانچ روپے یا اس سے زائد قیمت کے آرڈر پر بیس فیصدی رعایت دی جائے گی۔

ترسیل زر کا پتہ

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دلی ۱۱۰۰۰۱

کرشن چندر

وی فلیٹس۔ ایور فلورینٹ فرانسس ایونیو سانتا کروز ویسٹ بمبئی ۵۴

ولادت لاہور ۱۹۱۴ء تعلیم میٹرک تک کشمیر میں جہاں والد ڈاکٹر تھے۔ ایم اے انگریزی، فورمین کرسچین کالج لاہور اور ایل ایل بی گورنمنٹ کالج لاہور سے۔
انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھنا شروع کیا۔ اردو افسانوں کا پہلا مجموعہ "طلسمِ خیال" ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ دو برس تک آل انڈیا ریڈیو میں کام کیا۔ پھر شالیمار اسٹوڈیو پونا میں اسکرین پلے رائٹر کے طور پر شامل ہوئے۔ پونا سے بمبئی منتقل ہوئے اور وہیں فلمی دنیا میں رچ بس گئے۔
ابھی تک کرشن چندر نے کوئی اسّی کتابیں لکھی ہیں جن میں چھتیس ناول، چوبیس مجموعے کہانیوں کے، بارہ ڈرامے اور چھ طنزیہ مزاحیہ کتابیں ہیں۔
ان کی کتابیں دنیا کی ساٹھ زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں اور وہ یورپ اور ایشیا کے مختلف ممالک حتیٰ کہ چین کا بھی دورہ کر چکے ہیں۔
کرشن چندر کو "پدم بھوشن" اور نہرو سوویت لینڈ ایوارڈ سے نوازا جا چکا ہے۔ [illegible]

پرہیز

میں نے دیکھا ہے کہ قدرت ہر حال میں اپنا توازن برقرار رکھتی ہے۔ ہم نے زکام، نزلہ، بخار اور نمونیا کے لئے پنسلین ایجاد کی تو قدرت نے پنسلین ہی کو مہلک بنا دیا۔ اب اتنے لوگ نمونیا سے نہیں مرتے جتنے پنسلین سے مرتے ہیں!۔

ہم نے اربوں روپے خرچ کر کے عالمگیر پیمانے پر ملیریا کو ختم کر دیا تو کینسر کا مرض وبائی صورت اختیار کر گیا۔ ہم نے تپ دق کا شافی علاج دریافت کر لیا تو دل کا عارضہ عام ہو گیا۔ جسے دیکھئے اپنے سینے کے بائیں طرف ہاتھ رکھے متوحش نگاہوں سے ڈرا سہما دکھائی دیتا ہے۔ میرے دوستوں میں ہر چوتھا دوست دل کا مریض ہے۔ پہلے دل کی بیماری میں صرف آہ و بکا کی جاتی تھی۔ اب جان بھی جاتی ہے۔

دل کا عارضہ رنج و غم کرنے سے بڑھتا ہے۔ اسی لئے ساری دنیا کے ہارٹ اسپیشلسٹ یہی کہتے ہیں کہ اگر دل کے عارضے سے محفوظ رہنا چاہتے ہو اور لمبی عمر پانا چاہتے ہو تو رنج و محن کو کبھی اپنے قریب پھٹکنے نہ دو ہمیشہ خوش رہا کرو۔ اس لئے اب میں ہمیشہ خوش رہتا ہوں۔ گزشتہ سال میرے والد کا انتقال ہو گیا تو میں برابر مسکراتا رہا۔ احباب تعزیت کو آتے رہے مگر میں مسکراتا رہا۔ نہ جانے انہوں نے کیا سمجھا مگر میں تو ڈاکٹر کے کہنے پر عمل کر رہا تھا۔ پھر جب چھ ماہ بعد میری خالہ محترمہ کا انتقال ہوا تو میں خوش رہنے کے لئے ایک پکچر ہاؤس میں ایک طربیہ فلم دیکھنے چلا گیا۔ پچھلے دنوں میرے گھر میں آگ لگ گئی تو میں خوشی سے قہقہے لگانے لگا۔ میری بیوی نے سمجھا شاید میں پاگل ہو چکا ہوں۔ مگر جب میں نے اسے سمجھایا کہ میں پاگل نہیں ہوں بلکہ خوش ہوں اور خوش بھی اس لئے ہوں کہ اس سے عمر بڑھتی ہے تو اس نے پاگل خانے لے جانے والی ایمبولینس واپس کر دی۔ مگر میں دیکھ رہا تھا وہ ایمبولینس واپس کر دینے پر کچھ خوش نظر نہیں آتی۔

فکر کو دور رکھنے اور دل کو ہمیشہ خوش رکھنے کے علاوہ آج کل ڈاکٹر لوگ اور خصوصاً ہارٹ اسپیشلسٹ دل کی بیماری کے مریضوں یا ہونے والے مریضوں کو وزن گھٹانے کا مشورہ بھی دیتے ہیں۔ ڈاکٹروں کی رائے میں طویل عمر پانے کا ایک ہی نسخہ ہے۔ اپنا وزن گھٹا دو۔ مجھے اس دلیل میں وزن نظر آتا ہے۔ کیونکہ میں نے سنا ہے مجنوں لیلیٰ کے مر جانے کے بعد بھی بہتر برس زندہ رہا! میں نے سنا ہے اور فلموں میں بھی دیکھا ہے کہ اس کا وزن اتنا کم تھا کہ جب اُسے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا ہوتا تو اس کے دوست اور احباب محض ایک پھونک مار کر اُسے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیتے تھے۔ ایک بار زور کی پھونک لگ جانے سے وہ اپنی منزل سے کچھ دور دریا میں گر پڑا۔ مگر ڈوب نہ سکا کیونکہ اس کا وزن پانی سے بھی کم تھا۔ پھر ایک مچھلی نے پھونک ماری اور وہ واپس اپنے احباب کے پاس پہنچ گیا۔ اس کا گریبان ہمیشہ چاک رہتا تھا۔ کیونکہ اس کا تنِ ناتواں کپڑوں کا بوجھ نہ سہار سکتا تھا۔ لیلیٰ کے مرنے کے بعد مجنوں نے کئی بار مرنے کی کوشش کی مگر ہمیشہ ناکام رہا۔ ڈوب وہ نہ سکا۔ زہر کھایا تو زہر سیال بن کر اس کے جسم سے نکل گیا اس لئے کہ زہر کا وزن مجنوں کے وزن سے زیادہ تھا۔ ایک بار مجنوں نے ایک کانٹے سے ایک پتلا دھاگا لٹکا کر پھانسی گلے میں لگا کر مر جانے کی سوچی۔ دس سال تک وہ اس دھاگے سے بندھا کانٹے سے لٹکا رہا۔ مگر اس کی جان نہ نکلی۔ کیونکہ اس کا وزن دھاگے اور کانٹے دونوں سے کم تھا۔ پھر ایک دن ایک لڑکے نے اس دھاگے کو مچھلی پکڑنے کا دھاگا سمجھ کر پانی میں لٹکا دیا۔ جہاں مجنوں کو ایک مچھلی نے نگل لیا لیکن وہ اسے ہضم نہ کر سکی۔ کیونکہ ہضم کرنے کے لئے بھی وزن چاہئے۔ اس لئے مجنوں پھر پانی کی سطح پر اگل دیا گیا۔ لوگ باگ کہتے ہیں۔ مگر میں نہیں جانتا۔ خدا جانے کہاں تک سچ ہے۔ مگر سبھی دیوانے اور فرزانے بھی کہتے ہیں کہ مجنوں آج بھی زندہ ہے۔ کچھ لوگوں کو دیکھ کر تو گمان

ہوتا ہے اس کہانی میں اور کوئی صداقت ہو نہ ہو، اتنا ضرور واضح ہو جاتا ہے کہ آدمی وزن گھٹانے سے دل کی بیماری سے محفوظ رہتا ہے۔ دوسرے عوارض اس پر اس لئے حملہ نہیں کرتے کہ انہیں حملہ کرکے ملے گا کیا! اس لئے درازیٔ عمر کی دعا کرنے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ اپنا وزن گھٹا لیا جائے۔

وزن گھٹانے سے پہلے یہ معلوم کرنا بہت ضروری ہے کہ وزن بڑھتا کیسے ہے؟ پہلے یہ خیال عام تھا کہ وزن آپ ہی آپ بڑھتا ہے اور بچپن سے بڑھاپے تک ایک خاص مقدار اور رفتار سے بڑھتا رہتا ہے۔ پہلے یہ خیال عام تھا۔ اب یہ خیال خام ہے۔ اب ڈاکٹروں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وزن خود بخود نہیں بڑھتا نہ زیادہ اور عمدہ کھانوں سے بڑھتا ہے۔ جس گھر میں اچھا باورچی یا اچھا کھانا پکانے والی بیوی ہوگی اس گھر کے مالک کو دل کا عارضہ کسی وقت بھی ہو سکتا ہے۔ یہ لازم ہے کہ اگر آپ دل کے عارضے میں مبتلا نہیں ہونا چاہتے تو ایسا باورچی یا ایسی بیوی لائیے جو کھانا پکانا نہ جانتی ہو۔ اس لئے آجکل طلاق عام ہو رہے ہیں اور پھوہڑ بیویوں کو ترجیح دی جانے لگی ہے اور اچھا کھانا پکانا اور اصلی گھی استعمال کرکے اپنے شوہر کو کھلانا بیویوں کی خامی اور نقائص میں شمار کیا جانے لگا ہے۔ پرسوں میں نے اخبار میں ایک مقدمے کی روداد پڑھی جس میں شوہر نے اپنی بیوی پر زہر دینے کا الزام لگایا تھا۔ تفتیش کرنے پر معلوم ہوا کہ بیوی اپنے شوہر کو اصلی گھی میں کھڑے مصالحے کا قورمہ تیار کرکے کھلاتی تھی! عدالت نے مجرمہ کو چھ سال قید با مشقت کی سزا دی ہے کیونکہ ملزمہ اپنے شوہر کو اصلی گھی ہی نہیں کھلاتی تھی صبح ناشتے میں ایک گلاس اصلی دودھ بھی زبردستی پلاتی تھی تاکہ اس کے شوہر کا وزن بڑھ جائے اور وہ وزن بڑھ جانے سے دل کے عارضے میں مبتلا ہو کر جلدی مر جائے۔ لیکن آج کل کے جج عاقل اور دانش مند ہوتے جا رہے ہیں۔ پہلے پوسٹ مارٹم پر ڈاکٹروں کی رائے طلب کی جاتی تھی۔ اب سنا ہے عدالت فیصلہ سنانے سے پہلے اس قسم کے وزن بڑھانے والے کیس پر ڈاکٹر کی رائے بھی لیتی ہے اور اسے ناطق سمجھا جاتا ہے۔ سنا ہے کہ آل انڈیا میڈیکل ایسوسی ایشن نے ایک ایسی تجویز حکومت کے سامنے رکھی ہے کہ جو عورت اپنے شوہر کو اصلی گھی کھلائے، اصلی دودھ پلائے اور مرغن کھانے کھلائے اُسے فوراً پھانسی دے دی جائے! لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ وزن صرف اصلی گھی کھانے اور اصلی دودھ پینے اور گوشت کے مرغن کھانوں ہی سے نہیں بڑھتا۔ وزن دراصل غذا میں نشاستہ کی زیادتی سے بڑھتا ہے اور نشاستہ آلو میں سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ جوں جوں لوگ آلو زیادہ کھاتے جاتے ہیں وزن ان کا بڑھتے جاتے ہیں۔ اس لئے اگر وزن کم کرنا ہے تو آلو مت کھائیے۔

نشاستہ روٹی میں بھی ہوتا ہے اور ڈبل روٹی میں تو اصلی روٹی سے بھی ڈبل ہوتا ہے۔ اسی لئے تو اُسے ڈبل روٹی کہا جاتا ہے۔ اس لئے جہاں تک ہوسکے روٹی سے اجتناب کیجئے۔ پہلے زمانے میں لوگ روزی روٹی کے لئے تگ و دو کرتے تھے اور دونوں کو حاصل کرکے موٹے ہو ہوکر مر جاتے تھے۔ اب صرف روزی کے لئے تگ و دو کیجئے اور روٹی کو بالکل ہی بھول جائیے۔ نشاستہ اس لئے بھی بُرا ہے کہ یہ انسان کے جسم میں پہنچ کر ایک خاص کیمیاوی عمل سے شکر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور شکر کی زیادتی سے ذیابیطس ہوتی ہے جس سے اکثر قلب کا دورہ شروع ہو جاتا ہے۔ نشاستہ انسان کے جسم میں پہنچ کر اس قدر ناشائستہ ہوگا، اس کا مجھے علم نہ تھا۔ آج سے چائے میں شکر بند۔ مٹھائی بند اور آئس کریم بھی ختم!

پروٹین بھی انسان کو موٹا کرتی ہے۔ کیونکہ اس میں وہ اجزا ہوتے ہیں جو گوشت بناتے ہیں۔ اس لئے زندہ رہنے کے لئے پروٹین کو بھی کم کرنا ہوگا۔ گندم میں پروٹین ہوتی ہے۔ سرخ گوشت میں پروٹین ہوتی ہے۔ سفید گوشت میں البتہ پروٹین کم ہوتی ہے۔ جیسے مرغی کا گوشت یا مچھلی۔ آج کل اچھی مرغی آٹھ روپے سے کم میں نہیں آتی۔ اس لئے اگر آپ کی تنخواہ دو سو پچاس روپے ہے تو اس میں سے دو سو چالیس روپے مرغی پر صرف کیجئے۔ اور دس روپے ہر ماہ بچا لیجئے۔ اور جناب مہینے میں دس روپے کی بچت کچھ کم نہیں ہوتی۔ فرض کیجئے کہ آپ اس طرح سو سال زندہ رہیں اور ہر ماہ دس روپے بچاتے رہیں تو ذرا سوچئے کہ آپ کے مرنے کے بعد آپ کے کتنے رشتہ داروں کا بھلا ہوگا۔

گٹھیا بھی دل کا دشمن ہے۔ گٹھیا کا عارضہ جس میں جوڑوں میں درد ہوتا ہے اور وہ سوج جاتے ہیں، یہ ابتدا ہے دل کے دورے کی اور گٹھیا یورک ایسڈ کی زیادتی سے پیدا ہوتا ہے یعنی جسم کا اندرونی نظام جسے انگریزی میں میٹابولزم کہتے ہیں آپ ہی آپ یورک ایسڈ زیادہ پیدا کرتا ہے اور وہ چیزیں یورک ایسڈ پیدا کرتی ہیں وہ ہیں دالیں، مٹر، پھلیاں، سرخ گوشت وغیرہ۔ یاد رکھئے کہ آپ شکر بند کر چکے ہیں۔ دودھ مکھن آپ پر حرام ہے۔ اب سب طرح کی دالیں مع مٹر بند ہو چکیں تو آپ کیا کھائیں گے؟ غم کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آرام اور اطمینان سے سوچئے کہ غم کھانے سے بھی عمر کم ہوتی ہے اور آپ لمبی عمر پانا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹروں کی رائے یہ ہے کہ آپ دن کو لوکی کھائیے اور رات کو پالک کا ساگ اور اصلی گھی کی جگہ سورج مکھی کے بیجوں کا تیل استعمال کیجئے۔ بہتر یہ ہوگا کہ سورج کو بھی چھوڑ دیجئے صرف مکھی کا تیل استعمال کیجئے۔ دن کو لوکی رات کو ساگ۔ اے میری موت اور بھاگ! اور اگر آپ کو لوکی اور پالک کے ساگ اور سورج مکھی کے بیج کے تیل سے نفرت ہے تو صرف پانی

پیجئے۔ اس میں تھوڑا سا سنگترے کا رس ملا لیجئے دل کو زیادہ کام کرنا پڑتا ہے، اس لئے نمک بھی مت کھائیے۔ اس کی جگہ صرف سنگترے کا رس پانی میں ڈال کر پیجئے۔ مہاتما گاندھی جی بھی اکیس دن کے فاقے کے بعد یہی کرتے تھے۔ پانی اور سنگترے کا رس۔ بس!

لمبی عمر پانے کا مجھے بھی بچپن سے شوق رہا ہے اور اچھے کھانے کا بھی بچپن سے شوق رہا ہے لیکن دونوں شوق ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے اس لئے میں نے وزن گھٹانے کے لئے نشاستہ بند کر دیا اور وہ تمام روٹیاں اور سبزیاں بھی جن میں نشاستہ ہوتا ہے۔ پھر میں نے مٹھائی کھانا بند کیا۔ آئس کریم کو چھونے سے انکار کر دیا۔ شروع گوشت سے پرہیز کیا۔ آلو مٹر، پھل والی سبزی بھاجی۔ آہستہ آہستہ خوراک کم کرتے کرتے میں صرف پانی اور دو چمچے اورینج جوس پر آگیا۔

دو ہفتے اس خوراک پر کسی نہ کسی طرح زندہ رہ کر جب میں ڈاکٹر کے پاس پہنچا تو اس نے مجھے وزن تولنے والی مشین پر لا کھڑا کیا۔ معلوم ہوا اس پرہیز کے بعد بھی میرا وزن دس پونڈ بڑھ چکا تھا۔

ڈاکٹر کے چہرے پر ایک خطرناک سنجیدگی کی لہر آئی۔ اسٹیتھسکوپ کو میرے دل پر رکھتے ہوئے بولا: "کیا کھاتے رہتے ہو!"

میں نے کہا: "پانی میں تھوڑا سا اورنج جوس ڈال کے پیتا رہا ہوں۔"

"یہی تو خرابی ہے تم میں" ڈاکٹر میرے سینے کو اپنے انگوٹھے سے ٹھونکتے ہوئے بولا۔ "وزن بڑھ گیا ہے۔ سنگترے کے رس میں بڑے قوی اجزا ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں تم صرف پانی پیو۔ ایک ہفتے میں تمہارا وزن کم ہو جائے گا۔ موجودہ حالات اور صحت بے حد خطرناک ہے۔ تمہیں کسی وقت بھی دل کا دورہ پڑ سکتا ہے! اگلے ہفتے آنا!"

گھر آ کر میں نے بیوی سے کہا کہ آئندہ سے میں صرف پانی پیا کروں گا۔ صرف پانی پی کر جیا کروں گا۔ صبح ناشتے میں ایک کپ پانی۔ لنچ پر ایک گلاس پانی۔ رات کو دو گلاس پانی۔ ایک ہفتے میں وزن آپ ہی آپ کم ہو جائے گا۔ بیوی نے بھی خوش ہو کر اس پر صاد کیا۔ کیونکہ اس طریقے پر عمل کرنے سے کچن کا خرچ بہت کم ہو گیا تھا۔

ایک ہفتے کے بعد جب میں پھر ڈاکٹر کے پاس گیا تو معلوم ہوا کہ محض پانی پینے سے میرا وزن دو پونڈ اور بڑھ چکا ہے! ڈاکٹر حیرت میں پڑ گیا۔ بولا: "تم نے کچھ اور تو نہیں کھایا؟ پلیز سچ سچ بتا دو۔"

"مطلق نہیں ڈاکٹر صاحب! آپ فون کر کے میری بیوی سے پوچھ سکتے ہیں۔"

"پانی پینے کا گلاس صاف ستھرا تھا؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"جی ہاں سوڈے سے دھلوا دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "پہلے دھلواتا پھل اور اپنے سامنے نل کا پانی نکلوا کر پیتا ہوں۔"

"پھر وزن کیوں بڑھ گیا؟" ڈاکٹر نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے کہا: "جب آپ جانتے ہیں بمبئی کے پانی میں پانی کے سوا سب کچھ ہوتا ہے۔ نل کھولئے تو کبھی پانی کی پتلی دھار کے ساتھ مچھلی چلی آ رہی ہے۔ کبھی گھونگھے۔ کبھی چوہے۔ کبھی کیکڑے۔ ایسی ایسی مقویات پائی جاتی ہیں کہ آدمی اگر اس پانی کو پیئے تو ناممکن ہے کہ موٹا نہ ہو۔"

"تو آئندہ سے پانی چھان کر پیجئے۔" ڈاکٹر نے بڑی سختی سے کہا۔ "سولہ روپے نکالو میری فیس کے!"

میں نے سولہ روپے جیب سے نکال کے ڈاکٹر کی ہتھیلی پر رکھے اور گھر چلا آیا اور گھر آ کر بیوی سے کہا کہ وہ میرے لئے کوفتے مصالحے کا گوشت تیار کرے۔ چکن۔ ریشمی کباب۔ تیتر کے تکے۔ قیمے بھرے پراٹھے اور آخر میں ایک پاؤ آئس کریم! رات کو سونے سے پہلے بالائی والے دودھ کا ایک گلاس بھرا ہوا جس میں بادام اور کشمش اور چھوارے بھی پڑے ہوں اور پستہ بھی! بیوی نے گھبرا کر کہا: "تمہارا کیا ارادہ ہے؟ اپنی جان دینے کا؟ بارہ پونڈ وزن تمہارا پہلے سے بڑھ چکا ہے۔ اب صرف چھنا ہوا پانی پیو۔ بلکہ ابال کر پیو!"

میں نے کہا: "مرنا تو ہر حال میں ہے۔ میں جیسے کہتا ہوں تم ویسے کرو۔"

دوسرے دن میں نے اس سے کہا: "آج کے مینو میں تندوری مرغ، تلی ہوئی پام فریٹ، چکن بریانی اور لہسن سے بگھارا ہوا دہی کا رائتہ اور آلو کے پراٹھے اور بعد میں بنارسی حلوائی والے کے ہاں سے موہن بھوگ کی ایک پلیٹ! ادھر کھانے میں اصلی گھی استعمال ہو۔ ورنہ تازہ مکھن۔" سات دن میں نے اسی طرح کا پرہیز رکھا اور خوب ڈٹ کر کھایا۔ بیوی مسلسل احتجاج کرتی رہی۔ اس نے اپنے میکے والوں کو خط لکھ دیا کہ وہ جلد کوئی بری خبر سننے کے لئے تیار رہیں! اور میرے تمام دوستوں کو خبردار کر دیا کہ انہوں نے مجھے جو قرضے دے رکھے ہیں وہ جلد سے جلد اس کا تقاضا کریں ورنہ بعد میں وہ اس کی ذمہ دار نہ ہوگی!

سات دن مرغن غذائیں کھانے کے بعد جب میں نے ڈاکٹر کے کہنے پر وزن تولنے والی مشین پر پاؤں رکھا تو میرا وزن بارہ پونڈ کم ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر کے چہرے پر ایک مطمئن تبسم نظر آیا: "میں کہتا نہ تھا۔ موٹا کرنے والی، وزن بڑھانے والی تمام اشیا چھوڑ دو۔ تمہارا وزن خود بخود کم ہو جائے گا۔ دیکھا آج وزن بارہ پونڈ کم ہے! اور چہرے پر کیسی رونق ہے! جوا انتظامیہ پرہیز اور ڈاکٹر کا کہا ماننے سے آتی ہے۔ نکالو فیس سولہ روپے!"

کنہیا لال کپور
پرنسپل، ارجن داس کالج دھرم کوٹ، (فیروزپور) پنجاب

جہلستان

تاریخ پیدائش ۲۷ جون ۱۹۱۰ء مقام۔ ضلع لائل پور کا ایک گمنام گاؤں۔
والد کا نام۔ لالہ ہری رام کپور۔ تعلیم ایم۔ اے انگلش، یہ امتحان ۱۹۳۲ء میں گورنمنٹ کالج لاہور کے طالب علم کی حیثیت سے پاس کیا۔ وہاں ہی سید احمد شاہ بخاری پطرس کا شاگرد ہونے کی سعادت حاصل یا نصیب ہوئی۔

پہلی تصنیف "سنگ و خشت" (۱۹۴۲ء) مکتبہ جدید لاہور نے شائع کی۔ باقی تصنیفات "شیشہ و تیشہ" (۱۹۴۴ء) "چنگ و رباب" (۱۹۴۶ء) "نوک نشتر" (۱۹۴۹ء)۔ "بال و پر" (۱۹۵۲ء) "نرم گرم" (۱۹۵۷ء) "گرد کارواں" (۱۹۶۰ء) "گستاخیاں" (۱۹۶۶ء)۔ زیرِ طبع "نازک خیالیاں"۔

حلیہ: قد پانچ فٹ گیارہ انچ، وزن ۶۰ کلو، جسم دبلا لمبا ٹوٹکا، رنگ گندمی۔
عمر ۶۳ ½ سال، طنز و مزاح کے متعلق نظریہ، اُلّو لفظ استعمال کئے بغیر کسی کو اُلّو کہنا طنز ہے، اپنے یا غیر پر ہنسنا مزاح ہے ——— مشاغل: کتابیں اکٹھی کرنا، لمبی سیر کرنا، غزلوں کو اپنے بھونڈے ترنم سے پڑھنا، خدا، احباب اور حکومت کو کوسنا۔

کنہیا لال کپور

جہلستان میں جسے کچھ لوگ جہالت نشان بھی کہتے تھے بہت سی چیزیں اور اشخاص عجیب و غریب تھے۔ ایسے دو پائے تھے جن پر چوپایوں کا گمان ہوتا تھا۔ ایسے وکلا تھے جن میں اور جیب کتروں میں بظاہر کوئی فرق نہ تھا۔ ایسے حکیم تھے جو دُکھتی آنکھ کے مریض کو آنکھ نکلوا دینے کا مشورہ دیتے تھے۔ ایسے ڈاکٹر تھے جو مُہلک سے مُہلک مرض سے بھی زیادہ خطرناک تھے۔ ایسے سادھو اور ملنگ تھے جو پچھلے چوبیس سال سے درختوں کے ساتھ لٹکے ہوئے تھے اور جنہیں جب نیچے اُترنے کے لئے کہا جاتا تو کہتے ہم لٹکنے کی سلور جوبلی مناکر ہی اتریں گے۔ ایسے اسکول اور کالج تھے جن میں تعلیم پانے کے بعد بھلا چنگا طالب علم وحشی بن جاتا تھا۔ تاہم جہلستان کا سب سے بڑا عجوبہ "حزبِ اختلاف" تھا جسے دیکھ کر امیر خسرو کا یہ مصرع بے اختیار زبان پر آجاتا تھا ع

بسیار خوباں دیدہ ام اما تو چیزے دیگری!

"حزبِ اختلاف" نے دارالعوام کی ایک سو ایک نشستوں کے لئے ایک سو ایک اُمیدوار کھڑے کئے تھے۔ بدقسمتی سے سات امیدواروں کے علاوہ جو کامیاب ہوئے باقی سب کی ضمانت ضبط ہوگئی تھی۔ اُسے اس شکست سے اتنی مایوسی نہیں جتنی کہ حیرانی ہوئی تھی۔ کیونکہ اُس نے اپنے الیکشن مینی فیسٹو میں برسرِ اقتدار آنے کے بعد ملک میں کلّی مساوات لانے کا وعدہ کیا تھا۔ اُس نے ببانگِ دہل اعلان کیا تھا:۔

— "ہم وعدہ کرتے ہیں اگر حکومت کی باگ ڈور ہمارے ہاتھ میں آگئی تو ملک میں مساوات کا دور دورہ ہوگا۔

ہر گھر میں ایک جیسے خد و خال رکھنے والے بچے پیدا ہوا کریں گے۔ تمام شوہروں کی ایک جیسی خوبصورت یا بدصورت بیویاں ہوں گی۔ سب لوگ ایک جیسے عالی دماغ یا بد دماغ ہوں گے۔ جملہ مریض ایک جیسے امراض میں مبتلا ہوا کریں گے۔ ہر ایک شخص کو فنونِ لطیفہ پر یکساں دسترس حاصل ہوا کرے گی۔ تمام گھروں میں چوہوں، بلیوں اور چمگادڑوں کی ایک جیسی تعداد ہوگی۔ سب افراد ایک جیسی عمر پایا کریں گے۔ کمانڈر اور سپاہی کو ایک جیسی تنخواہ ملا کرے گی۔"

اس مینی فیسٹو کے باوجود جو اچھا خاصہ "سبز باغ" تھا، جب "حزبِ اختلاف" کو عبرتناک شکست ہوئی تو اُس نے اپنی خجالت مٹانے کے لئے طرح طرح کے دلائل کا سہارا لیا۔ کہا کہ پولنگ افسر بے ایمان تھے۔ ووٹر بے شعور تھے۔ ووٹوں کی گنتی کرنے والے حساب میں کمزور تھے۔ مزید کہا، ہم اس شکست کا انتقام حکراں پارٹی سے "مخالفت برائے مخالفت" کے اصول پر عمل کر کے لیں گے۔ چنانچہ آئے دن اُس اور سرکار میں اس قسم کی جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔

سرکار: "سورج مشرق میں طلوع اور مغرب میں غروب ہوتا ہے۔"

"حزبِ اختلاف": "ہم اس حقیقت کو تسلیم کر لیتے اگر آپ نے اسے بیان نہ کیا ہوتا۔ اب تو ہم یہی کہیں گے سورج جنوب مشرق میں طلوع

اور شمال مغرب میں غروب ہوتا ہے۔"

"شور و غل مچانے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔"

"مسائل کو حل کرنا آپ کا کام ہے۔ ہمارا فرض صرف شور و غل مچانا ہے۔"

"تاریکی کو کوسنے کی بجائے یہ بہتر ہے اُسے دُور کرنے کے لئے ایک چھوٹی سی شمع روشن کی جائے۔"

"ہم آپ کے ساتھ متفق نہیں۔ ہمارا خیال ہے تاریکی کو دُور کرنے کے لئے اُسے صرف کوسنا کافی ہے۔"

"ناؤ اگر منجدھار میں پھنس جائے تو متحدہ کوشش سے اُسے بچانا چاہیے اگر وہ ڈوبے گی تو سب ڈوبیں گے۔"

"بے شک ہم بھی ڈوبیں گے لیکن ہمیں مسرت ہوگی کہ آپ بھی تو ڈوبیں گے۔"

"حزبِ اختلاف" کے صرف دو تکیہ ہائے کلام تھے۔ پہلا یہ کہ ہر مصیبت کے لئے چاہے وہ آسمانی قہر کیوں نہ ہو، حکومت ذمّہ دار ہے۔ دوسرا، سرکار کو فوراً مستعفی ہوجانا چاہیئے۔

ایک سال قدرت نے "حزبِ اختلاف" کی اس طرح امداد کی کہ ملک میں بارش بالکل نہ ہوئی۔ بہت سے علاقوں میں سوکھا پڑ گیا۔ "حزبِ اختلاف" نے اس کی ذمّہ داری سرکار کے سر تھوپتے ہوئے کہا۔ ہمیں معتبر ذریعہ سے پتہ چلا ہے کہ ہماری سرکار نے امسال دیدہ دانستہ بارش ہونے نہیں دی۔ بادلوں کو غیر ممالک میں برآمد کیا گیا تاکہ بدیسی سکّہ کمایا جا سکے۔ جنتا فاقہ کشی کرنے پر مجبور ہوگئی۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ سرکار کو فوراً مستعفی ہوجانا چاہیئے۔

اس سے اگلے سال اتنی زبردست بارش ہوئی کہ جگہ جگہ سیلاب آنا شروع ہوگئے۔ "حزبِ اختلاف" کو ایسا موقع خدا دے۔ اس نے سرکار میں عدمِ اعتماد کی تحریک پیش کرتے ہوئے الزام لگایا۔ غیر معمولی بارش کے لئے سرکار ذمّہ دار ہے۔ اس نے غیر ممالک سے اتنی تعداد میں بادل درآمد کئے کہ کثرتِ باراں کی وجہ سے سیلاب آئے۔ ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ حکومت کو فوراً استعفےٰ دیدینا چاہیئے۔

جب آبادی کے بڑھنے اور پیداوار کے گھٹنے کی وجہ سے ضروریاتِ زندگی بہت گراں یا کمیاب ہوگئیں تو "حزبِ اختلاف" نے حسبِ دستور سرکار کو آڑے ہاتھوں لیا۔ جب اُس سے پوچھا گیا۔ کیا ایسی صورتِ حال کئی دیگر ممالک میں نہیں پائی جاتی تو اس نے کہا ہمیں اس سے سروکار نہیں کہ دوسرے ممالک میں صورتِ حال ہمارے ملک سے بدتر ہے۔ ہم اس بات سے کیا تسلّی حاصل کرسکتے ہیں کہ اگر ہم پریشان ہیں تو دوسرے بھی تو پریشان ہیں۔

دو سال کے دوران "حزبِ اختلاف" نے سرکار میں عدمِ اعتماد کی آٹھ تحریکیں پیش کیں جب وہ سب رد ہوگئیں اور اس کے مسلسل تقاضوں کے باوجود سرکار مستعفی نہ ہوئی تو اس نے ایک نئے حربے کا سہارا لیا۔ غیر مطمئن عوام کو اُکسانا اور ہڑتال کا فرض ادا کرنا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بات بات پر ہڑتالیں ہونے لگیں۔ ایک برات کو جو بلا ٹکٹ سفر کر رہی تھی پولیس نے حراست میں لے لیا۔ پولیس کے اس ناجائز رویّے کے خلاف ہڑتال کی گئی۔ انجن میں خرابی کی وجہ سے ایک ایکسپریس ٹرین لیٹ ہوگئی۔ ریلوے کے خلاف ہڑتال کرنے کا اعلان کیا گیا۔ ایک شہر میں آوارہ کتّوں اور سانڈوں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا۔ کتّوں اور سانڈوں کے خلاف ہڑتال کی گئی۔

جب ہڑتالوں سے بھی "حزبِ اختلاف" کو اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی، اُس نے ایک ملک گیر "بندھ" کے اہتمام کا فیصلہ کیا۔ اس کے لئے بڑے زور شور سے پراپیگنڈا کیا گیا۔ کہا گیا۔ یہ "بندھ" ملک کی تمام مشکلات کا واحد حل ثابت ہوگا۔

یہ آخری بندھ ہوگا۔ اس کے بعد ملک میں ہر چیز کی فراوانی ہوجائے گی۔ نایاب یا کمیاب چیزوں کے گلیوں اور بازاروں میں ڈھیر لگ جائیں گے۔ چونکہ یہ بندھ اپنی نوعیت کا پہلا بندھ تھا لوگوں کو تلقین کی گئی کہ اسے کامیاب بنانے کے لئے وہ ایک خاص دن اور خاص وقت اپنے اپنے گھروں کو آگ لگا دیں تاکہ سرکار کو پتہ لگے کہ وہ کتنے بے چین اور مضطرب ہیں۔

جنتا "حزبِ اختلاف" کے بھرے میں آگئی اُس نے مقررہ تاریخ اور وقت پر اپنے گھروں کو نذرِ آتش کر دیا۔ "آگ کچھ ایسی لگی گھر کا ہر اِک تنکا جل گیا" کے مصداق تمام چیزیں جل کر سیاہ ہوگئیں۔

اب چاروں طرف راکھ ہی راکھ کے ڈھیر تھے اور بھوکی ننگی اور بے حال جنتا تھی۔ فانی بدایونی نے جب یہ نظارہ خلدِ بریں سے دیکھا تو انہیں بے ساختہ اپنا ایک شعر یاد آگیا۔

بہلا نہ دل، نہ تیرگیِ شامِ غم گئی
یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

یوسف ناظم

وائی-۲-۹۳ بی ڈبلیو ڈی کالونی، باندرہ ایسٹ بمبئی ۵۱

آئینے میں



یوسف ناظم خود ساختہ نام ہے۔ اصلی نام سید محمد یوسف ہے اور ناظم تخلص، ادب کے میدان میں، شاعری کے راستہ سے داخلہ ملا۔ جالنہ ضلع اورنگ آباد وطن ہے۔ ۱۹۴۴ء میں جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد سے اردو ادب میں ایم اے کرنے کے بعد، حیدرآباد کے محکمۂ لیبر میں مترجم کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ ریاستوں کی تقسیم کے بعد مہاراشٹر میں منتقل عمل میں آئی اس وقت مہاتما گاندھی میموریل اسپتال بمبئی میں ڈپوٹیشن پر پرسونل PERSONNEL آفیسر ہوں۔

ادبی زندگی کا آغاز سنجیدہ نظم گوئی سے ہوا، مزاح نگاری بعد میں اختیار کی۔ طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کے اب تک چار مجموعے چھپ چکے ہیں۔ پہلا مجموعہ "کیف و کم"، ادارۂ ادبیاتِ اردو، حیدرآباد سے شائع ہوا جس کا دوسرا ایڈیشن مبین بکڈپو دلی سے چھپا۔ دوسرا مجموعہ "ذکر فٹ نوٹ" نصرت بکڈپو لکھنؤ، تیسرا مجموعہ "دیباچہ" نقشِ کوکن پبلی کیشن بمبئی اور چوتھا مجموعہ "زیرِ غور" ہنستا حاتا پبلی کیشن بمبئی سے شائع ہوا۔ "زیرِ غور" کی اشاعت پر حکومتِ مہاراشٹر کی جانب سے پچھلے سال ایوارڈ دیا گیا۔ ایک مضمون "جنونِ لطیفہ" ثانوی اسکول کے نصاب میں بھی شامل ہے۔ منتخب مضامین کا مجموعہ "کاک ٹیل" اور خاکوں کا مجموعہ "سایے اور ہمسایے" کے نام سے زیرِ طباعت ہے۔

یوسف ناظم

دنیا میں کوئی ایسا خوش نصیب ملک نہیں ہے جہاں ادیب پیدا نہ ہوتے ہوں۔ بہت سے ملک ایسے ہوتے ہیں جہاں ادیبوں کو فرش وغیرہ پر بیٹھنے نہیں دیا جاتا۔ انہیں وہاں کے لوگ ہمیشہ سر آنکھوں پر بٹھائے رکھتے ہیں۔ ان ادیبوں کو بھی لوگوں کے سروں پر بیٹھے رہنے کی اتنی عادت ہوتی ہے کہ پھر کہیں اور بیٹھ ہی نہیں سکتے۔ بہت سے ملک ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں ادیبوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے اور ان کا بچا کھچا حصہ ان کے ورثا کو بڑی مشکل سے واپس ملتا ہے، بلکہ بعض صورتوں میں تو یہ حصہ بھی میونسپلٹی کے حصے میں آتا ہے۔ اب یہ ادیب کی قسمت پر منحصر ہے کہ وہ کہاں پیدا ہوتا ہے۔ اگر اس کے ہاتھ کی لکیریں اچھی ہیں اور اس کے والدین سعادت مند ہیں تو وہ یقیناً ایسے ملک میں پیدا ہوگا جہاں خرافات لکھنے پر باز پرس نہیں کی جاتی ——— ادیبوں کے بہت سے حقوق ہوا کرتے ہیں جن میں سے چند حقوق پیدائشی ہوتے ہیں۔ خرافات لکھنا، پیدائشی حقوق کی فہرست میں آتا ہے۔ اچھا ادیب وہ ہوتا ہے جو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دے۔ دودھ خود پی لے اور پانی اپنے پڑھنے والوں کی خدمت میں پیش کر دے۔

اچھا ادیب اُسے بھی مانا گیا ہے جو قلم توڑ دے لیکن اس ادیب کے ساتھ مشکل یہ ہوتی ہے کہ وہ ایک قلم توڑ کر چپ نہیں بیٹھ جاتا بلکہ دوسرے قلم سے لکھنا شروع کر دیتا ہے اور لوگ کہتے ہیں وہی پچھلے والا قلم غنیمت تھا۔ لیکن جو قلم ٹوٹ گیا، ٹوٹ گیا۔ سمجھ دار لوگ اسی دوسرے قلم سے نکلی ہوئی تحریر کو صبر و شکر کے ساتھ سہہ لیتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ کم سے کم یہ قلم تو نہ ٹوٹے۔

ادیب کو ہمیشہ لگن سے لکھنا چاہیے۔ لوگ چاہے کتنا ہی منع کریں، لکھنے سے کبھی ہرگز باز نہ آئے۔ لوگ خود ہی عادی ہو جائیں گے۔ یوں بھی لوگوں میں مدافعت کا مادّہ کم ہی ہوتا ہے اور جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ ادیبوں کے مقابلے میں استعمال نہیں کیا جاتا۔ جو ادیب اس سہولت سے فائدہ نہیں اٹھاتے وہ غبی ہوتے ہیں۔

ادیبوں کی صحبت کے کئی فائدے ہیں۔ ان میں سے ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ مشتبہ قسم کے لوگ اگر ادیبوں کی صحبت میں بیٹھیں تو انہیں کوئی بھی نہیں پہچان سکتا۔

عام آدمیوں کی طرح ادیبوں کی بھی دو ٹانگیں ہوتی ہیں لیکن انکی ایک ٹانگ ہمیشہ اونچی رہتی ہے۔ غیر ادیبوں کو یہ اعزاز حاصل نہیں ہے۔ مساوات ہر معاملے میں اچھی بھی نہیں معلوم ہوتی۔ ادیب کی اس اونچی ٹانگ کو گھسیٹنا مشکل ہے۔ ادیبوں کی ناک بھی خلافِ معمول اونچی ہوتی ہے اور اس ناک کو اونچا رکھنے کے سلسلے میں ادیب راستہ چلتے وقت نیچے نہیں دیکھا کرتے۔ البتہ بعد میں صرف یہ دیکھ لیتے ہیں کہ گرنے پر انہیں زیادہ چوٹ تو نہیں لگی۔ ادیب کی ناک پر مکھی بھی نہیں بیٹھ سکتی۔ خود مکھیوں کو بھی اس

قاعدے کا علم ہے اور وہ اپنے بیٹھنے کے لئے کسی اور معقول شخص کی ناک کا انتخاب کر لیتی ہیں۔ آرام دہ نشستوں کی اس وسیع دنیا میں کمی نہیں ہے۔

پہلے زمانے میں سنتا ہے ادیب پیدائشی ہوا کرتے تھے اور جس گھر میں یہ پیدا ہو جاتے اس گھر میں پہلے ہی دن سے سونا پھلنا شروع ہو جاتا۔ لیکن اب قدرت کو والدین پر رحم آنے لگا ہے۔ اب ہر گھر میں صرف آدمی پیدا ہوتے ہیں۔ البتہ آگے چل کر ان میں سے کچھ ادیب بن جاتے ہیں۔ اپنے اپنے کرتوت ہیں۔ اس کی ذمہ داری اب قدرت پر نہیں ڈالی جا سکتی۔

ادیبوں کے پاؤں میں سنیچر ہوتا ہے اور سر میں ہوا یعنی بالکل پھپھلی۔ ادیبوں میں ایک بات اچھی ہوتی ہے کہ یہ جو کچھ لکھتے ہیں خود نہیں پڑھتے۔ اگر خود پڑھ لیں تو آئندہ کبھی نہ لکھیں۔ یہ اسی سے ڈرتے ہیں اور دوسروں کا لکھا بھی نہیں پڑھتے۔ اس کے باوجود اگر ان کے خیالات کسی اور کے پراگندہ خیالات سے ٹکرا جائیں تو اس میں ان کا قصور نہیں ہوتا، نظام شمسی کا ہوتا ہے۔ جو نظام شمسی ادیبوں کے مشورے کے بغیر بنے گا اس میں یہی خرابی ہوگی ——— اگر ادیبوں کے خیالات کسی وجہ سے ایک دوسرے سے نہ ٹکرائیں تو ادیب خود ٹکرا جاتے ہیں۔ ادیبوں ہی کی دیکھا دیکھی کئی ملکوں میں بل فائٹنگ اور گھونسہ بازی کے مقابلے مقرر کئے جاتے ہیں۔

ادیب دیکھنے میں بے ضرر نظر آتے ہیں لیکن یہ اندر ہی اندر بڑے جنگجو ہوتے ہیں۔ تحریر و تقریر کی آزادی کے لئے انہوں نے پانی پت اور واٹرلو کی کئی لڑائیاں لڑی ہیں۔ ان لڑائیوں میں جب بھی اور جہاں بھی ادیب جیتے ہیں وہاں ہر قسم کے ادب کے ڈھیر کے ڈھیر لگ گئے اور اقوام و افراد بے بس ہو کر رہ گئے ہیں۔ بعض ملکوں میں ادیبوں کو لکھنے پر اور بعض ملکوں میں نہ لکھنے پر انعامات دیئے جاتے ہیں۔ کس میں نقصان اور کس میں فائدہ ہے ابھی تک طے نہیں ہوا ہے۔ یوں بھی ادیبوں کے سلسلے میں کوئی بات طے ہو بھی نہیں سکتی۔ ظلم اور ادب ہمیشہ غیر محدود رہے ہیں۔

بعض ادیب بے حد بے دردی سے لکھتے ہیں اور کاغذ پر اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیتے ہیں۔ اس صورت حال کی وجہ سے پڑھنے والا کچھ بھی نہیں پڑھ سکتا۔ خود اس کا کلیجہ بھی منہ کو آ جاتا ہے اور بڑی مشکل سے واپس جاتا ہے۔

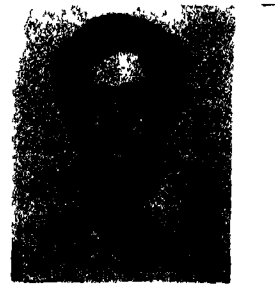
ادیبوں کو لکھنے سے جب بھی فرصت ملتی ہے وہ اور زیادہ لکھتے ہیں۔ وہ اصل میں اس شخص کی طرح ہوتے ہیں جو لیٹے لیٹے تھک جاتا ہے تو اور آرام کرتا ہے۔ ادیب بھی جب ایک چیز لکھتے لکھتے تھک جاتا ہے تو دوسری چیز لکھنے لگتا ہے اور پہلے کے لکھے ہوئے علمی مضمون کے صفحے بعد کے لکھے ہوئے سیاسی مضمون کے صفحوں میں مل جاتے ہیں اور ادیب کو فرصت نہیں ملتی کہ انہیں چھانٹ سکے۔ پڑھنے والوں کی قسمت میں یہی دو رنگی مضمون ہوتا ہے۔ ایڈیٹر اس مضمون کو صرف اس لئے چھاپ دیتا ہے کہ اس کی سمجھ سے بالاتر ہوتا ہے۔ ادب کی ترویج و اشاعت کے لئے ضروری ہے کہ ہر وہ مضمون جو سمجھ میں نہ آئے ہر حال میں چھاپا جائے۔ اخباروں اور رسالوں میں صرف اشتہارات اچھے بھی نہیں معلوم ہوتے۔ ایک آدھ مضمون رہنا ہی چاہئے۔

بہت سے ادیب تعمیراتی ادب لکھتے ہیں۔ تعمیراتی ادب وہ ہوتا ہے جس میں نفرت کی دیواریں کھڑی کی جائیں، نفاق کی خلیجیں پیدا کی جائیں اور رائی کے پربت بنائے جائیں۔ ایسا ادب بہت جلد مقبول ہو جاتا ہے۔ اس ادب کا معقول معاوضہ بھی لیا جاتا ہے۔ معاوضے کی رقم عام طور پر دساور سے منگوائی جاتی ہے۔

ادیب سکون و اطمینان کے متلاشی ہوتے ہیں۔ امن و سلامتی ان کا آدرش ہوتا ہے۔ اس امن کی تلاش میں کئی ادیب کسی اسٹیج پر جمع ہو کر تبادلۂ خیال کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ کا تبادلۂ خیال کئی برسوں کے لئے کافی ہوتا ہے۔ جو ادیب اس تبادلۂ خیال کے بعد صحیح و سالم پائے جائیں ان کے بارے میں سمجھ لینا چاہئے کہ وہ اسٹیج پر موجود نہیں تھے۔

مجتبیٰ حسین
۲۱۹۔ ایشیا ہاؤس۔ کستور با گاندھی مارگ۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۱

مرزا کی یاد میں



مرزا تیس سال تک سرکاری ملازمت سے وابستہ رہنے کے بعد پرسوں ریٹائر ہو گئے۔ میں اُن سے ملنے گیا تو گلے سے لگ گئے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ میں نے کہا "مرزا بھلا یہ بھی کوئی رونے کا موقع ہے۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیئے کہ تیس سال تک عملاً کوئی کام کئے بغیر تم نے سرکاری ملازمت بحسن و خوبی انجام دی۔ پھر رونا کیسا ؟" وہ بولے "یار تم ایک سرکاری ملازم کے دل کا درد کیا جانو۔ تمہیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ دُنیا کے سارے افرادِ زندگی میں صرف ایک بار مرتے ہیں لیکن سرکاری ملازم تین مرتبہ مرتا ہے۔"

میں نے پوچھا "وہ کیسے ؟"

وہ بولے "جب وہ سرکاری ملازمت میں داخل ہوتا ہے تو اُس کی پہلی موت واقع ہوتی ہے اور جب وہ وظیفہ پر علیحدہ ہوتا ہے تو اُس کی دوسری موت واقع ہو جاتی ہے اور تیسری موت طبعی ہوتی ہے۔"

میں نے کہا "مرزا مر مر کے جیے جانا بھی تو ایک فن ہے۔"

بولے "فن تو خیر ہے لیکن یہ بھی سوچ لو کہ لوحِ تربت پر وفات کی کتنی تاریخیں کندہ کروانی پڑتی ہیں۔ گویا لوحِ تربت نہ ہوئی ایک اچھی خاصی فائل ہو گئی۔"

میں نے مرزا کو تسلی دی اور واپس چلا آیا۔

مرزا کا شمار اُن سرکاری ملازمین میں ہوتا تھا جو بہت زیادہ سرکاری ملازم ہو گئے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ وہ پیدائشی سرکاری ملازم تھے۔ کیونکہ بچپن ہی سے وہ ہر کام کو پینڈنگ (PENDING) رکھنے میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ جب طالب علم

پیدائش: ۱۵ جولائی ۱۹۳۶ء۔ تعلیم بی۔ اے۔ ڈی۔ پی۔ ایم (عثمانیہ)
تصانیف: "شیشہ و تیشہ" (رشاد صدیقی کے مزاحیہ کالموں کا انتخاب) "تکلف برطرف" "قطع کلام" "قصہ مختصر" "بہرحال" (زیرِ طبع)
حالاتِ زندگی: حیدرآباد کے مقبول روزنامہ "سیاست" کے مزاحیہ کالم "شیشہ و تیشہ" کے ذریعہ ۱۲ اگست ۱۹۶۲ء کو دن میں ٹھیک ۱۰½ بجے مزاح نگاری شروع کی۔ دس سال تک حکومت آندھرا پردیش کے محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ سے وابستہ رہا۔ اب مرکزی حکومت کی فروغِ اردو کمیٹی کے شعبۂ ریسرچ سے وابستہ ہوں اور دہلی میں مقیم ہوں۔ سات سال تک حیدرآبادی مزاحیہ نگاروں کی تنظیم "زندہ دلانِ حیدرآباد" کا جنرل سکریٹری رہا۔ ۱۹۶۶ء میں مزاح نگاروں کی جو پہلی کل ہند کانفرنس حیدرآباد میں منعقد ہوئی تھی اس کا جنرل سکریٹری رہ چکا ہوں۔
کمزوری: پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی، کرشن چندر اور مشتاق احمد یوسفی۔
مشاغل: مزاح نگاروں کے اجتماعات منعقد کرانا، دوستوں میں اپنی عمرِ عزیز کا قیمتی وقت ضائع کرنا، خطوط کے جوابات نہ دینا، اپنے سائے سے آپ ڈر جانا، دوسروں کی مشکلات کو اپنی مشکلات جاننا اور خود مشکلات میں گھر جانا، علی الصباح گھر کو واپس ہونا اور علی الصباح گھر سے نکل جانا۔ (مجتبیٰ حسین)

تھے تو نہ صرف اِن کا ہوم ورک پینڈنگ رہتا تھا بلکہ اسکول کی فیس بھی پینڈنگ رہا کرتی تھی۔ سوائے شادی کے انہوں نے اپنی زندگی کا ہر کام پینڈنگ رکھا۔ اُن کے ہاں ہر کام "تھرو پراپر چینل" ہوا کرتا تھا۔ اس "تھرو پراپر چینل" پر مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا کہ مرزا نے ایک بار اپنے دفتر میں ایک مزاحیہ ادبی محفل آراستہ کی اور مجھ سے ایک مزاحیہ مضمون پڑھنے کو کہا۔ مرزا کا معاملہ تھا سو میں چلا گیا۔ اب جو میں نے مضمون پڑھنا شروع کیا تو محسوس ہوا کہ سامعین بالاقساط ہنس رہے ہیں۔ کبھی کچھ لوگ ہنستے ہیں تو کبھی کچھ۔ کبھی اِس گوشے سے ہنسی کی آواز آتی ہے تو کبھی اُس گوشے سے۔ جیسے ہی میں نے مضمون ختم کیا مرزا سے شکایت کی کہ میرے مضمون پر تمہارے دفتر کے لوگوں نے یوں بالاقساط ہنسنے کی سازش کیوں کی ؟ اِس پر مرزا نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "یار تم کیا جانو کہ دفتری قواعد کیا ہوتے ہیں۔ ہم تو بس "تھرو پراپر چینل" ہنس رہے تھے۔ تمہارے مضمون پر پہلے ہمارے سکریٹری صاحب ہنستے تھے۔ اس کے بعد ڈپٹی سکریٹریز نے ہنسنے کی باری آتی تھی۔ پھر اسسٹنٹ سکریٹریز ہنستے تھے اور تب کہیں یہ ہنسی سپرنٹنڈنٹس تک پہنچتی تھی اور تم جانتے ہو کہ سپرنٹنڈنٹس کسی بھی معاملہ کو دبا دینے میں کتنی مہارت رکھتے ہیں۔ اگر خوش قسمتی

قسمتی سے سپرنٹنڈنٹ نہیں دیتے تو ہم کلرکوں کی باری آتی تھی۔"

میں نے کہا "یار! اس کا ایک سادہ سا حل ہے یہ تو برش پینسل کو بھی عبور کر سکتی ہے؟ "تھرو پراپر چینل" کی کیا اہمیت ہے"۔

وہ بولے "تمہیں کیا معلوم کہ دفتری قواعد کی رُو سے آدمی برٹش چینل کو تو بہ آسانی عبور کر سکتا ہے لیکن "تھرو پراپر چینل" کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔"

مرزا زندگی بھر "تھرو پراپر چینل" کے چکر میں پھنسے رہے اور اس حد تک پھنسے رہے کہ اگر گھر میں ان کا سب سے چھوٹا بچہ شرارت کرتا تو اسے "تھرو پراپر چینل" مارنے کے لئے وہ پہلے اپنی بیوی کو پیٹتے پھر بڑے لڑکے کو اور علی الترتیب اپنی ساری اولادوں کے گالوں پر طمانچے رسید کرتے ہوئے اپنے چھوٹے بچے کے گال تک پہنچتے تھے۔

مرزا یہ سمجھتے تھے کہ دنیا کا ہر کام "روٹین کورس" میں ہوتا ہے۔ ان کے سامنے دنیا کا کوئی مسئلہ پیش ہوتا تو اسے "روٹین کورس" کے حوالے کر کے مطمئن ہو جایا کرتے تھے۔ اسی "روٹین کورس" میں مرزا نے گیارہ بچے پیدا کئے۔ اسی "روٹین کورس" میں وہ بیوی سے مسلسل پچیس سال تک لڑتے جھگڑتے رہے۔ اسی "روٹین کورس" میں وہ دس ہزار کے مقروض ہو گئے۔ غرض مرزا تیس سال تک ہر روز ایک ہی قسم کا کام انجام دیتے ہوئے خود ایک "روٹین کورس" میں تبدیل ہو گئے تھے۔ مرزا کا سب سے بڑا سرکاری فریضہ یہ تھا کہ ہر روز رجسٹرِ حاضری میں دستخط کریں۔ رجسٹرِ حاضری میں دستخط کرنے سے پہلے مرزا کی حالت بالکل وہی ہوتی تھی جو انڈا دینے سے پہلے مرغی کی ہوا کرتی ہے۔ رجسٹرِ حاضری میں دستخط کر دینے کے بعد مرزا یوں سمجھتے تھے جیسے وہ دن بھر کے سارے فرائض منصبی سے عہدہ برآ ہو چکے ہوں۔

میں نے ایک دن اُن سے پوچھا "بھئی جب تم کوئی کام کرتے ہی نہیں ہو تو پھر رجسٹرِ حاضری میں دستخط کرنے کا تکلف کیوں کرتے ہو؟"

وہ بولے "یار! میں کام کرنے کے لئے رجسٹرِ حاضری میں دستخط نہیں کرتا بلکہ دستخط کرنے کو ہی سب سے بڑا کام سمجھتا ہوں۔ میں تو رجسٹر میں دستخط صرف اس لئے کرتا ہوں کہ اس طرح دنیا میں میرے موجود رہنے کا کوئی ثبوت تو باقی رہے ورنہ تاریخ کے اتنے بڑے دھارے میں اور اتنی بڑی کائنات میں کون یہ دیکھتا ہے کہ مجھ جیسا ادنیٰ کلرک زندہ بھی ہے یا مر گیا۔ میں تو صرف اپنے زندہ رہنے کی حاضری دلواتا ہوں۔ یوں بھی حکومت جو تنخواہ مجھے دیتی ہے اس میں آدمی صرف دستخط ہی کر سکتا ہے۔ اس سے زیادہ کچھ کرنے کا معاوضہ الگ ہوتا ہے جو حکومت مجھے نہیں دیتی۔ اب تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کروں؟"

رجسٹرِ حاضری میں دستخط کرنے کے بعد مرزا کو ہمیشہ بڑی شدت سے چائے کی طلب ہوا کرتی تھی لہٰذا وہ کسی ایسے شخص کو تلاش کرنے نکل جاتے جو انہیں چائے پلا سکے۔ جب بارہ بجے وہ اپنی سیٹ پر پہنچتے تو انہیں لنچ کا خیال آنے لگتا تھا۔ درمیانی وقفے میں وہ اپنی فائلوں پر سے گرد جھاڑتے اور انہیں سونگھ کر پھر اپنی جگہ پر رکھ دیتے تھے۔ مرزا کے پاس فائلیں اتنے طویل عرصے تک رہا کرتی تھیں کہ اُن کی اصل بو تو کہیں غائب ہو جاتی تھی اور ان میں سے مرزا کی بو آنے لگتی تھی۔ ان کے ساتھی صرف فائلوں کو سونگھ کر یہ پتہ چلا لیتے تھے کہ کون سی فائل مرزا کی ہے اور کون سی نہیں۔

فائلوں کی گرد جھاڑنے سے فرصت ملتی تو وہ تھوڑی دیر کے لئے اپنی کرسی پر محض اس خیال سے بیٹھ جاتے کہ اس عمل سے بھی ان کی کرسی صاف ہو جایا کرتی تھی۔ کرسی کے صاف ہونے تک لنچ کا وقفہ آ جاتا تھا اور مرزا اپنی ٹوپی میز پر چھوڑ کر لنچ کے لئے نکل جاتے تھے

میں مرزا سے ملنے جب بھی اُن کے دفتر پر جاتا تو ہمیشہ انکی ٹوپی سے ہی ملاقات ہوا کرتی تھی۔ میں اکثر اس ٹوپی کو اٹھا کر دیکھ لیتا کہ شاید مرزا ٹوپی کے نیچے موجود ہوں مگر مجھے ہمیشہ ٹوپی خالی ہی ملی۔

مرزا کا لنچ دنیا کا طویل ترین لنچ ہوا کرتا تھا حالانکہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مرزا کے توشے میں دو سے زیادہ چپاتیاں نہیں ہوتی تھیں بلکہ اکثر اوقات تو وہ اپنے وقار کو برقرار رکھنے کے لئے خالی توشہ دان ہی لایا کرتے تھے۔

میں ان سے پوچھتا "مرزا دو چپاتیاں کھانے کے لئے تمہیں تین گھنٹے کیوں درکار ہوتے ہیں؟"

اس پر وہ کہتے "بھئی دو چپاتیاں تو میں دو منٹ میں کھا لیتا ہوں لیکن بعد کے سارے وقت میں جگالی کرتا رہتا ہوں۔ آخر غذا کو ہضم کرنے کے لئے بھی تو کچھ وقت درکار ہوتا ہے۔"

مرزا کے لنچ سے واپس آنے تک چار بج جایا کرتے تھے اور یہ وقت حالات حاضرہ پر تبادلۂ خیال کرنے کے لئے بہت موزوں ہوتا ہے اور پھر مرزا کو گھر واپس جانے کی تشویش بھی تو کرنی پڑتی تھی

ان کی نظر ہمیشہ گھڑی پر لگی رہتی۔ دن کے کسی بھی عرصہ میں اگر کوئی ان سے وقت پوچھتا تو مرزا اپنی گھڑی کی طرف دیکھ کر نہایت وثوق سے کہتے کہ بھئی وقت کیا پوچھتے ہو دفتر کے برخاست ہونے میں ابھی تو پورے چار گھنٹے پچیس منٹ باقی ہیں۔

مرزا نے ساری زندگی اسی طرح گذاری۔ دفتر کے برخاست ہونے کا وقت دیکھ دیکھ کر لیکن انہوں نے کبھی گھڑی میں جھانک کر یہ نہ دیکھا کہ ایک دن وہ خود دفتر سے برخاست ہونے والے ہیں۔

مرزا کی میز پر بھانت بھانت کی فائلیں رکھی رہتی تھیں اور ان کا بیان تھا کہ فائلوں کے اس انبار سے ان کا کوئی تعلق نہیں کیونکہ یہ فائلیں ان کے یہاں آنے سے پہلے ہی میز پر رکھی ہوئی تھیں۔ وہ کہا کرتے کہ اپنے بزرگوں کی نشانیوں کو جوں کا توں برقرار رکھنا ہم سب کا اولین فرض ہے۔ دفتر میں کوئی بھی فائل کہیں گم ہو جاتی تو وہ بالآخر مرزا کی میز پر مل جاتی تھی، وہ کہا کرتے تھے کہ وہ دفتر کی گمشدہ فائلوں کے انچارج ہیں۔ ان کی میز پر فائلوں کا اتنا انبار رہتا کہ ایک دن جب انہوں نے ان فائلوں کو محافظ خانے میں بھجوانے کی تجویز پیش کی تو محافظ خانے کے انچارج نے انہیں منع کرتے ہوئے لکھا کہ آپ اپنی فائلیں محافظ خانے میں بھجوانے کا تکلف کیوں کرتے ہیں۔ میں خود اپنا محافظ خانہ آپ کے پاس بھیج دوں گا۔ وہ جب کبھی ان فائلوں کے انبار میں بیٹھ جاتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے وہ کسی خندق میں گر کر باہر نکلنے کی ساری کوششوں میں ناکام ہو گئے ہوں۔ مرزا زندگی بھر اسی خندق میں گھرے رہے اور کبھی باہر نہ نکل سکے۔

مرزا رخصتِ اتفاقی (CASUAL LEAVE) لینے میں بڑی مہارت رکھتے تھے یوں بھی وہ ہمیشہ بیمار رہا کرتے تھے اور چونکہ بیماری بڑھ کر ان کے لئے ایک "اتفاق" نہیں بلکہ "ایک مستقل ساتھی" بن گئی تھی اس لئے وہ اس سلسلے میں رخصت اتفاقی سے استفادہ نہیں کرتے تھے۔ ایک دن انہوں نے اپنے دفتر کو اس قسم کی رخصت کی درخواست بھجوائی کہ حضور والا آج ناچیز کی طبیعت اتفاق سے بہتر ہے لہٰذا فدوی آج زندگی کا کچھ لطف اٹھانا چاہتا ہے اگر آج ایک دن کی رخصت اتفاقی منظور کی جائے تو فدوی آپ کا احسان مند رہے گا۔" لیکن مرزا کی رخصت اتفاقی منظور نہیں ہوئی۔ اس کے بعد سے مرزا نے رخصت اتفاقی کے حصول کے لئے باری باری سے اپنے رشتہ داروں کو دوسری دنیا میں بھیجنا شروع کر دیا۔ چنانچہ اس کوشش میں انہوں نے اپنے والد کو چار مرتبہ اور والدہ کو دو مرتبہ، نانی کو دس مرتبہ اور دادی کو سولہ مرتبہ جام شہادت نوش کروایا۔ دفتر والے حیران رہتے تھے کہ آخر مرزا کے اتنے سارے والد اور واقعی ساری والدائیں کہاں سے آگئیں۔ اس کے جواب میں وہ کہتے "بھئی میں خود اپنے باپ کو پیدا کرتا ہوں اور رخصتِ اتفاقی کے وقت اُسے مار دیتا ہوں۔ دفتری قواعد کی پابندی کے لئے آدمی کو کیا نہیں کرنا پڑتا"

اپنی بیماری کے دوران میں مرزا پابندی سے دفتر آیا کرتے تھے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اگر بیماری کے سبب وہ رخصت لے کر گھر میں بیٹھ رہیں تو ان کی خانگی ذمہ داریوں میں اضافہ ہو جاتا ہے اور بیوی اُن سے گھر کے کئی پینڈنگ کام کرواتی ہے۔ ایک مرتبہ مرزا نے اپنے کسی خانگی کام کے سلسلے میں دو مہینوں کی رخصتِ خاص حاصل کی تھی لیکن ابھی رخصت کے آٹھ دن بھی نہیں گذرے تھے کہ دفتر میں مرزا کی ایک درخواست طبی صداقت نامے کے ساتھ پہنچی جس میں لکھا تھا:

"حضور والا فدوی نے اپنے بعض خانگی امور کے لئے دو مہینوں کی رخصت حاصل کی تھی لیکن اسی اثنا میں فدوی کی صحت کافی خراب ہو گئی ہے۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا ہے کہ فدوی مکمل آرام کرے ورنہ جان کا خطرہ ہے۔ لہٰذا استدعا ہے کہ فدوی کی رخصت کو منسوخ فرماتے ہوئے آج ہی سے رجوع بکار ہونے کی منظوری دی جائے۔ ڈاکٹر کا طبی صداقت نامہ بملاحظۂ عالی پیش ہے۔"

مرزا کی کامیاب تیس سالہ ملازمت کا راز صرف یہی تھا کہ وہ اپنے عہدے داران بالا کو خوش رکھنے کا فن خوب جانتے تھے۔ عہدے داران بالا کے دکھ سکھ میں وہ ہمیشہ ضرورت سے زیادہ شریک رہا کرتے تھے۔ اگر ان کے کسی عہدے دار کا لڑکا کسی امتحان میں کامیاب ہوتا تو یوں اظہارِ مسرت کرتے جیسے یہ کامیابی خود ان کے لڑکے کے حصہ میں آئی ہو۔ میں لاکھ منع کرتا، مرزا اپنے عہدے داروں کے دکھ سکھ میں اتنا زیادہ شریک نہ رہا کرو کسی دن نقصان بھی پہنچ سکتا ہے' مگر وہ نہ مانتے۔ چنانچہ ایک بار انہیں اس کی سزا بھی مل گئی۔ ہوا یوں کہ ان کے متعلقہ اسسٹنٹ سکریٹری کی بیوی کا کسی عارضہ میں انتقال ہوا تو مرزا اس خبر کو سن کر تقریباً بے ہوش ہو گئے۔ رو رو کر برا حال کر لیا۔ اسسٹنٹ سکریٹری کی بیوی کا نام لیتے جاتے تھے اور آہیں بھرتے جاتے تھے۔ ان کی اس مجنونانہ حالت پر اسسٹنٹ سکریٹری بھی دنگ رہ گیا۔ چنانچہ دوسرے ہی دن اس نے مرزا سے ایکسپلینیشن (EXPLANATION) طلب کیا کہ آخر میری بیوی کے انتقال پر تمہیں اس قدر آنسو بہانے کی کیا ضرورت تھی اگر صحیح صحیح وضاحت پیش نہ کرو گے تو معطل کر دیئے جاؤ گے۔ مرزا بہت پریشان ہوئے اور بالآخر رخصت لے کر گھر بیٹھ گئے اور اس اسسٹنٹ سکریٹری کا تبادلہ ہونے کے بعد ہی دفتر آسکے۔

مرزا اپنے عہدہ داران بالا کے پاس تحفے تحائف پہنچانے میں بھی بڑی مہارت رکھتے تھے۔ اس معاملہ میں ان کا طریقۂ کار یہ تھا کہ وہ کسی شیرینی فروش کے پاس سے مٹھائی خریدتے اور اپنے عہدہ دار کے گھر پہنچ کر کہتے:
"صاحب لکھنؤ سے میرے بھائی نے مٹھائی بھجوائی ہے۔ سوچا کہ آپ کی خدمت میں بھی تھوڑی سی مٹھائی پیش کر دوں۔"

ایک بار تو انہوں نے اپنے ایک عہدہ دار کے گھر پر ایک بھینس لے جاکر باندھ دی۔ جب اس سلسلے میں استفسار کیا گیا تو بولے "حضور میرے گھر میں تین چار بھینسیں بیکار پڑی رہتی ہیں۔ ان کا کوئی مصرف سمجھ میں نہ آتا تھا۔ سوچا کہ ایک بھینس آپ کی خدمت میں پیش کر دوں۔ ایک غریب آدمی کا تحفہ ہے اسے قبول کیجئے۔"

میں نے مرزا کو اس بات پر ٹوکا کہ اپنے عہدہ دار کو تحفہ میں بھینس دینے کی کیا تک ہے۔ وہ بولے "میاں زمانہ ترقی کر گیا ہے اب مسکہ لگانے کے پرانے طریقے بھی بدل گئے ہیں۔ بھینس کا تحفہ تو مسکہ لگانے کا بالواسطہ طریقہ ہے کہ خود دودھ دوہ کر مسکہ نکالو اور خود ہی اسے لگاؤ۔"

پہلی تاریخ آتی تھی تو مرزا سے پہلے مرزا کے قرض خواہ دفتر پہنچ جاتے تھے۔ وہ اپنے قرض خواہوں کی بڑی خاطر مدارات کرتے اور ان کے ساتھ کچھ ایسی ہوشیاری سے پیش آتے تھے کہ بیچاروں کی زبان پر اپنا قرض مانگنے کی بات تک نہ آتی تھی۔ وہ انہیں اپنی چکنی چپڑی باتوں میں لاکر نہ صرف پچھلے قرض کی ادائی کی بات کو ٹال جاتے تھے بلکہ ان سے نیا قرض بھی حاصل کر لیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مرزا کے اکثر قرض خواہ ایک بار انہیں قرض دینے کے بعد ان سے منہ چھپانا زیادہ مناسب سمجھتے تھے۔ میں نے یہ منظر بھی دیکھا ہے کہ جب مرزا سڑک پر نکلتے تو ان کے قرض خواہ دھڑا دھڑ گلیوں میں بھاگ جاتے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے سڑک ویران ہو جایا کرتی تھی۔ اس بات سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مرزا کے قرض خواہوں کی تعداد کتنی زیادہ تھی۔ میں ان سے کہتا کہ مرزا اگر تم اپنے قرض خواہوں کا ایک حلقۂ انتخاب بنانے میں کامیاب ہو سکو تو تمہارا رکن اسمبلی بن جانا یقینی ہے مگر مرزا کو ٹال مٹول کی عادت پڑ گئی تھی۔ مرزا میرا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے۔ جب بھی ملاقات ہوتی تو میری خاطر تواضع پر بے دریغ رقم خرچ کیا کرتے تھے۔ میں سمجھاتا "مرزا تم ایک کلرک ہو فضول خرچی کیوں کرتے ہو؟"

وہ کہتے "یار بخدا میں اپنی کمائی سے فضول خرچی نہیں کرتا۔ تم فکر نہ کرو، میری جیب پر کوئی بار نہیں پڑتا۔ میں تو لوگوں سے قرض لاتا ہوں اور تم پر خرچ کرتا ہوں۔ بھلا میرا کیا جاتا ہے۔ میں تو قدرت کا وہ وسیلہ ہوں جس کے توسط سے جس کا رزق ہے اسے پہنچ جایا کرتا ہے۔ اپنا کام تو صرف ایک درمیانی شخص کا فریضہ انجام دینا ہے۔"

مرزا دوسری تاریخ ہی سے اپنے ساتھیوں سے قرض مانگنا شروع کر دیتے تھے۔ مہینے کی آخری تاریخیں مرزا کے حق میں دوسری تاریخ ہی سے شروع ہو جایا کرتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ مہینہ کی ساری ابتدائی تاریخیں تو پہلی تاریخ کو ہی گذر جاتی ہیں اور بقیہ سارے مہینہ میں صرف ایک ہی تاریخ سبک خرامی سے گذرتی ہے، وہ ہے ۳۱ یا ۳۰ تاریخ۔

مرزا کو قرض حاصل کرنے کے نت نئے طریقے معلوم تھے۔ میں تو کہتا ہوں کہ اگر وہ قرض حاصل کرنے کے طریقوں پر ایک کتاب لکھ ڈالتے تو ہاتھوں ہاتھ بک جاتی اور مرزا کو اتنی رائلٹی تو ضرور مل جاتی کہ وہ اپنے قرض خواہوں کی پائی پائی کا حساب چکا دیتے۔

مرزا زندگی بھر اپنی ترقی کے لئے کوشاں رہے۔ ان کے کئی ساتھی ترقی کر کے گزیٹیڈ بن گئے مگر مرزا آخر وقت تک پوری مستقل مزاجی کے ساتھ اسی عہدے پر ڈٹے رہے جس پر ان کا ابتدائی تقرر ہوا تھا۔ وہ اپنے ان ساتھیوں کا بڑی حقارت سے ذکر کرتے تھے جنہیں ترقی مل چکی تھی۔ وہ اندر ہی اندر حسد کی آگ میں جلتے رہتے۔ ان کی آنکھوں میں وہ منظر ہمیشہ تازہ رہتا جب ان کے ایک ساتھی کو گزیٹیڈ عہدے پر ترقی کا آرڈر ملا تھا۔ اس آرڈر کو پاتے ہی ان کے ساتھی نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ مرزا اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے رہے۔ وہ بس اچانک اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور آرڈر کو اپنے ہاتھ میں پکڑ کر اپنے سارے نان گزیٹیڈ ساتھیوں پر حقارت کی نظر ڈالتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا اور پوری شان کے ساتھ چلتا ہوا گزیٹیڈ آفیسرس کے "ٹائلٹ روم" میں داخل ہو گیا۔ یہ حرکت اس بات کے اعلان کی حیثیت رکھتی تھی کہ وہ گزیٹیڈ بن گیا۔ مرزا بھی زندگی بھر گزیٹیڈ آفیسرس کے "ٹائلٹ روم" سے استفادہ کرنے کی حسرت اپنے دل میں پالتے رہے لیکن بالآخر ان کے وظیفے پر سبکدوش ہونے کا وقت آگیا۔ جس روز وہ وظیفہ پر علیحدہ ہوئے اس روز انہوں نے سارے دفتر میں گھوم کر سارے عہدہ داروں سے ملاقات کی۔ حتیٰ کہ اپنے سکریٹری کے کمرے میں بھی چلے گئے اور جب سب سے رخصت ہو کر دفتر سے نکلنے لگے تو تھوڑی دیر کے لئے گزیٹیڈ آفیسرس کے "ٹائلٹ روم" کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اچانک ان کی آنکھوں سے ایک جھیل سی بہہ نکلی۔ "ٹائلٹ روم" پر ایک معصوم سی نگاہ ڈالی اور ایک طویل و عریض آہ بھر کر کہا۔

"اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"

●●

فکر تونسوی
روزنامہ "ملاپ" بہادر شاہ ظفر مارگ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱



بیوی کی بغاوت

(میں بزعم خود اُردو کا (ہندی سمیت) بہترین طنز نگار ہوں۔ قسامِ ازل نے میری جائے پیدائش تونسہ (پاکستان) مقرر کی۔ اس لئے مجبوراً تونسوی کہلایا — سن ولادت پہلی جنگ عظیم ہے۔ سن وفات کا امکان تیسری جنگ عظیم میں ہے۔

نقادوں سے نظر بچا کر چودہ کتابیں تصنیف کر ڈالیں، اُردو اور ہندی دونوں میں لکھنے کے علاوہ، روزی کے لئے ادبی رسائل کی ایڈیٹری کا پیشہ بھی اختیار کیا۔ "ادب لطیف" "سویرا" "نقوش" "شاہراہ" غرض جس رسالے پر بھی نظرِ کرم ڈالی اُسے بند کروا دیا۔

ذہن و قلم کی تربیت میں بائیں بازو کے نظریات اور جذبات غالب رہے کیونکہ میرا ضمیر [illegible] تھا۔ اسی لئے زندگی بھر مفلسوں یعنی اپنے حق میں لکھتا رہا۔ جنازہ اٹھنے تک اپنے ہی حق میں لکھنے کا ارادہ ہے خود غرضی کی حد ہے۔

گزشتہ پندرہ برس سے اخبار "ملاپ" دہلی، جالندھر، حیدرآباد، لندن وغیرہ میں طنزیہ کالم "پیاز کے چھلکے" لکھ کر عوام کو ہنسا اور اپنے کو رُلا رہا ہوں۔
(فکر تونسوی)

چند دن ہوئے میں رات کو جب گھر لوٹا اور مردانہ روایت کے مطابق دیر سے لوٹا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میری پہلی اور آخری بیگم نے اپنے گورے گورے کندھے پر ایک سیاہ بلا لگا رکھا ہے۔

میں نے عرض کیا "یہ کیا ہے حضور؟"

وہ بولی "جھنڈا اونچا رہے ہمارا"

میرا ماتھا ٹھنکا کہ آج دال میں کچھ کالا ہے۔ چاند سا چہرہ جو کل تک رشکِ بتاں تھا آج کسی انجمنِ خدامِ وطن کا پوسٹر معلوم دے رہا تھا جس پر لکھا تھا ؎

اٹھو، میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو

میں نے تھوڑا سا مسکرا کر (اور تھوڑا سا ڈر کر) کہا "اے میری پیاری کاخِ اُمرا! پہلے کھانا لے آؤ"

وہ اپنی سڈول باہوں کو کسی جھنڈے کی طرح لہرا کر بولی:

"آج کھانا نہیں ملے گا، آج چولہا ڈاؤن اسٹرائک ہے"

شک یقین میں بدلنے لگا کہ معاملہ گمبھیر ہے اور اب بیگم کے ساتھ رومانٹک گفتگو کرنا فضول ہے۔ یہ کس ستم گر نے گھر پر انقلابی چھاپا مارا ہے کہ آج محترمہ کی آنکھوں میں کاجل کی تحریر کی بجائے مطالبات کا چارٹر دکھائی دیتا ہے۔ معاملے کی سنجیدگی کو دیکھ کر میں نے بھی اپنا لب و لہجہ بدل لیا اور مالکانہ وقار کے ساتھ کہا "بیگم تمہیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ تم میری بیوی ہو"

تڑاق سے جواب آیا "ہاں ہاں! میں بیوی کے علاوہ بھی کچھ ہوں، یعنی ایک ورکر ہوں اور آپ میری محنت کا استحصال کرتے ہیں"

"مگر ڈارلنگ!" میں نے اُس کا جارحانہ لب و لہجہ دیکھ کر ایک دم اپنا لب و لہجہ بدل لیا اور کہا "مالک تو تم ہو، میرے دل و جان کی مالک، اس گھر کی مالک — اگر میں سلطنت ہوں تو تم اس سلطنت کی نواب واجد علی شاہ ہو۔ بتاؤ ہو کہ نہیں؟"

ایک دن پہلے تک میرا یہ فقرہ طلسم ہوش رُبا کا سا کام کر جاتا تھا اور بیگم تڑپ کر میرے بازوؤں میں جھولنے لگتی تھی لیکن آج آغوش میں آنے کی بجائے اُس نے اپنی نرم و نازک مٹھی دکھائی اور میز پر مارتے ہوئے بولی "سیٹھ صاحب! لچھے دار لفظوں کے پھندے اب نہیں چلیں گے۔ صدیوں سے ظلم کی چکی میں پستی ہوئی بیوی اب بیدار ہو چکی ہے اور اب تو وہ اپنے حقوق منوا کر دم لے گی۔ اور... اور... اور کیا کہتے ہیں وہ کہ... ہاں، جو ہم سے ٹکرائیگا پاش پاش ہو جائے گا"

میں نے پوچھا "پاش پاش کرنے سے پہلے یہ بتاؤ کہ کیا آج ہمارے گھر میں کوئی ترقی پسند شاعر آیا تھا!"

وہ بولی "نہیں، وہ شاعر صدیوں سے میرے اندر سویا ہوا تھا۔ لیکن آج وہ جاگ اٹھا ہے، لہٰذا میرے مطالبات ماننے پڑیں گے۔ نہیں تو...؟"

"کون سے مطالبات؟" میں نے اینٹی شاعر یعنی نقاد کی

بلندی سے پوچھا "۔۔۔ سب سے پہلے" بیگم نے حلق میں تھوک نگلتے ہوئے کہا اُس کی آواز میں گھنگروؤں کی مانوس جھنکار نہیں تھی. بلکہ طبل جنگ کی سی گھن گرج تھی ۔ "ہاں، سب سے پہلے میرا مطالبہ یہ ہے کہ میرے کام کے اوقات گھٹائے جائیں. صبح پانچ بجے سے مرغ سحر کے ساتھ بانگ دیتی ہوں اور پھر رات کے گیارہ بجے تک کام کرتی رہتی ہوں۔ جب مرغ تک مجھے بور سمجھ کر سو جاتا ہے ۔ گویا اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کام کرتی ہوں. کیا مہذب سماج کا یہی دستور ہے؟"

"مگر ڈارلنگ! ہمارا تو ہندوستانی سماج ہے۔"

وہ بھڑک اُٹھی "۔ اور بائی دی وے! ایک بات نوٹ کر لیجیے کہ جب تک مطالبات کی گفت وشنید جاری رہے آپ مجھے ڈارلنگ کے لقب سے مخاطب نہ کیا کریں۔ ہاں بتائیے! ہندوستانی سماج کو مہذب بنانے کے لئے کیا نو گھنٹے کے اوقات آپ کو منظور ہیں؟"

میں نے کہا: "دیکھو ڈارلنگ، ویری سوری، ڈارلنگ نہیں، ورکر بیگم! اگر اس گھر میں صرف نو گھنٹے کام ہوا تو اس سے پروڈکشن پھاڑ پڑے گا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ کام کی دو شفٹیں کرنا پڑیں گی۔ دو شفٹیں اور دو بیویاں۔ کیا تم چاہتی ہو کہ میں اس گھر میں دو بیویاں لے آؤں؟"

سوکن کا جلاپا عورت ذات کی نازک کمزوری ہے اور میں نے جان بوجھ کر اس نازک رگ پر انگلی رکھ دی۔ میرا مقصد یہ تھا کہ ٹریڈ یونین میں انتشار پیدا ہو جائے۔ مگر آہ! میری بیگم کے اندر شاید وہ قدیم حاسد عورت مر چکی تھی۔ وہ ماڈرن ہو چکی تھی بولی "یہ مالک کی اپنی پرابلم ہے۔ آپ چاہے کوئی بھی بندوبست کرلیں، چاہے تو ایک ملازمہ رکھ لیں۔ چاہے تو ۔۔۔"

یعنی بیگم سوکن والے پہلو سے اپنا دامن صاف بچا کر نکل گئی۔ اس کی یہ چترائی مالک کے لئے پریشان کن تھی۔ چنانچہ میں نے ایک اور ہتھیار نکالا۔ "مگر اُسے تنخواہ کہاں سے دیں گے۔ جتنی تنخواہ ملتی ہے تمہارے مخملیں ہاتھوں پر لاکر رکھ دیتا ہوں۔ تم چاہو تو اس تنخواہ میں سے ایک ملازم رکھ سکتی ہو۔"

"اس تنخواہ میں ملازمہ نہیں رکھی جا سکتی۔"

"تو پھر کیا کیا جائے ڈارلنگ!"

"پھر ڈارلنگ؟"

"معاف کرنا ورکر بیگم!"

"ورکر بیگم نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ یہ مالک کی اپنی پرابلم ہے، اُسے خود سوچنا چاہیے۔"

"آل رائٹ" میں نے تنگ آکر کہا "مینیجمنٹ اس پر ہمدردانہ غور کرے گی۔ اگلا مطالبہ پیش کیا جائے گا۔"

"اگلا مطالبہ چھٹیوں کا ہے۔"

"مستقل چھٹی کا؟ مگر اس کی پیش کش تو میں کئی بار کر چکا ہوں۔ مگر ہر بار تم نے حقارت سے ٹھکرا دیا۔"

"دیکھیے آپ اسے مذاق میں مت ٹالئے (حالانکہ باللہ قسم! یہ مذاق بالکل نہیں تھا)

"ہندوستان بھر کے سارے کامگاروں کو اتوار کی ہفت روزہ چھٹی ملتی ہے۔ مگر مجھے اتوار کو سب سے زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔ ہر اتوار کو آپ کے احباب آدھمکتے ہیں۔ کوئی لنچ کھانے کو کوئی ڈنر اور کوئی یونہی گھومتے گھامتے چائے پینے آٹپکتا ہے، دیوالی، دسہرہ، عید، بقرعید، کوئی چھٹی بھی تو نہیں ملتی ہے۔ نہ میڈیکل چھٹی، نہ ایمرجنسی چھٹی ـــ بھلا چھٹیوں کے بغیر بھی کوئی زندگی ہے۔" یہ کہہ کر وہ گلوگیر ہو گئی اور زار و قطار رونے لگی۔

میں بھی رونا چاہتا تھا لیکن مینیجمنٹ میں رونے کا رواج نہیں تھا۔ مطالبہ (خدا جھوٹ بولنے کی توفیق اگر نہ دے) بالکل جائز تھا۔ لیکن مینیجمنٹ کا رویہ بھی اس کے متعلق بڑا واضح تھا کہ مطالبہ کیسا بھی ہو، اُسے جائز قرار نہ دیا جائے۔ بلکہ اگر چار و ناچار مطالبہ تسلیم بھی کر لیا جائے تو اُسے جائز پھر بھی نہ کہا جائے بلکہ احسان کہا جائے۔ چنانچہ میں نے کہا "دیکھو بیگم! عورت ذات کی تاریخ گواہ ہے کہ اُسے موت سے پہلے کوئی چھٹی نہیں ملتی۔"

"لیکن میں تاریخ کا دھارا موڑنا چاہتی ہوں۔"

"میری پیاری ٹوکیٹیرا! اگر تم عقل کا تھوڑا سا استعمال بھی کرو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ سماج کا سارا ڈھانچہ عورت کے کاندھے پر کھڑا ہے۔ جس دن عورت نے چھٹی کی اُسی دن سماج میں تعطل آجائے گا بھائیں بھائیں کرتی ہوئی ایک ویرانی گھر پر مسلط ہو جائے گی۔ سارے کام چوپٹ ہو جائیں گے۔ یوں لگے گا جیسے زندگی کی فیکٹری پر جبری تالہ بندی کر دی گئی ہے۔ بچے روئیں گے، میں چلاؤں گا، گھر کی بلی اور طوطا اور چوہا سبھی روئیں گے ـــ اچھا بتاؤ، اگر تم چھٹی پر چلی گئیں تو اس دوران میں کام کون کرے گا؟"

"آپ کریں گے۔" ظالم نسائی جذبات سے بالکل عاری ہو چکی تھی۔ میں نے جھٹ پینترا بدلا: "اچھا چلو، میں تمہاری ویکلی چھٹی منظور کرتا ہوں لیکن سوال یہ ہے کہ اس چھٹی پر تم کرو گی کیا؟"

معلوم ہوتا تھا انقلاب کے جوش میں اُس نے ان چھوٹی چھوٹی تفصیلات پر غور نہیں کیا تھا۔

لہٰذا ایک دم بوکھلا گئی اور بوکھلاہٹ میں بولی "بس بیٹھی رہوں گی، بیٹھی رہوں گی یا پھر . . . یا پھر سوتی رہوں گی، ارے ہاں تاش کھیلوں گی، سہیلیوں کے ساتھ خواہ مخواہ گھومنے جاؤں گی۔ شام کو . . . کوئی فلم دیکھوں گی۔"

لب و لہجہ صاف چغلی کھا رہا تھا کہ بیگم صرف میری نقل کرنا چاہتی ہے اور سنجیدہ بالکل نہیں ہے۔ میرے دل میں اچانک ایک شیطانی خیال آیا کہ اسے اوور ٹائم کا لالچ دے دوں۔ یعنی چھٹی کے دن کام کرو تو دوگنی اجرت ملے گی۔ اوور ٹائم کی رقم جمع کر کے ایک ساڑھی خرید لینا۔ لیکن بیوی عرف جیون ساتھی کو اوور ٹائم کے ترازو پر تولنا کچھ غیر مہذب سا لگا۔ لہٰذا میں نے مردانہ فراخ دلی سے سینہ تان کر کہا۔

"ویکلی چھٹی منظور کی جاتی ہے صرف ایک شرط پر کہ اُس دن تم اپنے بال بچوں کو ہمراہ لے کر میکے چلی جایا کرو۔"

میکے کے ذکر پر بیگم کچھ کنفیوز ہو گئی۔ میکہ ہر عورت کا ماضی ہے اور ماضی بڑا حسین ہوتا ہے۔ بے حد دل کش۔ میکے کے مقابلہ پر سارا ٹریڈ یونین ازم تباہ ہو جاتا ہے۔ بیگم کی سمجھ میں فوری طور پر یہ بات نہیں آئی کہ اس کا مطالبہ تسلیم کر لیا گیا یا مطالبے کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا گیا۔ مطالبے کے ساتھ شرط کی تیغ لگا کر میں نے ایک تیر سے دو شکار کیے تھے۔ میں نے سوچا کہ اس سے بیگم بھی خوش ہو جائے گی اور میں بھی۔ بیگم کی غیر حاضری میں خاوند کو جو آزادی نصیب ہوتی ہے اس کا اندازہ صرف وہی شادی شدہ مرد لگا سکتے ہیں جو ایک مستقل یکسانیت سے نالاں رہتے ہوں۔

بیگم نے زیر لب تبسم فرمایا اور اس فیصلے پر صاد کر لیا اور میرے دل میں اُبھرتے ہوئے اس شعر کی آواز بھی نہ سن سکی کہ ؎

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

بیگم کا تیسرا مطالبہ یہ تھا کہ گھر کے اخراجات کے لئے اُسے جو رقم دی جاتی ہے اس میں اضافہ کیا جائے کیونکہ اشیاء کے پرانے نرخ قائم نہیں رہے۔ ہر چیز پہلے کے مقابلے پر دگنی تگنی ہو گئی ہے مگر اخراجات کی رقم بدستور وہی ہے۔

گویا یہ مہنگائی الاؤنس کا مطالبہ تھا جو بیک وقت جائز بھی تھا اور ناجائز بھی۔ میں نے جھٹ کہا "بیگم صاحبہ مجھے تمہارے اس مطالبے سے ہمدردی ہے بلکہ صرف ہمدردی ہے۔"

وہ بگڑیں "مگر صرف ہمدردی سے ایک بینگن بھی نہیں آ سکتی۔"

"تو بینگن نہ خریدو۔ بزرگوں نے کہا ہے بینگن کی بجائے روکھی سوکھی کھا کے ٹھنڈا پانی پی لو۔ اس کا کچھ مطلب تھا، کچھ فلاسفی تھی۔ افسوس یہ ہے کہ بیگم تم ٹریڈ یونین ازم کے جوش میں بزرگوں کی فلاسفی بھول گئیں۔"

اس کے جواب میں بیگم نے جو ارشاد فرمایا وہ بہت اذیت ناک تھا۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ روکھے سوکھے فلسفے میں یقین نہیں رکھتی۔ اس سے میرا معیار زندگی پست ہو جائے گا جس سے محلے میں میری ناک وغیرہ کٹ جائے گی اور اس کے بعد اس نے اپنے آنسوؤں کے مختلف سائز کے ہتھیار نکالے جن سے مجھ پر بار بار حملہ کرتی رہی اور یہاں تک دھمکی دے دی کہ گھر کے اخراجات کی ذمہ داری تم خود سنبھال لو اور یاد رکھو، اس صرف ہمدردی اور بزرگوں کی فلاسفی کی بدولت اگر تم ایک ہفتہ میں دیوالیہ نہ بن گئے تو میں تمہاری بیگم کہلانا چھوڑ دوں گی۔

"تو پھر میں کیا کروں حضور! جتنی آمدنی ہے اُس سے زیادہ کہاں سے لاؤں؟"

"اپنی آمدنی بڑھائیے۔" انقلاب زندہ باد قسم کی بیوی نے نعرہ لگایا۔

"کیسے؟"

"رشوت لو، جیب کتری شروع کر دو، سمگل کیا ہوا مال بیچو، کوئی پرمٹ لائسنس لے کر بلیک میں بیچ دو۔ ساری دنیا اسی طرح ترقی کر رہی ہے۔"

اور میرا جواب بلکہ کورا جواب یہ تھا کہ مجھ سے یہ نہیں ہو سکے گا۔ گذشتہ ایک سو برس سے جو خاندانی شرافت میرے سر پر سایہ کیے ہوئے ہے اُسے میں چند ٹکوں، اناج کے چند دانوں، بینگنوں اور آلو گوبھی کے ریٹ پر فروخت نہیں کر سکتا۔ سودا کافی سستا ہے۔

مگر بیگم مُصر تھی کہ ہر دور کے اخلاق و شرافت کی اپنی الگ قدریں ہوتی ہیں۔ اخراجات میں کمی کر دینا بزدلی ہے اور بزدل انسان کو کسی باغیرت بیوی کا خاوند کہلائے چلے جانے کا کوئی حق نہیں۔ اس لئے میرا مطالبہ مان لیجیے ورنہ جنرل اسٹرائیک کے لئے تیار ہو جائیے۔

اُس نے مجھے بزدل کہا، میرے شوہر پن کو مشکوک قرار دیا، جنرل اسٹرائیک کی دھمکی دے کر گھر کے مفاد پر ضرب لگانے کا اعلان کیا۔ یہ رویّہ سیدھا طلاق کی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مگر میں نے بھی تہیہ کر لیا کہ میں بیوی کو طلاق دے دوں گا مگر خاندانی شرافت پر طلاق نہیں دوں گا۔ ہرگز نہیں دوں گا۔

چند منٹ تک بحرانی خاموشی طاری رہی۔ اچانک بیگم بولی "تو کیا ارادے ہیں؟"

"مطالبہ رد کیا جاتا ہے۔" میں نے تاریخِ انسانیت کا عظیم اعلان کیا۔

"لیکن میرا بنیادی مطالبہ ہے۔" بیگم نے ایک بار پھر اپنا ناک منہ سکوڑا۔

"اگر اسے رد کر دیا گیا تو میں اس بات پر غور کروں گی کہ پہلے دو مطالبے بھی منظور کراؤں یا نہ کراؤں۔"

(بقیہ صفحہ ۲۰ پر)

مخلص بھوپالی
پنچ بھون، جہانگیر آباد۔ بھوپال ۲۳



ایک گز کپڑا

میں ۱۹۱۸ء میں نازل ہوا۔ میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ زمانۂ تعلیم میں سیاست کا شغل بھی کرنے لگا تھا۔ نواب بھوپال کے خلاف تحریکیں چلائیں نتیجہ میں انقلاب زندہ باد ہوا، تعلیم چھوٹی، گھر گیا۔ پھر ملٹری میں ایک بڑے عہدہ پر ممتاز رہا، وہاں سے فارغ ہونے کے بعد یا اپنی جان بچا لانے کے بعد کاروبار میں پڑ گیا۔
اکسپورٹ اور امپورٹ یہ دو لائنیں میری تجارتی ہیں۔ اب بھی ہیں ہڈیاں پیس کر ممالک غیر کو اکسپورٹ اور موٹر کے پرزے امپورٹ کرتا ہوں۔
۱۹۴۰ء میں ہفت روزہ "بھوپال پنچ" کا اجرا کیا۔ بہت مقبول ہوا یوں کہئے کہ ادبی دسترخوان کا نمک ہو گیا تھا۔ خالہ اور غفور میاں کی زبان کو پورے ہندوستان میں متعارف کیا۔ یہ زبان بھوپال کے متوسط طبقے کی زبان ہے۔ کہاں تک کامیاب رہا، خدا ہی جانے۔ بھوپال پنچ ۱۹۴۲ء میں بند کر دیا۔ (مخلص بھوپالی)

غفور میاں کے مکان کے باہری حصہ میں ایک کوٹھری تھی جس میں ایک بے عذر بے زبان اور ناغہ سے بالاقساط کرایہ ادا کرنے والا شبراتی کرایہ دار بھی رہتا تھا۔ غفور میاں نے یہ کوٹھری موجودہ مہنگائی سے نبٹنے کے لئے چار روپیہ ماہوار پر شبراتی کو دے رکھی تھی منجملہ عام فہم اور "چالو" شرائط کہ

"ماہ بماہ" ہر مہینے کی پہلی تاریخ پر کرایہ (بجبر و اکراہ ہی سہی) ادا کرتا رہوں گا۔ خالی کرانے کی حاجت پر مالک مکان کو پورا حق ہے کہ وہ کھڑے کھڑے کرایہ دار کے برتن ٹھیکرے سڑک پر پھکوا دے گا اور "میری دنیا لٹ رہی تھی اور میں خاموش تھا" کے بمصداق من مقر کرایہ دار کا کوئی عذر قابل قبول نہ ہوگا۔" شبراتی کرایہ دار کے ذمے ایک شرط یہ بھی تھی کہ خاکسار شبراتی روزانہ رات میں غفور میاں کی دو بکریاں اور ایک نہایت بدبو دار بربرا بکرا بھی اپنے جائے رہائش میں باندھنے کے لئے پابند ہوگا۔ نیز رات بھر غفور میاں کے ہر استفسار پر کہ

"ارے خاں شبراتی تینوں جانور خوب بندھے ہوئے ہیں:"

شبراتی جواب میں "ہاں دادا ہم چاروں بندھے ہوئے ہیں فکر مت کرو" کہتا رہے گا۔

ایک دن صبح صبح غفور میاں نے شبراتی کو آواز دی "ابے شبراتی۔ کوٹھری میں سے تو نکل یار۔ ذرا چوک بازار چلا جا۔ گز بھر کپڑا لے آ خاں۔ یہ دیکھ ہاتھ کا رومال چندیج چار ہو گیا اب تو۔"

"لاؤ دادا پیسے نکالو۔ پھر مجھے بھی محنت مزدوری پر جانا ہے۔" شبراتی نے کوٹھری سے برآمد ہو کر پیسے طلب کئے۔

"ہاں بیٹا۔ یہ لے ایک روپیہ۔ دیکھ روپے گز ملے گا۔ ذرا دیکھ کر مضبوط لانا، آج کل کلف چڑھے لٹے آ رہے ہیں۔ ایک مرتبہ کے دھونے میں ململ کی طرح نکل آتا ہے۔ اندھیر مچی ہے خاں۔ انسان بھوکوں مر رہا ہے۔ ان مل والوں کے کلف کے لئے چاول کہاں سے مل جاتے ہیں یار! خیر دیکھ" غفور میاں نے شبراتی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "وہ رام پرشاد بزاز کی دوکان سے لانا۔ تو نے تو رام پرشاد کی دوکان دیکھی ہے نا"

"ہاں ہاں دادا خوب دیکھی ہے" شبراتی نے پیچھا چھڑانے کے لئے جلدی سے جواب دیا۔ "ہوں ــــــ اچھا بتلا تو ذرا کہاں ہے، وہ دیکھ جبھی تو کہتا ہوں کہ تجھے ابھی کچھ نہیں معلوم ہے۔ ارے وہ بیچ چوک میں علی بھائی لنگڑے دوا فروش کی دوکان کے بالکل سامنے ہے۔ وہ چشمے والی ہرے دروازے والی دوکان۔

" یہ علی بھائی بھی خاں اندھا دھند نفع لیتا تھا۔ بس ایک رات جڑی بوٹی لینے جنگل گیا تو ایک ریچھ جھوم گیا سالے سے۔ ٹانگ چبا ڈالی۔ بہت دوا علاج کیا مگر آخر کو ٹانگ کٹوانا پڑی ــــ ارے خاں اپنے پاس آجاتا شبراتی تو وہ ہڈی جوڑ جڑی دیتا کہ دو روز کے بیچ میں ایسا معلوم ہوتا کہ ٹانگ ٹوٹی ہی نہیں جیسے اپنے پاس بھی خاں فقیروں کے نسخے رہتے ہیں۔ برسوں درویشوں کے جوتے سیدھے کئے ہیں اور چلمیں بھری ہیں جب کہیں جاکے دو چار نسخے ہاتھ لگے ہیں۔"

" دادا مجھے جانا ہے۔ ذرا جلدی روپیہ نکالو"

"ہاں تو بس۔ اسی دو چشمے کی دوکان میں ایک بڈھا سا میلی کچیلی سی پگڑی باندھے بیٹھا ہوگا۔ لاکھوں ہی اللہ نے دیا ہے مگر سال کے سال پگڑی دھلواتا ہے۔ روز شام کو دوکان بند کرکے دو آنے کی بچی کچی سستی سبزی خرید کر گھر لے جاتا ہے۔" غفور میاں نے شبراتی کے کان کے پاس منہ لے جا کر کہا "ارے خاں ایک ہی کنجوس

ہے بھیا۔ یہ اپنے میاں بھائیوں کی طرح تھوڑی ہیں جو کمایا پیا اور جو ترخوں سے ہاتھ پونچھے اور چل میرے بھائی۔ جو دے گا جن کو وہی دے گا کفن کو بھی۔"

"ہاں دادا۔ روپیہ دے دو مجھے جلدی سے۔ ورنہ آج مزدوری نہیں ملے گی۔"

"ارے یار شبراتی۔ سمجھ تو لے بیٹا ذرا۔ ہاں تو اس کی دوکان ذرا اونچی ہے۔ وہ پچھلے سال میونسپلٹی والوں نے اس بیچارے کی دوکان کے سامنے کے پٹے کھود کر پھینک دیئے تھے۔ اب پوری نالی دکھتی ہے۔ کیڑے بلبلاتے رہتے ہیں۔ ہزاروں بھنگی ہیں میونسپلٹی میں کھلا کر کرا رہے ہیں مگر یہ نہیں بنتا کہ نالی کی صفائی کر دیں۔"

"ہاں دادا تو بس ایک گز کپڑا لا دوں، جلدی سے ایک پیسہ دے دو۔"

"ہاں شبراتی تو اب سمجھ گیا ہوگا۔ بس اسی کی دوکان پر جا کر میرا نام کہہ دینا۔ باپ دادا سے اُدھار سدھار کپڑا لیتے آئے ہیں۔ نام سنتے ہی خاں فوراً اچھا سا کپڑا دے دے گا۔ اور دیکھ پہچان کے لئے یاد رکھنا اسی رام پرشاد کی دُکان کے سامنے وہ بمبئی والے درزی کی دوکان ہے ذرا جھام ہے خان درزی کیا ہے۔ وہ پچھلی عید پر سالے اناڑی نے میرے بچارے کی رومالی کھی ہی چھوڑ دی۔ نماز پڑھنا مشکل ہوگیا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا گھس رہی تھی۔ خدا خدا کر کے نماز ختم ہوئی اور ہاتھ سے ٹٹول کر دیکھا تو خان اوپر کی ادھار پیچھے پیچھے رہ گئی۔ جن دق رہ گیا۔ وہ تو اللہ نے بڑی خیر کی کہ شیروانی پہنے تھا۔ چپ چاپ رومالی اٹھا کر جیب میں رکھی اور گھر آگیا۔"

"دیکھو دادا مجھے بہت دیر ہو رہی ہے۔ مجھے آکر دو روٹی بھی ڈالنا ہے۔ خیر اب تو روٹی پکانے کا ٹیم ہی نہیں رہا۔ البتہ چائے بنا کر پی لوں گا۔ ذرا دادا جلدی سے روپیہ نکال دو۔"

"ہاں بے لے" غفور میاں نے اپنی قمیص کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ "بس دیکھ اسی سامنے والی سڑک سے نکل جاتا۔ جلدی پہنچ جائے گا۔ وہ کوتوالی کے پاس سے پہلے تو خان اس بلڈنگ میں بڑا اسپتال تھا۔ ڈاکٹر سہراب جی بڑا مانا ہوا ڈاکٹر تھا۔ کتنا ہی بڑا مرض ہو، بس دو خوراکوں میں غائب۔ ہائے ہائے کیا ڈاکٹر تھا۔ یہ شیش محل تو نے دیکھا ہوگا۔ بس اسی میں رہتا تھا اپنی بیوی کے ساتھ مگر خاں بیچارے نے آخر میں خودکشی کر لی تھی۔ اور خاں ایک آج کے ڈاکٹر ہیں، کل کے لونڈے۔ دن بھر وہ کالی کالی گولیاں بس سے آتی ہیں کھا لیتے ہیں۔ ہو گئی ہیں وہ ... وہ موٹی موٹی کیپسول کو بھی ہی دیتے ہیں لگ کے سر ... گئی لو ... جگہوں میں سوئیاں جھید جھید کر ... ہوگیا ... قبرستان جاؤ پھر۔"

"دادا دیکھو آج کی میری مزدوری چلی جائے گی۔ اب کل تمہیں کرایہ کا روپیہ بھی دینا ہے۔ نہیں تو کل تم پھر گالیاں دو گے۔ ذرا جلدی سے روپیہ دے دو۔"

"ہاں یار لے روپیہ بس خیال رکھنا۔ جیسے ہی چوک میں داخل ہوگا تو سیدھے ہاتھ کی طرف وہ رحیم خاں دادا کی پان کی دوکان ملے گی۔ ہائے ہائے شبراتی۔ تو تو کل کا لونڈا ہے۔ یہ رحیم دادا پہنچے ہوئے بنوٹ جانتا تھا۔ اب بھی خاں اس عمر میں اگر تیری گردن پکڑ لے گا تو بیٹا شام تک جھومتے رہے گا، مگر چھڑا نہیں سکتا۔ وہ تو نے محرم میں ملنگ دادا کا اکھاڑہ دیکھا ہے کالو کا مجید پہلوان کے نام سے مشہور تھا۔ مجیدا بھی کیا تلوار چلاتا تھا۔ دو ہاتھوں سے چار تلواریں چلاتا تھا۔ مگر ایک دسویں کی رات نہ معلوم کیا غلطی ہو گئی یا کوئی پینترا غلط ہو گیا کہ ایک تلوار مجید کے پیٹ میں جا گھسی۔ نکل گیا سب تلوار چلانا۔ بس اسی قدر تڑپا مچھلی کی طرح تڑپنے لگا اور صبح ہوتے ہوتے مر گیا۔ اور ہاں اپنے مدار المہام صاحب کی کرسی بھی ملنگ دادا کے اکھاڑے میں لگتی تھی۔ اسی مجیدا کی تلوار دیکھنے آتے تھے۔ ارے یار شبراتی دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ کیا کڑیل جوان تھا جیسے شیر جا رہا ہے۔"

"دادا قسم خدا کی آج کی مزدوری گئی میری تو غریب آدمی ہوں۔ میرے کہنے سے تم روپیہ توڑ دو۔ اگر غلط کپڑا لاؤں تو اپنے ہاتھ سے سوچ کے مار دینا۔"

"ابے نہیں بے۔ یہ ریزگاری ہے۔" جیب سے غفور میاں نے ریزگاری نکالتے ہوئے کہا۔ "ذرا گن تو لوں، تجھے تو خاں بڑی جلدی ہو رہی ہے شبراتی۔ اب یہ دیکھ" شبراتی کو ریزگاری دکھا کر "نئے پرانے پیسوں کا جھگڑا میرے تو باپ بھی مر جائیں تو حساب نہیں لگا سکتے۔ باپ دادا سے سیدھا سادا حساب چل رہا تھا مگر خان یہ سب بھلانے کی باتیں ہیں غریبوں کی جیب میں سے پیسہ کھینچ کھینچ کر خزانے بھرے جا رہے ہیں۔"

"اچھا دادا مجھے دو۔ میں گن لوں گا۔" شبراتی نے تقریباً روہانسا ہو کر کہا۔

"ارے ٹھہر تو یار بس وہی جلدی۔ آخر میں تو خود گن کر دیتا ہوں" اب غفور میاں نے گنتے گنتے مٹھی بھر کے کہا۔ "کبھی کبھار مجھ سے کوئی اچھے بھڑے کام کو کہو تو خاں شبراتی دو ہاتھ پاؤں پٹکتا ہے تو کہ جیسے بس جان نکلی جا رہی ہے اور ہم جو یہ بیس گھنٹے تیرے بغیر تالے کے مکان کی چوکیداری کرتے ہیں تو وہ کچھ نہیں۔ خدا کسی دوسرے کے مکان میں کرایہ سے رہ کر دیکھ رات دن تالے ٹوٹ رہے ہیں۔ جس کا مال چلا گیا آج تک ملا نہیں۔

ہمارا شکر یہ ادا کرو شبراتی بیٹا کہ ادھر کوئی پرندا بھی پر نہیں مار سکتا۔ اس محلے میں اب بھی خاں اپنا حکم چلتا ہے۔ رات کو چھ مرتبہ پیشاب کرنے باہر آتا ہوں سڑک پر۔ یہ آرام تمہیں شبراتی میاں کہیں اور نہیں ملے گا۔ مگر خاں شبراتی میں نے اپنے پیشاب کا کتنا علاج کرایا مگر بار چھ کے بجائے چار مرتبہ بھی نہیں ہوا۔ بڑے بڑے حکیموں اور ڈاکٹروں کو دکھلایا۔ تین تین روپے روز کے نسخے پیے مگر مرض نہیں گیا۔ اچھا خیر۔ ہاں تو کیا کہہ رہا تھا۔ بس شبراتی تجھ میں یار یہ بات بڑی خراب ہے۔ بات پوری سنتا نہیں۔ بیچ میں ٹخ ٹخ کیا کرتا ہے۔"

"ارے دادا کیا ٹخ ٹخ کرتا ہوں چپ چاپ کھڑا سن رہا ہوں تم تو بس بات میں بات نکالتے چلے جاتے ہو۔ ایک بات ختم نہیں ہوتی کہ بیچ میں دوسری شروع ہو گئی۔ اب تمہیں انصاف کرو۔" شبراتی نے دادا کی طرف جھنجھنا کر کہا "کہاں کپڑا اور کہاں دادا یہ تمہارے پیشاب کا مرض۔"

"ابے تو کیا۔ میرا مرض تجھے لگ گیا۔" غفور میاں نے جھینپ کر غصے سے کہا "تیرے ساتھ تو میں نے رعایت کی کہ مزدور آدمی ہے، کام کو دیر ہو رہی ہے۔ ورنہ خاں شبراتی میاں میں نے انہیں پیٹیوں پر دو پیٹیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) باتوں ہی باتوں میں لوگوں کو سلا دیا ہے۔"

"اچھا دادا رعایت ہی کی تم نے میرے ساتھ مگر راستہ تو نکالو جلدی سے۔"

"ہاں دیکھو اور بہ فرض محال اگر رام پرشاد کی دوکان بند ہو تو پھر ناک کی سیدھ ابراہیم پورہ کی طرف چلا جانا دیکھ۔" اس طرح غفور میاں نے جنوب کی طرف منہ کرتے ہوئے اشارہ کیا "بس اسی طرف منہ کر کے چل دینا تو ایک۔ دو۔ تین۔ چار دوکانیں چھوڑ کر۔۔۔"

"بس دادا بس سمجھ گیا۔" شبراتی نے کہا اور تیز تیز بازار کی طرف چل دیا۔

"ارے سن تو شبراتی روپیہ تو لیتا جا۔"

"روپیہ ہے دادا میرے پاس بس کرایہ میں کاٹ لوں گا کل۔" اور جوں جوں شبراتی دور ہوتا گیا غفور میاں نے شبراتی کی طرف بڑھتے ہوئے چیخنا شروع کیا۔ "بس آگے سے سیدھے ہاتھ کو مڑ جانا ہے اور دیکھ۔۔۔ ذرا۔۔۔ مضبوط دیکھ کر لانا۔"

"او۔۔۔ شبراتی۔ کلف دیکھ لینا خاں۔"

شبراتی غفور میاں کی ہر آواز پر ہاتھ کو اٹھا اٹھا کر ہلاتا رہا۔ گویا سب سمجھ گیا ہو اور ایک قریب کی گلی میں جلدی سے داخل ہو کر غفور میاں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

غفور میاں جو شبراتی کو سمجھاتے ہوئے کافی دور تک چلے گئے تھے۔ زیر لب بڑبڑاتے ہوئے واپس ہوئے "بڑا کام چور ہے۔ پوری بات بھی نہیں سنی اور چلا گیا۔"

●●

بقیہ "بیوی کی بغاوت"

"مجھے یہ چیلنج منظور ہے!"

اس مرحلے پر آکر سمجھوتے کی بات چیت ٹوٹ گئی۔ مصلحت کے پیش نظر بیگم پلنگ پر جا کر لیٹ گئی۔ میں خصلت کے مطابق کوئی پرانا میگزین اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگا۔ گھڑی کی ٹک ٹک ہمارے غم اور مسرت دونوں کو پیچھے چھوڑ کر وقت کی منزلیں بے نیازی سے طے کرتی رہی۔ میں نے کھانا نہیں کھایا، شاید بیگم نے بھی نہیں کھایا اور پھر یوں لگا، جیسے ہم دونوں ایک دوسرے سے آہستہ آہستہ دور ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل ہوتے جا رہے ہیں۔ شاید ہم دل ہی دل میں روتے روتے سو گئے تھے کھو گئے تھے۔

اور پھر جب بھوک کے گھڑیال نے دو بجائے تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ایک گرم گرم آنسو میری پیشانی پہ آگرا ہے اور پھر ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز نازک ہاتھوں کا لمس اور چوڑیوں کی مترنم جھنکار۔

یہ کون تھا؟

یہ کوئی ٹریڈ یونین لیڈر تو نہیں تھا۔

یہ کوئی انقلابی بھی نہیں تھا۔

یہ میری اکلوتی اور پہلی اور آخری بیگم تھی جو کہہ رہی تھی۔

"اٹھو کھانا کھا لو، مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔"

●●

بقیہ "ذکر اس پری وش کا"

چاندی بھر جاتی ہے۔ خود پری وش میں اب پختگی کے آثار نظر آنے لگے ہیں۔ مگر ان کا رخِ روشن اب بھی تابناک ہے۔ جلالِ شاہانہ برقرار ہے مگر ان کے خیالات، ان کی حرکات اور ان کی پالیسی جس جذبے کے تحت تشکیل پاتی ہے وہ ماں کی محبت کا جذبہ ہے۔ ان کے دل میں اس بے لوث محبت کے انمول خزانے پنہاں ہیں اور آنکھوں میں اس محبت کے دریا لہریں مارتے ہیں۔ گرانی اور ملاوٹ کے جس دور سے ہماری زندگی گذر رہی ہے اس میں بھی انہی بے پناہ نگرانی کے باعث صاف ستھرا رزق ہم کو میسر آ رہا ہے۔ رانی جی کو جب میں ماں کی محبت کے روپ میں دیکھتا ہوں تو اس نیلی چھتری والے کے حضور میں یہ دعا مانگتا ہوں کہ ان کی حکومت ہم۔ "دائم رہے۔"

آپ شاید مسکرا رہے ہیں کہ عامرانہ حکمرانی کی اس لمبی چوڑی داستان کے بعد یہ کیا؟ —— اس کے جواب میں مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ:

اے دیکھنے والو مجھے ہنس ہنس کے نہ دیکھو
تم کو بھی محبت کہیں مجھ سا نہ بنا دے

احمد جمال پاشا
سرودی منزل، کچا احاطہ، لکھنؤ

یونیورسٹی کے لڑکے



۱۹۲۶ء ماڈل۔ الٰہ آباد میں پیدا ہوا، لکھنؤ میں پرورش پائی، علی گڑھ سے واجبی تعلیم ایم اے حاصل کرنے کے بعد پہلے تین سال "اودھ پنچ" نکالا، اب مجھے "قومی آواز" نکال رہا ہے۔ ۱۹۶۶ء میں سرود جمال سے میری شادی ہوئی۔
تصنیف، تالیف، تدوین: "اندیشۂ شہر" "ستم ایجاد" "لذت آزار" "چشم حیران" وغیرہ وغیرہ "مضامین پاشا" (زیر طبع) "مضامین اکبر الٰہ آبادی" (زیر طبع) "ظرافت اور تنقید" "احیہ ادب کی تاریخ" (زیر تصنیف)
مشاغل: ناموزوں شعر کہتے رہنا اپنی تسلی کے لیے۔ ادبی شعری نشستیں و مذاکرے برپا کرنا۔ ناقد، اہل ریڈیو، اڈیٹر، ناشر، انعامی، اعزازی کمیٹیوں کے ممبروں سے پکی دوستی کرتے رہنا۔ صبح تڑکے سے رات گئے تک اور سوتے سے اٹھا اٹھا کر گوشہ نشینی کا کام کرتے رہنا۔ گھر میں گھستے یا باہر نکلتے میں لیٹر بکس دیکھنا رات کو بھی۔ باغبانی کرنا، خاص طور پر کیکٹس لگانا (پھولوں کا زمانہ نہیں اس لئے کانٹوں سے پیار کرنا)۔ لاٹری کے ٹکٹ خریدنا۔ (احمد جمال پاشا)

صاحب لڑکوں کی تو آج کل بھرمار ہے۔ جدھر دیکھئے لڑکے ہی لڑکے نظر آتے ہیں۔ گویا خدا کی قدرت کا جلوہ یہی لڑکے ہیں۔ گھر اندر لڑکے، گھر باہر لڑکے، پاس پڑوس میں لڑکے، محلّہ محلّہ لڑکے، گاؤں اور شہروں میں لڑکے، صوبے اور ملک میں لڑکے، غرضیکہ دنیا بھر میں لڑکے ہی لڑکے، جہاں تک نظر کام کرے گی لڑکے ہی لڑکے دکھائی دیں گے اور جہاں نظر کام نہ کرے گی وہاں کا کیا کہنا کیونکہ وہاں تو لڑکے ہوں گے ہی۔

یوں تو ان کی کاشت ہر موسم، ہر آب و ہوا اور ہر ملک میں کی جاتی ہے۔ لیکن آپ جانئے ہر ملک کی روایات الگ الگ ہوتی ہیں اور اسی میں شان ہے۔ ہمارے ملک کی شان چونکہ سب سے الگ ہے لہٰذا دنیا بھر میں لڑکوں کی کاشت کے اعتبار سے ہمارا ملک سب سے زرخیز واقع ہوا ہے۔ یہاں کے باشندوں نے بنجر مقامات پر بھی ان کی کاشت کر کے ملک کو زرخیز و مالا مال کر دیا ہے۔ اس کے بارے میں کچھ ماہرین کا خیال ہے "زیادہ غلہ اگاؤ" کی تحریک کو جب سے زیادہ لڑکے پیدا کرو میں بدل دیا گیا ہے تب سے یونیورسٹیاں لڑکوں سے کھچا کھچ بھرنے لگی ہیں۔۔۔ ان میں سے پہلی قسم "حوالی طلبا" کی ہے جو اسی نام سے مشہور بھی ہے۔ خود ان طلبا کے بارے میں اب تک یہ طے نہیں کہ واقعی ان کا وجود ہے بھی یا صرف حوالے کی کتابوں کی طرح حوالے ہی حوالے ہیں۔ ان طلبا کو یونیورسٹی کے نافذا، الاؤ، منکر نکیر اور کراما کاتبین بھی کہا جا سکتا ہے۔ یونیورسٹی میں ہونے والے کھیل تماشے، مشاعرے،

قوالی، پکے گانے، ہلکے پھلکے پروگرام، جلسے، جلوس وغیرہ کے یہ سولہ آنے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ ان کے نام سے یونیورسٹی بھر واقف ہوتی ہے۔ آس پاس کے موچی ان کے نام لے کر اپنی دکانیں سڑکوں کے کنارے جماتے ہیں۔ بات بات میں ان کی تصاویر اور بیانات اخبارات ہینڈ بلس اور لیف لیٹس میں اچھلتے نظر آتے ہیں۔ مگر یہ خود نظر نہیں آتے گو کہ ان کا ذکر ہوتا ہے۔ تمام انتظامی امور میں ان کا خاص عام ہاتھ ہوتا ہے۔ یہ تخت رہے یا تختہ کے قائل ہوتے ہیں۔ مگر کچھ دشمنوں کا شک ہے کہ یہ لوگ فاتر العقل اور بدچلن ہوتے ہیں جبکہ ہمارا شک یہ ہے کہ بات کچھ اور ہے اور جو شاید خود ہم بھی نہیں جانتے ورنہ آپ سے کیا پردہ تھا۔

ان طلبا کی پہچان یہ ہے کہ یہ آپ کو ہر وقت چلتے پھرتے نظر آئیں گے۔ مگر ان کے چلنے کے راستے مقرر ہیں۔ اگر آپ کو ان کی تلاش آنکھ بند کر کے کرنا مقصود ہے تو ہماری رائے میں آپ کا من روم کے سامنے چلے جائیے۔ یہی ایک پُر فضا مقام ہے جہاں یہ لوگ موقع پاتے ہی تبدیلیٔ آب و ہوا کی غرض سے پہنچ جاتے ہیں۔ ویسے یہ شام کو حضرت گنج میں ہوا خوری کرتے نظر آئیں گے جہاں یہ سیسل روز، ایروز، کوالٹی اور اسی طرح کے انگریزی ہوٹلوں میں تفریحاً قہقہوں سے اپنے کھوکھلے قہقہے ملاتے ہوں گے۔ اگر آپ کو ان کی تمیز کرنا مقصود ہے تو آپ اپنی آنکھیں کھول کر ان کو بجائے تلاش کرنے کے شوشے یہ کہیں نہ کہیں زور زور سے کسی اہم مسئلے پر کسی نیم ریٹائرڈ قسم کے ہڑنگ سے بحث کرتے ہوں گے۔ ان کے پیچھے بہت سے عقیدت مندوں کا ہجوم ہو گا جس کا

ہونگے کہ سب کا نام جانتے ہونگے اور عام بات یہ ہوگی کہ یہ خود کسی کا نام نہ جانتے ہونگے بلکہ کسی نہ کسی طالب علم یا پروفیسر وغیرہ کو کسی ہونے والی میٹنگ کی صدارت کے لئے اکساتے ہوئے ملیں گے۔ ہر تقریب میں آپ بآسانی ان کو صدر کے دائیں بائیں پہلو میں دیکھ سکتے ہیں۔

تمام مقابلے غالباً انہی طلبا کے لئے کروائے جاتے ہیں۔ امتحانات میں فرسٹ کلاس اور تھرڈ کلاس شاید انہی نے جاری کروایا تھا۔ غرضیکہ وہ محفل محفل نہ ہوگی جہاں یہ پالا نہ مار لے جائیں۔ ہر کلاس کی چھٹی کے کلاس میں ان کا نام سب سے اوپر ہوگا یا سب سے نیچے مگر ہوگا ضرور۔ یہ تھوڑا سا فرق جو فرسٹ کلاس اور تھرڈ کلاس میں پیدا ہو جاتا ہے، وہ ان طلبا کی تنخواہ نہیں بلکہ خیالات کا ٹکراؤ ہے کیونکہ کچھ طلبا کا خیال ہے کہ ٹاپ اوپر سے یعنی ٹاپ سے کیا جائے اور کچھ کا خیال ہے کہ ٹاپ نیچے سے یعنی باٹم سے کیا جائے۔ ان کا اعتقاد اسی بات پر ہے کہ ناک ناک ہی ہوتی ہے خواہ اِدھر سے پکڑ لو یا اُدھر سے۔ باقی جو کسر ٹاپ کرنے میں رہ جاتی ہے وہ یہ طلبا، ٹیپ ٹاپ پوری کر لیتے ہیں۔ ان کے ٹیپ ٹاپ کرنے کے بھی دو طریقے ہیں۔ کچھ طلبا کا خیال ہے کہ "اعلیٰ خیالات سادہ زندگی" جبکہ بقیہ طلبا کا قول ہے کہ نہیں نہیں "اعلیٰ زندگی اور سادہ خیالات" ہونا چاہیئے۔ مگر پروفیسر اوٹ پٹانگ کا خیال ہے کہ یہ طے کرنا بہت مشکل ہے کہ خیالات اور زندگی میں کس کو اعلیٰ اور کس کو سادہ ہونا چاہیئے۔

طلبا کا دوسرا گروہ پہلے والے گروہ سے مختلف ہوتا ہے یعنی زندگی اعلیٰ پسند کرتا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ آپ ان کے جوتوں میں جو شیشے سے زیادہ چمکدار ہوتے ہیں بآسانی اپنا چہرہ دیکھ سکتے ہیں۔ یہ نہایت اعلیٰ قسم کے سوٹ پہنے ہوتے ہیں جو ٹاٹ، چمڑے، پلاسٹک وغیرہ کے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے چہروں کے بارے میں ہم آپ سے کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ آپ کو ان کے منہ پر کریم، پاؤڈر اور اسنو ملے گا مگر چہرہ نہیں ملے گا۔ مگر ہاں اگر آپ نہار منہ صبح سویرے ان کا منہ دیکھنا گوارا کریں تو ممکن ہے ان کے چہرے کا درشن ہو جائے۔

ان طلبا کے بات چیت کے طریقے ان کے کھانے پینے کے طریقوں سے مختلف ہوتے ہیں مگر پھر بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات نہیں کریں گے بلکہ کھا جائیں گے۔ جب کسی مسئلہ پر بات چیت ہوگی تو ایسا ظاہر کریں گے کہ بس ان کے جانے کی دیر ہے سمجھئے کہ مسئلہ حل ہوا۔ حالانکہ ان سے مسئلہ حل ہونا ایک دوسرا مسئلہ ہوگا مگر چونکہ ان کو بات چیت کرنے اور خطاب کرنے کی لت ہوتی ہے اس وجہ سے ہمیشہ صرف بڑے بڑے مسائل کو ہاتھ لگاتے ہیں اور بات کرنے میں ہمارا ہاتھ

پیر ہلانے، ٹھینگا دکھانے، گردن ہلانے، کندھے اچکانے اور منہ چڑھانے سے بھی نہیں چوکتے۔

طلبا کی تیسری قسم وہ ہوتی ہے جن کو ہم خیالی طلبا کہہ سکتے ہیں۔ ان کے بارے میں ہمارا خیال ہے کہ یہ یونیورسٹی پڑھنے کے لئے نہیں آتے بلکہ یونیورسٹی میں خیال کی رفتار سے آتے جاتے رہتے ہیں۔ یہ طلبا ہمیشہ طوائف الملوکی میں مبتلا رہتے ہیں۔ ان کو درجوں سے سخت نفرت ہوتی ہے۔ کبھی کبھی یہ درجوں میں چلے جاتے ہیں مگر چونکہ دل کے بالکل صاف ہوتے ہیں اور اپنی صفائی میں فرق نہیں آنے دیتے ہیں اس لئے یہ درجوں میں صرف سونے یا کسی کی تلاش کرنے کی غرض سے جانے کی تکلیف اٹھاتے ہیں اور جیسے صاف جاتے ہیں ویسے ہی لوٹ آتے ہیں۔ کسی پروفیسر سے جب یہ ٹکر لیتے ہیں جو عموماً ہو ہی جاتی ہے تو اس کو نہایت مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ ویسے ہوتے بہت ذہین ہیں اور آسانی سے نہیں جاتے۔ عموماً جس کلاس میں ایک مرتبہ بھرتی ہوتے ہیں نہایت وضع داری سے چار پانچ سال تک اسی کلاس کو نبھاتے ہیں۔ دراصل ان کے منہ اس کلاس کا خون لگ جاتا ہے ہو سکتا ہے یہ اپنے بچوں کا انتظار کرتے ہوں کہ ان کو اپنے سامنے پڑھوانے کا موقع مل جائے۔ بہرحال ان کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔

ان طلبا کی نشست و برخاست یونیورسٹی کے کافی ہاؤس "اناپورنا" "کھوپڑی" اور یونین ہال میں ہوتی ہے۔ ویسے یہ گھاس پھوس پر بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ لوگ وقت گذاری کے لئے موٹروں میں بیٹھتے ہیں جس کے پاس موٹر نہیں ہوتی وہ کوئی نہ کوئی موٹر تلاش کر لیتا ہے خواہ اس کے لئے انہیں موٹر والے کی ڈانٹ پھٹکار سہنا پڑے یا کسی کو سگریٹ پلانا پڑے۔ یہ طلبا کپڑوں کے بڑے شوقین ہوتے ہیں اس لئے ہم سے ان کے کپڑوں کی تعریف کرنا چراغ کو سورج دکھلانا ہے۔ ان طلبا کا صدر مقام گرلس کامن روم کے آس پاس کا علاقہ ہے جہاں یہ اس کثرت سے جمع ہوتے ہیں کہ رونق پیدا ہو جاتی ہے اور اس کو یہاں کی زبان میں چہل پہل یعنی چلنا پھرنا کہتے ہیں۔ یہ بات کرنے میں ایک دوسرے پر کڑی نظر رکھتے ہیں اور لباس شناس ہوتے ہیں۔ ان میں کثرت ان طلبا کی ہوتی ہے جو سال بھر ایک ہی پتلون اور ایک ہی کوٹ کو استری سے رگڑ رگڑ کر اور ایک ہی ٹائی کو الٹ پلٹ کر لٹکاتے ہیں۔ یہ کسی بات سے نہیں چوکتے۔ ہر موقع سے پورا فائدہ اٹھاتے ہیں مثلاً جاڑے کا موسم جس کا یہ بہت بے چینی سے انتظار کرتے ہیں۔ ان کو اس کا کیوں شدت سے انتظار رہتا ہے صرف اس وجہ سے کہ جاڑے آتے ہی پھٹی ہوئی قمیص اور بنیائن استعمال کرنے کا موقع مل جاتا ہے جاڑوں میں کپڑے کم میلے ہوتے ہیں۔ دوسرا جاڑا ایک فائدہ

میں گز اڑا جا سکتا ہے جس کے اگر سب بٹن لگا لیے جائیں تو قمیص کی بچت ہوتی ہے۔

چوتھی قسم ہوتی ہے اُن طلبا کی جو "سر پھرے" کہلاتے ہیں۔ آپ ان کو دیکھتے ہی بآسانی پہچان جائیں گے۔ ان کے دس کتابیں اِدھر اور دس کتابیں اُدھر بغل میں ہونگی اور نہایت سنبھل سنبھل کر چلتے ہوئے نظر آئیں گے۔ یہ رہتے ہیں خیالات کی دنیا میں۔ بات اشاروں میں کرتے اور چلتے پرچھائیوں میں ہیں۔ یہ کتابیں پڑھنے کے لئے نہیں بلکہ بانٹنے کے لئے لاتے ہیں تاکہ کچھ لوگ ان سے متاثر ہوں کچھ عبرت پکڑیں۔ ان کو موٹی موٹی کتابوں کے نام اور حوالے زبانی یاد ہوتے ہیں جب یہ بات کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ کسی لائبریری کا چپراسی بول رہا ہے۔ عام طور پر ناداں لوگ دل ہی دل میں ان پر پیچ و تاب کھاتے ہیں اور منہ پر انہیں برداشت کئے رہتے ہیں جب یہ آپ سے مجبوراً بات کرنے کے لئے رکیں گے تو یہ آپ کو سر سے پیر تک ایک گہری نظر سے اس طرح دیکھیں گے جیسے کہ یہ کسی شیر خوار بچے پر شفقت کر رہے ہوں۔ آپ ان کے سامنے کسی بہت قابل آدمی کا نام لے لیجئے آپ کی مصیبت آجائے گی۔ فوراً بہت نفرت سے سنبھل کر اور ٹھہر ٹھہر کر آنکھیں میچ میچ کر بھوں سکوڑ کر بولیں گے "ہونہہ" پھر وہ آپ سے اس کی برائی شروع کر دیں گے۔ اُن کا دن رات کا یہ کام ہے کہ دنیا بھر میں جو چیز بھی ہو اُس کی ڈھونڈ ڈھونڈ کر برائی نکالیں گے۔ اگر مسکرانا چاہیئے تو ہفتوں مسکرانے کے لئے زمین تیار کریں گے جی کڑا کریں گے۔ اور آخر میں ناکام رہیں گے۔ ایسے لوگوں کی دنیا بھر تو شاگرد ہوتی ہے۔ اگر آپ اُن کی تعریف نہ کریں گے تو بس غضب ہو جائے گا۔ "آپ جاہل ہیں۔ آپ کیا مجھیں معاف کیجئے گا۔ آپ سے ملنے کے لئے تو مجھے اپنا معیار بہت گرا کر بات کرنا پڑتی ہے۔ اگر کوئی دیکھے تو آپ کا کیا جائے گا میری مفت میں بدنامی ہوگی"۔ اگر آپ ان کی تعریف کر دیں تو یہ سمجھیں گے کہ بے وقوف بنا رہا ہے۔ اگر آپ ادب کریں تو یہ آپ کو بازار پان لینے کے لئے بھیج دیں گے۔

پانچویں قسم ہوتی ہے ان طلباء کی جو خانہ نشین کہلاتے ہیں۔ یہ بیچارے گھر سے گردن جھکا کر سیدھے یونیورسٹی پڑھنے آتے ہیں۔ یہ بہو بیٹیاں کیا جانیں کہ یونیورسٹی میں کیا ہوتا ہے۔ نہ اس کا غم کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے نہ انہیں اس کی فکر کہ پہلے قیامت آئے گی یا تیسری عالمگیر جنگ۔ درحقیقت یہ دردِ دل کو دردِ جہاں کا درجہ دینے کے سخت مخالف ہیں۔ یونیورسٹی میں پڑھتے ہیں، پھر ٹھاٹھ سے لائبریری میں گھس جاتے ہیں اور وہاں سے لگڑم گھر کی طرف بھاگتے ہیں۔ ان کو اس بات کا خوف رہتا ہے کہ گھر دیر ہو گئی تو کہیں امی نہ ماریں یا اگر راستے میں کسی نے چھیڑ دیا تو کیا

ہوگا۔ اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے۔ گھر میں گھستے ہی یہ پھر پڑھنا لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ دوسرے دن پھر اسی طرح سے آتے ہیں اور گھنٹہ ختم ہونے پر ایک کلاس سے دوسرے کلاس میں اس طرح بے تحاشا بھاگ کر گھستے ہیں گویا اُن کو کوئی کلاس میں جانے سے روک رہا ہو۔ آپس میں جگہ کے لئے بھی لڑتے ہیں۔ یہ کتاب کے کیڑے جب کتابوں کی دنیا سے باہر آتے ہیں تو ان کی حالت قابلِ رحم ہوتی ہے۔ امتحان میں ان کی زیادہ تعداد فیل ہو جاتی ہے کیونکہ آج کل جنرل پرچے زیادہ آتے ہیں جو ان کے بس سے باہر ہوتے ہیں۔ جب یہ ہنستے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ رو رہے ہیں۔ روئیں گے تو معلوم ہوگا کہ ہنس رہے ہیں، بات کریں گے تو معلوم ہوگا کہ بھاں بھاں کر رہے ہیں۔ اگر آہستہ گفتگو کریں گے تو پتہ چلے گا کہ کچھ مانگ یا سونگھ رہے ہیں۔ عام طور پر یہ بہت تنگ نظر ہوتے ہیں اور سوائے پڑھائی لکھائی کے، میں بالکل صفر ہوتے ہیں ہر چیز بہت حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کے بارے میں یہ طے کرنا ذرا مشکل ہے کہ ان کی زندگی گھر سے شروع ہوتی ہے یا یونیورسٹی سے، ویسے اگر ان کو یونیورسٹی کی چلتی پھرتی میت کہا جائے تو غالباً بیجا نہ ہوگا۔

چھٹی قسم ہوتی ہے ان طلباء کی جو خیر سے "کھلاڑی" ہوتے ہیں اور اپنے کھیل کے لئے مشہور بھی۔ یہ چوکا، پنجا اور سکسر سے کم بات نہیں کرتے۔ کرکٹ بھی اتنا ہی اچھا کھیلتے ہیں جتنی اچھی کومنٹری سنتے ہیں۔ یہ جتنے پھرتیلے ہوتے ہیں اسی قدر پڑھنے لکھنے میں صاف ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی مستقل ایک کھیل کا میدان ہوتی ہے، جس میں یہ برابر رن بناتے رہتے ہیں۔ یہ کبھی کبھی کلاسوں میں بھی چلے جاتے ہیں مگر صرف میچ کا چیلنج دینے، کھلاڑی تلاش کرنے یا ٹورنامنٹ وغیرہ کے بارے میں طے کرنے۔ پھر نہایت شدت کے ساتھ شام کا انتظار کرتے ہیں۔ کھلاڑیوں کے اوپر تبصرے کرتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ ٹیم بنا کر کھیلتے ہیں۔ لیکن اگر ٹیم نہ ملے تو اکیلے کھیلنے سے بھی نہیں چوکتے۔ اخبار کا لاسٹ پیج (آخری صفحہ) بہت شوق سے دیکھتے ہیں۔ باقی اخبار اگر اُن کا بس چلے تو بند کروا کے دم لیں ورنہ اس کو بھی آخری صفحہ بنا کر چھوڑیں۔ جب یہ لوگ کھیل شروع کرتے ہیں تو اس وقت تک کھیلتے رہتے ہیں جب تک کہ کھیل ختم نہ ہو۔

ساتویں قسم ہوتی ہے اُن طلباء کی جن کے اوپر فلمی بھوت سوار رہتا ہے۔ یہ فلم زدہ کہلاتے ہیں اور فلمی مالی خولیا میں مبتلا رہتے ہیں۔ یہ باتیں کرنے میں تشبیہ اور استعارے کی جگہ فلم ایکٹریس کے نام، مقام ولدیت، سکونت وغیرہ سے کام لیتے ہیں۔ ان کو اس سے غرض نہیں کہ کلاس میں کیا پڑھایا جا رہا ہے۔ مگر یہ آپ کو بتلا دیں گے کہ کون سی فلم میں کون کون کام کر رہا ہے اور آخر کیوں؟ یہ آپ کو بآسانی سمجھا دیں گے کہ کب اور

تکلیف میں کیا بنیادی فرق ہے جو ہم آپ میں نہیں یہ فلمی پرچہ پڑھتے فلمی
سے بھرتے اور دن دھاڑے بالی ووڈ کے خواب دیکھا کرتے ہیں فلمی گانے
فلمی اس طرح یاد ہوتے ہیں جس طرح ہیں آپ کو قومی ترانہ یاد ہو یہ ڈائیلاگ
میں بات کرتے اور پھر پچھتاتے ہیں میں چلتے ہیں۔ غرض کہ ہر وقت یا تو آرٹ
کی دنیا میں رہتے ہیں ورنہ کبھی بھاگ جاتے ہیں۔

طلبا کی آٹھویں قسم ادیب کہلاتی ہے اور شاعری یا افسانہ نگاری کے
مرض یا تنقید کے خبط میں مبتلا رہتی ہے۔ یہ آپس میں کچھ اس طرح ملتے ہی
لڑنا شروع کر دیتے ہیں کہ بس ایک دوسرے کو کھا ہی جائیں گے۔ مگر چونکہ
ان کا غصہ سوڈے کا ابال ہوتا ہے اس لئے فوراً ہی ایسا عمل پیش کرنا
کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ بیچ بچاؤ کا ارادہ کرنے والا بھی فی الحال ہی خدا کا شکر ادا کرے
کہ اچھا ہوا جو بیچ میں نہیں بولے ورنہ خواہ مخواہ شرمندگی اٹھانی پڑتی۔ یہ
تو لڑ جھگڑ کر پھر ایک ہو گئے۔ ادیب قسم کے طلبا پر ہر وقت خوف طاری رہتا ہے
کہ ادب پر جمود طاری ہے اور اس جمود کو خود اپنے اوپر اس طرح طاری کر لیتے
ہیں جیسے کوئی کھوسٹ بڑھیا کسی جوان کا صبر سمیٹ لے۔ ان کا ہاضمہ ہمیشہ
بہت خراب رہتا ہے۔

آج کل سارے ادیب تھک چکے ہیں ——— اب ان کے پاس
کہنے کو کوئی بات نہیں رہ گئی ہے۔ ادب کو بچایئے سخت خطرے میں ہے۔
تم لوگ لکھو تو میری ذمہ داری کچھ کم ہو۔ گویا ادب کے سارے چھپر کا بوجھ
ہی کی ناچیز ہستی کا سہارا روکے ہوئے ہے۔ مگر یہ لوگ اب تبرک ہوتے
جا رہے ہیں۔ دیکھئے اس تبرک سے کب محرومی نصیب ہو۔ کچھ حقیر نقیر
قسم کے بگڑے دل ادیب خطوط کے جواب میں مدیران رسائل کو متاثر
کرنے کے لئے اپنے نام کے بجائے اپنے فرضی سکریٹری کے دستخط کر دیتے ہیں۔
گویا خود اپنے ہی فرضی سکریٹری کی قائم مقامی کرتے ہیں اور خطوط میں ظاہر
کرتے ہیں کہ وہ یا تو علیل ہیں یا باہر گئے ہوئے ہیں ورنہ بہت سخت
مصروف ہیں۔ میں آپ کا پیغام اُن تک پہنچانے کی کوشش کروں گا۔
آپ ان کو پڑھ سکتے ہیں۔ ان سے بات نہیں کر سکتے۔ یہ ادب کی زبان میں
ادیب کہلاتے ہیں اور ہوتے بھی ہیں بالکل فری اسٹائل۔ انہیں ملک
اور قوم کا معمار کہا جاتا ہے۔ جی ہاں جہاں ملک کا پلستر اکھڑا یا کوئی دیوار
گری یہ اپنی کنی بسولی لے کر اس کی مرمت کے لئے پہنچ جاتے ہیں۔ ان کی
کنی ان کا قلم ہوتا ہے اور روشنائی کو گارے کے طور پر استعمال کرتے
ہیں۔ رہ گئی اینٹ کی بات تو اُن کے بھاری بھرکم الفاظ اینٹوں کا کام دیتے
ہیں۔ مثال کے طور پر مابعد الطبیعات، حفظ ماتقدم، مسئلہ لاانتہائی
اور فلسفہ اجتماع بالمتقدین اور اسی طرح کے دوسرے بھاری بھرکم الفاظ
یکجا کر کے یہ ملک و قوم کی وہ شاندار تعمیر کرتے ہیں کہ تہذیب کو پہچاننے

میں آسانی ہوتی ہے۔

یہ آپ کو گیارہ بجے رات کے بعد گروہ کی شکل میں سڑکوں پر
پھرتے نظر آئیں گے۔ پہلے یہ آپ سے بغلگیر ہو کر آپ کی جیبوں کا جغرافیہ
معلوم کریں گے۔ اس کے بعد آپ جب ان سے پوچھئے گا کہ کیوں
جناب آپ نے فلسفۂ STRAPTOKIO پر
نئی کتاب پڑھی ہے؟ تو یہ آپ کو ناقابل یقین کرتے ہوئے جواب دیں گے کہ لکھی ہوئی
ویسے پڑھ تو ڈالی ہے مگر کتاب میں سوائے حوالوں کے اور کچھ نہیں ہے
لیکن خدا کے لئے آپ ان سے جل کر یہ نہ کہہ دیجئے گا یہ کتاب اودھ
میڈیکل اسٹورز سے مل سکتی ہے!

اور وہ لڑکے جو لڑکے نہیں لڑکیاں ہوتے ہیں اُن سے طلبہ
کہاں ملنا چاہتے ہو۔ یہ گھروں سے لاکر کیلاش ہاسٹل میں رہنے لگتی
ہیں جس کے بارے میں یہ ایک عام خیال ہے کہ یہ انہی کے لئے بنایا
گیا ہے اور جہاں شاید آپ کو یاد ہو کہ کچھ لڑکوں نے رات کو پنشو پالن
وبھاگ کا بورڈ اس کے دفتر سے اکھاڑ کر جو اس سے ملا ہوا ہے ہوسٹل کے
پھاٹک پر لگا دیا تھا اور جس پر ایک آفت مچ گئی تھی اور یار لوگوں کے
نام ہو گئے تھے اور تب ہی سے اس ہاسٹل کو "پنشو پالن وبھاگ" کا لقب دے
دیا گیا جہاں کہ یہ مخلوق پلتی بڑھتی ہے۔ یہ وہاں سے نکل کر کامن روم میں
گھس جاتی ہے جس کے بارے میں یہ ایک عام خیال ہے کہ اس کے
اندر ان کی نشست و برخاست رہتی ہے اور جس کی چک کی کوئی سے
زیادہ تیلیاں ان لوگوں نے خلال کر کر کے ختم کر دیں اور اس طرح تاک
جھانک کی ایک نئی راہ پیدا کر لی۔ یہاں سے نکل کر آپ ان کو مختلف
درجوں میں سب سے آگے بیٹھا ہوا پا سکتے ہیں۔ ان کو سب سے آگے
کیوں بٹھلایا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں تجربہ کار پروفیسروں کا
خیال ہے کہ کہیں یہ لوگ بھی نہ کلاس بنک کرنے لگیں۔ اس وجہ سے ان کو
درجہ میں سب سے آگے بٹھا کر کڑی نظر رکھی جاتی ہے۔ کامن روم کے
سامنے جو گھاس کے میدان ہیں ان میں ان کے جھنڈ کے جھنڈ اُڑتے
پھرتے دکھائی پڑیں گے۔ اگر ان میں کوئی جوان کسی لڑکے سے بات
چیت کرتی نظر آئے تو لوگ کہتے ہیں مجھے اس کو کچھ ہیں
یہ سب فلرٹ کرنے والی باتیں ہیں ورنہ یہ سب تو چلتا ہی رہتا
ہے۔ یہاں چونکہ تعلیم ساتھ ساتھ دی جاتی ہے اس وجہ سے لڑکیاں
لڑکوں سے الگ الگ رہتی ہیں اور اسی لئے مصلحت کا تقاضا ہے کہ
یونیورسٹی کے ان لڑکوں کو جو لڑکیاں کہلاتے ہیں، ان کو بہت سے
الگ ہی رکھا جائے تاکہ پڑھنے والوں کا بھلا ہو اور پڑھانے والے
بھی خیریت سے رہیں۔

بھارت چند کھنہ
۶۸۔ بی ایسٹ مارڈ پلی۔ سکندر آباد (آندھرا)



"ذکر اس پری وش کا"

نام: بھارت چند کھنہ۔ تعلیم: بی۔ اے (گورنمنٹ کالج لاہور)، ایم۔ اے (تاریخ) عثمانیہ، ٹرائی پوس TRIPOS کیمبرج (انگلستان) سے تاریخ اور قانون میں۔ ملازمت آئی۔ اے۔ ایس۔ آندھرا پردیش۔
اہم خدمات: بحیثیت ممبر پبلک سروس کمیشن، جوائنٹ سکریٹری، جنرل ایڈمنسٹریشن ڈیپارٹمنٹ، چیف الیکٹورل آفیسر، کمشنر ٹرانسپورٹ، ایکسائز کمشنر، سکریٹری گورنر آندھرا پردیش جہاں سے وظیفہ یاب ہوا
مشغلے: کرکٹ۔ واحد ہندوستانی جو کیمبرج کرکٹ بلو BLUE ہوتے ہوئے آئی۔ اے۔ ایس کا رکن بھی رہا۔
زندگی: ازدواجی جس میں دستور کے تحت دی گئی سب آزادیاں مفقود کر دی گئیں۔
تصانیف: (۱) مسکراتے آنسو (افسانے) ۱۹۴۴ء } انجمن ترقی اردو حیدرآباد
(۲) مصیبتیں (مضامین) ۱۹۴۶ء } کے زیرِ اہتمام شائع ہوئیں
(۳) "ٹھنڈی بجلیاں" (مضامین) ۱۹۵۰ء ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد نے شائع کیا
(۴) "تیر نیم کش" (مضامین اور ڈرامے) ۱۹۹۲ء۔ زندہ دلانِ حیدرآباد نے شائع کیا۔
(آندھرا پردیش اردو اکیڈمی سے ایوارڈ یافتہ)
(۵) مصیبتیں۔ ہندی پرچار سبھا حیدرآباد نے اردو کتاب کو ہندی رسم الخط میں چھاپا۔
(بھارت چند کھنہ)

پیدائش پٹیالہ کے ایک دیوان خاندان میں ہوئی۔ تاریخ پیدائش مت پوچھئے کہ صنفِ نازک کی حد تک اس سوال کا پوچھنا خلافِ تہذیب سمجھا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اگر اس موضوع پر کوئی احمق سوال کر ہی بیٹھے تو بزرگوں کے قول کے مطابق یہ صنف تاریخ تو یاد رکھتی ہے مگر سنہ بھول جاتی ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ اگر انسان کا حافظہ خراب ہو تو وہ زیادہ دیر تک جوان رہ سکتا ہے۔

اس بات کا ثبوت کہ پری وش کی ولادت واقعی دیوانوں (یعنی وزیروں) کے خاندان میں ہوئی اس بات سے بھی ملتا ہے کہ بات کرتے ہوئے موصوفہ خود کو صیغۂ واحد کے بجائے صیغۂ جمع سے تعبیر کرتی ہیں، مثلاً "ہم نے ایسا کیا"، "ہم یہ کرنا چاہتے ہیں"، "ہمارا فیصلہ ہے کہ یہی ہوگا"۔ اس کے علاوہ کسی اور کو کسی معاملے میں برتری حاصل نہ ہونے دینے کی خو، گو ایسا کرنے سے کوئی خوبی ثابت نہ ہوتی ہو۔ مثال کے طور پر اگر کوئی ان کے سامنے یہ دعویٰ کرے کہ اس کے لڑکے ایسے سر پھرے ہیں کہ دن میں دس روپے کی پتنگیں اڑا دیتے ہیں، تو پری وش فوراً بے پر کی اڑانے لگتی ہیں کہ ان کی لڑکیاں اپنے اس شوق کو پورا کرنے میں ایک دن میں بیس روپے صرف کر دیتی تھیں!

تاجپوشی اور تخت نشینی ان کی [illegible] میں ہوئی۔ جب راوی تذکرہ شیروانی اور آہنی تلوار کرایہ کی لے کر اس تقریب میں شریک ہوا تو پتہ چلا کہ ہمارے خسر صاحب مرحوم ہو کر ہم کو محروم کر گئے تھے ان حقوق سے جو فرزندی میں لینے کے بعد خاکسار کو حاصل ہو سکتے تھے۔ بہرحال پری وش کی تخت نشینی کے بعد ان کا راج شروع ہوا، جو اب تک جاری و ساری ہے۔ عنانِ حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد انہوں نے ایک ایسا نظام قائم کر رکھا ہے جس میں ایک صاحب، ایک بی بی اور ایک غلام ہونے کے باوجود غلاموں کی تعداد دو ہے۔

ممکن ہے اب آپ یہ سمجھنے لگیں کہ رانی جی کے تعلق سے خاکسار غیر جانبدارانہ رویہ اختیار نہیں کر سکتا، مگر حقیقت یہ ہے کہ موصوفہ کا شمار حسینانِ جہاں میں ہونا چاہیے۔ سرو قد، متناسب جسم، سرخ و سپید رنگت، تابناک چہرہ، آہو چشم — ایک ماہِ کامل۔ زندگی میں جب پہلی مرتبہ دیکھا تھا تو ایک لڑکی تھی۔ قیس کی لیلیٰ سے زیادہ خوبصورت اور فرہاد کی شیریں سے بڑھ کر شیریں۔ لڑکی جو عورت بنی، پھر ماں بنی، گھر کی مالک، گھرانے کی رانی، جس کی حکمرانی میں سرکشی اور بغاوت شرم سے پانی پانی۔ جس کا حکم نادرشاہی، جس کے فرامین اٹل، جس کا غصہ قہر، جو لرزہ براندام کر دے، جس کے رعب سے سر اور کمر جھکے رہیں۔ جس کی خشمگیں نگاہوں سے گھر کا کتا بھونکنا بند کر کے اور دُم دبا کر پلنگ کے نیچے پناہ ڈھونڈے اور خاندان کے افراد تتر بتر ہو کر سراسیمگی کی حالت میں گھر کے کونوں اور گوشوں میں سہم کر سمٹ جائیں۔ غرض شان اس پری وش کی شاہانہ، انداز حاکمانہ، لہجہ بیباکانہ، جب لب ہلے تو غیر [illegible]

ہوں، یعنی یہ کھولیں اپنا دہانہ تو اپنے الفاظ کی روانی کے سامنے تھم جائے ٹینی سن کی پہاڑی ندی کا پانی، اور چون وچرا کرنے کا جذبہ بھسم ہو جائے مانندِ پروانہ!

جب اس رنگین قیامت کا عتاب شباب پر ہو تو آواز ایسی بلند کہ ٹیلیفون کا توسط غیر ضروری محسوس ہو۔ کانوں کے پردے ہل جائیں اور اڑوس پڑوس کی پردہ والیاں بھی پردے پرے کرکے اپنے آشیانوں سے باہر نکل پڑیں۔

جب سے رانی جی نے چابیوں کا گچھا کمر میں لٹکانا شروع کیا ہے گھر میں سخت قسم کا کنٹرول عائد ہو گیا ہے جہاں ہر چیز کسی مقفل الماری، صندوق، کمرہ یا میز کی دراز میں ہو تو اُن کی اجازت یا ایما کے بغیر تنکا بھی اِدھر سے اُدھر نہیں ہو سکتا اور خادم کو سگرٹ ماچس وغیرہ کے لئے گھر کے کتے کی طرح دُم ہلانی پڑتی ہے!

اُن کے دَورِ حکومت میں خاندان کے ارکین میں دو کا اضافہ ہوا اور مالک یعنی اُس اُوپر والے کی مرضی سے دونوں چاند کی ٹکڑیاں ثابت ہوئیں۔ اس طرح ملکہ صاحبہ اولادِ نرینہ سے محروم ہیں اور ہمیشہ خاکسار کو اس کمی کے لئے ذمّہ دار قرار دیا جاتا ہے جب صاحبزادیاں امتحانوں میں اُونچے درجے حاصل کرکے پاس ہوتی ہیں یا کوئی اور قابلِ ستائش کام انجام دیتی ہیں تو بتلایا جاتا ہے کہ آخر اُن کی رگوں میں اُن کا ہی خون ہے اور اگر شاذونادر وہ کبھی ضد کرتی ہیں یا کسی بات پر اَڑ جاتی ہیں تو ان بچیوں کی رگوں میں خالص میرا خون دورہ کرنے لگتا ہے۔

رانی صاحبہ کو اپنی رعایا سے جو کم وبیش خاکسار پر مشتمل ہے، یہ شکایت ہے کہ ان کو انتظامِ خانہ داری کی ہر ذمّہ داری سے نپٹنا پڑتا ہے جبکہ راوی دفتر میں ٹانگیں پھیلائے گلچھرّے اُڑاتا رہتا ہے۔ اُن کے خیال کے مطابق دفتر کا کام محض غپ شپ لڑانے چائے پینے، اناپ شناپ بکنے، نیچے والوں کو دھمکانے اور اوپر والوں کے سامنے بھیگی بلی کی طرح میاؤں میاؤں کرنے، اور فائلوں پر کچھ آلٹے سیدھے دستخط کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ جب کبھی مجھے دفتر سے آنے میں دیر ہو جاتی ہے تو ملکہ صاحبہ میرے انتظار میں بیزار و برسرِ پیکار، مرنے مارنے پر تیار، جب مجھ پر بڑھاپے میں آوارہ گردی کا الزام دھرتے ہوئے، دفتر کے کام کے متعلق اپنے نظریے کو بہ آوازِ بلند بیان فرمانے لگتی ہیں تو میں نہایت ادب سے اُن کے حضور میں یہ عرض کرنے کی جسارت کر بیٹھتا ہوں کہ اگر بیگم صاحبہ کے ان خیالات کی بھنک محکمہ فنانس کے کسی عہدہ دار کے کانوں میں پڑ گئی تو خادم کی جگہ تخفیف میں آجائے گی اور وہ بے روزگار ہو جائے گا اور سرکار کے دربار میں جو خراج مہینے کی پہلی تاریخ کو پیش کیا جاتا ہے اس سے حضور کو ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ اس پر ملکہ صاحبہ کچھ دیر کے لئے رُک تو ضرور جاتی ہیں مگر رعایتی ٹھوکر کے طور پر یہ فرماتی ہیں کہ اپنے عیبوں پر پردہ ڈالنے کے لئے خاکسار نے اچھی منطق تراشی ہے۔

اُن کو خادم سے یہ بھی شکایت ہے کہ جب وہ اُن اُلٹی سمجھ والے نوکروں کو سیدھی طرح کام کرنے کے لئے تنبیہ کر رہی ہوتی ہیں تو اُس نازک موقع پر خاکسار کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ شکایت درست اور بجا ہے مگر خاکسار کو اس فروگزاشت کی صفائی میں یہ عرض کرنا ہے کہ جب ملکہ صاحبہ نوکروں سے عالمِ غیض وغضب میں مخاطب ہوتی ہیں تو ایسے موقع پر میرا کچھ کہنا سننا نقار خانے میں طوطی کی آواز سے بڑھ کر اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں جس نوکر کو بڑی سفارشوں سے حاصل کیا جاتا ہے اور بڑی ناز برداری سے رکھا جاتا ہے اس کو ملازمت چھوڑ دینے کے لئے اُکسانے میں بھلا میں کیونکر شریک ہو سکتا ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ رانی جی کے راج میں بہت سے نوکر ہماری ملازمت چھوڑ کر چلے گئے۔ ان میں سے ایک پچھلی جنگ کے موقع پر فوج میں بھرتی ہو گیا!

تنگ آمد بجنگ رفت!

ملکہ صاحبہ کے نوکروں کا کچھ حال آپ نے سُنا۔ اُن میں اور مجھ میں صرف یہ فرق ہے کہ خاکسار راہِ فرار اختیار نہیں کر سکتا۔ زندگی میں بعض ایسے موقعے بھی آئے۔ جب خاکسار نے جھگڑنے کی کوشش کی مگر رانی جی نے فوراً یہ کہہ کر منہ بند کر دیا کہ اگر وہ مجھ سے شکایت نہ کریں تو اور کس سے کریں۔ کوئی اور اُن کی کیوں سنے گا۔ اور یہ کہ گائے اُسی کھونٹے کے زور پر جس سے وہ بندھی ہوتی ہے، بدکتی ہے۔

پچھلے ۲۳ سال گزارنے کے بعد یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ زندگی کی اُلجھنیں کم مگر زندہ رہنے کی بہت بڑھ گئی ہیں۔ خاکسار کو اب پوری طرح یقین ہو گیا ہے کہ یہ دُنیا عورتوں کی ہی ہے۔ جب آدمی پیدا ہوتا ہے تو پہلا سوال جو پوچھا جاتا ہے یہ ہوتا ہے کہ بچہ کی ماں کی طبیعت کیسی ہے؟ جب وہ شادی کرتا ہے تو لوگ یہ کہتے ہیں کہ کیا خوبصورت دُلہن ہے! اور جب وہ مرجاتا ہے تو لوگ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ مرنے والے نے بیوہ کے لئے کیا چھوڑا؟!

اِس دُنیا کی بس یہی ریت ہے۔ خادم اس دنیا میں اب تک جو حاصل کر چکا ہے وہ محض تجربہ ہے جس کے حصول میں اُس وحات کی عمر میں پہنچ گیا ہے جس میں پیروں میں سکت، منہ میں سوتا اور بالوں میں

(باقی صفحہ ۲۳ پر)

سلمیٰ صدیقی
"دی نش" سینٹ فرانسس ایونیو سانتا کروز ویسٹ، بمبئی ۵۴



نئی فلمی ہیروئن سے انٹرویو

انٹرویو شروع کرنے سے پہلے میں آپ کو نئی اور پرانی ہیروئن کا فرق سمجھا دوں۔ پرانی ہیروئن عقل رکھتی تھی۔ نئی ہیروئن امپالا رکھتی ہے۔ پرانی ہیروئن ایکٹنگ کرتی تھی، نئی ہیروئن نخرہ کرتی ہے۔ نئی ہیروئن اپنے سر پر گھونسلہ بناتی ہے جس میں نہ کوئی بچہ پالتی ہے نہ کوئی دماغ رکھتی ہے۔ پرانی ہیروئن بیچاری ہر روز شوٹنگ سے دو گھنٹے پہلے اسٹوڈیو پہنچ جاتی تھی اپنی ماں کے ساتھ۔ نئی ہیروئن دو گھنٹے بعد پہنچتی ہے اور اپنے عاشق کے ساتھ۔ آج کل ماں کو ساتھ لے جانے کا فیشن ختم ہو گیا ہے اور جو فیشن اب شروع ہوا ہے اس کے ختم ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ اس لئے کہ عاشق اور آفت کبھی ٹالے سے نہیں ٹلتے!

"فلم شیئر ویکلی" کے ایڈیٹر نے مجھے نئی ہیروئن سے انٹرویو کا کام سونپا تھا۔ اس ویکلی کے ایڈیٹر اور مالک شری پی ڈی بکھوکا ہیں۔ ان کا اصلی نام بھگوانداس بکھوکا ہے۔ لیکن دراصل وہ کھلے عام ایک دھوکا ہیں۔ فلم ویکلی شروع کرنے سے پہلے وہ خالی بکھو کے بیچتے تھے۔ پیشے کی مناسبت سے انہوں نے اپنا نام بھی بکھوکا رکھ لیا ہے۔

شری بکھوکا نے مجھے اپنے اخبار کا لیٹر پیڈ تھمایا اور نئی ہیروئن سے جلد سے جلد دیوالی نمبر کے لئے انٹرویو لینے کے لئے روانہ کر دیا۔

میں نے جلدی سے ایک ٹیکسی پکڑی۔ ڈرائیور کو ہیروئن کے گھر کا اتا پتا بتایا۔ لیکن ڈرائیور نے کہا "یہ پتہ تو ایکدم کنڈم ہے!"

"کیوں!" میں نے پوچھا۔

اس نے جواب دیا "یہ پتہ تو گئے مہینے کا ہے۔ اس وقت اس چھوکری کے پاس کام نہیں تھا اور اچھا سا نام بھی نہ تھا۔ اب تو وہ گلفام بلڈنگ میں رہتی ہے سولھویں سڑک پہ۔ اب اس کے پاس کام بھی ہے اور نام بھی ہے۔" پھر ٹھہر کے بولا ——— "اور دام بھی!"

"میری تصویر آپ کے سامنے ہے اس لئے یہ کہے بغیر چارہ نہیں ہے کہ میں ہی سلمیٰ صدیقی ہوں۔ اپنی پیدائش میں میری کسی خواہش یا CHOICE کو دخل نہ تھا لیکن پیدا ہونے کے بعد سے اب تک اپنی مرضی اور خواہش کی زندگی گزار رہی ہوں۔ اچھی زندگی گزارنے میں خدا، والدین، سوسائٹی تینوں ہی کا اشتراک مجھے حاصل ہے اس لئے میں اپنی زندگی سے بہت مطمئن ہوں۔ ادب، فن اور تہذیب کے متعلق وہی نظریہ رکھتی ہوں جو زندگی کو خوشگوار بنا سکے۔

فطرتاً کاہل اور مطمئن ہوں۔ اس لئے طرح طرح کی الجھنوں سے بچی بچی ہوئی ہوں۔ کلاسیکی ادب کی عزت کرتی ہوں، ترقی پسند ادب سے محبت کرتی ہوں۔ جدید ادب سے کم علمی کے باعث خائف رہتی ہوں اور ادب میں طنز و مزاح کے باب کو بہت پسند کرتی ہوں۔ وطن کے بارے میں عرض ہے کہ

گھر میرا نہ دِلّی نہ صفاہاں نہ سمرقند

بنارس میں پیدا ہوئی، علی گڑھ میں پلی بڑھی، وہیں پڑھا، پڑھایا، دلّی کی خاکِ پاک میں کچھ وقت گزارا اور اب بمبئی میں تضیعِ اوقات کر رہی ہوں۔ خاندانی حالات نہایت نارمل، یعنی معمولی، یعنی شریفانہ ہیں۔ کھینچ تان کے بھی کسی نواب، راجہ یا جاگیردار سے رشتہ حقیقت نہیں افسانہ طرازی ہوگی۔ سلمیٰ صدیقی

میں نے دل ہی دل میں ڈرائیور کی اس موزونیٔ طبع کی داد دی۔

ڈرائیور نے ایک لمبی سانس لی اور بولا۔ "کلجگ ہے . . . کلجگ ——— !"

میں نے کہا "نہیں نہیں، اس کی آنے والی فلم کا نام نیا یگ ہے، کلجگ نہیں ہے۔"

ڈرائیور نے بیزاری سے کہا "ہم فلم کی بات نہیں کرتا ہے، زمانے کی بات کرتا ہے!"

'یہ تو زمانے کی بات کرتا ہے'، میں نے سوچا۔ 'اب غالباً اپنے پرانے زمانے کی بات چھیڑے گا' ——— مگر ڈرائیور نے باتوں کا گیئر بدلتے ہوئے پوچھا ———

"کدر سے چلنا ہے؟ کنگ روڈ سے یا گھوڑ بندر روڈ سے؟"

"گھوڑ بندر روڈ سے" میں نے کہا اور خود سڑک کے شاعرانہ نام پر غور کرنے لگی۔ بمبئی کو عروس البلاد یعنی شہروں کی دلہن کہا جاتا ہے لیکن جہاں تک یہاں کی سڑکوں اور گلیوں کے نام کا تعلق ہے انہیں خوبصورت دلہنوں جیسے نام نہیں، جانوروں کے نام دیئے جاتے ہیں اور جانوروں میں بھی اہلِ بمبئی کو گھوڑے اور بندر سے بڑی الفت ہے۔ جیسے بوری بندر، گھوڑ بندر، کالا گھوڑا!!

ٹیکسی پندرھویں سڑک پہ پہنچی اور ہیروئن کا فلیٹ سولھویں سڑک پر تھا۔ بظاہر معمولی سی گنتی جاننے والے کے لئے بھی یہ فاصلہ بائے نام تھا لیکن

سے سنتے چلے آئے ہیں کہ پندرہ کے بعد ہمیشہ سولہ کا ہندسہ آتا ہے۔ لیکن بمبئی کی میونسپلٹی نے اس اتنی بڑی حقیقت کو جھٹلانے میں بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔ غالباً بمبئی کی سڑکیں بعد میں بنی تھیں۔ ان کے نمبر پہلے رکھ لیے گئے تھے۔ اس میں سڑکوں یا سڑکوں پہ چلنے والوں کی سہولت اتنی پیش نظر نہ تھی جتنی کہ نمبر ڈالنے والوں کی آسانی! پندرھویں سڑک کے بعد جب ہم اگلی سڑک پہ مڑے جسے قاعدے سے سولھویں سڑک ہونا چاہیے تھا تو وہاں سڑک کا اکیسواں نمبر لگا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے تو میں چکرا گئی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایک ہی لمحے میں یہ کایا لیعنی سڑک کیسے پلٹ گئی؟ بہت دنوں سے بمبئی میں کوئی زلزلہ بھی نہ آیا تھا۔ پھر اچانک خیال آیا کہ کہیں جلدی میں ہم بمبئی کے بجائے کوٹنا تو نہیں پہنچ گئے ہیں!

گھڑی دیکھی تو شام کے چھ بجنے والے تھے اور یہی وقت انٹرویو کے لیے بھی مقرر کیا گیا تھا۔ اکیسویں سڑک پر کھڑے ہو کر سولھویں سڑک کا انتظار کرنے میں کوئی فائدہ نہ تھا۔ مشکل یوں آسان ہوئی کہ ہمارے برابر ایک بڑی سی شوفر ڈرائیون گاڑی ٹیکسی کے قریب سے گزر گئی۔ شوفر نے جس انداز سے ٹیکسی سے اپنا دامن بچایا تھا اس سے بخوبی اندازہ ہوتا تھا کہ یہ اعلیٰ حسب نسب کی گاڑی بے سبب نہیں نازاں ہے۔ ضرور اس میں کوئی راز ہے یعنی اس کے اندر ایک عدد ہیرو اور اس کی دمسا ہے۔

اور جب گاڑی سہمی ہوئی ہماری ٹیکسی اپنے حساب سے تیسویں سڑک پہ مڑی تو سامنے سولھویں سڑک کا پتھر جڑا تھا اور بلڈنگ کے سامنے ایک کتا کھڑا تھا اور پھاٹک پہ ایک دربان بیٹھا تھا۔

کتے اور دربان کے تیور کو دیکھ کے آسانی سے اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا کہ کتا کب بولنے لگے گا اور دربان کب کاٹنے لگے گا۔ اسی لیے تو لوگ ہاگ فلمی ہیروئن کے کتے اور رنگ بھون کے دربان سے بہت گھبراتے ہیں۔

دربان اور کتے سے اجازت لیتی ہوئی میں جلدی سے ہیروئن کے فلیٹ کے دروازے پہ پہنچ گئی، دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے دروازے میں بنی ہوئی جھرّی سے آنکھ لگائی تو اُدھر سے بھی ایک آنکھ نظر آئی۔ گویا ع دونوں طرف تھی آنکھ برابر لگی ہوئی

گھنٹی بجائی تو پائل کی سی جھنکار بجتی ہی چلی گئی۔ یہ نئی گھنٹی کا نغمہ تھا۔ نئی ہیروئن کی ابتدا نئی گھنٹی سے ہوئی تھی... دروازہ تھوڑا سا کھلا... نام پوچھا گیا۔ کام پوچھا گیا... اور پھر اندر آنے کی اجازت ملی۔

میرے اندر جاتے ہی دروازہ پھر بند ہو گیا۔ نیا نیا فلیٹ تھا۔ نیا نیا فرنیچر تھا۔ نئی ہیروئن کی خوشبو کے بجائے فضا میں نئے وارنش کی مہک رچی ہوئی تھی جیسے ہیروئن کی شہرت کا وارنش بھی نیا نیا تھا۔ میرے سامنے ایک سن رسیدہ خاتون اپنے سائز سے بڑا ہاؤس کوٹ پہنے کھڑی تھیں۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے اپنی دنیا دیکھی ہوئی آنکھ کے ایک کونے سے جس طرح کا اشارہ کیا اس سے میں یہ نہ سمجھ سکی کہ انہوں نے مجھے بیٹھنے کے لیے کہا یا کسی مکھی کو اڑایا ہے۔

میں بیٹھ گئی تو وہ بھی بیٹھ گئیں۔

میں نے پوچھا "مس گلنار کب تک مل سکیں گی؟"

وہ بولیں: "بی بی کو فرصت کہاں ہے آپ سے ملنے کے لیے۔ اس وقت اُس نے سات پروڈیوسروں کو اور سات ہیروں کو ٹالا ہے۔"

"بڑی مہربانی ہے۔" میں نے کہا۔

سامنے کا پردہ ہلا اور مس گلنار ہماری نئی ہیروئن کسی نئے پوسٹر کی طرح چمکتی دمکتی تشریف لے آئیں۔

میں نے اپنی نوٹ بک سنبھالی۔ انہوں نے اپنے بالوں کی لٹ سنبھالی۔

میں نے قلم نکالا، انہوں نے رومال نکالا۔

میں نے پوچھا "مس گلنار آپ کو فلم لائن میں لانے کا سہرا کس کے سر بندھنا چاہیے؟" پتہ نہیں انہوں نے میرا سوال سمجھا کہ نہیں سمجھا۔ لیکن سہرے کے نام پر بہت شرمائیں کہنے لگیں۔

"ابھی تو میری شادی ہوئی نہیں ہے۔ مجھے کیا پتہ سہرا کس کے سر بندھے گا۔"

میرا دوسرا سوال تھا۔ "آپ کی خوبصورتی کا راز کیا ہے؟"

بولیں: "پنٹو اور سندرم"

میں نے حیرت سے پوچھا "پنٹو اور سندرم کون ہیں؟"

وہ بولیں "ایک پالش والا ہے، ایک مالش والا ہے۔ پنٹو میک اپ کرتا ہے۔ سندرم مالش کرتا ہے۔ وہی دونوں میری خوبصورتی کا راز جانتے ہیں۔"

اگلا سوال تھا۔ "آپ کب پیدا ہوئی تھیں؟"

اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے ہیروئن نے اپنی ماں سے پوچھا۔ "ممی... میں کب پیدا ہوئی تھی؟"

ممی بولیں "پیدا... پیدا تو تم ہوئی تھیں، بیشک پیدا ہوئی تھیں"

میں نے پوچھا۔ "مس گلنار جب یہ ثابت ہو ہی چکا ہے کہ آپ بیشک پیدا ہوئی تھیں تو یہ بھی بتا دیجیے کس دن اور کس تاریخ آپ کا جنم ہوا تھا۔"

اس کا جواب بھی مس گلنار کی بجائے ان کی والدہ نے دیا۔ مجھے

بجھو سے بولیں۔

"دن میں کیا رکھا ہے جی... سب دن ایک سے ہوتے ہیں... ویسے برسات کا دن تھا شاید اور تاریخ... تو میرا خیال ہے کہ تاریخ بھی ضرور کوئی تھی" کسی ماہر سیاست داں کی طرح وہ بولیں۔

"ابھی تاریخیں بھی کون سی سو دو سو ہوتی ہیں وہی تیس اکتیس کے دن ہوتے ہیں۔ اسی میں سے کوئی تاریخ سمجھ لیجئے... ہاں فروری کے دو دن گھٹا دیجئے گا۔"

یوم پیدائش اور تاریخ پوچھنے کے بعد میں نے پوچھا۔

"آپ کہاں کی رہنے والی ہیں؟"

مس گلنار نے کہا "میں تو زیادہ تر گھر سے باہر ہی رہتی ہوں..."

"ٹھیک ہے" اس سے بہتر جگہ رہنے کے لئے اور کیا ہو سکتی ہے۔ آپ کس طرح کے (GAMES) پسند کرتی ہیں آؤٹ ڈور یا اِن ڈور...؟"

بولیں "۔ اب گیمس کے لئے وقت ہی کہاں ملتا ہے۔ ویسے شوٹنگ آؤٹ ڈور ہی پسند کرتی ہوں۔"

"اچھا مس گلنار یہ بتائیے کہ آپ کا پسندیدہ رنگ کون سا ہے؟"

مسکرا کر بولیں "پہلے تو بہت سارے رنگ پسند تھے، اب تو بس سارنگ پسند ہے۔"

جی "میں نے گھبرا کے پوچھا "سارنگ! یہ کس طرح کا رنگ ہے۔"

"جی یہ میری نئی فلم کا پروڈیوسر ہے۔ اپنا سارنگ!"

"ٹھیک ہے ٹھیک! اور مس گلنار! آپ کو کھانے پینے میں کیا کیا چیزیں پسند ہیں اور کیا کیا چیزیں ناپسند ہیں؟"

"کھانے کی چیزوں میں مجھے چنیز پسند ہے اور پینے کی چیزوں میں بس پانی کو ناپسند کرتی ہوں..."

"آپ کس طرح کے رول پسند کرتی ہیں ٹریجک یا کامیڈی کے؟"

بہت سوچ کے مس گلنار بولیں "مجھے وہ ٹریجڈی اچھی لگتی ہے جو آخر میں کامیڈی بن جاتے۔"

ہیروئن کی ماں بیٹی کے اِس جواب سے بہت متاثر ہوئیں اور بڑے فخر سے اس کی جانب دیکھ کے مجھ سے بولیں۔

"یہ بچپن سے بڑی اِن ٹیلیجنٹ ہے جی، بالکل مجھ پر پڑی ہے۔"

"بیشک آپ کی بیٹی کا شمار ہیروئن میں بھی ہو سکتا ہے اور انٹلیکچوئلز میں بھی" میں نے کہا "اور بات جب انٹلکٹ پر پہنچ گئی ہے تو کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ مرزا غالب کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

مس گلنار مسکرا کر بولیں "غالب تو اس کا فلمی نام تھا۔ اصلی نام تو بھارت بھوشن تھا جی اُس کا۔"

"جی؟"

"جی ہاں، میں نے بہت بچپن میں یہ پکچر دیکھی تھی اب تو اس کی اسٹوری ٹھیک سے یاد نہیں ہے۔"

"آئیے!! اب کچھ شعر و ادب کے بارے میں بات ہو جائے۔"

مس گلنار بولیں "شیر تو مدھیہ پردیش کے فارسٹ میں بہت ملتا ہے۔ کوئی کوئی لوگ ہاتھی کا شکار بھی کرتا ہے۔ یہ عجب کا شکار ہم نے کبھی نہیں سُنا۔"

"عجب نہیں مس گلنار! ادب! ساہتیہ! لٹریچر..."

"اچھا اچھا وہ ادب جو ڈائیلاگ رائٹر لکھتا ہے؟"

"جی ہاں، میرا مطلب اسی ادب سے ہے!" میں نے کہا "غالب کا یہ شعر آپ کو کیسا لگتا ہے۔

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو"

مس گلنار بہت حیران ہو کے بول اٹھیں۔

"نوا سنجے؟ سنجے تو جونا اسٹار ہے۔ وہ نیا تو نہیں ہے...!"

اِس جواب پر میں جھوم اٹھی۔ پھر میں نے پوچھا:

"اور مس گلنار! آرٹ کے متعلق بھی ہمارے پاٹھک آپ کی رائے جاننا چاہیں گے!"

"اوہ آرٹ ـــــ سچ ـــــ آرٹ بہت گریٹ ہوتا ہے۔"

"آپ کو کون سا آرٹ پسند ہے؟"

"اجنتا آرٹس... وہاں تو میں اکثر جاتی رہتی ہوں۔ نرگس اور سنیل دت سے ملنے..."

ہیروئن نے جواب دیا اور اب میرے ضبط نے بھی جواب دے دیا تھا خاموشی سے میں نے کاغذ سنبھالے اور ہیروئن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے رخصت ہو گئی۔

واپسی پر جب ٹیکسی آدھا فاصلہ طے کر چکی تو میں نے گھبرا کر ڈرائیور سے کہا "ٹیکسی واپس لے چلو! میں ہیروئن کے فوٹو لانا بھول ہی گئی ہوں..."

"تو اتنی دیر تک آپ کیا کرتی رہیں؟" ٹیکسی ڈرائیور نے کہا "ہیروئن سے تو بس فوٹو ہی لئے جاتے ہیں۔ باقی سب کچھ تو اخبار والے خود ہی لکھتے ہیں۔"

"ایں! تمہیں کیسے پتہ...؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

ڈرائیور نے ٹھنڈی سانس بھری اور بولا "پہلے میں بھی فلم کا ہیرو تھا!!"



جیتئے

20,50,000 روپے

کے انعامات

ڈاک گھر کے سیونگز بنک کے ذریعے

6 اپریل 1974ء سے پہلے پہلے ڈاک گھر میں 200 روپے یا اس سے زیادہ رقم جمع کرکے سیونگز بنک کھاتہ کھول دیں۔ 30 ستمبر 1974ء تک جمع شدہ رقم دو سو روپے سے کم نہ ہونے دیں۔

اگر آپ نے پہلے ہی کھاتہ کھول رکھا ہے تو 6 اپریل 1974ء سے پہلے پہلے اس میں جمع شدہ رقم 200 روپے یا اس سے زیادہ ہو جانی چاہیئے۔

اپنے نام پر ایک سے زیادہ کھاتے کھول کر آپ اپنے لئے انعام جیتنے کے مواقع بڑھا سکتے ہیں (ایک ڈاک گھر میں ایک سے زیادہ کھاتہ نہیں ہونا چاہیئے)۔ یاد رکھیئے کسی ایک شخص کے نام پر تمام کھاتوں میں جمع شدہ رقم مجموعی طور پر 25 ہزار روپے سے زیادہ نہیں ہونی چاہیئے۔

کنبے کے ہر فرد کے نام پر کھاتہ کھولئے۔

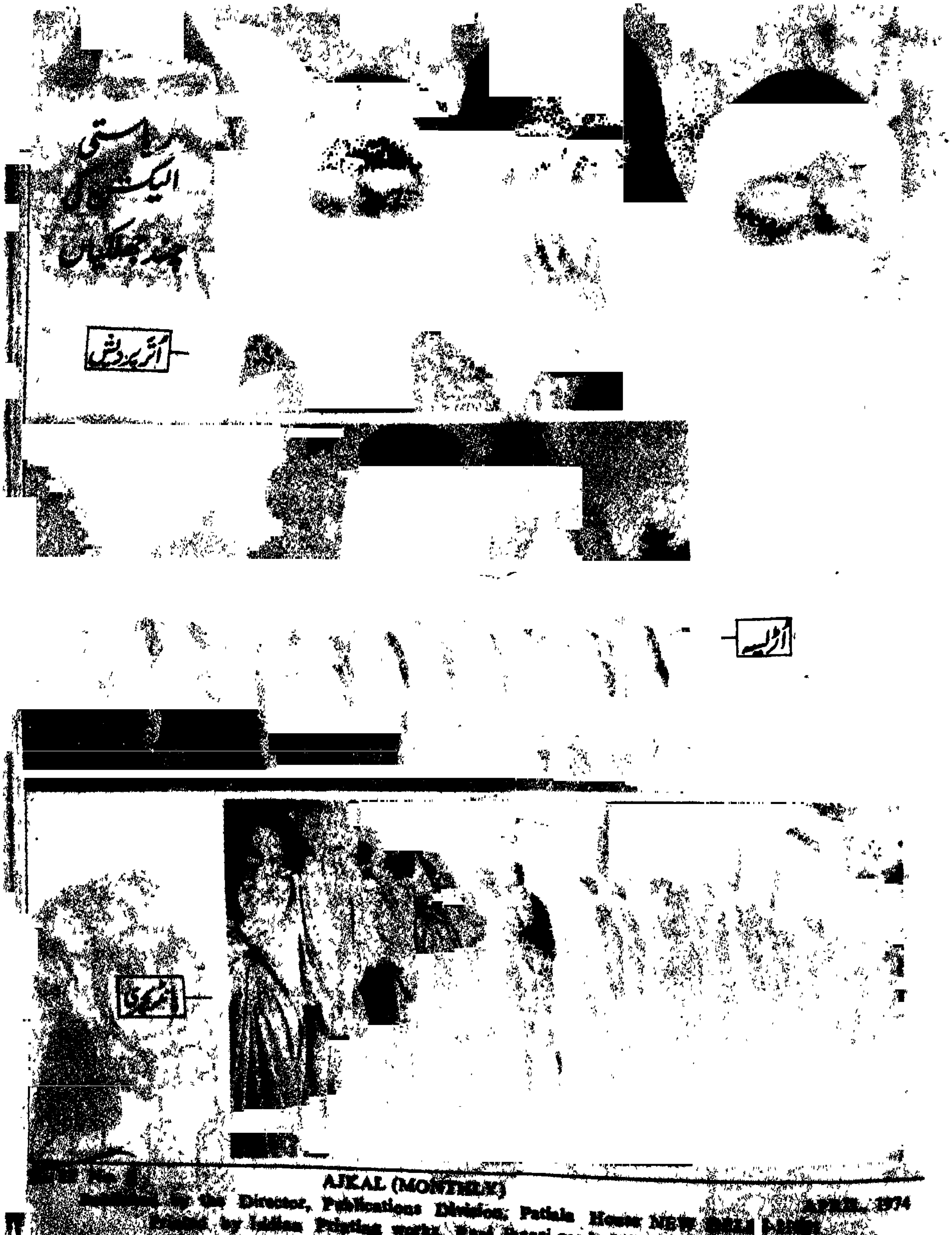
بھاری انعامات اور سُود اس کے علاوہ!

انعام	تعداد	رقم
پہلا	1	1,00,000 روپے
دوسرا	5	50,000 روپے فی انعام
تیسرا	10	20,000 روپے فی انعام
چوتھا	100	5,000 روپے فی انعام
پانچواں	1,000	500 روپے فی انعام
چھٹا	10,000	50 روپے فی انعام

لاٹری جنوری 1975ء میں نکالی جائے گی۔
تفصیلات کے لئے درج ذیل پتہ پر لکھئے۔
نیشنل سیونگز کمشنر، پوسٹ بکس 1001، ناگپور

davp 73/631

آج کل نئی دہلی



AJKAL (MONTHLY)
Published by the Director, Publications Division, Patiala House, NEW DELHI APRIL, 1974
Printed by Indian Printing works, Rani Jhansi road, NEW DELHI

ڈاکٹر تاراچند صاحب کی

چند یادگار تصاویر

اُردو کا مقبولِ عام مصوّر ماہنامہ

آج کل

نئی دہلی

ایڈیٹر

مہدی عباس حسینی

ٹیلیفون نمبر :- ۳۸۷۰۶۹

سب ایڈیٹر

نند کشور وکرم

جلد (۳۲) شمارہ (۱۱)

جون ۱۹۷۴ء

جیٹھ اساڑھ شک سنہ ۱۸۹۶

شرحِ چندہ

سالانہ	دس روپے	۱ پونڈ	۳ ڈالر
دو سالہ	۱۷ روپے	۱ر۱۰ پونڈ	۵ ڈالر
سہ سالہ	۲۴ روپے	۲ر۴ پونڈ	۷ ڈالر
فی پرچہ	ایک روپیہ	۱۰ پنی	۳۰ سینٹ

ترتیب

سرورق: عکس: جیون اڈلجہ

شائع کردہ

ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ

ایڈیٹر "آج کل" (اردو)، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیلِ زر کا پتہ

بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

گذشتہ برس ڈاکٹر تاراچند صاحب کی وفات پر ملال پر ہم نے جو چند سطور سپردِ قلم کی تھیں، اُن میں یہ ارادہ بھی ظاہر کیا تھا کہ "آج کل" کا ایک آئندہ شمارہ موصوف سے مخصوص کیا جائے گا۔ موجودہ شمارہ اسی ارادے کی تکمیل ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی ذاتِ والاصفات کسی تعریف کی محتاج نہیں۔ انہوں نے گنگا جمنی تہذیب کو سنوارا اور جلا دی۔ وہ ایک جید عالم، مشہور مورخ، اعلیٰ مدبر، مشفق استاد اور تعلیم داں تھے۔ ایران میں ہند کے سفیر کی حیثیت سے انہوں نے وہاں کے اہلِ علم و دانش پر اپنی علمیت، تدبر، انسان دوستی اور رواداری کے گہرے نقوش چھوڑے۔ آج بھی ہند کی طرح ایران کی ادبی مجالس میں ان کا نام بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔

پبلیکیشنز ڈویژن کو یہ فخر و شرف حاصل ہے کہ اس نے ڈاکٹر صاحب کی انگریزی میں تحریر کردہ "تاریخ تحریکِ آزادیٔ ہند" شائع کی ہے۔ یہ معرکتہ الآرا کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہے

⁂

وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی حال ہی میں ایران کا کامیاب دورہ کرنے کے بعد وطن لوٹی ہیں۔ اپنے قیام کے دوران انہوں نے شہنشاہ اور دیگر عمائدینِ حکومت سے سود مند تبادلۂ خیالات کیا جس کا نتیجہ دونوں ملکوں کے مابین اقتصادی، کلچرل اور ٹکنیکی میدانوں میں مزید تعاون کی شکل میں نکلا۔ یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ دونوں ملکوں کے تعلقات اور روابط مزید مضبوط اور خوشگوار ہو گئے ہیں۔ ایران کو یقین ہو چکا ہے کہ حکومتِ ہند برِ صغیر میں پائیدار امن کی تہِ دل سے خواہاں ہے۔

ہند اور ایران کے تہذیبی اور تمدنی تعلقات نہایت دیرینہ ہیں۔ خود ہماری وزیرِ اعظم کے الفاظ میں "بھارت اور ایران نے الگ الگ راہیں اختیار کیں لیکن ہم عصر زندگی میں دونوں کے گذشتہ روابط کی جھلک ملتی ہے۔ ہماری زبان میں فارسی کے الفاظ اور ہماری موسیقی میں ایران کے اجزا بھی ہیں اور ہماری بہت سی تاریخی عمارتوں پر ایرانی طرزِ تعمیر کی چھاپ ہے۔"

ہمیں امید ہے کہ دونوں ممالک کی باہمی دوستی اور خوشگوار تعلقات ایشیا کے اِس خطے کی ترقی و خوشحالی میں ممد و معاون ثابت ہوں گے۔

⁂

دسمبر ۱۹۷۱ء کی چودہ روزہ جنگ کے بعد جن ۹۳ ہزار پاکستانی فوجیوں اور غیر فوجیوں کو ان کی جانوں کی حفاظت کے لئے ہندوستان میں رکھا گیا تھا اب اُن میں سے ہر ایک اپنے وطن واپس پہنچ چکا ہے۔ ان سب کو واپس بھیجکر ہند اور بنگلہ دیش کی حکومتوں نے پھر دنیا پر ظاہر کر دیا ہے کہ وہ برِ صغیر میں امن اور فقط امن کی خواہشمند ہیں۔ جنگی قیدیوں کی رہائی اور واپسی ہند اور بنگلہ دیش کی انسان دوستی، تدبر اور رواداری کی ایک ایسی مثال ہے جس کی نظیر حالیہ تاریخ میں ملنا محال ہے۔

نظر بندی کے دوران پاکستانیوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا گیا۔ اس کی تعریف بین الاقوامی ریڈ کراس نے بھی کی ہے۔ دیگر سہولیات کے علاوہ انہیں مکمل مذہبی آزادی تھی، انہیں قرآن مجید کے ہزاروں نسخے دیئے گئے، انگریزی اور اردو کے اخبارات و جرائد مہیا کئے گئے اور عید الفطر اور عید الاضحٰی اور نئے سال کے موقعوں پر اُن کی ضیافت کے انتظام کئے گئے۔

امید ہے کہ پاکستان کے اربابِ اقتدار بھی برِ صغیر میں پائیدار امن کی بحالی کے لئے دوستی کا ہاتھ بڑھائیں گے۔

⁂

۲۵ اپریل کی صبح یہ خبر سن کر از حد ملال گزرا کہ ہندی کے مشہور شاعر رام دھاری سنگھ دنکر دل کا دورہ پڑنے سے مدراس میں انتقال کر گئے۔ دنکر جی نے دُنیائے ادب میں بڑا نام پیدا کیا۔ انہیں اُن کی شہرۂ آفاق تصنیف "اُروشی" کے لئے گزشتہ برس ملک کا سب سے بڑا ادبی انعام "گیان پیٹھ ایوارڈ" ملا۔ ان کی اچانک موت سے ملک کے ادب کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔

قرۃ العین حیدر
آشا محل - نوروجی، گمباڈیا روڈ - بمبئی ۲۶

کارِ جہاں دراز ہے

فصل سوم

باب ۵ - نوجوان ترک

۲۱ جولائی ۱۹۰۵ء نمازِ جمعہ کے بعد سلطان المعظم مسجد سے نکل رہے تھے۔ کسی نے بم کا گولہ ان پر پھینکا۔ ۲۴ آدمی ہلاک ہوئے۔ سلطان المعظم بال بال بچ گئے۔ چہرے سے کسی قسم کا خوف و اضطراب ظاہر نہ ہوا۔ سلطان المعظم کے بچنے کی خبر پر لاہور میں مسلمانوں نے بعد نمازِ جمعہ شکرانے کے نفل پڑھے اور درگاہِ حق تعالیٰ میں ان کی صحت اور سلامتی کے لئے دعائیں مانگیں ———— تہذیب نسواں لاہور۔

"نوجوان عثمانیوں" کی خفیہ جماعت صدر اعظم علی پاشا کے دور میں قائم ہوئی تھی۔ ۱۸۷۲ء میں جب سلطان عبدالحمید دوئم نے پریس پر مکمل پابندی عائد کی تو ترک انقلابیوں نے یوروپ میں بکھر کر وہاں سے رسالے اور کتابچے شائع کرنا شروع کئے جو ترکیہ اسمگل کئے جاتے۔ حکومت نے جاسوسوں کا جال پھیلا دیا۔ نامق کمال اور ضیا بے پیرس فرار ہوئے۔

"انجمن اتحاد و ترقی"، "نوجوان عثمانیوں" کی جانشین جماعت تھی۔ یوروپ کی تحریک انقلابی انجمنیں اس سے منسلک ہوئیں۔ نوجوان ترکوں کا پہلا اجتماع پیرس میں ۱۹۰۲ء میں ہوا۔ اس کے بعد یہ جماعت انڈر گراؤنڈ ہو گئی۔ نوجوان ترک خواتین بھی ان تنظیموں میں شامل تھیں۔

نوجوان ترکوں کو اپنے ذرائع سے معلوم ہوا کہ ایڈورڈ ہفتم اور زار نکولس دوئم نے ایک خفیہ معاہدہ کیا ہے جس کی رو سے برطانیہ اور روس دولت عثمانیہ کو آپس میں تقسیم کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ یہ اطلاع ملتے ہی مصطفیٰ کمال اور چند جوشیلے نوجوان فوجی افسروں نے ایک اور جماعت قائم کی جس میں فود بے، نیازی بے اور جمال بے شامل تھے۔

مصطفیٰ کمال مع ساتھیوں کے پکڑ لئے گئے۔ ۱۹۰۵ء میں قید سے رہا ہوئے۔ کُرد بغاوت فرو کرنے کیلئے اپنی رجمنٹ کے ساتھ انہیں صوبہ شام روانہ کر دیا گیا۔ ۱۹۰۶ء میں عصمت بے (مستقبل کے عصمت انونو) ملٹری کالج استنبول سے نکلتے ہی "نوجوان ترکوں" میں شامل ہو گئے۔

مصطفیٰ کمال کا فوجی دستہ دمشق میں تعینات تھا۔ یہاں انہوں نے ۱۹۰۶ء میں ایک اور انڈر گراؤنڈ "وطن و حریت" کی بنا ڈالی۔ اس کی شاخیں یروشلم، حیفہ اور بغداد میں قایم کی گئیں۔

بغداد میں ڈریگومین سجاد حیدر کا وطیرہ یہ تھا کہ دفتر کے بعد قونصل خانہ کے کلب جانے کے بجائے شہر کے ترک صحافیوں اور ادیبوں کے ساتھ وقت گزارتے۔ نہایت شستہ و رواں ترکی اور عربی بولتے تھے۔ انگریزی کے ماہر اور فرانسیسی سے واقف۔ ترکی زبان و ادب کے عاشق۔ قلمی نام یلدرم۔ نوجوان ترکوں کے حامی اور ان میں مقبول۔ نہایت ولولہ انگیز زمانہ تھا۔

مصطفیٰ کمال کی انجمن "وطن و حریت" کی شاخِ بغداد کا پہلا جلسہ یلدرم کے مکان پر ہوا۔ بابِ عالی کے جاسوسوں کے خوف سے یلدرم نے اپنا عرب ملازم مکان کے دروازے پر بٹھا دیا تھا۔ اس کے بعد ہر ہفتہ یا فوری میٹنگ کے مواقع پہ بے حد احتیاط برتی جاتی۔

یلدرم کے بھانجے سید عثمان حیدر ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۳ء تک بسلسلۂ ملازمت ایران و عراق و فلسطین[1] و ترکی میں مقیم رہے۔ بغداد میں ایک مرتبہ سخت بیمار پڑے اور بغرضِ علاج ترکی گئے جہاں دیار بکر میں ترکی کی نئی جمہوری حکومت نے بہت بڑا شفاخانہ تعمیر کروایا تھا۔ سید عثمان حیدر لکھتے ہیں :-

"خوش قسمتی سے انہیں دنوں غازی عصمت پاشا یعنی عصمت انونو وزیر اعظم ترکی نے ماسکو جاتے ہوئے دو دن کے لئے دیار بکر میں قیام کیا۔ دوسرے سرکاری اداروں کا معائنہ کرتے ہوئے اس ہسپتال میں بھی تشریف لائے۔ سب مریضوں سے مصافحہ اور مزاج پرسی کرتے میرے پلنگ کے نزدیک آئے۔ میرے سینے پر میرے نام اور ملک کا کارڈ لگا تھا۔ ڈاکٹر زبانی ہر مریض کا تعارف کراتا جا رہا تھا۔ میرا نام معلوم کر کے عصمت انونو نے فرانسیسی تلفظ کے ساتھ انگریزی میں مجھ سے پوچھا۔

'Do you know Yildirim Sajjad Hyder?'

'Yes, Your Excellency.'

'How? Are you related to him?'

---

[1] "مشاہدات بلادِ اسلامیہ" از محمود عثمان حیدر، ادارۂ علم مجلسیؔ کراچی نے ۱۹۶۲ء میں دوبارہ شائع کی ہے۔

'Yes, Your Excellency. He is my uncle.
'Real uncle ? '
'Yes , Your Excellency. My mother's brother.'
' Do you write to him ? '
' Yes, Your Excellency, I do.'
'Fine. When you write to him next do convey my Selam Aleikh.

اسکے چندمنٹ بعد مزید باتیں کیں اور آگے بڑھ گئے۔ دوسرے ہی دن میں نے یہ واقعہ ماموں جان کو علی گڑھ لکھ کر بھیجا جس پر انہوں نے جواب میں مجھے لکھا کہ عصمت پاشا کو انہوں نے اس بندہ نوازی پر شکریہ کا خط لکھا ہے۔

کمال اتاترک کی مشہور تقریر

Seven Day's speech by Ghazi Mustafa Kemal Pasha.

اس زمانے میں انگریز بہادر نے ہندوستان میں یہ کتاب [illegible] کر رکھی تھی۔ دوسرے ممالک میں بھی جہاں برطانوی تسلط تھا اس بات کی کڑی نگرانی رکھی جاتی تھی کہ ہندوستانی اسے ہاتھ نہ لگا پائیں۔ بغداد میں ایک مرتبہ بہت کوشش سے میں ترکی سفارت خانے کے فرسٹ سکریٹری سے ملا اور ان سے اظہارِ مدعا کیا (اس وقت عراق میں انگریز کا اتنا دبدبہ تھا کہ وہ کتاب وہاں بھی بازار میں کہیں نہ بکتی تھی۔ لوگ آکر ترکی سفارت خانے سے خرید لیا کرتے تھے۔ فرسٹ سکریٹری نے جاکر سفیر سے یہ کتاب لینی چاہی (جو انہی کی تحویل میں رہتی تھی)، چنانچہ مجھے سفیر صاحب کے سامنے پیش ہونا پڑا۔ موصوف نے بڑے اخلاق سے فرمایا کہ آپ ہندوستانی ہیں یہ جرأت کیسے کر رہے ہیں۔ اتنے میں فرسٹ سکریٹری نے میرا ملاقاتی کارڈ جو ان کے ہاتھ میں تھا سفیر صاحب کے سامنے رکھ دیا۔ ان کا مطلب شاید یہ رہا ہوگا کہ برطانوی سفارت خانے سے تعلق رکھتا ہوں اور وہاں ایک ذمہ دار عہدہ پر فائز ہوں۔ لیکن سفیر موصوف نے کارڈ پر میرے نام کے ساتھ حیدر پڑھ کر بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھا اور وہی عصمت انونو والا سوال دہرایا۔

'Do you know EFFENDI, Sajjad Hyder Yildirim ?'

میرا وہی جواب "یس یور ایکسی لنسی"
پوچھا " ہاؤ ہاؤ دو یو نو دس گریٹ مین"
میرا وہی جواب کہ "میرے سگے ماموں ہیں۔"

سفیر صاحب نے بڑے جوش سے مجھ سے مصافحہ کیا۔ چند منٹ ادھر اُدھر کی باتیں کیں اور چائے کا حکم دیا۔ میرے متعلق بہت کچھ دریافت کیا۔ پھر کہنے لگے آپ ہماری جدید حکومت کے ایک محسن کے عزیز ہیں۔ میں آپ کو یہ کتاب بطور تحفہ دوں گا۔ مگر شرط ہے کہ پڑھ کر مجھے واپس کر دیں۔ آفندی بلدرم اس زمانے میں جب کہ ہم لوگوں کا شمار غداروں میں ہوتا تھا اور وہ برطانوی سفارت خانے میں بحیثیت مترجم (Dragoman) ملازم تھے ہم لوگوں کے ساتھ ہر ممکن تعاون کرتے رہے اور رؤف پاشا سے ان کے گہرے تعلقات ہوگئے تھے۔ آج سے آپ ہم سب کے بھانجے ہیں!

میں تو کتاب لے کر اور ان کا شکریہ ادا کر کے چلا آیا مگر وہ مجھے نہ بھولے (افسوس کہ ہزار کوشش کے باوجود ان کا نام یاد نہیں آرہا) کبھی کسی ڈپلومیٹک دعوت میں سامنا ہو جاتا تو خود آگے بڑھ کر مجھ سے بڑی شفقت سے ملتے۔ دو مرتبہ گھر پر مدعو کیا۔ میرے ہاں مع فیملی کے آئے۔ جب میں تبادلے پر فلسطین جانے لگا تو ہم دونوں کی دعوت کی اور کتاب واپس کرنے پر بڑی شاباش دی اور کہنے لگے "بھانجے آفندی میں تو یہ بھول ہی گیا تھا!" میں ان ملاقاتوں کے متعلق برابر ماموں جان کو لکھتا رہتا تھا اور ماموں جان نے ایک مرتبہ ترکی زبان میں سفیر صاحب کو بھی شکریہ کا خط لکھا تھا۔ اور ان کی فرمائش پر ان کو اپنی تازہ تصویر بھی بھیجی تھی جو سفیر صاحب نے بہت خوش ہو کر ماموں جان کے خط کے ساتھ مجھے دکھائی۔"

صاحبان پی اینڈ او کا جہاز کب سے کھڑا بھونپو بجا رہا ہے۔ اب تک اس پر سے مسافروں کی جانے کتنی نسلیں چڑھیں اور اتر گئیں۔ کتنی مسافتیں طے ہو گئیں۔ آیئے اس پر سوار ہو کر دوبارہ ۱۹۰۷ء کے بغداد واپس چلیں۔

فصل سوم، باب ۶

غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

سید سجاد حیدر سے قبل محمد حسین رامپوری نے دو ترکی ناول انگریزی سے اردو میں منتقل کئے تھے۔ سجاد حیدر نے زمانۂ طالب علمی میں تین ناولٹ "زہرا"، "مطلوب حسیناں"۔ اور "ثالث بالخیر" ترکی سے راست ترجمہ کئے۔ وقت بہت تیزی سے گزرتا ہے۔ یہ آج سے بہتر برس قبل کی بات ہے۔ جب ۱۴ اگست ۱۹۰۲ء کے روز ۲۲ سالہ سجاد حیدر نے "ثالث بالخیر" کے دیباچے میں لکھا:۔

"میری تمنا یہ تھی کہ کسی طرح ترکوں کے قصے ترجمے ہوں ترکوں کی سوشل زندگی کی تصویریں اُردو میں اسلئے ضروری سمجھتا تھا کہ ہماری سوسائٹی اور طرزِ معاشر میں جو انقلاب پیش آرہا ہے وہ انہیں بھی پیش آچکا ہے۔ اس وجہ سے

---

[13] ترکی یورالی التائی زبان ہے اور اس کا یورپین اور سامی لسانی خاندانوں سے تعلق نہیں رکھتی، گو اس چغتائیہ میں عربی اور فارسی الفاظ داخل ہو گئے۔ یہ عثمانی یا مغربی ترکی آذربائیجان، اناطولیہ اور بلقان میں رائج ہے اور وسط ایشیا کی مشرقی چغتائی یا ازبک ترکی سے مختلف ہے۔

ہمیں اس نقشے سے معلوم ہو جائے گا کہ اس منزل سے وہ کس طرح گذرے ہیں اور اب کہاں ہیں۔

" ترجمہ اُکھڑا اُکھڑا اور انوکھا معلوم ہوگا مگر ترکوں کا طرزِ ادا کچھ ایسا بھلا معلوم ہوتا ہے اور مغربی اور ایشیائی طرزِ تحریر کا ایسا معقول میل ہے کہ میں نے لفظی ترجمے کی کوشش کی ہے۔ گفتگو تو ضرور انوکھی ہے۔ لیکن سنیے تو سہی ؎

غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

شیخ عبدالقادر نے مخزن ۱۹۰۱ء میں جاری کیا۔ اس میں اسی سال جولائی میں سجاد حیدر کی پہلی افسانہ نما نگارش " فطرتِ جواں مردی" شائع ہوئی۔ یہ ترک ادیب مفاخربے کے ایک افسانے کا ترجمہ تھا۔

ایک پاکستانی محقق اور نقاد سید معین الرحمٰن نے "خیالستان" کا نیا ایڈیشن نئی ترتیب کے ساتھ اُردو مرکز لاہور سے ۱۹۶۸ء میں شائع کیا ہے۔ مقدمے میں فرماتے ہیں: " پریم چند کی بجائے یلدرم اُردو کے پہلے باقاعدہ افسانہ نگار تھے۔ پریم چند کا پہلا افسانہ ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا۔ دنیا کا سب سے انمول رتن" پریم چند کے افسانوں کے پہلے مجموعے " سوزِ وطن" (۱۹۰۹ء) کا پہلا افسانہ ہے۔ اس کو پریم چند نے اپنی پہلی کہانی قرار دیا ہے۔

" ترک ادیب خلیل رشدی کے افسانے " نشے کی پہلی ترنگ" کا ترجمہ سجاد حیدر نے 'معارف' اکتوبر ۱۹۰۰ء میں شائع کیا تھا۔ لیکن تین طبع زاد افسانے " غریبِ وطن" ۔ اُردوے معلیٰ علی گڑھ اکتوبر ۱۹۰۹ء " دوست کا خط" مخزن ۱۹۰۹ء اور " حضرتِ دل کی سوانح عمری" دسمبر ۱۹۰۹ء میں لکھے گئے"۔

۱۹۰۴ء سے ۱۹۰۷ء تک سجاد حیدر بغداد اور استانبول میں مقیم تھے۔ بقول مولانا سلیمان ندوی سرکاری ملازم ہونے کے باعث انہوں نے اپنا نام یلدرم رکھا جو مشہور ترک سلطان بایزید (۱۳۸۹ء ـــ ۱۴۰۲ء) کا لقب تھا۔ کیونکہ وہ اپنے دشمنوں کی بے خبری میں ان کے سروں پر بجلی کی سی تیزی سے آگرتا تھا"۔

بقول زاہدی "اس لفظ کے تلفظ پر غور کرنے سے خیال ہوتا ہے یلدرم کے معنی گرج کے ہوں گے نہ کہ محض برق کی چمک کے۔ اگر اس کے معنی گرج لئے جائیں تو سجاد کے نام کے ساتھ یہ ہرگز موزوں نہ تھا کیونکہ وہ خیالات کی بارش کرتے رہے مگر کبھی گرجے نہیں"۔

ترک ادیب، شاعر اور صحافی فرانس کی تازہ ترین ادبی اور سیاسی تحریکوں سے اس وقت وابستہ تھے جب ہمارے ہندوستان کا بیچارہ کوئی تعلیم یافتہ ادیب والٹر اسکاٹ اور تھیکرے کا وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ ہمارے نوجوان اعلیٰ تعلیم کے لئے "مدر کنٹری" جاتے تھے اور زیادہ تر برطانوی سامراجی رعایات میں شرابور ہو کر واپس لوٹتے تھے۔

اُردو والوں کو بہرحال باہر کی ہوا لگ چکی تھی۔ مخزن کا اولین دور اس خوش آئند سماجی تبدیلی کا عکاس ہے۔ مثال کے طور پر صرف ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۹ء کے فائل دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ متعدد نوجوان ادیب اور شاعر بیرونی ممالک سے اپنی تخلیقات بھیج رہے ہیں۔ شیخ محمد اقبال اور سید علی بلگرامی (بعد میں شمس العلما) کیمبرج سے، محمد علی آکسفورڈ سے، سجاد حیدر یلدرم بغداد سے، مدیر رسالہ شیخ عبدالقادر استانبول سے، لالہ لاجپت رائے (جی ہاں لالہ لاجپت رائے) روم سے، مشرف الحق انبرا سے وغیرہ وغیرہ۔

اُردو والوں کی ذہنی دنیا وسیع ہو چکی ہے۔ شیخ عبدالقادر یورپ سے لکھتے ہیں ؎

بخت آزمانے نکلو جنگل بسانے نکلو گھر سے نکل کے دیکھو ہندستان والو

ہمت والا پنجابی کسان اور کاروباری امریکہ اور کناڈا تک جا بسا ہے۔ مخزن میں ایک مضمون کسی سید حاکم شاہ کا جزائر کینری سے آیا اور یہ آج سے تقریباً ستر برس قبل کی باتیں ہیں۔

مخزن کے دوسرے مضمون نگار فصیح الملک داغ دہلوی، خواجہ حسن نظامی، شاد عظیم آبادی، حسرت موہانی، سرور جہاں آبادی، ونائیک پرشاد طالب بنارسی، وحشت کلکتوی، ناظر کاکوروی، گوہر رامپوری (مولانا شوکت علی کے بھائی)، اکبر الہ آبادی، عزیز لکھنوی، غلام بھیک نیرنگ، احسن لکھنوی، لالہ سری رام، مرزا محمد سعید، محمد اکرام، راشد الخیری، ڈپٹی لال نگم، آغا شاعر قزلباش، آغا حشر کاشمیری وغیرہ اور ایک پردہ نشین نوعمر خاتون مس نذر الباقر تھیں جن کا ذکر بعد میں آئے گا۔

سجاد حیدر اب مخزن کے نورتنوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ ایک ([illegible]) شخصیت کے مالک تھے۔ مخزن میں تصویر کیا چھپی تہلکہ مچ گیا۔ سید نظام الدین شاہ دلگیر اکبر آبادی نے ایک نہایت رقت خیز نثر پارہ " بعنوان " تصویر سجاد کو دیکھ کر" تحریر فرمایا ہے " سجاد۔ سجاد کون سجاد۔ وہی فطرت شناس سجاد، آزاد سجاد [illegible] سجاد جس کی تصویر ہنستی بولتی اکتوبر کے مخزن میں شائع ہوئی ہے۔ دلوں کو، مٹے دلوں کو اپنی طرف بے طرح کھینچتی ہے۔ وہی روشن خیال سجاد جس کے مضامین کی نسبت بجا طور سے کہا جاتا ہے ؎

عطا کیا طبع نکتہ رس نے ترے قلم کو سخنوری میں
خیال انوکھا، بیان اچھوتا، زمیں نئی اور روش نرالی

وغیرہ وغیرہ (مخزن فروری ۱۹۰۸ء)

قیامِ بغداد کے زمانے میں یلدرم نے سلطنتِ عثمانیہ اور اس کے یورپین صوبوں کی سیاحت کی جو ہندوستانی نوجوان باہر جاتا ہے اس کا کم از کم ایک سنجیدہ رومانس ایک غیر ملکی لڑکی سے برحق ہے۔ یلدرم نے ترک خواتین کو پہلے سے آئیڈیل بنا رکھا تھا۔ راوی کہتا ہے کہ استانبول کی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان ترک خانم نے ان سے اصرار کیا کہ شادی کر کے ترکیہ میں سکونت اختیار کر لیں لیکن ترکی سے شدید عشق کے باوجود یلدرم ترکِ وطن پر راضی نہ ہوئے۔ وہ انقلابی خانم غلامستانِ ہند میں آکر رہنے پر تیار نہ تھیں۔

نومبر ۱۹۰۷ء میں یلدرم ہندوستان واپس آئے۔ قاری سرفراز حسین عزمی دہلوی (مصنف شاہدِ رعنا) نے رسالہ "اولڈ بوائے" میں لکھا۔

آ گئے سجاد حیدر آ گئے — آ گئے قندِ مکرر آ گئے
چھوڑ آئے اپنی ٹرکن کو وہاں — رکھ کے وہ سینے پہ پتھر آ گئے

بوسویل زاہدی لکھتے ہیں: "سجاد بغداد میں کئی سال اپنے فرائضِ منصبی نہایت شرافت اور خوش اسلوبی سے ادا کرتے رہے۔ شرافت میں نے اس لئے کہا کہ سیاسی[2] کاموں میں بہت کچھ لگائی بجھائی کرنی پڑتی ہے اور اپنے ہم مذہب اور ہم قوم لوگوں کے گلے کاٹنے پڑتے ہیں۔ مگر یہ کام سجاد حیدر نے نہیں کیا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس اہم عہدے کے باوجود ان کو کوئی خطاب نہیں ملا اور نہ یہ عہدہ ان کی ترقی کا زینہ بن سکا۔

"مخزن" میں شائع شدہ مضامین کا مجموعہ "خیالستان" کے نام سے ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا۔ علامہ اقبال نے اسے پنجاب یونیورسٹی کے بی۔اے نصاب میں شامل کروایا۔ اقبال سے یلدرم کی دوستی کالج سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ہوئی تھی۔ لہٰذا اولین دور میں اقبال اپنا تازہ کلام اشاعت سے قبل یلدرم کے پاس بھیجا کرتے تھے[3]

۱۹۴۳ء میں سید احمد شاہ بخاری پطرس نے یلدرم کی وفات پر لکھا "یہ واقعہ کہ ان کی موت پر اتنی خاموشی رہی المناک ضرور ہے۔ اُردو ادب پر ان کا اثر بہت عظیم تھا۔ بڑی شوخی اور بڑے لطف کے ساتھ انہوں نے اُردو زبان و ادب کے بوڑھے چہرے کو جوانی اور تازگی بخشی اور گو اُن کے تجربے کی جسارت کو اب تقریباً فراموش کر دیا گیا ہے لیکن رنگ و روپ کی بہت سی لطافتیں جو انہوں نے پیدا کیں

ابھی باقی ہیں۔ "خیالستان" اپنی اشاعت کے چند ہفتوں کے اندر اُردو کی ایسی مقبول تصنیف بن گیا جو بڑی رغبت سے بار بار پڑھی گئی[1] آج ہم اس سے ایک سنگِ میل کی حیثیت سے واقف ہیں اور جب ادبی فیشن بدلے گا اور شاید لوگ خیالستان کے شستہ اور شائستہ حُسن کی طرف متوجہ نہ ہوں گے اس وقت بھی ہمیں ادبی مطالعہ کی خاطر اس کتاب کی طرف رجوع کرنا پڑے گا اور ہمیں ان خصوصیات کا سراغ ملے گا جنہوں نے بڑی حد تک اُردو کو اس کام کا دم خم اور لوچ بخشا ہے۔

"یلدرم مسلمانوں کی نئی آگہی کے دھارے میں شامل تھے۔ وہ اس دور کی پیداوار بھی تھے اور رہنما بھی۔ انہوں نے علی گڑھ میں تعلیم پائی اور ساری دنیا میں ان کو نہایت فخر کے ساتھ اس دل پذیر گروہ میں شامل سمجھا گیا جس نے اس مرکز سے باہر آکر ایک نئے طرزِ فکر اور طرزِ زندگی کی تزئین کی۔ ابھی ہم اس عہد سے اتنے قریب ہیں کہ غالباً آسانی سے یہ نہیں جان سکتے کہ اس تحریک و تزئین کی قدر و قیمت کیا ہے۔ لیکن قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مستقبل کے مورخ کو اس اولین دور میں اس قومی وجاہت اور امید کو دوبارہ حاصل کرنے کی تمنا ضرور کارفرما نظر آئے گی جو سلطنت مغلیہ کے خاتمے کے بعد ہندوستانی مسلمان اپنی زندگیوں میں کھو چکے تھے۔

"اقتدار کی خواہش بعد کے عہد میں پیدا ہوئی اور اس میں سجاد حیدر اور اُن کے ہم عصر شریک تھے۔ لہٰذا عمرانیات کے لحاظ سے اقبال کے برعکس سجاد حیدر موجودہ دور سے تعلق نہیں رکھتے۔ اقبال دونوں ادوار میں شامل تھے۔ چنانچہ عظیم ہونے ساتھ ساتھ زیادہ لوگوں کی زبانوں پر رہے۔۔۔۔

سجاد حیدر اس نسل کے فرد تھے جس نے مسلمانوں کی زندگی میں ایک ترکیبِ نو پیدا کرنا چاہی۔ اس کے اجزائے ترکیبی قدیم و جدید، مغرب و مشرق، سائنس و مذہب عربی اور انگریزی پر مشتمل تھے۔ یہی نظریہ تھا جس نے علی گڑھ کالج کے لئے "اینگلو اورینٹل" کا نام تجویز کیا۔ اس نظریئے کے چند مظاہر نے اکبر الہ آبادی جیسے لوگوں کو بہت ملول کیا مگر وقت آگے بڑھتا گیا اور جدید مدنیت کے پیغمبر اپنے مشن میں کامیاب رہے۔

اس جدید مدنیت اور شائستگی کے لئے سجاد حیدر نے ایک مناسب اور مناسب طور پر ترقی پسندانہ نگارشِ جمیل سے اُردو زبان کو روشناس کیا۔ ترکی ٹوپی، مغل شیروانی اور انگریزی پتلون میں ملبوس نوجوان ادیبوں کی ایک پوری نسل اس طرزِ تحریر کی طرف جوش و خروش سے لپکی

[1] اگلے پندرہ سال میں خیالستان کے ۱۲ اڈیشن شائع ہوئے۔

[2] انڈین پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ۔ اس محکمے میں یلدرم کے دو دوست خان بہادر انعام الحق دہلوی بیچلرز للج والے اور مرزا سکندر علی بیگ ملازم تھے۔ موخر الذکر جنرل سکندر مرزا کے نام سے چند سال پاکستان کے گورنر جنرل رہے۔

[3] سجاد حیدر یلدرم از امتیاز علی تاج "تہذیب نسواں" ۲۹ مئی ۱۹۴۳ء

گویا صرف یہی چیز تھی جس کا وہ اب تک انتظار کر رہے تھے اور یہ واقعہ بھی تھا۔ اس طرزِ تحریر میں وہ سب کچھ تھا جس کی انہیں آرزو تھی۔ الفاظ عربی اور فارسی کے تھے۔ لیکن لے پیچ پل کی پل میں انکی سختی اور بھاری پن غائب ہو گیا گویا کسی نے ملٹن کے زورِ بیان میں آسکر وائلڈ کے رنگ کی آمیزش کر دی ہو۔

قومی نشاۃ ثانیہ کے ساتھ تجدیدِ ماضی کے خواہش مند نوجوانوں نے اس نئے اندازِ تحریر کو بڑے غور اور پیار سے اپنایا ان کو مسرت اس بات کی تھی کہ یہ نفیس ترقی پسند نرم و نازک اور آزاد خیال تھا مغرور اس وجہ سے تھے کہ یہ اندازِ بیان قوم کے شاندار ماضی سے بھی وابستہ تھا مشرقی تھا۔"

اس مضمون میں پطرس نے ایک اہم نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے۔" یلدرم کی بیشتر کہانیاں اور ڈرامے تراجم ہیں لیکن مجھے معلوم نہیں کہ اصل تصانیف سے ان تراجم کا مقابلہ کیا گیا ہے یا نہیں[1]۔ اسلئے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ سجاد حیدر نے اپنے آپ کو صحیح معنوں میں مترجم کی حیثیت سے پیش کیا ہے یا یہ محض اُن کا حسنِ بیان ہے یا محض انکسار جو انہیں ایک نئی تکنیک برتنے کی معذرت کے طور پر برتنا پڑا۔ چند داخلی شہادتوں کی بنا پر مجھے شبہ ہے کہ تراجم در اصل تقریباً طبع زاد تخلیقات ہیں اور جیسا سمجھا جاتا ہے اس سے کہیں زیادہ اوریجنل واقع ہوئی ہیں۔ اُن کی ترغیب سجاد حیدر کو ترکی کے معاشرتی پس منظر نے دلائی کیونکہ جدید مدنیت یورپین کی بجائے ترکی لیبل کے ساتھ کہیں زیادہ دل آویز نظر آسکتی تھی۔ . . .

انہوں نے ایک ترکی قلمی نام یلدرم اختیار کیا جس نے قلمی نام اختیار کرنے کے نئے فیشن کی بنا ڈالی۔ یہ تفصیل گو غیر اہم ہے لیکن اپنی جگہ پر ایک علامت کی حیثیت رکھتی ہے[2]"

پطرس مرحوم نے جب یہ مضمون لکھا تھا دُنیا اس وقت سے بھی اور تیس برس آگے نکل گئی۔ اُردو ادب میں مزید انقلاب آچکے ہیں۔

[1] آج تک نہیں کیا گیا۔ دل چسپی کے ہے ، ق۔ ح۔

[2] سید سجاد حید ریلدرم اور پطرس بخاری روزنامہ اسٹیٹسمین نئی دہلی مئی ۶۴ء تلخیص و ترجمہ ق۔ ح

اعجاز حسین
نشیمن، ۱۱ منٹو روڈ، الہ آباد

ڈاکٹر تاراچند — میرے تاثرات

یادش بخیر! اب سے نصف صدی قبل کا زمانہ یاد آگیا جب ہندستان حصولِ آزادی کے لئے سرگرم عمل تھا۔ اپنے ایثار و خلوص سے آگ کا دریا بنا ہوا تھا۔ غلامی کی غیر صحت مندسردی و جمود کو نذرِ آتش کر رہا تھا۔ اس کی سیاسی اور سماجی محرکات دنیا کی توجہ کا مرکز تھیں، بدیسی حکومت اپنی جابرانہ روش کے تحفظ کے لئے خون کی ہولی کھیل رہی تھی۔ اس کے جبر و تشدد اور ہندوستان کی سرفروشی کے تصادم سے ایک نیا دور جنم لے رہا تھا۔ اس کے استقبال و انتظار میں الہ آباد سیاست کا ایک گہوارہ بن گیا تھا۔ اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے اب وہ دو دریاؤں کا سنگم نہ تھا بلکہ فکر و عمل کے سمندروں کا بھی نقطۂ اتصال بن گیا تھا۔ حسنِ اتفاق سے یہاں اب سے پہلے بھی عظیم و ہندوستان گیر شخصیتوں کے اجتماع نے فضا کو باشعور و خطر پسند بنا دیا۔ مختلف شعبہ جات کے سربرآوردہ علمبردار سارے ملک کو دعوتِ علم و عمل دے رہے تھے جسٹس محمود، مدن موہن مالوی، موتی لال، سر تیج بہادر سپرو، اکبر الہ آبادی وغیرہ نے اپنے کارناموں سے اس کو اتنی سربلندی عطا کر دی تھی جو شاید ہی ہندوستان کے کسی دوسرے شہر کا طرۂ امتیاز رہی ہو۔

نتیجہ یہ تھا کہ جب کبھی سیاسی تحریک کو نئے مرحلے کی طرف قدم اٹھانے کی ضرورت ہوتی تو اچھی خاصی تعداد میں ملک کے مشہور و ہر دلعزیز رہنما اپنی مشکلات و الجھن دور کرنے کے لئے اسی مقدس سنگم کی سرزمین پر جمع ہوتے۔ چنانچہ مہاتما گاندھی، سردار ولبھ بھائی پٹیل، مولانا ابوالکلام آزاد ایسے مقتدر حضرات تبادلۂ خیالات کے لئے اکثر آیا جایا کرتے لیکن باوجود اس انہماک کے یہ نہیں ہوا کہ سیاست نے علم و ادب کو اپنی سرگرمی میں پسِ پشت ڈال دیا ہو، اس وقت الہ آباد یونیورسٹی نمایاں حیثیت سے اپنا کام کرتی رہی۔ گو قواعد و ضوابط یا ہیئت کے لحاظ سے اس کا نظام امتحانی تھا۔ مگر سرکاری میور سنٹرل کالج اپنی خصوصیات کے لحاظ سے ہندوستان بھر میں مشہور تھا۔ یونیورسٹی کے زیرِ سایہ منجملہ دوسرے علمی اداروں کے یونگ کرسچن کالج اور کایستھ پاٹھ شالا کالج الہ آباد میں اور ایم۔ او کالج علی گڑھ میں نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔ ۱۹۲۱ء میں یونیورسٹی کا نظام گورنمنٹ نے تبدیل کیا تو علاوہ اور تبدیلیوں کے پڑھانے کا فرض بھی یونیورسٹی کے سپرد کر دیا گیا۔

اس نئی شکل میں الہ آباد یونیورسٹی نمایاں ہوئی تو اس وقت بھی یہاں قابلِ قدر اساتذہ کی کمی نہ تھی۔ بلکہ دوسرے الفاظ میں کہا جا سکتا کہ ہندوستان گیر شخصیت کے مالک یہاں متعدد اساتذہ موجود تھے۔ مثلاً میگھ ناتھ سہا، ڈاکٹر دھار، سر شفاعت احمد خاں، رام پرشاد ترپاٹھی، رانا ڈے، امرناتھ جھا، پروفیسر ستیش چند دیب، ایشوری پرشاد، وغیرہ، ایسے ہی ممتاز اساتذہ میں ڈاکٹر تاراچند بھی تھے۔ اس وقت وہ کایستھ پاٹھ شالا کالج کے پرنسپل تھے۔ الہ آباد یونیورسٹی سے بہ حیثیت استاد ان کا براہِ راست واسطہ نہ تھا نئے نظام کے بعد ہی سے ہوا۔ ان کی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ وہ یونیورسٹی سے منسلک ہونے پر بیک وقت تین فرائض ادا کرنے پر مامور تھے۔ کایستھ پاٹھ شالا کالج نے بھی ان کی علیحدگی گوارا نہ کی اور الہ آباد یونیورسٹی نے ایک شعبہ کے بجائے دو شعبہ جات میں ان کو وقتی خدمات سپرد کر دیں۔ یہاں شعبۂ اردو میں بھی وہ ایم اے کلاس کو پڑھاتے رہے اور شعبۂ سیاسیات میں بھی درس دیتے رہے۔

میں اس وقت بی اے کا طالب علم تھا۔ ڈاکٹر تاراچند سے شرفِ نیاز حاصل نہ تھا۔ میں ان کو چلتے پھرتے شیروانی اور پائجامہ پہنے سائیکل پر رواں دواں دیکھتا تھا۔ اب ان کو یونیورسٹی میں برابر آتے جاتے دیکھ کر جی چاہا کہ واقفیت حاصل کی جائے۔ ہنوز وہ شعبۂ اردو میں بحیثیت استاد نہ آتے۔ ان کا تقرر اردو ڈیپارٹمنٹ میں اس وقت ہوا جب ایم اے کلاس ۱۹۲۲ء میں قائم ہوا۔ لیکن پھر بھی وہ ضامن علی صاحب صدر شعبۂ اردو سے کبھی کبھی ملنے آجاتے۔ ضامن صاحب سے ایک دن میں نے دریافت کرنے کی جرأت کی کہ یہ کون بزرگ ہیں؟ انہوں نے فرمایا۔ تم عجب آدمی ہو، ان کو نہیں جانتے، ارے یہ ڈاکٹر تاراچند صاحب ہیں۔ بڑے قابل اور مشہور شخص ہیں۔ ان کو دنیا جانتی ہے۔ یہ یونیورسٹی کی مجلس عاملہ کے ممبر بھی ہیں اور کایستھ پاٹھ شالا کالج کے پرنسپل بھی۔ تاریخ ان کا خاص موضوع ہے مگر اردو و فارسی کے بھی دلدادہ ہیں۔ ان سے ضرور ملو اچھا وہ

کل پھر آئیں گے۔ تم آجانا۔ میں ملادوں گا۔ دوسرا دن آیا۔ ضامن صاحب نے میری نادانی پر ملامت کرتے ہوئے موصوف سے متعارف کرادیا۔

جب میں ایم اے درجہ میں آیا تو ڈاکٹر تاراچند صاحب سے استادی و شاگردی کا رشتہ قائم ہوا۔

الہ آباد یونیورسٹی ہندوستان بھر میں پہلی یونیورسٹی تھی جس میں اُردو کا ایم اے درجہ قائم ہوا۔ اور منجملہ دوسرے مستقل اساتذہ کے ڈاکٹر تاراچند کو وقتی استاد کی حیثیت سے اُردو پڑھانے کی تکلیف دی گئی۔ اس دور میں انگریزی زبان کا غلبہ تھا۔ ہر شعبہ میں انگریزی ہی میں درس دیا جایا کرتا تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر تاراچند نے بھی اسی زبان میں لیکچر دینا شروع کیا۔ ان کا موضوعِ سخن اُردو کی تاریخ تھا وہ جس خوبی اور مہارت سے پڑھاتے وہ سنتے ہی بنتا۔ ان کی معلومات و وسیع النظری سے میں بیحد متاثر تھا۔ چنانچہ ان کے لیکچروں کو طالب علم کی حیثیت سے میں برابر لکھ لیتا اور آج تک بفضلہ اُن کے لکھائے ہوئے Notes میرے پاس محفوظ ہیں۔ ایک خرابی یہ تھی کہ کلام ختم کرنے کے بعد وہ فوراً چلے جاتے۔ خرابی اس لئے کہہ رہا ہوں کہ مزید کسی گفتگو کا موقع طلبا نہ پاتے ان کو اس کے بعد ہی شعبہ سیاسیات میں کلاس کو لکچر دینا ہوتا۔ اس لئے وہ بھی معذور تھے لیکن میں ہمیشہ محسوس کرتا کہ بغیر بات چیت کے تشفی نہ ہوگی اس لئے غالب کی طرح کہنا پڑتا کہ

بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

اس تشنگی کے ساتھ میں نے اُن سے گھر پہ ملنے کا تہیہ کیا وہاں جانے لگا۔ وہاں بھی ان کو مصروف دیکھا۔ مگر اخلاقاً مجھے بھی کچھ وقت دے دیتے، علمی و ادبی گفتگو ہوتی۔ لیکن کبھی کسی موضوع پر ضرورت سے زیادہ باتیں نہ کرتے بہر حال سلسلۂ ارتباط بڑھتا رہا۔ جب ایم اے پاس کرنے کے بعد ان سے ملنے گیا تو اُٹھ کر گلے ملے۔ کہنے لگے۔ اعجاز تمہارے درجہ اول میں پاس ہونے اور اوّل آنے کی خوشی مجھ سے زیادہ شاید کسی کو ہو۔ اس لئے کہ میں نے تم کو اپنے پرچہ میں نمبر کم دیے تھے، اس میں میری دُور اندیشی شامل تھی۔ تمہاری صلاحیتوں کے پیشِ نظر یہ بتانا چاہتا تھا کہ ابھی بہت محنت و دیدہ ریزی کی ضرورت ہے۔ تم کو اگر میں اچھے نمبر دیدیتا تو شاید تم کو خیال ہوتا کہ میرے سخت گیر استاد نے مجھے فرسٹ کلاس کے نمبر دیدیے تو سچ مچ میں قابل ہوں۔ اب لکھنے پڑھنے کی ضرورت کیا ہے؟ میں نے یہ نصیحت یا قابلِ قدر اشارہ گوشِ ہوش سے سنا اور حتی المقدور عمل کرنے کی کوشش کی۔ یہ واقعہ ۱۹۲۸ء کا ہے۔ اسی سال ڈاکٹر تاراچند صاحب شعبۂ اُردو سے الگ ہوگئے۔ ہمہ وقتی استاد شعبۂ سیاست میں ہوگئے۔ ان کا ڈپارٹمنٹ سے الگ ہونا مجھے کیا سبھی کو تکلیف دہ تھا۔ لیکن اس اندھیرے میں ایک اُجالا یہ نظر آیا کہ اُن کی جگہ شعبۂ اُردو میں میرا تقرر ہوگیا۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہنا ہے کہ گویا انہی کی بدولت میں اس شعبہ سے ہمیشہ کے لئے منسلک ہوا۔

ملازمت کی اس ردّ و بدل کے بعد وہ بھی مستقلاً یونیورسٹی میں آنے لگے اور میں بھی لیکن میں راہ و رسم کے بعد معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے ان کے گھر ہی جانے لگا۔ اب قرب کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کو پرکھنے کا موقع ملا۔ میں نے محسوس کیا وہ سادہ مزاج مردم شناس آدمی ہیں۔ باوجود قابلیت و مرتبہ کے نام کو بھی شیخی یا غرور نہیں عموماً فیصلہ کُن باتیں کرتے ہیں اور مفید مشورے دیتے ہیں۔ اپنی وضع داری و تہذیب و تمیز کے جوہر سے ہر شخص کو سنجیدگی و فرض شناسی پر مائل کردیتے ہیں۔ ہر وقت کتابوں کا ڈھیر میز پر رہتا ہے۔ پڑھنے میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔ بیکار و بدمزہ گفتگو نہ کرتے ہیں نہ اس انداز و مزاج کے لوگوں کو پسند کرتے ہیں لیکن باوجود متانت و شائستگی کے وہ زاہدِ خشک نہ تھے۔ بے تکلف صحبتوں میں ہنس مکھ ہو جاتے، خود بھی ہنستے اور اپنی پُر لطف باتوں سے دوسروں کو بھی ہنساتے۔ اُنکی قابلیت و دیگر خصوصیات کی بنا پر کبھی کبھی وہ ایسی پُر لطف باتیں کر جاتے جو بظاہر مزیدار ہوتیں اور بباطن تلخ لیکن ان کا وقار درمیان میں ایسا حائل ہوتا کہ بدمزہ ہونے والا بھی مسکرادیتا۔

ڈاکٹر تاراچند صاحب کی تصانیف کی مقبولیت روز افزوں تھی، میں نے بھی اپنی دو کتابوں میں ان سے اقتباسات پیش کئے ہیں نظریاتی و عملی لحاظ سے ان کا طرزِ تخیل نہ ہندوانہ تھا نہ اسلامی۔ وہ فرقہ وارانہ ذہنیت کے دشمن تھے۔ ان کو ابنِ آدم سے دل چسپی تھی بشرطیکہ وہ انسان ہو۔ آزادی سے پہلے جب ہندوستان کی ایک زبان کو آئندہ سرکاری زبان بنانے کا خیال ہوا تو ہندی اور اُردو زبانوں پر اربابِ حل و عقد کی نظریں پڑیں۔ اس دور میں اگرچہ ہندو مسلمان کا اتحاد مجموعی حیثیت سے ہمہ گیر ہو رہا تھا لیکن پھر بھی دلوں میں خلش تھی۔ لسانیاتی اہمیت و مقصد کو نظر انداز کرکے اس مسئلہ کو بھی عام طور پر فرقہ وارانہ ذہنیت سے ہمکنار سمجھا گیا۔ ہندوؤں نے ہندی کو اور مسلمانوں نے اُردو کو فضیلت و صلاحیت کا مجمع سمجھا۔ مہاتما گاندھی نے سوچ سمجھ کر بین بین ایک راستہ نکالا کہ فی الحال اُردو ہندی کی مشترکہ خصوصیت سے ایک ایسی زبان عام کی جائے جو دونوں کے ماننے والوں کو قابلِ قبول ہو اس لسانی گتھی کو سلجھانے کیلئے انہوں نے ایک ادارہ بنا دیا۔ کاکا کلیلکر کو اس کا نگراں و ناظم منتخب کیا۔ موصوف نے ایسے الفاظ و زبان کو عملی صورت میں لانے کے لئے ڈاکٹر تاراچند کو منتخب کیا۔ آخر الذکر کی قابلیت اور بے لوث مزاج سے متاثر ہوکر انہوں نے اس سلسلہ کا دفتر الہ آباد ہی میں

قائم کردیا۔ کام شروع ہوا تو ڈاکٹر تاراچند نے مجھے یاد کیا۔ اغراض و مقاصد سے آگاہ کرکے میری خدمات کو بھی اِس مہم سے وابستہ کردیا۔ سب سے پہلے ایک لغت تیار کرنے کا پروگرام بنا۔ اس سلسلہ میں نئے الفاظ و اندازِ بیان کو رواج اور ہر دلعزیز بنانے کے لئے ایک عملی پہلو ڈاکٹر تاراچند نے یہ رکھا کہ اس نئی زبان کا ایک مشاعرہ بھی ہوا کرے۔ اس میں شعرا اپنے جذبات و خیالات کے اظہار میں صرف ایسے الفاظ استعمال کریں جو عام فہم ہوں۔ جن کو زیادہ سے زیادہ لوگ سمجھ سکیں۔ مشاعرہ ہونے لگا۔ اس طرزِ بیان کی اشاعت میں ہندی اور اُردو کے شعرا حصّہ لینے لگے۔ ایک جگہ جمع ہوکر ایک ہی سرمایۂ لفظیات کامیابی کے ساتھ اس اسکیم کو آگے بڑھانے لگے۔ تاراچند صاحب بہت خوش تھے کہ اس بہانے وہ ملک اور قوم کی ایک عظیم خدمت کر رہے ہیں لیکن آزادی آتے ہی یہ صورتِ حال کچھ اور ہوگئی۔ معاشرہ نے اس کی اہمیت کو فرقہ واریت کی بھینٹ چڑھا کر یہ کہتے ہوئے برباد کردیا ؎

ایں دفترِ بے معنی غرقِ مے ناب اولیٰ

ڈاکٹر تاراچند یونیورسٹی اور اس کے باہر بھی علم و ادب کے اہل ہونے کے علاوہ انتظامی امور میں بھی خاص اہمیت کے مالک سمجھے جانے لگے۔ چنانچہ ان کو وائس چانسلر منتخب کیا گیا۔ یہ عہدہ کسی اور لحاظ سے اہم ہو تو ہو مگر اس کے بے کیف ہونے میں کسی کو شک نہ ہوگا۔ ایک خیالی اعزاز تو ضرور اس عہدہ سے منسلک ہے لیکن فرائض پر نظر ڈالئے تو اس علم و ادب سے دُور کا واسطہ بھی نظر نہیں آتا۔ بہرحال دنیا اس کو ایک شمار کرتی ہے۔ ڈاکٹر تاراچند نے اس ضمن میں بہت کچھ قابلِ قدر کام کیا اور ثابت کر دیا کہ وہ اس محاذ پر کسی تجربہ کار منتظم سے کم نہیں۔ مثال کے لئے ایک نازک موقع پر ان کی انتظامی صلاحیت کا نمونہ یہ ہے کہ اُن کے دَورِ وائس چانسلری میں گورنمنٹ سے حکم آیا کہ بجائے دس ماہ کے طلبا بارہ مہینے کی فیس ادا کریں۔ اس حکم سے لڑکوں کو بڑی تکلیف ہوئی۔ ہر طرف شورش، ہڑتال اور مظاہرے شروع ہوگئے۔ آتشِ غیظ و غضب کے شعلے بھڑکنے لگے۔ عام خیال یہ ہوا کہ اس حکم میں وائس چانسلر کا بھی ہاتھ ہے۔ اس لئے ڈاکٹر تاراچند بھی اس لپیٹ میں آگئے ان کے خلاف وائس چانسلر مردہ باد کے نعرے بلند ہوئے۔ ان کا مصنوعی جنازہ بھی نکالا گیا۔ گشت کرنے کے بعد لڑکے یونین ہال میں جمع ہوئے۔ جوش و خروش شباب پر تھا۔ تقریر و عملی سرگرمی سے معلوم ہوتا تھا کہ آج یونیورسٹی اُلٹ جائے گی۔ ہال میں بڑی گرماگرم تقریریں ہو رہی تھیں اس ہنگامہ خیز فضا میں ڈاکٹر تاراچند تن تنہا لڑکوں کے درمیان پہنچ گئے۔ لڑکوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ یہ فیصلہ میرا ہے تو تمہاری غلط فہمی ہے، میں تمہاری ناراضگی کسی قیمت پر مول لینا نہیں چاہتا۔ یہ کہہ کر جیب سے ایک کاغذ نکال طلبا کے صدرِ انجمن کے ہاتھ میں دے کر کہا کہ یہ میرا استعفیٰ ہے۔ میں وائس چانسلر نہیں رہنا چاہتا۔ یہ اس کو تمہارے ہاتھ میں اسلئے دینا چاہتا ہوں کہ تم لوگ اس کو چانسلر کے پاس بھیج کر منظور کرالو۔ مجھے اپنے لڑکے عزیز ہیں وائس چانسلری نہیں۔ اس پُرخلوص بر محل اقدام کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارے ہال میں سناٹا چھا گیا۔ خیال کی رو دفعۃً بدل گئی۔ لڑکوں نے ڈاکٹر تاراچند کو اٹھا لیا۔ وائس چانسلر زندہ باد کے نعروں سے فضا گونجنے لگی۔

ڈاکٹر تاراچند کی قابلیت کا براہِ راست سرکارِ ہند نے بھی اعتراف کیا۔ ان کو اپنا سفیر بنا کر ایران بھیج دیا۔ وہاں سے اپنے فرائض و مدتِ سفارت بخیر و خوبی ختم کرکے واپس آئے تو انکی گفتگو ایران کے تذکرے سے لبریز رہی۔ کبھی وہاں کی آب و ہوا کا، کبھی طرزِ معاشرت کا، کبھی علمی و ادبی تحریکات کا ذکر ہر نشست میں کرتے محسوس ہوتا تھا کہ انہوں نے وہاں کی زندگی کا اس غور و خوض سے مطالعہ کیا ہے کہ ایرانیوں اور ایران کی معقول خصوصیات رگ و پے میں سما گئی ہیں۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اس کا احساس ہوتا تھا کہ اُن کی بین الاقوامی ادراک کا دائرہ وسیع تر ہوگیا ہے۔ اس ملازمت میں بحیثیت سفیر اُن کو دوسری قوموں کے کردار کے مطالعے و مشاہدہ کا ہمیشہ سے زیادہ موقع ملا اور تاریخی شعور و انسان پرستی بغیر کسی قید و بند کے اس عمر میں شباب پر آگیا۔ کسی قوم یا ملک کے بارے میں ان کی زبان سے یہ سننے میں نہیں آیا کہ ان کا مذہبی عقیدہ چونکہ ہمارے عقائد سے مختلف ہے اس لئے مجھے اس سے نفرت محسوس ہوئی، بلکہ وہ اُس کے ذہنی و مادّی ترقی کا اندازہ کرکے اس کی بیداری یا بیکاری کا جائزہ لیتے۔

ایران سے پلٹ کر ہندوستان آئے تو دہلی میں زیادہ رہنے لگے۔ بہت عرصے کے بعد دہلی کو خیر باد کہہ کر الہ آباد کو آباد کیا۔ اب درازیٔ عمر سفرِ حیات کی آخری منزل تک لے آئی تھی مگر ان کا ذوقِ مطالعہ ہر حال میں اپنا کام کرتا رہا۔ اب بھی ان کے قریب کتابوں کا ڈھیر ہوتا۔ میں جب بھی عیادت کے لئے حاضرِ خدمت ہوتا تو علالت سے متعلق گفتگو کم کرتے زیادہ تر کسی کتاب اور موضوع پر تبصرہ کرتے اپنی رائے اور نتیجۂ فکر سے باخبر کرتے۔ گویا ایک طرح سے اپنے پرانے شاگرد کو اب بھی کسی نہ کسی طرح اپنے خیالات و اندازِ مطالعہ سے فیض پہنچانا ضروری سمجھتے تھے اور مجھے کہنا پڑتا ہے کہ ؎

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را ▬▬

طنز و مزاح نمبر ۱ و نمبر ۲ کے سرورق کے کارٹون ہم نے بشکریہ "نقوش" لاہور شائع کئے۔

بنارسی پرشاد سکسینہ
۵۰۔ چیتھم لائنز۔ الہ آباد

ڈاکٹر تاراچند ہندو مسلم اتّحاد کے علمبردار

ڈاکٹر تاراچند کی وفات سے علمی اور ادبی حلقے میں ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا جس کا پُر ہونا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ اُن کی ذات اعلیٰ صفات کی یاد ہمیشہ تازہ رہے گی۔ اس کی بنیادی وجہ ہے کہ ان کا تعلق متعدد اداروں سے رہا ہے اور یہ سب اُن سے فیضیاب ہوتے رہے ہیں۔ ایک زمانے میں وہ انقلاب پسند بھی تھے اور ان کا ساتھ لالہ ہردیال جیسی ہستی سے رہا مگر بعد کو ان کے خیالات میں کچھ تبدیلی واقع ہوئی پھر بھی ان کا پس منظر ترقی پسندی ہی رہا۔ وہ فلسفہ اور منطق کے عالم تھے۔ ان کا ذوق درس و تدریس میں تازیست جاری رہا مگر اس کے ساتھ ساتھ ان کا رجحان عمل کی جانب کبھی بھی کم نہ ہوا۔ ان کا نقطۂ نظر وسیع اور جامع تھا۔ انسان کی برابری ان کا راسخ عقیدہ تھا۔ اسی سے متاثر ہو کر وہ ہندو مسلم اتحاد کے دلدادہ ہو گئے تھے اور انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اسی مسئلہ کے مطالعہ میں صرف کیا۔ اُنکے خیال میں ہندو مسلم تفرقہ کسی مذہبی اصول پر مبنی نہیں بلکہ خود پرست انسانوں نے ہی اس کو تشکیل دے رکھی ہے۔

چنانچہ اپنے اس خیال کی مستند تائید حاصل کرنے کی غرض سے انہوں نے ہندو اور مسلم مذاہب کا سرگرمی سے مطالعہ کیا۔ ان کو فارسی اور سنسکرت دونوں ہی زبانوں پر مکمل عبور تھا اور انہوں نے بنیادی تصانیف کی گہری چھان بین کی اور جن نتیجوں پر وہ پہنچے انکو بلاتعصب آمیزی کے ایک مقالے کی شکل میں پیش کیا۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے مشہور و معروف عالموں نے اسے پڑھا اور جی کھول کر اس کی داد دی اور مصنف کو ڈی فِل کی ڈگری عطا فرمائی۔ یہ بیش خیر مقالہ بیسویں صدی کے اوّل نصف کی ایک اہم ترین تصنیف قرار دی گئی ہے ۔ اور جو دلائل و نتائج اس میں پیش کئے گئے ہیں ان کی ہنوز کما حقہٗ کوئی ترمیم و تنسیخ نہیں ہو سکی ہے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے ہندو اور اسلام کے اساسی اصولوں پر دقیق بحث کرتے ہوئے یہ بات ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے کہ ان کے مابین کوئی اہم فرق نہیں اور جو فرق ہے بھی وہ صرف ظاہری ہی ہے نہ کہ اصولی۔ چنانچہ انہوں نے اسلامی توحید اور شنکر آچاریہ کے اصول وحدت مطلق کو ہم آہنگ قرار دیا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اُن کی رائے میں شنکر آچاریہ کا اصول اسلام سے متاثر تھا۔ اگرچہ بعض عالموں کو اس سے اتفاق نہیں ہے مگر چونکہ شنکر آچاریہ کو قرون وسطیٰ کی بھگتی کی تحریک کا منبع تصور کیا جاتا ہے اس لئے ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال ایک معرکہ آرا پہلو ہے خصوصاً اس لئے کہ بھگتی اور تصوف کے اصول و عمل میں بیحد یکسانیت ہے اور اس یک رنگی کی بنیاد ہے اسلام کا بھگتی پر گہرا اثر۔

اگرچہ اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہنا ہی مناسب ہوگا کہ بھگتی ہندوستان کے قدیم ترین مذہبی نقطۂ نظر سے وابستہ ہے کیونکہ اس کا حوالہ بھگوت گیتا میں مفصل آیا ہے۔ مگر قرون وسطیٰ میں جس بھگتی تحریک کا آغاز ہوا وہ کچھ معنوں میں دورِ قدیم کی بھگتی سے مختلف تھی۔ اول تو یہ کہ گیتا کی بھگتی علم و عمل کا نتیجہ ہے اور دوسرے یہ کہ گیتا کی بھگتی ایک فلسفی نظریہ ہے جس سے کہ عوام محروم رہ جاتے تھے۔ اس کے برعکس قرون وسطیٰ کی بھگتی تحریک کا بانی مبانی ادنیٰ طبقہ تھا جس کا کہ ہر ایک فرد نجات کا جویا تو تھا مگر فلسفیانہ بحث کے پیچ و خم میں نہ پڑنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ طبقہ عرصۂ دراز سے اعلیٰ طبقہ کی زیادتیوں کا شکار رہ چکا تھا، اور وہ نجات کے ایک ایسے راستے کا متلاشی تھا جس پر چلنے کے لئے اس کو اعلیٰ طبقہ کا دست نگر نہ ہونا پڑے۔ ہندوستان میں اسلام نے اپنے اصولِ مساوات کی اشاعت کر کے ایک نئی ہل چل پیدا کر دی تھی۔ اس نے یہ زور دیا کہ خدا کی نظر میں ہر فرد برابر ہے اور پاکیزہ زندگی بسر کر کے وہ خالقِ کائنات تک رسائی کا حقدار بن جاتا ہے۔ چنانچہ ہندو سنتوں نے مسلم صوفیوں کی تعلیم و تلقین سے بہرہ مند ہو کر پامال طبقہ کو یہ پیام دیا کہ اصل اصول مذہب ہے انسان کو انسان سمجھنا۔ قادرِ مطلق کو اپنے افعال سے مطمئن کرنا اور حیات جاودانی کے لئے کوشاں رہنا۔ یہ ہی ایک طریقہ ہے نجات حاصل کرنیکا۔

علیٰ ہذا ڈاکٹر صاحب موصوف نے ایک طرف تو کبیر، نانک، دادو وغیرہ ہندو سنتوں کی تلقین کا تبصرہ کیا اور دوسری طرف صوفیائے کرام کے نظریوں اور اصول ہائے زندگی کا جائزہ لیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ سنت اور صوفی دونوں ہی ہندو مسلم یگانگت کے قائل تھے اور انہوں نے دونوں قوموں کو متحد کرنے کی مسلسل کوشش کی ۔ چنانچہ اس خیال کو ثابت کرنیکی غرض سے انہوں نے ان اصحاب کی تصانیف سے متعدد حوالے پیش

گئے ہیں اور یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں کی ہی منزلِ مقصود ایک ہی ہے پھر تفرقہ کس لئے؟

ڈاکٹر صاحب نے ہندو مسلم یکجہتی کا مشاہدہ نہ صرف مذہبی اصول کو پیشِ نظر رکھ کر ہی کیا ہے بلکہ اس کی مثالیں عملی زندگی کے ہر ایک پہلو سے لیکر اپنے نظریہ کی تائید کی ہے۔ صنعت و حرفت، موسیقی، مصوری اور فنِ تعمیر میں جو قرونِ وسطیٰ میں تغیر و تبدل ظہور پذیر ہوئے ان پر تفصیلی بحث کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انکی پس پشت میں دونوں کا باہمی اور مشترک ذوق و جذبہ تھا۔ اس دور میں جو عمارتیں بنیں وہ نہ تو کلیتاً اسلامی طرز کی بنیں اور نہ ہندو طرز کی ہی تھیں بلکہ دونوں طرزوں کا خوشگوار امتزاج بنیں۔ اسی طرح مسلمانوں نے ہندو راگ راگنیوں پر ایک نیا رنگ چڑھایا۔ کچھ کو تو بجنسہٖ اپنالیا اور کچھ کو نئی شکل دی۔ پھر جب فنونِ لطیفہ کی نشو و نما میں ہندو اور مسلمانوں نے اپنے جذبات اور ہنر کی یکرنگی کا نمونہ پیش کیا ہے تو اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ زندگی کے دیگر شعبوں میں بھی وہ دوش بدوش ہی گامزن رہے ہوں گے۔

زبان ہی مذہب کا اہم مجسمہ مانا گیا ہے۔ بلا زبان کی مدد کے مذہب کی نہ تو تلقین ہی ہوسکتی ہے اور نہ اشاعت ہی۔ اہلِ اسلام ہندوستان میں اپنے ساتھ فارسی اور عربی زبانیں لائے۔ عربی تو رجعت پسند علماؤں تک محدود ہوکر رہ گئی مگر درباری زبان ہونے کی وجہ سے فارسی کہیں زیادہ مقبول ہوگئی۔ یہاں کی فضا میں نہ صرف اس کا رنگ و روپ ہی بدل گیا بلکہ اس کا اثر ہندوستان کے مختلف علاقوں کے عوام کی زبانوں پر پڑا۔ بنگالی، مرہٹی، پنجابی، تلیگو، کنڑ میں فارسی کے سینکڑوں الفاظ شامل ہی نہ ہوگئے بلکہ شیر و شکر ہوگئے اور اردو فارسی اور ہندی کے امتزاج کا ایک دلکش نمونہ ہی بن گئی۔ اس پہلو پر بھی ڈاکٹر صاحب ممدوح نے ہندو مسلم اتحاد کے نقطۂ نظر سے تفصیلی بحث کی ہے اور انہوں نے یہ بتایا ہے کہ اردو ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے۔

دائرۂ ادب میں ڈاکٹر صاحب ہمیشہ اردو اور ہندی دونوں کے اشتراک کے حامی رہے اور ان زبانوں کو نزدیک تر لانے کے لئے کوشاں رہے۔ اس کام میں انہوں نے پنڈت سندر لال صاحب کا ہاتھ بٹایا۔ گرامی پنڈت جی نے ایک رسالہ کی اشاعت کی جس میں صفحہ بصفحہ اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں مضامین چھپتے تھے۔ غالباً اس رسالے کی اشاعت بند ہوگئی۔ مگر یہ دونوں زبانوں کو قریب تر لانے کی ایک قابلِ ستائش ترکیب تھی۔

اسکے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے ایک اور بھی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لی۔ ایک ایسا موقع آیا جبکہ ۱۹۲۷ء میں صوبہ یوپی کے وزیر تعلیم جناب رائے راجیشوربلی نے ہندوستانی اکاڈیمی کے افتتاحی جلسے میں تقریر کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ "میں اس موقع کا ایک خاص دلچسپی سے منتظر تھا نہ صرف اس لئے کہ اب میری سالہا سال کی ایک آرزو پوری ہو رہی ہے بلکہ اس لئے بھی کہ یہ موقع ہندوستان کے ادبی انقلاب میں ایک منزلی ستون کے مانند ہے۔ مجھے اکاڈیمی کے کارِ منصبی کی ترتیب و تکمیل کے لئے ایک ذی علم اور وسیع النظر شخص کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ آپ لوگ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ ڈاکٹر تاراچند سے بہتر کوئی دوسرا شخص ملنا محال تھا۔" اس کے بعد برسوں تک ڈاکٹر صاحب اکاڈیمی کے سکریٹری رہے اور ان کے زیرِ انتظام اردو و ہندی میں متعدد تصانیف شائع ہوئیں اور کئی خرد افزا لکچر بھی ہوئے۔ اس کے علاوہ انہیں کے زیرِ نگرانی "ہندوستانی" نام کا ایک سہ ماہی رسالہ عرصۂ دراز تک شائع ہوتا رہا۔ اس میں ملک کے نامی گرامی عالموں کے مضامین چھپے جن سے کہ ادبی دنیا بہرہ مند ہوئی۔ یہ ڈاکٹر صاحب میں حوصلہ تھا کہ مہامہوپادھیا پنڈت گوری شنکر ہیراچند اوجھا، لالہ سیتارام، کوبلی، مسٹر عبداللہ یوسف علی، مولانا سلیمان ندوی اور پروفیسر محمد حبیب جیسے مفکروں کو ایک ہی لڑی میں منسلک کرکے اکاڈیمی کا نام روشن کیا۔ ہندو مسلم اتحاد کی یہ ایک معرکۃ الآرا خدمت تھی۔

ڈاکٹر صاحب کا علمی معیار تو اعلیٰ درجہ کا تھا ہی، مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک ہوشیار سیاست داں اور سیاست کار بھی تھے۔ الہ آباد یونیورسٹی میں وہ سیاست کے پروفیسر رہے۔ پھر وائس چانسلر ہوئے۔ ازاں بعد مرکز ہند میں محکمۂ تعلیم کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ ان تمام جگہوں پر اپنی ذمہ داری کو پورا کرنے میں انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کے پہلو کو برابر مدِ نظر رکھا۔ ان کے نقطۂ نظر اور وضعداری سے خوش ہوکر پنڈت جواہر لال نہرو نے ڈاکٹر صاحب موصوف کو سفیر بناکر ایران بھیجا۔ وہاں پہنچ کر شاہِ ایران انکے دلدادہ ہوگئے۔ ایران کے ادبی حلقوں میں ان کی بیحد قدر و منزلت ہوئی۔ وہاں دورانِ قیام میں شہزادہ داراشکوہ کی مشہور تصنیف سرِ اکبر کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور ایک پرمعنی تمہید بھی لکھی۔ ڈاکٹر صاحب نے موزوں الفاظ میں داراشکوہ کے خیالات کی تائید کی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا آخری حصہ ہندوستان کی جدوجہدِ آزادی کی مستند تاریخ کی تصنیف و تالیف میں صرف ہوا۔ یہ چار جلدوں میں ہے۔ اس میں بھی انہوں نے جگہ بجگہ ہندو مسلم اتحاد کے مسئلہ پر بحث کی ہے اور سرسید احمد کی تقریروں کے حوالے سے اس پہلو کو روشن کرنے کی کوشش کی ہے کہ مذہب ایک چیز ہے اور قومیت دوسری چیز [illegible] کوئی تصادم لازم نہیں۔ مختصر یہ کہ ڈاکٹر صاحب نے ہندو مسلم اتحاد کے مسئلہ پر ہر پہلو سے غور کیا ہے اور اپنے خیالات کا اظہار [illegible] میں کیا ہے۔ وہ انسان کو سمجھتے تھے اور مساوات کے اصول کے قائل [illegible] تھے ان کی نگاہ میں

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں [illegible]
ہندی ہیں ہم وطن ہیں [illegible]

وی۔ جی۔ ڈگھے
۸۰ آنند وتیدیا روڈ۔ بمبئی ۴۰۰۰۲۸

ڈاکٹر تاراچند
مورّخِ تحریکِ آزادی

ڈاکٹر تاراچند کا عظیم ترین کارنامہ ان کی کتاب "تاریخ تحریکِ آزادیِ ہند" ہے جو ۲۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے اور چار جلدوں میں شائع ہو رہی ہے۔ یہ کتاب نہ صرف ہند کے ماضی و حال کی خامیوں کا ایک مفصل اور واضح تجزیہ پیش کرتی ہے بلکہ ہند کے تاریخی ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ ڈاکٹر تاراچند کی خواہش تھی کہ ان کے ملک کے باشندے خصوصاً اس کا طبقۂ خواص اپنے ملک کے ماضی کو اچھی طرح سمجھ لیں تاکہ وہ اس کی اساس پر ایک ترقی پسند، مستحکم اور مضبوط ہند کی تعمیر و تشکیل کر سکیں۔ انہوں نے ہند کے سماجی اور سیاسی نظام کا جو بصیرت افروز اور بے لاگ تجزیہ کیا اس کی دور بینی سے ایک طرف تو ملک کے رجعت پسند خفا ہوئے اور دوسری طرف "مائی باپ" مدرسۂ فکر کے برطانوی مورخین چراغ پا ہوئے کیونکہ ڈاکٹر تاراچند نے ہند میں برطانوی حکومت کے ڈھول کی پول کھول کر رکھدی۔

چنانچہ پریس اور پارلیمنٹ دونوں میں "تاریخ تحریکِ آزادی" کی پہلی جلد پر بڑی نکتہ چینی ہوئی لیکن ڈاکٹر تاراچند نے ان معترضوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا کیونکہ تحریک آزادی کی تاریخ اور بنیادی مسائل کے بارے میں وہ وہی کچھ لکھ رہے تھے جو سرکاری دستاویزات، کانگریس، مسلم لیگ اور دیگر سیاسی جماعتوں کے محفوظ کاغذات، ہم عصر رسائل، اخبارات اور ہندی اور برطانوی لیڈروں کے روزنامچوں اور سوانح میں پایا جاتا تھا۔ ان کے معترضین ایسی سی کہتے رہے لیکن ڈاکٹر تاراچند جس راہ کو حق کی راہ سمجھتے تھے اس پر آگے بڑھتے چلے گئے۔

حکومت ہند نے اس کام کے لئے ایک نہایت موزوں شخص کا انتخاب کیا تھا۔ ڈاکٹر تاراچند ایک ممتاز طالب علم تھے۔ انہوں نے ۱۹۱۲ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے تاریخ میں ایم اے کیا اور اول درجہ حاصل کیا۔ حکومت نے انہیں ڈپٹی کلکٹری کی پیش کش کی لیکن انہوں نے یہ عہدہ قبول نہیں کیا اور اس کی جگہ ایک قلیل مشاہرے پر ایک مقامی کالج میں تاریخ اور سیاست کے معلم بن گئے۔ رفتہ رفتہ وہ اس کالج کے پرنسپل ہو گئے۔ طلبا ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ ۱۹۲۱ء میں وہ آکسفورڈ چلے گئے اور ڈی فل کی تیاری کرنے لگے۔ ۱۹۴۶ء میں ان کو الٰہ آباد یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا لیکن وہ اس عہدے پر زیادہ دنوں نہ رہ سکے۔ جب ملک کی پہلی آزاد حکومت قائم ہوئی تو اس نے قوم کی تعمیر میں تعلیم کی اہمیت کو پہچانا اور ایک ایسے قابل شخص کی تلاش شروع کی جو وزارتِ تعلیم کا انتظام سنبھال سکے۔ نظرِ انتخاب ڈاکٹر تاراچند پر پڑی۔ یہاں وزارتِ تعلیم میں ان کی خدمات کا جائزہ لینا مقصود نہیں۔ حکومت نے ڈاکٹر تاراچند کی فارسی زبان و ادب کی بے مثال ہمہ دانی سے بھی فائدہ اٹھایا اور وزارتِ خارجہ نے ان کو سفیر بنا کر ایران بھیجا۔ اپنی فارسی علمیت کی بنا پر انہوں نے ایران میں بڑے دوست بنائے اور ہند ایرانی دوستی کی بنیادیں استوار کیں۔ وہ ایران سے ۱۹۵۰ء کے اواخر میں واپس آئے اور ۱۹۵۰ء میں انہوں نے تحریکِ آزادیِ ہند کی تاریخ لکھنے کی عظیم الشان مہم شروع کی جو ۱۹۷۱ء کے وسط میں ختم ہوئی لیکن جب فروری ۱۹۷۳ء میں راشٹرپتی وی وی گری نے اس تاریخ کی آخری دو جلدوں کا اجرا کیا تو ڈاکٹر تاراچند شدید علالت کے باعث اس تقریب میں شریک نہ ہو سکے۔ اکتوبر ۱۹۷۳ء وہ اپنے عزیزوں، دوستوں اور شاگردوں کو سوگوار چھوڑ کر راہیِ ملکِ عدم ہو گئے۔

ڈاکٹر تاراچند کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ وہ اعلیٰ پائے کی گفتگو سے لطف اندوز ہوتے تھے لیکن کھانے پینے اور دیگر لذائذِ دنیاوی کے سلسلے میں وہ احتیاط اور پرہیز کے عادی تھے۔ وہ صرف کتابوں کے رسیا تھے۔ وہ آخر دم تک علم کے جویا تھے اور مذہب، فلسفہ، تاریخ اور سوانح کی کتابوں سے ہمہ وقت گھرے رہتے تھے۔

ڈاکٹر تاراچند کو ہند کی تہذیب کے ارتقا میں گہری دلچسپی تھی۔ اس موضوع میں ان کی دلچسپی محض اپنے ملک اور ہند کی موجودہ زندگی کے تصادم تک محدود نہ تھی بلکہ جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے "تاریخ ہند مختلف الجہات کلچروں کے باہمی تصادم کی ایک درخشاں مثال پیش کرتی ہے جس کے بعد یہ کلچر رفتہ رفتہ باہمی ردو قبول کے ایک عمل سے منقلب ہو گئے۔ لہٰذا تاریخ، سماجیات اور تاریخ کے طالب علم کی توجہ چاہتی ہے کیونکہ وہ انسانی ذہنوں کے باہمی تفاعل اور کلچرل رابطوں کے اثرات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے جو کسی قوم کے رسم و رواج، مذہب، ادب اور فن میں دیکھے جا سکتے ہیں۔"

انہوں نے اس انداز فکر سے بدیشی چنگل سے ہند کی آزادی کے مسئلے کا مطالعہ کیا۔ انہوں نے یہ سوال اٹھایا کہ آخر بنیادی مسائل کیا کیا تھے۔ ہند کے سیاسی اور سماجی نظام میں کیا نقائص تھے جن کی بنا پر یہ دیوزاد ملک کوئی ڈیڑھ سو برس تک غلام رہا۔ پھر کس طرح اس ملک میں قومیت کے جذبے نے انگڑائی لی اور کیوں یہ جذبہ ساری قوم کے دل میں بیدار نہ ہوا اور کیا وجوہ تھے جن کی بنا پر ملک کو تقسیم کرنا پڑا۔ انہوں نے ۱۹۰۵ء کی تقسیم بنگال اور سودیشی تحریک، ۱۹۲۰-۲۲ء کی خلافت اور عدم تعاون تحریک، ۱۹۳۰-۳۴ء کی سول نافرمانی تحریک اور ۱۹۴۲ء کے خودبخود رونما ہونے والے انقلاب کو قومی تحریک میں سنگِ میل قرار دیا۔ ان کا ذہن قومی تحریک کے بڑے خط وخال پر مرکوز تھا نہ کہ مقامی تحریکوں کی جزئیات پر۔ اس کے باعث کبھی کبھی چند تنگ نظر لوگ ان سے خفا بھی ہو گئے۔

ڈاکٹر تاراچند کے اندازِ فکر اور طریق کار کو بہتر طور پر سمجھنے کے لئے ہم ذیل میں تاریخ تحریکِ آزادی کی چاروں جلدوں کا ایک اجمالی جائزہ پیش کرتے ہیں۔

ہندوستان کی قومی تحریک نہ صرف اس ملک بلکہ دیگر ممالک کے لئے بھی اہمیت رکھتی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں جب برطانیہ نے بھارت کو چھوڑا تو ایسی قوتیں حرکت میں آئیں جن کے باعث ایشیا کے براعظم میں دوسرے ملکوں کو بھی آزادی نصیب ہوئی۔ یہ وہ ممالک تھے جو اٹھارہویں صدی میں یکے بعد دیگرے مغربی استبداد کے شکار ہوئے، غلام بنے اور جن کا یورپین ملکوں کے ہاتھوں استحصال ہوتا رہا۔ ان میں ہند غالباً پہلا ملک تھا جو صدیوں کی گراں خوابی سے بیدار ہوا۔ مغربی تعلیم اور مغربی ملکوں سے روابط نے ہند باسیوں میں جو تحقیق وتفتیش کا جذبہ پیدا کیا اس کے باعث انہوں نے اپنی روایتی اقدار سے اعراض کیا، اپنے سماجی اور سیاسی اداروں کی جانچ پرکھ شروع کی اور بدیسی تسلط کو للکارا۔ تاریخ ہند کے برطانوی دور کا اولین حصہ گہرے احساسِ ذلت اور روحانی کرب پر مشتمل تھا لیکن بعد میں اس کا ارتفاع ہوا، جمہوری اقدار کو قبول کیا گیا اور ان کے حصول کے لئے جدوجہد کی گئی۔ چنانچہ ہند کی تحریکِ آزادی محض ایک سیاسی جدوجہد نہیں تھی بلکہ ایک قدیم تہذیب کی از سرِ نو تشکیل تھی جس نے جدید دنیا میں اپنا ایک مقام بنا لیا۔ ڈاکٹر تاراچند نے اس حیاتِ نو، ماہیت، یا بہ الفاظ دیگر اس ملک کی ایک نئی شخصیت کے ارتقا کے خطوط کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب کی پہلی جلد میں ۱۷۰۰ء سے ۱۸۵۷ء کے دور کا جائزہ لیا گیا ہے جو گویا تحریک آزادی کے ڈرامے کے عقبی پردے کا کام دیتا ہے۔ یہ کتاب ایک سماجی وتاریخی دستاویز کے طور پر بنیادی اہمیت کی حامل ہے اور ماقبل برطانوی ہند اور برطانوی تسخیرِ ہند اور اس کے اثرات کی ایک عمرانی تفسیر وتشریح پیش کرتی ہے۔ اس عہد کی سیاسی تاریخ پر بے شمار کتابیں ہیں۔ اٹھارہویں صدی کی لاقانونیت، بدامنی اور جنگوں کا تذکرہ ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ یہ دلیل بہت عام ہے کہ اٹھارویں صدی کا ہندوستان مادی طور پر اور اخلاقی طور پر پست تھا جس کے باعث وہ بیدار اور فاتح مغرب کا مقابلہ نہ کر سکا۔ لیکن ڈاکٹر تاراچند کی اس کتاب میں پہلی بار اس دلیل کا نقد وتجزیہ کیا گیا ہے۔

مصنف نے پیش لفظ میں اپنے موقف کی ان الفاظ میں وضاحت کی ہے: "میں تحریک آزادی کی تاریخ لکھنا چاہتا ہوں نہ کہ محض غلامی سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کہانی۔ غلامی سے چھٹکارا پانا ایک منفی تصور ہے۔ اس کے مفہوم میں غیر منحصر ہونا۔ اس سے اس سماج کے کردار وصفات پر کوئی روشنی نہیں پڑتی جس نے بدیسی غلامی کا جوا اتار کر سیاسی خودمختاری حاصل کی۔ آزادی محض بدیسی قبضے کی غیر موجودگی نہیں۔ آزادی ایک ایسے سماج کی نشان دہی کرتی ہے جس میں بعض مثبت صفات موجود ہیں۔ یعنی جس میں عوام کی مرضی کے مطابق عمل کرنے کی صلاحیت موجود ہے جو ایک جمہوری طرزِ زندگی کی حامل ہے اور جس میں تمام شہریوں کو آزادی ومساوات حاصل ہے۔"

ہند کی آزادی ایک نئے ڈھنگ سے سوچنے اور زندگی بسر کرنے کا لازمی نتیجہ تھی۔ آزادی اس وقت آئی جب عہدِ وسطیٰ کے ذہن کی جگہ ایک جدید ذہن اور عہدِ وسطیٰ کے سماج کی جگہ جس میں ذات اور فرقہ کا فیصلہ کن پارٹ تھا، ایک ایسا سماج وجود میں آیا جس میں ذات اور فرقے کی وفاداری پر ملک کی وفاداری کو مقدم سمجھا گیا اور جب عہد وسطیٰ کی معیشت کی جگہ ایک جدید معیشت قائم ہو گئی۔ اس مجموعی تبدیلی کو ایک معنی خیز انقلاب کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ یہ ضروری تھا کہ نئے ہندوستان کو سمجھنے کے لئے اس ریاست، سماج اور معیشت کی ماہیت کا جائزہ لیا جائے جو برطانوی تسلط کے ماقبل ہند میں پائی جاتی تھی۔

اس طرح ڈاکٹر تاراچند نے اپنے کام کو کہیں زیادہ مشکل اور وسیع تر بنا لیا ہے کیونکہ ایک فلسفی مورخ کا کام محض بیانِ واقعہ نہیں۔ آزادی کا جو تصور ان کے ذہن میں تھا وہ تحریک نہ صرف بدیسی حکومت کے جبر کے خلاف بلکہ ہندوستانی سماج کی لایعنیت کے بھی خلاف چلائی گئی تھی۔ پہلی اور تمہیدی جلد میں بیشتر اسی کی لایعنیت یعنی توہم، تعصب کے سماجی ماحول، سیاسی زندگی میں اخلاقی اقدار کے فقدان اور بدیسی حملے کے تشدد کا ذکر ہے۔ مختصراً اس میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح پرانا نظام خود اپنے کرتوتوں کے طفیل اور بدیسی تسلط کے باعث پارہ پارہ ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ یہی وہ بنیاد تھی جس پر بعد کا

ڈھانچہ کھڑا کیا گیا۔

پہلے باب میں اٹھارویں صدی کے دوران ہند کی سیاست کی ایک تاریک اور مایوس کن تصویر پیش کی گئی ہے۔ حاکم عیش و عشرت میں ڈوبے تھے۔ درباروں میں گٹ بندی تھی۔ انتظامیہ اور دفاع عدم توجہی کا شکار تھے۔ نتیجتاً ملک میں لاقانونیت اور بدامنی کا دور دورہ تھا۔ نہ تو کوئی صوبائی حاکم نہ ہی کوئی ہندو راجا اس قابل تھا کہ شہنشاہی طاقت اپنے ہاتھوں میں لے سکے۔ چنانچہ حملہ آوروں نے آسانی سے ملک پر قبضہ کر لیا اور ۱۸۰۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے شہنشاہ کو اپنے زیر تحفظ لے لیا۔

دوسرے باب میں مصنف نے ہند کے سماجی اداروں کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ اور مملکت ہند کی سماجی اساس کا جائزہ لیا ہے۔ گو آریہ کلچر کی صدیوں تک توسیع ہوتی رہی، لیکن ملک کی وسعت، اس کی جغرافیائی خصوصیات کا اختلاف اور ازمنۂ وسطیٰ میں ذرائع رسل و رسائل کی کمی نے ادغام و اجتماع کو دشوار بنا دیا اور مرکز سے گریز کرنے والی قوتوں پر شاذ ہی کوئی روک ٹوک رہی۔ ملک کے بڑے جغرافیائی خطوں نے اپنے اپنے مخصوص نسلی نمونے پیدا کئے جو کہ اولین اور مابعد کے باشندوں کے اختلاط سے وجود میں آئے اور جنہوں نے اپنی مخصوص زبانیں بنائیں۔ جغرافیائی اور لسانی اختلافات کو ذات پات اور دیہاتوں نے جو ہندوستانی معاشرے کا سماجی اور معاشی خاکہ مہیا کرتے ہیں مزید ہوا دی۔ ذات پات کے تصورات نے ہند کے ذہنوں پر شروع ہی سے غلبہ کر لیا اور معاشرے کو سینکڑوں خود کفیل غیر متحرک اور بے میل ٹکڑوں میں منقسم کر دیا۔ فرد کا وجود اس کی ذات اور اس کے گاؤں سے باہر نہیں تھا۔ ان چھوٹی جماعتوں نے اس کے ذہنی اُفق کو محدود کر دیا اور باہر کی دنیا سے بے تعلق بنا دیا چنانچہ امور مملکت ایک چھوٹی جماعت کے ہاتھ میں چھوڑ دیئے گئے اور عوام نہ اپنی دلچسپی حکومت میں لیتے تھے اور نہ اپنے حاکموں میں۔ اس لحاظ سے اٹھارویں صدی کا ہندوستان کوئی زندہ سماج نہ تھا بلکہ بے شمار خود کفیل اکمل بے جوڑ اکائیوں کا ایک بڑا مجموعہ تھا۔

کوئی بھی نڈر مہم جو اپنا راج قائم کر سکتا تھا لیکن جیسے ہی اس کی رہنمائی ختم ہوتی، متفرق اکائیاں اپنی الگ تھلگ زندگی بسر کرنے میں مشغول ہو جاتیں۔ حاکم تلوار کے ذریعہ حکومت کرتا تھا۔ فوج اور مالیہ اس کے دو خاص سہارے تھے۔ اگر تلوار کمزور ہاتھوں میں پڑ جاتی تو یہ حاکم خاندان کی بدقسمتی ہوتی۔ رعایا کو نہ اس سے کوئی سروکار تھا اور نہ اس کا کوئی غم ہوتا۔ حاکم و محکوم کے درمیان وہ ربطی بندھن مفقود تھا جو دونوں کو ایک کر دیتا اور دونوں کو احساس دلاتا کہ وہ کسی بڑی مہم میں ایک دوسرے کے شریک ہیں۔ سمجھا یہ جاتا تھا کہ حکومت بادشاہ کے بچوں کی جاگیر ہے نہ کہ کوئی دولتِ مشترکہ یا جمہوریہ۔ یہ محض بادشاہ کی ذاتی خوبیوں اور کردار پر منحصر تھا کہ وہ کسی دوسرے بادشاہ سے بہتر ثابت ہو۔ عملی طور پر کسی بھی سیاسی نظام سے خواہ وہ ہندو ہو یا مسلم یہ پتہ نہ چلتا تھا کہ وہ کسی اخلاقیات پر مبنی ہے۔ حاکم طاقت کا سرچشمہ تھا اور وہ کسی بھی دوسرے ادارے کو اپنی طاقت میں شریک نہ کرتا تھا۔

بادشاہ کو فوج اور تعلیم یافتہ طبقہ کی حمایت حاصل ہوتی لیکن یہ طبقے بہرحال ایک چھوٹی سی اقلیت تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ بادشاہیت عوام سے کٹ کر الگ تھلگ ہو گئی اور اس کو کوئی استقلال نہ تھا۔ کوئی اندرونی بغاوت یا کوئی بیرونی حملہ ایک شاہی خاندان کی حکومت کو ختم کر سکتا تھا۔ عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ ایسے بے شمار شاہی خاندانوں کی مثال مہیا کرتی ہے جنہوں نے نئی حکومتیں قائم کیں لیکن ایک یا دو ہی نسل کے بعد تاراج کے سمندر میں گم ہو گئے۔

چنانچہ یہ ڈھیلا ڈھالا معاشرہ منظم حملہ آوروں کا کیا خاک مقابلہ کرتا۔ انگریز ہندوستان میں پھیری کر کے مال بیچنے والے تاجروں کی حیثیت سے آئے اور ملک کے مالک بن بیٹھے۔ برطانوی قبضہ اور ہندوستانی معاشرہ پر اس کے اثرات اس کتاب کا اہم ترین حصہ ہیں جو پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ کیونکہ یہی زمانہ تھا جس کے دوران بہت سی پرانی اور فرسودہ باتیں ختم ہو گئیں اور ان کی جگہ نئے خیالات اور نئے اداروں نے لے لی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کو اُس تاجرانہ ذہنیت نے جنم دیا جس کا اس زمانے کے یورپ میں دور دورہ تھا۔ کمپنی کو یہ ڈھارس تھی کہ اس کا ملک آڑے وقتوں میں ہمیشہ اس کی مدد کرے گا۔ چنانچہ اس نے ہند سے تجارت کی اجارہ داری حاصل کر لی۔ ایک کے بعد ایک اسکے یورپین مقابل راہ سے ہٹتے گئے حتیٰ کہ ۱۷۵۷ء میں فتح پلاسی کے بعد برطانوی طاقت کو ہند میں استحکام حاصل ہو گیا ۱۹ویں صدی کے آخر تک مرہٹوں کو ہرا کر برطانیہ ہند میں سب سے بڑی طاقت بن گیا۔ فتوحات کا سلسلہ سکھ جنگوں پر ختم ہوا اور سارا ہند انگریزوں کے ہاتھ میں آ گیا۔ ہندوستانیوں میں حوصلے یا ہمت کی کمی نہ تھی لیکن برطانوی افواج نے انہیں شکست دیدی کیونکہ وہ بہتر علم، نظم و ضبط اور تنظیمی صلاحیتوں کے مالک تھے اور ان میں جذبۂ حب الوطنی تھا جس کی ہندوستان میں کمی تھی۔

نئے انتظامیہ کے عزائم یہ تھے کہ ملک میں برطانوی حکومت کو استوار حاصل ہو اور حکمراں طاقت کے عوام کے فائدے کے لئے محکوم رعایا کی دولت کا استحصال کیا جائے۔ برطانوی پارلیمنٹ ہندوستان کی حکومت کی مختار اعلیٰ بن گئی اور گورنر جنرل اور صوبائی گورنر پارلیمنٹ کے مقامی ایجنٹوں کے طور پر کام کرنے لگے۔ شہری اور فوجی انتظامیہ میں تمام

کلیدی نوکریاں حکمراں نسل کے لئے مخصوص ہوگئیں۔ بیرونی حاکم کے اقتدار کا انحصار ننگی تلوار پر تھا۔ اس میں محکوم کی مرضی کا کوئی دخل نہ تھا۔ ملک کی آمدنی سے مستقل طاقت کو خراج ادا کیا جاتا تھا۔ اسے ملکی زراعت و صنعت کو فروغ دینے یا ملکی دولت بڑھانے کے لئے استعمال کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

یہ تبدیلیاں عوام کے لئے تباہ کن ثابت ہوئیں۔ وہ بے زار، بے حس، بداخلاق اور بے ہمت ہوگئے۔ ان میں ایک غلام قوم کے سارے معائب اور اخلاقی خرابیاں پیدا ہوگئیں۔ راجاؤں کو نہتا اور رعایا سے الگ تھلگ کر دیا گیا۔ حاکم طبقوں یعنی سپاہیوں اور منتظموں سے ذمہ دار عہدے چھین لئے گئے۔ عوام کو بھاری محصولات سے تہی دست کر دیا گیا اور ان کی صنعت و حرفت کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔

لیکن برطانیہ نے جن معاشی اور انتظامی پالیسیوں پر عمل کیا ان سے ایک سماجی انقلاب آیا اور نئے طبقے وجود میں آئے۔ اس انقلاب نے دانشور پیدا کئے۔ انہوں نے بدیشی حکومت کے تحت رہنے سے انکار کیا۔

اس تاریخ کی دوسری جلد میں ۱۸۰۰ء سے ۱۹۰۵ء تک کا جائزہ لیا گیا ہے اور انیسویں صدی میں برطانیہ نے ہند پر جو اثرات ڈالے تھے ان کے بارے میں ہند کے ردِّ عمل کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ ہند جب مغرب کے مقابل آیا تو اس نے مجبوراً اپنی روایات، اپنے اداروں اور اپنی قدروں پر ایک ناقدانہ نظر ڈالی۔ مغرب کے چیلنج کا ایک زبردست ردِّ عمل ہوا اور ایک بار پھر ہند نے ہندوستانی زندگی کے بنیادی اصول کا ادعا کیا۔ وہ اصول جو ہندوستانی کلچر، ان کی انفرادیت اور قرنہا قرن میں اس کے تسلسل کا اخلاقی جواز پیش کرتے ہیں۔ ہند کی تخلیقی قوتوں کے احیا کے لئے سیاسی آزادی شرطِ اول تھی۔ چنانچہ یہی قومی جدوجہد کا مقصدِ اوّل یا اولیٰ بن گئی۔

انیسویں صدی کے پہلے پچاس برسوں میں جب کہ ملک میں تبدیلی کی ہوائیں چلنے لگیں تو پرانے ہندوستان کو بہت برا لگا کیونکہ اس تبدیلی سے قدیم کلچر کو خطرہ لاحق تھا۔ لہٰذا ملک میں ایک زبردست لیکن بے سود ردِّ عمل ہوا۔ اِدھر اُدھر چند جاگیرداروں، کسانوں اور قبائلیوں نے بغاوت کا علم بلند کیا اور اس کا انجام ۱۸۵۷ء کی لڑائی میں رونما ہوا۔ لیکن اسی دوران ایک نئے ہند کی تشکیل ہو رہی تھی اور ایک نیا طبقہ یعنی ہند کا متوسط طبقہ بیدار ہو رہا تھا۔ اس طبقے نے عوامی حقوق کے بارے میں انگلستان سے بہت کچھ سیکھا اور وہ ان خیالات کو ہندوستانی زندگی کا جز بنانا چاہتا تھا۔ نتیجتاً سماجی، مذہبی اور سیاسی اصلاحات کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ قومیت کا تصور انیسویں صدی کے اوائل میں پیدا ہوا اور بڑھنے اور پھیلنے لگا۔ شروع میں قومیت کی تحریک کمزور تھی اور اس کے مقاصد واضح نہیں تھے۔ اسے سامراج کے معنی اور اس کی محوسیت کا جو اس وقت مغرب میں ایک وبا کی طرح پھیل رہی تھی صحیح ادراک نہیں تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ جب تک عوامی بغاوتیں اور عالمی تباہیاں اسے مجبور نہ کر دیں سامراج کبھی بھی خود مختاری کی عوامی مانگوں کو پورا کرنے پر راضی نہیں ہوتا۔

لیکن اس صدی کے دوران جو اقتصادی تبدیلیاں ہو رہی تھیں وہ قومی تحریک کو ڈھال بنانے کے لئے زمین ہموار کر رہی تھیں۔ عوام کے افلاس اور مصیبتوں میں روز افزوں اضافہ اور متوسط طبقے کی توسیع سے قومی تحریک کو تشویق ملی اور اس کا دائرہ روز بروز وسیع تر ہوتا گیا۔

نئے جذبے سے ایک طرف تو مذہبی اور سماجی اصلاحات بروئے کار آئیں اور دوسری طرف علم و ادب اور فنونِ لطیفہ میں ایک نئی زندگی آئی اور ان سب نے مل کر ایک نئے عہد کے لئے زمین ہموار کی۔

عوام کی مانگوں کے مقابلے میں حاکم قوم نے نفی کی ایک دیوار کھڑی کر دی۔ انہوں نے یہ ماننے سے بھی انکار کر دیا کہ ہند کی کوئی ہستی ہے۔ بقول اُن کے "نہ کوئی ہند ہے، نہ کوئی ہند تھا اور نہ کوئی ملک ہند کے نام سے موسوم تھا۔" اس تضاد کے تقابل نے ایک عظیم ڈرامے کی شکل اختیار کر لی۔ شروع کے ایکٹ میں کشمکش محض عرض داشتوں اور احتجاجوں کا روپ دھارن کرتی ہے لیکن بعد میں یعنی بیسویں صدی کے شروع میں سین بدلتا ہے اور زندگی کے سکون میں بحران اور شدت کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔

ہند کی تحریکِ آزادی کا عملی دور ۱۹۰۵ء میں شروع ہوتا ہے۔ کیونکہ تقسیم بنگال سے راہیں واضح طور پر جدا ہو جاتی ہیں۔ پھر ایک مختصر وقفہ ہے جس کے بعد شدید سرگرمی کا دور شروع ہوتا ہے۔ ہند کے عوام مہاتما گاندھی کی قیادت میں جوق در جوق سامنے آتے ہیں۔ انجام کار یہ شاندار جدوجہد آزادی حاصل کر لیتی ہے۔ اس عظیم و اسع ڈرامے کا منتہا آخری دو جلدوں کا موضوع ہے۔

قومیت کے تصور کا فروغ و توسیع اور خود محکومی کا جذبۂ شدید تیسری جلد کا موضوع ہے۔ ان تصورات کی تبلیغ کے لئے ہندو اور مسلم دونوں مذاہب اور فلسفوں کی نئی تشریح و ترجمانی کی گئی۔ ترجمانوں کا مقصد تو یہ تھا کہ جذبۂ آزادی کے شعلے کو فروزاں کیا جائے لیکن انہوں نے اس اپیل کے لئے قدیم مقدس کتب کے حوالوں کا سہارا لیا۔

ہندو اور مسلم دونوں ترجمانوں کا مقصد ایک ہی تھا۔ انہوں نے ایسی زبان استعمال کی جس سے ان کا فرقہ مانوس تھا لیکن جو دوسرے فرقے کے لئے ناقابلِ فہم تھی۔ اس عدم مفاہمت سے

(باقی [illegible])

امیر حسن عابدی
ہیڈ ڈیپارٹمنٹ آف عربک اینڈ پرشین اینڈ ڈین فیکلٹی آف آرٹ، یونیورسٹی دہلی۔

ڈاکٹر تاراچند اور فارسی ادب

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

بیسویں صدی کی اہم شخصیتوں میں، جنہوں نے ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کو سنوارنے اور جلا دینے میں مدد دی ہے، ڈاکٹر تاراچند صاحب کا نام نمایاں رہے گا۔ جو لوگ ان کے ساتھ رہے ہیں اور جن کو انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے، ان کو پورا اندازہ ہے کہ ان کا دل کتنا کشادہ اور ان کا مزاج کتنا ہمہ گیر تھا۔ ان کو زندگی کے تقریباً ہر گوشہ سے لگاؤ تھا۔ نیز ان کی بزرگانہ شفقتیں نوجوانوں کو کام کرنے کی ہمت دلاتی تھیں۔ ان میں حقیقت کی تلاش کا مادہ بہت قوی تھا اور بلا لحاظِ مذہب و ملت ان کے دل میں سب کے لئے برابر کی جگہ تھی۔ اگر وہ ہندو، بدھ اور دوسرے ہندوستانی مذاہب کے دلدادہ تھے تو دوسری طرف انہیں اسلام عیسائیت اور دنیا کے دیگر مذاہب سے اتنا ہی لگاؤ تھا، اور ہر قدم پر انہیں وحدت فی الکثرت کی تلاش رہتی تھی جو تمام انسانی رجحانات میں کارفرما ہے۔ اگر وہ بحیثیت ایک مورخ کے ہندوستانی تہذیب و تمدن اور یہاں کے فنون لطیفہ کا گہرا مطالعہ کرتے تھے تو دوسری طرف وہ یورپی تہذیب، اسلامی تمدن اور اسلامی فرہنگ سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ خاصکر وہ ایران و ہند کے تہذیبی ورثہ کے صحیح مالک، ناقد اور قدردان تھے۔ میں ان کی علالت کے زمانہ میں بھی اکثر ان سے ملا ہوں۔ اس عالم میں بھی ان کے اردگرد کتابوں کے انبار لگے رہتے تھے، جن میں دیوانِ حافظ اور دیوانِ غالب ضرور ہوتا تھا۔ ان دیوانوں کو وہ اپنے مطالعہ میں رکھا کرتے تھے۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ جس عہدہ پر فائز رہے، اپنی تمام مشغولیتوں کے باوجود تاریخ، ادب اور فلسفہ کا مطالعہ ان کی زندگی کا مسلسل جزو بنا رہا، جس سے کسی وقت بھی وہ غافل نہیں رہتے تھے۔

انہوں نے دہلی میں نشو و نما پائی۔ نیز ابتدائی تعلیم یہیں حاصل کی، مگر زیادہ تر وقت الہ آباد میں گذرا، جہاں وہ یونیورسٹی میں تاریخ کے علاوہ اردو ادب اور اس کی تاریخ بھی پڑھایا کرتے تھے۔ آزادی ہند کے بعد وہ الہ آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے۔ مگر مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی نظرِ انتخاب ان پر پڑی اور وہ انہیں وزارتِ تعلیم میں سکریٹری اور مشیر بنا کر دہلی لے آئے۔ اس کے بعد وہ ایران میں ہند کے سفیر کی حیثیت سے تہران تشریف لے گئے۔

ان کی شخصیت کے بہت سے نمایاں پہلو ہیں۔ مگر میں نے ان کا مطالعہ زیادہ تر فارسی ادب اور ایرانی فرہنگ کے عاشقوں کی حیثیت سے کیا اور ان کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ یوں سفرا آتے جاتے رہتے ہیں اور ایران بھی ہندوستان سے کتنے سفیر گئے اور رہے۔ مگر ڈاکٹر تاراچند صاحب نے اپنے دوران قیام میں ایران اور وہاں کے اہلِ علم و فضل پر جو گہرے نقوش چھوڑے ہیں وہ آج بھی باقی ہیں اور ان کا صحیح اندازہ وہی حضرات لگا سکتے ہیں جو وہاں جا کر وہاں کی علمی اور ادبی محفلوں میں شریک ہوتے ہیں۔ وہ وہاں اتنے دنوں سفیر رہے کہ انجمن سفرا کے رئیس بھی ہو گئے تھے۔ وہ ایرانیوں سے بے تکلف فارسی میں گفتگو کرتے تھے۔ آج بھی ایران میں ان کی شخصیت سے ہر صاحبِ علم و فضل واقف اور ان کا معترف ہے۔ وہاں کی مجلسوں میں آج بھی ان کا ذکر رہتا ہے۔

اس مدتِ اقامت میں بھی وہ سفارت کے رسمی کاموں کے علاوہ اپنا زیادہ تر وقت تہران یونیورسٹی کے اساتذہ اور دوسرے دانشوروں کے ساتھ صرف کرتے تھے، نیز وہاں کی علمی محفلوں میں شریک ہوتے، فارسی اور انگریزی میں تقریر کرتے اور صدارت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ آپ کے بہت سے مضامین اور تقریریں فارسی اور انگریزی میں شائع ہوئی ہیں جو ایران و ہند کے تعلقات پر روشنی ڈالتی ہیں۔ ان کا گھر اس زمانے میں علم و فضل کا مخزن خیال کیا جاتا تھا اور ایران کے ممتاز شعرا، اساتذہ، افسانہ نویس اور دوسرے علما اکثر وہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ ایران کے مشہور علما میں مرحوم پروفیسر پور داؤد، مرحوم استاد سعید نفیسی، مرحوم ڈاکٹر لطف علی صورتگر، مرحوم ڈاکٹر محمد معین، ڈاکٹر حسین خطیبی، ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا، ڈاکٹر پرویز ناتل خانلری اور علی دشتی صاحب وغیرہ جیسی بلند شخصیتوں سے ان کے دوستانہ اور برادرانہ تعلقات تھے۔ نیز ان کی شخصیت ایرانی تہذیب و تمدن اور وہاں کی زندگی کا ایک جزو بن گئی تھی۔

ڈاکٹر تاراچند، اعلیٰحضرت ہمایوں شہنشاہ آریا مہر کے بے حد مداح تھے۔ نیز اعلیٰحضرت بھی ان کا بڑا خیال فرماتے تھے جب اعلیٰحضرت ۱۹۶۹ء

میں ہندوستان تشریف لائے تو ڈاکٹر تاراچند صاحب ان سے ملنے کے لئے مخصوص الہ آباد سے دہلی آنے کی تیاریاں کر رہے تھے، مگر ضعفِ پیری اور بیماری نے اجازت نہ دی۔ اعلیحضرت کے علاوہ وہاں کے وزیر اعظم، وزرائے دربار اور دوسرے وزرا اور امرا سے بھی ان کے دوستانہ اور بے تکلفانہ مراسم تھے۔ مرحوم حسین علا صاحب اور ڈاکٹر منوچہر اقبال ایران کے وزیر اعظم اور وزیر دربار رہ چکے ہیں۔ بہرحال ان سے اور دوسرے اسی پائے کے حضرات سے ان کے بڑے مخلصانہ اور گہرے تعلقات تھے۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ ایک تقریب میں ڈاکٹر صاحب کے گھر پر ایک بڑا جلسہ ہوا جس میں مرحوم حسین علا صاحب نے جو اس وقت وزیر اعظم تھے صدارت فرمائی اور مرحوم پروفیسر پور داؤد نے ایران و ہند کے قدیم تعلقات پر ایک پرمغز مقالہ پڑھا۔ اسی طرح ایک جلسہ میں مرحوم ڈاکٹر محمد معین نے حضرت امیر خسرو پر ایک تحقیقی مقالہ پڑھا۔ کہا جاتا ہے کہ حافظ شیرازی نے حضرت امیر خسرو کی تین مثنویاں اپنے ہاتھ سے لکھی تھیں، جو اس وقت روس کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ ڈاکٹر محمد معین نے اس پر بھی کافی روشنی ڈالی تھی۔

ڈاکٹر علی اصغر حکمت کا ایران کی بلند ترین شخصیتوں میں شمار ہوتا ہے اور بڑے صاحب علم و فضل ہیں۔ آپ شاعر، نثر نگار اور تہران یونیورسٹی کے استاد بھی ہیں۔ دہلی یونیورسٹی سے انہیں اعزازی ڈاکٹری کی ڈگری بھی دی گئی ہے۔ رضا شاہ کبیر کے زمانہ میں عرصہ تک آپ وزیر تعلیم رہے۔ آپ نے وزارت خارجہ کا عہدہ بھی سنبھالا ہے۔ ڈاکٹر تاراچند صاحب کے ایران میں قیام کے دوران آپ ہندوستان میں ایران کے سفیر تھے۔ یہاں کے دوران قیام میں ڈاکٹر حکمت صاحب نے کالیداس کی شکنتلا کا "انگشترِ گمشدہ" کے نام سے منظوم ترجمہ کیا جسے دہلی یونیورسٹی نے شائع کیا تھا۔ اس کے علاوہ اسی زمانے میں آپ نے "سرزمین ہند" اور "نقشِ پارسی بر احجارِ ہند" نام کی اہم کتابیں لکھی ہیں۔ بہرحال وہ بھی ڈاکٹر تاراچند صاحب کے گہرے دوستوں میں سے تھے اور ایک دوسرے کے بڑے مداح تھے۔

ڈاکٹر سید محمد رضا جلالی نائینی صاحب کو ۱۹۷۱ء میں بنارس ہندو یونیورسٹی سے ڈاکٹری کی اعزازی ڈگری عطا ہوئی۔ اس موقع پر میں موجود تھا۔ ڈاکٹر تاراچند صاحب کو بھی دعوت دی گئی تھی، مگر وہ اپنی علالت کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے۔ ڈاکٹر نائینی صاحب پیشہ کے لحاظ سے وکیل ہیں۔ نیز آج کل اٹارنی جنرل اور رئیس وکلاء ہیں، مگر انکا زیادہ تر وقت ہندوستان کی تاریخ و تمدن کے مطالعہ میں صرف ہوتا ہے۔ آپ نے "رگ وید" کا جدید فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔ نیز بہت سی کتابیں لکھی اور ایڈٹ کی ہیں جن میں ایک اہم کتاب وہ ہے جو گورونانک پر لکھی ہے۔ آپ تقریباً ہر سال کسی نہ کسی کانفرنس میں شرکت کے لئے ہندوستان تشریف لاتے ہیں۔ ڈاکٹر تاراچند صاحب کے ایران کے دوران قیام میں آپ نے بہت سے علمی کام ان کے ساتھ اور ان کی رہنمائی میں کئے ہیں، نیز وہ انہیں استاد کی طرح مانتے اور عزت کرتے تھے۔ سب سے اہم کام یہ تھا کہ دونوں حضرات نے سالہا سال کی محنت سے داراشکوہ کے "اپنشاد" کے فارسی ترجمہ کو ایڈٹ کر کے بڑے اہتمام سے ایران میں شائع کرایا ہے۔ اس ترجمہ کا نام "سرِّ اکبر" یا "سرالاسرار" ہے۔ یہ کتاب بہت ضخیم ہے اور اس میں انگریزی اور فارسی دونوں میں مفصل مقدمہ ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم بھی اس کتاب کی اشاعت کے منتظر تھے۔ ڈاکٹر نائینی صاحب کی کتابیں زیادہ تر ہندوستان سے متعلق ہیں نیز ڈاکٹر تاراچند صاحب کی ہمکاری اور رہنمائی انھیں برابر حاصل رہی۔ بعض کتابوں پر ڈاکٹر صاحب کے مقدمے اور بعض پر ان کے پیش لفظ ہیں۔ ڈاکٹر نائینی صاحب جب بھی ہندوستان تشریف لاتے تھے مجھے یا کسی اور دوست کو ساتھ لے کر ڈاکٹر صاحب سے ملنے کے لئے مخصوص الہ آباد جاتے تھے۔

مجھے بھی ڈاکٹر نائینی صاحب کے ساتھ کام کرنے کا شرف حاصل ہے "منتخب الطائف" اردو فارسی شعرا کا نایاب تذکرہ ہے جسے رحم علی خاں ایمان نے لکھا ہے اور جس کا واحد اور منحصر بفرد نسخہ میں نے کئی سال پہلے دہلی یونیورسٹی کے لئے خریدا تھا۔ میں نے ڈاکٹر نائینی صاحب کی مدد سے اس تذکرہ کو ایڈٹ کر کے تہران سے شائع کیا ہے جس میں ڈاکٹر تاراچند صاحب کا پیش لفظ بھی ہے۔

مجھے ڈاکٹر تاراچند صاحب کے ساتھ کام کرنے اور ان کی ہدایت اور نگرانی کا شرف حاصل ہے۔ خوش قسمتی سے ڈاکٹر صاحب کے ایران کے قیام کے دوران میں بھی تہران یونیورسٹی میں موجود تھا اور مقالہ دکتری کی تیاری میں لگا ہوا تھا۔ اس زمانہ میں ان کا انداز وہی پدرانہ اور مشفقانہ تھا، نیز سفارت کا پورا ماحول علمی ہو گیا تھا جہاں برابر ایران کے منتخب ادیب اور عالم حضرات آیا جایا کرتے تھے۔ ڈاکٹر مہتاب نارائن ماتھر صاحب اس وقت یونیورسٹی میں طالب علم تھے اور سفارت میں بھی کام کرتے تھے۔ وہ اب تقریباً ۱۹ سال سے تہران میں ہیں۔ انہوں نے تہران یونیورسٹی سے ڈاکٹری کی ڈگری لی اور اب وہاں آئینہ ہند کے ایڈیٹر ہیں۔ ڈاکٹر جی، ال ٹکو صاحب اس وقت سفارت میں کام کرتے تھے۔ مگر فرصت کا تمام وقت تہران یونیورسٹی کے اساتذہ اور دوسرے علما کے ساتھ صرف کرتے تھے۔ آپ نے بھی تہران یونیورسٹی سے ڈاکٹری کی ڈگری لی اور

اب امریکہ میں فارسی کی خدمت کر رہے ہیں۔ شباہت علی خاں صاحب بھی اس وقت سفارت میں کام کرتے تھے۔ مگر اب تہران یونیورسٹی سے ڈاکٹر کی ڈگری لے کر جبرمتی میں مقیم ہیں۔ اسی زمانہ میں پروفیسر نذیر احمد اور پروفیسر سید حسن جیسی شخصیتیں بھی تھیں جو تہران یونیورسٹی میں فارسی میں مطالعہ کے لئے تشریف فرما تھے۔ بہرحال ان سب حضرات کو ڈاکٹر تاراچند جیسی عظیم شخصیت کی سرپرستی کا شرف حاصل تھا۔ میرے قیام کے دوران میں تہران میں بین الاقوامی کنگرۂ نصیر الدین طوسی ہوا جس میں دُنیا کے معزز مستشرقین موجود تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے ہندوستان کے رشتہ سے محقق طوسی پر مقالہ پڑھا۔ نیز بعض نشستوں کی صدارت کی۔ بہرحال مجھے ان سے استفادہ کا برابر موقع ملتا رہا۔

میری خوش قسمتی تھی کہ ایران سے واپسی پر بھی کئی سال تک ڈاکٹر تاراچند صاحب دہلی میں مقیم رہے۔ یہاں آپ راجیہ سبھا کے ممبر رہے۔ نیز ہندوستان کی آزادی کی تاریخ لکھ رہے تھے۔ آپ پابندی سے نیشنل آرکائیوز میں تشریف لاتے تھے، جہاں آپ کی وجہ سے ایک غیر معمولی علمی ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ اس زمانہ میں بھی آپ ہم جیسے طالب علموں کی سرپرستی اور رہنمائی فرماتے تھے۔ سب سے پہلے میں نے ڈاکٹر صاحب کی سرپرستی اور رہنمائی میں پربودھ چندر اودی Prabodha Chandra Odaya کے فارسی ترجمہ کو ایڈٹ کیا، جسے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ۱۹۶۱ء میں شائع کیا۔ شاہزادہ دارا شکوہ کے منشی بنواری داس ولی نے اس کو سلیس فارسی میں ترجمہ کیا اور اس کا نام "گلزار حال" یا "طلوع قمر معرفت" رکھا تھا۔

جہانگیر نے اپنی شاہزادگی کے زمانہ میں نظام الدین پانی پتی سے پنڈت گوداہنیدا کی جوگ بشست کے انتخاب کو فارسی میں ترجمہ کروایا تھا۔ ایران کے مشہور فلسفی میر ابوالقاسم فندرسکی اس زمانہ میں ہندوستان آئے اور اس فارسی ترجمہ کو اپنے ساتھ ایران لے گئے۔ نیز انہوں نے اس پر حاشیہ لکھا۔ فرہنگ تیار کی اور اس کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا۔ مگر داراشکوہ کو یہ ترجمہ پسند نہ آیا۔ اس لئے اس نے دوبارہ اپنی نگرانی میں اس کا ترجمہ کروایا۔ ڈاکٹر صاحب کی رہنمائی میں میں نے اس ترجمہ کو ایڈٹ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ۱۹۶۸ء میں شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں "سوال و جواب داراشکوہ و شعلی قلندر" نام کا ایک نادر رسالہ بھی ہے جو پہلی دفعہ منظرِ عام پر آیا ہے۔

* "پنجتنتر" کو ایران میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ نوشیرواں

عادل کے زمانہ میں اس کے دربار کا حکیم برزویہ ہندوستان آکر اس کتاب کو آبِ حیات سمجھ کر لے گیا اور سب سے پہلے اس نے اس کا پہلوی زبان میں ترجمہ کیا۔ اس کے بعد عربی، فارسی اور دُنیا کی تقریباً تمام اہم زبانوں میں اس کے بے شمار ترجمے ہوئے اور اب فارسی، عربی میں یہ کتاب "کلیلہ و دمنہ" کے نام سے مشہور ہے۔ ایک جینی پنجتنتر کا نام "پنچاکیانہ" ہے۔ شہنشاہ اکبر نے مصطفیٰ خالقداد عباسی سے فرمائش کر کے اسے سلیس اور سادہ فارسی میں ترجمہ کروایا تھا۔ اس کا منحصر بفرد نسخہ نیشنل میوزیم نئی دہلی میں موجود ہے جو شاید خود مترجم کے ہاتھ کا لکھا ہوا یا اس کے عہد کا ہے۔ مگر بدقسمتی سے یہ نسخہ جگہ جگہ سے ناقص اور خراب ہے۔ ۱۹۶۴ء میں بین الاقوامی مستشرقین کی کانگریس وگیان بھون نئی دہلی میں ہوئی جس کے ایرانی سیکشن کے صدر استاد پور داود تھے۔ ڈاکٹر صاحب خصوصیت سے اس میں تشریف لائے اور اپنی موجودگی میں مجھ سے اس کے متعلق مقالہ پڑھوایا۔ یہ مقالہ ہندوستان، ایران اور افغانستان کے رسالوں میں شائع بھی ہوا۔ اس کتاب کی تیاری میں تقریباً دس برس صرف ہوئے اور ابھی حال ہی میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اسے شائع کیا ہے۔

ایک اور مشہور ہندوستانی قصوں کی کتاب "کتھا سرت ساگر" ہے۔ کشمیر کے بڈشاہ سلطان زین العابدین نے اسے فارسی میں ترجمہ کروایا تھا جس کا نام "بحر الاسمار" رکھا گیا۔ شہنشاہ اکبر نے مصطفیٰ خالقداد عباسی سے کہہ کر اس ترجمہ کو پھر سے ٹھیک کرایا اور اس کا نام "دریای اسمار" رکھا گیا۔ مُلّا عبدالقادر بدایونی مؤلف "منتخب التواریخ" کا دعویٰ ہے کہ اکبر نے یہ کام ان کے سپرد کیا تھا، مگر اس نسخہ کا ابھی تک پتہ نہ چل سکا۔ بہرحال "دریای اسمار" کا منحصر بفرد قلمی نسخہ مل گیا ہے۔ ۱۹۷۱ء کے ایرانی جشن کے لئے ڈاکٹر صاحب کی رہنمائی میں میں نے اس کے متعلق ایک مفصل مضمون لکھا تھا جو شیراز کے بین الاقوامی کنگرۂ ایران شناسان میں پڑھا گیا اور یورپ کے مستشرقین نے اسے پسند کیا۔ ڈاکٹر صاحب کو بھی اس میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ مگر باوجود اشتیاق کے اپنی علالت کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے۔ یہ مضمون اسلامک کلچر میں شائع ہو چکا ہے اور عنقریب یہ نادر ترجمہ چھپ کر منظرِ عام پر آنے والا ہے۔

ڈاکٹر تاراچند صاحب کی راہنمائی میں بے شمار سنسکرت کے نادر فارسی ترجموں کا پتہ لگایا جا چکا ہے اور ان کو ایڈٹ کر کے چھپوانے کا کام جاری ہے۔ فارسی نے ہندوستان میں بہت بڑی خدمت کی ہے۔ نیز کچھ سنسکرت اور دوسری ہندوستانی کتابیں فارسی

(باقی ص ۳۲ پر)

نظیر حسین نظیر مظفر پوری
سفیر ہند، یمن عرب جمہوریہ، صنا

ڈاکٹر تاراچند بطور سفیر

اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ ڈاکٹر تاراچند کی سیرت کی نمایاں خصوصیت کیا تھی تو میں بلا تامل کہوں گا کہ اخلاص و شرافت۔ کسی نے بالکل سچ کہا ہے کہ سچا دوست ہر حال میں دوست رہتا ہے۔ شادی و الم ہو یا ذلت و رسوائی کی حالت، زندگی کا کوئی نشیب و فراز ہو ایک حقیقی دوست کی رفاقت غیر متزلزل رہتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب آنجہانی ایسے کمیاب ہی انسانوں میں ایک انسان تھے ـــــ جن لوگوں کو ان کی یگانگت و رفاقت کا موقع حاصل رہا ہے وہ اس کی تصدیق کریں گے۔ راقم الحروف کو یہ افتخار، سعادت و سرافرازی کچھ اوپر بیس سال سے اُن کی زندگی کے گویا آخری وقت تک نصیب رہی ہے۔ اُن کا آخری خط مجھے یمن میں ۲۰ ستمبر ۱۹۷۳ء کو ملا۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۷۳ء وہ ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔ شاید موت کی پرچھائیں اُن کے دل پر پڑنے لگی تھی۔ اس لئے کہ دوسروں کے متعلق اپنے جذبۂ اخلاص و محبت کے اظہار میں وہ بہت محتاط تھے لیکن اپنے اس آخری مکتوب کی پہلی ہی سطر میں بالکل غیر معمولی طور پر محبت کی مٹھاس سے بھرے ہوئے لہجے میں یہ گلہ کیا کہ "کئی مہینوں کے بعد تمہارا خط آیا۔" اُن کا مزاج آشنا ہونے کی وجہ سے میرے لئے اُن کے اس مختصر سے جملہ میں خلوص کی ایک دُنیا بند تھی۔ غالب کا یہ شعر زباں پر رواں ہو گیا ؎

با تو چنیں معاملہ بر خویش منت است
از شکوۂ تو شکر گذارِ خودیم ما!

میری اور ڈاکٹر صاحب کی عمر میں باپ اور بیٹے کا فرق تھا میں نے اُن کو ہمیشہ اسی نظر سے دیکھا اور اپنا بزرگ سمجھا لیکن وہ اپنی بزرگواری، کریم النفسی، بلند و بالا اخلاق اور خلقی شرافت سے عمر کی اس تفاوت کے باوجود مجھ جیسے نا اہل و تہی ظرف کے ساتھ ہمیشہ دوستانہ تکلف سے پیش آتے اور خوردی و بزرگی کے اس نمایاں فرق کو کبھی بروئے کار نہیں لاتے۔

ڈاکٹر صاحب اور راقم الحروف کے تعلقات کی بنیاد ۱۹۵۱ء میں سرزمینِ گُل و بلبل اور شہرستانِ حافظ و خیام یعنی ایران میں پڑی۔ سید علی ظہیر صاحب کے بعد ڈاکٹر تاراچند ایران میں ہندوستان کے سفیر مقرر ہوئے۔ پنڈت نہرو نے یہ انتخاب مولانا ابوالکلام آزاد کے مشورہ سے کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اُس وقت مرکزی حکومت کے محکمۂ تعلیمات میں سکریٹری کے عہدہ پر فائز تھے۔ انہی دنوں تازہ ہی افغانستان میں اپنی سفارت سے حقیر کا تبادلہ ایران ہوا تھا جہاں میں ہندی سفارت میں شعبۂ اطلاعات و کلچر کا انچارج تھا۔

ہندوستانی سفیر کی حیثیت سے ایران کے لئے ڈاکٹر تاراچند کا انتخاب نہایت ہی صحیح اور احسن انتخاب تھا جسے انگریزی اصطلاح میں "موزوں آدمی موزوں مقام پر" کہنا چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب کیریر ڈپلومیٹ (CAREER DIPLOMAT) نہ تھے نہ ڈپلومیسی اُن کا پیشہ تھا لیکن سچ یہ ہے کہ ایران و ہند کے قدیمی قریبی تعلقات کی بنا پر ایران میں کسی ایسے ہی ہندی صاحبِ علم و فضل، مورخ، ادیب، حکیم و دانشمند کی ضرورت تھی جسے صحیح معنوں میں ہندو مسلم کلچر کا رفیع الشان، درخشاں اور بے نظیر نمائندہ کہا جا سکتا ہے۔ ایران نے ایسی نظر سے ڈاکٹر تاراچند کو دیکھا اور ان کا استقبال کیا۔

بلا خوفِ تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ فضائلِ علمی اور محاسنِ اخلاقی کی وجہ سے جیسی ہر دلعزیزی، قدر و منزلت ہندوستانی سفیر کی حیثیت سے ڈاکٹر تاراچند کو ایران میں حاصل ہوئی وہ اُن کے عہد میں کسی غیر ہندی سفیر کو حاصل نہیں ہوئی ـــــ ایک خاص موقع پر شاہنشاہ ایران نے ڈاکٹر صاحب کی ایرانی تاریخ کے وسیع مطالعہ کا ذکر کرتے ہوئے ان سے یہ کہا تھا کہ "اگر آپ ایرانی ہوتے تو میں اپنا سفیر بنا کر باہر بھیجتا۔" ایرانی وزراء اور حکام ڈاکٹر صاحب کی تعظیم کرتے۔ پروفیسروں کے حلقہ میں وہ استاد مانے جاتے۔ اربابِ شعراء، صاحبانِ علم و فن اور اہلِ قلم حضرات ان کی نکتہ دانی اور سخن شناسی کے قائل اور مدّاح تھے۔ اُن کے گھر پر اور سفارت خانے میں جلسۂ شعر و ادب آراستہ ہوتا۔ صحبتِ یارانِ یک دل سرور افزائے دل ہوتی۔ ترقی پسند شعراء، مصنفین، انشا پرداز، افسانہ نویس، مورخین، مدیرانِ جرائد، فنونِ لطیفہ کی دیگر ممتاز ہستیاں رونق افزائے انجمن ہوتیں۔ صحبتی معرکے

ڈاکٹر حسین خطیبی، سعید نفیسی، مُعدّل شیرازی، رضا زادہ شفق، پوردائود، مطیع الدولہ حجازی، صُبحی، محمود داعی، اکثر وزیر دربار حسین اعلیٰ (مرحوم) اور ہماری انجمن ہندو ایران کے معزز صدر اور ایران کے معروف و معتبر سیاست داں اور لیڈر حسن تقی زادہ مرحوم وغیرہ۔ بہار رووقار افروز بزم ہوتے اور محفل دیر تک ان کے جمالِ کمال، عالمانہ و ادیبانہ گل افشانیوں سے گرم و پرکیف رہتی۔ ڈاکٹر صاحب فارسی بہ روانی نہیں بول سکتے تھے مگر سمجھتے خوب تھے۔ اس طرح کاروبارِ علم و فن حسن و خوبی کے ساتھ جاری رہتا اور کوئی بے کیفی نہ پیدا ہوتی۔ انجمنِ ایران و ہند کے جلسوں میں ڈاکٹر صاحب کی پُر مغز و عالمانہ تقریریں بڑا گہرا اثر پیدا کرتیں اور ہندو ایران کے روابط کو مستحکم کرنے میں بڑی موثر ثابت ہوتیں۔

اکثر و بیشتر راقم الحروف کو اُن کی اسکالرلی و ادیبانہ سخن رانیوں کا برجستہ ترجمہ کرنا پڑتا۔ وہ مرصّع و رنگین انگریزی میں تقریر کرتے جو کبھی کبھی میرے ترجمے کے بس سے باہر کی بات ہو جاتی۔ جرمن مستشرق وان کریلیر نے ترجمہ کو کسی بانقاب حسینہ کا بوسہ لینے سے عبارت کیا ہے۔ اس سے بہتر تعریف ترجمہ کی نہیں ہو سکتی۔ آنچل پڑے ہوئے حسین عارض کا بوسہ کیا مزہ دے سکتا ہے؟ میرے ترجموں میں بھی اکثر ایسا ہی پھیکا پن پیدا ہو جاتا۔

ایران میں پاکستانی سفیر راجہ غضنفر علی خاں اور ڈاکٹر تاراچند ہمعصر تھے۔ تقسیم ہند کا زخم تازہ تھا۔ ہندو پاکستان میں پناہ گیروں کے مسئلہ اور فرقہ وارانہ فسادے بین الاقوامی فضا بھی متاثر تھی۔

ایران میں بعض ملکوں کے باشندوں نے "ہندو بھارت" کے نام پر ہندوستان کے خلاف پروپیگنڈہ کا طوفان برپا کر رکھا تھا۔ ایران کے مذہبی حلقہ میں ہندوستان کی تصویر دراج، ڈراونی اور بھیانک رنگ میں پیش کی جا رہی تھی۔ کوشش یہ تھی کہ ایرانیوں کے دل و دماغ پر یہ بٹھا دیا جائے کہ ہندوستان کی تقسیم یک قلم ناگزیر تھی اور اب بٹوارہ کے بعد تو ہندوستان میں اسلام، اسلامی تہذیب و روایات، ثقافت و آثار جانکنی کی حالت سے گذر رہے ہیں۔ مظلوم و بے پناہ مسلم پناہ گیروں کا موج در موج گروہ پراگندہ و پریشان امن و امان کی تلاش میں ہندوستان چھوڑ کر یہاں وہاں بھاگ رہا ہے۔

ہندوستان کے سیکولر نظام کو "لادینی" قرار دے کر اُس کا مضحکہ اُڑایا جاتا اور اُسے دین و مذہب کے خلاف ٹھہرایا جاتا۔ ایرانی حکومت اور وہاں کا روشن خیال طبقہ اس ہند دشمن مخالف گروہ کی مذموم و معاندانہ سرگرمیوں سے قطعاً خوش نہ تھا اور ہم سے اپنی بیزاری و تنفر کا مخلصانہ اظہار کرتا۔ تقسیم ہند کے باوجود اُن کے دلوں میں ہندوستان کی عزت و عظمت بدستور باقی تھی۔ وہ نہرو حکومت کے سیکولر نظام کو یعنی ہر مذہب کے تقدس کا احترام کرنے اور خود حکومت کا کسی مذہبی جماعت سے متعلق نہ رہنے کے جدید و ترقی پسندانہ نظریہ کو توقیر و احترام کی نگاہ سے دیکھتے۔ خود پنڈت نہرو کی شخصیت اُن کے لئے بڑی دلنواز و مسحور کن تھی۔ اس جماعت کی نظر میں ہندی سفیر سید علی ظہیر کا بڑا مرتبہ و وقار تھا۔ لیکن ایران مقیم مخالفینِ ہند کی انتھک اور مسلسل کوشش یہ تھی کہ سفیر علی ظہیر کے احترام و اہمیت کو ایرانی عوام و علمار کی نگاہ میں گرا کر اُن کی سفارتی سرگرمیوں کو بے اثر بنا دے۔ "مسلم کشمیر" کا شعلہ بھی خوب بھڑکایا جاتا اور اسے بہیم ہوا دی جاتی۔ جب سفیرِ ہند کی حیثیت سے علی ظہیر صاحب کی مدتِ خدمت تمام ہوئی اور وہ ہندوستان واپس آگئے تو اس مخالف جماعت کے کارکنوں نے اطمینان کا لانبا سانس لیا جیسے کوئی مصیبت تھی جو ختم ہوئی! ہندوستان کے خلاف ایسے مکدّر اور غلط فہمی سے غبار آلودہ فضا کو صاف کرنے اور ہندوستان کی قبل و بعدِ آزادی کی روایاتی و قومی شخصیت (PERSONALITY) اور اعلیٰ آدرشوں کو مزید نمایاں طور پر پیش کرنے میں ڈاکٹر صاحب کی مشہور گنگا جمنی خصوصیت و ذہنیت، طرزِ رہائش و رفتار نیز ایرانی تاریخ و ادب کے عمیق علم و واقفیت نے بڑا کام کیا۔

ڈاکٹر تاراچند کے زمانہ سفارت کے چند ابتدائی سالوں میں مشہورِ عالم ڈاکٹر محمد مصدق ایران کے وزیر اعظم تھے۔ ڈاکٹر مصدق کا عہدِ حکومت ایرانی تاریخ میں اس اعتبار سے ممتاز و یادگار سمجھا جائے گا کہ ایرانی نفت (تیل) کو قومی بنانے اور انگریزوں کے دیرینہ سیاسی تسلط اور اثر و رسوخ کو سرزمین سے اکھاڑ پھینکنے کا اوّلین محاذ ڈاکٹر مصدق ہی نے کھڑا کیا۔

انگلستان سالہا سال سے ایرانی تیل پانی کے مول خرید رہا تھا۔ برطانوی سیاست کے پنجۂ استعمار سے ایرانی حیاتِ قومی کا کم و بیش کوئی ادارہ آزاد نہ تھا۔ دوسری عالمی جنگ کے موقع پر ایران کی جرمن دوستی سے غضب ناک ہو کر برطانیہ نے ایرانی قومی وقار، تاج و اقتدار کی جو تحقیر کی تھی اور بادشاہ رضا شاہ پہلوی کو بزورِ شمشیر تخت سے محروم کر کے جس طرح جلا وطن کیا تھا اس کی تلخی ایرانی قومی حافظہ میں ابھی تازہ تھی۔ خود ڈاکٹر مصدق اپنے شیراز کی گورنری کے زمانے میں انگریزی سیاسی جبر و تشدد کا کڑوا تجربہ اٹھا چکا تھا۔ اس کا ذکر خود ڈاکٹر مصدق نے ہم لوگوں سے کیا تھا۔

ایک کم سو سال سے برطانوی سفارت ایران میں "برسرِ اقتدار" تھی۔ اس کی جڑیں دور دور تک مضبوطی کے ساتھ پھیلی ہوئی تھیں۔

ایران میں انگلستان کا یہ سیاسی ادارہ عام سفارت خانوں کی طرح نہ تھا۔ بلکہ اس کی حیثیت کم و بیش وہی تھی جو "غلام ہندوستان" میں "وائسرائیگل ہاؤس" (نئی دہلی) کی تھی۔ مصدق پہلا شخص ہے جس نے ایران میں برطانوی سامراجی شر و طغیان کے خلاف علم بلند کیا۔ گاندھی جی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ مہاتما نے ہندوستانی دلوں سے برطانوی رعب و دبدبہ، خوف و دہشت کو دور کر دیا یہی کام کم و بیش ایران میں ڈاکٹر مصدق نے کیا۔ یہی اُس کی وہ عظیم و شاندار خدمت ہے جسے ایرانی سیاسی تاریخ کا کوئی دیانتدار مورخ نظر انداز نہیں کر سکتا ——— لیکن لگے ہاتھوں یہاں یہ بھی بیان کر دینا ضروری ہے کہ جہاں مصدق نے ایرانی قومی وقار و حریت کا بول بالا کیا وہاں اُس نے چند ایسی فاش غلطیاں بھی کیں جو بالآخر اُسکی شکست و سقوط کا بنیادی سبب ثابت ہوئیں۔

خلاصہ، تیل کی صنعت کو "قومیانے" اور برطانیہ عظمیٰ کے رسوخ و مفاد کا ایران میں قلع قمع کر دینے کے لئے مصدق کی حکومت اپنی گرفت کو سخت تر کرتی جا رہی تھی۔ تیل کا مسئلہ عظیم الشان شعلہ کی طرح بھڑکا ہوا تھا۔ ایران و انگلستان کے تعلقات کی دُوری روز افزوں بڑھتی جا رہی تھی۔ طوفانی آثار فضا پر چھائے ہوئے تھے۔ امریکی سفیر ہینڈرسن اور پاکستانی سفیر غضنفر علیخان سمجھوتہ کرانے کی انتھک کوشش کر رہے تھے اسی اثنا میں چند دیگر مطالبات کے علاوہ ڈاکٹر مصدق نے برطانیہ سے مطالبہ کیا کہ اگر لندن، طہران سے سفارتی تعلقات بدستور قائم رکھنا چاہتا ہے تو اسے چاہیئے کہ آٹھ ملین پاونڈ اسٹرلنگ کی وہ رقم جو بینک آف انگلینڈ میں ایران کے نام جمع ہے ایک ہفتہ بھر کے اندر ایران کے حوالے کر دے۔ اگر اس وقفہ میں یہ رقم ادا نہیں ہوئی تو ایران کے لئے بجز اس کے اور کوئی چارۂ کار نہیں رہے گا کہ وہ انگلستان سے اپنا سفارتی اور ڈپلومیٹک رشتہ منقطع کرے۔

اسی اثنا میں چرچل کی کنزرویٹو (CONSERVATIVE) پارٹی ایٹلی کی لیبر حکومت کو شکست دے کر طاقت میں آچکی تھی۔ اُدھر چرچل تھا اِدھر مصدق اور یہ دونوں اپنی ضد، سخت سری اور حصولِ مقصد کے کٹرپن میں آپ اپنی مثال تھے۔ چرچل کی استعمارانہ ذہنیت ڈاکٹر مصدق کی اس "جرأت و گستاخی" سے آگ بگولہ تھی۔ دوسری عالمی جنگ سے پہلے کی حالت ہوتی تو "بندق و کشتی" (GUN-BOAT) کی "قادر المطلق" اور کار آزمودہ سیاست کو بروئے کار لا کر ایران کو بزور جبر جھکنے اور گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا جاتا۔ لیکن بعد مرگی جہانی جنگ کے بعد بین الاقوامی فضا کا مزاج کچھ اور ہی ہو چکا تھا۔ برطانوی حکومت عجیب مخمصہ میں تھی۔ مصدق اپنے الٹی میٹم (ULTIMATUM) کے نفاذ پر اڑا ہوا تھا۔ امریکی و پاکستانی سفراء اور برطانوی نائب سفیر جارج مڈلٹن کی ساری سفارتی فراست و چابک دستی بے اثر ثابت ہوئی۔ ایسے خطرناک و حساس موقع پر لوہے سے زیادہ سخت مزاج مصدق کو عارضی طور پر ہموار کر لے اور الٹی میٹم کو ملتوی کرانے میں اگر کسی کی پسندیدہ اور پُر خلوص شخصیت با اثر اور مفید کار ثابت ہوئی تو وہ ڈاکٹر تاراچند تھے ——— بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ طہران میں مقیم سارے سفراء کے مقابلے میں وزیر اعظم ڈاکٹر مصدق ڈاکٹر تاراچند کی وسیع العلمی، تاریخ دانی، خوش اخلاقی اور ظرافت طبع کا نہایت معترف اور مداح تھا۔ طہران کے سرکاری اور ڈپلومیٹک حلقہ میں یہ بات ہر شخص جانتا تھا۔ اس معاملہ کی مزید تصدیق اس وقت ہوئی جب تیل کے قضیہ کے پُر آشوب دنوں میں اور اپنی انتہائی مشغولیت کے باوجود ڈاکٹر مصدق نے ڈاکٹر تاراچند اور اُن کی پوری فیملی کو اپنے گھر پر عصرانہ کے لئے بلایا۔ اس دعوت میں گھریلو اور بے تکلفانہ فضا پیدا کرنے کے لئے مصدق اپنی ڈھائی سالہ پوتی کو گود میں لے کر بیٹھا اور گھنٹوں گھل مل کر باتیں کرتا رہا۔ طہران کے تقریباً تمام ممتاز اخبارون نے اس "غیر معمولی عصرانہ" کی خبر کو مع تصویر کے صفحۂ اول پر چھاپا۔

ایران میں ڈاکٹر تاراچند کی ہر دلعزیزی اور ڈاکٹر مصدق سے دوستانہ روابط و باہمی اعتماد و احترام کی شہرت کا علم مسٹر چرچل کو ہونا چاہیئے تھا اور تھا۔ مصدق کے الٹی میٹم کو ملتوی کرانے کے سلسلے میں دوسری اور کوئی موثر دکارگر راہ نہ پا کر چرچل نے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کو لکھا کہ وہ اپنے سفیر مقیم طہران کی وساطت سے ایران و انگلستان کے درمیان الٹی میٹم کے متعلق سمجھوتہ کرانے کی کوشش کریں۔ پنڈت جی ایرانی تیل کے قضیے کے متعلق ایرانی قومی مطالبات کی پُر زور حمایت کر چکے تھے اور اس وجہ سے ایران و ہند کے تعلقات نہایت ہی خوشگوار دَور سے گذر رہے تھے۔

الٹی میٹم کے التوا کے سلسلہ میں ڈاکٹر مصدق اور سفیر ہند کے درمیان جو حسب ذیل گفتگو ہوئی اس کا مختصر اقتباس یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا ——— ڈاکٹر تاراچند مصدق سے یہ اصرار کر رہے تھے کہ وہ ایک بار پھر اپنے الٹی میٹم پر نظر ثانی کریں۔ لیکن مصدق نے خندہ روئی سے قہقہہ لگا کر ان کو جواب دیا۔

آقائے سفیر کبیر شمانی دانید کہ این انگلسیہا چہ قدر موذی ہستند۔
آیا می فہمی موذی چیست؟

یعنی جناب سفیر آپ کو معلوم نہیں کہ یہ انگریز کتنے بڑے موذی ہیں۔

موذی آپ سمجھے نہیں کیا ہے ؟

ہندوستانی سفیر نے کہا:- ہاں ! ہندوستان میں سانپ کو بھی موذی ہی کہتے ہیں ۔" پس بہ جانِ شما باور کنید این انگلسہا موذی ہستند۔ برائے آنہا این قدر پول چیزے فہم نیست (یعنی انگریزوں کے لئے اتنے پیسے کوئی بڑی چیز نہیں) اگر جداً (واقعی طور پر) میل میداشتند بہ آسانی میدادند ۔ ولی اصلاً نمی خواہند ہنوز دنبال این فکر ہستند کہ بافشار اقتصادی ایران را از پا در میارند (یہ ابتک اس خیال میں ہیں کہ اقتصادی دباؤ سے ایران کے پاؤں اکھاڑ دیں ۔)" نہ ۔ نہ بسر شما ! (آپ کے سر کی قسم) برائے آنہا ہشت ملیون (ملین) لیرہ (پاونڈ) چیزی نیست (کوئی چیز نہیں) ——

ڈاکٹر تاراچند نے کہا :- مگر آپ کا اصرار یہ ہے کہ یہ آٹھ ملین پاونڈ کی رقم کو ڈالر میں قابلِ تبدیل ہونا چاہیے ۔ لیکن اس سلسلہ میں بڑی دشواری یہ ہے کہ برطانیہ کے لئے یکبارگی اس قدر ڈالر کا فراہم کرنا ممکن نہیں دنیا کے تمام نرم سکہ (SOFT CURRENCY) والے ملکوں کی طرح انگلستان بھی ڈالر کی کمی کی مشکلات سے دوچار ہے . . . : مصدق نے پہلو بدل کر کہا : - بسر شما - این ہم (یہ سب) دروغ است ۔ دروغ گندہ (بھاری جھوٹ) ۔ انگلسہا کہ این قدر سنگِ دوستیِ امریکا بہارا بہ سینہ خود می میزنند (یعنی انگریز جو امریکنوں کی دوستی کا اتنا دم بھرتے ہیں) اگر حقیقتاً از حیث دلار (ڈالر کی وجہ سے) در مضیقہ (مشکل) ہستند چرا از آنہا دلار نمی گیرند ۔ (کیوں امریکنوں سے ڈالر نہیں مانگتے) . . . عقیدہ من این است (میرا خیال یہ ہے) کہ امریکا یہا حاضر ہستند کہ ایران را کمک (مدد) کنند مگر این پدر سوختہا (یعنی انگریز) نمی گذارند (نہیں چھوڑتے) جلوی امریکا یہارا گرفتہ اند (یعنی امریکنوں کی راہ انگریزوں نے روک رکھی ہے) وَالّا (نہیں تو) انگلسہا حقیقتاً در مضیقہ دلار نیستند ۔ مملکتِ شما کہ از دستِ اینہا این قدر زجر و مصیبت دیدہ است، آیا شما انگلسہا را نمی شناسید ؟ (آپ کے ملک نے کہ ان کے ہاتھوں اتنا کچھ دُکھ درد دیکھا ہے، کیا آپ انگریزوں کو نہیں پہچانتے . . . . ؟"

بہ حال ڈاکٹر تاراچند کے شخصی اصرار پر ڈاکٹر مصدق نے یہ کہکر " بخدا بخاطرِ شما قبول میکنم " (آپ کی خاطر یہ مان لیتا ہوں) چند دنوں کیلئے الٹی میٹم واپس لے لیا —— ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کی یہ کوئی معمولی فیروز مندی نہ تھی —— بعد میں مصدق، شاہ ایران، انگلستان اور امریکہ کی چوطرفہ سیاسی مناقشات نے جو صورت حال اختیار کر لی اس پر البتہ ڈاکٹر تاراچند کا کوئی زور نہ تھا ۔

انسانی کمزوریوں کے لئے ڈاکٹر تاراچند کتنے حلیم، بُردبار، متحمل اور روشن خیال تھے عفو و درگذر کا جذبہ اُن کی طبیعت میں کتنا رچا بسا ہوا تھا اس کا اندازہ اس روحانی واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے ۔

ہماری سفارت کے ایک اچھے عہدہ دار ہندوستانی ملازم کسی زردشتی قتالہ کی عشوہ فروشیوں کا شکار ہو گئے ۔ بات سفیر صاحب تک پہنچی تھی اور سفارت کے ایک دوسرے سکریٹری اور ہمارے " بیمارِ محبت " میں بنتی نہ تھی ۔ انہوں نے ایک خفیہ شکایتانہ خط ڈاکٹر صاحب کے سامنے رکھتے ہوئے کہا ۔ " دیکھیے فلاں شخص نے، سفارت کا ایک ذمہ دار عہدہ دار ہونے کے باوجود ہوس کاری کا بازار گرم کر رکھا ہے اور ملک کے پوتر نام کا ستیا ناس کر رکھا ہے ۔ مقامی حلقہ میں ہر جگہ تھُو تھُو ہو رہی ہے ۔ ہر محفل میں یہی چرچا ہے ۔ بڑی رسوائی کا سامنا ہے ۔ یہ شخص ہماری خارجی ملازمت کے کسی طرح قابل نہیں ۔ یہی بہتر ہے کہ اسے چارج شیٹ دے کر فوراً دہلی روانہ کر دینا چاہیئے :" وغیرہ وغیرہ

ڈاکٹر صاحب نے جوانِ غیض آلودہ افسر کی " پاکیٔ داماں " کی " حکایت " سے بے خبر نہ تھے اس کے " وطن پرستانہ اندیشں " اور مُلّایانہ ناروا داری کا جواب خاموشی سے دیا ۔

بعد میں ہمارے دل باختۂ محبت کو بُلایا خفیہ شکایت اُس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے فرمایا :" جاؤ ۔ اپنی ذمہ داریوں کا خیال رکھو " عشق کا شعلہ آنسو بن کر بہنے لگا ۔ اُس کی ندامت کی انتہا نہ تھی ۔ غالب نے کیا خوب کہا ہے ؎ ۔

ہفت دوزخ در نہادِ شرمساری مُضمر است
انتقام است اینکہ با مجرم مدارا کردہ

یہ ہے وہ بلند و بالا شرافت، اعلیٰ ظرفی اور انسانی کمزوریوں کا وسیع و روادارانہ احساس جسے ڈاکٹر تاراچند کی سیرت کا طرۂ امتیاز کہنا چاہیے ؎ اب نظر آئیں گی کاہے کو یہ تصویریں کہیں !

بقیہ : " اقبال کی معاشرتی فکر کے چند پہلو "

فکر کے اہم گوشوں پر روشنی ڈالتے ہیں ۔ اقبال کی شاعری چونکا دینے والی شاعری ہے ۔ یہ ایک ایسے عارف کے خیالات ہیں جس نے ہر اہم تحریک پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے جس نے تقدیرِ اُمم کی تعبیر کی ہے جس کی راتیں سوز و سازِ رومی اور پیچ و تابِ رازی میں گذری ہیں ۔ ان کے یہاں نہ صرف عصری میلانات پر تبصرے ملتے ہیں بلکہ عصری واقعات اور حادثات تک کی دھمک سنائی دیتی ہے ۔ شاعر ہمیں ہر قدم پر دعوتِ فکر دیتا ہے اور ہماری بصارت اور بصیرت دونوں کا امتحان لیتا نظر آتا ہے ۔ اقبال کا ذہن اگرچہ ماضی کے دھندلکوں سے لے کر مستقبل کی پرچھائیوں تک کا احاطہ کرتا نظر آتا ہے ۔ مگر اُس کے قدم اُس سرزمین اور اُس دَور میں گڑے ہوئے ہیں جس کی وہ پیداوار ہے ۔

غیاث احمد گدی
فتحپور لین۔ جھریا (بہار)

میمنہ

"ممی تو مجھے آنے ہی نہیں دے رہی تھیں۔۔۔" لڑکی نے کہا اور گردن نکال کر باہر دیکھنے لگی۔ اس وقت اس کے ذہن میں کوئی چیز نہیں تھی۔ نہ کوئی ڈر نہ خوف جس آدمی کے ساتھ وہ جا رہی تھی اُسے اس پر اعتماد تھا۔ آج نہیں تو کل، جو کچھ اس کے پاس ہے اس آدمی کا ہو جائے گا۔ پھر مجھے کیا فکر؟ اپنی چیز کو وہ آپ سنبھالے۔

دودھیا رنگ کی فیٹ تیزی سے بھاگی جا رہی تھی۔ ہوا کے تیز جھونکے اس کے سنہرے، باب کٹے ہوئے بالوں کو دھنکے چلے جا رہے تھے۔ وہ باہر کھیتوں کی ہریالی میں کھوئی رہی۔ جہاں صبح، زندگی کی جلوہ آرائیوں میں یوں مصروف تھی کہ دور دور تک روشنی پھیل گئی تھی، روشنی اور تازگی، حسن اور نغمگی، رنگ اور ترنگ، خواب ناک سچائیوں کی نقاب نہ جانے کہاں کھو گئی تھی، اور اب جو تھا کھرا تھا، سچا تھا اور خوبصورت تھا۔

دفعتاً سامنے ایک چھوٹا سا سفید سفید میمنہ دوڑتا ہوا گاڑی کے سامنے آ گیا۔ نوجوان نے بے حد پھرتی اور تیزی سے اسٹیرنگ کو کاٹا۔ پہیے ترچھے ہوئے اور میمنہ کو چھوتی ہوئی گاڑی ایک طرف کو کھڑی ہو گئی۔ لڑکی کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

سڑک پر گرا ہوا میمنہ اُٹھا اور لنگڑاتا ہوا نیچے کھیتوں میں اُتر گیا۔ لڑکی نے اور خود اس نوجوان نے اطمینان کا سانس لیا۔ بچ گیا؟

"ہاں، بال بال بچا۔۔"

گاڑی اسٹارٹ ہوئی۔ سامنے دور تک دوڑتی ہوئی لمبی سڑک پر نظریں جمائے جمائے نوجوان نے ذرا پلٹ کر لڑکی کی طرف دیکھا اور مسکرا پڑا۔ اس کا ہاتھ اسٹیرنگ وہیل پر سختی سے جما ہوا تھا۔ ایک موڑ آ گیا۔ بھاگتی ہوئی فیٹ کو اس نے ہلکے سے بریک دیا اور اُتر کو جانے والی سڑک پر گاڑی کو ڈال دیا۔

"ممی اکیلے کیوں آنے نہیں دے رہی تھیں۔۔۔؟"

"پتہ نہیں کیوں۔۔۔ شاید انہیں ڈر ہو کہ تم مجھے بھگا کر نہ لے جاؤ۔" لڑکی بے ساختہ ہنسی۔ کچھ عجیب سی دھلی دھلائی سی ہنسی۔ جواب میں نوجوان بھی ہنسا جو پچھلے سترہ دنوں سے منگیتر کی حیثیت سے اس کی زندگی میں داخل ہوا تھا۔ لڑکی کی بات سن کر وہ ہنسا ضرور لیکن اس سلسلے میں کچھ کہنے کے بجائے اس نے ایک الگ بات کہی۔

"رما تم ہنستی ہو تو ایسا محسوس ہوتا ہے۔۔۔؟"

"کیسا محسوس ہوتا ہے؟" اس نے پلٹ کر نوجوان کی طرف دیکھا اور مسکرا پڑی۔ "اب ہونے لگے رومانٹک ذرا میں!!"

"نہیں یہ بات نہیں ہے۔" نوجوان نے ایک نظر لڑکی کی طرف ڈالی پھر سڑک کو دیکھنے لگا۔ "سچ کہہ رہا ہوں تم ہنستی ہو تو۔۔۔ لگتا ہے کہیں کوئی پرندہ، کوئی کبوتر پھڑپھڑا رہا ہے۔۔۔!"

"کبوتر نہیں جناب فرشتہ کہئے فرشتہ۔" لڑکی نے قطع کلام کرتے ذرا اِترا کر کہا، آپ نے میرا رول دیکھا ہے ڈرامے میں، وہی فرشتہ ہوں۔۔۔ لیکن آپ۔؟

"میں"

وہ لڑکی پھر کھلکھلا کر ہنسی "آپ شیطان بنے تھے نا۔۔"

اتفاق سے اُسے ڈرامے میں حصہ لینا پڑا تھا۔ ڈرامے سے اسکی دلچسپی صرف کالج کے دنوں تک تھی، اب یہ شوق کہاں؟ وہ تو ہر روز لڑکی کو ریہرسل کرانے کلب لے جایا کرتا تھا۔ کل رات ڈرامہ ہونے والا تھا اور کل ہی وہ لڑکا نہیں آسکا تھا جس کا ایک خاص رول تھا سارے لوگ پریشان تھے۔

لڑکی کی سہیلیاں بدحواس سی مری جا رہی تھیں۔ تب اس نے اپنے آپ کو اس رول کے لئے پیش کر دیا۔ لڑکی اور اس کے تمام دوستوں کو بے حد حیرت ہوئی۔ لیکن تین چار گھنٹے اپنا رول اور مکالمہ یاد کرنے کے بعد جب وہ اسٹیج پر اترا تو سب دنگ رہ گئے۔

"لیکن کمال کر دیا آپ نے، ایسی اداکاری ایک دم سے حیرت ہوتی۔"

واقعی اداکاری ایسی غضب کی ہوئی تھی، کہ لوگ دنگ رہ گئے تھے۔ ایک وحشی شیطان جب سنہرے بالوں والے فرشتے کی طرف جھپٹا تو تماشائیوں کی سانس اکھڑنے لگی۔ ایک بار تو وہ لڑکی بھی یوں ڈر گئی کہ اس کا دل دھڑک اُٹھا۔

"اچھا بتایئے تو کتنے دن ہوئے آپ کو یہ سب چھوڑے ہوئے۔۔۔!" لڑکی ریشمی اسکارف ڈھیلا کرتی ہوئی بولی۔

سوال معمولی تھا، بے حد معمولی۔ لڑکی نے تو ڈراموں میں حصہ لینے والی بات پوچھی تھی۔ لیکن لڑکی کی یہ بات سُن کر نوجوان کا دل

دھڑک اٹھا۔ ۔ ، اس کا پاؤں سختی سے اکسیلیٹر پر پڑا، یکایک گاڑی کی رفتار تیز سے تیز تر ہو گئی۔ اس کے ہاتھ شدت سے اسٹیرنگ کو پکڑے ہوئے تھے، تیزی سے بھاگتی ہوئی فیٹ سائیڈ کے دونوں پہیوں پر گھسٹتی ہوئی کچھ دور تک چلی، پھر اچانک سیدھی ہو گئی۔ اس کی رفتار بھی کم پڑ گئی۔

"ارے باپ رے .... افوہ، کیا وحشت میں چلاتے ہو بھائی .... ابھی کچھ ہو جاتا تو؟؟"

"کچھ نہیں رتا، کچھ نہیں ہوتا" اس نے گھبراہٹ چھپانے کی کوشش کی "اور میرے ہوتے ہوئے تمہیں کچھ ہو بھی کیسے سکتا ہے!"

لڑکی پر کئی بوتلوں کا نشہ چھا گیا۔ اس نے پلٹ کر نوجوان کی طرف پیار سے دیکھا، سانولے چہرے پر ہلکی سرخی بکھری ہوئی تھی۔

اس نے پیار بھرے جذبات میں ڈوبے ہوئے لہجہ میں پوچھا۔

"اگر کچھ ہو جاتا تو ....؟"

"لیجئے اب آپ ہونے لگیں رومانٹک .... !"

پھر دونوں زور زور سے ہنسنے لگے۔

باہر صبح کاذب بکھر گئی تھی۔

کہاں سے یہ آدمی آیا، اور کب اس کی زندگی میں چپکے سے داخل ہو گیا جب آدھی رات کو چاندنی تالاب میں دبے قدموں اتر آتی ہے اور سارے تالاب۔ اس کے اندر اور باہر کو جگمگا دیتی ہے۔ ایسا ہی کچھ محسوس ہوا۔ اس نے بند آنکھوں سے دیکھا، سامنے کون تھا ... کوئی ہوگا ... اس کے چہرے پر گرم گرم سی بھاپ پڑی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔

"ارے باپ" اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ جلدی سے اس نے چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ وہ نوجوان ہنس پڑا۔ ذرا دیر۔ پانچ سیکنڈ، اور آنکھیں بند رہتیں تو ... بس،

"چپ ..." لڑکی ہنسی۔ "جان سے مار دوں گی ... ہاں!"

نوجوان نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھا اور مسکرا پڑا۔

۲۵ دن ہو گئے اس شہر میں آئے ہوئے۔ کیسے وہ اپنی ماں کے اصرار پر لڑکی دیکھنے چلا آیا تھا۔ بڑی بے دلی سے وہ جانتا تھا۔ ہوگی کوئی سونے چاندی میں مڑھی ہوئی ہر وقت سنگھار پٹار میں مصروف رہنے والی لڑکی۔ لیکن لڑکی دیکھی تو عجیب سا لگا۔ پہلے وہ سمجھا کوئی اور ہوگی۔ رتا کی چھوٹی بہن۔

جب اس نے پوچھا کہ "ممی، رتا کیا یہاں نہیں ہے!

"ارے نہیں بھئی، میں ہی رتا ہوں .." اور وہ ہنستی ہوئی ممی پر لد گئی تھی۔

اسے عجیب لگا۔ اتنی چھوٹی سی بچی سی، ایسی معصوم سی لڑکی کو کیا کرے گا۔ شادی کے لئے تو بھرپور عورت چاہیئے، دانا سمجھ دار۔ جو اسکے جذبات کو، اس کی ضرورتوں کو سمجھ سکے یہ لڑکی ... تو ...

وہ دوسرے ہی دن چلا جانا چاہتا تھا کہ رتا نے اسے رہرسل میں چلنے کے لئے کہا۔

"ہم لوگ بہار کے قحط زدوں کے لئے ایک ناٹک کھیل رہے ہیں۔ چلئے میری دوست کے یہاں رہرسل پر، وہاں آپ کو بہت اچھے اچھے لوگوں سے ملا دوں گی"۔ رتا کے اصرار میں کچھ ایسی بچوں کی سی معصومیت تھی کہ وہ انکار نہ کر سکا۔

اور یوں وہ رک گیا۔ ایک سے دو، دو سے پچیس دن ہو گئے رفتہ رفتہ رتا اسے پسند آنے لگی۔ پھر یوں ہوا کہ رتا کی باتیں، رتا کی ہنسی، چال ڈھال، اٹھنا، بیٹھنا سب اسے اچھا لگنے لگا۔

اور رتا، رتا تو کچھ نہیں جانتی تھی۔ اسے تو جیسے ہی معلوم ہوا کہ یہ مرد جو اس کے سامنے کھڑا ہے وہ اس کا منگیتر ہے، اور اس سے ملنے آیا ہے۔ وہ اسے اپنا سا لگنے لگا۔ جانے آگے کیا ہو؟ شادی ہوگی بھی یا نہیں۔ ہوگی تو نبھے گی یا نہیں؟ اتنا سوچنے کی اسے فرصت تھی نہ ضرورت۔ بس ٹھیک ہے، سب ٹھیک ہے، کوئی تکلف نہیں، کوئی بناوٹ نہیں وہ دوسرے ہی دن سے یوں پیش آنے لگی جیسے اس کی پرانی جان پہچان ہے۔

دو ہی دن کے اندر وہ مہمان جو اس کو دیکھنے آیا تھا، اس سے رتا یوں گھل مل گئی جیسے کوئی خاص بات ہی نہ ہو، گویا وہ اس سے برسوں سے واقف ہو۔ گھر میں اس کی بوڑھی ماں تھی جو شوہر کے مرنے کے بعد یا تو چوکی میں بیٹھی رہتی یا پھر اپنے کمرے میں چپ چاپ لیٹی مرحوم شوہر کی تصویر کو گھورا کرتی۔ چھوٹا بھائی یا تو باہر میدان میں گیند کھیلتا رہتا یا پھر اسکول میں ہوتا۔ ایسی حالت میں رتا ہی اپنے مہمان کی دیکھ بھال کرتی۔ وہ بڑی لاپرواہی سے صبح سویرے چائے کی ٹرے لئے مہمان کے کمرے میں بغیر دستک دیئے، بے جھجک گھس جاتی، اسے جگاتی، چائے کی پیالی پکڑاتی اور جلدی سے غسل خانے میں جانے کیلئے کہہ کر باہر چلی جاتی۔

وہ نوجوان خاموشی سے لیکن گہری نظروں سے دیکھتا رہتا۔ یہ کیسی لڑکی ہے۔ ذرا جھجک نہیں، ذرا خوف نہیں۔ یوں رات دن دوپہر، اکیلے میں، اس کے کمرے میں آ جاتی ہے۔ ہنستی ہے، بولتی ہے۔ کچھ محسوس ہی نہیں کرتی کہ زندگی کبھی کبھی کھسوٹ لیتی ہے۔ کوئی گرم ہوا کا جھونکا اس کو چھو کر چلا جائے، چلا جائے تو ...؟؟

لیکن گرم ہوا کا جھونکا کہیں نہیں ہوتا۔ صرف ٹھنڈک ہی ٹھنڈک

ہوتی، چھاؤں ہی چھاؤں، چاندنی ہی چاندنی۔ اُسے خود تعجب تھا۔
"دیکھئے جب ہماری شادی ہوجائے گی۔ اور آپ یوں اتنی دیر تک سوتے رہیئے گا تو جانتے ہیں میں کیا کروں گی؟"

"کیا کروگی ۔۔؟" وہ پیار سے اس کی طرف دیکھتا۔

"ماروں گی آپ کو ایک تھپڑ۔۔۔"

"ارے۔۔۔ اچھا چلو ابھی ممی کو کہتا ہوں۔۔۔"

"چلئے" اور وہ اس سے پہلے ہی ممی کو کہہ دیتی "ممی میں ان کے ساتھ کیسے نبھا سکوں گی۔۔۔"

ممی تعجب سے اور ذرا غصے سے اسکی طرف دیکھتی "کیا بک رہی ہو رما۔۔!"

"سچی ماں یہ کہتے ہیں کہ تم جس دن دیر سے سوکر اٹھوگی تو خوب پیٹونگا۔۔۔ ایسے آدمی سے۔۔۔

ممی زور سے ہنس دیتی "ٹھیک ہی کہتا ہے میرا بیٹا۔۔۔ پٹے بغیر تو ڈھنگ سے کبھی رہیگی!"

وہ نوجوان بھی ہنس دیتا، اور رما کو ذرا چھیڑنے کے لئے کہہ اٹھتا۔۔۔

"نہیں ممی، یہ خود کہتی ہے کہ۔۔۔"

رما تڑپ کر اٹھتی اور اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیتی۔ "ارے رے۔۔ کیا آپس کی سب باتیں ممی سے کہہ دوگے۔۔۔؟"

"سب نہیں فقط پٹنے والی بات۔۔۔"

"اب بس کرو بھئی۔۔۔ رما اٹھ کھڑی ہوتی اور جلدی سے بات موڑنے کی کوشش کرتی "اچھا بھئی شادی کے بعد پیٹ لیجئے گا بس؟"

دفعتاً گاڑی رک گئی

ارے یہ روک کیوں دی؟

"تم سے ایک بات پوچھنی ہے!" اُس نے ذرا سنجیدہ ہوکر کہا۔

"لو یہ بھی کوئی بات پوچھنے کی جگہ ہے" اس نے ساتھ نظر آنے والے گاؤں کی طرف دیکھا۔ جہاں صبح کی پہلی دھوپ اور گھروں سے اٹھنے والا دھواں آپس میں خلط ملط ہو رہے تھے۔ سارا گاؤں کہانیوں کی طرح عجیب اور پُراسرار معلوم ہو رہا تھا۔ وہ ذرا دیر کے لئے اس کو بھول گئی اور باہر کی پُراسرار دنیا کی خوبصورتیوں میں بہہ گئی۔

"رما سچ سچ بتاؤ، ابھی ابھی جواب دو" نوجوان نے سگریٹ نکالا اور دیاسلائی دکھادی۔

"مگر کیا بھئی؟"۔۔ رما باہر کی طلسمی صبح کے ماحول سے لوٹ آئی اور نوجوان کی طرف مسکراتے ہوئے یوں دیکھا کہ وہ اپنا سوال بھی بھول گیا۔

"یہی۔۔۔ یہی۔۔۔ کہ تم مجھے پسند کرتی ہو نا"

"ارے لو" اُس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارلیا "کھودا پہاڑ نکلی چوہیا بھی نہیں۔ میں نے سوچا جانے کیا کہنا ہے اسے، جواب یہ ہے کہ۔۔ نہیں صاحب بالکل نہیں۔۔۔

"سچ؟" نوجوان جانتا تھا کہ وہ لڑکی سنجیدہ نہیں ہے۔ پھر بھی ذرا تشویش ہوئی۔ کیوں ہوئی وہ سمجھ نہ سکا۔

"بالکل سچ"۔

"پھر مجھ سے شادی کیوں کرنا چاہتی ہو بھلا؟"

"اب چلو نا بھئی۔۔۔ تم بھی عجیب سے شکی آدمی ہو، ایکٹ مت بڑھو بڑھیئے"

"تم رما جب تک میری اس بات کا جواب نہیں دوگی تب تک گاڑی ایک انچ آگے نہیں بڑھے گی"

"اچھی مصیبت ہے۔۔۔۔ بچوں کی طرح ضد کرتے ہو۔۔" رما ذرا کو چڑھ گئی لیکن ساتھ ہی ہنس بھی پڑی۔

"ارے بھئی شادی اس لئے کرنا چاہتی ہوں کہ تم بے حد دولت مند جو ہو۔۔۔ تمہیں پتہ ہے آج کل یورپ میں لڑکیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے مردوں سے شادی رچاتی ہیں جنکے پاس پیسے بہت اور عقل بہت کم ہوتی ہے تاکہ بیوقوف شوہر کی دولت اور اپنے حسن سے غیر مردوں کو زیادہ سے زیادہ رجھائیں۔

نوجوان کھلکھلا کر ہنس پڑا اور گاڑی اسٹارٹ کردی۔

لیکن ذرا دیر بعد لڑکی نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ خاصا سنجیدہ ہو رہا تھا۔ اسے اپنے اس مذاق کے ردعمل کی توقع نہیں تھی لیکن جب اس کے چہرے پر عجیب سا رنگ دیکھا تو دفعتاً اُسے بڑا مزا آیا۔ وہ چور نظروں سے اُس کی طرف دیکھ لیتی اور اندر ہی اندر ہنس پڑتی۔

گاڑی اپنی رفتار سے ہموار سڑک پر چلی جارہی تھی۔ رویہ رویہ درختوں کی قطاریں تیزی سے سر جھکائے اُلٹے قدموں بھاگی جارہی تھیں۔ رما کو ایک عجیب لطف آرہا تھا، اُس نے زندگی میں کبھی کسی ایسے آدمی کے ساتھ سفر نہیں کیا تھا جس سے اس کا کوئی رشتہ بھی نہ ہو اور اجنبیت کے باوجود بھرپور اعتماد بھی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آج وہ پہلی بار کسی مرد سے اتنا کھل کر مذاق بھی کر رہی ہے۔

لیکن نوجوان پر اس کا اچھا اثر نہ پڑا۔ اسے کچھ عجیب سی بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔ ذرا دیر بعد اس نے اپنے آپ کو جھٹک دیا اور خود کو ہلکا کرلیا۔

مذاق، مذاق تھا۔ ایک نوخیز سی، کمزور سی لڑکی اسکے پہلو میں بیٹھی تھی اور بڑی بے فکری سے بیٹھی تھی، اسے کسی بات کا خوف جھجک بھی نہیں۔

"تو آپ بھی میرے پیسوں سے عاشقوں کو رجھایا کریں گی، کیوں؟"

"ضرور"

"کتنے عاشق ہیں آپ کے؟"

"فی الحال تو ایک ہی ہے۔۔۔ ویسے۔۔۔" بہت دیر سے ضبط کی ہوئی ہنسی اس کے اختیار سے باہر ہوگئی اور وہ کھلکھلا پڑی۔

پھر وہی پردوں کی سرسراہٹ . . . .

لیکن وہ کچھ اور سوچ رہا تھا۔ عجیب بات ہے۔ اس کی زندگی میں کتنی لڑکیاں آئیں۔ راتوں کو آباد کیا اور چلی گئیں۔ جسم ہی جسم، جو خوشی سے تیار نہ ہوئی اس نے پیسوں کے آگے سر جھکا دیا اور جسے پیسہ بھی نہ جھکا سکا وہ اس کے مضبوط بازوؤں میں تڑپ کر رہ گئی۔ جوانی کی پندرہ برس کی طویل مدت میں رنگ و بو کی طرح کتنی ہی حسین راتیں آئیں اور اس کے ایوان کو مہکا کر چلی گئیں۔ کتنے ہی خوبصورت جسم جلے بجھے اور اس کی آنکھوں کے سامنے راکھ کی مانند بے رنگ اور پھیکے ہو گئے۔

مگر یہ لڑکی . . . ؟

لیکن اس سے پہلے ایک لڑکی اس کی زندگی میں اور آئی تھی۔ سنبل، وہ بھی ایسی ہی تھی، اسے یاد آیا۔ وہ بے حد نازک، بے حد خوبصورت، بے حد محبت کرنے والی، اس کی باتوں میں، اس کے انداز میں، اس کی گفتگو میں جانے کیا چیز تھی کہ وہ ہمیشہ اُسے الجھائے رہی۔ اس کی نگاہوں کو آگے بڑھنے ہی نہیں دیا۔ جانے کیا چیز تھی جو سنبل کے جسم کی حفاظت کرتی رہی تھی۔ اس کی اداؤں میں عجیب جادو تھا جس کے باعث ہر وقت کہرہ اس پر چھایا رہتا۔

احساسات میں ٹھنڈی میٹھی آنچ سی سلگتی رہی۔ اس کا وجود موم کے ٹکڑے کی طرح ذرا نرم سا ایک سرمستی کے عالم میں سنور تا رہتا۔ کمہار کی کچی مٹی کی طرح سنبل کی آواز اس کے سارے وجود کو آہستہ آہستہ الگ الگ شکل دیتی رہتی۔ جدھر چاہتی اس کا رُخ اُدھر موڑ دیتی۔

کبھی کبھی جب وہ اکیلا ہوتا، بہت سوچتا ایسا کیوں ہوتا ہے ؟ اس ذراسی لڑکی میں کیا چیز ہے جو اس کے سارے جذبات پر سخت پہرے دار کی طرح چوکس رہتی۔

زندگی کے گہرے رنگوں میں ہر جگہ سنبل کا اپنا رنگ بڑا شوخ بڑا واضح تھا اور وہ رنگوں کے شور میں کمزور اور مجبور آواز کی طرح گم ہو جاتا۔

ہزار خواہش ہونے کے باوجود وہ سنبل کے سامنے کچھ سوچ نہیں سکتا۔ اور تب وہ سوچتا کہ سنبل سے کوئی رشتہ ضرور ہے۔ ایسا جو بے حد مقدس ہے، ایسا جو بے حد پاکیزہ ہے۔

.. بدن سے دُور وہاں بھی جہاں اندھیرا ایک چراغ کی طرح روشن رہتا ہے، وہ اپنے آپ کو سر بہ زانو پاتا اور خاموشی سے آس پاس تکتا رہتا جیسے اس کے سوچنے کی، سمجھنے کی، کچھ کرنے کی ساری طاقت سلب ہو گئی ہو۔

اس نے بڑے سے دریچے کے باہر کھلے آسمان کی نیلاہٹوں میں کالے کالے بادلوں کو ایک دوسرے کے تعاقب میں بھاگتے ہوئے دیکھا، دوڑتے ہوئے آگے پیچھے ایک خاص فاصلہ بناتے ہوئے وہ دونوں بھاگے جا رہے تھے کہ اس نے دیکھا دفعتاً تعاقب کرنے والے سفید بادل نے اگلے کو جا لیا . . . . پھر دونوں ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ کتنے برس ہو گئے وہ سنبل کو اپنی زندگی کا رفیق بنانا چاہتا تھا۔ زندگی کی ساری سیاہیاں اس کے قدموں میں بکھیر دینا چاہتا تھا۔

اور چاہتا تھا، اور چاہتا تھا . . . .

لیکن یہ سب نہیں ہوا اور جو کچھ ہوا وہ اُسے یاد بھی نہیں کرنا چاہتا۔ سنبل کیسی گہری اور تہہ دار شخصیت کی مالک تھی۔ اس کے سارے خواب ٹوٹ گئے۔ کرچی کرچی ہو کر اس کے آنگن میں بکھر گئے۔ وہ ایک معمولی دربان کے ہاتھوں میں موم کی گڑیا کی طرح . . . .

بہت دیر تک مہینوں وہ دیکھتا رہا۔ سوچتا رہا۔ پھر ایک دن اس کے لبوں پر زہر خند اُبھرا اور اس دن اس نے جھاڑو لے کر اُن ساری کرچیوں کو بٹور کر باہر کسی تاریک گڑھے میں پھینک دیا۔

لڑکیاں سب ایک سی ہوتی ہیں۔ سب ایک سی۔ صرف اُوپر سے ملمع معلوم ہوتا ہے جو ذرا سی آنچ سے اُتر جاتا ہے . . . .

"کیا سوچ رہے ہو . . ." بہت دیر تک خاموش دیکھ کر لڑکی نے پوچھا۔

گاڑی اب سڑک کے ڈھلان میں تیزی سے بھاگتی جا رہی تھی۔ اس نے رفتار کو کنٹرول میں کرنے کے لئے ہلکے سے بریک پر دباؤ ڈالا۔ گاڑی کی رفتار ذرا سست ہوئی۔ گہری نظروں سے لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے آہستہ سے کہا۔

"رتا ابھی میں تم سے کچھ مانگوں تو تم مجھے مایوس تو نہیں کرو گی ؟ . . . مجھے دے سکو گی . ؟"

"کیا ؟" لڑکی نے تعجب اور اپنایت سے جواب دیا۔ ذرا دیر اس کے چہرے کی جانب دیکھتی رہی پھر دفعتاً سب کچھ اس کی سمجھ میں آگیا۔ ایک طوفان سا اُٹھا۔ سمندر کی ایک تیکھی لہر چیختی ہوئی آگے بڑھی، بڑے شور سے نیلا آسمان ٹوٹا . . . لیکن چند منٹوں میں سب کچھ ختم گیا۔ اس نے اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا اور ٹھہراؤ سے جواب دیا۔

"ہاں ضرور" اس نے اپنے پیروں کی طرف دیکھا اور سنجیدگی سے بولی۔ "کچھ کیا تم چاہو تو سب کچھ تمہارے قدموں میں ڈال دوں گی !"

جواب سُن کر نوجوان کے ہونٹ بھنچ گئے۔ آنکھیں سرخ ہونے لگیں، اُس نے اور گہری نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے لرزیدہ آواز میں پوچھا

"سب کچھ . . . سب . . . ؟"

"ہاں، سب کچھ . . . " لڑکی نے اطمینان اور سادگی سے جواب دیا "وہ سب کچھ جو تمہارا ہے . . . !"

جواب خلاف توقع تھا۔ نوجوان چونکا، پیشانی پر تیوریاں اُبھریں۔ کئی گہری گھاٹیوں میں سے صحیح و سالم نکل کر وہ باہر آیا اور پوچھا۔

"اور وہ سب کچھ جو میرا نہیں ہے . . . . ؟"

"وہ تو میرا ہے۔ چھوٹا سا سفید سفید میمنہ کی طرح پیارا پیارا . . . " لڑکی نے ہنستے ہوئے معصومیت سے جواب دیا "اسے تو جب ہی دونگی جب میرا جی چاہے گا . . . "

ایک معمولی سی سادہ سی لڑکی کیا کہہ گئی۔ اس نے پل بھر میں اپنی طویل زندگی کا جائزہ لیا۔ ایسی سیدھی، صاف اور دو ٹوک بات . . . اُس نے کبھی نہیں سنی تھی . . . کبھی نہیں۔

ذرا دیر بعد اس نے آہستہ سے مگر مضبوط اور تیکھے لہجے میں کہا۔

"اگر میں تمہارے میمنے پر اپنی تیز رفتار گاڑی چڑھا دوں . . . اسے روند ڈالوں! . . . "

ابھی اس کا فقرہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ لڑکی ہنس پڑی

"چہ چہ، تو میرا میمنہ بے چارہ . . . . مر جائے گا"

پلٹ کر نوجوان نے لڑکی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے کلیجے پر ایک نشتر سا ٹوٹا۔ باتوں باتوں میں لڑکی کتنی بڑی بات کہہ گئی۔ وہ بہت دیر تک رتا کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ جہاں سنجیدگی تھی، وقار تھا، پُر اعتماد سکون تھا۔

گاڑی تیزی سے سڑک پر بھاگتی رہی۔ جب وہ ڈھلان ختم ہو گیا اور سڑک ذرا کشادہ ملی تو اس نے دھیرے سے گاڑی کو بیک کیا اور واپس گھر جانے والی سڑک پر ڈال دیا۔

"ارے کیا گھر واپس جا رہے ہو . . . گھاٹی دیکھنے نہیں چلوگے ؟!"

"نہیں۔" اس کا ہاتھ سختی سے اسٹیرنگ وہیل پر پڑا "نہیں چلو جلدی سے دیکھیں وہ میمنہ جو کیچڑ میں اتر گیا تھا اسے کہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی ؟"

کچھ دیر تک لڑکی سمجھ نہ سکی۔ اس نے پلٹ کر نوجوان کے چہرے کی طرف دیکھا جو شانت تھا۔ یوں جیسے آسمان پر سے سارے کالے بادل چھٹ گئے ہوں . . .

دفعتاً وہ آدمی اسے اتنا پیارا، اتنا پیارا لگا کہ اس کا جی چاہا اپنا وہ چھوٹا سا سفید سفید سا خوبصورت میمنہ چپکے سے اُس کی گود میں ڈال دے . . .

باہر ساری فضا سنہری دھوپ میں خوبصورت دلوں کی طرح چمک رہی تھی . . . . .

غزلیں

حامدی کاشمیری

۳۹۶ - جواہر نگر - سری نگر (کشمیر)

دشتِ ظلمات میں خورشید اُگایا جائے
خالی آنکھوں کو کوئی خواب دکھایا جائے

جانے کیا پوچھے مجھ سے یہ بوڑھا بالک
اب اسے تھپکیاں دے دے کے سلایا جائے

کھلبلی ہوگی ہم اخبار نئی سرخی ہوں گے
اپنا ہی پتلا چورا ہے پہ جلایا جائے

ساحلی لڑکیوں کے جسم، سلگتے جنگل
برف سے لپٹے سمندر کو جلایا جائے

اب دہکتا ہے شب و روز سوا نیزے پہ
سب کا اصرار ہے سورج کو بجھایا جائے

ہو چکے خشک سمندر نہ بجھی پیاس مری
اب خدا را مجھے زہراب پلایا جائے

○

مظفر حنفی

نزد پہلی نظامت، فضرے، بھوپال

بھڑکتا ہوں خود اپنے دل دھڑکنے کی صدا سے ہی
چراغ صبح سالرزے میں ہوں ٹھنڈی ہوا سے ہی

فنا کے غار سے بچ کر نکلنا غیر ممکن ہے
تمہارے پاؤں لغزیدہ رہے ہیں ابتدا سے ہی

خزانہ کب ملے گا عصرِ نو کے سندبادوں کو
سفر کے زعم میں پتھر اٹھا لائے خلا سے ہی

زمانے میں کوئی اپنا نظر آتا نہیں مجھ کو
مری بیچارگی دیکھو شکایت ہے خدا سے ہی

مجھے گمراہ کہتے جاؤ لیکن قافلے والو
یہ سارے راستے نکلے ہیں میرے نقشِ پا سے ہی

کدھر جاؤں مجھے پہچاننے والے ہزاروں ہیں
چھٹی حس کانپ اٹھتی ہے نگاہِ آشنا سے ہی

سزا کا خوف تم کو تجربوں سے باز رکھتا ہے
غزل نے رنگ بدلا ہے مظفر کی خطا سے ہی

عشرت علی صدیقی
ایڈیٹر قومی آواز لکھنؤ

برصغیر میں پائیدار امن کی طرف

اس سال ۹ اپریل کو نئی دہلی میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان اور ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے درمیان جو سمجھوتے ہوئے ہیں، ان کو بجا طور پر برصغیر کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز کہا گیا ہے۔ اگرچہ تینوں ملکوں میں بعض لوگوں نے ان سمجھوتوں کی بعض باتوں پر بے اطمینانی ظاہر کی ہے لیکن دنیا میں کوئی بندوبست ایسا نہیں ہو سکتا جو سب کو سو فیصدی مطمئن کر سکے اور جس پر کسی طرف سے کوئی اعتراض نہ کیا جا سکے۔ مگر تینوں جگہ عام طور پر ان سمجھوتوں کا خیر مقدم کیا گیا ہے اور یہ ان سمجھوتوں کی ایک بڑی خوبی ہے۔ ان کی دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ تینوں ملکوں نے اپنے جھگڑے ایک مشترکہ خاندان کے افراد کی طرح آپس میں گفت و شنید کے ذریعہ طے کرنے کی کوشش کی اور کسی بیرونی مداخلت کی دعوت یا اجازت نہیں دی۔ اگر یہ دونوں رجحان برقرار رہے تو برصغیر میں پائیدار امن کا قیام ممکن اور آسان ہو جائے گا۔

اس علاقے میں اس کی طرف ایک بڑا قدم ۱۹۷۱ء کے تصادم کے بعد ۲ جولائی ۱۹۷۲ء کو اٹھایا گیا تھا جب پاکستان کے صدر اور ہندوستان کی وزیر اعظم نے شملے میں ایک سمجھوتہ پر دستخط کئے تھے۔ ان دونوں ملکوں میں ایک ایسا تصادم ۱۹۶۵ء میں بھی ہوا تھا جبکہ دونوں ملکوں کے سربراہوں نے روسی وزیر اعظم کی دعوت پر تاشقند جا کر جنگ سے پیدا ہونے والے مسئلوں کو حل کرنے کے لئے ایک سمجھوتہ پر دستخط کئے تھے۔ یہ سمجھوتہ بظاہر بلا جبر و اکراہ ہوا تھا مگر تاشقند میں میزبان وزیر اعظم نے بیچ بچاؤ کا کام کیا تھا۔ اگرچہ انہوں نے اپنے لئے کسی سے کوئی رعایت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اور دونوں مہمان سربراہوں ——— صدر ایوب خاں اور وزیر اعظم لال بہادر شاستری نے ان کی پُر خلوص امن پسندی کا اعتراف کیا تھا۔ تاہم جو لوگ اپنی فکر کو تقسیم کی تنگ تنگیل محدود نہیں رکھ سکتے اور برصغیر کے ماضی نیز اس کے مستقبل سے واقفیت اور دلچسپی رکھتے ہیں اُن کے لئے یہ بات کسی قدر تکلیف دہ تھی کہ کوئی تیسری طاقت چاہے وہ کتنی ہی بے غرض اور پُر خلوص کیوں نہ ہو اس علاقے کے ملکوں کے باہمی معاملات میں کسی قسم کی مداخلت کرے چاہے وہ کتنی ہی تعمیری کیوں نہ ہو۔ روس کی نیت ہر طرح سے نیک تھی اور وزیر اعظم کوسی گن نے اس معاملے میں نمایاں ہونے اور سمجھوتے کا سہرا اپنے سر باندھنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ پھر بھی جب کسی علاقے کے کسی معاملے میں کوئی ایک بڑی طاقت دلچسپی لینے لگتی ہے تو دوسری بڑی طاقتوں میں رشک اور رقابت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ طرح طرح کی ریشہ دوانیاں شروع کر دیتی ہیں جس کی وجہ سے سلجھتے ہوئے معاملے بھی اُلجھ جاتے ہیں۔ ۱۹۷۱ء کے تصادم میں ایک منزل پر بیرونی مداخلت کا امکان پیدا ہو گیا تھا اور بظاہر اسی وجہ سے شملہ سمجھوتے میں ہندوستان اور پاکستان نے اپنے اس تہیّے کا اظہار کیا کہ وہ اپنے اختلافات دو فریقی گفت و شنید کے ذریعہ پُر امن طور پر طے کر لیں گے۔

شملہ میں رواداری

اس سمجھوتے سے پہلے جنگ کا نتیجہ پاکستان کے خلاف رہا تھا۔ لیکن شملہ میں مسٹر بھٹو کا خیر مقدم ایک ہارے ہوئے ملک کے لیڈر کی طرح نہیں بلکہ ایک برابر والے ملک کے سربراہ کی حیثیت سے کیا گیا اور ہندوستان نے سمجھوتے کی تدوین میں اس بات کا خیال رکھا کہ مسٹر بھٹو کے اپنے ملک میں اُن کی پوزیشن جو اُس وقت بہت اچھی نہیں تھی خراب نہ ہونے پائے۔ چنانچہ جنگ میں جیتا ہوا علاقہ واپس کرنے پر آمادگی ظاہر کی گئی اور بنگلہ دیش کے تسلیم کئے جانے کو سمجھوتے کی شرط نہیں بنایا گیا۔ نہ پاکستان سے بنگالیوں اور بنگلہ دیش سے پاکستانیوں کی فوری واپسی پر اصرار کیا گیا۔ البتہ پاکستان کے سربراہ نے ہندوستان کی مصالحت پسندی اور وقت کے تقاضوں کو دیکھ کر شملہ میں گفتگو کے دوران یہ تاثر دیا تھا کہ ان کا ملک تھوڑے ہی دنوں میں بنگلہ دیش کو تسلیم کرے گا۔ لیکن شملہ سے واپسی پر نہ معلوم اپنے بیرونی دوستوں کے کہنے سے یا اپنے ملک کے اندرونی حالات کے دباؤ سے انہوں نے اس اقدام کو التوا میں ڈال دیا اور اسی لئے شملہ سے دہلی تک کے سفر میں تقریباً پونے دو برس لگ گئے۔

اس سے پہلے جولائی ۱۹۷۳ء میں ہندوستان کا ایک وفد پاکستان گیا تھا اور اگست میں پاکستان کا ایک وفد گفتگو کا سلسلہ جاری رکھنے کے لئے نئی دہلی آیا تھا۔ اس گفتگو کی بنیاد ہندوستان اور بنگلہ دیش کے ۱۷ اپریل ۱۹۷۳ء والے مشترکہ اعلان پر تھی جس میں برصغیر میں کشاکش کو کم کرنے اور دوستانہ تعلقات کو بڑھاوا دینے نیز پائیدار امن و مفاہمت کے واسطے سازگار فضا پیدا کرنے کے لئے

جنگ سے پیدا ہونے والے انسانی مسائل کے حل پر زور دیا گیا تھا اور کہا گیا تھا کہ سوائے ان جنگی قیدیوں کے جن پر بنگلہ دیش جنگی جرائم کے سلسلے مقدمہ چلانا چاہتا ہے باقی تمام جنگی قیدی اور غیر فوجی نظر بند نیز پاکستان اور بنگلہ دیش کے ایسے شہری جو ایک دوسرے کے وہاں پھنسے ہوئے ہیں اپنے اپنے وطن واپس کر دیئے جائیں۔ چنانچہ نئی دہلی ۲۸ اگست ۱۹۷۳ء کے سمجھوتے میں ان سب لوگوں کی واپسی کا ضابطہ طے پا گیا۔ اس گفتگو میں بنگلہ دیش شریک نہیں تھا لیکن اس نے اس کی پوری تائید کی اور دوسری طرف پاکستان نے یہ مان لیا کہ اس سلسلے میں مزید گفتگو میں بنگلہ دیش ایک برابر کے آزاد ملک کی حیثیت سے شرکت کرے گا۔

مشکل لمحات

ستمبر میں سہ طرفہ واپسی شروع ہو گئی مگر پاکستان نے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے میں پانچ مہینے لگا دیئے۔ اس سال فروری میں جب پاکستان اسلامی چوٹی کانفرنس کا میزبان بنا تو اس نے متعدد مہمان ملکوں کے مشورے پر آخر کار بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا اور اس طرح وزرائے خارجہ کی سطح پر سہ فریقی گفتگو کیلئے میدان ہموار ہو گیا۔ پانچ روز کی اس گفتگو میں کئی آثار چڑھاؤ اور متعدد مشکل لمحات آئے۔ اس زمانے میں وزیراعظم بھٹو فرانس کے صدر کی تدفین میں شرکت کے لئے پیرس گئے ہوئے تھے جہاں انہوں نے دھمکی دی کہ جب تک ان ۱۹۵ پاکستانی قیدیوں کا معاملہ جنہیں بنگلہ دیش نے جنگی جرائم کے مقدموں کے لئے ہندوستان میں رکوا رکھا تھا اطمینان بخش طور پر طے نہیں ہوتا اس وقت تک چین بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کرے گا اور اس طرح وہ انجمن اقوام متحدہ میں شریک نہیں ہو سکے گا۔ یہ دھمکی نہ صرف یہ کہ شملہ سمجھوتے کی روح کے منافی تھی بلکہ اس مسئلے پر نئی دہلی کی گفتگو سے پہلے شیخ مجیب الرحمان نے جو کچھ کہا تھا اسکی روشنی میں یہ ایک بے تکی بات تھی۔ بنگلہ دیش کے وزیراعظم نے کہا تھا کہ ان کی قوم کو اگرچہ پاکستانی فوجیوں کے ہاتھوں انسانیت سوز مظالم سہنا پڑے ہیں مگر وہ معاف کرنا اور بھول جانا بھی جانتے ہیں۔ ان کے وزیر خارجہ ڈاکٹر کمال حسین اسی جذبے کو لے کر نئی دہلی کی گفتگو میں شرکت کیلئے آئے تھے۔

اگر بنگلہ دیش کو انتقام لینا ہوتا تو وہ پہلے ہی تقریباً نوے ہزار پاکستانی قیدیوں میں سے ۱۹۵ کے سوا باقی سب کی رہائی پر رضامند کیوں ہو جاتا۔ اس نے جنگ کے زمانے میں ہونے والی زیادتیوں کو اپنی آزادی کی خاطر پیش کی جانے والی قربانیاں سمجھ لیا۔ اگرچہ شیخ مجیب الرحمان کو یہ بات اپنے عوام کو سمجھانے میں کچھ وقت لگا ہے۔ وہ برصغیر میں پُرامن حالات اور دوستانہ تعلقات کی ضرورت سے بھی واقف تھے اور جانتے تھے کہ جنگی جرائم کے مقدمے چلانے سے تعلقات میں کشیدگی اور تلخی بڑھ جائیگی۔ ان احساسات کو چھپانے کی انہوں نے کبھی کوشش نہیں کی۔ وہ ایک ہی وقت میں دو طرح کی باتیں کرنا نہیں جانتے۔ مسٹر بھٹو نے غالباً یہی دیکھ کر پیرس میں دھونس والا لہجہ اختیار کیا تھا جس کا مقصد اتنا دہلی کی گفتگو کو متاثر کرنا نہیں تھا جتنا کہ اپنے عوام کو یہ باور کرانا کہ وہ کسی سے دب کر گفتگو نہیں کر رہے ہیں۔ ان کے وزیر مملکت برائے امور خارجہ مسٹر عزیز احمد نے بھی دہلی کی گفتگو کے ابتدائی دور میں یہ کوشش کی کہ ۱۹۵ جنگی قیدیوں کو مسئلے کو اوّلیت مل جائے اور اسے دوسرے مسئلوں سے الگ تھلگ رکھا جائے۔

پاکستانیوں کی واپسی

پاکستان کی اندرونی سیاست میں جو الجھنیں پائی جاتی ہیں انکی وجہ سے اس مسئلہ کو وہاں خاص اہمیت حاصل ہے اور اس کے طے ہو جانے سے مسٹر بھٹو کو فائدہ ہوگا۔ دوسری طرف بنگلہ دیش میں اتنی ہی اہمیت اس مسئلے کو ہے کہ جو چار لاکھ کے قریب پاکستانی وہاں مقیم ہیں انہیں انکے وطن واپس بھیج دیا جائے۔ یہ دو مسئلے انہیں دو ملکوں سے متعلق تھے مگر ان کے درمیان مفاہمت سے ہندوستان کو بھی دلچسپی تھی اور اُس کے وزیر خارجہ سردار سورن سنگھ نے جھگڑے میں پڑے بغیر اسے طے کرانے کی کوشش کی۔ خبروں کے مطابق انہوں نے دو رہبر اصول پیش کئے ایک یہ کہ جن لوگوں نے پاکستان کی خاطر مصیبتیں جھیلی ہیں انہیں پاکستانی قومیت نہ دینا پاکستان کے بنیادی تصور کے منافی ہوگا اور دوسرے یہ کہ جن پاکستانیوں کو واپس لے لیا جانا چاہیئے اور جتنے آدمیوں کو پاکستان اپنے وہاں کھپا سکتا ہے ان دونوں کی تعداد میں باہمی تعلق کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ آخر طے پایا کہ پاکستان تین طرح کے لوگوں کو بنگلہ دیش سے واپس بلا لے گا۔ (۱) جو سابق مغربی پاکستان کے باشندے تھے (۲) جو لوگ مرکزی حکومت کے ملازم تھے اور ان کے گھر والے اور (۳) منقسم خاندانوں کے ارکان۔ ایسے جن لوگوں کی درخواستیں حکومت پاکستان نے پہلے رد کر دی ہیں اگر وہ چاہیں گے تو انہیں درخواست رد کئے جانے کے اسباب بتا دیئے جائیں گے اور اگر کوئی شخص اپنی درخواست کے سلسلے میں کوئی نئی دلیل یا تفصیل پیش کرے گا تو اس پر بھی دوبارہ غور کیا جا سکے گا۔ ان تین قسم کے افراد میں سے کسی کی بھی درخواست خارج المیعاد تصور

نہیں ہوگی اور اگر کسی نظرثانی کی درخواست پر فیصلہ درخواست دہندہ کے خلاف ہوگا تو حکومت پاکستان اور حکومت بنگلہ دیش اس کو باہمی صلاح و مشورے سے طے کریں گی۔

سہ فریقی سمجھوتے میں ان لوگوں کی تعداد نہیں بتائی گئی ہے جنکو پاکستان واپس لے چکا ہے یا آئندہ واپس لینے پر تیار ہے، سوائے ان ۲۵ ہزار افراد کے جن کو "مصیبت زدہ" قرار دیا گیا ہے اور جن کے متعلق سمجھوتے میں کہا گیا ہے کہ انہیں واپسی کی اجازت دینے کی کارروائی ہو رہی ہے۔ لیکن بنگلہ دیش کے ایک سابقہ بیان کے مطابق چار لاکھ سے زائد افراد نے اپنے کو پاکستانی قومیت کا حامل کہا ہے اور جس کی تصدیق بین الاقوامی ریڈکراس نے کردی ہے اور ہندوستان کی پارلیمنٹ میں وزیر خارجہ جناب سورن سنگھ نے بتایا ہے کہ ابھی تک کچھ اوپر نوے ہزار کو واپسی کی اجازت دی جا چکی ہے۔ سمجھوتے سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ ان میں وہ ۲۵ ہزار افراد بھی شامل ہیں جنکو "مصیبت زدہ" قرار دیا گیا ہے اور جو بظاہر وہ لوگ ہیں جنہوں نے بنگلہ دیش سے بھاگ کر نیپال اور برما میں پناہ لے رکھی ہے یا وہاں سے کسی نہ کسی طرح پاکستان پہنچ گئے ہیں۔

اصلی بہاری

حالانکہ پاکستان نے کہا ہے کہ وہ جن تین قسم کے لوگوں کو واپس لینے کے لئے تیار ہے ان کی تعداد پر کوئی پابندی نہیں لگائی جائے گی مگر بنگلہ دیش میں ایسے اور بھی بہت سے لوگ ہیں جو ان تینوں میں سے کسی بھی زمرے میں نہیں آتے اور پاکستان واپس جانا چاہتے ہیں۔ مثلاً وہ لوگ جو تقسیم ہند کے بعد اپنے خاندانوں کے ساتھ اُس زمانے کے "مشرقی پاکستان" چلے گئے تھے اور جنہیں صحیح معنوں میں بہاری کہا جا سکتا ہے۔ وہ اس علاقے کو پاکستان کا جز سمجھ کر گئے تھے اور قدرتی طور پر اپنے کو پاکستان کا وفادار کہتے ہیں۔ بنگلہ دیش کے لوگ بھی انہیں ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ اس طرح ان کی حیثیت اقلیت ایسی نہیں بلکہ غیر قوم والوں جیسی ہے۔ اگر وہ مذکورہ بالا تین قسموں میں سے کسی کے تحت نہیں آتے تو انہیں "مصیبت زدوں" میں شمار کرنا چاہئے۔ جن حالات میں بنگلہ دیش کا جنم ہوا ہے ان کے پیش نظر ان سب لوگوں کا اس نئے ملک کی معیشت اور معاشرت میں پوری طرح کھپ جانا دشوار ہے۔ اگرچہ وقت کے ساتھ پرانی تلخ یادیں ہلکی ہوتی جائیں گی پھر بھی ان کے پوری طرح ملنے میں وقت لگے گا اور بنگلہ قومیت کا تصور تھوڑی بہت تفریق کو برقرار رکھے گا۔ اور اگر پاکستان نے انہیں واپس لینے سے انکار کر دیا تو ان بدنصیبوں کو نظریۂ پاکستان سے وابستگی رکھنے یا تلاشِ معاش میں "مشرقی پاکستان" میں جانے کا خمیازہ بہت دنوں تک بھگتنا پڑے گا۔ ان کی حالت انہی لوگوں جیسی ہے۔

غربت جن کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

اتفاقات نے انہیں سیاسی بساط کا مہرہ بنا دیا ہے مگر ان کا مسئلہ بنیادی طور پر ایک انسانی مسئلہ ہے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کی زیادہ تر ذمہ داری پاکستان پر ہے۔ مگر کسی حد تک یہ ذمہ داری بنگلہ دیش اور دنیا کے ان دوسرے ملکوں پر بھی عائد ہوتی ہے جو مغربی ایشیا میں پناہ گزینوں کے مسئلے کی پیچیدگیاں اور اس سے پیدا ہونے والی دشواریاں دیکھ رہے ہیں۔

پاکستان نے واپس آنے والوں کی تعداد مبہم رکھ کر سمجھوتے کی من مانی تاویل کی گنجائش باقی رکھی ہے لیکن بنگلہ دیش نے پاکستان سے اس مسئلے او جنگی قیدیوں کے مسئلے کا باہمی تعلق منوا لیا ہے اور سمجھوتے کے متن میں جنگی قیدیوں کے مسئلے کا ذکر بنگلہ دیش میں مقیم پاکستانیوں کے ذکر کے بعد آیا ہے اس مسئلے پر بھی پاکستان کو اپنی بات منوانے کے لئے یہ ماننا پڑا کہ جو بھی جرائم ہوئے ہیں اُن کی وہ مذمت کرتا ہے اور ان پر دلی افسوس کا اظہار کرتا ہے مگر ان داموں یہ سودا مہنگا نہیں ہے۔ اس لئے کہ سب جنگی قیدیوں کے واپس چلے جانے پر مسٹر بھٹو کا وہ وعدہ پورا ہو جائے گا جو انہوں نے اپنی قوم سے کیا تھا۔ ادھر انجمنِ اقوام متحدہ میں بنگلہ دیش کے شامل کر لئے جانے سے جس میں رکاوٹ ڈالنے کا اب چین کے پاس کوئی بہانہ نہیں رہ گیا ہے، شیخ مجیب الرحمٰن کے لئے اپنی قوم سے دہلی سمجھوتے کو منظور کرا لینا او اس کے مخالفوں کی آواز کو بے اثر بنا دینا آسان ہو جائے گا۔ اس سمجھوتے سے دنیا میں ان کی ساکھ بڑھ گئی ہے اور پاکستانی وفد کے لیڈر مسٹر عزیز احمد نے ان کی فراخ دلی کی خاص طور پر تعریف کی ہے۔

ہندوستان کا فائدہ

پاکستان اور بنگلہ دیش میں مفاہمت ہندوستان کے لئے کئی اعتبار سے مفید ہے۔ ۱۹۷۱ء میں اُسکے جنگ بندی کے یک طرفہ اعلان جنگ میں کامیابی کے بعد شملہ سمجھوتے میں اس کی مصالحت پسندی، پاکستان کے جیتے ہوئے علاقوں کی واپسی، اور ہند بنگلہ دیش مشترکہ اعلان میں واضح طور پر ظاہر ہونے والی انسانیت دوستی کے باوجود اس کے خلاف جو معاندانہ پروپیگنڈا پاکستان اور بعض دوسری بغرض منعطاقتیں کرتی رہی ہیں وہ کند ہو جائے گا، عالمی رائے عامہ برصغیر کے مسئلوں کو صحیح پس منظر میں دیکھ سکے گی یہ بات اچھی طرح محسوس کی جا سکے گی کہ بنگلہ دیش کو ہندوستان اپنا حاشیہ بردار بناتا، یا اس کی داخلہ اور خارجہ پالیسیوں پر اثر انداز ہونا نہیں چاہتا —— اور سب سے بڑھ کر یہ کہ برصغیر میں امن و تعاون کے لئے سازگار فضا پیدا ہو جائے گی۔

ایسی فضا بناتے وقت اس دوسرے سمجھوتے سے بھی مدد ملے گی جو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ہوا ہے اور جس میں شملہ سمجھوتے میں طے پانے والی باتوں کو عملی جامہ پہنانے کا ارادہ ظاہر کیا گیا۔ خاص طور سے ان باتوں پر جن کا ذکر سمجھوتے کی تیسری دفعہ میں کیا گیا ہے اور جو دونوں ملکوں کے درمیان رسل و رسائل، آمد و رفت اور تجارتی مال، سائنسی معلومات کے تبادلے اور تہذیبی تعلقات سے متعلق ہیں۔ شملہ سمجھوتے کی آخری دفعہ کی آخری سطر میں سفارتی تعلقات کی بحالی کی بات کہی گئی تھی۔ ابھی تک پاکستان سمجھوتے کی دوسری باتوں پر عملدرآمد کو سفارتی تعلقات کی بحالی سے مشروط قرار دیتا رہا ہے لیکن اب بہ ظاہر اس نے سمجھوتے میں درج ترتیب کو منظور کر لیا ہے۔ امید ہے کہ وہ اس جذبے کو بھی برصغیر سے متعلق اپنی پالیسیوں کا محرک بنائے گا، جس کا ذکر سمجھوتے کے شروع میں کیا گیا ہے۔

اسی جذبے کے تحت ہندوستان اور پاکستان کے دو فریقی سمجھوتے میں طے ہوا ہے کہ نہ صرف ۱۹۷۱ء کی جنگ کے بعد اور اس کے دوران بلکہ اس کے پہلے سے ایک دوسرے کے جو شہری ایک دوسرے کے وہاں نظر بند یا لاپتہ ہیں ان کا پتہ لگانے، انہیں رہا کرنے اور ان کو ان کے وطن واپس بھیجنے کا انتظام کیا جائے گا۔ اس انتظام کی اہمیت اس بات میں مضمر ہے کہ یہ مسئلہ اس وقت بھی طے نہیں ہو سکا تھا جب دونوں ملکوں کے تعلقات بہ ظاہر معمول کے مطابق تھے۔ ان لوگوں کی واپسی کی آخری تاریخ سمجھوتے میں ۱۴ اگست طے ہوئی تھی مگر دونوں حکومتوں نے سمجھوتے پر دستخط کے چند ہی روز بعد اس کارروائی کو اس تاریخ سے کئی مہینے پہلے مکمل کر لینے پر آمادگی ظاہر کر دی۔

حالات کا تقاضا

پچھلے ۲۷ برسوں کے دوران جنگ اور اس کی تیاریوں سے برصغیر کے ملکوں کے لئے زبردست دشواریاں پیدا ہوئی ہیں اور اس طرح کوئی مسئلہ حل ہونے کے بجائے نئے نئے مسئلے پیدا ہوتے رہے ہیں۔ یعنی سیاست داں اپنی اغراض کے تحت ان مسئلوں کو برقرار رکھنا اور پیچیدہ تر بنانا چاہتے ہیں لیکن عوام کے مفاد کا تقاضا ہے کہ ان مسئلوں کو پُرامن گفت و شنید کے ذریعے جلد سے جلد حل کر لیا جائے۔ لیکن بیرونی طاقتیں بھی اپنے فائدے کے لئے ایسے جھگڑوں کو بڑھانا چاہتی ہیں جیسا کہ انہوں نے کوریا، ویت نام اور جرمنی میں کیا ہے لیکن اس کوشش سے کسی کو کوئی فائدہ نہیں ہوا اور جب مشرقی جرمنی اور مغربی جرمنی جو کبھی ایک ہی ملک تھے اور دوسری جنگ عظیم کے بعد تقریباً ۲۰ برس تک ایک دوسرے کے خلاف صف آرا رہنے کے آخرکار مصالحت و مفاہمت اور دوستی و تعاون کے تعلقات قائم کرنے پر مجبور ہو گئے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش جو کبھی ایک ملک تھے اور جن کے درمیان بہت سے حالات اور مسائل مشترک ہیں، جن کو غریبی اور پسماندگی جیسے مشترک دشمنوں کا سامنا ہے آپس میں امن اور تعاون کے تعلقات قائم نہ کر سکیں۔ وہ اپنا الگ الگ وجود برقرار رکھ سکتے ہیں۔ امن کا مطلب انضمام اور تعاون کا مطلب تسلط نہیں ہے۔ نہ دوستی سے مراد یک رنگی ہے۔

سگے بھائیوں اور عزیز دوستوں کی طرح اچھے پڑوسیوں میں بھی نقطۂ نظر کا اختلاف ہو سکتا ہے۔ مگر آج کی دنیا پُرامن بقائے باہم کی روز بروز زیادہ سے زیادہ قائل ہوتی جا رہی ہے۔ اس لئے کہ دوسرا راستہ قتالِ باہم کا ہے جس کا نتیجہ ہار جیت دونوں صورتوں میں بہت ہی تکلیف دہ ہوتا ہے۔ کئی تجربوں کے بعد شملہ میں اس اصول کا اعتراف کیا گیا تھا اور دہلی میں اس کا اعادہ کیا گیا ہے۔ دہلی کے دونوں سمجھوتوں میں ایک اور خاص بات یہ ہے کہ ان میں جنگ کے بجائے تصادم یا ٹکراؤ ([illegible]) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش جنگ سے کتنے بیزار اور امن کے کتنے خواہشمند ہیں۔ ●●

بقیہ "ڈاکٹر تاراچند اور فارسی ادب"

ترجموں میں محفوظ ہو گئی ہیں جو شاید اصل زبان میں نہ مل سکیں۔ تان سین نے ہندی میں موسیقی سے متعلق "بدھ پرکاش" نام کا ایک رسالہ لکھا تھا جس کا آج پتہ نہیں چلتا، مگر خوش قسمتی سے اس کا فارسی ترجمہ موجود ہے۔

لودی عہد کو عام طور سے ادبی نقطۂ نظر سے غیر اہم سمجھا جاتا ہے، مگر اسی زمانہ میں فارسی ادب میں ایک غیر معمولی اضافہ ہوا اور 'لہجاتِ سکندر شاہی' نام کی ہندوستانی موسیقی پر ایک بلند پایہ کتاب لکھی گئی ہے۔ اس پر مقالات بھی لکھے گئے ہیں۔ دہلی یونیورسٹی کی فیکلٹی آف میوزک میں اس کتاب کے فارسی متن کو چھپوانے اور اس کا انگریزی اور ہندی میں ترجمہ کرانے کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔

اب تک ہندوستان کے فارسی ادب کا ہندوستانی عناصر کے لحاظ سے پوری طرح مطالعہ نہیں کیا گیا ہے، مگر اس قسم کے اور بہت سے گوشے ہیں جن کی طرف ڈاکٹر تاراچند صاحب نے توجہ دلائی ہے۔ آج وہ ہم میں نہیں ہیں، مگر ان کا لگایا ہوا پودا سرسبز و شاداب رہے گا اور آنے والی نسلوں کو ان کی یاد دلاتا رہے گا۔ ▬ ▬

اولاد احمد صدیقی

۱۴/۱ انجینئرنگ کوارٹرز ۔ زین العابدین روڈ ۔ علی گڑھ

اقبال کی معاشرتی فکر کے چند پہلو

اقبال کی شاعری لگ بھگ چالیس سال کے عرصہ پر محیط ہے۔ سر شیخ عبدالقادر کا بیان ہے کہ انہوں نے اقبال کو بیسویں صدی کے آغاز سے چند سال قبل لاہور کے مشاعروں میں پہلی بار سنا جہاں ان کے چند ہم جماعت دوست انہیں کھینچ لائے تھے اور کہہ سن کر غزل پڑھوائی تھی۔ اس وقت سے لے کر اپنی وفات تک وہ ہر اہم مسئلہ پر اظہارِ خیال کرتے رہے۔ وہ اسلام کی دوامی قدروں کے شاعر ہیں اور ان کی شاعری کا مطالعہ اسی نقطۂ نظر سے کیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام اُن کی فکر کا سب سے غالب عنصر ہے اور ان کے فکری سرچشمے اسی ماخذ میں تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ مگر اُنہوں نے اپنے دَور کے سارے اہم میلانات اور تحریکات پر بھی تبصرہ کیا ہے۔ بالِ جبریل کی غزلیں اور نظمیں عصری اور دوامی، ملکی اور بین الاقوامی اقدار اور واقعات کے تذکروں سے بھری ہوئی ہیں۔ ضربِ کلیم کا ایک ذیلی عنوان "اعلانِ جنگ دورِ حاضر کے خلاف" ہے۔ ارمغانِ حجاز کی ایک اہم نظم "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" ہے جس میں چند اہم تحریکات پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ ضربِ کلیم کا مطالعہ بالخصوص ہمیں ایک ایسے اقبال سے روشناس کراتا ہے جو ایک پُرتجسس ذہن رکھتا ہے جو قوموں کے عروج و زوال کے اسباب دریافت کرنا چاہتا ہے۔ اور جو اسلام کے توانا اور صحت مند عناصر کا اُس کے روایتی عناصر سے مقابلہ کرتا ہے۔ اگر اس کتاب کے ابواب کے عنوانات پر نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال مغربی تہذیب کے اہم عناصر، اس کے مخصوص مظاہر اور دنیا کے تمدن پر اس کے اثر کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ اسلام اور مسلمان، تعلیم و تربیت، عورت، ادبیات، فنونِ لطیفہ، سیاست، مشرق و مغرب، محرابِ گل افغان کے افکار، چند وسیع عنوانات ہیں جن کے تحت بہت سی اہم تحریکات، نظریات اور اقدار پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ یہاں شاعر آزاد ہے۔ اس کا ذہن بیدار ہے۔ وہ دوامی اقدار کی پائیداری اور بعض اقدار کی ناپائیداری کا احساس رکھتا ہے۔ اُس نے اپنی آنکھیں کھول دی ہیں۔ اور کان ہر مانوس اور نامانوس آواز سے یکساں ردِ عمل قبول کرتے ہیں۔ وہ تحریکات، ادارے، اقدار سب سے اُلجھتا ہے۔ اُن پر ناقدانہ نظر ڈالتا ہے اور اپنے شاعر ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے چند بلیغ اور پُرمعنی اشاروں کے ذریعہ اپنا مافی الضمیر واضح کر دیتا ہے۔ قوتِ نقد یہاں ششدر رہ جاتی ہے اس لئے کہ قوتِ متخیلہ قاری کو ایک ایسی وادی میں لے جاتی ہے جو سارے نظریات سے ماوریٰ ہے۔ جہاں ثبوت کے لئے مثالوں کی اتنی ضرورت نہیں جتنی قوتِ مشاہدہ کی جہاں احساس عمل پر فوقیت رکھتا ہے اور جہاں بات بڑی ہی بلاغت اور ماہرانہ چابکدستی کے ساتھ روایتی تغزل کے پیرایہ میں کہی گئی۔ یہ مضمون اُن چند اہم اداروں اور تحریکات کے تجزیہ کی ایک کوشش ہے۔ جو اقبال کی اُردو شاعری میں جابجا نظر آتے ہیں۔ کوشش یہ کی گئی ہے کہ بجائے اقدار کو صحیح یا غلط ثابت کرنے کے، اقبال کا اُن کے بارے میں تصور واضح کیا جائے، اور اُن کے اندازِ فکر کی وضاحت کی جائے۔ یہ مضمون اقبال کے افکار پر ناقدانہ نظر ڈالنے کے بجائے اُن کا ترجمان ہے۔ یہاں ہم جن اداروں یا تحریکات کا ذکر کریں گے اُن میں سرمایہ داری، سوشلزم، فیشزم، جمہوریت اور دورِ حاضر کے انسان کی چند صفات قابلِ ذکر ہیں۔

سرمایہ داری

تدبّر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا ۔ جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

اقبال کا مندرجہ بالا بیان اتنا قطعی ہے کہ ہمیں اس بات کا پتہ چلانا پڑے گا کہ وہ سرمایہ داری سے کیا مراد لیتے ہیں اور اُن کے نزدیک اس نظام کی کیا خرابیاں ہیں؟

اقبال سرمایہ داری سے وہی نظام مراد لیتے ہیں جو ۱۹۳۰ء تک یورپ میں مروج تھا یعنی جس میں ایک طبقہ ذرائع پیداوار کی ملکیت کی وجہ سے اپنا غلبہ حاصل کرتا ہے۔ یہ طبقہ مزدور طبقہ کو اس کی محنت کا پورا معاوضہ نہیں دیتا اس لئے اس کا لہو پیتا ہے۔ کمزور ممالک سے خام اشیا کی درآمد اور پھر انہیں ممالک کے ہاتھ انہیں خام اشیا کو مصنوعات کی شکل دینے کے بعد منافع سے فروخت کو اس نظام میں تجارت کا شریفانہ نام دیا گیا ہے، مگر جو دراصل جوا ہے جو ایک شاطر جواری ایک ناسمجھ کے ساتھ کھیل رہا ہے، بنک زر کا منبع ہیں جن سے صنعتوں کے کل پُرزے چلتے ہیں اور جو زردار کی اندرون اور بیرونِ ملک اقتدار اور ہوسِ اقتدار کو تیز کرتے ہیں۔ اس نظام میں دولت کی تقسیم غیر فطری ہے اس لئے ایک بڑا طبقہ بے کاری

اور مفلسی کا مستقل شکار رہتا ہے۔ اس وجہ سے یہ تہذیب مدقوق ہوگئی ہے۔ اور چہروں پر سرخی جو صرف سرِ شام نظر آتی ہے وہ یا تو غازہ یا سلز وینا کی کرامات ہے جو صحت اور تازہ خون کی افزائش کی کمی پر دلالت کرتی ہے۔ اقبال خدا کو یہ حکم دیتے ہوئے دیکھتے ہیں کہ اس نظام میں جہاں دستِ دولت آفریں کو مزدیوں ملتی ہے جیسے اہل ثروت غریبوں کو [illegible] کے غریبوں کو خوابِ غفلت سے جگایا جائے [illegible] کے غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے گرما دیا جائے [illegible] اپنے حقوق کا احساس ہوسکے۔ خدا کے احکامات میں سے ایک [illegible] ہے کہ اگر کاشتکار کو اس کی فصل سے روزی حاصل نہیں ہوتی تو ایسی فصل ہی کو خاکستر کر دیا جائے۔

تجارتی نظام کی جکڑ بندیوں کے خلاف جس نے علمِ بغاوت بلند کیا معاشی خیالات کی تاریخ میں اسے سرمایہ داری سے متصف کیا گیا ہے اس کا فلسفہ بنتھم ([redacted]) اور ایڈم اسمتھ [redacted]) نے اور معاشیات ایڈم اسمتھ، رکارڈو ([redacted]) اور جان اسٹورٹ مل [redacted] نے مہیا کئے۔ معاشی نقطۂ نظر سے اس نظام کی بنیاد سرمایہ، اور اس کی بقا اس سرمایہ کے روز افزوں اضافہ پر ہے۔ سرمایہ کی کوئی خاص شکل متعین نہیں۔ وہ زر، مصنوعات، مشین یا فنی مہارت کوئی قالب اختیار کر سکتا ہے، اس کے لئے صرف یہ کفالت کرتا ہے کہ مزید دولت میں اضافہ کا سبب ہو۔ اس نظام کی ترقی میں سائنسی ترقی اور فنی مہارت کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کا نظام پیداوار اشیا کو بڑے پیمانہ پر مصنوعہ کرتا ہے اور اسی وجہ سے بڑے پیمانہ پر خام اشیا کا طالب ہوتا ہے۔ ظاہر ہے قوتِ پیداوار میں زبردست اضافے کھپت کیلئے بازار چاہتے ہیں اور اس وجہ سے نوآبادیوں کی تلاش ہوتی ہے جو اس کی مصنوعات کا محفوظ بازار اور ان مصنوعات کے لئے خام اشیا کے حصول کا ذریعہ ہوں۔ شروع میں یہ بازار خود سرمایہ دار ممالک فراہم کرتے ہیں، کیونکہ ان کی معاشی ترقی ایک سطح پر نہیں ہوتی مگر وہ جلد بڑی حد تک ایک دوسرے کے مقابل ہوجاتے ہیں۔ انیسویں صدی اور بیسویں صدی کی پہلی دو دہائیاں یورپ کا ایشیائی اور افریقی عوام کو مغلوب کرنے اور ان پر حکمرانی کرنے کی تاریخ ہیں۔

یہ سرمایہ داری کا ایک رُخ ہے۔ دوسرا رُخ اس کا معاشرہ کے اندر دیکھا جاسکتا ہے۔ سرمایہ داری سرمایہ دار طبقہ کو جو درمیانی طبقہ سے تعلق رکھتا ہے اس نظام میں سب سے اعلیٰ جگہ دیتی ہے۔ سرمایہ دار طبقہ اس نظام کو سرمایہ، فنی مہارت، اور مصنوعات کی کھپت کے لئے بازار فراہم کرتا ہے۔ وہ پیداوار کے نہ بکنے کی شکل میں سرمایہ کے تباہ ہونے کے لئے خطرہ مول لیتا ہے اور نئے سائنسی ایجادات اور انکشافات کو صنعتی ترقی کے لئے اختیار کرتا ہے۔ یہ مزدور کو اتنی اجرت دیتا ہے جو اس کیلئے صرف کفالت کا کام کرسکے۔ یہ خود بھی کوئی عیش و عشرت کی زندگی بسر نہیں کرتا۔ بلکہ ذاتی خرچ میں کفایت شعاری سے کام لیتا ہے۔ آمدنی کا بیشتر حصہ صنعتوں کی ترقی میں صرف ہوتا ہے۔ مگر جوں جوں اس کی طاقت بڑھتی ہے وہ اپنے منصب سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرتا ہے اور املاک و جائداد پیدا کرتا ہے جو ہنڈیاں، بانڈ ([redacted]) اور شیئر [redacted]) کہلاتے ہیں چنانچہ جس سخت کوشی سے پہلے تلخ زندگانی انگبین تھا، اب وہ اقتدار کو سنوارنے کے لئے ظاہری شان و شوکت اختیار کر لیتا ہے۔ دولت جب اکٹھی ہونے لگتی ہے تو خرچ میں زیادتی ہوتی ہے جو مزید دولت کمانے کا ذریعہ بنتی ہے۔ یہی طبقاتی کشمکش کو جنم دیتی ہے مزدوروں کو اپنے حقوق کا احساس دلاتی ہے اور ٹریڈ یونین کی تشکیل کرتی ہے۔ یہ ٹریڈ یونینز اپنی اہمیت منواتی ہیں تا آنکہ رائے دہندگیٔ بالغان کے ذریعہ خود اپنی حکومت قائم کر دیتی ہیں۔ قانون اب مزدور طبقہ کی حمایت کے لئے بنتے ہیں اور سرمایہ داری اپنا ڈھانچہ تو قائم رکھتی ہے، مگر اس کی روح "فلاحِ ریاست" [redacted] بن جاتی ہے۔ اقبال کے زمانے تک "فلاحِ ریاست" کا تصور ابتدائی حالت میں تھا۔

اقبال کا سرمایہ داری کا یہ تصور ۱۹۳۰ء تک کی لکھی ہے مکمل ہم آہنگی رکھتا ہے۔ ۱۹۳۰ء کا عالمی معاشی بحران سرمایہ دارانہ نظام پر سب سے کاری ضرب سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد حکومت کی مداخلت اس نظام کا ایک جزو بن گئی۔ اس معاشی مداخلت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ "کر جائے کام اپنا لیکن نظر نہ آئے"۔ ترقی یافتہ ممالک کے مروجہ نظام کی خرابیوں کو اجاگر کر کے اقبال نے اس نظام کی اندھی تقلید سے خبردار کیا ہے۔

سوشلزم

سوشلزم بالخصوص اشتراکیت، بالشویک روس، مارکسزم اور مارکس پر اقبال نے جو اظہارِ خیال کیا ہے وہ اُن کی فکر کے ایک ایسے گوشے کی وضاحت کرتا ہے جس کی طرف پوری توجہ نہیں کی گئی۔ اقبال مارکس سے متفق نہیں۔ مگر وہ اُسے پسند کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ مارکس کو اس لئے پسند کرتے ہیں کہ اُس نے سرمایہ دارانہ نظام کا پردہ فاش کر دیا ہے اور مغربی مدرسہائے افکار میں جو علم و حکمت کی مہرہ بازی اور بحث و تکرار کی نمائش ہو رہی تھی ان کو بے نقاب کر دیا ہے۔ روس میں اشتراکیت کی وجہ سے جو گرم رفتاری آئی اس کی وجہ یہ تھی کہ ؎

اندیشہ ہوا شوخیٔ رفتار پہ مجبور فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار

انسان کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر　　کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار

یہاں ہمیں روس میں پورے معاشرہ کو ایک منظم اور مربوط منصوبہ کے ذریعہ ترقی دینے کی کوشش کا جو فرسودہ طریقوں کے مقابلہ میں نیا پن رکھتا ہے، احساس ملتا ہے۔ بندہ و آقا کی تمیز مٹانے کی خواہش جس معاشرہ کی تشکیل کی محرک ہو، اقبال کے نزدیک وہ اس معاشرہ کے مستحسن ہونے کی دلیل ہے۔ چنانچہ وہ بالشویک روس کے اس اقدام کی بھی قدر کرتے ہیں جس کے ذریعہ اس نے دہریت کو اپنا کر کلیسا کے زور کو ختم کیا۔ کلیسا نے جو خواجگی کے مظاہر دکھائے ہیں، اور انسان انسان میں جس طرح تفریق ڈالی ہے، اس کا ختم ہوجانا ان کے نزدیک لات و منات کو توڑنے سے کم حقیقت نہیں رکھتا۔ ابلیس کی مجلس شوریٰ میں مارکسزم کا جس طرح تذکرہ کیا گیا ہے وہ قابلِ توجہ ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اسلام کے بعد مارکسزم کو ابلیسی نظام کو ختم کردینے کا سب سے خطرناک وسیلہ سمجھا گیا ہے۔ مارکس اور مارکسزم کا تعارف ملاحظہ ہو۔

ہے مگر کیا اس یہودی کی شرارت کا جواب
وہ کلیمِ بے تجلی وہ مسیحِ بے صلیب　　نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب
کیا بتاؤں کیا ہے کافر کی نگاہِ پردہ سوز　　مشرق و مغرب کی قوموں کیلئے روزِ حساب
اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا طبیعت کا فساد　　توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب

گرچہ ہیں تیرے مرید افرنگ کے ساحر تمام　　اب مجھے ان کی فراست پر نہیں ہے اعتبار
وہ یہودی فتنہ گر وہ روحِ مزدک کا بروز　　ہر قبا ہونے کو ہے اسکے جنوں سے تار تار
زاغ دشتی ہو رہا ہے ہمسرِ شاہین و چرغ　　کتنی سرعت سے بدلتا ہے مزاجِ روزگار
چھا گئی آشفتہ ہو کر وسعتِ افلاک پر　　جس کو نادانی سے ہم سمجھے تھے اک مشتِ غبار
فتنۂ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج　　کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئے بار
میرے آقا وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے　　جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

اس نظم میں چند باتیں قابلِ ذکر ہیں جو مارکسزم کی مخصوص صفات کی شکل میں بیان کی گئی ہیں۔ یعنی مارکس کا پیغمبر نہ ہونے کے باوجود ایک کتاب کا لکھنا جو اس کے نظام کے بنیادی عناصر کی شرح اور اس کے پیرؤوں کو صراطِ مستقیم کی تلقین کرتی رہے گی۔ اس کی تعلیمات مشرق اور مغرب کے ہر نظام سے ان کے مفید اثرات کا حساب مانگتی ہیں جس نے بندوں کو آقاؤں کے خلاف اعلان جنگ پر آمادہ کردیا ہے جس کے طلسم نے بڑے بڑے ساحروں کو سر بگریباں کردیا ہے۔ جس سے ہر قبا کو خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔ جسے پہلے لوگ صرف ایک آندھی سمجھتے تھے جو اپنا زور دکھا کر خود ہی ختم ہوجاتی ہے، مگر جس نے پورا اُفق ایک طویل عرصہ سے گرد آلود کردیا ہے جس کی ہیبت سے ہر ظالم اپنا مستقبل تاریک سمجھنے لگا ہے اور جہاں خود ابلیس کی قیادت خطرہ میں پڑ گئی ہے۔ سوال یہ نہیں کہ اقبال اسلام اور مارکسزم میں کسے ترجیح دیتے ہیں، ظاہر ہے اسلام کو ترجیح دیتے ہیں۔ ابلیس صاف کہتا ہے۔ الحذر آئین پیغمبر سے سو بار الحذر۔ کیونکہ آئین پیغمبر

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں

بلکہ سوال یہ ہے کہ وہ مارکس کو بذات خود کیا سمجھتے ہیں۔

اوپر ہم مارکسزم کے ان عناصر جن پر اقبال نے زور دیا ہے، بیان کرچکے ہیں۔ ان کو مختصر طور پر اس طرح دہرایا جاسکتا ہے۔ مارکسزم سلطانی جمہور قائم کرتا ہے۔ طبقاتی فرق کو مٹاتا ہے۔ دولت کی مساویانہ تقسیم کا علمبردار ہے۔ دنیا کے معاشرہ کو ایک نئے ڈھنگ سے تشکیل کرنے کا دعویدار ہے۔ اس طرح یہ ایک تجربہ ہے جسے دنیا نے عوام کی بہتری کے لئے کیا ہے۔ اس میں اسلام کے بہت سے اصولوں سے اتفاق ملتا ہے مگر یہ اسلام سے مکمل ہم آہنگی نہیں رکھتا اس لئے اسلام کے برابر نہیں ہوسکتا۔ میرے خیال میں اقبال کی مجلس غور طلب مارکسزم کی تضحیک کے بجائے روایتی اسلام کی خامیوں پر طنز ہے۔

انیسویں صدی کے آخر تک سرمایہ داری کے خلاف جن احتجاجی تحریکات نے دنیا کے سماجی اور معاشی افکار پر اثر ڈالا، مارکسزم اُن میں سب سے زیادہ واضح، مکمل اور آپس کے مختلف عناصر کے درمیان مطابقت رکھنے والی عمرانی تحریک ہے جس شخص نے سب سے پہلے مارکسزم کو مذہب سے تعبیر کیا، میرے خیال میں اس نے کوئی غلطی نہیں کی۔ مذہب کی طرح یہ بھی چند واضح اصولوں کے ذریعہ انسانی شخصیت کے سارے پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ اس کے اثرات جملہ سماجی علوم سے لے کر فلسفہ اور ادبیات تک سب پر اپنا نقش چھوڑتے ہیں۔ یہ دراصل سرمایہ داری کے متضاد عناصر کا تجزیہ ہے۔ اس کی بنیاد تاریخ کی معاشی تعبیر کے نظریہ پر قائم ہے۔ یہ سرمایہ و محنت کی کشمکش کو سرمایہ دارانہ نظام کی بدیہی حقیقت سمجھتا ہے جو دراصل مزدور کو اس کی مزدوری میں کمی کرکے افزائش سرمایہ پر سرمایہ دار کو استعمال کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ سرمایہ داری نظام اس وقت تک ترقی کرتا ہے جب سرمایہ دار کا حصہ پیداوار میں اتنا ہو کہ منافع کا عنصر باقی رہے۔ اس میں کمی اس وقت واقع ہوتی ہے جب نفع کی شرح کم ہوجائے اور مزدوری پیداوار کا غالب جز بن جائے۔ چنانچہ جب سائنسی انکشافات کو سرمایہ دار صنعتوں میں اپناتا ہے تو وہ مزدوروں کی مانگ میں اضافہ کرتا ہے۔ یہ اضافہ اُسے شرح مزدوری بڑھانے پر مجبور

کرتے ہیں جو نفع کی شرح کو بلاواسطہ متاثر کرتی ہے۔ چنانچہ معاشی بحران واقع ہوتا ہے۔ یہ بحران بیروزگاری میں اضافہ کرتا اور سرمایہ کی افزائش میں کمی کر دیتا ہے۔ بے روزگاری کے وسیلے سے شرح مزدوری کم ہو جاتی ہے اور مزدوروں کی مانگ پھر سے بڑھنے لگتی ہے۔ یہ معیشت میں ایک نئی سرگرمی پیدا کر دیتا ہے۔ لوگوں کی قوت خرید اضافہ طلب کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے جو سرمایہ دار کو سرمایہ کاری، اس میں اضافے اور توسیع کرنے پر مائل کرتا ہے۔ نتیجہ پھر بحران کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ مارکس کا فاضل فوج کا نظریہ (Concept of Reserve Army of Labour) سرمایہ داری کی ترقی کے حدود اور اس کے سارے اندرونی تضادات کو پیش کرتا ہے، یہ تضادات اس لئے پیدا ہوتے ہیں کہ دولت کی تقسیم ذرائع پیداوار کی شخصی ملکیت کے تحت ہوتی ہے۔ اس لئے ذرائع پیداوار کی قومی ملکیت مارکسزم کی اساس ہے۔ ذرائع پیداوار کی قومی ملکیت صنعتی ممالک میں کوئی مستقل طبقات قائم نہیں کرتی جو صرف املاک کی وراثت کی وجہ سے زندہ ہیں۔ بلکہ ہر شخص کو شخصی محنت اور اکتساب فن سے اپنے لئے روزی اور سماج میں اپنا مقام پیدا کرنا پڑتا ہے۔ طبقات اور آمدنیوں میں کمی بیشی اب بھی قائم رہتے ہیں، مگر اب یہ فنی مہارت، بلندیٔ فکر اور سماج کے لئے مفید ہونے کا انعام ہیں۔ سماجی ترقی اس نظام میں ایک متوازن اور معیشت کے مختلف حصوں کے درمیان مطابقت رکھنے والے منصوبہ کے تحت ہوتی ہے۔ مارکسزم انسانی معاشرہ کی تشکیل ایک نئے ڈھنگ اور ایک نئے نظریہ کے تحت کرنے کا دعوی دار ہے۔ اگر امریکی انقلاب نے درمیانی طبقہ کو برسر اقتدار کیا تو انقلاب روس نے نچلے طبقہ کو۔ معاشی خیالات کی تاریخ میں مارکسزم مشرق و مغرب میں ایک نئے دور کا آغاز ہے۔

فیشزم

فیشزم کا تذکرہ اقبال نے مسولینی اور ابی سینیا والی نظموں میں کیا ہے۔ ان نظموں میں ہمیں اقبال کے خیالات میں بتدریج تبدیلی ہوتے رہنے کا احساس ہوتا ہے۔ سب سے پہلی نظم جو مسولینی پر ہمیں ملتی ہے وہ بالِ جبریل میں ہے جس میں مسولینی کی ندرت فکر و عمل کی تعریف کی گئی ہے۔ اس لئے کہ اس کی نظر کے فیض اور اس کی کرامت کی وجہ سے رومۃ الکبریٰ کا ضمیر دگرگوں ہو گیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ

چشمِ پیرانِ کہن میں زندگانی کا فروغ   نوجواں تیرے ہیں سوزِ آرزو سے سینہ تاب

لیکن ضرب کلیم میں مسولینی کی "ندرتِ فکر و عمل" ترقی یافتہ استعمار پسند قوموں کے اقتدار کی کشمکش کا پیکر اختیار کر لیتی ہے،

میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم   تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج
یہ عجائب شعبدے کس کی ملوکیت کے ہیں   راجدھانی ہے مگر باقی نہ راجہ ہے نہ راج

جب ایک نئی اور ابھرتی ہوئی جارحیت پرانی اور تسلیم شدہ جارحیت سے ٹکراتی ہے تو اس پر جہاں بانی کا الزام لگایا جاتا ہے۔ مگر در اصل یہ اس تنظیم کی پیروی ہے جو اس سے پہلے اقوام قائم کر چکی ہیں۔ مسولینی پہ الزام لگانے والوں کو اس کا جواب ملاحظہ ہو۔

آل سیزر چوبِ نے کی آبیاری میں رہے   اور تم دنیا کے بنجر بھی نہ چھوڑو بے خراج
تم نے لوٹے بے نوا صحرا نشینوں کے خیام   تم نے لوٹی کشتِ دہقاں تم نے لوٹے تخت و تاج
پردۂ تہذیب میں غارت گری آدم کشی   کل روا رکھی تھی تم نے میں روا رکھتا ہوں آج

ابلیس کی مجلس شوریٰ میں فیشزم مارکسزم کا مقابل اور اس کے توڑ کی شکل میں نمودار ہوتا ہے جو محض مارکسزم سے لڑائی لڑنے کے لئے ایجاد کیا گیا ہے۔

توڑ اس کا رومۃ الکبریٰ کے ایوانوں میں دیکھ   آل سیزر کو دکھایا ہم نے پھر سیزر کا خواب

اسی فیشزم کو ابی سینیا والی نظم میں تہذیب کا کمال اور شرافت کا زوال اور جہاں کی غارت گری کا ایک وسیلہ بتایا گیا ہے۔ ہر گرگ ایک برۂ معصوم کی تلاش میں نظر آتا ہے۔ ایک قابل توجہ نظام کی حیثیت سے اور بالشوزم کے مدمقابل کے نقطۂ نظر سے فیشزم نے ۱۹۳۰ء کے بعد بڑی مقبولیت حاصل کی۔ اقبال کے یہاں ہمیں اس تحریک کا فوراً ردعمل ملتا ہے جیسے جیسے فیشزم کے عناصر واضح ہوتے گئے اقبال کے خیالات میں تبدیلی ہوتی گئی۔ چنانچہ ضرب کلیم میں مسولینی والی نظم ان کے خیالات کی نمائندہ کہی جا سکتی ہے۔ یہاں ہمیں لینن (Lenin) کی مشہور تصنیف Imperialism The Highest Stage of Capitalism کے افکار کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

جمہوریت

جمہوریت کے بارے میں اقبال کے خیالات واضح ہیں۔ خضر راہ میں سلطنت کے زیر عنوان تذکرہ کرتے ہوئے وہ اسے دیو استبداد سے تعبیر کرتے ہیں، جس میں وہی پرانی نوائے قیصری ملتی ہے۔ جہاں پارلیمنٹ میں عوامی [illegible] گفتگو سرمایہ داروں کی ایک جنگ زرگری ہے۔ اسے سرابِ رنگ و بو کہنا زیادہ مناسب ہے نہ کہ گلستاں۔ جمہوریت اقبال کے نزدیک سرمایہ داری نظام کا ایک مظہر ہے۔ جہاں اقتدار کی ہوس، تغلب اور طبقاتی کشمکش برقرار رکھنے کی کوششیں، مجلسِ آئین، اصلاحات، مراعات اور حقوق کے پردہ میں کی جاتی ہیں۔ جب وہ جمہوریت کو تماشا کہتے ہیں تو اس سے ان کی مراد ہوتی ہے کہ یہ ایک فریب ہے جس کی ظاہرا در پردہ نظام اقتدار کا تضاد دیدۂ بینا کو صاف نظر آ جاتا ہے۔ ایک نظم میں انہوں نے جمہوریت کی ایک خاص خامی کی طرف اشارہ کیا ہے یعنی [illegible]

اقلیت پر ظلم جس نظام میں فیصلہ تعداد رائے دہندگان کی اکثریت پر ہو نہ کہ مسئلہ کی نوعیت اور مخالفت کے وزن پر، اس نظام پر ہر حالت بھروسہ نہیں کیا جاسکتا اور اس سے توقعات وابستہ نہیں کی جاسکتیں۔ اقبال جمہوریت کو قیصریت کا نیا نقاب کہتے ہیں جو چونکہ پردہ پوش ہے اس لئے زیادہ پُر فریب اور خطرناک ہے۔

اگر ہم یونانی ریاستوں کو چھوڑ دیں تو جمہوریت کے موجودہ دور کا آغاز اٹھارویں صدی کے آخر سے سرمایہ داری نظام کی ابتدا کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ بنتھم (Bentham)، کے فلسفہ نفع وضرر (Pleasure and Pain) جو زیادہ سے زیادہ اشخاص کی زیادہ سے زیادہ بہتری (Greatest happiness of the greatest number) اور "نمائندہ حکومت" (Representative Government) کے اصولوں پر مبنی ہے، اس نظام کی اساس ہے۔ یہ مقامی سے لے کر قومی سطح تک نمائندہ حکومت کا اصول کے قوانین کو وضع کرنا اور ان کے نفاذ پر زور دیتی ہے۔ جمہوریت باوجود تعداد رائے دہندگان کے تابع ہونے کے، نچلے اور کمزور طبقہ کے حقوق کا از خود تحفظ نہیں کرتی۔ حکمراں طبقہ جو سرمایہ داری نظام میں سرمایہ دار ہوتا ہے، اپنے اثرات اور طاقت کی وجہ سے کلیدی حیثیت رکھتا۔ یہ اس کو خیالات اور محرکات بہم پہنچاتا ہے۔ موجودہ دور میں سب سے پہلی جمہوری ریاست برطانیہ میں قائم ہوئی۔ مگر برطانیہ میں بھی تقریباً سو سال نچلے اور کمزور طبقہ کی حمایت میں قوانین بنانے میں لگ گئے۔ انیسویں صدی کی نصف اول کی پارلیمنٹری اصلاحات سے لے کر بیسویں صدی کے نصف اول کی فیبین (Fabian) دستوری حکومت کے تصور تک جمہوریت نے برطانیہ میں بہت سی منزلیں طے کی ہیں۔ اس دور کے ایک عظیم مفکر ٹانی نے (Tawney) جس کی کتابیں (Acquisitive society) اور (Equality) اس دور کا عہد نامۂ جدید (New Testament) کہی جاسکتی ہیں۔ اس بات پر بار بار زور دیا ہے کہ جمہوری نظام میں فائدہ اجتماعی ہونا چاہیئے۔ چنانچہ سرمایہ کاری معیشت کا ایسے حصوں میں ہونی چاہیئے جس سے فائدہ کمزور تعداد میں اکثریت رکھنے والے طبقہ کو پہنچے چنانچہ مکمل روزگار اور ترقی کے یکساں مواقع اسی وقت فراہم ہوسکتے ہیں جب فنی اور عام تعلیم عام ہو اور صحت اور تندرستی اور ماحول کو بہتر بنانے پر سرمایہ زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جائے۔ جمہوریت کا یہ نیا تصور دوسری جنگ سے چند سال قبل شروع ہوتا ہے اور بعد از جنگ بہ مسلکات ہی سے تصور کیا جاتا ہے۔ اقبال کی جمہوریت سے مخالفت کسی اصول کی بنا پر نہیں بلکہ اس کے اندر مخصوص اقدار کی کمزوالی کی وجہ سے ہے وہ جمہوریت کو سرمایہ داری نظام کی اقدار کا تسلسل سمجھتے ہیں اور اس لئے اس کی آزادی کی نیلم پری کو دیو استبداد کے تغلب میں محصور پاتے ہیں۔ جمہوریت آج وہ نہیں جو قبل از جنگ تھی۔ اسلئے آج کی فکر کے تحت اقبال کے خیالات کو پرکھا نہیں جاسکتا۔

دور حاضر کا انسان

ایک اور وسیع عنوان جس پر اقبال نے مختلف طریقوں سے اظہار خیال کیا ہے 'دورِ حاضر کا انسان' ہے۔ یہ انسان ترقی یافتہ اور بظاہر متمدن یورپین ملکوں میں آباد ہے۔ اسے دنیا کی ساری راحتیں اور آسائشیں حاصل ہیں۔ اس نے فطرت کو زیر نگیں کرکے اپنا غلام بنایا ہے۔ سمندر اس کی جولان گاہ اور فضا اس کے کھیل کے میدان ہیں لیکن اس کی اپنی زندگی ایک شب تاریک ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے!

اقبال کا خیال ہے کہ سینوں کی بے نوری کی وجہ یقین کا فقدان جس کی وجہ سے ضمیر پاک، خیالِ بلند اور ذوقِ لطیف نظر نہیں آتے۔ اقبال خرد مندان مغرب کی حکمت کو ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغ کارزائی سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک مغربی تہذیب میں اخوت اور مساوات نسب پہ منحصر ہے۔ چنانچہ ایشیائی اقوام کا تبدیلِ مذہب بھی انہیں یورپین اقوام کی نظر میں برابر نہیں کرسکتا۔ اقبال انسان کو ابھی تک طلسم کہن میں اسیر پاتے ہیں جس کے بت عہد عتیق سے اب تک قیصریت اور استعماریت چلے آرہے ہیں۔ اقبال کا عہد حاضر کا انسان علاوہ بتان عہد عتیق کے بہت سے نئے نئے بتوں کا بھی پجاری ہے۔ اس نے خود اپنے ہم قوم افراد میں افتراق ڈالا۔ اس کی شکست اس کی فتح کا منہ چڑھاتی ہے۔ اس لئے خود اس نے اپنے معاشرہ کے اندر بے کاری، مے خواری، عریانی اور افلاس پیدا کیا ہے۔ اس کی بے یقینی اس کے اعمال پر کوئی پابندی نہیں لگاتی، نہ وہ اس کا احتساب کرتی ہے چنانچہ روحانی افلاس مادّی ترقی کا مدِ مقابل ہے۔ اقبال یہاں اس تحریک کے پیرو نظر آتے ہیں جو خیالات کی تاریخ میں خیال پرست تحریک (Utopianism) سے تعبیر کی گئی ہے۔ ان کے خیالات مشہور خیال پرستوں سے مماثلت ظاہر کرتے۔ ہم سینٹ سیموں (St. Simon) فوریئے (Fourier) رابرٹ اوون (Robert Owen) اور ولیم مارس (William Morris) کے خیالات کی بازگشت پاتے ہیں۔ ایک ہمہ گیر اخوت، دولت کی مساویانہ تقسیم، انسان کی اپنی فطرت کی جھلکی زار میں آباد ہونے کی کوشش، اس معاشرہ کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

اوپر ہم نے چند تحریکات اور مسائل کا تذکرہ کیا جو اقبال کی

(باقی صفحہ ۱۳ پر)

عرش ملسیانی
ایف ۱۱/۴ ماڈل ٹاؤن ۔ دہلی

بُلّھے شاہ

پنجابی کے صوفی شعرا میں بُلّھے شاہ کو وہی مقام حاصل ہے جو ہندی شعرا میں کبیر کو۔ آسبورن ایک مصنف کے قول کے مطابق بُلّھے شاہ کی تاریخ ولادت ۱۶۸۰ عیسوی اور تاریخ وفات ۱۷۵۸ عیسوی ہے لیکن انہوں نے اس کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا۔ پنجابی کے بعض تذکرہ نگاروں نے اس کی تاریخ ولادت ۱۱۴۸ ہجری یعنی ۱۷۳۵ء لکھی ہے۔ یہ سراسر غلط ہے۔ کیونکہ بلھے شاہ کے مرشد عنایت شاہ قادری قصوری کا انتقال ۱۷۲۸ء میں ہوا اور بُلّھے شاہ نے ایک جگہ یہ تسلیم کیا ہے کہ وہ تیس سال مرشد کی خدمت میں رہے۔ قرائن سے آسبورن کی دی ہوئی تاریخ ولادت پر یقین کرنا پڑے گا۔ گویا بُلّھے شاہ عالمگیری دَور کے شروع ہونے سے ذرا پہلے پیدا ہوئے ——— اور بہت بعد تک زندہ رہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ تھے تو اُمّی لیکن اپنے مرشد سے انہوں نے سلوک و تصوف کے سب راز پالئے ہوں گے۔

بُلّھے شاہ کا زمانہ مغلیہ سلطنت کے زوال کا زمانہ تھا۔ وہ اورنگ زیب کی موت کے بعد قریب قریب اسی سال تک زندہ رہا۔ اس نے کیا کیا مذہبی، معاشی اور معاشرتی افراتفری نہیں دیکھی ہوگی۔ گورو نانک، کبیر داس، رامانج اور اس کے وشنو چیلوں اور ادھر مشائخ چشت کی صلح رواداری کا چرچا عام ہوچکا تھا۔ تعصب کی عینک جنہوں نے لگائی تھی وہ ٹوٹ چکی تھی۔ بُلّھے شاہ، سرمد، بابا فرید، اور شاہ عبداللطیف صحیح قسم کے صوفی شعرا پیدا ہوئے۔

لاجونتی راما کرشنا نے پنجابی کے صوفی شاعروں پر ایک تحقیقی مقالہ ایک زمانہ ہوا لکھا تھا۔ اس نے اس شاعری کے تین دَور قائم کئے تھے۔ پہلا دَور تو ان شعرا کا تھا جو صوفی تو تھے لیکن تبلیغ و اشاعت اسلام بھی اپنا فرض سمجھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت فرید کو اس دبستان شاعری میں شامل کیا ہے حالانکہ اسے درست تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

بُلّھے شاہ کو دوسرے دبستان شاعری میں شمار کیا گیا ہے جو مذہب کے باب میں زیادہ سخت نہیں تھے بلکہ ان کے یہاں رواداری تھی۔ انہوں نے مجذوبانہ انداز سے محبوب کو پکارا ہے۔ غلط قسم کے اور گمراہ کرنے والے مذہب کے پرستاروں اور رہنماؤں پر ملامت کی بوچھاڑ کی ہے پنجابی شعرا میں یوں تو کئی صوفی شاعر ہوئے ہیں۔ شاہ حسین، سلطان باہو، علی حیدر، ہاشم، فرید ثانی، خواجہ غلام فرید۔ ان سب کا اپنا اپنا رنگ ہے لیکن بُلّھے شاہ کا انداز اور ہی ہے۔ اب ذرا اس کے کلام سے لطف اٹھائیے۔ جہاں ضرورت ہو وہاں ترجمہ کردیا جائے گا۔

کتے مُلّا ہو بہندے ہو ۔ کتے سُنّت فرض دسیندے ہو ۱۔ کہیں
کتے رام دہائی دیندے ہو کتے ماتھے تلک لگائی دا ۲۔ بیٹھے
ہُن کی تھیں آپ چھپائی دا ۳۔ بتاتے

بندرا بن میں گیا چراوے لنکا چڑھ کے ناد بجاوے ۴۔ دیتے
مکے دا بن حاجی آوے واہ واہ رنگ وٹائی دا ۵۔ بدلتا ہے
ہُن کی تھیں آپ چھپائی دا

اک نقطے وِچ گل مکدی اے
پھڑ نکتہ چھوڑ حساباں نوں کر دور کفر دیاں باتاں نوں
لاہ دوزخ گور عذاباں نوں کر صاف دِلے دیاں خواباں نوں
گل ایسے گھر وِچ ڈھکدی اے
اک نقطے وِچ گل مکدی اے
ایویں متھا زمین گھسائی دا لماں پا محراب دکھائی دا
پڑھ کلمہ لوگ ہنسائی دا دل اندر کجھ نہ لیائی دا
کدی بات سچی بھی لکدی اے
اک نقطے وِچ گل مکدی اے

مطلب: نکتے کی بات پکڑ لے اور حساب کرنا چھوڑ دے۔ کفر کی باتوں کا بھی ذکر نہ کر۔ دوزخ اور قبر کے عذابوں کا فکر نہ کر۔ اپنے دل کے خوابوں (خیالات) کو صاف کر۔ بات ایسے گھر میں آپہنچی ہے اور ایک نقطے میں ختم ہوجاتی ہے۔

زمین پر پیشانی کیوں رگڑتا ہے۔ لیٹ کر محراب کیوں دکھاتا ہے کلمہ پڑھ کے لوگوں کو کیوں ہنساتا ہے۔ دل میں تو تیرے راز حق موجود نہیں۔ کبھی سچی بات بھی چھپ سکتی ہے۔ بات تو ایک نقطے میں ختم ہوجاتی ہے۔

بُلھا کیہ جاناں میں کون

نہ میں مومن وِچ مسیتاں ۔ نہ میں وِچ کفر دیاں رِیتاں ۱مسجدیں
نہ میں پاکاں وِچ پلتیاں ۔ نہ میں موسیٰ نہ فرعون ۲پلیداں

بُلھا کیہ جاناں میں کون

نہ میں عربی نہ لاہوری ۔ نہ میں ہندی شہر ناگوری ۳پشاوری ۴ناگوری
نہ ہندو نہ ترک پشوری ۔ نہ میں رہندا وِچ ندّون ۵ضلع کانگڑہ میں ایک پہاڑی ریاست کا صدر مقام ہوا کرتا تھا

بُلھا کیہ جاناں میں کون

اقبال نے بھی بعد میں کہا ہے ع نہ میں عجمی نہ ہندی نہ عراقی نہ حجازی۔ لیکن بُلھے شاہ کے زمانے میں وہی تصورات ہو سکتے تھے جو اس نے بیان کئے۔

ٹک بوجھ کون چھپ آیا اے ۔ کس بھیکی بھیک وٹایا اے
اینویں قصّے کاہنوں گھڑنا ایں ۔ تے گلستاں بوستاں پڑھنا ایں
اینویں بے موجب کیوں لڑنا ایں ۔ کس اُلٹا وید پڑھایا اے

ٹک بوجھ کون چھپ آیا اے
کس بھیکی بھیک وٹایا اے

ایہہ پڑھنا علم ضرور ہویا ۔ پر دسنا نا منظور ہویا
جس دسیا سو منصور ہویا ۔ اس سُولی پکڑ چڑھایا اے

ٹک بوجھ کون چھپ آیا اے
کس بھیکی بھیک بنایا اے

ذرا بتا کہ چھپ کر کون آیا ہے اور یہ کس نے بھیس بدلا ہوا ہے۔ فضول قصّے کیوں گھڑتا ہے۔ گلستاں اور بوستاں پڑھنے سے کیا حاصل۔ بے سبب لڑتا کیوں ہے۔ کس نے تجھے الٹا وید پڑھا دیا۔ ذرا چھپ کر کون آیا ہے۔ اس علم کا حاصل کرنا ضروری ہے۔ لیکن کسی کو بتانا نہیں چاہیے جس نے یہ راز فاش کیا اس کا انجام منصور کی طرح ہوا اور اُسے سُولی پر چڑھایا گیا۔ ذرا بتا کہ چھپ چھپ کر تیرے دل میں کون اپنا مقام بناتا ہے اور بھیس بدلتا ہے۔

یہ باتیں گہری معرفت کی باتیں ہیں۔ بھولے پن سے سادہ الفاظ میں غیر فلسفیانہ انداز سے بُلھے شاہ نے صوفیانہ نکات حل کئے ہیں۔ قاری کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ بُلھے پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ مندر مسجد کی قید کا قائل نہیں۔ دراصل عبادت میں ریا کاری پر ضرب لگاتا ہے۔ یک جہتی کی بات اسی کافی میں کہتا ہے۔

دُوئی دُور کرو کوئی شور نہیں ۔ ایہہ تُرک ہندو کوئی ہور نہیں
سب سادھو کہو کوئی چور نہیں ۔ ہر گھٹ وِچ آپ سمایا اے

ٹک بوجھ کون چھپ آیا اے
کس بھیکی بھیک بنایا اے

حافظ نے ترکِ شیرازی کا لفظ استعمال کیا تھا۔ بُلھے شاہ نے ترک ہندو استعمال کر کے کہا کہ وہ کوئی غیر نہیں ہیں اور من تو شدم تو من شدی کی مثال پیش کر دی۔

من تو شدم تو من شدی کی ایک مثال ان دو مصرعوں میں ملاحظہ کیجئے۔

رانجھا رانجھا کردی نی میں آپے رانجھا ہوئی
سدّو نی مینوں دھیدو رانجھا ہیر نہ آکھو کوئی

یہ الفاظ ہیر یعنی محبوبہ کی زبان سے ہیں۔ رانجھا رانجھا کہتی کہتی میں خود رانجھا ہو گئی ہوں۔ اب مجھے کوئی ہیر کے نام سے نہ پکارے بلکہ رانجھا ہی کہے

قیس کے دل کی تمنا حسن میں کچھ کم نہیں ۔ جلوہ گر ہے سامنے لیلےٰ کے لیلےٰ ایک وہ

ایک اور کافی میں والہانہ انداز میں محبوبہ اپنی ماں سے کہتی ہے۔

روزے صبح نمازنی مائے ۔ مینوں پیالے آن بھُلائے
جاں پیا دیاں خبراں آئیاں ۔ منطق نحو سبھے بھُل گئیاں

اس انہد تار بجائے

روزے صبح نماز نی مائے ۔ مینوں پیالے آن بھُلائے

اسی موضوع کو اب یک جہتی کے انداز میں بُلھا ادا کرتا ہے۔

عاشق دی نوینوں نویں بہار

جاں میں سبق عشق دا پڑھیا ۔ مسجد کولوں جیوڑا ڈریا
ڈیرے جا ٹھاکر دے وڑیا[۱] ۔ جتھے وجدے ناد ہزار ۱داخل ہوا

عاشق دی نوینوں نویں بہار

بید قرآناں پڑھ پڑھ تھکے ۔ سجدے کردیاں گھس گئے متھے
ناں رب تیرتھ ناں رب مکّے ۔ جس پایا تس نور انوار

عاشق دی نوینوں نویں بہار

ٹیپ کا مطلب ہے کہ عاشق کی بہار نئی سے نئی ہے۔ بُلھے کا بنیادی خیال اس زمانے کے سماج کی اصلاح ہے لیکن وہ عاشق کا درد مند دل بھی رکھتا ہے اور اس کا عشق کسی صورت سے بھی مجازی نہیں۔ کبھی وہ کہتا ہے

کدی آمل یار پیاریا ۔ تیریاں واٹاں توں سر واریا

اے یار کبھی تو آمل۔ تیری راہ میں یہ سر بھی قربان ہے۔ اس کی معرفت کی اصطلاحیں صوفیوں کی عام اصطلاحیں نہیں۔ اس کا کلام کلشنِ راز تو ہے لیکن اس کے لئے شرح لاہجی کی ضرورت نہیں۔

وہ چرخہ کاتنے کے ہر عمل کو تصوف کی اصطلاح کی شکل دیتا ہے اور اس نے ایک طویل مگر خوبصورت کافی لکھی ہے جس کا ترجیع کا مصرعہ ہے "کر کتن ول دھیان کڑے" یعنی اے لڑکی کاتنے کی طرف دھیان لگائے رکھ۔ اس میں لکھتا ہے کہ تیرا چرخہ رنگ رنگیلا ہے سارے قبیلے کے لوگ

اس پہ طبلک کرتے ہیں تو گنوار لڑکی اس کی قیمت کو نہیں پہچانتی ۔ یہ بڑی قیمتی چیز ہے ۔ اس سے بازو کھلتے ہیں یہ محنت اور ریاضت کی قدر سکھاتا ہے ۔ اس سے کھیلنے کی حرص زیادہ نہ کر ۔ اب گڑا اور بڑی نہیں ہوگی ۔ تو سو کر رات نہ گزار ۔ یہ وقت پھر نہیں ملے گا ۔ کاتے جا اور کاتے جا ۔ اسی طرف دھیان رکھ ۔ یہ نظم بہت طویل ہے اور اسرارِ معرفت کا خزانہ ہے ۔ ایک بات میں نہ جانے کتنے کنائے ہیں ۔ اب خیال آتا ہے کہ ہندوستان کی جنگ آزادی جب ۲۱-۱۹۲۰ء میں زوروں پر تھی تو چرخے کا بھی خوب زور تھا ۔ بُلّھے شاہ کی روح کو ہم لوگ خراجِ عقیدت ادا کر رہے تھے کہ وہ اس روزانہ استعمال کی گھریلو چیز میں کتنے اسرارِ رہبانیت و معرفت بھر گیا تھا ۔ گاندھی جی بھی چرخے کو اقتصادی آلہ کہتے ہوئے کردار سازی کا ایک موثر ذریعہ بتاتے تھے ۔ بُلّھے شاہ کا یہ مصرع "کر کتن ول دھیان کڑے" واقعی ایک فقیر کا الہام تھا ۔

اس کے یہاں ایسی کافیاں بھی ہیں جو خالص ہندوانہ ہیں ع

گھر میں گنگا آئی سنتو گھر میں گنگا آئی

گھر لیا باج انہی ان گھاتاں ۔ سکن سکے بھل گئیاں سب باتاں

یا من انکھیو شام سندر سوں

اب اس کی اس معرکۃ الآرا کافی کے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں جو غزل کے سب اچھے شعر یعنی شاہ بیت کی طرح اس کی کافیوں میں شاہ کافی ہے ۔ قوال جب سماع کی مجلسوں میں اس کافی کے بند سناتے ہیں تو وجد و حال کا عالم ہر طرف طاری ہو جاتا ہے ۔

منہ آئی بات نہ رہندی اے

جھوٹھ آکھاں تے کجھ بچدا اے ۔۔۔ سچ آکھاں بھانبڑ مچدا اے

جی دوہاں گلاں توں جچدا اے ۔۔۔ جچ جچ کے جیبھا کہندی اے

منہ آئی بات نہ رہندی اے

جو بات زبان پہ آ جائے وہ رک سکتی نہیں ۔ جھوٹ کہوں تو کچھ بچاؤ ہوتا ہے ۔ سچی بات کہنے سے تو پورے ماحول میں آگ لگ جاتی ہے ۔ دونوں باتوں سے دل گھبراتا ہے ۔ زبان جھجک جھجک کچھ نہ کچھ کہتی ہے ۔ یہ ایک بڑی حقیقت ہے اور دل کو لگنے والی بات ہے ۔ لوگ سنتے ہیں اور بُلّھے کو یاد کرتے ہیں ۔ اور دو تین بند دیکھئے ۔

جس پایا بھید قلندر دا ۔۔۔ راہ کھوجیا اپنے اندر دا

اوہ واسی ہے سکھ مندر دا ۔۔۔ جتھے کوئی نہ چڑھدی لہندی اے [1]

منہ آئی بات نہ رہندی اے

اک لازم بات ادب دی اے ۔۔۔ سانوں بات معلومی سب دی اے [2]

ہر ہر وچ صورت رب دی اے ۔۔۔ کتے ظاہر ہے کتے چھپدی اے

---

[1] چڑھنا اترنا
[2] سے مجھول گئیں ۔

منہ آئی بات نہ رہندی اے

اساں پڑھیا علم تحقیقی اے ۔۔۔ اوتھے اکو حرف حقیقی اے [3]

ہور جھگڑا سب ودھیکی اے ۔۔۔ اینویں رولا پایا بہندی اے [4]

منہ آئی بات نہ رہندی اے

واقعی سکھ کے مندر میں وہی بس سکتے ہیں جس نے اپنے اندر کا بھید پا لیا ہو اور جس کے لئے طلوع و غروب میں کوئی فرق نہ ہو ۔ خانقاہوں ، درگاہوں ، امراء اور فقراء کی مجلسوں میں قوال بُلّھے شاہ کی اس کافی سے سب کو سرشاری اور مستی کی دولت بخشتے ہیں ۔ سہل ممتنع بات کہتا ہے اور الغزالی و بایزید بسطامی کو مات کرتا ہے ۔

اور بھی متعدد مشہور کافیاں ہیں ۔ خوفِ طوالت سے ان کے اولین مصرعے یا شعری درج کئے جاتے ہیں ۔

۱۔ "میری بکل دے وچ چور" یعنی میری کملی کے نیچے ہی چور ہے ۔

۲۔ "کتے رام داس کتے فتح محمد ۔ ایہو قدیمی شور" یعنی کہیں ہندو اور کہیں مسلمان کا جھگڑا ہے اور یہ قدیمی شور ہے ۔ محبوب حقیقی تو میرے اندر ہی ہے ۔

۲۔ میں پایا اے میں پایا اے

کیوں ترک کتاباں پڑھدے ہو ۔۔۔ کیوں بھگت ہندو جپ کردے ہو

کہیں گور کنڈی وچ پڑدے ہو ۔۔۔ ہر گھر گھر لاڈ لڈایا اے

میں پایا اے میں پایا اے

۳۔ نی سیو میں گئی گھواچی ۔۔۔ کھول گھنگھٹ مکھ ناچی

اب دوہڑے یا دوہے ملاحظہ فرمائیے ۔

بلھیا پینڈے پئے پریم کے کیا پینڈا آ گا کون [5]

اندھے کو اندھا مل گیا راہ بتاوے کون [6]

بلھیا ملاں اتے مشالچی دونوں اکو چت

لوکاں کردے چاننا آپ ہنیرے نت

اے بُلّھے ملا اور مشعلچی ایک ہی قبیل سے ہیں ۔ لوگوں کو روشنی دیتے ہیں اور خود ہمیشہ اندھیرے میں رہتے ہیں ۔

ٹھاکر دوارے ٹھگ بسیں کافر دوار مسیت

ہر کے دوارے بھیکھ بسیں ہمری ایہہ پریت

بُلّھے شاہ چل اوتھے چلیئے جتھے سارے انھے

نہ کوئی ساڈی قدر پچھانے نہ کوئی سانوں منے

وہاں چلو جہاں سب اندھے ہی بستے ہوں ۔ نہ ہماری کوئی قدر پہچان سکے اور نہ کوئی ہماری بات مانے ۔

---

[3] ے وہاں
[4] ے ڈالنا (حاشیہ ناخواندہ)
[5] ے راہ
[6] ے مشعلچی

بھیا معرم سال وچ نا ہیں جتنے موہن بھوگ پرائے
وچ مستیاں دھکے مِل دے تکاں تھوڑی پائے
دولت منداں نے بُوہیاں آتے چوب دار بہائے
پکڑ دروازہ رب سچے دا جتھوں دُکھ دل مُٹ جائے

اس کے علاوہ دوسری اصنافِ سخن میں بارہ ماسہ، سہ حرفی اور گنڈھاں (گانٹھیں) بھی ہیں۔

ڈاکٹر فقیر محمد فقیر نے پاکستان میں بڑی تحقیق سے بُلھے شاہ کے کلام کو جمع کیا ہے۔ وہ شائع بھی ہو چکا ہے۔ حالات کی تحقیق تو کی ہے لیکن نتیجہ خاص نہیں نکالا۔ خزینۃ الاصفیا مصنفہ غلام سرور لاہوری کے بیان کردہ حالات درج کر دیئے ہیں۔ تاریخ الاصفیار کے مطابق بلھے شاہ شیخ عبدالقادر جیلانی کی چودھویں پشت میں سے تھے۔ یہ کتاب ان کے مرشد عنایت شاہ قادری قصوری کی خاندانی تصنیف ہے ان کے والد کا نام سخی شاہ محمد تھا جو دریائے سندھ کے کنارے ایک گاؤں اُچ پنڈ گیلانیاں میں رہتے تھے۔ یہاں سے نقل مکان کر کے ملک وال پانڈو علاقہ ساہیوال کی نئی آبادی میں آئے اور انجام کار پنڈ پانڈو بھٹی کی مسجد میں امامت کرنے لگے۔ بُلھے شاہ کا اصل نام عبداللہ تھا لیکن اب تو وہ بُلھے شاہ ہی کے نام سے مشہور ہیں پانڈو بھٹی میں آنے کے وقت انکی عمر چھ سات سال تھی۔ یہ اپنے آبائی وطن اُچ پنڈ گیلانیاں میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی تاریخ وفات ۱۱۷۱ھ یعنی ۱۷۵۸ء ہجری کا ثبوت انکی لوحِ مزار کے اس قطعۂ تاریخ سے ملتا ہے ؎

چوں بُلھے شاہ شیخ ہر دو عالم
مقامِ خویش اندر خلد در رزید
رقم کن شیخ اکرم ارتحالش
دگر ہادیِ اکبر مست توحید

تاریخ نافع السالکین میں بھی اس صوفیٔ باکمال کے حالات مجملاً ملتے ہیں۔ پنجابی زبان ہی میں نہیں بلکہ ہندوستان بھر کی صوفی شاعری میں بُلھے شاہ کا درجہ بہت بلند ہے۔

نہیں نہیں نہیں...

راج نرائن راز
ایسٹ پٹیل نگر، نئی دہلی

دھرتی کی سوندھی مٹی سے اُگنا
اُجلی دھوپ میں بڑھنا
چندر کرن سے سرگوشی میں باتیں کرنا
سرمستی میں جھولتے رہنا — جھومتے رہنا

اک موسم میں تازہ شگوفوں سے لد جانا
شبنم سے مُنہ دھونا
بارش کی ننھی بوندوں سے اور نکھرنا
تیز ہواؤں کے جھونکوں سے کھِل کھِل جانا
مالی کی، مالک کی خواہش، منشا پر مُسکانا
خوشبوئیں پھیلانا

ڈال سے ٹوٹ کے گرنے کی فطری خواہش سے
ایک سہاگن سیج کی زینت
اک مزار کی رونق بننا

وقت سے پہلے مرجھا جانا
کچرے کے اک ڈھیر میں گرنا
پتی پتی بن کے بکھرنا
مٹی میں مل جانا

ہندوستان کی مسجدیں

غزلیات

معشوق سبزواری

معرفت شاد دہلوی، ٹھاکر اکانہ نوح، ضلع گوڑگانوں ہریانہ

ہُوا صدف سے نکل کر خراب دریا میں
میں وہ گُہر ہوں گئی جس کی آب دریا میں
یہ چاہتوں کے فسانے دروغ گو راوی
یہ کہہ کے پھینک دی اس نے کتاب دریا میں
اُداس ماہجبیں بس اب تو اپنے گھر جاؤ
کہ وہ تو بیٹھا ہے بن کر حباب دریا میں
ہیں آر پار کچھ اُجلے بدن کی تحریریں
نہاتا ہوگا کوئی ماہتاب دریا میں
ہیں زیرِ آب ابھی کتنے جہانِ نامعلوم
چمکتے ہیں کئی رنگ سراب دریا میں
نہ آئے گا وہ معشوق ہو منتظر جس کے
بہا دو ہاتھوں کے سارے گلاب دریا میں

○

آزاد گلاٹی — گورنمنٹ کالج نابھہ

خود مجھی سے کیا ہے کسی نے یوں مجھ کو جدا دوستو
میرے اندر جو میں تھا نہ جانے کہاں کھو گیا ہے بتا دوستو
ایک مخصوص آواز سننے کی خواہش ہی ہے مجھے
وہ صدا تو نہ آئی میں خود ہو گیا بے صدا دوستو
میں وہی ہوں مرے قد سے مجھ کو نہ چھوڑو الگ
بس ذرا ٹھیک کر لو نگاہوں کا تم زاویہ دوستو
اب کہاں سے کوئی شعر لاؤں، بھری بزم میں
میرے احساس میں غم کی جھنکار ہے بے نوا دوستو
اپنے اندر نہیں، اپنے باہر نہیں خود کو ڈھونڈوں کہاں
سب کو میرا پتہ ہے، مگر میں ہوں خود لاپتہ دوستو
ایک غنچہ صفت میں چٹکنے کو تھا ۔ اور مرجھا گیا
آتے آتے اِدھر کھو گئی اُس سمت کی ہوا دوستو
اُس کی آواز سے اپنی آواز تک کا سفر ختم ہے
جی چکے ہم بس اک گونج کی ہمنوائی ہے کیا دوستو
اُس سے بچھڑے تو آزاد! اِس تجربے سے گزرتے ہیں ہم
کس طرح روح ہوتی ہے تن سے تڑپ کر جدا دوستو!

احتشام اختر

شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج، کوٹہ (راجستھان)

اپنی بربادی کا احساس مٹانے دو مجھے
گھر میں جو کچھ بھی بچا ہے وہ جلانے دو مجھے
دل کی دیواروں پہ کیوں نام لکھا ہے اس کا
لوگ پڑھ لیں گے یہ تحریر مٹانے دو مجھے
ہوگی تذلیل جو آوارہ پھریں گے ہر سو
غم کے سوکھے ہوئے پتوں کو جلانے دو مجھے
دولتِ دید کہ رستے میں ملی ہے مجھ کو
چھین لے گا کوئی آنکھوں میں چھپانے دو مجھے
اپنی ہی گونج سے ٹکرا کے میں مر جاؤں گا
گنبدِ درد میں آواز لگانے دو مجھے
اس سے پہلے کہ کوئی آ کے چرا لے اختر
دل کی سوغات کو رستے میں لٹانے دو مجھے

○

جعفر عسکری — احتشام اکیڈمی ۵۱، نوراللہ روڈ، الٰہ آباد

یہ ہے شہرِ ہوس سب مرثیہ خواں اپنے اپنے ہیں
لباسِ زخم میں پنہاں دل و جاں اپنے اپنے ہیں
بڑھا ہے اور سنّاٹا دلِ وحشت زدہ میں یوں
قمیصِ شب ہے اور چاکِ گریباں اپنے اپنے ہیں
فضائے تیرگی ہے، ہم سفیرانِ سحر بولو
کہ خنجر آستینوں میں درخشاں اپنے اپنے ہیں
وہاں تفریقِ رہزن اور رہبر کیا کوئی کرتا
کہ راہِ پُر خطر میں سب نگہباں اپنے اپنے ہیں
کہاں تم بے خبر دیوار و در کی بات کرتے ہو
یہاں میراث میں کوہ و بیاباں اپنے اپنے ہیں
کسی کی آنکھ کا جادو، چلا ہوتا تو کیا کرتے!
کہ ہم نے رمز توڑے عہد و پیماں اپنے اپنے ہیں
حصارِ ظلمتِ تنہائی کے اندر ہے جہاں سب کی
جُدا ہیں سب کی تحریریں، دبستاں اپنے اپنے ہیں
چلو جعفر کریں تاریکیِ جاں میں سحر پیدا
خیالوں میں کئے سب ہی چراغاں اپنے اپنے ہیں

"فنگر پرنٹس"

سخاوت شمیم

۲۸ سینیئر میڈیکل ہاسٹل، جے پور

جو میرا امتیاز ہیں، میری دلیل ہیں
وہ صرف انگلیوں کے نشانات ہیں مرے
میرے وجودِ خاک میں سب کچھ چھپا نہیں
لیکن ہے جو بھی کچھ، وہ کسی سے جدا نہیں
ہر وقت سب کے سامنے دل کی کتاب ہے
یوں دیکھئے تو چہرہ مرا لاجواب ہے
طلعت جبینِ شوخ کی ہے غیرتِ قمر
بالا ہے سرو سے قدِ رعنا میرا، مگر
جسمانیت میں کیا ہے کوئی بات ہی نہیں
اس طرح دیکھئے تو مری ذات ہی نہیں
لیکن یہ انگلیوں کے نشاں بے نظیر ہیں
میرے ثباتِ ذات کے گویا سفیر ہیں
رہتے ہیں میرے ساتھ یہ دمساز کی طرح
مجھ کو نصیب ہیں کسی اعزاز کی طرح
بے مثل ہیں یہ جیسے کہ منصور کا مقام
اور منفرد ہیں جیسے کہ غالب کا ہو کلام
ستھرے ہوئے نئے ادبی ذوق کی طرح
پیچیدہ ہیں مگر یہ رہِ شوق کی طرح
چہرہ ملے، مزاج ملے، خانداں ملے
لیکن کسی سے بھی نہ کبھی یہ نشاں ملے
جو میرا امتیاز ہیں، میری دلیل ہیں
وہ صرف انگلیوں کے نشانات ہیں مرے

شاہد پرویز
۱۸۔ انصاری روڈ، دریاگنج، دہلی

مِٹّی کے پُتلے

نمبردار عبدالرشید نے اپنی گلابی پگڑی کو تھوڑا سا ترچھا کر کے سر پر جمایا اور رومال میں بندھے ہوئے سارے نوٹوں کی پوٹلی کو لمبے کُرتے کے نیچے پہنی ہوئی صدری کی لمبی جیب میں احتیاط سے رکھتے ہوئے اپنی گھر والی کو زور سے آواز دی۔

"نمبردارنی او نمبردارنی"

نمبردار عبدالرشید جب ذرا خوش یا مزے میں ہوتے تو وہ اپنی بیوی کو نمبردارنی ہی کہہ کر پکارتے تھے لیکن نمبردار کی آواز کے جواب میں جب اندر سے اُن کی گھر والی کی کرخت آواز "کیا ہے" آئی تو نمبردار عبدالرشید کا سارا موڈ چوپٹ ہوگیا۔

وہ چیخ کر بولے "میں کہتا ہوں سوئی دھاگا لینے گئی تھی یا چکّی پیسنے، وہیں جاکر سو گئیں۔ لاری آٹھ بجے چھوٹ جاتی ہے"

"توبہ ہے۔ تم تو ہَوا کے گھوڑے پر سوار ہو" نمبردارنی چیختی ہوئی باہر نکلی "چھری تلے دم تو لو، شہر جا رہے ہو لام پر!"

نمبردار نے ایسے خوشی کے موقع پر تکرار کرنی مناسب نہ سمجھی۔ بس اپنے کُرتے کا اگلا دامن اٹھا کر بنڈی کی جیب آگے کر دی۔

نمبردارنی نے پوچھا "روپے رکھ لئے؟"

"ہاں رکھ لئے، تم اپنا کام کرو"

نمبردارنی نے بنڈی کی پھٹی ہوئی جیب کو خوب اچھی طرح گونتھا اور بولیں، "دیکھو جی کسی کام کے کرنے کا ڈھنگ تو خدا نے تمہیں دیا نہیں۔ پھر بھی ذرا آنکھ پلک کھول کر کام کرنا۔ بس ایسے کپڑے ہوں کہ ایک دفعہ تو سارا گاؤں ہریان (حیران) رہ جائے۔ خوب جڑاؤ، چھپا تے، جیسے رؤف خاں تحصیلدار کی بیگم صاحب کے ہیں" ——— پھر خود ہی سوچ کر بولیں۔ "ارے ہاں تم نے اُن کمبختی ماروں کو دیکھا کب ہے! مگر سچ جب وہ بڑی کوٹھی والوں کے یہاں پہن کر آئیں تو میراثیوں پر آنکھ نہیں جم رہی تھی"

"ہاں ہاں، سب ٹھیک ہے۔ میں اندھا نہیں ہوں"

"توبہ" وہ جھنجھلا گئیں "بات سمجھاؤ تو ناک کان دو، ہوا سے لڑتے ہیں اور ہاں سنو، شہر جا رہے ہو تو کوئی اَلّا بَلا مت بٹورلانا۔ بس کپڑے بنوا کر سیدھے لوٹنا۔ باقی سب انتظام ہوگیا ہے"

نمبردار عبدالرشید نے اپنا سر سے اونچا لٹھ اٹھایا اور منہ ہی میں کچھ بڑبڑاتے باہر نکل آئے۔

× × ×

خیرپور میں چودھری عبدالغفور کی بیٹی گوراں کی شادی کی بات کسی دشمن ملک کے بم کی طرح پھٹی اور نیک انسان کی بُرائی کی طرح پھیل گئی۔

منگت رام کی آٹے دال کی دکان سے گاؤں کی چوپال تک اور برجو مہاجن کی گدّی سے موچیوں کے پنگھٹ تک، بس ایک ہی بات تھی۔

گوراں کی شادی کی بات ——— گاؤں والوں کے لئے اب نہ دلبر بیسوا کے سوانگ اور رسول پور کی نٹنیوں میں کوئی دلچسپی رہ گئی تھی نہ اسلام الدین کی تاڑی میں کوئی لطف تھا۔ انھیں تو بس ایک ہی بات یاد رہ گئی تھی۔ گوراں کی شادی والی بات۔

کیا بیاہیاں کیا کنواریاں، وہ بوڑھی عورتیں بھی ——— جن کا کام گھروں کے کچے آنگن میں بیٹھ کر سوت کی پونیا اٹیرنا یا اپنی بہوؤں کو کوسنے کے علاوہ دھوپ سینکنا رہ گیا تھا ——— وہ بھی اب صرف گوراں کی شادی کی باتیں کرتیں۔

آنگن آنگن عورتیں یہی کہتی ملتیں "بہنو خدا کی شان ہے۔ کل کا دن تھا جب رمضان علی ڈوبتے سورج کی لالی میں خون بھرا کلہاڑا اٹھائے چودھری عبدالغفور کے باپ طفیل خاں کی تڑپتی لاش کے پاس کھڑے خونِ حسین اور آلِ رسول کی قسمیں کھا کھا کر طفیل خاں کی سات پشتوں کو بکھان رہے تھے اور آج اُن ہی رمضان علی کے پوتے کی شادی طفیل خاں کی پوتی گوراں سے ہو رہی ہے"

ستّو کی بیوہ دودھیا مائی ماتھے پر ہاتھ مار کر کہتی "میری تو آنکھوں دیکھی بات ہے، اُن دنوں فیضاں کے بادا جیتے تھے، میں نے بچپن بھی ڈھنگ سے نہ دیکھا تھا کہ بیاہ کر آگئی تھی۔ پھر بھی آج کی مَری گھڑی چرخ چھوکریوں سے دُگنی تھی ایک رنگ آتا ایک جاتا۔ اُس دِن کروے کا

بھاری بوجھ لئے کھیت سے لوٹ رہی تھی کہ رستا رُکا ہے کے کھیت کی مینڈھ کے پاس سارا ماجرا دیکھ کر دل دہل گیا۔ اندھیرا پھیلنے میں کچھ ہی پل رہے ہوں گے۔ پر میں کم بخت ہول کے مارے ایسی بولائی کہ اِدھر کی رہی نہ اُدھر کی —— اوپر سے گھر پہنچنے کی فکر الگ۔ تم جانوں بوا تو ہماری ساس اُٹھتے بیٹھتے دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو کی دعائیں دیتی تھیں۔ بڑے مزاج کی بہت تیز تھیں۔ گھڑی بھر کی دیر ہوئی نہیں کہ لتّے لے ڈالتیں۔ کبھی کبھی ٹھیک تھیں۔ ایسی کچی عمر میں تہمت لگتے کیا دیر لگتی ہے۔ دُلاری بیگم کی مثال ہی لے لو، مَرے کو بُرا کہئے سو خود بُرا مگر تم جانو منہ پہ آئی بات کہیں رُکے ہے۔ خدا معاف کرے نگوڑے پنڈے پہ پانچ پانچ داغ لے کر مریں۔ اوپر تلے پانچ میاں کھا کر بھی چین نہ آیا تو مرتے مرتے یاسین میاں کو رنڈوا کر گئیں ——

مگر یہ گوراں کی شادی والی خوب رہی۔“ جس رمضان علی نے گوراں کے دادا کو ٹھور کر رکھ دیا اُسی کے پوتے سے چودھری عبدالغفور اپنی بیٹی کا بیاہ رچا رہے ہیں —— میں تو کہتی ہوں کہاں گئی وہ ساری اکڑ، بڑے ماتھے خاں بنتے تھے، کہتے تھے باپ کے قاتل کا بدلہ اُس کے بیٹے نمبردار عبدالرشید سے لوں گا۔“

× × ×

چودھری عبدالغفور کی بیٹی گوراں کی شادی ایک نہ ایک دن کسی سے ہونا ہی تھی —— بیٹی کو تو راجہ نل بھی زندگی بھر گھر پر نہ بٹھا سکے۔ لیکن انوکھی بات یہ تھی کہ اُس کی شادی ارشاد سے ہو رہی تھی۔ ارشاد جو خیرپور تحصیل میں امین تھا اور جس نے اپنے قصبے کے جونیرا سکول سے مڈل کا امتحان پاس کر کے پورے قصبے میں اپنے باپ نمبردار عبدالرشید کی ناک ہاتھ بھر اونچی اور اپنے خاندانی دشمن چودھری عبدالغفور کی ناک ہاتھ بھر نیچی کر دی تھی۔ یوں تو چودھری عبدالغفور کو اپنے دشمن کے بیٹے ارشاد کا تحصیلدار صاحب کے پاس عزت و آبرو کی نوکری کرنا ہی سوہانِ روح تھا کہ دوسرا حادثہ گوراں کی شادی کا ہو گیا۔ وہ جب سنسناتی دوپہر میں رہٹ سے بیلوں کی جوڑی کھول کر شیشم کے سائے میں پڑی کھاٹ پر تھوڑی دیر کمر سیدھی کرنے کے لئے لیٹتے تو اُن کی آنکھوں میں اپنے باپ طفیل خاں کی خون آلود لاش کے ساتھ نمبردار عبدالرشید کی طُرّے دار گلابی پگڑی گھوم جاتی —— چودھری عبدالغفور کی رگوں میں خون کی روانی تیز ہو جاتی۔ ڈھیلے ڈھالے بان کی جھلنگی کھاٹ میں چودھری عبدالغفور کا پورا وجود کسی ذبح کئے ہوئے بکرے کی طرح لرز لرز کر بے جان ہو جاتا اور ان ہی لمحوں میں اُسے اپنے گھر سے بھاگے ہوئے جوان اور آوارہ بیٹے سلیمان کی یاد آتی۔ اُس کی دھندلائی آنکھوں میں لمبے لمبے بازوؤں والا ایک کڑیل جوان اُبھرتا —— وہ سوچتا اگر آج سلیمان ہوتا تو میں اتنا بے بس اور تنہا نہ ہوتا۔

اکثر چوپال میں سرپنچ عنایت اللہ سے وہ یہی بات کہتا۔ ”بھیئے، اگر آج سلیمان ہوتا تو میں نمبردار عبدالرشید سے پوچھتا کہ خیرپور میں کتنے کھونٹ اور کتنے دروتے (دروازے) ہیں۔ ایمان سے رشید کی لاش کھٹ سے دئیں رہ ہیں) گرتی جہاں میرے باپ طفیل خاں کی لاش گری تھی۔ مگر کیا کروں سلیمان میری کمر توڑ گیا۔“

سرپنچ عنایت اللہ ہی نہیں پورے گاؤں کا کہنا تھا کہ گوراں اور ارشاد جرنیل صاحب کے باغ میں روز رات کو چھپ چھپ کر ملتے ہیں اور یہ بات سن کر چودھری عبدالغفور اپنی ٹھکواں بندوق سے نمبردار اور اُس کے بیٹے کا سینہ ضرور پھاڑ دے گا۔

مگر ایسا کچھ نہ ہوا . . .

پہلے تو عبدالغفور کو اس کہانی پر یقین ہی نہ آیا۔ لیکن ایک رات جب چاند آم کی گھنی ڈالیوں کے جھنڈ سے جھانک رہا تھا اور باغ میں آم کے کچے بور کی مہک رچی ہوئی تھی چودھری نے خود اپنی آنکھوں سے گوراں اور ارشاد کو ایک دوسرے کے اتنے قریب دیکھا کہ اس کی آنکھوں سے رمضان علی کی کلہاڑی کا خون ٹپکنے لگا۔ کئی روز تک وہ گھر سے باہر نہ نکلا۔

پھر گاؤں والوں نے وہ سُنا جو اُنہوں نے سوچا بھی نہ تھا۔ نمبردار عبدالرشید سرپنچ عنایت اللہ کو لے کر خود چودھری عبدالغفور کے دروازے پہ گوراں کا ہاتھ مانگنے گیا۔

عبدالغفور پہلے ہی ایک جوان بیٹے سلیمان کی جدائی کا داغ چھاتی پر لئے بیٹھا تھا۔ اب زندگی کے اس آخری ہیرے گوراں کو کیسے گنوا دیتا —— پھر بھی بائیس برس کی دشمنی کو پل بھر ختم کر کے نمبردار عبدالرشید کے گلے لگتے ہوئے اُسے ایسا لگا جیسے وہ اپنے باپ طفیل خاں کے گرم گرم لہو میں پیر جمائے کھڑا ہو۔

دوسرے ہی دن سارے گاؤں نے سُن لیا کہ گوراں اور ارشاد کے پیار نے دو خاندانوں کی دشمنی رشتہ داری میں بدل دی —— دونوں گھروں میں شادی کی تیاریاں ہونے لگیں اور نمبردار عبدالرشید اپنی بہو کے لئے سونے کے جڑاؤ کڑے بنوانے شہر چل دیا۔

× × ×

نمبردار عبدالرشید کوئی پندرہ برس بعد شہر آیا تھا۔

اس دوران، شہر کی عمارتیں کچھ اور اونچی ہو گئی تھیں، یہ الگ بات ہے کہ جیسے عمارتیں بلند ہو رہی تھیں آدمی کا قد گھٹتا جا رہا تھا۔

نمبردار کو گاؤں کی چوپال میں سُنی ہوئی فسانۂ عجائب اور الف لیلیٰ کی کہانیوں کے جادوئی محل یاد آ گئے۔ اُسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس بار وہ ملکہ مہرنگار کے روایتی شہر میں آ گیا ہو۔ آسمان سے باتیں کرتی نئی نئی عمارتوں کی بلندی کو دیکھتا تو اُسے اپنے سر پہ بندھی ہوئی گلابی پگڑی ساتھ چھوٹی نظر آتی۔

خوب نیلے رنگ بھگے کپڑے پہنے مٹکتی ہوئی نوجوان عورتوں کو محویت سے گھورنے لگتا تو پیچھے سے آتی ہوئی کسی موٹر کی پوں پوں اُسے بے خودی کے طلسم سے باہر کھینچ لاتی۔ اُسے لگا جیسے گاؤں میں ہونے والے نما پیر کے میلے میں بیل گاڑیوں کی دوڑ لگ رہی ہو۔ ہر شخص بھاگ رہا تھا۔ شہر کے بس اڈے سے صرافہ دو ڈھائی میل دور تھا۔ وہ کاندھے پر رکھے ہوئے لٹھ کو مضبوطی سے تھام کر پیدل ہی چل پڑا۔

شہر کے پہلے چوراہے پر اُس نے بڑی حیرت سے سفید وردی پہنے ٹریفک کے سپاہی کو دائیں بائیں ہاتھ ہلاتے دیکھا تو اُسے گاؤں کی نوٹنکی میں چوبولے گانے والے بھانڈ یاد آگئے۔ ابھی کچھ دیر تک وہ یہ تماشا اور دیکھتا اگر اُسے دھوپ کے تیز ہونے کے ساتھ شام کو ہی واپسی کی فکر نہ ہوتی۔

چوراہے پار کرکے الااسوڑ کاٹتے ہی نمبردار عبدالرشید کی نظریں سڑک کے ایک طرف پڑی ہوئی کپڑے کی ایک میلی سی پوٹلی پر جم گئیں۔ چند لمحے وہ اس میلی سی پوٹلی کو گھورتا رہا پھر اُس نے لپک کر ہوشیاری سے اٹھالی۔ ابھی وہ چند ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ کسی نے پیچھے سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیا مل گیا پٹھان ہمیں بھی تو دکھا دو۔"

چھینٹے چھینٹے سے کپڑے پہنے ایک نوجوان اُس کے پیچھے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

نمبردار عبدالرشید یوں تو پورے گاؤں میں ہیکڑ اور لٹھ باز مشہور تھا لیکن پردیس میں اُس کی بھی سٹی گم ہو گئی۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس آدمی کو کیا جواب دے کہ اتنے میں سائیکل پر ایک لالہ گھبرایا ہوا پسینے میں شرابور اُن دونوں کے پاس آکر ٹھہر گیا۔ اجنبی کے ساتھ ہی نمبردار کی آنکھیں بھی سوالیہ انداز میں سائیکل سوار کی طرف اُٹھ گئیں۔

"کیا بات ہے لالہ!" اجنبی نوجوان نے پوچھا۔

"کا بتائیں صاحب! ہم لوٹ گئے سویرے سویرے۔ دو ہزار کے سونے کے کڑے، یہ موٹے موٹے ٹکڑے سے پوٹلیا میں باندھ کر دوکان لے جا رہے تھے۔ نہ جانے کہاں سرک گئی راستے میں؟" اتنا کہتے کہتے لالہ رو پڑا۔

"تھانے جاؤ لالہ!" اجنبی نے اُسے مشورہ دیا۔ "ہم نے یہاں کچھ نہیں دیکھا۔"

"جات ہیں بھیا!" لالہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔ "پر اب کوئی آس نہیں!" اور لالہ سائیکل پر سوار ہو کر چل دیا۔

لالہ کے کھسکتے ہی اجنبی نے نمبردار کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا اور بولا، "کیوں پٹھان سارا مال اکیلے ہی پی رہے ہو؟"

نمبردار عبدالرشید کی جان ہی تو نکل گئی۔ پھر بھی سونے کے کڑوں کا تصور کر کے اُس کی آنکھیں کھلنے بند ہونے لگیں۔ پاس ہی کچہری کے سنسان و میدان میں دونوں نے پوٹلی کو کھول کر دیکھا تو خوب چمکدار سونے کے کڑے باریک گلابی رنگ کے پتلی کاغذ کے گھونگھٹ سے جھانک رہے تھے۔

اجنبی نوجوان بڑے ایمانداری سے ایک کڑا لے لیا ــــــ اچانک نمبردار کی آنکھوں میں اپنی ہونے والی بہو گوراں کی گوری کلائیاں گھوم گئیں۔ اُس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"بھیا، یہ دونوں کڑے مجھے دے دو، میں اپنی بہو کے لئے کڑے ہی بنوانے شہر آیا تھا۔"

اجنبی ہنس کر بولا "پٹھان یہ کڑے دو ہزار سے کم نہیں، میرے حصے کے ہزار نکالو تو دونوں کڑے تم لے جاؤ۔"

نمبردار عبدالرشید نے بنڈی کی سیون اُدھیڑ کر خوشی خوشی ہزار روپے نکال کر اجنبی کو تھمائے اور اپنی جان چھڑائی۔ اُس نے سوچا نمبردارنی نے کڑوں کے لئے اُسے بارہ سو دیئے تھے۔ ہزار میں دو ہزار کا مال لے کر بھی اُس کے پاس دو سو روپے بچ گئے تھے۔

× × ×

نمبردار کے شہر سے لوٹنے کے بعد ہی گاؤں کی فضا میں دوسرا شگوفہ پھوٹا۔ نمبردارنی پڑوس کی ایک ایک عورت کو اپنی بہو گوراں کے لئے شہر سے بن کر آئے سونے کے کڑے دکھاتی پھری۔ پڑوس کے خاں صاحب کی جوان بیٹی زوراں نے بڑی حسرت سے کڑوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "اے چچی، کیسے اچھے ہیں، خوب موٹے، ایک دم کندنی۔"

نمبردارنی نے فخر سے گردن اونچی کرکے کہا "اور کیا، اصل سونے کے ہیں، شہر سے بن کر آئے ہیں!"

نکّا بنجارے کی بڑی بہو سلامتی نے زوراں کے ہاتھ سے کڑے لپکتے ہوئے کہا، "ہائے کیسے چم چم کر رہے ہیں!"

نمبردارنی نے فوراً سلامتی کے ہاتھ سے کڑے چھینتے ہوئے کہا، "چل مُردار، ایسے نہ چھو، چمک ماری جائے گی۔"

سلامتی کھسیانی ہو کر بولی، "اے ہے آپا، کون سے پیتل کے ہیں جو چمک ماری جائے گی!"

نمبردارنی کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ تڑاخ سے بولیں "تیرے منہ میں خاک، پیتل کے ہوں تیرے سگوں کے۔"

غرض گئی رات تک محلے میں کڑوں کی نمائش ہوتی رہی۔ جب نمبردارنی گھر لوٹی تو عبدالرشید بے خبر سو رہا تھا اور ارشاد اپنے پلنگ سے غائب تھا۔ نمبردارنی بھی چٹائی پر لیٹتی ہوئی بڑبڑائی۔

'چار دن شادی میں رہ گئے۔ پھر بھی صبر نہیں۔ حرامزادہ...!'

× × ×

آج گوراں کا بیاہ تھا۔

کچے کوٹھے کے ایک کونے میں اُبٹنے کی مہکی ہوئی خوشبو میں گوراں کے شہابی رخساروں پر کنیر کے سرخ پھولوں کی لالی بکھری ہوئی تھی۔

وہ بہت خوش تھی۔ آج ارشاد ہمیشہ کے لئے اُس کا ہونے والا تھا۔ ساتھ ہی اُس کا برسوں پہلے گھر سے بھاگا ہوا بھائی سلیمان اچانک لوٹ آیا تھا۔

اپنے بھائی سلیمان کی چوڑی چھاتی پر سر ٹیک کر جب وہ رونے لگی تھی تو اس نے کہا تھا "باؤلی روتی کیوں ہے۔ اب تو میں آگیا ہوں۔ دیکھ تیری شادی میں ایسا تحفہ دوں گا کہ سارے گاؤں کی آنکھیں پھٹی رہ جائیں گی۔"

اچانک آنگن میں بجتی ڈھولک کی تھاپ اور کنواریوں کے گیت رُک گئے۔ باہر سے کسی نے چیخ کر کہا، "نمبردار عبدالرشید شادی کا جوڑا لائے ہیں۔"

سلیمان سیدھا باہر کی طرف بھاگا۔ لیکن نمبردار عبدالرشید کے ہاتھوں چاندی کا جڑا تھال لیتے وقت اُس کے ہاتھ کانپ گئے۔

سلیمان پر نظر پڑتے ہی نمبردار کی پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئیں۔ بھویں تن گئیں، اور لاٹھی پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ اتنے میں چودھری عبدالغفور نے پیچھے سے پکارا "کیوں نمبردار پہچانا نہیں، ارے یہ اپنا سلیمان ہے۔ میرا بیٹا۔"

لاٹھی پر نمبردار کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

سلیمان شادی کے جوڑے اور زیوروں کا تھال لئے کر سیدھا اپنی کوٹھری میں گھس گیا۔ اندر سے دروازے بند کر کے وہ زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ اس کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اُسے اپنی اور نمبردار عبدالرشید کی وہ ملاقات یاد آگئی جو ایک ہفتے پہلے شہر میں ہوئی تھی۔

سلیمان نے شادی کے لال جوڑے کے ساتھ گلابی کاغذ میں لپٹے ہوئے پیتل کے اُن کڑوں کی طرف دیکھا جن پر سونے کا پانی پھرا تھا اور جو اُس نے نمبردار کے سر تھوپے تھے۔ اُسے کیا خبر تھی کہ یہ پیتل کے کڑے اسی کی بہن کو جہیز میں آنے والے تھے۔ اُسے ایسا لگا جیسے شادی کے اطلسی جوڑے کے ساتھ کڑوں کی طرح یہ سہاگ پڑا اور مہندی سب ہی جھوٹے تھے۔

کچھ دیر سوچ کر اس نے اپنی بہن کے بکس سے سونے کے وہ کڑے نکالے جو وہ اپنی بہن گوراں کے لئے بنوا کر لایا تھا۔ نقلی کڑے اٹھا کر وہ کڑے سلیمان نے جوڑے کے ساتھ رکھ دیئے

رخصتی کے دوسرے دن جب سلیمان اپنی بہن گوراں کو میکے لانے کے لئے نمبردار کے گھر پہنچا تو گوراں رسم کے مطابق میکے جانے سے پہلے اپنے سسر کو سلام کرنے کے لئے چودرے چلی گئی۔

جوانی کی آنچ اور دلہناپے کی شیرینی کو گوراں کے گالوں پر کھلتے دیکھ کر نمبردار کا جی خوش ہو گیا۔ بہو کو اکیس روپے شگون کے دے کر جب نمبردار کی نظر گوراں کے ہاتھوں پر پڑی تو وہ چونک گیا۔ ایک لمحے کے لئے اُس کی نظر گوراں کے پیچھے کھڑے سلیمان پر جا کر رُکی۔ یہ کڑے بالکل ویسے ہی تھے ——— اُجلے چمکدار اور جڑاؤ جن کا فرق سلیمان اور نمبردار کے سوا کسی کو معلوم نہ تھا۔

سلیمان کے چہرے پر کچھ ایسی شریر مسکراہٹ تھی جیسے اُس نے اپنے دادا طفیل خاں کا بدلہ نمبردار عبدالرشید کو سونے کے کلہاڑے سے قتل کر کے لے لیا ہو۔ ●●

بقیہ "ڈاکٹر تاراچند۔ مورخ تاریخ آزادی"

حکمراں طبقے نے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا اور اپنے اثرات سے اختلافات کو اور ہوا دی۔ وہ طاقت کے مالک تھے اور ڈرتے تھے کہ کہیں یہ سلطنت ہاتھ سے نہ چھن جائے۔ لہٰذا وہ ہرگز یہ باور کرنے کو تیار نہیں تھے کہ ہندوستانیوں میں وہ اتحاد اور استعداد موجود ہے جس سے کہ وہ اپنے ملک کو متحد رکھ سکتے ہیں اور اس کا انتظام بخوبی چلا سکتے ہیں۔

چنانچہ خودمختاری کا سوال اس پُرخطر امکان پر چھوڑ دیا گیا کہ جب دو مخالف پارٹیاں اپنے اختلافات دور کر سکیں گی تو وہ اپنی قسمت کا فیصلہ کر لیں گی۔ بدیسی حکومت نے دونوں فرقوں میں پھوٹ ڈالنے کا کام اس خوبی سے کیا تھا کہ اُن کا ایک بڑا حصہ اپنے کو دو مختلف قومیں سمجھنے لگا۔ لیکن دوسری جنگِ عظیم بیچ میں آگئی اور اس کے باعث برطانوی سلطنت کا زوال شروع ہوا۔ برطانیہ کی اوّلیت چھن گئی اور اس کی جگہ دو عظیم قوتوں امریکہ اور روس نے لے لی۔ برطانیہ کو مجبوراً اپنے سامراجی مقبوضات سے پیچھے ہٹنا پڑا تاکہ وہ اپنی برباد شدہ گھریلو اقتصادیات کو سدھار سکے۔

لیکن ہند کو چھوڑنے سے پہلے برطانیہ نے آخری قدم یہ اٹھایا کہ اس نے مسلم لیگ کی علیحدگی کی مانگ کو منظور کر لیا اور ملک کو دو ملکوں یعنی ہندوستان اور پاکستان میں تقسیم کر دیا۔ برطانیہ اپنی سلطنت تو قائم نہ رکھ سکا لیکن اس نے جاتے جاتے ملک پر یہ نظریہ مسلط کر دیا کہ اس کے عوام مختلف قوموں سے تعلق رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر تاراچند کی تاریخ برطانیہ اور ہند کے نظریات کے تصادم کو پیش کرتی ہے جس میں برطانیہ کا نظریہ یہ تھا کہ ہند میں اتحاد کا فقدان ہے اور ہند کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ متحد ہے اور اسے خود ارادیت کا حق ملنا چاہیئے۔

(انگریزی سے ترجمہ)

غزل

رتن پنڈوری
سری ہرگوبند پور ضلع گورداسپور (پنجاب)

آگئی آہِ شرربار زباں تک آخر
آگ کے نیچے دھواں رہتا کہاں تک آخر

توبہ کر کے نہ رہا دل میں وقارِ توبہ
فصلِ گل لائی در بیرِ مغاں تک آخر

اُف یہ تاکیدِ خموشی کا نرالا انداز
کاٹ کر رکھ دی ستم گر نے زباں تک آخر

اپنی صورت میں نظر آتی ہے اُنکی صورت
بات پہنچی ہے محبت کی یہاں تک آخر

پرسشِ غم ہے نہ اربابِ وفا کی توقیر
محسنِ خوددار! یہ انداز کہاں تک آخر!

نہ چھپا رازِ محبت کسی عنواں نہ چھپا
آگیا نام ترا میری زباں تک آخر

اب نہ وہ رنگِ سخن ہے نہ وہ اسلوبِ سخن
بدلا فن کار کا اندازِ بیاں تک آخر

اے رتن چھوٹ گیا دامنِ تسلیم رضا
بات آہی گئی فریاد و فغاں تک آخر

غزل

عرش صہبائی
۲۴۵ صہبائی اسٹریٹ، پکی چھاؤنی جموں

یہ چاہتا ہے کہ اس دور میں کروں تنقید
وہ شخص قبر میں زندہ اُتارتا ہے مجھے

قدم جو رکھتا ہوں میں مصلحت کی وادی میں
مرا ضمیر برابر پکارتا ہے مجھے

بکھیر دے گی مجھے کل ہوا زمانے کی
تو آج کس لئے اتنا سنوارتا ہے مجھے

جنم جنم سے میں جس کے لئے بھٹکتا ہوں
کوئی تو ہے جو مسلسل پکارتا ہے مجھے

یہ دیکھنا ہے کہ تدبیر کے بغیر اے عرش
مرا نصیب کہاں تک سنوارتا ہے مجھے

غزل

مہدی پرتاب گڑھی
معرفت ایگزیکیٹو انجینیر، اریگیشن ڈویژن، پرتاب گڑھ

سرحدِ ہوش سے گذرا کئے طوفاں کتنے
ہم رہے جلوہ گہِ حسن میں حیراں کتنے

دَردِ تر سی ہوئی کلیوں کا کئی زخموں کے پھول
دے کے انعام گئی فصلِ بہاراں کتنے

یوں ہی بدنام نہیں آبلہ پائی میری
میری وحشت نے کھنگالے ہیں بیاباں کتنے

کتنے لفظوں کے شگوفوں کو کھلاتی گذری
میری تخئیل سجاتی ہے خیاباں کتنے

ہوش میں رہ کے بھی کہلاتے ہیں ہم دیوانے
فصلِ گل کر کے گئی چاک گریباں کتنے

دہکا ہے حسرتِ تعمیر کے سوزِ غم لئے
سینہ و دل میں مرے دفن ہیں ارماں کتنے

سانپ تنہائی کا ہر لمحہ ڈسے جاتا ہے
دامنِ شب میں ہیں بربادی کے ساماں کتنے

ہم تھے دیوانے الم خانۂ غم سے نہ اُٹھے
لائی پیغامِ خرد صبحِ درخشاں کتنے

جل گئی ہیں یہاں لفظوں کی رِدائیں مہدی
زخم کی طرح ملے پھولوں کے داماں کتنے

غزل

خلیل بسابی کولاری رائے میسور

بزمِ فطرت کس قدر پُرجوش ہے
ہوش والا بھی یہاں بے ہوش ہے

جتنا میرا دل ندامت کوش ہے
اتنا حق کی رحمتوں میں جوش ہے

کون سنتا ہے مری فریاد کو
ہر طرف اک شورِ نائے و نوش ہے

کر سبک تو اپنی رفتارِ حیات
زندگی ورنہ وبالِ دوش ہے

میرے جلووں کی تجلی سے خلیل
جلوہ گاہِ طور بھی بے ہوش ہے

غزل

برلاج حیرت
۲/۱۲ بھولا ناتھ نگر۔ شاہدرہ۔ دہلی

اربابِ ذی شعور کا ایسا خیال ہے
غم پائیدار ہے نہ جنوں لازوال ہے

آئینہ ساز اس میں تری مصلحت ہے کیا
جس کو بھی دیکھئے اسی شیشے میں بال ہے

کچھ منزلیں ہیں جن کا نہ ملنا ہے خوب تر
کچھ راستے ہیں جن میں بھٹکنا کمال ہے

آ انتظارِ دوست یہاں سے نکل چلیں
یہ شہرِ آرزو نہیں، شہرِ خیال ہے

کیا کیا حسیں جواز تراشے ہیں زیست نے
کم بخت لیکن اب بھی سراپا سوال ہے

حیرت ہیں تو ہیں وہ پراگندہ طبع لوگ
جن کے لئے شعور و بصیرت وبال ہے

غزل

مانوس سہسرامی
معرفت پاپولر طلاح کمپنی۔ گاندھی کا تیم۔ سہسرام۔

غزلوں میں کیا ہم نے اظہارِ الم برسوں
تحریر کے پردے میں رویا ہے قلم برسوں

اک پھول کی خوشبو تک یہ بات رہی شاید
مہکنے نہ دیا جس نے گلشن کا بھرم برسوں

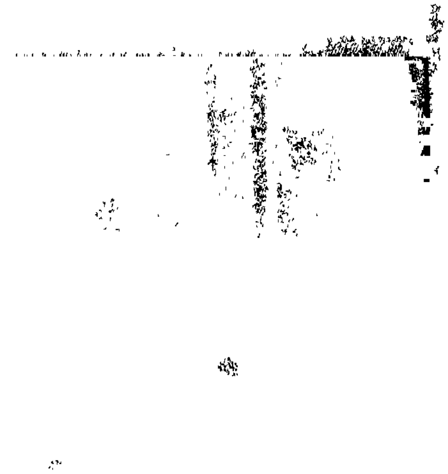
امید شکن کیا کیا امید کی منزل تھی
چھلکا کیا رہ رہ کے پیمانۂ غم برسوں

یہ ظرف تھا دل ہی کا کس طرح سہا دل نے
پھولوں کا پھولوں کا، کانٹوں کا ستم برسوں

اُس راہ میں پھر دل نے سنتے ہیں اذاں دی ہے
جس راہ میں حائل تھے پتھر کے صنم برسوں

کیا عکس نئے غم کا الجھن کا سبب بنتا
اس درجہ مکدر تھا آئینۂ غم برسوں

مانوس تسلی کیا اک جینے کی صورت تھی
آوارۂ محبت میں پھرتے رہے ہم برسوں



(۱)



(۲)



(۳)

(۱) ڈاکٹر سید محمود کے ساتھ شہزادہ ایران کا تعارف کراتے ہوئے

(۲) ڈاکٹر تاراچند بمعہ اپنے اہل وعیال

(۳) اپنی اہلیہ اور صاحبزادی کے ساتھ

(۴) ایران کے سابق وزیراعظم ڈاکٹر مصدق کے ساتھ

(۵) اپنی بیٹی کے ساتھ

(۴)



(۵)



سابق صدر ڈاکٹر رادھا کرشنن اور ڈاکٹر تارا چند



پنڈت گووند ولبھ پنت اور ڈاکٹر تارا چند

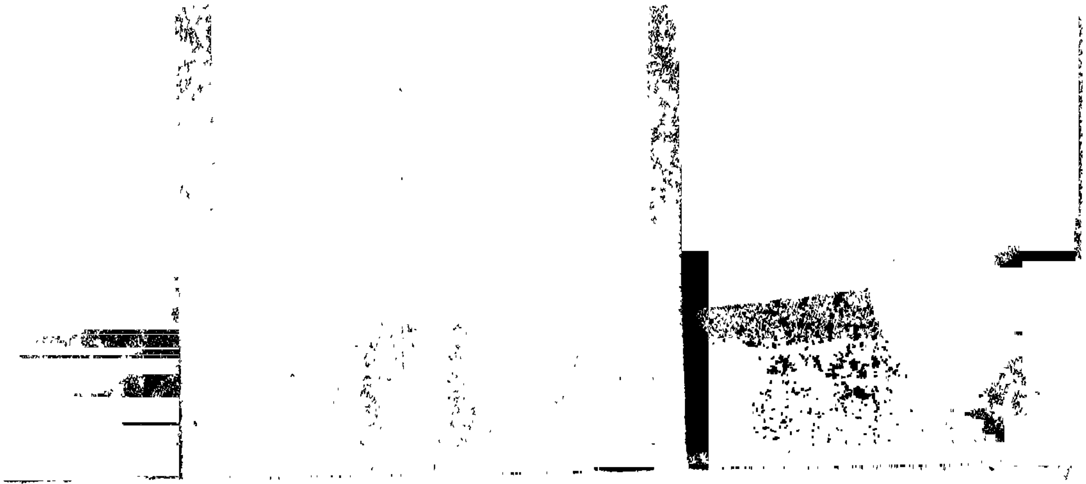
صدر جمہوریہ [illegible] وی وی گری ڈاکٹر تارا چند کو پدم وبھوشن کا اعزاز عطا کر رہے ہیں



جواہر لال نہرو کے ساتھ







ڈاکٹر بھابھا　　　ڈاکٹر سارابھائی　　　ڈاکٹر سیٹھنا

ہند کے ان تین شہرۂ آفاق سائنس دانوں اور ان کے رفقاءِ کار کی مساعیٔ جمیلہ، عزم اور سچی لگن ہی کا نتیجہ ہے کہ آج ہندوستان پر امن مقاصد کے لئے زیرِ زمین تجربہ کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔

بنگلا دیش کے وزیرِ اعظم شیخ مجیب الرحمٰن حال ہی میں سرکاری دورے پر ہند تشریف لائے تھے۔ نئی دہلی میں انہوں نے وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے ساتھ کئی اہم اور دور رس نتائج کے حامل معاہدوں پر دستخط کئے جن سے دونوں ممالک کے عوام مستفید



اردو کا مقبولِ عام مصور ماہنامہ

آجکل
نئی دہلی

ایڈیٹر
رام شرن چوپڑہ

ٹیلیفون نمبر:- ۳۸۷۰۶۹

سب ایڈیٹر
نند کشور وکرم

جلد (۳۲) شمارہ (۱۲)
جولائی ۱۹۷۴ء
اساڑھ - شراون سمت ۱۸۹۶

شرحِ چندہ

سالانہ	دس روپے	۱ پونڈ	۳ ڈالر
دو سالہ	۱۷ روپے	۱.۷۰ پونڈ	۵ ڈالر
سہ سالہ	۲۴ روپے	۲.۴۰ پونڈ	۷ ڈالر
فی پرچہ	ایک روپیہ	۱۰ پینی	۳۰ سینٹ

ترتیب

سرورق و عکس: آر۔ سارنگن
تصاویر: گورچرن اروڑہ

شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیلِ زر کا پتہ
بزنس منیجر پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر آجکل (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

ہند کا کامیاب ایٹمی تجربہ

ہند کے سائنس دانوں نے کسی بیرونی امداد کے بغیر زیرِ زمین کامیاب ایٹمی تجربہ کر کے نہ صرف ایک اہم اور عظیم کارنامہ انجام دیا ہے بلکہ دنیا بھر پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ سائنسی علم و تحقیق کے میدان میں ہندوستان ترقی یافتہ ملکوں سے پیچھے نہیں۔ مہلک ایٹمی ہتھیار رکھنے والے ممالک ــــ امریکہ، روس، چین، فرانس اور برطانیہ نے جو ایٹمی تجربات اور دھماکے کئے تھے وہ اول فضا ہی میں کئے گئے تھے کیونکہ ان سے مقصود ایٹمی ہتھیاروں کی ہلاکت آفریں قوت کا اندازہ لگانا [illegible] ہندوستان ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے اپنا پہلا [illegible] کیا [illegible] پُرامن مقاصد کے لئے۔

ہندوستان [illegible] وزرائے اعظم بار بار اعلان کر چکے ہیں کہ ہند ایٹمی توانائی کو فقط پُرامن مقصدوں کے لئے بروئے کار لائے گا۔ سیاسی اور عوامی دباؤ کے باوجود ہند اپنے اس موقف پر سختی سے قائم رہا ہے۔ وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ہمارے کامیاب تجربے کے بعد پھر کہا کہ یہ تو ہماری تحقیق اور مطالعہ کا ایک جزو ہے اور ہم ایٹمی توانائی کے پُرامن استعمال کے اپنے عزم پر اب بھی قائم ہیں۔

وزیرِ خارجہ سردار سورن سنگھ نے بھی کہا ہے کہ اس تجربے سے کسی کو ڈرنے یا گھبرانے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی ہندوستان بالادستی کا خواہاں ہے۔ زیرِ زمین تجربہ کر کے کسی بین الاقوامی معاہدے کی خلاف ورزی نہیں کی گئی ہے۔

ایٹمی توانائی کمیشن کے صدر ڈاکٹر سیٹھنا نے جنہوں نے اس کامیابی کی اطلاع اخبار نویسوں کو دی بتایا کہ اس تجربے سے ہمارا مقصد یہ دیکھنا ہے کہ اس کو ترقیاتی کاموں کے لئے کیسے استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔

ہند نے ایٹمی توانائی کو ابھی تک بجلی تیار کرنے اور زرعی و صنعتی تحقیق کے لئے استعمال کیا ہے۔ زیرِ زمین تجربے سے ترقی کے وسیع امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔ کانوں کی کھدائی، باندھوں [illegible] کی تعمیر اور پہاڑوں کو کاٹ کر راستہ بنانے کے کام میں اب اس تکنیک کو استعمال کیا جا سکے گا۔ ہندوستان کے لئے جس کے توانائی کے وسائل محدود ہیں، ایٹمی توانائی [illegible] کے لئے استعمال کرنے کی ضرورت ان ملکوں سے کہیں زیادہ [illegible] صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ ہیں۔

ہندوستان میں نیوکلیائی پروگرام کی شروعات آزادی کے ساتھ ہی ہوئی۔ اسی وقت وزیرِ اعظم جواہر لال نہرو نے ایٹمی توانائی کا ایک شعبہ قائم کیا [illegible] میں ایٹمی توانائی کمیشن میں بدل دیا گیا۔ اس کمیشن کے ذمے ایٹمی توانائی کے پُرامن استعمال کی تلاش و تحقیق کا کام سونپا گیا۔ ڈاکٹر ہومی بھابھا اس پروگرام کے بانی اور روحِ رواں تھے۔ یہ انہی کی انتھک مساعی جمیلہ کا نتیجہ تھا کہ ملک میں نہ صرف ایٹمی بھٹیاں اور ایٹمی بجلی گھر تعمیر کئے گئے بلکہ ہند ضروری ایٹمی سامانیات اور آلات اور مشینوں کے معاملے میں خود کفیل ہو گیا۔

حالیہ کامیاب تجربہ ڈاکٹر ہومی بھابھا کی دور اندیشی اور ہندوستانی سائنس دانوں کے جن کے سربراہ ڈاکٹر سیٹھنا ہیں اعلیٰ علم و کمال اور جذبۂ تحقیق و تجسس کا مرہونِ منت ہے اور ہم اس پر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔

ہند بنگلہ دیش مفاہمت

بنگلہ دیش کے وزیرِ اعظم شیخ مجیب الرحمٰن مئی کے وسط میں پانچ روزہ سرکاری دورے پر نئی دلی تشریف لائے اور وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی اور دیگر رہنماؤں کے ساتھ نہایت سود مند تبادلۂ خیالات کیا۔ ان کے مذاکرات کا خوشگوار نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں ممالک کے درمیان تعاون و اشتراک کو بڑھانے کے لئے دور رس اقدام کے سلسلے میں ٹھوس اور مثبت فیصلے کئے گئے۔ طویل المیعاد معاشی معاہدوں کے تحت ایک ملک سے دوسرے ملک کو خام مال اور تیار شدہ سامان ملنے کی بنیاد پر چار کارخانے قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ان میں سیمنٹ کیمیاوی کھاد اور اسپنج لوہے کے کارخانے شامل ہیں جو ہندوستان کی فنی اور مالی امداد کے ساتھ بنگلہ دیش میں تعمیر کئے جائیں گے۔ انہی کے تحت کلکتے سے بنگلہ دیش سے گزرتا ہوا ریل کا ایک سیدھا سلسلہ اگرتلہ تک قائم کرنا بھی مقصود ہے۔ اس سے ہند کے دو خطوں کے درمیان مسافت کم ہو جائے گی اور دونوں ملکوں کے درمیان تجارت کی آسانیاں بڑھ جائیں گی۔ چونکہ دونوں ممالک دنیا میں پٹ سن کی کل پیداوار کا اسّی فیصد حصہ اپنے ہاں پیدا کرتے ہیں اس لئے یہ زرِ مبادلہ کمانے کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔ معاہدے کی رو سے پٹ سن کا ایک مشترکہ کمیشن مقرر کیا جا رہا ہے تاکہ پٹ سن کی برآمدی قیمت مشترکہ طور پر مقرر کرے جس سے مناسب آمدنی ہو [illegible] جائے جو دونوں ملکوں کے لئے فائدہ مند ہوگی۔ سرحد پر سے چوری چھپے مال لانے لے جانے کے انسداد کے لئے ٹھوس [illegible]

اختیار کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

صنعتی، معاشی اور تجارتی معاہدوں کے علاوہ دونوں ملکوں نے سرحدوں کی حد بندی اور محصورہ علاقوں کی ادلا بدلی کے سلسلے میں بھی اہم فیصلے کئے ہیں جو گزشتہ بیس پچیس برس سے تصفیہ طلب تھے۔ آبی وسائل کے مسئلے کو اس جذبے سے سلجھانے کی سعی کی گئی ہے کہ کسی بھی ملک کے مفادات کو ضرب نہ لگے۔ دونوں وزرائے اعظم نے فیصلہ کیا ہے کہ آبی وسیلوں سے بہتر طریقے پر فائدہ اٹھانے کی تجاویز پر مشترکہ دریائی کمیشن غور کرے گا اور دونوں ممالک کی ضروریات کی تکمیل کے لئے مناسب و موزوں سفارشات پیش کرے گا۔

شیخ صاحب کے دورے کے اختتام پر جاری کردہ دونوں وزرائے اعظم کے مشترکہ اعلانیہ میں یہ عہد کیا گیا ہے کہ وہ قیامِ امن، حالات کو معمول پر لانے اور ایک دوسرے کے اشتراک و تعاون کے لئے اپنی مساعی جاری رکھیں گے۔ انہوں نے امید ظاہر کی ہے کہ اس سلسلے میں پاکستان بھی مثبت رویہ اختیار کرے گا تاکہ برصغیر کے ان ممالک میں دوستانہ روابط قائم ہو جائیں۔ یہ نہ صرف ہندوستان اور بنگلہ دیش ہی کے لئے بلکہ پورے برصغیر کے امن کے لئے ضروری اور اہم ہے۔

ہند اور بنگلہ دیش کے معاہدے اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ اگر خیر سگالی، فراخ دلی اور رواداری کے جذبے سے کام لیا جائے تو ہر مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے۔ شیخ مجیب الرحمٰن کا حالیہ دورہ دونوں ملکوں کے آپسی تعلقات کو مزید مضبوط اور خوشگوار بنانے کے سلسلے میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

بزرگ صحافی کا انتقالِ پُر ملال

بزرگ اور نامور صحافی شری درگا داس کے انتقال سے میدانِ صحافت میں جو خلا پیدا ہوا ہے اُسے پُر کرنا آسان نہ ہوگا۔

موصوف ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا اور اسٹیٹسمین کے خاص نامہ نگار اور بعد میں ہندوستان ٹائمز کے چیف ایڈیٹر رہے۔ ریٹائر ہونے پر انڈیا انٹرنیشنل فیچر الائنس کے نام سے ایک نیوز ایجنسی قائم کی۔ انکی کتاب "ہندوستان۔ کرزن سے نہرو تک" بڑی مقبول ہوئی۔ انہوں نے سردار پٹیل کی خط و کتابت کی دس جلدیں بھی مرتب کیں۔ انہوں نے میدانِ صحافت میں اعلیٰ کارکردگی اور اسکی ترقی کے لئے درگا رتن ایوارڈ بھی قائم کیا۔ شری درگا داس واقعی صحافیوں کے سالارِ کارواں کہلانے کے مستحق تھے۔

سلطان اختر
فلیٹ نمبر ۲۸، روڈ نمبر ۳ - راج بنسی نگر، پٹنہ

غزل

ڈوبتی ساعتوں کی طرح ایک دن سب کی آنکھوں سے روپوش ہو جائے گی
بے بسی کی کڑی دھوپ ڈھلنے تلک زندگی گرم پتھر پہ سو جائے گی

اس سفر کے سمندر میں چاروں طرف سہمی سہمی صداؤں کی دیوار ہے
وقت کی موج سے بچ گئے بھی اگر خوف کی لہر ہم کو ڈبو جائے گی

جستجو کی گھنی شام رخصت ہوئی فاصلوں کے اندھیرے سرکنے لگے
آنکھ کھلنے سے پہلے ہی یہ رات بھی روشنی کے تعاقب میں کھو جائے گی

بیٹھ کر جسم و جاں کی تھکن جھاڑ لو نیند آئے تو آنکھیں کھلی ہی رکھو
ورنہ یادوں کے جنگل کی ٹھنڈی ہوا نرم پلکوں میں سوئی چبھو جائے گی

قربتوں کی دہکتی ہوئی دوپہر لذتوں کے پگھلتے ہوئے بام و در
دیکھتے دیکھتے چند لمحوں میں اس خواہشوں کی چتا سرد ہو جائے گی

خواب کے نیلگوں پیرہن پھٹ گئے عکس جتنے تھے سب ریزے ریزے ہو گئے
کیا خبر تھی کہ یوں صبح کی جل پری نیند کا آئینہ آکے دھو جائے گی

کچھ دنوں تشنگی کی سزا کاٹیے یوں ہی چاروں دشاؤں کے لب چاٹیے
پانچویں سمت سے آنے والی گھٹا ریت کی خشک چادر بھگو جائے گی

قرۃ العین حیدر
آشا محل عظمت روڈ سنگھاڈیا روڈ بمبئی ۲۶

کارِ جہاں دراز ہے

فصل سوم۔ باب ۷

افغان باقی کہسار باقی

جنوری ۱۹۰۸ء میں سجاد حیدر یلدرم نے امیر یعقوب خاں سابق شاہ افغانستان کے اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ کی حیثیت سے دہرہ دون میں نجف علی خاں سے اپنے عہدے کا چارج لیا۔ پولیٹیکل ایجنٹ انگریز تھا۔ اس کا تعلق براہِ راست برٹش فارن آفس سے تھا۔

تیسری اینگلو افغان جنگ اور امیر یعقوب خان کی معزولی یلدرم کی پیدائش سے پہلے کے واقعات تھے[1] مگر آج ۲۸ سالہ سجاد حیدر ان بوڑھے قیدیوں کے انچارج بناکر دہرہ دون بھیجے گئے تھے۔ سلطانیہ کا اقبال عجیب و غریب کرشمے دکھا رہا تھا۔

موسم گرما میں وہ قیدی فرزندِ کوہستان چند ماہ کے لئے مع اہل و عیال دہرہ دون سے مسوری منتقل کر دیا جاتا۔

مسوری میں اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ کی سرکاری کوٹھی کا نام (Bellevue) تھا جو ایک آدھا ادیب مسوری آتا وہ اس کا اڈہ بن گئی۔ نیاز فتحپوری بھی بہ سلسلۂ ملازمت مسوری میں مقیم تھے۔ اتوار کا دن اکثر یلدرم کے ہاں گزارتے۔ چند روز کے لئے قاری سرفراز حسین دہلوی آئے اور اس صحبت میں شریک رہے۔ نیاز صاحب فرماتے ہیں "میرے مخصوص ادبی ذوق کو ابھارنے میں یلدرم کا بڑا ہاتھ تھا۔ رومانی افسانہ نگاری میں ان کی حیثیت یقیناً ایک موجد کی سی ہے اور میری مقلد کی سی۔ سلطان حیدر جوش[2] کا مقصد کچھ رہا ہو لیکن تھے وہ یلدرم کے مقلد۔ میں مسوری ہی میں تھا کہ جوش کا ایک افسانہ مخزن میں شائع ہوا۔ جب یلدرم سے اس کا ذکر آیا تو وہ صرف یہ فقرہ کہہ کر خاموش ہو گئے

Imitation is the [illegible] of flattery

یلدرم کا دفتر اُن کی کوٹھی میں تھا۔ شام شاہی قیدیوں کے ساتھ گزارتے۔ کام وام کرنے کو کچھ خاص تھا نہیں۔ سابق امیر، شہزادوں اور سرداروں کے ساتھ فرفر فارسی بولا کرتے۔ شعر و شاعری پر گفتگو رہتی جس نے بیشتر اسلامی سلطنتوں کو اکھاڑا۔

بغداد کے جاندار انقلابی ماحول کے بعد یہ عجیب غیر حقیقی سا وقت تھا۔ امیرِ کابل کی کوٹھی کے نیچے کہر نیلے پہاڑوں پر پھیل جاتا۔ شہر کے بل کھاتے ہوئے راستوں پر گیس کی روشنیاں ٹمٹماتیں۔ بارش ہوتی تو لالٹین کے شیشے دھندلا جاتے۔ آتشدان میں آگ کی روشنی زیادہ تیز معلوم ہونے لگتی، نفیس قالینوں اور دبیز مخملیں پردوں سے آراستہ کوٹھی میں نظر بند شاہی قیدیوں کے لئے ہر موسم یکساں تھا۔ دوست محمد خاں کا پوتا بوڑھا یعقوب خاں مسند پر نیم دراز اکثر دن بھر چپ چاپ دیوانِ حافظ پڑھا کرتا۔

سہ پہر کو اندھیرا پڑے اکثر نوجوان اسسٹنٹ پولیٹیکل افسر تیز تیز ہلکے پھلکے قدموں سے زینہ چڑھتا اوپر آتا۔ علیک سلیک ہوتی سارے ادب کے ہندی نوجوان بزرگ امیرِ کابل کے سامنے سگریٹ نہ پیتا، امیر کا قلیان تازہ کیا جاتا۔ خشک میوے اور تازہ پھلوں کے طشت کشمیری تپائیوں پر رکھے ہوتے۔ نقرئی سماوار آتشدان کے شعلوں کی روشنی میں جھلملاتا۔ بغیر دودھ کی چائے اور قہوے کے فنجانوں کا دور چلتا۔

ایک سردار سابق امیر کے سامنے شطرنج کی بساط پھیلاتا۔ ہاتھی دانت کے صندوقچے میں سے مہرے نکالے جاتے۔ یعقوب خاں اور یلدرم اپنی اپنی چال سوچنا شروع کر دیتے۔ اکثر سوچتے سوچتے بوڑھا بادشاہ عقابی نظروں سے دریچے سے باہر دیکھتا۔ جاں لکھ پہاڑ تھے۔ ان پہاڑوں کے آخری سلسلے کے اُس پار مغرب میں افغانستان تھا۔ پختونوں کا دیس۔ خوشحال خاں کے اشعار اس وقت کتنے صحیح معلوم

---

[1] نجف علی خاں نواب پاٹودی کے جدِ امجد تھے۔ ان کی نواسی ہمدم اور ان کے سجاد حیدر عصمت کی مضمون نگاری میں سکینہ بیگم صاحبہ پاکستان فارن سروس کے ریٹائرڈ ایمبیسیڈر ہیں۔ کچھ عرصہ نئی دہلی میں پاکستان کے ہائی کمشنر رہ چکے ہیں۔ ۲۰ نومبر ۱۸۷۸ء میں برطانیہ نے افغانستان پر حملہ کیا۔ امیر شیر علی کابل سے فرار ہوئے چند ماہ بعد المناک حالات میں وفات پائی۔ ان کے فرزند اور جانشین امیر یعقوب خاں کو روس کی خیبر وادی کرم پشین سبی اور بہت سا قبائلی علاقہ برطانیہ کے حوالے کرنا پڑا۔ افغان امورِ خارجہ بھی برطانیہ کے سپرد کئے گئے۔ ستمبر ۱۸۷۹ء میں کابل کے عوام اور فوجیوں نے ریزیڈنسی پر حملہ کر کے برطانوی ریذیڈنٹ کو قتل کیا۔ ۱۲ اکتوبر کو جنرل رابرٹس نے کابل پر قبضہ کر لیا۔ امیر یعقوب خاں تخت و تاج سے دستبردار ہوئے۔ معہ خاندان برٹش انڈیا جلا وطن کئے گئے۔ دہرہ دون اور مسوری میں نظر بند رہے۔

[2] سلطان حیدر جوش کا یلدرم سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔

ہوتے تھے۔ جلاوطنی کا اتنا بڑا ناقابلِ عبور فاصلہ کوئی بادِ صبا، کوئی سحاب رواں وہاں سے کرینک یادوں کے علاوہ کوئی پیغام نہیں لا سکتے۔

جلال آباد، کابل، قندھار، اپنا وطن، دادا کا قلعہ۔ وہ ضیغم صفت دادا جس نے انگریزوں کو ناکوں چنے چبوا دیئے تھے۔

وہ نیم تاریک ایوان۔ روشن صحن۔ مٹی کی فصلیں۔ سکھ اور برطانوی جنگوں کی یادگار ڈھالیں۔ زنگ خوردہ توپیں۔ ناکامی۔ مایوسی، شکست چنار کے درختوں سے گھرے ان آبائی قلعوں کے نزدیک اب برطانوی فوجی بیس جگمگا رہے تھے۔ ۱۸۸۰ء آج کی بات معلوم ہوتی ہے۔ وہ سارا لرزہ خیز المیہ اکثر رات کو خواب میں دہرایا جاتا ہے۔ جنرل رابرٹ کی دہشتناک آمد، برطانوی فوج کی یلغار، گھوڑوں کی ٹاپیں، میدان جنگ میں اللہ اکبر کے نعرے۔ اور جو پناہ ملی تو کہاں ملی۔ برطانوی کیمپ میں! شکست کا عہد نامہ، کاغذات پر لرزتے ہاتھوں سے دستخط۔ اکثر پچھلے پہر کو زندانیوں کا کارواں درۂ خیبر کی سمت رواں ہوتا ہے۔ اونٹوں کی گھنٹیاں بجتی ہیں آنکھ کھلتی ہے تو معلوم ہوتا ہے مسوری کی سڑکوں پر سے گھنٹیاں بجاتیں رکشائیں گزر رہی ہیں دل دیر تک دھڑکتا رہتا ہے۔

اٹھائیس سال گزر گئے جب انگریزوں نے دوست محمد خاں کے دوسرے پوتے عبدالرحمان کو اپنا مطیع امیر کابل تسلیم کیا۔ عین وہی زمانہ تھا جب امیر بخارا، امیر جیوا، امیر خوقند سب کی روسی جنرل کافمین چھٹی کر رہا تھا۔

برادر ایوب خاں نہ مانا۔ لڑتا رہا انگریزوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ اپنی خستہ حال فوج کے ساتھ بے جگری سے لڑا۔ آخر دوست محمد خاں کا پوتا تھا۔ مگر ہندوستانی شاعر حالی نے جس کے اشعار ترجمہ کر کے ہندی سید زادہ اکثر سناتا ہے۔ ٹھیک کہا ہے ع

اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

برادر ایوب کو بھی جنرل رابرٹ کے آگے ہار ماننا پڑی۔ ہندروانہ کیا گیا۔

امیر عبدالرحمان خاں کی وفات کو بھی سات سال ہو چلے۔ اخباروں میں چھپا ہے کہ حبیب اللہ خاں کچھ اصلاحات نافذ کرنے میں مشغول ہے تو اصلاحات کی ہوا سارے مشرقِ وسطیٰ میں چل پڑی ہے۔ پچھلے سال برخوردار حبیب اللہ خاں علی گڑھ کالج آیا تھا۔ بے حد پرجوش استقبال اس کا کیا گیا۔ ہندی مسلمان مشرقِ وسطیٰ کے مسلمانوں پر صدقہ ہوا جاتا ہے۔ مستقل افغانوں، ترکوں، عربوں، ایرانیوں کا غم کھاتا ہے۔ اُن کی ترقی سے خوش اور ان کی ناکامیوں سے رنجیدہ ہوتا ہے۔ ان کے لئے روتا، مسجدوں میں دعائیں مانگتا اور چندے جمع کرتا ہے۔ عجیب بات ہے۔ ہم مشرقِ وسطیٰ کے مسلمانوں نے کبھی ان بے چاروں کے متعلق سوچا بھی نہیں۔

اس دلچسپ سعادت مند ہندی سید زادے نے اپنا تخلص ہی ترکی رکھ لیا ہے۔ بے حد جوش و مسرت سے ترک انقلاب کے قصے سناتا ہے۔ کہتا ہے یہ ۱۹۰۸ء ترک انقلاب کا سال ہے۔ ابھی ۲۳ جولائی کو خلیفۃ المسلمین سلطان المعظم نے نوجوان ترکوں کے مطالبات منظور کر لئے۔ دولتِ علیہ کے عوام کو دستوری حقوق عطا فرمائے۔

دستوری حقوق کیا شے ہے؟ عجیب نئی نئی اصطلاحات اس نئی پود نے ایجاد کی ہیں۔ بہت خون خرابہ اس کی وجہ سے ہوتا ہے۔ شاہِ قاچار نے بھی اپنی رعایا کو کچھ "حقوق" عطا کئے ہیں۔ برادرزادہ عبدالرحمان خاں کابل میں انگریزی کالج کھول رہا ہے۔

شہ ——

شہ ——

مات ——

شطرنج کی دوسری بازی شروع ہوتی ہے۔ نوجوان سید زادہ اچھا کھلاڑی ہے۔ مگر اتنا منکسر المزاج، شرمیلا اور قناعت پسند نہ ہو تو زندگی میں آئندہ بہت ترقی کرے گا یا شاید نہ کر سکے۔ اسے زمانہ سازی نہیں آتی۔

سردار عمر خاں عرض کرتے ہیں خاصہ تیار ہے۔ انگریزوں کا پنشن خوار امیر اللہ کا نام لے کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر مسند سے اٹھتا ہے۔ دوسرے کمرے میں دسترخوان بچھا ہے۔ بھاپ اٹھتی ہوئی قابیں لا کر رکھی جاتی ہیں۔ افغان ہمیشہ سے جمہوری رہا ہے۔ دسترخوان پر بوڑھا بادشاہ بھائی بھتیجے، رشتہ دار اور خدام ایک ساتھ بیٹھتے ہیں۔ بسم اللہ کہہ کر کھانا شروع کرتے ہیں۔ خداوند تعالیٰ جس حال میں رکھے اس کا شکر ہے۔

افغان باقی! کہسار باقی! الحکم للہ! الملک للہ!

۱؎ امیر یعقوب خاں کے انتقال کے بعد بھی جلاوطن شاہی خاندان یلدرم کا اس طرح پرستار رہا۔ راقم الحروف کے بچپن میں دہرہ دون میں مقیم افغان شہزادے (جن میں سردار عمر خاں مجھے اب تک یاد ہیں) اور شہزادیاں ہمارے یہاں اکثر آیا کرتے تھے۔ ۱۹۶۰ء میں میری ملاقات لاہور میں ایک افغان شہزادی سے ہوئی جو دہرہ دون میں نظر بند رہ چکی تھیں۔ وہ یلدرم کا نام سنتے ہی رونے لگیں۔ موصوفہ کے بیٹے سردار شاہ نواز خاں ایران میں پاکستان کے سفیر رہ چکے ہیں اور بیٹی ڈاکٹر مس محبوب شاہ زمان خان نے جو پہلے کالج آف ہوم سائنس لاہور کی پرنسپل تھیں اب امریکہ میں سکونت اختیار کر لی ہے۔ امیر یعقوب خاں کے خاندان کے دوسرے افراد بھی پاکستان میں رہتے ہیں۔

صالحہ عابد حسین
جامعہ نگر، نئی دہلی - ۲۵

اُردو ادب اور خواتین

بچہ جو زبان ماں کی آغوش میں سنتا سیکھتا اور بولتا ہے، وہی اُس کی زبان ہوتی ہے، اور یہ 'مادری زبان' کہلاتی ہے۔ بڑا ہوکر، اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم پاکر دنیا کی دس اور زبانیں سیکھ کر بھی وہ اپنی زبان کی محبت اور اُس سے جو جذباتی تعلق ہوتا ہے اُس سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکتا۔ مادری زبان کے بول ہمیشہ اُس کے کانوں میں رس گھولتے ہیں۔ مادری زبان میں لکھی کتابیں اُس کو سب سے زیادہ محبوب ہوتی ہیں۔ مادری زبان کا رشتہ ماں سے، تہذیب و تمدن سے، اور دل سے بہت نزدیک کا ہوتا ہے۔

اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ کسی بھی زبان کے حسن، شیرینی، سادگی، روانی اور سلاست میں عورتوں کا حصّہ بنیادی ہوتا ہے۔ اُس کا روزمرّہ محاورے، کہاوتیں، اُس کی مقامی بولی کی گھلاوٹ میں عورت کا ہاتھ صاف دیکھا جاسکتا ہے۔ ہماری محبوب زبان اُردو میں بھی جو لطافت، جو رس، مٹھاس، سادگی و پرکاری ہے، اُس کا سہرا عورتوں کے سر ہے۔ کوئی شک نہیں کہ اس زبان کو پروان چڑھانے، ترقی اور وسعت دینے، اسے علمی، ادبی اور شعر کی زبان بنانے میں مردوں نے بہت بڑا حصّہ لیا ہے۔ ہمارے ہاں بہت بڑے بڑے شاعر، عالم، اور ادیب پیدا ہوئے، اور صدیوں تک یہ صرف مرد تھے، اِکا دُکا شاعرات نظر ضرور آجاتی ہیں مگر اُن کی تعداد آٹے میں نمک سے زیادہ نہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ عورتوں میں تعلیم نہ ہونے کے برابر تھی۔ ہاں جو عورتیں تھوڑا بہت پڑھ جاتیں اور اُن میں قدرتی صلاحیت اور اُپج ہوتی، وہ شعر کہنے لگتیں، کیونکہ شعر کہا جاتا ہے، ضروری نہیں کہ لکھا بھی جائے۔ لیکن نثر لکھنا اتنا آسان نہیں، جب تک فطری صلاحیت کے ساتھ ساتھ ادیب اپنی زبان پر عبور، اپنے خیالات کو صفحۂ قرطاس پر خوبی سے منتقل کرنے کی قابلیت نہ ہو، وہ اچھا نثر نگار نہیں بن سکتا۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ اُردو زبان کے اُبھرنے، ترقی کرنے، اور شعر و ادب کی زبان بننے کی پانچ صدیوں کے درمیان ادیب عورتیں کہیں نظر نہیں آتیں۔ کوئی ۸۰، ۹۰ برس ہوئے جب پہلے پہل عورت نے قلم کے جادو کو جانا اور اُس سے کام لینا شروع کیا۔ اُس وقت ایک محدود حلقے میں عورتوں کو لکھنا پڑھنا سیکھنے کی اجازت ہو چکی تھی۔ ان عورتوں نے، جن کا علم اگرچہ محدود تھا، مگر اُس سے کام لینے اور دوسروں کو فائدہ پہنچانے کا جذبہ لامحدود تھا، اپنی ہم جنس بہنوں کی فلاح و بہبود کی کوشش دل و جان سے شروع کردی۔ اُن کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ عورتوں میں تعلیم پھیلے، تاکہ وہ اپنے گھر، بچوں اور دوسرے بنی نوع کی خدمت بہتر طریقہ سے کرسکیں۔ مسلمان عورتوں میں تعلیم کا رواج پھیلانے میں مولانا الطاف حسین حالی اور مولوی ممتاز علی کے نام سب سے نمایاں ہیں۔ انہیں مولوی ممتاز علی کی بیوی محمدی بیگم تھیں جن کے بیٹے امتیاز علی تاج نے اُردو دنیا میں بڑا نام اور شہرت پائی، جنہوں نے پہلے پہل قلم اٹھایا اور مضمون اور کتابیں لکھنی شروع کیں۔ لگ بھگ اُسی زمانے میں سلطان جہاں بیگم والیٔ بھوپال نے، جو تعلیم یافتہ تھیں، اور دردمند دل رکھتی تھیں، لکھنا شروع کیا۔ ان دونوں خواتین نے عورتوں اور بچوں کے لئے متعدد چھوٹی چھوٹی کتابیں اور مضمون لکھے۔ مولوی ممتاز علی اور محمدی بیگم نے عورتوں کا ایک ہفتہ وار اخبار "تہذیبِ نسواں" اور بچوں کا پہلا اخبار "پھول" نکالا تھا۔ اور بھوپال میں بیگم بھوپال کی سرپرستی میں "ظِلّ السّلطان" ایک ماہنامہ عورتوں کے لئے شائع ہوتا تھا۔ پہلا قدم اٹھانے والے کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ ان خواتین کی اوّلیت اور اہمیت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ یہ انہیں کی کوششوں اور کاوشوں کا نتیجہ تھا کہ خواتین میں روز بروز لکھنے پڑھنے کا شوق ترقی کرنے لگا اور کم پڑھی لکھی عورتیں بھی مطالعہ اور محنت کی بدولت اپنی استعداد بڑھاتیں اور اچھی اچھی چیزیں لکھتیں۔ ان ادیب خواتین کی کوشش یہ تھی کہ ایک طرف مردوں کو یہ بات سمجھائیں کہ عورت کوئی چوپایہ یا حیوان نہیں، علم کی پیاس اُسے بھی ہے۔ ضرورت ہے کہ عورتیں تعلیم پائیں اور ایک بہتر زندگی بسر کرنا سیکھیں، بچوں کی بہتر تربیت کرسکیں، شوہر کی سچّی رفیقِ حیات بنیں اور ساتھ ہی اپنے مذہب کی صحیح تعلیم حاصل کرسکیں۔ اُن کی اور اُن کی تعلیم کے حامی مردوں کی کوششیں بار آور ہوئیں۔ اگرچہ تعلیم تیزی سے نہیں پھیلی اور نچلے متوسط طبقے کی عورتیں زیادہ تر علم کی دولت سے بے بہرہ رہیں لیکن متوسط اور اعلیٰ طبقہ کی عورتوں میں تعلیم پھیلنے لگی چراغ سے چراغ روشن ہونے لگا۔

بیسویں صدی کے ابتدائی بیس سالوں میں ایک خاص تعداد اُن خواتین کی پیدا ہو گئی تھی جو ادب کی خدمت کا شوق اور صلاحیت رکھتی تھیں ان میں اسکولوں کی پڑھی ہوئی بہت کم تھیں سوائے بمبئی اور حیدرآباد کی خواتین کے اور ان میں بھی زیادہ تر اونچے طبقہ سے تعلق رکھتی تھیں جو اسکولوں میں یا اکا دکا [illegible] تعلیم پا چکی تھیں۔ بیشتر وہ تھیں جن کی تعلیم گھر پر ہوئی تھی اور ان کا مشاہدہ بھی گھریلو اور خاندانی زندگی تک محدود تھا، مگر اپنے شوق سے وہ اپنی زبان میں اچھی استعداد پیدا کر لیتی تھیں اور مطالعہ بھی جس حد تک ان حالات میں ہو سکتا تھا، اچھا تھا۔ بعض نے فارسی اور تھوڑی بہت انگریزی بھی پڑھی تھی۔ اُن حساس دل اور روشن دماغ کی مالک خواتین نے جو فن کارانہ صلاحیتیں لے کر پیدا ہوئی تھیں قلم ہاتھ میں اٹھا لیا۔ ان میں سنجیدہ چیزیں لکھنے والیاں خال خال تھیں۔ زیادہ تر کو کہانیوں قصوں کا شوق تھا اور اس میں وہ اپنے خیالات کا اظہار اور مقصد کی تبلیغ کرتی تھیں۔ ان میں طیبہ بیگم، نفیس دلہن، عطیہ فیضی زہرا فیضی، صغرا ہمایوں مرزا، اور خجستہ سہروردی وغیرہ اپنے دور کی مشہور لکھنے والیاں تھیں۔ اس زمانے میں زنانہ رسالے اور ہفتہ وار اخبار بھی نکلے۔ "تہذیب نسواں" خواتین کا پہلا ہفتہ وار اخبار تھا۔ "ظل السلطان" "عصمت" اور بعد میں "نور جہاں" اور کئی زنانہ رسالے نکلے جن میں لکھنے والیاں زیادہ تر عورتیں تھیں۔ مرد بھی لکھتے تھے مگر انہیں مسائل پر جو عورتوں سے متعلق ہوتے تھے۔ ان رسالوں کی ہمت افزائی کی وجہ سے کئی شاعرات اور مضمون نگار پیدا ہوئیں مگر قابلِ ذکر وہ ناول ہیں جو اس دور میں لکھے گئے۔ یہ قصے یا ناول آج کے ناقدین کی نظروں میں بچکانہ ہوں گے اور وہ "ناول" کی تعریف میں شاید پورے بھی نہ اتریں۔ اِن پر یہ اعتراض بھی کیا جا سکتا ہے کہ نہ ان میں سیاسی شعور ہے، نہ نفسیاتی آگاہی۔ نہ اعلیٰ درجہ کی کردار نگاری ملتی ہے، نہ گہری جذبات نویسی۔ نہ گٹھے ہوئے پلاٹ ہیں، نہ زندگی اور اس کے مسائل کا گہرا مشاہدہ۔

لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہ ناول کا ابتدائی دور تھا۔ مردوں کے ناول بھی اس کسوٹی پر پورے کب اترتے تھے۔ مولوی نذیر احمد، شرر، سرشار، کے ناول بھی بہت سی کمزوریوں کے حامل ہیں۔ البتہ "امراؤ جان ادا" ضرور ایک ایسا ناول ہے جس کو آج کے ناقدین بھی سراہنے پر مجبور ہیں۔ لیکن جب اس بات پر غور کرتے ہیں کہ ابتدائی دور کی ان ادیب خواتین کا مطالعہ صرف اردو ادب تک محدود تھا اور اس میں بھی ناول نہ ہونے کے برابر تھا، گھروں سے نکل کر باہر کی زندگی دیکھنے کے مواقع نہ تھے۔ ان کی تعلیم میں نفسیات شامل نہیں تھی، سیاسی شعور کے لفظ سے بہت سے لوگ نا آشنا تھے۔ نقادوں کی رہنمائی (جسے رہنمائی کہنا چاہیے یا رہزنی؟) اور نکتہ چینیوں کی ہدایت نہ ملتی تھی۔ اس کے باوجود اُن کے ناولوں میں ایک جان تھی، دلکشی تھی، اثر تھا، اس لئے کہ وہ جس محدود موضوع پر قلم اٹھاتی تھیں اُس سے انہیں اچھی واقفیت ہوتی تھی اور سب سے بڑھ کر اُن میں خلوص تھا، اور مقصد کی لگن۔ اور ان خوبیوں نے ان ناولوں کو زندگی بخشی۔ اردو کے مشہور نقاد وقار عظیم نے عورتوں کے ناولوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے:

"اِن قصوں اور ناولوں کا قابلِ رشک امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے فن کی سادگی کو جو یقیناً مقصد کے خلوص سے پیدا ہوئی ہے کہانی کا سب سے اہم معیار بنایا۔ . . جہاں تک کہانی کہنے اور اُسے کہانی کی طرح کہنے کا تعلق ہے عورتوں کے قصے اور ناول آپ اپنی مثال ہیں اور یہ مثال قدیم اور جدید کے فرق کے بغیر عورتوں کے تقریباً سبھی ناولوں میں موجود ہے۔"

یہ بات بالکل صحیح ہے۔ اِن ادیب خواتین نے کسی پر رعب جمانے یا اپنی قابلیت اور ذہانت کا لوہا منوانے کے لئے نہیں لکھا۔ وہ اپنے اردگرد کی دنیا سے قصے کا پلاٹ اور کردار چنتی تھیں اور انہیں کہانی کی لڑی میں پرو کر پیش کر دیتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ناول کی ٹیکنیک وغیرہ سے واقفیت اور اس کے اصولوں سے آگہی کے بغیر ہی ان ناولوں میں اچھی خاصی کردار نگاری اور جذبات کی پُر اثر عکاسی ملتی ہے۔ ان قصوں کے ذریعے وہ ایک طرف عورت کے مسئلوں کی طرف مرد اور سماج کو متوجہ کرنا چاہتی تھیں تو دوسری طرف خود عورت کو یہ بتانا چاہتی تھیں کہ تعلیم پانا اس کا حق ہے اور بچوں کی اچھی طرح تربیت اس کا فرض۔ اسے ایک بہتر اور خوشگوار زندگی کے لئے جدوجہد کرنی چاہیے۔ وہ سعادت مند بیٹی، اچھی بہو، سچی رفیقِ حیات اور مثالی ماں کیسے بن سکتی ہے؟ اور اگر اس پر سوت کی مصیبت نازل ہو جائے یا بُری ساس نندوں سے سابقہ پڑے تو وہ کیسے اپنی زندگی بنا سکتی ہے؟ یہ مثالی باتیں ضروری نہیں کہ حقیقت کا جامہ بھی پہن لیتی ہوں پھر بھی فن کار کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے پڑھنے والوں کی کسی حد تک رہنمائی کرے اور عورتوں کے اِن ناولوں کا یہی مقصد تھا۔ اِن ابتدائی ناول نگار خواتین میں طیبہ بیگم، عباسی بیگم، والدہ افضل علی، نذر سجاد حیدر، خاتون خاص طور پر مشہور ہوئیں۔ والدہ افضل علی کا "گودڑ کا لال" خاتون کا "شوکت آرا بیگم"۔ نذر سجاد حیدر کا "حرماں نصیب"، عباسی بیگم کا "زہرا" ایسے ناول ہیں جنہوں نے یقیناً عورتوں اور لڑکیوں کی پوری پوری نسل کو متاثر کیا ہے۔ میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ یہ ناول گھرانوں میں بڑے ذوق و شوق سے پڑھے جاتے تھے۔

ایک خاتون ناول کو پڑھتیں اور دوسرے گھروں کی عورتیں، لڑکیاں، بچے اور کبھی کبھی مرد بھی، اُن کو ذوق و شوق سے سنتے۔ ان قصوں کے کرداروں کے ساتھ روتے ساتھ ہنستے، ان کی مصیبت پر دکھی ہوتے، اُن کی خوشی میں شرکت کرتے اور ذہن پر اُن کا ایک گہرا اثر لے کر اٹھتے۔ یہ کردار اُن کے لئے جیتے جاگتے انسانوں کی سی حیثیت رکھتے تھے، وہ ان کا ذکر ایسے کرتے جیسے دور رہنے والے قریبی عزیزوں کا ہوتا ہے۔ کسی ناول کی اس سے بڑی اور کیا کامیابی ہو سکتی ہے کہ اُس کے کردار زندہ انسانوں کی طرح محبوب بن جائیں اور پھر ایک کے بعد ایک ادیب اور ناول نگار خواتین کی نسل ابھرتی رہی۔ تعلیم، مطالعہ، اور باہر کی دنیا سے واقفیت کا اثر بھی اُن کے فن پر نظر آنے لگا۔ پُرانی خواتین کا طوطی ابھی بول ہی رہا تھا کہ زیادہ پختہ ذہن رکھنے والی ادبی صلاحیتوں سے بھرپور سیاسی شعور سے کسی حد تک آگاہ ادیب خواتین مطلع ادب پر طلوع ہوئیں۔ ان میں سے کسی نے خیالی اور رومانی دنیائیں بسائیں، کسی نے ہیئت افسانے لکھے، کسی نے نفسیاتی تجزیئے کئے، کسی نے معاشرتی ناولوں کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا۔ بعض نے ترقی پسند نقطۂ نظر اپنا کر سیاست میں اپنے فن کو ڈبو دیا اور بعض نے بغیر کسی سیاسی یا ادبی تحریک سے وابستہ ہوئے محض فن اور فن کے ذریعہ انسانیت کی خدمت کرنے کے مقصد کو پیشِ نظر رکھا۔ لیکن ان سب میں ایک قدر مشترک تھی۔ اپنی زبان سے پیار اور اپنے فن سے خلوص۔

حجاب اسمٰعیل (جو شادی کے بعد حجاب امتیاز علی کے نام سے مشہور ہوئیں) رومانی کہانیاں لکھتی تھیں جن میں ہلکا سا نفسیاتی تجزیہ بھی ہوتا۔ اِنکے تخیل کی پرواز تیز تھی اور خیالی حسین دنیائیں بسانے کا شوق تھا مگر ان حسین دنیاؤں میں دُکھ اور ہجر اور درد و محبت کی کسک بھی ہوتی تھی۔ ان کی کہانیاں اور ناول سبق لینے کے لئے نہیں لطف اٹھانے اور اپنے غموں کو دلکش کہانیوں میں بھول جانے کے لئے پڑھے جاتے۔ ان کے کردار بھی مخصوص تھے۔ بوڑھی چوہیا "زوناش" بوڑھا ڈاکٹر "گار" روحی وغیرہ وغیرہ۔ بیگم عبدالقادر نے ہیبتناک افسانے لکھے جو خواتین کے ادب میں نہ اس سے پہلے نظر آئے اور نہ بعد ہی میں یہ صنف مقبول ہو سکی۔ مگر ایک خاص ذوق کے لوگوں کو یہی کہانیاں پسند آتی تھیں۔ رشید جہاں مشہور کمیونسٹ خاتون لیڈر بھی کہانیاں لکھتی تھیں۔ دراصل ان کی شہرت "انگارے" کی باغی کہانیوں سے شروع ہوئی۔ انہوں نے کم لکھا مگر جو لکھا اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگر وہ فن کو سیاست پر قربان نہ کرتیں تو ادب کی دنیا میں کافی شہرت حاصل کر سکتی تھیں۔ عصمت چغتائی ترقی پسند خیالات رکھتی تھیں اور ترقی پسند ادب کے شباب کے زمانے میں انہوں نے قلم اٹھایا اور آناً فاناً شہرت کے آسمان پر پہنچ گئیں۔ ان کی گھریلو بے تکلف زبان، چونکا دینے والے موضوع، اندازِ بیان کا تیکھا پن، کرداروں کی شوخیاں اور بے باکیاں، نوک جھونک اور ڈھکی چھپی عریاں نویسی ان سب نے مل کر عصمت کی کہانیوں (اور ناول) میں ایسی کشش بھر دی کہ صرف ان کے پرستار ہی نہیں بلکہ وہ لوگ بھی جو بنیادی طور پر ان کے خیالات اور اندازِ بیان کو ناپسند کرتے تھے ان کہانیوں کو پڑھتے تھے۔ وہ عورتوں سے زیادہ مردوں اور نوجوان طبقے کی محبوب ادیب تھیں۔ عصمت نے تین ناول بھی لکھے ہیں۔ "ٹیڑھی لکیر" انکا سب سے مشہور ناول ہے اور باوجود کچھ خامیوں کے اُردو کے چوٹی کے ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ انکی کہانیاں ناولوں سے زیادہ کامیاب ہیں۔ اے آر۔ خاتون گھریلو پڑھی لکھی سیدھی سادی خاتون تھیں جنھوں نے اپنے ناولوں میں دلی کی تہذیب، رہن سہن اور معاشرت پیش کی ہے۔ ان کی زبان ٹھیٹھ دلی کی بامحاورہ روزمرہ ہے جس میں گھلاوٹ، رس اور بے بناوٹ حسن بھرا ہوا ہے۔ وہ اپنے دور کے نوجوان تعلیم یافتہ لڑکے لڑکیوں کی زندگی، خیالات اور ان کے رومانس وغیرہ بھی بیان کرتی ہیں اور پُرانے زمانے کی بڑی بوڑھیوں کی سیرت بھی بڑی خوبی سے دکھاتی ہیں۔ پلاٹ بنانے میں اِن کا مقابلہ شاید ہی کوئی ادیب خاتون کر سکے۔ اس میں آخر تک سسپنس اور تجسس قائم رہتا ہے۔ ان کا پہلا ناول "شمع" ان کا سب سے مقبول ناول ہے۔

شکیلہ اختر اردو کی مشہور افسانہ نگار ہیں۔ ان کی کہانیوں میں اثر اور گداز بھی ہوتا ہے اور گہرا مشاہدہ اور زندگی کے مسائل سے آگہی بھی۔ اِن کی کہانیاں اپنے ماحول اور اپنے شہر اور صوبے کی زندگی کے گرد گھومتی ہیں۔ ان کا بہاری زندگی کا مطالعہ اچھا ہے اور کہانی کہنے کا گر بھی جانتی ہیں۔ انہوں نے بہت سی کہانیاں لکھی ہیں۔ لیکن ادھر چند سالوں سے وہ ایسی ذاتی پریشانیوں میں مبتلا رہیں کہ لکھنا لکھانا بہت ہی کم ہو گیا ہے۔

صالحہ عابد حسین نے بھی لگ بھگ اس زمانے میں لکھنا شروع کیا۔ ابتدا زنانہ رسالوں میں کہانیوں اور مضامین سے ہوئی۔ اس نے زیادہ تر اس ماحول کی تصویر کشی کی اور انہیں کرداروں کی زندگی دکھائی جو اسے اپنے گرد نظر آتے اور صرف اس موضوع کو اپنایا جس سے گہری واقفیت تھی۔ ان کے چھوٹے چھوٹے ڈرامے شروع ہی سے اسکولوں وغیرہ میں اسٹیج کئے جانے

گئے تھے۔ اس کا پہلا ناول "ضدی" گھریلو خواتین اور نوجوان لڑکیوں میں بہت مقبول ہوا۔ بعد کی تخلیقات نے صاحبانِ ذوق اور نقادوں کو بھی اپنی طرف متوجہ کرلیا۔

حمیدہ سلطان نے دو ناول لکھے ہیں۔ "ثروت آرا بیگم" تو کم عمری کا لکھا ہوا ناول ہے جو دِلّی کی بامحاورہ بے تکلف زبان اور گھریلو رسموں کے بیان (جو بیاہ برات زچہ خانوں، چھٹی چلوں میں ہوتی تھیں) کی وجہ سے کچھ اہمیت رکھتا ہے۔ دوسرا ناول "رنگ محل" بھی اسی طرز کا ہے مگر اس میں ناول نگار کا شعور پختہ ہوچکا ہے۔ وہ ادبی مضامین بھی لکھتی ہیں مگر کم۔ اُردو کی ترقی اور اس کے حقوق منوانے کی طرف ان کی توجہ زیادہ رہتی ہے۔

یہ ادیب خواتین ناول کے ساتھ ساتھ کہانیاں اور مضامین لکھتی تھیں۔ ان کے علاوہ دوسری ادیب خواتین تھیں جو زیادہ تر زنانہ رسالوں میں لکھا کرتی تھیں۔ آمنہ نازلی، جہاں بانو نقوی، محمودہ رضویہ، صدیقہ بیگم وغیرہ کہانیوں پر طبع آزمائی کرتی رہیں۔ ممتاز شیریں جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے ادیب، نقاد اور مدیر تھیں۔ انہوں نے اپنے شوہر کے ساتھ ایک اونچے درجے کا ادبی ماہنامہ "نیا دور" کی ادارت بھی کی اور تنقیدی مضامین بھی لکھے۔ ان کی کہانیاں اور ایک ناول بھی شائع ہوا ہے۔ مگر تنقید کے میدان میں ان کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ ترقی پسندانہ نقطۂ نظر کے ساتھ ان کی تنقیدوں میں فکر کا عنصر بھی ملتا ہے۔ رضیہ سجاد ظہیر نے بھی ابتدا زنانہ رسالوں میں مضامین لکھنے سے کی مگر جلد ہی کہانیوں اور خاکہ نگاری میں شہرت حاصل کرلی۔ ان کے تین ناول بھی شائع ہوئے ہیں جس میں سے "سمن" نے زیادہ شہرت پائی اور اس کا ترجمہ روسی زبان میں بہت بڑی تعداد میں چھپا۔ حال ہی میں انکا ایک مختصر ناول "اللہ میگھ دے" شائع ہوا ہے جس میں سیاسی شعور بھی ہے اور گھریلو مسائل بھی۔ اونچے طبقے کی زندگی کا کھوکھلا پن اور نوجوانوں کے مسائل اور احساسات کی بڑی اچھی عکاسی کی گئی ہے۔ یہ ناول پُر اثر بھی ہے اور سوچنے کی دعوت بھی دیتا ہے۔

یہ خواتین لکھ رہی تھیں کہ نوجوان لڑکیوں کی ایک بڑی تعداد میدانِ ادب میں اتری جس میں سے بعض اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی تھیں۔ قرۃ العین، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور وغیرہ۔ خدیجہ اور ہاجرہ پر عصمت اور منٹو کا رنگ غالب تھا پھر بھی انداز اپنا تھا۔ یہ کہانیاں لکھتی تھیں۔ قرۃ العین کا اپنا الگ اسٹائل تھا وہ سب سے زیادہ مشہور ہوئیں۔ عورتیں کیا پڑھے لکھے مرد بھی ان کے مطالعہ کی وسعت، اندازِ بیان کے نئے پن، جدید ترین تکنیک اور گنگا جمنی زبان سے مرعوب ہوگئے۔

۱۹۴۷ء کے پُر آشوب واقعات کے بعد کچھ عرصہ تک ادب پر جمود سا طاری تھا اور جو چیزیں لکھی بھی گئیں وہ ہنگامی ادب سے موسوم کی گئیں لیکن اُردو کے حساس فنکاروں پر ۱۹۴۷ء کے واقعات سے جو بیت رہی تھی اس پر اگر وہ قلم نہ اٹھاتے تو یا انکے سینے پھٹ جاتے یا دماغ اُلٹ جاتے۔ ادیب خواتین میں سے عصمت چغتائی کی "دھانی بانکیں" بڑا پُر اثر ڈراما تھا جس کو پڑھ کر جسم میں عجیب سی سرد لہریں دوڑ جاتی تھیں۔ صالحہ عابد حسین نے بھی اسی زمانے میں کئی افسانے اور مضامین لکھے جو "یاس میں آس" کے نام سے شائع ہوئے۔

اُردو کے سبھی ادیبوں کی یہ کوشش تھی کہ اس دورِ بربریت میں انسانی شرافت، ہمدردی اور قربانی کے جو مظاہرے ہوئے ہیں انکو سامنے لاکر آدمی کا انسانیت، شرافت، مذہب اور محبت پر سے جو عقیدہ اٹھتا جا رہا ہے اسے قائم رکھیں اور وحشیانہ مظالم کے مرقع دکھا کر لوگوں کے ضمیر کو جگائیں۔ پاکستان کی ناول نگار خواتین میں سے بھی تقریباً سبھی نے اپنے اس دور کے اور بعد کے ناولوں میں تقسیم اور اس کے بعد کے پڑنے والے اثرات اور گھر سے بے گھر ہوئے لوگوں پر جو کچھ بیتی اس کے مرقع دکھانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ ایک خاص طبقے اور حلقے کی حالت دکھاتی تھیں۔ انسانیت اور شرافت وغیرہ ان کو بھی نظر آتی تھی مگر صرف اپنے ہم مذہبوں میں۔ پھر بھی یہ ناول نفرت یا تعصب پھیلانے والے نہ تھے۔ اے۔ آر۔ خاتون کے کئی ناول ہندوستان کی زندگی سے شروع ہوکر پاکستان جاکر ختم ہوئے اور اسی سے ان کو پلاٹ بنانے میں بڑی مدد ملی۔ خدیجہ مستور کا ناول "آنگن" بھی تقسیم سے پہلے کے ہندوستان کے حالات اور بعد میں وہاں جاکر جو کچھ ان کرداروں پر بیتی اس کے گرد گھومتا ہے۔ مگر خدیجہ مستور کا شعور زیادہ پختہ، ذہن زیادہ صاف اور سیاسی حالات اور اس کے نتائج پر گرفت بہت اچھی ہے۔ ساتھ ہی کردار نگاری اور جذباتی کشمکش بھی بڑی خوبی سے دکھائی گئی ہے۔ ناول روایاتی ٹریجڈی نہ ہوتے ہوئے بھی ٹریجڈی ہے اور پڑھنے والے کا دل ہل ہل جاتا ہے۔ وہاں اسی زمانے میں اور بھی بہت سی لکھنے والیاں اُبھریں ان میں الطاف فاطمہ، رضیہ فصیح احمد، جمیلہ ہاشمی اور جہاں دین سرور بہت اچھی لکھنے والیاں ہیں۔ الطاف فاطمہ کا ناول "دستک نہ دو"

عام ڈگر سے ہٹا ہوا بڑا پُر اثر ناول ہے جس سے ان کے قلم کی قوت اور مشاہدہ کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ جمیلہ ہاشمی کا "تلاشِ بہاراں" اور رضیہ فصیح احمد کا "آبلہ پا" بھی اچھے ناول ہیں۔ ان تینوں ناولوں پر اور "آنگن" پر پاکستان کا سب سے بڑا ادبی انعام • آدم جی پرائز" بھی مل چکا ہے۔ اگرچہ کسی فنکار کی پہلی ہی تصنیف پر سب سے بڑا انعام دے دینا عام طور پر اس کی صلاحیتوں کو کچل دیتا ہے۔ پروین سرور غالباً سرحد کی خاتون ہیں جنہوں نے ادھر کی گھریلو زندگی اور حرم سراؤں کے حالات لکھ کر اُردو ادب میں ایک نئی زندگی کی جھلک دکھائی ہے۔ زبیدہ خاتون نے اپنی والدہ اے۔ آر۔ خاتون کے رنگ کو اپنایا ہے اور متعدد ناول لکھے ہیں۔ اگرچہ زبان اور بیان پر انہیں وہ قدرت تو نہیں جو ان کی والدہ کو تھی مگر ان کے ناول صاف ستھرے ہلکے پھلکے دلچسپ معاشرتی رومانی ناول ہوتے ہیں جو عورتوں اور لڑکیوں کے حلقے میں پسند کئے جاتے ہیں۔

ہندوستان میں ایک عرصے تک اُردو پر اور اُردو ادیبوں پر بڑا سخت وقت رہا۔ ابتدائی اسکولوں میں اکثر جگہ اُردو ختم کر دی گئی جس کی وجہ سے رفتہ رفتہ اردو پڑھنے والے کم ہونے لگے۔ اُردو سے تعصب کی وجہ سے اکثر ہندو گھرانوں میں اُردو کا رواج کم ہوا تو مسلمان گھرانوں میں یہ سمجھ کر بچوں کو صرف ہندی انگریزی پڑھائی جانے لگی کہ اردو پڑھ کر کریں گے کیا۔ کسی زبان کے چاہنے والوں اور فنکاروں کے لئے اس سے بڑا صدمہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ ان کی زبان ہی کاٹ دی جائے۔ اُردو کا ادیب دیکھ رہا تھا کہ کتابیں چھپنا مشکل ہیں چھپ جاتی ہیں تو بکتی نہیں۔ ہاں گھٹیا رومانی ناول، جاسوسی اور جنسی ادیب کی اب بھی مانگ ہے مگر اونچے درجے کے ادب کو کوئی نہیں پوچھتا۔ ان حالات سے گھبرا کر کچھ ادیب ہندی کی طرف چلے گئے۔ کچھ نے فلمی لائن اپنالی کہ ادب کی نہ سہی زبان کی خدمت تو فلم کے ذریعہ بھی ہو سکتی ہے اور ساتھ ہی اپنی روزی کا سہارا بھی رہے گا۔ کچھ نے کمرشل ادب پر طبع آزمائی کی لیکن ایسے سرپھرے جانباز بھی تھے جو ہر حال میں اردو کو زندہ رکھنے اور مرتے دم تک اس کی خدمت کرنے کا جذبہ دل میں رکھتے تھے۔ نہ انہوں نے اسکی حمایت کی کہ اُردو کی لپی بدلی جائے نہ انہوں نے اپنے بچوں کو اُردو پڑھانا چھوڑا اور نہ خود قلم سے ہاتھ اٹھایا۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

اور حالات نے ثابت کر دیا کہ اُردو زبان اور اس کا ادیب دونوں بڑے سخت جان ہیں اور ان کو ختم کرنا آسان نہیں۔ ان اُردو کے پرستار خادموں میں ادیب خواتین کا حصہ بھی کم نہیں کچھ زیادہ ہی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ ادب کے ذریعہ روزی کمانے پر مجبور نہیں تھیں۔ یہ تخلیقی کام وہ دلی لگن اور ذاتی اُپج کی بنا پر کرتی تھیں۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مردوں کے مقابلے میں ان کو بھاگ دوڑ کم کرنی پڑتی ہے اور خاص کر ناول نگاری کے لئے جس سکون اور فرصت کی ضرورت ہے وہ ان کو مل سکتی ہے۔ بہرحال اس دورِ پُر آشوب میں بھی اور جب حالات کچھ بہتر ہوئے تب بھی اُردو کی ادیب خواتین برابر لکھتی رہیں ان میں پرانی لکھنے والیاں بھی ہیں اور نئی آنے والیاں بھی۔ ان کو پیسہ کمانے کی فکر نہیں وہ چاہتی ہیں کہ ان کے فن پارے چھپ جائیں اور ان کے خیالات اور فن کی دوسروں تک رسائی ہو جائے۔ یہی ان کے لئے بڑا انعام ہے۔

ہماری اکا دُکا ادیب خواتین نے فلم کو یا کمرشل ادب کو اپنایا بھی مگر اپنے فن پر اس کا کچھ زیادہ اثر نہ پڑنے دیا۔ البتہ نئی لکھنے والیوں کے ناول پر فلم بینی نے بہت اثر ڈالا ہے اور اکثر ناولوں کا خاتمہ یا کلائمکس فلمی سا ہوتا ہے۔ وہ ابھی یہ نہیں جانتیں کہ جس طرح فلم میں اونچے درجے کے ادب اور شاعری کی گنجائش نکالنا محال ہے اس طرح اچھی ادبی تخلیق کو فلمی رنگ دے کر سستی شہرت دینا اس کو گھٹیا بناتا ہے۔

پُرانی لکھنے والیوں میں سے کچھ نے لکھنا چھوڑ دیا۔ کچھ خدا کو پیاری ہوئیں۔ بہت سی پاکستان جا بسیں لیکن کچھ ایسی بھی ہیں جن کے دل میں فن کی شمع روشن ہے' اپنے قلم سے انسانیت اور انسانوں کی خدمت کا جذبہ زندہ ہے اور وہ اب بھی مضامین، ڈرامے، کہانیاں، ناول اور محض ادبی تخلیقی کام بھی کر رہی ہیں۔ بعض نے عمدہ ترجمے بھی کئے ہیں اور کچھ نے مزاحیہ رنگ کو اپنایا ہے۔

عصمت چغتائی اگرچہ فلمی کہانیاں اور ڈائلاگ بھی لکھتی ہیں مگر ان کے ادبی مضامین کہانیوں وغیرہ پر فلمی چھاپ کم ہے۔ گہرا مشاہدہ اور حساس طبیعت اور دردِ انسانیت کی جھلکیاں زیادہ نظر آتی ہیں۔ ان کے قلم میں اب دو دھاری تلوار کی کاٹ نہیں جراح کے نشتر کی سی نرمی پیدا ہو گئی ہے۔ ان کے پلاٹ اب سیکس کے گرد نہیں بلکہ غریب، مجبور، مصیبت زدہ عورتوں اور لڑکیوں کے مسائل کے گرد گھومتے ہیں۔ حال ہی میں انہوں نے اسلام کے مشہور و مظلوم ہیرو حضرت حسین ابن علی پر

ایک کتاب اپنے مخصوص انداز میں لکھی ہے۔

قرۃ العین حیدر جن کو اپنے مشہور ناول "آگ کا دریا" کی بدولت پاکستان چھوڑنا پڑا اب پھر ہندوستان کی بن گئی ہیں۔ یہاں انہوں نے پہلے "امپرنٹ" میں کام کیا اور اب السٹریٹڈ ویکلی کی ادارت میں شریک ہیں۔ اب وہ کم لکھتی ہیں مگر جو کچھ لکھتی ہیں اس میں زیادہ رچاؤ ہے۔ بیان میں پیچیدگی کم ہوتی جاتی ہے اور زبان میں روانی آرہی ہے۔ ان کی کہانیاں بہت پسند کی جاتی ہیں۔ ساہتیہ اکیڈمی کا جو ایوارڈ ابھی دو تین سال پہلے انہیں دیا گیا وہ ان کی کہانیوں کے مجموعے "پت جھڑ کی آواز" پر ملا ہے۔ اُردو کی وہ واحد ادیبہ ہیں جن کو یہ ایوارڈ ملا ہے۔ آج کل وہ ایک اور ناول قسط وار رسالہ "آج کل" میں لکھ رہی ہیں جس کا عنوان ہے "کارِ جہاں دراز ہے"۔ ان کے کئی ترجمے بھی شائع ہو چکے ہیں۔

اُردو میں ترجمے یوں تو بہت سی پڑھی لکھی خواتین نے کیے ہیں اور کر رہی ہیں انگلش سے، ہندی سے، روسی سے۔ مگر اس میں سرِ فہرست نام رضیہ سجاد ظہیر کا ہے جنہوں نے متعدد ضخیم کتابوں کے ترجمے اُردو میں کیے ہیں۔ یہ ترجمے اصل سے قریب ہوتے ہیں۔ زبان بے تکلف، رواں اور سلیس ہے۔ وہ کہانیاں اور خاکے بھی برابر لکھ رہی ہیں۔ خاکہ نگاری میں بھی وہ بہت کامیاب ہیں۔ ان کے ہندی ناول تقسیمِ ملک کے بعد شائع ہوئے ہیں۔

صالحہ عابد حسین بھی ان ادیبوں میں سے ہیں جو برابر لکھ رہی ہیں۔ اس کے اب تک سات ناول، ڈراموں اور افسانوں کے کئی مجموعے اور مضامین کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ بچوں اور کم پڑھے لکھے بالغوں کے لیے بھی کئی کتابیں لکھیں اور ترجمہ کی ہیں۔ اس کی "یادگارِ حالی" جو اُردو کے مشہور شاعر الطاف حسین حالی کی سوانح حیات ہے اب سے بیس بائیس برس پہلے شائع ہوئی تھی اور کئی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ حال ہی میں دوسری ادبی تصنیف میر انیس پر چھپی ہے۔ اس کے ناولوں میں پہلا ناول "عذرا" عورتوں اور لڑکیوں میں بہت مقبول ہے۔ "یادوں کے چراغ" اور "اپنی اپنی صلیب" نے صاحبانِ ذوق اور نقادوں سے بھی داد پائی ہے۔

فاطمہ سبیں پرانی لکھنے والی ہیں۔ ان کے ناول گھریلو عورتوں اور لڑکیوں میں شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ ایک عرصے تک ان کا کوئی ناول نہیں چھپا تھا۔ مگر حال ہی میں "غزالی" ان کا نیا ناول شائع ہوا ہے جو امید ہے پسند کیا جائے گا۔

۱۹۴۷ء کے بعد جن افسانہ نگاروں نے بہت شہرت حاصل کی ان میں جیلانی بانو اور واجدہ تبسم کے نام سرِ فہرست ہیں۔ یہ دونوں بہت اچھی لکھنے والیاں ہیں۔ ان کی ابتدائی چند کہانیوں ہی نے لوگوں کو چونکا دیا تھا۔ واجدہ تبسم کچھ عرصہ سے زیادہ عریاں اور جنس زدہ افسانے لکھنے لگی ہیں پھر بھی وہ ایک خاص قسم کے حلقے میں بہت پسند کی جاتی ہیں۔ ان کی زبان بڑی رواں بے تکلف اور اندازِ بیان سلیس ہوتا ہے اور جو کہانیاں ان مخصوص موضوعات سے الگ ہٹ کر لکھتی ہیں وہ جواب نہیں رکھتیں۔

جیلانی بانو کا اپنا ایک الگ رنگ ہے۔ ان کے انداز کا تیکھا پن، تھوڑی سی بے باکی اور حقیقت نگاری (جس میں عریانیت آجاتی ہے مگر بیہودگی نہیں)، ان کے افسانوں کو اور دلکشی بخشتے ہیں۔ آمنہ ابوالحسن بھی اس دور کی لکھنے والی ہیں۔ ان کی کہانیوں میں غریب طبقے کی زندگی کی محرومیاں اور دُکھ ہوتے ہیں۔ ان کا گہرا خلوص اور طنز کے ڈھکے چھپے نشتر ان افسانوں میں انفرادیت پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کا ایک ناول "سیاہ سُرخ اور سفید" بھی شائع ہوا ہے۔ ہاجرہ نازلی نے بہت سے ناول لکھے ہیں۔ ان کے بعض ابتدائی ناولوں پر مغربی ناولوں کا اثر دیکھا جا سکتا ہے لیکن بعد کے ناولوں میں اپچ زیادہ ہے۔ یہ ناول اگرچہ رومانی ہوتے ہیں مگر اخلاقی تعلیم دیتے ہیں اور متوسط یا غریب گھرانے کی لڑکیوں کے مسائل اور انکے حل بھی پیش کرتے ہیں۔ عام طور پر عورتوں میں یہ ناول پسند کیے جاتے ہیں۔

سلمٰی صدیقی نے کچھ عرصہ پہلے اُردو میں طنزیہ و مزاحیہ مضامین اور خاکے لکھنے شروع کیے جو کافی پسند کیے جاتے تھے۔ امید کی جاتی تھی کہ وہ اس انداز میں اپنی انفرادیت منوالیں گی مگر اب انہوں نے اُردو میں لکھنا چھوڑ دیا ہے۔ زینت ساجدہ افسانے بھی لکھتی ہیں اور مزاحیہ انداز کے مضامین بھی۔ ان کے افسانے سیدھے سادے مگر دلکش ہوتے ہیں۔ مزاحیہ مضامین میں وہ زیادہ کامیاب ہیں۔ انداز دلچسپ طنز کا ہلکا سا نشتر اور ظرافت کی پھلجھڑیاں ان کے خاکوں کو دلکشی بخشتی ہیں۔

انیس قدوائی کا نام زیادہ مشہور نہیں کیونکہ وہ اپنی سیاسی اور سماجی خدمات میں اتنی محو رہیں کہ ادبی چیزیں چھپوانے کی طرف توجہ ہی نہ دے سکیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مزاحیہ مضامین لکھنے میں ان کا جواب ملنا مشکل ہے۔ اندازِ بیان کی سادگی و پرکاری، موضوع کی جدت، فقرے فقرے میں سموئی ظرافت، برمحل اشعار اور لکھنؤ کی خوبصورت زبان ان کے مضامین کو بڑی دلکشی بخشتے ہیں اور سننے والوں کو پھڑکا دیتے ہیں۔

شفیقہ فرحت بھی ایک اُبھرتی ہوئی ادیبہ ہیں اور مزاحیہ مضامین اچھے لکھتی ہیں۔ گذشتہ دس بارہ سال میں نوجوان ادیب

خواتین کی ایک پوری نسل ابھر کر سامنے آئی ہے۔ ان میں سے بعض اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ بعض کی تعلیم اسکول تک محدود ہے۔ بعض نے گھریلو تعلیم پائی ہے مگر مطالعہ وسیع اور مشاہدہ اچھا ہے۔ ناول پہلے بھی خواتین کی محبوب صنف تھی اور یہ تو دور ہی ناول کی مقبولیت کا ہے۔ خاص طور پر عام پڑھنے والوں میں عورتوں کے لکھے ناول بہت مقبول ہیں اور اسی سے گھٹیا قسم کے پبلشرز ناجائز فائدے بھی اٹھاتے ہیں۔ یعنی کچھ تو پاکستانی ناول نام بدل کر شائع کر دیتے ہیں یا ناول اصلی رہتا ہے ناول نگار کا نام بدل جاتا ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ گھٹیا قسم کے لکھنے والے مردوں سے تھوڑے سے پیسے دے کر ناول لکھوایا اور کسی عورت کے فرضی نام سے شائع کر دیا۔ مگر یہ حرکتیں اُردو سے مخصوص نہیں اور زبانوں میں بھی ہوتی ہیں۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا کہنا یہ تھا کہ ہماری یہ نوجوان ادیب خواتین یوں تو منہ کا مزا بدلنے کے لئے زمانہ رسالوں میں مضامین لکھ لیتی ہیں مگر ان کا اصل شوق ناول نگاری کا ہے اور اس میدان میں وہ جولانیاں دکھا رہی ہیں۔ ان کے قلم بڑی تیزی سے چل رہے ہیں اور ایک کے بعد ایک ناول تیار ہوتا چلا جاتا ہے اور چھپ بھی جاتا ہے۔ یہ ناول زیادہ تر رومانی ہوتے ہیں جن میں وہی حسن و عشق کی داستانِ پارینہ نئے نئے انداز میں سنائی جاتی ہے۔ مرکزی کردار کسی لڑکی کا ہوتا ہے جو عام طور پر حسن و ذہانت اور جملہ خوبیوں سے سر سے پاؤں تک مزین ہوتی ہے۔ محبت زیادہ تر پاک صاف ہوتی ہے۔ قربانی اور ایثار کا جذبہ بھی نظر آتا ہے۔ ہیرو کی وجاہت، شان و شوکت کے ساتھ دولت کی فراوانی بھی اکثر ناولوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ دو لڑکیاں ایک لڑکا۔ دو لڑکے ایک لڑکی کی تکون سے ناول کا پلاٹ بنتا ہے۔ ناول کے خاتمے پر اکثر فلمی اثرات نمایاں ہوتے ہیں۔ یہ ناول عام طور پر گھریلو عورتوں جوان لڑکیوں بلکہ نوعمر لڑکیوں میں بھی شوق سے پڑھے جاتے ہیں لیکن ان میں اچھی ناول نویس ادیب بھی ہیں جن کے ہاں ایک ندرت ہوتی ہے عورت کے مسئلوں سے جانکاری اور ہمدردی ہوتی ہے، اس کی محرومیوں کا احساس اور اسے دور کرنے کی لگن ہوتی ہے۔ ساتھ ہی انسانیت کا درد اور مذہب پر عقیدہ اور اخلاقی قدروں کی اہمیت کا احساس بھی ان میں موجود ہے۔ بعض میں کردار نگاری کی بڑی صلاحیت بھی ہے ہماری یہ نوجوان لکھنے والیاں اگر قلم کو ذرا روک کر لکھیں، ناول پر پوری محنت کریں تو ان کے ناولوں میں زیادہ گہرائی اور اثر پیدا ہوگا۔ ناول لکھنا بہت آسان بھی ہے اور بہت مشکل بھی۔ معمولی یا گھٹیا ناول آپ مہینے یا دو مہینے میں بھی لکھ سکتی ہیں۔ لیکن اچھے ناول فنکار کے ماتھے کے پسینے اور خونِ جگر کی آمیزش سے تخلیق ہوتے ہیں۔ ناول نگار ہر ہر کردار کے ساتھ مرتا اور جیتا ہے جب زندہ کردار تخلیق کرتا ہے ناول کو ذہن سے کاغذ پر منتقل کرنے کے لئے مہینوں کی راتوں کی نیند اور دن کا چین نثار کرنا پڑتا ہے۔

ان نوجوان ادیب خواتین میں یوں تو بہت سی ہیں لیکن رضیہ بٹ، زلیخا حسین، عفت موہانی، عطیہ پروین، مسرور جہاں، صغریٰ مہدی، عذرا جمال، وسیم بانو قدوائی وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں اور ہمیں امید ہے کہ ہماری یہ لکھنے والیاں مستقبل میں اُردو کو بہت اچھے ناول دے سکیں گی۔ ان میں عطیہ پروین کی نظر جزویات پر گہری ہے۔ زبان بے تکلف رواں اور بامحاورہ ہوتی ہے کردار نگاری بھی اچھی کرتی ہیں۔ رضو آپا ان کا بہت اچھا ناول ہے مگر چند سال میں اتنے بہت سے ناول لکھنے کی وجہ سے ان کے ہاں پلاٹ کی یکسانی آگئی ہے اور ان ناولوں میں کوئی نئی بات نہیں کہی گئی ہے۔ اگر وہ زیادہ محنت سے لکھیں تو بہت اچھی ناول نگار بن جائیں گی عفت موہانی کے قلم میں بھی بڑا زور ہے۔ وہ جاگیرداری نظام اور دولت و ثروت اور حسن و اعلیٰ ترین اخلاق دکھانے کی ذرا کمی کر دیں اور اپنے ناولوں میں وقت کے مسائل بھی رکھیں تو ان کا شمار بھی بہت اچھی لکھنے والیوں میں ہوگا۔

ایک اور بات جس کی طرف نوجوان لکھنے والیوں کو متوجہ کرنا چاہتی ہوں یہ ہے کہ وہ اپنا شوق صرف ناولوں تک محدود نہ رکھیں۔ اُن لڑکیوں کو چھوڑ کر جو ریسرچ کے سلسلے میں ادبی مقالے وغیرہ لکھتی ہیں عام طور پر سنجیدہ ادب کی طرف ہماری یہ تعلیم یافتہ خواتین بہت کم توجہ دے رہی ہیں۔ ادب صرف کہانی یا ناول ہی کا نام نہیں۔ ادبی موضوعات، تنقید، ڈراما، سیرت نگاری وغیرہ بھی نثری ادب کے اہم موضوع ہیں اور ان کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔

اُردو کی ادیب خواتین نے اُردو ادب کی جو خدمت کی ہے اور زبان کو جو کچھ دیا ہے اس کا ایک بہت مختصر سا جائزہ ہے جس میں سرسری طور پر ان کے کارناموں کا تذکرہ ہے ورنہ ان میں سے بہت سی ادیب ایسی ہیں جن میں سے ہر ایک پر ایک پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ بہرحال اس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُردو کی پرستار ادیب خواتین کو اپنی زبان سے کتنا گہرا تعلق اور ادب کے ذریعہ اپنی قوم، اپنے ملک، اپنی ہم جنسوں اور انسانیت کی خدمت کرنے کا گہرا جذبہ ہے اور ہمیں یقین ہے کہ یہ جذبہ یہ لگن یہ شوق اسی طرح بڑھتا جائے گا اور ایک کے بعد ایک نسل اُردو ادب کی خدمت کے لئے پیدا ہوتی رہے گی حقیقت تو یہ ہے کہ یہ وہی کہہ سکتی ہیں کہ

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

جوگیندر پال
پارک وِلا۔ مقبرہ روڈ، اورنگ آباد

وحدت

آپ متعجب ہوں گے کہ میری دائیں ٹانگ بائیں سے لمبی کیسے ہوگئی قصہ یہ ہے کہ میں اپنی دائیں ٹانگ کو ہر دم ہلاتا رہتا ہوں اور ہل ہل کر یہ میرے اوپری دھڑ سے باہر کھنچ آئی ہے۔

"ٹانگ ہلانا بند کرو، راکیش!" میرے پتاجی اکثر مجھے متنبہ کیا کرتے ہیں اور میں گھبرا کر اُسے اور تیز ہلانے لگتا ہوں۔

"بند کرو!"

"کیسے بند کروں پتاجی!؟" میں روہانسا ہو کر پوچھتا ہوں۔

"بیٹا" پتاجی کا غصہ دُور ہو جاتا ہے "یہ عادت اچھی نہیں، کل تم سوتے سوتے میں بھی اپنی ٹانگ ہلا رہے تھے ——— اور جانتی ہو مجھے کیا معلوم ہوا!؟" انہوں نے میری ماں کی طرف دیکھ کر کہا ہے "مجھے خیال آیا کہ راکیش اپنے بدن کے اندر ہی چل رہا ہے نہ جانے اسے کہاں جانا ہے۔"

"ہاں نہ جانے مجھے کہاں جانا ہے!"

ایک دفعہ میں اپنے ماں باپ کو اکیلے میں باتیں کرتے ہوئے سنتا ہوں۔

"آپ خواہ مخواہ پریشان ہوتے ہیں۔ وہ تو میرے پیٹ میں بھی اپنی ٹانگ ہلا ہلا کر مجھے اودھا کر دیا کرتا تھا۔"

مگر اس وقت تو مجھے اپنی ماں کے پیٹ سے باہر آنا تھا میں اسلئے بے چین تھا۔ کہیں آنا ہو تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔ وہاں آنے جانے کے بعد ہمیں چین آنا چاہیئے لیکن میری بے چینی آجانے کے بعد بھی ویسی ہی رہی۔

اسکول کا وہ دن:

بیٹھے بیٹھے مجھے نامعلوم کیا سوجھی ہے اور کوئی بہانہ پیش کر کے میں کلاس سے نکل آیا ہوں اور گیٹ سے باہر آکے گھنٹوں بھٹکتا رہا ہوں اور پھر ایک اُجاڑ راستے پر کسی تالاب کے کنارے بیٹھ کر پانی میں اپنے عکس کو گھورنے لگا ہوں اور مجھے صرف اتنا ہوش ہے کہ اپنے پاگل پن کا احساس ہو رہا ہے۔ میرے عکس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا ہے اور میرا ہاتھ بھی اس کی طرف بڑھا ہوا ہے۔ آپ گھبرائیے نہیں، آرام سے پڑھیئے۔ میں کوئی بھونڈا اور توتلا فلسفہ پیش کرنا نہیں چاہتا ہوں بلکہ اپنے بچپن کا ایک معصوم مشاہدہ رقم کر رہا ہوں۔ مجھے واقعی یہ محسوس ہو رہا ہے کہ میں اپنے عکس کا عکس ہوں۔ (شاید آپ سوچ رہے ہیں کہ ہائی اسکول کا کوئی پگلا چھوکرا ایسی باتیں نہیں سوچ سکتا۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ مگر میں اس کا کیا کروں کہ میں واقعی اسی طرح سوچ رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی پگلا چھوکرا ہی ایسی باتیں سوچ سکتا ہو)

تالاب کے کنارے میرے گرد و پیش چند اجنبی لوگ آگئے ہیں۔

"تم کون ہو؟"

"میں اپنی پرچھائیں ہوں۔"

"اگر تم اپنی پرچھائیں ہو تو وہ کہاں ہے جس کی تم پرچھائیں ہو؟"

میں پانی کے نیچے اپنی پرچھائیں کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔

وہ بوڑھا شاید سوچ رہا ہے کہ شردھا سے اپنے ہاتھ باندھ لے۔

(نہ جانے مجھے کس بال اوتار کا خیال آیا ہے)

"تم جا کہاں رہے ہو بالک؟"

"پتہ نہیں۔"

"کہاں سے آئے ہو؟"

"پتہ نہیں۔"

"تمہارے ماتا پتا کون ہیں؟"

"کہا جو ہے، پتہ نہیں۔" مگر میرے والدین کی شکلیں میری آنکھوں کے سامنے آگئی ہیں۔ "میرے ماتا پتا اسی شہر میں رہتے ہیں پچھلے جنم میں وہ میرے ماتا پتا تھے۔ اسی وقت سے میں انہیں ڈھونڈنے نکل پڑا جب مر گیا۔" میں اٹھ کھڑا ہوا ہوں۔ "میں ان سے مل کر ہی دم لوں گا۔"

میں واپس شہر کی طرف چل پڑا ہوں اور یہ چند لوگ میرے ساتھ ساتھ ہو لئے ہیں۔

میں چل رہا ہوں

"یہ سڑک وہی ہے۔"

"وہی؟"

"ہاں اس سڑک پر میں کئی بار چل چکا ہوں۔"

"آؤ بالک راج، ہم تمہیں اٹھا کر تمہارے ماتا پتا کے پاس لے جاتے ہیں ——— آؤ بالک، تھک جاؤ گے۔"

"نہیں، میں اپنے پیروں سے چل کر اپنے ماتا پتا سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ ۔ اُس مندر کے پیچھے جو سڑک ہے . . . . . اس سڑک کے سرے پر ایک پیپل ہے۔ آؤ تیز تیز چلو ــــ اس پیپل کے سامنے ایک ور سڑک ہے، وہیں ہمارا گھر ہے ۔ آؤ ــ آؤ!"

میں دوڑ رہا ہوں ــــ پورے ایک جنم کی جدائی کے بعد میں اپنے والدین سے مل رہا ہوں۔ میری دیوانگی مجھے بڑھتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ میرا شوق دیوانہ وار ہے۔ مگر میری سوچ صاف ہو رہی ہے۔ اصل میں میں اپنے اسکول سے اس لئے بھاگا تھا کہ خودکشی کر لوں۔ اور حالانکہ میں نے خودکشی نہیں کی تھی، مجھے یہی لگ رہا تھا کہ میں مر کر ہی اپنے والدین سے ملنے جا رہا ہوں ــــ میں خودکشی کیوں کرنا چاہتا تھا؟ نہ معلوم کیوں۔ یا شاید اس لئے کہ، مجھے اپنی چھوٹی بہن کے پاس جانا تھا جو پچھلے مہینے ہمیں سدا کے لئے چھوڑ چلی گئی۔

"میں نہیں جاؤں گی۔"

"کہاں نہیں جاؤ گی گڑیا؟"

"وہ بولتا ہے، چلو ــــ چلو میرے ساتھ ــ چلو، نہیں تو ــــ میں نہیں جاؤں گی، راکی بھیّا۔ اس سے کہو، چلا جائے۔ میں نہیں جاؤں گی ــــ نہیں ــــ"

وہ میرے ہاتھوں میں پڑی پڑی چلی گئی اور میں اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر پھیر کر گویا اپنی گڑیا بہن کی چابی ڈھونڈ رہا تھا کہ چابی ذرا گھما دوں اور اس کا بے جان جسم پھر سے ناچنے لگے۔

یہ ٹھیک ہے میں اسکول سے اسی لئے نکل پڑا تھا کہ سیدھا گڑیا کے پاس جاؤں گا ــــ تالاب کے پانی میں میری پرچھائیں مجھ سے کہہ رہی تھی تم یہاں ہو، پانی کے نیچے، میری طرف دیکھو، یہ! ــ یہ! ــــ تم مر چکے ہو ــــ مر چکے ہو! مر ــــ!

یہ میرا گھر ہے!

پیپل کے پچھواڑے میں اپنے گھر کے سامنے آ کھڑا ہوا ہوں۔ دروازہ کھٹکھٹاؤ لوگو، اور میرے ماں باپ سے کہو، تمہارا کیش لوٹ آیا ہے

بیٹا! بیٹا! ــــ بے ــــ!"

میرے ماں باپ بے قابو ہو ہو کر باری باری مجھے بھینچ رہے ہیں۔

"دھنیہ ہو، بالک رشی!"

میں اپنے باپ کی باہوں میں جکڑا ہوا ہوں اور میری دائیں ٹانگ ہل ہل کر شل ہو رہی ہے۔ شل ہو ہو کر بھی ہلتی چلی جا رہی ہے۔

"ٹانگ ہلانا بند کرو بیٹا۔"

میں بے اختیار رونے لگا ہوں کیونکہ میری ٹانگ ہلنا بند نہیں ہو رہی ہے۔

"دھنیہ ہو، بالک رشی!"

"ماں، میری دائیں ٹانگ کو زور سے پکڑ لو۔ میں اب کہیں نہیں جاؤں گا ماں، کبھی نہیں مروں گا، کبھی ــــ!"

لیکن میری ٹانگ بدستور ہل رہی ہے۔ مجھے بدستور انتظار ہے، میں ابھی آیا نہیں، مجھے ابھی جانا ہے۔

"لیکن کہاں؟"

یہیں بیٹھے بیٹھے اپنی ٹانگ ہلا ہلا کر میں بچپن سے جوانی تک آ پہنچا ہوں۔

"بند کرو، راکی۔ کیوں بیٹھے بیٹھے لنگڑا رہے ہو؟"

شوبھی سے مجھے بے انتہا محبت ہے۔ اس کی خوشی کے لئے میں بڑے سے بڑا کام انجام دے سکتا ہوں۔ میری ٹانگ ہلنا ازخود بند ہو گئی ہے۔ میرے دل کی دھڑکن رک گئی ہے مگر میں زندہ ہوں۔

"ہائے رام! تمہیں یوں بے حرکت دیکھ کر لگتا ہے کہ تم اپنے وجود سے خارج ہو گئے ہو اور تمہارا بے جان وجود میرے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔" وہ میری طرف دیکھ کر خوف زدہ سی معلوم ہونے لگی ہے۔ "مجھے لگ رہا ہے راکی، تم محبت کرنے کے لئے میری طرف ہاتھ بڑھاؤ گے تو میرا گلا گھونٹ دو گے۔"

میری ٹانگ پھر ہلنا شروع ہو جاتی ہے، میں جی اٹھتا ہوں اور مسکرانے کی کوشش کرنے لگتا ہوں۔

"اور اب تم اتنے عجیب نظر آ رہے ہو راکی کہ جی چاہتا ہے، یہاں سے چلی جاؤں اور باہر نکل کر جو بھی آدمی پہلے دکھائی دے اس سے شادی کر لوں۔"

شوبھی کو نہ پا سکنے سے میری اضطرابی کیفیت بڑھ گئی ہے۔ مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے پا کر بھی میرا اضطراب بڑھ جاتا۔ کچھ ہونا ہوتا ہے تو اس کے ہونے کا کوئی ایک سبب نہیں تو دوسرا ہو جاتا ہے۔ مجھے بہر صورت مضطرب رہنا ہے۔ سو میں مضطرب ہوں۔ شوبھی کو پا کر شاید میں اس لئے مضطرب رہتا کہ میں نے کسی اور کی بجائے اسے پا لیا ہے۔

کیا جس کا ہمیں انتظار رہتا ہے اسے ہمارا انتظار نہیں رہتا؟۔ یہ تو نہیں کہ انتظار ہمیشہ اسی کا کیا جاتا ہے جسے ہمارا انتظار نہ ہو؟ شوبھی کے انتظار میں میں اس دن پل پل بے چین رہا اور اس بے چینی میں اپنی ٹانگ اتنی ہلائی کہ کوسوں پہنچ کر بھی ایسی تھکن نہ ہوتی۔

"ارے! مجھے کیا پتہ تھا تم میرا انتظار کروگے!" وہ یقیناً جھوٹ نہیں بول رہی تھی "میں نے تو یونہی کہہ دیا تھا، آجاؤں گی۔"

در اصل وہ یوں ہی آگئی تھی۔ جیسے چلتے چلتے ذرا یوں ہی اپنا آپ دیکھنے کے لئے شیشے کے سامنے آکھڑی ہو۔ ہم شیشے کی طرف شیشہ دیکھنے کے لئے نظر نہیں اٹھاتے بلکہ شیشہ ہماری جھلک پاکر ہمیں پورے کا پورا اپنے کلیجے میں اُتار لیتا ہے۔

اپنی شیشے کی یہ مثال مجھے ایک اور اعتبار سے بھی صحیح معلوم ہوتی ہے۔ شوبھی جب تک میرے سامنے رہی ہے میری رگ رگ میں رچی رہی ہے، جیسے شیشے کے سامنے کوئی خوبصورت انسان۔ اور اب وہ پرے ہٹ گئی ہے تو اسکا سالم نقش میرے دلُ دماغ میں اُتر چکا ہے۔ اصل میں جس طرح شوبھی کو میرا انتظار نہیں مجھے بھی اس کا انتظار نہیں، لیکن چونکہ مجھے کسی کا انتظار ہے اسلئے اس سے ملُ کر میں نے اپنے آپ پر کیفیت طاری کرلی کہ مجھے انتظار ہے۔

اور تو اور، شادی کے بعد اپنی بیوی کے بارے میں بھی میرا پہلا تاثر یہی تھا کہ مجھے اسی کا انتظار تھا۔ حالانکہ ہزار خوبیوں کی بیوی کو بھی ایک بات نہیں آتی تو یہ کہ اپنا انتظار کیسے کروایا جائے۔ اسے بس یہی جنون ہوتا ہے کہ وہ آپ ہی انتظار کرے میرا چچیرا بھائی اپنی دانست میں بیوی کو خوش کرنے کیلئے اسکو ایک لمحے کے انتظار کا موقعہ بھی نہ دیتا مگر وہ ہمیشہ ناخوش دکھائی دیتی۔ شوہر پاس بیٹھا ہوتا اور وہ بھلی عورت پل پل اپنی دزدیدہ نظروں کو دروازے کی طرف اٹھاتی۔ مرد کو شک ہونے لگا کہ اس کی عورت کسی غیر مرد کے عشق میں گرفتار ہے۔ خلافِ معمول اس کے لئے اپنی بے پروائی جتانے کے لئے ایک رات وہ بہت دیر سے گھر لوٹا پر یہ دیکھ کر اس کا جی خوش ہوگیا کہ اس کی آہٹ پاتے ہی اس کی بیوی بے اختیار دروازے کی طرف دوڑی۔ سجی سجائی نظروں میں گھی کے چراغ لئے۔ کہ آتے ہی وہ یہاں گھس آئے اور پھر وہ آنکھیں بند کرکے اسے اپنے اندر بسالے۔

"تم کس کا انتظار کر رہی ہو؟"

"تمہارا"

"لو ہر روز جب میں تمہارے پاس ہوتا ہوں اس وقت کس کا انتظار کرتی رہتی ہو؟"

"تمہارا!"

میں اور میری بیوی کئی سال سے اکٹھا رہ رہے ہیں مگر مجھے معلوم ہے کہ وہ ہمہ وقت میرا انتظار کرتی رہتی ہے اور میں ——— اگرچہ مجھے شروع شروع میں یہی لگا تھا کہ مجھے اسی کا انتظار ہے مگر اب جب وہ میرے پاس بیٹھی میری راہ تک رہی ہوتی تو مجھے خیال آتا کہ حقیقتاً وہ اپنا ہی انتظار کر رہی ہے۔ میں جگہ پر بیٹھے بیٹھے دایاں پاؤں تیز تیز ہلانے لگتا ہوں اور مجھے یقین سا ہونے لگتا ہے اگر میں اٹھ جاؤں تو اسے میری روانگی پر آمد کا گمان ہوگا اور اس کا انتظار ختم ہوجائے گا۔

باری باری میرے چار بچے آئے تو ہر بار مجھے یہی لگا کہ میں اسی نووارد کی راہ دیکھ رہا تھا میرا چوتھا بچہ تو اس زمانے وارد ہوا تھا جیسے ٹرسٹ فنڈ اندر میں سمجھ رہا ہو کہ کیو میں سب سے آخر میں کھڑا تھا، اب وہاں کوئی نہیں، پیا ——— میں خالی الذہن ہو کر مزے سے حقے کی نے کو منہ سے لگا کر گڑگڑ کرنے لگا اور اپنے آپ سے کہنے لگا، اب باقی کیا رہ گیا ہے۔ جو ہونا تھا، سب ہو لیا قصہ ختم ——— اب مجھے کہیں نہیں جانا ہے۔ میری منزل آگئی ہے۔ میرا سفر ختم ہو گیا ہے۔

آج کا دن، پھر آج کا دن، پھر آج کا دن، وقت ایک ہی جگہ پر رکا تھا ہے ہم اپنا پاؤں ہلائے چلا جا رہا ہے۔ اور میں اپنی اس آج ہی آج میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ ناقابلِ یقین حد تک بوڑھا۔ کیا میں وہی ہوں جو تھا؟ یہ پرچھائیں میری ہی ہے یا کسی اور کی؟ یہ وہ پرچھائیں تو نہیں ——— یہ میں نہیں۔

تم کون ہو؟ وہ کہاں ہے جس کی تم پرچھائیں ہو؟ وہ گورا چٹا بالک، میرا وہ پچھلا جنم ——— میں اپنا سارا سفر طے کر کے پھر وہیں آگیا ہوں، یہ وہی سڑک ہے یہ وہی مندر ہے ——— وہ سڑک اس کے سرے پر پیپل ——— پیپل کے پچھواڑے ہمارا گھر، وہی گھر ——— اے بھگوان میرا سفر شروع ہوا ہے یا ختم؟

پتا جی، پچھلے جنم میں، میں آپ کا بیٹا تھا اور اس جنم میں آپ کا باپ ہوں میں آپ ہی اپنا باپ ہوں، آپ ہی اپنا بیٹا ہوں۔ مجھے معلوم نہیں میرا سفر ختم ہوا ہے یا شروع ہوا ہے؟ بتاؤ ورنہ میں خودکشی کرلوں گا۔ ٹھہرو گڑیا، ٹھہرو، میں آرہا ہوں ——— میں نہیں جاؤنگی راکی بھیا ——— اس سے کہو میں اسکے ساتھ نہیں جاؤنگی ———

تمہاری چابی کہاں ہے گڑیا؟ تمہاری چابی کیوں نہیں؟ یہ کیوں نہیں ہوتا کہ جب ہم مرجائیں تو کوئی ہماری چابی گھمائے اور ہم ناچنا شروع کردیں؟ مگر ہماری چابی کہاں ہے! ہماری چابی اس لئے نہیں کہ ہماری زندگی کا انحصار ہماری خارجی حرکت پر نہیں، ہمیں اپنے وجود کے باہر جسم کا بوجھ اٹھا اٹھا کے نہیں چلنا ہوتا بلکہ ہم ساری زندگی اپنے اندر ہی اندر سفر کرتے رہتے ہیں اور جو کچھ ہمیں اپنے باہر نظر آتا ہے وہ در اصل ہمارے اندر ہی اندر پیدا ہوتا ہے۔ ہمارا آس پاس ہمارے اندر کی پرچھائیں ہے۔ اس کا اپنا کوئی وجود نہیں۔

آج کا دن ———

میں مر رہا ہوں۔

اور میرے آس پاس زندگی کا ہجوم لگا ہوا ہے

میں اپنے سفر کے کنارے پہنچ رہا ہوں جیسے کوئی ٹرین اپنے جنکشن پر رکنے کے لئے پلیٹ فارم کی چھت تلے نیچے داخل ہو رہی ہے۔

میری ٹانگ ہلنا بند ہو گئی ہے۔

اور میں نے ایک پل میں اپنی تھمی ہوئی نظر اپنے سامنے کھڑے چاروں بیٹوں کی ٹانگوں کی طرف اٹھائی ہے، یا شاید مجھے یوں ہی لگا ہے کہ میں نے اپنی نظر اٹھائی ہے ——— اور ادھر دیکھ کر میری مرتی ہوئی سانس میری مسکرا دینے کی خواہش میں ڈوبنے لگی ہے۔

محمد یسین
بے ۲۳ جواہر نگر، سرینگر (کشمیر)

ہمارے ملک کا تعلیمی نظام

"ہندوستان کی قسمت پڑھائی کے کلاسوں میں بنائی جا رہی ہے۔" یہ مفروضہ نہیں حقیقت ہے۔ مبالغہ نہیں، واقعہ ہے۔ آج کی دنیا میں، جس کا محور سائنس اور ٹکنالوجی ہے، تعلیم ہی عوام کی خوشحالی، فلاح و بہبود اور حفاظت و نگہداشت کی ضامن ہے۔ اسکول، کالج اور یونیورسٹی سے فارغ التحصیل لوگوں کی صلاحیت اور تعداد پر ہمارے ملک کی تعمیر نو کا انحصار ہے۔ وہ تعمیر نو جس کا بنیادی مقصد عوامی زندگی کی بہتری ہے۔ یہ بات ذہن نشین ہونی چاہیئے کہ کوئی بھی طریقۂ تعلیم اس وقت تک بامعنی اور بامقصد نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ کسی خاص سماجی طریقہ کار سے مناسبت نہ رکھتا ہو۔ ہم کیسا سماج چاہتے ہیں، جب تک یہ تصور واضح نہیں ہوگا تعلیمی میدان میں افراتفری برپا رہے گی۔ تعلیم کا کوئی انفرادی تصور نہیں ہو سکتا ہے۔ یہ جاننے سے پہلے کہ ہم تعلیم سے کیا چاہتے ہیں۔ یہ بات صاف ہونی چاہیئے کہ ہم زندگی سے کیا چاہتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں تعلیم کے فلسفہ کا ماخذ فلسفۂ زندگی ہے۔

تعلیم کے تین مقاصد ہو سکتے ہیں۔ پہلا مقصد تو یہ کہ ہمیں کچھ علم حاصل ہو جائے۔ ہم اپنے گرد و پیش کو جانیں پہچانیں۔ دوسرا مقصد یہ کہ ایک کندۂ ناتراش مہذب بن جائے۔ تہذیب سے مراد یہ ہے کہ ایک شخص دوسروں کے احساسات کو سمجھ سکے۔ اس کا اندازہ اور احاطہ کر سکے، دوسروں کی خواہشات کا احترام کر سکے اور دوسروں کے ساتھ اچھی طرح پیش آ سکے۔ تیسرا مقصد زندگی میں ایک مقام حاصل کرنا ہے، ایک پیشہ اختیار کرنا ہے۔ ایسا پیشہ جو اس کے مزاج سے مناسبت رکھتا ہو جس میں وہ اپنی تخلیقی صلاحیتیں استعمال کر سکے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ پیشہ خواہ کوئی بھی ہو لیکن وہ سماجی دھارے سے الگ نہیں ہو سکتا جو سماج کے کام نہ آ سکے وہ پیشہ نہیں ہے۔

آزادی کے بعد ہندوستان میں ہمہ گیر تعلیمی سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ تعلیمی میدان میں انقلابی تبدیلیاں عمل میں آئیں۔ اس سے دو چیزیں سامنے آئیں۔ ایک تو یہ کہ حصولِ تعلیم کے بہتر مواقع میسر ہوئے اور تعلیم کو فروغ حاصل ہوا۔ دوسرے نظریاتی بحث شروع ہوئی کہ تعلیم کا کردار کیا ہو؟ اس کا دائرہ کتنا وسیع ہونا چاہیئے؟ اور تعلیم کا مقصد کیا ہے؟

ہندوستان کے نظامِ تعلیم کا جائزہ لینے سے پہلے یہ بہتر ہوگا کہ دنیا کے چند ترقی یافتہ ممالک کے تعلیمی ڈھانچے پر نظر ڈال لی جائے۔ اس پس منظر میں ہندوستانی تصویر زیادہ بہتر طریقہ پر سامنے آئے گی۔

فرانس میں نپولین نے تعلیمی نظام کی از سرِ نو تشکیل کی۔ مرکز کا دائرۂ اختیار ہمہ گیر بنا۔ مرکزیت کی یہی پالیسی کم و بیش اب بھی رائج ہے۔ پورا ملک سترہ اکیڈمی میں منقسم ہے۔ سارا نظام ایک ڈائرکٹر (DIRECTOR) کے ماتحت ہے جس کی تقرری مرکزی وزیرِ تعلیم کرتا ہے اور یہ صرف وزارتِ تعلیم ہی کو جواب دہ ہے۔ ہر جگہ ایک ہی جیسا نظام نافذ ہے جو مرکز کے تابع ہے۔ فی زمانہ اگرچہ یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ مرکزی وزیرِ تعلیم پیرس میں بیٹھے ہوئے اپنی گھڑی دیکھ کر بتا دیں گے کہ فرانس کے کس کلاس روم میں کس وقت کس مضمون کا کون سا سبق پڑھایا جا رہا ہے لیکن یہ صحیح ہے کہ بہت حد تک نصاب اور طریقۂ تعلیم میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ گذشتہ برسوں میں اس یک رنگی اور سخت روی کے خلاف آواز بلند کی گئی ہے اور اب مقامی ضرورتوں کے پیشِ نظر نصاب اور طریقۂ تعلیم میں مناسب رد و بدل کی اجازت دے دی گئی ہے لیکن مرکز کا اب بھی ہر طرف غلبہ ہے۔

امریکہ میں صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے جہاں لامرکزیت کا ہر شعبہ میں دور دورہ ہے۔ امریکہ کے آئین میں تعلیم فیڈرل یعنی مرکز کے دائرہ اختیار میں نہیں ہے۔ بنیادی ذمہ داری ریاستوں کی ہے جنھوں نے عملاً پرائمری اور سکنڈری تعلیم کو مقامی اداروں کو سونپ دیا ہے۔ ریاستیں فیڈرل امداد اور کنٹرول کو پسند نہیں کرتی ہیں اور ایسی ہر کوشش کی سختی سے مخالفت کرتی ہیں۔

انگلینڈ نے ان دو کناروں کے بیچ کا راستہ اختیار کر رکھا ہے۔ مرکزی وزارتِ تعلیم اور مقامی تعلیمی اداروں کے درمیان ایک خوشگوار رابطہ قائم ہے جو فرانس کی مرکزیت کے اثرات کو اگر ایک طرف کم کرتا ہے تو دوسری طرف ایک قومی پالیسی مرتب کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ جہاں کہیں کچھ خامیاں ہوتی ہیں انہیں دور کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ آزادی اور رنگارنگی کو جو تعلیمی صحت اور ترقی کی روح ہے قربان کئے بغیر پورے ملک میں تعلیمی معیار میں یکسانیت اور ہم آہنگی

پیدا کی جاسکتی ہے۔

ہندوستان ایک سیکولر جمہوری مملکت ہے۔ اس کے آئین کا جھکاؤ زیادہ تر فیڈرل طرزِ حکومت کی طرف ہے۔ اس کا تعلیمی نظام بھی امریکہ کے نظام سے زیادہ قریب ہے۔ دستورِ ہند کے تحت جس کا نصب العین جمہوری سوشلزم ہے، ریاستوں کو آئین کے بنیادی حقوق کا احترام کرتے ہوئے تعلیم کے میدان میں تقریباً مکمل خودمختاری حاصل ہے۔ ریاستیں خود تعلیمی لائحہ عمل مرتب کرتی ہیں، خود ہی کفالت کرتی ہیں، خود ہی انتظام سنبھالتی ہیں اور خود ہی نگرانی کرتی ہیں۔ مرکزی وزارتِ تعلیم اور وزارتِ سائنسی اور ثقافتی تحقیق کا کام تال میل پیدا کرنا ہے۔ ہدایات اور مشورے دینا ہے۔ وہ صرف ان علاقوں کا نظامِ تعلیم چلاتی ہیں جو براہ راست مرکز کے زیرِ انتظام ہیں یا ان یونیورسٹیوں کے نظم و نسق کی نگرانی کرتی ہیں جن کو مرکزی یونیورسٹی کہا جاتا ہے جیسے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور بنارس ہندو یونیورسٹی۔ ان کے علاوہ سائنسی تحقیق اور تکنیکی تعلیم کے کچھ ادارے بھی مرکز کے زیرِ اہتمام ہیں بقیہ دیگر تمام تعلیمی شعبے، محکمے اور ادارے ریاستوں کے دائرہ اختیار میں ہیں اور یہ ان کی ذمہ داری ہیں۔ مرکزی حکومت صرف انکو مشورے دیتی ہے، اطلاعات بہم پہنچاتی ہے ان کی ہمت افزائی کرتی ہے۔ مرکزی حکومت انکے ایسے طریقہ تعلیم کو اپنانے میں رہنمائی کرتی ہے جو آئین کے جمہوری اصولوں سے مطابقت رکھتا ہو۔ مرکزی حکومت فراخ دلی سے ریاستوں کو مالی امداد بھی دیتی ہے۔

ریاستی حکومتوں نے عام طور پر ابتدائی تعلیم کی ذمہ داریاں دیہی اور شہری میونسپل کمیٹیوں اور بورڈوں کو سپرد کر دی ہیں۔ تجربے نے ثابت کیا ہے کہ مقامی اداروں نے نظامِ تعلیم کو عموماً خوش اسلوبی سے نہیں چلایا۔ اس لئے نئی زمانہ یہ رجحان بڑھ رہا ہے کہ ابتدائی تعلیم بھی ریاستوں کے بلاواسطہ کنٹرول میں رہے۔ چونکہ مرکز ریاستوں کے تعلیمی اخراجات بہت حد تک برداشت کرتا ہے اس لئے اس کا حلقۂ اثر بھی بڑھتا جا رہا ہے لیکن مرکزی وزارتِ تعلیم کل ہند پیمانہ پر تعلیم کو بڑھاوا دینے میں اور ہم آہنگی پیدا کرنے میں ایک موثر اور مثبت رول ادا کر رہی ہے۔

تعلیم کے میدان میں مرکز کا بڑھتا ہوا متحرک رول کچھ لوگ شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں لیکن صاحبِ نظر یہ ماننے پر مجبور ہوگا کہ ملک میں تخریبی عناصر کی سرگرمیوں کے پیشِ نظر تعلیم کو قومی اتحاد اور استحکام کی طاقتوں کے ہاتھ کو مضبوط کرنا ہے۔ ملک کی ہمہ گیر اقتصادی، معاشی، صنعتی، سماجی اور ثقافتی ترقی کے لئے یہ ضروری ہے کہ کل ہند پیمانہ پر تعلیمی خاکہ تیار کیا جائے اور مرکزی حکومت تعلیم کے معاملہ میں بھی رہبری اور قیادت اپنے ہاتھ میں لے۔ ریاستی اور مقامی سطحوں پر تعلیمی خودمختاری کے لئے بہت کچھ کہا جاسکتا ہے لیکن بنیادی تعلیمی پالیسی اور مقاصد کو ان پر قربان کرنا قومی مفاد کے منافی ہے۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ مرکز ریاستی اور مقامی اداروں سے مل جل کر کام کرے۔ صرف اوپر سے احکام نافذ کرنے تک اپنے کو محدود رکھنا مہلک ثابت ہوگا۔

دنیا کے تمام ممالک آج کل تعلیمی بحران سے دوچار ہیں۔ ہندوستان ان سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ یہاں بھی تعلیمی بے چینی پائی جاتی ہے اور مختلف مسائل درپیش ہیں۔ ایک بہت ہی نازک مسئلہ امتحان کا ہے۔ کیا امتحانات ضروری ہیں؟ ان کی افادیت کیا ہے؟ کیا رائج امتحانی طریقہ کار مناسب ہے؟ ایسے بہت سے سوالات سامنے آتے ہیں۔ بہت سے ادارے تو امتحان کے سلسلہ کو یکسر ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ امتحانات پوری تعلیمی فضا کو مکدر کر دیتے ہیں۔ اساتذہ اور طلبا دونوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ امتحانات کا موجودہ طریقہ طلبا کی صحیح قابلیت اور لیاقت کو جانچنے سے معذور رہے۔ امتحانات پر مکمل انحصار کی وجہ سے طلبا مضمون کو پڑھنے کی بجائے کسی صورت سے امتحان پاس کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ لیکن امتحانات ضروری ہیں اور لازمی طور پر رہیں گے۔ جو لوگ امتحانات کو ختم کرنے کی رائے دیتے ہیں وہ اس کو دوسرے طریقوں سے پھر درمیان میں لاتے ہیں اگر معلم کو یہ معلوم کرنا ہو کہ اس کی تعلیم کے اثرات اور نتائج کیا ہیں تو اسے جانچنا اور امتحان لینا ضروری ہے خواہ اس کا طریقہ کچھ بھی ہو۔

امتحانات ایک مسلسل عمل ہے، تعلیمی ڈھانچہ کا ایک لازمی حصہ ہے اور تعلیمی مقاصد کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس کو الگ کر کے نہیں سوچا جاسکتا۔ اس کا طالب علم کے مطالعے اور استاد کے درس و تدریس سے گہرا تعلق ہے۔ اس سے نہ صرف تعلیمی لیاقت کا پتہ چلتا ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کسی طرح بہتری پیدا کی جاسکتی ہے۔ امتحانات طلبہ کی ترقی اور کارکردگی کو معلوم کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ایک استاد اپنے طالب علموں سے پوری پڑھائی کی مدت میں وابستہ رہتا ہے لیکن صرف اُس کی رپورٹ پر طلبا کی ترقی اور درجہ بندی نہیں کی جاسکتی ہے۔ طالب علم ہمیشہ استاد کو خوش کرنے کی فکر میں لگا رہے گا اور اس کی مناسب اور صحیح دماغی اور ذہنی نشوونما نہیں ہوسکے گی۔ دوسرے یہ رپورٹ بذاتِ خود ایک معمہ ثابت ہوسکتی ہے اور اس کا تجزیہ کرنے کے لئے ایک الگ شعبہ کی ضرورت پڑے گی۔

آج کل امتحانات میں اصلاح کے بارے میں بہت کچھ کہا جا رہا ہے لیکن ہمیں اپنے سماجی ڈھانچے کو مدِنظر رکھ کر قدم آگے بڑھانا چاہیئے۔

اندھی تقلید سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ مثال کے طور پر امریکی سیمسٹر سسٹم (SEMESTER SYSTEM) عام طور پر اُس وقت تک قابلِ عمل نہ ہو سکے گا جب تک روزگار حاصل کرنے کے مواقع میں بہتری پیدا نہیں ہوتی ہے۔ کیونکہ نوکری حاصل کرنے کے لئے اچھے نمبروں سے پاس ہونا ضروری ہے۔ اس لئے اچھے نمبر حاصل کرنے کے لئے اساتذہ کو مجبور کیا جا سکتا ہے۔ یہی خدشات درمیانی مدت کے امتحانات اور وائی واووسی (VIVA VOCE) کے بارے میں بھی محسوس کئے جاتے ہیں۔ سالانہ امتحان کی جگہ سال میں دو تین مرتبہ امتحان لینا اتنا قابلِ عمل نہیں ہے جتنا کہ خیال کیا جاتا ہے۔

امتحانات کے طریقہ کو موثر بنانے کے لئے پہلی توجہ تو سوالوں کے پرچے پر مرکوز کرنی چاہیئے۔ سوالات ایسے ہونے چاہئیں جو طلبا کی ذہنی نشوونما، بصیرت، تنقیدی مادہ اور مضمون پر اُن کی گرفت معلوم کر سکیں۔ ایسے سوالات جن سے صرف رٹ کر کچھ اطلاعات کو کاپی پر منتقل کر دینا مقصود ہو امتحان کو بہت حد تک بے معنی بنا دیتے ہیں۔ کچھ ممتحن فخریہ بیان کرتے ہیں کہ وہ ناشتہ کی میز پر امتحان کا ایک پرچہ بنا دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے امتحانی پرچے امتحان کے مقصد ہی کو فوت کر دیتے ہیں۔

امتحانات کے ساتھ ساتھ طریقۂ تعلیم میں بھی اصلاح کی ضرورت ہے۔ پڑھائی کے تین عام طریقے رائج ہیں۔ لکچر۔ سیمنار اور ٹیوٹوریل۔ ان تینوں طریقوں میں استاد سب سے اہم اور کلیدی رول ادا کرتا ہے، تینوں طریقے اپنی اپنی جگہ اپنا اپنا پارٹ ادا کرتے ہیں لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ ہمارے ملک میں لکچر کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ سیمنار اور ٹیوٹوریل کی طرف بہت کم توجہ دی جاتی ہے جہاں لکچر ختم ہوتے ہیں وہیں سے بحث و مباحثہ کا آغاز ہوتا ہے۔ لکچر کا مقصد ادھورا رہ جائے گا اگر اس پر بحث نہ ہو۔ جو چیز لکچر اور سیمنار سے حاصل نہیں ہوتی ہے اسکی تلافی ٹیوٹوریل میں ہوتی ہے۔ اس نئے پڑھائی کی کسی بھی اسکیم میں لکچر، سیمنار اور ٹیوٹوریل کو برابر جگہ ملنی چاہیئے۔

نصابِ تعلیم میں بھی زبردست تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ ملک کی تمام یونیورسٹیوں کا نصاب کچھ ایک ہی جیسا ہے۔ ہر پیپر یعنی مضمون کے نیچے عنوانات کا اندراج طلبا، اساتذہ اور ممتحن، سب کو ایک ہی دائرہ میں گھومنے پر مجبور کرتا ہے۔ طلبا ان عنوانات پر دسترس حاصل کر لینا تعلیم کی معراج سمجھتے ہیں اور معراج کا معیار ہوتا ہے استاد کا لکچر یا لکھوایا ہوا کلاس نوٹ۔ ظاہر ہے ایسا نصاب تعلیم صحیح سمت میں رہنمائی نہیں کر سکتا ہے۔ دوسرے ہمارا نصاب بدلتے ہوئے تقاضوں سے مطابقت نہیں رکھتا۔

دوسرا مسئلہ طلبا میں ڈسپلن کا ہے۔ میرے ایک استاد کہا کرتے تھے کہ میں نے بُرے استاد دیکھے ہیں بُرے طالب علم نہیں۔ یہ بات بہت بڑی حد تک صحیح ہے۔ جہاں تعلیم کا ایک تصور ہے وہاں استادگی بھی ایک تصویر ہوتی ہے۔ ہر شخص اُستاد نہیں ہو سکتا۔ اُستاد بننے کے لئے نہ صرف علمی صلاحیت ضروری ہے بلکہ ایک مزاج بھی۔ عالمِ باعمل ہی استاد ہو سکتا ہے۔ ضبط اور ایثار، خدمتِ خلق اور تعلیم دینے کا جذبہ جب تک نہ ہو استاد استاد نہیں بن سکتا۔ مقصدیت استاد بننے کی اولین شرط ہے۔

ہر اُستاد معمارِ قوم ہوتا ہے۔ یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ اُستاد کلاس روم میں اکیلا ہوتا ہے۔ جو کچھ وہ کہتا ہے اس کی صحت پر شبہ نہیں کیا جا سکتا ہے اور نہ کوئی ذریعہ ہے کہ اس کی تردید ہو سکے۔ اگر وہ طلبا کو سمجھائے کہ ایک ہفتہ میں آٹھ دن ہوتے ہیں تو معصوم دل و دماغ اس پر یقین کرتے ہیں۔ اگر وہ کہے کہ سورج زمین کے گرد چکر لگاتا ہے تو طلبا اس پر آمنّا و صدّقنا کہیں گے۔ قابل اور مناسب اشخاص کی استاد کی حیثیت سے تقرری طلبا میں نظم پیدا کرنے میں بہت حد تک ذمہ دار ہوگی۔ اس قومی مسئلہ پر مقامی، علاقائی، مذہبی، رنگ و نسل اور تمام دوسرے تعصبات سے بالاتر ہو کر غور کرنا پڑے گا۔ اساتذہ میں ٹریڈ یونین رجحانات بھی تعلیم کی نفی ہیں۔

تیسرا مسئلہ یونیورسٹی تعلیم کا ہے۔ ملک کی یونیورسٹیوں سے شعلے اُٹھ رہے ہیں۔ کیوں؟ اس کا تعلق پورے نظامِ تعلیم سے تو ہے ہی لیکن اس کی کچھ مخصوص وجوہات بھی ہیں اور ان کی سب سے بڑی وجہ یونیورسٹی انتظامیہ کے سربراہ ہیں۔ یونیورسٹی ایک خود مختار ادارہ ہوتا ہے۔ تحقیق و جستجو کا مقدس گہوارہ۔ یہاں انتظامیہ تین حصوں میں منقسم ہے۔ کنٹرولر امتحانات، امتحانات کا کام دیکھتا ہے۔ رجسٹرار دفتری کام سنبھالتا ہے اور وائس چانسلر علمی و ادبی تحقیق اور جستجو کی نگرانی کرتا ہے۔ طلبا میں کردار اور خود اعتمادی پیدا کرنے کے لئے نمونہ اور مثال قائم کرتا ہے۔ مشعلِ راہ اور سنگِ میل ثابت ہوتا ہے۔ اور جب یونیورسٹی کا سربراہ ایسا شخص نہ ہو جس کے آگے خود بہ خود عقیدت اور احترام سے سر جھک جائے یونیورسٹی کبھی آگے قدم نہیں رکھ سکتی۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن اور ڈاکٹر ضیاءالدین، ڈاکٹر ذاکر حسین اور ڈاکٹر دولت سنگھ کوٹھاری، آچاریہ نریندر دیو اور پروفیسر امرناتھ جھا کی وائس چانسلری میں آج کل کے حیران کن اور بھیانک ڈرامے کبھی رونما نہیں ہوئے تھے۔

(باقی ص ۴۳ پر)

وشوا ناتھ درد ۲۲۴ ریلوے کوارٹرز کشن گنج۔ دلّی ۶

دستاویز

جو سانس سانس سے اکھڑے تو موت کا عالم
کڑی کڑی سے جڑے تو بنے کہیں زنجیر!
ہمارا ماضی اندھیروں میں گم ہوا ہے مگر
ہمارا حال اندھیروں کی بن گیا تصویر
ہماری شعلہ بیانی کی خواب گاہوں سے
ملے گی وقت کے ہونٹوں کو اک نئی تعبیر
لکھی ہے ہم نے نئی نسل کے جو ماتھے پر
حیاتِ نو کے مورخ پڑھیں گے وہ تحریر

جو ہو سکے تو کتابِ حیات کو پڑھنا
یہ مدرسے تو کتابوں کے قید خانے ہیں
ہمارے سامنے سرگوشیوں کی چلمن ہے
تمہاری آنکھ تلے عمر کے فسانے ہیں
بڑی حسین ہے قسمت تمہارے فردا کی
ہماری زیست ڈگر ہے تمہاری دنیا کی

علقمہ شبلی ۸۹/۵ رپن اسٹریٹ، کلکتہ۔ ۷۰۰۰۱۶

گرودیو

اے مرے شاعرِ قد آور و شیریں گفتار!
لبِ افکار کو بخشا ہے تبسم تو نے
دل کی خاموش امنگوں کو زباں بخشی ہے
روحِ افسردہ کو بخشا ہے ترنم تو نے
تیرے سینے میں جو تھا شعلۂ افکار نہاں
نخلِ باطل کی ہر اک شاخ جلا دی اس نے
"پورَبی"[1] ساز پہ جو تو نے ترانہ چھیڑا
بزمِ مغرب میں بھی اک آگ لگا دی اس نے

ہے یہ تسلیم گرودیو! وطن میں تیرے
زندگی خاک بسر آج نظر آتی ہے
جس طرف دیکھیے، ہے تیرہ دلی کا منظر
روشنی شہر بدر آج نظر آتی ہے
قول تیرا یہ مجھے یاد ہے ٹیگور، مگر
"تیرگی لاکھ بڑھے اس کا ہے انجام سحر"

[1] ٹیگور کے ایک مجموعے کا نام

شاہد ماہلی
معرفت دفتر آل انڈیا کانگریس کمیٹی۔ راجندر پرساد روڈ، نئی دہلی

عظمتیں

عظمتیں اپنے سینوں پہ
کتبوں کے تمغے لگائے
بڑی دیر تک میری حیرت پہ ہنستی رہیں
جانے کتنی فتوحات کی داستاں
پتھروں کی زبانی سناتی رہیں
گنگناتی رہیں
جانے کتنے شب و روز کے
رنگ صد رنگ نغمے
دکھاتی رہیں
دھند میں جب کوئی قافلہ آ کے ٹھہرا
نکلتا رہا صف بہ صف
آتی جاتی رہی لشکروں کی کمک
وہ چمک وہ چمک
چیخ، للکار، جھنکار آہ و بکا
خون کی ندیاں
عظمتیں دھند میں سب دکھاتی رہیں
مسکراتی رہیں گنگناتی رہیں
عظمتیں میری ــــ کتبوں کی تحریر پڑھنے کی لاحاصلی دیکھ کر
رو پڑیں ــــ عظمتیں رو پڑیں

سلطان علی شیدا
دہلی کالج، اجمیری گیٹ۔ نئی دلی

وجودیت اور جدید انسان

(۱)

ہم کہ رمزِ محبت کی تجسیم تھے
منقسم ہو گئے
بوڑھی اقدار کے کالے بازار میں
لرزشِ بوسۂ اولیں بک گئی
(ساجدہ زیدی)

انسان جب اپنے ماحول اور معاشرہ کی بلند عمارتوں کو منہدم ہوتے اور اپنی اخلاقی اور سماجی قدروں کے آبگینوں کو چکنا چور ہوتے دیکھتا ہے تو اس کے دل کی گہرائیوں سے ایک آہ اور حلق سے ایک کربناک چیخ نکلتی ہے اور یہ چیخ جب لَے اور نغمگی کا روپ دھارتی ہے تو شاعری بن جاتی ہے اور جب افکار و تخیلات کا جامہ پہن کر آتی ہے تو فکر و فلسفہ کہلاتی ہے۔ اپنے وجود کی ناپائیداری اور نزاکت جب اس پر آشکار ہوتی ہے تو ابدیت اور لافانیت کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے اور یاس و ناامیدی کے بیابانِ لق و دق صحرا میں انسان خود کو بے یار و مددگار پاتا ہے۔ وجودیتی فلسفہ انسان کو اپنا سفر اس صحرا سے شروع کرنے کی ترغیب دیتا ہے جہاں سے چل کر وہ ایک بار پھر اپنی دنیا اور اپنی ذات کے متعلق حقائق کی دریافت کرے اور انہیں اپنے وجود کے آئینے میں سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش کرے۔

وجودی فلسفے کا آغاز یوں تو اس وقت سے ہوتا ہے جب یونانی اور جدید کلاسیکی فلسفیوں نے کسی نہ کسی وجہ سے اس بات پر زور دیا کہ انسان اپنی حقیقت کی جستجو کرے اور یہ جان لے کہ اس کا مابہ الامتیاز کیا ہے۔ یہ 'وجودی فکر' انسانی شعور اور لاشعور میں اُس وقت سے کارفرما ہے جب سے انسان کے ذہن نے اپنے آپ کو فطرت کا ایک حصہ سمجھتے ہوئے بھی فطرت کے دیگر عناصر اور مخلوقات سے ممیز کرنے کی کوشش کی۔ وجودی فکر کے وسیع ترین معنیٰ یوں تو اکثر تلاشِ ذات اور فکرِ ذات کے اندر محدود نظر آتے ہیں مگر اس وسیلے سے انسان ایک معروضی حقیقت کو سمجھنا چاہتا تھا جو انسان میں بحیثیت حیوان عقلی (ناطق) پائی جاتی ہے۔ کبھی کبھی یہ فکر ان اشیا کی طرف بھی رجوع ہوئی جس سے انسان نے خود کو کسی نہ کسی طرح مربوط پایا ــــــ اس طرح ایک طرف اُپنیشد، سوفسطائی فلسفی، سقراط، تھامس اکوئینا، ڈے کارٹ، روسو، ہیگل، مارکس، نٹشے، مسلکِ انسانیت، نظریۂ علیت وغیرہ تمام فلسفیوں یا تحریکوں میں وجودی فکر کارفرما نظر آئے گی۔ اور دوسری طرف صوفیا، مفکرین، بھگتی تحریک یا درد، میر، فانی، غالب، اقبال جیسے شعرا میں بھی یہ عناصر بدرجۂ اتم موجود ہیں اور ان کے مقاصد کے لئے لابدی ہیں۔

مگر دورِ جدید میں وجودیتی فلسفہ عقل کی معروضیت اور ہمہ گیریت کو رد کر کے ان حقائق کی طرف رجوع کرتا ہے جو اس کو جذبات و محسوسات کے آئینے میں ذاتی مشاہدہ کرا سکیں۔ 'وجودیتی فکر' ایک خاص دور اور ایک مخصوص سیاسی، سماجی پسِ منظر کا زائیدہ ہے اور اس لئے اس کو سمجھنے کے لئے اُن حالات و کشاکش کو واضح اور شعوری طور پر سمجھنا ضروری ہے جن کا یہ عطیہ ہے[1] وجودیتی فلسفے کا سفر ڈنمارک سے شروع ہوتا ہے اور جرمنی اور فرانس ہوتا ہوا اٹلی میں داخل ہوتا ہے۔ اس کے اہم سالارِ کارواں ڈنمارک کے کارک گارد، جرمنی کے یاسپرس اور ہائیڈیگر، فرانس کے سارتر، مارسل اور کامو اور اٹلی کے اونامنو رہے ہیں۔

زیرِ نظر مقالہ میں میرا مقصد اس فلسفے کے صرف چند پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنا ہے جن کی بازگشت عصری انسان کو اس کے دل کی آواز لگتی ہے اور اسی لئے جن کا پرتو ادب و فن پر بلاواسطہ یا بالواسطہ بہت نمایاں ہے۔ آخر الذکر کے سلسلے میں توضیحاً چند شاعروں کا حوالہ دوں گا جو اپنی شاعری کے آئینے میں اس تحریک یا طرزِ فکر سے متاثر نظر آتے ہیں۔[2]

(۲)

وجودیت کی یوں تو کوئی سادہ اور سیدھی تعریف مشکل ہے کیونکہ ذاتی تجربات و داخلی مشاہدات کو اس میں جتنا دخل ہے شاید کسی اور مکتبِ فکر میں نہیں۔ ہر وجودیت پسند نے وجود سے متعلق مسائل کو اپنے تئیں سمجھا اور ان پر غور کیا ہے اس لئے کسی بندھے ٹکے پیمانے سے ان فلسفیوں کو ناپنا

---

[1] اُمید ہے 'وجودی' اور 'وجودیتی' فکر کے معنوں کا باریک فرق قارئین کو محسوس ہو گیا ہوگا۔
[2] اس ضمن میں قارئین سے درخواست ہے کہ ان نظموں یا شعروں کا انتخاب مجھے کسی بھی معنوں میں رسوا کرنے کا ضامن نہ ہے کیونکہ ادبی ذوق اور شعر فہمی کی بے مائیگی کا شدید احساس ہے۔ علاوہ ازیں جدید شعرا جن میں کچھ وہ بھی شامل ہیں جو اصطلاحی معنی میں 'جدید' ہیں کی بہت لمبی فہرست ہے اور جدید شاعری بہت بسیط ہے۔ لہٰذا یہاں صرف چند نمونوں پر ہی اکتفا کروں گا کسی مخصوص ادبی اصولِ انتخاب کے نہ برتے جانے کے لئے معافی کا خواستگار ہوں۔

خود اس فلسفے سے متناقض نظر آئے گا۔ تاہم اس کی تعریف کے سلسلے میں کچھ غیر قطعی اور محتاط جملے کہے جا سکتے ہیں جن کی تعبیر کم از کم ہو تو بہتر۔

سارتر نے اپنی کتاب 'وجودیت اور مسلکِ انسانیت' (Existentialism and Humanism) میں وجودیت کو ایک ایسا فلسفہ کہا ہے جس میں 'وجود' جوہر یا ماہیت سے مقدم ہے: دوسرے الفاظ میں یہ فلسفہ وجود کو 'ہستی' سے ماقبل اور زیادہ بنیادی قرار دیتا ہے کیونکہ انسان کی ہستی جو کچھ بھی ہو سکتی ہے وہ وجود کے اندر ہی ممکن ہے اور اس لئے وجود کو تسلیم کئے بغیر ہستی کا تصور ممکن نہیں۔ 'تقدم' کے یہ معنی صرف زمانی نہیں بلکہ منطقی اور مابعد الطبیعاتی تقدم کے معنوں کو بھی شامل کرتے ہیں۔ پس وجودیت ایسی طرزِ فکر ہے جس میں فطرت اور عالمِ طبیعی پر نہیں بلکہ انسانی وجود اور اس کی مخصوص خصوصیات پر زور دیا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا فلسفہ ہے جس میں فلسفی خود کو آفاقی یا الہامی بلندیوں پر پہنچا کر فانی انسانوں اور فطرت کا ماورائی تماشائی نہیں بنتا بلکہ وہ خود ان حقائق و واقعات میں شامل اور خود ایک عامل بن کر اپنے ہی افعال و اعمال کا تجزیہ کرتا ہے اور ان کو پرکھتا ہے۔ فلسفہ یہاں محض مجرد تخئیل و تفہیم کا عمل نہیں بلکہ ایک خود نگر و خود کار تجربی فکر بن جاتا ہے۔

وجودیتی مفکر کے مسائل خود اس کے وجود سے ابھرتے ہیں اور اسی سے منسوب ہیں لہٰذا ان کے حل کی کوشش اس کے وجود اور ہستی کے تجزیے کے بغیر ممکن نہیں۔ یہی تجزیہ اس کے حاصل شدہ فہم و درک بعد میں تمام تر انسانوں کے وجود کے لئے اس حد تک صادق آتے ہیں جس حد تک ان میں تجرباتی یکسانیت و مماثلات ہیں۔ اس فلسفے کے تمام تر نمائندوں کے حاصلات بیشک مختلف ہیں کیونکہ وہ خود ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ لہٰذا اس وجودی تجربہ کا اظہار کبھی تو ناامیدی، خوف، تردد یا کرب میں ہوتا ہے تو کبھی متلی اور لغویت کے احساس میں۔ اردو کی جدید شاعری تمام تر اسی ایک محرک کا مظہر ہے جس میں مختلف علائم و اشارات کی مدد سے جدید انسان کے مسائل و مشکلات کی عکاسی کی جا رہی ہے۔

کافکا کا یہ قول ہے کہ "زندگی کی شان ہمیشہ اور مکمل طور پر سب کو حاصل ہے مگر یہ گہرائی اور بُعد کی چادر میں ملبوس رہتی ہے مگر یہ موجود ہوتی ہے ــــ یہ نہ تو جارحیتی قوت ہے اور نہ بہری ہے۔ اس کو صحیح الفاظ سے بلانا پڑتا ہے اور مناسب نام پکارنے سے یہ چلی آتی ہے۔" وجودیتی فلسفہ اس صحیح نام اور پکارنے کے اس مناسب انداز کی جستجو ہے جس کی آواز پر وجود و ہستی کا پیکرِ حسین ہو یا قبیح، لبیک کہہ کر ان دریچوں سے باہر نکل آئے جن کے پیچھے وہ ملفوف منتظر رہتا ہے اور اس طرح وجودیتی فلسفہ وجود کی توضیح اور اس کے درک و حصول کا نام ہے جس کی تاویل کسی اور سطح کے حقائق سے نہیں کر سکتے اور جس کو اس کی تمام تر نیرنگیوں کے ساتھ ہیں اصلی روپ میں دیکھنا چاہیئے۔ لہٰذا تمام تر وجودیتی فکر 'وجود' اور اس سے ملزوم و مدلول دیگر پہلوؤں اور معنی و مطالب کے تجزیئے سے نبرد آزما نظر آتی ہے اور محض اسی ایک تصور کی مدد سے ہم وجودیت کی تعریف کے اہل ہو سکتے ہیں۔

اب ذرا اس پس منظر کا اجمالی جائزہ لیں جس میں اس فلسفے کا بیج کرکگارد نے بویا اور بعد میں جس میں یہ پروان چڑھا۔ کرکگارد کا بنیادی سوال یہ تھا کہ انسانی وجود کی اصلیت اور اس کا مقام کیا ہے۔ انسان کو خود آہنگی اور خود مماثلت کے حصول کے لئے دو بڑی قوتوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے جو اس کی ذات اور اس کے وجود کی دھجیاں اڑانے میں مصروف ہیں۔ یہ ہیں عقلیت کا معروضی نظریہ اور کلیسا۔ موجودہ سماج میں دونوں خارجیت کے علمبردار ہیں۔ لہٰذا یہ سماج بھی اس حد تک اصل وجودِ انسانی کا دشمن ہے۔ ہیگل کے معروضی فلسفے کی حدت سے وجود کی تمام تر داخلی خصوصیات پگھل کر رہ جاتی ہیں اور انسان کچھ اس طرح اپنے آپ کو کھو دیتا ہے کہ اس کے نشانات نقش بر آب سے زیادہ کچھ نہیں ہوتے۔ خود علیحدگی کی یہ کربناک صورت حال اس کے لئے ایک مستقل کشمکش اور تضاد کی ایسی حالت پیدا کرتی ہے جس میں آیا وہ خود کو ہمیشہ کے لئے کھو دیتا ہے یا ایک دائمی نفسیاتی تناقض کا شکار رہتا ہے۔ خارجیت اور عقلیت انسان کو محض کچھ ایسے مشترکات کا حامل بنا دیتے ہیں جنکے وسیلے سے وہ تمام انسانوں کی صنف کا ایک رکن تو بن جاتا ہے مگر اپنے اس جوہرِ اصلی سے دست بردار ہو جاتا ہے جو ایک انسان کو وہ سب کچھ بنانے کا ضامن ہے جو فی الحقیقت اسے ہونا چاہیئے۔ یہ مجرد مشترکات اسکے کردار و شخصیت کی عکاسی تو نہیں کرتے بلکہ کچھ غیر اساسی اور سطحی وصائف و وظائف سے اس کو اس طرح مربوط کر دیتے ہیں کہ وہ انہی کو اپنے وجود کا سرمایہ سمجھتا ہے اور اس حال میں وہ تشفی و طمانیت محسوس کرتا ہے جب اس کا اصل سرمایہ لٹ چکا ہوتا ہے۔ وجود کی یہ جہت اس کو سماج اور دوسرے انسانوں کے ساتھ بھی حقیقی رشتے بنانے اور استوار رکھنے کے قابل نہیں رکھتی کیونکہ اب وہ اس بنیاد سے مبرا ہو چکا ہے جو ان رشتوں کو سچائی اور ایمانداری عطا کر سکتی ہے لہٰذا خود علیحدگی سماج علیحدگی کا ذریعہ بن جاتی ہے اور کبھی تعکیساً ہم سماج سے بچھڑ کر اور خود سماج کے درمیان تضاد و تناقض کا شکار ہو کر خود علیحدگی سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔

دوسری طرف کرکگارد نے انسانی وجود اور خدا کے درمیان بلاواسطہ اور وجدانی تعلق کی راہ میں کلیسا کو ایک بہت بڑی رکاوٹ سمجھا۔ کلیسا کے احکامات و واجبات میں بھی اس نے انسان کو اپنے خدا سے اتنا دُور ہوتے ہوئے دیکھا کہ وہ خدا کی آواز نہیں سن سکتا اور عشق و سپردگی کے بدلے اسے کچھ کھوکھلی رسوم و قیود ملتی ہیں جن میں وہ مذہب کے نام پر اپنی عمر رائیگاں گزارتا رہتا ہے۔

ان دونوں عوامل کا محکوم سماج انسان کے داخلی اور محسن محاسن کو نہیں پہچانتا اور خارجی "ہمواریت" کا امین بن جاتا ہے۔ سماج کی بےرحمی اور مظالم کا وہ خود بھی نجی زندگی میں شکار رہا تھا اور اس عمل میں اہم ترین رول پولیس نے ادا کیا تھا جو دورِ جدید میں واقعات کو خارجی اور معروضی بنانے کا ایک طاقتور ذریعہ ہے۔ اس کی نجی زندگی اور اس کی جسمانی قباحتوں کا جو مذاق پولیس نے اڑایا تھا اس کا اثر اس پر بہت شدید پڑا تھا یہی وہ ابتدا تھی جس نے وجودیت کی داغ بیل ڈالی اور اس فلسفے کا خاکہ تیار کیا جس میں آئندہ کے وجودیتی فلسفیوں نے اپنے اپنے رنگ بھرے۔ کرکگارد کے ذاتی اور نجی تجربات بعد میں چل کر ان محرکات میں تبدیل ہو گئے جو سماجی، سیاسی اور معاشی بحران کی وجہ سے انسانی وجود کو کھوکھلا کر رہے تھے۔ یہ بحران اخلاقی اور دیگر انسانی اقدار کا بحران تھا، سماجی اور نظامی زندگی کا بحران تھا، انسانی رشتوں اور معاشی پائداری کا بحران تھا۔ مختصر یہ کہ وجود کا بحران تھا جس میں انسان سماج اور اپنے آپ سے بچھڑ رہا تھا۔ اس صورت حال کو عالمی جنگ نے اور مہیب کر دیا تھا اور اس لئے جرمنی اور فرانس کے اس عصر کے مفکروں پر ان کا بہت گہرا سایہ نظر آتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک مزید تفاعل جس نے بیشتر وجودیت پسندوں کو متاثر کیا ہے اور جس کا نمایاں اظہار مارسل کی فکر پر ظاہر ہے وہ ہے مشینی عصر کی ایسی کیفیت جس نے انسان کو ایک خوفناک طور پر منظم اور وسیع مشین کا ایک چھوٹا سا بے بس پرزہ بنا دیا ہے جس کے تحت اس کی تمام حرکات اور اس کے تمام اعمال خود ارادیت اور آزادی سے تہی اس نظام کی میکانکی حرکت بن جاتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر انسان اب ان تمام سامان و تخلیقات کا خود غلام ہو چکا ہے جنکی اختراع اس نے ان پر حکومت کرنے کے لئے کی تھی۔ اس مشینی عصر کا غلام انسان ان مشینوں کے ہاتھوں اس قدر بک چکا ہے کہ وہ حرص و طمع کا پیکر بن کر تمام انسانوں سے اپنا ناطہ توڑ کر صرف اپنی اس ہستی میں گم ہے جو اس کا اصل وجود ہے اور اشیاء کے حصول میں اتنا کوشاں ہے کہ اسے جینے کی فرصت نہیں۔ یہ وہ حالت ہے جہاں پہنچ کر آدمی اپنی تمام تر انسانی اقدار و خصوصیات کھو کر ریاکاری، بے وفائی، بےحیائی، بے رحمی، خود غرضی اور مصلحت اندیشی کا غلام بن جاتا ہے۔ انسان کی اس پستی اور تنزل کا پُراثر بیان وحید اختر کی نظم 'لاالہٰ' میں ملتا ہے۔ سلیمان اریب (زخم کس سے ملے گئے ہو)، زاہدہ زیدی (لاشوں کا سوداگر) اور بہت سے شاعروں نے اسے موضوعِ سخن بنایا ہے۔

مغرب کے یہ حالات جدید ہندوستانی سماج میں بھی منعکس نظر آتے ہیں۔ جہاں تقسیم کے بعد اور زمینداری نظام کے اختتام کے ساتھ سماجی اور سیاسی ڈھانچہ ایسا بدلا کہ پرانی قدروں کے انحطاط اور نئے مطالبات نے جدید ہندوستانیوں کو ایک نفسیاتی کشمکش میں مبتلا کر دیا۔ مشینی عہد کے بیجا تقاضوں نے ہمارے سماجی اور انسانی رشتوں کو بھی تنزل کر دیا ہے عدم تطابق کی واضح مثال حالیہ سماج میں [illegible] کے مسئلے سے ملتی ہے۔ بہرحال گو ہندوستان میں خارجیت اور فرسودہ نظام سے انحراف یا بغاوت کے محرکات مغرب سے جداگانہ ہیں مگر نفسیاتی کیفیات یکساں ہیں۔

جدید شاعری میں انہی کیفیات کا بھرپور احساس شہاب جعفری کی نظم 'خدا کی واپسی' اور 'سورج کا شہر'، عمیق حنفی کی نظم 'سند باد' اور ساقی فاروقی کی نظم 'شکست کی آواز' میں نظر آتا ہے۔ محمود ایاز کی 'منجمد آنکھیں' اور حبیب الرحمٰن کی نظم 'اونچے مکان' بھی اس رستے ناسور کی جراحت کی کوششیں ہیں۔

شہاب جعفری کا دیوانہ خدا کی آواز سناتے ہوئے کہتا ہے:

"تم اپنے پیدا کئے ہوئے خوف اور احساس کمتری سے
کل آسماں، چاند اور سورج کو پوجتے تھے
اور آج بھی تم اپنی ڈھالی ہوئی مشینوں کے سامنے سر جھکا رہے ہو۔
خدائے خالق کو تم نے نادم کیا تھا کل تک
اور آج انسانیت کی تذلیل کر رہے ہو" (خدا کی واپسی)

عمیق حنفی کا 'سند باد' (مشین زادوں کی بستی میں)، انسان کے انجماد کا تماشا دیکھتے ہوئے آخر میں کہتا ہے "آدمی ہرن کی پٹڑیاں بن گئے"۔ حالات کی ابتری اور ماحول کا گھٹن جب انسان کو شکستہ ہونے کا احساس دلاتے ہیں تو وہ کہہ اٹھتا ہے:

"میں فلک زاد اپنے اندر سے
ٹوٹتا جا رہا ہوں روز بروز" (ساقی فاروقی: شکست کی آواز)

ساجدہ زیدی کی نظم 'مشرق و مغرب کا نقطۂ اتصال' میں ان دونوں کی زبوں حالی کا خوبصورت بیان دیکھئے۔

"تم بتاؤ کہ وہاں
چاہنے والوں کی محفل میں خریدار ہیں غم خوار ہیں
میں بتاؤں کہ یہاں
مونس و احباب کے دل سنگ ہیں نظریں پتھر
تم بتاؤ کہ وہاں
برق رفتار مشینوں کی حکومت میں خریدے ہوئے ذہن
سحر و شام کے یخ بستہ طلسمات میں جم جاتے ہیں
میں بتاؤں کہ یہاں
ذہن و زباں کا سودا
کم سے کم داموں پہ ہو جاتا ہے۔"

یہ وہ حالات ہیں جنکے پس منظر میں ہمیں وجودیتی فلسفیوں کی اس سعی کو سمجھنا چاہیئے جو انہوں نے وجود کو اپنے مقام پر لانے اور اس کی خفتہ صلاحیتوں اور ممکنات کے اظہار کے لئے کی۔ وجودیتی فلسفہ ایک آئینہ ہے جو انسان کو اپنی نظروں میں برہنہ کر دیتا ہے اور پھر اسکو اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ وہ اپنی پسند اور اپنے ظرف کے مطابق اعمال و صالحات سے اس کی تزئین کرے۔

(۳)

اب آئیے ان چند تصورات پر ایک سرسری نظر ڈالیں جو وجودیتی فلسفے کی بنیادیں ہیں جن پر تمام تر افکار کم و بیش مرکوز ہیں۔

(۱) وجود

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
تیرا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں (اقبال)

وجود کا تصور داخلیت اور دروُنیت کے خاکوں کے تحت پیش کیا گیا ہے اور معروضی حقیقت سے میز کیا گیا ہے۔ وجود ایک غیر عقلی حقیقت ہے جس کا ارتسام عقل کے زمروں میں ممکن نہیں۔ وجود کو سمجھا نہیں بلکہ اپنایا جاتا ہے اور وجود کو اپنانے کے معنی ہیں موجود ہونا جس کے مظاہر یا جس کی شہادت' تجربات، محسوسات اور افعال ہی ہو سکتے ہیں۔ یہی وہ عمل ہے جس کے دوران وجود کے پنہاں اور نہفتہ اسرار کا کشف ہوتا ہے لیکن معروضی عقل ان وجودیتی حقائق کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ اس لئے کرکگارد نے یہ نعرہ بلند کیا تھا کہ 'داخلیت صداقت ہے' اور یاسپرس نے یہ کہا کہ وجود کا علم محض ان رموز و کنائے کے ذریعہ ممکن ہے جن کی شانِ نزول کچھ ایسی ہے کہ انہیں سمجھنے کے لئے نظری فکر اور عقلی دلائل سے ہٹ کر وجودی فکر کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ یا پھر وہ اسے ایک الہامی زبان کی طرح تصور کرتا ہے جسے صرف روحانی اور غیر مادی سطح پر سمجھا جا سکتا ہے۔ مارسل کا وجود کو مسئلہ سے میز کرتے ہوئے سرِ راز، کہنا بھی اسی حقیقت کا غماز ہے۔ ایسے وجود کا عرفان ہی بالوجود ہونے کا مقصدِ اکمل بنتا ہے اور مستند وجود کا معراج۔ یہ وجود ایک حوصلہ اور امید ہے جس کی تکمیل ان اعمال کے ذریعہ ہی ممکن ہے جن کی مدد سے اسے حاصل یا مسخر کیا جاتا ہے۔ مگر وجود کوئی معطیہ شے نہیں اور نہ کوئی اس کے معینہ معنی ہیں جس کی روشنی میں ہم بلا تامل یہ کہہ دیں کہ 'یہ رہا وجود'۔ وجود چونکہ ایک جاری و رواں حقیقت ہے اس لئے اسے کسی منزل پر کسی ایک مخصوص حالت کی عینیت حاصل نہیں ہو سکتی۔ وجود کو کسی حالت کے عین بنانے کا عمل بھی وجود کا ایک حصہ ہے اور تا وقتیکہ اعمال و تجربات کا سلسلہ منقطع نہیں ہوتا وجود کی مکمل تصویر سامنے نہیں آسکتی۔ اسی حقیقت کو ایک دوسرے سیاق و سباق میں اقبال نے زندگی کی زمانیت اور بیقراری کا نام دیا ہے:

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ ٭ جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی

یاسپرس کی نظر میں فلسفہ اسی وجود کو سمجھنے کا نام ہے جو لامحصور پہنائیوں میں گم گشتہ ہے اور جس کے عرفان کے لئے ایک لامحدود تجربہ ضروری ہے جو ماورائی حقیقت کو سمجھے اور اس میں ساری ہونے کا امکان رکھتا ہو اور یہ تجربہ صرف روحانی تجربہ ہو سکتا ہے۔

وجود کے کئی پہلو اور کئی جہات ہیں۔ مثلاً وجود برائے خود، وجود بہ وجودِ دگر (ہم وجودی) وجود بہ (در) عالم اور یہ تمام پہلو داخلیت کے ذریعہ ہی سمجھے جا سکتے ہیں۔ انسانی وجود جب اپنے آپ میں محصور رہتا ہے تو وہ گویا اصل وجود کی حالت ہے جس پر سارتر نے تفصیل سے بحث کی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ یاسپرس، ہائیڈیگر اور مارسل نے یہ دکھلانے کی کوشش کی کہ وجود دیگر وجود کے ساتھ اور اس دنیا میں ہوتا ہے جو اسے زمانیت اور تاریخیت کے عناصر بخشتا ہے۔

سارتر کے لئے وجود کا تصور شعور سے وابستہ ہے اور وجود کا تجربہ دراصل شعور کا تجربہ بن جاتا ہے کیونکہ ڈے کارٹ کی طرح سارتر بھی محض جس چیز پر یقین کر سکتا ہے وہ ہے انسان کا شعور جو اس کو آگہی بخشتا ہے مگر جہاں ڈے کارٹ کا شعور بنیادی طور پر صرف 'خود شعور' ہے سارتر کی نظر میں شعور دراصل ماورائے شعور کی طرف لے جاتا ہے کیونکہ شعور ہمیشہ کسی کا ہوتا ہے جو شعور سے منسلک تو ہوتی ہے مگر خود شعور نہیں۔ لہٰذا شعور ہمیشہ خود سے باہر نکل کر اس شے کی طرف جاتا ہے جسے ہم غیر شعور کہہ سکتے ہیں۔ انسان اپنے وجود میں شعور کے معروض کے ذریعہ وہ سب کچھ پاتا ہے جو وہ نہیں ہے اور جو کچھ وہ دراصل ہے وہ اس کے سامنے موجود نہیں کیونکہ وجود میں وہ تمام امکانات بھی شامل ہیں جو ہنوز بروئے کار نہیں آئے۔ انسانی وجود صرف ماضی و حال کا مخزن نہیں بلکہ مستقبل کی طرف بھی رواں دواں ہے مگر مستقبل کی چادر سے صرف ایک لمحہ چھن چھن کر حال کی جھولی میں گرتا ہے اور گرتے ہی وہ ماضی کی وراثت بن جاتا ہے مگر جب تک مستقبل کا پردہ آخری بار نہیں اٹھتا وجود کا تعین حدِ امکان میں نہیں۔ وجود کی تخلیق اسی زمانی تسلسل میں ہوتی ہے:

سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات
سلسلۂ روز و شب اصلِ حیات و ممات
سلسلۂ روز و شب تارِ حریرِ دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات (اقبال۔ مسجد قرطبہ)

اس لئے سارتر یہ کہنے پر مجبور نظر آتا ہے کہ 'میں وہ ہوں جو میں نہیں ہوں اور میں وہ نہیں ہوں جو میں ہوں'۔ اس مقولہ کا محرک وجود کا وہ تصور ہے جسے وہ ہستی برائے ذات یا خود کہتا ہے شعور کی یہ وہ حالت ہے جو تمام مختص و مخصوص شعورات اور آگہی کی بنیاد ہے۔ اسی وجود کے تصور سے

ہستی و نیستی کے تصورات وابستہ ہیں۔

(۱) ہستی

ان دو متصل تصورات کی مدد سے سارتر اپنی کتاب ہستی اور نیستی (Being and Nothingness) میں اپنے وجودیتی فلسفے کی تفصیل بیان کرتا ہے۔ وہ شعور اور معروضات شعور میں اہم تفریق کرتا ہے اور ان دونوں کو مختلف طریقوں سے موجود تسلیم کرتا ہے۔ شعور ہستی برائے ذات (Pour-soi) کا حامل ہے جبکہ وہ اشیاء جن پر شعور فکر کرتا ہے ہستی در ذات (en-soi) کی حامل ہیں۔ معروضات شعور کی معروض ہستی ہے۔ یہ موجود ہوتے ہیں ان کو دیکھا، سنا، سونگھا اور چھوا جا سکتا ہے۔ یعنی ان کا مشاہدہ ممکن ہے۔ لیکن مشاہدہ کنندہ کی کیا حقیقت ہے؟ شاہد کو مشہود سے ممیز کرنا ہی اس فرق کو سمجھنا ہے جو سارتر کا مقصود ہے۔ شاہد (جو یہاں محض شعور ہے) خود مشہود نہیں بلکہ اس کی ہستی برائے ذات ہے۔ میں تجربہ حاصل کرتا ہوں اور مجھے خود اس تجربے کا شعور ہوتا ہے لیکن یہ 'میں' کیا ہے؟ 'انا' یا 'اغو' کی ہستی میز کرسی کی طرح نہیں ہو سکتی اور نہ ہی میرے جسم کی طرح جس کا وجود بہر حال مسلم ہے۔ تاہم ایک معنی میں میرا جسم اور میں دونوں ایک ہی ہیں ——— میں میرا جسم ہوں لیکن درحقیقت میرے جسم کی ہستی در ذات ہے جو میز کرسی پودوں اور پتھروں سے الگ نہیں لے 'میں' جو اس جسم کے بارے میں سوچتا ہے اور ہستی برائے ذات ہے اس جسم سے الگ ہے جو ہستی در ذات سے مماثل ہے۔ لیکن یہ دونوں الگ کیسے ہیں؟ ان کو جو شئے الگ کرتی ہے اس کو سارتر نے نیستی (یا کچھ نہ ہونا) کے نام سے موسوم کیا ہے۔ پھر وہ کہتا ہے کہ ہستی در ذات 'ہے' یا ہوتی ہے جبکہ ہستی برائے ذات 'نہیں ہے'۔ ہستی در ذات وہی ہے جو ظاہر ہے۔ اس کے ظاہر و باطن، شہود و حقیقت میں کوئی فرق نہیں۔ اس کا کوئی داخلی پہلو نہیں جو خارجی سے توافق نہ رکھتا ہو۔ دوسری طرف علت، غایت، اہلیت و صلاحیت اور اشیاء سے جو دیگر روابط و رشتے ظاہر ہوتے ہیں وہ سب ہستی برائے ذات کے توسط سے ممکن ہیں۔ یعنی یہ تمام تر محض داخلیت کے دائرے میں ہی سمجھی اور پہچانی جا سکتی ہیں۔ اس طرح وہ دنیا جو ہمارے فکر و مشاہدے میں آتی ہے وہ 'در ذات' اور 'برائے ذات' دونوں ہستیوں کی آمیزش کا نام ہے جو نکہ اس دنیا میں جہاں ایک طرف واقعاتی وجود ٹھوس پن اور حرکات شامل ہیں وہاں دوسری طرف نظم، تبدل، قدر اور غایت بھی ہویدا ہیں۔

مگر اس کے ساتھ ساتھ وجود کا ایک اور پہلو بھی اجاگر ہوتا ہے۔ ہائیڈیگر کی طرح سارتر بھی یہ مانتا ہے کہ شعور پر یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ وجودی حقیقت کا حامل ہوتے ہوئے وہ خود دوسروں کا معروض بن جاتا ہے ——— گویا ایک شئے جس کا خارجی پہلو اور فطرت ہے اور جو دوسرے کے مشاہدے میں آتا ہے۔ مگر شعور تو در اصل ہستی در ذات نہیں بلکہ ہستی برائے ذات ہے۔ لہٰذا یہ تناقص و استعجاب پیدا ہوتا ہے کہ میں وہ نہیں ہوں جو ہوں اور جو ہوں وہ نہیں ہوں (مزید براں وجود ہے دو ایک معنی میں) وہ حال کے آئینے میں ہی ہو سکتا ہے مگر یہ حال تو ماضی کا پردہ اور مستقبل کا نقیب ہے جو دونوں نہیں ہیں۔ مگر شعور ماضی و حال سے ماورا جانے کا نام ہے اور اس معنی میں جو درحقیقت ہے وہ نہیں ہے۔

(۲) نیستی

خدا نواز بہت ہے مرا جنونِ خودی
نہیں ہے جو وہ مری خودگری سے پیدا ہے (شہاب جعفری)

جو شئے ہستی برائے ذات اور در ذات کو ممیز کرتی ہے وہ ایک خلا ہے جہاں کچھ بھی نہیں۔ مگر یہ کچھ نہ ہونا سب کچھ ہونے کا ضامن ہے کیونکہ انسان ایک مخصوص لمحے میں مکمل اور لائق تعین حقیقت کا حامل نہیں۔ اس کا وجود ایک لگاتار عمل ہے جہاں ہر لمحہ وہ بنتا یا بگڑتا ہے۔ اس کے فیصلے، اسکے انتخابات، اس کے عزائم اور امیدیں، اس کی کاوشیں اور جستجو ——— تمام تر اسکو مستقل بناتے رہتے ہیں اور یہ خود ساختی یا خود تخلیقی عمل درجہ بدرجہ اور لمحہ بہ لمحہ اسکے وجود کے پوشیدہ امکانات کو اجاگر کرتا اور ابھارتا رہتا ہے۔ سارتر کا یہی تصور اس سے یہ کہلواتا ہے کہ انسانی فطرت کچھ نہیں بلکہ انسانی 'حالت' ہوتی ہے۔ وجود کی اس کیفیت کو سارتر نے مابعد الطبیعاتی حالت بھی کہا ہے۔ یہ ایک عقدہ ہے جو مکمل طور پر اسی وقت کھلے گا جب انسان زندگی کے احاطے سے باہر نکل جائے گا (پھر وجود کیا اور ہستی کیا!) لہٰذا اس کی معروضی اور سائنٹیفک پیمائش ہرگز ممکن نہیں۔

نیستی کا تصور ایک سادہ اور معمولی صورت حال سے پیدا ہوتا ہے اور وہ ہے سوال کرنے کی حالت۔ 'ہستی اور نیستی' میں وہ کہتا ہے کہ جب ہم کسی سے سوال کرتے ہیں ہم خود کو ایک ایسی ممکن حالت میں لے آتے ہیں جہاں نفی میں جواب مل سکتا ہے کیونکہ بالخصوص جواب کی دو جہتیں ممکن ہیں: اثباتی یا منفی اور اس طرح سوال کرنے کے عمل میں ہم غیر ہستی یا نیستی (تعدیم) کے معروضی وجود سے دوچار ہوتے ہیں۔ سوال کرنے کی اس حالت کا تجزیہ کرتے ہوئے سارتر کہتا ہے کہ ایک طرف منفی امکان کا جواب ہے اور دوسری طرف سوال کنندہ اپنے سوالی عمل سے خود کو ایک لایقینی اور لاتعینی کی حالت میں لے آتا ہے

لے مارسل اس کے برعکس روح اور جسم کے اتصال کو 'وجودیتی تعلق' سمجھتا ہے جس سے وجود کے اسرار منکشف ہوتے ہیں۔

یعنی وہ یہ نہیں جانتا کہ جواب کیا ہوگا لہٰذا یہ سوال جو اس کے وجود کا اعادہ یا ایک ادعائی عمل تضاد و غیر ہستی کے درمیان ایک ربط بن کر رہ جاتا ہے۔ سوالات کا سلسلہ بہرحال ہمیں ہستی کی تہہ تک لے جاتا ہے جہاں تعدیم اور غیر ہستی کے سوا کچھ بھی نہیں اور اس طرح ہم اپنے آپ کو نیستی سے گھرا ہوا پاتے ہیں۔ اس نیستی کو وہ ایک وجودیاتی Ontological حقیقت مانتا ہے جو ہستی سے ماخذ ہوتی ہے۔ ہستی گو مقدم ہے مگر بقول سارتر نیستی ہستی پر منڈلاتی رہتی ہے۔ اسی کے الفاظ میں "نیستی جراثیم کی طرح ہستی کے سینے کے اندر سکڑی ہوئی موجود رہتی ہے"

ہائیڈیگر بھی نیستی کو ہستی کے تجزیہ کے لئے ایک لازمی عنصر مانتا ہے[1] مگر اس کے لئے وجود سے ٹکرانے کے بعد نیستی خود اپنا خاتمہ کر لیتی ہے جبکہ سارتر کی نظر میں نیستی کا خاتمہ صرف ہستی کے پس منظر میں ہی ممکن ہے لہٰذا یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اس کا خاتمہ کیا جاتا ہے۔ پس کائنات میں ایک ایسی ہستی لازم ہے جس میں نیستی کو ختم کرنے کی صلاحیت ہو اور اس کے ساتھ ساتھ وہ نیستی کو اپنی ہستی کے اندر باقی بھی رکھ سکے۔ ایسی ہستی 'درذات' تو نہیں ہو سکتی اس لئے دوسری قسم کی ہستی یعنی 'برائے ذات' یا شعور لابدی ہے اور اس طرح سارتر یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ انسان وہ ہستی ہے جس کے توسط سے نیستی دنیا میں داخل ہوتی ہے۔

یہاں یہ کہنا بڑا مشکل نظر آتا ہے کہ سارتر کے نظریہ میں کیا صادق ہے اور کیا کاذب، کیا قابلِ قبول ہے اور کیا نہیں۔ شاید کچھ باتیں وہ ایسی کہہ گیا ہے جو بے معنی ہیں 'نیستی' 'عدم' یا 'کچھ' نہ ہونا، بہرحال سلبی تصور ہے جس کو بعض فلسفیوں نے ایک اثباتی تصور بنا دیا ہے۔ ذرا ان دو بیانات کو دیکھئے: 'جب کائنات نہیں تھی تو عدم تھا اور جب کائنات نہیں ہوگی تو عدم ہوگا' اور 'نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا' (غالب) اگر اول الذکر جملہ کو دیکھیں تو اس کی نحوی ساخت ہمیں اس مغالطے میں مبتلا کر سکتی ہے کہ 'عدم تھا' اور 'عدم ہوگا' کسی مخصوص شے کے وجود کا اعادہ کرتے ہیں جبکہ دوسرے میں معنی بہت صاف ہے۔ یہاں اگر میں لیوس کیرول کی کتاب Alice Through the Looking Glass سے کچھ جملے پیش کروں تو دلچسپ معلوم ہوں گے۔ جب ایلیس بادشاہ سے کہتی ہے 'مجھے سڑک پر کوئی نظر نہیں آرہا' تو بادشاہ جواب دیتا ہے: 'کتنا اچھا ہوتا اگر میری بھی ایسی آنکھیں ہوتیں کہ مجھے بھی اتنی دور سے 'کوئی نہیں' نظر آسکتا'۔ ایک اور جگہ ایلیس کہتی ہے 'مجھ سے تیز کوئی نہیں دوڑتا' جس پر بادشاہ کہتا ہے "اگر 'کوئی نہیں' تم سے تیز دوڑتا ہے تو وہ تم سے پہلے پہنچ جاتا"، یہ گفتگو نحوی ساخت کے اعتبار سے بالکل جائز ہے مگر اس لئے بے معنی معلوم ہوتی ہے کہ یہاں سلبی تصدیقات کو اثباتی معنی سمجھے جا رہے ہیں یا یوں کہئے کہ زبان کا غلط استعمال ہو رہا ہے کیونکہ الفاظ کے غلط معنی سمجھے جا رہے ہیں۔ 'کوئی نہیں'، 'عدم'، 'نیستی' وغیرہ کسی مرئی یا پر اسرار اشیاء کے نام نہیں۔

لیکن یہ ممکن ہے کہ سارتر نے نیستی کے لفظ سے ایک ایسے خلا کے تصور کی طرف اشارہ کیا ہے جو ہستی درذات کو ملفوف رکھتی ہے اور جس کی وجہ سے یہ ہستی برائے ذات سے الگ ہوتی ہے۔ یہ ایک بے نام 'کچھ' ہے جس کی حقیقت تو ہے مگر اس کا سمجھنا مشکل ہے۔ یہ اسی طرح کی توضیح ہے جس کے تحت شنکر کا برہمن 'نرگن' اور بدھ مت کے مادھیمک مکتبِ خیال کا بانی ناگا رجن حقیقت کو 'شُنیہ' کہتا ہے جس کے معنی ان کا ناقابلِ توضیح و بیان ہونا ہے۔ یا یوں کہئے کہ وجود خود کو ایسے مقام پر پاتا ہے جس کے چاروں طرف کچھ نہیں۔ کچھ بھی نہیں سوائے اس احساس کے:

"میں ایسے صحرا میں اب پھر رہا ہوں
جہاں میں ہی میں ہوں
جہاں میرا سایہ ہے
سائے کا سایہ ہے
اور دور تک
بس خلا ہی خلا ہے" (خلیل الرحمٰن اعظمی 'میں گوتم نہیں ہوں')

یہ ایک ایسا مقام ہے۔

"جہاں کوئی منزل نہ رستہ
نہ تو ہے، نہ میں ہوں
نہ لمحوں کے محبس

فقط حدِ امکاں تک ایک خلا ہے
جہاں جسم آزاد ہے
روح بے باک ہے
جراتِ آگہی بے کراں ہے" (زاہدہ زیدی 'خاموشی')

(۲) بے معنویت یا ابلہیت

ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کا ہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا (فانی)

ہستی اور عالمِ موجود کی حقیقت محض حادثی ہے اور دنیا کے تمام تر

---

[1] سارتر ہستی اور نیستی کے کئی تصورات میں ہائیڈیگر سے متاثر نظر آتا ہے۔

حالات، خصوصیات کسی معینہ مقصد یا غایت سے مُبرّا ہیں۔ دُنیا کا مقصد و معنی ڈھونڈنا دہریئے وجودیت پسندوں کی نظر میں ایک خیالِ خام ہے کیونکہ نطشے کی زبانی خدا کی موت کا اعلان سن کر ان کو یہ یقین ہے کہ نہ تو کائنات کی کوئی علتِ غائی ہے اور نہ کوئی خالق۔ خدا شکستہ پڑا ہے اور انسان اپنی تنہائی میں بھٹک رہا ہے:-

"اے خدا!
تو فلک پر نہیں
ہم زمیں پر نہیں
عدم اور ابد کے تضادات میں
تو بھی بکھرا ہوا
ہم بھی ٹوٹے ہوئے" (ساجدہ زیدی)

جہاں تک انسانی وجود کا سوال ہے یہ بھی ہستی در ذات کے معنی میں اتنا ہی بے معنی ہے کیونکہ یہ بہت سی سماجی، سیاسی اور دیگر زمانی و مکانی پابندیوں میں محصور ہے۔ اسی صورت حال کو کچھ وجودیت پسندوں نے ہستی یا وجود کی وقوعیت کہا ہے۔ انسان ایک سطح پر جو کچھ ہے وہ ہے۔ وہ پیدا ہوتا ہے جس پر اس کا کوئی اختیار نہیں، کس خاندان میں کس سماج میں، کس سیاسی نظام میں، کس تاریخی پس منظر میں، کس وقت اور کہاں ـــ یہ سب باتیں اس کی ہستی میں شامل ہیں اور ان کے ساتھ ذہن و جسم کی وہ موروثی خصوصیات بھی اسے ملتی ہیں جو اس کے اجزائے لاینفک ہیں اور سب سے اہم اور ناگزیر ہے اسکی موت جو انسانی وجود اور آزادی کو عبث و نابود کرنے کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ مارسل اسی کو انسان کی تاریخیت کہتا ہے۔ ان سب باتوں کا مجموعی احساس انسان کو بے معنویت اور لغویت یا اہلیت کا شعور عطا کرتا ہے جو سارتر اور کامو میں بہت نمایاں ہے مگر دیگر وجودیت پسندوں کے یہاں بھی موجود ہے۔ انسان اپنے وجود کے دھندلکے میں اس زنداں سے نکلنا چاہتا بھی ہے مگر نہیں نکل سکتا۔ وہ ان آہنی دیواروں سے اپنے وجود کی آخری حد تک ٹکراتے ٹکراتے سسی فس بن جاتا ہے،

"قید خانے کی دیوار ہے خود تمہارا وجود
یہ گراں بار زنجیر و طوق و رسن ہیں تمہارے ہی انفاس کے سلسلے
توڑ دو ساری دیواریں، زنجیریں اطراف کی
اور اپنے تئیں یہ سمجھ لو کہ آزاد ہو
پھر بھی آزاد ہو کر جہاں جاؤں گے
اپنی دیواریں، زنجیریں تم ساتھ لے جاؤ گے
تم خود اپنے ہی صیاد بھی صید بھی
تم خود اپنی زنجیر بھی اور دیوار بھی" (وحید اختر، نوحۂ زنجیر)

(۳) آزادی و خود اختیاری

انسانی وجود کی اصل ماہیت وہ ہے جس کی وہ خود ہی تخلیق و تزئین کر سکے۔ مستند اور حقیقی وجود ہوتا نہیں بلکہ بنایا جاتا ہے اور انسان کا جوہر اس عمل کے دوران رفتہ رفتہ نمایاں ہوتا ہے۔ وجود کا یہ تصور جبریت کو ترک کر کے خود اختیاری یا آزادی کو مفروض کر لیتا ہے۔ کرکگارد نے معروضی عقلیت اور سماج و کلیسا کے ہاتھوں انسانی وجود کی آزادی کو سلب ہوتے دیکھا اور اس کے خلاف احتجاج کیا جو وجودیت کی پہلی منزل تھی۔ یاسپرس اور ہائیڈیگر نے مختلف طریقوں سے وجود کے بازادعا کی سمت رہنمائی کی۔ یہ عمل انسان کی آزادی سے متصل ہے اور اس کے بغیر اپنے وجود کی تلاش یا تخلیق ممکن نہیں۔ یاسپرس کے فلسفے میں کچھ الہامی اشارات و علائم کی مدد سے اس کی نشاندہی کی جاتی ہے مگر ان کو سمجھنا اور اُن کی صحیح تعبیر خود وجودی فکر کا ایک آزاد عمل ہے۔ مگر سارتر کے یہاں آزادی کا تصور اپنے معراج پر پہنچ جاتا ہے۔ خدا کی موت سے جہاں انسان کو بہت سی چیزوں سے رہائی ملی وہاں اسے اپنی لامحدود آزادی کی قید بھی ملی۔ اب وہ ہر چیز کا خود ذمہ دار ہو گیا۔ اپنے وجود اور اپنے اعمال کے ماسوا ساری دُنیا کا بوجھ اس غریب ناتواں انسان کے کاندھے پر آ رہا۔ اس کا ہر فیصلہ، ہر انتخاب، ہر فکر اور ہر عمل صرف اسی پر نہیں بلکہ تمام انسانوں پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ اس تصور کا نفسیاتی پس منظر وہ عرصہ ہے جو اس نے نازی افواج کے خلاف مزاحمتی تحریک کے ایک اہم رکن کی حیثیت سے گزارا جہاں ہر عمل، ہر حرکت، ہر خیال اور ہر سانس بڑی احتیاط طلب تھی۔ اس کی ذرا سی چوک صرف اس کی زندگی اور مستقبل کے لئے نہیں بلکہ اس کے ساتھیوں اس کے ہم قوموں، تمام متحدہ افواج و ممالک اور تمام دنیا کے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔ اس احساس کو اس نے اپنے فلسفے کا ایک اہم عنصر بنایا ہے لہٰذا اس کی نظر میں انسان اپنے تمام تفاو لبعض و ارتکابات کا ذمہ دار ہے ـــ ان اعمال کا جو وہ کرتا ہے اور اُن کا جو وہ نہیں کرتا ہے، ان باتوں کا جو وہ سوچتا ہے اور ان کا بھی جو وہ نہیں سوچتا۔ وہ اپنی زندگی کا بھی اس معنی میں ذمہ دار ہے کہ وہ جیتا کیوں ہے بلکہ وہ مر بھی سکتا ہے۔ کامو کے لئے اسی وجہ سے خودکشی ایک اہم فلسفیانہ مسئلہ ہے۔ یہ بے محابا آزادی انسان پر نازل ہوتی ہے کیونکہ خدا کے بعد صرف انسان ہی اس کا سزاوار ہو سکتا ہے۔ کائنات کی بے معنویت اور اہلیت کتنی باکار اور معنی خیز تحریک کا ذریعہ بن گئی! لامحدود آزادی کا یہ تصور دشوار سہی مگر سارتر کے فلسفے کا ایک اہم مثبتی پہلو ہے۔

مارسل کے لئے آزادی وخود اختیاری خدا کی دین ہے اور اس لئے انسانی آزادی کی خدا کی خود مختاری تک تحدید کی جاتی ہے۔ یاسپرس کے نظریہ کے مطابق انسانی وجود ماورائیت کی حدوں کو چھونے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اتنی ہی خود اختیاری کا حامل ہے مگر آخرش اس کی آزادی بھی خدا کے وجود میں گم ہوسکتی ہے —— بشرطیکہ وہ اس حد تک ہر شئے سے ماورا ہوجائے۔

۴۔ نفسیاتی رویئے

ہستی کی دقوعیت اور تاریخیت، حادثی حالات کا مشاہدہ، وجود کے اندر چھپے ہوئے تضاد و استعباد، واقعات کی ناگزیری، انسانی جدوجہد کا مآل، بیرونی وخارجی قوتوں کا وجود کو کچلنے اور اس کو غیر وجود بنانے کی کوششیں، انسان کا اپنے وجود کا اعادہ، اپنی آزادی کا شعور اور ذمہ داریوں کا احساس —— یہ تمام امور وحقائق انسان کے اندر ایک گھٹن اور خلش کی حالت پیدا کرتے ہیں جو اذیت ناک حد تک ذہنی کشاکش اور سماج، خدا اور خود اپنی ذات سے فرد کی علیحدگی کا سبب بنتے ہیں یا پھر اس کو شدید ذمہ داری کے تحت دبا دیتے ہیں۔ یہ مختلف لیکن مختلف مگر ملتی جلتی نفسیاتی کیفیات کے ضامن ہیں۔ کرکگارد کی تشویش اور خوف حقیقت وجود کو سمجھنے کے لئے ایک ناگزیر ذہنی حالت ہے کیونکہ اسی کے دائرے میں اس کو خارجیت کے کذب اور داخلیت کے ثواب کا وجدان ہوتا ہے۔ یہ تشویش ہمیشہ اِیا... یا... کی صوری تلبیس میں ظاہر ہوتی ہے۔ جب بھی کوئی اخلاقی یا روحانی تضاد درپیش ہوتا ہے یہ کیفیت ضرور پیدا ہوتی ہے۔ الہامی کتابوں میں ابراہیم کا اپنے بیٹے کو ذبح کرنے پر رضامندی اور اس انتخاب یا فیصلہ اور اس سے متبع تشویش کرکگارد کے لئے اس صورت حال کی بہترین مثال ہے اور اسی انتخاب کے ذریعہ انسان خود کو کلیتہً خدا کے سپرد کرسکتا ہے یا پھر خدا کے فرمان کی عدول حکمی بھی کرسکتا ہے۔ اسی طرح خوف اپنے گناہ کے احساس کی تخلیق ہے۔ کرکگارد کی نجی زندگی کے کچھ حالات —— مثلاً اس کی کنواری ماں اور اس کے باپ کے گناہ کا اذیت دہ احساس —— نے اس کو خوف کی وجودی اہمیت سے آشنا کیا اور وہ زندگی بھر اس سے چھٹکارا حاصل نہ کرسکا۔ اسی طرح یاسپرس کی ناامیدی اس وقت ظہور میں آتی ہے جب انسانی وجود اپنی محدودیت سے سر ٹکراتا ہے اور ماورائیت کی طرف بڑھنے میں ناکام رہتا ہے۔ ہائیڈیگر کا موت سے سروکار یا کامو کے افکار میں موت وخودکشی کی اہمیت اسی طرح کے ذہنی رویوں کی غماز ہے۔ سارتر کا احساس کرب انسان کی لامحدود آزادی میں اس کی مکمل ذمہ داری کے شعور سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر صحیح معنوں میں آدمی اپنے وجود کے امکانات سے باخبر ہے اور اپنے اعمال کے دور رس نتائج کی آگہی رکھتا ہے تو پھر کیسے نہ یہ احساس پیدا ہو! اس کا ہر عمل صالح اور ہر انتخاب اس شعور کو اجاگر کرتا ہے کہ اس سے بہتر انتخاب ممکن تھا مگر جب اس کا احساس کرب ناقابل برداشت حد تک اذیت ناک ہوجاتا ہے تو وہ فرار ڈھونڈتا ہے اور خود کو وہ سب کچھ سمجھنے سے انکار کردیتا ہے جو وہ ہے۔ یہ تجاہل عارفانہ اپنی ہستی برائے ذات کو ہستی در ذات بنانے کا وسیلہ بن جاتا ہے جسے وہ قبیح ربد اعتقادہ کہتا ہے۔ اس کے تحت انسان کبھی کبھی خود کو محض دوسروں کی لذت اور مشاہدے کا آلۂ کار بنا لیتا ہے یا دوسروں کے عطا کردہ منصب کو اپنا اصل وجود سمجھ لیتا ہے۔ سارتر اس کو سب سے بڑا وجودی گناہ سمجھتا ہے۔ سلیمان اریب کی نظم "ٹیپ فریز" اس قبیح عقیدہ کی بڑی اچھی عکاسی ہے۔

جدید انسان کی اندوہناک تنہائی اور عدم تحفظ کے پروردہ ذہنی کرب، تشویش، تردد، تشنج، شکست وغیرہ کیفیات وعلائم ہیں جو جدید شاعری کو کبھی تو خود ترحمی، علیحدگی، یاس ونامرادی یا خود سپردگی کے رنگ عطا کرتے ہیں اور کبھی احتجاج، جھلاہٹ اور بغاوت کے تاثر کے اظہار کے محرک نظر آتے ہیں۔ ساجدہ زیدی (میں وہ تصویر نہیں)، شہاب جعفری (ذرے کی موت)، عتیق حنفی (سندباد)، زاہدہ زیدی (تنہائی)، قاضی سلیم (راستہ کس طرف جا رہا ہے)، اور بہت سے —— بلکہ بیشتر —— جدید شعرا، اس ذہنی حالت اور نفسیاتی بحران کی یا تو مخلصانہ عکاسی کرتے ہیں یا ان کے خلاف بھرپور احتجاج ——

۵۔ اقدار

"وہ گرز دار سب فرشتے بھی مرچکے ہیں
جو خیر و شر پر نگاہ رکھنے کے واسطے تھے
کوئی بھی میزان نیک وبد کی نہیں ہے قائم"
(خالق عبداللہ "رواںگی")

وجود کے ساتھ ساتھ انسانی اقدار کی تخلیق بھی خود انسان کے ذمے ہے۔ وجودیت پسند ان کھوکھلی اور ناقص اقدار کے شاکی ہیں جو انہیں اپنے ماحول میں نظر آتی ہیں۔ ایمانداری، سچائی اور مستند وجود کا تقاضا ہے کہ وہ غیر مقلدانہ طور پر جھوٹی اور سطحی اقدار کی گرتی ہوئی عمارت کا انہدام مکمل کرکے پھر اپنی اقدار کی بنیاد خود ڈالے اور ان پر جس طرح کی قدری عمارت وہ منتخب کرے بنائے جب وہ خود اپنے وجود کا خالق ہوتا ہے تو ان اقدار کا بھی اسی کو خالق بننا پڑے گا جو وہ قبول کرتا ہے اور جن پر وہ عمل پیرا ہوگا۔ یوں تو اولین وجودی عمل سے ہی اقدار کی تخلیق کا کام شروع ہوجاتا ہے۔ کیونکہ ہر فیصلہ اور ہر انتخاب اقدار کے پس منظر میں ہی ممکن ہے۔ اور اگر یہ اقدار اس کو ودیعت کی گئی ہیں یا انہیں وہ ادھار لیتا ہے تو یہ غیر مستند اور ریاکارانہ عمل

کی نشانی ہے جس کی آگ میں سچے اور اصل وجود کا پودا جھلس جائے گا۔
لہٰذا کرکگارد سے کامو تک تمام وجودیتی فلسفی اقدار کی اہمیت پر بہت زور دیتے ہیں مگر ان کا مخرج خود انسان کو بننا پڑتا ہے۔ اقدار کے بحران اور ان کے متروک ہو جانے کا احساس ہی نئی اور مستند قدروں کی تخلیق کا پیش خیمہ بنتا ہے۔ یہی احساس جدید شاعری میں بہت سی اچھی نظموں کا خالق ہے۔ زاہدہ زیدی کی نظم 'شکست و ریخت' میں اقدار کی شکستگی سے ہی نئی اقدار کی کرن پھوٹنے کی بشارت ملتی ہے۔ نئی قدروں کی تلاش میں اختر الایمان، وحید اختر، قاضی سلیم، ساجدہ زیدی، عمیق حنفی اور بہت سے دوسرے شعراء آبلہ پا ہیں۔

(۶) علیحدگی اور فراریت

آخر میں وجودیت میں علیحدگی اور فراریت کے بارے میں کچھ کہنا چاہوں گا جن کو اکثر مبالغہ کے ساتھ سمجھا جاتا ہے۔ یوں تو ہم دیکھ چکے ہیں کہ علیحدگی کن کن جہتوں میں اور کب کب پیدا ہوتی ہے مگر اکثر علیحدگی کو اس لئے تسلیم کیا گیا ہے کہ اس کا 'احساس ہی انسان کو اس کا مداوا ڈھونڈنے کی طرف راغب کرے گا۔
مگر جہاں سارتر ایک وجود کو دوسرے وجود سے بنیادی طور پر علیحدہ اور متصادم سمجھتا ہے وہاں مارسل یا یاسپرس اس ناامید کن احساس پر مستند یا ماورائی وجود کے حصول کے ذریعہ قابو پا لیتے ہیں۔ آخرالذکر عمل میں خدا کی اعانت شامل ہوتی ہے۔ مگر جہاں علیحدگی وجود کا ایک بنیادی پہلو بن جاتا ہے وہاں سے منفیت اور فراریت کی راہیں بیشک قریب تر ہو جاتی ہیں۔ کچھ وجودیتی فلسفی منفی پہلو کو زیادہ اہمیت ضرور دیتے ہیں۔ کرکگارد کے فکر میں انسان اور خدا کا جو بلاواسطہ ربط ہے اسکو حاصل کرنے کے لئے سماج سے فرار ناگزیر ہے۔ ہائیڈیگر اور یاسپرس کے بنیادی تضاد بھی مختلف طریقوں سے فراریت کے لئے راہ ہموار کرتے ہیں مگر یاسپرس اپنے نظریہ ابلاغ (ترسیل) سے انسانوں کے مابین ایک سررشتہ قائم کر دیتا ہے۔ تاہم اجتماعی زندگی اور سماجی یکجہتی کو وہ بھی اپنے فلسفے کی وجہ سے زیادہ اہمیت نہیں دے سکتا۔ روح سے روح کی گفتگو تو ممکن ہو جاتی ہے مگر سماجی زندگی عالم ارواح نہیں ہے۔ نیز اس کی روحانی زبان کو تسلیم کرنے کے لئے ہمیں زبان کی نئی تعریف ایجاد کرنا ہوگی۔ مارسل بہرحال اس میں زیادہ استوار نظر آتا ہے کیونکہ وہ خدا سے قربت کے لئے بندوں کی محبت، ان سے وفاداری اور دوستی، ان کی زندگی کے ہر پہلو میں شرکت اور باہمی اعتبار اور بھروسہ کو ضروری سمجھتا ہے۔ سارتر کی منفیت یوں تو ناامید کن حد تک شدید ہے اور انسانی رشتوں کی بنیاد بھی باہمی تصادم پر رکھی گئی ہے مگر اس کا احساسِ ذمہ داری اور ہر انفرادی انتخاب میں تمام عالم کے لئے منتخب کرنے کی تلقین اس منفیت میں ایک مثبت انداز پیدا کر دیتی ہے۔
کامو اپنے تصورِ ابلہیت کے باوجود اس لغو اور بے معنی دنیا میں انسان کو تندہی سے ان فرائض کی انجام دہی کا سبق دیتا ہے جو اسے دیگر انسانوں کا وجود تسلیم کرنے سے ملتے ہیں۔ وہ درحقیقت ایک عملی اور صحت مند تصورِ انسانیت کا علمبردار نظر آتا ہے کیونکہ وہ تمام تر ناامیدی، لامقصدیت اور ناگفتہ بہ حالات کے باوجود بغاوت کے جذبے کے ساتھ عمل پیرا ہونے پر زور دیتا ہے۔
وجودیت کا مندرجہ بالا اجمالی اور ناکافی جائزہ ہمیں اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ یہ ایک ایسی فلسفیانہ تحریک ہے جو آفاقی بلندیوں سے نازل نہیں ہوتی بلکہ یہ ایسے انسانوں کی کراہ اور چیخ سے پیدا ہوتی ہے جو سازگار ماحول اور ثابت بنیادوں کو کھو چکے ہیں اور ماضی سے کٹ کر حال میں بھٹک رہے ہیں۔ مختصر یہ کہ یہ فلسفہ اس سوال کا ایک جواب ہے کہ 'ہم کیا ہیں؟' اس جواب کی بازگشت جدید شاعری میں بھی سنائی دیتی ہے۔

"ہم سب اپنی اپنی لاشیں اپنے انا کے دوش پر لادے
ایک قبرستان کی پُر ہول اداسی سے اکتائے ہوئے
ایک نئے شمشان کا رستہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ ۔ ۔ ۔"

(وحید اختر 'کھنڈر، آسیب اور پھول')

●●

بقیہ: صفحہ "ہمارے ملک کا تعلیمی نظام"

ہندوستان آگے بڑھ رہا ہے۔ نئی کروٹ لے رہا ہے۔ سیاسی اعتبار سے ملک آزاد ہے لیکن اقتصادی میدان میں بہت کچھ کرنا ہے۔ صدیوں کی جہالت اور غریبی سے چھٹکارا پانا آسان نہیں ہے۔ گزشتہ چند برسوں میں ملک کو نئی زندگی اور نئی روشنی دینے کے بارے میں بہت کچھ کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں سب سے طاقتور ایجنسی سائنس اور ٹکنالوجی پر مبنی تعلیم ہے۔

شفق سہسرامی
کبیر گنج، سہسرام

کلنک

صنوبر جب کالج کے گیٹ سے باہر نکلی تو کوئی چیز اُس کے دل میں ٹوٹ سی گئی۔

اُسے اپنا وجود بکھرتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ خوشی جو بی اے کا امتحان پاس کرنے پر ہوئی تھی وہ مسرت کی لہر جو کانوکیشن میں آنے سے پہلے تھی جب اُسے ڈگری ملی اور پرنسپل مہتہ نے کہا "صنوبر میں بہت خوش ہوں کہ تم نے اپنا ریکارڈ قائم رکھا۔ تم کالج کی جان اور عزت تھیں، میری دعا ہے کہ تم زندگی کی ہر منزل پر اسی طرح کامیابی سے آگے بڑھتی رہو" تو اس کا دل فرطِ مسرت سے جھوم اٹھا تھا۔ اُس نے پُر غرور نظروں سے ہال میں بیٹھے لوگوں کا جائزہ لیا تھا۔ نہ جانے کتنی آنکھوں میں حسد کی آگ جل اٹھی تھی۔ ایک بے ساختہ مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر مچل گئی تھی۔

لیکن اب اُس کا دل بھر آیا تھا۔ آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں، جیسے آنسوؤں پر بندھا بند خوشی کے سیلاب کی تاب نہ لا کر ٹوٹ گیا اور آنسو اُمنڈ پڑے۔ اُس نے رُک کر رومال سے آنکھیں پونچھیں اور ایک بار ڈگری پر نظر ڈالی۔ چند کالے کالے بے جان حرفوں میں کون سی کشش ہے جس کے لئے اُس نے راتوں کی نیندیں حرام کیں۔ صنوبر نے سوچا۔ موٹی موٹی کتابیں سینے سے لگا کر کالج جاتی، ہر ماہ فیس جمع کرتی۔ ان چند حرفوں میں کتنی وسعت اور گہرائی ہے جس میں سارے کھیت سما گئے۔ زندہ رہنے کی اُمید ان کالے حرفوں کے لئے بک گئی۔

وہ تھکے قدموں سے سڑک پر چلنے لگی۔ سڑک جاگ رہی تھی۔ درد سے کراہ رہی تھی۔ تیز تیز باتیں کرتے لوگوں کا ہجوم، موٹر کاروں، بسوں اور سائیکلوں کا ہجوم، ہر طرف شور تھا لیکن صنوبر کے ذہن میں تیز آندھی چل رہی تھی اور وہ اس سڑک پر ہوتے ہوئے بھی ذہنی طور سے نہیں تھی۔ اُس کے قدم غیر ارادی طور پر اٹھ رہے تھے وہ خود بخود مڑ گھوم جاتی

اور پھر اُس کا قدم اپنی قبر تک پہنچ گیا۔ وہ قبر جس میں وہ رہتی تھی۔

گھر میں چہل پہل تھی۔ بیٹھک کا دروازہ کھلا ہوا تھا جس میں سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ غیر ارادی طور پر صنوبر کی نظریں اُدھر اُٹھ گئیں اُس نے اُن بزرگ کو دیکھا جن کی آنکھیں حلقوں میں دھنس گئی تھیں۔ گال کا گوشت پگھل گیا تھا اور چمڑا ہڈیوں سے چمٹ گیا تھا لمبی ناک جھک کر ہونٹوں تک آگئی تھی۔ سر کے سفید بال ٹوپی سے جھانک رہے تھے۔ اُن کی داڑھی دیکھ کر نہ جانے کیوں اُسے مگو چچا کا بکرا یاد آگیا جسے وہ اب بھی شیرو کہہ کر پکارتے تھے اور شیرو غیر کی طرح اکڑ جاتا تھا۔

صنوبر تیزی سے گھر میں داخل ہوگئی۔ دالان میں ادھیڑ عمر کی ایک خاتون جس کے کلّوں میں پان کی گلوریاں تھیں جُگالی کرتی ہوئی اسکی ماں سے باتیں کر رہی تھیں۔

صنوبر نے اُن محترمہ کو سلام کیا۔ جواب میں انہوں نے سر سے پاؤں تک اس طرح گھور کر دیکھا جیسے قصاب بکری خریدتے وقت دیکھتا ہے کہ اس میں کتنا گوشت اور کتنی چربی ہوگی۔ پھر انہوں نے جھک کر پلنگ کے نیچے اُگالدان تلاش کیا۔ اُگالدان اُس کی ماں کے پاس تھا۔ انہوں نے جلدی سے اٹھا کر اُس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ اُگالدان منہ کے پاس لے گئیں بائیں ہاتھ کا چھجا بنا کر اگالدان میں پیک تھوکی پھر آنچل سے ہونٹ خشک کر کے دعائیں دیں۔

صنوبر کو دیکھ کر اُس کے والد بیٹھک سے اُٹھ کر پردے کے پیچھے آگئے۔

آگئیں بیٹی کالج سے

جی ابا جان! دیکھئے بڑی ڈگری ملی ہے۔ صنوبر نے اُن کی طرف ڈگری بڑھائی لیکن وہ یہ کہتے ہوئے واپس چلے گئے۔

تم خود ہی آؤ اپنے چچا کو بھی دکھاؤ۔

صنوبر نے ماں کی طرف دیکھا جیسے نظروں سے پوچھ رہی ہو، جاؤں ماں! جاؤ جاؤ شرماتی کیوں ہو، یہ لوگ غیر تھوڑے ہی ہیں۔ اگر خدا نے چاہا تو۔ . . . اور ماں کا جملہ پورا ہونے سے پہلے وہ بیٹھک میں چلی گئی۔ اُس نے بزرگ کو سلام کیا۔ انہوں نے مشفقانہ انداز میں دعائیں دیں۔ ڈگری دیکھی اور بولے۔

مجھے بہت خوشی ہوئی کہ تم ایک ہونہار لڑکی ہو۔

صنوبر سمٹی سمٹائی ایک کونے میں کھڑی رہی۔ اُس نے ان لوگوں کو پہچان لیا تھا اُس کی عرفان سے نسبت کی بات چل رہی تھی۔ اس نے عرفان کی تصویر بھی دیکھی تھی۔ بہت خوبصورت جوان تھا۔ چہرے پر شرافت اور آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔ ہونٹوں کی مسکراہٹ میں کلیوں کی پاکیزگی

ورشبنم کی ٹھنڈک تھی۔ اُسے عرفان پسند آیا تھا۔ وہ گھنٹوں تصویر دیکھ کر سوچتی رہتی میری قسمت میں ایک شہزادہ لکھا ہے۔ ایک لڑکی کی تمنا ہی کیا ہوتی ہے۔ شریف گھرانا، خوبصورت نیک کردار اور محبت کرنے والا خاوند۔ اور جہاں تک عرفان کی شرافت کا سوال تھا اُس کے خاندان کی صرف ایک یہی چیز تو رہ گئی تھی ورنہ وقت نے اپنی پوری کوشش کر ڈالی تھی کہ اُن کا سب لُٹ جاتے جاتے سب ختم ہو گیا صرف شرافت باقی تھی۔

جہاں تک اُس کی معلومات کا سوال تھا اور شبنم نے اس کی مدد کی تھی اُسے یہی معلوم تھا کہ صورت کے ساتھ عرفان کی سیرت بھی اچھی ہے۔ صنوبر محسوس کرتی کہ عرفان کے لئے اس کے دل میں جگہ بنتی جا رہی ہے۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہر وقت اُس کے بارے میں سوچتی رہتی ہے۔ ہر گھڑی وہ عرفان کی تصویر دیکھتے رہنا چاہتی تھی لیکن ماں کا ڈر تھا ترش سے کہدیں گی۔

نظر کا پانی مر گیا ہے کالج میں پڑھکر کیسے دیدے پھاڑ پھاڑ کر تصویر دیکھ رہی ہے۔ شرم بھی نہیں لگتی۔ ایک ہم لوگوں کا زمانہ تھا۔ تصویر کا تو نام بھی نہیں جانتے تھے۔ والدین نے جہاں مناسب سمجھا ہاتھ پیلا کر کے ڈولی میں بٹھا دیا۔

صنوبر کی ماں پرانے خیال کی عورت تھیں اس لئے تعلیم نسواں کی سخت مخالف۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ صنوبر کالج میں پڑھے۔ شریف گھر کی بیبیاں جب سرے بازار گھومنے لگیں تو پھر زمانہ کیوں نہ غارت ہوگا۔

صنوبر کے والد مرزا صاحب کی نظریں بدلتے حالات کا جائزہ لے رہی تھیں۔ پڑھی لکھی لڑکیوں کو تو رشتے مشکل سے مل رہے ہیں جاہل لڑکی کو کون پوچھے گا؟ انہوں نے سخت سے سخت حالات کا مقابلہ کیا اپنی اچکن میں پیوند لگوا لیا۔ جوتے کی ایڑی گھِس کر پانی ہو گئی۔ پیوند نے جوتے کی شکل بدل ڈالی لیکن صنوبر کے کالج کی فیس وقت پر دی گئی۔ کتابیں فوراً خریدی گئیں۔ مرزا صاحب کی عمر پچاس سے تجاوز کر چکی تھی۔ زمانے کی تُند ہواؤں نے اُن کے قویٰ اضمحل کر دیئے تھے۔ ورنہ پچاس کی عمر کس گنتی میں ہوتی ہے۔ مثل مشہور ہے ساٹھا تب پاٹھا لیکن وہ تو اس لائق بھی نہیں رہ گئے تھے کہ دو بار بازار جا کر سودا سلف لے آئیں۔ اگر کبھی چلے جاتے تو گھنٹوں پلنگ پر لیٹے پنکھا جھلتے اور لمبی لمبی سانسیں لیتے رہتے۔ زمینداری ختم ہونے کے بعد کچھ کھیت رہ گئے تھے جنہیں بیچ کر پیٹ کی دوزخ کا ایندھن اور صنوبر کی پڑھائی کے اخراجات پورے کئے جاتے تھے اور اب تو سب ختم ہو گیا تھا۔ اگر صنوبر کو دو ایک کلاس اور پڑھنا ہوتا تو شاید ... ؟ اب تو یہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ بیٹی کا بیاہ کیسے کریں گے؟ اُن کی بقیہ زندگی کیسے گذرے گی؟ کیا کھائیں گے۔ کون اُن کی دیکھ بھال کرے گا۔ آنکھ سے کم سجھائی دیتا ہے لیکن انھیں اپنی اتنی فکر نہیں تھی جس خدا نے انہیں پیدا کیا وہ سب کچھ دیکھتا ہے۔ وہ کسی طرح صنوبر کو ڈولی میں بٹھا دینا چاہتے تھے۔

مرزا صاحب کو صنوبر کے امتحان کے نتیجے کا انتظار تھا جس کشتی کو وہ کتنے طوفانوں سے بچاتے ہوئے کنارے تک لائے تھے اُسے منزل پر پہنچا دیں پھر دیکھیں گے اچھا ہوا یا بُرا؟ یہ کنارہ بہتر ہے یا وہی کنارہ بہتر تھا۔

آج عرفان کے والدین صنوبر کو دیکھنے آئے تھے۔ اُن کے چہروں پر بکھری مسکراہٹ اس کا ثبوت تھی کہ صنوبر اُنہیں پسند آئی ہے۔ جاؤ بیٹی! چائے لے آؤ۔ مرزا صاحب نے صنوبر سے کہا۔ وہ جلدی سے بیٹھک سے نکل گئی۔ گھر میں داخل ہوتے وقت اس کے کانوں میں شہنائیوں کی آوازیں دُور سے آکر رس گھول رہی تھیں۔

لڑکی مجھے پسند آئی۔ صنوبر کے جانے کے بعد عرفان کے والد نے کہا۔ عرفان بھی آپ لوگوں کا دیکھا بھالا ہے۔ وہ بھی نہایت ذہین لڑکا ہے۔ بی اے پاس کئے سالوں گذر گئے میں نے نوکری نہیں کرنے دی۔ زیادہ سے زیادہ سو ڈیڑھ سو روپے کی کلرکی ملے گی اور اس گرانی کے بڑھتے ہوئے طوفان میں اس کی کیا حیثیت ہے۔ ایک وہ بھی زمانہ تھا جب درجنوں لوگ ہماری ڈیوڑھی پر پڑے رہتے تھے اور آج خود اپنا پیٹ بھرنے کی فکر ہی سب سے بڑی فکر ہے۔ انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ گذرے دنوں کی یادوں کے نقوش ایک ایک کر کے اُن کے چہرے کی جھریوں میں اُبھرے اور چھپتے گئے۔ موضوع بدل رہا تھا اس لئے مرزا صاحب نے رُخ بدلا۔

ہاں تو پھر عزیزم عرفان کے لئے کیا سوچا ہے۔ کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہے۔

گھبرایئے نہیں مرزا صاحب! میں نے جب تک ہر اونچ نیچ کو سوچ نہیں لیا تھا آئندہ زندگی کا خاکہ بنا نہیں لیا تب تک اُس کی شادی کی طرف دھیان نہیں دیا۔ بات یہ ہے کہ اُس کی رگوں میں زمینداروں کا خون دوڑ رہا ہے جو صرف حکم چلانا جانتے تھے —— ہم لوگ خود کو ہی دیکھیں بال سفید ہو گئے لیکن نوکری کی؟ کسی کا درشت لہجہ برداشت ہی نہیں ہوتا۔ اس لئے میں نے سوچا ہے سب سے بہتر ذریعہ تجارت ہوگی۔ کہئے کیا خیال ہے؟

واللہ کیا کہتے ہیں آپ کے اس خیال کے۔ مرزا صاحب خوش ہو کر بولے۔ سچ پوچھئے یہی ہمارے آبا و اجداد کا پیشہ رہا ہے۔ اس میں جو برکت ہے وہ کسی دوسرے دھندے میں نہیں۔

جی ہاں اس لئے میں نے شادی کی بات آپ کے یہاں چلائی کہ آپ سمجھ دار آدمی ہیں۔ ویسے تو لڑکیوں کی کمی نہیں۔ ایک سے ایک بڑے گھرانوں کی لڑکیاں مل سکتی ہیں لیکن میں نے سوچا آپ بھی باغ باغ

روپیہ تجارت کے لئے دے ہی دیں گے۔ جی ... مرزا صاحب ایسے اُچھل پڑے جیسے سینے میں نشتر اُتار دیا گیا ہو۔ پانچ ہزار لیکن اتنی ....

دیکھیے قبلہ اگر عرفان خوشحال رہے گا تو آپ کی بیٹی بھی سُکھی رہے گی اور آپ کے لئے یہ کون سا مشکل ہے۔ ویسے دینا نہ چاہیں تو یہ الگ بات ہے۔ لیکن ہم لوگوں نے تو یہی طے کیا ہے کہ عرفان کی شادی اسی جگہ ہوگی جہاں سے مانگ پوری ہو۔ ہم لوگ جا رہے ہیں آپ سوچ کر جواب دیجئے گا۔

وہ لوگ چلے گئے اور مرزا صاحب کے ہاتھوں میں ڈگری من من بھر کی ہوگئی۔

صنوبر نے سُنا تو بڑی مشکل سے چیخ حلق میں گھونٹ سکی لیکن اسکی کڑواہٹ اس کی رگ رگ میں سرایت کرگئی۔ ایک غبار سا دل سے اٹھا اور کہیں بلندی پر جا کر پھٹ گیا۔ عرفان کی تصویر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گئی، کئی دنوں تک گھر میں موت کا سا سناٹا رہا۔ چلتی پھرتی لاشوں کے سائے تھے۔ زندگی کا سایہ تھا لیکن زندگی نہیں تھی آنکھوں میں روشنی تو تھی لیکن اُس پر سوچ اور اُلجھن کے سائے پڑے ہوئے تھے۔

بازی پلٹ گئی۔ وہی کتنا اچھا تھا۔ اپنا سب کچھ بیچ کر یہ کاغذ کیوں خریدا۔ کیا ملا اس سے۔ عزیز رشتہ داروں میں چہ میگوئیاں ہوئیں۔ بیٹی کو پڑھا رہے ہیں دیکھو کیا ملتا ہے۔

ملے گا کیا وہی لعنت جو تعلیم کے ساتھ چمٹی ہوئی ہے۔ مرزا صاحب ہی اس تعلیم کے حق میں ہیں۔

پُرانے ڈھانچے میں نئی زندگی۔ کہیں کے نہ رہیں گے۔

کون کچھ کہہ کر بُرا بنے، وہ اپنے آگے کسی کی سنتے ہیں۔

اور جنگل کی آگ کی طرح عرفان کے والدین کی مانگ کی خبر اڑوس پڑوس سے ہوتی ہوئی رشتہ داروں تک پہنچ گئی۔

اب بڈھے کی آنکھ کھلے گی عقل پر خدا کی مار ہی پڑ گئی تھی۔

پھٹکار پڑے ایسی عقل پر، صنوبر کی زندگی برباد ہوئی۔

صنوبر کو اس بات سے دلی تکلیف پہنچی تھی۔ ایک معصوم لڑکی کے خواب بکھر گئے تھے لیکن وہ کسی پر ظاہر نہ ہونے دیتی کہ اُسے کوئی غم بھی ہے۔ والدین کی گرتی حالت دیکھ کر اُس نے خود کو سنبھال لیا۔ اس بے فکری سے رہتی ہنستی بولتی کہ کسی کو شک بھی نہ ہوتا کہ اس ہنسی کے پیچھے بے چینیوں کا طوفان مچل رہا ہے۔

لیکن جب شبنم آئی تو اُسے دیکھ کر طوفان پھٹ پڑا۔ اور وہ اسکے سینے میں منہ چھپا کر رو پڑی، دیر تک روتی رہی۔ جب اُس کے آنسو تھمے دل کا غبار نکل گیا تو شبنم نے اُس کی آنکھیں اپنے دوپٹے سے صاف کردیں پھر دیر تک سمجھاتی رہی۔

جب وہ دوبارہ کمرے سے نکلیں تو صنوبر پہلے کی طرح مسرور تھی۔ اُسکی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جیسی چمک اُس پیاسے کی آنکھوں میں آتی ہے جب وہ ریگستان میں میٹھے پانی کا چشمہ پالیتا ہے۔

ماں نے اس چمک کو حیرت سے دیکھا۔ مرزا صاحب نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ کیا کہا تم نوکری کروگی؟

اس میں کون سا حرج ہے ابا جان۔ لڑکیوں کو تعلیم اس لئے دلوائی جاتی ہے کہ ضرورت پڑنے پر وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکیں۔ پھر آپ نے مجھے بیٹا سمجھ کر پرورش کی ہے۔ آفاق بھیا اگر بچپن میں اللہ کو پیارے نہ ہوگئے ہوتے تو اتنا پڑھ لکھ کر یوں بیکار رہتے۔

بیٹی میں نے تمہیں پڑھا کر ہی غلط کیا؟ مرزا صاحب دھیرے سے بولے۔ تم نے جو کچھ کہا میں اس سے متفق ہوں لیکن دُنیا کا بھی خیال کرو اُس نے پہلے ہی مجھے اچھی نظروں سے نہیں دیکھا ہے۔ اب تم چاہتی ہو کہ گھر سے نکلنا ہی چھوڑ دوں۔

آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں چچا جان! شبنم بولی۔ میں بھی تو نوکری کرنے لگی ہوں اور کوئی کچھ نہیں کہتا۔ دنیا کو چھوڑیئے۔ اُسے کسی کی اچھی حالت پسند نہیں، اگر دنیا والوں کو اتنی فکر ہے تو پانچ ہزار دے کر شادی کیوں نہیں کرا دیتے۔

وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن نوکری ملنا بھی تو آسان نہیں، کہاں کہاں دھکے کھاتی پھرے گی۔ مرزا صاحب نیم رضامند ہوگئے۔

دھکے کھانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میں جس فرم میں کام کرتی ہوں وہاں ایک لیڈی کلرک کی ضرورت ہے میرے کہنے سے اسے وہ جگہ مل جائیگی۔

مرزا صاحب رضامند ہوگئے۔ لیکن صنوبر کی ماں نے خوب واویلا مچایا۔ اب جو عزت رہ گئی ہے اُسے کیوں نیلام کرانے پر تُلی ہے تُو۔ غضب خدا کا اب لڑکی کمائے گی اور ہم بے شرم کھائیں گے۔ ایسی زندگی سے تو موت ہی بہتر ہے۔ نہ جانے خدا کن بُرے اعمالوں کی سزا دے رہا ہے۔

وہ چیختی رہ گئیں اور صنوبر کام پر چلی گئی۔ شبنم خود ہی اُسے اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ جب شام کو وہ لوٹی تو خوش تھی لیکن اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی بھی تھی اور خوف کی پرچھائی بھی۔ مرزا صاحب نے کام کے بارے میں پوچھا تو کہہ دیا، بہت اچھا کام ہے ابا جان۔ فی الحال وہ ایک سو روپیہ تنخواہ دیں گے۔ جب کام پوری طرح سمجھ جاؤں گی تو تنخواہ بڑھ جائے گی۔ وہ کام پر جاتی رہی اور اب کسی قدر مطمئن ہوگئی۔ پہلے اس کی آنکھوں میں خوف و ہراس کی جو کیفیت تھی وہ بھی رفتہ رفتہ ختم ہوگئی۔

گھر کی حالت بدل گئی اور زندگی کسی قدر پُرسکون ہوگئی۔ وہ صبح اُٹھ کر جلدی جلدی گھر کا کام کر ڈالتی۔ ناشتے کے بعد فوراً کھانا بنا دیتی اور دس بجے کام پر چلی جاتی۔ لیکن مرزا صاحب گھُلے جا رہے تھے۔ عرفان

کے یہاں سے جواب کا تقاضا ہو رہا تھا نہ وہ اس رشتے کو نگل سکتے تھے نہ اگل سکتے تھے۔

ایک دن صنوبر وقتِ مقررہ پر گھر واپس نہیں آئی۔ پانچ بجا۔ چھ۔ پھر سات بج گئے۔ مرزا صاحب کی نظریں دروازے پر جمی تھیں۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ مرزا صاحب نے ٹٹول کر دروازہ کھولا۔ پھر آنکھوں کی بصیرت سمیٹ کر باہر کھڑے آدمی کو دیکھا۔

"آپ ہی مرزا انیس ہیں ——؟ سپاہی پوچھ رہا تھا۔

جی ہاں کیوں؟

تھانہ چلئے آپ کو داروغہ جی نے بلایا ہے۔ سپاہی نے کہا اور مرزا صاحب کا دل ہول کھانے لگا۔ آج تک ایسا نہیں ہوا تھا۔ اللہ تو ہی عزت رکھنے والا ہے۔ وہ ہانپتے کانپتے سپاہی کے ساتھ تھانہ پہنچے۔ وہاں بہت سی لڑکیاں کھڑی تھیں۔ مرزا صاحب کی نظریں لڑکیوں کا جائزہ لیتے ہوئے صنوبر پر آکر رک گئیں۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

کیا یہ آپ کی بیٹی ہے ——؟ داروغہ نے صنوبر کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ مرزا جی نے سر ہلا کر اقرار کیا۔ پھر اُن کی نظریں عرفان کے والد پر پڑیں جو ایک سپاہی کے ساتھ داخل ہو رہے تھے۔ مجھے کیوں بلایا ہے صنوبر بیٹی ——!

یہ اُس گروہ کے ساتھ پکڑی گئی ہیں جو ٹرین میں مسافروں کو دھوکا دے کر اُن کا سامان اڑایا کرتی تھیں۔

ارے . . . . مرزا صاحب کے ہاتھ سے چھڑی چھوٹ کر گر پڑی۔

صنوبر یہ کیا کیا تم نے۔ میری اس سفید داڑھی کا خیال بھی نہیں کیا۔ عزت کی پرواہ بھی نہیں کی

وہ رو پڑے۔ تُو تو کہتی تھی میں نوکری کرتی ہوں۔ تُو نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا۔ بتا . . . بتا مجھے۔

اچانک صنوبر کا زرد رخسار شہابی ہو گیا۔ جھکی ہوئی گردن تن کر سیدھی ہو گئی۔ اس نے حقارت سے عرفان کے والد کی طرف دیکھا اور کہا۔

صرف پانچ ہزار روپے کے لئے ابا جان، میں مجبور تھی ——!!

اکسٹا کا صفحہ

[illegible]

[illegible]

غزل

محسن صدیقی لکھنوی
گوجر پورہ، بھوپال

فیصلہ زندگیِ دل کا ہے دشوار اب تک
لبِ نازک پہ نہ اقرار نہ انکار اب تک

قیدِ ہستی میں ہیں کتنے ہی گنہگار اب تک
کہیں دیکھے نہ سنے ایسے گرفتار اب تک

خاک میں مل گئے کتنے ہی طرحدار اب تک
اور تم ہو کہ محبت سے ہو بیزار اب تک

غیرتِ عشق مری راہ نہ تکتی ہو کہیں
جان دینے پہ نہیں کوئی بھی تیار اب تک

اے شہیدانِ وطن تم نے تو جانیں دے دیں
یہ بتاؤ کہ ہوا کوئی بھی ہشیار اب تک

دوڑتے ہی رہے زنداں سے بیاباں تک ہم
نہ ملا آہ کوئی سایۂ دیوار اب تک

نازبردار لہو اپنا چھڑکتے ہی رہے
گل کھلاتی ہی رہی شوخیٔ رفتار اب تک

کتنی لاشیں ہیں یہاں منتظرِ گور و کفن
اِدھر اٹھتی ہی نہیں نرگسِ بیمار اب تک

کتنے ہی لیلیٰ و مجنوں ہوئے بربادِ وفا
حسن اور عشق کی ہے گرمیٔ بازار اب تک

عہدِ منصور کا اس دور میں دستور کہاں
کوئی پرساں ہی نہیں ہم ہیں سرِ دار اب تک

ہم نہیں تو نہ سہی تجھ کو مبارک اے عشق
دھونڈتی پھرتی ہے [illegible]

ہم پکارا کئے بازارِ جہاں میں
نہ ملا عظمتِ انساں

منظر اعظمی
شعبۂ اردو، جموں یونیورسٹی، کنال روڈ، جموں (کشمیر)

دستورِ عشّاق کا ماخذ

۱۹۲۴ء میں مولوی عبدالحق نے جب 'سب رس' کو دریافت کر کے اس کا تعارف کرایا تو انہیں اس کے ماخذ کا علم نہیں تھا لیکن جب ۱۹۲۶ء میں آرتھالیس۔ گرین شیلڈس نے 'دستورِ عشاق' کی ترتیب و تدوین کر کے اسے برلن سے شائع کرایا تو اس کے مقدمے سے انہیں بہت سی معلومات حاصل ہوئیں اور انہوں نے ۱۹۳۲ء میں 'سب رس' کی باقاعدہ تدوین کی اور اس پر ایک عالمانہ مقدمہ بھی لکھا۔ اسی مقدمہ سے معلوم ہوا کہ 'سب رس' کا اصل ماخذ 'دستورِ عشاق' ہے۔ اس کے بعد بہت سے حضرات نے 'سب رس' اور اس کے ماخذ پر اظہارِ خیال کیا۔ ان میں عزیز احمد کا مضمون 'سب رس کے ماخذ اور مماثلات' (مطبوعہ رسالۂ اردو کراچی جنوری ۱۹۵۰ء) اور ڈاکٹر نور السعید اختر کا مضمون 'قصۂ حسن و دل مختلف زبانوں میں' (مطبوعہ دوماہی شیرازہ، سری نگر جلد ۸ شمارہ ۲) وقیع، معلومات افزا اور تحقیق کی اچھی مثالیں ہیں۔ پروفیسر عزیز احمد نے 'سب رس' اور اسکے ماخذ کا تنقیدی اور عالمانہ جائزہ لیا اور خیال ظاہر کیا کہ "وجہی 'حسن و دل' کے قصے کے علاوہ 'دستورِ عشاق' سے بھی واقف تھا اور اس نے عمداً دستورِ عشاق کی تفصیلات اور خضر کے معارف و اسرار کے بیان سے احتراز کیا ہے"[۱] اس کے برعکس مولوی عبدالحق کا خیال تھا کہ "وجہی نے فتاحی کے نثری قصے 'حسن و دل' کا چربہ اتارا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ 'دستورِ عشاق' اس کی نظر سے نہیں گزری"[۲] قطع نظر اس سے کہ 'سب رس' میں 'حسن و دل' کا چربہ اڑایا یا 'دستورِ عشاق' کا، اصل بات یہ ہے کہ وجہی کا معنوی استاد فتاحی نے 'دستورِ عشاق' کے علاوہ اس کا نثری خلاصہ 'حسن و دل' اور نظم

میں اسی موضوع سے متعلق دوسری کتاب 'شبستانِ خیال' لکھی۔ ڈاکٹر نور السعید اختر نے 'مراٹھی ساہتیہ پتریکا' میں سابق ممبر مہاراشٹر پبلک سروس کمیشن جناب دیوی سنگھ چوہان کے مضمون 'پربودھ چندرودیہ اور دستورِ عشاق'[۳] سے استفادہ کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار بلا تکلف کیا کہ فتاحی نے 'دستورِ عشاق' میں گیارہویں صدی عیسوی کے مشہور ڈرامہ نگار کرشن مشر کی سنسکرت تصنیف 'پربودھ چندرودیہ' سے فائدہ اٹھایا ہے اس لئے 'دستورِ عشاق' کا ماخذ سنسکرت ڈرامہ 'پربودھ چندرودیہ' ٹھہرتا ہے"۔ فتاحی نے دستورِ عاشق (عشاق) کی تکمیل میں اس کی تصنیف 'پربودھ چندرودیہ' سے استفادہ کیا ہے[۴]

ان حقائق سے تحقیق کی نئی راہیں کھلیں اور حقیقتاً نئی نئی باتیں معلوم ہوئیں۔ مجھے اپنے تحقیقی مقالے کی تیاری کے دوران ان سارے حقائق پر غور کرنے کا موقع ملا اور اندازہ ہوا کہ بہت سی باتیں اب بھی تحقیق طلب ہیں اور بعض معلوم شدہ نکات محض رواداری کا نتیجہ ہیں۔

پروفیسر عزیز احمد نے 'دستورِ عشاق' اور فرانس کی مشہور تمثیل 'رومان گل' [illegible] کی حیرت انگیز مشابہتوں پر زور دیا ہے۔ اور اسی بنیاد پر ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے 'رومان گل' کو قصۂ حسن و دل سے متاثر سمجھ لیا ہے[۵] حالانکہ قصۂ حسن و دل موجودہ شکل میں دستورِ عشاق سے پہلے نظر نہیں آتا۔ 'دستورِ عشاق' ۱۴۹۶ء کی تصنیف ہے اور 'رومان گل' بقول عزیز احمد صاحب "دستورِ عشاق سے تقریباً چار سو سال قبل لکھی گئی"[۶] کم و بیش اسی زمانے میں 'پربودھ چندرودیہ' بھی لکھی گئی۔ اس لئے کہ کرشن مشر گیارہویں صدی عیسوی کا ڈرامہ نگار تھا اور اس نے اسی زمانے میں اپنا مشہور ڈرامہ لکھا۔ البتہ ان میں جس بنیادی موضوع یعنی صفائے قلب کو تمثیل کے پیرائے میں پیش کیا گیا ہے وہی کم و بیش ہر جگہ نظر آتا ہے اور سب سے بڑا اشتراک یہ ہے کہ یہ سبھی تصنیفیں تمثیلی ہیں اور ان میں مجرد اوصاف و اشیاء کو جاندار بنا کر پیش کیا گیا ہے اور ظاہری سطح کے علاوہ باطنی سطح میں گہری معنویت کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے۔ ابھی تک ایسی کوئی داخلی یا خارجی شہادت نہیں ہے کہ فتاحی کے 'رومان گل' سے استفادے ہی کا قیاس کیا جاسکے

---

۱ 'سب رس کے ماخذ اور مماثلات' رسالۂ اردو کراچی شمارہ ۱ جلد ۲۹ ص ۲
۲ 'سب رس' ص ۱۴

۳ 'پربودھ چندرودیہ' اور دستورِ عشاق' مراٹھی ساہتیہ پتریکا ماہ اپریل ۱۹۶۹ء
۴ قصۂ حسن و دل مختلف زبانوں میں، دوماہی شیرازہ سری نگر جلد ۸ شمارہ ۲ ص ۵۲
۵ ملاحظہ ہو مجلہ عثمانیہ ۶۴-۱۹۶۳ء مضمون 'دکنی ادب کے عالیہ نمونے' از ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ
۶ 'سب رس ماخذ اور مماثلات' از عزیز احمد رسالہ اردو کراچی جنوری ۱۹۵۰ء ص ۱۳

البتہ پربودھ چندر ودیہ' کے مصنف کرشن مشر کے بارے میں کچھ داخلی شہادتوں کی بنیاد پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ فتاحی نے اس سنسکرت تمثیل سے ضرور استفادہ کیا ہوگا۔

'پربودھ چندر ودیہ' بڑی مشہور سنسکرت تصنیف تھی اور اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ وہ ہندوستان کی کم و بیش سبھی زبانوں میں منتقل ہوئی یہاں تک کہ اس کا اردو میں بھی ترجمہ ہوا اسکا پہلا ترجمہ گجراتی میں ہی ہوا۔ یہ ترجمہ تیرہویں صدی عیسوی میں گجراتی کے ایک ادیب جن پربھاچاریہ نے 'سمبودھ چرت' کے نام سے کیا۔ اس کے بعد مختلف زمانوں میں ۹ اور ترجمے ہوئے۔ اس کے علاوہ دو ترجمے مراٹھی میں بھی ہوئے۔ گارساں دتاسی کے قول کے مطابق دو ترجمے اردو میں ایک تعوید ایمان یا تہذیب مقالی' کے نام سے اور دوسرا' مہتاب معرفت' کے نام سے ہوا اور ایک ترجمہ نند داس جیو نے ہندی یا گوالیاری میں کیا[۱] اسی ہندی ترجمے کے ذریعہ جسے بنوالی داس ولی گوالیاری بھا کا کہتا ہے۔ پربودھ چندر ودیہ' عرف گلزار حال' کے نام سے اس نے فارسی تصنیف پیش کی۔ ولی کی یہ فارسی تصنیف جس کا ایک نسخہ ٹیگور لائبریری لکھنؤ اور دوسرا دہلی یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے مجھے دیکھنے کو ملی جو شکستہ ہونے کے باوجود' پربودھ چندر ودیہ' کی مقبولیت اور اہمیت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

'پربودھ چندر ودیہ' کی اس مقبولیت سے قیاس ہوتا ہے کہ یہ یا اسکا کوئی ترجمہ فتاحی کی نظر سے ضرور گزرا ہوگا۔ اس لئے کہ اس نے اپنی مثنوی 'دستورِ عشاق' میں جس نہج کو اختیار کیا وہ تمثیل کا تھا۔ اگرچہ ان دونوں موضوعات میں بھی تنوع ہے، فکر بھی جدا ہے اور ادبی صنف کے اعتبار سے بھی انتخاب جداگانہ ہے۔ کرشن مشر نے وشنو بھگتی کی فضیلت اور اہمیت کو موضوع بنایا اور عشق کے مقابلے میں عقل کو فوقیت دی۔ عشق اس کے نزدیک ہوس کے مترادف ہے عقل اور مذہب کے امتزاج سے اس نے طلوع مہتابِ معرفت' یعنی' پربودھ چندر ودیہ' کا نظریہ پیش کیا۔ اس کے برعکس فتاحی نے تصوف کو مرکزی نقطہ ٹھہرایا اور عقل کے مقابلے میں عشق کی برتری ثابت کی جس کے ذریعہ آبِ حیات کو دستیاب کیا۔ فکر کے اعتبار سے کرشن مشر وشنو بھگتی کا سختی سے قائل ہے۔ اس نے بدھ اور جین متوں پر طنز بھی کیا ہے اور مذاق بھی اڑایا ہے۔ فتاحی توحید کا قائل اور وصل الی اللہ ہونے ہی کو نجات کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ 'پربودھ چندر ودیہ' ۲ ابواب کے ڈرامے کی شکل میں ہے جبکہ 'دستورِ عشاق' مثنوی کی صورت میں لیکن عقل اور عشق اور حسن و دل کی کشمکش دونوں میں ملتی ہے۔ اس کے علاوہ کرشن مشر لوگ اور رہبانیت اور فتاحی ریاض اور مجاہدے پر زور دیتے ہیں جو بنیادی اعتبار سے ایک ہی چیز ہے۔ مادیت کے دونوں خلاف ہیں۔ دونوں مذہب کی اثر انگیزی کے قائل ہیں۔ دونوں نے دنیاوی عیش و تنعم اور فلسفۂ لذتیت کی مذمت کی ہے۔ اسی طرح ان دونوں میں اختلاف و اشتراک متوازی صورت میں ملتے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ فتاحی نے دعویٰ کیا ہے کہ

دریں باغ ارچہ بے برگیت کشتم نہ دزدم باستانِ باغِ خویشتم
زکان خاطرِ خود نکتہ سنجم نہ با نقدِ کساں چوں مار گنجم

اس کے باوجود تمثیلی پیرایۂ بیان کے استفادے کی تردید نہیں ہوتی بلکہ اس کے برعکس 'دستورِ عشاق' میں ایسے اشعار موجود ہیں جس سے کرشن مشر کی طرف واضح اشارہ ملتا ہے۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر نور السعید اختر نے اپنے گرانقدر مضمون "قصۂ حسن و دل مختلف زبانوں میں" جن دو اشعار کو ثبوت کے طور پر پیش کیا ہے وہ رواداری کی اچھی مثال ہے۔ وہ کہتے ہیں "ملا وجہی مصنف سب رس (۱۶۳۵ء) کی طرح فتاحی نے اپنی تینوں تصانیف میں جو قصۂ حسن و دل پر مبنی ہیں کہیں بھی قصے کے ماخذ کی طرف اشارہ نہیں کیا۔ فتاحی نے بھی یہ نہیں بتایا کہ اس نے اس تمثیلی پیرایۂ بیان کی کس ادب سے خوشہ چینی کی ہے۔ البتہ فتاحی نے حقیقت کی طرف عارفانہ پردہ داری کے ساتھ خفیف سا اشارہ کر دیا ہے۔ دستورِ عاشق (دعشاق) میں فتاحی کا اشارہ اپنے پیرِ والا کی طرف اس طرح ہے ــــ

بہ مشرق رہ نمودش پیرِ والا زلیتی دستِ قدرش ساخت بالا
نظر از خاکِ مشرق شد طربناک کہ ہست اشراق نور عزت از خاک

ان اشعار سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا پیرِ والا مشرق کا باشندہ ہے۔ لیکن واضح طور پر اس کا نام کہیں نہیں ملتا لیکن بیرونی معلومات کی مدد سے ہم بغیر کسی پس و پیش کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ فتاحی کا یہ اشارہ بلاشبہ کرشن مشر کی طرف ہے جو اس قصے کا خالق ہے اور فتاحی نے دستورِ عاشق (دستورِ عشاق) کی تکمیل میں اس کی تصنیف 'پربودھ چندر ودیہ' سے استفادہ کیا ہے۔"[۲] اسی کے ساتھ اگر ہم دیوی سنگھ چوہان کے یہ جملے بھی اضافہ کر لیں کہ "پربودھ چندر ودیہ' ناٹک کا اثر ہندوستان، ایشیا میں ایران، ترکستان وغیرہ ملکوں اور انگلینڈ پر بھی پڑا

---

[۱] خطبات گارساں دتاسی' انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن ۱۹۴۳ء اور ۱۹۴۴ء

[۱] دو ماہی شیرازہ سری نگر جلد ۸ شمارہ ۲ ص ۵۲-۵۳
[۲] بحوالہ مضمون "قصۂ حسن و دل، مختلف زبانوں میں" دو ماہی شیرازہ سری نگر جلد ۸ شمارہ ۲ ص ۵۴

تو فتاحی کے اس ڈرامے سے استفادہ کرنے کی بات بعید از قیاس نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن ڈاکٹر نور السعید اختر نے بیرونی معلومات کا ذکر تو کیا مگر شہادت نہیں دی اور جو داخلی شہادت پیش فرمائی ہے وہ سراسر بے محل بلکہ گمراہ کن ہے۔ اس لئے کہ محولہ بالا اشعار کا محل یہ ہے کہ دل، نظر اور ہمت جب 'گلزار رخسار' میں حضرت خضرؑ سے ملاقات کرتے ہیں تو خضرؑ اس داستان کے تمام مجازی کرداروں پر حقیقت کی پردہ کشائی فرماتے ہیں اور عقل، بدن، رزق، توبہ، زہد، ہمت، قامت زلف اور دوسرے کرداروں کی حقیقت بتلاتے ہوئے ہمت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ

زہمت نیز فیض راہ بیں یافت　　　ز ارشادش طریق داد و دیں یافت

اور اس کے معاً بعد ارشاد ہوتا ہے کہ

بہ مشرق رہ نمودش پیر والا　　　زپستی دستِ قدرش ساخت بالا

اور پھر نظر کے لئے کہتے ہیں کہ

نظر از خاکِ مشرق شد طربناک　　　کہ ہست اشراقِ نور عزت از خاک
دیا رِ عشق و عرفانِ خدائیست　　　کہ او را از محبت رہنمائیست

صاف ظاہر ہے یہاں ہمت کی صفت بتائی گئی ہے۔ یعنی یہ وہی پیر والا ہے جس نے مشرق کی طرف اس کی یعنی دل کی رہنمائی کی اور اپنے دستِ قدر سے اس کی پستی کو بلند کیا۔ یہاں یہ بھی ذہن میں رہے کہ نظر کو جو دل کا فرستادہ تھا مشرق کی طرف شہرِ دیدار کے گلزار رخسار میں آبِ حیات کا پتہ اسی ہمت نے دیا تھا۔ ساتھ ہی اسی ہمت کی بدولت نظر بھی مشرق کی خاک کی روشنی سے طربناک و شرفیاب ہوا۔ گویا "نظر از خاکِ مشرق شد طربناک" میں نظر کردار کا ذکر ہے۔ خاکِ مشرق سے طربناک ہونے کی بات درپردہ یا عارفانہ انداز میں بھی مصنف کے لئے نہیں ہے۔ کم سے کم ان اشعار سے یہ مطلب نکالنا کسی طرح بھی درست نہیں کہ مشرق کے پیر والا سے کرشن مشر مراد ہے۔ البتہ دستور عشاق میں دوسری جگہوں پر ہندوستان کا ذکر ہے اور صفحہ ۴ پر تو اس نے صاف صاف ہندوستان کے ایک برہمن سے فیضیاب ہونے کا اقرار کیا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔

بہندوستاں شنیدم برہمن ہست　　　کہ در عشقِ بت افشاند زجاں دست
چو سوزد بت بسوزد خویشتن را　　　بسوزد پیش رویش برہمن را
شود ہندوے انگشتے در آتش　　　کہ دارد با بتہ زریں دمے خوش
دل کافر بسوزد آتشے لیک　　　تو با مومن وے افسردۂ نیک
بتِ بے جاں چنیں شد آتش افروز　　　ترا کو در دل و جاں آفریں سوز
بہر حرفے کہ در لوحِ جہاں ہست　　　ترا در عشق او صد داستاں ہست

بہر بابت کزیں منزل صدالیست　　　ترا در عشق آوازِ درایست
حکیماں سالہا کردند تصنیف　　　نمودندت رہ عرفان و تعریف
رسیدند انبیا ملت نہادند　　　ترا با عشق راہِ دل گشادند
بہر پیغمبرے کامد ز اوّل　　　ترا در عشق از و شد نکتۂ حل

ظاہر ہے ان اشعار میں عشق کے سلسلے میں حکیموں کی تصانیف خصوصاً ہندوستان کے صاحبِ معرفت برہمن کی تصنیف جس سے فتاحی نے راہِ عشق میں رہنمائی حاصل کی اسی بات کی غماز ہے کہ 'دستورِ عشاق' کی تصنیف کے وقت تمثیلی پیرایۂ بیان کے علاوہ مذہب اور خدا پرستی کی برتری کو بیان کرنے کے لئے بھی 'پربودھ چندر ودیہ' یا اسکے کسی ترجمے سے اسے بڑی مدد ملی۔ اس کے علاوہ فتاحی ہندوستان کا ذکر کئی جگہ کرتا ہے اس سے اس کی اس ملک سے دلچسپی کا ثبوت ملتا ہے اور اس کی بھی تاکید ہوتی ہے کہ وہ یہیں کے کسی صاحبِ معرفت کے نتیجۂ افکار اور طریقِ نگارش سے متاثر ہے۔ ایک جگہ نظر جب زلف سے ملاقات کرتا ہے تو اپنے آپ کو ہندزادہ بتاتا ہے۔ غالباً اس لئے کہ زلف خود ہندوستان کی امیرزادی تھی۔

منم مردے ز ملک ہندزادہ　　　گہے در روم و گہہ در چین فتادہ
سراسر گشتہ ام ہندوستاں را　　　بگردن کردہ خدمت چوکیاں را

ان شواہد کی روشنی میں یہ ایک بات تو قریب قریب طے ہے کہ 'دستورِ عشاق' نے پیرایۂ بیان 'پربودھ چندر ودیہ' سے مستعار لیا۔

تمثیل ہی کے سلسلے کی ایک کتاب 'حدائق العشاق' بھی ہے 'حدائق العشاق' ہندوستان میں غیر معروف نہیں رہی۔ چنانچہ رجب علی بیگ سرور نے مہاراجہ ایشری پرشاد نرائن سنگھ بہادر والیٔ بنارس کے حکم سے اس کا ترجمہ 'گلزار سرورؔ' کے نام سے کیا جس پر مرزا غالب نے تقریظ لکھی۔ یہ ترجمہ ۱۲۷۵ھ اور ۱۲۷۹ھ کے درمیان کیا گیا۔ اس کی بنیاد پر ۱۸۷۰ء میں عبدالرحمٰن حیرتؔ نے 'جنگِ عشق' کے نام سے ایک مثنوی لکھی:

عشاقِ حدائق جو ہے اک کتاب　　　اوسے نظم اردو تو کر دے شتاب
اوسیدم لیا ہاتھ میں بس قلم　　　کیا سارا اُردو میں قصہ رقم

اس کے علاوہ اس سے متاثر ہو کر فراقؔ گورکھپوری کے والد ماجد عبرتؔ گورکھپوری نے بھی ۱۸۹۰ء میں 'حسنِ فطرت' کے نام سے ایک تمثیلی مثنوی لکھنی شروع کی لیکن تھوڑا سا لکھ کر اسے ادھورا ہی چھوڑ دیا۔ ۲۸ سال بعد کہیں ۱۹۱۸ء میں اس کی تکمیل کا خیال آیا۔ مگر شدتِ علالت نے اجازت نہ دی اور جیسے تیسے اسے مکمل کر کے راہیٔ ملکِ عدم ہو گئے۔

یہ مثنوی اگرچہ ناقص اور نامکمل چھپ ہے مگر "جنگِ عشق" یا 'حدائق العشاق' سے صاف متاثر معلوم ہوتی ہے۔ اس سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ 'حدائق العشاق'، "دستورِ عشاق" سے زیادہ معلوم اور مشہور تھی۔ اور حدائق العشاق' 'دستورِ عشاق' کی بہ نسبت پربودھ چندر ودیہ' سے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے۔ اگرچہ تینوں تمثیلیں معرفت و سلوک سے متعلق ہیں لیکن 'پربودھ چندر ودیہ' اور حدائق العشاق' میں مذہب اور لامذہبیت یا سلوکِ معرفت اور اور مادیت کی کشمکش کا موضوع واضح ہے کرداروں کے لحاظ سے بھی یہ دونوں ایک دوسرے سے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہیں اور دونوں ہی میں دنیاداری اور دنیا بیزاری کے سلسلے میں دنیا بیزاری کی فتح قدرِ مشترک ہے۔ کرداروں کو دیکھئے تو ان میں بھی بڑی حد تک مماثلت نظر آئے گی۔ مثلاً 'حدائق العشاق' میں دیارِ روحانیاں کا بادشاہ روح ہے جس کا لڑکا دل ہے۔ روح شہرِ جسم کا فرمانروا ہے جس کا وزیر عقل ہے۔ مغرب میں دیارِ دوستی کے بادشاہ عشق کی لڑکی حسن ہے جس کے وصل کی آرزو میں دل سلوک و معرفت کی کٹھن منزلوں سے گزرتا ہے۔ 'پربودھ چندر ودیہ' میں دل ایک راجہ ہے جس کے دو بیٹے عقل اور عشق ہیں۔ عشق مظاہرِ نفس کے لطیں سے اور عقل ضبطِ نفس کے شکم سے ہے۔ 'حدائق العشاق' میں روح کے لشکر میں عقل، صبر، شہود، حلم، غضب، شعور، نظر اور امید و بیم وغیرہ ہیں اور عشق کے لوائے عساکر میں غیرت، حیرت، شوق، محبت، غم، حزن اور آہ و فغاں وغیرہ ہیں۔ پربودھ چندر ودیہ میں عشق کے ساتھ ہوس، جنس، حرص، تشدد اور غرور ہیں اور عقل کے گروہ میں ذہانت، رحم، صبر، عقیدت، توکل اور خیال وغیرہ ہیں اسکے علاوہ 'حدائق العشاق' میں بھی ہوس، غرور، طمع، شہوت، ریا، فریب، حیلہ، علم، عبادت، ریاضت، قناعت، عزلت اور تقویٰ وغیرہ بھی ہیں۔ 'دستورِ عشاق' میں اک آدھ نام کے علاوہ یہ نام نہیں ہیں۔ 'دستورِ عشاق' میں دو الگ الگ بادشاہوں کی شکل میں جانبین کا ارتقا ہوا ہے اور آخر میں کہیں جا کر ان کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے عزیز و قریب بھی ہیں۔ 'حدائق العشاق' میں اگرچہ دو الگ الگ جماعتیں قائم ہیں پھر بھی اس کے دونوں گروہوں کے کردار 'پربودھ چندر ودیہ' کے راجہ دل کے دو بیٹوں عشق اور عقل کے ساتھیوں اور منتریوں کے کرداروں سے زیادہ مماثل ہیں۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ محض اس مماثلت کی بنا پر یہ ثابت نہیں ہوتا کہ 'حدائق العشاق' 'پربودھ چندر ودیہ' کا چربہ ہے۔ اس لئے کہ سب سے پہلے تو مصنف کا یہ دعویٰ ہی سامنے آتا ہے کہ اس نے اس کتاب کی تصنیف کے وقت کسی کی خوشہ چینی نہیں نہیں کی بلکہ یہ کہ یہ مضامین میرے ہی خانہ تخیل سے نکلنے کے لئے بے تاب تھے۔ چونکہ میں اپنے احوال میں گرفتار تھا اس لئے توجہ نہ دے سکا۔ مگر اندھیرے سے روشنی کی ایک کرن نمودار ہوئی اور ایک محسن کا سایۂ عاطفت مل جانے سے اس تصنیف کی طرف توجہ ہوئی۔ اگرچہ اس طرح کا دعویٰ کم و بیش ہر مصنف نے خصوصاً تمثیل نگاری کے ضمن میں کیا ہے کہ اس کی ایجاد کا سہرا اسی کے سر بندھتا ہے۔ لیکن 'حدائق العشاق' کے سلسلے میں مشکل یہ ہے کہ اس کا عہدِ تصنیف بھی قطعیت کے ساتھ معلوم نہیں۔ رجب علی بیگ سرور حیات اور کارنامے' میں ڈاکٹر نیر مسعود نے 'گلزارِ سرور' اور 'حدائق العشاق' پر گفتگو تو کی ہے مگر 'حدائق العشاق' کے مصنف کے احوال، اس کے محسن اللہ ویردی خاں اور کتاب کے سنِ تصنیف کے بارے میں مکمل سکوت اختیار کیا ہے۔ میں نے مختلف تاریخی کتابوں سے صرف اتنا معلوم کیا ہے کہ عہدِ جہانگیر میں اللہ وردی خاں نام کے ایک امیر تھے جو مناصبِ جلیلہ پر فائز رہے اور امیرِ شکار بھی تھے[1] ان کے لڑکوں میں میرزا جعفر کو بھی شاہ جہاں نے اللہ وردی خاں عالمگیر شاہی کا خطاب عطا کیا تھا، قیاس یہ ہے کہ 'حدائق العشاق' کے مصنف محمود رضی الدین ابن محمد شفیع تبریزی کے محسن اللہ ویردی خاں یا اللہ وردی خاں جہانگیر کے امیرِ شکار ہی تھے۔ اس لحاظ سے 'حدائق العشاق' کا زمانۂ تصنیف عہدِ جہانگیر کے آخر یا شاہجہاں کی بادشاہت کی ابتدا کا زمانہ ہو سکتا ہے۔ یعنی یہ بہرحال سترہویں صدی عیسوی کی تصنیف ہوگی جبکہ 'دستورِ عشاق' پندرہویں صدی عیسوی کی ہے۔ اس لحاظ سے 'حدائق العشاق' کا ماخذ 'پربودھ چندر ودیہ' اور 'دستورِ عشاق' دونوں ہی یا ان میں سے کوئی ایک کتاب ہو سکتی ہے۔ اسی طرح دیکھا جائے تو سنسکرت ادب العالیہ سے فارسی نے جو استفادہ کیا اس کی 'پربودھ چندر ودیہ' اور فارسی کی دو مشہور تمثیلی کتابیں یعنی 'دستورِ عشاق' اور 'حدائق العشاق' اچھی مثالیں ہیں۔

---

[1] ملاحظہ ہو آثر الامراء جلد اول تالیف نواب صمصام الدولہ شاہنواز خاں مطبع اردو گائیڈ کلکتہ ۱۸۸۸ء

رفیعہ سلطانہ
پھول بن، اندرانگر، حیدرآباد،

معاون زبان اور اس کا فلسفہ

زبان انسانی تہذیب کے ارتقا کا نقطۂ آخر ہے۔ انفس و آفاق اس کی گرفت میں ہے۔ اگر قدرت انسان کو یہ مؤثر وسیلہ نہ دیتی تو انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہ رہتا۔

لیکن یہ مؤثر وسیلہ کبھی کبھی تہذیب و تمدن کے لئے مہلک آلہ بن جاتا ہے۔ دنیا کی تاریخ "لسانی عصبیت" اور "لسانی اخوت" دونوں کی داستانوں سے بھری ہے۔ لسانی اخوت نے جہاں منتشر قوتوں کی شیرازہ بندی کی، وہیں لسانی عصبیت نے انتشار و افتراق کے ذریعے اقالیم بھی ڈھادیں

معاون زبان اٹھارویں صدی

موجودہ دور کا انسان لسانی عصبیت کے اس مرض کا مداوا تلاش کر رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ موجودہ عالم گیر انسانی برادری کو جو ان گنت زبانوں کے شکنجے میں جکڑی ہوئی ہے ایک زبان عطا کرنے کی کوششوں میں بھی مصروف ہے Auxiliary language (معاون زبان) کا آغاز اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ معاون کا یہ تصور عالمی معاشرہ کی گتھیوں کو سلجھائے یا نہ سلجھائے کسی ایک ملک کے اندرونی لسانی انتشار کا حل ہو سکتا ہے۔ لسانی عصبیت اور انتشار اس دور کا المیہ ہیں۔ پچھلے ادوار میں بھی اس کے آثار ملتے ہیں۔ سترھویں صدی کے دانش وروں نے اپنے طور پر اس کے سلجھانے کی سعی کی تھی۔ چنانچہ جس وقت یورپ میں لاطینی زبان کا طوطی بول رہا تھا لاطینی کے تسلط کے خلاف بعض علما صف آرا ہوگئے تھے۔ فرانسس بیکن نے ایک ایسی طرز تحریر کی وکالت کی تھی جس کا تعلق یورپ کی کسی زبان سے نہ تھا بلکہ ایک طرح کی تصویری زبان تھی جس میں حروف تہجی کے بجائے علامات استعمال کی گئی تھیں۔ ۱۶۲۹ء میں ڈیکارٹس نے اس مسئلہ کا حل ایک ایسی زبان میں تلاش کیا جو اعداد کے ذریعے مفہوم واضح کرتی تھی۔ ۱۶۶۱ء میں ڈوال گارنو Dalgarno نے لاطینی اور یونانی الفاظ و علامتوں کے امتزاج سے ایک نئی زبان کی نیو ڈالی۔ اسی زمانے میں Bishop Wilkins بشپ ولکنز نے علاماتِ ریاضی کے ذریعے ایک اور مصنوعی زبان کا بیڑا اٹھایا۔ ان علما کے علاوہ چند نام اور قابل ذکر ہیں جنھوں نے کسی ایک زبان کے تسلط کے خلاف اپنے طریقے بتائے جو زبان کے بجائے ترسیل و ابلاغ کا ذریعہ بن سکیں۔ چنانچہ Francis Lodwick فرانسس لوڈوک۔ تھامس ارک ہارٹ Thomas Urquhart اور کیو بک 'Cave Book' (۱۶۳۹ء) اس میں خصوصی طور پر مشہور ہیں۔ بک نے حروف و اعداد دونوں کے امتزاج سے مافی الضمیر کی ادائی کا کام لیا۔ انیسویں صدی کے اوائل میں Sudre سودر نے موسیقی کی 'لے' اور 'تان' کو زبان کا نعم البدل بنانا چاہا۔

بیسویں صدی

بیسویں صدی میں لسانیات کے چرچے کے ساتھ اس طرح کی مصنوعی یا معاون زبان کو کئی نام دیئے گئے۔

(۱) Neutral (غیر جانب دار) یا غیر معین

(۲) Novial (انوکھی نئی)

(۳) Inter lingua بین لسان

لیکن سب سے زیادہ مقبولیت دو اصطلاحوں کو ملی۔ ولاپک Pak ولا World-Vola (دنیا) Pak + Vola پک Speak Pak تقریر سے مشتق ہے۔ اور Esperanto (ایسپرنٹو) Language of Hope (زبانِ رجا) ایسپرنٹو

اس کا موجد پولینڈ کا عالم اور فلسفی زمنہاف Zamenhof تھا۔ اس نے جرمن، یونانی، لاطینی اور ہند یورپی[۱] زبانوں کے امتزاج سے ایک ایسی زبان کی نیو ڈالی جس کے استعمال کرنے والے یورپ اور امریکہ میں ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں۔ اس کا چلن ڈاکٹروں، سائنس دانوں، وکیلوں اور دیگر پیشہ ور افراد کے عالمی اداروں میں

۱۔ ہند یورپی، ہند جرمانی، ہند آریائی یہ سب اصطلاً میں ایک ہی خاندان کی زبانوں کے لئے مستعمل ہیں

ہوتا ہے۔کئی ادارے اسی ایسپرینٹو میں اپنی فہرستیں طبع کرواتے ہیں۔ سو سے زائد اخبار تمام دنیا میں اسی زبان میں شائع کئے جاتے ہیں۔ مزید تفصیلات میں گئے بغیر اتنا بتانا کافی ہوگا کہ نیویارک میں (I.A.L.A.) (International Auxiliary Language Association) ان ہی خطوط پر آگے بڑھ رہی ہے۔ ماہرینِ صوتیات (International Phonetic Association) (I.P.A.) ایک ایسی طرزِ تحریر کے لئے کوشاں ہیں جن میں تمام زبانوں کی آوازیں علامتوں کے ذریعے بتائی جاتی ہیں۔ انہوں نے انسانی دہن سے نکلنے والی سو آوازوں کو ریکارڈ کر لیا ہے اور اس کے لئے علامتیں وضع کر لی ہیں۔ اصل میں معاون زبان کی اصطلاح بڑی پہلودار ہے۔ جیساکہ سطور بالا سے واضح ہوگا کہ پچھلے سو سالوں میں معاون زبان کی تشکیل کے کئی تجربے کئے گئے۔ اس کی تشریح دو طرح سے کی جاتی ہے۔ ایک مکتبِ خیال 'معاون زبان' سے مُراد ایک ایسی زبان سمجھتا ہے جو ہر ایک کے لئے قابلِ فہم ہو بلکہ خاص طبقہ کے لئے ہی رائج ہو سکے۔ گویا ایک طرح کی Language Code۔ اس زبان کو زیادہ سے زیادہ مشکل بھی بنایا جا سکتا ہے (ایک ماہر لسانیات کے خیال میں ہماری قومی زبان ہندی کو زیادہ سے زیادہ مشکل بنا کر عوام سے دور کیا جا رہا ہے) دوسرا مفہوم Esperanto ایسپرنٹو سے یعنی اتنی سہل العام فہم زبان ہے جسے لوگ بلا امتیاز مذہب و ملت و ذات پات زیادہ سے زیادہ سمجھ سکیں۔ اوٹو جیسپرسن نے جو عالمی لسانیاتی تحقیق کے مشاورتی بورڈ کا ممبر ہے معاون زبان کے لئے ایسپرنٹو کے بجائے Novial کی اصطلاح استعمال کی۔ اس کے خیال کے مطابق جب تک تمام دنیا کی آبادی کے لئے کوئی مکمل زبان تیار نہیں کی جائے گی تحقیقات جاری رہیں گی ۱۹۲۷ء میں بین الاقوامی معاون زبان کی انجمن کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے تحت جو نئے لسانی تجربے کئے گئے ان کا ماحصل یہ ہے۔

(۱) یہ زبان تلفظ کے اعتبار سے سلیس ہونی چاہیئے۔

(۲) تحریر و تقریر کے استعمال میں دِقّت نہیں ہونی چاہیئے۔

(۳) سائنٹیفک ہونے کے ساتھ روزمرہ کی ضروریات کو بھی پورا کر سکے یعنی اس میں علمی و عوامی دونوں خصوصیات ہونی چاہئیں۔

(۴) نئی دنیا کی ضروریات اور نئے خیالات کے اظہار کی وسعت ہو۔

معاون زبان کے تصور پر اعتراضات کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ معترضین کا کہنا ہے کہ اس طرح کی 'مصنوعی زبان' ہماری ضروریات پوری نہیں کر سکتی۔ دوسری خرابی یہ بتائی گئی کہ اس پر مغربی زبانوں

بالخصوص یورپی زبانوں کی چھاپ ہے۔ اس اندیشہ کا بھی اظہار کیا جاتا ہے کہ مستقبل میں اسے ہر قوم اپنی ضرورت کے مطابق ڈھال لیگی۔ جن میں اختلاف بھی ہوں گے۔ ایک جاپانی ممبر نے جو وضع اصطلاحات کی قومی معیاری کمیٹی I.S.A. (National Standardising Association) کا ممبر ہے تجویز پیش کی کہ ٹیکنیکل اور فنی مقاصد کے لئے ایک علٰحدہ فنی زبان تیار کی جائے۔ اس کے بعد ایک روسی ممبر نے جو روسی معیاری زبان کمیٹی کے ممبر ہیں سائنٹیفک اصطلاحوں کی ترویج کے لئے تمام عالمی ممالک کو متفق ہونے پر زور دیا۔ امریکہ کے سائنس دانوں نے جو اصطلاحات بنائی ہیں اسے دنیا کے اہم سائنٹیفک ادارے جیسے (International Commission for Measures and Weights) (C.I.P.M.) بین الاقوامی انجمن اوزان و پیمانہ جات۔ I.E.C. (International Electro Technical Commission) بین الاقوامی برقی کمیشن I.B.E. (Commission for lighting and Electrical equipment) اور ٹیلی کمیونی کیشن یہ تمام ادارے معاون زبان انگریزی ایسوسی ایشن کے فیصلوں کی پابندی کر رہے ہیں۔

اردو معاون زبان کی حیثیت سے

اس صورت میں ہندستان کو جو مختلف اللسان ملک ہے اور جس میں ۲۶۵ زبانیں رائج ہیں راشٹر بھاشا کے علاوہ ایک عوامی زبان کی ضرورت ہے کیونکہ ہندی 'دربار' کی زبان بن چکی ہے۔ عوام کے لئے جس میں چھوٹے تاجر۔ اہلِ حرفہ۔ کسان اور مزدور ہیں ایسی سلیس اور سادہ زبان کی ضرورت ہے جو نہ اُردوئے معلیٰ ہو نہ آریہ بھاشا، بلکہ صحیح معنوں میں ہندوستانی ہو۔ اس طرح کی زبان کو ہمارے مفکرین نے 'ہندوستانی' کا نام دیا تھا لیکن ہندوستانی نام اتنا مبہم تھا کہ اسے نہ تو اُردو والوں نے اپنایا نہ ہندی والوں نے منہ لگایا۔ اگر مسلم لیگی سیاست زبان کو آلۂ کار نہ بناتی اور فرقہ وارانہ ذہنیت دخل نہ دیتی تو اُردو کا مسئلہ اتنا کٹھن نہ بنتا۔ جس زمانے میں ہندوستانی (سلیس اردو) کو قومی زبان بنانے کا مسئلہ اٹھا تھا لندن یونیورسٹی کے ماہر صوتیات Daniel Jones نے ایک مختصر رسالہ Problem of a National Script of India نام سے شائع کیا تھا .... اگر ان خطوط پر عمل ہوتا تو آج ہندی (ہماری قومی زبان) اتنی کٹھن نہ ہوتی کہ تعبیر دہانی ص ۴۱ ہا

پرویز یداللہ مہدی
وائی-۱ یم پی-ڈبلوڈی-اد سآئی-ایم-باندرہ ممبئی ۵۱

پانی کا چکّر

(مزاحیہ)

پچھلے کچھ دنوں سے "شارٹیج" کا لفظ سنتے سنتے کان پک گئے ہیں۔ جسے دیکھئے شارٹیج کا رونا رو رہا ہے۔ الکٹرک شارٹیج، مٹی کے تیل کا شارٹیج، شکر کا شارٹیج —— انتہا یہ ہے کہ پرسوں ایک شناسا سے اُن کی لڑکی کی شادی کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگے کہ دیکھتے نہیں، آج کل اچھے لڑکوں کا کس قدر شارٹیج ہے —— ویسے اپنے یہاں کس چیز کا شارٹیج نہیں ہے۔ اشیائے خوردونوش سے لے کر زہر سنکھیا، نیلا تھوتھا غرض ہر شے کا شارٹیج ہے۔ البتہ منافع خوری، ملاوٹ، تنگ نظری، فرقہ وارانہ ذہنیت کا کبھی شارٹیج نہیں رہا، بلکہ یہ لعنتیں تو روز افزوں ترقی کی منازل طے کر رہی ہیں۔ کہتے ہیں اللہ میاں کے ہاں ہر قسم کی بلاؤں کا وافر اسٹاک ہے جو آئے دن اس عالمِ خانہ خراب کے کسی نہ کسی حصہ پر قیامتِ صغریٰ و کبریٰ ہر دو کا ٹکنی کلر ٹریلر دکھانے کے لئے مختلف صورتوں میں نازل ہوتی رہتی ہیں۔ ان بلاؤں کا کبھی شارٹیج نہیں رہا۔

عوام کی اکثریت کا خیال ہے کہ شارٹیج کے روپ میں ان دنوں جو بلائیں نازل ہو رہی ہیں جن کا اصل سبب پانی کی قلّت ہے جس سے کوئی ایک بستی، ایک گاؤں، ایک شہر ہی دوچار نہیں ہے بلکہ سارا ملک اس کی زد میں ہے۔ سچ ہے کسی شے کی اہمیت کا اندازہ اس کی قلت کے بعد ہی ہوتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب یہی پانی ہر کس و ناکس اس بیدردی سے بہاتا تھا کہ گمان ہوتا تھا کہ ہر گھر میں ایک عدد "تالاب" بلکہ "دریا" موجود ہے۔ جب بھی کوئی ایک گلاس پانی مانگتا اس کی خدمت میں صراحیاں اور گھڑے پیش کر دیئے جاتے کہ پانی پلانا سب سے بڑا کارِ ثواب ہے، لیکن آج ایک گلاس پانی کا سوال سن کر چہرے پر ہوائیاں اُڑنی شروع ہو جاتی ہیں بلکہ بعض اصحاب ہوائیوں سے پہلے خود اُڑ جاتے ہیں۔ جب بھی کوئی پیاسا لرز کر ایک گلاس پانی مانگتا ہے تو لوگ شرم سے پانی پانی ہو جاتے ہیں لیکن ایک گلاس پانی پیش نہیں کر سکتے۔ اگر پانی کی قلت کا یہی حال رہا تو وہ دن دُور نہیں جب ایک گلاس پانی کے سوال پر مجبوراً یہ جواب دینا پڑے گا کہ بھائی جان ایک بوتل خون لے لو لیکن ایک گلاس پانی مت مانگو کیونکہ میں نے خود ایک گلاس پانی سے نہ صرف منہ ہاتھ دھویا بلکہ غسل کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔

پہلے صرف من چاہی چیزوں کو دیکھ کر منہ میں پانی بھر آتا تھا اب پانی کو دیکھ کر ہر ایک کے منہ میں پانی بھر آنے لگا ہے بلکہ بعض اصحاب کو پانی کی محرومی کا اس شدت سے احساس ہونے لگا ہے کہ پانی کو دیکھ منہ میں پانی اور آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں، لیکن ساون بھادوں کی اس مسلسل جھڑی کے باوجود فلک سے لوٹا بھر پانی برستا نظر نہیں آتا۔ وہی آبی ذخائر جو کل تک فراخ دلی کے ساتھ نہ صرف انسانوں بلکہ جانوروں کی بھی پیاس بجھاتے رہے ہیں آج اُن کی سطح صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھتی چلی جا رہی ہے اور پانی کی سطح کو روز بروز گھٹتا دیکھ کر رگوں میں دوڑنے والا خون بھی منجمد ہوتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔

آج ہر فرد پانی کی ایک ایک بوند کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہے۔ وہی نل جو ساون کی جھڑی کی طرح دھاروں دھار بہتے رہتے تھے اب کسی عمر رسیدہ بیوہ کی آنکھوں کی طرح خشک ہو گئے ہیں۔ آج پانی بھی کچھ یوں چچا غالب کا سا انداز اختیار کئے ہوئے ہے کہ ؎

نلوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل

ان بند نلوں کو پہروں گھورنا آج ہر شہری کے معمولات میں داخل ہو چکا ہے۔ بعض کمزور دل اصحاب سارے کام کاج چھوڑ کر یوں ٹکٹکی باندھے نلوں کو گھورتے نظر آتے ہیں کہ لگتا ہے جیسے آنکھیں پتھرا گئی ہوں بعض دل پھینک حضرات نلوں کو گھور گھور کر شاعر بن گئے ہیں۔ پرسوں ہی محلے کے نل پر بڑے خان پہلوان نے جو الف کا مطلب لٹھ جانتے ہیں یہ شعر موزوں کر دیا ؎

نل ہے نظروں کے سامنے لیکن
پانی آتا نظر نہیں آتا

پہلے جو نل کھلتے ہی پانی برسایا کرتے تھے اب کافی دیر تک ایسی آوازیں نشر کرتے ہیں جنہیں سن کر یوں لگتا ہے جیسے کئی بلیاں آپس میں لڑ رہی ہوں، کُتّے بھونک اور بھنبھوڑ رہے ہوں۔ بلکہ بعض سرکاری

نلوں کے تعلق سے سُنا ہے کہ ایسی آوازیں نشر کرتے ہیں کہ آنکھوں کے آگے جنگِ ویت نام کا نقشہ کھنچ جاتا ہے اور پانی کے لئے سر سے کفن باندھے ہوئے مجمع کی گرفت اپنے اپنے ہتھیاروں یعنی گھڑوں بالٹیوں صراحیوں وغیرہ پر مضبوط ہو جاتی ہے اور ہر آنکھ نل کی ٹونٹی کو یوں گھورنے لگتی ہے جیسے اس میں "آبِ حیات" ٹپکنے والا ہو اور پھر جیسے ہی یہ "آبِ حیات" ٹپکنا شروع ہوتا ہے بچے بڑے سبھی نل پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ چاہے اس دھینگا مشتی میں کسی کی حیات کا تار ہی کیوں نہ ٹوٹ جائے۔ اس "آبِ حیات" نے اچھے اچھوں کی حیات مختصر کر دی ہے۔ پانی کے لئے ہر نل پہ "پانی پت" کی ایک نئی تاریخی لڑائی چھڑ جاتی ہے جو اچھے اچھوں کا جغرافیہ بگاڑ دیتی ہے۔

کسی سرکاری نل سے پانی کا ایک گھڑا حاصل کرنا "جوئے شیر" لانے سے کم نہیں۔ اب رہے گھروں کے نل تو سائز کے اعتبار سے سرکاری نلوں سے چھوٹے ہوتے ہیں اور ظاہر ہے چھوٹوں کے نخرے زیادہ ہوتے ہیں۔ سنا ہے بعض لوگ گھر کے نلوں کے ناز نخرے اٹھانے میں اس قدر محو ہو جاتے ہیں کہ اپنے بال بچوں کو بالکل بھول جاتے ہیں۔ ہمارے ایک پڑوسی نے قلتِ آب کو دیکھتے ہوئے غالباً کوئی منت مانی ہے اسلئے جیسے ہی نل کھلتا ہے پورا محلے کے بچوں میں نیاز کے گڑ چنے تقسیم کرنے لگتے ہیں۔ ان دنوں نل کھلنے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ کبھی تو یہ سرِ شام کھل جاتا ہے اور کبھی آدھی رات گئے تک کسی ضدی محبوبہ کی طرح انتظار رہتا ہے اور ہمارے پڑوسی بے چارے چونکہ منت مان چکے ہیں اس لئے اگر نل رات کے دو بجے کھلتا ہے تو گڑ چنے لے کر پڑوسیوں کے دروازے کھٹکھٹاتے نظر آتے ہیں۔

سرکاری نلوں پر شریف لوگوں کی اکثریت اپنی بڑی بڑی مونچھوں کو پانی پلوانے کے باوجود گھڑا بھر پانی حاصل کرنے میں ناکام رہتی ہے۔ نل بند ہونے کے بعد جب مجمع چھٹتا ہے تو نل کے اطراف گھڑوں کے ٹکڑے، کپڑوں کی دھجیاں، ٹوٹی چوڑیاں، مڑے تڑے کنگھے، رومال، پرس، پھٹے ہوئے جوتے چپل اور نہ جانے کیا کیا الابلا ڈھیر کی شکل میں بلکہ سلسلۂ مغربی گھاٹ کی صورت میں نظر آتے ہیں۔

جن گھروں میں "باؤلیاں" اور "کنویں" ہیں وہاں کے مکینوں کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ یہ لوگ خدا کے مقبول بندوں میں سے ہیں ... اور پانی جیسی چیز سے کبھی محروم نہیں ہو سکتے۔ ہو سکتا ہے یہ بات کسی حد تک درست ہو لیکن پانی کی قلت نے انہیں بھی نہیں بخشا ہے۔ پانی کیلئے گھر پر دھاوا بولنے والے ہجوم کا مقابلہ کرتے کرتے ان کی حالت دیوانوں، باؤلوں کی سی ہو جاتی ہے بلکہ اب تو جہاں کہیں جس کسی سے باؤلی حرکت سرزد ہوتی ہے ہوشیار لوگ اندازہ لگا لیتے ہیں کہ ان کے گھر میں ضرور باؤلی (کنواں) ہے۔ چنانچہ فوراً تعاقب شروع ہو جاتا ہے۔

پانی کی اس ہیبت ناک قلت کو دیکھتے ہوئے دنیا کی یہ جغرافیائی تقسیم غلط معلوم ہوتی ہے کہ اس میں تین حصّہ پانی اور ایک حصّہ خشکی ہے بلکہ یوں لگتا ہے کہ جیسے تین حصّہ خشکی اور صرف ایک حصہ پانی ہے . . . . اور اس میں بھی کئی جزیرے اور بے شمار لق و دق صحرا ہیں۔

اشیائے ضرورت اور روپے پیسے ادھار مانگنے کا رواج انسانوں میں ابتدائے آفرینش سے عام ہے لیکن پرسوں ایک پڑوسی نے پانی اُدھار مانگ کر ہمیں چونکا دیا۔ فرمانے لگے "چار گھڑے پانی عنایت فرمایئے، انشاء اللہ پہلی تاریخ کو چھ گھڑے لوٹا دوں گا"۔

اگر کچھ مہینے اور یہی حال رہا تو وہ دن دُور نہیں جب محنت کا معاوضہ بھی پانی کی شکل میں لیا جائے گا۔ کام کی نوعیت کے اعتبار سے پانی کی مقدار مقرر کی جائے گی۔ مثال کے طور پر ہلکی پھلکی محنت کا معاوضہ ایک لوٹا یا ایک صراحی پانی تو کڑی محنت کا معاوضہ ایک بالٹی یا ایک گھڑا پانی۔ تفریحی مقامات پر بھی شرح داخلہ پانی ہی ہوگا۔ مثلاً کسی سینما میں داخلہ کے لئے تھرڈ کلاس کا شرح داخلہ ایک یا دو لوٹے پانی مقرر کیا جائیگا سیکنڈ کلاس کا ایک صراحی پانی اور فرسٹ کلاس کا ایک گھڑا پانی۔ ممکن ہے ہر قسم کے دعوت ناموں میں اس خصوصی سطر کا اضافہ نظر آئے۔

"حضرات آپ سے گزارش کی جاتی ہے کہ تقریب سے ایک دن قبل تشریف لا کر پانی کا ذخیرہ کرنے میں صاحب خانہ کی مدد فرمائیں اور اگر کسی وجہ سے نہ آسکیں تو تقریب میں آتے ہوئے ایک صراحی پانی ضرور لیتے آئیں"۔

آگے چل کر بھکاریوں کی اکثریت بھی روٹی، چاول، کپڑے وغیرہ کے بجائے یوں پانی کا سوال کیا کرے گی "ایک صراحی پانی دلا دو سرکار، تین دن کا پیاسا ہوں آپ کے حق میں دعا کروں گا"۔

پانی کی قلت سے منظم کاروبار بھی متاثر ہیں۔ سرکاری، نیم سرکاری، خانگی، ہر دفتر، ہر اسکول، ہر کالج اس کی لپیٹ میں آچکا ہے۔ رات رات بھر پانی کے حصول میں سرگرداں رہنے کی وجہ سے ہر شخص دن بھر اونگھنے پر مجبور ہے۔ بسوں، ریلوں، رکشاؤں میں ہر جگہ لوگ اونگھتے نظر آتے ہیں۔ حتیٰ کہ کچھ لوگ بائیسکلوں پر بھی اونگھتے ہوئے دیکھے گئے ہیں۔

پانی کی قلت سے جو خطرناک صورتِ حال پیدا ہو چلی ہے اس سے حکومت بے خبر نہیں ہے۔ اس ناقابلِ حل مسئلہ سے نپٹنے کے لئے

سرکار کی طرف سے بہت کچھ کیا جا رہا ہے۔ اس کی مثال مختلف محلہ جات میں منظرِ عام پر آنے والی "ہینڈ پمپ" ہیں جو اکثر اسم بامسمّیٰ ظاہر ہوتی ہیں۔ جب بڑی آس اور امید کے ساتھ کوئی ڈیڑھ دو میل کا فاصلہ طے کرکے جلولی تک پہنچتا ہے اور اس کا "ہینڈ پمپ" ٹوٹا ہوا یا مقفل دیکھتا ہے تو سچ مچ بوریت اور جھلاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ اکثر "گوردیل" کے "ہینڈ پمپ" پہلوانی کے شوقین نوجوانوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کروا لیتے ہیں چنانچہ وہاں پانی کم بھرا جاتا ہے اور زور آزمائی زیادہ ہوتی ہے۔ نتیجتاً روزانہ کسی نہ کسی کے ہاتھ پاؤں ٹوٹنے کی خبر ضرور ملتی ہے کبھی کبھی ہینڈ پمپ کے ٹوٹ جانے کی بھی اطلاع ملتی ہے۔ ہم تو مصافحہ کرکے ہی جان لیتے ہیں کہ یہ شخص ضرور "بورویل" سے پانی بھرتا ہے اور پھر آئندہ اس سے ہاتھ ملانے کی غلطی نہیں کرتے۔

قلت آب سے اتنا فائدہ ضرور ہوا ہے کہ ان دنوں دودھ اکثر خالص مل جاتا ہے ورنہ ہمارا گوالا جو دودھ سپلائی کرتا ہے اسے دیکھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ بھینس کے تھن سے کم اور نل سے زیادہ نچوڑا گیا ہے۔

پانی کی قلت نے پہلے ہی عوام الناس کے ہوش اڑا دیئے ہیں۔ اس پر طرح طرح کی افواہیں اور پیشین گوئیاں کرنے والے ایسی سنسنی دوڑا رہے ہیں کہ کمزور دل اصحاب کی آنکھوں میں یقیناً خود اپنی قبر کا نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ سنسنی خیز خبروں سے گھر گھر میں دہشت پھیلانے والے ملک دشمن عناصر ہر ملک، ہر شہر، ہر گاؤں، ہر بستی، ہر محلے میں پائے جاتے ہیں۔ ان سے خبریں سننے کے بعد دنیا کے کسی ریڈیو اسٹیشن سے خبریں سننے کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ ان کے آگے "وائس آف امریکہ" اور بی بی سی لندن کے وسائل بھی محدود معلوم ہوتے ہیں۔ ہمارے محلے میں بھی ایک چلتی پھرتی خبر رساں ایجنسی سکونت پذیر ہے جو دوسروں کا سکون اور چین حرام کرنا اپنا اولین فرض سمجھتی ہے۔ ان کی زبانی نئے نئے انکشافات سُن کر محلے کا ہر فرد اس بات پر ایمان لا چکا ہے کہ پانی کی قلت دراصل قربِ قیامت کی علامت ہے ——— ہم تو موصوف کو خود قربِ قیامت کی علامت سمجھتے ہیں۔

ابھی اُس دن کی بات ہے پانی کے لئے سرگرداں ہر شخص کو پکڑ کر فرمانے لگے ——— "پانی کی بڑھتی ہوئی قلت کے پیشِ نظر حکومت کاغذ کا استعمال ہر شہری کے لئے لازمی قرار دینے والی ہے، گھر بیٹھے انگریز بننے کے لئے تیار ہو جاؤ" ——— اور اُس روز یہ خبر سُنا کر لوگوں کے دل دہلا رہے تھے "سُنا ہے: "عثمان ساگر" میں پانی اس قدر کم ہو گیا ہے کہ اگلے وقتوں کی کسی مسجد کے مینارے نظر آ رہے ہیں ———" جب انہوں نے یہی خبریں سنائیں تو ہم نے کہا ——— "غالباً اگلے جمعہ کی نماز آپ اسی مسجد میں پڑھنے والے ہیں ———" یہ سُن کر وہ یوں غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ ——— جب ہم نے ٹھنڈے دل سے پانی کی بڑھتی ہوئی قلت کے بارے میں سوچا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ ابرِ رحمت کو اگر واقعی جوش میں لانا ہے تو تمام گنہگار بندوں کو انہی مسجدوں اور مندروں میں جا کر سر جھکانا چاہیئے جو کل تک زیرِ آب اور نایاب تھے۔

بقیہ "معاون زبان" صفحہ ۳۸

سنسکرت کے اس کی آگہی مشکل ہو جاتی؛ موجودہ صورت یہ ہے کہ ہندی میں رجعت قہقری ہوئی ہے ہندی کے سادہ اور سہل روپ جو صوتی تغیر کی وجہ سے سنسکرت سے الگ ہوئے تھے پھر سنسکرت کی آغوش میں جا پڑے ہیں۔ مثلاً ایک آواز 'س' اور 'ش' کا استعمال بجے دلیس ۔ دیش بن گیا ہے۔ سری ۔ شری میں منتقل ہو گیا ہے۔ شال بن گیا وغیرہ وغیرہ۔ اردو میں معاون زبان بننے کی صلاحیت موجود ہے۔ اس لئے کہ اس میں عربی، فارسی۔ سنسکرت۔ ترکی۔ مرہٹی۔ بنگالی سب ہی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں۔ یہ زبان ہندوستان زاد اور ہندوستان گیر فکر و فن کے اعتبار سے بھی جان دار ہے۔ اس لئے اسے کم از کم [redacted] یعنی عوامی رابطہ کی زبان کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ حکومت کے اعلانات اور اشتہارات ہندی کے ساتھ اردو میں بھی جاری کئے جا سکتے ہیں۔ سیاحوں کیلئے گائیڈ بک اردو میں لکھی جا سکتی ہیں۔ اعلیٰ امتحانوں میں اردو کا شمول بحیثیت مضمون اختیاری ہو سکتا ہے۔ ساتھ ہی ہندی کے طالب علم کو اردو ادب کی تاریخ سے بآسانی واقف کرایا جا سکتا ہے۔ یو۔پی کی حد تک دیکھا جائے تو رامپور۔ مراد آباد۔ بجنور۔ مغربی روہیلکھنڈ۔ میرٹھ۔ مظفر نگر۔ سہارنپور ایسے علاقے نکلیں گے جہاں عوام کی اکثریت اردو کے قریب ہوگی۔ ویسے بھی عوامی سطحوں پر جیسے فلموں میں، بازاروں میں ہندی اور اردو غیر دو شکر ہیں اُردو کی حالت پر اقبال کا یہ شعر صادق آتا ہے ؎

میری مشاطگی کی کیا ضرورت حسنِ معنی کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالہ کی حنابندی

غزلیں

انیس الرحمٰن
جیل روڈ۔ مظفر پور (بہار)

گہرے سمندروں میں بھی سایا دکھائی دے
باہر چلوں تو سایوں کا پہرا دکھائی دے
جب چپ رہے تو فاصلہ بڑھتا دکھائی دے
اور بول دے تو جان سے پیارا دکھائی دے
دیکھوں تو شہر کا یہی نقشہ دکھائی دے
سورج کا جیسے شیشے میں چہرا دکھائی دے
آیا نہیں ہے آج تلک وہ کبھی مگر
ہر لمحہ مجھ کو آتا ہوا سا دکھائی دے
آئینہ شکستہ کا پرسانِ حال میں
ٹوٹا ہوا مجھے مرا چہرا دکھائی دے
اب چلئے تھوڑی دیر وہاں بیٹھئے انیس
اس راہ میں جہاں کہیں سایہ دکھائی دے

غبار بھٹی
ملکی دواخانہ، باقر گنج، پٹنہ ۴

رفیقو کیا غبارِ خستہ تن کی آزمائش ہے
ہم اہلِ فن کہاں گر اہلِ فن کی آزمائش ہے

کھڑے ہیں ناخنوں کو تیز کر کے ہر طرف کانٹے
گلستاں میں ہمارے پیرہن کی آزمائش ہے

قلم کیا کر سکے گا دل ہو گر جذبات سے خالی
یہاں تیشے سے پہلے کوہکن کی آزمائش ہے

جنوں دیکھوں خرد کی انگلیاں کب تک اٹھاتی ہیں
تری زلفِ شکن اندر شکن کی آزمائش ہے

نکال اے دل قدم کیسے کے اس شہرِ خموشاں سے
وہاں لے چل جہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

اِدھر شیشہ اُدھر تیشہ یہ دیکھیں کیا اٹھاتے ہیں
جنابِ عشق کے دیوانہ پن کی آزمائش ہے

خود اپنی ہی وفا کا جائزہ لے کر ذرا دیکھو
یہ کیا اندھیر بس میرے چلن کی آزمائش ہے

تمہارا نام تک باقی نہیں قرطاسِ ہستی پر
شہیدانِ وطن خونیں کفن کی آزمائش ہے

غبار آوارہ تھا ٹھہرا نہ راہِ دیر و کعبہ میں
اب اس رستے میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

ساتا پرشاد استھانہ زیب بریلوی
محلہ ذکائی۔ بریلی (اتر پردیش)

فنائے زیست کی تکمیل کر جانا ہی بہتر ہے
سمجھ کر حاصلِ امید مر جانا ہی بہتر ہے

پیامِ مرگ کی آن تک ٹھہر جانا ہی بہتر ہے
یہ میرا آخری خط نامہ بر جانا ہی بہتر ہے

یہ معراجِ جنوں ملتی ہے دیوانے کو مشکل سے
جہاں سے بے نیازانہ گزر جانا ہی بہتر ہے

سمجھ میں خود ہی آجائیگی وجہ پاکدامانی
تری چاکِ گریباں تک نظر جانا ہی بہتر ہے

بچو ان رواداری کے دستِ محبت سے
یہ الجھی الجھی زلفوں کا سنور جانا ہی بہتر ہے

چھپا رکھے دیں کب تک آپ کے داغِ محبت کو
یہ نقشِ حاصلِ ہستی ابھر جانا ہی بہتر ہے

نہ کر مجبور شوقِ جادہ پیمائی مسافر کو
پہنچ کر اپنی منزل پر ٹھہر جانا ہی بہتر ہے

فریبِ جستجو ہے ہر تعین راہ و منزل کا
حدِ امکاں سے وحشت میں گزر جانا ہی بہتر ہے

چمن میں لے نظر والو شگفتہ رنگ و نکہت پر
بجائے تبصرہ شام و سحر جانا ہی بہتر ہے

صنم خانہ ہو، کعبہ ہو، حرم ہو یا کلیسا ہو
تمہاری جستجو میں دربدر جانا ہی بہتر ہے

جہاں پر منتشر ہو جائے رنگ و بوئے رعنائی
وہاں شیرازۂ ہستی بکھر جانا ہی بہتر ہے

تصادم زیب دیتا ہے تلاطم موج و طوفاں سے
کنارے پر سفینے کا ٹھہر جانا ہی بہتر ہے

آفتاب شمسی
اردو لیکچرر گورنمنٹ کالج شاہ آباد۔ رام پور (اتر پردیش)

درِ ادراک کھلے دیدۂ بینا ٹھہرے
میری آواز کا کوئی تو شناسا ٹھہرے

یہ تو سورج ہے اسے روز نکلنے سے غرض
دیکھنا یہ ہے کہاں رات کا قصہ ٹھہرے

صرف اس ضد پہ ہوں سرگرمِ سفر صدیوں سے
میں جو ٹھہروں تو مرے ساتھ زمانہ ٹھہرے

سچ نظر آنے لگے اہلِ نظر کے خدشے
سرحدِ شہر میں آکر بھی نہ صحرا ٹھہرے

دھوپ کے قہر سے ہے جان لبوں پر اب تو
میرے سائے کے برابر کوئی سایہ ٹھہرے

ٹھہر کر پیر کے کانٹے ہی نکالو شمسی
کہ ذرا دیر یہ جلتا ہوا رستہ ٹھہرے

محمود بالیسری
ڈاکخانہ الامندہ براستہ بندھوگاؤں۔ کورا پٹ (اڑیسہ)

اُڑیہ ناول اور افسانے آزادی کے بعد

۱۹۴۷ء کے بعد پچیس سال کے دوران اُڑیہ ادب میں جن ناولوں اور افسانوں کی تخلیق ہوئی وہ سب نفسیاتی، تاریخی، روایتی، معاشرتی، سماجی اور سائنسی اساس پر مبنی ہیں۔ ان ناولوں اور افسانوں میں خوش آئند مستقبل کا تصور اندھیرے میں صرف ایک کرن کی حیثیت رکھتا ہے اور ان کے موضوعات سماجی عدم مساوات، بے ترتیب ثقافتی واقعات، سیاسی خود غرضی، تہذیبی زندگی کے خط و خال کا بگاڑ، مشینی دور کا انتشار اور ذہنی الجھن سے پیدا شدہ ردِ عمل اور یاس زدگی، جنگ و جدل، کشت و خون، بھوک، بے اطمینانی وغیرہ ہیں۔

آزادی کے بعد کے نمائندہ فن کار گوپی ناتھ مہانتی، کانہو چرن مہانتی، ہرے کرشن مہتاب، کرشنا پرشاد مصرا، سانتنو کمار اچاریہ، راج کشور پٹنایک، نیتا نند مہاپاترا اور رام پرشاد مصرا وغیرہ ہیں۔ ان کے ناول اور افسانے سماجی و معاشی قدروں پر مبنی ہیں جن میں انہوں نے اپنے کرداروں کو نفسیاتی الجھنوں اور ذہنی پریشانیوں کو ابھارنے کے لئے استعمال کیا ہے۔ گوپی ناتھ مہانتی کے "دانا پانی" کے کردار 'بلی دتا' اور ناول "پرجا" کے کردار 'سراجاتی' اور 'مانڈیا جانی'، کانہو چرن کے ناول 'سامتی' کے کردار 'سونیا اور دھوبی'، ہرے کرشن مہتاب کے ناول "ناو ترٹ" کے کردار 'لکشمی کانت اور جامنی بابو' اور شانتنو کمار اچاریہ کے 'نرکن نر' میں 'ششی کاؤل اور جارج' وغیرہ نے کبھی سماج کی اوہام پرستی، ظلم و ستم اور معاشیاتی بے اعتدالیوں کا رونا رویا ہے اور کبھی انہیں ختم کرنے کے لئے شمشیر بکف سامنے آئے ہیں۔ کبھی تباہی اور بربادی سے لطف اندوز ہوتے ہیں، تو کبھی ستیہ اور شِو، کے پرستار بن کر شدید ذہنی الجھن میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ ہیرومانی، بھنگا بارڈو، پرتی ہنسا، دیو لیکا، تنڈا بائیدا، ماٹی مٹال، امرت رو سنتانو بھوسا میگھو، سنجو بتی، چولا باٹو، کوڑا پردہ اور اڑا باٹو وغیرہ بھی آزادی کے بعد کی پہلی اور دوسری دہائی کے کامیاب ناول ہیں اور اسی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ناول 'دانا پانی' کا کردار بلی دتا سماج سے اپنی روٹی اور اپنے وجود یا دوسرے الفاظ میں اپنے حق کو منوانے کے لئے جیون سنگرام پر اتر آتا ہے اور غلط راہ پر جا پڑتا ہے۔ گوپی ناتھ مہانتی نے اس ناول میں ذہنی الجھن اور مایوسی کی جو تصویر کشی کی ہے اس کا جواب اُڑیہ ادب کے دوسرے ناولوں میں نہیں ملتا۔ ناول 'سامتی' کے کردار دھوبی اور سونیا شدید ذہنی الجھن میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ سونیا کا کردار انسانیت کا علمبردار نظر آتا ہے۔ دھوبی پریشان کن حالات سے مجبور ہو کر اپنے کو پتھر کے دیوتا کے سپرد کر دیتا ہے اور بذاتِ خود پتھر بن جاتا ہے۔ اس کا ضمیر مر جاتا ہے اور ذہن منجمد ہو جاتا ہے۔ اُدھر سونیا اپنے مظلوم اور بیکار ساتھیوں کے ہمراہ سرد و دتے اور مساوات کے پرچم تلے جب ایک نئی تہذیب و تمدن کا سورج طلوع ہوتا دیکھتا ہے تو ماضی کے سارے زخموں کو بھول جاتا ہے اور اسی جگہ ناول نگار کانہو چرن عظیم بن جاتا ہے۔

ناول 'نرکن نر' میں کاؤل اور جارج دو مختلف کردار ہیں۔ کاؤل اپنے لاشعور کے اندھیرے اُجالے میں گم ہو گیا ہے۔ لیکن جارج ایک پُر اسرار فضا کی جستجو میں بیتاب نظر آتا ہے۔ یہ دونوں کردار مردہ اور نیم مردہ سماج کی ترجمانی کرتے ہیں۔ سنت کمار پٹنایک کے ناول 'اٹرا باٹو' کی کردار 'مایا' اپنے بچپن کی شوخ اور چنچل زندگی کو چھوڑ کر جب شادی کے بندھن میں بندھ جاتی ہے تو اسے یہی زندگی حقیقی زندگی محسوس ہوتی ہے نیز زندگی کے بے شمار نشیب و فراز ہی حقیقی زندگی بن جاتے ہیں۔ زندگی کے حقیقی مسئلوں کو اپنانا اور حل کرنا ہی اصل زندگی ہے۔

سائنسی ترقیوں کے پیش نظر مستقبل میں بربادی اور تباہی کے تصور، روٹی اور مکان کے مسائل نیز دوسرے امور نے اُڑیہ ادیبوں کے ذہنوں کو حقیقت پسند بنا دیا۔ اُن کے ذہنوں سے قدیم قدریں مٹ گئیں۔ اس غیر معین اور مشتبہ ماحول میں فرائڈ، ہنری جیمس گراہم گرین اور ایچ۔ آئی بیٹس وغیرہ نے اُڑیہ ادیبوں کی رہنمائی کی۔ آزادی سے پہلے اور بعد کے پانچ سال کے ناول نویس اور افسانہ نگار گوڈ اور ش مہاپاترا، کالندی چرن پانی گرہی، راج کشور رائے، کانہو چرن مہانتی، گوپی ناتھ مہانتی اور سیمی راوت رائے وغیرہ ہیں۔

اُن کی نگارشات کسی حد تک نفسیاتی ہیں، لیکن ان کی اساس سماج، معاشرہ و سیاست، جنگِ عظیم اور جنگِ آزادی پر ہے۔ ان کے بعد جدید پیکروں، علامتوں اور ذہنی الجھنوں کے ساتھ ناول نویس اور افسانہ نگار سُریندر مہانتی، کشوری چرن داس، کرشنا پرشاد مصرا، سانتنو کمار اچاریہ، دُرگا مادھب مصرا، باماچرن مترا اور رودی پٹنایک وغیرہ سامنے آئے جنکی تخم ریزی بتدریج ایک سبزہ زار کا روپ دھارنے لگی۔

سُریندر مہانتی نے سیشن بیک کے افسانہ [illegible] کی اساس پر ایک افسانہ "ساپو" کی تخلیق کی جس میں سانپ کو ایک جنسی پیکر کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ سریندر مہانتی نے اس افسانہ کے کردار 'جیوں نندا' کے دل اور دماغ میں مختلف احساسات اور جذبات اُبھارنے میں زبردست کامیابی حاصل کی ہے' اس افسانہ سے اس کی فن کارانہ چابک دستی کا پتہ چلتا ہے۔ کرشنا پرساد مصرا کے بیشتر افسانوں پر البرٹ موراویا، ہنراں بال سارترے اور ٹینیس ولیم کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ کرشنا پرشاد کی کہانی "سے ہی آبو توجکسو بوگولو" میں سارترے کے افسانہ [illegible]... اور ٹینیس ولیم کے افسانہ [illegible] کا خاصا اثر ہے۔ اس کہانی کا ایک کردار 'سوریتی' ذہنی الجھن میں مبتلا ہو کر اپنی بالتونی بیوی کو قتل کر دیتا ہے۔ سُریندر مہانتی کی کہانی "پاگولو گارو دورو کہانی" کی طرح 'منوج داس' کی کہانی 'سُنگو پولو کہانی' میں بوڑھے سرت بابو خود کو ماضی کی یادوں میں گم کر دیتا ہے اور افسانہ نگار نہایت ہوشیاری سے نفسیاتی تجربے کے مراحل طے کرتا ہے۔ اسی طرح "بھنگا کھلونا" میں کشوری چرن پٹنایک افسانے کے کردار گیتا اور اس کے شوہر بانو دادا کے ذہن میں الجھن اور جنسی ناآسودگی کے بیج بو دینے میں کامیاب نظر آتا ہے۔ آزادی کی دوسری دہائی کے کامیاب ناول نگار کشوری چرن پٹنایک، منوج داس، سُریندر مہانتی، شانتنو کمار اچاریہ۔ کرشنا پرشاد مصرا اور باماچرن مترا وغیرہ ہیں جن کے مجموعوں میں نفسیاتی افسانے زیادہ ملتے ہیں۔

ان ادیبوں کے علاوہ نوجوان فنکار رودی پٹنایک، جیناموری نریندر کمار، بی بھوتی بھوشن ترپاٹھی، نارائن چودھری وغیرہ ہیں جن کے تمام افسانے نفسانی اور ذہنی الجھنوں کی بنیاد پر لکھے گئے۔

ملکی معاملات میں ایک طرف بدنظمی، رشوت ستانی، ظلم و ستم چور بازاری اور سرکاری ملازموں کی من مانی وغیرہ اور دوسری طرف منصوبہ بندی، انسداد سیلاب، غریبی، لاچاری او بیکاری کے مسائل اور مختلف سیاسی پارٹیوں کی کشاکش وغیرہ ہیں۔ ان سب کو مدِ نظر رکھ کر جن چند ادیبوں نے قلم اٹھائے ان میں ہرے کرشنا مہتاب، سُریندر مہانتی، گوپی ناتھ مہانتی، رام پرشاد مصرا، سانتنو کمار اچاریہ، ابھنی کمار بیرا، باماچرن مترا، سنتیل مصرا وغیرہ کو بلند مقام حاصل ہوا ہے۔

ہرے کرشنا مہتاب کا ناول مختلف سیاسی تجربوں پر مبنی ہے' اُن میں جذبے کی شدت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ناول 'ٹاؤٹر' میں انہوں نے لکھا ہے "گاؤں میں ٹاؤٹری ایک حل طلب مسئلہ بن گیا ہے۔ انسان کا کردار اگر نہ سدھر سکا تو ٹاؤٹری کا دور ہونا اتنا آسان نہیں"۔ اس ناول کے کردار ایسے ہیں کہ ہم انہیں روز مرہ کی زندگی میں دیکھ اور محسوس کر سکتے ہیں۔

سریندر مہانتی کا ناول "اندھو دیگو نتو" ٹھوس سیاسی واقعات پر مبنی ہے۔ اسی وجہ سے یہ ناول قارئین کو خشک معلوم ہوتا ہے لیکن یہ آزادی کی جنگ کی اساس پر لکھے گئے ناولوں میں سرفہرست ہے۔ نفسیاتی تجربہ اور شعور کو بنیاد بنا کر ناول نگار نے اس ناول کے کرداروں کے ذریعے ترباتی، ذہنی الجھن اور عملی تنظیم وغیرہ کا مظاہرہ کیا ہے اور اس میں کامیاب نظر آتا ہے۔ مہانتی کا ناول "کالا تورو" اڑیسہ میں آنے والے ہر سال کے طوفان اور سیلاب پر لکھا گیا ہے اور اس میں گاؤں پر طوفان اور سیلاب کے اثرات کا بیان نہایت کامیابی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ سرکاری ملازموں اور دوسرے افراد کی رشوت ستانی وغیرہ کا بھی ذکر ہے۔ سریندر مہانتی جس طرح تاریخی ناول لکھنے میں کامیاب ہے اسی طرح سیاسی ناول لکھنے میں بھی کامیاب نظر آتا ہے۔ آج کی دنیا میں شک و شبہ اور بے یقینی وغیرہ ایک طرح کے فیشن بن گئے ہیں۔ گوپی ناتھ مہانتی کے ناول "دانا پانی" کی تخلیق اس بنیاد پر ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ کانہو چرن مہانتی نے "ملن رو چھند" اور "بجرو باہو" کی تخلیق کی۔ بی بھوتی پٹنایک کے ناول "تو تو نو پر تھیو" اور "بیدیش" بھی اسی اساس پر لکھے گئے۔ سیاسی ناول کی حیثیت سے [illegible] مصرا کے ناول "پوجا رو بول" "جھنو متا" اور "پور بورا گو" وغیرہ [illegible] رکھتے ہیں۔

آزادی کے بعد کے افسانہ نگاروں کے ذہن مختلف [illegible] نیز ان کے بانیوں کے فکر و خیال سے زیادہ متاثر ہوئے [illegible] نہرو اور گوپ بندھو داس وغیرہ کا زیادہ اثر نہ پڑ سکا بلکہ مارکس انجلز، ہیگل، ماؤ سی تنگ اور بھگت سنگھ کے فکر و کردار نے [illegible]

ڈالا۔ سانتنو کمار اچاریہ کا 'دربار' ایک قابلِ تحسین افسانہ ہے جس میں افسانہ نگار نے سماج کے اندر پھیلی ہوئی رشوت ستانی اور چور بازاری کے لئے چوہے کو ایک پیکر کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ یہ چوہا چاہے کانگریس کے سایہ میں پلے چاہے گاندھی جی کے تھیلے میں پروان چڑھے لیکن جنتا اسے کبھی معاف نہ کرے گی۔ رشوت ستانی اور چور بازاری کا انسداد کاغذ، قلم یا آئین سے کبھی نہیں ہو سکتا اس کے لئے ایک انقلاب کی ضرورت ہے۔ باماچرن مترا نے اپنے افسانے 'ابادمی' اور 'مادلا بانگی' میں جمہوری نظام پر اس انداز سے طنز کی ہے کہ اس سے اس کے انقلابی ذہن کا پتہ چلتا ہے۔ اس نے اپنے افسانہ 'سمرتی رتناکر' میں آج کی مادی زندگی کی نمائشی مسرتوں کو جس انداز سے چھوا ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔ جھوٹا، دو کلکتہ روبلٹ اور چندرا مہالنگری رو جاتری، کرشنا چوڑا اور مراڑ رو مرتھو وغیرہ سریندر مہانتی کے ۱۹۶۰ء سے پہلے اور بعد کے افسانے ہیں، جن میں افسانہ نگار نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مستقبل کی طویل زندگی کی بجائے حال کا ایک لمحہ بہتر ہے۔ اس نے لمحوں کی کہانیاں تخلیق کی ہیں۔ اس ایک لمحہ کے پیچھے آج کا انسان بھاگ رہا ہے اور اسے حاصل کرنے کے لئے اپنی جان کی بازی لگاتے رہا ہے۔ طنز نگار ابنی کمار براڑ نے ۱۹۷۲ء کے افسانوں 'دولوبدلو' اور 'مغربی ہٹاؤ' میں سماج وادی پکار کھوکھلے نعروں اور حکومت کی نااہلیوں کے خلاف جس طرح طنز کیا ہے اس کی مثال اڑیا افسانوں میں دور دور تک نظر نہیں آتی۔ بی بھوتی پٹنایک کے دو افسانے 'سیٹے' اور 'غبندا' ۱۹۶۰ء کے بعد کے ہیں جن میں افسانہ نگار نے انتہا پسند کردار اہمیت کے جذبات کو ابھارا ہے۔ دو جماعتوں کی باہمی جد و جہد کو پیش کیا ہے اور سیاسی دلالوں پر بڑی زبردست چوٹیں کی ہیں۔ اس کی بلند ہمتی اور بلند عزمی کا ثبوت ملتا ہے۔

...... دیگر افسانہ نگاروں میں سدیو داس، پرسنو کمار، کیلاس لینکا، سونیل مصرا اور رنجیر داس وغیرہ مشہور ہیں جنہوں نے سرمایہ داری، رشوت ستانی، چور بازاری اور حکومت کی نااہلی کے خلاف آواز اٹھائی۔

آزادی کے پہلے اڑیا ادب میں تاریخی اور نیم تاریخی افسانے اور ناول لکھے گئے تھے لیکن آزادی کے بعد اس کا فقدان نظر آتا ہے۔ صرف سیتا ناتھ چمپت رائے نے روایت کی اساس پر 'کانچی گڑھ' روسیکا او گنتا' کی تخلیق کی۔ سریندر مہانتی کی تخلیق 'نیلو سیلو' بھی نہایت کامیاب ہے۔ اس کے علاوہ پچیس سال کے طویل عرصہ میں اس قسم کا دوسرا کوئی ناول نظر سے نہیں گزرا۔ البتہ متعدد تاریخی اور روایتی افسانے لکھے گئے۔ ان افسانوں کے خالق سریندر مہانتی، راج کشور رائے، ستیہ برت رتھ، پریا برت داس اور ستیہ مصرا وغیرہ ہیں۔ سریندر مہانتی کے افسانے 'پتا و پتر' اور 'آمبا پالی'، راج کشور رائے کے افسانہ 'کھو چو سو تو دولو' وغیرہ کا بھی ذکر آئے گا۔ پریا برت داس کی کہانی 'مہارانی' ستیہ برت رتھ کا 'مرزا غیاث' اور ستیہ مصرا کے افسانہ 'یسوع کرسٹا' وغیرہ کا نام لیا جانا بھی ضروری ہے۔ ان میں کئی افسانے ہندوستان گیر شہرت حاصل کر چکے ہیں۔

فرسودہ سماج، اوہام پرستی، رشوت ستانی اور گمراہ کن رسوم و روایات کے خلاف آواز اٹھانے میں طنز و مزاح کی صنف کا خاصا ہاتھ ہے مگر اسی صنف میں فقیر موہن سیناپتی کا مدِ مقابل کوئی اور نظر نہیں آتا۔ جن ادیبوں نے آزادی کے بعد کے اڑیا ادب میں اس صنف کو اپنایا انہیں ہم عظیم کہہ سکتے ہیں لیکن وہ فقیر موہن کے ہم پلہ نہیں ہو سکتے۔ آزادی کے بعد جن فنکاروں نے اس صنف کو مالا مال کیا ہے وہ ہیں گوپی ناتھ مہانتی، راج کشور پٹنایک، ابنی کمار براڑ، کولومنی مہاپاترا، چندر سیکھر رتھ، گوداورش مہاپاترا، کرشنا چرن بے ہرا، سریندر مہانتی، باماچرن مترا، چودھری ہیم کانت مصرا، فتورانند، منوج داس، بسنت کمار ستپتھی، مہاپاترا نیل منی ساہو، گوراچاند مصرا، کملا کانت داس، کشوری چرن داس اور ہرے کرشن داس وغیرہ۔ ان میں سے گوپی ناتھ مہانتی نے دانا پانی اور امرت رو سنتانو، راج کشور پٹنایک نے کالا پردہ اور لکشمی چاندو، کرشنا پرشاد نے آکھا ٹا گھورے بیٹھک، لکسمی دھر نائک نے ہائے رے ڈر بھاگا دیش، مہاپاترا نیل منی ساہو نے تامسی رادھا، بی بھوتی پٹنایک کے چڑ بولو چھندا اور سریندر مہانتی نے اندھو دیگنتو جیسے ناول لکھ کر طنز و مزاح کے خزانوں میں اضافہ کیا۔ مندرجہ بالا مزاح نگاروں نے واقعات پر نظر رکھنے کے بجائے کردار نگاری کو زیادہ اہمیت دی۔ ان کے علاوہ گوپال چندرا مصرا، ہرے کرشنا داس، راج کشور رائے، ونود بنی، گوداورش مہاپاترا، کرشنا چرن بے ہرا، کشوری چرن داس، باماچرن مترا، کرشنا پرشاد مصرا، فتورانند، نیتا نند مہاپاترا، مہاپاترا نیل منی ساہو، ابنی کمار براڑ اور منوج داس کے افسانے طنز و مزاح سے لبریز ہیں اور ہندوستان کی کسی اور علاقائی زبان کے افسانوں سے کم نہیں۔

اگر ادب سماج کا آئینہ دار ہوتا ہے تو جن افسانوں اور ناولوں

سماج کی تصویر کشی کی گئی ہو اور اس کے بے شمار واقعات و مسائل نیز کشمکش کو پیش کیا گیا ہو تو ہم نہیں اصولاً سماجی ناول یا افسانہ کہتے ہیں۔ بلاشبہ یہ بڑی حد تک صداقت پر مبنی ہیں لیکن ایسی چیزوں کو سیاسی یا تاریخی ناول یا افسانہ نہیں کہہ سکتے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کے اڑیہ ادب میں گوپی ناتھ مہانتی بعد کا نہوچرن مہانتی سماجی ناول نگاری کے علمبردار ہیں۔ 'پرجا' 'ماٹی مٹال'، امرت سنتانو اور دانا پانی وغیرہ ناولوں میں گوپی ناتھ مہانتی نے سماجی واقعات کو صاف ستھرے پیرائے میں پیش کیا ہے۔ اُس کے ناولوں میں صرف انسانی کردار ہی نہیں پیڑ پودے، کیڑے مکوڑے، حیوانات، ندی آبشار اور موسم وغیرہ بھی زندہ جاوید نظر آتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس کے تمام کردار آزاد ہونے کے باوجود، سماجی رشتہ کے ذریعہ ایک دوسرے سے منسلک بھی ہیں۔ اسی طرح کانہوچرن مہانتی نے اپنے مختلف ناولوں میں سماج کی بنیادی صداقت، اس کے جمالیاتی عناصر پاپ اور پن کے فرق کو پیش کرنے اور سرمایہ دارانہ نظام اور مظلوموں کی تصویر کشی کرنے میں کامیاب نظر آتا ہے۔ راج کشور پٹنایک نے پتھر، ڈھیا چولا باٹو، کولا پردہ اور سال گرام وغیرہ اور بیشانندا مہاپاترا نے جیونتا موتی نیو، جیونور نکھشہ اور سبھول وغیرہ لکھے۔ ان ناولوں میں سماج کے مختلف مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آزادی کی دوسری دہائی کے بعد بی بھوتی پٹنایک کے ناول نظر آتے ہیں جن کے پلاٹ ایک خاص کردار کے گرد گھومتے نظر آتے ہیں۔ اس کے متعدد ناول جنسیات سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان ناولوں میں سماج کے بعض دوسرے پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ برجو موہن مہانتی کی کہانی 'کہانی تینی بند ھورد' اور گانیشر مصرا کی کہانی 'ندی مدی کو'، گورا چند مصرا کی 'چہتر کہی نو، نرسنگھ ساہو کی 'دکھو نولی رو کوڑے کوڑے' اور 'بوڑو گھور و جھیو' کملا کانت داس کی 'مد بھائی'، 'رلمن روسند ھیا'، چترا تارو کا اور چاندنی چوک' وغیرہ دسرتھ سال کی 'میگھ میدور واکاش'، رودی نارائن مہاترا کی 'بھوت رنگو اور بسنتو روسو ہو' وغیرہ ۱۹۶۰ء کے قبل کی تحریر کردہ ہیں جن میں سماج کے مختلف مسائل کو کامیابی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ گوپی ناتھ مہانتی نے پرجا، امرت روسنتانو، سیبو بھائی اور دادی بوڑھا وغیرہ کی تخلیق کی جنھوں نے اُڑیہ ادب میں اس کو ایک مخصوص مقام بخشا۔

جن ادیبوں نے گذشتہ پچیس سال کے دوران سماج کے ڈھانچے میں گوشت پوست بھرنے یا سماج کے جسم سے متعفن پھوڑوں کو دور کرنے کی غرض سے اُڑیا افسانے کو ایک نیا موڑ دیا ہے وہ آج بھی خاموش نہیں ہیں۔ ان کے قلم اب بھی متحرک ہیں۔ اُڑیا زبان میں افسانہ نگاری کے بانی فقیر موہن سیناپتی کے افسانہ ربے پوتی کے وجود میں آنے کے ایک طویل مدت کے بعد گوداورش مہاپاترا نے 'ملیا ماشرنی ملو گوڑیا' کی تخلیق کی۔ اسی طرح فقیر موہن کی کہانی 'دھلیا باکی اساس پر شربون مہانتی نے اپنے افسانے 'امرت تکلی' تیرانیلو چوشنا اور سوبھی چترا دمو سورا گلاب' میں سماج کی بے راہ روی اور دوسرے مسائل پر نکتہ چینی اور آج کے سماج کی مکمل تصویر کشی کی ہے۔ کرشنا پرشاد مصرا کی کہانی سرو درو کورو پرسنا اور کرتو داس رو کا وبہ میں پورے سماج کے شعور اور لاشعور کی تصویر جلوہ فگن ہے۔ نیتا نندا مہاپاترا کا افسانہ 'دلبس اسٹینڈ' اور بسنت کمار پٹنایک 'ناستک' دونوں سماج کے مختلف مسائل پر لکھے گئے ہیں لیکن دونوں کا مقصد ایک ہی ہے۔

افسانہ نگار بی بھوتی پٹنایک نے ۱۹۶۵ء کے بعد چند افسانے لکھے جو فرقہ وارانہ فسادات اور اسی طرح کے دوسرے موضوعات پر مبنی ہیں۔ اُس کے افسانے 'جہاں آرا'، 'پریم پترا'، 'موفو پنگو' اور 'بوسا بلاؤ' وغیرہ ہیں۔ کشوری چرن داس کے ۱۹۶۰ء کے بعد کے افسانوں کے مجموعے کی بیشتر کہانیاں ماڈرن سوسائٹی کے زہریلے پن کی تصاویر ہیں۔ اس کے علاوہ بینا پانی مہانتی نے پانتھو سالا اور رکتو کوروبی، پرمانندا پنڈا نے کلا اور کلپنا، منوج داس نے سیبو بسنتو رو چیٹھی، اننت پٹنایک نے چوڑھا ئی تار، منورما مہاپاترا نے یہ پر تھیو سورو ربھ، زبیدا لگار نے برتیو جھوڑو رو سنگیتو اور رتیش دھل نے جھوروتا جھری جھری جلنے کی تخلیق کی جو اُڑیا کے نہایت کامیاب افسانے ہیں۔

سرشت انسانی کو جنسی میلانات کی ودیعت کوئی ایسی حیرت انگیز بات نہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو انسان کی قوت تخلیق کا اظہار و استعمال کس طرح ممکن ہوتا۔ مگر آج بیشتر ادیبوں نے اس سے بیجا فائدہ اٹھایا ہے۔ یہی حال اُڑیا ادب کا بھی ہے۔ جنسی احساسات پر مبنی بیشتر اُڑیا افسانوں اور ناولوں میں ادبی قدروں کا فقدان ہے۔ بھوک اور جنسی بھوک انسانی جبلت میں شامل ہیں۔ ان جبلتوں کا قابو میں رکھنا سماج کا پہلا کام ہے۔ ان کا بے قابو ہو جانا سماجی انتشار کا باعث ہوتا ہے اور اسی انتشار نے آج کے انسان کو بے راہ اور گمراہ کر دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ صرف اُڑیا ادب ہی نہیں، بین الاقوامی ادب بھی اسی عارضے میں مبتلا نظر آتا ہے۔ بھارت کے قدیم ادب میں بھی متعدد کاویہ اور کویتائیں ایسی پائی جاتی ہیں جو جنس پر مبنی ہیں۔ لیکن آج کے اُڑیا قلمکار ان سے استفادہ کرنے کی بجائے یورپی ادب سے اثر پذیر ہیں۔ گوپی ناتھ مہانتی

کا ناول "راہو رہ چھایا" اسی زمرے میں آتا ہے۔ یہ ناول فرائڈ کے جنسی اصول پر مبنی ہے۔ راہو کا سایہ جس طرح چاند کی کرنوں کو ختم کردیتا ہے اسی طرح جنس کی آگ میں ایک ہستی کا کردار ختم ہوجاتا ہے۔ سانتو نو کمار آچاریہ کا ناول "نت سنک" بھی اس کے دوسرے ناول "شتابدی روتی" کیتا اور نرکن نرکی طرح جنسی مرض میں مبتلا کرداروں پر مبنی ہے۔ بی بھوتی پرشاد کا کردار ایک جنسی مریض کا کردار ہے۔ وہ سکماری کو ہلاک کردیتا ہے۔ اس کے پس منظر میں اس کے لمحاتی جنسی فکر و خیال کی کارفرمائی ہے۔ نیز یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو قابو میں نہ رکھ سکا اور سکماری کا قاتل بنا۔ جنسی مرض میں مبتلا انسان ہمیشہ ایک غیر مکمل ناکام اور مایوس زندگی گذارتا ہے۔ نرکن نرکی پیرزن جن بچوں کو پال پوس کر بڑا کرتی ہے وہی بچے جوان ہوکر اس سے میوی جیسا سلوک کرتے ہیں۔ بے راہ روی، مایوسی اور ناکامی کا نتیجہ ہے جو آج کے نوجوانوں کا خاصہ ہیں۔ البتہ گووند داس کا ناول "اماوس رو چندرو" چند خامیوں کے باوجود انسانی جبلتوں پر مبنی ہونے کی وجہ سے کارآمد نظر آتا ہے۔

برجو موہن مہانتی کے دو ناول ہیں۔ ایک "بندرے نیا" اور دوسرا "کہانی تیمنی بندھورو" جنہیں زبان اور انداز بیان کے لحاظ سے کامیاب کہا جاسکتا ہے۔ لیکن فحش عریاں اور گندے واقعات کا بیان "بندرے نیا" کو کوئی اچھی جگہ نہیں دیتا۔ آج کا انسان بے یقینی اور تشویش کا شکار ہے۔ ناول نگار نے اس حقیقت کو اپنے کرداروں کے ذریعے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ کملا کانت داس، بی بھوتی پٹنایک، گندھری چرن داس، پرمانند ادھیکاری، بھاگیرتھی نیاک، مہاپاترا بسنت کمار، خنک دیو ساہو، بھوبن گوسوامی اور گوپی ناتھ بے ہرا وغیرہ کے نام آتے ہیں جنہوں نے اپنے ناولوں میں جنس سے متعلق واقعات اور جنسی ردِ عمل کو جگہ دی ہے۔ ان ناول نگاروں میں بیشتر جاسوسی ناولوں کے خالق ہیں۔ عظیم جنگوں کے محرق واقعات، قتل و غارتگری، آج کے سماج کے مختلف فرقوں کے باہمی تصادم اور لوٹ کھسوٹ وغیرہ پر مبنی بیشتر جاسوسی ناولوں کی تخلیق اڑیا ادب میں بھی ہوئی ہے۔ انگریزی کے پیری میسن کی طرح اڑیا میں دیپک سیریز، تارجن سیریز، کندن سیریز اور شیطان سیریز وغیرہ پابندی سے شائع ہو رہے ہیں۔ یہ ناول عوام میں مقبول بھی ہو رہے ہیں۔ لیکن ٹائیل ڈوئل کا ناول "مول فلنڈر" یا جاسوسی ناول نگار پیکاریس کے ناولوں کی طرح کا ایک بھی ناول اڑیا ادب میں نہیں لکھا جاسکا۔

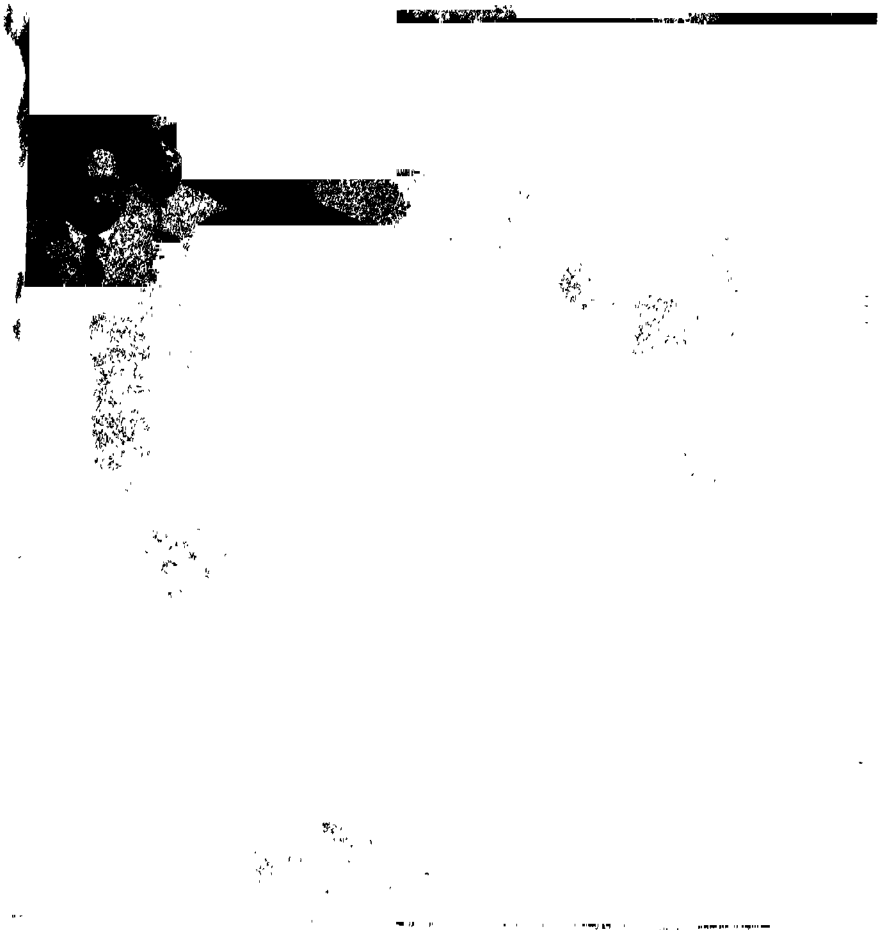
آزادی کے بعد چند نوجوان قلمکاروں کے جنسیت پر مبنی ناول منظرِ عام پر آئے ہیں جن میں جنس سے متعلق نفسیاتی عمل اور ردِّ عمل کو پیش کیا گیا ہے۔ اگرچہ ان قلمکاروں نے البرٹ موراویہ، فرائڈ، موپاساں اور سیشن بیک جیسے مفکروں اور ادیبوں کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کی ہے لیکن ان کا پس منظر ہندوستانی سماج اور ماحول ہے۔ ۱۹۶۰ء کے وہ قلمکار جو اس زمرے میں آتے ہیں انادا پرشاد رائے، کیلاس لنکا، مہاپاترا، بسنت کمار پرفلا تریپاٹھی، بی بھوتی بھوسنڈ تریپاٹھی، رووی پٹنایک، رجنیا موتی نریندرا کمار وغیرہ ہیں۔ عورت کا حسن ہر انسان کو چاہے وہ کسی بھی عمر کا ہو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ اسکی تشریح بی بھوتی تریپاٹھی کی کہانی "مادھو کے نے بچارو" میں کی گئی ہے۔ رووی پٹنایک نے اپنی کہانی "اندھو گوڑی رو گوڑی رے" میں جنسی مرض میں مبتلا نوجوان کے نفسیاتی ردِّ عمل کی تصویر کشی کی ہے۔

دوسری زبانوں سے منتقل ہونے والے ادب میں بھی کافی اضافہ ہوا ہے۔ کسی ادب پارے کا کسی دوسری زبان میں ترجمہ آسان کام نہیں ہے۔ ترجمے کرنے والے کا دونوں زبانوں پر عبور رکھنا لازمی ہے ورنہ ترجمہ کامیاب نہ ہوگا اور اس میں فنی حسن اور لسانی نزاکتوں کا فقدان ہوگا۔ آزادی سے قبل کے اڑیا ادب میں ترجمہ کی کمی تھی لیکن ۱۹۶۰ء کے بعد متعدد نوجوان ادیب اس مشکل کام کو انجام دینے کے لئے آگے بڑھے ہیں اور انہوں نے انگریزی، ہندی اور بنگلہ زبان کے افسانوں اور ناولوں کے ترجمے کئے ہیں۔ اڑیا ادب کے مشہور ترجمہ کار لکشمی نارائن مہانتی، چنتا مونی مصرا، سرنواس اُدگاتا، اودے نارائن سڑنگی، اننت پٹنایک اور گردھاری مصرا ہیں جنہوں نے بالترتیب مولا مونی سوکتا کو ہے، ٹی سی تھے نستار، ٹاسو، شام کاکا رو کوٹی رو، ماں اور بندھاری موگو کو لکھ کر ترجمہ کا وقار بڑھایا ہے۔

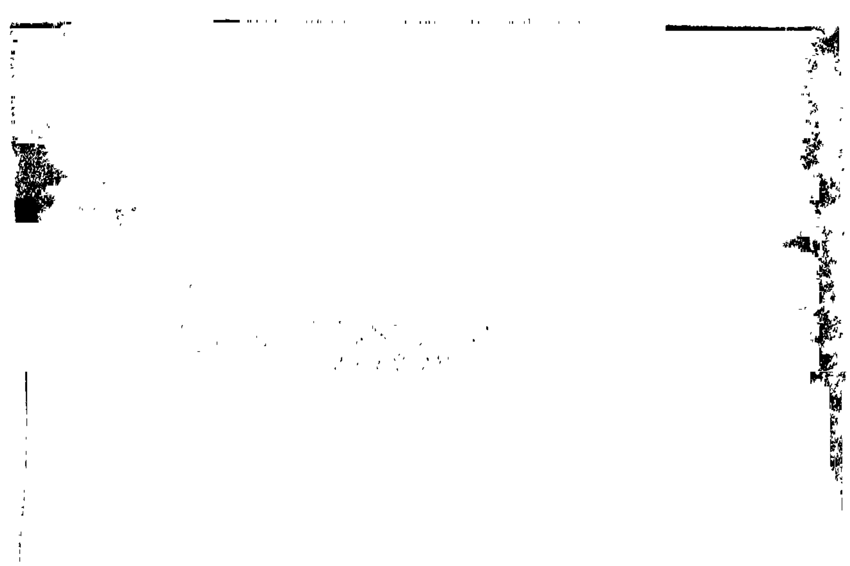
اڑیا ادب میں سائنسی ناولوں اور افسانوں کی کمی ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں بھی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں جن کا اثر ادب پر بھی پڑنا لازمی ہے لیکن اب تک اڑیا قلمکاروں کے نقطۂ نظر میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آرہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اڑیا ادب میں سامئول ویکٹ کے مولوے (....) یا ایچ۔ جی۔ ویلز کے مختلف سائنسی ناولوں جیسے ناول نظر نہیں آتے۔ پھر بھی گوکولا نندا مہاپاترا، اسوینی کمار پنجاری اور دیوکانت مصرا نے چند ناول لکھے ہیں اور امید ہے کہ آئندہ ان موضوعات پر بھی قلم اٹھایا جائے گا۔ ●●



خوراک
ضائع نہ کریں
دوسرے کئی لوگوں کو خوراک کی ضرورت ہے۔
گھروں، پارٹیوں، ہوٹلوں اور کلبوں میں کھانا ضرورت کے مطابق ہی لیجئے۔
بچوں کو بھی یہی سکھائیے۔
اس طرح آپ اپنا پیسہ بچائیں گے اور ملک کا بھی۔
دانہ دانہ قیمتی ہے
اسے ضائع نہ کریں
davp 73/329



احب اور ان کے وفد کے
لین جناب کھاانڈیکر
احمد اور ڈاکٹر کمال حسین
ج گھاٹ پر جہاتما گاندھی
دی پر عقیدت کے پھول چڑھائے



ہند کے حالیہ دورے کے بعد مغربی
افریقہ کے دوست ملک سینیگل کے
صدر سینگھور کی نئی دلی سے روانگی
کا منظر۔ شری گری اور شریمتی اندرا گاندھی
انہیں الوداع کہہ رہے ہیں۔
صدر سینگھور بڑے انسان دوست ہیں
اور افریقہ کے ملک الشعراء کہلاتے ہیں۔



شیخ مجیب الرحمٰن کے قیام نئی دلی کے دوران ہی سلطان المشائخ حضرت
خواجہ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کا عرس منایا جا رہا تھا۔ شیخ صاحب
روضۂ مبارک پر حاضری دے رہے ہیں اور پھولوں کا نذرانہ پیش کر رہے ہیں۔

Vol. 32 No. 12 Ajkal (Monthly) July, 1974
[illegible] by the Director, Publications Division, Patiala House, NEW DELHI-110001
[illegible] by Indian Printing Works, Rani Jhansi Road, NEW DELHI-110055

نطق اختتامیهٔ

اعلیحضرت همایونی

بعد از ختام معروضه فوق ریاست شورای ملی تکراراً ذات شاهانه درکلمات مختصر دلچسپ نهایت مهم ازین حسیات وکلای ملت محبوب شان شکر گذاری فرمودند ودعا کردند «که خداوند بذات شاهانه وعموم مامورین وعسکر وملت افغانستان توفیق ارزانی فرماید تادرراه انجام خدمات مقدس وطن که فرض ذمهٔ هرفرد ملت است مصدر اجراآت مهمی شده این وظیفه مقدسه ایمانی ووجدانی خودرا بکمال صداقت وامانت انجام دهند»

راجع بر اصلاحات و پیشرفتی که درین عرصهٔ دو سال به ملت ومملکت افغانستان عائد شده است چنین ارشاد نمودند :ـ

« این اصلاحات و اجراآت که شما ازان اظهارات نمودید در حقیقت از لطف و کرم حضرت الهی به نصیب شما واین خاك پاك اسلامی گردیده است ـ بازهم چون جهان عالم اسباب است ، تمام این کامیابی وموفقیت افغانستان دراثر مساعدت ومعاضدت ملت محبوبم باحکومت متبوعه شان وکوشش ومساعی جمیله صدراعظم وکابینه شان وعامهٔ مامورین ملکی و نظامی افغانستان بعمل آمده است »

از درگاه الهی امیدواریم همانطوریکه از لطف وکرم خویش افغانستان را از آفات وبلیات گوناگون نجات بخشیده درمدت اندك همهٔ جراحاتش را التیام بخشیده است، دائماً اورا باشرف ووقار وجاده پیمای راه ترقی وافتخارداشته باشد .

درخاتمه بعموم شما توصیه میکنم که در همه مواقع برای خدمت وطن وتعالی

ملت خود ساعی وجاهد وهمت خودرا همیشه بلند وعالی داشته باشید تا بواسطه جد وجهد وسعی وعمل وهمت بلند خویش نزدخالق ومخلوق سرفراز وممتاز باشید

همت بلند دار که نزد خدا وخلق
باشد بقدر همت تو اعتبار تو

بهر اندازهٔ که عزم وهمت شما عالی وبدرگاه حضرت الهی سرعجز ونیاز شما بسجده باشد البته که بهمان اندازه مراحم ربانیه ممدو معاون شما بوده بواسطه عزم بالجزم وهمت بلند خود مراتب ارجمندی‌را نائل میشوید .

استقبال از جشن

بیا را دگر بار صحن چمن را — که وقت است جشن نجات وطن را
همی خواهم از حالت زار ماضی — کنم روشن و آشکار این سخن را
که تا شکر گویند امروز مردم — ازان حال گویم همی تن به تن را
سری یافت ازخودسران دزدورهزن — خدا کم کند این چنین یافتن را
رسیدند برتخت و تاج آن کسانی — که بودند شایسته دار و رسن را
قبای شهی کرد در بر غنیمی — که هر دم سزاوار بودی کفن را
ندانم که سر داد بر جان ملت — بیکباره سیل چنین موجزن را
که افگند در خانهٔ ملك و دولت — الهی چنین برق آتش فگن را
چسان بی‌سبب خشك وتر سوخت یارب — که کرد این چنین آتش افرختن را
وطن گشت ویرانه از سؤ تدبیر — که دید آنچنان سیل بنیاد کن
ندیدم یکی دزد با چند فردی — که بر پای تخت آ...

کجا بود تدبیرو ناموس‌و غیرت — که دانند ملك و وطن چند تن را
توان برد دست‌از مخالف حریفی — که هر دم مهیاست جان باختن را
چها در وطن کرد دزد بد اختر — که مردن بدی مژدهٔ زیستن را
تن خلق ازان‌زشت رفتار دیدی — شب و روز زندان غم پیرهن را
بتکرار دیدند افراد ملت — غم و درد و رنج و بلا و محن را
زبی‌ضبطی ضبط و تاراج مردم — ندا نستی از خویشتن خویشتن را
زکف داده هرواحدی‌خان‌ومان‌را — وداع ابد گفته فرزند و زن را
بجوروجفاسوخت جان‌ها گروهی — که واقف نبودند دل سوختن را
چه‌بودی اگردیدی آن‌سخت‌حالت — که آسان شدی بیستون کوه کن را
نمود ار غوانی رخان زعفرانی — برنگ بهی ساخت سیب ذقن را
وطن بود گلزار و خون شهادت — عزیزان کفن ساخته پیرهن را
نمودند درخاك بس جامه خونین — شهیدان ندانند رسم کفن را
شب ما کند روز ای قوم‌وملت — خبر میرسد آفتاب زمن را
بپاریس‌خواهد شد آگاه روزی — کند در زمان عزم باز آمدن را
نجات وطن سخت باشد ولیکن — نه شاه توانای شمشیر زن را
وحید زمان نادر عصرو دوران — که جان میدهد لطف طبعش بدن را
ازان گوشهٔ دور این‌بود عزمش — که از خارو خس پاك سازد وطن را
پی راحت ملك‌و ملت‌چومردان — پسندید برخویش رنج و محن را
وطن را کند باز خالی زدشمن — کند خانهٔ عیش بیت‌الحزن را
خورشید طالع شدازصبح کشور — زدود آن شب تار تاری پرن را

شهٔ معدلت کیش یکتای گیتی — که در بست برروی رنج و حزن را
بهردل کمین کرده صد زخم کاری — که داند جز او زخم دل دوختن را
نظیرش نه بینم باخلاق نیکو — ازو یاد گیرید خلق حسن را
وطنخواه فرزانه دلسوز ملت — که بشکست خیل بلا و فتن را
شهٔ دانش آموز جان معارف — که پیوسته میپرورد علم و فن را
بعقل و بتدبیر و اقبال و طالع — زبد خواه دون کرد خالی وطن را
بدانگونه شد منجی قوم و ملت — که حاجت نشد جنگ وخون ریختن را
کند عزم ترمیم ویرانهایش — نوی میدهد این سرای کهن را
بجان و دلا کنون وطنخواه گوید — روان شکر شاه فرید وطن را
توان خواستن حافظ جسم وجانش — خداوند دانای سرو علن را
وطن یافت از دست دشمن خلاصی — رسانید بادوستان این سخن را
منادی توان کرد در کوی و برزن — که سازد خبردار اهل وطن را
که آمد دگر بار عید مسرت — مبر بعد ازین نام رنج و محن را
کنون وقت عیش است و ایام عشرت — بیاور گل و سنبل و یاسمن را
چمن گردد از جوش گل جای فرحت — رسانده خدا بلبلی همچو من را
صبا ازچمن سوی چین و ختا شو — که ارزان نمایند مشك ختن را
چراغان چمن را کند صحن روشن — کند خیره از رشك چشم پرن را
وطن را کنون میکند برق روشن — نگیرد کسی نام شمع و لگن را
نفس وار هردم نمایند مردم — بسوی چمن رفتن و آمدن را
چو نقش قدم هر که هرجا نشیند — نماید فراموش برخاستن را
گروهی تماشائی پهلوانی — کند سیر مغلوب و غالب شدن را